تکملہ

تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

للامام النواب محمد صدیق حسن خان القنوجی رحمہ اللہ

تالیف

مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۲۶۲-۱۳۴۰ھ)

تصحیح وتنقیح ونظرثانی

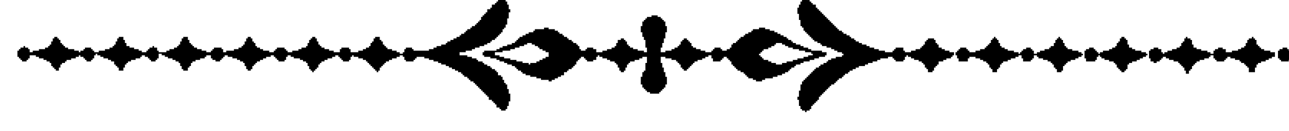
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف رحمۃ اللہ علیہ | حافظ عبداللہ سلیم حفظہ اللہ

تسہیل: محمد یحییٰ قریشی تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد دہم

دار ابی الطیب للبحث والتحقیق

مکتبہ قدوسیہ



نام کتاب: ______ تکملہ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف: ______ مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی

قیمت: ______

طبع اول: ______ فروری 2025ء



ناشر

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

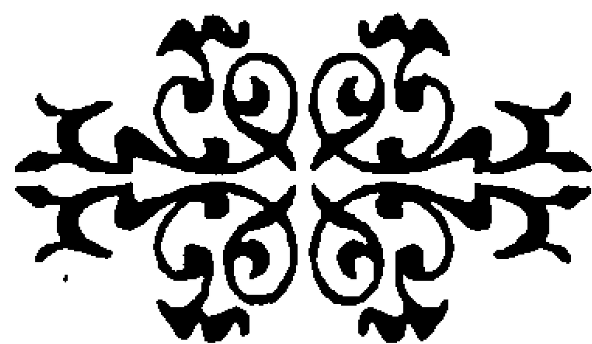
گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ

www.darabitayyab.com darabitayyab1@gmail.com

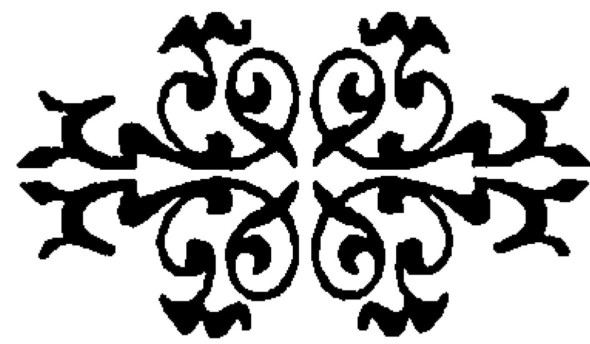
www.facebook.com/darabitayyab/

+92-55-3823990

فہرست



فہرست مضامین



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ الطُّوْرِ

بعض نسخہ جلالین میں سورت ﴿وَالطُّوْرِ﴾ ہے۔ اس سورت مبارکہ میں ایک کم پچاس (۴۹) آیات ہیں اور مکی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول میں مکی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ طور مکہ میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس والنحاس وابن مردويه والبيهقي) سیدنا عبداللہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] (أخرجه ابن مردويه)

سورۃ الطّور کی فضیلت:

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ مغرب میں سورۃ الطّور پڑھتے تھے۔[3] (أخرجه البخاري ومسلم وغيرهما) سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے پہلو کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے سورۃ الطّور کے ساتھ۔[4] (أخرجه البخاري وغيره)

مطلب یہ ہے کہ نماز میں سورۃ الطّور پڑھ رہے تھے۔[5] (كذا في فتح البيان) تفسیر ابن کثیر میں سیدنا جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اتنا زیادہ ہے: پس میں نے نہیں سنا کسی کو کہ وہ آواز یا قراءت کی رو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوب ہو۔[6] (أخرجاه من طريق مالك) اور سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث یوں ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میں بیمار ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو لوگوں کے پرے سے طواف کر اور تو سوار ہو، چنانچہ میں نے طواف کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے پہلو کی طرف نماز پڑھ رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ﴿وَالطُّوْرِ ۝ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ﴾ کی قراءت کر رہے تھے۔[7]

---

① تفسير القرطبي (۱۷/۵۸۔دار الكتب المصرية، القاهرة) ② الدر المنثور (۷/۶۲٦) فتح القدير (۵/۱۲٤)

③ صحيح البخاري (۷۳۱) صحيح مسلم (٤٦٣)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٢) ⑤ فتح البيان (۱۳/۲۱۵)

⑥ صحيح البخاري (۷۳۱) صحيح مسلم (٤٦٣) تفسير ابن كثير (٤/۳۰۳)

⑦ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۲۷٦)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالطُّوْرِ ۙ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۙ﴿۴﴾ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَاۗءُ مَوْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۭ﴿۱۰﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۘ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۭ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَاۗءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے طور (پہاڑ) کی ① اور ایک کتاب کی (قسم) جو لکھی ہوئی ہے ② کھلے کاغذ میں ③ اور بیتِ معمور کی (قسم) ④ اور اونچی چھت کی (قسم) ⑤ اور بھڑکائے ہوئے سمندر کی (قسم) ⑥ بے شک آپ کے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے ⑦ اسے کوئی روکنے والا نہیں ⑧ (وہ واقع ہوگا) جس دن آسمان زور سے حرکت کرنے لگے گا ⑨ اور پہاڑ تیزی سے چلنے لگ جائیں گے ⑩ چناں چہ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی ہے ⑪ جو (تکذیبِ حق کی) سخن سازی میں پڑے کھیل رہے ہیں ⑫ جس دن انھیں نہایت سختی سے دھکے دے دے کر جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا ⑬ (کہا جائے گا:) یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ⑭ کیا پھر یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں؟ ⑮ تم اس (دوزخ) میں داخل ہو جاؤ، اب تم صبر کرو یا صبر نہ کرو تمھارے لیے برابر ہے، تمھیں بس اسی کی سزا دی جائے گی جو تم عمل کیا کرتے تھے ⑯

اللہ جل جلالہ کا وقوعِ عذاب پر قسم کھانا:

کھلے ورق شاید لوحِ محفوظ کو کہا۔ آباد گھر کعبے کو کہا، یا ساتویں آسمان پر فرشتوں کے طواف کے لیے کعبہ ہے۔ اونچی چھت، یعنی آسمان، بھڑکایا ہوا سمندر، اوپر ایک دریا ہے۔ انتہیٰ[1]

اللہ پاک اپنی اس مخلوق کی قسم کھاتا ہے جو اس کی عظیم قدرت پر دلالت کرتی ہے۔ قسم کھا کر فرماتا ہے کہ اس

کا عذاب واقع ہونے والا ہے اس کے دشمنوں پر اور اس کو اُن سے دور کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ طور تو وہ پہاڑ ہے جس میں درخت ہوتے ہیں، اس پہاڑ کی طرح جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں اور جس سے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا۔ جس پہاڑ میں درخت نہیں ہوتے اس کا نام طور نہیں رکھا جاتا، اس کو صرف جبل ہی کہتے ہیں۔ ﴿ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ﴾ کسی نے کہا ہے کہ لوحِ محفوظ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کتبِ منزلہ مکتوبہ ہیں جو انسان پر جہاراً پڑھی جاتی ہیں، اسی لیے ﴿ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ﴾ فرمایا ہے۔

﴿ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ﴾ صحیحین میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شبِ معراج میں آپ ﷺ کے ساتویں آسمان تک جانے کے بعد مجھے اوپر بیت المعمور کی طرف لے گئے اور دیکھا تو اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، وہ فرشتے پھر لوٹ کر وہاں نہیں آتے۔ آخر ما علیھم[1] (بظاہر "آخر ما علیھم" کا مطلب دیگر روایات کے مطابق یہ ہے کہ وہ فرشتے پھر دوسری بار وہاں نہیں آتے، یعنی فرشتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ایک دفعہ وہاں پر آئے ہوئے فرشتوں کی دوبارہ وہاں آنے کی نوبت کسی زمانے میں نہیں آتی۔ از مصحح سلمه الله تعالى)۔

یعنی یہ ان کا آنا آخر ہے اس کا جو اُن پر ہے جو ان پر فرض تھا وہ ادا کر چکے، پھر دوبارہ نہ آئیں گے۔ یعنی اس میں عبادت کرتے ہیں، اس کا طواف کرتے ہیں جس طرح کہ زمین والے اپنے کعبے کا طواف کرتے ہیں، اسی طرح وہ بیت المعمور ساتویں آسمان والوں کا کعبہ ہے اور اسی لیے ابراہیم علیہ السلام کو آپ ﷺ نے پایا کہ اپنی پشت بیت المعمور کے ساتھ ٹکائی ہوئی ہے، اس لیے کہ وہ زمین کے کعبہ کے بانی ہیں اور جزا جنسِ عمل سے ہوتی ہے۔ بیتِ معمور کعبے کے مقابلے میں ہے اور ہر آسمان میں ایک گھر ہے جس میں اس کے لوگ عبادت کرتے ہیں اور اس کی طرف نماز پڑھتے ہیں اور جو آسمانِ دنیا میں ہے اس کو بیت العزۃ کہا جاتا ہے۔ والله أعلم.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ نبی اکرم ﷺ سے راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آسمان میں ایک گھر ہے اس کو معمور کہا جاتا ہے، وہ کعبہ کے مقابلے میں ہے، اور چوتھے آسمان میں ایک نہر ہے جس کو حیوان کہا جاتا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام ہر روز اس میں داخل ہوتے ہیں، پھر اس میں ایک دفعہ غوطہ لگاتے ہیں، پھر نکلتے ہیں تو ایک بار پر جھاڑتے ہیں اور اس سے ستر ہزار قطرے گرتے ہیں، اللہ ہر قطرے سے ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے، ان فرشتوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ بیت المعمور میں آئیں اور نماز پڑھیں، چنانچہ وہ ایسا کرتے ہیں اور اُن میں سے ایک ان پر حاکم بنایا جاتا ہے، اسے یہ حکم کیا جاتا ہے کہ ان کو لے کر آسمان کے کسی موقف میں وقوف کرنے اور اس میں وہ تسبیح کرتے رہیں، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔[2] یہ حدیث انتہائی غریب

---

[1] صحيح البخاري (٣٠٣٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣١٤/١٠) اس کی سند میں "روح بن جناح" سخت ضعیف راوی ہے۔

ہے۔ (تفرد به روح بن جناح هذا وهو القرشي الأموي مولاهم أبو سعيد الدمشقي، وقد أنكر عليه هذا الحديث جماعة من الحفاظ، منهم الجوزجاني والعقيلي والحاكم أبو عبد الله النيسابوري وغيرهم، قال الحاكم: لا أصل له من حديث أبي هريرة ولا سعيد ولا الزهري)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے خالد بن عرعرہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ بیت المعمور کیا ہے؟ فرمایا: آسمان میں ایک گھر ہے اس کو ضراح کہا جاتا ہے اور وہ کعبے کے مقابلے میں ہے بالکل اس کے اوپر آسمان میں، اس کی حرمت ایسے ہے جیسی زمین میں بیت اللہ کی حرمت ہے۔ اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں، پھر وہ اس میں کبھی نہیں آتے۔ (وكذا رواه شعبة وسفيان الثوري عن سماك وعندهما ان ابن الكواء هو المسائل عن ذلك) پھر ابن جریر رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود ابن ربیعہ سے روایت کیا ہے کہ ابن کواء نے علی رضی اللہ عنہ سے بیت المعمور سے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ آسمان میں ایک مسجد ہے جس کو صراح کہا جاتا ہے۔ اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں۔ پھر وہ کبھی اس میں دوبارہ نہیں آتے۔ (ورواه من حديث أبي الطفيل عن علي مثله)

امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول روایت کیا ہے کہ وہ عرش کے مقابل میں ایک گھر ہے اس کو فرشتے آباد رکھتے ہیں۔ ہر روز اس میں ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں، پھر وہ اس میں دوبارہ نہیں آتے۔ اسی طرح امام عکرمہ اور مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے سلف میں سے کہا ہے۔ امام قتادہ، ربیع بن انس اور سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے اصحاب سے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ بیتِ معمور کیا ہے؟ عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: پس بے شک کعبے کے مقابلے میں وہ آسمان میں ایک مسجد ہے، اگر وہ گرتا تو البتہ بیت اللہ پر گرتا، اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں جب وہ اس سے نکلے تو پھر دوبارہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ آخر ما علیهم۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کا یہ زعم ہے کہ اس کو فرشتوں کا ایک گروہ آباد رکھتا ہے جن کو جن کہا جاتا ہے، وہ قبیلۂ ابلیس سے ہیں۔[1] والله أعلم.

امام سفیان ثوری، شعبہ اور ابو الاحوص رحمہ اللہ نے عن سماک عن خالد بن عرعرہ عن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: ﴿ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ﴾ یعنی آسمان۔ سفیان نے کہا: پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ﴾ [الأنبياء: ۳۲] ''آسمان کو محفوظ چھت بھی ہم نے ہی بنایا ہے۔'' اسی طرح امام مجاہد، قتادہ، سدی، ابن جریج اور ابن زید رحمہ اللہ نے بھی کہا اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[2] امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرش ہے، یعنی وہ تمام مخلوقات کے لیے چھت ہے۔ (وله اتجاه وهو مراد مع غيره كما قاله الجمهور)

﴿ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴾ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: یہ وہ پانی ہے جو عرش کے نیچے ہے جس سے اللہ تعالیٰ وہ بارش نازل کرے گا جس سے جسم اپنی قبروں میں سے اپنے روزِ معاد میں زندہ ہو جائیں گے۔ جمہور نے کہا: وہ یہی دریا ہے۔[3] ''مسجور'' کے معنی میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ بعض نے کہا: مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن وہ آگ

[1] تفسير الطبري (۲۲/۴۵۵-۴۵۷) [2] تفسير الطبري (۲۲/۴۵۷، ۴۵۸) [3] تفسير ابن كثير (۴/۳۰۴)

کے ساتھ دھکایا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴾ [التكوير: ٦] ''اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے۔'' ''أَيْ: أُضْرِمَتْ'' یعنی جس وقت دریا جھونکیں جھائیں گے تو وہ آگ ہو کر دہکنے لگیں گے۔ اہلِ موقف کا احاطہ کرنے والے ہوں گے۔[1] (ورواه سعيد بن المسيب عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه و روي عن ابن عباس رضي الله عنهما وبه يقول سعيد بن جبير و مجاهد و عبد الله بن عبيد بن عمير وغيرهم)

علاء بن بدر نے کہا ہے کہ بحرِ مسجور اس کا نام صرف اس لیے رکھا گیا ہے کہ نہ اس سے پانی پیا جاتا ہے اور نہ اس سے کھیتی سیراب کی جاتی ہے اور اسی طرح قیامت کے دن دریا ہوں گے۔[2] (كذا رواه عنه ابن أبي حاتم) امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مسجور'' مرسل ہے، یعنی دریا چھوڑ دیا گیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''المملوء'' کے معنی میں ہے، یعنی بھرا ہوا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو پسند کیا ہے اور اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ وہ آج کے دن دھکایا ہوا نہیں ہے تو مملو ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد فارغ ہے۔

امام اصمعی رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ''مسجور'' بہ معنی فارغ ہے۔ ایک امت نکلی جو پانی مانگتی تھی، پھر وہ لوٹ آئی تو کہا: ''إِنَّ الْحَوضَ مَسْجُورٌ'' یعنی حوض فارغ ہے۔ (رواه ابن مردويه في مسانيد الشعراء) کسی نے کہا ہے کہ ''مسجور'' سے مراد ''ممنوع ومکفوف'' ہے، یعنی زمین سے روکا ہوا ہے، تاکہ اس کو نہ ڈھانکے کہ اس کے لوگوں کو ڈبو دے۔[4] (قاله علي بن أبي طلحة عن ابن عباس رضي الله عنهما وبه يقول السدي وغيره)۔

اور اسی پر وہ حدیث دال ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں عوام سے روایت کیا ہے، کہا: مجھے حدیث کی ایک شیخ نے جو دریا کے کنارے پر مرابط تھا (دشمن کی سرحد پر رہنے والا)۔ کہا: میں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے مولی ابو صالح سے ملا تو اس نے کہا کہ ہم کو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی رات ایسی نہیں ہے کہ جس میں دریا تین بار اشراف نہ کرتا ہو (اشراف اوپر سے نیچے تک دیکھنے کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ معنی ہیں کہ وہ بلند ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ سے اس بات کی اجازت مانگتا ہے کہ ان پر انفضاخ کرے (یعنی زمین والوں پر پھیل پڑے اور اُن کے سر کچل ڈالے، سب کو ہلاک کر دے، واللہ أعلم) تو اللہ عزوجل اس کو روکتا ہے۔[5]

حافظ ابوبکر اسماعیلی رحمہ اللہ نے عوام بن حوشب سے روایت کیا ہے، کہا: مجھے ایک شیخ نے حدیث کی، وہ دریا کے کنارے پر مرابط تھا۔ کہا: میں ایک رات اپنی حراست کے لیے نکلا (''مجمع البحار'' میں ''ليلة محرسي''[6]

---

[1] تفسیر الطبري (٤٥٨/٢٢)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٣١٥/١٠)

[3] تفسیر الطبري (٤٥٩/٢٢، ٤٦٠)

[4] تفسیر ابن کثیر (٣٠٥/٤)

[5] مسند أحمد (٤٣/١) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٣٩٢)

[6] مجمع بحار الأنوار (٦٤٤/٤)

ہے، یعنی اپنا پہرہ دینے کی رات میں نکلا) چوکیداروں میں سے میرے سوا کوئی نہیں نکلا۔ چنانچہ میں میناء کے پاس آیا تو چڑھا (میناء اس جگہ کا نام ہے جہاں کشتیوں کا لنگر ہوتا ہے۔[1] كذا في مجمع البحار) پھر میرے خیال میں یہ بات آنے لگی کہ دریا بلند ہوتا ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں کے برابر آ جاتا ہے، اس نے کئی بار یہ کیا اور میں جاگ رہا ہوں۔ پھر میں ابو صالح سے ملا تو اس نے کہا: ہم کو سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حدیث کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی رات ایسی نہیں ہے مگر حال یہ ہے کہ دریا تین بار بلند ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس بات کا اذن مانگتا ہے کہ ان پر انفصاخ کرے، پھر اس کو اللہ عزوجل روکتا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴾ جس بات پر قسم کھائی گئی ہے وہ یہی ہے، یعنی بے شک تیرے رب کا عذاب البتہ کافروں پر واقع ہونے والا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: ﴿ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴾ یعنی اس کو دفع کرنے والا کوئی نہیں ہے کہ اس کو اُن سے ہٹا دے، جبکہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اس کا ارادہ کرے۔

حافظ ابو بکر ابن ابی الدنیا نے عن صالح المری عن جعفر بن زید عبدی روایت کیا ہے، کہا: عمر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں ایک رات نکلے، وہ پاسبانی کا گشت کر رہے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ایک گھر کے پاس سے گزرے تو اس کو کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہوئے پایا، چنانچہ آپ ٹھہر کر اس کی قراءت سننے لگے تو اس نے ﴿ وَالطُّوْرِ ﴾ پڑھی، یہاں تک کہ اس آیت پر پہنچا: ﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴾ فرمایا: "قَسَمٌ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ حَقٌّ"، یعنی ربِ کعبہ کی قسم یہ ایک حق قسم ہے۔

پھر اپنے گدھے سے اتر پڑے اور دیوار کے ساتھ ٹک گئے، پھر دیر تک ٹھہرے رہے، پھر اپنے گھر کی طرف لوٹ گئے اور ایک مہینہ ٹھہرے رہے، لوگ ان کی عیادت کرتے تھے اور جانتے نہ تھے کہ ان کی بیماری کیا ہے۔[3] امام ابو عبید رحمہ اللہ نے فضائلِ قرآن میں حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴾ "فَرَبَا لَهَا رَبْوَةً"، یعنی اس کے باعث ان کی سانس اوپر چڑھ گئی اور ان کا سینہ تنگ ہو گیا، پھر اس کی وجہ سے بیس دن تک ان کی عیادت کی گئی۔[4] مطلب یہ ہے کہ وقوعِ عذاب کے سننے سے بیمار پڑ گئے۔

احوالِ قیامت:

﴿ يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: "تَتَحَرَّكُ تَحْرِيكًا"، (اصل میں اسی طرح ہے۔ شاید ""تحركا" ہو۔ والله أعلم) یعنی جس دن آسمان حرکت کرے گا ایک قسم کا حرکت کرنا۔ ان کا

---

① مجمع بحار الأنوار (٦٤٤/٤) ② تفسیر ابن کثیر (٣٠٥/٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
③ تفسیر ابن کثیر (٣٠٥/٤) ④ فضائل القرآن لأبي عبيد (١٣٦/١)

دوسرا قول: "هو تشققها" ہے، یعنی مور السماء سے مراد اس کا شق ہونا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "تَدُوْرُ دَوْرًا" یعنی جس دن آسمان چکر کھائے گا ایک طرح کا چکر کھانا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِسْتِدَارَتُهَا وَتَحَرُّكُهَا لِأَمْرِ اللّٰهِ وَمَوْجُ بَعْضِهَا فِيْ بَعْضٍ" یعنی آسمان کا چکر مارنا اور حرکت کرنا امرِ الٰہی کے لیے اور اس کے بعض کا بعض میں موج مارنا۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار ہے کہ "مور" حرکت کرنا ہے استدارت میں۔ کہا اور امام ابو عبیدہ معمر بن مثنی رحمہ اللہ نے اعشیٰ کا شعر پڑھا:

كَأَنَّ مِشْيَتَهَا مِنْ بَيْتِ جَارَتِهَا ... مَوْرُ السَّحَابَةِ لَا رَيْثٌ وَلَا عَجَلُ[1]

واہ! چال کی کیا خوب تشبیہ دی ہے، کہتا ہے گویا چال اس محبوبہ کی اپنی پڑوسن کے گھر سے بادل کی حرکت کی طرح ہے جس میں نہ دیر ہے نہ جلدی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴾ "أَيْ: تَذْهَبُ" یعنی پہاڑ جائیں گے، پھر ھبائً منبث ہو جائیں گے ("ھبا" وہ ہے جو سوراخ میں سے سورج کی روشنی آتی ہے اور اس میں باریک غبار چمکتا نظر آتا ہے)۔ اور بالکل اڑا دیے جائیں گے۔ ﴿ فَوَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ یعنی ان کو اس دن خرابی ہے اللہ تعالیٰ کے عذاب و نکال و عذاب سے جو اُن کے لیے ہوگا۔ پھر مکذبین کا وصف کیا: ﴿ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ﴾ یعنی وہ ایسے جھٹلانے والے ہیں کہ دنیا میں باطل کے اندر خوض کرتے تھے اور اپنے دین کو ٹھٹھا اور کھیل ٹھہراتے تھے۔

﴿ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴾ یعنی جس دن آتشِ جہنم کی طرف خوب زور سے دھکے دے کر ہانکے جائیں گے۔ امام مجاہد، شعبی، محمد بن کعب، سدی اور ثوری رحمہم اللہ نے کہا: "يُدْفَعُوْنَ فِيْهَا دَفْعًا"[2] یعنی اس میں دھکے مار مار کر دھکیلے جائیں گے، پھر ملامت اور سرزنش کے طور پر زبانیہ فرشتے ان سے یوں کہیں گے: ﴿ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی یہ وہ آگ ہے جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے، کیا پھر یہ جادو ہے یا تم کو سوجھتا نہیں ہے۔ ﴿ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی تم اس آگ میں اس شخص کی طرح داخل ہو جاؤ جس کو وہ اس کے چاروں طرف سے ڈبا دے، یعنی غرق کر دے۔ اب برابر ہے کہ تم اس کے عذاب اور نکال پر صبر کرو یا نہ کرو، تمھارے لیے اس سے کسی طرح کا نہ مفر (چھٹکارا) ہے اور نہ تم کو اس سے کوئی خلاصی ہے۔ تم تو وہی بدلہ دیے جاؤ گے جو تم کیا کرتے تھے، یعنی اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا دیتا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

امام جوہری اور قرطبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ طور وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں۔

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٤٦١-٤٦٣) [2] تفسير الطبري (٢٢/٤٦٤) [3] تفسير ابن كثير (٤/٣٠٣-٣٠٦)

امام مجاہد اور سدی ﷭ نے کہا ہے کہ سریانی زبان میں طور، کوہ کے معنی میں ہے اور اس سے مراد طورِ سینا ہے۔ امام مقاتل بن حیان ﷫ نے کہا ہے کہ وہ دو طور ہیں: ایک کو تو طورِ سینا کہا جاتا ہے اور دوسرے کو طورِ زیتا، اس لیے کہ یہ دونوں انجیر اور زیتون کو اُگاتے ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ وہ طور کوہِ مدین ہے، اس کا نام زبیر ہے۔

صاحبِ فتح البیان ﷫ فرماتے ہیں کہ مدین ارضِ مقدسہ میں ہے، یہ مدین شعیب علیہ السلام کی بستی ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ طور وہ پہاڑ ہے جو پھل دار درختوں کو اُگاتا ہے اور جو نہیں اُگاتا وہ طور نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ نے فرمایا: طور، جبل ہے۔ کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ طور جنت کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔[3] (أخرجه ابن مردويه وكثير ضعيف جدا) غرضیکہ اللہ پاک نے جبلِ طور کے شرف اور عزت کے لیے اس کی قسم کھائی اور ان نشانیوں کو یاد دلانے کے لیے قسم کھائی جو اس میں ہیں۔

﴿ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ﴾ یعنی قسم ہے کتاب کی! ایسی کتاب کہ لکھی گئی ہے، جس کی کتابت سطروں کے ساتھ متفق ہے، جو ان مرتب حرفوں میں صف بندھی ہوئی ہیں جو کلماتِ متفقہ کو جمع کرنے والے ہیں۔ سطر کسی شے کی صف کو کہتے ہیں، مثلاً: جب کوئی برابر پتھر رکھ کر دیوار کا ردہ اٹھائے گا تو کہیں گے: ''بَنٰى سَطْرًا'' یعنی اس نے ایک سطر بنائی۔ مطلب یہ کہ دیوار کا ایک تہہ رکھا اور سطر کے معنی خط کتابت کے بھی ہیں۔ ''سطر'' اصل میں مصدر ہے باب نصر سے اور ''سَطَر'' بفتحتین بھی۔ ''سَطَرٌ'' کی جمع ''أَسْطَارٌ'' ہے، جیسے: ''سَبَبٌ وَأَسْبَابٌ'' اور ''أَسْطُرٌ وَسُطُوْرٌ''، جیسے: ''أَفْلُسٌ وَفُلُوْسٌ'' اور جمع الجمع ''أَسَاطِيْرُ'' ہے۔ کتاب سے مراد یا تو قرآن شریف ہے۔ اس کو نکرہ اس لیے کہا کہ باقی کتابوں میں سے ایک مخصوص کتاب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ لوحِ محفوظ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ساری کتبِ منزلہ۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ کتاب جس کو حافظین فرشتے لکھتے ہیں۔ یہ قول امام فراء ﷫ وغیرہ کا ہے،[4] اس سے مراد نامۂ اعمال ہے۔ اسی کی طرح یہ آیت ہے: ﴿ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴾ [الإسراء: ١٣] ''بروزِ قیامت ہم اس کے سامنے اس کا نامۂ اعمال نکالیں گے جسے وہ اپنے اوپر کھلا ہوا پائے گا۔'' اور یہ آیت: ﴿ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴾ [التكوير: ١٠] ''اور جب نامۂ اعمال کھول دیے جائیں گے۔''

امام کلبی ﷫ نے کہا ہے کہ یہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے اپنے ہاتھ سے لکھی، یعنی توریت، اور موسیٰ علیہ السلام قلم کی آواز سن رہے تھے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے

---

[1] تفسير القرطبي (٥٨/١٧) فتح القدير (١٢٤/٥) [2] فتح البيان (٢١٧/١٣)

[3] المعجم الكبير (١٨/١٧) الدر المنثور (٦٢٦/٧) اس کی سند میں ''کثیر بن عبداللہ'' سخت ضعیف راوی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٤٩٠)

[4] فتح القدير (١٢٥/٥) [5] تفسير البغوي (٣٨٢/٧)

لیے لکھا، وہ آسمان میں اس کتاب میں سے وہ شے پڑھتے ہیں جو ہو گئی اور جو آیندہ ہو گی۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد وہ کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مومنوں میں سے اولیاء کے دلوں میں لکھا ہے۔ اس کا بیان اس آیت میں ہے: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ ﴾ [المجادلة: ۲۲] ''یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو لکھ دیا ہے۔'' اس قول میں بُعد ہے۔

﴿ فِیْ رَقٍّ ﴾ متعلق ہے ﴿ مَّسْطُوْرٍ ﴾ سے، یعنی ایسی کتاب جو ﴿ رَقٍّ ﴾ میں لکھی گئی ہے۔ ﴿ رَقٍّ ﴾ بہ معنی صحیفہ ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رَقٍّ ﴾ وہ شے ہے جس میں لکھا جاتا ہے اور وہ ایک باریک چمڑا ہے۔ اسی معنی سے قولہ تعالیٰ: ﴿ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ﴾ ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے ﴿ رَقٍّ ﴾ وہ چمڑا ہے جو رقیق ہوتا ہے کہ اس میں لکھا جائے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی جمع رقوق ہے۔[1] امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر وہ شے جس میں لکھا جاتا ہے چمڑا ہو یا کچھ اور ﴿ رَقٍّ ﴾ ہے۔ اور جمہور نے ﴿ رَقٍّ ﴾ کو بہ فتحِ راء پڑھا ہے اور اس کا کسرہ بھی جائز ہے، جیسا کہ شاذ میں پڑھا گیا ہے۔ رہا ''رَقٌّ'' جو بہ معنی ملک ارقاء ہے سو وہ بالکسر ہی ہے اور بس۔ غلام مملوک کو ''عَبْدٌ رِقٌّ وَعَبْدٌ مَرْقُوْقٌ'' کہتے ہیں۔ ﴿ مَّنْشُوْرٍ ﴾ ﴿ رَقٍّ ﴾ کی صفت ہے، یعنی ایسا صحیفہ اور ورق جو مبسوط اور مفتوح ہے، یعنی کشادہ غیر پیچیدہ جس پر مہر نہیں ہے۔ یا بہ معنی لائح ہے، یعنی ظاہر و واضح۔ جب کتاب سے مراد تورات ٹھہرے گی تو ﴿ رَقٍّ ﴾ سے مراد وہ تختیاں ہوں گی جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئیں اور جب قرآن شریف مراد ہو گا تو ﴿ رَقٍّ ﴾ سے مراد مصحف ٹھہرے گا اور جب کتاب سے مراد لوحِ محفوظ یا کتابِ ملائکہ یا نامۂ اعمال یا کتابِ قلوبِ اولیائے ذوالجلال ہو گی تو ﴿ كِتٰبٍ ﴾ و ﴿ رَقٍّ ﴾ کی تنکیر یہ امر بتانے کے لیے ٹھہرے گی کہ وہ کتاب ورق ایک خاص قسم کے ہیں، اس قبیل سے نہیں ہیں جس کو لوگ جانتے پہچانتے ہیں۔

﴿ اَلْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ ﴾ کے مقام میں چھے قول ہیں: ایک یہ ہے کہ سمائے دنیا میں ہے، یا تیسرے آسمان میں، یا چوتھے یا چھٹے میں، یا ساتویں میں، یا ساتویں آسمان کے اوپر عرش کے نیچے۔ ان اقوال کی بنا پر معمور ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہاں کے زائرین ملائکہ اسے آباد رکھتے ہیں، ہر روز ستر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں اور اس میں نماز پڑھتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے، جیسا کہ پہلے حدیثوں میں گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بیت المعمور خود یہی کعبۂ معظمہ ہے اس بنا پر اس کا عمارت کے ساتھ موصوف ہونا حقیقتاً ہے یا مجازاً باعتبار کثرت ان لوگوں کے جو بنی آدم میں سے اس میں عبادت کرتے ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بیت المعمور یہی کعبہ ہے اور یہ وہ بیتِ حرام ہے جو

---

[1] تفسير القرطبي (۵۹/۱۷)

آدمیوں سے معمور (بھرا ہوا) ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہر سال چھے لاکھ سے آباد کرتا ہے، پھر اگر لوگ اس سے عاجز ہوئے تو فرشتوں سے اس کو پورا کر دیتا ہے۔ یہ پہلا گھر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں لوگوں کے لیے وضع کیا ہے۔[1] ''سقفِ مرفوع'' سے مراد آسمان ہے، جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[2] اس کا نام سقف اس لیے رکھا ہے کہ زمین کے لیے وہ چھت کی طرح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عرش ہے، کیوں کہ وہ جنت کا سقف ہے، چنانچہ یہ قول پہلے گزر چکے ہیں۔

''مسجور'' بمعنی موقد ومحمی، یعنی افروختہ اور گرم کیا ہوا۔ ماخوذ ہے ''سجر'' سے۔ ''سجر'' تنور میں آگ کے افروختہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی معنی سے ﴿ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴾ [التكوير: ٦] ہے کہ دریا قیامت کے دن افروختہ کیے جائیں گے تو وہ آگ ہو جائیں گے۔ پھر اس سے جہنم کی آگ میں زیادتی کی جائے گی۔ أعاذنا الله منها آمين. کسی نے کہا ہے کہ پانی سے بھرا ہوا دریا وہ یہی بحرِ محیط ہے، جیسا کہ عمادی نے ذکر کیا ہے۔[3]

کسی نے کہا ہے کہ ''مسجور''من جملہ اسمائے اضداد ہے، محاورے میں بولتے ہیں: ''بَحْرٌ مَسْجُوْرٌ'' یعنی بھرا ہوا۔ اور ''مسجور'' بہ معنی فارغ وخالی۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی ''ممسوك'' ہے یعنی روکا ہوا۔ اسی معنی سے ''ساجور کلب'' ہے۔ اس لیے کہ وہ کتے کو روکتا ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ''مسجور'' وہ دریا ہے جس کا پانی جاتا رہا اور وہ سوکھ گیا۔ کسی نے کہا: ''مسجور'' بہ معنی ''مفجور'' ہے، اسی معنی سے ہے: ﴿ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴾ [الانفطار: ٣] ''اور جب سمندر بہہ نکلیں گے''۔ ربیع بن انس نے کہا: وہ ہے جس میں میٹھا کھارے سے ملتا ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ مجاہد وضحاک ومحمد بن کعب واخفش وغیرھم اسی کے قائل ہیں۔[4]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آسمان میں عرش کے نیچے ایک دریا ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے بھی اسی کی طرح مروی ہے۔[6] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ''محبوس'' اور دوسرا ''مرسل'' ہے۔ غرضیکہ پہلا حرفِ واوَ قسم کے لیے ہے اور باقی عطف کے لیے۔ قسم کا جواب یہ ہے: ﴿ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا لَهُ مِنْ دَافِعٍ ﴾۔ ﴿ إِنَّ ﴾ کی خبر ثانی ہے، یا ''واقع'' کی صفت ہے اور حرف ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے تاکید کے لیے، یعنی بے شک تیرے رب کا عذاب ضرور ہونے والا ہے، اس شخص کے لیے جو اس کا مستحق ہے۔ اس کو دفع کرنے والا یا دور کرنے والا کوئی نہیں کہ اہلِ نار سے اس کو ہٹا دے۔ یہ جملہ ﴿ إِنَّ ﴾ کی خبر ہے یا ''واقع'' کی صفت ہے اور حرف ﴿ مِنْ ﴾ تاکید کے لیے زائد ہے۔ خاص کر ان امور کی قسم اس لیے کھائی کہ یہ عظیم الشان کام

---

① تفسير القرطبي (٦٠/١٧) ② تفسير الطبري (٤٥٧/٢٢) ③ تفسير أبي السعود (١٤٦/٨)

④ تفسير القرطبي (٦٢،٦١/١٧) فتح القدير (١٢٥/٥) ⑤ تفسير الطبري (٤٦١،٤٦٠/٢٢)

⑥ تفسير الطبري (٤٥٩/٢٢) الدر المنثور (٦٢٩/٧)

ہیں جو قدرتِ ربانیہ کے کمال کو ظاہر کرتے ہیں۔

﴿ يَوْمَ ﴾ ظرف ہے ﴿ وَاقِعٌ ﴾ کا یا ﴿ دَافِعٍ ﴾ کا۔ "مور" بہ معنی اضطراب وحرکت ہے۔ لغت والوں نے کہا ہے کہ جس وقت کوئی شے حرکت کرتی ہے اور دور کرتی ہے اور آتی جاتی ہے تو اس وقت بولتے ہیں: "مَارَ الشَّيْءُ يَمُوْرُ مَوْرًا"۔ یہ قول امام اخفش اور ابو عبید رحمہ اللہ کا ہے،[1] دونوں نے اس کی سند میں وہی اعشیٰ کا شعر پڑھا ہے جو پہلے مذکور ہو چکا ہے، لیکن وہ ان کے قول پر دال نہیں ہے، مگر جب کہ اس چال پر جو شعر میں مذکور ہے "مور" کا اطلاق لغتاً کیا جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ "تَجْرِيْ جَرْيًا"، یعنی وہ چلے گا چلنا۔ کسی نے کہا ہے کہ "تَتَكَفَّأُ"۔ یہ قول امام اخفش رحمہ اللہ کا ہے،[2] یعنی اِدھر اُدھر جھکے گا، مائل ہوگا جیسے کشتی جھکتی ہے۔ بعض اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔

امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا "مور" ان سب معانی کا جامع ہے، اس لیے کہ لغت میں "مور" کے معنی "ذہاب و مجیئ" تردد و دوران واضطراب کے ہیں۔[3] "مور" کا اطلاق موج پر بھی ہوتا ہے۔ اس معنی سے یہ ہے کہ جو شتر مادہ اپنے چلنے میں سریع السیر ہوتی ہے، موج مار مار کر چلتی ہے، اس کو "نَاقَةٌ مَوَّارَةُ الْيَدِ" کہتے ہیں۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ گناہ گاروں پر عذاب واقع ہوگا اور کوئی دافع اُن سے دفع نہ کرے گا اس دن میں جس میں آسمان کی یہ صفت ہوگی، یعنی قیامت کا دن۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ "سماء" سے مراد فلک ہے، اس کا "مور" یہ ہے کہ اس کا نظم و سیر مضطرب اور مختلف ہو جائے گا۔

"سیر جبال" کے یہ معنی ہیں کہ اپنی جگہ سے ٹل جائیں گے اور اپنی جگہوں سے چلیں گے جیسے بادل چلتا ہے اور ہوا میں اُڑیں گے، پھر زمین پر ریت کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں گے، پھر دھنکی ہوئی اُون کی طرح ہو جائیں گے، پھر اُن کو ہوائیں اڑائیں گی تو وہ ھبائے منبث ہو جائیں گے، یعنی پراگندہ غبار۔ ﴿ تَمُوْرُ ﴾ اور ﴿ تَسِيْرُ ﴾ کی جو مصدر سے تاکید کی تو اس سے یہ نکلا کہ آسمان کا حرکت کرنا اور پہاڑوں کا چلنا ایک عجیب وغریب اور نادر امر ہوگا اور معہود سے خارج ہوگا۔ مورِ سماء و سیرِ جبال میں حکمت یہ ہے کہ اس بات کی خبر دینا اور ڈرانا مقصود ہے اس طور پر کہ اب نہ دنیا کی طرف لوٹنا ہے نہ رجوع، کیوں کہ دنیا خراب اور برباد ہو چکی اور آخرت آباد ہوئی۔ "ویل" عذاب کا کلمہ ہے جو ہلاک ہونے والے کے لیے کہا جاتا ہے اور جہنم میں ایک وادی ہے۔ اس پر حرفِ فاء صرف اس لیے داخل ہوا ہے کہ کلام میں مجازات کے معنی ہیں، یعنی جس وقت مورِ سماء و سیرِ جبال واقع ہوگا جس کا ذکر ہوا تو اُن کے لیے عذاب کی شدت ہے۔

پھر "مکذبین" کا یہ وصف فرمایا: ﴿ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ﴾ یعنی جن تکذیبین کو ویل ہے وہ ایسے ہیں کہ باطل میں آمد و رفت رکھتے ہیں اور اس میں لگے رہتے ہیں، کھیلتے ہیں، نہ حساب کو یاد کرتے ہیں اور نہ عذاب

[1] فتح القدير (١٢٥/٥) [2] تفسير القرطبي (٦٣/١٧) [3] تفسير البغوي (٣٨٧/٧)

سے ڈرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں تکذیب اور ٹھٹھا مذاق کے ساتھ خوض کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ دنیا کے اسباب میں خوض کرتے ہیں اور آخرت سے منہ موڑتے ہیں۔ خوض من جملہ معانی غالبہ ہے، کیوں کہ یہ شے میں خوض کی صلاحیت رکھتا ہے مگر خوض فی الباطل میں غالب ہو گیا ہے، جیسے: لفظ ''احضار'' کہ یہ عام ہے ہر شے میں۔ پھر اس کا استعمال ''احضار للعذاب'' میں غالب ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴾ [الصافات: ٥٧] ''تو میں بھی دوزخ میں حاضر کیے جانے والوں میں ہوتا۔'' یعنی البتہ میں ان میں سے ہوتا جو عذاب کے لیے حاضر کیے جاتے ہیں۔ اسمائے غالبہ میں اس کی نظیر کلمۂ دابہ ہے، کیوں کہ چوپایوں میں غالب ہوا ہے اور قوم غالب ہوا ہے مردوں میں۔ (إفاده الكرخي أخذا عن حواشي الكشاف)

''دَعّ'' درشتی اور سختی سے دور کرنے کو کہتے ہیں۔ ''يُقَالُ دَعَّتَهُ أَدُعُّهُ دَعًّا أَيْ: دَفَعْتُهُ''، معنی یہ ہیں: ''يُدْفَعُوْنَ إِلَى النَّارِ دَفْعًا عَنِيْفًا شَدِيْدًا'' یعنی وہ سختی کے ساتھ نار کی طرف دفع کیے جائیں گے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن کے ہاتھ اُن کی گردنوں کی طرف مغلول کیے جائیں گے، یعنی جکڑ دیے جائیں گے اور اُن کی نواصی (پیشانیوں کے بال) ان کے قدموں کے ساتھ جمع کیے جائیں گے، پھر وہ منہ کے بل جہنم کی طرف دفع کیے جائیں گے۔ جمہور نے بہ فتحِ دال و تشدیدِ عین پڑھا ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ وغیرہ، (یعنی امام سلمی، ابو رجاء، زید بن علی اور ابن سمیفع رحمہم اللہ) نے بہ سکونِ دال و تخفیفِ عین مفتوحہ پڑھا ہے ماخوذ ''دعاء'' سے، یعنی وہ جہنم کی طرف بلائے جائیں گے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ''یدفعون'' ہے۔ دوسرا یہ ہے: ''يُدْفَعُ فِيْ أَعْنَاقِهِمْ حَتَّى يَرِدُوا النَّارَ''۔[2]

کلمۂ ﴿ يَوْمَ ﴾ یا تو بدل ہے ﴿ يَوْمَ تَمُوْرُ ﴾ سے، یا متعلق ہے قول سے جو مقدر ہے بعد کے جملے میں اور وہ یہ ہے: ﴿ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴾ یعنی جس دن وہ جہنم کی آگ کی طرف دھکیلے جائیں گے تو اس دن اُن سے نار کے داروغہ یوں کہیں گے کہ یہ نار جس کا تم مشاہدہ کر رہے ہو وہ نار ہے جس کی تم دنیا میں تکذیب کیا کرتے تھے۔ پھر خود اللہ پاک نے ان کی ملامت کی، یا اپنے فرشتوں کو ان کی ملامت کا حکم دیا۔ ﴿ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ ﴾ یعنی کیا پھر یہ جادو ہے جس کا تم مشاہدہ کر رہے ہو اور آنکھ سے دیکھ رہے ہو جس طرح کہ تم اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں کو اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کے متعلق کہتے تھے کہ یہ سحر ہے۔ اصل میں ''أَفَهَذَا سِحْرٌ'' ہے۔ یہاں خبر کو مبتداء پر اس لیے مقدم کیا ہے کہ استفہام خبر ہی سے واقع ہوا ہے اور اسی کی طرف توبیخ اور ملامت متوجہ ہوئی ہے۔

﴿ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی یا کیا تم اس سے اندھے ہو جیسے کہ تم دنیا میں حق سے اندھے تھے۔ کافر لوگ دنیا میں کہا کرتے تھے: ﴿ اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا ﴾ [الحجر: ١٥] ''ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے۔'' چنانچہ یہ

[1] فتح القدير (١٢٦/٥) [2] تفسير الطبري (٤٦٤/٢٢)

اس کے مقابلے میں فرمایا ہے۔ ﴿ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی جب تم کو اس آگ کا انکار ممکن نہیں ہے اور تم نے تحقیق جان لیا ہے کہ یہ نہ جادو ہے اور نہ تمھاری نگاہوں میں کچھ خلل ہے تو اب تم اس میں داخل ہو جاؤ اور اس کی شدت کھینچو۔

﴿ فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ﴾ یعنی پس تم عذاب پر صبر کرو یا نہ صبر کرو اور جو چاہو کرو، چنانچہ تمھارے لیے عدمِ نفع میں دونوں امر برابر ہیں۔ یہ قول امام ابو حیان رحمہ اللہ کا ہے اور اسی کے امام ابو البقاء رحمہ اللہ قائل ہیں۔[1] یعنی ﴿ سَوَآءٌ ﴾ خبر ہے مبتدا محذوف کی: "أَيْ: اَلْأَمْرَانِ سَوَاءٌ" یا یوں کہو کہ ﴿ سَوَآءٌ ﴾ مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے۔ "أَيْ: سَوَاءٌ عَلَيْكُمُ الصَّبْرُ وَعَدَمُهُ"۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کا میل اسی طرف ہے،[2] لیکن وجہِ اول احسن ہے، اس لیے کہ نکرہ کا خبر ٹھہرانا زیادہ اچھا ہے۔ اس کے مبتداء قرار دینے سے اور معرفہ کے خبر قرار دینے سے۔

جملہ ﴿ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ تعلیل ہے استوا کی، کیوں کہ جس وقت جزاء بالعمل قطعاً واقع ہو گی تو صبر و عدمِ صبر دونوں برابر ہوں گے۔ پھر جب اللہ پاک مجرموں کے حال ذکر کرنے سے فارغ ہوا تو متقی لوگوں کا حال بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا:[3]

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴿١٧﴾ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ
رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿١٨﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ
بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿٢٠﴾

بلاشبہ متقین باغات اور نعمتوں میں ہوں گے ⑰ درآں حالیکہ وہ ان چیزوں سے لطف اُٹھا رہے ہوں گے جو اُن کے رب نے انھیں دیں اور ان کے رب نے انھیں جہنم کے عذاب سے بچا لیا ⑱ (انھیں کہا جائے گا:) خوب مزے سے کھاؤ اور پیو، ان اعمال کے بدلے میں جو تم کیا کرتے تھے ⑲ جبکہ وہ باہم برابر بچھے تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے اور ہم انھیں سیاہ سفید موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں سے بیاہ دیں گے ⑳

پرہیزگاروں کا انجام:

جنت والی انواع و اقسام کی لذت والی چیزوں سے مزے لیں گے۔ طرح طرح کے کھانے پینے کی اشیاء، قسم قسم کے لباس، عمدہ رہنے بسنے کے مکان، نفیس سواریاں اور اُن کے سوا اور چیزیں ملیں گی۔ عذابِ نار سے ان کو نجات

① البحر المحيط (١٥٤/٨) التبيان في إعراب القرآن (١١٨٣/٨) ② الكشاف (٤١٢/٤) ③ فتح البيان (٢١٧/١٣-٢٢٢)

دینا بذاتہ ایک مستقل نعمت ہے اس کے ساتھ دخولِ جنت کا اضافہ ہوا جس میں وہ مزا اور سرور ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال گزرا۔ انتہیٰ

قولہ تعالیٰ: ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴾ [الحاقة: ٢٤] ''(ان سے کہا جائے گا کہ) مزے سے کھاؤ پیو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گذشتہ زمانے میں کیے۔'' یعنی اللہ پاک کی طرف سے بطور فضل و احسان یہ نعمت اور آرام اس عملِ صالح کے بدلے میں ہے۔

﴿ سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اَلسُّرُرُ فِي الْحِجَالِ'' [1] یعنی چھپر کھٹ۔ ہیثم بن مالک طائی مرفوعاً کہتے ہیں کہ مرد چالیس برس جتنی مدت تکیے سے ٹکا رہے گا نہ اس سے کسی اور جگہ نقل کرے گا اور نہ اس سے اُکتائے گا، اس کے پاس وہ شے آتی رہے گے جس کو اس کا جی چاہے گا اور جس سے اس کی آنکھ کو لذت ملے۔ [2] (أخرجه ابن أبي حاتم) ثابت کہتے ہیں: ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ مرد البتہ جنت میں ستر برس تکیہ لگائے رہے گا، اس کے پاس اس کی کچھ بیویاں اور خادم ہوں گے اور وہ کرامت اور نعمتیں ہوں گی جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمائی ہیں۔ پھر جب اس کی طرف ایک نظر پڑے گی (اصل روایت کے الفاظ: ''فإذا حانت منه نظرة'' ہیں) تو ناگاہ اس کی وہ بیویاں آ موجود ہوئیں جن کو اس سے پہلے دیکھا نہ تھا، پس وہ کہیں گی کہ تیرے لیے وہ وقت آ گیا ہے کہ تو ہمارے لیے اپنا ایک حصہ ٹھہرائے۔ [3] ﴿ مَّصْفُوْفَةٍ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ بعض کے چہرے بعض کی طرف ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴾ [الصافات: ٤٤] ''تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے (بیٹھے) ہوں گے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے لیے قرینات کر دیں، یعنی ساتھ رہنے والیاں نیک اور خوبصورت بیویاں جو حورِ عین میں سے ہیں۔ امام مجاہد نے کہا ہے کہ ''أَنْكَحْنَاهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ''. [4] حوروں کا وصف کئی جگہ گزر چکا ہے۔ [5] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

جملہ ﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴾ مستانفہ ہے یا اس بات میں سے ہے جو کفار سے کہی جائے گی، ان کے غم اور حسرت کو زیادہ کرنے کے لیے۔ ﴿ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴾ میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، یعنی متقی لوگ عظیم الشان باغوں میں اور بڑی نعمت میں ہیں۔ جمہور نے ﴿ فٰكِهِيْنَ ﴾ بہ الف و نصب پڑھا ہے بنا برحال اور خالد رحمہ اللہ نے

---

[1] تفسير الطبري (٢٠/٥٣٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/٢٣٦٠) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/٢٣٦٠) [4] تفسير الطبري (٢٢/٥٢) [5] تفسير ابن كثير (٤/٣٠٦)

بہ رفع پڑھا ہے بنا بر خبر بعد خبر "يُقَالُ: فَاكِهَةٌ أَيْ: ذُوْ فَاكِهَةٍ" جیسا کہ دودھ والی کو "لَابِنٌ" اور کھجور والی کو "تَامِرٌ" بولتے ہیں، یعنی وہ میوے والی ہیں جنت کے میووں سے یا نعمت والی اور لذت پانے والی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے "فَكِهِيْنَ" پڑھا ہے۔[1] "فَكِهٌ" بہ معنی طیب النفس ہے، یعنی خوش طبع "مُفَاكَهَةٌ" بہ معنی "مُمَازَحَةٌ" یعنی باہم خوش طبعی کرنا۔ کلمۂ "مَا" موصولہ ہے اور حرفِ باء اپنی اصل پر ہے یا بہ معنی "في" ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴾ معطوف ہے صلہ پر۔ یہ وجہ باقی وجوہ سے ظاہر تر ہے۔ بالجملہ اہلِ جنت سے کہا جائے گا: ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا ﴾۔ "هنئ" وہ شے ہے جس میں نہ کسی طرح کی تنغیص ہو، نہ کچھ محنت ومشقت، نہ کچھ کدر۔ زجاج رحمہ اللہ نے کہا: چاہیے کہ گوارا ہو تم کو وہ شے ہے جس کی طرف تم رجوع ہوئے۔[2] گوارا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ تم کھاؤ کھانا رچتا اور پیو پینا رچتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی تم اس میں نہ مرو گے۔[3] چنانچہ اس وقت انھوں نے کہا: ﴿ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ۝ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴾ [الصافات: ۵۸۔ ۵۹] "کیا (یہ صحیح ہے) کہ ہم مرنے والے ہی نہیں ہیں؟ بجز پہلی ایک موت کے، اور نہ ہم عذاب کیے جانے والے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی بہ سبب ان اعمال کے جو تم دنیا میں آخرت کے لیے کیا کرتے تھے۔ ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ ﴾ حال ہے ﴿ كُلُوْا ﴾ کی ضمیر سے۔ ﴿ عَلٰى سُرُرٍ ﴾ "أَيْ: عَلَى نَمَارِقَ عَلَى سُرُرٍ مَصْفُوْفَةٍ" جمہور نے بہ ضم رائے اول اور ابن السماک نے بہ فتحِ راء پڑھا ہے۔ "سُرُرٌ" جمع ہے "سَرِيْرٌ" کی۔ امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَصْفُوْفَةٍ ﴾ بعض تخت بعض سے متصل ہیں، یہاں تک کہ وہ ایک صف ہو جائیں،[4] یعنی بعض تخت بعض کی طرف رکھے ہوئے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ تم کھاؤ پیو، کھانا پینا رچتا اس حال میں کہ تکیوں پر ٹیک لگائے ہوئے ہو، یا نہالچوں پر جو تختوں کے اوپر ہیں، کون سے تخت جو صف کے صف ایک دوسرے سے لگے ہوئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ تخت سونے کے ہیں جو گوہر وزبرجد ویاقوت سے جڑے ہوئے ہیں اور تخت اتنا بڑا ہے کہ جتنا مکہ اور ایلہ کے درمیان کا فاصلہ ہے۔

یونس بن حبیب رحمہ اللہ نے کہا: عرب لوگ یوں بولتے ہیں: "زَوَّجْتُهُ امْرَأَةً" یعنی میں نے اس کو ایک عورت بیاہ دی، "وَتَزَوَّجْتُ بِامْرَأَةٍ" اور میں نے ایک عورت سے بیاہ کیا۔ "زَوَّجْتُهُ بِامْرَأَةٍ" کلامِ عرب سے نہیں ہے[5] اور اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴾ کے معنی ہیں کہ "قَرَنَّاهُمْ" یعنی ہم نے ان کو حورِ عین کے ساتھ قرین کر دیا اور ہم نے "قَرَنَّاهُمْ" صرف اس لیے کہا ہے کہ جنتوں میں حورِ عین مملوکات بہ ملکِ یمین ہیں، بہ ملکِ نکاح مملوک نہیں

---

[1] تفسير القرطبي (٦٥/١٧) [2] معاني القرآن (٦٣/٥) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣١٥/١٩)
[4] تفسير القرطبي (٦٥/١٧) [5] تفسير القرطبي (٦٥/١٧)

ہیں۔عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: "زَوَّجْتُ إِبِلِي"۔ یعنی میں نے اپنے بعض اونٹوں کو بعض کے قرین کر دیا،
یہ اس تزویج سے نہیں ہے جو عقدِ نکاح ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں: "زَوَّجْتُهُ بِامْرَأَةٍ" ازدِشنوءہ کا لغت ہے۔[1]

جمہور نے ﴿ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴾ کو بغیر اضافت پڑھا ہے اور امام عکرمہ رحمہ اللہ نے حور کی اضافت ﴿ عِيْنٍ ﴾ کی
طرف کی ہے۔ حور بڑی اور خوبصورت آنکھوں والیوں کو کہتے ہیں جن کی آنکھوں کی سفیدی نہایت درجہ ہو۔[2] پھر جب
اللہ پاک علی العموم اہلِ جنت کے ذکر سے فارغ ہوا تو علی الخصوص ان میں سے ایک گروہ کا حال بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿21﴾ وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿22﴾ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴿23﴾ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿24﴾ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَاۗءَلُوْنَ ﴿25﴾ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿26﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿27﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿28﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی، تو ہم ان کی اولاد کو (جنت میں) ان سے ملا دیں گے، اور ہم ان کے عمل میں سے کچھ بھی کم نہیں کریں گے۔ ہر شخص اس کے عوض جو اس نے کمایا گروی ہے (21) اور وہ جو چاہیں گے ان میں سے ہم انھیں (ہر طرح کے) پھل اور گوشت وافر دیں گے (22) وہاں وہ (شراب کے چھلکتے) جام ایک دوسرے سے جھپٹ رہے ہوں گے، اس میں نہ بے ہودہ گوئی ہو گی اور نہ گناہ (کا کام) (23) اور ان (کی خدمت) کے لیے ان کے آس پاس نوعمر لڑکے پھر رہے ہوں گے (ایسے حسین) جیسے وہ چھپا کر رکھے گئے موتی ہیں (24) اور وہ (اہلِ جنت) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم (حال) پوچھیں گے (25) وہ کہیں گے: بلاشبہ ہم (اس سے) پہلے اپنے اہل و عیال میں (اللہ سے) ڈرا کرتے تھے (26) پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور اس نے ہمیں (جھلسا دینے والی)

[1] فتح القدير (١٢٧/٥) [2] فتح البيان (٢٢٢/١٣ـ٢٢٤)

لو کے عذاب سے بچا لیا㉗ بلاشبہہ ہم پہلے ہی اس (اللہ) کو پکارا کرتے تھے، بے شک وہی خوب احسان کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے㉘

مومنوں کی اولاد جنت میں انہیں کے مرتبے میں ہو گی:

نیکوں کی اولاد کو اسی وقت فائدہ ہے اگر وہ ایمان رکھیں اور اُن کی راہ پر چلیں تو ان کے درجے کو پہنچیں، نیک لوگوں کا عمل ان کو بانٹ نہیں دیتے پر اُن کی خوشی کے لیے ان پر مہربانی کی۔ اور اگر وہ ان کی راہ نہ چلیں تو جیسے دوسرے لوگ ویسے ہی یہ۔ ہمیں تیز وتند گرم ہواؤں کے عذاب سے بچایا، یعنی دوزخ کی بھاپ بھی نہ لگی۔ انتھٰی.

اللہ تعالیٰ کا جو فضل وکرم اور احسان اور لطف اپنی خلق پر ہے اس کی خبر دیتا ہے کہ جب مومنوں کی اولاد ایمان میں ان کی پیروی کرے گی تو اولاد کو ان کے باپوں سے ملا دے گا، گو درجے کے لحاظ سے وہ ان کے عمل کو نہیں پہنچے، تاکہ آباء کی آنکھیں اپنی اولاد سے ٹھنڈی ہوں، وہ اُن کے پاس ان کے درجوں میں ہی ان کو جمع کر دے گا، بہترین وجوہ پر اس طرح سے کہ ناقص عمل والوں کو کامل عمل والوں کے سبب سے بلند کر دے گا اور اس سے ان سب کو برابر کرنے کی وجہ سے کسی کے اجر میں کمی نہ کرے گا، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ مومن کی ذریت کو اس کے درجے میں بلند کرے گا گو عمل میں وہ اس سے کم ہوں، تاکہ ان سے اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو، پھر آیتِ مذکورہ پڑھی۔[1]

(قاله الثوري عن عمرو بن مرة عن سعيد بن جبير عنه و رواه ابن جرير وابن أبي حاتم من حديث سفيان الثوري به وكذا رواه ابن جرير من حديث شعبة عن عمرو بن مرة به و رواه البزار عن سهل بن يحيى عن الحسن بن حماد الوراق عن قيس بن الربيع عن عمرو بن مرة عن سعيد عن ابن عباس رضي الله عنهما مرفوعاً فذكره ثم قال: وقد رواه الثوري عن عمرو بن مرة عن سعيد عن ابن عباس موقوفا)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا: یہ مومن کی ذریت ہے جو ایمان پر مرتی ہے، چنانچہ اگر ان کے آباء کے درجے زیادہ بلند ہوں گے تو وہ اپنے آباء کے ساتھ ملا دیے جائیں گے اور اُن کے اعمال سے جو انھوں نے کیے کچھ کم نہ کیے جائیں گے۔[2] حافظ طبرانی نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما أظنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے، فرمایا: جس وقت مرد جنت میں داخل ہو گا تو اپنے ماں باپ کے متعلق پوچھے گا اور بیوی اور اولاد کے متعلق پوچھے گا، چنانچہ کہا جائے گا کہ وہ تیرے درجے کو نہیں پہنچے تو کہے گا: اے رب! میں نے درحقیقت اپنے لیے اور ان کے لیے عمل کیا، پھر ان کو اس کے ساتھ ملا دینے کا حکم دے دیا جائے گا اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مذکورہ آیت پڑھی۔[3]

---

① تفسير الطبري (٤٦٧/٢٢) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣١٦/١٠) ② تفسير ابن أبي حاتم (٣٣١٦/١٠)

③ المعجم الكبير للطبراني (٤٤٠/١١) اس کی سند میں ''محمد بن عبدالرحمان بن غزوان'' سخت ضعیف راوی ہے۔ تفصیل دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٦٠٢)

امام عوفی رحمہ اللہ نے ان سے ان الفاظ سے روایت کیا ہے: اور جو لوگ کہ اُن کی ذریت نے ایمان پا لیا اور میری اطاعت کے ساتھ عمل کیا تو میں اُن کو اُن کے ایمان کے سبب سے جنت میں ملا دوں گا اور ان کی چھوٹی اولاد اُن کے ساتھ ملا دی جائے گی۔ یہ قول پہلی تفسیر کی طرف راجع ہے، کیوں کہ وہ مفسر ہی اس سے اصرح ہے۔ اسی طرح امام شعبی، سعید بن جبیر، ابراہیم، قتادہ، ابو صالح، ربیع بن انس، ضحاک اور ابن زید رحمہ اللہ بھی کہتے ہیں اور یہی امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار ہے۔[1]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دو لڑکوں کے متعلق پوچھا جو جاہلیت میں مر گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ نار میں ہیں، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرے میں کراہت دیکھی تو فرمایا کہ اگر تو ان کا مکان دیکھتی تو البتہ تو ان کو مبغوض رکھتی۔ عرض کی: اے اللہ کے رسول! پھر میرا جو لڑکا آپ سے ہوا اس کا کیا حال ہے؟ فرمایا: وہ جنت میں ہے۔ کہا: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن اور اُن کی اولاد جنت میں ہیں اور مشرک اور اُن کی اولاد نار میں ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ مذکورہ پڑھی۔[2] یہ تو آباء کے عمل کی برکت کی بنا پر اللہ کا فضل ہے۔

اب رہا اس کا آباء پر ابناء کی دعا کی برکت سے فضل کرنا تو اس کی یہ دلیل ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ جب بندۂ صالح کا درجہ جنت میں بلند کرے گا تو وہ کہے گا: اے رب! یہ میرے لیے کہاں سے ہے؟ تو فرمائے گا: تیرے لڑکے کے تیرے لیے مغفرت مانگنے کے سبب سے ہے۔[3] (إسناده صحيح ولم يخرجوه من هذا الوجه) لیکن اس کا شاہد صحیح مسلم میں ہے بواسطہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ جس وقت ابن آدم مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے سوا تین چیزوں کے: صدقہ جاریہ، یا علم جس سے نفع لیا جاتا ہے، یا نیک لڑکا کہ اس کے لیے دعا کرتا تھا۔[4]

عدلِ الٰہی:

پھر جب اللہ پاک نے مقامِ فضل کی خبر دی، یعنی اولاد کے درجے کو آباء کے درجے کی طرف بلند کرنا بغیر کسی ایسے عمل کے جو اس کا مقتضی ہو تو پھر مقامِ عدل کی خبر دی، وہ یہ ہے کہ کسی سے کسی اور کے گناہ پر مواخذہ نہیں کرتا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ﴾ یعنی ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے، اس پر اس کے غیر کا گناہ نہیں لادا جائے گا، وہ خواہ باپ ہو یا بیٹا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۝ فِي جَنّٰتٍ

[1] تفسير الطبري (٢٢/ ٤٦٨-٤٧٠)

[2] مسند أحمد (١/ ١٣٤) اس کی سند میں ''محمد بن عثمان'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٧٩١)

[3] مسند أحمد (٢/ ٥٠٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦١٧) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣١)

يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ [المدثر: ٣٨۔ ٤١] ''ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے مگر دائیں ہاتھ والے کہ وہ بہشتوں میں (بیٹھے ہوئے) گناہ گاروں سے سوال کرتے ہوں گے۔''

جنتیوں کی نعمتوں کا تذکار:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴾ یعنی اور ہم نے ان کو میووں اور گوشتوں کی متفرق اقسام کے ساتھ لاحق کر دیا ان اشیاء میں سے جو پاک اور ستھری سمجھی جاتی ہیں اور جن کے کھانے کو جی چاہتا ہے۔ ''تنازع کأس'' کا یہ مطلب ہے کہ جنت کے اندر شراب کے پیالے کا باہم لین دین کریں گے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''کأسا'' سے مراد شراب کا پیالہ ہے۔

﴿ لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴾ یعنی اس میں ہذیان نہ بکیں گے اور نہ فحش ہوگا جس طرح کہ دنیا والوں کے شرابی ہذیان اور فحش بکتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ لَغْوٌ ﴾ باطل ہے اور ﴿ تَاْثِيْمٌ ﴾ جھوٹ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ گالیاں نہ بکیں گے اور نہ گناہ میں ڈالے جائیں گے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ دنیا میں تھا شیطان کے ساتھ،[1] چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آخرت کی شراب کو دنیا کی شراب کی پلیدیوں اور ایذا سے منزہ اور پاک کیا جیسا کہ گزر چکا ہے۔ چنانچہ اس سے دردِ سر، دردِ شکم اور عقل کے زائل کرنے کی نفی کی ہے اور یہ خبر دی ہے کہ وہ ان کو کسی بری بات پر آمادہ نہ کرے گی جو فائدے سے خالی ہو۔ اور ان بری باتوں میں ہذیان اور فحش بکنا شامل ہے۔ اس کی خوبصورتی اور خوش مزگی کی خبر دی تو یوں فرمایا ہے: ﴿ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴾ [الصافات: ٤٦۔ ٤٧] ''جو صاف شفاف اور پینے میں لذیذ ہوگی نہ اس سے دردِ سر ہو اور نہ اس کے پینے سے بہکیں۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴾ [الواقعة: ١٩] ''جس سے سر میں درد نہ ہو نہ عقل میں فتور آئے۔'' اور یہاں یوں فرمایا: ﴿ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴾

پھر ان کے خادموں اور نوکر چاکروں کی خبر دی جو جنت میں ہوں گے گویا وہ اپنے حسن و جمال ونور و رونق ولباس کی نظافت اور حسن میں ایسے ہیں جیسے غلاف میں تازہ موتی چھپے دھرے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۝ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴾ [الواقعة: ١٧۔ ١٨] ''ان کے پاس ایسے لڑکے جو ہمیشہ (لڑکے ہی) رہیں گے آمدورفت کریں گے، آبخورے اور جگ لے کر اور ایسا جام لے کر جو بہتی ہوئی شراب سے پر ہوں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴾ یعنی جنت والے متوجہ ہوں گے، آپس میں بات چیت

---

[1] تفسیر الطبري (٢٢/٤٧٤، ٤٧٥)

کریں گے۔ دنیا میں جو اعمال اور حالات گزرے ہیں، ان کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ یہ ویسی بات ہے جیسے شرابی لوگ شراب پر آپس میں ان کاموں کے متعلق باتیں کرتے ہیں جو ان سے ہوئے، جبکہ شراب اُن میں اپنا عمل کرتی ہے۔ وہ کہیں گے کہ ہم دنیا میں اپنے گھر والوں میں تھے اور اپنے رب سے ڈرتے رہتے تھے اور خوف کرتے تھے اس کے عذاب اور عقاب سے تو اللہ تعالیٰ نے ہم پر مہربانی فرمائی اور ہمیں اس شے سے بچالیا جس سے ہم ڈرتے تھے، بے شک ہم اس سے پہلے اس کی طرف عاجزی اور زاری کرتے تھے چنانچہ اس نے ہماری دعا قبول فرمائی اور ہم کو ہمارا سوال عطا کیا۔

﴿ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴾ عن الحسن عن انس رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت جنت والے جنت میں داخل ہوں گے تو وہ اپنے اخوان سے ملاقات کے مشتاق ہوں گے، چنانچہ اس کا تخت آئے گا، یہاں تک کہ اس کے تخت کے برابر روبرو ہو جائے گا، پھر آپس میں باتیں کریں گے، پھر تکیہ لگائے گا یہ اور تکیہ لگائے گا وہ، پھر اس بارے میں بات چیت کریں گے جو دنیا میں ہوا تھا۔ پھر ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہے گا: او فلاں! کیا تو جانتا ہے کہ کون سے دن اللہ نے ہماری مغفرت کی تھی؛ جس دن ہم فلاں فلام مقام پر تھے اور ہم نے اللہ عزوجل سے دعا کی تھی تو اس نے ہماری مغفرت کر دی۔ (أخرجه الحافظ أبو بكر البزار في سنده ثم قال: لا نعرفه يروى إلا بهذا الإسناد) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''سعيد بن دينار الدمشقي قال أبو حاتم: هو مجهول وشيخه الربيع بن صبيح قد تكلم فيه غير واحد من جهة حفظه وهو رجل صالح ثقة في نفسه''[1]

امام مسروق رحمہ اللہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے راوی ہیں کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴾ تو کہا: ''اَللّٰهُمَّ مُنَّ عَلَيْنَا وَقِنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ إِنَّكَ أَنْتَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ''، کسی نے امام اعمش رحمہ اللہ سے کہا کہ نماز میں یہ کہا؟ تو جواب دیا کہ ہاں۔[2] (أخرجه ابن أبي حاتم كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ منصوب بہ فعلِ مقدر ہے اور ﴿ اَلْحَقْنَا ﴾ اس فعلِ مقدر کا مفسر ہو گا۔ تقدیر یہ ہے: ''وَأَكْرَمْنَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا'' دوسری وجہ یہ ہے کہ مجرور ہے بنا بر قول زمخشری کہ ''حُوْرٌ عِيْنٌ'' پر معطوف ہے: ''أَيْ: قَرَنَّاهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ وَبِالَّذِيْنَ آمَنُوْا''[3] یعنی ہم نے ان کو حورِ عین کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ قرین کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ مومنوں کے فریقوں جلیسوں کے ساتھ ہم نے ان کو قرین کر دیا۔ سو کبھی تو وہ حورِ عین کے ساتھ کھیلیں کر کے مزے اٹھاتے ہیں اور کبھی اخوان کی موانست سے محظوظ ہوتے ہیں۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ

---

[1] مسند البزار (۲۰۲/۱۳) تفسير ابن كثير (۳۰۸/٤) اس کی سند میں ''ربیع بن صبیح اور سعید بن دینار'' ضعیف راوی ہیں۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۱٦/۱۰) تفسير ابن كثير (۳۰۷۔۳۰۹) [3] الكشاف (٤۱۳/٤)

کہتے ہیں کہ اس شخص کے سوا کوئی یہ خیال نہیں کرتا کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ ﴿ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴾ پر معطوف ہے۔ حالانکہ یہ ایک اعجمی خیال ہے جو خالص عربی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کے فہم کے مخالف ہے۔[1]

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام زمخشری رحمہ اللہ نے جو معنی بیان کیے ہیں، ان کے حسن اور تازگی میں کوئی شک نہیں اور کلامِ عربی میں وہ شے نہیں ہے جو اس کو دفع کرے، بلکہ یہ معنی اگر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ پر پیش کیے جاتے تو اُن کو پسند آتے۔ کون سا معنوی یا صناعی مانع ہے جو اس سے منع کرتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بنابر مبتداء مرفوع ہے اور جملہ ﴿ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ﴾ خبر ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد مہاجرین اور انصار ہیں۔ آیت کا ظاہر عموم ہے، اس کے نزول میں ان کا سبب ہونا اس کا موجب نہیں کہ آیت کو ان کے ساتھ خاص کیا جائے، اگر ان کا سبب نزول ہونا صحیح ہو۔ پس اعتبار لفظ کے عموم کا ہے نہ کہ خصوصِ سبب کا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاتَّبَعَتْهُمْ ﴾ ﴿ اٰمَنُوْا ﴾ پر معطوف ہے اور ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ بِاِيْمَانٍ ﴾ ﴿ اِتَّبَعَتْهُمْ ﴾ سے متعلق ہے، یا مبتداء اور خبر کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بِاِيْمَانٍ ﴾ حال ہے ﴿ ذُرِّيَّتُهُمْ ﴾ سے، یعنی ان کی ذریت نے ان کی پیروی کی اس حال میں کہ وہ ایمانِ استقلالی یا ایمانِ تبعی کے ساتھ متلبس ہے، یعنی یا ان کا ایمان مستقل ہے یا اپنے آباء کی اتباع سے حاصل ہوا ہے۔ رہی کافر ذریت تو وہ اپنے آباء کی تابع نہ ہوگی۔ یہ وجہ اس بنا پر ہے کہ حرفِ با ملابست کے لیے ہو، لیکن جمہور مفسرین اس پر ہیں کہ وہ سببیت کے لیے ہے، یا بہ معنی "في" ہے۔

اس اعتبار سے اولادِ کبار کا دخول ظاہر نہ ہوگا، کیوں کہ ان کا ایمان استقلالی ہے، صغار کی طرح تبعی نہیں ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اس کے جواب کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ ہم دونوں قسموں کی ذریت کو اس کے آباء کے ساتھ ملا دیں گے، اس ایمانِ کامل کے سبب سے جو آباء میں ہے۔ چنانچہ جب کہ بیٹا بڑا ہوگا اور مومن ہوگا اور اس کے باپ کا ایمان اس سے زیادہ قوی ہوگا تو اللہ پاک اس کو اس کے ایمانِ کامل میں اس کے باپ کے ساتھ ملا دے گا۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ کی عبارت یہ ہے: "وَاتَّبَعْنَاهُمْ ذُرِّيَّاتِهِمْ بِإِيْمَانٍ فِيْ الْجُمْلَةِ قَاصِرٌ عَنْ رُتْبَةِ إِيْمَانِ الْآبَاءِ وَاعْتِبَارِ هٰذَا الْقَيْدِ لِلْإِيْذَانِ بِثُبُوْتِ الْحُكْمِ فِيْ الْإِيْمَانِ الْكَامِلِ إِصَالَةً لَا إِلْحَاقاً"[3]

جمہور نے ﴿ اِتَّبَعَتْهُمْ ﴾ پڑھا ہے، فعل کا ذریت کی طرف اسناد کیا ہے اور ابو عمر رحمہ اللہ نے "اِتَّبَعْنَاهُمْ" بہ صیغہ متکلم مع الغیر پڑھا ہے اور جمہور نے ﴿ ذُرِّيَّتُهُمْ ﴾ کو بہ افراد اور ابن عامر وغیرہ، (یعنی ابو عامر اور یعقوب رحمہما اللہ نے) "ذُرِّيَّاتِهِمْ" بہ جمع پڑھا ہے۔ مگر امام ابو عمرو رحمہ اللہ نے بہ نصب پڑھا ہے بنا بر مفعولیت، اس لیے کہ انھوں نے "وَاتَّبَعْنَاهُمْ" پڑھا ہے۔ یہ قراءت جمع کی نافع سے بھی مروی ہے اور نافع سے مثل قراءت جمہور کے مشہور ہے۔

---

(1) البحر المحيط (١٤٦/٨) (2) فتح البيان (٢٢٤/١٣) (3) تفسير أبي السعود (١٤٨/٨)

اور جمہور نے ﴿ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ کو بہ افراد اور امام نافع، ابن عامر، ابو عمرو اور یعقوب رحمہ اللہ نے بہ جمع پڑھا ہے۔[1] (كذا في فتح القدير)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾، امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذریت اس جگہ آباء پر اور ابناء پر صادق آتی ہے، اس لیے کہ جب مومن کا عمل اکثر ہوگا تو اس کے ساتھ وہ شخص ملا دیا جائے گا جو عمل میں اس سے کم ہے، وہ بیٹا ہو یا باپ۔ یہ بات سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے اور نسب کی ذریت کے ساتھ ذریت بہ سبب ملائی جاتی ہے، یہ سبب محبت ہے۔ پھر اگر اس محبت کے ساتھ اخذِ علم یا عمل ہو تو زیادہ تر لائق ہے، چنانچہ ذریتِ افادہ مثل ذریتِ ولادت کے ہوگی۔ انتہیٰ.

بالجملہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک مومن کی ذریت کو اس کی طرف بلند کر دے گا، گو وہ عملی لحاظ سے اس سے کم ہوں، تا کہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور اس کا جی خوش ہو، بشرطیکہ وہ مومن ہوں، چنانچہ یہ اولاد میں سے اس کے ساتھ خاص ہے جو ایمان کے ساتھ متصف ہوں اور یہ بالغ اولاد ہے، چھوٹی اولاد نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اگرچہ اپنے آباء کے ساتھ لاحق ہیں، مگر ان کا ملنا اَور دلیل سے ہے جو اس آیت کے سوا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ذریت کا اطلاق بڑوں اور چھوٹوں دونوں پر ہوتا ہے، جس طرح کہ لغوی معنی یہی ہیں تو آبائے مومنین کے ساتھ ان کی صغار و کبار ذریت ملائی جائے گی۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمہ ﴿ بِهِمْ ﴾ میں ضمیر اس ذریت کی طرف راجع ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، یعنی ہم لاحق کریں گے آباء کے ساتھ اس ذریت کو جو ایمان کے ساتھ اپنے آباء کی پیروی کرنے والی ہے۔ یہ آباء کے ساتھ ذریت کا الحاق محض فضل و کرم سے ہے اور اللہ پاک کے کمال لطف کے زیادہ تر یہی لائق ہے۔

جمہور نے ﴿ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ ﴾ کو بہ فتحِ لام پڑھا ہے اور ابن کثیر نے بہ کسرِ لام پڑھا ہے اور ابن ہرمز رحمہ اللہ نے "آلَتْنٰهُمْ" پڑھا ہے مد کے ساتھ، یہ ایک لغت ہے۔ صحاح میں ہے: "يُقَالُ: مَا آلَاتَهُ مِنْ عَمَلِهِ شَيْئًا أَيْ: نَقَصْتَهُ".[2] ﴿ مِنْ شَيْءٍ ﴾ میں کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے، یعنی نہیں کم کیا ہم نے آباء کو ان کے اعمال کے ثواب میں سے کچھ ان کی ذریت کو ان کے ساتھ ملانے کے سبب سے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ نہیں کم کیا ہم نے ذریت کو ان کے اعمال میں سے کچھ ان کی عمروں کے چھوٹا ہونے کے سبب سے، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

﴿ رَهِيْنٌ ﴾ بہ معنی مرہون ہے، ظاہر یہ ہے کہ یہ عام ہے اور ہر انسان اپنے عمل میں مرتہن ہے، چنانچہ اگر اس نے اس کے ساتھ قیام کیا، اس کی اس وجہ پر جس کا اللہ تعالیٰ نے امر کیا ہے تو وہ اس کو رہائی دے گا، ورنہ اسے ہلاک کر دے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ رَهِيْنٌ ﴾ بہ معنی "رَاهِنٌ" ہے۔ "أَيْ: كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ ثَابِتٌ دَائِمٌ"، یعنی ہر آدمی اس شے پر جو اس نے کمائی ثابت و دائم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت کفار کے ساتھ خاص ہے، اس آیت

[1] فتح القدير (۱۲۸/۵، ۱۲۹) [2] فتح القدير (۱۲۹/۵)

کے سبب سے: ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴾ [المدثر: ۳۸۔ ۳۹] ''ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے مگر دائیں ہاتھ والے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴾ یعنی ابتدائی عیش و آرام کی جو چیزیں اُن کے لیے تھیں ہم نے وقتاً فوقتاً ان کو قسم قسم کے میوے اور طرح طرح کے گوشت زیادہ دیے اور اُن کو انواع و اقسام کی نعمتیں دیں جن کو اُن کے جی چاہیں اور ان کو پاک سمجھیں گو انھوں نے ان چیزوں کی نہ فرمایش کی اور نہ وہ طلب کیں صاف طور پر، بلکہ صرف اُن کے دلوں میں ان کا خیال گزرے گا تو وہ ان کو پیش کی جائیں گی۔ اور وہ اُور اُن کے اقرباء میں سے ان کے ہم نشین شراب کا پیالہ ایک دوسرے کو دیں گے اور بعض بعض سے پیالے کی کھینچا کھینچی کریں گے، یہ اس کے ہاتھ سے اور وہ اس کے ہاتھ سے، وہ لذت اور اُنس حاصل کرنے کے لیے ایسا کریں گے۔ ''کأس'' شراب کے برتن کو کہتے ہیں اس کا اطلاق ہر بھرے ہوئے برتن پر کیا جاتا ہے، وہ شراب سے بھرا ہوا ہو یا کسی اور چیز سے، پھر جب وہ خالی ہو تو اس کا نام ''کأس'' نہیں رکھتے۔

جمہور نے ﴿ لَغْوٌ ﴾ اور ﴿ تَاْثِيْمٌ ﴾ کو بہ رفع وتنوین پڑھا ہے اور امام ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ، (یعنی ابن محیصن رحمہ اللہ) نے بہ فتح ہر دو بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: جاری نہ ہوگی اُن میں سے وہ شے جس سے لغو کیا جاتا ہے اور نہ وہ شے جس میں گناہ ہے جس طرح کہ ان لوگوں میں جاری ہوتی ہے جو دنیا میں شراب پیتے ہیں۔[2] لغو کلام میں سے وہ بات ہے جس میں نہ کوئی فائدہ ہو اور نہ کچھ نقصان ہو۔ ﴿ تَاْثِيْمٌ ﴾ بروزن تفعیل ہے ''إثم'' سے۔

﴿ فِيْهَا ﴾ کی ضمیر ''کأس'' کی طرف راجع ہے یا جنت کی، یعنی اس میں وہ شے جاری نہ ہوگی جس میں گناہ ہو۔ پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ شراب ان کی عقلیں نہ لے جائے گی کہ لغو بکنا شروع کر دیں، جیسا کہ دنیا کی شراب سے ہوتا ہے اور نہ اُن سے وہ شے ہوگی جو ان کو گناہ میں ڈالے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغو بہ معنی باطل ہے۔ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں کسی طرح کا فضول نہ ہوگا۔ امام سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں کچھ رفث نہ ہوگا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں نہ گالی دینا ہوگا نہ باہم جھگڑنا۔[3] ''طوفِ غلمان'' کا یہ مطلب ہے کہ شراب کے پیالے، میوے، کھانے اور تحفے وغیرہ لیے ہوئے ان کے مملوک ان کے آس پاس پھریں گے۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ غِلْمَانٌ لَّهُمْ ﴾ کہا، ''غِلْمَانُهُمْ'' باضافت نہ فرمایا، تاکہ یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ وہی خادم ہیں جو دنیا میں اُن کی خدمت کیا کرتے تھے تو ہر شخص ڈرے جس نے دنیا میں کسی کی خدمت کی

[1] تفسیر القرطبي (۶۹/۱۷) [2] معاني القرآن (۶۳/۵) [3] فتح القدير (۱۲۹/۵، ۱۳۰)

ہے اس بات سے کہ جنت میں وہی اس کا خادم ہو گا تو وہ اس کا رنج کرے کہ وہ ہمیشہ تابع رہے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ غِلْمَانٌ ﴾ سے مراد اُن کی اولاد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ ہیں جن کو ان کے غیر کی اولاد سے اللہ نے ان کا خادم بنایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ غلمان ہیں جو جنت میں مخلوق ہوئے ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کبھی بڑے نہ ہوں گے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ یہ مشرکوں کی اولاد ہیں اور یہ اہلِ جنت کے خادم ہیں، حالاں کہ جنت میں نہ کسی طرح کی محنت مشقت ہے نہ خدمت کی کچھ حاجت، لیکن اللہ پاک نے یہ خبر دی ہے کہ وہ انتہا درجے کی نعمتوں اور خوشحالی میں ہیں۔

پھر اُن کا یہ وصف کیا کہ گویا وہ حسن و لطافت و نور و رونق میں اپنی سفیدی اور صفائی سے موتی ہیں سیپی میں چھپے اور بچے ہوئے جن کو ہاتھوں نے چھوا تک نہیں، کیوں کہ موتی جب تک تر و تازہ رہتا ہے تو زیادہ تر خوبصورت اور صاف ہوتا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كَنَنْتُ الشَّيْءَ" کے یہ معنی ہیں کہ میں نے اس کو سورج سے چھپایا اور بچایا۔[2] یا ﴿ مَكْنُوْنٌ ﴾ بہ معنی "مَخْزُوْنٌ" ہے، کیوں کہ خزانہ وہی شے کی جاتی ہے جو قیمتی اور گراں قیمت ہوتی ہے۔ پھر اُن میں سے ایک دوسرے پر متوجہ ہو گا جنت میں ایک دوسرے سے اپنے اپنے حال اور دنیا کے رنج و تکلیف کے متعلق سوال کریں گے جس میں وہ تھے اور عاقبت کے خوف کے متعلق سوال کریں گے، پھر اللہ پاک کی حمد کریں گے جس نے ان سے غم اور خوف اور ڈر کو دور کر دیا اور جو محنت و مشقت طلبِ معاش اور ضروری رزق حاصل کرنے کے لیے کرتے تھے، اس سب کو زائل کر دیا اور جس نعمت کی طرف وہ پہنچے ہیں اس کا اقرار کر کے اور اس کی لذت لے کر اللہ سبحانہ کا شکر کریں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ بعض بعض سے کہے گا کہ تم اس بلند درجے میں کس سبب سے پہنچے؟ کسی نے کہا ہے کہ ان کا آپس میں سوال کرنا بعث کے وقت، یعنی قبروں سے اٹھنے کے وقت ہو گا، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ سیاق اس پر دال ہے کہ وہ جنت میں پہنچ چکے۔

جملہ ﴿ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴾ مستانفہ ہے جواب ہے سوالِ مقدر کا، گویا کسی نے کہا ہے کہ باہم سوال کرنے کے وقت بعض نے بعض سے کیا، کہا: تو یہ اس کا جواب ہے کہ انھوں نے کہا۔ یعنی جن نعمتوں میں وہ ہیں اُن کے پہنچنے کی علت کی طرف اشارہ کر کے یوں کہا ہے کہ ہم آخرت سے پہلے دنیا میں اپنے گھر والوں میں اس طرح تھے کہ اللہ کے عذاب سے یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے تھے اور اس بات سے ڈرتے تھے کہ ایمان نہ چھن جائے اور امانت فوت نہ ہو جائے یا وہ نیکیوں کو رد نہ کریں اور برائیوں کو اپنا نہ لیں۔ مقصد سارے اوقات اور احوال میں بطریقِ اُولیٰ ان کے خوف کو ثابت کرنا ہے، کیوں کہ ان کا اپنے گھر والوں میں ہونا امن و بے خوفی کا مظنہ (گمان کرنے کی جگہ) ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۷/۶۹) [2] تفسیر القرطبي (۱۷/۶۹)

پھر جب وہ اس حال میں ڈرے تو اس کے سوا اور احوال میں ان کا ڈرنا بطورِ اولیٰ ہوگا۔ شاید زیادہ اچھی یہ بات ہو کہ ﴿ مُشْفِقِيْنَ ﴾ اسی معنی کی طرف اشارہ ٹھہرایا جائے کہ وہ اللہ کی مخلوق پر شفقت اور مہربانی کرتے تھے جس طرح کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ﴾ امر اللہ کی تعظیم کی طرف اشارہ ہے۔ بالجملہ نعیم جنت کی طرف پہنچنے کی جو علت ہے اس کا اتار اس قول پر ہے: ﴿ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴾ یعنی ہم جو اس عیش وعشرت کو پہنچے، اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا اس طرح کہ ہمارے گناہ بخش دیے اور ہم پر رحم کیا۔ یا یہ کہ ہم کو اپنی اطاعت وعبادت کی توفیق دی اور ہم کو جہنم کی آگ اور عذاب سے بچا لیا۔ اللهم من علينا بمغفرتك ورحمتك و وفقنا لطاعتك وقنا عذاب السموم. آمين

"سموم" جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ امام حسن اور مقاتل رحمہما اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام کلبی اور ابو عبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عذابِ نار ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سمومِ جہنم وہ شے ہے جو اس کی گرمی سے پائی جاتی ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سموم" دن میں ہے اور کبھی رات میں ہوتی ہے اور "حرور" رات میں ہے اور کبھی دن میں ہوتی ہے۔ کبھی "لفح برد" میں مستعمل ہوتی ہے اور یہ "لفح شمس وحر" میں اکثر ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ہوا کا نام سموم اس لیے رکھا ہے کہ وہ مسام میں داخل ہوتی ہے۔ "سموم" اصل میں وہ گرم ہوا ہے جو مسام کے اندر گھستی ہے۔ اس کی جمع سمائم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "سَمَّ يَوْمُنَا" کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے دن کی گرمی سخت ہوئی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ زمین والوں پر عذابِ سموم کو ایک پور جتنا کھول دیتا تو البتہ وہ زمین کو اور جو کچھ اس پر ہے سب کو جلا ڈالتی۔[2] (أخرجه ابن المنذر)

غرضیکہ پھر انھوں نے علتِ وصول کی طرف اشارہ کر کے کہا: ﴿ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ﴾ یعنی یہ سارا راحت وآرام کا ساز وسامان ہم کو اس لیے ملا کہ ہم اس سے پہلے اس کی توحید اور عبادت کیا کرتے تھے یا اس سے یہ سوال کیا کرتے تھے کہ ہم پر مغفرت اور رحمت کے ساتھ احسان کرے۔ علت کا اتار یہ قول ہے: ﴿ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴾ جمہور نے بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے اور امام نافع اور کسائی رحمہما اللہ نے بہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے: "أَيْ: لِأَنَّهُ بَرٌّ"[3] بہ معنی کثیر الاحسان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی لطیف اور رحیم ہے، بہ معنی کثیر الرحمت، یعنی یہ عیش وآرام کا دوام اور انواع واقسام کی نعمتوں کا انعام اس لیے ہے کہ بے شک وہ بڑا کثیر الاحسان لطیف ومہربان اور اپنے بندوں پر کثیر الرحمت ہے کہ اس نے محض اپنے لطف وکرم سے ہم کو یہ عیش مہیا فرمایا۔[4]

---

[1] فتح القدير (١٣٠/٥) [2] الدر المنثور (٦٣٤/٧)
[3] تفسير القرطبي (٧٠/١٧) [4] فتح البيان (٢٢٤/١٣_٢٢٩)

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿٢٩﴾ اَمْ
يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿٣٠﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ
مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿٣١﴾ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ
بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿٣٢﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ
بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٣﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿٣٤﴾

تو (اے نبی!) آپ نصیحت کرتے رہیں کہ آپ اپنے رب کے فضل سے نہ تو کاہن ہیں اور نہ دیوانے ㉙ کیا وہ (کافر) کہتے ہیں: (یہ نبی) شاعر ہے اور ہم اس کے بارے میں حوادثِ زمانہ (موت) کا انتظار کر رہے ہیں؟ ㉚ کہہ دیجیے: تم انتظار کرو، یقیناً میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ㉛ کیا ان کی عقلیں انھیں یہ سبق دیتی ہیں یا پھر وہ لوگ ہی سرکش ہیں؟ ㉜ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود ہی یہ (قرآن) گھڑا ہے؟ بلکہ وہ ایمان نہیں لاتے ㉝ پھر (انھیں) چاہیے کہ اس (قرآن) جیسی ایک بات لے آئیں، اگر وہ سچے ہیں ㉞

رسول اللہ ﷺ مشرکین کے بہتانوں سے بری ہیں:

اللہ پاک اپنے رسول ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ اس کی رسالت اس کے بندوں کو پہنچائیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کیا ہے، اس سے ان کو سمجھائیں۔ پھر آپ کو بہتان اور فجور والی جس بات کی تہمت لگاتے تھے وہ بات آپ سے دور کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴾ یعنی تو بحمد اللہ کاہن نہیں ہے، جیسا کہ کفارِ قریش کے جاہل لوگ کہتے ہیں۔ کاہن وہ ہے جس کے پاس جنوں کا تابع وہ کلمہ لاتا ہے جس کو وہ آسمان کی خبر سے لیتا ہے اور نہ تو مجنون ہے۔ مجنون وہ ہے جس کو شیطان چھو کر مخبط کر دیتا ہے۔ پھر جو بات وہ آپ ﷺ کی شان میں کہتے تھے، اللہ پاک نے اس میں اُن پر انکار کر کے فرمایا: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴾ "أَيْ: قَوَارِعَ الدَّهْرِ" یعنی زمانے کے حوادث و زواجر۔ "مَنُوْن" بہ معنی موت ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اس کا انتظار کرتے ہیں اور اس پر صبر کرتے ہیں، یہاں تک کہ اسے موت آ جائے تو ہم اس سے اور اس کے حال سے راحت پائیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴾ یعنی تم انتظار کرو کہ میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں اور تم عن قریب جان لو گے کہ دنیا اور آخرت میں نیک انجام اور نصرت کس کے لیے ہو گی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب قریش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے دارِندوہ میں جمع ہوئے تو اُن میں سے ایک نے کہا ہے کہ اس کو وثاق میں روک رکھو، یعنی اس کو بند کرو یا قید رکھو اور اس پر زمانے کی گردش کا انتظار کرو، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جائے، جیسے کہ اس سے پہلے کے شعراء ہلاک ہو گئے۔ (قاله محمد بن إسحاق عن عبد الله بن أبي نجيح عن مجاهد عنه)۔ یہ جو زہیر اور نابغہ ہے تو ان میں سے ایک کی طرح ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ ان کے قول سے نازل فرمایا: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴾۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴾ یعنی یہ باطل باتیں جو تیرے حق میں کہتے ہیں جن کو وہ خود اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ وہ جھوٹ اور کذب ہیں، کیا ان باتوں کا حکم ان کو ان کی عقلیں کرتی ہیں؟ نہیں بلکہ وہ سرکش گمراہ اور دشمن لوگ ہیں۔ چنانچہ یہ وہی بات ہے جو تیرے حق میں ان باتوں کے کہنے کا ان کو باعث ہوئی۔ پھر فرمایا: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ﴾ یعنی کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کو اپنی طرف سے بنا لایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی ایسی بات کہنے پر ان کا کفر ہی ان کے لیے باعث ہوا۔

﴿ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی اگر وہ اپنی اس بات میں سچے ہیں کہ اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے بنا لیا ہے تو چاہیے کہ جو قرآن آپ لے کر آئے ہیں اس جیسا وہ بھی لے آئیں۔ پس بے شک اگر وہ اور سارے زمین والے جن اور انسان جمع ہو جائیں تو اس کی طرح کا قرآن نہ لا سکیں گے اور نہ اس جیسی دس سورتیں لا سکتے ہیں، بلکہ اس جیسی ایک سورت بھی نہیں لا سکتے۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ جس وعظ و تذکیر پر تو ہے اس پر ثابت و دائم رہ اور وعظ اور نصیحت کرتا رہ۔ ﴿ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ ﴾ میں حرفِ باء محذوف سے متعلق ہے جو حال ہے۔ یعنی تو اس حال میں کاہن اور مجنون نہیں ہے جبکہ تو متلبس ہے اپنے رب کی نعمت کے ساتھ جس کا اس نے تجھ پر انعام کیا ہے۔ وہ نعمت یہ ہے کہ اس نے تجھے راجح العقل، عالی ہمت نبی کریم الفعال اور طاہر الاخلاق بنایا ہے۔ پس تو ان صفات کے ساتھ متصف ہو کر نہ کاہن ہے نہ مجنون ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس محذوف سے متعلق ہے جس پر کلام دال ہے۔ "أَيْ: مَا أَنْتَ فِيْ حَالِ إِذْكَارِكَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ" یعنی تو جو اپنے رب کی نعمت یاد دلاتا ہے اس حال میں نہ تو کاہن ہے نہ مجنون ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ باء سببیہ ہے، مضمونِ جملہ منفیہ سے متعلق ہے: "أَيْ: اِنْتَفَى عَنْكَ الْكَهَانَةُ

[1] تفسير الطبري (٤٧٩/٢٢) [2] تفسير ابن كثير (٣٠٩/٤)

وَالْجُنُوْنُ بِسَبَبِ نِعْمَةِ اللّٰهِ عَلَيْكَ،، یعنی اللہ کی تم پر نعمت کے سبب سے تجھ سے کہانت اور جنون منتفی ہو گئی یعنی ہو نہیں سکتی۔ جیسے تم بولتے ہو: ''مَا أَنَا بِمُعْسِرٍ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَغِنَاهُ،، یعنی اللہ کی حمد اور غنا کے سبب سے میں تنگ حال نہیں ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ بائے قسمیہ ہے، تقدیر یہ ہے: ''مَا أَنْتَ وَنِعْمَةِ اللّٰهِ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُوْنٍ،، یعنی اللہ کی نعمت کی قسم تو نہ کاہن ہے نہ مجنون۔ کاہن وہ ہے جو یہ وہم ڈالتا ہے کہ وہ غیب جانتا ہے بغیر وحی کے، یعنی جو کچھ تو کہتا ہے وہ کہانت نہیں ہے، کیوں کہ تُو تو اسی وحی کے ساتھ بولتا ہے جس کے پہنچانے کا اللہ تعالیٰ نے تجھے حکم کیا ہے۔ آیت سے اس بات کا رد کرنا مقصود ہے جو مشرک کہا کرتے تھے کہ وہ کاہن ہے یا مجنون ہے۔

کلمۂ ﴿ أَمْ ﴾ منقطعہ ہے، اس کے متعلق اختلاف پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ مقدر بہ ''بل،، و''ہمزہ'' ہے یا صرف بہ ''بل،،۔ امام خلیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں ﴿ أَمْ ﴾ استفہام کے لیے ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بندے اس بات کے ساتھ خطاب کیے گئے جو ان کے کلام میں جاری ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیبویہ رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ کلامِ عرب میں ﴿ أَمْ ﴾ خروج کے لیے ہے ایک حدیث سے دوسری حدیث کی طرف،[1] یعنی ان کی طرف سے یہ بات کہنا سزاوار اور لائق نہیں ہے۔ کواشی کہتے ہیں کہ ﴿ أَمْ ﴾ جو ''بل،، کے ساتھ مقدر کیا گیا تو صرف اس لیے کہ اس کا مابعد متیقن ہے اور ﴿ أَمْ ﴾ کا ما بعد مشکوک فیہ مسئول عنہ ہوتا ہے۔ یہاں ﴿ أَمْ ﴾ پندرہ مرتبہ مذکور ہوا ہے اور وہ سب ان سے الزامات ہیں جن کو خطاب کیا گیا ہے۔ ان کے لیے ان کا کوئی جواب نہیں ہے، لیکن امام ثعلبی رحمہ اللہ نے خلیل رحمہ اللہ سے نقل کر کے کہا ہے کہ سورۃ الطّور میں سب کے سب ﴿ أَمْ ﴾ استفہام ہیں، عطف کے نہیں ہیں۔[2] اللہ تعالیٰ نے جو باوجود اپنے علم کے استفہام کیا ہے تو وہ اُن کی ملامت و توبیخ کے لیے ہے جس طرح کوئی شخص اپنے غیر سے کہے: ''أَجَاهِلٌ أَنْتَ،، باوجود اس کے کہ اس کے جہل کا علم ہے۔

جمہور نے ﴿ نَتَرَبَّصُ ﴾ کو بہ صیغۂ متکلم مع الغیر پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی زید بن علی نے) بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ یہ شاعر کی صفت ہے۔ عرب لوگ شاعر کو ایذا دینے سے بچتے تھے۔ چنانچہ کہتے کہ ہم فی الحال اس کا معارضہ نہ کریں اس خوف سے کہ وہ اپنے شعر کی قوت کے سبب سے ہم پر غالب ہو جائے اور ہم تو یہی اس کی موت اور ہلاکت کا انتظار کرتے ہیں، جیسے اس سے پہلے کے شعراء ہلاک ہو گئے۔

﴿ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴾ یعنی زمانے کی گردشیں اور حادثے، مطلب یہ کہ ہم اس پر حوادثِ ایام کا انتظار کرتے ہیں سو وہ مر جائے گا جیسے اس کا غیر مر گیا، یا ہلاک ہو گا جیسے اس سے پہلے ہلاک ہو گئے۔ ''منون،، بہ معنی دہر ہوتا ہے اور بہ معنی ''منیة،، اس لیے کہ موت عدد کو کم کرتی ہے اور مدتوں کو قطع کرتی ہے۔ زمانے کا نام ''منون،، اس لیے رکھا ہے

---

[1] فتح القدير (١٣١/٥)
[2] الكشف والبيان للثعلبي (١٣٢/٩)

کہ وہ اجل کو قطع کرتا ہے۔ ﴿ رَيْبَ ﴾ کا حوادث پر اطلاق استعارۂ تصریحیہ ہے۔ حوادث کی تشبیہ دی گئی ﴿ رَيْبَ ﴾ سے جس کے معنی شک ہیں، اس لیے کہ حوادث ایک ہی حال پر ہمیشہ باقی نہیں رہتے جس طرح کہ شک بھی ایسا ہی ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: ''نَتَرَبَّصُ إِلَى رَيْبِ الْمَنُوْنِ''، یعنی گردشِ روزگار تک اس کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر حرفِ جر، یعنی کلمۂ ''إلى''، کو حذف کر دیا، جیسے تم کہتے ہو: ''قَصَدْتُ زَيْدًا أَيْ: إِلَى زَيْدٍ''۔ امام اصمعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''منون'' واحد ہے اس کی کوئی جمع نہیں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واحد و جمع ہوتا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمع ہے اس کا کوئی واحد نہیں ہے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر فرمایا کہ اس کا ان کو جواب دیں: ﴿ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴾ یعنی تم میری موت یا ہلاکت کا انتظار کرو، چنانچہ میں بھی تمھارے ساتھ تمھاری موت یا ہلاکت کا انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ امر تحدیدی (ملامت کرنے اور خوف دلانے کے لیے) ہے ایجابی یا ندبی یا اباحتی نہیں ہے، کیوں کہ ان کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہلاکت کا انتظار کرنا لازمی طور پر حرام ہے۔

پھر ان کو توبیخ کی یہ کہہ کر: ﴿ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَاۤ ﴾ یعنی کیا اُن کی عقلیں ان کو اس قسم کے متناقض (متضاد) کلام کا امر کرتی ہیں، اس لیے کہ کاہن تو فطنت و عقل و ذکاوت و دقتِ نظر میں افراط کے درجے کو پہنچا ہوتا ہے اور مجنون وہ ہے جس کی عقل جاتی رہے، اس کے فہم پر پردہ ڈال دیا گیا اس کے لیے فطنت و ذکاء ہونے کا کیا ذکر ہے اور شاعر موزوں و متسق و مخیل کلام والا ہوتا ہے اور مجنون سے یہ بن نہیں آتا۔ ان کو کیا ہوا ہے کہ ایسی متضاد باتیں کہتے ہیں!

امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ علمائے قریش کا تو احلام اور عقول کے ساتھ وصف کیا جاتا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عقلوں کو عیب لگایا، جبکہ ان کو باطل سے حق پہچاننے کا ثمرہ نہ دیا۔[2] قاموس میں ہے ''حلم'' بالکسر اناۃ و عقل ہے اور اس کی جمع احلام اور حلوم ہے۔[3] یہاں امر کی نسبت احلام کی طرف کی، چنانچہ یہ مجاز ہے مراد عقلوں کا اس بات کی طرف جانا، یعنی یہ جو شاعر، کاہن مجنون کہتے ہیں کیا اُن کی عقلیں اس بات کی طرف ان کو پہنچاتی ہیں، یہ انکار ہے یعنی نہیں پہنچاتیں۔

﴿ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ کیا وہ طاغی اور سرکش ہو گئے، عناد میں حد سے بڑھ گئے کہ وہ بات کہی جو کہ کہی۔ یہ اضرابات، یعنی ایک شے سے دوسری شے کی طرف منتقل ہونا استفہام کے ساتھ جیسا کہ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ کا مدلول ہے، اس بات پر دال ہیں کہ جو شے اُن کے بعد آئے گی وہ پہلی بات سے بڑھ کر بری و درشت و سخت اور زیادہ جرأت اور عناد والی ہو گی۔ ''تَقَوَّل'' بہ معنی اختلاق و افتعالِ قول ہے اور اس کا استعمال صرف کذب میں ہوتا ہے غالباً۔ گو اصل اس کی قول کا تکلف ہے۔ اسی معنی سے ''اِقْتَالَ عَلَيْهِ'' ہے، ''وَيُقَالُ: اِقْتَالَ عَلَيْهِ'' بہ معنی

[1] تفسیر القرطبي (۷۳،۷۲/۱۷) [2] فتح القدیر (۱۳۱/۵) [3] القاموس المحیط (۱۴۱۶/۱)

"تَحَكَّمَ عَلَيْهِ"، یعنی بلکہ کیا کہتے ہیں کہ قرآن کو اپنی طرف سے بنالیا ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس سے اضراب کیا جو شے شناعت وسختی میں اس سے بھی بڑھ کر ہے، اس کی طرف انتقال کر کے (متوجہ ہوکر) فرمایا: ﴿ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی ان سے ان متضاد قولوں کا صادر ہونا، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کافر ہیں اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اس شے کی تصدیق کرتے ہیں جس کو اس کے رسول لے کر آئے۔ پھر اللہ پاک نے ان سے تحدی کی اور اُن پر حجت کا الزام کیا۔

﴿ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ ﴾ یعنی اگر وہ قرآن کو بنایا ہوا بتاتے ہیں تو چاہیے کہ قرآن کی طرح کی کوئی بنی ہوئی بات لے آئیں جو اس جیسے نظم وحسنِ بیان و بدیعِ اسلوب کی حامل ہو۔ امام رازی نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ امر اس جگہ اپنی حقیقت پر ہے، کیونکہ ﴿ فَلْيَاْتُوْا ﴾ مطلق نہیں فرمایا، بلکہ یوں کہا: ﴿ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴾[1] یعنی اگر وہ اس بات میں سچے ہوں جس کا انھوں نے زعم کیا ہے کہ محمد ﷺ نے قرآن اپنے دل سے بنالیا ہے اور اپنی طرف سے اس کو لائے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک امر شرط پر معلق ہے جب وہ شرط پائی جائے گی تو اس کا لانا واجب ہوگا باوجود اس کے کہ یہ عربی کلام ہے اور وہ لوگ عرب کے سردار اور فصیح اور ہر طرح کے عربی کی نظم اور نثر کے ممارس اور ماہر تھے۔[2]

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ اَمْ خَلَقُوا
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿٣٦﴾ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ
اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ
فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ
الْبَنُوْنَ ﴿٣٩﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿٤٠﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ
الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿٤١﴾ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۚ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ
الْمَكِيْدُوْنَ ﴿٤٢﴾ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٤٣﴾

کیا وہ بغیر کسی شے کے پیدا کیے گئے ہیں، یا وہی (خود اپنے) خالق ہیں؟ 35 کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے 36 کیا ان کے پاس آپ کے رب کے خزانے ہیں؟ یا وہ (ان پر) محافظ ونگران ہیں؟ 37 کیا ان کے لیے کوئی سیڑھی ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے (چڑھ کر آسمان کی باتیں) سن لیتے ہیں؟ پھر چاہیے کہ ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل لے آئے 38 کیا اس (اللہ) کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے؟ 39 کیا

[1] تفسير الرازي (٢٢٢/٢٨) [2] فتح البيان (١٣/٢٢٩_٢٣٢)

آپ ان سے کوئی اجر مانگتے ہیں کہ وہ (اس کے) تاوان سے بوجھ تلے دب گئے ہیں؟⁽⁴⁰⁾ یا ان کے پاس (علمِ) غیب ہے، تو وہ لکھتے ہیں⁽⁴¹⁾ کیا وہ کسی فریب کا ارادہ کرتے ہیں؟ تو جن لوگوں نے کفر کیا وہی فریب خوردہ ہیں⁽⁴²⁾ کیا ان کے لیے اللہ کے سوا اور کوئی معبود ہے؟ اللہ پاک ہے اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں⁽⁴³⁾

توحیدِ الوہیت کا اثبات اور اس سلسلے میں مشرکین سے چند سوالات:

یہ ربوبیت و توحیدِ الٰہیت کے اثبات کا مقام ہے، یعنی کیا وہ بغیر کسی موجد کے وجود میں لائے گئے، یا انھوں نے خود اپنے آپ کو ایجاد کر لیا، یعنی نہ یہ ہے کہ نہ یہ، بلکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کی انشا اور ایجاد کی، اس کے بعد کہ وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ مغرب میں سورۃ الطّور پڑھ رہے تھے، پھر جب آپ اس آیت کو پہنچے: ﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴾ تو قریب تھا کہ میرا دل اڑ جائے۔[1] (وهذا الحديث مخرج في الصحيحين من طرق عن الزهري به) جبیر رضی اللہ عنہ آپ پر بدر کے واقعہ کے بعد آئے "فداء أساری" میں اور وہ اس وقت مشرک تھے، پس ان کا اس سورت میں سے اس آیت کا سننا بعد میں ان کے اسلام میں داخل ہونے کا باعث ہوا۔

پھر فرمایا: ﴿ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴾ یعنی کیا انھوں نے آسمان اور زمین بنائے۔ یہ ان پر اس بات میں انکار ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں، حالاں کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ وہی خالق ہے وحدہ لا شریک لہ، لیکن ان کا یقین نہ کرنا ہی ان کو اس کا باعث ہوا ہے۔

﴿ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَۜيْطِرُوْنَ ﴾ یعنی کیا وہ ملک میں تصرف کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں خزانوں کی کنجیاں ہیں، یا خلائق کا حساب لینے والے وہی ہیں۔ بات یوں نہیں بلکہ اللہ عزوجل ہی مالک و متصرف ہے وہی "فعال لما یرید" ہے۔

﴿ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی کیا ان کے ملائے اعلیٰ کے پاس جانے کے لیے کوئی زینہ ہے تو چاہیے کہ وہ شخص جو ان کی طرف کان لگاتا ہے کوئی ظاہر حجت لے آئے جو اس فعل وقول کی صحت پر حجت ہو جس پر وہ ہیں، یعنی ان کو اس طرح کوئی راہ نہیں ہے تو وہ کسی شے پر نہیں اور نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے۔ پھر جو انھوں نے اللہ پاک کی طرف بیٹیوں کی نسبت کی اور ملائکہ کو عورتیں ٹھہرایا اور اپنے لیے بیٹیاں چھوڑ کر بیٹے پسند کیے، اس طرح سے کہ ان میں جس وقت کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خوش خبری دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا چہرہ سیاہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٧٣)

رہے اور وہ غصے کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اپنا تو یہ حال اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں ٹھہرایا اور اُن کو اللہ کے ساتھ پوجا۔

پھر فرمایا: ﴿ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴾ یہ ایک سخت قسم کی ملامت اور وعید ہے۔ ﴿ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴾ یعنی تو جو ان کو اللہ کی رسالت پہنچاتا ہے کیا اس پر ان سے اجرت مانگتا ہے سو وہ ادنیٰ شے کے سبب سے اس سے ملول ہوتے ہیں اور ان پر گراں وشاق گزرتی ہے، یعنی تو ان سے اس پر کچھ نہیں مانگتا۔ ﴿ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴾ یعنی بات یوں نہیں ہے، کیوں کہ آسمان و زمین والوں میں سے اللہ پاک کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔

﴿ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴾ یعنی کیا یہ لوگ رسول و دین کے بارے میں یہ بات کہہ کر لوگوں کو دھوکا دینے کا اور رسول کو اور اس کے اصحاب کو داؤ میں لینے کا ارادہ کرتے ہیں، چنانچہ ان کے داؤ کا وبال خود انہیں پر لوٹے گا۔ ﴿ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ ﴾ یہ مشرکوں پر اس بات میں شدید انکار ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بتوں اور شریکوں کو پوجا۔ پھر اُن کے قول و افتراء وشرک سے اپنے نفسِ کریم کی پاکیزگی بیان کی، چنانچہ فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے: کیا وہ اس انوکھی کیفیت اور عجیب وغریب کاریگری سے بغیر کسی خالق کے پیدا کیے گئے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: بلکہ کیا وہ باطل بغیر کسی مقصد کے پیدا کیے گئے کہ ان کا حساب لیا جائے نہ اُن کو کسی چیز کا امر کیا جائے اور نہ اُن کو کسی شے سے منع کیا جائے۔ حرفِ ﴿ مِنْ ﴾ کو لام کے معنی میں ٹھہرایا ہے۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا: بلکہ کیا وہ بے فائدہ پیدا کیے گئے اور کھلے چھوڑ دیے گئے کہ نہ انھیں حکم کیا جائے اور نہ منع کیا جائے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ بلکہ کیا وہ بغیر ماں اور باپ کے پیدا کیے گئے، چنانچہ وہ جماد (پتھر) کی طرح ہیں کہ نہ سمجھیں اور نہ اُن پر کوئی حجت قائم ہو۔ بلکہ کیا وہ کہتے ہیں کہ وہی خود اپنی جانوں کے خالق ہیں اور جب اقرار کر لیا تو اُن پر حجت قائم ہوگئی۔ امام محلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ کوئی مخلوق خالق کے بغیر ہو اور نہ کوئی معدوم پیدا کرے تو اب یہ ضروری ہوگا کہ ان کا کوئی خالق ہے اور وہ اللہ واحد ہے، پھر وہ اس کی توحید کیوں نہیں کرتے اور اس کے رسول اور کتاب پر ایمان نہیں لاتے؟[3] بلکہ کیا انھوں نے آسمان اور زمین بنائے، حالانکہ وہ اس کا دعویٰ نہیں کرتے تو اُن کو حجت لازم ہوگئی۔

اسی لیے اس سے اضراب کیا (دوسری طرف توجہ کی) اور یوں فرمایا: ﴿ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴾ یعنی وہ اس بات

---

[1] تفسير ابن كثير (٣٠٩/٤، ٣١٠) [2] تفسير البغوي (٣٩٢/٧) [3] تفسير الجلالين (٦٩٩/١)

کے یقین پر نہیں ہیں، بلکہ شک کے اندھیروں میں خبط کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید میں شک کرنے والے ہیں ورنہ اس کے نبی پر ایمان لے آتے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کو مزید تسلی ہے، یعنی جیسے انھوں نے تیرے حق میں طعن کیا ویسے ہی اپنے خالق کی شان میں طعن کیا، بلکہ کیا ان کے پاس بندوں کی روزیوں کے خزانے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ رحمت کی کنجیاں ہیں۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کیا اُن کے ہاتھ میں تیرے رب کی رسالت کی کنجیاں ہیں کہ اس کو جہاں چاہیں رکھیں، اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بارش اور رزق کے خزانے ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ خزائنِ رب سے مراد اس کی مقدورات (تقدیر) ہیں، ان کی خزائن سے مثال دی گئی ہے، اس لیے کہ خزانہ وہ گھر ہے جو اس لیے تیار کیا جاتا ہے کہ مختلف قسم کے ذخیرے اس میں جمع کیے جائیں اور رب کی مقدوارت ان خزانوں کی طرح ہیں جن میں تمام کی تمام جنسیں ہیں اور ان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بلکہ کیا وہی مصیطر ہیں، یعنی مسلط و غالب و قاہر و جبار۔ کسی نے کہا ہے کہ اربابِ قاہر کہ وہ کسی امر اور نہی کے ماتحت نہ ہوں اور جو چاہیں کریں۔

صحاح میں کہا ہے کہ "مُصَیْطِرٌ" وہ ہے جو کسی شے پر مسلط ہے، تاکہ اس پر مطلع رہے اور اس کے حالات کی خبر گیری رکھے اور اس کا عمل لکھے۔ اس کی اصل "سطر" سے ہے، اس لیے کہ کتاب سطر کی جاتی ہے،[2] یعنی کیا وہ حفظہ ہیں، یعنی حافظ و نگہبان۔ جمہور نے بہ صادِ خالص پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابن محیصن، حمید، مجاہد، قنبل اور ہشام رحمہم اللہ نے اور یہ قراءتِ حفص سے ہی مروی ہے) بہ سینِ خالص پڑھا ہے۔[3] اس محاورے سے کہ جب کوئی کسی شے کا مراقبہ و حفظ رکھتا ہے اور اس کو مقہور کرتا ہے تو بولتے ہیں: "سَیْطَرَ عَلَیْهِ". اور کسی نے (یعنی خلاد نے) بہ صادِ مشمہ بہ زائے پڑھا ہے۔ مفیعل کے وزن پر صرف پانچ لفظ آئے ہیں چار تو صفت اسم فاعل ہیں: "مُهَیْمِنٌ وَمُبَیْقِرٌ وَمُسَیْطِرٌ وَمُبَیْطِرٌ"۔ اور ایک پہاڑ کا نام ہے، وہ "مُحَیْمِرٌ" ہے۔ بلکہ کیا وہ کہتے ہیں کہ اُن کے لیے کوئی زینہ ہے آسمان کی طرف نصب کیا ہوا جس پر چڑھتے ہیں اور اس میں سے فرشتوں کی باتیں سنتے ہیں اور وہ شے سنتے ہیں جس کی اُن کی طرف وحی کی جاتی ہے اور اس سے علمِ غیب کی طرف پہنچتے ہیں جس طرح کہ نبی اکرم ﷺ اس کی طرف پہنچتے ہیں وحی کے طریقے سے، تاکہ اپنے زعم میں اُن کے لیے نبی اکرم ﷺ سے منازعت (لڑنا) ممکن ہو۔ ان کی طرف سے یہ زعم فرض کیا گیا ہے یہ بالفعل ان سے واقع نہیں ہوا، کیوں کہ جب وہ دشمنی اور مقابلے کی حالت میں تھے تو گویا انھوں نے اس کا دعویٰ کیا۔ کلمۂ ﴿فِيهِ﴾ ﴿سُلَّمٌ﴾ کی صفت ہے اور وہ اپنی اصل پر ظرفیت کے لیے ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی "عَلَی" ہے: "أَيْ: یَسْتَمِعُوْنَ عَلَیْهِ" جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

(1) تفسير البغوي (٣٩٢/٧) (2) الصحاح للجوهري (٢٤٧/٣) (3) تفسير القرطبي (٧٥/١٧)

﴿ وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ﴾ [طٰہٰ: ۷۱] ''تم سب کو کھجور کے تنوں میں سولی پر لٹکوا دوں گا۔'' امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: ''يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖ''۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ وہ جبرائیل علیہ السلام کی طرح ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر آتا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فِيْهِ ﴾ حال ہے محلِ نصب میں: ''أَيْ: صَاعِدِيْنَ فِيْهِ''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ یعنی پس چاہیے کہ ان کے سننے والا اگر اس کا دعویٰ کرے تو کوئی ظاہر واضح اور روشن حجت لے آئے۔ بلکہ کیا تم کہتے ہو کہ اللہ کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے ہیں۔ اللہ پاک نے ان کی عقلوں کی سبکی اور گمراہی بیان کی اور ان کو ڈانٹا، یعنی کیا وہ اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں، حالاں کہ وہ سب سے زیادہ ضعیف قسم ہیں اور اپنے لیے بیٹے ٹھہراتے ہیں جو اعلیٰ قسم ہے۔ اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ جس کی یہ رائے ہو تو وہ فہم اور عقل کے پست درجے میں ہے، اس سے یہ بعید نہیں کہ بعث کا اور توحید کا انکار کرے۔

پھر اللہ پاک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرنے کی طرف رجوع ہو کر فرمایا: ﴿ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴾ یعنی بلکہ کیا تو ان سے رسالت کے پہنچانے پر اُجرت مانگتا ہے کہ وہ تجھے دیں اور وہ اس اُجرت کے لازم ہونے پر جو تو ان سے مانگتا ہے مشقت میں ڈالے گئے ہیں، اس اجرت کے ادا کرنے کے لیے تکلیف میں پڑے ہوئے اور غمگین ہیں۔ ﴿ مُثْقَلُوْنَ ﴾ ماخوذ ہے: ''أَثْقَلَهُ الْحَمْلُ أَتْبَعَهُ'' سے (اس کو بوجھ نے بھاری، یعنی ماندہ کر دیا) لیکن یہ ثقل معنوی ہے، کیوں کہ عادت یہ ہے کہ جو کوئی کسی انسان پر مال کی چٹی ڈالتا ہے جس سے تاوان دینے والا غمگین ہوتا ہے اور اس کو ناخوش رکھتا ہے تو نہ اس کی بات سنتا ہے نہ اس کا حکم مانتا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: کیا تو نے اس قوم سے اُجرت کا سوال کیا ہے جس نے ان کو مشقت میں ڈالا ہے، اس لیے وہ اسلام کی طاقت نہیں رکھتے۔[2] بلکہ کیا وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پاس غیب ہی غیب ہے جو لوحِ محفوظ میں ہے جس میں غیب کی چیزیں ثبت کی گئی ہیں۔ چنانچہ غیب بہ معنی غائب ہے اور ﴿ اَلْغَيْبُ ﴾ میں الف و لام نوع کے معنی میں ہے عہدی وجنسی نہیں ہے، تو اب غیب سے مراد نوع ہوگی۔ یہ زعم فرضی ہے، کیوں کہ عملی طور پر ان سے واقع نہیں ہوا، لیکن وہ مکابرہ (بحث و سینہ زوری) اور معارضہ (مقابلہ) کی ایسی حالت میں ہیں کہ اُن کی طرف یہ زعم منسوب ہوتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان کے قول کا جواب ہے۔

﴿ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴾[3] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا اُن کے پاس غیب ہے کہ انھوں نے یہ جان لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے پہلے مر جائیں گے، پس وہ اس بات کو جان لینے کے بعد اس کو لکھتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ان کے قول کا رد ہے کہ ہم مرنے کے بعد اٹھائے نہ جائیں گے اور اگر اٹھائے جائیں گے تو ہمیں عذاب نہ ہوگا۔

---

[1] تفسير القرطبي (٧٦/١٧) [2] تفسير الطبري (٤٨٤/٢٢) [3] تفسير البغوي (٣٩٣/٧)

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يَكْتُبُوْنَ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ "يَحْكُمُوْنَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ"۔[1] بلکہ کیا وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکر کرنا چاہتے ہیں کہ اس مکر سے ان کو ہلاک کر دیں۔ لہٰذا جو لوگ کافر ہوئے انہی کے ساتھ مکر کیا گیا، وہی اپنے مکر کا بدلہ دیے جائیں گے تو اُن کے مکر کا نقصان انہی کو ہوگا۔ ﴿ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ﴾ [الفاطر: ٤٣] ''اور بری تدبیروں کا وبال ان تدبیر والوں ہی پر پڑتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ یا تو اس باب سے ہے کہ اسم ظاہر بجائے ضمیر واقع ہوا ہے۔ یہ بات بتانے کے لیے کہ وہ کفر کی اس قبیح صفت کے ساتھ متصف ہیں۔ اصل یہ ہے: "أَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا فَهُمُ الْمَكِيْدُوْنَ"۔ یا جنسِ کفار پر حکم ہے۔ جس کی ایک قسم یہ مکر وفریب والے ہیں تو یہ اس جنس میں سب سے پہلے شامل ہوں گے، اس لیے کہ یہ کفر کی اس صفت میں غلو کرنے والے (بہت آگے بڑھنے والے) ہیں۔ یہ مکر وفریب اور حیلہ گری دارِ ندوہ میں ہوئی جو اہلِ مکہ کے گھروں میں سے ایک گھر ہے۔ کید کے ارادے کی جو خبر دی تو ظاہر یہ ہے کہ یہ غیب کی خبروں میں سے ایک خبر ہے، کیوں کہ سورت مکی ہے اور اس کید کا وقوع ہجرت کی رات میں ہوا۔

پھر اللہ پاک نے بدر میں ان کو ہلاک کیا، اتنے برسوں کی مدت پوری ہونے کے بعد جن کی گنتی کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ کی تعداد کے برابر ہے جو اس جگہ مذکور ہوا ہے، وہ شمار پندرہ دفعہ ہے، اس لیے کہ بدر کی لڑائی ۲ ہجری میں ہوئی اور یہ سالِ نبوت سے پندرہ سال پورے ہونے کا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بہت جگہ ان کو ذلت دی اور ان کے ساتھ کید کیا۔ ﴿ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٥٤] ''اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی (مکر) خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔'' اللہ تعالیٰ کی طرف مکر کی نسبت بطور مشاکلت (مشابہت) کے ہے۔ مراد مکر کی جزا دینا ہے۔ اس کی ذات پاک حقیقی مکر سے پاک اور مبرا ہے، بلکہ کیا وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا اُن کا کوئی معبود ہے جو اُن کی حفاظت کرتا ہے۔ اُن کو روزی دیتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے کہ اصل سے حصول کی نفی ہے، یعنی درحقیقت ان کا اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اس معنی میں کہ ان کے اس اعتقاد کے لحاظ سے ان کی ابتغاء اور لیاقت کی نفی ہے کہ وہاں اللہ کے سوا اور معبود ہیں۔ یعنی لائق نہیں ہے کہ اللہ پاک کے سوا ان کا کوئی معبود ہو۔

پھر اللہ پاک نے اپنے آپ کی اس برے قول سے پاکیزگی بیان فرمائی اور فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾۔ کلمۂ ''ما'' مصدریہ ہے: "أَيْ: سُبْحَانَهُ عَنْ إِشْرَاكِهِمْ" یعنی وہ ان کے شرک کرنے سے پاک ہے۔ یا خبر یہ ہے: "أَيْ: عَنِ الَّذِيْنَ يُشْرِكُوْنَ" یعنی وہ ان لوگوں سے پاک ہے جن کو شریک کرتے ہیں اس بنا پر۔ پھر یہ احتمال ہے کہ ولد سے پاکیزگی بیان کی ہو، اس لیے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بیٹیوں اور بیٹوں سے پاک ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ کی مثل سے پاکیزگی بیان کی ہو، کیوں کہ وہ کہا کرتے

[1] فتح القدير (١٣٤/٥)

تھے کہ وہ اس شے کی مثل ہے جس کو وہ پوجتے ہیں تو فرمایا کہ اللہ اس شے کی مثل سے پاک ہے جس کو وہ پوجتے ہیں۔
پھر اللہ سبحانہ نے ان کی بعض جہالتیں ذکر کیں۔ چنانچہ فرمایا:[1]

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾

اور اگر وہ آسمان سے گرتا ہوا کوئی ٹکڑا بھی دیکھیں تو وہ کہیں گے: (یہ) تہ بہ تہ بادل ہے 44 لہٰذا (اے نبی!) آپ انھیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے، حتی کہ وہ اپنے اس دن سے ملیں، جس میں وہ بے ہوش کیے جائیں گے 45 اس دن انھیں ان کا فریب کچھ فائدہ نہیں دے گا، اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی 46 اور بلاشبہ جن لوگوں نے ظلم کیا، ان کے لیے اس عذاب کے علاوہ (دنیا میں) بھی ایک عذاب ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے 47 اور (اے نبی!) اپنے رب کے حکم (آنے) تک صبر کیجیے، بلاشبہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور جب آپ کھڑے ہوں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے 48 اور (کچھ حصہ) رات میں بھی، پس آپ اس کی تسبیح کیجیے اور ستارے غروب ہونے کے بعد بھی 49

مشرکین اپنی سرکشیوں کی بنا پر مبتلائے عذاب ہوں گے:

تو انھیں چھوڑ دے، یعنی باتیں بنائیں اور کھیلیں۔ انتہیٰ۔

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ مشرکین محسوس شے سے دشمنی اور مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر اپنے اوپر کوئی تختہ آسمان سے گرتا ہوا دیکھیں جس سے ان کو عذاب کیا جائے تو اس کی تصدیق نہ کریں اور نہ اس پر یقین کریں، بلکہ کہیں کہ یہ ایک بادل ہے، "مُتَرَاكِمٌ"، یعنی گاڑھی بدلی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴾ [الحجر: ١٤۔ ١٥] "اور اگر ہم ان پر

[1] فتح البیان (۱۳/۲۳۲۔۲۳۶)

آسمان کا دروازہ کھول بھی دیں اور یہ وہاں چڑھنے بھی لگ جائیں تب بھی یہی کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے، بلکہ ہم لوگوں پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَذَرْهُمْ ...الآية ﴾ "أَيْ: دَعْهُمْ" یعنی اے محمد! تو ان کو چھوڑ دے، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے ملیں جس میں ان پر کڑاکا پڑے گا، یہ دن قیامت کا دن ہے جس دن ان کا کید اور مکر ان کو کوئی فائدہ نہ دے گا۔ جس مکر و فریب کا انھوں نے دنیا میں استعمال کیا تھا وہ قیامت کے دن ان کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔ پھر فرمایا: جنھوں نے ظلم کیا اُن کے لیے اس سے پہلے دارِ دنیا میں عذاب ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [السجدة: ٢١] "بالیقین ہم انھیں قریب کے چھوٹے سے بعض عذاب اس بڑے عذاب کے سوا چکھائیں گے، تاکہ وہ لوٹ آئیں۔"

اسی لیے فرمایا: ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی ہم ان کو دنیا میں عذاب کرتے ہیں اور مصائب میں مبتلا کرتے ہیں شاید وہ رجوع ہوں اور انابت الی اللہ کریں، سو وہ اس شے کو نہیں سمجھتے جس کا ان کے ساتھ ارادہ کیا جاتا ہے، بلکہ جس بلا میں وہ مبتلا ہوتے ہیں وہ جس وقت ان سے دور کر دی جاتی ہے تو جس کام پر وہ پہلے تھے، اس سے بھی بہت برے کام کی طرف عود کرتے ہیں، جیسا کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ منافق جس وقت بیمار ہوتا ہے اور صحت دیا جاتا ہے تو اس میں اس کی مثال اونٹ کی طرح ہے، وہ نہیں جانتا کہ اسے کس بات کے لیے باندھا گیا اور کس بات کے لیے اسے چھوڑا گیا۔[1] اثرِ الٰہی میں ہے میں تیری کتنی نافرمانی کرتا ہوں اور تو مجھے عذاب نہیں کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے بندے! میں تیری کتنی معافات (معافی) کرتا ہوں اور تو نہیں جانتا ہے۔

نبی مکرم ﷺ کو صبر اور تسبیح کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا ﴾ یعنی تو ان کی ایذا پر صبر کر اور اُن کی پروا نہ کر تو ہمارے سامنے اور ہمارے زیرِ حفاظت ہے: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [المائدة: ٦٧] یعنی اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴾ یعنی اور اپنے رب کی پاکی اور خوبیاں بیان کر جس وقت تو اٹھتا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی نماز کی طرف۔ "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ"، امام ربیع بن انس اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہما اللہ وغیرہما سے بھی اس کی طرح مروی ہے۔[2] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ نماز کے شروع میں اس کو کہا کرتے تھے۔[3] (رواه مسلم في صحيحه ورواه أحمد وأهل السنن عن أبي سعيد رضي الله عنه وغيره عن النبي ﷺ إنه كان يقول ذلك)[4]

---

[1] سنن أبي داود (٣٠٨٩) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل دیکھیں: (ضعيف أبي داود: ٤٦٨/٢)

[2] تفسير الطبري (٤٨٩/٢٢) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٩)

[4] مسند أحمد (٥٠/٣) سنن أبي داود (٧٧٥) سنن الترمذي (٢٤٢) سنن ابن ماجه (٨٠٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو "صحیح" کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح أبي داود: ٣٦١/٣)

امام ابو الجوزاء نے کہا: "أَيْ: مِنْ نَوْمِكَ مِنْ فِرَاشِكَ"، یعنی جس وقت تو اپنی نیند سے اپنے بچھونے سے اٹھے۔ اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے اس قول کی تائید ہوتی ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص رات سے بیدار ہوا اور کہا: "لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" پھر کہا: "رَبِّ اغْفِرْ لِي" یا فرمایا: پھر دعا کی تو اس کے لیے قبول کی جائے گی، پھر اگر قصد کیا اور وضو کیا پھر نماز پڑھی تو اس کی نماز قبول کی جائے گی۔[2] (أخرجه الإمام أحمد وأخرجه البخاري في صحيحه وأهل السنن من حديث وليد بن مسلم به)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: (قاله ابن أبي نجيح) جب تو ہر مجلس سے کھڑا ہو۔ امام ابو الاحوص رحمہ اللہ نے کہا: (قاله الثوري عن أبي إسحق عنه) جس وقت کوئی شخص اپنی مجلس سے اٹھنے کا ارادہ کرے تو کہے: "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ"۔[3] امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تو کھڑا ہو ہر مجلس سے، اگر تو نے نیکی کی ہے تو زیادہ کرے گا خیر کو اور اگر تو نے اس کے سوا کیا ہے تو یہ اس کا کفارہ ہو گا۔[4] (أخرجه ابن أبي حاتم) ابو عثمان فقیر سے مروی ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم کی کہ جس وقت اپنی مجلس سے اٹھیں تو کہیں: "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ"، معمر نے کہا: میں نے غیر عبد الکریم کو سنا، وہ کہتا تھا کہ یہ قول مجالس کا کفارہ ہے۔ اور یہ مرسل ہے۔[5] (أخرجه عبد الرزاق في جامعه) اس بارے میں مسند حدیثیں وارد ہوئی ہیں کئی طریق سے بعض بعض کو قوت دیتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (حديث ابن جريج عن سهل بن أبي صالح عن أبيه) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ جو شخص کسی مجلس میں بیٹھا، پھر اس میں بہت شور وغل ہوا، پھر اس نے اپنی مجلس سے اٹھنے سے پہلے کہا: "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ"۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کی اس شے کو بخش دے گا جو اس مجلس میں ہوئی۔[6]

(رواه الترمذي و هذا لفظه و النسائي في اليوم والليلة من حديث ابن جريج وقال الترمذي: حسن صحيح وأخرجه الحاكم في مستدركه، وقال: إسناده على شرط مسلم إلا أن البخاري علله)

---

[1] تفسير ابن كثير (٣١١/٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٠٣) مسند أحمد (٣١٣/٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٦٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤١٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٢١٥/٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٧٨)

[3] تفسير الطبري (٤٨٨/٢٢، ٤٨٩) تفسير ابن كثير (٣١١/٤)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣١٧/١٠)

[5] مصنف عبدالرزاق (٢٤/١١) یہ روایت مرسل ہے۔

[6] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٣٣) سنن النسائي الكبرىٰ (١٠٥/٦) مستدرك الحاكم (٧٢٠/١) صحيح الجامع (٦١٩٢)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام احمد، بخاری، مسلم، ابو حاتم، ابو زرعہ اور دارقطنی وغیرہم رحمہم اللہ نے اسے معلول کہا ہے اور اس میں وہم کو ابن جریج کی طرف منسوب کیا ہے کہ ابو داود نے اسے اپنی سنن میں ابن جریج کے طریق کے علاوہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انھوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ نیز امام ابو داود نے اور الفاظ بھی انہی کے ہیں اور امام نسائی نے اور امام حاکم نے مستدرک میں حجاج بن دینار عن ابی ہاشم عن ابی العالیہ عن ابی برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے روایت کیا ہے۔

کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی آخر عمر میں جب ارادہ کرتے کہ مجلس سے اٹھیں تو فرماتے تھے: ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ'' پس ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! بے شک آپ البتہ ایک قول کہتے ہیں جو ماضی میں نہیں کہتے تھے، فرمایا کہ یہ اس شے کے لیے کفارہ ہے جو مجلس میں ہوتی ہے۔[1] (وقد روي مرسلا عن أبي العالية والله أعلم و هكذا رواه النسائي والحاكم من حديث الربيع بن أنس عن أبي العالية عن رافع بن خديج رضي الله عنه عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم مثله سواء و روي مرسلا أيضا فالله أعلم وكذا رواه أبو داود عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما)

کہا: کلمات یہ ہیں کہ جو شخص اپنی مجلس سے کھڑے ہونے کے وقت ان کو تین بار کہے گا کہ ان کے سبب سے اس سے کفارہ کیا جائے گا اور جب بھی وہ ان کلمات کو مجلسِ خیر و مجلسِ ذکر میں کہے گا تو اس کے لیے ان کے ساتھ اس طرح سے ختم کیا جائے گا جیسے مہر کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے۔ وہ کلمات یہ ہیں: ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ''[2] (وأخرجه الحاكم من حديث أم المؤمنين عائشة رضي الله عنها وصححه ومن رواية جبير بن مطعم رضي الله عنه ورواه أبوبكر الإسماعيلي عن أمير المؤمنين عمر بن الخطاب رضي الله عنه كلهم عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے اس کے طرق، الفاظ، علتوں اور اس سے متعلق چیزوں کو الگ الگ جزء میں بیان کر دیا ہے۔ ولله الحمد والمنة.[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ ﴾ یعنی اس کا ذکر کر اور رات میں تلاوت اور نماز کے ساتھ عبادت کر۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ [بني إسرائيل: ٧٩] ''رات کے کچھ حصے میں تہجد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کریں یہ زیادتی آپ کے لیے ہے عن قریب آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود میں کھڑا کرے گا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں پہلے گزر چکا ہے کہ یہ وہ

---

[1] سنن أبي داود (٤٨٥٩) سنن النسائي الكبرىٰ (١١٢/٦) مستدرك الحاكم (٧٢١/١) صحيح الترغيب والترهيب (١٠١/٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٥٧) [3] تفسير ابن كثير (٣١٢/٤)

دو رکعتیں ہیں جو نمازِ فجر سے پہلے ہیں،[1] چنانچہ وہ اس وقت مشروع ہیں جب تارے ڈوبنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ابن سیلان نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ تم ان کو مت چھوڑو۔ ''وَإِنْ طَرَدَتْكُمُ الْخَيْلُ'' یعنی اگرچہ تم کو لشکر بھگا دے۔ مراد فجر کی دو رکعتیں ہیں۔[2] (رواه أبو داود)

اسی حدیث کی وجہ سے امام احمد رحمہ اللہ کے بعض اصحاب سے ان کا وجوب بیان کیا گیا ہے۔ یہ وجوب ضعیف ہے اس حدیث کے سبب سے کہ دن اور رات میں پانچ نمازیں ہیں۔ سائل نے عرض کی کہ کیا مجھ پر ان کے علاوہ کچھ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ تو نفل کرے۔[3] صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نوافل میں سے کسی شے پر خبر گیری کے لحاظ سے اتنے زیادہ سخت نہیں تھے جتنے فجر کی دوسنتوں کے لیے تھے۔[4] مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ فجر کی دو رکعت دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔[5] آخر تفسير سورة الطور، ولله الحمد والمنة.

فتح البیان کا بیان:

''كِسَفٌ''، ''كِسْفَةٌ'' کی جمع ہے، ''كِسْفَةٌ'' کسی شے کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ امام فراء اور اخفش رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ جس نے ''كِسْفًا'' کو بہ کسرِ کاف وسکونِ سین پڑھا ہے تو اس کو واحد ٹھہرایا ہے اور جس نے بہ کسرِ کاف و فتحِ سین پڑھا ہے تو اس کو جمع قرار دیا ہے۔[6] ﴿سَاقِطًا﴾ کا نصب بنا بر حال ہے یا بنا بر مفعولِ ثانی۔ ﴿مَرْكُومٌ﴾ وہ ہے جس کا بعض بعض پر رکھا ہوا ہو۔ یہ بات بطور فرض وتقدیر کے ہے، کیوں کہ یہ بات معلوم ہے کہ قریش پر عذاب کرنے کے لیے ان پر آسمان سے ٹکڑے نازل نہیں ہوئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيْهِمْ﴾ [الأنفال: ٣٣] ''اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرے گا کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو عذاب کرے۔''

گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہم ان کو اس طرح سے عذاب کرتے کہ آسمان سے ان پر ٹکڑے گر پڑتے تو بھی وہ باز نہ رہتے اور رجوع نہ ہوتے اور عناد اور ٹھٹھے کے طور پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ دلانے کے لیے اس نازل کردہ شے کے بارے میں وہ کہتے کہ وہ ﴿سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ﴾ ہے، یعنی ایک بدلی ہے جس کا بعض اس کے بعض پر تہہ بہ تہہ ہے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو امر کیا کہ ان کو چھوڑ دیں، چنانچہ فرمایا: ﴿فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ﴾۔ یہ شرط مقدر کا جواب ہے، یعنی جبکہ وہ کفر وعناد میں اس حد تک پہنچے اور یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ کفر سے نہ پھریں گے تو تُو ان کو چھوڑ دے، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو پہنچیں جس میں ہلاک ہوں گے۔ یہ دن

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٤٩٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٥٨) اس کی سند میں ''ابن سیلان'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٦٢٠٨)

[3] صحيح البخاري (٤٦) صحيح مسلم (١١) [4] صحيح البخاري (١١١٦) صحيح مسلم (٧٢٤)

[5] صحيح مسلم (٧٢٥) تفسير ابن كثير (٤/٣١٠-٣١٢) [6] فتح القدير (٥/١٣٥)

یا تو اُن کی موت کا ہے یا بدر میں ان کے قتل کا۔ ظاہر یہی ہے جیسا کہ بقاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یا روزِ قیامت۔ جمہور نے ﴿ يُلٰقُوْا ﴾ پڑھا ہے اور ابوحیوہ نے ”یلقوا“ پڑھا ہے۔ اور جمہور نے ﴿ يُصْعَقُوْنَ ﴾ کو بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور ابن عامر و عاصم نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور باقی سبعہ نے بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ صیغۂ مجہول کی قراءت میں احتمال ہے کہ ”صَعِقَ فَهُوَ مَصْعُوْقٌ“ سے ہو، یعنی ثلاثی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ”أَصْعَقَ فَهُوَ مُصْعِقٌ“ رباعی سے ہو۔ معنی یہ ہیں کہ ان کے غیر نے ان کو ہلاک کیا اور سلمی کی قراءت بہ ضمِ یاء و کسرِ عین اس بات کی موذن ہے کہ ”افعل“ بمعنی ”فعل“ ہے۔ ”صعقة“ بہ معنی ہلاک ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔[1]

﴿ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ یہ بدل ہے ﴿ يَوْمَهُمُ ﴾ سے، یعنی ان کو اس دن ان کا کید نفع نہ دے گا جو انھوں نے دنیا میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا تھا اور نہ ہی کوئی مانع ان سے اس عذاب کو روکے گا جو اُن پر نازل ہو گا، بلکہ وہ عذاب ان پر بالضرور واقع ہو گا۔ ﴿ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ ﴾ کا مطلب ہے کہ یہ لوگ جنھوں نے کفر اور معاصی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے ان کے لیے روزِ قیامت عذاب کے علاوہ دنیا میں ایک عذاب ہے یعنی روزِ قیامت سے پہلے۔ مراد بدر کے دن ان کا قتل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عذاب سے مراد قحط اور بدحالی ہے اور جو عذاب اس سے بعد آئے گا، اس سے مراد بدر کے دن ان کا قتل ہے، کیوں کہ بدر کا واقعہ سنہ ۲ ہجری میں ہوا اور اس سے قبل ان پر قحط پڑا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سات برس تک بھوک اور تکلیف سے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد دنیا کے مصائب ہیں، یعنی درد، بیماریاں، بلائیں اور مال و اولاد کا نقصان۔ کسی نے کہا ہے کہ روزِ قیامت سے قبل قبر کا عذاب ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[2] ﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی لیکن ان کے اکثر اللہ کے عذاب کو نہیں جانتے جس کی طرف وہ رجوع ہوں گے اور اس کو جو اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں ان کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ﴾ یعنی اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کر یہاں تک کہ ان پر عذاب واقع ہو جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ ﴿ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا ﴾ یعنی پس بے شک تو ہماری نظر میں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تو ایسی جگہ ہے کہ ہم تجھے دیکھتے ہیں اور تیری حفاظت و رعایت رکھتے ہیں سو وہ تجھ تک پہنچ نہ سکیں گے[3] یا یوں کہو کہ تو ہماری حفظ اور حمایت میں ہے، لہٰذا تو اُن کی کچھ پروا مت کر۔ صرف نون عظمت کی مناسبت کے لیے ”أعين“ کو بہ لفظِ جمع کہا ہے ورنہ مدلول اس کا واحد ہے، یعنی مصدر، کیونکہ ﴿ بِاَعْيُنِنَا ﴾ کے معنی ”بِمَرْأًى وَمَنْظَرٍ مِنَّا“ ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴾ یعنی پاکی بیان کر اپنے رب کی اس شے سے جو اس کے لائق

---

[1] فتح القدير (۱۳۵/۵) [2] تفسير الطبري (۴۸۸،۴۸۷/۲۲) [3] فتح القدير (۱۳۵/۵)

نہیں ہے اور اس میں اپنے رب کی حمد کو بھی شامل کر اس انعام پر جو اس نے تجھ پر کیا ہے، یعنی "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" کہہ جبکہ تو اپنی مجلس سے اٹھے۔ امام عطاء، سعید، سفیان ثوری اور ابوالاحوص رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی تسبیح کرے جب اپنی مجلس سے اٹھے، چنانچہ کہے: "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" یا "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ"

ہر مجلس میں جس میں بیٹھتا ہے اس سے اٹھنے کے وقت یہ کلمات کہے۔ امام محمد بن کعب، ضحاک اور ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: جبکہ تو نماز کے لیے کھڑا ہو۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یوں کہے: "اَللّٰهُ أَكْبَرُ كَبِيْراً، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّأَصِيْلًا" اس قول میں نظر ہے، اس لیے کہ تکبیر قیام کے بعد ہوتی ہے نہ کہ حالتِ قیام میں اور تسبیح تکبیر کے بعد ہوتی ہے۔ یہ قول آیت کے معنی سے غیر ہے۔ پس زیادہ صحیح قول پہلا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ نماز پڑھ اللہ کے لیے جب تو اپنے مقام سے کھڑا ہو۔ امام ابوالجوزاء اور ابن عطیہ رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1]

امام کلبی رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب تو اپنے بچھونے سے اٹھے تو زبان سے اللہ کا ذکر کر، یہاں تک کہ نماز میں داخل ہو، یہ نماز فجر کی ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ جب تو اپنی نیند سے اٹھے۔ عاصم بن حمید کہتے ہیں کہ میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ اپنی نیند سے بیدار ہوتے تو کس شے کے ساتھ شروع کرتے تھے؟ فرمایا کہ تو نے مجھ سے اس شے کے بارے میں پوچھا ہے جس کے متعلق تجھ سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا، جس وقت آپ ﷺ کھڑے ہوتے تو دس بار تکبیر کہتے اور اللہ کی حمد کرتے دس بار اور تسبیح کہتے دس بار اور تہلیل کرتے دس بار اور استغفار کرتے دس بار اور فرماتے: "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ وَعَافِنِيْ" اور آپ ﷺ قیامت کے دن تنگیٔ مقام سے پناہ مانگتے تھے۔[3] (أخرجه أبو داود و النسائي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ ﴾ اللہ پاک نے آپ ﷺ کو فرمایا کہ بعض رات میں اس کی تسبیح کریں۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اس کو اور اول کو حقیقی تسبیح ٹھہرایا ہے۔[4] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یعنی نماز پڑھ مغرب وعشاء کی۔[5] کسی نے کہا ہے کہ فجر کی دو رکعتیں ہیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ صبح کی نماز سے پہلے کی دو رکعتیں ہیں۔[6] (أخرجه ابن مردويه)

﴿ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴾ یعنی تاروں کے پیٹھ پھیرنے کے وقت اس کی تسبیح کر، یعنی رات کے آخر ہے۔ کسی نے

---

(1) تفسير القرطبي (۷۹،۷۸/۱۷) (2) تفسير البغوي (۳۹۵/۷) الدر المنثور (۶۳۸/۷)

(3) سنن أبي داود، رقم الحديث (۷۶٦) سنن النسائي، رقم الحديث (۱٦۱۷) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو "صحیح" کہا ہے۔ تفصیل دیکھیں: (صحيح أبي داود: ۳۵۲/۳)

(4) تفسير الجلالين (۷۰۰/۱) (5) فتح القدير (۱۳٦/۵) (6) الدر المنثور (٦۳۸/۷)

کہا ہے کہ نمازِ فجر مراد ہے۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ادبارِ صلوات میں، یعنی نمازوں کے بعد تسبیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: فجر کی دو رکعتیں ہیں۔[1] کسی نے کہا: صبح کی سنت ہے۔ جمہور نے ﴿ إِدْبَارَ ﴾ بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے بنا بر مصدر اور سالم بن ابی الجعد وغیرہ، (یعنی محمد بن سمیفع یعقوب اور منہال بن عمرو نے) بہ فتح ہمزہ پڑھا ہے بنا بر جمع "أَيْ: أَعْقَابَ النُّجُوْمِ وَأَدْبَارَهَا إِذَا غَرَبَتْ"۔[2] "دَبْرُ أَمْرٍ" بہ معنی "آخِرُ أَمْرٍ" ہے اس کا بیان سورت "قٓ" میں گزر چکا ہے۔[3] (كذا في فتح البيان مع التوضيح)

الحمد لله والمنة کہ اس سورۂ مبارکہ کی تفسیر روز چہار شنبہ (بدھ) ماہ ذی حجہ عشیہ روز عرفہ ۱۳۱۴ ہجری کو تمام ہوئی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے۔ اللهم اغفرلنا و تب علينا و وفقنا و تجاوز عنا وأحسن عواقبنا في الأمور كلها وقونا في رضاك وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة، وصلى الله علىٰ نبينا محمد وعلىٰ آله وصحبه إلى يوم الدين آمين، والحمد لله أولًا وآخراً وظاهراً وباطنا، سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم.

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٤٩٠-٤٩٢) [2] فتح القدير (٥/١٣٦) [3] فتح البيان (١٣/٢٣٦-٢٣٩)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ النَّجْمِ

اس سورت مبارکہ کی اکسٹھ (۶۱) یا باسٹھ (۶۲) آیتیں ہیں، جمہور کے قول میں ساری سورت مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورت ﴿ اَلنَّجْمِ ﴾ مکہ میں نازل ہوئی۔ اسی طرح عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[1] (أخرجهما ابن مردويه)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے، سوائے ایک آیت کے اور وہ یہ ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴾ [النجم: ۳۲][2] کسی نے کہا ہے کہ ساری سورت مدنی ہے، لیکن صحیح قول پہلا ہے۔

سورۃ النجم وہ پہلی سورت ہے جس میں سجدۂ تلاوت ہے:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پہلی سورت جو نازل کی گئی جس میں سجدہ ہے وہ ﴿ وَالنَّجْمِ ﴾ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور سب لوگوں نے سجدہ کیا سوائے ایک مرد کے۔ میں نے اسے دیکھا کہ اس نے مٹھی بھر مٹی لی پھر اس پر سجدہ کیا۔ چنانچہ میں نے اس کو اس کے بعد دیکھا کہ وہ کافر مارا گیا۔ یہ شخص اُمیہ بن خلف ہے۔[3] (أخرجه البخاري و مسلم وغيرهما)۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسے اپنی صحیح میں کئی جگہ روایت کیا ہے، نیز امام مسلم، ابو داود اور نسائی رحمہم اللہ نے کئی طرق سے ابو اسحاق سے روایت کیا ہے۔ ''المتنع'' میں ان کے اس قول پر اشکال ہے کہ وہ شخص امیہ بن خلف ہے۔ اس کے علاوہ طرق سے مروی ہے کہ وہ شخص عتبہ بن ربیعہ ہے۔[4] انتھٰی.

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ پہلی سورت جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ آپ اس کو پڑھتے ہوں ﴿ وَالنَّجْمِ ﴾ ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو نماز پڑھائی تو آپ نے سورۃ النجم پڑھی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ سجدہ کیا اور سجدہ دراز کیا۔[6] (أخرجه ابن مردويه والبيهقي في سننه)

---

[1] الدر المنثور (۶۳۹/۷) [2] تفسير القرطبي (۸۲/۱۷) [3] صحيح البخاري (۴۵۸۲) صحيح مسلم (۵۷۶)

[4] تفسير ابن كثير (۳۱۳/۴) [5] الدر المنثور (۶۳۹/۷) [6] سنن البيهقي الكبرىٰ (۱۸۲/۳)

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت نجم پڑھی، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے کو پہنچے تو اس میں سجدہ کیا۔[1] سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سورت نجم پڑھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سجدہ نہیں کیا۔[2] (أخرجه أحمد والبخاري ومسلم وأبو داود والترمذي والنسائي والطبراني والطيالسي وابن أبي شيبة وابن مردويه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورت نجم میں سجدہ کرتے تھے، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو اس کو چھوڑ دیا۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مفصل میں سے کسی شے میں سجدہ نہیں کیا جب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف اٹھ آئے۔[3] (أخرجهما ابن مردويه)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝۱ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝۲ وَمَا
يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
قسم ہے ستارے کی جب وہ گرتا ہے ① تمھارا ساتھی نہیں بہکا اور نہ وہ بھٹکا ہے ② اور وہ (اپنی) خواہش سے نہیں بولتا ③ وحی ہی تو ہے جو (اس کی طرف) بھیجی جاتی ہے ④

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برحق ہونے پر اللہ عزوجل کا قسم کھانا:

امام شعبی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ خالق اپنی مخلوق میں سے جس کی چاہے قسم کھائے اور مخلوق کو لائق نہیں ہے کہ وہ خالق کے سوا کسی اور کی قسم کھائے۔ (رواه ابن أبي حاتم)۔ مفسروں نے ﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى﴾ کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''نجم'' سے مراد ثریا ہے جبکہ وہ فجر کے ساتھ گرے۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سفیان ثوری رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ کا زعم یہ ہے کہ وہ زہرہ ہے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''إِذَا رُمِيَ بِهِ الشَّيَاطِينُ'' یعنی قسم ہے تارے کی جبکہ اس سے شیطان پھینک مار کیے جائیں۔ اس قول کو ایک قسم کا اتجاہ ہے۔ امام اعمش رحمہ اللہ کی روایت مجاہد رحمہ اللہ سے یہ ہے کہ قسم ہے قرآن کی جبکہ نازل ہو۔[4]

① الدر المنثور (٦٤٠/٧)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٢٢) صحيح مسلم (٥٧٧) مسند أحمد (١٨٢/٥) سنن أبي داود (١٤٠٤) سنن الترمذي (٥٧٦) سنن النسائي (٩٦٠)

③ الدر المنثور (٦٤٠/٧)

④ تفسير الطبري (٤٩٥/٢٢-٤٩٧) تفسير ابن كثير (٣١٣/٤)

یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ﴿75﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِيۡمٌ ﴿76﴾ اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ ﴿77﴾ فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍ ﴿78﴾ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ ﴿79﴾ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴾ [الواقعة: ۷۵۔ ۸۰] ''پس میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کی اور اگر تمھیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے کہ بے شک یہ قرآن بہت بڑی عزت والا ہے جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے، جسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ یہ رب العالمین کی طرف سے اترا ہوا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمۡ وَمَا غَوٰى ﴾۔ یہ وہی بات ہے جس پر قسم کھائی گئی ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے اس بات کی گواہی ہے کہ آپ نیکوکار، راہ یاب اور حق کے پیرو ہیں۔ ضال نہیں ہیں۔ ضال وہ جاہل ہے جو بغیر علم کے غیر راہ پر چلتا ہے۔ اور غاوی وہ ہے جو حق کا عالم ہے اور اس سے ارادتاً، یعنی جان بوجھ کر دوسری طرف مائل ہونے والا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اور اپنی شریعت کی پاکیزگی بیان فرمائی کہ وہ گمراہ لوگوں مثلاً نصاریٰ کی مشابہت سے اور یہود کے طریقے سے اور کسی چیز کا علم ہونے کے بعد اس کے چھپانے سے اور اس کے برخلاف عمل کرنے سے ہر طرح سے پاک ہیں۔ بلکہ نبی اکرم ﷺ اور وہ عظیم شریعت جس کو دے کر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہے انتہائی درجے کی استقامت اور اعتدال پر اور اچھے اور راستی کے طریقے پر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ خواہشِ نفس سے گفتگو نہیں کرتے:

اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ﴾ یعنی وہ کوئی بات ہویٰ (خواہشِ نفس) اور اپنی غرض سے نہیں کہتا۔ ﴿ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى ﴾ وہ تو وہی بات کہتا ہے جس کا اس کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کو لوگوں کی طرف کامل طریقے سے بغیر زیادتی و کمی کے پہنچا دے، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ فرماتے تھے: البتہ جنت میں ایک شخص نبی کے علاوہ کسی شخص کی شفاعت سے داخل ہو گا، ان دو قبیلوں کی طرح، یا ان دو قبیلوں ربیعہ اور مضر میں سے ایک کی طرح تو ایک شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا ربیعہ مضر سے نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّمَا أَقُولُ مَا أَقُولُ» یعنی میں جو کہتا ہوں وہی ہے جو کہتا ہوں۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: میں ہر شے جس کو رسول اللہ ﷺ سے سنتا تھا اس کی حفاظت کے ارادے سے اس کو لکھ لیا کرتا تھا۔ قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ تو رسول اللہ ﷺ سے ہر شے جس کو تو سنتا ہے لکھ لیتا ہے اور رسول اللہ ﷺ ایک بشر ہیں اور غضب میں کلام کرتے ہیں، یعنی غصے کی حالت میں کلام کرتے ہیں (اصل روایت میں اسی طرح ہے، لیکن مسند امام احمد رحمہ اللہ کی روایت میں یہ ہے: "في الغضب والرضا")۔

[1] مسند أحمد (۲۵۷/۵) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۱۷۸)

اس لیے میں نے لکھنا چھوڑ دیا، پھر میں نے آپ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: لکھ پس قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! نہیں نکلا میری زبان سے مگر حق۔ [1] (ورواه أبو داود عن مسدد وأبي بكر بن أبي شيبة كلاهما عن يحيى بن سعيد القطان به)

حافظ ابو بکر بزار رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس شے کے بارے میں، میں نے تم کو خبر دی کہ وہ اللہ کے پاس سے ہے تو وہ وہی ہے جس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے۔ پھر امام بزار رحمہ اللہ نے کہا: ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں۔ [2] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں کہتا ہوں میں مگر حق۔ آپ کے بعض اصحاب نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ سے ہم مداعبہ (مزاحیہ کلام) کرتے ہیں، فرمایا: بے شک میں نہیں کہتا ہوں مگر حق۔ [3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

"نجم" بمعنی کوکب ہے، یعنی تارا۔ اس کا نام اس کے طلوع ہونے کے سبب سے نجم رکھا گیا۔ ہر طلوع ہونے والا نجم ہے جس وقت دانت، روئیدگی اور سینگ نکلتا ہے تو عرب کی بول چال میں کہتے ہیں: "نَجَمَ السِّنُّ وَالنَّبَتُ وَالْقَرْنُ"۔ یہاں اس میں کئی قول ہیں:

پہلا یہ ہے کہ الف و لام جنسی ہے اور اس سے مراد نجوم کی جنس ہے، یعنی آسمان کے سارے تارے جبکہ وہ غروب ہوتے ہیں۔ اللہ پاک نے تاروں کی قسم کھائی، جبکہ وہ غائب ہوں۔ یہ بات اس سے مانع نہیں کہ نجوم کو لفظ واحد کے ساتھ تعبیر کیا جائے اور اس کے معنی جمع ہوں۔ مفسروں کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے۔ دیکھو عمر بن ربیعہ کا قول اسی باب سے ہے:

أَحْسَنُ النَّجْمِ فِي السَّمَاءِ الثُّرَيَّا　　وَالثُّرَيَّا فِي الْأَرْضِ زَيْنُ النِّسَاءِ

یعنی آسمان میں سب تاروں سے زیادہ حسین تارا ثریا ہے اور محبوبہ ثریا نام زمین میں عورتوں کی زینت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ اَلنَّجْمِ ﴾ سے مراد ثریا ہے۔ یہ ایک اسم ہے جو ثریا کے معنی پر غالب ہو گیا ہے۔ عرب لوگ ﴿ اَلنَّجْمِ ﴾ بولتے ہیں اور اس سے ثریا مراد لیتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہما اسی کے قائل ہیں اگرچہ ثریا گنتی میں کئی تارے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سات تارے ہیں، چھ تو ظاہر ہیں اور ایک خفی ہے۔ لوگ اس سے اپنی نگاہوں کا امتحان کرتے ہیں۔ [4] قاضی عیاض رحمہ اللہ نے شفاء میں کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ثریا میں گیارہ تارے دیکھتے تھے۔ [5]

---

(1) مسند أحمد (١٦٢/٢) سنن أبي داود (٣٦٤٦) السلسلة الصحيحة (١٥٣٢) (2) كشف الأستار عن زوائد البزار (١١٢/١)

(3) مسند أحمد (٣٤٠/٢) تفسير ابن كثير (٣١٣/٤، ٣١٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٢٦)

(4) تفسير القرطبي (٨٣/١٧) (5) الشفاء (٦٨/١)

تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿ اَلنَّجْمِ ﴾ سے مراد "الشِّعْرٰی" ہے اس لیے کہ اس آیت میں اس کا ذکر ہے ﴿ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی ﴾ [النجم: ٤٩] "اور یقیناً وہی شِعریٰ (ستارے) کا رب ہے۔"

چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد زہرہ ہے، اس لیے کہ عرب کی ایک قوم اسے پوجا کرتی تھی۔ یہ قول امام سدی رحمہ اللہ کا ہے۔

پانچواں قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ روئیدگی ہے جس کا تنا نہیں ہوتا، جیسے: کدو وغیرہ کی بیل۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ﴾ [الرحمن: ٦] "اور ستارے اور درخت دونوں سجدہ کرتے ہیں۔" یہ قول امام اخفش رحمہ اللہ کا ہے۔

چھٹا قول یہ ہے کہ اس سے مراد جنابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

ساتواں قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن شریف ہے، اس کا نام نجم اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ منجم ومفرق نازل کیا گیا ہے۔ عرب لوگ تفریق کا نام تنجیم اور مفرق کا نام منجم رکھتے ہیں۔ امام مجاہد اور فراء رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ اَلنَّجْمِ ﴾ سے مراد تارے ہیں جبکہ قیامت کے دن گریں گے۔[1] یہ آٹھواں قول ہوا۔

کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ تارے ہیں جن سے شیاطین کو شعلے مارے جاتے ہیں۔ یہ نواں قول ہوا۔

"هَوَى يَهْوِيْ هَوِيًّا بِالْفَتْحِ إِذَا سَقَطَ وَغَرَبَ وَهُوِيًّا بِالضَّمِّ إِذَا طَلَعَ وَصَعِدَ" یعنی ﴿ هَوٰى ﴾ بالفتح بہ معنی سقوط وغروب ہے اور بالضم بہ معنی طلوع وصعود ہے، فعل دونوں کا ایک ہے اختلاف جو ہے وہ مصدر میں ہے۔ بالجملہ یہ دونوں معنی اول کی چار قراءتوں کی بنا پر ٹھیک ہو سکتے ہیں، یعنی قسم ہے تاروں کی جبکہ وہ اوپر کی جانب سے نیچے کی طرف گریں، یا غروب ہوں، یا جبکہ طلوع ہوں۔ یا قسم ہے ثریا کی جب وہ ساقط ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "إِذَا أَنْصَبَ"، یعنی جب کہ وہ گرے۔[2] (رواه ابن جرير عنه)

یا جبکہ وہ طلوع ہو۔ یا قسم ہے شعریٰ کی جبکہ وہ غروب ہو یا طلوع ہو۔ یا قسم ہے زہرہ کی جب وہ غروب ہو یا طلوع ہو۔ تارے کی قسم کو جو سقوط وغروب یا طلوع کے وقت کے ساتھ مقید کیا گیا تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ جس وقت تارہ وسطِ آسمان میں ہوتا ہے تو اس کا فائدہ تھوڑا ہوتا ہے، اس لیے کہ چلنے والا اس سے راہ نہیں پاتا، کیوں کہ اس وقت نہ مشرق کی تمیز ہو سکتی ہے نہ مغرب کی، نہ جنوب کی نہ شمال کی۔ اس کے برعکس جب وہ آسمان کے وسط میں نہیں ہوتا اس طرح سے کہ مشرق کی جانب ہوتا ہے یا مغرب کی جانب تو اس وقت اس سے مشرق کی جانب مغرب سے متمیز ہوتی ہے اور جنوب کی جانب شمال سے متمیز ہوتی ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (٨٣/١٧) فتح القدير (١٣٨/٥) [2] تفسير الطبري (٤٩٥/٢٢)

اب رہا پانچواں قول تو اس میں ﴿ هَوٰى ﴾ کے دونوں معنی بنتے ہیں، یعنی قسم ہے نبات کی، جبکہ وہ زمین پر ساقط ہو یا بڑھے اور بلند ہو۔ چھٹے قول کی بنا پر یہ معنی ہیں: قسم ہے محمد ﷺ کی جبکہ وہ نازل ہو یا چڑھے۔ یہ نازل ہونا اور چڑھنا شبِ معراج کا ہوگا۔ ساتویں قول کی بنا پر یہ معنی ہیں: قسم ہے قرآن کی جبکہ وہ نازل ہو۔ آٹھویں قول کی بنا پر یہ معنی ہیں: قسم ہے تاروں کی جبکہ وہ قیامت کے دن جھڑ پڑیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴾ [الانفطار: ۲] ''اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔'' نویں قول کی بنا پر یہ معنی ہیں: قسم ہے تاروں کی جب وہ ٹوٹ پڑیں شیاطین کو مارنے کے لیے۔ ان تینوں قولوں کی بنا پر ﴿ هَوٰى ﴾ ماخوذ ہوگا ''هَوِيٌّ'' بہ فتحِ ''الهاء'' سے۔ کلمۂ ﴿ اِذَا ﴾ کے عامل میں کئی وجہیں ہیں اور ہر وجہ پر اشکال وارد ہوتا ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ فعلِ قسم محذوف اس کا ناصب ہے: ''أَيْ: أُقْسِمُ بِالنَّجْمِ وَقْتَ هَوِيِّهِ''۔ یہ قول امام ابو البقاء رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔[1]

بالجملہ ﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴾ قسم کا جواب ہے۔ قریش نے کہا تھا کہ محمد ﷺ ضال وغاوی (گمراہ اور کج رو) ہیں۔ نعوذ باللّٰه منه. اس پر اللہ پاک نے قسم کھا کر فرمایا کہ وہ نہ ضال ہے نہ غاوی ہے اس لیے کہ جس ذات کی یہ قدرت ہے کہ اس نے آسمان پر تارے بنائے جس سے لوگ رات کو راہ پاتے ہیں بھلا مخلوق کو راہ پر لانے کے لیے اسی کی طرف سے مامور اور بھیجا ہوا، کیوں کر بے راہ ہوسکتا ہے بلکہ وہ تو حق کی سیدھی راہ پر ہے اور اپنے رب کے حکم سے لوگوں کو سیدھی راہ بتاتا ہے۔

اکثر مفسر اس طرف گئے ہیں کہ ضلال وغی ایک ہیں تو اس بنا پر ﴿ وَمَا غَوٰى ﴾ کا عطف اس باب سے ہوگا کہ باوجود اتحادِ معنی کے مخالف لفظ کے ساتھ تاکید کی گئی۔ بعض نے یوں فرق کیا ہے کہ ﴿ مَا ضَلَّ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ صراطِ مستقیم سے مائل نہیں ہوئے اور ﴿ مَا غَوٰى ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ کسی باطل کا اعتقاد نہیں کیا۔ قاضی صاحب مرحوم کا یہی قول ہے۔[2] اس فرق کا حاصل یہ ہے کہ غوایت تو اعتقاد میں خطا ہے خصوصاً اور ضلال اس سے عام تر ہے جس میں افعال واقوال وعقائد کی خطا شامل ہے۔

پس ضلال اس طریقِ مستقیم سے مائل ہونا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے بیان کیا ہے، وہ مائل ہونا خواہ افعال سے ہو یا اقوال سے یا عقائد سے یا اخلاق سے۔ اور غوایۃ عقائد میں طریقِ مستقیم سے مائل ہونا ہے۔ تو اب ﴿ وَمَا غَوٰى ﴾ تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہوگا۔ اس سے نفیِ خاص کا مزید اہتمام کرنا منظور ہے۔

مراد اس بات کی نفی ہے جو قریش نے آپ ﷺ کی طرف منسوب کی تھی کہ آپ ہر لحاظ سے اعتقاد اور عمل میں صحیح راستے سے ہٹے ہیں، چنانچہ جو بات انھوں نے آپ ﷺ سے کہی تھی، خود اللہ پاک نے اس کے جواب کا ذمہ

[1] التبيان في إعراب القرآن (۱۱۸۶/۲) [2] تفسير البيضاوي (۲۵۲/۵)

لیا اور فرمایا: ﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴾ [النجم: ٢]، ﴿ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴾ [التكوير: ٢٢]، ﴿ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ﴾ [الحاقة: ٤١]، ﴿ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ﴾ [الحاقة: ٤٢].

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴾ اور باقی انبیاء علیہم السلام خود اپنی طرف سے جواب دیتے تھے، دیکھو جب قومِ نوح علیہ السلام نے ان سے کہا: ﴿ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأعراف: ٦٠] ''ہم تم کو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں۔'' تو خود انھوں نے جواب دیا: ﴿ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ ﴾ [الأعراف: ٦١] ''اے میری قوم! مجھ سے تو ذرا بھی گمراہی نہیں۔'' عاد نے جب ہود علیہ السلام سے کہا: ﴿ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأعراف: ٦٠] ''ہم تم کو کم عقلی میں دیکھتے ہیں۔'' تو انھوں نے کہا: ﴿ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ ﴾ [الأعراف: ٦٧] ''اے میری قوم! مجھ سے ذرا بھی کم عقلی نہیں ہے۔'' اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے خود جواب دیا۔ (كذا أفاده اليشخ رحمہ اللہ)

کسی نے یوں فرق کیا ہے کہ ضلال کے معنی ہیں مخالفت، تو بات اس طرف رجوع ہو گی کہ ضلال فعلِ معاصی ہے، پس اب اس کے اور غی کے درمیان فرق مکمل طور پر ایک دوسرے سے دوری ہو گا، کیوں کہ ضلال تو فعلِ معاصی ہے اور غی جہلِ مرکب ہے، یعنی جو جہل اعتقادِ فاسد سے پیدا ہوا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جہل کبھی تو انسان کے غیر معتقد ہونے سے ہوتا ہے کہ اس کو نہ صالح کا اعتقاد ہوتا ہے نہ فاسد کا اور کبھی شے فاسد کے اعتقاد سے ہوتا ہے، اس دوسرے جہل کو غی کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ غی بہ معنی خیبت ہے۔ یعنی خائب نہیں ہوئے اس شے میں جو طلب کی۔ (ومنه قول الشاعر:

فمن يلق خيرا يحمد النّاس أمره ومن يغو لا يعدم على الغي لائما

''أَيْ: مَنْ يَّخِيبُ'') ﴿ صَاحِبُكُمْ ﴾ کا خطاب قریش کو ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ آپ کی حقیقتِ حال پر مطلع تھے، یعنی تمھارا مصاحب، ساتھی اور ہم صحبت جس کے صدق، راستی، امانت اور دیانت کو تم خوب جانتے ہو، وہ ضال و غاوی نہیں ہے۔ یا یوں کہو کہ صحبت قریش کو آپ کے حق میں رغبت دینے والی ہے اور اُن کو آپ کی طرف متوجہ کرنے والی ہے اور قبیح کرنے والی ہے ان پر آپ کے اتہام کو آپ کے انذار میں، حالاں کہ وہ آپ کی طہارت اور شمائل و نزاہتِ خصائل کو جانتے پہچانتے ہیں۔

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴾ کلمۂ ﴿ عَنِ ﴾ اپنے معنی مجاوزت پر ہے مع ایک نوع تضمین کے، یعنی اس کا نطق اپنی خواہش سے صادر نہیں ہوتا نہ تو قرآن کے ساتھ اور نہ غیر قرآن کے ساتھ اور مثل نطق کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ عَنِ ﴾ بہ معنی ''باء'' ہے۔ ''أَيْ: بِالْهَوَى'' یعنی خواہشِ نفس کے ساتھ نہیں بولتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن کے ساتھ نہیں بولتا اپنی خواہش سے۔[1] بھلا جس شخص کا یہ حال ہے وہ کیونکر ضال اور غاوی ہو سکتا ہے۔

[1] تفسير القرطبي (٨٥/١٧)

نکتہ:

پہلے اللہ پاک نے ﴿ مَا ضَلَّ ﴾، ﴿ وَمَا غَوٰى ﴾ بہ صیغۂ ماضی فرمایا، پھر ﴿ وَمَا يَنْطِقُ ﴾ بہ صیغۂ مستقبل کیا۔ یہ اس لیے کہ قبل بعث کے اور اس کے بعد آپ کا حال بیان کرنا منظور ہے، یعنی وہ کبھی ضال اور غاوی نہیں ہوا، جبکہ تم سے اور تمھارے معبودوں سے اپنی نبوت سے پہلے کنارہ کیا اور اب جبکہ تم پر وہ اپنے رب کی آیتیں پڑھتا ہے تو اپنی ہوا (خواہش) سے نہیں بولتا۔

﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ یعنی نہیں ہے وہ قرآن جس کے ساتھ وہ کلام کرتا ہے اور اس کے کل احوال واقوال وافعال مگر ایک وحی ہے اللہ کی طرف سے جس کی وہ اس کی طرف وحی کرتا ہے۔ ﴿ يُوْحٰى ﴾ صفت ہے وحی کی، اس سے استمرار تجددی ظاہر ہوتا ہے، یعنی ایسی وحی جو مستمر ومتجدد کی جا رہی ہے اور کسی اشارے وکنائے کی نفی کرتی ہے، یعنی وہ حقیقتاً وحی ہے نہ صرف اس وجہ سے کہ اس کا نام وحی رکھ دیا گیا ہے، جیسے: تم بولتے ہو: "هٰذَا قَوْلٌ يُقَالُ" کسی نے کہا ہے کہ تقدیر "يُوْحَى إِلَيْهِ" ہے، چنانچہ اس میں مزید فائدہ ہے۔ آیت اس پر دلیل ہے کہ سنتِ مطہرہ ﴿ وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ ہے۔ (كما في فتح البيان)[1]

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ
الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ
اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ
مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً
اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝
اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝
لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

اسے مضبوط قوتوں والے (جبریل) نے سکھایا⑤ جو نہایت طاقتور ہے، سو وہ (اپنی اصلی صورت میں) سیدھا کھڑا ہو گیا⑥ جبکہ وہ (آسمان کے) بلند کنارے پر تھا⑦ پھر وہ قریب ہوا اور اتر آیا⑧ تو وہ دو کمانوں جتنا بلکہ اس سے بھی قریب ہو گیا⑨ پھر اس نے اللہ کے بندے کی طرف وحی کی جو وحی کی⑩ اس (رسول) نے جو کچھ دیکھا، اس کے دل نے (اس کے متعلق)

[1] فتح البيان (١٣/٢٤٣_٢٤٥)

جھوٹ نہیں بولا⑪ کیا پھر تم اس چیز پر اس (نبی) سے جھگڑتے ہو جو وہ دیکھتا ہے⑫ اور البتہ تحقیق اس (رسول) نے اس (جبریل) کو ایک بار اور بھی اُترتے دیکھا⑬ سدرۃ المنتہیٰ (آخری حد کی بیری) کے قریب⑭ اس کے نزدیک ہی جنت الماویٰ ہے⑮ اس وقت بیری پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا⑯ نگاہ نہ تو بہکی اور نہ حد سے بڑھی⑰ البتہ تحقیق اس (رسول) نے اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں⑱

جبریل امین علیہ السلام معلم رسولِ امین صلی اللہ علیہ وسلم:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے شروع میں جبرائیل علیہ السلام اپنی اصل صورت میں نظر آئے، وہ ایک کرسی پر بیٹھے تھے، آسمان ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ان سے بھر گیا تھا، یہ دیکھ کر گھبرائے تو سورۃ المدثر اتری۔ جبرائیل علیہ السلام کی صفتیں ﴿ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ﴾ سورۃ التکویر میں بیان کی ہیں۔ دوسری دفعہ جبرائیل علیہ السلام کو اپنی صورت میں معراج کی رات میں سات آسمانوں کے اوپر دیکھا، جہاں بیری کا درخت ہے وہ نیچے والوں اور اوپر والوں کے لیے حد ہے۔ نیچے والے لوگ اوپر نہیں جا سکتے اور اوپر والے نیچے نہیں اتر سکتے۔ اسی کے پاس بہشت کو دیکھا اور اس بیری پر سنہری پروانے چھا رہے تھے ایسے خوبصورت رنگ والے کہ جسے دیکھ کر دل کھنچا جائے اور جو نمونے دیکھے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ انتہیٰ۔

اللہ پاک اپنے بندے اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ جس شے کو وہ لے کر لوگوں کی طرف آئے ہیں، وہ ان کو سخت قوتوں والے نے سکھائی ہے۔ وہ جبرائیل علیہ السلام ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴾ [التكوير: ١٩- ٢١] ''یقیناً یہ ایک بزرگ رسول کا کہا ہوا ہے، جو قوت والا ہے عرش والے (اللہ) کے نزدیک بلند مرتبہ ہے، جس کی (آسمانوں میں) اطاعت کی جاتی ہے جو امین ہے۔'' نیز یہاں فرمایا: ﴿ ذُوْ مِرَّةٍ ﴾ "أَيْ: ذِيْ قُوَّةٍ"۔ یہ قول امام مجاہد، حسن اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "ذُوْ مَنْظَرٍ حَسَنٍ وَقُوَّةٍ شَدِيْدَةٍ" [1] یعنی خوبصورت سخت قوت والا۔

بروایت سیدنا عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم حدیثِ صحیح میں وارد ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ » [2] ''غنی اور صاحبِ قوت تندرست کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے۔'' ﴿ فَاسْتَوٰى ﴾ یعنی

① تفسير الطبري (٢٢/٤٩٩)

② سنن أبي داود (١٦٣٤) سنن الترمذي (٥٥٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٣٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٥١)

جبرائیل علیہ السلام۔ یہ قول حسن ومجاہد وقتادہ وربیع بن انس رحمہم اللہ کا ہے۔[1] ﴿ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى ﴾ یعنی جبرائیل علیہ السلام مستوی ہوئے، یعنی افقِ اعلیٰ میں سیدھے بیٹھے۔ یہ قول امام عکرمہ اور کئی ایک اہلِ علم کا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ افقِ اعلیٰ وہ ہے جس سے صبح آتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلعِ شمس ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہے جس سے دن آتا ہے۔ اسی طرح امام ابن زید رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی کہا۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں نہیں دیکھا مگر دو بار۔ ایک بار تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سوال کیا کہ ان کو ان کی اصل صورت میں دیکھیں تو انھوں نے افق کو بند کر دیا، یعنی آسمان کے کنارے کو اپنے جسم سے چھپا لیا اور دوسری بار آپ اُن کے ساتھ تھے، جب کہ آپ چڑھے، چنانچہ وہ اللہ کا یہ قول ہے: ﴿ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى ﴾[3] (أخرجه ابن أبي حاتم)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس جگہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک قول کہا ہے کہ میں نے اس کو نہیں دیکھا واسطے ان کے غیر کے اور نہ انھوں نے اس کو کسی سے نقل کیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اس طرف گئے ہیں کہ معنی یہ ہیں کہ ﴿ فَاسْتَوٰى ﴾ یعنی مستوی ہوا یہ ﴿ شَدِيْدُ الْقُوٰى ﴾ ﴿ ذُوْ مِرَّةٍ ﴾ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم افقِ اعلیٰ میں، یعنی دونوں اکٹھے افقِ اعلیٰ میں مستوی ہوئے اور یہ شبِ معراج میں ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے اور اس پر کسی نے اُن کی موافقت نہیں کی۔ پھر جو بات کہی: من حیث العربیة اس کی توجیہ کرنا شروع کیا تو کہا کہ یہ قول اس آیت کی طرح ہے: ﴿ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ ﴾ [النمل: ٦٧] ''کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے باپ دادا بھی۔'' چنانچہ آباء کا عطف کیا ہے ضمیرِ مستتر پر جو ﴿ كُنَّا ﴾ میں ہے بغیر اظہار ''نَحْنُ'' کے، چنانچہ اسی طرح ﴿ فَاسْتَوٰى ﴾ ﴿ وَهُوَ ﴾ ہے۔ کہا اور امام فراء رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ بعض عرب نے اس کو یہ شعر سنایا:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ النَّبْعَ يَصْلُبُ عُوْدُهُ   وَلَا يَسْتَوِيْ وَالْخِرْوَعُ الْمُتَقَصِّفُ[4]

(دیکھو یہاں ''والخروع'' کا عطف ''یستوي'' کی ضمیر مستتر پر ہے بغیر تاکید منفصل کے۔ ''نبع'' بہ فتحِ نون وسکونِ یاء ایک درخت ہے جس سے کمان بناتے ہیں اور اس کی ٹہنیوں سے تیر بنتا ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا درخت نبع کو کہ اس کی لکڑی سخت ہوتی ہے اور برابر نہیں ہوتا ہے نبع اور بید انجیر شکستہ ہونے والا ارنڈ کی لکڑی نہایت کمزور ہوتی ہے)۔

یہ بات جو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہی عربیت کے لحاظ سے تو متجہ ہے، لیکن معنی اس پر اس کی مساعدت نہیں

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٤٩٨، ٤٩٩) [2] تفسير الطبري (٢٢/٥٠١) تفسير ابن كثير (٤/٣١٤)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣١٨) اس کی سند میں ''اسحاق بن ابی الکھتلہ'' مجہول راوی ہے اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے میں صیغۂ شک استعمال ہوا ہے۔

[4] تفسير الطبري (٢٢/٥٠٠)

کرتے، کیوں کہ یہ جبرائیل علیہ السلام کو دیکھنا شبِ معراج میں نہ تھا، بلکہ اس سے پہلے تھا اور رسول اللہ ﷺ زمین میں تھے، چنانچہ جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ پر اترے اور آپ ﷺ کی طرف لٹک آئے، پھر آپ ﷺ سے قریب ہوئے اور وہ اس صورت پر تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے، ان کے چھے سو پر تھے۔ پھر انھوں نے ان کو اس کے بعد شبِ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ایک دوسری حالت میں دیکھا۔ اور یہ پہلا دیکھنا نبوت کے لیے مبعوث ہونے کے شروع میں تھا جب جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس پہلی بار آئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طرف سورت اقراء کے شروع کی وحی کی، پھر وحی سست پڑ گئی۔

اس فترت کی مدت (جب وحی رکی ہوئی تھی) میں نبی ﷺ کئی بار پہاڑوں کی چوٹیوں پر گئے، تاکہ فترت کے رنج سے گر پڑیں، مگر جب کبھی آپ اس کا ارادہ کرتے تو جبریل علیہ السلام آپ کو ہوا سے پکارتے: اے محمد! تو اللہ کا سچا رسول ہے اور میں جبریل ہوں تو اس سے آپ ﷺ کا دل چین پکڑتا اور آپ کی آنکھ ٹھنڈی ہوتی اور جب کبھی آپ ﷺ پر طولِ امر ہوتا، یعنی زیادہ وقت گزر جاتا تو ایسا ہی پھر کرتے تھے، یہاں تک کہ جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے لیے ظاہر ہوئے اور آپ ﷺ ابطح میں تھے (ابطح مکہ سے کچھ دور ایک سنگستان کا نام ہے) اپنی اس صورت میں جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے، ان کے چھے سو پر تھے جن سے اُفق چھپ گیا تھا، پھر وہ آپ ﷺ کے قریب ہوئے اور آپ ﷺ کی طرف اللہ عزوجل کی طرف سے اس شے کی وحی کی جس کا اس نے ان کو امر کیا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ نے اس فرشتے کی عظمت کو جان لیا اور اپنے خالق کے نزدیک اس کی جلالت اور بلند مرتبہ کو پہچان لیا جو آپ ﷺ کے پاس اس کی رسالت لایا تھا جس نے اس کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا تھا۔[1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک جبریل علیہ السلام آئے اور میرے دونوں شانوں کے درمیان مکا مارا، پھر میں ایک درخت کے پاس کھڑا ہوا جس میں پرندوں کے دو گھونسلے جیسے گھونسلے تھے، اُن میں سے ایک میں تو وہ بیٹھے اور دوسرے میں مَیں بیٹھا، پھر وہ درخت بلند ہوا اور اونچا ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس نے مشرق و مغرب کو بند کر دیا اور میں اپنی آنکھ کو لوٹتا پوٹتا تھا اور اگر میں یہ چاہتا کہ میں آسمان کو چھو لوں تو البتہ میں اسے چھو لیتا، پھر میں نے جبریل علیہ السلام کی طرف توجہ کی، گویا وہ ایک حِلس لاطی ہیں (حلس بالکسر بہ معنی گلیم سطیر ہے، یعنی خوف اور خشیتِ الٰہی کے مارے وہ اس سے پست ہو گئے، جیسے: کمل زمین سے چپکا ہوا ہوتا ہے)۔ چنانچہ میں نے اللہ کے علم کی وجہ سے ان پر جو فضل تھا اس کو پہچان لیا اور میرے لیے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھولا گیا اور میں نے نورِ اعظم دیکھا اور یہ دیکھا کہ پردے کے پیچھے سے موتیوں اور یاقوت کی جنبش

[1] تفسیر ابن کثیر (٣١٤/٤، ٣١٥)

تھی اور میری طرف وحی کیا گیا جو کچھ اللہ نے چاہا کہ وحی کیا جائے۔ ① (رواه الحافظ أبو بكر البزار في مسند ثم قال: لا يرويه إلا الحارث بن عبيد (عن أبي عمران الجوفي عن أنس رضی اللہ عنہ) وكان رجلا مشهورا من أهل البصرة)۔ (**حافظ ابن کثیر** کہتے ہیں: "الحارث بن عبيد هذا هو أبو قدامة الإيادي أخرج له مسلم في صحيحه إلا أن ابن معين ضعفه وقال: ليس هو بشيء وقال الإمام أحمد: مضطرب الحديث. وقال أبو حاتم الرازي: يكتب حديثه ولا يحتج به، وقال ابن حبان: كثر وهمه فلا يجوز الاحتجاج به إذا انفرد فهذا الحديث من غرائب روايته فإن فيه نكارة وغرابة ألفاظ وسياقا عجيبا ولعله منام والله أعلم")۔ ②

سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو ان کی صورت میں دیکھا اور اُن کے چھے سو پَر تھے، ان میں سے ہر پر سے اُفق کو واقعی بند کر دیا تھا۔ اُن کے پَر میں سے وہ گونا گوں رنگ اور موتی اور یاقوت گرتے تھے جس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ ③ (رواه الإمام أحمد وانفرد به) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے سوال کیا کہ ان کو ان کی اصل صورت میں دیکھیں تو انھوں نے کہا کہ تو اپنے رب سے دعا کر، چنانچہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا تو بے ہوش ہو گئے، پھر جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باچھ سے تھوک پونچھا۔ ④ (رواه الإمام أحمد وتفرد به وقد رواه ابن عساكر عن هناد ابن الأسود في ترجمة عتبة بن أبي لهب من طريق محمد بن إسحاق عن عثمان بن عروة بن الزبير عن أبيه عن هبار ... الخ)

ہبار رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ابولہب اور اس کے بیٹے عتیبہ نے شام کے سفر کی تیاری کی تھی تو میں نے بھی اس کے ساتھ تیاری کی، پس اس کے بیٹے عتیبہ نے کہا: واللہ! البتہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاؤں گا اور اس کو رب سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں ایذا دوں گا پھر وہ چلا، یہاں تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: "يَا مُحَمَّدُ! هُوَ يَكْفُرُ بِالَّذِيْ دَنَا فَتَدَلّٰى، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى"، یعنی وہ شخص اس کا منکر ہے جس کی یہ صفت ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَللّٰهُمَّ ابْعَثْ عَلَيْهِ كَلْبًا مِنْ كِلَابِكَ"، یعنی اے اللہ! تو اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتا بھیج۔ پھر عتیبہ آپ کے پاس سے لوٹ آیا اور اپنے باپ کی طرف رجوع ہوا۔ چنانچہ ابولہب نے کہا: او بیٹے! تو نے اس سے کیا کہا؟ تو عتیبہ نے جو کہا تھا، وہ بتایا۔ پھر ابولہب نے کہا کہ اس نے تجھ سے کیا کہا؟ عتیبہ بولا کہ اس نے کہا: "اَللّٰهُمَّ سَلِّطْ عَلَيْهِ كَلْبًا مِنْ كِلَابِكَ"۔ ابولہب نے کہا: او بیٹے! واللہ! میں اس کی دعا سے تجھ پر خوف کھاتا ہوں۔ پھر ہم چلے یہاں تک کہ ابراہ میں اترے اور وہ سدّہ میں ہے (ابراہ شاید کوئی جگہ ہو اسی طرح سدہ بھی کسی جگہ کا نام، ہو یا

① مسند البزار (١٠/١٤) اس کی سند میں ''حارث بن عبید'' متکلم فیہ راوی ہے۔ ② تفسير ابن كثير (٣١٥/٤)

③ مسند أحمد (٣٩٥/١) اس کی سند میں ''شریک بن عبداللہ'' متکلم فیہ راوی ہے۔

④ مسند أحمد (٣٢٢/١) اس کی سند میں ''ادریس'' ضعیف راوی ہے۔

ماسدہ ہو یعنی شیروں کے رہنے کی جگہ۔ واللہ أعلم) اور ہم ایک راہب کے صومعہ (عبادت کی جگہ) میں اترے تو راہب نے کہا کہ اے عرب کے لوگو! تم کو اس شہر میں کس چیز نے اتارا ہے، یہاں تو شیر ایسے چرتے ہیں جیسے بکریاں چرتی ہیں۔ پس ابولہب نے ہم سے کہا کہ بے شک تم میرے بڑھاپے کو جان چکے ہو اور میرے حق کو بھی اور بے شک اس شخص نے واقعی میرے بیٹے پر ایک بد دعا کی ہے، واللہ! میں اس کے متعلق بہت خوف میں ہوں پس تم اپنا سامان اس صومعہ میں جمع کرو اور اس میں میرے بیٹے کے لیے بستر لگاؤ اور تم اس کے گرد اپنا بستر لگاؤ۔ پس ہم نے ایسا ہی کیا، پھر شیر آیا اور اس نے ہمارے چہرے سونگھے، پھر جب اس نے نہ پائی وہ شے جو چاہتا تھا تو پیچھے ہٹا اور سمٹا، پھر ایک جست لگائی تو ناگاہ وہ اس سامان کے اوپر تھا، پھر اس کا چہرہ سونگھا، ”ثُمَّ هَزَمَهُ هَزْمَةً فَفَسَخَ رَأْسَهُ“ یعنی پھر اس کو ایک جھٹکا دیا اور اس کا سر توڑ ڈالا۔ پس ابولہب بولا کہ میں واقعی پہچان گیا تھا کہ وہ محمد ﷺ کی دعا سے نہ چھوٹے گا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ﴾ یعنی پھر جبریل علیہ السلام محمد ﷺ کے قریب ہوئے جبکہ وہ زمین میں آپ ﷺ پر اترے، یہاں تک کہ اُن کے اور آپ ﷺ کے درمیان اتنا فاصلہ تھا جتنا دو کمان کے درمیان ہوتا ہے جب وہ دراز کی جائیں۔ یہ قول امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔[2] یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ”بعد ما بين وتر القوس إلى كبدها“ ہے، یعنی اتنا فاصلہ تھا جتنا کمان کی تانت میں اور اس کے وسط میں ہوتا ہے۔ واللہ أعلم.

﴿ أَوْ أَدْنَىٰ ﴾ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ صیغہ لغت میں مخبر عنہ کے اثبات کے لیے اور اس شے کی نفی کے لیے، جو اس پر زیادہ ہو، استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ﴾ [البقرۃ: ۷۴] ”پھر اس کے بعد تمھارے دل پتھر جیسے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔“ یعنی وہ دل پتھروں سے زیادہ نرم نہیں ہیں، بلکہ ان جیسے ہیں یا شدت وسختی میں ان سے زیادہ سخت ہیں۔ اسی طرح یہ آیت ہے: ﴿ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ﴾ [النساء: ۷۷] ”وہ لوگوں سے اس قدر ڈرنے لگے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ڈر ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔“ اور یہ آیت: ﴿ وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ ﴾ [الصافات: ۱۴۷] ”اور ہم نے انھیں ایک لاکھ بلکہ اور زیادہ آدمیوں کی طرف بھیجا۔“ یعنی وہ ایک لاکھ سے کم نہیں ہیں، بلکہ حقیقتاً ایک لاکھ ہیں یا اس سے زیادہ ہیں۔

چنانچہ یہ مخبر بہ کی تحقیق ہے کسی طرح کا شک وتردد نہیں ہے، اس لیے کہ یہ یہاں ممتنع ہے۔ اسی طرح یہ آیت ہے: ﴿ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ﴾۔ یہ بات جو ہم نے کہی کہ یہ قریب ہونے والا جس کے اور آپ کے درمیان دو کمان کا فاصلہ تھا، وہ جبریل علیہ السلام ہی ہیں۔ یہ ام المومنین سیدہ عائشہ، عبداللہ بن مسعود اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا قول

---

[1] تاریخ دمشق (۳۰۲/۳۸) اس کی سند میں ”محمد بن اسحاق“ مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۵۰۳/۲۲)

ہے، چنانچہ عن قریب ہم ان کی حدیثیں وارد کریں گے۔ إن شاء اللّٰه تعالىٰ.

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: ''رَأَى مُحَمَّدٌ رَبَّهُ بِفُؤَادِهِ مَرَّتَيْنِ'' [1] یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو اپنے دل سے دو بار دیکھا، پس اس روایت کو ان دو باروں میں ایک بار ٹھہرایا۔ حدیث اسراء میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ (في حديث شريك بن أبي نمرعن أنس) ''ثُمَّ دَنَا الْجَبَّارُ رَبُّ الْعِزَّةِ فَتَدَلَّى''۔ [2] اور اسی لیے بہت سے لوگوں نے اس روایت کے متن میں کلام کیا ہے اور اس میں کئی چیزیں ذکر کی ہیں جن میں غرابت ہے۔

پس اگر یہ صحیح ہو تو اور وقت پر اور کسی اور قصے پر محمول ہو گی نہ یہ کہ اس آیت کی تفسیر ہو، کیوں کہ یہ رویت اس حال میں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین میں تھے شبِ معراج میں نہیں تھے، اسی لیے اس کے بعد فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴾ پس یہ وہی شبِ معراج میں ہے اور پہلی رویت زمین میں تھی۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ میں نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا ان کے چھ سو پر تھے۔ [3] (أخرجه ابن جرير)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حال یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو اپنے خواب میں اجیاد میں دیکھا جو مکہ میں ایک جگہ ہے، پھر آپ نکلے تا کہ اپنی حاجت پوری کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریل علیہ السلام چیخے: یا محمد! یا محمد! چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں بائیں نظر کی تو کوئی شے نظر نہ آئی، ایسا تین بار کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام آسمان کے کنارے پر اپنے دونوں پاؤں موڑے ہوئے ہیں ایک پاؤں دوسرے کے ساتھ چنانچہ کہا: ''يَا مُحَمَّدُ جِبْرِيْلُ''۔ جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھاگے، یہاں تک کہ لوگوں میں داخل ہوئے، پھر نظر کی تو کوئی شے نہ دیکھی، پھر لوگوں میں سے باہر نکلے، پھر نظر کی تو اُن کو دیکھا، پھر لوگوں میں داخل ہو گئے تو کوئی شے نہیں دیکھی، پھر نکلے اور نظر کی تو اُن کو دیکھا۔ چنانچہ وہ اللہ عزوجل کا یہ قول ہے: ﴿ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ ... إلى قوله ... ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴾ اور کہتے ہیں کہ قاب آدھی انگلی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ''ذِرَاعَيْنِ كَانَ بَيْنَهُمَا''، یعنی ان میں دو ہاتھ کا فرق تھا۔ [4] (رواه ابن جرير وابن أبي حاتم من حديث ابن وهب به)

امام بخاری رحمہ اللہ نے ذر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہم کو عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو دیکھا ان کے چھ سو پر تھے۔ [5] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ﴿ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦) [2] تفسير الطبري (٥٠٢/٢٢) اس کی سند میں ''شریک بن ابی نمر'' ضعیف راوی ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤) تفسير الطبري (٥٠٣/٢٢، ٥٠٤)

[4] تفسير الطبري (٥٠٤/٢٢) تفسير ابن أبي حاتم ٣٣١٩/١٠) اس کی سند میں ''ابن وکیع'' ضعیف راوی ہے۔

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤)

﴿ مَا رَاٰى ﴾ کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا ان پر رفرف کے دو حلے تھے، یعنی سبز رنگ کا لباس تھا، انھوں نے آسمان وزمین کے درمیان کو بھر دیا تھا۔[1] اب جو ہم نے ذکر کیا ہے اس کی بنا پر ﴿ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴾ کے یہ معنی ہوں گے، پس وحی کی جبریل علیہ السلام نے اللہ کے بندے محمد ﷺ کی طرف جو وحی کی۔ یا پس وحی کی اللہ نے اپنے بندے محمد ﷺ کی طرف جو وحی کی جبریل کے واسطے سے، یہ دونوں معنی صحیح ہیں۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے ذکر کیا گیا ہے، کہا: وحی کی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طرف: "أَلَمْ أَجِدْكَ يَتِيمًا" یعنی کیا نہیں پایا میں نے تجھ کو یتیم۔ ﴿ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ یعنی اور بلند کر دیا ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر۔ غیر سعید نے کہا: آپ کی طرف وحی کی گئی ہے کہ جنت نبیوں پر حرام کی گئی ہے یہاں تک کہ تو اس میں داخل ہو اور اُمتوں پر یہاں تک کہ اس میں تیری امت داخل ہو۔[2]

کیا نبی مکرم ﷺ نے شبِ معراج اللہ جل جلالہ کا دیدار کیا؟

امام مسلم رحمہ اللہ نے عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے: ﴿ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴾، ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴾ کہا: دیکھا اس کو اپنے دل سے دو بار۔[3] (وكذا رواه سماك عن عكرمة عن ابن عباس رضي الله عنهما مثله، وكذا قال أبو صالح والسدي وغيره أنه رآه بفؤاده مرتين)[4]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے ان کی مخالفت کی ہے اور ایک روایت میں ان سے یہ مروی ہے کہ انھوں نے رویت کا اطلاق کیا ہے اور وہ محمول ہے اس رویت پر جو مقید بفؤاد ہے اور جس نے ان سے رویت بصر (آنکھ سے دیکھنا) روایت کی ہے تو یقیناً اس نے غریب بات کہی، کیوں کہ اس بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے کوئی شے صحیح نہیں ہوئی ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ کا قول اپنی تفسیر میں ان الفاظ میں ہے: "وَذَهَبَ جَمَاعَةٌ إِلَى أَنَّهُ رَآهُ بِعَيْنِهِ وَهُوَ قَوْلُ أَنَسٍ رضي الله عنه وَالْحَسَنِ وَعِكْرِمَةَ"[5] سو اس میں نظر ہے۔ واللہ أعلم.

ترمذی نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، کہا کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا، میں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نہیں کہتا: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ﴾ [الأنعام: ۱۰۳] "اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے"۔ فرمایا تیری خرابی ہو یہ تو اس وقت ہے کہ اپنے نور سے تجلی کرے جو اس کا نور ہے اور مقرر دیکھا اپنے رب کو دوبار۔ پھر ترمذی نے کہا کہ حسن غریب ہے۔[6] نیز ترمذی نے شعبی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کعب سے عرفہ میں ملے تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کعب سے کسی

---

[1] تفسير الطبري (۵۰۹،۵۰۸/۲۲) [2] تفسير ابن كثير (۳۱۷/٤) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷٦)

[4] تفسير الطبري (۵۰۸،۵۰۷/۲۲) [5] تفسير البغوي (۴۰۳/۷)

[6] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۷۹) اس کی سند میں "محمد بن عمرو بن نبہان" مجہول راوی ہے۔

شے کا پوچھا۔ یہ سوال شاید رویتِ رب کا تھا تو کعب نے اس سوال کو ایک بڑی بات سمجھا تو تکبیر کہی، یہاں تک کہ پہاڑوں نے ان کو جواب دیا، یعنی زور سے تکبیر کہی تو پہاڑ گونج گئے اور اُن کی صدا لوٹ کر آئی، یہ ان کا جواب دینا ہوا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہم بنی ہاشم ہیں، یہ کعب کو تسکین اختیار کرنے اور غصہ چھوڑنے پر آمادہ کرنا ہے اور جواب میں غور کرنے پر آمادہ کرنا ہے، کیوں کہ بنی ہاشم اہلِ علم ہیں اور کسی ایسی چیز کا سوال نہیں کرتے جو مستبعد ہو۔ اسی لیے جب کعب نے غور وفکر کیا تو یہ جواب دیا کہ اللہ نے اپنی رویت اور اپنا کلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان بانٹ دیا، سو موسیٰ علیہ السلام سے دو بار کلام کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دو بار دیکھا۔ (كذا في مجمع البحار))

اور مسروق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا اور کہا: کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا؟ چنانچہ فرمایا: البتہ تو نے ایسی بات کہی جس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تو میں نے کہا: ''رُوَيْدًا'' یعنی آپ ٹھہریں جلدی نہ کریں، پھر میں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴾ تو فرمایا: ''أَيْنَ يَذْهَبُ بِكَ'' یعنی یہ تجھے کہاں لے جاتی ہیں۔ مطلب یہ کہ تو نے خطا کی وہ تو یہی جبریل علیہ السلام ہیں۔ جو کوئی تجھے یہ خبر دے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں کوئی شے چھپائی جس کے ساتھ آپ کو امر کیا گیا، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پانچ باتوں کو جانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہیں: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ﴾ [لقمان: ٣٤] ''بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش نازل فرماتا ہے۔'' تو یقیناً اس نے اللہ پر بڑا بہتان لگایا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا اُن کو ان کی اصل صورت میں صرف دو بار دیکھا: ایک بار تو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور ایک بار جیاد میں جو اسفلِ مکہ میں ایک جگہ ہے اور اُن کے چھ سو پَر تھے جن سے پورے اُفق کو بند کر دیا تھا۔[1]

نسائی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: کیا تم تعجب کرتے ہو کہ خلت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہو اور کلام موسیٰ علیہ السلام کے لیے اور رویت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے۔[2] صحیح مسلم میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو فرمایا: « نُوْرٌ أَنّٰى أَرَاهُ »[3] (''نور'' بہ تنوین اور ''أنى'' بہ فتح ہمزہ وتشدیدِ نون ومفتوحہ ''و أراہ'' بہ فتحِ ہمزہ، یعنی اس کا حجاب نور ہے، پھر میں اس کو کیسے دیکھوں یعنی نور نے مجھے رویت سے منع کیا، اس لیے کہ نور آنکھوں کو ڈھانک لیتا ہے۔ اور یوں بھی مروی ہے: ''نُوْرٌ أَنِّيْ أَرَاهُ'' بہ فتحِ راء وکسرِ نون وتشدید یاء شاید اس کے معنی یہ ہوں کہ خالقِ نور اپنی رویت سے مانع ہے۔[4] كذا في مجمع البحار) ایک روایت میں ''رَأَيْتُ نُوْرًا''[5] ہے، یعنی میں نے نور کو دیکھا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے محمد بن کعب سے روایت

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٧٨) اس کی سند میں ''مجالد بن سعید'' ضعیف راوی ہے، البتہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خبر صحیح ہے۔ مزید آگے روایت آئے گی۔

[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٤٧٢/٦) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (ظلال الجنة: ٢١٦/١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨) [4] مجمع بحار الأنوار (١١٢/١) [5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨)

کیا ہے، کہا: لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا؟ فرمایا: میں نے اس کو اپنے فؤاد، یعنی دل سے دو بار دیکھا، پھر یہ پڑھا: ﴿ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴾[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن محمد بن کعب عن بعض اصحاب النبی ﷺ روایت کیا ہے، کہا: ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا؟ فرمایا: میں نے اس کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا اور میں نے اس کو اپنے فؤاد سے، یعنی دل سے دو بار دیکھا۔ پھر یہ پڑھا: ﴿ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ﴾۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عباد بن منصور سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عکرمہ سے ﴿ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴾ کے متعلق پوچھا تو امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: تو چاہتا ہے کہ میں تجھے یہ خبر دوں کے واقعی انھوں نے اس کو دیکھا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ کہا: ''قَدْ رَآهُ ثُمَّ قَدْ رَآهُ'' یعنی مقرر اس کو دیکھا پھر مقرر اس کو دیکھا۔

عباد نے کہا: پھر میں نے حسن رحمہ اللہ سے اس کے متعلق پوچھا تو فرمایا: ''قَدْ رَآی جَلَالَهُ وَعَظَمَتَهُ وَرِدَاهُ'' یعنی تحقیق دیکھا اس کے جلال وعظمت و ردائے کبریا کو۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے امام ابو العالیہ رحمہ اللہ سے دوسری روایت ان الفاظ سے کی ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو سوال کیا گیا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا؟ فرمایا: میں نے ایک نہر دیکھی اور نہر کے پرے ایک حجاب دیکھا اور حجاب کے پرے ایک نور دیکھا۔ میں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔[3] یہ حدیث نہایت درجہ غریب ہے۔

اب رہی وہ حدیث جو امام احمد رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً روایت کی ہے کہ میں نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا۔[4] چنانچہ یہ ایسی حدیث ہے جس کی اسناد شرطِ صحیح پر ہے، لیکن یہ حدیثِ منام سے مختصر ہے جس طرح کہ امام احمد رحمہ اللہ نے عن ابی قلابہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کو روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آج کی رات میرے پاس میرا رب آیا احسن صورت میں، ''أَحْسِبُهُ''، یعنی ''فِي النَّوْمِ'' پس فرمایا: اے محمد! کیا تو جانتا ہے کہ ملائے اعلیٰ کس بات میں جھگڑتے ہیں؟ کہا: میں نے کہا: نہیں، تو اس نے اپنا ہاتھ میرے دونوں شانوں کے درمیان رکھا، یہاں تک کہ میں نے اس کی ٹھنڈک محسوس کی، اپنے دونوں پستانوں کے درمیان یا فرمایا کہ ''نحري'' یعنی سینہ کے اگلے حصے میں۔ پس میں نے اس شے کو جان لیا جو آسمانوں میں ہے اور اس شے کو جو زمین میں ہے۔

پھر فرمایا: اے محمد! کیا تو جانتا ہے کہ ملائے اعلیٰ کس بات میں جھگڑتے ہیں؟ کہا: میں نے کہا: ہاں وہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣١٨/٤) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (٥٠٥/٢٢) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٣١٨/١٠، ٣٣١٩) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔

[4] مسند أحمد (٢٨٥/١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٤٦٦)

کفارات و درجات میں جھگڑتے ہیں، کہا اور کفارات کیا ہیں؟ میں نے کہا: مسجدوں میں نمازوں کے بعد ٹھہرنا اور جماعتوں کی طرف قدموں پر چل کر جانا اور تکالیف میں بھی وضو کا پورا کرنا۔ جس نے یہ کیا تو وہ خیر کے ساتھ زندہ رہا اور خیر کے ساتھ مرا اور اپنی خطاؤں سے اس دن کی طرح پاک ہو گیا جس دن اس کو اس کی ماں نے جنا اور کہا کہ اے محمد! جس وقت تو نماز پڑھے تو یہ کہہ: "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَإِذَا أَرَدْتَّ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً أَنْ تَقْبِضَنِيْ إِلَيْكَ غَيْرَ مُفْتُوْنٍ" کہا اور درجات یہ ہیں: "بَذْلُ الطَّعَامِ وَإِفْشَاءُ السَّلَامِ، وَالصَّلَاةُ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ" [1] (وقد تقدم في آخر سورة ص عن معاذ نحوه وقد رواه ابن جرير من وجه آخر عن ابن عباس رضي الله عنهما وفيه سياق آخر وزيادة غريبة)

وہ سیاق یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے رب کو احسن صورت میں دیکھا تو مجھ سے فرمایا: اے محمد! کیا تو جانتا ہے کہ ملائے اعلیٰ کس بات میں جھگڑتے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں یا رب! پس اس نے اپنا ہاتھ میرے دونوں شانوں کے درمیان رکھا تو میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے دونوں پستانوں کے درمیان پائی۔ چنانچہ میں نے اس شے کو جان لیا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ تو میں نے کہا: یا رب! درجات و کفارات اور جمعوں کے لیے قدم اٹھانے میں اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں۔

پھر میں نے کہا: یا رب! بے شک تو نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا اور تو نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا، «وَفَعَلْتَ وَفَعَلْتَ»، یعنی اور نبیوں کو جو فضائل دیے ان کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا: کیا نہیں کھول دیا میں نے تیرے لیے تیرا سینہ اور اتار نہیں رکھا میں نے تجھ سے تیرا بوجھ۔ "أَلَمْ أَفْعَلْ بِكَ أَلَمْ أَفْعَلْ"، یعنی اس کے سوا جو انعام آپ ﷺ پر کیے ان کا ذکر کیا۔ فرمایا: "فَأَفْضَى إِلَيَّ بِأَشْيَاءَ لَمْ يُؤْذَنْ لِيْ أَنْ أُحَدِّثَكُمُوْهَا"، یعنی پھر میری طرف ایسی چیزیں پہنچائیں جن کی مجھے اجازت نہ دی کہ تم سے وہ بیان کروں۔

(اس سے معلوم ہوا کہ علوم میں کچھ ایسی باتیں ہیں کہ ان کے کشف کا حکم نہیں ہے، یا تو اس لیے کہ عوام کی سمجھ سے دور ہیں، ان کا افشا نظمِ عالم کے خلاف ہے، یا کوئی اور مصلحت ہے۔ واللّٰه أعلم۔ علمائے ربانی اور اولیاء اللہ اس کا خوب برتاؤ کرتے ہیں۔) فرمایا: "فَذَاكَ قَوْلُهُ فِيْ كِتَابِهِ ثُمَّ دَنَا إِلَى قَوْلِهِ مَا رَأَى" پس کر دیا میری آنکھ کے نور کو میرے دل میں تو میں نے اس کی طرف اپنے دل سے نظر کی۔ [2] اس کی اسناد ضعیف ہے۔

امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ عتیبہ بن ابی لہب جب شام کی طرف تجارت کی غرض سے گیا تو اہلِ مکہ سے کہا: "اِعْلَمُوْا أَنِّيْ كَافِرٌ بِالَّذِيْ دَنٰى فَتَدَلّٰى" (یعنی تم جان رکھو کہ میں منکر ہوں اس کا جس کی یہ صفت ہے)۔

---

[1] مسند أحمد (٣٦٨/١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٩)

[2] تفسير الطبري (٥٠٧/٢٢، ٥٠٨) اس کی سند میں "سعید بن زربی" ضعیف راوی ہے۔

پھر اس کی بات رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عن قریب اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتا بھیجے گا۔ ہبار رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ان کے ساتھ تھا تو ہم ایک ایسی زمین میں اترے جس میں شیر بہت تھے۔ کہا: البتہ واقعی میں نے دیکھا ایک شیر کو کہ وہ آیا اور لوگوں کے سر پر ایک ایک کر کے سونگھنے لگا، یہاں تک کہ عتیبہ کی طرف گیا اور اُن کے درمیان میں اس کا سر الگ کر دیا۔[1] (ذكره الحافظ ابن عساكر بسنده إلى هبار بن الأسود رضي الله عنه)

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ نے سیرت میں ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ زمین زرقاء میں تھا۔ کسی نے کہا: اس رات میں اور وہ اس رات ڈرا اور لوگوں نے اس کو اپنے درمیان میں رکھا اور اس کے گرد سو رہے۔ پھر شیر آیا اور سونگھنے لگا، پھر ان سے آگے بڑھ کر اس کی طرف گیا اور اس کا سر کاٹ کھایا۔ لعنه الله۔[2]

نبی مکرم ﷺ کو جبریل علیہ السلام کا ان کی اصل شکل میں دوسری بار دیدار ہونا:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿13﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿14﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴾ یہ وہی دوسری باری ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا ان کی اس صورت میں جس میں ان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ یہ رویت شبِ معراج میں تھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اسراء ومعراج کے بارے میں وارد احادیث اپنی تمام سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ ہم سورت بنی اسرائیل کے شروع میں بیان کر آئے ہیں، لہٰذا یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔[3]

پہلے گزر چکا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما شبِ معراج میں رویت کو ثابت کرتے تھے اور اس آیت سے استشہاد کرتے تھے اور سلف و خلف میں سے ایک جماعت ان کی تابع ہوئی اور صحابہ و تابعین وغیرہم میں سے کئی جماعتوں نے ان کی مخالفت کی۔ امام احمد رحمہ اللہ نے عن زر بن حبیش عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کیا ہے کہ میں نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا اور اُن کے چھے سو پَر تھے (اصل میں سب جگہ لفظ جناح ہے۔ جناح پرندے کے بازو کو کہتے ہیں اور بازو میں پَر ہوتے ہیں، سہولت کے لیے پَر ترجمہ کر دیا۔ فلیعلم) ان کے پَروں سے گونا گوں رنگ کے موتی اور یاقوت جھڑتے تھے۔[4] یہ اسناد جید قوی ہے۔

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے عن ابی وائل عن عبد اللہ روایت کیا ہے، کہا: رسول اللہ ﷺ نے جبریل کو دیکھا ان کی صورت میں اور ان کے چھے سو پَر تھے ان میں ہر بازو نے مقرر بند کر دیا تھا افق کو، گرتے تھے ان کے بازو سے

---

[1] تاریخ دمشق (۳۰۲/۳۸) اس کی سند میں ''محمد بن اسحاق'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (۳۱۹/٤) [3] تفسیر ابن کثیر (۳۱۹/٤)

[4] مسند أحمد (٤٦٠/١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (الإسراء و المعراج: ١٠٠/١، ١٠١)

گونا گوں رنگ کے وہ موتی جن کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔[1] (إسناده حسن أيضا) میں نے شقیق بن سلمہ کو سنا، وہ کہتے تھے میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سنا، وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نے جبریل علیہ السلام کو سدرۃ المنتہیٰ پر دیکھا اور اُن کے چھے سو بازو تھے۔ حسین نے کہا (یہ عاصم سے راوی ہیں) میں نے عاصم سے بازوؤں کے متعلق پوچھا تو انکار کیا کہ مجھے بتائے۔ پھر عاصم کے بعض اصحاب نے مجھے خبر دی کہ بازو مابین مشرق ومغرب کے تھے۔[2]

(وهذا أيضا إسناد جيد)

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے شقیق سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سنا، وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس جبریل علیہ السلام سبز لباس میں آئے جس سے موتی لٹکے ہوئے تھے۔[3] (إسناده جيد أيضا)

دیدارِ الٰہی کے بارے میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا موقف:

نیز امام احمد رحمہ اللہ نے عامر، یعنی شعبی سے روایت کیا ہے، کہا: امام مسروق رحمہ اللہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور کہا: اے ام المومنین! کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا؟ فرمایا: سبحان اللہ! البتہ واقعی میرے رونگٹے کھڑے ہوئے اس بات سے جو تو نے کہا، کہاں ہے تو، جو کوئی تجھے ان تین باتوں میں سے کوئی بیان کرے تو واقعی اس نے جھوٹ کہا، جو کوئی تجھے یہ بیان کرے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تو یقیناً اس نے جھوٹ کہا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ [الأنعام: ١٠٣] ''اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے۔'' نیز یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ﴾ [الشورىٰ: ٥١] ''ناممکن ہے کہ کسی بندہ سے اللہ تعالیٰ کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے۔'' اور جو کوئی تجھے یہ خبر دے کہ وہ اس شے کو جو کل ہو گی جانتے ہیں تو یقیناً اس نے جھوٹ کہا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ [لقمان: ٣٤] ''بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش نازل فرماتا ہے اور ماں کے پیٹ میں جو ہے اسے جانتا ہے، کوئی (بھی) نہیں جانتا کہ کل کیا (کچھ) کرے گا؟ نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ کس زمین میں مرے گا (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ ہی پورے علم والا اور صحیح خبروں والا ہے۔''

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[2] مسند أحمد (٤٠٧/١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: (الإسراء والمعراج: ١٠١/١، ١٠٢)

[3] مسند أحمد (٤٠٧/١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٣٨٥)

رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو کتنی بار دیکھا؟

اور جو کوئی تجھے یہ خبر دے کہ واقعی انھوں نے (رسول اللہ ﷺ نے) چھپایا تو واقعی اس نے جھوٹ کہا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ [المائدة: ٦٧] ''اے رسول! جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجیے۔'' لیکن آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دو دفعہ دیکھا۔[1] نیز امام احمد رحمہ اللہ نے عن الشعبی عن مسروق روایت کیا ہے، کہا: میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا تو میں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا: ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴾ [التكوير: ٢٣] ''اس نے اس (فرشتے) کو آسمان کے کھلے کنارے پر دیکھا بھی ہے۔'' ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴾ چنانچہ فرمایا: میں اس امت کی سب سے پہلی ہوں جس نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّمَا ذَاكَ جِبْرِيْلُ » یعنی یہ جو تھا تو وہ جبریل تھا۔ آپ ﷺ نے ان کو ان کی اس صورت پر نہیں دیکھا جس پر وہ مخلوق ہوئے ہیں مگر دو بار۔ آپ نے ان کو آسمان سے زمین کی طرف اترتے ہوئے دیکھا اس حال میں کہ ان کے جسم نے آسمان و زمین کے درمیان والی جگہ کو ڈھانپ لیا تھا۔[2] (أخرجاه في الصحيحين من حديث الشعبي به)

روایتِ ابو ذر رضی اللہ عنہ: امام احمد رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن شقیق سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے ابو ذر سے کہا: اگر میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا تو آپ ﷺ سے پوچھتا۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو اُن سے کیا پوچھتا؟ کہا: میں ان سے پوچھتا کہ آیا انھوں نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا؟ تو ابو ذر نے کہا: بے شک میں نے واقعی اُن سے پوچھا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: « قَدْ رَأَيْتُهُ نُوْرًا أَنّٰى أَرَاهُ »۔[3] امام احمد رحمہ اللہ کی روایت میں اسی طرح واقع ہوا ہے اور امام مسلم رحمہ اللہ نے دو طریق سے مختلف الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے۔

ایک روایت عن قتادہ عن عبد اللہ بن شقیق عن ابی ذر رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: « نُوْرًا أَنّٰى أَرَاهُ »۔ دوسری روایت عن قتادہ عن عبداللہ بن شقیق کے الفاظ یہ ہیں، کہا: میں نے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا تو البتہ آپ ﷺ سے پوچھتا تو ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو اُن سے کس چیز کے بارے میں پوچھتا؟ کہا: میں نے کہا کہ میں اُن سے پوچھتا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا؟ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے یہ واقعی آپ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٧٤) مسند أحمد (٤٩/٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧) مسند أحمد (٢٤١/٦)

[3] مسند أحمد (١٤٧/٥)

«رَأَيْتُ نُورًا»۔[1] خلال نے اپنی علل میں بیان کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ سے کسی نے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو فرمایا: "مَا زِلْتُ مُنْكِرًا لَهُ وَمَا أَدْرِي مَا وَجْهُهُ" [2] یعنی میں ہمیشہ اس کا منکر رہا اور میں نہیں جانتا کہ اس کی کیا توجیہ ہے۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عن ابراہیم عن ابیہ عن ابی ذر رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا: "رَآهُ بِقَلْبِهِ وَلَمْ يَرَهُ بِعَيْنِهِ" [3] یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو اپنے دل سے دیکھا اور اس کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے ارادہ کیا کہ عبداللہ بن شقیق اور سیدنا ابو ذر کے درمیان اس کے انقطاع کا دعویٰ کریں۔ رہے ابن جوزی تو انھوں نے اس کی یہ تاویل کی کہ شاید ابو ذر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معراج شریف سے پہلے سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جواب دیا جو کچھ دیا اور اگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے معراج شریف کے بعد پوچھتے تو وہ ان کو اثبات میں جواب دیتے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "هَذَا ضَعِيفٌ جِدًّا" یعنی یہ بات نہایت ہی کمزور ہے، اس لیے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ام المومنین نے واقعی اس کے متعلق معراج شریف کے بعد پوچھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے رویت کا اثبات نہیں کیا۔ اور جس کسی نے یوں کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کی عقل کے مطابق خطاب کیا، یا جس طرف وہ گئی ہیں، اس میں ان کے تخطیہ (خطا پکڑنا) کا قصد کیا، جیسے ابن خزیمہ نے کتاب التوحید میں کہا تو بے شک خطا کار وہی شخص ہے۔[4] واللہ أعلم۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو اپنے دل سے دیکھا اور اس کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔[5] صحیح مسلم میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ﴿ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴾ کی تفسیر میں ثابت ہوا ہے، کہا کہ جبریل علیہ السلام کو دیکھا۔[6] امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دو بار دیکھا۔ اسی طرح امام قتادہ اور ربیع بن انس رحمہم اللہ وغیرہما نے بھی کہا ہے۔[7]

سدرۃ المنتہیٰ کے بے مثال مناظر:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴾ احادیثِ اسراء میں گزر چکا ہے کہ فرشتوں نے سدرہ کو کوؤں کی طرح ڈھانک دیا تھا اور اس کو نورِ رب نے ڈھانکا اور اس کو رنگوں نے ڈھانکا اور میں نہیں جانتا وہ کیا ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیر کرائی گئی تو آپ کو لے کر سدرہ کے پاس پہنچے اور وہ چھٹے آسمان میں ہے، وہاں تک منتہی ہوتی ہے وہ شے جس کو زمین سے اوپر چڑھا کر لے جاتے ہیں تو وہ اس سے لے لی جاتی ہے اور وہیں تک منتہی ہوتی ہے وہ شے جس کو اس کے اوپر سے اتار کر لاتے ہیں، پھر وہ اس سے لے لی جاتی ہے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨) [2] تفسير ابن كثير (٣٢٠/٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣١٩/١٠)
[4] تفسير ابن كثير (٣٢٠/٤) [5] سنن النسائي الكبرىٰ (٤٧٢/٦) [6] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٥)
[7] تفسير الطبري (٥١٢/٢٢)

﴿ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴾ کہا: وہ سونے کے پروانے ہیں، کہا کہ رسول اللہ ﷺ یہ تین چیزیں عطا کیے گئے: پانچ نمازیں اور خواتیم سورۃ البقرہ، اور آپ ﷺ کی اُمت میں سے اس شخص کی مقحمات کی بخشش جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔[1] (انفرد به مسلم) ("مقمحات" وہ بڑے گناہ ہیں جو اپنے کرنے والوں کو آگ میں لے جاتے ہیں۔ بہ ضم میم وسکونِ قاف وکسرِ ہاء یعنی کبائر۔ بخشنے سے مراد یہ ہے کہ ان کو کرنے والا آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ یا بعض امت مراد ہے۔[2] كذا في مجمع البحار)۔

امام ابوجعفر رحمہ اللہ رازی نے عن الربیع عن ابی العالیہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ (یہ شک ابوجعفر کا ہے) روایت کیا ہے، کہا کہ جب رسول اللہ ﷺ کو سیر کرائی گئی تو آپ ﷺ سدرہ تک پہنچے تو آپ ﷺ سے کہا گیا کہ یہ سدرہ ہے، پھر اس کو نورِ خلاق نے ڈھانک لیا اور اس کو فرشتوں نے کوؤں کی طرح ڈھانک لیا، جب وہ درختوں پر واقع ہوتے ہیں۔ پھر اس وقت آپ ﷺ سے کلام کیا اور فرمایا کہ سوال کر۔ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے، کہا کہ سدرہ کی ٹہنیاں موتی اور یاقوت وزبرجد تھیں، چنانچہ محمد ﷺ نے ان کو دیکھا اور اپنے رب کو اپنے دل سے دیکھا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: عرض کی گئی: اے اللہ کے رسول! آپ نے کون سی شے دیکھی جو اس سدرہ کو ڈھانک رہی تھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ اس کو سونے کے پروانے ڈھانک رہے ہیں اور میں نے دیکھا کہ اس کے پتوں میں سے ہر پتے پر ایک فرشتہ کھڑا ہو کر اللہ عزوجل کی تسبیح کر رہا ہے۔

﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نہیں گئی نگاہ دائیں طرف اور نہ بائیں جانب، اور نہ اس شے سے آگے بڑھی جس کا امر کیے گئے ثبات و طاعت میں۔ یہ ایک عظیم صفت ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے صرف وہی کیا جس کا امر کیے گئے اور نہ اس سے زیادہ کا سوال کیا جو آپ کو عطا کیا گیا۔[3] ناظم نے کیا خوب کہا ہے:

رَأَى جَنَّةَ الْمَأْوٰى وَمَا فَوْقَهَا وَلَوْ رَأَى غَيْرُهُ مَا قَدْ رَآهُ لَتَاهَا

یعنی آپ ﷺ نے جنت الماویٰ دیکھی اور وہ شے جو اس کے اوپر ہے اور اگر آپ کا غیر اس شے کو دیکھتا جو آپ ﷺ نے دیکھی تو البتہ متحیر رہ جاتا۔

﴿ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴾ [طٰهٰ: ٢٣] "یہ اس لیے کہ ہم تجھے اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھانا چاہتے ہیں۔" یعنی البتہ مقرر آپ ﷺ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں دیکھیں جو اس کی قدرت اور عظمت پر دال ہیں۔ اہلِ سنت میں سے جو لوگ اس طرف گئے ہیں کہ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣) مسند أحمد (٤٢٢/١)
[2] مجمع بحار الأنوار (٢١٥/٤)
[3] تفسير الطبري (٥١٩/٢٢_٥٢١)

اس رات رویت کا وقوع نہیں ہوا انھوں نے ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے یوں فرمایا ہے: ﴿ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴾ اور اگر آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہوتا تو البتہ وہ اس کی خبر دیتا اور لوگوں سے اس کے بارے میں کہہ دیتا۔ اس کی تقریر سورت سبحان میں گزر چکی ہے۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو ان کی صورت میں صرف دو بار دیکھا: ایک بار تو آپ نے ان سے سوال کیا تھا کہ آپ کو اپنا نفس اپنی صورت میں دکھائیں تو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صورت دکھائی تو اُفق کو بند کر دیا۔ رہی دوسری بار تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چڑھے جبکہ آپ کو اوپر چڑھا لے گئے۔ وقولہ: ﴿ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی ﴾ پھر جب جبریل علیہ السلام نے اپنے رب کو خبر دی تو اپنی صورت میں لوٹ کر آئے اور سجدہ کیا۔ پس قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ... تا ... الْكُبْرٰی ﴾ کہا کہ خلقِ جبریل علیہ السلام کو دیکھا۔[2] امام احمد رحمہ اللہ نے اس کو اسی طرح روایت کیا ہے اور یہ غریب ہے۔[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے: "قُوَی" "قُوَّۃٌ" کی جمع ہے۔ ﴿ شَدِيْدُ ﴾ کی ﴿ الْقُوٰی ﴾ کی طرف اضافت ہے، صفت کی موصوف کی طرف اضافت کے باب سے ہے۔ "عَلَّمَ" کا فاعل جبریل علیہ السلام ہیں۔ اکثر مفسروں کا یہی قول ہے، یعنی ان کو جبریل علیہ السلام نے سکھایا جن کی قوتیں سخت ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: فاعل اللہ عزوجل ہے۔[4] پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ جبریل علیہ السلام کی قوت میں سے یہ ہے کہ انھوں نے قومِ لوط کی بستیوں کو اُکھاڑا اور آسمان کی طرف اٹھایا، پھر اُن کو الٹا دیا۔ اور ثمود پر ایک چیخ ماری تو وہ صبح کو گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور ان کا نبیوں پر اترنا اور ان کا چڑھنا آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ جلدی ہوتا ہے۔ ان کے لیے یہ قوت ثابت ہے گو وہ آدمیوں کی صورت پر ہوں۔ غرضیکہ ان کی ایک قوت تو ﴿ شَدِيْدُ الْقُوٰی ﴾ ہے اور دوسری صفت ﴿ ذُوْ مِرَّةٍ ﴾ ہے۔ ﴿ مِرَّةٍ ﴾ پیدایش میں قوت اور شدت کے معنی میں ہے۔ کسی نے کہا آفات سے جسم کی صحت اور سلامتی ہے، اس معنی سے وہ حدیث ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حصافتِ عقل ومتانتِ رائے کے معنی میں ہے، یعنی درست وصحیح عقل اور رائے والے۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شخص جس کی رائے سخت و مستقیم ہوتی ہے، عرب کے لوگ اس کو "حصيف العقل ذو مرة" کہتے ہیں۔ اسی معنی سے شاعر کا قول ہے:

قَدْ كُنْتُ قَبْلَ لِقَائِكُمْ ذَا مِرَّةٍ   عِنْدِيْ لِكُلِّ مُخَاصِمٍ مِيْزَانُهُ[5]

---

[1] رقم الآية (1) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسیر ابن کثیر (٤/٣١٤۔٣٢١)
[4] تفسير القرطبي (٢٦/١٧) [5] فتح القدير (١٣٩/٥)

یعنی مقرر میں تمھارے ملنے سے پہلے محکم اور مستقیم رائے والا تھا، میرے پاس ہر جھگڑنے والے کے لیے اس کی میزان تھی، لیکن تمھارے ملنے کے بعد میری عقل ٹھیک نہیں رہی۔

﴿ مِرَّةٍ ﴾ کی یہ تفسیر زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ شدت وقوت کا فائدہ تو ﴿ شَدِيْدُ الْقُوٰى ﴾ نے دے دیا۔ اب رہی عقل اور رائے کی قوت وشدت تو وہ ﴿ ذُوْ مِرَّةٍ ﴾ سے معلوم ہوگئی۔ دیکھو امام جوہری رحمہ اللہ نے صحاح میں کہا ہے: "اَلْمِرَّةُ: إِحْدَى الطَّبَاعِ الْأَرْبَعِ، وَالْمِرَّةُ: اَلْقُوَّةُ وَشِدَّةُ الْعَقْلِ"[1] یعنی مرہ بہ معنی صفرا ہے جو چار خلطوں میں سے ایک خلط ہے۔ دوسرے معنی قوت کے ہیں، تیسرے شدتِ عقل کے۔ کسی نے کہا ہے کہ عقل میں قوت اور وحدت کے معنی میں ہے تو ﴿ ذُوْ مِرَّةٍ ﴾ کے یہ معنی ہوئے کہ ایسا قوی اور تیز عقل کہ کوئی روکنے والا اس کو اس شے سے روک نہیں سکتا جس کی وہ مزاولت کرتا ہے اور نہ ملول ہوتا ہے اس چیز سے جس کی وہ مزاولت کرتا ہے۔

پس اب قوت ومرۃ کے درمیان فرق معلوم ہوگیا۔ جبریل علیہ السلام کی شدت وقوت میں سے یہ بات ہے کہ ان کو شکل بدلنے پر قدرت ہے، اس لیے یوں فرمایا: ﴿ فَاسْتَوٰى ﴾ حرفِ فاء ﴿ عَلَّمَهٗ ﴾ پر عطف کے لیے ہے، یعنی آپ کو جبریل علیہ السلام نے سکھایا، پھر آسمان میں اپنے مکان کی طرف مرتفع اور بلند ہوئے آپ ﷺ کو تعلیم کرنے کے بعد۔[2] (کما قالہ سعید بن المسیب وسعید بن جبیر) کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ قائم ہوئے اپنی اس صورت میں جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا، کیوں کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آدمیوں کی صورت میں آتے تھے جس طرح کہ انبیا علیہم السلام کی طرف آیا کرتے تھے۔ سوائے ہمارے نبیِ کریم ﷺ کے کسی نبی نے ان کو ان کی اصل صورت پر نہیں دیکھا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ قرآن شریف آپ ﷺ کے سینہ مبارک میں مستوی ہوا جب آپ ﷺ پر اترا، یا جبریل علیہ السلام کے سینے میں مستوی ہوا جب وہ اس کو لے کر اترے۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ اپنی قوت میں معتدل ہوئے، یا اپنی رسالت میں۔ اس کا ذکر ماوردی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔[3] کسی نے کہا: نبی اکرم ﷺ معراج کے ساتھ مرتفع ہوئے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: یعنی اللہ عزوجل عرش پر مستوی ہوا۔[4] پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یعنی پھر جبریل علیہ السلام مستوی ہوئے اس حال میں کہ وہ افقِ اعلیٰ میں تھے۔ افقِ اعلیٰ سے مراد مشرق کی جانب ہے اور وہ مغرب کی جانب سے بلند ہے۔ افق آسمان کے کنارے کے معنی میں ہے۔ افق کی جمع آفاق ہے، یہ بھی جائز ہے کہ جملہ مستانفہ ہو۔ ﴿ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴾ یعنی پھر جبریل علیہ السلام اپنے افقِ اعلیٰ میں مستوی ہونے کے بعد زمین سے قریب ہوئے اور نبی اکرم ﷺ پر وحی لے کر اترے۔ کسی نے کہا: کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔ تقدیر یہ ہے: "ثُمَّ تَدَلّٰى فَدَنَا"۔ یہ قول امام ابن انباری رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے (شاید اس قول کی بنا اس پر ہے کہ "تدلی" کا درجہ پہلے ہے، پھر "دنو" کا۔ سمین میں ہے کہ "تدلی"

[1] الصحاح (۳/۳۷۸) [2] تفسیر القرطبي (۸۷/۱۷) [3] تفسیر القرطبي (۸۷/۱۷) [4] فتح القدیر (۱۳۹/۵)

امتداد ہے علو سے طرف سفل کے، پھر علو سے قرب میں استعمال کیا گیا۔ کما قالہ الفراء و ابن الأعرابي. واللّٰہ أعلم)۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴾ کے معنی ایک ہیں، یعنی قریب ہوا اور بڑھا قرب میں جیسے تم بولتے ہو: ”دَنَا مِنِّيْ فُلَانٌ وَقَرُبَ“۔ اگر ”قَرُبَ مِنِّيْ وَدَنَا“ کہتے تو بھی جائز ہوتا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴾ میں حرفِ فاء بہ معنی واؤ ہے۔ تقدیر یہ ہے: ”تَدَلّٰى جِبْرِيْلُ وَدَنَا“۔ لیکن یہ اس وقت جائز ہے جب دونوں فعلوں کے ایک معنی ہوں تو جس کو چاہو مقدم کرو۔ جمہور اس کے قائل ہیں کہ ”اَلَّذِيْ دَنَا فَتَدَلّٰى“۔ جبریل علیہ السلام ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ”دَنَا فَتَدَلّٰى إِلٰى رَبِّهٖ“

مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا امر و حکم قریب ہوا۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے: ”دَنَا رَبُّهٗ فَتَدَلّٰى“ یعنی آپ کا رب قریب ہوا، پھر قرب میں زیادہ ہوا۔ ”تَدَلّٰى“ کسی شے کے قرب میں نازل ہونے کو کہتے ہیں۔ اور جو شخص اس بات کا قائل ہے کہ ”اَلَّذِيْ اسْتَوٰى جِبْرِيْلُ“ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو اس کے نزدیک ”دَنٰى فَتَدَلّٰى“ کے معنی یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے قریب ہوئے۔ قریب ہونا کرامت کا، پھر سجدے کے لیے جھکے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ﴾ یعنی پھر جبریل علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان فاصلہ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے رب تعالیٰ کے درمیان، بنا بر اختلافِ قولین، فاصلہ دو عربی کمان کے فاصلے جتنا تھا۔ ”قَابَ وَقِيْبَ وَقَادَ وَقِيْدَ وَقِيْسَ“ بہ معنی مقدار ہے۔[1] (ذكر معناه في الصحاح) امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قوس و رمح و سوط و ذراع و باع و خطوہ و شبر و فتر و اصبع کے ساتھ مقرر تقدیر آئی ہے[2] (یعنی کلامِ عرب میں یہ اشیاء اندازہ کرنے میں استعمال ہوتی ہیں۔ قوس کمان، رمح نیزہ، سوط کوڑا، ذراع ہاتھ، باع ایک ہاتھ کی بیچ کی انگلی سے لے کر دوسرے ہاتھ کی بیچ کی انگلی تک کا نام ہے، خطوہ بالضم قدم، شبر بالکسر بالشت، فتر بالکسر دو انگشت سبابہ و ابہام کے درمیان اصبع انگلی)۔

قرطبی میں ہے کہ ﴿ قَابَ ﴾ میں ”مقبض و سیۃ“ ہے (سیہ بہ کسرِ سین و تخفیف یا کمان کی منحنی طرف کو کہتے ہیں اور اوپر کی طرف کو دستِ کمان اور نیچے کی طرف کو پائے کمان بولتے ہیں) اور ہر قوس کی دو قاب ہوتی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد ”قابي قوس“ ہے، اس کو قلب کر کے ﴿ قَابَ قَوْسَيْنِ ﴾ کر لیا ہے۔ امام سعید بن میسب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ قَابَ ﴾ کمانِ عربی کا صدر ہے جس جگہ پر باندھا جاتا ہے وہ تسمہ جس کو کمان والا اپنے کندھے پر ڈالتا ہے اور ہر کمان کی ایک قاب ہوتی ہے۔ پس یہ خبر دی کہ جبریل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے قریب ہوئے جتنی قریب ﴿ قَابَ قَوْسَيْنِ ﴾ ہوتی ہے۔

---

[1] فتح القدير (٥/١٣٩، ١٤٠) [2] الكشاف (٤/٤٢٠)

امام سعید بن جبیر، عطاء، ابواسحاق ہمدانی اور ابو وائل شقیق بن سلمہ کہتے ہیں: ''فَكَانَ قَدْرَ ذِرَاعَيْنِ''۔ قوس بہ معنی ذراع ہے، اس سے ہر شے کا قیاس کیا جاتا ہے، یہ بعض حجازیوں کی لغت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ازدشنوءَ کی لغت ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ ﴿ قَابَ ﴾ بہ معنی قید، یعنی مقدار ہے اور ﴿ قَوْسَيْنِ ﴾ بہ معنی ''ذِرَاعَيْنِ''۔[2] قوس مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے۔ چنانچہ جس نے مؤنث ٹھہرایا تو کہا کہ اس کی تصغیر ''قويسة'' ہے اور جس نے مذکر قرار دیا تو کہا کہ ''قویس'' ہے۔ اس کی جمع ''أَقْوَاسٌ وَقِسِيٌّ وَقِيَاسٌ'' آتی ہے۔ قوس کھجور کی بقیہ کو بھی کہتے ہیں جو ظرف میں رہ جاتا ہے اور قوس ایک برج کا بھی نام ہے جو آسمان کے برجوں میں سے ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ایک قوس ہے۔[3]

کلمۂ ﴿ اَوْ ﴾ اپنی اصل پر ہے، یعنی شک کے معنی میں۔ زجاج رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ میں کہا، یعنی دونوں کے درمیان دو کمان جتنا فاصلہ تھا، یا اس سے بھی کم اس شے میں جس کا تم اندازہ کرتے ہو۔ اللہ سبحانہ تو تمام اشیاء کے اندازوں کا عالم ہے، لیکن وہ ہم سے اس طرح سے خطاب کرتا ہے جس کی ہمیں آپس میں خطاب کی عادت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی واؤ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی بل ہے، لیکن زیادہ بہتر پہلا قول ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''أَوْ يَزِيدُونَ'' اس لیے کہ معنی یہ ہیں: پس دونوں کے درمیان دیکھنے والے کی رائے میں ان دو مقداروں میں سے ایک مقدار جتنا فاصلہ تھا، یعنی دونوں کے درمیان قربت کی وجہ سے دیکھنے والا اس مقدار میں شک کرتا ہے۔

﴿ اَدْنٰى ﴾ افعل تفضیل ہے اور مفضل علیہ محذوف: ''أَيْ: أَوْ أَدْنَى مِنْ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى مِنْ ذَلِكَ''

مروی ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو آدمی کی صورت پر دیکھا تو افقِ اعلیٰ کے نزدیک ان سے یہ سوال کیا کہ ان کو اُن کی اس صورت پر دیکھیں جس پر وہ پیدا کیے گئے تو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صورت دکھائی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں تھے، انھوں نے افق کو مغرب تک بند کر دیا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم گر پڑے، اس حال میں کہ آپ پر غشی کی گئی تھی۔ پھر جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور زیادہ قریب ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ چپکا لیا، یہاں تک کہ آپ کو افاقہ ہوا تو فرمایا: اے جبریل! میں نے نہیں خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو ایسی صورت پر پیدا کیا ہو، پس جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد! میں نے تو اپنے بازوؤں سے صرف دو بازو کھولے تھے، حالانکہ میرے چھے سو بازو ہیں، ہر بازو کی فراخی مشرق و مغرب کے درمیان فاصلے جتنی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک یہ البتہ ایک بڑی شے ہے۔ پس جبریل علیہ السلام نے کہا کہ میں اللہ کی خلق کے مقابلے میں ذرا سا ہوں، البتہ اللہ تعالیٰ نے اسرافیل علیہ السلام کو واقعی چھے سو بازوؤں والا پیدا کیا ہے، ان میں سے ہر بازو میرے سارے

[1] تفسير القرطبي (۹۱،۹۰/۱۷) [2] المعجم الكبير (۱۰۳/۱۲) [3] تفسير القرطبي (۹۱/۱۷)

بازوؤں کی طرح ہے، حالاں کہ وہ البتہ کبھی اللہ کے خوف سے اتنے چھوٹے ہو جاتے ہیں جتنی کہ وصع ہوتی ہے، یعنی عصفورِ صغیر، یعنی چھوٹی چڑیا۔[1] (کما في القرطبي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴾ راجع ہے ﴿ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ﴾ کی طرف، یعنی اس کو ﴿ شَدِيْدُ الْقُوٰى ﴾ نے تعلیم کیا، اللہ کی تعلیم کے ساتھ نہ کہ خود اپنی طرف سے، یعنی پھر جبریل علیہ السلام نے اللہ کے بندے کی طرف وحی کی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ﴿ عَبْدِهٖ ﴾ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ ﴾ [الفاطر: ٤٥] ''تو روئے زمین پر ایک جاندار کو نہ چھوڑتا۔''

مطلب یہ ہے کہ دونوں میں مرجع کا ذکر پہلے نہیں ہوا، لیکن قرینۂ مقام سے معلوم ہوتا ہے، یہ ایک قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے جبریل علیہ السلام کی طرف وحی کی جو جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[2] امام کرخی رحمہ اللہ نے امام ربیع، حسن، ابن زید اور قتادہ رحمہم اللہ کی طرف اس کی نسبت کی ہے۔ فتحین میں پہلی کو اُن کی طرف منسوب کیا۔[3] واللہ أعلم۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر کا یہی قول ہے۔

وحی کسی شے کے بسرعت القا کرنے کو کہتے ہیں، اس معنی سے ''وَحَا'' بہ معنی سرعت ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ عموم کے لیے ہے ابہام کے لیے نہیں ہے، مراد ہر وہ شے ہے جس کی وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی اور ابہام پر محمول کرنا زیادہ اچھا ہے، اس لیے کہ اس میں اس شے کی تعظیم ہے جس کی وحی کی گئی۔ کہا ہے کہ اللہ پاک نے اس شے کو مبہم رکھا، ہم سے اس کا بیان نہیں کیا تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کی تفسیر سے تعرض کریں، بلکہ اس کو مبہم رہنے دیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر کی ہے، چنانچہ ان کا قول پہلے گزر چکا ہے۔[4]

﴿ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴾ ﴿ كَذَبَ ﴾ کو بہ تخفیف وتشدیدِ ذالِ معجمہ پڑھا ہے اور دونوں سبعیہ ہیں (جمہور نے مخفف اور ہشام و ابوجعفر نے مشدد پڑھا ہے)۔[5] تشدید تو ان معنوں میں ہے کہ جو شے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھ سے دیکھی اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل نے یوں نہیں کہا ہے کہ میں تجھے نہیں پہچانتا اور اگر یوں کہتا تو کاذب ہوتا، کیوں کہ اس نے تو اس کو پہچان لیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شے کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے دل سے اس کو پہچانا اور اس میں شک نہ کیا جو شے دیکھی وہ حق ہے۔

کلمۂ ''ما'' موصولہ مفعول بہ ہے اور عائد محذوف۔ فاعل ﴿ رَاٰى ﴾ کا ضمیر ہے راجع ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔ رہی تخفیف تو اس میں بھی وہی تقریر ہے جو تشدید میں ہے۔ ﴿ كَذَبَ ﴾ بہ تخفیف خود متعدی ہوتا ہے: ''یُقَالُ

---

[1] تفسیر القرطبي (١٩/٢٤١) البتہ تفسیر قرطبی میں الفاظ کچھ مختلف ہیں۔ [2] تفسیر الجلالین (١/٧٠١)

[3] فتح القدیر (٥/١٤٠) فتح البیان (١٣/٢٤٩) [4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [5] فتح القدیر (٥/١٤٠)

كَذَبَهُ إِذَا قَالَ لَهُ الْكَذِبَ وَلَمْ يُصَدِّقْهُ"۔ کسی نے کہا ہے کہ بنا بر اسقاطِ خافض "أَيْ: فِيمَا رَآهُ"۔ فتح البیان میں ہے: "مَا كَذَبَ فُؤَادُ مُحَمَّدٍ ﷺ مَا رَآهُ بَصَرُهُ لَيْلَةَ الْمِعْرَاجِ رُؤْيَةً حَقِيقِيَّةً"[1] یعنی آپ ﷺ کے دل نے اس شے کی تکذیب نہ کی جو شبِ معراج میں حقیقی طور پر آپ ﷺ کی آنکھ نے دیکھی۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں: "إِنَّهُ رَأَى شَيْئًا فَصَدَّقَ بِهِ" یعنی ایک شے دیکھی پھر اس کی تصدیق کی۔ کلمۂ "ما" میں ایک قول یہ ہے کہ مصدریہ ہے محلِ نصب میں کذب مخفف و مشدد سے۔ اب رہی وہ شے جو آپ ﷺ نے دیکھی تو اس میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام کی اصل صورت، دوسرا یہ ہے کہ اللہ عزوجل ہے، ان کے دلائل پہلے گزر چکے ہیں۔

﴿ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴾ جمہور نے بہ الف پڑھا ہے "مُمَارَاةٌ"، بہ معنی "مُجَادَلَةٌ وَمُلَاحَاةٌ" سے، یعنی آپس میں جھگڑنا، حق یہ تھا کہ کلمۂ "في" سے متعدی ہوتا، مگر چوں کہ اس میں غلبے کے معنی شامل کیے گئے ہیں، اس لیے کلمۂ ﴿ عَلٰى ﴾ کے ساتھ متعدی ہوا۔ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ مشرکین کو خطاب ہے، جنھوں نے نبیِ کریم ﷺ کے جبریل علیہ السلام کو دیکھنے کا انکار کیا اور آپ ﷺ سے جھگڑے۔ جبکہ آپ ﷺ کو معراج ہوئی تو آپ ﷺ سے کہا کہ تو ہم سے بیت المقدس کا وصف بیان کر، اس پر فرمایا: کیا پھر تم اس سے جھگڑتے ہو اور اس پر غالب ہوتے ہو اس شے پر جس کو وہ دیکھتا ہے، ایسا جھگڑنا جس سے تمھارا ارادہ ہے کہ اس کو اس شے سے دور کرو جس کا اس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے اور اس کو جان لیا ہے، یعنی جبریل علیہ السلام کی اصلی صورت جو آپ ﷺ نے دیکھی۔

مطلب یہ ہے کہ وہ تو دیکھتا ہے اور تم نہیں دیکھتے، اس لیے اس سے تمھیں جھگڑنے کا حق نہیں ہے۔ کسی نے (یعنی امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے) "تَمْرُوْنَهُ" بہ فتحِ تاء وسکونِ میم پڑھا ہے، یہ "مَرَاهُ حَقَّهُ أَيْ: جَحَدَهُ" سے ماخوذ ہے یعنی جان بوجھ کر کسی کے حق کا انکار کرنا۔ اس کی تعدیت بھی ﴿ عَلٰى ﴾ سے اس لیے ہے کہ معنی غلبہ کو متضمن ہے، یا ماخوذ ہے: "مَرَاهُ عَلَى كَذَا أَيْ: غَلَبَهُ عَلَيْهِ" سے۔ پس یہ "مراء" بہ معنی جدال سے ہے۔ (کما قال السمین)

امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ کہا: اس لیے کہ کفار نے آپ سے مماراۃ ومجادلہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے تو صرف آپ کا جحد وانکار کیا تھا۔ محاورے میں بولتے ہیں: "مَرَاهُ حَقٌّ أَيْ: جَحَدَهُ وَمَرَيْتُهُ أَنَا أَيْ: جَحَدْتُهُ". امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: جب کوئی کسی کو اس کے حق سے منع کرتا ہے اور اس کو دفع کرتا ہے تو کہتے ہیں: "مَرَاهُ عَنْ حَقِّهِ وَعَلَى حَقِّهِ"۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ عَلٰى ﴾ بہ معنی "عن" ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ (یعنی امام شعبی، مجاہد اور اعرج رحمہم اللہ نے) "أَفَتُمْرُوْنَهُ" بہ ضمِ تاء پڑھا ہے۔ امریت سے: "أَيْ: أَتُرِيبُوْنَهُ وَتَشُكُّوْنَ فِيهِ"[2] یعنی کیا تم اپنے شک میں ڈالنے سے اس پر غالب ہو جاؤ گے۔ ﴿ مَا يَرٰى ﴾ فرمایا، "مَا رَأَى" نہ کہا، بنا بر حکایت

---

[1] فتح البیان (۱۳/۲۴۹)
[2] تفسیر القرطبي (۱۷/۹۳) فتح القدیر (۵/۱۴۰، ۱۴۱)

حالِ ماضی واسطے مستحضر کرنے حالتِ بعید کے مخاطبوں کے ذہن میں۔

﴿ وَلَقَدْ ﴾ میں حرفِ لام توطیہ قسم ہے، "أَيْ: وَاللّٰهِ لَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى" نزلہ مرہ نزول سے ہے۔ نصب اس کا بنا برظرف ہے۔[1] (كما ذكره الزمخشري) یہ مذہب بصریوں کا نہیں ہے، یہ صرف امام فراء رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ مکی نے فراء سے اس کو نقل کیا ہے۔ یا منصوب ہے اس مصدر کی بنا پر جو موقعِ حال میں واقع ہوتا ہے۔ مکی نے کہا: "أَيْ: رَآهُ نَازِلًا نَزْلَةً أُخْرَى"۔ امام حوفی اور ابن عطیہ رحمہما اللہ اسی طرف گئے ہیں، یا منصوب ہے بنا بر مصدر مؤکد۔ پس امام ابو البقاء نے اس کی یوں تقدیر کی ہے: "مَرَّةً أُخْرَى" اور "رُؤْيَةً أُخْرَى"۔[2] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ نَزْلَةً ﴾ کی تاویل میں ساتھ رویت کے نظر ہے اور ﴿ أُخْرٰى ﴾ سبق رویت پر دلالت کرتا ہے اس کے قبل۔ بالجملہ جمہور مفسرین نے کہا ہے: معنی یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ایک اور بار اُن کی اصل صورت میں دیکھا، یہ دیکھنا شبِ معراج میں تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے رب کو ایک اور بار دیکھا اپنے دل سے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنی آنکھ سے۔ ان سب قولوں کی حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔

﴿ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴾ میں ظرف ﴿ رَاٰهُ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں ایک اور بار دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک، جبکہ آپ ﷺ کو آسمانوں میں سیر کرائی گئی۔[3] (كما قاله المحلي) من جملہ معلوم یہ بات ہے کہ ہجرت سے ایک سال چار ماہ یا تین سال قبل اسراء ہوا بنا بر خلاف۔ اور پہلی رویت بعثت کے شروع میں تھی تو ہر دو رویت کے درمیان قریباً دس سال کی مدت ہے۔

﴿ سِدْرَةِ ﴾ شجرۃ النبق ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ زیوروں اور حلوں کا پھل لاتا ہے اور سب قسم کے میووں کا۔ اگر اس کا ایک پتا زمین پر رکھ دیا جاتا تو وہ اپنے رہنے والوں کے لیے روشن ہو جاتی۔ یہ وہی درخت طوبیٰ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے سورۃ الرعد میں ذکر کیا ہے۔[4] "نبق" بہ کسرِ موحدہ ثمر ہے سدر کا، اس کا واحد "نبقة" ہے، اس میں "نبق" بہ فتحِ نون وسکونِ موحدہ بھی کہا جاتا ہے۔ یعقوب نے اصلاح میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ بصریوں کی لغت ہے۔ سب سے زیادہ فصیح لغت پہلی ہے اور نبی اکرم ﷺ سے وہی ثابت ہوا ہے۔ یہ سدرہ چھٹے آسمان میں ہے، جیسا کہ صحیح میں آیا ہے۔[5] یہ بھی مروی ہے کہ ساتویں آسمان میں ہے عرش کے دائیں جانب۔

"منتهىٰ" مکانِ انتہا ہے، یا مصدر میمی ہے اور خود اس سے مراد انتہا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ میں کئی قول ہیں: ایک یہ ہے کہ خلائق کا علم اسی تک منتہی ہوتا ہے، اس کے ماوراء کو ان سے کوئی نہیں جانتا۔ دوسرا یہ ہے کہ شہداء کی روحیں اس کی طرف منتہی ہوتی ہیں۔ اس کے سوا اور قول بھی ہیں، بعض کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ وغیرہ

---

[1] الكشاف (٤/٤٢١) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٨/١٦٩) [3] تفسير الجلالين (١/٧٠١)
[4] تفسير البغوي (٧/٤٠٥) [5] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

نے آٹھ قول ذکر کیے ہیں۔[1] شجرہ کی اضافت ''منتھیٰ'' کی طرف ''اضافتِ شیء الی مکانہ'' کے باب سے ہے جیسے کہتے ہو: ''أَشْجَارُ الْبُسْتَانِ''۔ یا اضافتِ محل الی الحال کے قبیل سے ہے جیسے بولتے ہو: ''كِتَابُ الْفِقْهِ''۔ تقدیر یہ ہے: ''عِنْدَ سِدْرَةٍ عِنْدَهَا مُنْتَهَى الْعُلُوْمِ'' یعنی سدرہ کے نزدیک کہ اس کے پاس علوم کا منتھیٰ ہے۔ یا ''اضافتِ ملک الی مالک'' کی وادی سے ہے بنا بر حذفِ جار و مجرور۔ ''أَيْ: سِدْرَةُ الْمُنْتَهَى إِلَيْهِ'' یعنی سدرہ اس کا جس کی طرف انتہا ہے، یعنی اللہ عزوجل۔ اللہ سبحانہٗ نے فرمایا: ﴿ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴾ [النجم: ٤٢] ''اور یہ کہ آپ کے رب ہی کی طرف پہنچنا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴾ یعنی اس سدرہ کے نزدیک ایک جنت ہے جو معروف بجنۃ الماوی ہے، یہ جنت عرش کے دائیں طرف ہے، اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ آدم علیہ السلام نے اس کی طرف ٹھکانا پکڑا۔ کسی نے کہا ہے کہ شہداء کی روحیں اس کی طرف ٹھکانا پکڑتی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ جبریل علیہ السلام اور فرشتے۔ کسی نے کہا ہے کہ متقی لوگ اس کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ جمہور نے ﴿ جَنَّةُ ﴾ بہ رفع پڑھا ہے بنا بر ابتداء اور ظرف متقدم اس کی خبر ہے۔ کسی نے ''جَنَّهُ'' بہ صیغۂ فعل ماضی پڑھا ہے ماخوذ ''جَنَّ يَجُنُّ'' سے: ''أَيْ: ضَمَّهُ الْمَبِيْتُ أَوْ سَتَرَهُ إِيْوَاءُ اللّٰهِ لَهُ''۔ یعنی ان کو شب باشی نے ملا لیا، یا ان کو اللہ کے جگہ دینے نے چھپا لیا۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: اور جیسے کہ تم کہتے ہو: ''جَنَّهُ اللَّيْلُ أَيْ: سَتَرَهُ وَأَدْرَكَهُ''۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنت سمائے سابعۂ علیا میں ہے اور نار ارضِ سابعۂ سفلیٰ میں۔[3]

﴿ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴾ اس ظرف میں بھی عامل ﴿ رَاٰهُ ﴾ ہے۔ یہ ظرفِ زمان ہے اور پہلا ظرفِ مکان تھا۔ ''غشیان'' بہ معنی تغطیہ وستر ہے، یعنی کسی شے کو ڈھانک دینا، چھپا دینا۔ ''إتیان'' کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ ''فُلَانٌ يَغْشَانِي كُلَّ حِيْنٍ'' یعنی فلاں میرے پاس ہر وقت آتا ہے۔ صیغۂ مضارع ماضی کی حکایت کے واسطے ہے جو صورتِ بدیعہ کے متحضر کرنے کے لیے ہے۔ یا استمرارِ تجددی کے بتانے کے لیے ہے اور موصول وصلہ کے ابہام میں جو ڈھانکنے والی اشیاء کی تعظیم وتکثیر ہے، وہ مخفی نہیں ہے۔ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ جو خلائق کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت پر دال ہیں جنھوں نے سدرہ کو ڈھانک لیا تھا اور اس پر چھا رہی تھیں، وہ ایسی اشیاء ہیں کہ ان کی صفت بیان نہیں ہوسکتی اور نہ ہی کوئی تعریف اور وصف ان کی حقیقت کو ظاہر کرسکتی ہے اور نہ کوئی عدد شمار کر کے پورا بتا سکتا ہے، یعنی آپ نے اس کو جس وقت دیکھا اس وقت اس بیری کے درخت کو ڈھانک رہا تھا جو کچھ کہ ڈھانک رہا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ اس کا مت پوچھو کہ کیا کچھ تھا، وہ بیان سے باہر ہے اللہ ہی اس کو جانتا ہے۔ ﴿ مَا يَغْشٰى ﴾

---

[1] تفسير القرطبي (٩٥/١٧) [2] تفسير القرطبي (٩٦/١٧) [3] الدر المنثور (٦٥١/٧)

میں کئی قول ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ سونے کی ٹڈیاں اس کو ڈھانک رہی تھیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: سونے کے پروانے۔[1] یہ اور بعض قول پہلے گزر چکے ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا: یہ بات ضعیف ہے (یہ بات ضعیف نہیں بلکہ قوی ہے، کیوں کہ ادلہ سمعیہ سے ''فراش من ذهب'' کا ''غشیان'' احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوا ہے۔ چنانچہ اہلِ معرفت پر پوشیدہ نہیں۔ مصحح سلمه الله تعالى)۔ کیونکہ یہ ثابت نہیں ہوتی مگر کسی دلیل سمعی سے، چنانچہ اگر اس میں کوئی خبر صحیح ہو جائے تو فبہا ورنہ پھر اس کی کوئی وجہ نہیں۔[2]

﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ ﴾ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بصر اس شے سے مائل نہ ہوئی جس کو دیکھا اور نہ اس شے کی طرف التفات کیا جس نے سدرہ کو ڈھانکا تھا، یعنی سونے کے پروانے وغیرہ۔ یہ معنی تو اس خیال سے ہیں کہ جس شے نے سدرہ کو ڈھانکا تھا وہ سونے کے پروانے وغیرہ ہوں اور اس اعتبار سے کہ وہ اللہ پاک کے انوار تھے تو یہ معنی ہوں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں اور بائیں توجہ نہ کی، بلکہ انوارِ الٰہی کے مطالعے میں مشغول رہے، باوجود اس کے کہ وہ عالم بنی آدم کے لیے عجیب وغریب ہے اور اس میں وہ عجائبات ہیں کہ دیکھنے والے کو حیران کر دیتے ہیں۔

﴿ وَمَا طَغٰی ﴾ یعنی آپ کی بصر نے اس شے سے تجاوز نہ کیا جو دیکھی۔ کسی نے کہا ہے کہ اس شے سے تجاوز نہ کیا جس کا ان کو امر ہوتا تھا، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کا وصف ظاہر ہوتا ہے، اس مقام میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے التفات نہ کیا اور نہ اپنی آنکھ کو مائل کیا اور نہ بڑھایا ﴿ مَا رَاٰی ﴾ کے علاوہ کسی طرف، بلکہ جس شے کے دیکھنے کا حکم تھا صرف اسی میں مشغول رہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ایک یہ قول نقل کیا ہے کہ سدرہ کو اللہ پاک کے انوار ڈھانک رہے تھے،[3] کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کے پاس پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب نے اس کے لیے تجلی کی، جیسے کہ پہاڑ کے لیے تجلی کی تھی۔ پس انوار ظاہر ہوئے لیکن سدرہ اس پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور ثابت تھا کہ پہاڑ تو ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا اور وہ درخت متحرک نہ ہوا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم متزلزل نہ ہوئے۔ کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح شریف میں خوب کہا ہے:

موسیٰ زہوش رفت بیک پرتو صفات   تو عین ذات می نگری در تبسمے

یعنی موسیٰ علیہ السلام (اللہ کی) صفات کے ایک ہی پرچھائیں سے بے ہوش ہو گئے، آپ اس کی حقیقی ذات کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔''

یہ مضمون اس قول کی بنا پر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔

﴿ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴾ یعنی واللہ! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات واقعی اپنے رب کی بڑی آیتوں میں سے وہ شے دیکھی جس کا وصف بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کسی نے کہا ہے کہ رفرف دیکھا کہ اس نے افق کو بند

---

[1] تفسیر الطبري (٥١٩/٢٢) [2] تفسیر الرازي (٢٥٣/٢٨) [3] تفسیر القرطبي (٩٧/١٧)

کر دیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ جبریل علیہ السلام کو حلۂ سبز میں دیکھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ملکوت کے عجائبات دیکھے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ہر وہ شے ہے جو آپ ﷺ نے اس رات اپنے جانے اور واپس آنے کے وقت دیکھی۔

﴿ اَلْكُبْرٰى ﴾، ﴿ رَاٰى ﴾ کا مفعول بہ ہے اور ﴿ مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ ﴾ حالِ مقدم ہے، تقدیر یہ ہے: ''لَقَدْ رَآى الآيَاتِ الْكُبْرٰى حَالَ كَوْنِهَا مِنْ جُمْلَةِ آيَاتِ رَبِّهِ'' یعنی دیکھیں بڑی نشانیاں درآنحال کہ اپنے رب کی نشانیوں کے جملے سے تھیں۔ سمین نے اس وجہ کو ظاہر کہا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ رَاٰى ﴾ کا مفعول ﴿ مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ ﴾ ہے اور ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے اور ﴿ اَلْكُبْرٰى ﴾ صفت ﴿ اٰيٰتِ رَبِّهِ ﴾ کی ہے۔ ''أَيْ: رَآى بَعْضَ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى''۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے اور ﴿ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴾ ﴿ رَاٰى ﴾ کا مفعول ہے۔ ''أَيْ: رَآى آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى''۔ رفرف یا تو اسمِ جنس ہے یا اسمِ جمع ہے، اس کا واحد ''رفرفة'' ہے۔ کسی نے کہا: رفرف وہ قیمتی کپڑے ہیں جو تختوں پر لٹکتے ہیں۔ کسی نے کہا: فروش کی ایک قسم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وسائد (تکیے) ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ نمارق (غالیچے) ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر لمبا چوڑا کپڑا رفرف ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنے تذکرے میں معراج کی حدیث کے تحت ذکر کیا ہے کہ رفرف اللہ تعالیٰ کے روبرو خادموں میں سے ایک خادم ہے اس کے لیے قریب کی جگہ میں خاص کام ہیں جس طرح کہ براق ایک دابہ (چوپایہ) ہے جس پر انبیاء سوار ہوتے ہیں، وہ زمین میں خاص اس کام کے لیے ہے۔[2]

وصل: اس میں امام نووی رحمہ اللہ کے کلام کا ذکر ہے جو انھوں نے ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴾ میں ذکر کیا ہے اور کیا نبی اکرم ﷺ نے اپنے رب عزوجل کو شبِ معراج میں دیکھا یا نہیں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سلف و خلف نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ کیا آپ ﷺ نے شبِ معراج میں اپنے رب تعالیٰ کو دیکھا یا نہیں۔ پس سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے تو اس کا انکار کیا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں واقع ہوا ہے اور اسی کے مثل سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ایک جماعت سے آیا ہے اور یہی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مشہور ہے اور اسی طرف محدثین اور متکلمین کی ایک جماعت گئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا، اسی کے مثل سیدنا ابوذر، کعب رضی اللہ عنہما اور امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے اور حسن رحمہ اللہ اس پر قسم اٹھاتے تھے اور اسی کے مثل سیدنا عبداللہ بن مسعود، ابوہریرہ رضی اللہ عنہما اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے حکایت کیا گیا ہے۔

اصحابِ مقالات نے ابوالحسن اشعری اور اُن کے اصحاب کی ایک جماعت سے حکایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ کو دیکھا اور ہمارے بعض مشائخ نے اس میں توقف کیا ہے اور کہا ہے کہ اس پر کوئی واضح دلیل نہیں ہے، لیکن

[1] تفسير القرطبي (١٧/٩٨) [2] التذكرة للقرطبي (١/٩٣٥)

یہ جائز ہے اور دنیا میں اللہ عزوجل کی رویت جائز ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا رویت کا سوال کرنا اس کے جواز پر دلیل ہے، کیوں کہ کوئی نبی اس شے کے بارے میں جاہل یعنی ناواقف نہیں ہوتا جو اس کے رب پر جائز ہے یا ممنوع ہے اور اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ آیا ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں اپنے رب سے بلا واسطہ کلام کیا یا نہیں۔ پس اشعری اور متکلمین کی ایک جماعت سے یہ حکایت کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے کلام کیا۔

بعض نے اس قول کی نسبت جعفر بن محمد رحمہ اللہ، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی طرف کی ہے۔ اسی طرح ﴿ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴾ میں اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ اکثر کا خیال تو یہ ہے کہ یہ "دنو و تدلی" جبریل علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان منقسم ہے، یا ان میں سے ایک کے ساتھ دوسرے کے حق میں مختص ہے، یا سدرۃ المنتہیٰ سے مختص ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وحسن ومحمد بن کعب وجعفر بن محمد رحمہم اللہ وغیرہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ "دنو" نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے رب کی طرف ہے، یا اللہ تعالیٰ سے ہے۔ چنانچہ اس قول کی بنا پر "دنو و تدلی" متاول (تاویل کیا گیا) ہوگا اپنی وجہ پر نہ رہے گا، بلکہ ویسا ہے جو جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "دنو" اللہ سے اس کی کوئی حد نہیں اور بندوں سے محدود ہے۔

پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا "دنو" اور اللہ سے قرب کے معنی اللہ کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم منزلت کا ظاہر ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ کی مغفرت حاصل ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے غیب اور اسرارِ ملکوت میں سے اس شے پر مطلع ہونا ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور مطلع نہیں ہوا۔ اور "دنو" سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے امورِ مذکورہ کو ظاہر کرنا ہے اور اللہ سبحانہٗ کا عظیم بر اور فضل ہے اس کے نزدیک۔ اور یہاں ﴿ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ﴾ عبارت ہے لطفِ محل سے اور معرفت کے واضح کرنے سے اور حقیقت پر مطلع ہونے سے۔ یہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رغبت کا قبول کرنا اور منزلت کا ظاہر کرنا ہے۔

یہ قاضی عیاض کے کلام کا آخر ہے جیسا کہ شیخ محی الدین یعنی امام نووی رحمہ اللہ نے اس کو نقل فرمایا ہے۔ اب رہے صاحبِ تحریر تو انھوں نے رویت کے ثابت ہونے کو اختیار کیا ہے۔ کہا: اس مسئلے میں حجتیں بہت ہیں، لیکن ہم ان میں سے سب سے مضبوط حجت سے تمسک کرتے ہیں (چمٹتے ہیں یا پکڑتے ہیں) اور وہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے کہ کیا تم تعجب کرتے ہو اس بات میں کہ خلت تو ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہو۔ الخ۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور امام عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب تعالیٰ کو دیکھا؟ فرمایا: ہاں! اور باسناد "لا بأس به عن شعبة عن قتادة عن أنس" مروی ہے، کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا اور حسن رحمہ اللہ قسم اٹھایا کرتے تھے کہ البتہ واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا۔

اصل مسئلے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے جو اس اُمت کے حبر و عالم ہیں اور مشکلات میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور درحقیقت سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس مسئلے میں ان کی طرف مراسلت

ومراجعت کی کہ کیا نبی کریم ﷺ نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا تو اُن کو یہ خبر دی کہ آپ ﷺ نے اس کو دیکھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث اس میں قدح (عیب جوئی) نہیں کرتی ہے، اس لیے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ خبر نہیں دی کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے اپنے رب تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔

انھوں نے جو کچھ ذکر کیا ہے، اس آیت کے لیے: ﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ [الشوریٰ: ۵۱] ''ناممکن ہے کہ کسی بندے سے اللہ تعالیٰ کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے یا کسی فرشتہ کو بھیجے اور وہ اللہ کے حکم سے جو وہ چاہے وحی کرے، بے شک وہ برتر ہے حکمت والا ہے۔'' اور اس آیت کے لیے: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ﴾ [الأنعام: ۱۰۳] ''اس (کی حقیقت) کو نگاہیں نہیں پا سکتیں، اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔'' اور صحابی جب کوئی قول کہے اور اُن میں سے اس کا غیر اگر اس کی مخالفت کرے تو اس کا قول حجت نہیں ہوتا۔

اور جب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایتیں صحیح ہو چکیں تو انھوں نے اس مسئلے میں رویت کا ثابت ہونا بیان کیا ہے تو اس کے ثابت ہونے کی طرف رجوع ہونا واجب ہے، اس لیے کہ یہ مسئلہ اس قبیل سے نہیں ہے جس کو عقل سے سمجھا جاتا ہے اور جو ظن سے ماخوذ ہوتا ہے، یہ تو صرف سمع (سننے) سے لیا جاتا ہے اور کوئی بھی اس بات کو جائز نہیں سمجھتا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ اس مسئلے میں انھوں نے ظن و اجتہاد سے کلام کیا۔ معمر بن راشد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب سیدہ عائشہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا اختلاف ذکر کیا گیا کہ ہمارے نزدیک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر عالم نہیں ہیں۔

پھر یہ بات ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس شے کا اثبات کیا ہے جس کی اُن کے غیر نے نفی کی اور ثابت کرنے والا نفی کرنے والے پر مقدم ہوتا ہے، یہ کلام صاحبِ تحریر کا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا: حاصل یہ ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک راجح یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج میں اپنے سر کی دونوں آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی حدیث کی وجہ سے: جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اس امر کے اثبات کو نہیں لیتے، مگر ساتھ سننے کے رسول اللہ ﷺ سے، یہ بات اس قبیل سے ہے کہ لائق نہیں ہے کہ اس میں شک کیا جائے۔ پھر یہ بات ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم ﷺ کی کسی حدیث کے سبب سے روایت کی نفی نہیں کی۔ اور اگر اُن کے پاس کوئی حدیث ہوتی تو اس کو ذکر کرتیں، انھوں نے تو صرف آیتوں کے استنباط پر اعتماد کیا ہے۔

اب ہم ان کے جواب کی وضاحت کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا آیت: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ﴾ [الأنعام: ۱۰۳] سے حجت پکڑنا تو اس کا جواب ظاہر ہے، کیوں کہ ادراک یہی احاطہ کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور جب احاطہ کی نفی کی نص وارد ہوئی تو اس سے احاطہ کے بغیر رویت کی نفی لازم نہیں آتی۔ یہ

جواب اختصار کے ساتھ ساتھ انتہائی حسین ہے۔

اب رہا ان کا آیتِ کریمہ: ﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ ﴾ سے حجت پکڑنا تو اس کا جواب کئی وجہ سے ہے۔ ایک یہ ہے کہ رویت کے ساتھ اس حالت میں کلام کرنے کا وجود لازم نہیں ہے، پس رویت کا بغیر کلام کے وجود جائز ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس عام کی ان دلیلوں سے تخصیص کی گئی ہے جو گزر چکی ہیں۔ تیسری وجہ وہ ہے جو بعض علماء نے کہی ہے کہ وحی سے مراد بغیر واسطہ کے کلام ہے۔ یہ قول اگرچہ محتمل ہے لیکن جمہور اس پر ہیں کہ اس جگہ وحی سے مراد الہام اور رویت فی المنام ہے اور ان دونوں کا نام وحی رکھا جاتا ہے۔

رہا اللہ پاک کا یہ قول: ﴿ اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ﴾ [الشوریٰ: ٥١] پس امام واحدی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ساتھ کلام کرنے کے لیے غیر مجاہر ہے بلکہ وہ اللہ پاک کا کلام ایسی جگہ سے سنتے ہیں کہ اس کو دیکھتے نہیں ہیں، یہ مراد نہیں کہ وہاں کوئی ایسا پردہ ہے جو ایک جگہ کو دوسری جگہ سے الگ کرے اور وہ محجوب کی تحدید (اندازہ کرنا) پر دال ہو تو وہ اس شے کے مرتبے میں ہو جو پردے کے پیچھے سے سنی جاتی ہے، جہاں پر متکلم کو نہ دیکھا جائے۔[1] اور سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آپ ﷺ کا قول مبارک « نُوْرٌ أَنّٰى أَرَاهُ »[2] سو یہ بہ تنوینِ نور و فتحِ ہمزہ ہے۔ ''أَنّٰی'' میں بہ تشدیدِ نون مفتوحہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا حجاب نور ہے تو میں اس کو کیسے دیکھ سکتا ہوں؟ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''أَرَاهُ'' میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے، معنی یہ ہیں کہ نور مجھ کو رویت سے روکتا ہے جس طرح کی عادت جاری ہوئی ہے کہ انوار آنکھوں کو ڈھانک دیتے ہیں اور آنکھوں کو اس شے کے ادراک سے روکتے ہیں کہ اس کے اور دیکھنے والے کے درمیان حائل ہوئے ہیں۔

ایک روایت میں ''رَأَيْتُ نُوْرًا'' ہے،[3] اس کے معنی یہ ہیں ہے کہ میں نے نور دیکھا اور بس۔ میں نے اس کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ''ذَاتُهُ نُوْرٌ أَنّٰى أَرَاهُ''اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نور کا خالق ہے اور وہ نور اس کی رویت سے مانع ہے۔ پس یہ من جملہ صفاتِ افعال ہوگا اور یہ بات من جملہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات نور ہو، کیوں کہ نور جملہ اجسام سے ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے برتر ہے۔ یہ تمام ائمہ مسلمین کا مذہب ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم۔ امام نووی رحمہ اللہ کا کلام تمام ہوا جو خازن رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔[4] [5]

---

① المنهاج للنووي (٣/٤-٦)
② اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
③ اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
④ المنهاج للنووي (١٢/٣) تفسیر الخازن (٢٦٠/٦-٢٦٢)
⑤ شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا جو مسئلہ ہے، اس میں دلائل کی رو سے راجح بات یہی ہے کہ آپ ﷺ نے نہیں دیکھا۔ دنیا میں انبیاء علیہم السلام سمیت کوئی انسان اللہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ یہ اعزاز صرف قیامت میں اہلِ جنت کو حاصل ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ کا عرش پر جانا ہی کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ آپ ﷺ بھی صرف سدرۃ المنتہیٰ تک ہی گئے ہیں۔ جب عرش پر جانے ہی کا ثبوت نہیں ہے تو پھر رویت اور براہِ راست کلام کس طرح ثابت ہو سکتا ہے۔ معراج میں بھی آپ کو احکام وحی کے ذریعے سے دیے گئے ہیں۔ اس کی مکمل تفصیل راقم کی کتاب ''واقعۂ معراج'' (مطبوعہ دار السلام) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ (ص۔ ی)

سلیمان جمل رحمہ اللہ نے خطیب سے بھی نووی رحمہ اللہ کے مثل ذکر کیا ہے۔ فتح البیان میں فرمایا ہے کہ اس مسئلے پر قاضی عیاض رحمہ اللہ نے شفا میں کلام کیا ہے اور خفاجی رحمہ اللہ نے اس کی شرح میں کلام کیا ہے اور قسطلانی رحمہ اللہ نے شرح مواہب لدنیہ میں اور نووی نے ذکر کیا۔ بالجملہ جب اللہ پاک قصص مذکورہ ذکر کر چکا جو اس کی کمال قدرت وعظمت پر مشتمل ہیں تو اس کے بعد مشرکوں کو ملامت اور سرزنش کرنے کے لیے یوں فرمایا:[1]

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ﴿١٩﴾ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ﴿٢٠﴾

کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا؟ ⑲ اور تیسری (دیوی) مناۃ کو جو گھٹیا ہے ⑳

لات وعزیٰ ومنات کے بیان میں بت پرستوں کا رد:

مشرکوں نے جو بتوں اور انداد اور اوثان کو پوجا اور ان کے لیے کعبہ مکرمہ کی مشابہت کے لیے گھر بنائے جس کعبہ کو خلیل الرحمان علیہ السلام نے بنایا تھا تو اللہ پاک اس بارے میں ان کو ملامت کر کے فرماتا ہے کہ بھلا تم لات کو دیکھو یہ ایک سفید منقوش پتھر تھا، اس پر ایک گھر تھا طائف میں اس کے پردے اور خادم تھے اور اس کے گرد ایک بڑا سا میدان تھا۔ اہلِ طائف کے نزدیک یہ لوگ ثقیف ہیں اور اُن کے تابع جنھوں نے قریش کے بعد ان کی پیروی کی۔ اس کے سبب سے عرب کے دوسرے قبیلوں پر فخر کرتے تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے اس کا نام اللہ پاک کے اسمِ مبارک سے اشتقاق کیا تو کہا: ﴿اللّٰتَ﴾۔ ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اس سے ایک مونث ہے۔[2] تعالى الله عن ذلك علوا كبيرا.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ربیع بن انس رحمہ اللہ سے حکایت کیا گیا ہے کہ انھوں نے "اَللَّاتّ" بہ تشدیدِ تاء پڑھا ہے اور اس کی یوں تفسیر کی ہے کہ "إِنَّهُ كَانَ رَجُلًا يَلُتُّ لِلْحَجِيجِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ السَّوِيقَ"[3] یعنی وہ جاہلیت میں ایک شخص تھا جو حاجیوں کے لیے ستو گھولا کرتا تھا، پھر جب وہ مرگیا تو اس کی قبر پر جمع ہو گئے اور اس کو پوجا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ لات ایک مرد تھا جو ستو گھول کر حاجیوں کو پلایا کرتا تھا۔[4] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا اور اسی طرح عزیٰ ہے عزیز سے۔[5] یہ نخلہ میں جو مکہ اور طائف کے درمیان میں ہے اس میں ایک درخت تھا اس پر مکان اور پردے تھے۔ قریش اس کی تعظیم کیا کرتے تھے، جیسا کہ ابوسفیان نے اُحد کے دن کہا تھا کہ "لَنَا الْعُزَّى وَلَا عُزَّى لَكُمْ" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم یوں کہو: "اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلَى لَكُمْ"[6]

---

① فتح البيان (١٣/٢٤٥ـ٢٥٤) ② تفسير الطبري (٢٢/٥٢٢) ③ تفسير الطبري (٢٢/٥٢٣)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٧٨) ⑤ تفسير الطبري (٢٢/٥٢٢) ⑥ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٤)

صنم خانے:

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس شخص نے قسم کھائی اور اپنی قسم میں کہا "وَاللَّاتِ وَالْعُزَّى" تو چاہیے کہ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہے اور جس نے اپنے صاحب سے کہا: آ میں تجھ سے جوا کھیلوں، تو چاہیے کہ صدقہ دے۔ [1] چنانچہ یہ اس شخص پر محمول ہے جس کی زبان اس میں سبقت کر گئی، جیسے کہ جاہلیت میں ان کی زبانیں اس کی خوگر ہو گئی تھیں، جیسا کہ نسائی نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے لات اور عزیٰ کی قسم کھا لی تو میرے اصحاب نے کہا کہ تم نے بری بات کہی اور بے ہودہ الفاظ کہے۔ پس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو "لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" کہہ اور اپنی بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ اور پھر وہ بات نہ کہنا۔ [2]

رہا منات تو یہ مکہ و مدینہ کے درمیان قدید کے نزدیک مشلل میں تھا۔ خزاعہ، اوس اور خزرج اپنی جاہلیت میں اس کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اس سے حج بیت اللہ کے لیے احرام باندھتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ [3] جزیرۂ عرب وغیرہ میں ان تین بتوں کے علاوہ اور بت تھے جن کی وہ کعبہ کی طرح تعظیم کرتے تھے جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز میں نص فرمائی ہے۔ ان کا الگ کر کے صرف اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ اپنے غیر سے زیادہ تر مشہور ہیں۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں کہا ہے کہ عرب نے کعبے کے ساتھ طواغیت ٹھہراتے تھے اور یہ گھر تھے جن کی تعظیم کعبے کی تعظیم کی طرح کرتے تھے، ان کے خادم اور دربان تھے، ان کے لیے ہدیہ لایا جاتا تھا، جیسا کہ کعبہ کے لیے ہدیہ لایا جاتا ہے اور ان کا کعبے کے طواف کی طرح طواف کرتے تھے اور اُن کے نزدیک نحر کیا جاتا تھا، یعنی جانور ذبح کرتے تھے اور اُن گھروں میں کعبہ کی فضیلت جانتے تھے، اس لیے کہ وہ یوں مشہور تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کا گھر ہے اور اُن کی مسجد ہے۔ پس وہ تو قریش کے لیے تھا اور بنی کنانہ کے لیے نخلہ میں عزیٰ تھا اور اس کے خادم اور دربان بنی شیبان سلیم کے حلیف بنی ہاشم تھے۔ [4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کو اُس کی طرف بھیجا اور اس کو ڈھا دیا اور یہ کہنا شروع کیا:

يَا عُزَّى كُفْرَانَكِ لَا سُبْحَانَكِ　　إِنِّي رَأَيْتُ اللّٰهَ قَدْ أَهَانَكِ [5]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٧٩) صحيح مسلم (١٦٤٧) (2) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٧٧٧)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٨٠) (4) السيرة النبوية لابن هشام (٢٠٩، ٢١٠) (5) تفسير ابن كثير (٤/ ٣٢٢)

یعنی اے عزیٰ! میں تیرا انکار کرتا ہوں اور تیری پاکی نہیں بولتا ہوں۔ میں نے دیکھا اللہ کو کہ واقعی اس نے تیری اہانت کی۔

امام نسائی رحمہ اللہ نے ابو الطفیل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو نخلہ کی طرف بھیجا اور وہاں عزیٰ تھا، چنانچہ خالد اس کے پاس آئے اور وہ ببول کے تین درختوں پر تھا تو خالد رضی اللہ عنہ نے ببولوں کو کاٹ ڈالا اور اس گھر کو گرا دیا جو اس پر تھا، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو لوٹ جا، پس بے شک تو نے کچھ نہ کیا، پھر خالد لوٹے، چنانچہ جب ان کو سدنہ نے دیکھا، یہ اس کے دربان ہیں "أَمْعَنُوا فِيْ الْحِيَلِ"، یعنی انھوں نے حیلوں میں غور کیا، مطلب یہ ہے کہ تدبیریں سوچیں۔ واللہ أعلم.

اور وہ کہتے تھے: "يَا عُزَّى يَا عُزَّى"۔ خالد رضی اللہ عنہ اس کے پاس آئے تو دیکھا تو ایک ننگی عورت سر کے بال بکھیرے ہوئے تھی، اپنے سر پر خاک کی لپیں بھر کر ڈال رہی تھی، "فَغَمَسَهَا بِالسَّيْفِ"، یعنی پھر اس کو گہرا زخم لگایا، یہاں تک کہ اسے مار ڈالا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ عزیٰ ہے۔[1]
امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: لات ثقیف کے لیے طائف میں تھا اور اس کے خادم اور دربان بنی معتب تھے۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف مغیرہ بن شعبہ اور ابو سفیان صخر بن حرب رضی اللہ عنہما کو بھیجا تو انھوں نے اس کو گرا دیا اور طائف میں اس کی جگہ ایک مسجد بنا دی۔[3] امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منات اوس اور خزرج کے لیے تھا اور اُن کے لیے تھا جنھوں نے یثرب والوں میں سے کنارۂ دریا پر جو قدید میں ناحیہ مشلل سے تھا، ان کا دین اختیار کیا تھا۔[4] چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف ابو سفیان صخر بن حرب رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور اس کو گرا دیا۔ اور کہا جاتا ہے کہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو کہا اور ذوالخلصہ دوس، خثعم اور بجیلہ کے لیے تھا اور ان کے لیے تھا جو اُن کے شہروں میں عرب تھے تبالہ میں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کو کعبۂ یمانیہ کہا جاتا تھا اور جو کعبہ مکہ میں ہے، اس کو کعبہ شامیہ کہا جاتا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تو اس نے اس کو گرا دیا۔ کہا: اور فلس طی کے لیے تھا اور جبلِ طی میں سلمی واجاء کے درمیان جو لوگ تھے ان کے لیے تھا۔[5] ابن ہشام نے کہا مجھے بعض اہلِ علم نے حدیث کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اس کی طرف بھیجا تو انھوں نے اس کو گرا دیا اور اس سے دو تلواریں رسوب و مخذم منتخب کیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں ان کو دے دیں سو یہ دونوں علی رضی اللہ عنہ کی تلواریں ہیں۔

---

(1) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٧٤/٦) (2) السيرة النبوية لابن هشام (٢١٠/١) (3) تفسير ابن كثير (٥٢٣/٤)
(4) السيرة النبوية لابن هشام (٢١٠/١) (5) تفسير ابن كثير (٣٢٣/٤)

ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: حمیر و اہلِ یمن کے لیے ایک گھر تھا صنعا میں جس کو ریام کہا جاتا تھا۔[1] ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں ایک سیاہ کتا تھا اور دو حمیری شخص جو تبع کے ساتھ گئے تھے۔ انھوں نے اس کو نکالا اور قتل کر ڈالا، اس گھر کو گرا دیا۔

ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا اور رضاء ایک گھر تھا بنی ربیعہ بن کعب بن سعد بن زید بن مناۃ بن تمیم کے لیے۔ مستوغر بن ربیعہ کعب بن سعد اسی کے لیے کہتا ہے، جبکہ اس کو اسلام میں ہدم کیا:

وَلَقَدْ شَدَدْتُ عَلَى رُضَاءَ شَدَّةً فَتَرَكْتُهَا قَفْرًا بِقَاعٍ أَسْحَمَا

یعنی البتہ واقعی میں نے رضا پر ایک سخت حملہ کیا اور میں نے اس کو چھوڑ دیا ایک سیاہ چٹیل میدان میں۔

ابن ہشام رحمہ اللہ نے کہا: کہا جاتا ہے کہ یہ شخص تین سو تیس برس زندہ رہا اور یہی ان شعروں کا قائل ہے:

وَلَقَدْ سَئِمْتُ مِنَ الْحَيَاةِ وَطُولِهَا وَعُمِرْتُ مِنْ عَدَدِ السِّنِيْنَ مِئِيْنَا
مِائَةٌ حَدَتْهَا بَعْدَهَا مِائَتَانِ لِيْ وَعُمِرْتُ مِنْ عَدَدِ الشُّهُوْرِ سِنِيْنَا
هَلْ مَا بَقِيَ إِلَّا كَمَا قَدْ فَاتَنَا يَوْمٌ يَمُرُّ وَلَيْلَةٌ تَحْدُوْنَا

یعنی البتہ میں واقعۂ زندگی سے اور اس کی درازی سے اکتا گیا اور عمر دیا گیا میں برسوں کی زندگی سے سیکڑوں کی۔ ایک سو ہے کہ ہانکا اس کو اس کے بعد دو سو نے، یعنی تین سو برس ہوئی اور عمر دیا گیا میں مہینوں کے شمار سے برسوں کی، یعنی تین سو پر اور برس گزرے، بھلا اب نہیں باقی رہا مگر ویسا جو ہم سے فوت ہو چکا ہے کہ ایک دن گزرتا ہے اور ایک رات ہم کو ہانکے لیے جاتی ہے۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بکر و تغلب فرزندانِ وائل کے لیے اور ایاد کے لیے ذو الکعبات تھا۔ سنداد میں، اعشی بن قیس بن ثعلبہ اسی کے لیے یہ کہتا ہے:

بَيْنَ الْخَوَرْنَقِ وَالسَّدِيْرِ وَبَارِقٍ وَالْبَيْتِ ذِي الْكَعْبَاتِ فِيْ سَنْدَادِ[2]

(خورنق نعمان بن منذر کے محل کا نام ہے، سدیر بھی ایک محل کا نام ہے۔ بارق یمن کے ایک قبیلے کا نام ہے اور کوفہ کے نزدیک ایک جگہ ہے۔ سنداد بالکسر ایک ندی کا نام ہے)۔[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ تم مجھے ان معبودوں کی خبر دو جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، کیا ان کو کوئی قدرت ہے جس کے ساتھ وہ موصوف ہیں، کیا انھوں نے تمھاری طرف کسی شے کی وحی کی ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کی طرف وحی کی، یا وہ جمادات ہیں کہ نہ عقل رکھتے ہیں نہ نفع پہنچاتے ہیں۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمزہ انکار کا ہے اور حرفِ فاء اس کے متوجہ کرنے کے لیے ہے اللہ تعالیٰ کی رؤیت کی طرف اس کے شیون

[1] تفسیر ابن کثیر (٧/ ٤٥٧) [2] السيرة النبوية لابن هشام (١/٢١٢_٢١٣) [3] تفسیر ابن کثیر (٤/٣٢١_٣٢٣)

مذکورہ پر جو بتوں سے انتہا درجے کی منافات رکھتے ہیں۔[1]

معنی یہ ہیں: کیا اس کے بعد جو تم نے سنی اللہ تعالیٰ کی کمال عظمت کے آثار اور احکامِ قدرت و نفاذِ امر ملائے اعلیٰ ''وما تحت الثریٰ وما بینهما'' میں دیکھا تم نے ان بتوں کو ان کی انتہائی ذلت اور حقارت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے شریک ہوتے ہوئے باوجود اللہ کی عظمت کے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان تین بتوں کا ذکر کیا جو عرب میں مشہور ہو رہے تھے اور ان میں ان کا عظیم اعتقاد تھا۔

امام واحدی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ ان بتوں کے لیے اسمائے الٰہی سے ناموں کا اشتقاق کرتے تھے۔ چنانچہ کہا کہ لات تو اللہ سے اور عزیٰ عزیز سے ہے۔ عزیٰ تانیث ہے اعز کی، یعنی عزیزہ اور مناۃ ماخوذ ہے ''مَنَى اللّٰهُ الشَّيْءَ إِذَا قَدَّرَهُ'' سے۔ جمہور نے بہ تخفیفِ تاء پڑھا ہے، یہ اللہ کے اسم سے ماخوذ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی اصل ''لات یلیت'' ہے تو اب حرفِ تا اصلی ہو گا۔ کسی نے کہا ہے کہ زاید ہے اور اصل اس کی ''لَوىٰ يَلْوِيْ'' ہے۔ ''لِأَنَّهُمْ كَانُوْا يَلْوُوْنَ أَعْنَاقَهُمْ إِلَيْهَا أَوْ يَلْتَوُوْنَ وَيَعْتَكِفُوْنَ عَلَيْهَا وَيَطُوْفُوْنَ بِهَا''[2] یعنی لات نام اس لیے رکھا کہ وہ لوگ اپنی گردنیں اس کی طرف جھکاتے تھے یا اس پر اعتکاف کرتے اور اس کا طواف کرتے تھے۔

قراء نے اختلاف کیا ہے کہ آیا اس پر بہ تاء وقف کیا جائے یا بہ ہاء۔ سو جمہور نے تو اس پر بہ تاء وقف کیا ہے اور امام کسائی رحمہ اللہ نے بہ ہاء وقف کیا ہے۔ امام زجاج اور فراء رحمہ اللہ نے وقف بہ تاء اختیار کیا ہے رسمِ مصحف کی اتباع کے سبب سے، اس لیے کہ بہ تاء لکھا جاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ (یعنی ابن الزبیر رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، منصور بن معتمر، ابو الجوزاء، ابو صالح اور حمید رحمہم اللہ) نے بہ تشدید تاء پڑھا ہے۔ یہ قراءت ابن کثیر رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ اس کی توجیہ میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول تو پہلے گزر چکا ہے کہ ایک شخص تھا جو حاجیوں کے لیے ستو گھولا کرتا تھا۔ پس اصل میں یہ اسمِ فاعل ہے، اس شخص پر غالب ہو گیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ پہاڑ کی چوٹی پر ایک شخص تھا اس کی کچھ بکریاں تھیں، ان کے دودھ اور گھی سے حیس بناتا تھا اور حاجیوں کو کھلاتا تھا اور یہ بطنِ نخلہ میں تھا، پھر جب وہ مر گیا تو اس کو پوجنے لگے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثقیف میں سے ایک شخص تھا، اس کے لیے بکریوں کا ایک گلہ تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شخص عامر بن ظرب عدوانی ہے اور یہ بت ثقیف کا ہے، اسی کے حق میں شاعر کہتا ہے:

لَا تَنْصُرُوْا اللَّاتَ إِنَّ اللّٰهَ مُهْلِكُهَا وَكَيْفَ يَنْصُرُكُمْ مَنْ لَيْسَ يَنْتَصِرُ

یعنی تم لات کی مدد مت کرو، بے شک اللہ اس کو ہلاک کرنے والا ہے اور وہ شخص تمھاری مدد کیسے کرے گا جو خود بدلہ نہیں لے سکتا۔

صحاح میں کہا ہے کہ لات ثقیف کے ایک بت کا نام ہے اور وہ طائف میں تھا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ عکاظ

[1] تفسیر أبي السعود (١٥٨) [2] فتح القدير (١٤٢/٥) [3] تفسير القرطبي (١٠٠/١٧، ١٠١) فتح القدير (١٤٢/٥)

میں تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ نخلہ میں تھا۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔ "اللات" میں الف و لام زائدہ لازمہ ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زایدہ نہیں ہے۔ یہ قول غلط ہے (اس میں اختلاف ہے کہ لات و عزیٰ دو علم ہیں بالوضع یا دو صیغۂ غالب ہیں۔ اس اختلاف کی بنا پر حذفِ الف و لام کا جواز اور عدمِ جوازِ حذف مترتب ہوتا ہے، چنانچہ اگر ہم یہ کہیں کہ اصل میں دونوں وصف میں ہیں، ان سے الف لام حذف نہ کیا جائے گا اور اگر یوں کہیں کہ دو صفتیں ہیں اور الف لام بسبب "لمح" صفت ہے تو حذفِ الف لام جائز ہوگا اور بر دو تقدیر الف لام زاید ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دو صفت غالب ہیں، مثل الحارث والعباس کے تو اب الف لام زائد نہ ہوگا۔[1] یہ قول غلط ہے، اس لیے کہ جو الف و لام بسبب "لمح" صفت کے ہوتا ہے، اس کی زیادت پر نص کی گئی ہے، اس معنی میں کہ اس نے تعریف کا اثر نہ کیا۔ کما قاله السمین)۔

"عُزَّی" ماخوذ ہے "عز" سے اور یہ "أَعَزُّ" کی تانیث ہے۔ قریش اور بنی کنانہ کے ایک بت کا نام ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غطفان کے لیے ایک درخت تھا جسے وہ پوجا کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس کی طرف بھیجا تو انھوں نے اسے کاٹ ڈالا۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک سفید پتھر تھا جسے پوجا کرتے تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بطنِ نخلہ میں ایک گھر تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عزیٰ بطنِ نخلہ میں تھا اور لات طائف میں تھا اور منات قدید میں تھا۔ منات بنی ہلال کا بت تھا۔ امام ابن ہشام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہذیل وخزاعہ کا بت تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انصار کا بت تھا۔[2]

جمہور نے ﴿ مَنٰوةَ ﴾ کو بہ الف پڑھا ہے بغیر ہمزہ کے اور ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی ابن محیصن، حمید، مجاہد اور سلمی رحمہم اللہ) نے بہ ہمزہ پڑھا ہے۔ پس اول کا اشتقاق تو "مَنَى يَمْنِي" بہ معنی "صَبَّ" سے ہے، اس لیے کہ ذبیحہ جانوروں کے خون اس کے پاس بٹوئے جاتے تھے، اس سے اس کی طرف تقرب کرتے تھے۔ دوسری کا اشتقاق "نَوْءٌ" سے ہے "نَوْءٌ" بہ معنی مطر ہے، اس لیے کہ اس کے پاس "أَنْوَاء" سے بارش طلب کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ دونوں عرب کے دو لغت ہیں۔ اشعارِ عرب میں دونوں واقع ہوئے ہیں۔ جمہور قراء نے بہ تاء اس پر وقف کیا ہے، رسمِ مصحف کی اتباع کے سبب سے اور امام ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی ابن محیصن رحمہ اللہ) نے بہ ہاء پڑھا ہے۔ صحاح میں کہا ہے کہ منات ایک بت کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان تھا، حرفِ ہاء تانیث کے لیے ہے اور بہ حرف تاء اس پر سکتہ کیا جاتا ہے، یہ ایک لغت ہے۔[3]

﴿ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى ﴾ صفت ہے ﴿ مَنٰوةَ ﴾ کی، اس کو جو یوں موصوف کیا کہ وہ ثالثہ ہے اور یوں کہ وہ

---

[1] التبيان (في إعراب القرآن (١١٨٧/٢) [2] فتح القدير (١٤٢/٥) [3] تفسير القرطبي (١٠٢،١٠١/١٧) فتح القدير (١٤٣،١٤٢/٥)

اخریٰ ہے، حالاں کہ ثالثہ نہیں ہوتا مگر اخریٰ، سو اخریٰ کے ساتھ وصف کرنا تاکید کے لیے ہے۔[1] (کما قاله البقاء) ثالثہ کا اخریٰ کے ساتھ وصف مشکل سمجھا گیا ہے، حالاں کہ عرب لوگ اخریٰ کے ساتھ حرفِ ثانیہ کا وصف کرتے ہیں۔ چنانچہ امام خلیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ صرف اس لیے کہہ دیا ہے کہ رؤسِ آیات موافق ہو جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ مَاٰرِبُ اُخْرٰی ﴾ [طٰہٰ: ۱۸]

امام حسین بن فضل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر یہ ہے: "أَفَرَأَیْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰی الْأُخْرَی وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ"۔[2] کسی نے کہا ہے ﴿ مَنٰوةَ ﴾ کا وصف "أُخریٰ" کے ساتھ تعظیم کے قصد کے لیے ہے، اس لیے کہ وہ مشرکوں کے نزدیک عظیم تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ تحقیر اور مذمت کے لیے ہے اور مراد یہ ہے: "اَلْمُتَأَخِّرَةُ الْوَضِیْعَةُ الْمِقْدَارِ" یعنی منات پھسڈی نیچے کے رتبے کا، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ ﴾ [الأعراف: ۳۸] "پچھلے لوگ پہلے لوگوں کی نسبت کہیں گے۔" "أَيْ: وَضْعَاءُهُمْ لِرُؤَسَائِهِمْ" یعنی ان کے کمینوں نے اپنے سرداروں سے کہا۔ یہ وجہ زمخشری رحمہ اللہ کی ہے۔[3] امام ابن عادل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں نظر ہے، اس لیے کہ "أخری" صرف غیریت پر دال ہے اور اس میں مدح کا تعرض نہیں ہے، نہ مذمت کا تعرض ہے، پھر اگر اس میں سے کوئی شے آئے گی تو کسی قرینۂ خارجی کے سبب سے آئے گی۔[4] انصاف سے دیکھو تو زمخشری کی وجہ نہایت بلیغ اور پاکیزہ ہے اور ابن عادل کی نظر صرف ہٹ دھرمی ہے۔ بالجملہ پھر اللہ پاک نے مشرکوں کو ملامت اور توبیخ فرمائی ایک برے قول کی وجہ سے جو انھوں نے کہا تھا۔ چنانچہ فرمایا:[5]

﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝۲۱ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝۲۲ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝۲۳ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ۝۲۴ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ۝۲۵ ﴾

کیا تمھارے لیے بیٹے ہیں اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟ (21) یہ تو پھر بڑی ہی بے انصافی کی تقسیم ہے (22) یہ تو محض چند نام ہی ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کی کوئی دلیل و برہان نازل نہیں کی، وہ لوگ تو گمان ہی کی پیروی کرتے ہیں اور اس چیز کی

[1] التبيان في إعراب القرآن (۱۱۸۸/۲) [2] تفسير القرطبي (۱۰۲/۱۷) [3] الكشاف (٤٢٤/٤)
[4] اللباب في علوم الكتاب (۱۸۱/۱۸) [5] فتح البيان (۱۳/۲۵۵۔۲۵۷)

جو اُن کے دل چاہتے ہیں، حالاں کہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس یقیناً ہدایت آ چکی ہے ﴿23﴾ کیا انسان کے لیے (ہر چیز میسر) ہے جو وہ تمنا کرے؟ ﴿24﴾ چناں چہ اللہ ہی کے لیے ہے آخرت اور دنیا ﴿25﴾

مشرکین کے اپنے لیے بیٹے اور اللہ کی اولاد بیٹیاں ماننے کی ایک بے انصاف تقسیم:

بتوں کے نام رکھے تھے، کافر کہتے تھے: یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اُن کی ماں جنوں کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ ہی کے ہاتھ یہ جہاں اور وہ جہاں بھی ہے، یعنی بتوں کو پوجنے سے کیا ملتا ہے ملتا وہی ہے جو اللہ دے۔ انتھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کیا تم اللہ کے لیے اولاد ٹھہراتے ہو۔ اس کی اولاد کو تو بیٹیاں قرار دیتے ہو اور اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہو۔ پس اگر تم اور تمھارے جیسی اور مخلوق یہ تقسیم کرتی تو یہ تقسیم ظلم اور باطل ہوتا، پھر تم اپنے پروردگار سے اس قسم کی تقسیم کیوں کرتے ہو اور اگر ایسی تقسیم دو مخلوق کے درمیان ہوتی تو ظلم اور کم عقلی ٹھہرتی، پھر جو انھوں نے کذب، افتراء اور کفر بنا نکالا کہ بتوں کی پوجا کی اور اُن کا نام اللہ رکھا تو اس بارے میں اللہ پاک ان پر انکار کر کے فرماتا ہے کہ یہ سب نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے یعنی خود تم نے اپنی طرف سے رکھ لیے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ اللہ نے ان کی کوئی حجت نہیں اتاری۔ ان کے لیے کوئی سند نہیں ہے، مگر ان کا اپنے بڑوں پر نیک گمان جو یہ باطل راہ چلے ان سے پہلے اور مگر ان کے جیوں کا اپنی ریاست میں مزہ اٹھانا اور اپنے پہلے پرکھوں کی تعظیم میں اور البتہ واقعی اللہ نے ان کی طرف رسول بھیجے حق روشن اور قطعی حجتیں دے کر اور باوجود اس کے انھوں نے اس کی پیروی نہ کی جو وہ اُن کے پاس لائے اور نہ اس کے مطیع ہوئے۔

محض خواہشات سے بات نہیں بنتی:

پھر فرمایا: کہیں آدمی کو ملتا ہے جو وہ چاہے، یعنی نہیں ہے ہر وہ شخص کہ وہ کسی خیر کی تمنا کرے اور وہ اسے حاصل ہو جائے۔ ﴿ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ ﴾ [النساء: ۱۲۳] ''حقیقتِ حال نہ تو تمھاری آرزو کے مطابق ہے اور نہ اہلِ کتاب کی امیدوں پر موقوف ہے۔'' نہیں ہے ہر وہ شخص جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ راہ یاب ہے تو ویسا ہو جائے جیسا کہا اور نہ ہر وہ شخص جو کسی شے کو پسند کرے تو وہ اسے حاصل ہو جائے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں جس وقت تم میں سے کوئی شخص تمنا کرے تو چاہیے کہ اس کی طرف غور کرے جس کی تمنا کرتا ہے، بے شک وہ نہیں جانتا اس شے کو جو اس کی تمنا سے اس کے لیے لکھی جاتی ہے۔[1] (أخرجه الإمام أحمد و تفرد به)۔

[1] مسند أحمد (۳۵۷/۲) اس کی سند میں ''عمر بن ابی سلمہ'' متکلم فیہ راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۲۲۵۵)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ﴾ یعنی کام سب کا سب اللہ کے لیے ہے جو دنیا اور آخرت کا مالک ہے اور ان میں متصرف ہے۔ چنانچہ وہی ہے کہ جو کچھ اس نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ تم اللہ کے لیے وہ شے کیوں ٹھہراتے ہو جس کو اپنے لیے مکروہ سمجھتے ہو، یعنی بیٹیاں اور اپنے لیے وہ شے قرار دیتے ہو جسے محبوب رکھتے ہو، یعنی بیٹے۔ کہا گیا ہے کہ یہ ان کا وہ قول ہے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ تم لات وعزیٰ ومنات کو اللہ تعالیٰ کے لیے شریک کیوں ٹھہراتے ہو، حالاں کہ وہ تمھارے زعم میں عورتیں ہیں اور اُن کی شان سے یہ تھا کہ اناث کو حقیر جانتے تھے۔

پھر اللہ پاک نے ذکر کیا کہ یہ نام رکھنا اور بانٹنا جو استفہام سے ظاہر ہوتا ہے قسمتِ جائرہ ہے، یعنی حق سے مائل ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾۔ جمہور نے بہ یائے ساکنہ بغیر ہمزہ پڑھا ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے ہمزۂ ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ ایک ایسی تقسیم ہے جو صحیح نہیں ہے اور عدل وحق سے ہٹ کر ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يُقَالُ: ضَازَ فِي الْحُكْمِ أَيْ: جَارَ وَضَازَهُ حَقَّهُ يَضِيزُهُ ضَيْزًا أَيْ: نَقَصَهُ وَبَخَسَهُ" کہا: اور کبھی مہموز ہوتا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: "ضَازَ يَضِيزُ ضَيْزَى وَضَازَ يَضُوزُ ضَوْزًا إِذَا تَعَدَّى وَظَلَمَ وَبَخَسَ وَانْتَقَصَ"

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض عرب کہتے ہیں: "ضِئْزَى" بہ ہمزہ۔ امام ابوزید رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اس نے عرب کو سنا ہے کہ "ضِئْزَى" کو مہموز کرتے ہیں۔[2] امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں "فِعْلَى" بہ کسرِ فاء نعوت میں نہیں ہے، یہ جو ہوتا ہے تو اسماء میں، جیسے: "ذِكْرَى وَشِعْرَى"۔ مؤرج نے کہا ہے کہ ﴿ ضِيْزٰى ﴾ میں ضاد کا ضمہ مکروہ رکھا اور خوف کیا انقلاب یاء کا واؤ سے، حالانکہ یہ بنات واؤ سے ہے تو بہ وجہ اس علت کے ضاد کو کسرہ دیا جس طرح کہ ابیض کی جمع میں بیض کہا،[3] اسی طرح امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ ضِيْزٰى ﴾ مصدر ہے مثل "ذِكْرَى" کے تو اب یہ معنی ہوں گے: "قِسْمَتُهُ ذَاتُ جَوْرٍ وَّظُلْمٍ"۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ ضِيْزٰى ﴾ "جَائِرَةٌ لَا حَقَّ فِيهَا"۔[5] کسی نے کہا ہے کہ "عَوْجَاءُ غَيْرُ مُعْتَدِلَةٍ"۔

پھر اللہ پاک نے ان پر یوں رد کیا کہ ﴿ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ﴾ یعنی نہیں ہیں یہ اوثان یا اصنام باعتبار اس شے کے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو کہ وہ معبود ہیں مگر صرف نام جن کا الوہیت کے معنی سے کچھ تعلق نہیں ہے، کون سی الوہیت جس کے تم مدعی ہو، کیوں کہ وہ نہ دیکھتے ہیں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣٢٣/٤، ٣٢٤)
[2] تفسیر القرطبي (١٠٢/١٧، ١٠٣) فتح القدیر (١٤٣/٥)
[3] تفسیر البغوي (٤٠٩/٧)
[4] معاني القرآن (٧٣/٥)
[5] تفسیر الطبری (٥٢٧/٢٢)

نہ سنتے ہیں نہ عقل رکھتے ہیں نہ سمجھتے ہیں، نہ ضرر دیتے ہیں نہ نفع پہنچاتے ہیں تو اب وہ نہ ہوئے مگر صرف نام۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿هِیَ﴾ کی ضمیر اسمائے ثلاثہ مذکورہ کی طرف راجع ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

﴿سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ﴾ یعنی ان کا تم نے اور تمھارے باپ دادا نے نام رکھ لیا ہے، اس میں آخر والوں نے پہلوں کی تقلید کی ہے اور اولاد اپنے آباء کی تابع ہوئی۔ اس میں جو اُن کی شان کی تحقیر ہے وہ چھپی ہوئی نہیں ہے، جیسے: تم کسی شخص کی حقارت کے لیے کہتے ہو: "مَا هُوَ إِلَّا اسْمٌ"، یعنی نہیں ہے وہ مگر نام جبکہ وہ شخص اعتبار کے قابل نہ ہو۔ اس آیت کی مثل یہ آیت ہے: ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ﴾ [یوسف: ٤٠] ''اس کے سوا تم جن کی پوجا پاٹ کر رہے ہو، وہ سب نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے خود ہی گھڑ لیے ہیں۔''

عرب کی بول چال میں "سَمَّيْتُهُ زَيْدًا وَسَمَّيْتُهُ بِزَيْدٍ"، دونوں طرح بولتے ہیں، تو اب ﴿سَمَّيْتُمُوْهَآ﴾ ﴿اَسْمَآءٌ﴾ کی صفت ہوگی اور ضمیر ﴿اَسْمَآءٌ﴾ کی طرف پھرے گی نہ کہ اصنام کی طرف، یعنی تم نے ان اسماء کو اسماء ٹھہرایا، یہ معنی نہیں ہے کہ تم نے ان کے لیے اسماء ٹھہرائے، تاکہ کلام اس بات کی طرف اشارہ کرے کہ وہاں صرف اسماء ہیں جن کی قطعاً کوئی مسمیات (جن کا نام رکھا گیا) نہیں ہیں۔ ﴿سُلْطٰنٍ﴾ سے مراد حجت و برہان ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے لیے کوئی کتاب نازل نہیں کی جس میں تمھارے لیے کوئی حجت ہو، جیسا کہ تم کہتے ہو کہ وہ بت معبود ہیں۔[1]

پھر اُن کی طرف سے یہ خبر دی کہ ﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ﴾ یعنی بتوں کے پوجنے میں ان کا یہ حال ہے کہ وہ نہیں پیروی کرتے مگر ظن کی، جو حق سے کچھ کافی نہیں ہوتا۔ وہ ظن یہ ہے کہ بت عبادت کے مستحق ہیں اور وہ اس شے کی پیروی کرتے ہیں جس کی ان کے جی خواہش کرتے ہیں، یعنی جس کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس کو چاہتے ہیں بغیر اس شے کی طرف توجہ کرنے کے جو حق ہے اور جس کا اتباع واجب ہے اور جس نے اپنے ظن کا اتباع کیا اور اس شے کا جس کو اس کا دل چاہتا ہے، حالانکہ اس کے پاس ہدایت اور شافی بیان آ گیا تو وہ نہ انسان شمار کیا جاتا ہے اور نہ اس کا کچھ اعتبار کیا جاتا ہے۔

یہ معنی تو جمہور کی قراءت کی بنا پر ہیں جو بہ یائے تحتیہ ہے اس میں غیبت کی طرف التفات ہے، یہ بتانے کے لیے کہ ان کی برائیوں کے شمار کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے اعراض کیا جائے اور اُن کے گناہوں کی حکایت ان کے غیر سے کی جائے۔ کسی نے بہ تائے خطاب پڑھا ہے، یعنی تم پیروی نہیں کرتے ہو نام رکھنے میں اور اس کے

[1] فتح القدير (١٤٤/٥)

مطابق عمل کرنے میں جس کا ذکر ہوا مگر ظن اور خواہشِ نفس کی۔ ظن سے مراد اس بات کا گمان ہے کہ بت عبادت کے مستحق ہیں اور ﴿ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ ﴾ سے مراد شیطان کا یہ زینت دینا ہے کہ وہ اللہ کے پاس ان کی سفارش کریں گے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ عطف مغایرت (ایک دوسرے کا غیر ہونا) کے لیے ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴾ یعنی وہ ظن کی اور ہوائے نفس کی پیروی اس حال میں کرتے ہیں کہ اُن کے پاس اُن کے رب سے اس بات کا واضح اور ظاہر بیان، کتابِ منزل اور نبیِ مرسل کے سبب سے آ گیا کہ بت معبود نہیں ہیں اور عبادت اللہ واحد قہار کے سوا کسی کے لائق نہیں۔ یہ جملہ حال ہے ﴿ يَتَّبِعُوْنَ ﴾ کے فاعل سے، یا معترضہ ہے (یعنی اس لیے کہ ﴿ اَمْ لِلْاِنْسَانِ ﴾ ﴿ وَمَا تَهْوَى ﴾ سے متصل ہے) کچھ بھی ہو اس میں اتباعِ ظن اور ہوائے نفس کے باطل ہونے کی تاکید ہے اور ان کے حال کی قباحت کی زیادتی کی خبر ہے، کیوں کہ ان دونوں چیزوں کا اتباع کسی بھی شخص سے ہو وہ برا ہے۔ اور جس بات کی اللہ نے ہدایت کی رسول بھیج کر اور کتابیں نازل کر کے ان کو چھوڑ کر ظن اور ہوائے نفس کی پیروی کرنا اور بھی زیادہ قبیح ہے۔

کلمۂ ﴿ اَمْ ﴾ منقطعہ بہ معنی ”بل“ و ہمزۂ انکار ہے۔ انھوں نے جو ظن کی اتباع کی جو صرف توہم ہے اور ہوائے نفس کی پیروی کی اور اس شے کی پیروی کی جس کی طرف جی مائل ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس سب سے اضراب و انتقال کر کے اس بات کا انکار کیا کہ ان کے لیے وہ شے ہو جس کی تمنا کرتے ہیں کہ بت ان کو نفع دیں گے اور ان کے لیے سفارش کریں گے۔ کسی نے کہا: وہ تمنا ہے ان کے بعض کی کہ وہ نبی ہو۔ کسی نے کہا: یہ قول ہے: ﴿ وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْۤ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ﴾ [فصلت: ۵۰] ”اور اگر میں اپنے رب کے پاس واپس کیا گیا تو بھی یقیناً میرے لیے اس کے پاس بھی بہتر ہے۔“

غرضیکہ یہ نہیں ہوسکتا کہ انسان جو تمنا کرتا ہے وہ حاصل ہو جائے، پھر اس کی یہ علت ذکر فرمائی: ﴿ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ﴾ یعنی اس لیے کہ آخرت اور دنیا کے سب کام اللہ عزوجل کے واسطے ہیں تو اُن کے لیے امور میں سے کوئی امر نہیں ہے، ان میں سے ان کی باطل تمنائیں اور خالی طمعیں ہیں۔ پھر اس کی تاکید کی اور ان کی تمنا کے باطل کرنے میں زیادتی فرمائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[1]

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا
مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴿۲۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿۲۷﴾ وَمَا

[1] فتح البیان (۱۳/۲۵۷_۲۵۹)

لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ
لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿۲۸﴾ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ
ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ
الْعِلْمِ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ
بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾

اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں، جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دے گی، مگر بعد ازاں کہ اللہ اجازت دے، جس کے لیے چاہے اور پسند کرے 26 بلاشبہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے سے رکھتے ہیں 27 حالاں کہ انھیں اس کا کوئی علم نہیں، وہ تو بس گمان کی پیروی کرتے ہیں، اور بلاشبہ گمان حق کے مقابلے میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا 28 لہٰذا (اے نبی!) آپ اس سے اعراض کر لیں، جو ہمارے ذکر سے پھرے (اور منہ موڑے) اور وہ صرف دنیاوی زندگی چاہتا ہو 29 ان کے علم کی یہی انتہا ہے، بلاشبہ آپ کا رب ہی اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بھٹک گیا، اور وہی اس شخص کو خوب جانتا ہے، جس نے ہدایت پائی 30

اللہ عزوجل کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرة: ۲۵۵] ''کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے۔'' اور اس آیت کی طرح: ﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ [سبا: ۲۳] ''شفاعت (سفارش) بھی اس کے پاس کچھ نفع نہیں دیتی، بہ جز ان کے جن کے لیے اجازت ہو جائے۔'' پس جب یہ بات ملائکہ مقربین کے حق میں ہو تو ارے جاہلو! تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان بتوں اور انداد کی سفارش کی کس طرح امید رکھتے ہو، حالانکہ اللہ نے ان کی عبادت مشروع نہیں فرمائی اور نہ اس کی اجازت دی ہے، بلکہ اپنے تمام رسولوں کی زبان پر اس سے منع فرمایا ہے اور اس کی ممانعت میں اپنی ساری کتابیں نازل فرمائیں۔

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے پر مشرکین کا رد:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓىِٕكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴾ مشرکوں نے جو فرشتوں کے

زمانے نام رکھے اور اُن کے متعلق یہ قرار دیا کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تعالی اللّٰه عن ذلك۔ چنانچہ اللہ پاک اس بارے میں ان پر انکار فرماتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الزخرف: ١٩] ''اور انھوں نے فرشتوں کو جو رحمان کے عبادت گزار ہیں بندے قرار دے لیا۔ کیا ان کی پیدائش کے موقع پر یہ موجود تھے؟ ان کی یہ گواہی لکھ لی جائے گی اور ان سے (اس چیز کی) باز پرس کی جائے گی۔''

اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ ﴾ یعنی ان کو کوئی صحیح علم نہیں ہے کہ ان کی بات کی تصدیق کرے، بلکہ وہ کذب، جھوٹ، بہتان اور برا کفر ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴾ یعنی وہ پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی اور گمان کسی شے کا فائدہ نہیں دیتا اور نہ مقامِ حق میں کبھی قائم ہوتا ہے۔ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ » (1) یعنی ظن سے بچتے رہو، بے شک ظن سب سے جھوٹی بات ہے۔

باطل پرستوں سے اعراض کا حکم:

پھر فرمایا: ﴿ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴾ یعنی تو اس سے منہ موڑ لے جس نے حق سے منہ موڑا ہے اور اسے چھوڑ دیا ہے اور اس کا زیادہ فکر وغم اور مبلغِ علم صرف دنیا ہے۔ چنانچہ یہ اس شے کی انتہا ہے جس میں کوئی خیر وخوبی نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ ﴾ یعنی یہی طلبِ دنیا اور اس کے لیے کوشش کرنا اس شے کی غایت ہے جس کی طرف وہ پہنچے۔ سیدہ عائشہ ؓ ام المومنین مرفوعاً فرماتی ہیں کہ دنیا اس کا گھر ہے جس کے لیے کوئی گھر نہیں ہے اور اس کا مال ہے جس کے لیے کوئی مال نہیں ہے اور اس کے لیے وہی شخص جمع کرتا ہے جس کو کچھ عقل نہیں ہے۔ (2) (أخرجه الإمام أحمد) دعائے ماثور میں ہے: ''اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا'' یعنی الٰہی دنیا کو ہمارا سب سے بڑا فکر وغم نہ کر اور نہ ہماری سمجھ کے پہنچنے کا منتہی اسے کر۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴾ یعنی اللہ ساری مخلوقات کا خالق ہے اور وہی اپنے بندوں کی مصلحتوں کا عالم ہے اور وہی راہ بتاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور بے راہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور یہ سب اس کی قدرت وعلم وحکمت سے ہے اور وہی وہ عادل ہے کہ کبھی ظلم نہیں کرتا، نہ اپنی شرع میں اور نہ اپنی تقدیر میں۔ (3) (كذا في ابن كثير)

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٣)

(2) مسند أحمد (٧١/٦) اس کی سند میں ''دوید بن نافع'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ١٩٣٣)

(3) تفسير ابن كثير (٣٢٤/٤)

فتح البیان کا بیان:

کلمۂ ﴿ كَمْ ﴾ خبریہ ہے جو تکثیر کا فائدہ دیتا ہے اور اسی لیے ﴿ شَفَاعَتُهُمْ ﴾ میں جمع کی ضمیر لائی گئی ہے باوجود اس کے کہ کلمۂ ﴿ مَلَكٍ ﴾ مفرد ہے، پس لفظ اس کا تو مفرد ہے اور معنی اس کے جمع کے ہیں۔ ﴿ كَمْ ﴾ کا محل رفع ہے بنا بر ابتداء اور جملہ ما بعد خبر ہے۔ مشرک لوگ جو شفاعتِ اصنام کے شیفتہ اور فریفتہ تھے اور اس کی تمنا اور طمع رکھتے تھے، اللہ پاک نے اس سے ان کو ناامید کر دیا اور اس پر ان کو توبیخ کی کہ آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ کام نہیں آتی باوجود اس کے کہ وہ فرشتے ہیں اور بہت زیادہ ہیں اور بکثرت عبادت کرتے ہیں اور اللہ کے نزدیک کرامت اور عزت رکھتے ہیں، وہ سفارش نہیں کرتے مگر اس کے لیے جس کی سفارش کرنے کا اللہ تعالیٰ اذن دے۔

بھلا پھر یہ پتھر کے بت جو عقل اور فہم سے عاری ہیں کیسے سفارش کریں گے، یہی معنی ہیں اس قول کے ﴿ إِلَّا مِنْۢ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ ... ﴾ یعنی ان کی سفارش کام نہیں آتی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اذن دے شفاعت کے ساتھ، واسطے اس شخص کے کہ وہ چاہے کہ اس کے لیے شفاعت کریں اور شفاعت کے ساتھ راضی ہو، اس کے توحید والوں میں سے ہونے کی وجہ سے، اس میں مشرکوں کے لیے حظ و بہرہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ ان کو شفاعت کا اذن دے گا اور نہ ان کو پسند کرے گا اس لیے کہ وہ شفاعت کے مستحقین میں سے نہیں ہیں۔ قولہ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴾ یعنی یہ لوگ جو بعث پر ایمان نہیں لاتے اور دارِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے جو اس کے بعد ہے، اس وجہ پر جو رسولوں نے بیان کی ہیں، یہ لوگ کفار ہیں جو اپنے کفر کے ساتھ ایک بہت برا قول اور ایک سخت جہالت ملاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ فرشتوں کے زنانے نام رکھتے ہیں۔ وہ فرشتے جو ہر نقص سے مبرا اور پاک ہیں۔ یہ نام رکھنا اس طرح سے ہوا کہ انھوں نے ملائکہ میں تائے تانیث دیکھی اور اُن کے نزدیک یہ صحیح ہوا کہ یوں کہا جائے کہ "سَجَدَتِ الْمَلَائِكَةُ"، تو یہ زعم کیا کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، چنانچہ ان کو عورتیں ٹھہرایا اور ان کا نام بنات رکھا۔

جملۂ ﴿ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ ﴾ میں ﴿ عِلْمٍ ﴾ حالیہ ہے، یعنی ان کا یہ نام رکھتے ہیں اس حال میں کہ وہ اس بات کو جانتے نہیں ہیں جو کہتے ہیں، کیوں کہ نہ ان کو یہ حق پہنچتا ہے، نہ ان کا مشاہدہ کیا ہے، نہ ان کی طرف یہ بات کسی طریق سے پہنچی ان طریقوں میں سے جن کی مخبر لوگ خبر دیتے ہیں، بلکہ یہ بات صرف جہالت و گمراہی اور جرأت سے کہی۔ کسی نے "مَا لَهُمْ بِهَا" پڑھا ہے۔ "أَيْ: بِالْمَلَائِكَةِ أَوِ التَّسْمِيَةِ" اور کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زاید ہے مبتدائے مؤخر میں، یعنی ان کو اس کا کچھ بھی علم نہیں ہے، بلکہ صرف ظن کا اتباع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ﴾ یعنی اس بات میں پیروی نہیں کرتے ہیں، مگر صرف ظن و توہم کی۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ظن تقلیدِ آباء ہے۔[1]

---

[1] تفسير النسفي (١٩٠/٤)

پھر اللہ پاک نے ظن کی اور اس کے حکم کی خبر دی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴾ یعنی ظن علم سے بے نیاز نہیں کرتا کچھ بھی بے نیاز کرنا۔ کلمۂ ﴿ مِنَ ﴾ بہ معنی ”عن“ ہے اور یہاں ﴿ اَلْحَقِّ ﴾ سے مراد علم ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ صرف ظن مقامِ علم میں قائم نہیں ہوتا اور ظن کرنے والا عالم نہیں ہے۔ یہ بات ان امور میں سے ہے جن میں علم کی طرف حاجت ہوتی ہے۔ یہ مسائلِ علمیہ ہیں نہ ان امور میں جن میں ظن کو کافی سمجھا جاتا ہے۔

یہ مسائلِ عملیہ ہیں، اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے، یہ تخصیص ضروری ہے، کیوں کہ دلالتِ عموم و قیاس و خبرِ واحد اور اسی طرح کی اور باتیں ظنی ہیں تو اس کے ساتھ عمل کرنا ظن پر عمل کرنا ہوا، حالانکہ ان امور میں، یعنی عملیات میں عمل بالظن ہم پر واجب ہے تو اب ان امور میں وجوب عمل بالظن کے جو دلائل ہیں وہ مخصص ہوں گے اس عموم کے اور اس مذمت کے جو اس کے معنی میں وارد ہوئی، اس شخص کے لیے جو عمل بالظن کرے اور اس نہی کے جو اتباعِ ظن سے وارد ہوئی ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معارفِ حقیقیہ میں ظن کا کچھ اعتبار نہیں ہے، اس کا جو اعتبار ہے تو صرف عملیات میں ہے اور اس شے میں جو اُن کی طرف وصلہ (موصل۔ پہنچنے والی) ہے جیسے علمِ فقہ کے مسائل۔ امام ابن الخطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ظن اعتقادیات میں کچھ کام نہیں دیتا۔ رہے افعالِ عرفیہ یا شرعیہ تو ان میں ظن کا اتباع کیا جاتا ہے، جب یقین کی طرف نہیں پہنچ پاتے۔

”ذکر“ سے یہاں مراد قرآن شریف ہے یا ذکرِ آخرت یا عام طور پر اللہ کا ذکر۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ اس سے مراد ایمان ہے۔ معنی یہ ہیں تو ان کا مجادلہ (جھگڑا کرنا) چھوڑ دے، پس تو درحقیقت ان کو وہ چیز پہنچا چکا جس کا تجھے حکم دیا گیا تھا۔ تجھ پر تو یہی پہنچا دینا ہے۔ یہ آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں جتنے کلمے ﴿ فَاَعْرِضْ ﴾ کے ہیں، وہ سب آیتِ قتال سے منسوخ ہیں، حالانکہ یہ قول باطل ہے، کیوں کہ اعراض کا حکم تو آیتِ قتال کے موافق ہے تو پھر اس سے منسوخ کیوں ہونے لگا۔[1] مناظرے سے اعراض کرنا تو قتال کرنے کے جواز کے لیے شرط ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ارادہ نہیں کیا سوائے حیاتِ دنیا کے اور نہ اس کے غیر کو طلب کیا، بلکہ اپنی نظر اسی پر روکی تو وہ خیر کے لائق نہیں اور نہ ہی اس کا مستحق ہے کہ اس کے حال کا اعتنا (خیال) اور اہتمام کیا جائے۔

پھر اللہ پاک نے ان کی شان و امر کی تصغیر و تحقیر کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ﴾ یعنی یہ ذکر سے اعراض کرنا اور اپنے تمام ارادوں اور کوششوں کو صرف دنیاوی زندگی تک ہی محدود رکھنا ان کے علم کا مبلغ ہے اس کے سوا ان کو کوئی علم نہیں اور نہ اس کے سوا دین کے امر کی طرف التفات کرتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یعنی یہ ان

[1] تفسیر الرازي (٢٨/٢٦٨)

کی عقلوں کی قدر ہے اور اُن کے علم کی انتہا ہے کہ انھوں نے دنیا کو آخرت پر اختیار کیا ہے۔[1] کسی نے کہا: یعنی ان کا فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینا اور اُن کے زنانے نام رکھنا ہی اُن کے علم کی حد ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

یہاں ﴿ اَلْعِلْمِ ﴾ سے مراد صرف ادراک ہے کہ جس کے تحت میں ظنِ فاسد شامل ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو ان کی جہالت اور صرف ان کے مجرد ظن کی اتباع کو ثابت کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جملہ معترضہ ہے معلل اور علت کے درمیان۔ علت یہ ہے: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴾ اس لیے کہ یہ تعلیل ہے امر باعراض کی، یعنی اللہ پاک خوب جانتا ہے اس کو جو حق سے مائل ہوا اور اس سے اعراض کیا اور اس کی طرف راہ نہ پائی اور خوب جانتا ہے اس کو جو راہ پر آیا تو حق کو مانا اور اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے ساتھ عمل کیا تو وہ ہر عامل کو اس کے عمل کا بدلہ دینے والا ہے، اگر خیر کا عمل ہے تو خیر اور اگر شر ہے تو شر۔

اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی ہے اور آپ ﷺ کو اس بات کا ارشاد ہے کہ اپنی جان کو اس شخص کو بلانے میں نہ تھکائیں، جس نے گمراہی پر اصرار کیا ہے اور اس کے لیے بدبختی سابق ہو چکی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس گمراہ فریق کے حال کو جان چکا ہے، جیسا کہ راہ یاب فریق کے حال کو جان لیا ہے۔ کلمۂ ﴿ هُوَ اَعْلَمُ ﴾ کو دوبار لانا دو وجہ سے ہے: ایک تو زیادتِ تقریر کے لیے ہے، دوسرے یہ بتانے کے لیے کہ دونوں معلوم (باتوں) میں بہت دوری ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنی قدرت کی وسعت اور عظیم ملک کی خبر دی۔ چنانچہ فرمایا:[2]

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿٣١﴾ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿٣٢﴾

اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو جنھوں نے برے کام کیے، ان کے اعمال کی سزا دے اور ان لوگوں کو جنھوں نے اچھائیاں کیں، اچھا بدلہ دے (31) وہ لوگ جو کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، الا یہ کہ کوئی صغیرہ گناہ (سرزد) ہو، بے شک آپ کا رب بڑی وسیع مغفرت والا ہے، وہ تمھیں،

---

[1] تفسیر القرطبي (١٠٥/١٧) [2] فتح البیان (٢٥٩/١٣-٢٦١)

(اس وقت سے) خوب جانتا ہے، جب اس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں بچے تھے، لہٰذا تم اپنے آپ کی پاکی بیان نہ کرو، وہ اسے (بھی) خوب جانتا ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا (32)

اللہ تعالیٰ کا علم ہر چھوٹی بڑی چیز پر محیط ہے:

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور وہ اپنے ماسوا سے بے نیاز ہے۔ اپنی خلق میں عدل وحق کے ساتھ فیصلہ کرنے والا ہے اور حق کے ساتھ ہی مخلوق کو پیدا کیا تاکہ جنھوں نے برائی کی، ان کو اس شے کے ساتھ جزا دے جو انھوں نے کی اور جنھوں نے نیکی کی ان کو نیکی کے ساتھ جزا دے۔ یعنی ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا، اگر خیر کا عمل ہے تو خیر کی جزا اور اگر شر کا عمل ہے تو شر کی جزا۔

محسنین کون ہوتے ہیں؟

پھر نیکی کرنے والوں کی یہ تفسیر کی کہ وہ ہیں جو بڑے گناہوں سے بچتے ہیں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، یعنی وہ محرماتِ کبائر میں خوض نہیں کرتے، یعنی ملوث نہیں ہوتے، گو اُن سے بعض صغیرہ گناہ سرزد ہو جاتے ہیں تو بے شک وہ اُن کے لیے بخش دیے جائیں گے اور اُن کی پردہ پوشی کی جائے گی۔ جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴾ [النساء: ۳۱] ''اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے تو ہم تمھارے چھوٹے گناہ دور کر دیں گے اور عزت اور بزرگی کی جگہ داخل کریں گے۔''

اور یہاں فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ﴾ یہ استثناء منقطع ہے، اس لیے کہ ''لمم'' من جملہ صغیرہ گناہ اور محقراتِ اعمال ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے کوئی ایسی شے نہیں دیکھی جو زیادہ مشابہ ہو ''لمم'' کے ساتھ اس شے سے جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرکے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے ابنِ آدم پر اس کا زنا سے حصہ لکھا ہے جس کو وہ لامحالہ پائے گا۔ چنانچہ زنا آنکھ کا تو نظر ہے اور زبان کا زنا نطق ہے اور نفس تمنا کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق کرتی ہے یا اس کی تکذیب کرتی ہے۔[1] (أخرجه الإمام أحمد وأخرجاه في الصحيحين من حديث عبد الرزاق به)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آنکھوں کا زنا نظر ہے اور ہونٹوں کا زنا بوسہ لینا ہے اور ہاتھوں کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا چلنا ہے اور اس کی شرم گاہ تصدیق کرتی ہے یا تکذیب کرتی ہے۔ پھر اگر وہ اپنی شرم گاہ کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٧) مسند أحمد (٢٧٦/٢)

ساتھ آگے بڑھا تو زانی ہوگا، ورنہ پھر وہ "لمم" ہے۔(أخرجه ابن جرير)اسی طرح امام مسروق اور شعبی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔عبدالرحمان بن نافع (الذي يقال له: ابن لبابة الطائفي) نے کہا: میں نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے "لمم" کا پوچھا تو کہا کہ قبلہ، غمزہ، نظرۃ اور مباشرۃ۔ پس جب ختان نے ختان سے مس کیا تو یقیناً غسل واجب ہوگیا اور یہ زنا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ﴿ اِلَّا اللَّمَمَ ﴾ "إِلَا مَا سَلَفَ"، یعنی "لمم" سے مراد وہ گناہ ہے جو گزر چکا ہے۔ اسی طرح امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلَّذِيْ يُلِمُّ بِالذَّنْبِ ثُمَّ يَدَعُهُ"، یعنی وہ ہے کہ گناہ سے آلودہ ہوتا ہے، پھر اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

إِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وَأَيُّ عَبْدٍ لَكَ مَا أَلَمَّا

(أخرجه ابن جرير)[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے دوسری روایت ان الفاظ میں کی ہے: "اَلرَّجُلُ يُلِمُّ بِالذَّنْبِ ثُمَّ يَنْزِعُ عَنْهُ"، یعنی آدمی گناہ میں آلودہ ہو جاتا ہے، پھر اس سے باز رہتا ہے۔ کہا: اور جاہلیت والے بیت اللہ کا طواف کرتے اور یہ کہتے تھے:

إِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وَأَيُّ عَبْدٍ لَكَ مَا أَلَمَّا[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو مرفوعاً بھی روایت کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ تو عن عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ ہیں: کہا وہ شخص ہے جو فاحشہ میں آلودہ ہوتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے اور کہا: "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنْ تَغْفِرْ لَهُمَ... الخ"۔ اسی طرح ترمذی نے بھی روایت کیا ہے:[3] (عن أحمد بن عثمان أبي عثمان البصري عن أبي عاصم النبيل ثم قال: هذا حديث صحيح حسن غريب لا نعرفه إلا من حديث زكريا بن إسحاق وكذا قال البزار لا نعلمه يروى متصلا إلا من هذا الوجه وساقه ابن أبي حاتم والبغوي من حديث أبي عاصم النبيل وإنما ذكره البغوي في سورة تنزيل وفي صحته مرفوعا نظر. كذا في ابن كثير)۔

پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے عن الحسن عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ "أُرَاهُ رَفَعَهُ" روایت کیا ہے۔ کہا "لمه" زنا سے ہے، پھر توبہ کرتا ہے اور دوبارہ نہیں کرتا اور "لمم" سرقہ سے ہے، پھر توبہ کرتا ہے اور دوبارہ نہیں کرتا اور "لمه" شرب خمر سے ہے، پھر توبہ کرتا ہے اور دوبارہ نہیں کرتا۔ کہا: پس یہ ہے: "إلمام"۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ کا قول ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ "لمم" یا زنا سے یا چوری سے یا شراب پینے سے ہے، یعنی توبہ کرے اور دوبارہ نہ کرے۔ حسن رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کہتے تھے کہ وہ شخص ہے جو "لمه" کو پہنچتا ہے زنا

---

[1] تفسير الطبري (٥٣٤/٢٢، ٥٣٥) [2] تفسير الطبري (٥٣٧/٢٢)

[3] تفسير الطبري (٥٣٥/٢٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٨٤) مسند البزار (٢٠٦/١١) تفسير البغوي (١٢٨/٧) تفسير ابن كثير (٣٢٥/٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٤١٧)

سے اور شراب پینے سے، پھر اس سے پرہیز کرتا ہے اور اس سے توبہ کر لیتا ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک قول عن عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اس طرح روایت کیا ہے کہ ﴿ اِلَّا اللَّمَمَ ﴾ "يُلِمُّ بِهَا فِي الْحِيْنِ قُلْتُ: اَلزِّنَا؟ قَالَ: اَلزِّنَا ثُمَّ يَتُوْبُ"، یعنی "لمم" یہ ہے کہ کسی وقت اتفاقاً اس میں آلودہ ہو جاتا ہے، میں نے کہا: زنا؟ کہا: زنا، پھر توبہ کر لیتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ سے مروی ایک قول عن عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ ہے: "اَللَّمَمُ الَّذِيْ يُلِمُّ الْمَرَّةَ"[1] یعنی "لمم" یہ ہے کہ اس سے ایک بار آلودہ ہو جاتا ہے۔ ابو صالح نے کہا: مجھ سے کسی نے "لمم" کا پوچھا تو میں نے کہا: وہ شخص ہے جو گناہ کو پہنچتا ہے، پھر توبہ کر لیتا ہے۔ میں نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر دی تو فرمایا: البتہ یقیناً اس پر ایک ملکِ کریم نے تیری مدد کی۔[2] (حكاه البغوي) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا: "لَمَمٌ مَا دُوْنَ شِرْكٍ" ہے۔[3] (رواه ابن جرير من طريق المثنى بن الصباح وهو ضعيف عن عمرو بن شعيب)

سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "لمم" دو حدوں کے درمیان ہے، یعنی حدِ دنیا اور عذابِ آخرت۔ عوفی رحمہ اللہ کے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے الفاظ یہ ہیں کہ ہر شے دو حدوں کے درمیان ہے حدِ دنیا اور حدِ آخرت۔ جس کا نمازیں کفارہ کرتی ہیں وہ "لمم" ہے اور وہ ہر موجب کے علاوہ ہے، چنانچہ دنیا کی حد تو ہر وہ حد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس کی سزا فرض کی ہے۔ (رواه سفيان الثوري عن جابر الجعفي عن عطاء عنه وكذا رواه شعبة عن الحكم عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مثله سواء) رہی آخرت کی حد تو وہ ہر شے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نار کے ساتھ ختم کیا ہے اور اس کی سزا کو آخرت تک تاخیر دی ہے۔ اسی طرح امام عکرمہ، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔[4]

توبہ کی ترغیب اور اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی ممانعت:

﴿ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رحمت نے ہر شے کو سما لیا ہے اور اس کی مغفرت اس شخص کے سارے گناہوں کو سما لیتی ہے جس نے اُن سے توبہ کی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۚ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ [الزمر: ٥٣] "(میری جانب سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بالیقین اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہ بڑی بخشش بڑی رحمت والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمھارا بصیر ہے، تمھارے احوال، افعال اور اقوال کو خوب جانتا ہے جو آئندہ تم سے صادر ہوں گے اور واقع ہوں گے۔ جس وقت تمھارے باپ آدم کو پیدا کیا زمین سے اور اس کی ذریت کو اس کی پشت سے نکالا مثل مورِ خرد کے پھر ان کو دو فریقوں میں بانٹا:

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٥٣٥، ٥٣٦)
[2] تفسير البغوي (٧/٤١١)
[3] تفسير الطبري (٢٢/٥٣٦)
[4] تفسير الطبري (٢٢/٥٣٦، ٥٣٧)

ایک فریق جنت کے لیے اور ایک فریق دوزخ کے لیے۔

وکذا قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ﴾ تحقیق اس فرشتے نے جو اس پر مقرر ہے اس کا رزق اور اس کی اجل اور اس کا عمل لکھا اور یہ بات لکھی کہ وہ بد بخت ہے یا نیک بخت۔ امام مکحول رحمہ اللہ نے (یعنی ریحانۃ الشام زاہد و عابد و معتمد) کہا: ہم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین تھے، پھر گر پڑا ہم میں سے جو گر پڑا اور ہم ان میں سے تھے جو باقی رہے، پھر ہم دودھ پینے والے تھے تو ہلاک ہوا ہم میں سے جو ہلاک ہوا اور ہم ان میں سے تھے جو باقی رہے، پھر ہم "قریب البلوغ" ہوئے تو ہلاک ہوا ہم میں سے جو ہلاک ہوا اور ہم اُن میں سے تھے جو باقی رہے، پھر ہم جوان ہوئے تو ہلاک ہوا ہم میں سے جو ہلاک ہوا اور ہم اُن میں سے تھے جو باقی رہے، پھر ہم بڈھے ہو گئے تیرا باپ نہ ہو، اب کیا اس کے بعد ہم انتظار کرتے ہیں؟![1] (رواه ابن أبي حاتم عنه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ یعنی پس تم مت مدح و شکر کرو اپنی جانوں کا اور اپنے اعمال کے سبب سے تمنا مت کرو، وہ اس کو خوب جانتا ہے جو متقی ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴾ [النساء: ٤٩] "کیا آپ نے انھیں نہیں دیکھا جو اپنی پاکیزگی اور ستایش خود کرتے ہیں؟ بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے پاکیزہ کرتا ہے، کسی پر ایک دھاگے کے برابر ظلم نہ کیا جائے گا۔"

محمد بن عمرو بن عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے اپنی بیٹی کا نام "برہ" رکھا تو مجھ سے زینب بنت ابی سلمہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام سے منع فرمایا ہے۔ میرا نام "برہ" رکھا گیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی جانوں کا تزکیہ نہ کرو اور اللہ تم میں سے بر والوں کو خوب جانتا ہے۔ پس گھر والوں نے کہا کہ آپ اس کا نام رکھیں، فرمایا کہ اس کا نام زینب رکھو۔[2] (رواه مسلم في صحيحه)

یہی بات ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ثابت ہوئی ہے۔ کہا کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص کی مدح کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری خرابی ہو تو نے اپنے صاحب کی گردن کاٹ ڈالی۔ یہ کلمہ کئی بار فرمایا۔ پھر فرمایا: "جس وقت تم میں سے کوئی اپنے ساتھی کی مدح کرنے والا ہو تو لازمی طور پر یہ کہے: «أَحْسِبُ فُلَانًا وَاللّٰهُ حَسِيْبُهُ وَلَا أُزَكِّي عَلَى اللّٰهِ أَحَدًا أَحْسِبُهُ كَذَا وَكَذَا إِنْ كَانَ يَعْلَمُ ذٰلِكَ»۔[3] (رواه الإمام أحمد ثم رواه عن غندر عن شعبة عن خالد الحذاء به وكذا رواه البخاري ومسلم وأبو داود وابن ماجه من طرق عن خالد الحذاء به)۔ ہمام بن حارث کہتے ہیں کہ ایک شخص عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف آیا اور اُن کے روبرو اُن کی تعریف کی، چنانچہ

[1] تفسير ابن كثير (٣٢٦/٤) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٤٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٠٠) مسند أحمد (٤١/٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٤٤)

سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے شروع کیا کہ اس کے چہرے میں خاک ڈالتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو حکم کیا ہے کہ جب ہم مدح کرنے والوں سے ملیں تو ان کے چہروں پر خاک ڈالیں۔[1] (أخرجه الإمام أحمد ورواه مسلم وأبو داود من حديث الثوري عن منصور به كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ لِيَجْزِيَ ﴾ میں حرفِ لام "ملك" سے متعلق ہے جس پر کلام دال ہے اور ﴿ بِمَا عَمِلُوْا ﴾ سے مراد شرک وغیرہ معاصی ہیں۔ گویا یوں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شے کا مالک ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو شے زمین میں ہے۔ وہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور راہ پر لاتا ہے جسے چاہتا ہے، تاکہ برائی کرنے والے کو اس کے برائی کرنے کا بدلہ دے اور نیکی کرنے والے کو اس کے نیکی کرنے کا بدلہ دے۔ اس بنا پر جملۂ ﴿ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا ﴾ مستانفہ ہوگا ماقبل کے لیے تعلیل کے طور پر، کیوں کہ اس کا "ما في السماوات والأرض" کا مالک ہونا اس کا مقتضی ہے کہ وہ اس کے احوال کا عالم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ لام اس سے متعلق ہے جس پر ﴿ اَعْلَمُ ﴾ دال ہے اور جملۂ ﴿ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ﴾ معترضہ ہے ماقبل کی تاکید کرتا ہے، کیونکہ جب "كل شيء" اس کی مخلوق ہے تو ثابت ہوا کہ وہ اس کے احوال کا عالم ہے۔

گویا یوں کہا کہ وہ گمراہ کی گمراہی کو اور ہدایت یافتہ کی ہدایت کو جانتا ہے، پھر اس کو نگاہ رکھتا ہے، تاکہ جزا دے، الخ۔ کسی نے کہا ہے کہ عاقبت کا لام ہے تعلیل کا نہیں ہے، یعنی خلق کی عاقبت اور انجام کار جس خلق میں نیک و بد ہیں، یہ ہے کہ اللہ ان میں سے ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے۔ امام واحدی اور زمخشری رحمہ اللہ نے اسی وجہ کی تصریح کی ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ لام ﴿ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ ﴾ سے متعلق ہے، یہ قول لفظ و معنی کی حیثیت سے بعید ہے۔ جمہور نے ﴿ لِيَجْزِيَ ﴾ بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے اور زید بن علی نے بہ نون پڑھا ہے۔[3]

﴿ وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴾ یعنی تاکہ جن لوگوں نے توحید وغیرہ طاعات کے ساتھ نیکی کی ان کو مثوبہ حسنیٰ کی، یعنی نیک ثواب یا جنت کے ساتھ جزا دے۔ یا ان کے نیک اعمال کے سبب سے انھیں نیک جزا دے۔ ﴿ يَجْزِيَ ﴾ کو دوبارہ ذکر کیا، اس لیے کہ اس امر کو ظاہر کرنا منظور ہے کہ امرِ جزا کا کمال خیال اور اہتمام کیا گیا ہے اور یہ بات بتانے کے لیے کہ دونوں قسم کی جزاؤں میں بہت فرق اور دوری ہے۔ پھر ان محسنین کا وصف بیان کیا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ ﴾ (یہ موصول محلِ نصب میں ہے اس بنا پر کہ موصول اول کی صفت ہے، یا اس سے بدل، یا اس کا بیان ہے، یا منصوب بنا بر مدح بتقدیر "أعني" یا مرفوع بنا بر خبر

---

1. صحيح مسلم (٣٠٠٢) مسند أحمد (٥/٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٠٤) تفسير ابن كثير (٣٢٥/٤ـ٣٢٧)
2. الكشاف (٤٢٥/٤)
3. فتح القدير (١٤٨/٥)

مبتدائے محذوف ہے: "أَيْ: هُم الَّذِينَ")۔ یعنی محسنین وہ لوگ ہیں جو کبائر اثم سے اور فواحش سے بچتے ہیں مگر وہ گناہ جو قلیل ہیں اور صغیر ہیں۔

جمہور نے ﴿ كَبٰٓئِرَ ﴾ بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی حمزہ، کسائی، اعمش اور یحییٰ بن وثاب نے) "کبیر" بہ افراد پڑھا ہے۔[1] کبیرہ ہر وہ گناہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے نار کی وعید دی ہے، یا اس کے لیے کوئی حد معین فرمائی ہے، یا اس کے کرنے والے کی شدید مذمت کی ہے۔ ﴿ كَبٰٓئِرَ ﴾ کی تحقیق میں اہلِ علم کا طویل کلام ہے اور جیسا کہ اس کے معنی اور ماہیت میں اختلاف کیا ہے، ویسا ہی اس کے عدد میں بھی اختلاف کیا ہے۔ "فواحش" "فاحشہ" کی جمع ہے۔ "فاحشہ" وہ کبیرہ گناہ ہے جو کبیرہ گناہوں میں فاحش ہوا ہے، جیسا کہ زنا اور اس طرح کے اور گناہ۔

﴿ وَالْفَوٰحِشَ ﴾ کا عطف ﴿ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ ﴾ پر عطفِ خاص علی العام میں سے ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ ﴾ ہر وہ گناہ ہے کہ جس کا خاتمہ نار کے ساتھ کیا گیا ہے اور فواحش ہر وہ گناہ ہے جس میں حد ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ كَبٰٓئِرَ ﴾ شرک اور ﴿ اَلْفَوٰحِشَ ﴾ زنا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ﴿ كَبٰٓئِرَ ﴾ وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے نار کا نام لیا ہے اور ﴿ اَلْفَوٰحِشَ ﴾ وہ ہے جس میں دنیا کی حد ہے۔[3] سورۃ النساء میں اس سے بڑھ کر مفصل اور کثیر الفائدہ بیان گزر چکا ہے۔[4]

﴿ اِلَّا اللَّمَمَ ﴾ استثنائے منقطع ہے، اس لیے کہ "لمم" کبائر و فواحش میں سے نہیں ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: مشہور یہی وجہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس شخص کے نزدیک متصل ہو جو "لمم" کی تفسیر غیر صغائر سے کرتا ہے۔ لغت میں "لمم" کی اصل وہ شے ہے جو قلیل اور چھوٹی ہو۔ اسی معنی میں "أَلَمَّ بِالْمَكَانِ" ہے، یعنی اس کا اس مکان میں ٹھہرنا قلیل ہوا، اسی طرح "أَلَمَّ بِالطَّعَامِ" یعنی طعام میں سے اس کا کھانا قلیل ہوا۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: اصل "لمم" یہ ہے کہ "يُلِمُّ بِالشَّيْءِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّرْتَكِبَهُ" یعنی قریب ہو کسی شے کے اور اس کا مرتکب نہ ہو۔ جب کوئی شخص کسی شے کا مقارب ہو اور اس کا مخالط نہ ہو تو اس وقت کہیں گے: "أَلَمَّ بِكَذَا"۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ "إلمام" کا استعمال دنو و قرب کے معنی میں کرتے ہیں: (ومنه قول جرير:

بِنفسي من تجنبه عَزيز علي ومن زيارته لمام

وقول الآخر:

متى تأتنا تلمم بنا في ديارنا تجد حطبا جزلا ونارا تأججا)

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لمم و المام" کی اصل وہ شے ہے جس کو انسان کرتا ہے مرة بعد مرة اور اس میں تعمق نہیں کرتا اور نہ اس پر قائم رہتا ہے: "يُقَالُ: أَلْمَمْتُ بِهِ إِذَا زُرْتَهُ وَانْصَرَفْتَ عَنْهُ وَيُقَالُ:

---

[1] تفسیر القرطبي (١٠٦/١٧) [2] تفسیر القرطبي (١٠٦/١٧) [3] الدر المنثور (٦٥٥/٧) [4] رقم الآية (٣١)

مَا فَعَلْتُهُ إِلَّا لَمَامًا وَإِلْمَامًا أَيْ: اَلْحِيْنُ بَعْدَ الْحِيْنِ" اسی معنی میں "إِلْمَامُ الْخَيَالِ" ہے۔ (قال الأعشي:

ألم خيال من قتيلة بعد ما   وهي حبلها من حبلنا فتصرما)

صحاح میں کہا ہے: "أَلَمَّ الرَّجُلُ مِنَ اللَّمَمِ وَهُوَ صَغَائِرُ الذُّنُوْبِ وَيُقَالُ: هُوَ مُقَارَبَةُ الْمَعْصِيَةِ مِنْ غَيْرِ مُوَاقَعَةٍ" (وأنشد غيره:

بزينب ألمم قبل أن يرحل الركب   وقل ان تملينا فما ملك القلب)[1]

یہ "لمم" جو اس آیت میں مذکور ہے اس کی تفسیر میں اہلِ علم کے اقوال مختلف ہیں۔ چنانچہ جمہور تو اس پر ہیں کہ "لمم" صغائرِ ذنوب ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ہیں جو زنا سے کم ہیں قبلہ، غمزہ اور نظرہ اور جیسے وہ کذب جس میں کوئی حد نہیں اور نہ کچھ ضرر ہے اور جیسے لوگوں کے گھروں پر جھانکنا اور تین دن سے زیادہ مسلمان کو چھوڑنا، یعنی اس سے بات نہ کرنا اور نمازِ مفروضہ میں ہنسنا اور نوحہ کرنا اور مصیبت میں گریبان پھاڑنا اور چلنے میں تبختر کرنا اور فساق کے درمیان بیٹھنا ان کو انس دینے کے لیے اور دیوانوں اور بچوں کو مسجد میں داخل کرنا اور مسجد کی نجاست جبکہ یہ غالب ہو کہ وہ اس کو نجس کر دیں گے اور نجاست کا بدن اور کپڑے میں بغیر حاجت کے استعمال کرنا اور اسی طرح کے اور کام "لمم" ہیں۔ (ذکرہ الخطیب وغیرہ)

کسی نے کہا ہے کہ وہ شخص ہے جو گناہ میں آلودہ ہوتا ہے، پھر توبہ کر لیتا ہے: "أَوْ يَقَعُ الْوَقْعَةَ ثُمَّ يَنْتَهِيْ" یعنی اتفاقاً گناہ ہو جاتا ہے پھر باز رہتا ہے۔ یہ قول سیدنا ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے اور اسی کے قائل امام مجاہد، حسن اور زہری رحمہم اللہ ہیں۔ امام زجاج اور نحاس رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔ كَمَا تَقَدَّمَ۔ کسی نے کہا ہے کہ "لمم" جاہلیت کے گناہ ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اسلام میں ان کا مواخذہ نہیں کرتا۔ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور زید بن اسلم رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ نفطویہ نے کہا: وہ یہ ہے کہ کوئی ایسا گناہ کر لیتا ہے جس کی اسے عادت نہ تھی کہا: اور عرب کہتے ہیں: "مَا تَأْتِيْنَا إِلَّا إِلْمَامًا أَيْ: فِي الْحِيْنِ قَالَ: وَلَا يَكُوْنُ أَنْ يُهِمَّ وَلَا يَفْعَلُ لِأَنَّ الْعَرَبَ لَا تَقُوْلُ: أَلَمَّ بِنَا إِلَّا إِذَا فَعَلَ لَا أَذَاهُمْ وَلَمْ يَفْعَلْ"۔[2] قولِ راجح اول ہے۔

﴿ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ﴾ یعنی بے شک تیرا رب وسیع مغفرت والا ہے، اس لیے کہ کبائر سے بچنے کے سبب سے صغیرہ گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ کرخی نے کہا کہ یہ جملہ سابقہ مضمون کے بعد اس لیے آیا تا کہ کبیرہ گناہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہ ہو جائے اور تا کہ وہ یہ وہم نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ پر وجوب عقاب ہے کہ کبیرہ گناہ والے کو ضرور ہی سزا دے۔ کسی نے کہا کہ یہ جملہ اس مضمون کی تعلیل ہے جس میں استثناء شامل ہے، یعنی یہ لمم گو مواخذے کے حکم سے خارج ہے لیکن وہ اس سے خالی نہیں ہے کہ ایک گناہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کا

---

[1] فتح القدير (١٤٩/٥)
[2] تفسير القرطبي (١٠٨/١٧) فتح القدير (١٤٩/٥، ١٥٠)

محتاج ہے، بلکہ اس کا مواخذے سے خارج ہونا اللہ کی مغفرت کے سبب سے ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک اس کو بخشتا ہے جس نے اپنے گناہ سے توبہ کی اور رجوع ہوا۔ سیدنا عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اسلام میں کبیرہ کوئی نہیں ہے، یعنی توبہ کے ساتھ اور نہیں ہے کوئی صغیرہ مع اصرار کے، یعنی اس پر ڈٹے رہنے سے وہ صغیرہ نہیں رہتا، بلکہ کبیرہ ہو جاتا ہے۔[1]

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "إصرار علی الصغیرة" کے کبیرہ ہونے میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے۔ پھر امام نووی رحمہ اللہ کی تقریر لکھی ہے۔ اس کے بعد فرمایا ہے کہ اس بارے میں صحیح وہ ہے جو قاضی محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ نے "إرشاد الفحول إلی تحقیق الحق من علم الأصول" میں ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے: کہا گیا ہے کہ صغیرہ پر اصرار کا حکم کبیرہ کے مرتکب کا ہے، حالانکہ اس پر کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو اس لائق ہو کہ اس سے تمسک کیا جائے۔ یہ تو صرف بعض صوفیہ کا ایک قول ہے، اس لیے کہ انھوں نے یوں کہا ہے: "لا صغیرة مع الإصرار"، بعض لوگ جو علمِ روایت کو نہیں پہچانتے، انھوں نے اس لفظ کو روایت کیا ہے اور ایک حدیث ٹھہرا دیا، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ اصرار کا حکم اسی شے کے مطابق ہے جس پر اصرار کیا۔ اگر صغیرہ پر اصرار کیا تو صغیرہ ہے اور اگر کبیرہ پر اصرار کیا تو کبیرہ ہے۔[2] انتہیٰ۔ اس سے یہ بات بھی سمجھی گئی کہ کبیرہ پر اصرار کفر نہیں ہے، پھر کبیرہ سے توبہ گو عیناً فوراً واجب ہے کتاب وسنت اور اجماعِ امت کی رو سے، لیکن کبھی اللہ تعالیٰ اس کو بغیر توبہ کے بھی بخش دیتا ہے۔ جیسا کہ سنتِ مطہرہ سے ثابت ہے اور محقق اہلِ حدیث نے اسے اختیار کیا ہے۔

پھر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ اس کا علم بندوں کے احوال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ﴾ یعنی وہ تمھارے احوال اور تمھارے امور کی تفاصیل کو خوب جانتا ہے، جبکہ تم کو تمھارے باپ آدم علیہ السلام کی ضمنِ خلق میں زمین سے پیدا کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد خود آدم علیہ السلام ہیں، اس لیے کہ ان کو مٹی سے بنایا اور وہ خوب جانتا ہے تمھارے احوال کو جس وقت تم جنین تھے۔ ﴿ اَجِنَّةٌ ﴾ "جنین" کی جمع ہے، "جنین" بچے کو کہتے ہیں، جب تک وہ شکم میں ہوتا ہے، اس کا نام جنین اس کے اجتنان کے سبب سے رکھا، یعنی اپنی ماں کے شکم میں اس کے مستتر ہونے کے سبب سے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ﴾ پس جو بچہ شکم سے خارج ہو گیا، اس کا نام جنین نہیں رکھا جاتا۔

جملہ ﴿ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ ﴾ مستانفہ ہے ما قبل کی تقریر کے لیے۔ ثابت بن حارث انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ

[1] المنهاج للنووي (٢/٨٦، ٨٧) [2] إرشاد الفحول (١/١٤٦) فتح البيان (١٣/٢٦٥_٢٦٧)

یہود کا جب کوئی چھوٹا بچہ مرتا تو کہتے تھے کہ وہ صدیق ہے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ کو یہ بات پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہود نے جھوٹ کہا، نہیں ہے کوئی نسمہ، یعنی جان کہ اللہ پیدا کرے اس کو اس کی ماں کے شکم میں مگر وہ شقی ہے یا سعید۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی۔[1] (أخرجه الطبراني وغيره يعني ابن المنذر وابن أبي حاتم وابن مردويه وأبو نعيم في المعرفة) کسی نے کہا ہے کہ کچھ لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو نیک اعمال کرتے، پھر کہتے: ہماری نماز، ہمارے روزے، ہمارا حج، ہمارا جہاد۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ یعنی جب اللہ تعالیٰ پہلے سے تمھارے احوال کو خوب جانتا ہے تو تم اپنے نفوس کی مدح مت کرو اور نہ خیر کی اُن پر ثنا کرو اور نہ منسوب کرو ان کو پاکیزہ عمل اور زیادتِ خیر وطاعات وحسنِ اعمال کی طرف اور ان کا کسر کرو اس لیے کہ تزکیۂ نفس کو ترک کرنا ریا سے بعید تر ہے اور خشوع کے قریب تر ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کی مدح مت کرو۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: اللہ نے ہر نفس سے اس شے کو جان لیا ہے جو وہ کرنے والا ہے اور اس شے کو جس کی طرف رجوع ہونے والا ہے۔ سو تم اس کو گناہوں سے بری مت کرو اور نہ اس کی حسنِ اعمال کے ساتھ تعریف کرو۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ان کا تزکیہ مت کرو از راہِ ریا وخیلاء اور اس شخص کو جس کی حقیقت کو تم نہیں جانتے، مت کہو کہ میں تم سے بہتر ہوں اور تم سے زیادہ پاکیزہ ہوں، یا میں تجھ سے زیادہ متقی ہوں اس لیے کہ علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عاقبت کا خوف واجب ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس شخص کے انجام کو جانتا ہے جو تقویٰ پر ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ ممانعت بر سبیلِ اعجاب ہے اور بر طریقِ اعتراف بہ نعمت حسن ہے،[3] اسی لیے کہا گیا ہے کہ طاعت پر مسرت ہونا طاعت ہے اور اس کا ذکر کرنا شکر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾ [الضحیٰ: ١١] ''اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتا رہ''

جملۂ ﴿ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴾ مستانفہ ہے نہی کا مقرر ہے، یعنی بے شک وہ خوب جانتا ہے تم میں سے متقی و غیر متقی کو اس سے پہلے کہ تم کو تمھارے باپ آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالے۔ چنانچہ جس شخص نے اپنے نفس کا مجاہدہ کیا اور اس سے تقویٰ خالص ہوا تو وہ اس کو اس ثواب سے بھی اوپر پہنچا دے گا جس کی وہ دارین میں امید رکھتا ہے۔ پھر بھلا اس شخص کا کیا کہنا ہے جس کے لیے تقویٰ کا وصف ثابت ہو گیا ہے اور یہ وہی ہے کہ اس سے منتفع ہوتا ہے اور اس پر ثواب دیا جاتا ہے۔ پھر جب اللہ پاک نے مشرکوں کی علی العموم جہالت بیان کی تو ان میں سے بعض کو مذمت کے ساتھ مخصوص کیا۔ چنانچہ فرمایا:[4]

---

[1] المعجم الكبير (٨١/٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ٦١١٦)

[2] تفسير البغوي (٤١٣/٧) [3] تفسير الجلالين (٧٠٢/١) [4] فتح البيان (٢٦٨_٢٦٢/١٣)

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ۝۳۳ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ۝۳۴ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ
الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ۝۳۵ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝۳۶
وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ۝۳۷ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝۳۸ وَاَنْ
لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝۳۹ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝۴۰ ثُمَّ
يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝۴۱

کیا پھر آپ نے اسے دیکھا جو پھرا (اور جس نے حق سے روگردانی کی) (33) اور اس نے تھوڑا سا (مال) دیا، اور (پھر دینا) روک دیا (34) کیا اس کے پاس علمِ غیب ہے کہ وہ (سب کچھ) دیکھ رہا ہے؟ (35) کیا اسے ان (باتوں) کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں؟ (36) اور ابراہیم جس نے (صحیفوں میں جو باتیں تھیں، انھیں) ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا؟ (37) یہ کہ کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا (38) اور یہ کہ انسان کے لیے بس وہی کچھ ہے جس کی اس نے سعی کی (39) اور بلاشبہ اس کی سعی جلد دیکھی جائے گی (40) پھر اسے پوری پوری جزا دی جائے گی (41)

اطاعت سے روگردانی کرنے والے اور بخیل کی مذمت:

اللہ پاک اس شخص کی مذمت فرماتا ہے جس نے اللہ کی اطاعت سے منہ پھیرا اور یقین نہ لایا اور نہ نماز پڑھی، لیکن تکذیب کی اور اعراض کیا اور تھوڑا سا لایا اور سخت نکلا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تھوڑی سی اطاعت کی، پھر اس کو قطع کیا۔ امام مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، قتادہ رحمہم اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام عکرمہ اور سعید رحمہما اللہ نے کہا: اس قوم کی مثال کی طرح کہ جس وقت وہ کوئی کنواں کھودتے تھے اور کھودنے کے دوران میں کوئی پتھر پاتے جو اُن کو کام کے پورا کرنے سے روکتا تھا تو کہتے: "أَكْدَيْنَا"[1] یعنی ہم نے قطع کیا اور کام کو چھوڑ دیتے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴾ یعنی کیا اس شخص کے پاس جس نے خرچ کرنے کے خوف سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اپنے احسان کو قطع کیا، علمِ غیب ہے اس بات کا کہ آیندہ وہ شے جو اس کے ہاتھ میں ہے ختم ہو جائے گی، یہاں تک کہ وہ اپنے احسان کرنے سے رک گیا، چنانچہ وہ شخص یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، یعنی بات ایسی نہیں ہے۔ وہ جو صدقہ کرنے سے اور معروف کام سے اور نیکی اور صلہ رحمی سے رکا ہے تو صرف بخیلی کی

---

[1] تفسیر الطبري (۲۲/۵٤۲) تفسیر ابن كثير (٤/۳۲۷)

وجہ سے رکا ہے اور مال کی حرص کی وجہ سے رک گیا ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے «أَنْفِقْ بِلَالًا وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَالًا»[1] یعنی اے بلال! خرچ کیے جا اور عرش والے سے کمی کا خوف نہ کر۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴾ [سبا: ٣٩] ''تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اللہ اس کا (پورا پورا) بدلہ دے گا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔''

صحفِ موسیٰ وابراہیم علیہما السلام کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ لَمْ یُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰی ۝ وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی ﴾ امام سعید بن جبیر اور ثوری رحمہما اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا: ابراہیم کے جس نے وہ ساری شے پہنچا دی جس کا اسے امر کیا گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ وَفّٰۤی ﴾ ''بَيَّنَهُ بِالْبَلَاغِ''۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وفا کی وہ شے جس کا ان کو امر کیا گیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پوری کی اللہ کی اطاعت اور خلق کی طرف اس کی رسالت ادا کی۔ یہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا اختیار ہے[2] اور اس کو شامل ہے جو اس سے پہلے ہے۔ اس کی شاہد یہ آیت ہے: ﴿ وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ ﴾ [البقرة: ١٢٤] ''جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمایا اور انھوں نے سب کو پورا کر دیا تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمھیں لوگوں کا امام بنا دوں گا۔''

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے سارے احکامات کے ساتھ قیام کیا اور سارے نواہی چھوڑے اور رسالت مکمل طور پر پہنچا دی تو اس وجہ سے وہ اس کے مستحق ہوئے کہ لوگوں کے امام ہوں اور اُن کے سارے احوال اور اقوال و افعال میں ان کی پیروی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾ [النحل: ١٢٣] ''پھر ہم نے آپ کی جانب وحی بھیجی کہ آپ ملتِ ابراہیم حنیف کی پیروی کریں، جو مشرکوں میں سے نہ تھے۔'' سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی ﴾ فرمایا: کیا تو جانتا ہے کہ ﴿ وَفّٰۤی ﴾ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: اپنے دن کا عمل پورا کیا، شروع میں چار رکعت کے ساتھ، یعنی دن کے شروع میں۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم ورواہ ابن جرير من حديث جعفر بن الزبير وهو ضعيف)

حدیثِ قدسی: «ابْنَ آدَمَ ارْكَعْ لِي أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ مِنْ أَوَّلِ النَّهَارِ أَكْفِكَ آخِرَهُ»[4] (أخرجه الترمذي عن أبي الدرداء رضي الله عنه وأبي ذر رضي الله عنه عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم عن الله عز وجل) یعنی اے آدم کے بیٹے! تو میرے واسطے دن کے شروع میں چار رکعتیں پڑھ، میں تیری کفایت کروں گا اس کے آخر میں۔ سہل بن معاذ بن انس عن ابیہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] المعجم الكبير (٣٤٠/١) صحيح الجامع (١٥١٢) [2] تفسير الطبري (٥٤٤/٢٢، ٥٤٥) تفسير ابن كثير (٣٢٧/٤)

[3] تفسير الطبري (٥٤٥/٢٢) اس کی سند میں ''جعفر بن زبیر'' ضعیف راوی ہے۔ [4] سنن الترمذي (٤٧٥) صحيح الجامع (٤٣٣٩)

راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمھیں اس بات کی خبر نہ دوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کا نام ﴿ اَلَّذِيْ وَفّٰۤى ﴾ کیوں رکھا؟ وہ ہر صبح اور شام کو کہتے تھے: ﴿ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴾ [الروم: ١٧] ''پس اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھا کرو جب کہ تم شام کرو اور جب صبح کرو۔''[1] (رواه ابن أبي حاتم ورواه ابن جرير عن أبي كريب عن رشدين بن سعد عن زبان) (فتح البیان میں ہے: وفي إسناده ابن لهيعة وهو ضعيف)۔

روزِ قیامت کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا:

پھر اللہ تعالیٰ نے اس شے کا بیان کرنا شروع کیا جو اس نے ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں وحی کی، چنانچہ فرمایا: ﴿ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ یعنی ہر نفس جس نے کفر کے ساتھ اپنے نفس پر ظلم کیا یا کسی گناہ کے ساتھ اپنے آپ پر ظلم کیا تو اس کا بوجھ اسی پر ہے اس کو اس کی طرف سے کوئی اور نہ اٹھائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ﴾ [الفاطر: ١٨] ''اگر کوئی گراں بار دوسرے کو اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے بلائے گا تو وہ اس میں سے کچھ بھی نہ اٹھائے گا گو قرابت دار ہی ہو۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ یعنی جس طرح اس پر کسی اور کا بوجھ نہیں لادا جاتا، اسی طرح اجر میں سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا مگر وہی جو خود اس نے اپنے لیے کمایا۔ اسی آیتِ کریمہ سے امام شافعی رحمہ اللہ نے اور اُن کے تابعین نے یہ استنباط کیا ہے کہ اہدائے قراءت (قراءت کا تحفہ) کا ثواب مردوں کو نہیں پہنچتا، کیوں کہ وہ نہ اُن کے عمل سے ہے اور نہ اُن کے کسب سے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمت کو اس کی طرف نہیں بلایا اور نہ اُن کو اس کی رغبت دلائی، نہ اس کے بارے میں ان کو ارشاد کیا، نص سے (یعنی واضح حکم دے کر)، نہ ایماء سے (یعنی اشارے سے) اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے یہ نقل کیا گیا۔ اور اگر یہ کوئی بہتر کام ہوتا تو وہ ہم سے بڑھ کر یہ کام کرتے۔ قربات کے باب میں نصوص (صریح احکام) پر اکتفا کیا جاتا ہے اور قیاسات اور آراء وغیرہ سے اس میں تصرف (انحصار) نہیں کیا جاتا۔ اب رہی دعا اور صدقہ تو ان کے وصول پر (یعنی پہنچنے پر) اجماع کیا گیا ہے اور شارع علیہ السلام سے ان پر نص کی گئی ہے۔

رہی وہ حدیث شریف جو مسلم نے اپنی صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ جس وقت انسان مر گیا تو اس کا عمل منقطع ہوا مگر تین چیزیں: نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتے ہیں، یا صدقہ جو جاری ہے، یا علم جس سے نفع لیا جاتا ہے۔[2] سو یہ تینوں اس کی سعی و کد و عمل سے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے

---

[1] تفسير الطبري (٢٢/٥٤٥) المعجم الكبير (١٩٢٢٠) فتح البيان (١٣/٢٦٩) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣١)

پاک چیز جو کوئی شخص کھاتا ہے وہ اپنے ہاتھ کے کسب سے ہے اور بیشک لڑکا اس کا اس کے کسب سے ہے[1] اور صدقہ جاریہ مثل وقف اور اسی طرح کی اور کچھ چیز یہ بھی اس کے عمل و وقف کے آثار سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ۣ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [یٰس: ۱۲] ''بے شک ہم مردوں کو زندہ کریں گے، اور ہم لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جن کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں، اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں ضبط کر رکھا ہے۔''

اور وہ علم جس کو اس نے ان لوگوں میں پھیلایا پھر اس کا لوگوں نے اقتداء کیا اس کے بعد۔ چنانچہ یہ بھی اس کی سعی و عمل سے ہے۔ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ جس نے کسی ہدایت کی طرف بلایا تو اس کے لیے ویسا ہی اجر ہو گا جیسا کہ ان لوگوں کے اجر ہوں گے جنھوں نے اس کا اتباع کیا اور ان کے اجور میں سے کچھ کم نہ ہو گا۔[2] قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴾ یعنی قیامت کے دن جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [التوبۃ: ۱۰۵] ''کہہ دیجیے کہ تم عمل کیے جاؤ تمھارے عمل اللہ خود دیکھ لے گا اور اس کا رسول اور ایمان والے (بھی دیکھ لیں گے) اور ضرور تم کو ایسے کے پاس جانا ہے جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں کا جاننے والا ہے، سو وہ تم کو تمھارا سب کیا ہوا بتلا دے گا۔'' یعنی پھر وہ تم کو اس کی خبر دے گا اور اس پر تم کو پوری پوری جزا دے گا اگر اچھے اعمال ہیں تو خیر اور اگر برے ہیں تو شر، اسی طرح یہاں فرمایا ہے۔ ﴿ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴾ "أي: الأوفر"۔[3] (كذا في ابن كثير).

فتح البیان کا بیان:

﴿ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ۝ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے: کیا پھر دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے خیر سے اعراض کیا اور اتباعِ حق سے منہ پھیرا اور اپنے مال میں سے بہت تھوڑی سی شے دی اور باقی کو روک رکھا اور اس کو قطع کر دیا اور اس سے رکا رہا۔ اصل میں ﴿ اَكْدٰى ﴾ "كدية" سے ماخوذ ہے، "كدية" صلابت و سختی کو کہتے ہیں۔ جب کسی نے کنواں کھودا، پھر اس میں ایک ایسے پتھر پر پہنچا کہ وہ کھودا نہیں جا سکتا تو اس کے لیے محاورۂ عرب میں یوں کہتے ہیں کہ "قَدْ أَكْدٰى"

پھر عرب نے اس کو اس شخص کے لیے استعمال کیا جس نے عطا دی اور پوری نہ دی اور اس شخص کے لیے جس نے کوئی شے طلب کی اور اس کے آخر کو نہ پہنچا۔ امام کسائی اور ابو زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کسی کی انگلیوں میں سے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٢٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٥٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٣٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٢٠٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٤) [3] تفسير ابن كثير (٣٢٧/٤ـ٣٢٩)

کھودنے سے گٹھے یا چھالے پڑ جاتے ہیں تو کہتے ہیں: ''كُدِيَتْ أَصَابِعُهُ'' اور جب کسی کا ہاتھ تھک جاتا ہے اور کچھ کام نہیں دیتا تو بولتے ہیں: ''كَدَتْ يَدُهُ'' اور جب زمین کی روئیدگی کم ہوتی ہے تو کہتے ہیں: ''كَدَتِ الْأَرْضُ''۔ اور ''أَكْدَيْتُ الرَّجُلَ عَنِ الشَّيْءِ'' کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اس شخص کو اس شے سے رد کیا اور جب آدمی کی خیر قلیل ہوتی ہے تو کہتے ہیں: ''أَكْدَى الرَّجُلُ''.

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کے معنی ہیں: عطیہ سے رک گیا اور قطع کیا۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منع کیا سخت منع کرنا۔ امام مجاہد، ابن زید اور مقاتل رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے دین پر آپ ﷺ کا اتباع کر چکا تھا، پھر بعض مشرکوں نے اسے عار دلائی تو دینِ اسلام کو چھوڑ دیا اور اپنے شرک کی طرف پھر گیا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ولید قرآن شریف کی تعریف کرتا تھا پھر اس سے رک گیا، چنانچہ اس نے اپنی زبان سے قلیل خیر دی پھر اس کو قطع کیا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نضر بن حارث کے حق میں اتری۔ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ اَكْدٰى ﴾ ''قَطَعَ''، عاص بن وائل کے بارے میں اتری۔[2] ان کا دوسرا قول پہلے بیان ہو چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴾ میں استفہام ملامت اور توبیخ کا ہے، یعنی کیا اس قطع کرنے والے کے پاس امرِ عذاب کا علم ہے جو اس سے غائب ہے، چنانچہ وہ اس کو جانتا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ولید بن مغیرہ ہے، اکثر اسی پر ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عاص بن وائل سہمی ہے یا ابوجہل، جیسا کہ محمد بن کعب نے کہا، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ یہ اختلاف تو ''مَنْ تَوَلّٰى وَأَعْطٰى وَأَكْدٰى'' میں ہے اور جس شخص نے اسے عار دلائی تھی اور اس کے لیے ضامن ہوا تھا کہ اس کی طرف سے عذاب اٹھالے گا تو یہاں پر اس کی تعیین کا ذکر نہیں کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴾ یعنی کیا اسے خبر نہیں دی گئی اور اس سے وہ بات بیان نہیں کی گئی جو موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں ہے، یعنی تورات یا اس سے پہلے کے صحیفے اور وہ بات ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے، وہ ابراہیم علیہ السلام جس نے اس شے کو تمام اور مکمل کیا جس کا اسے حکم ہوا۔ مفسروں نے کہا ہے کہ پہنچا دی اپنی قوم کو وہ شے جس کا ان کو حکم ہوا اور ادا کر دی۔ کسی نے کہا ہے کہ اس شے کے پورا کرنے میں مبالغہ کیا جس پر اللہ تعالیٰ سے معاہدہ کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''سہام'' یعنی اسلام کے حصے تیس ہیں ان کو ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کسی نے پورا نہیں کیا۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ﴾۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس نے اس شے میں اطاعت

[1] تفسير القرطبي (١١٢،١١١/١٧) فتح القدير (١٥٠/٥) [2] الدر المنثور (٦٥٩/٧)

کی تکمیل کی جو اپنے بیٹے کے ساتھ کی جبکہ خواب میں دیکھا۔[1] خاص طور پر ان دونبیوں کا ذکر اس لیے کیا کہ ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام سے پہلے مرد کا اپنے غیر کے جرم میں مواخذہ کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے جس نے ان کی مخالفت کی وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ پھر اللہ پاک نے اس شے کا بیان کیا جو ان کے صحیفوں میں تھی۔

ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسٰنِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ ("أن" مخففه عن مثقله، اسم اس کا ضمیر شان محذوف، خبر اس کی جملہ ما بعد اور محل جملہ کا جر ہے بنا بر بدل صحفِ موسیٰ و ابراہیم یا رفع بنا بر خبر مبتدائے محذوف۔ فتح)۔ یعنی کوئی نفس اٹھانے والا کسی اور کا بوجھ نہیں اٹھاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی نفس کسی اور کے گناہ میں نہیں پکڑا جاتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے مرد کو اس کے غیر کے گناہ میں پکڑتے تھے۔ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیوی اور اس کے غلام کے سبب سے قتل کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ ابراہیم علیہ السلام ہوئے۔ انھوں نے اس سے ان کو منع کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ حکم پہنچایا: ﴿ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾[2] اس کی تفسیر سورت انعام میں گزر چکی ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسٰنِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ معطوف ہے: ﴿ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ پر۔ یہ بھی ان چیزوں میں ہے جو صحفِ ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام میں ہے۔ یعنی انسان کے لیے نہیں مگر اس کی سعی کا اجر اور اس کے عمل کی جزا اور کسی کو کسی اور عمل کا نفع نہیں دیتا۔ یہ عموم خاص کیا گیا ہے اس آیتِ کریمہ کی طرح سے: ﴿ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ [الطور: ٢١] ''ہم ان کی اولاد کو ان تک پہنچا دیں گے۔'' اور اس شے کی طرح جو شفاعت کے بارے میں وارد ہوئی ہے کہ انبیاء اور ملائکہ بندوں کے لیے شفاعت کریں گے اور اس شے کی طرح جو زندہ لوگوں کے مردوں کے لیے دعا کرنے کی مشروعیت کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔

اور مثل اس شخص کے جو اس کا قائل ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے بہ مثل ایں امور، اس کا قول صحیح نہیں ہے، کیونکہ خاص عام کو منسوخ نہیں کرتا ہے، بلکہ اس کی تخصیص کرتا ہے۔ لہٰذا جب کبھی اس بات پر دلیل قائم ہو گی کہ انسان کو کسی ایسی شے کا فائدہ ہوتا ہے جو اس کی کوشش سے نہیں ہے تو وہ دلیل اس عموم کو خاص کرے گی جو اس آیت میں ہے۔ اس کا یوں تعقب بھی کیا ہے کہ یہ آیت خبر ہے اور اخبار میں نسخ نہیں ہوتا ہے اور یوں کہ یہ آیت اپنے ظاہر پر ہے اور لڑکے کی طرف سے دعا والد ہی سے دعا ہے اس طرح کہ اس نے لڑکے کا اکتساب کیا ہے، یعنی لڑکا اسی کے کسب سے ہے اور یوں کہ یہ آیت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کی قوم کے لیے مخصوص ہے، کیوں کہ وہ اس مضمون کو بیان کرتی ہے جو اُن کے صحیفوں میں ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٥٤٤،٥٤٥/٢٢) [2] تفسير البغوي (٤١٦/٧) [3] رقم الآية (١٦٤)

رہی یہ اُمتِ مرحومہ تو اس کے لیے وہ شے ہے جو اس نے سعی کی اور وہ شے جو اس کے غیر نے اس کے لیے سعی کی، بہ سبب اس بات کے جو صحیح ہوئی ہے کہ ہر نبی اور صالح کی شفاعت ہے، حالانکہ یہ فائدہ اٹھانا ہے غیر کے عمل سے ہے۔ اور اس کے سوا جو دلیل ہے اس کے سبب سے یہ بات ہے کہ انسان اس شے سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اس نے نہیں کی۔ جو کوئی نصوص (صریح احکامِ شرعی) میں غور وفکر کرے گا تو اس سے اتنا پائے گا جس کا شمار ممکن نہیں ہے۔ پس اب جائز نہیں ہے کہ آیت کی کتاب وسنت اور اجماعِ امت کے خلاف تاویل کی جائے۔ تو اس وقت ظاہر وہ بات ہے جو ہم نے کہی کہ آیت عام ہے، امورِ کثیرہ سے اس کی تخصیص کی گئی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کی تفسیر میں فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴾ [الطور: ۲۱] ''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی ہم ان کی اولاد کو ان تک پہنچا دیں گے اور ان کے عمل سے ہم کچھ کم نہ کریں گے ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا گروی ہے۔'' چنانچہ اللہ پاک نے بیٹوں کو باپوں کی صلاح (نیکیوں) کی وجہ سے جنت میں داخل کیا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جب اس آیت کو پڑھتے تو ''اِسْتَرْجَعَ وَاسْتَكَانَ''[2] یعنی راحت وسکون پاتے۔ کسی نے کہا ہے کہ انسان سے مراد کافر ہے، معنی یہ ہیں کہ اس کے لیے خیر میں سے نہیں ہے مگر وہ جو خود اس نے کی، چنانچہ وہ اس پر دنیا میں ثواب دیا جاتا ہے، اس طرح سے کہ اس کی روزی کو اس پر وسعت دی جاتی ہے اور اس کے بدن میں عافیت دی جاتی ہے، تاکہ آخرت میں اس کے لیے کوئی خیر باقی نہ رہے۔ کسی نے کہا یہ عدل کے باب سے، رہا فضل وکرم کا باب تو جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل وکرم سے جو کچھ چاہے زیادہ دے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس شریعت میں یہ منسوخ الحکم ہے۔ یہ جو ہے یہ ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں ہے۔

شیخ الاسلام تقی الدین ابو العباس احمد بن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جس نے یہ اعتقاد کیا کہ انسان منتفع نہیں ہوتا (فائدہ نہیں اٹھاتا) مگر اپنے عمل سے تو یقیناً اس نے خرقِ اجماع کیا اور یہ بہت سی وجوہ سے باطل ہے:

1. انسان اپنے غیر کی دعا سے فائدہ اٹھاتا ہے، حالانکہ یہ غیر کے عمل سے انتفاع ہے۔
2. نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حساب کے لیے اہلِ موقف کی شفاعت کریں گے۔ پھر اہلِ جنت کے داخلے کی شفاعت کریں گے۔
3. اہلِ کبائر کے لیے نار سے نکلنے کی شفاعت کریں گے، حالانکہ یہ دوسرے کی سعی سے فائدہ اٹھانا ہے۔
4. فرشتے ان کے لیے دعا کرتے ہیں اور مغفرت مانگتے ہیں جو زمین میں ہیں، حالانکہ یہ غیر کے عمل سے فائدہ اٹھانا ہے۔

[1] تفسیر الطبري (۲۲/۵۴٦، ۵۴۷) [2] الدر المنثور (۷/٦٦۲)

5 اللہ تعالیٰ اس شخص کو نار سے نکالے گا جس نے کبھی کوئی خیر نہیں کی محض اپنی رحمت سے۔ یہ اس کا فائدہ اٹھانا ہے بغیر کسی عمل کے۔

6 مومنین کی اولاد اپنے آباء کے عمل سے جنت میں داخل ہوگی، یہ صرف غیر کے عمل سے فائدہ حاصل کرنا ہے۔

7 اللہ تعالیٰ نے دو یتیم لڑکوں کے قصے میں فرمایا ہے: ﴿ وَكَانَ اَبُوْهُمَا صٰلِحًا ﴾ [الکهف: ٨٢] ''ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا۔'' پس انھوں نے اپنے باپ کی نیکی کی وجہ سے نفع پایا اور وہ ان کی سعی سے نہیں ہے۔

8 میت کو اس کی طرف سے صدقہ دینے سے یا غلام آزاد کرنے سے فائدہ ہوتا ہے سنتِ نبوی کی نص سے اور اجماع سے، حالانکہ یہ غیر کے عمل سے ہے۔

9 سنت کی نص کے مطابق میت سے فرض حج ساقط ہو جاتا ہے، اس کے ولی کے اس کی طرف سے حج کرنے پر، حالانکہ یہ غیر کے عمل سے فائدہ اٹھانا ہے۔

10 ایسا حج یا روزہ جس کی نذر مانی گئی ہو وہ اس کے غیر کے عمل کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے سنت کی نص سے، حالانکہ یہ غیر کے عمل سے فائدہ اٹھانا ہے۔

11 نبی اکرم ﷺ قرض دار پر نماز پڑھنے سے باز رہے، یہاں تک کہ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اس کا قرض ادا کیا اور دوسرے کا قرض سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ادا کیا، وہ شخص نبیِ مکرم ﷺ کی نماز سے منتفع ہوا، حالانکہ یہ عملِ غیر سے ہے۔

12 نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے لیے فرمایا جس شخص نے اکیلے نماز پڑھی: کیا نہیں ہے کوئی شخص جو صدقہ کرے اس پر اور نماز پڑھے اس کے ساتھ، چنانچہ واقعی اس کو دوسرے کے فعل سے جماعت کی فضیلت حاصل ہوئی۔

13 انسان کا لوگوں کے قرضوں سے ذمہ بری ہو جاتا ہے جبکہ کوئی ادا کرنے والا اس کی طرف سے ان کو ادا کر دے۔ یہ عملِ غیر سے فائدہ اٹھانا ہے۔

14 جس شخص پر تبعات و مظالم ہیں، یعنی اس نے ظلم اور زیادتیاں کی ہیں جب اس کی ان سے معافی کر دی جاتی ہے تو وہ اس سے ساقط ہو جاتے ہیں، یہ غیر کے عمل سے فائدہ اٹھانا ہے۔

15 نیک پڑوسی زندگی اور موت میں فائدہ پہنچاتا ہے جیسا کہ اثر میں آیا ہے، یہ غیر کے عمل سے فائدہ اٹھانا ہے۔

16 اہلِ ذکر کے ہم نشین پر ان کے سبب سے رحم کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ ان میں سے نہیں ہے اور نہ ہی وہ ذکر کے لیے بیٹھا۔ اسے کوئی حاجت پیش آئی تھی، اس لیے آیا تھا: ''وَالْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' پھر بھی وہ اپنے غیر کے عمل سے منتفع ہوا۔

17 میت پر نماز اور اس کے لیے دعا میت کے لیے انتفاع ہے اس پر زندہ کے نماز پڑھنے کے سبب سے، حالانکہ یہ اس کے غیر کا عمل ہے۔

18 جمعہ اجتماعِ عدد کے سبب سے حاصل ہوتا ہے اور اسی طرح جماعت زیادہ تعداد میں ہونے سے، یہ بعض کا بعض سے انتفاع ہے۔

19 اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ﴾ [الأنفال: ٣٣] ''اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرے گا کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو عذاب دے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ [الفتح: ٢٥] ''اور اگر ایسے (بہت سے) مسلمان مرد اور (بہت سی) مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن کی تم کو خبر نہ تھی یعنی ان کے پاس جانے کا احتمال نہ ہوتا جس پر ان کی وجہ سے تم کو بھی بے خبری میں ضرر پہنچتا (تو تمھیں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرے اور اگر یہ الگ الگ ہوتے تو ان میں جو کافر تھے ہم ان کو دردناک سزا دیتے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [البقرة: ٢٥١] ''اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر بڑا فضل و کرم کرنے والا ہے۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کے سبب سے بعض لوگوں سے عذاب کو دور کیا، حالانکہ یہ دوسروں کے عمل سے فائدہ اٹھانا ہے۔

20 صدقہ فطر کا واجب ہے صغیر وغیرہ پر منجملہ ان کے جن کی آدمی عیال داری کرتا ہے، لہٰذا جس کی طرف سے وہ نکالا جاتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، حالانکہ اس میں اس کی کوئی سعی نہیں ہے۔

21 صبی (بچہ) اور مجنون کے مال میں زکات واجب ہے اور وہ اس پر ثواب دیا جاتا ہے، حالانکہ اس کی سعی نہیں ہے۔[1] انتهٰى كلامه رحمه الله تعالى.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴾ یعنی اور یہ کہ اس کی سعی اس پر پیش کی جائے گی اور اس کے لیے قیامت کے دن کھول دی جائے گی اور وہ اس کو آخرت میں بغیر کسی شک کے اپنے میزان میں دیکھے گا۔ ﴿ ثُمَّ يُجْزٰىهُ ﴾ یعنی پھر انسان اپنی سعی کا بدلہ دیا جائے گا۔ محاورے میں دونوں طرح بولتے ہیں: "جَزَاهُ اللّٰهُ بِعَمَلِهِ وَجَزَاهُ عَلَى عَمَلِهِ" پس ضمیر مرفوع تو انسان کی طرف راجع ہے اور ضمیر منصوب راجع ہے ﴿ سَعْيَهٗ ﴾ کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ جزائے متاخر کی طرف راجع ہے، وہ یہ ہے: ﴿ اَلْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴾ تو یہ اس کا مفسر ہوگا۔

یہ بھی جائز ہے کہ اس جزا کی طرف راجع ہو جو ﴿ يُجْزٰىهُ ﴾ کا مصدر ہے۔ سفاقسی نے اس وجہ کو قوت دی ہے اور ﴿ اَلْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴾ تفسیر ٹھہرائی جائے اس جزا کی جس پر فعل سے دلالت کی گئی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے

[1] مجموع الفتاویٰ (٣١٣/٢٤) فتح البيان (٢٧١/١٣۔٢٧٣).

اس فرمان میں ہے: ﴿ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ [المائدۃ: ۸] ''عدل کیا کرو جو پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے۔'' امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''جَزَيْتُهُ الْجَزَاءَ وَجَزَيْتُهُ بِالْجَزَاءِ'' دونوں برابر بولے جاتے ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں ہے۔[1] كذا في فتح البيان.

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿٤٢﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿٤٣﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿٤٤﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٤٥﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿٤٦﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿٤٧﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿٤٨﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿٤٩﴾ وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ﴿٥٠﴾ وَثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰى ﴿٥١﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ﴿٥٢﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿٥٣﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿٥٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿٥٥﴾

اور بے شک (سب کا) آپ کے رب ہی کے پاس ٹھکانا ہے (42) اور بلاشبہہ وہی ہنساتا اور وہی رُلاتا ہے (43) اور بے شک وہی مارتا اور وہی زندہ کرتا ہے (44) اور بلاشبہہ اسی نے جوڑا (یعنی) نر اور مادہ پیدا کیے (45) نطفے سے جب وہ (رحم میں) ڈالا جاتا ہے (46) اور بلاشبہہ دوسری (بار) پیدائش بھی اسی کے ذمے ہے (47) اور بے شک وہی غنی کرتا اور سرمایہ دار بناتا ہے (48) اور یقیناً وہی شِعریٰ (ستارے) کا رب ہے (49) اور بلاشبہہ اسی نے پہلے عادیوں کو ہلاک کیا (50) اور ثمود کو بھی، پھر اس نے (کسی کو بھی) باقی نہ چھوڑا (51) اور (اُن سے) پہلے قومِ نوح کو بھی، بلاشبہہ وہ نہایت ظالم اور بڑے سرکش تھے (52) اور اس نے اُلٹی ہوئی بستیوں کو (زمین پر) دے مارا (53) پھر اس بستی کو ڈھانپ لیا جس (سنگ باری) نے ڈھانپ لیا (54) پھر (اے انسان!) تو اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں میں شک کرے گا؟ (55)

صفاتِ الٰہی کا بیان:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تیرے رب کی طرف منتہیٰ ہے، یعنی معاد قیامت کے دن۔ عمرو بن میمون اودی کہتے ہیں کہ ہم میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور کہا: اے بنی اود! میں تمھاری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] تفسير القرطبي (١١٥/١٧) فتح البيان (٢٦٨/١٣-٢٧٣)

کا بھیجا ہوا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ معاد (لوٹ کر جانا) اللہ کی طرف ہے، جنت کی طرف یا نار کی طرف۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم) اس کی تفسیر میں سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں، فرمایا: ''لَا فِكْرَةَ فِي الرَّبِّ''، یعنی رب میں فکر مت کرنا۔ اس کو امام بغوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اور کہا: یہ اس کی طرح ہے جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ مخلوق میں فکر کرو اور خالق میں فکر مت کرو۔ بے شک شان یہ ہے کہ فکر اس کا احاطہ نہیں کر سکتی، اسی طرح اس کو وارد کیا ہے،[2] حالانکہ یہ ان الفاظ سے محفوظ نہیں ہے۔

صحیح میں جو ہے وہ صرف یہ ہے کہ شیطان تمھارے ایک کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے: ایسا کس نے پیدا کیا؟ ایسا کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ کہتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟ اور تم سے کوئی جس وقت اس سوال کو پہنچے تو چاہیے کہ اللہ کی پناہ مانگے اور ایسے خیال سے باز رہے۔[3] دوسری حدیث میں ہے جو سنن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں فکر کرو اور اللہ کی ذات میں فکر مت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ پیدا کیا ہے جس کے کان کی لو سے لے کر اس کے کندھے تک تین سو برس کا فاصلہ ہے[4] یا جیسا فرمایا۔

﴿ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴾ یعنی اس نے اپنے بندوں سے ہنسا اور رونا پیدا کیا ہے اور ان کا سبب اور وہ دونوں مختلف ہیں۔ ﴿ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴾ كقوله تعالىٰ: ﴿ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ ﴾ [الملك:٢] ''جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا۔'' ﴿ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴾۔ كقوله تعالىٰ: ﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٣٩﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴾ [القيامة: ٣٦۔ ٤٠] ''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ ایک گاڑھے پانی کا قطرہ نہ تھا جو ٹپکایا گیا تھا؟ پھر وہ لہو کا لوتھڑا ہو گیا، پھر اللہ نے اسے پیدا کیا اور درست بنایا، پھر اس سے جوڑے، یعنی نر و مادہ بنائے، کیا (اللہ تعالیٰ) اس (امر) پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے؟''

﴿ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴾ یعنی جیسا اس نے پہلا اٹھان پیدا کیا ہے ویسا ہی وہ دہرانے پر قادر ہے۔ یہ پچھلا اٹھان ہے قیامت کے دن۔ ﴿ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴾ یعنی اسی نے اپنے بندوں کو مال کا مالک بنایا ہے اور اس کو ان کے لیے قنیہ، یعنی پونجی ان کے پاس قائم رہنے والا ٹھہرایا، اس کی بیع کی طرف محتاج نہیں ہوتے، چنانچہ یہ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦٣٠/٢) تفسير ابن كثير (٣٢٩/٤) [2] تفسير البغوي (٤١٧/٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٤)

[4] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ المعجم الأوسط (٢٥٠/٦) اور حلية الأولياء (٦٦/٦، ٦٧) میں حدیث کا پہلا جملہ مروی ہے۔ (السلسلة الصحيحة، رقم الحديث: ١٧٨٨)

ان پر تمام نعمت ہے۔ اسی معنی پر بہت سے مفسروں کا کلام چکر کھاتا ہے۔ ان میں سے امام ابو صالح اور ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہما ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے: ﴿ اَغْنٰى ﴾ "مَوَّلَ"، ﴿ وَاَقْنٰى ﴾ "أَخْدَمَ"، یعنی مالدار بنایا اور خادم دیے۔ اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور نیز امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَغْنٰى ﴾ "أَعْطَى"، ﴿ وَاَقْنٰى ﴾ "أَرْضَى" یعنی عطا کیا اور راضی کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَغْنٰى ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفس کو غنی کیا اور خلائق کو اپنی طرف محتاج کیا۔ (قاله الحضرمي بن لاحق)۔ کسی نے کہا ہے کہ غنی کیا جس کو اپنی خلق میں سے چاہا اور فقیر کیا جس کو چاہا ان میں سے۔ (قاله ابن زيد) ان دونوں کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے اور لفظ کے اعتبار سے دونوں بعید ہیں۔

﴿ الشِّعْرٰى ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ وہ یہ چمکنے والا تارہ ہے جس کو مرزم الجوزاء کہا جاتا ہے۔ عرب کا ایک گروہ اس کو پوجتا تھا۔[1]

﴿ عَادَا الْاُوْلٰى ﴾ ہود علیہ السلام کی قوم ہے ان کو عاد بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کہا جاتا ہے۔ كما قال تعالىٰ: ﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴾ [الفجر: ٦۔ ٨] "کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عادیوں کے ساتھ کیا کیا، ستونوں والے ارم کے ساتھ، جس کی مانند (کوئی قوم) ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی۔" چنانچہ وہ سب اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر لوگوں سے بڑھ کر سخت اور قوی اور سرکش تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہوا سے ہلاک کر ڈالا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا ﴾ [الحاقة: ٦۔ ٧] "بے حد تیز و تند ہوا جسے ان پر لگاتار سات رات اور آٹھ دن تک (اللہ نے) مسلط رکھا۔" "أَيْ: مُتَتَابِعَةً"، یعنی پے در پے۔

﴿ وَثَمُوْدَاۡ فَمَآ اَبْقٰى ﴾ یعنی ثمود کو ہلاک کر ڈالا اور نہ باقی چھوڑا ان میں سے کسی کو اور ان سے پہلے قوم نوح بے شک وہ تمرد و سرکشی میں ان سے زیادہ سخت تھی جو اُن کے بعد تھے اور الٹی بستی کو پٹکا، یعنی قوم لوط کے شہر ان پر قلب کر دیے، یعنی الٹا دیے۔ ﴿ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴾ [الحجر: ٧٤] "بالآخر ہم نے اس شہر کو اوپر تلے کر دیا اور ان لوگوں پر کنکر والے پتھر برسائے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٧٣] "اور ہم نے ان پر ایک خاص قسم کا مینہ برسایا، پس بہت ہی برا مینہ تھا جو ڈرائے گئے ہوئے لوگوں پر برسا۔"

اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴾ یعنی وہ پتھر جو ان پر بھیجے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ان بستیوں میں چار لاکھ آدمی آباد تھے۔ آبادی کی کل زمین آگ اور گندھک اور تیل بن کر ان پر بھڑک اٹھی۔ (رواه ابن أبي حاتم، عن أبيه محمد بن وهب بن عطية عن الوليد بن مسلم عن خليد عنه به وهو غريب جدا)۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴾

---

[1] تفسير الطبري (٥٤٩/٢٢۔٥٥١)

پس اے انسان! تو کون کون سی نعمتوں میں جو اللہ نے تجھ پر کی ہیں تو امتراء (جھگڑا) کرے گا۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور وہی ابن جریر رحمہ اللہ کا اختیار ہے۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحت کے ساتھ بیان یہ ہے کہ مرجع ومصیر اللہ پاک ہی کی طرف ہے نہ کہ اس کے غیر کی طرف، پھر وہ ان کو ان کے اعمال کی جزا دے گا۔ یہ سب باتیں اگلے صحیفوں میں ہیں۔ ﴿ رَبِّكَ ﴾ کا مخاطب عام ہے، یا خاص طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہنسانے رلانے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا خالق ہے اور اس کے سبب کو پورا کرنے والا ہے۔ امام حسن اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ جنت کو جنت میں ہنسایا اور اہلِ نار کو نار میں رلایا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین کو روئیدگی سے ہنسایا اور آسمان کو بارش سے رلایا۔ کسی نے کہا ہے کہ ہنسایا جس کو چاہا دنیا میں اس طرح سے کہ اس کو مسرت دی اور جس کو چاہا رلایا اس طرح سے کہ اسے غمگین کیا۔ سہل بن عبداللہ نے کہا ہے کہ مطیع لوگوں کو رحمت کے ساتھ ہنسایا اور گناہ گاروں کو ناراضی کے ساتھ رلایا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ مومنوں کو آخرت میں مواہب اور عطایا کے ساتھ ہنسایا اور ان کو دنیا میں مصیبتوں اور حادثات کے ساتھ رلایا۔ کسی نے کہا کہ خوشی اور غم کو پیدا کیا۔ یہ سب اقوال اس بنا پر ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا مفعول حذف کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ دونوں فعل من جملہ افعالِ لازمہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ [آل عمران: ١٥٦] ''اللہ تعالیٰ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔''

یہ آیتِ کریمہ اس پر دال ہے کہ انسان جو کچھ عمل کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وخلق سے ہے، یہاں تک کہ ہنسنا اور رونا بھی۔ مارنے اور جلانے کا یہ مطلب ہے کہ موت اور حیات کے اسباب پیدا کیے۔ اللہ کے سوا اور کوئی اس پر قادر نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خود موت وحیات کو پیدا کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ ﴾ [الملك: ٢] ''اس نے موت اور حیات کو پیدا کیا۔'' کسی نے کہا ہے کہ باپوں کو مارا اور بیٹوں کو زندہ کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ دنیا میں مارا اور بعث کے لیے زندہ کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان سے خواب اور بیداری مراد ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے عدل سے مارا اور اپنے فضل سے زندہ کیا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ کافر کو مارا اور مومن کو جلایا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ ﴾ [الأنعام: ١٢٢] ''ایسا شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا۔''

---

[1] تفسير الطبري (٥٥٦/٢٢) تفسير ابن كثير (٣٢٩/٤_٣٣٠) [2] تفسير القرطبي (١١٧/١٧، ١١٨) فتح القدير (١٥٣/٥، ١٥٤)

[3] تفسير القرطبي (١١٧/١٧)

﴿ الزَّوْجَيْنِ ﴾ سے مراد صنفین ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر حیوان سے نر و مادہ دو صنف پیدا کیے۔ یہ بھی ان متضاد چیزوں میں سے ہے جو نطفہ پر وارد ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض کو تو نر پیدا کر دیتا ہے اور بعض نطفے کو مادہ بنا دیتا ہے، اس کی طرف عقلاء کا فہم نہیں پہنچتا اور نہ وہ اس کو جانتے ہیں، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے۔ طبیعت کے فعل سے نہیں ہے، اس میں طبائعین کا رد ہے جو عورتوں میں برد و رطوبت کے قائل ہیں، چنانچہ بہت سی عورتیں ہیں کہ ان کا مزاج مرد سے زیادہ حار (گرم) اور یابس (خشک) ہوتا ہے۔ نطفہ آبِ قلیل کو کہتے ہیں، مراد منی ہے۔ نطفے سے پیدا کرنے میں آدم اور حوا علیہما السلام داخل نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ اس سے نہیں بنے۔

﴿ إِذَا تُمْنٰى ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت نطفہ رحم میں ڈالا جاتا ہے اور اس میں دفق کیا جاتا ہے۔ امام کلبی، ضحاک اور عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ وغیرہم نے اسی طرح کہا ہے۔ محاورے میں بولتے ہیں: "مَنَى الرَّجُلُ: يَمْنَى وَأَمْنَى أَيْ: صَبَّ الْمَنِيَّ"۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ إِذَا تُمْنٰى ﴾ "إِذَا تُقَدَّرُ"، یعنی جب مقدر کیا جاتا ہے۔ "يُقَالُ: مَنَيْتُ الشَّيْءَ إِذَا قَدَّرْتَهُ، وَمَنَى لَهُ إِذَا قَدَّرَ لَهُ"[1] یعنی جبکہ اس سے بچہ مقدر کیا جاتا ہے اور یہ کہ اسی پر ہے نشاۃ اخری، یعنی روحوں کا جسموں کی طرف اعادہ بعث کے وقت اپنے وعدے کو وفا کرنے کے لیے۔ اس لیے کہ اس نے فرمایا: ﴿ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ وَنُمِيتُ ﴾ [ق: ٤٣] "ہم ہی جلاتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں"۔ حکم عقل و شرع سے نہیں ہے۔ جمہور نے "نَشْأَةً" بہ قصر بروزن "ضَرْبَةً" پڑھا ہے اور کسی نے بہ مد بروزن کفالہ پڑھا ہے۔ یہ دونوں مصدر ہیں اور سبعیہ ہیں۔

﴿ أَغْنٰى وَأَقْنٰى ﴾ یعنی غنی کیا جس کو چاہا اور فقیر کیا جس کو چاہا، اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ﴾ [الرعد: ٢٦] "وہ جس کی روزی چاہتا ہے بڑھاتا ہے اور گھٹاتا ہے۔" اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ﴾ [البقرة: ٢٤٥] "وہ تنگی اور کشادگی کرتا ہے۔" یہ قول امام ابن زید رحمہ اللہ کا ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ أَقْنٰى ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ عطا کیا قنیہ یعنی وہ شے جو اموال سے اصل لے جاتی ہے مراد اصولِ اموال ہیں اور وہ جس کو ذخیرہ رکھتے ہیں کفایت کے بعد۔

حاصل یہ ہے کہ قنیہ وہ پونجی اور بچت ہے جو خرچ کے بعد پس انداز ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ أَقْنٰى ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ راضی کیا اس شے کے ساتھ جو عطا کی، یعنی اس کو غنی کیا، پھر اس کو اس شے سے راضی کیا جو عطا کی۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "قَنِيَ الرَّجُلُ يَقْنَى مِثْلُ غَنِيَ يَغْنَى، ثُمَّ يَتَعَدَّى بِتَغْيِيرِ الْحَرَكَةِ، فَيُقَالُ: قَنَيْتُ لَهُ مَالًا كَسَبْتُهُ، وَهُوَ نَظِيرُ شَتِرَتْ عَيْنُهُ بِالْكَسْرِ وَشَتَرَهَا اللّٰهُ بِالْفَتْحِ إِذَا دَخَلَتْ عَلَيْهِ الْهَمْزَةُ أَوِ التَّضْعِيفُ اكْتَسَبَ مَفْعُولًا ثَانِيًا، فَيُقَالُ: أَقْنَاهُ اللّٰهُ مَالًا وَقَنَّاهُ إِيَّاهُ أَيْ: أَكْسَبَهُ إِيَّاهُ وَأَقْنَاهُ أَرْضَاهُ وَالْقَنَا الرِّضَاءُ"، امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ کہتے ہیں: "مَنْ أُعْطِيَ مِائَةً مِنَ الْبَقَرِ فَقَدْ أُعْطِيَ

[1] تفسير القرطبي (١١٨/١٧) [2] اللباب في علوم الكتاب (١٢٤/١٨، ١٢٥) فتح القدير (١٥٤/٥)

الْقِنَى وَمَنْ أُعْطِيَ مِائَةً مِنَ الضَّأْنِ فَقَدْ أُعْطِيَ الْغِنَى وَمَنْ أُعْطِيَ مِائَةً مِنَ الْإِبِلِ فَقَدْ أُعْطِيَ الْمُنَى" امام اخفش اور ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَقْنٰی ﴾ "أَفْقَرَ"۔ یہ قول پہلے قول کی تائید کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَقْنٰی ﴾ "زَادَ فَوْقَ الْغِنَى"۔ ﴿ اَغْنٰی وَاَقْنٰی ﴾ کا مفعول اس لیے حذف کیا گیا کہ مراد ان دونوں فعلوں کی اس کی طرف نسبت ہے اور اسی طرح باقی افعال کا حال ہے۔

﴿ الشِّعْرٰی ﴾ ایک تارہ ہے جو سخت گرمی میں خلف جوزاء طلوع ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ شعریٰ ہے جس کو عبور کہتے ہیں، یہ اس شعریٰ سے بڑھ کر روشن ہے جس کو غمیصاء کہتے ہیں۔ اللہ پاک نے جو یہ ذکر کیا کہ وہ شعریٰ کا رب ہے، حالانکہ وہ کل اشیاء کا رب ہے۔ تو یہ صرف اس پر رد کرنے کے لیے کہا جو اس کو پوجتا تھا۔ پہلے پہل جس نے اس کو پوجا اور اس کے پوجنے کا طریقہ نکالا وہ ابو کبشہ ہے۔ یہ شخص اشرافِ قریش میں سے تھا۔ اس کو اس لیے پوجا کہ دوسرے تارے تو آسمان کو عرض میں قطع کرتے ہیں اور شعریٰ اس کو طول میں قطع کرتا ہے۔ چنانچہ یہ ان کا مخالف ہے، اس لیے اس نے اس کو پوجا اور خزاعہ و حمیر نے پوجا۔ قریش رسول اللہ ﷺ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے، تاکہ آپ کو اس سے تشبیہ دیں، اس لیے کہ آپ ﷺ نے ان کے دین کی مخالفت کی جیسے ابو کبشہ نے ان کی مخالفت کی تھی۔ یہ شخص آپ ﷺ کی والدہ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کے اجداد میں سے تھا، اسی وجہ سے ابوسفیان کا قول ہے، جب کہ وہ ہرقل پر داخل ہوا تو کہا: "لَقَدْ أَمِرَ أَمْرُ ابْنِ أَبِي كَبْشَةَ" یعنی واقعی ابو کبشہ کے فرزند کا کام غالب ہو گیا کہ اس سے روم کا بادشاہ ڈرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے: "هُوَ الْكَوْكَبُ الَّذِي يُدْعَى الشِّعْرَى"۔[1] دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت خزاعہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، وہ شعریٰ کو پوجا کرتے تھے، یہ وہ تارا ہے جو جوزاء کے تابع ہوتا ہے۔[2] انتہیٰ۔ اس کو کلب الجبار بھی کہتے ہیں۔

﴿ عَادَ ﴾ کو موصوف بہ "أُولَى" اس لیے کیا کہ وہ ثمود سے پہلے تھے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: ان کو عادِ اولیٰ اس لیے کہا کہ وہ پہلی امت ہے جو نوح علیہ السلام کے بعد ہلاک کیے گئے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: یہ دو عاد ہیں، پہلے عاد تو صرصر سے ہلاک کیے گئے اور دوسرے صیحہ سے۔ کسی نے کہا کہ عادِ اولیٰ ہود علیہ السلام کی قوم ہے، ریح صرصر سے ہلاک کی گئی اور "عاد أخرى" ارم بن عوص بن سام بن نوح ہیں۔ (جمہور نے ﴿ عَادًا الْاُوْلٰی ﴾ بہ تنوین و ہمزہ پڑھا ہے اور امام نافع، ابن کثیر اور ابن محیصن رحمہم اللہ نے اس طرح پڑھا ہے کہ ہمزہ کی حرکت منتقل کر کے لام کو دی اور تنوین کا اس میں ادغام کیا)۔[3] بالجملہ اور ہلاک کیا ثمود کو جس طرح کہ عاد کو ہلاک کیا، پھر فریقین میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ ثمود صالح علیہ السلام کی قوم ہیں جو صیحہ سے ہلاک کیے گئے۔

عاد و ثمود پر کئی جگہ کلام گزر چکا ہے اور عاد و ثمود کو ہلاک کرنے سے پہلے قومِ نوح کو ڈبو کر ہلاک کیا۔ بے شک

[1] تفسير الطبري (٥٥١/٢٢) [2] الدر المنثور (٦٦٥/٧) [3] فتح القدير (١١٥/٥)

وہ عاد وثمود سے بڑے ظالم تھے اور سارے کافروں سے زیادہ سرکش یا زیادہ ظالم اور زیادہ طاغی تھے۔ یا مشرکینِ عرب سے زیادہ ظالم اور زیادہ سرکش تھے، وہ ایسے صرف اسی لیے ہوئے کہ معاصی کر کے اللہ تعالیٰ پر سرکشی کی، باوجود اس کے کہ ایک طویل مدت تک نوح علیہ السلام ان کو دعوت الی اللہ دیتے رہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ فَلَبِثَ فِيهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ﴾ [العنكبوت: ١٤] ''وہ ان میں ساڑھے نو سو سال تک رہے۔'' کسی نے کہا کہ وہ ان کو مارتے تھے، یہاں تک کہ ان میں حرکت نہیں رہتی تھی اور ان پر غشی کی جاتی۔ پھر جب وہ ہوش میں آتے تو کہتے: ''رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ'' اور قوم ان سے نفرت کرتی تھی، یہاں تک کہ اپنے بچوں کو بچاتے کہ کہیں ان سے کچھ سن نہ لیں۔ ''اِئْتِفَاكٌ'' بہ معنی انقلاب ہے۔ ''مؤتفكة''قومِ لوط علیہ السلام کے شہر ہیں، ان کا نام مؤتفکہ اس لیے رکھا کہ وہ اُن پر الٹ گئے اور اُن کی اوپر کی جانب ان کی نیچے کی جانب ہوگئی۔ ''تَقُوْلُ أَفَكْتُهُ إِذَا قَلَبْتَهُ'' ﴿ اَهْوٰى ﴾ کے معنی ہیں ''أَسْقَطَ''، یعنی ان کو جبریل علیہ السلام نے آسمان کی طرف اٹھانے کے بعد الٹا کر کے زمین کی طرف گرا دیا، یعنی پٹک دیا۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ''جَعَلَهَا تَهْوِيْ''۔[1]

﴿ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴾ یعنی پھر پہنایا ان کو جو پہنایا، یعنی چھایا ان پر جو چھایا مراد حجارۂ منضود مسومہ ہیں، یعنی مٹی کے پتھر جن پر ان کے نام لکھے تھے جو ان پر گرے۔ جیسا کہ اس کے قول میں ہے: ﴿ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴾ [الحجر: ٧٤] ''بالآخر ہم نے اس شہر کو اوپر تلے کر دیا اور ان لوگوں پر کنکر والے پتھر برسائے۔'' جس امر کی وجہ سے ان بستیوں کو ڈھانکا اس عبارت میں اس کی تہویل تعظیم ہے۔ یا اس کی تعظیم ہے جس نے ان کو ڈھانکا۔ کسی نے کہا ہے کہ ضمیرِ جمع امم مذکورہ کی طرف راجع ہے، یعنی پھر ان کو عذاب میں سے اس شے نے ڈھانکا جس نے ڈھانکا عذاب کی مختلف قسمیں ہونے کی بنا پر۔

﴿ رَبِّكَ ﴾ کا خطاب انسانِ مکذب کو ہے، یعنی اے مکذب انسان! پھر تو اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں میں شک کرے گا۔ وہ نعمتیں جو اس کی وحدانیت اور قدرت کو ظاہر کر رہی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، دوسروں کی تعریض کے لیے، یعنی دوسروں کو بتانے کے لیے۔ تو اس بنا پر یہ الھاب و تہییج وتعریض بالغیر کے باب سے ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ولید بن مغیرہ کو خطاب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر اس شخص کو خطاب ہے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ابن عادل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح اس کا عموم ہے اس آیت کی وجہ سے: ﴿ يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴾ [الانفطار: ٦] ''اے انسان! تجھے اپنے ربِ کریم سے کس چیز نے بہکایا؟'' اور اس آیت کی وجہ سے ہے: ﴿ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴾ [الكهف: ٥٤] ''لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔''[2] صاحب فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور اس آیت کے سبب سے: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ [الرحمن: ١٣] ''پس (اے انسانو اور جنو!) تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟'' کہا ہے کہ فعل ''تماریٰ'' کی

[1] تفسير القرطبي (١٢٠/١٧) [2] اللباب في علوم الكتاب (٢٢٣)

نسبت ایک کی طرف اس کی تعداد کے اعتبار سے اس کے متعلق کی تعداد کے مطابق ہے، یعنی وہ آلاء جن سے ''تماري'' کی گئی ہے۔

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس تکلف کی کچھ ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ تفاعل مجرد ہے تعدد سے فاعل وفعل میں، فعل میں مبالغے کے لیے۔ اب رہی یہ بات کہ ان امورِ مذکورہ کا نام ﴿ اٰلَاۗءِ ﴾ یعنی نعمتیں رکھا اس کے باوجود کہ ان میں سے بعض تو ہیں نعمتیں نہیں ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عبرتوں اور نصیحتوں پر مشتمل ہیں اور ان میں گناہ گاروں سے انتقام ہوتا ہے اور اس میں انبیاء اور صالحین کی نصرت ہے۔ جمہور نے ﴿ تَتَمَارٰی ﴾ کو بغیر ادغام پڑھا ہے اور یعقوب وغیرہ (یعنی ابن محیصن نے) ایک تاء کا دوسری تاء میں ادغام کیا ہے۔[1]

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿56﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿57﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿58﴾ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿59﴾ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿60﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿61﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿62﴾

یہ (رسول) تو پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے ﴿56﴾ قریب آنے والی (قیامت) قریب آ گئی ﴿57﴾ اس (قیامت) کو اللہ کے سوا کوئی ظاہر کرنے والا نہیں ﴿58﴾ کیا پھر اس بات (قرآن) پر تم تعجب کرتے ہو؟ ﴿59﴾ اور تم ہنستے ہو اور روتے نہیں ﴿60﴾ اور تم غفلت و اعراض کرنے والے ہو ﴿61﴾ اب تم (باز آ جاؤ اور) اللہ کو سجدہ کرو اور (اسی کی) عبادت کرو ﴿62﴾

انذار وتنبیہ اور سجدہ وخضوع کا حکم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ڈر سنانے والا ہے، یعنی محمد ﷺ پہلے ڈرانے والوں کی جنس سے بھیجا گیا ہے، جیسے وہ بھیجے گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ [الأحقاف: ۹] ''آپ کہہ دیجیے! کہ میں کوئی بالکل انوکھا پیغمبر تو نہیں ہوں۔'' قوله تعالىٰ: ﴿ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴾ یعنی قریب آ گئی قریب آنے والی۔ وہ قیامت ہے۔ ﴿ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴾ یعنی اس کو کوئی اب دور نہیں کرتا سوائے اللہ کے اور نہ اس کے علم پر کوئی اور مطلع ہے سوائے اس کے۔ ﴿ نَذِيْرٌ ﴾ اس ڈرانے والے کو کہتے ہیں کہ جس شر کو وہ دیکھ رہا ہے اور اس کے اندر ان لوگوں کے پڑ جانے سے ڈرتا ہے جن کو اس نے ڈرایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ هُوَ

[1] فتح القدير (١٥٥/٥) فتح البيان (٢٧٣/١٣)

﴿إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ﴾ [سبأ: ٤٦] ''وہ تو تمھیں ایک بڑے (سخت) عذاب کے آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے۔''

حدیث شریف میں ہے: «أَنَا النَّذِيرُ الْعُرْيَانُ»[1] یعنی میں ڈرانے والا ہوں جس کو اس شر کی شدت نے عجلت میں ڈالا ہے جس کا اس نے معائنہ کیا ہے، اس سے کہ اپنے اوپر کچھ پہن لیتا، بلکہ وہ اس سے پہلے اپنی قوم کی طرف دوڑ آیا ہے، چنانچہ ان کے پاس برہنہ آیا ہے جلدی کرتا ہوا۔ یہ معنی ﴿أَزِفَتِ الْآزِفَةُ﴾ کے لحاظ سے مناسب ہیں، یعنی قریب آ پہنچی قریب آنے والی، مراد روزِ قیامت ہے، جیسا کہ بعد کی سورت میں فرمایا: ﴿اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: تم محقراتِ ذنوب سے بچو۔ سو اس کے نہیں کہ محقراتِ ذنوب کی مثال اس قوم کی مثال کی طرح ہے جو بطنِ وادی میں اتری، پھر یہ شخص ایک لکڑی لے آیا اور یہ لکڑی لے آیا، یہاں تک کہ اپنی روٹی پکا لی اور بے شک محقراتِ ذنوب سے جب ان کا صاحب پکڑا جاتا ہے تو وہ اس کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

ابو حازم نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ ابونضرہ نے کہا: میں نہیں جانتا ہوں، مگر سہل بن سعد سے فرمایا: میری اور قیامت کی مثال ان دو انگلیوں کی مثل ہے اور آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کے درمیان تفریق کی، بیچ والی انگلی اور وہ انگلی جو انگوٹھے کے ساتھ والی ہے۔ پھر فرمایا: میری مثال اور اس ساعت کی مثال گھڑ دوڑ کے دو گھوڑوں کی مانند ہے۔ پھر فرمایا کہ میری مثال اور ساعت کی مثال ہے اس مرد کی طرح ہے کہ اس کو اس کی قوم نے جاسوس بنا کر بھیجا، جب وہ ڈرا اس بات سے کہ اس سے سبقت کیا جائے تو اس نے اپنے کپڑے سے اشارہ کر دیا: ''أُتِيتُمْ أُتِيتُمْ''، یعنی دشمن تم پر آ پہنچا ہے۔ پھر آپ ﷺ فرماتے ہیں: وہ میں ہوں۔[2] (أخرجه الإمام أحمد)

اس حدیث کے صحاح اور حسان میں سے بوجوہِ دیگر اَور شواہد بھی ہیں۔ پھر جو مشرک لوگ قرآن کو سنتے اور اس سے اعراض کرتے اور اس بارے میں لہو کرتے تو اللہ پاک ان پر انکار کر کے فرماتا ہے، کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ وہ یعنی قیامت صحیح اور درست ہو اور استہزا و تمسخر یہ (ہنسی مذاق) کر کے اس سے ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو۔ یعنی جیسا کہ اس پر ایمان لانے والے کرتے ہیں جس طرح کہ ان کی طرف سے خبر دی ہے: ﴿وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا﴾ [بني إسرائيل: ١٠٩] ''وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں اور یہ قرآن ان کی عاجزی اور خشوع اور خضوع بڑھا دیتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿وَأَنتُمْ سَامِدُونَ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ غنا، یہ یمانی لغت ہے: ''أَسْمَدَ لَنَا أَيْ: غَنِّ لَنَا''، یعنی سمود بہ معنی غنا ہے۔ اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے، اس کے سوا ان سے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٣)

[2] مسند أحمد (٣٣١/٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣١٠٢)

ایک روایت میں مروی ہے: ﴿ سٰمِدُوْنَ ﴾ یعنی "مُعْرِضُوْنَ"۔ اسی طرح امام مجاہد اور عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "غَافِلُوْنَ"۔ یہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں "یَسْتَکْبِرُوْنَ" ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1]

پھر اللہ پاک نے بندوں کو اپنے سجدے اور عبادت کا حکم فرمایا۔ عبادت اس کے رسول ﷺ کی اتباع ہے اور توحید اور اخلاص ہے۔ ﴿ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴾ یعنی پس اس کے لیے خضوع و فروتنی اور اخلاص کرو اور اس کی توحید کرو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سورۃ النجم میں سجدہ کیا اور آپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں اور مشرکوں اور جنوں اور انسانوں نے سجدہ کیا۔[2] (أخرجه البخاري و انفرد به دون مسلم) مطلب بن ابی وداعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں سورۃ النجم پڑھی تو آپ ﷺ نے سجدہ کیا اور انھوں نے سجدہ کیا جو آپ ﷺ کے پاس تھے، پس میں نے اپنا سر اٹھایا، پھر اس سے انکار کیا کہ سجدہ کروں۔ اس وقت مطلب مسلمان نہیں ہوئے تھے، پھر اس کے بعد وہ کسی کو بھی سورۃ النجم پڑھتے ہوئے سنتے تو اس کے ساتھ سجدہ کرتے۔[3] (أخرجه الإمام أحمد وقد رواه النسائي في الصلاة عن عبد الملك بن عبد الحميد عن أحمد بن حنبل به) آخر تفسير سورة النجم ولله الحمد والمنة.

فتح البیان کا بیان:

﴿ هٰذَا نَذِيْرٌ ﴾ "أَيْ: مُحَمَّدٌ ﷺ" (قاله ابن عباس رضي الله عنهما)[4] یعنی محمد ﷺ تمھاری طرف ان رسولوں میں سے ایک رسول ہیں جو اُن سے پہلے گزر چکے ہیں۔ بے شک انھوں نے تم کو ڈرایا جیسا کہ اگلے رسولوں نے اپنی قوم کو ڈرایا۔ اسی طرح امام ابن جریج رحمہ اللہ (فتح القدیر میں ابن جریج رحمہ اللہ ہے اور فتح البیان میں ابن جریر رحمہ اللہ ہے)[5] اور محمد بن کعب رحمہ اللہ وغیرہما نے بھی کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مراد قرآن شریف ہے، اس نے اس شے کے ساتھ ڈرایا جس کے ساتھ اگلی کتابوں نے ڈرایا۔ کسی نے کہا: یہ شے جس کے ساتھ اس نے ہم کو خبر دی اخبارِ امم سے اس امت کو اس چیز سے ڈرانا ہے کہ کہیں ان پر وہ نازل ہو جو ان قوموں پر نازل ہوا۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ هٰذَا ﴾ کا اشارہ اس شے کی طرف ہے جو موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں ہے۔[6] پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ ﴿ نَذِيْرٌ ﴾ کی تنوین اگلی ساری تقدیروں میں تفخیم کے لیے ہے۔ کلمۂ ﴿ الْاُوْلٰى ﴾ جماعت کی تاویل کی بنا پر ہے مراعاتِ فواصل کے لیے۔

﴿ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴾ یعنی قیامت قریب ہوگئی اور پاس آ لگی۔ اس کا نام "آزفة" اس کے قربِ قیام کے

---

[1] تفسير الطبري (٥٥٩/٢٢) تفسير ابن كثير (٣٣٠/٤، ٣٣١)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٢١)
[3] مسند أحمد (٣٩٩/٦) سنن النسائي (٩٥٨) تفسير ابن كثير (٣٣٠/٤، ٣٣١)
[4] فتح القدير (١٥٧/٥)
[5] فتح القدير (١٥٥/٥) فتح البيان (٢٧٨/١٣)
[6] تفسير القرطبي (١٢١/١٧) فتح القدير (١٥٥/٧، ١٥٦)

سبب سے رکھا۔ کسی نے کہا کہ لوگوں سے اس کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ نام رکھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول میں ہے: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ ﴾ [القمر: ۱] ''قیامت قریب آ گئی۔'' ان کو اس کی خبر دی، تا کہ اس کے لیے مستعد اور تیار ہو جائیں۔ صحاح میں ہے: ﴿ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴾ یعنی ''اَلْقِيَامَةُ'' و''أَزِفَ الرَّجُلُ عَجِلَ''۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ اَلْاٰزِفَةُ ﴾ قیامت کے ناموں میں سے ہے۔[2] اس میں الف اور لام عہدی ہے جنسی نہیں ہے، تا کہ کلام فائدے سے خالی نہ رہے، اس لیے کہ اس کے کچھ معنی نہیں ہیں کہ قریب موصوف بقرب ہو، جیسا کہ کہا گیا اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ ''آزفة'' قیامت کا علم بالغلبہ ہے۔ اس میں نظر ہے اس لیے کہ قریب کو موصوف بقرب کرنا مبالغہ ظاہر کرتا ہے۔'' اس کے قرب میں جس طرح کہ ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ ﴾ میں باب افتعال اس پر دال ہے۔ فتأمل.

﴿ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴾ یعنی اس کے وقوع کے وقت اس کے لیے کوئی نفس یا کوئی حال اللہ کے سوا اس کے کشف پر قادر نہیں ہے۔ یہ معنی تو اس بنا پر تھے کہ ﴿ كَاشِفَةٌ ﴾ اپنی اصل پر رہا۔ کسی نے کہا کہ ﴿ كَاشِفَةٌ ﴾ بہ معنی انکشاف ہے اس میں حرفِ ''ہاء'' ایسا ہے جیسا کہ ''عَاقِبَةٌ وَوَاهِيَةٌ'' میں ہے۔ کسی نے کہا ﴿ كَاشِفَةٌ ﴾ بہ معنی ''کاشف'' ہے اور حرفِ ہاء مبالغے کے لیے ہے مثل ''رَاوِيَةٌ وَعَلَّامَةٌ وَنَسَّابَةٌ'' کے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے، یعنی ﴿ كَاشِفَةٌ ﴾ موصوف مقدر کی صفت ہے، جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ اپنی سختیوں اور ہولناکیوں سے مخلوق کو ڈھانک لے گی تو اللہ کے سوا اس کے کشف پر کوئی قادر نہ ہو گا۔ امام عطاء، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے اسی طرح کہا ہے۔[3] کسی نے کہا: نہیں ہے اس کے لیے کوئی بیان کرنے والا کہ کب واقع ہو گی مگر اللہ تعالیٰ۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ﴾ [الأعراف: ۱۸۷] ''اس کے وقت پر اس کو اللہ کے سوا کوئی اور ظاہر نہ کرے گا۔''

پھر چونکہ قرآن شریف قیامت کے آنے پر مشتمل ہے اور کفار اس سے تعجب کرتے تھے اور اس سے ہنستے تھے اس لیے اللہ پاک نے ان کو توبیخ کی۔ چنانچہ فرمایا: کیا تم اس حدیث سے تعجب کرتے ہو، مراد قرآن پاک ہے، یعنی تم کیونکر اس سے تعجب کرتے ہو اسے جھٹلا کر اور اس سے ہنستے ہو مذاق کر کے حالاں کہ وہ اس کو جھٹلانے کا استہزاء کرنے کا مقام نہیں ہے اور ڈر کر اور خوف کھا کر روتے نہیں ہو، اس وعیدِ شدید سے ڈر کر جو اس میں ہے۔ صالح ابو الخلیل کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہنسے اس کے بعد سوائے اس کے کہ مسکراتے تھے۔ (أخرجه ابن أبي شيبة وغيره يعني الإمام أحمد في الزهد وهناد وعبد بن حميد وابن المنذر وابن أبي حاتم. كذا في الفتح) ایک روایت میں (یعنی عبد بن حمید کے الفاظ میں كما في الفتح) یوں ہے: پھر نہ دیکھے گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہ کبھی ہنستے ہوں اور تبسم کرتے ہوں، یہاں تک کہ دنیا سے تشریف لے گئے۔[4]

---

[1] الصحاح للجوهري (۱٦/٥) [2] تفسير الطبري (۲۲/۵۵۷، ۵۵۸)

[3] فتح القدير (۱٥٦/٥) [4] الدر المنثور (٦٦٦/٧) فتح القدير (۱٥٧/٥)

جملۂ ﴿ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال "یَبْکُوْنَ" کے فاعل سے، یعنی منتفی ہوا (نہ ہو سکا) تم سے رونا اس حال میں کہ تم اس شے سے غفلت اور بے پروائی میں ہو جو تم سے مطلوب ہے۔ یا جملہ مستانفہ ہے ماقبل کی تقریر کے لیے۔ سمود کسی شے سے غفلت وسہو ہے اور اعراض اور لہو۔ کسی نے کہا ہے کہ تکبر ہے۔ صحاح میں کہا ہے: "سَمَدَ سُمُوْدًا رَفَعَ رَأْسَهُ تَكَبُّرًا فَهُوَ سَامِدٌ"۔ (1) امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سمود لہو ہے اور سامد لاہی ہے۔ "يُقَالُ لِلْقَيْنَةِ أَسْمِدِيْنَا أَيْ: أَلْهِيْنَا بِالْغِنَا" (یعنی گانے والی سے کہا جاتا ہے کہ ہم کو گانے میں مشغول کر)۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سٰمِدُوْنَ ﴾ "خَامِدُوْنَ"۔ (2) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "غِضَابٌ مُبَرْطِمُوْنَ"۔ (3) برطمہ بہ معنی اعراض ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "أَشِرُوْنَ بَطِرُوْنَ"، یعنی تکبر کرنے والے اترانے والے۔ کسی نے کہا ہے کہ "سَاهُوْنَ لَاهُوْنَ غَافِلُوْنَ لَاعِبُوْنَ"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ کچھ یہ ہیں فی الجملہ تفاوت ہے۔ ایک یہ ہے کہ "لاهي" ہیں، اس سے منہ پھیرنے والے ہیں۔ دوسرا یہ ہے: "سمود" لغتِ یمانیہ میں غنا ہے اور جب قرآن سنتے تو گاتے اور لعب کرتے۔ تیسرا یہ ہے کہ "كَانُوْا يَمُرُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ شَامِخِيْنَ أَلَمْ تَرَ إِلَى الْبَعِيْرِ كَيْفَ يَخْطِرُ شَامِخًا"، یعنی وہ نبی کریم ﷺ کے پاس سے سر اٹھائے ہوئے ناک چڑھائے ہوئے گزرتے تھے کیا تو نے اونٹ کی طرف نہیں دیکھا، وہ کیسا اکڑ کر سر اٹھائے ہوئے ناک چڑھائے ہوئے چلتا ہے۔ (4) اس قول کا حاصل استکبار (تکبر کرنا) ہے۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سمود غنا ہے حمیر کے لغت میں۔ وہ کہتے ہیں: "يَا جَارِيَةُ! اِسْمِدِيْ لَنَا أَيْ: غَنِّيْ"، (5) یعنی اے لونڈی! تو ہمارے لیے گا۔

ابو خالد والبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہم پر نکلے اور نماز قائم کی گئی تھی اور ہم کھڑے ہوئے ان کا انتظار کر رہے تھے، تا کہ وہ آگے بڑھیں۔ چنانچہ فرمایا: کیا ہے تم کو کہ سامد ہو نہ تو تم نماز میں ہو اور نہ تم جلوس میں ہو کہ انتظار کر رہے ہو۔ (6) (أخرجه عبد الرزاق وغيره) مشرکین قرآن شریف سے استہزاء وہنسی اور مذاق کرتے اور اس کے مواعظ اور زواجر سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے، چنانچہ جب اللہ پاک ان امور پر ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر چکا تو اپنے مومن بندوں کو سجود اور عبادت کا حکم کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴾ یعنی جب بات یوں ہے کہ مشرکین بتوں کو سجدہ کرتے ہیں اور ان کو پوجتے ہیں اور قرآن سے ہنستے ہیں تو اے مومنو! تم اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کو پوجو، بے شک وہ اس کا مستحق ہے۔ ﴿ وَاعْبُدُوْا ﴾ کا ﴿ فَاسْجُدُوْا ﴾ پر عطف، عطفِ عام علی الخاص کے باب سے ہے، یعنی تم بتوں کو سجدہ نہ کرو، نہ ان کو پوجو۔ یہ بات لامِ اختصاص و سیاق سے ماخوذ ہے۔

---

(1) الصحاح للجوهري (٥١/٣) (2) فتح القدير (١٥٦/٥) (3) تفسير الطبري (٥٥٩/٢٢)
(4) تفسير الطبري (٥٥٩/٢٢) (5) البحر المحيط (١٥٤/٨) (6) تفسير الطبري (٥٦٠/٢٢) الدر المنثور (٦٦٨/٧)

سورت کے شروع میں گزر چکا ہے کہ اس آیت کی تلاوت کے وقت نبی اکرم ﷺ نے سجدہ کیا اور کفار نے آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کیا۔[1] تو اس سجدے سے مراد سجدۂ تلاوت ہو گا۔ کسی نے کہا ہے کہ سجود فرض ہے۔[2] واللّٰہ سبحانہ أعلم. (كذا في فتح البيان)

عشیہ روزِ عرفہ کو اس کا لکھنا شروع ہوا تھا کہ ایک جز لکھا۔ ۱۷/ ذی الحجہ کو دوسرا جز شروع ہوا، پھر ایسی وحشت ہوئی اور ضعف و گرمی بھی پیش آئی کہ ایک حرف نہیں لکھا، پھر شبِ جمعہ ۱۴/ صفر ۱۳۱۵ ہجری سے لکھنا شروع کیا۔

الحمد للّٰه والمنة کہ شبِ جمعہ وقت عشاء ۲۸/ صفر ۱۳۱۵ ہجری کو تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے۔ لا حول ولا قوة إلا باللّٰه۔ ربنا آتنا في الدنيا حسنة، وفي الآخرة حسنة، وقنا عذاب النار. آمين آمين آمين

وصلى اللّٰه على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه وأتباعه وأشياعه وبارك وسلم، عدد ما علم، وزنة ما علم، وملأ ما علم. آمين

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[2] فتح البيان (۱۳/ ۲۷۸۔۲۸۰)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْقَمَرِ

اس کو سورت ﴿ اِقْتَرَبَتِ ﴾ بھی کہتے ہیں۔ اس سورت مبارکہ کی پچپن (۵۵) آیات ہیں۔ جمہور کے قول کے مطابق یہ ساری سورت مکی ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: مگر تین آیتیں ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴾ [القمر: ٤٤] سے لے کر ﴿ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴾ [القمر: ٤٦] تک۔ قرطبی نے کہا: یہ صحیح نہیں ہے۔[1] کسی نے کہا کہ مگر ﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مکہ میں نازل ہوئی۔[2] (أخرجه ابن الضريس وغيره يعني ابن مردويه والنحاس والبيهقي في الدلائل) سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔ (أخرجه ابن مردويه)

فضیلت:

1 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ "اقتربت" تورات میں مبیضہ پکاری جاتی ہے (یعنی تورات میں اس کا نام مبیضہ رکھا جاتا تھا، یہ اپنے صاحب کے چہرے کو سفید کرے گی جس دن کہ چہرے سفید ہوں گے۔ (أخرجه البيهقي في الشعب) امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ منکر ہے۔[3]

2 اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ رحمہ اللہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس نے ہر رات ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ ﴾ پڑھی تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن اس حال میں اٹھائے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوگا۔[4] (أخرجه ابن الضريس)

3 وأخرج نحوه عن ليث بن معن عن شيخ من همدان رفعه.[5]

4 ابو واقد رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت قٓ اور ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ ﴾ عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر میں پڑھتے تھے۔[6] (كذا في فتح البيان) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو سورتوں کو بڑی بڑی محفلوں میں پڑھا کرتے تھے، اس لیے کہ وہ ذکر ووعد ووعید و بدء واعادۂ خلق پر مشتمل ہیں اور ان میں توحید و اثباتِ نبوات وغیرہ مقاصدِ عظیمہ کا بیان ہے۔[7]

---

[1] تفسير القرطبي (١٢٥/١٧) [2] الدر المنثور (٦٦٩/٧)

[3] شعب الإيمان (٤٩٠/٣) اس کی سند میں "سلیمان بن مرقاع اور محمد بن عبدالرحمان جدعانی" ضعیف راوی ہیں۔ (ضعيف الجامع، ٤٠٣٦)

[4] الدر المنثور (٦٦٩/٧) یہ روایت مرسل ہے نیز "اسحاق بن عبداللہ" سخت ضعیف راوی ہے۔

[5] الدر المنثور (٦٦٩/٧) [6] صحيح مسلم (٨٩١) فتح البيان (٢٨١/١٣) [7] تفسير ابن كثير (٤٧٠/٧ـط: دار طيبة)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ۝۱ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝۲ وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝۴ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

قیامت بہت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا① اور اگر وہ (مشرک) کوئی معجزہ دیکھیں تو منہ موڑتے اور کہتے ہیں کہ (یہ) ہمیشہ سے چلا آتا ہوا جادو ہے② اور انھوں نے (اسے) جھٹلایا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی، اور ہر کام کا وقت مقرر ہے③ اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس وہ خبریں آچکی ہیں، جن میں تنبیہ ونصیحت ہے④ کمال کو پہنچی ہوئی حکمت، پھر (بھی) تنبیہات فائدہ نہیں دیتیں⑤

قیامت کا قریب آنا اور چاند کا پھٹنا:

حج کے دنوں میں کافر جمع تھے آدھی رات کے وقت نبی کریم ﷺ ان کو سمجھاتے تھے۔ انھوں نے کچھ نشانی مانگی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا آسمان کی طرف دیکھو چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا مشرق کی طرف آیا اور ایک مغرب کی طرف۔ جب سب لوگوں نے خوب اچھی طرح دیکھ لیا پھر آپس میں مل گیا۔ یہ قیامت کی نشانی تھی کہ آگے سب کچھ اسی طرح سے پھٹے گا۔ ہر کام ٹھہرے ہوئے وقت پر مقرر ہے، یعنی ان کا عذاب بھی ایک وقتِ مقرر پر آئے گا۔ انتھٰی.

اللہ تعالیٰ قیامت کے قریب ہونے کی اور دنیا کے فارغ اور ختم ہونے کی خبر دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ [النحل: ١] ''اللہ تعالیٰ کا حکم آ پہنچا، اب اس کی جلدی نہ مچاؤ۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ١] ''لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا، پھر بھی وہ بے خبری میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔'' اس بارے میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں:

1 حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے اصحاب کو خطبہ سنایا اور سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا تھا اور اس سے باقی نہیں رہی تھی مگر شف یسیر (شف بالشین المعجمة بہ معنی بقیة النهار) یعنی دن سے تھوڑی سے شے۔ چنانچہ فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، دنیا میں سے نہیں باقی رہی اس شے میں سے جو گزر چکی ہے مگر مثل اس شے کے جو تمھارے اس دن سے باقی رہ گئی ہے، اس شے کی

نسبت جو گزر چکی ہے اور ہمیں سورج ذرا سا نظر آ رہا تھا۔[1] (أخرجه أبو بكر البزار) (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "هذا حديث مداره على خلف بن موسى بن خلف العمي عن أبيه وقد ذكره ابن حبان في الثقات و ربما أخطأ")۔[2]

2 حدیثِ دیگر ما قبل کی مؤید و مفسر: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سورج عصر کے بعد قیقعان پر تھا۔ چنانچہ فرمایا: نہیں ہیں تمھاری عمریں ان کی عمروں سے جو گزر گئی مگر مثل اس شے کے جو دن میں سے باقی رہی ہے اس شے کے مقابلے میں جو گزر گئی اس دن میں سے۔[3] (أخرجه الإمام أحمد)

3 سہل بن سعد رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: بھیجا گیا میں اور قیامت اس طرح اور اپنی دو انگلیوں، یعنی کلمے کی انگلی اور درمیان والی انگلی سے اشارہ کیا۔[4] (أخرجه الإمام أحمد و أخرجاه من حديث أبي حازم سلمة بن دينار)

4 وہب سوائی رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں بھیجا گیا میں اور قیامت مثل اس کے اس سے بے شک وہ قریب تھی کہ مجھ سے پہلے ہو جائے۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے سبابہ اور وسطیٰ کو جمع کیا۔[5] (أخرجه الإمام أحمد)

5 اسماعیل بن عبیداللہ کہتے ہیں کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے ولید بن عبدالملک پر قدوم کیا (ان کے پاس آئے) تو اس نے ان سے پوچھا تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا شے سنی جس سے آپ قیامت کا ذکر کرتے تھے تو کہا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے: "أَنْتُمْ وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ"[6] یعنی تم اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہو۔ (أخرجه الإمام أحمد و تفرد به)

6 اس کا شاہد صحیح میں بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ حاشر ہیں کہ لوگ آپ کے دونوں قدموں پر حشر کیے جائیں گے۔[7]

7 خالد بن عمیر نے کہا ہے کہ عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے کہا (قال بهز يعني بهز بن أسد وقال قبل هذه المرة خطبنا رسول الله ﷺ)۔ پس حمد و ثنا کی اللہ تعالیٰ کی۔ پھر کہا: اما بعد! پس بے شک دنیا نے اعلام کر دیا (خبر دے دی) منقطع ہونے کا اور جلد منقطع ہوتے ہوئے پیٹھ پھیری اور باقی نہیں رہا اس سے مگر صبابہ (جو شے جو برتن کی تہہ میں باقی رہ جاتی ہے) مثل صبابہ ظرف کے کہ اس کو اس کا صاحب بہ تکلف ڈالتا ہے اور بے شک تم اس سے منتقل ہونے والے ہو ایک ایسے گھر کی طرف جس کو کسی طرح کا زوال نہیں ہے، چنانچہ تم

---

[1] مسند البزار (٤٦٢/١٣) [2] تفسير ابن كثير (٣٣١/٤)

[3] مسند أحمد (١١٥/٢) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو "حسن" کہا ہے۔ دیکھیں: (فتح الباري: ٣٥٠/١١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٩٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٠) مسند أحمد (٣٣٨/٥)

[5] مسند أحمد (٣٠٩/٤) [6] مسند أحمد (٢٢٣/٣) [7] صحيح البخاري (٣٣٣٩) صحيح مسلم (٢٣٥٤)

وہاں منتقل ہو، بہتر اس شے کے ساتھ جو تم کو حاضر کرے۔ پس بے شک حالت یہ ہے کہ مقرر ہم سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جہنم کے کنارے سے اس میں ایک پتھر ڈالا جائے گا جو ستر برس تک اس میں گرتا جائے گا اور تہ تک نہ پہنچے گا۔ واللہ! البتہ تم اس کو بھرو گے۔ کیا پھر تم نے تعجب کیا؟ واللہ! البتہ ہم سے مقرر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جنت کے دو کواڑوں کے درمیان چالیس برس کی راہ ہے اور اس پر ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ کظیظ الزحام ہو گا، یعنی وہ ازدحام سے پر ہوگا اور تمام حدیث کو ذکر کیا۔[1] (أخرجه الإمام أحمد و انفرد به مسلم)

8 ابو عبد الرحمان سلمی کہتے ہیں کہ ہم مدائن میں اترے تو ہم اس سے ایک فرسخ کے فاصلے پر تھے۔ چنانچہ جمعہ آیا تو میرے والد حاضر ہوئے اور میں بھی ان کے ساتھ حاضر ہوا، چنانچہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ہم کو خطبہ سنایا اور کہا: خبردار! بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ خبردار اور قیامت واقعی قریب ہوگئی، خبردار اور بے شک دنیا نے واقعی فراق یعنی بچھڑنے کا اعلام کر دیا۔ خبردار! اور بے شک آج کے دن مضمار ہے، یعنی گھڑ دوڑ کا میدان اور کل کو گھڑ دوڑ ہے تو میں نے اپنے والد سے کہا کہ کیا کل لوگ گھڑ دوڑ کریں گے؟ تو انھوں نے کہا: بے شک تو البتہ نادان ہے، وہ تو اعمال کے ساتھ گھڑ دوڑ ہے۔ پھر دوسرا جمعہ آیا تو ہم حاضر ہوئے۔ پھر حذیفہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا اور کہا: خبردار! بے شک اللہ عزوجل فرماتا ہے: ''قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا، بلاشبہ دنیا جدائی کا الارم بجا چکی ہے۔ آج کا دن کوشش اور تیاری ہے، کل تو دوڑ بھاگ کر کے آگے بڑھ جانے کا دن ہوگا۔ غایت و انتہا آگ ہے اور سابق وہ ہے جو جنت میں پہلے پہنچ گیا۔''[2]

قولہ: ﴿ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ یعنی اور چاند پھٹ گیا، بے شک یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہو چکا۔ چنانچہ اس بارے میں احادیث وارد ہوئی ہیں جو بہ اسانیدِ صحیحہ متواترہ ہیں۔

صحیح میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ پانچ باتیں واقع ہو چکیں: روم و دخان ولزام و بطشہ و قمر۔[3] علماء کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ چاند کا پھٹنا بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں واقع ہو چکا ہے اور وہ معجزات میں سے ایک واضح اور کھلا معجزہ تھا۔

ذکر احادیثِ واردہ۔ روایتِ انس رضی اللہ عنہ۔ امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ بہ سندِ خود یہ ہیں: عن معمر عن قتادة، عن أنس رضی اللہ عنہ کہ اہلِ مکہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نشانی کا سوال کیا تو مکہ میں دو بار چاند پھٹ گیا۔ پھر کہا: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾[4] (ورواه مسلم عن محمد بن رافع عن عبد الرزاق) بخاری کے الفاظ بہ سندِ خود یہ ہیں: عن سعید بن عروبہ عن قتادہ عن انس رضی اللہ عنہ کہ اہلِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ ان کو کوئی آیت

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٦٧) مسند أحمد (١٧٤/٤)
[2] تفسير الطبري (٥٦٨،٥٦٧/٢٢)
[3] صحيح البخاري (٤٤٨٩) صحيح مسلم (٢٧٩٨)
[4] صحيح مسلم (٢٨٠٢) مسند أحمد (١٦٥/٣)

دکھائیں تو آپ ﷺ نے ان کو چاند دو ٹکڑے ہوا دکھایا، یہاں تک کہ ان کے درمیان حراء کو دیکھا۔[1] (وأخرجاه أيضا بسنديهما عن شيبان عن قتادة)

روایتِ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ: امام احمد رحمہ اللہ کے بہ سندِ خود الفاظ یہ ہیں: ”عن حصين بن عبد الرحمن عن محمد بن جبير بن مطعم عن أبيه“ کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چاند پھٹ گیا اور دو ٹکڑے ہو گیا، ایک ٹکڑا اس پہاڑ پر اور ایک ٹکڑا اس پہاڑ پر۔ پس کہا کہ ہم پر محمد ﷺ نے جادو کیا۔ پھر کہا کہ اگر اس نے ہم پر جادو کیا ہے تو بے شک وہ یہ طاقت نہیں رکھتا کہ سارے لوگوں پر جادو کرے۔[2] (تفرد به أحمد من هذا الوجه وأسنده البيهقي في الدلائل من طريق محمد بن كثير عن أخيه سليمان بن كثير عن حصين بن عبد الرحمن وهكذا رواه ابن جرير من حديث محمد بن فضيل وغيره عن حصين به و رواه البيهقي أيضا من طريق إبراهيم بن طهمان وهشيم كلاهما عن حصين عن جبير بن محمد بن جبير بن معطم رضی اللہ عنہ عن أبيه عن جده فذكره)

روایتِ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما: بخاری کے الفاظ بہ سندِ خود یہ ہیں: عن جعفر عن عراك بن مالك عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں قمر شق ہوا۔[3] (ورواه البخاري أيضا ومسلم من حديث بكر بن مضر عن جعفر بن ربيعة عن عراك به مثله) امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ عن علی بن ابی طلحہ عنہ یہ ہیں کہ واقعی یہ واقعہ گزر چکا، یعنی شق القمر ہجرت سے پہلے تھا۔ چاند پھٹا یہاں تک کہ انھوں نے اس کے دو ٹکڑے دیکھے۔[4] (وروى العوفي عنه نحو هذا) طبرانی کے الفاظ عن عکرمہ عنہ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چاند کو گہن ہوا تو انھوں نے کہا کہ چاند پر جادو کیا گیا۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾[5]

روایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما: بیہقی کے الفاظ عن مجاہد عنہ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں چاند واقعی شق ہوا دو فلقے یعنی دو ٹکڑے، ایک فلقہ تو پہاڑ کے اس طرف سے اور ایک ٹکڑا پہاڑ کے پیچھے سے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! تو گواہ ہو۔[6] (وهكذا رواه مسلم والترمذي من طرق عن شعبة عن الأعمش عن مجاهد به قال مسلم كرواية مجاهد عن أبي معمر عن ابن مسعود وقال الترمذي: حسن صحيح)

روایتِ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ بہ سندِ خود عن مجاهد عن أبي معمر عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں چاند شق ہوا شقتین، یعنی دو ٹکڑے، یہاں تک کہ انھوں نے اس کی طرف نظر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ گواہ رہو۔[7] (وهكذا رواه البخاري ومسلم من حديث سفيان بن عيينة به وأخرجاه من حديث الأعمش عن إبراهيم عن أبي معمر عبد الله بن سخبرة عنه به)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٥٥) صحيح مسلم (٢٨٠٢) [2] مسند أحمد (٨١/٤) دلائل النبوة (٦٨/٢)
[3] صحيح البخاري (٣٤٣٩) صحيح مسلم (٢٨٠٣) [4] تفسير الطبري (٥٦٨/٢٢، ٥٦٩) [5] المعجم الكبير (٢٥٠/١١)
[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٨٨) دلائل النبوة (٢٦٧/٢)
[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٠) مسند أحمد (٣٧٧/١)

امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ عن ابراہیم عن رجل عنہ یہ ہیں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں تھے، چنانچہ چاند پھٹا تو ایک ٹکڑے نے پہاڑ کے پیچھے راہ لی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گواہ رہو، گواہ رہو۔[1] بخاری رحمہ اللہ نے کہا: "وقال أبو الضحى عن مسروق عنه بمكة"۔[2] ابو داود طیالسی رحمہ اللہ کے الفاظ عن ابی الضحیٰ عن مسروق عنہ یہ ہیں کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں چاند شق ہوا تو قریش بولے: یہ جادو ہے ابن ابی کبشہ کا (مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس کی وجہ تسمیہ پہلے بیان ہو چکی ہے)۔ پھر انھوں نے کہا ہے کہ تم دیکھو کہ مسافر لوگ تمھارے پاس اس کی کیا خبر لاتے ہیں۔ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ طاقت نہیں رکھتا کہ سارے لوگوں پر جادو کرے۔ کہا پھر مسافر آئے تو انھوں نے اس کے متعلق بتایا۔[3]

بیہقی کے الفاظ عن ابی الضحیٰ عن مسروق عنہ یہ ہیں کہ مکہ میں چاند شق ہوا، یہاں تک کہ فرقتین ہو گیا، یعنی دو ٹکڑے تو اہلِ مکہ کفارِ قریش بولے، یہ ایک جادو ہے جس کے ساتھ ابن ابی کبشہ نے تم پر جادو کیا ہے، تم مسافروں کو دیکھو، اگر انھوں نے بھی ایسے ہی دیکھا جو تم نے دیکھا تو واقعی وہ سچا ہے اور اگر انھوں نے اس طرح نہ دیکھا جو تم نے دیکھا تو وہ جادو ہے کہ اس کے ساتھ تم پر جادو کیا ہے۔ کہا: پھر مسافروں سے پوچھا گیا جو ہر طرف سے آئے تھے تو انھوں نے کہا کہ ہم نے بھی ایسے ہی دیکھا ہے۔ (و رواه ابن جرير من حديث المغيرة به) اور یہ زیادہ کیا۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ کو نازل کیا۔[4]

امام ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں خبر دیا گیا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ البتہ واقعی چاند شق ہوا۔ (أخرجه ابن جرير عن محمد هو ابن سيرين) امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ عن الاسود عن عبداللہ رضی اللہ عنہ یہ ہیں کہ البتہ میں نے واقعی چاند کے شگاف سے پہاڑ کو دیکھا جبکہ چاند شق ہوا۔[5] امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ عن الاسود عنہ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند شق ہوا، یہاں تک کہ میں نے پہاڑ کو چاند کے دو ٹکڑوں کے درمیان سے دیکھا۔[6] لیث نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند شق ہوا تو وہ فرقتین ہو گیا، یعنی دو ٹکڑے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابو بکر! گواہ رہو تو مشرک بولے کہ چاند پر جادو کیا، یہاں تک کہ پھٹ گیا۔[7]

مشرکین کی ہٹ دھرمی:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ کوئی دلیل و حجت و برہان دیکھیں تو اس کے لیے منقاد نہ ہوں، یعنی اس کو تسلیم نہ کریں، بلکہ اس سے اعراض کریں اور اس کو اپنی پس پشت چھوڑ

---

① تفسير الطبري (٢٢/٥٦٧) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
② صحيح البخاري (٣٦٥٦) ③ مسند الطيالسي (١/٣٨) ④ دلائل النبوة (٢٦٦، ٢٦٧) تفسير الطبري (٢٢/٢٦٧)
⑤ تفسير الطبري (٢٢/٥٦٧) ⑥ مسند أحمد (١/٤١٣) ⑦ تفسير الطبري (٢٢/٥٦٩) یہ روایت مرسل ہے۔

دیں اور کہیں کہ یہ چیز جو ہم نے حجتوں میں سے مشاہدہ کی ایک جادو ہے کہ اس کے ساتھ ہم پر جادو کیا ہے۔ ﴿ مُسْتَمِرٌّ ﴾ کے معنی ہیں: "ذاھب"۔ یہ قول امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہما کا ہے[1] یعنی یہ ایک باطل اور مضمحل ہونے والا جادو ہے جس کو کچھ دوام نہیں ہے اور حق کی تکذیب کی، جبکہ وہ ان کے پاس آیا اور اپنی جہالت اور کم عقلی کی پیروی کی جس کا ان کو ان کے خیالوں اور خواہشوں نے حکم کیا۔ ﴿ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی خیر اہلِ خیر پر واقع ہونے والی ہے اور شر اہلِ شر پر واقع ہونے والا ہے۔[2] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مُسْتَقِرٌّ ﴾ ہے اپنے اہل کے ساتھ۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ہر امر قیامت کے دن مستقر ہے۔ امام سدی نے کہا ہے کہ ﴿ مُسْتَقِرٌّ ﴾ بہ معنی "واقع" ہے۔[3]

﴿ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ﴾ یعنی اگلی اُمتوں کے قصوں کی خبریں جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی اور جو سزا اور عقوبت اور عذاب ان پر نازل ہوا، یہ سب قرآن میں ان پر پڑھا جاتا ہے۔ ان میں سے ان کے پاس وہ شے آچکی جس میں ان کے لیے شرک سے اور تکذیب پر اصرار کرنے سے وعظ و نصیحت ہے۔

﴿ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ ﴾ یعنی اللہ پاک نے جو بھی ہدایت کی اور جس کو کی اور جس کو گمراہ کیا تو اس ہدایت و گمراہ کرنے میں اس کی ایک حکمتِ بالغہ ہے۔ ﴿ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ﴾ یعنی ڈرانے والے ایسے لوگوں سے کیا کفایت کریں جن پر اللہ تعالیٰ نے بدبختی لکھ دی اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی، تو کون ہے جو ایسے لوگوں کو اللہ کے گمراہ کرنے کے بعد ہدایت کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [الأنعام: ١٤٩] "آپ کہیے کہ بس پوری حجت اللہ ہی کی رہی، پھر اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہِ راست پر لے آتا ہے۔" اور اسی طرح یہ آیت ہے: ﴿ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [یونس: ١٠١] "اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کو نشانیاں اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں۔"[4] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے: ﴿ اِقْتَرَبَتِ ﴾ بہ معنی قربت ہے، یعنی افتعال جو زوائد پر مشتمل ہے فعل مجرد کے معنی میں ہے۔ مزید کا صیغہ مبالغے کے لیے فرمایا، اس لیے کہ لفظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دال ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت انتہائی قریب آ پہنچی۔ نبوتِ محمدیہ ﷺ کے قیام کے بعد دنیا کا جو زمانہ باقی رہا، وہ گزرے ہوئے زمانے کی نسبت بہت تھوڑا ہے تو بے شک اس اعتبار سے قیامت قریب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہو، چونکہ وہ یعنی قیامت ضرور بر ضرور واقع ہونے والی تھی تو قریب ہوئی۔ ہر آنے والی شے قریب ہوتی ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٥٧٠/٢٢) [2] تفسير الطبري (٥٧٢/٢٢)
[3] تفسير ابن كثير (٣٣٤/٤) [4] تفسير ابن كثير (٣٣٥_٣٣١/٤)

﴿ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ "أَيْ: وَقَدِ انْشَقَّ الْقَمَرُ وَانْفَلَقَ" یعنی واقعی چاند شق ہو چکا۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسی طرح "قد" کے اضافے کے ساتھ پڑھا ہے۔[1] مراد وہ انشقاق ہے جو ایامِ نبوت میں واقع ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک معجزے کے طور پر۔ سلف و خلف میں سے جمہور اسی طرف گئے ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا اور مفسروں کی جماعت اسی قول پر ہے۔ مگر وہ جو عثمان بن عطاء نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ معنی "سَيَنْشَقُّ الْقَمَرُ" ہیں، یعنی چاند آیندہ زمانے میں شق ہو گا، سارے علماء اس کے خلاف ہیں۔ کہا کہ ساعت کے اقتراب کو جو انشقاقِ قمر کے ساتھ ذکر کیا وہ صرف اس لیے کہ چاند کا شق ہونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی علاماتِ نبوت سے ہے اور آپ کی نبوت اور آپ کا زمانہ قیامت کے قریب ہونے کے اشراط میں سے ہے۔

امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے: "أَيْ: اِنْشَقَّ الْقَمَرُ وَاقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ"۔[2]
امام قرطبی رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے قولِ عطاء کی طرح بیان کیا ہے کہ یہ وہ انشقاق ہے جو قیامت کے دن ہونے والا ہے۔[3] یہ قول باطل ہے صحیح نہیں ہے اور شاذ ہے اور اس کے خلاف مفسروں کے اجماع کی وجہ سے ثابت نہیں ہے اور اس لیے کہ اللہ پاک نے ماضی کے لفظ سے اس کا ذکر کیا ہے اور ماضی کو مستقبل پر محمول کرنا بعید ہے۔ ایسا کرنا کسی قرینے کا محتاج ہے جو اس کو نقل کرے، یا اس پر کوئی دلیل دال ہو، حالانکہ یہ کہاں ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد "سَيَنْشَقُّ" ہے، یعنی آیندہ شق ہو گا، حالانکہ یہ قول بعید ہے، اس کے کچھ معنی نہیں ہیں، کیوں کہ جس نے اس کو منع کیا ہے وہ فلسفی ہے، "خَذَلَهُ اللّٰهُ" اس کو ماضی و مستقبل میں منع کرتا ہے اور جو اس کو جائز رکھتا ہے وہ تاویل کا محتاج نہیں ہے۔ پھر منع کرنے والے پر رد کیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن شریف سب سے بڑی دلیل ہے اور سب سے قوی بات اس کا اور اس کے امکان کا مثبت ہونا ہے، اس میں شک نہیں کیا جاتا ہے، حالانکہ صادق اس کی خبر دے چکا ہے تو اب اس کے واقع ہونے کا اعتقاد کرنا واجب ہے۔ حدیث "امتناع خرق والالتئام حديث اللئام" ہے خرق و تخریب کا جواز آسمانوں پر ثابت ہو چکا ہے اور ہم اس کو بارہا ذکر کر آئے ہیں۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ کے معنی ہیں: "وَضَحَ الْأَمْرُ وَظَهَرَ" یعنی امرِ نبوت واضح اور ظاہر ہو گیا۔ جو شے واضح ہوتی ہے عرب لوگ اس میں قمر کی مثل بیان کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ انشقاقِ قمر تاریکی کا پھٹ جانا ہے اور اثنائے تاریکی میں اس کا طلوع ہونا ہے، جیسے: صبح کا نام فلق رکھا جاتا ہے، کیوں کہ اس سے تاریکی پھٹ جاتی ہے۔ پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا قول نقل کیا جو پہلے گزر چکا ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک قوم نے زعم کیا ہے جو میانہ روی سے اور اہلِ علم کے خیال سے ہٹ کر ہے، اس کی تاویل یہ ہے کہ قمر قیامت کے دن شق ہو گا، حالانکہ الفاظ سے اور اہلِ علم کے اجماع سے بات بالکل ظاہر

[1] الدر المنثور (٧/٦٧٢) [2] فتح القدير (٥/١٥٩) [3] تفسير القرطبي (١٧/١٢٦) [4] تفسير الرازي (٢٩/٢٦)

ہے، اس لیے کہ ﴿ وَاِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا وَيَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ﴾ اس پر دال ہے کہ یہ دنیا میں تھا نہ کہ قیامت میں۔[1] انتہیٰ. جس شخص نے جمہور کی مخالفت کی اور یہ کہا کہ انشقاق آئندہ قیامت کے دن ہوگا تو وہ کوئی بات قابلِ حجت نہیں لایا صرف استبعاد۔ چنانچہ کہا کہ قمر اگر زمانۂ نبوت میں شق ہوتا تو کوئی باقی نہ رہتا مگر اسے دیکھتا کیوں کہ وہ ایک معجزہ تھا اور لوگ آیات اور معجزات میں برابر ہیں۔

اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ اس کو ہر کوئی دیکھے نہ تو عقلاً نہ شرعاً نہ عادتاً اور یہ انشقاق رات کے وقت ہوا اور بہت سے لوگ سوئے ہوئے غافل پڑے تھے اور دروازے بند اپنے کپڑوں میں لپٹے لپٹائے ہوئے تھے، سو کم ہی لوگ ہوتے ہیں کہ آسمان میں غور وفکر کریں، یا اس کی طرف نظر کریں جو امرِ مشاہد ومعتاد ہے (روز مرہ نظر آنے والا اور واقع ہونے والا)۔

اس میں سے یہ ہے کہ چاند گہن اور اس کے علاوہ اور عجائب اور انوارِ طوالع اور بڑے بڑے شہاب اور اس طرح کی اور چیزیں جو رات کے وقت آسمان میں واقع ہوتی ہیں، حالانکہ ان کو کوئی ایک آدھ آدمی ہی بیان کرتا ہے اور دوسروں کو اس کا کچھ علم نہیں ہوتا، کیوں کہ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے لوگ اس سے غافل ہوتے ہیں اور یہ انشقاق ایک بڑی نشانی تھی جو رات کے وقت اس قوم کے لیے ظاہر ہوئی جنھوں نے اس کا سوال کیا اور اس کے دیکھنے کی فرمایش کی۔ ان کے علاوہ لوگ اس کو دیکھنے کے لیے تیار اور مستعد نہیں تھے۔

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ کبھی چاند اس وقت ایسے منازل اور راستے میں ہوتا ہے کہ بعض اہلِ آفاق کے لیے تو ظاہر ہوتا ہے اور بعض کے لیے نہیں ہوتا اور ایک قوم سے غائب ہوتا ہے اور جس طرح کہ ایک شہر والے گہن کو پاتے ہیں اور دوسرے نہیں پاتے۔ اور باوجود ان وجوہ کے شق القمر تواتر کے ساتھ ہماری طرف نقل کیا گیا ہے اور یہی صرف استبعاد کو دور کرتا ہے اور اس کے قائل کے منہ پر اس کو دے مارتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس وقت ہم نے کتاب اللہ کی طرف نظر کی تو واقعی اس نے ہم کو خبر دی کہ چاند شق ہو چکا اور ہم کو یہ خبر نہیں دی کہ آیندہ شق ہوگا اور اگر ہم سنتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف نظر کریں تو واقعی صحیح وغیرہ میں متواتر طرق سے ثابت ہو چکا ہے کہ بے شک ایامِ نبوت میں یہ ہو چکا ہے اور اگر اہلِ علم کے اقوال کی طرف نظر کریں تو واقعی انھوں نے اس پر اتفاق کیا ہے اور جو کوئی اس بارے میں شاذ اور منفرد ہوا اور جس نے استبعاد کیا تو اس کے شذوذ اور استبعاد کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ پھر شق القمر کے دلائل جو احادیث وآثار میں آئے ہیں ان کا ذکر کیا ہے، یہ سب پہلے مذکور ہو چکے ہیں۔ پھر فرمایا ہے: مواہب میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انشقاق صرف ایک بار ہی واقع ہوا ہے اور دوبار انشقاق کی روایت اپنے ظاہر سے ہٹی ہوئی اور پھری ہوئی ہے اور انشقاق تقریباً پانچ سال قبلِ ہجرت ہوا۔

[1] معانی القرآن (۸۱/۵)

تفہیماتِ الٰہیہ میں شیخ شیوخنا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۔قدس سرہ۔ نے فرمایا ہے: لیکن شق القمر ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں ہے، وہ تو صرف آیاتِ قیامت سے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس کے واقع ہونے سے پہلے اس کی خبر دی، چنانچہ اس لحاظ سے یہ معجزہ ہوا۔ انتہیٰ. شیخنا وسیدنا صاحبِ فتح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس پر بعض ان لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ جن کا قول نہ تو فربہ کرتا ہے اور نہ بھوک دور کرتا ہے۔ علمائے ہند وغیرہم میں سے ایک جماعت نے اس اعتراض کو دور کیا ہے۔ اس عبارت میں اس معجزے کا انکار نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے اس کو سمجھا ہے جو رتبۂ کمال تک پہنچنے سے قاصر ہیں، بلکہ یہ عبارت تو اس کے اثبات پر پہلی دلیل ہے اس شخص کے نزدیک جو علمائے باللہ تعالیٰ کے کلام کو سمجھتا ہے، لہٰذا غور کرو۔ شیخ رفیع الدین دہلوی رحمہ اللہ کے اس بارے میں مختلف رسالے ہیں، اسی طرح اور لوگوں کے بھی ہیں۔

بالجملہ اللہ پاک فرماتا ہے: ﴿ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴾ یعنی اور اگر کفارِ قریش کوئی نشانی دیکھیں جو رسول کے صدق اور راستی پر دلالت کرے، مراد شق القمر ہے تو اس میں تامل کرنے سے اعراض کریں اور اس پر ایمان لانے سے منہ موڑیں اور کہیں کہ یہ ایک جادو ہے دائم ومطرد وقوی۔ ہر شے جس کا حال دائم ہو اس کے حق میں مستمر کہا جاتا ہے۔ کفار نے جب دیکھا کہ معجزات اور آیات پے در پے آ رہے ہیں تو ان کی تصدیق سے اعراض کیا اور کہا کہ یہ ایک سحرِ مستمر ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب چاند شق ہوا تو مشرکوں نے کہا کہ محمد ﷺ نے ہم پر جادو کیا۔[1]

چنانچہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً ﴾ یعنی اگر چاند کا پھٹنا دیکھیں تو اس کی تصدیق سے اعراض کریں اور اس پر ایمان لانے سے منہ موڑیں اور کہیں کہ یہ ایک قوی اور شدید جادو ہے جو ہر جادو پر عالی اور غالب ہوتا ہے۔ یہ عرب کے قول سے ماخوذ ہے کہ جب شے قوی اور مستحکم ہوتی ہے تو کہتے ہیں: "اِسْتَمَرَّ الشَّيْءُ"۔ یہ بات کہ مستمر کے معنی قوی اور شدید ہیں، اس کی ایک جماعت اہلِ علم میں سے قائل ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے ﴿ مُّسْتَمِرٌّ ﴾ ماخوذ ہے امرارِ حبل سے، یعنی اسی کو خوب مضبوط بٹنا۔ امام ابو العالیہ اور ضحاک رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں اور امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔

امام فراء، کسائی اور ابو عبیدہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴾ "أَيْ: ذَاهِبٌ مَارٌّ سَوْفَ يَذْهَبُ وَلَا يَبْقَى"۔ یعنی ایک جادو ہے جانے والا گزرنے والا عن قریب جاتا رہے گا باقی نہ رہے گا۔ اس قولِ عرب سے ماخوذ ہے: "مَرَّ الشَّيْءُ اِسْتَمَرَّ أَيْ: ذَهَبَ وَبَطَلَ"۔ امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہما اسی کے قائل ہیں اور امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے[2] (اول کو نحاس نے اختیار کیا تھا اور اس کو بھی۔ معلوم ہوتا ہے دونوں قول ان کے نزدیک مختار

[1] فتح القدير (١٥٩/٥) [2] تفسير القرطبي (١٢٧/١٧) فتح القدير (١٥٩/٥)

ہیں، واللہ أعلم)۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا بعض مشابہ ہے بعض کے۔ کسی نے کہا ہے کہ مقرر مرور کیا زمین سے آسمان کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ مرارت بہ معنی تلخی سے ماخوذ ہے، جب شے کڑوی ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں: ”مَرَّ الشَّيْءُ“ یعنی یہ ایک جادو ہے مستبشع ہے (بدمزہ، گلوسوز) ہے ان کے نزدیک۔ ان کی خواہشوں پر تلخ ہے وہ قادر نہیں ہیں کہ اس کو حلق سے اتاریں جس طرح کہ کڑوی شے اتاری نہیں جاتی۔ امام زمخشری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] اس آیتِ کریمہ میں اس بات پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ انشقاقِ قمر نبیِ کریم ﷺ کے وقت میں ہو چکا تھا۔ کما قررناه سابقا.

پھر اللہ پاک نے ان کی تکذیب کا ذکر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ﴾ یعنی اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی اور اس شے کی جس کا اللہ کی قدرت میں سے معائنہ کیا اور اس شے کی پیروی کی جس کو شیطان رجیم نے ان کے لیے مزین کیا تھا، یعنی حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد اس کو مسترد کرنا۔ چونکہ یہ بات بتانا منظور ہے کہ تکذیب اور خواہشات کی پیروی کرنا ان کی پرانی عادت ہے، اس لیے دونوں کو بہ صیغۂ ماضی ذکر کیا، باوجود اس کے کہ ظاہر مضارع ہے، کیوں کہ یہ دونوں ﴿يُعْرِضُوْا﴾ پر معطوف ہیں۔

جملۂ ﴿وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ﴾ مستانفہ ہے دو امر کے لیے لایا گیا ہے (حقیقت میں ایک ہی امر ہے ذرا بیان کا فرق ہے) ایک تو اس بات کے بطلان کے لیے جو انھوں نے تکذیب کر کے اور خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے کہی تھی کہ ایک سحر ہے گزر جانے والا۔ دوسرا ان کو اس شے سے نا امید کرنا جس کے ساتھ انھوں نے اپنی خالی امیدیں متعلق کر رکھی تھیں کہ نبیِ کریم ﷺ کا کام مستقر نہ ہوگا جبکہ کہا: ﴿سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ﴾۔ یہ بات بیان کر کے آپ کا کام ثابت اور راسخ ہو گیا، مطلب یہ ہے کہ تمام امور میں سے ہر امر ایک غایت کی طرف منتہی ہونے والا ہے جس پر وہ ضرور قرار پکڑے گا۔ پس خیر تو اہلِ خیر کے ساتھ قرار پکڑے گی اور شر اہلِ شر کے ساتھ مستقر ہوگا۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: فرماتا ہے کہ ان کی تکذیب کا قرار اور قولِ مصدقین کا قرار مستقر ہوگا یہاں تک کہ اس کی حقیقت ثواب اور سزا کے ساتھ پہچان لیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر وہ شے جو مقدر کی گئی ہے تو وہ ضرور ہونے والی ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ہر امر کے لیے ایک حقیقت ہے وہ جو اس سے دنیا میں ہے تو عن قریب ظاہر ہو جائے گی اور وہ جو اس سے آخرت میں ہے تو عن قریب پہچانی جائے گی۔[2] کسی نے کہا ہے کہ یہ ان کے قول ﴿سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ﴾ کا جواب ہے، یعنی نبی اکرم ﷺ کا کام جانے والا نہیں، جیسا کہ تم نے زعم کیا ہے، بلکہ ان کا کام تو عن قریب ظاہر ہوگا ایسی غایت کی طرف جس میں یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ وہ حق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے امر میں سے ہر امر اور نبیِ کریم ﷺ کے امر سے مستقر ہے حالتِ خذلان پر یا دنیا میں نصرت پر یا شقاوت پر یا سعادت پر آخرت میں[3] (ذكره أبو السعود) ظاہر قولِ اول ہے۔

---

[1] الكشاف (٤٣٢/٤) [2] فتح القدير (١٦٠/٥) [3] تفسير أبي السعود (١٦٧/٨)

مستقر علیہ کو مبہم رکھا کمال ظہورِ حال پر تنبیہ کے لیے اور یہ مرفوع ہے، اس بنا پر کہ خبر ہے مبتداء کی، یعنی ﴿ كُلُّ أَمْرٍ ﴾ کی اور کسی نے (یعنی ابوجعفر اور زید بن علی رضی اللہ عنہ نے) بہ جر پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ أَمْرٍ ﴾ کی صفت ہے (شاید اس بنا پر خبر محذوف ہوگی، مثلاً "كل أمر مستقر واقع في وقته المقدر" والله أعلم)۔ اور شیبہ نے بہ فتحِ قاف پڑھا ہے۔ امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کسی نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے: "كل أمر ذو استقرار أو زمان استقرار ومكان استقرار" اس بنا پر کہ مصدر ہے یا ظرفِ زمان یا ظرفِ مکان۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ﴾ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے اور اس کا ماتحت محلِ نصب میں ہے بنا بر حال کلمۂ ﴿ مَا ﴾ سے اور ﴿ مُزْدَجَرٌ ﴾ بہ معنی "ازدجار" ہے، بنا بر مصدر میمی۔ جب تم کسی کو برائی سے منع کرو اور اس کو درشتی اور سختی کے ساتھ وعظ و نصیحت کرو تو کہو گے: "زَجَرْتُهُ" یعنی میں نے اس کو برائی سے منع کیا۔ یا ﴿ مُزْدَجَرٌ ﴾ اسمِ مکان ہے اس کی اصل "مُزْتَجِرٌ" ہے۔ تائے افتعال زائے و دال و ذال کے ساتھ دال سے قلب کی جاتی ہے، چنانچہ یہ بات بجائے خود ثابت ہو چکی ہے۔ یہ بات امام سیبویہ رحمہ اللہ کی آخر کتاب میں ہے۔ زید بن علی نے "مُزْجَرٌ" پڑھا ہے: "أَزْجَرَ" سے "أَيْ: صَارَ ذَا زَجْرٍ". کلمۂ ﴿ مَا ﴾ موصولہ ہے، یا موصوفہ، معنی یہ ہیں: قسم ہے اللہ کی البتہ مقرر آ چکی کفارِ مکہ کو یا علی العموم کفار کو وہ شے جس میں کفر و شرک وغیرہ سے باز رہنا ہے، یا وہ شے جس میں باز رہنے کی جگہ ہے، یعنی وہ خود باز رہنے کی جگہ ہے، درآنحالیکہ وہ شے ہونے والی ہے تکذیب کرنے والی بعض اُمتوں کی خبروں جو قرآن شریف میں ہمارے لیے بیان کی گئی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف میں اگلی اُمتوں کی بعض خبریں موجود ہیں اور ان کی تکذیب کرنے اور ہلاک ہونے کا قصہ مذکور ہے، وہ صاف بتا رہا ہے کہ کفر و شرک اور تکذیب کا انجام ہلاکت ہے اور ان امور سے زجر کر رہا ہے اور منع کر رہا ہے سو وہ بے شک آ چکا اب باز رہنا چاہیے، اس کے بعد پھر کس شے کا انتظار ہے۔ ﴿ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی: "أَيْ: هُوَ" یا کلمۂ ﴿ مَا ﴾ سے بدل ہے۔ بدل کل من کل یا بدلِ اشتمال ہے، یا بدل ہے ﴿ مُزْدَجَرٌ ﴾ سے۔ کسی نے ﴿ حِكْمَةٌ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے اس بنا پر کہ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ سے حال ہے: "أَيْ: حَالَ كَوْنِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ" یعنی قرآن شریف جو اُن کے پاس آ چکا، وہ ایک مکمل حکمت ہے اپنی غایت کو پہنچ چکی ہے، اس میں کسی طرح کا نقصان و خلل نہیں ہے۔ یا ایک ایسی حکمت ہے کہ نہایت ثواب کو پہنچنے والی ہے۔

﴿ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ﴾ (یہاں حرفِ یاء بعد نون کے لکھا نہیں جاتا رسمِ مصحف کے اتباع کے لیے)۔ حرفِ فاء

---

[1] فتح القدير (١٦٠/٥)

عدمِ اغناء کی ترتیب کے لیے ہے حکمتِ بالغہ کے آنے پر اور کلمہ ﴿ مَا ﴾ استفہامیہ ہے۔ ”أَيْ: أَيُّ شَيْءٍ أَوْ أَيُّ إِغْنَاءٍ تُغْنِي النُّذُرَ وَتَحْصُلُهُ وَتَكْسِبُهُ“ یا نافیہ ہے: ”أَيْ: لَمْ تُغْنِ النُّذُرُ شَيْئًا وَلَمْ تَنْفَعْ فِيهِمْ“ ﴿ النُّذُرُ ﴾ جمع ہے ”نَذِيْرٌ“ کی بہ معنی ”مُنْذِرٌ“ کے، یا بہ معنی ”إِنْذَار“۔ بنا بر مصدر ”مُنْذِرٌ“ سے مراد وہ امور ہیں جو کفار کو ڈرانے والے ہیں، جیسی اگلی اُمتوں کا احوال اور جو عذاب ان کو پہنچا جس کی خبر قریش کو پہنچ چکی تھی اور اس کے متعلق سن چکے تھے۔ معنی یہ ہیں: پھر کیا نفع حاصل کرتے ہیں ڈرانے والے امور، یا پھر ڈرانے والوں نے کچھ نہ کیا۔ حاصل دونوں کا ایک ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف جو پوری حکمتِ بالغہ ہے اور اگلی اُمتوں کا احوال اور ان پر عذاب کا آنا اس میں صاف طور پر مذکور ہے اور یہ امور کفر و تکذیب سے ڈرانے والے ہیں۔ اس کے آنے کے بعد کیا بات مترتب ہوئی، چنانچہ اس کا ثمرہ جو مرتب ہوا یہ ہے کہ ڈرانے والوں نے کچھ کام نہ کیا، ان میں کچھ اثر نہ کیا وہ جیسے پہلے تھے ویسے ہی رہے بلکہ اور بھی حد سے بڑھ گئے۔ اسی لیے اللہ پاک نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے اعراض کریں۔ چنانچہ فرمایا:[1]

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نُّكُرٍ ﴿٦﴾ خُشَّعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ ﴿٧﴾ مُّهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ ۖ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ﴿٨﴾

لہٰذا (اے نبی!) ان سے منہ موڑ لیجیے، (یاد کریں) جس دن بلانے والا نہایت ناگوار چیز کی طرف بلائے گا ⑥ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، وہ قبروں سے یوں نکلیں گے، جیسے وہ منتشر ٹڈی دل ہوں ⑦ درآں حالیکہ وہ بلانے والے کی طرف دوڑ رہے ہوں گے۔ کافر کہیں گے: یہ دن نہایت سخت ہے ⑧

روزِ قیامت کی ہولناکیاں:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ جس وقت کوئی نشانی دیکھیں تو اعراض کریں اور کہیں کہ یہ ایک سحرِ مستمر ہے، چنانچہ تو اے محمد! ان سے اعراض کر اور ان کا منتظر رہ جس دن پکارنے والا ایک شے کی طرف پکارے گا جو منکر فظیع ہو گی، یعنی ایسی شے جس کو پہچانتے نہ ہوں گے اور وہ نہایت سخت ہو گی، یہ حساب کے لیے کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور اس میں بلا و زلازل اور ہولناکیاں ہوں گی۔ ایسے حال میں آئیں گے کہ ان کی نگاہیں پست ہوں گی، وہ اپنے پکارنے والے کی آواز کو مانتے ہوئے اپنی قبروں سے نکلیں گے، گویا وہ منتشر ہو کر اور جلدی موقفِ حساب کی طرف چلنے میں جلدی جلدی اس طرح ہوں گے جیسے آسمان کے چاروں طرف ٹڈیاں بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اس لیے فرمایا:

---

[1] فتح البیان (۱۳/۲۸۳۔۲۸۹)

﴿ مُهْطِعِيْنَ ﴾ یعنی پکارنے والے کی طرف جلدی کرنے والے ہوں گے، نہ تو مخالفت کریں گے اور نہ پیچھے رہیں گے۔ کافر کہیں گے کہ یہ ایک سخت ہولناک دن ہے جو عبوس قمطریر، یعنی سخت ہول والا اور ترش رو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴾ [المدثر: ۹۔ ۱۰] ''تو وہ دن بڑا سخت ہوگا (جو) کافروں پر آسان نہ ہوگا۔''[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ تو ان سے اعراض کر اس لیے کہ ڈرانے نے ان میں کچھ اثر نہ کیا، یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ اکثر مفسرین اس کے قائل ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا اس کے منسوخ ہونے کا قائل ہونا کچھ چیز نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ تو ان سے کلام کے ساتھ مناظرہ مت کر۔[2] (ذكره الخطيب) ﴿ يَوْمَ ﴾ کا نصب ''اُذْكُرْ'' مقدر سے ہے۔ رمانی اور زمخشری رحمہما اللہ اسی طرف گئے ہیں، اس میں اور وجوہ بھی ہیں (یا ﴿ يَخْرُجُوْنَ ﴾ سے یا ﴿ فَمَا تُغْنِ ﴾ سے اور جملۂ ﴿ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ﴾ معترضہ یا ﴿ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ سے یا ﴿ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ ﴾ سے۔[3] كذا في الفتح) یہ وجہ سب سے زیادہ قریب ہے۔

﴿ يَدْعُ ﴾ سے واؤ گر گیا اتباعِ لفظ کے لیے اور رسم (تحریر) میں اسی طرح واقع ہوا ہے۔ ﴿ الدَّاعِ ﴾ سے یاء حذف کی گئی تخفیف میں مبالغے کے لیے اور کسرے کے ساتھ اکتفا کرنے کے لیے۔ داعی اسرافیل علیہ السلام ہیں، یا جبریل علیہ السلام۔ زیادہ مناسب ہے کہ داعی پہلے ہیں۔ ﴿ شَيْءٍ نُّكُرٍ ﴾ سے مراد امرِ فظیع ہے، یعنی ان کو ایک ایسے سخت امر کی طرف پکارے گا کہ اس کو عظیم اور بہت بڑا شمار کر کے اس کو عجیب جانیں گے، اس لیے کہ پہلے ان کو کبھی ایسے امر کا علم نہیں ہوا تھا۔ مراد قیامت کا دن یا حساب کا دن ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ جمہور نے ﴿ نُكُرٍ ﴾ بہ ضمِ نون وکاف پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے) بہ سکونِ کاف پڑھا ہے تخفیف کے لیے اور کسی نے (یعنی امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے) بہ کسرِ کاف وفتحِ راء بہ صیغۂ ماضی مجہول پڑھا ہے۔ ﴿ خُشَّعًا ﴾ کو جمہور نے ''خاشع'' کی جمع پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام حمزہ، کسائی اور ابو عمرو رحمہم اللہ نے) ''خَاشِعًا'' بہ افراد پڑھا ہے۔ اس باب سے یہ شعر ہے:

وَشَبَابٌ حَسَنٌ أَوْجُهُهُمْ مِنْ إِيَادِ بْنِ نَزَارِ بْنِ مُعِدّ

اور کسی نے (یعنی سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے) ''خَاشِعَةً'' پڑھا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ جب صفت جماعت پر مقدم ہوتی ہے تو اس میں تذکیر وتانیث وجمع جائز ہے (اس باب سے امرئ القیس کا قول ہے: ؎

وُقُوْفًا بِهَا صَحْبِيْ عَلَيَّ مَطِيَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ لَا تَهْلِكْ أَسًى وَتَجَلَّدْ)[4]

---

[1] تفسير ابن كثير (۳۳۵/٤) [2] تفسير الرازي (۳۰/۲۹) [3] فتح القدير (١٦٠/٥، ١٦١)

[4] تفسير القرطبي (۱۲۹/۱۷) فتح القدير (١٦١/٥)

مراد جمع تکسیر ہے نہ کہ جمع سالم، کیوں کہ وہ جمع بین الفاعلین سے ہوتی ہے۔ ﴿ خُشَّعًا ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے ﴿ يَخْرُجُوْنَ ﴾ کے فاعل سے۔خشوع نگاہ میں خضوع، عاجزی اور ذلت ہے۔خشوع کی نسبت ابصار کی طرف اس لیے کی کہ عزت اور ذلت ابصار میں ظاہر ہوتی ہے اور باقی بدن کی نسبت ان پر اس کا ظہور زیادہ ہوتا ہے۔ ''أجداث'' جمع ''جدث'' بہ معنی قبر ہے، یعنی سب کے سب لوگ وہ مومن ہوں یا کافر اپنی قبروں سے اس حال میں نکلیں گے کہ ان کی نگاہیں پست ہوں گی۔ اپنی کثرت اور پھیلاؤ اور آپس میں خلط ملط ہونے کی وجہ سے ایسے ہوں گے جیسے کہ آسمان میں اور مکانوں میں ٹڈیاں پھیلی ہوتی ہیں، ایک دوسرے سے خلط ملط۔ خوف اور حیرت کی وجہ سے انھیں پتا نہیں ہوگا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

''اھطاع'' چلنے میں تیزی کرنے کو کہتے ہیں، یعنی اپنی قبروں میں سے اس حال میں نکلیں گے کہ پکارنے والے کی طرف جلدی جلدی چلنے والے ہوں گے۔ پکارنے والے سے مراد اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مُقْبِلِيْنَ''۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''عَامِدِيْنَ''۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''فَاتِحِيْنَ أَذَانَهُمْ إِلَى الصَّوْتِ''، یعنی آواز کی طرف متوجہ ہونے والے، یا قصد کرنے والے۔ یا اپنے کانوں کو کھولنے والے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنی گردنوں کو اس کی طرف دراز کرنے والے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''نَاظِرِيْنَ إِلَيْهِ بِأَبْصَارِهِمْ لَا يَقْلَعُوْنَ''،[2] یعنی اس کی طرف اپنی آنکھوں سے نظر کرنے والے باز نہیں رہتے، یعنی ٹکٹکی لگائے اسے دیکھے جاتے ہیں۔

جملہ ﴿ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ مُهْطِعِيْنَ ﴾ کی ضمیر سے اور عائد مقدر ہے۔ یا مستانفہ ہے جواب ہے سوالِ مقدر کا۔ گویا کسی نے کہا ہے کہ پھر اس وقت کیا ہوگا تو یہ اس کا جواب ہے کہ کافر کہیں گے کہ یہ ایک سخت اور دشوار دن ہے کافروں پر، جیسا کہ سورۃ المدثر میں ہے: ﴿ فَذٰلِكَ يَوْمَىِٕذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴾ [المدثر: ۹۔ ۱۰] ''بڑا سخت دن (جو) کافروں پر آسان نہ ہوگا۔'' اس قول کی نسبت جو کفار کی طرف کی تو اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دن مومنوں پر سخت نہیں ہے۔ غرضیکہ اللہ پاک نے جو خبروں کو پہلے مجمل ذکر کیا تھا، اب ان کی کچھ تفصیل بیان کی۔[3] چنانچہ فرمایا:

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ
وَّازْدُجِرَ ۝۹ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝۱۰ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ
السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝۱۱ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ
عَلٰٓي اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝۱۲ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰي ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝۱۳ تَجْرِيْ

---

[1] تفسير القرطبي (۱۳۰/۱۷) فتح القدير (۱۶۱/۵) [2] تفسير الطبري (۵۷۵/۲۲) [3] فتح البيان (۲۸۹/۱۳۔۲۹۱)

بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾ وَ لَقَدْ تَّرَكْنٰهَاۤ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۱۶﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾

ان سے پہلے قومِ نوح نے جھٹلایا تھا، چناں چہ انھوں نے ہمارے بندے کی تکذیب کی اور کہا: (یہ تو) دیوانہ ہے، اور (اس کو) جھڑک دیا گیا⑨ تب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بے شک میں بے بس ہوں، اب تو ہی انتقام لے⑩ چناں چہ ہم نے زور سے برسنے والے پانی کے ساتھ آسمان کے دروازے کھول دیے⑪ اور ہم نے زمین سے چشمے جاری کر دیے، تو (آسمان اور زمین کا) پانی ایک امر پر مل گیا، جو بلاشبہہ مقدر ہو چکا تھا⑫ اور ہم نے اس (نوح) کو تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر سوار کیا⑬ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی، (ہم نے یہ کیا) اس شخص کا انتقام لینے کی خاطر جس کا انکار کیا گیا تھا⑭ اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے اس (کشتی) کو ایک نشانی (بنا) چھوڑا، پھر کیا کوئی نصیحت پکڑنے والا ہے؟⑮ پھر (دیکھو) میرا عذاب اور میرا ڈراوا کیسا تھا؟⑯ اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے، پھر کیا کوئی نصیحت پکڑنے والا ہے⑰

قومِ نوح کے قصے سے حصولِ عبرت:

جس کا کفر کیا گیا، یعنی نوح علیہ السلام۔ اس واقعہ کو نشانی بنا کر باقی رکھا، یعنی دنیا میں نوح علیہ السلام کے وقت سے وہ کشتی باقی رہی جو جودی پہاڑ پر نظر آتی تھی، بہت زمانوں تک اس امت کے لوگوں نے بھی وہ دیکھی۔ انتہیٰ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد! تیری قوم سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے تکذیب کی اور انھوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا، یعنی اس کے لیے تکذیب کی تصریح کی اور اسے جنون کی تہمت لگائی اور کہا: ﴿ مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ﴾ أي: "اُسْتُطِيرَ جُنُوْنًا" (قاله مجاهد)۔ کسی نے کہا ہے کہ "اِنْتَهَرُوْهُ وَزَجَرُوْهُ"، یعنی ان کو زجر کیا اور جھڑکا اور ان کو یہ وعید سنائی: ﴿ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۱۱۶] "اے نوح! اگر تو باز نہ آیا تو یقیناً تجھے سنگسار کر دیا جائے گا۔"[1] (قاله ابن زيد) یہ قول متجہ وحسن ہے۔

﴿ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ یعنی پھر اپنے رب کو پکارا کہ میں ان لوگوں سے کمزور ہوں اور ان کا

[1] تفسير الطبري (۵۷۷،۵۷۲/۲۲)

مقابلہ نہیں کر سکتا، اس لیے تو ہی اپنے دین کا بدلہ لے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پھر ہم نے آسمان کے دھانے کھول دیے ﴿ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴾ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہت زیادہ پانی کے ساتھ۔ ﴿ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ زمین کے سب اطراف سے چشمے بہہ نکلے، یہاں تک کہ تنور جو آگ کی جگہیں ہیں وہ بھی چشمے ہو کر ابل اٹھے۔ ﴿ فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلَىٰٓ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴾ یعنی پھر آسمان وزمین سے پانی مل گیا ایک امر پر جو مقدر ہو چکا تھا۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ پھر ہم نے آسمان کے دروازے بہت سے پانی سے کھول دیے۔ اس دن سے پہلے اور اس کے بعد پانی نہیں برسا مگر بادل سے اور اس دن بغیر بادل کے آسمان کے دھانے پانی سے کھول دیے گئے۔ سو دونوں پانی ایک امر پر مل گئے جو مقدر ہو چکا تھا۔[1] ابن الکواء نے علی رضی اللہ عنہ سے ”مجرہ“ کے متعلق پوچھا تو فرمایا: ”هِيَ شَرَجُ السَّمَاءِ“ (”شرج“ بہ فتحتین راہِ کہکشان ”وهو المجرة“) اور اسی سے مائے منہمر کے ساتھ آسمان کھولا گیا۔ (رواه ابن أبي حاتم) ﴿ دُسُرٍ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سعید بن جبیر، قرظی، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ”مَسَامِيْرُ“ ہیں، یعنی کیلیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے اس کا واحد ”دِسَارٌ“ ہے اور کہا جاتا ہے: ”دَسِيْرٌ“ جیسے: ”حَبِيْكٌ وَحِبَاكٌ“ کہا جاتا ہے اور جمع ”حُبُكٌ“ ہے۔[2]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”دسر“ کشتی کے اضلاع ہیں۔ امام عکرمہ اور حسن رحمہما اللہ نے کہا: کشتی کا سینہ ہے جس سے موج ماری جاتی ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کشتی کی دو طرفیں ہیں اور اس کی اصل۔ عوفی کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ”كَلْكَلُهَا“ ہے[3] یعنی کشتی کا سینہ۔ ﴿ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا ﴾ ”أَيْ: بِأَمْرِنَا بِمَرْأًى مِنَّا وَتَحْتَ حِفْظِنَا وَكَلَاءَتِنَا“ یعنی وہ کشتی ہمارے حکم سے ہمارے روبرو چلتی ہے اور ہماری زیرِ حفاظت ہے۔ ﴿ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴾ یعنی ان لوگوں کو جزا دینے کے لیے ان کے اللہ کے ساتھ کفر کرنے پر اور نوح علیہ السلام کا بدلہ لینے کے لیے۔

﴿ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً ﴾ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی کشتی کو باقی رکھا، یہاں تک کہ اس کو اس اُمت کے پہلے لوگوں نے پایا۔[4] ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد کشتیوں کی جنس ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿41﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴾ [يٰس: ٤١۔ ٤٢] ”اور ان کے لیے ایک نشانی (یہ بھی) ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ان کے لیے اسی جیسی اور چیزیں پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴿11﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ١١۔ ١٢] ”جب پانی میں طغیانی آگئی تو اس وقت ہم نے

[1] تفسير ابن كثير (٣٣٥/٤)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٠/١٠) تفسير الطبري (٥٧٩،٥٧٨/٢٢)
[3] تفسير الطبري (٥٨٠،٥٧٩/٢٢)
[4] تفسير الطبري (٥٨٢/٢٢)

تمھیں کشتی میں چڑھا لیا، تاکہ اسے تمھارے لیے نصیحت اور یادگار بنا دیں اور (تاکہ) یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔'' اسی لیے یہاں یوں فرمایا: ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ یعنی پھر کیا ہے وہ شخص جو نصیحت پذیر ہو۔

امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ پڑھایا۔[1] اسی طرح بخاری نے ان سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ''فَهَلْ مِنْ مُّذَّكِرٍ'' پڑھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾[2] نیز بخاری کی ان سے ایک روایت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے: ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾۔[3] بخاری رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود ابواسحاق سے روایت کیا ہے کہ ابواسحاق نے ایک شخص کو سنا کہ اس نے اسود سے پوچھا کہ ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ ہے یا ''مُذَّكِرٍ؟'' اسود نے کہا: میں نے عبداللہ کو سنا، وہ ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ پڑھتے تھے اور کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ دال کے ساتھ پڑھتے تھے۔[4] (وقد أخرج مسلم هذا الحديث وأهل السنن إلا ابن ماجه من حديث ابن إسحاق)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ ﴾ یعنی کیسا ہوا میرا عذاب اس شخص کے لیے جس نے میرے ساتھ کفر کیا اور میرے رسولوں کو جھٹلایا اور اس شے سے نصیحت پذیر نہ ہوا جس کو میرے ڈرانے والے لے کر آئے اور میں نے ان کے لیے کیسا بدلہ اور عوض لیا۔ ﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ ﴾ یعنی البتہ واقعی ہم نے قرآن کے الفاظ کو سہل کر دیا اور ہم نے اس کے معنی اس شخص کے لیے آسان کر دیے جس نے ان کا ارادہ کیا۔ یہ ہم نے اس لیے کیا تاکہ لوگ نصیحت پذیر ہوں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ [صٓ: ٢٩] ''یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف اس لیے نازل فرمایا ہے کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور وفکر کریں اور عقلمند اس سے نصیحت حاصل کریں۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴾ [مريم: ٩٧] ''ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں بہت ہی آسان کر دیا ہے کہ تو اس کے ذریعے سے پرہیزگاروں کو خوش خبری دے اور جھگڑالو لوگوں کو ڈرا دے۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ ﴾ ''أَيْ: هَوَّنَّا قِرَاءَتَهُ''[5] یعنی ہم نے قران کی قراءت آسان کر دی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''يَسَّرْنَا تِلَاوَتَهُ عَلَى الْأَلْسُنِ''یعنی ہم نے اس کی تلاوت زبانوں پر آسان کر دی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں، اگر اللہ تعالیٰ اس کو آدمیوں کی زبان پر

---

[1] مسند أحمد (١/٣٩٥) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٩٣) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٩٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٣٧) سنن النسائي الكبرىٰ (١/٤٧٦)

[5] تفسير الطبري (٢٢/٥٨٤)

آسان نہ کر دیتا تو خلق میں سے کوئی اس بات کی طاقت نہ رکھتا کہ اللہ عزوجل کے کلام کے ساتھ تکلم کرے۔[1] (وأخرج الديلمي عن أنس مرفوعا مثله كذا في فتح البيان)۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے قرآنِ مجید کی تلاوت کو آسان کر دیا ہے، جیسا کہ اس سے پہلے نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہہ یہ قرآن سات قراءتوں پر نازل کیا گیا ہے۔''[2] ہم نے اس حدیث کے تمام طرق اور الفاظ بیان کر دیے ہیں، اس لیے یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔[3]

قولہ تعالیٰ شانہ: ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ یعنی کیا ہے کوئی نصیحت پذیر ہونے والا اس قرآن سے جس کے حفظ ومعنی کو واقعی اللہ تعالیٰ نے آسان کر دیا ہے۔ امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا: کیا ہے کوئی منزجر معاصی سے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے مطر وراق کا قول ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ کیا ہے کوئی طالب علم کہ وہ اس پر اعانت کیا جائے۔[4] (وكذا علقه البخاري بصيغة الجزم عن مطر الوراق و رواه ابن جرير وروي عن قتادة مثله كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ ﴾ یعنی قریش سے پہلے قومِ نوح نے اپنے نبی کو جھٹلایا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے۔ یہ تو تکذیبِ مبہم و مجمل کا ذکر تھا، پھر اس کی تفصیل وتفسیر کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا ﴾ یعنی ہمارے بندے نوح علیہ السلام کو جھٹلایا۔ اس میں تکذیب کی مزید تقریر وتاکید ہے۔ اس بنا پر حرفِ فاء تفصیلی ہے، اس لیے کہ تفصیل اجمال کے بعد ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ تکذیب کی نوح علیہ السلام کی تکذیب بعد تکذیب کے۔ جب کبھی ان کا جھٹلانے والا قرن گزر گیا تو اس کے بعد اور جھٹلانے والا قرن آیا۔ اب حرفِ فاء تعقیب کے لیے ہوگا اور دوسرے جھٹلانے والے پہلے لوگوں کے علاوہ ٹھہریں گے، اگرچہ جس کی تکذیب کی گئی وہ ایک ہی ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ نوح علیہ السلام کی تکذیب کی اس کے بعد کہ سارے رسولوں کی تکذیب کی۔ اس بنا پر حرفِ فاء تسبب کے لیے ہوگا، یعنی ہمارے بندے نوح علیہ السلام کی تکذیب کی، ان کی رسولوں کی تکذیب کے سبب سے، کیونکہ وہ بھی ان میں سے ہے۔ قاضی نے جو ان دو وجہوں کو پسند نہ کیا، گو صاحبِ کشاف ان پر چلے ہیں، تو صرف اس لیے کہ دونوں تکذیب میں ظاہر اتحاد ہے۔

پھر اللہ پاک نے یہ بیان کیا کہ انھوں نے صرف تکذیب پر ہی اکتفا نہ کیا، بلکہ جھٹلایا اور کہا: ﴿ مَجْنُوْنٌ ﴾ یعنی نوح علیہ السلام کو جنون کی طرف منسوب کیا۔ ﴿ وَازْدُجِرَ ﴾ دال بدل ہے تاء سے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ یہ ﴿ قَالُوْا ﴾ پر معطوف ہے، یعنی مجنون کہا اور دعوائے نبوت پر زجر کیا گیا اور اس شے کے پہنچانے پر جھڑکا گیا اور دھمکایا گیا جس کو

---

[1] تفسير ابن كثير (٣٣٦/٤) الدر المنثور (٦٧٦/٧) فتح البيان (٢٩٥/١٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨١٨) [3] تفسير ابن كثير (٣٣٦/٤)

[4] صحيح البخاري (٢٧٤٤/٦) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٠/١٠) تفسير الطبري (٥٨٤/٢٢_٥٨٥) تفسير ابن كثير (٣٣٥/٤،٣٣٦)

دے کر بھیجا گیا۔ اس کو طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَجْنُوْنٌ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی کہا کہ ﴿ مَجْنُوْنٌ ﴾ ہے اور کہا کہ جنون نے اس کو زجر کیا ہے، خبطی بنا دیا ہے، اس کی عقل لے گئے ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ من جملہ کلامِ الٰہی ہے۔ اللہ پاک نے ان کی طرف سے یہ خبر دی کہ گالیوں سے اور طرح طرح کی ایذا سے اس کو زجر کیا، جھڑکا۔[1] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول سب سے صحیح ہے، اس لیے کہ مقصود نبی ﷺ کے دل کو اگلے لوگوں کے ذکر سے مضبوط کرنا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾۔ جمہور نے ﴿ اَنِّيْ ﴾ کو بہ فتح ہمزہ پڑھا ہے: "أَيْ: بِأَنِّيْ" اور کسی نے (یعنی امام ابن ابی اسحاق اور اعمش رحمہما اللہ نے) بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے بر تقدیرِ اضمارِ قول: "أَيْ: فَقَالَ إِنِّيْ" یا یہ کہ خود دعا کو قائم مقام قول کے کریں، یہ کوفیوں کا مذہب ہے۔ یہ قراءت عاصم سے بھی مروی ہے۔[3] غرضیکہ جب نوح علیہ السلام کو قوم نے مجنون کہا اور جھڑکا اور ان کی دعوت نے ان پر کچھ اثر نہ کیا تو عاجز ہو کر اپنے رب کو پکارا، یعنی اپنی قوم پر بد دعا کی کہ میں اپنی قوم کی طرف سے مغلوب ہوں، اس لیے کہ وہ طاعت سے تمرد و سرکشی کرتے ہیں اور رسالت کے پہنچانے پر مجھے جھڑکتے ہیں۔ یہ دعا اس وقت کی کہ انتہا درجے کا صبر کیا، ان میں ساڑھے نو سو برس رہے اور ان کو سمجھانے میں محنت و مشقت اٹھائی اور اس نے ان میں کچھ فائدہ نہ کیا۔ جب ان کے دعوت قبول کرنے سے ناامید ہوئے اور ان کے تمرد و سرکشی اور گمراہی پر ان کا ڈٹ جانا جان لیا تو اپنے رب سبحانہ سے ان پر نصرت طلب کی، چنانچہ کہا: تو میری طرف سے ان سے انتقام لے۔

پھر جس شے کے ساتھ ان کو عذاب کیا، اس کا ذکر کیا: ﴿ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴾ جمہور نے "فَتَحْنَا" کو مخفف پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی ابن عامر و یعقوب) نے مشدد پڑھا ہے[4] اور دونوں سبعیہ ہیں۔ ﴿ اَبْوَابَ السَّمَآءِ ﴾ اپنے ظاہر پر ہے۔ آسمان کے دروازے ہیں کہ کھولے جاتے ہیں اور بند کیے جاتے ہیں، یہ بات بعید نہیں سمجھی جاتی۔ حدیث شریف میں صحیح ہو چکا ہے کہ آسمان کے دروازے ہیں۔[5] کسی نے کہا ہے کہ یہ استعارے کی بنا پر ہے، کیوں کہ ظاہر یہ ہے کہ "مطر" سحاب سے ہوتا ہے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ حرفِ باء ﴿ بِمَآءٍ ﴾ میں متعدی بنانے کے لیے ہے۔ بنا پر مبالغہ، اس لیے کہ پانی کو مثل آلے کے ٹھہرایا جس سے کھولا جاتا ہے جیسے کہتے ہو "فَتَحْتُ بِالْمِفْتَاحِ"۔ ﴿ مُّنْهَمِرٍ ﴾ وہ پانی ہے جو قوت اور زور سے کثیر مقدار میں نازل ہو۔ "همر" کثرت سے گرنے کو کہتے ہیں۔ "يُقَالُ: هَمَرَ الْمَاءُ وَالدَّمْعُ يَهْمِرُ هَمْرًا وَهُمُوْرًا إِذْ أَكْثَرَ"، معنی یہ ہیں کہ پھر ہم نے آسمان کے سارے دروازے تمام اطراف سے بہت زیادہ پانی کے ساتھ کھول دیے جو کثرت اور پے در پے برسنے

[1] فتح القدير (١٦٢/٥) [2] تفسير الرازي (٣٣/٢٩) [3] فتح القدير (١٦٢/٥)
[4] تفسير القرطبي (١٣٢/١٧) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٠٠)

میں سخت زور سے گرنے والا تھا۔ چالیس دن تک بند نہ ہوا۔

﴿ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُوْنًا ﴾ جمہور نے بہ تشدید پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام ابو حیوہ اور عاصم رحمہ اللہ نے) بہ تخفیف پڑھا ہے۔ اصل ترکیب "فَجَّرْنَا عُيُوْنَ الْأَرْضِ" ہے۔ یعنی ہم نے زمین کے چشمے بہا نکالے۔ اس سے قرآنی ترکیب میں زیادہ مبالغہ ہے۔ "إِنَّا جَعَلْنَا الْأَرْضَ كُلَّهَا عُيُوْنًا مُتَفَجِّرَةً"، یعنی ہم نے ساری زمین کو چشمے پھوٹ نکلنے والی کر دیا۔ عبید بن عمیر کہتے ہیں: اللہ پاک نے زمین کی طرف یہ وحی کی کہ اپنا پانی نکالے تو وہ چشمے ہو کر پھوٹ نکلی اور پانی بہا دیے۔

﴿ فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴾ کسی نے (یعنی جحدری نے) "اَلْمَاءَانِ" پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی حسن رحمہ اللہ نے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور محمد بن کعب رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے) "اَلْمَاوَانِ"، یعنی پھر آسمان کا پانی اور زمین کا پانی ایک ایسے امر پر مل گیا جو اُن پر جاری کیا جا چکا تھا، یعنی ایسے حال پر ہونے والا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے مقدر کر دیا تھا اور لوحِ محفوظ میں اس کا فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ ہوگا، یعنی قومِ نوح کا طوفان سے ہلاک ہونا۔ کسی نے کہا ہے کہ آسمان کا پانی اکثر تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ زمین کا پانی اکثر تھا۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے یہ حکایت کیا ہے کہ معنی یہ ہیں: ایسی مقدار پر کہ ان میں سے ایک دوسرے پر زیادہ نہ ہوا، بلکہ آسمان کا پانی اور زمین کا پانی برابری پر تھا۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ان کے لیے یہ مقدر کیا گیا تھا کہ جس وقت وہ کفر کریں گے تو ڈبو دیے جائیں گے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴾ ﴿ اَلْوَاحٍ ﴾ بہ معنی اخشابِ عریضہ ہے، یعنی چوڑی لکڑیاں، مراد تختے ہیں۔ ﴿ دُسُرٍ ﴾ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ میخیں ہیں جن سے تختے جکڑے جاتے ہیں، اس کا واحد "دسار" ہے۔ ہر شے جو کسی شے میں داخل کی جاتی ہے جو اس کو جکڑ دے وہ ﴿ دُسُرٍ ﴾ ہے۔ قتادہ، محمد بن کعب، ابن زید اور سعید بن جبیر وغیرھم رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ حسن، شہر بن حوشب اور عکرمہ رحمہم اللہ نے کہا کہ ﴿ دُسُرٍ ﴾ ظہرِ سفینہ ہے، یعنی کشتی کی پشت جس کو موج مارتی ہے، اس کا نام ﴿ دُسُرٍ ﴾ اس لیے رکھا کہ وہ پانی کو دفع کرتی ہے۔ ﴿ دُسُرٍ ﴾ بہ معنی دفع ہے۔ لیث نے کہا "دسار" خیط ہیں جن سے کشتی کے تختے جکڑے جاتے ہیں۔ صحاح میں کہا ہے "دسار" واحد ہے ﴿ دُسُرٍ ﴾ کا۔ ﴿ دُسُرٍ ﴾ خیوط ہیں جن سے کشتی کے تختے جکڑے جاتے ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ میخیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْوَاحٍ ﴾ تو کشتی کی دو جانب ہیں اور ﴿ دُسُرٍ ﴾ اس کی اصل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی اصل اور دو اطراف ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ اَلْوَاحٍ ﴾ تو کشتی کے تختے ہیں اور ﴿ دُسُرٍ ﴾ اس کی معاریض ہیں جن سے کشتی جکڑی جاتی ہے[2] (شاید وہ تختے ہیں جو اس کے عرض میں لگتے ہیں اور نطق سے مراد نطاقِ سفینہ، یعنی کمر بند یہ اس کی کمر کی تختی ہوئی۔ واللّٰه أعلم)۔

---

① تفسیر القرطبي (۱۳۳،۱۳۲/۱۷) فتح القدير (۱۶۳،۱۶۲/۵) ② الدر المنثور (۶۷۵/۷)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "نطق السفينة"۔ دوسرا قول "أضلاع سفينة" ہے۔[1] ﴿بِاَعْيُنِنَا﴾ "أَيْ: بِمَنْظَرٍ وَمَرْأًى مِنَّا وَحِفْظٍ لَهَا" یعنی وہ ہمارے سامنے ہماری حفاظت میں چلتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ [هود: ٣٧] "اور ایک کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے بنا۔" کسی نے کہا ہے کہ "بِأَمْرِنَا"۔ کسی نے کہا ہے کہ "بِوَحْيِنَا"۔ کسی نے کہا ہے کہ چلتی ہے ان چشموں سے جو زمین سے ابلنے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہمارے اولیاء، یعنی فرشتوں کی آنکھوں کے سامنے چلتی ہے، وہ فرشتے اس کی حفاظت پر مقرر کیے گئے ہیں۔ لیکن پہلا قول اولیٰ ہے۔

﴿جَزَآءً﴾ منصوب ہے بنا بر علت۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ اور ان کی قوم کے ساتھ کیا جو کچھ کیا کہ اسے نجات دی اور ان کو غرق کر دیا، اس شخص کو ثواب دینے کے لیے جس کے ساتھ کفر کیا گیا اور اس کے امر کا انکار کیا گیا، اس سے مراد نوح علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ ان کے لیے ایک نعمت تھے کہ جس کی ناشکری کی، اس لیے کہ ہر نبی اپنی امت پر ایک نعمت ہوتا ہے۔ یا ﴿جَزَآءً﴾ کا نصب بنا بر مفعولِ مطلق ہے فعلِ مقدر سے: "أَيْ: جَازَيْنَاهُمْ جَزَاءً"۔ یا یوں کہو: "أُغْرِقُوْا انْتِصَارًا"۔ یہ معنی کی تفسیر ہے۔ جمہور نے ﴿كُفِرَ﴾ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے، مراد نوح علیہ السلام ہیں، یا اللہ پاک ہے، کیوں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا اور اس کی نعمت کا انکار کیا۔ کسی نے (یعنی یزید بن رومان، قتادہ، مجاہد، حمید اور عیسیٰ رحمہم اللہ نے) بہ فتحِ کاف و فاء بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے، یعنی اس شخص کی جزا و سزا کے لیے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا۔[2]

﴿وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً﴾ یعنی اللہ کی قسم! البتہ واقعی ہم نے کشتی کو باقی رکھا عبرت لینے والے کے لیے ایک عبرت کے طور پر۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ارضِ جزیرہ میں باقی رکھا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ جودی پہاڑ پر ایک طویل مدت اور زمانے تک اس کو باقی رکھا، یہاں تک کہ اس کو اس امت کے پہلے لوگوں نے دیکھا۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم نے اس کی خبر باقی رکھی، یا ہم نے کشتیوں کی جنس باقی رکھی۔ یا "تَرَكْنَا" بہ معنی "جَعَلْنَا" ہے، یعنی ہم نے اس کو ایک نشانی ٹھہرا دیا۔ یا ﴿تَّرَكْنٰهَآ﴾ کی ضمیر "فعلة" کی طرف راجع ہے، یعنی ہم نے اس فعل کو (یعنی کیفیتِ مذکورہ پر ان کو غرق کرنا) جو اُن کے ساتھ کیا اس شخص کے لیے ایک عبرت اور نصیحت کے طور پر چھوڑ رکھا جو اس سے نصیحت پذیر ہو۔

﴿فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ یعنی پھر کیا ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا۔ ﴿مُّدَّكِرٍ﴾ کی اصل "مذتكر" ہے، چنانچہ حرفِ تاء ذال سے بدلا گیا، پھر معجمہ کو مہملہ سے دونوں کے تقارب کی وجہ سے بدلا، پھر دال کا دال میں ادغام کیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ کیا ہے کوئی نصیحت پذیر و عبرت گیر کہ نصیحت مانے اور عبرت حاصل کرے اس نشانی سے اور

[1] تفسير الطبري (٥٨٠/٢٢) [2] فتح القدير (١٦٣/٥) [3] الكشاف (٤٣٦/٤)

معصیت کو چھوڑ دے اور طاعت کو اختیار کرے۔ پھر جب اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کی دعا قبول کی، اس طرح سے کہ ان سب کو غرق کر دیا تو اس عذاب کے برا سمجھنے کو اور مشرکینِ مکہ کے بعید کرنے کو یوں فرمایا: ﴿ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴾ یعنی پھر میرا وہ عذاب کیسا رہا جس کے ساتھ میں نے ان کو عذاب دیا اور میرے ڈرانے کا انجام کیسا ہوا۔ امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "إنذار" اور "نذر" دونوں مصدر ہیں اور استفہام واسطے تھویل اور تعجیب کے ہے،[1] یعنی یہ عذاب اور انذار دونوں ایک ایسی ہولناک اور عجیب کیفیت پر ہوئے کہ جس کا وصف بیان نہیں ہو سکتا۔ کسی نے کہا ہے کہ "نذر" جمع ہے "نذیر" کی اور "نذیر" بہ معنی "إنذار" ہے۔ جیسے "نکیر" بہ معنی "إنکار" ہے۔

﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ ﴾ یعنی اللہ کی قسم ہے کہ ہم نے قرآن کو وعظ اور نصیحت قبول کرنے کے لیے البتہ سہل اور آسان کر دیا اس طرح سے کہ اس کو ہم نے طرح طرح کی شافی اور کافی نصیحتوں اور عبرتوں سے مزین کیا اور اس میں وعدے اور وعید پھیر پھیر کر بیان کیے جن کو چھوٹا بڑا، عربی و عجمی اور ان کے سوا اور لوگ حفظ کرتے ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے اس کو حفظ اور قراءت کے لیے آسان کیا۔ اللہ کی کتابوں میں سے کوئی شے سوائے قرآن کے نہیں ہے جو پوری حفظ کی جائے اور پڑھی جائے۔[2]

یہ جملہ قسمیہ ہے جو چاروں قصوں کے آخر میں وارد ہوا ہے پہلے کے مضمون کی تقریر کے لیے (یعنی ﴿ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ ﴾) اور اس امر پر آگاہ کرنے کے لیے کہ ان میں سے ہر قصہ اس بات کے ساتھ مستقل ہے کہ اس میں نصیحت پذیر ہونے کو اس میں واجب کرتا ہے اور منزجر ہونے میں کافی ہے اور باوجود اس کے حیز کے اعتبار میں ایک بھی واقع نہ ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی قسم! البتہ ہم نے قران کو تیری قوم کے لیے سہل کیا اس طرح سے کہ ہم نے اس کو ان کی زبان میں نازل کیا۔

﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ (امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استفہام بہ معنی امر ہے:[3] "أَيْ: فتذكروا واتعظوا")۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت پذیر ہونے والا اس کی نصیحتوں سے اور عبرت لینے والا اس کی عبرتوں سے اور ہے کوئی طالب اس کے حفظ کے لیے کہ وہ اس پر مدد کیا جائے اور ہے کوئی قاری جو اس کو پڑھے اور ہے کوئی عالم اور خیر کا طلب گار۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا: "فَهَلْ مِنْ مُتَذَكِّرٍ"[4] اس سورت میں یہ جملہ تنبیہ کے لیے اور سمجھانے کے لیے بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اس امت کو دوسری امتوں کی خبریں اور رسولوں کے قصے بیان کیے ہیں اور یہ بات بتانے کا ارادہ کیا ہے کہ ان امتوں نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور پھر اُن کے امور کا اور رسولوں کے امور کا انجام کیا ہوا۔

ان قصوں میں سے ہر قصے اور خبر میں سننے والے کے لیے ایک ذکر ہے اگر وہ نصیحت حاصل کرنا چاہے، اور ہر

[1] تفسير البغوي (٤٢٩/٧) [2] تفسير البغوي (٤٢٩/٧) [3] تفسير الجلالين (٧٠٦/١) [4] الدر المنثور (٦٧٦/٧)

قصے میں جو ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ کی تکرار کی ہے تو اس لیے کہ "ھل" کلمۂ استفہام ہے اور متدعی ہے ان کے فہموں کا جو ان کے جوفوں میں ترکیب دیے گئے ہیں اور ان کو ان پر حجت ٹھہرایا ہے۔ سو "ھل" کا لام تو استعراض کے لیے ہے اور حرفِ "ھا" استخراج کے لیے۔ اس آیت میں اس بات پر آمادہ اور برانگیختہ کرنا ہے کہ قرآن شریف کا درس کریں اور اس کی تلاوت کثرت سے کریں اور اس کے سیکھنے میں جلدی کریں۔[1] (كذا في فتح البيان) پھر دوسرا قصہ بیان فرمایا:

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿١٨﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿١٩﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿٢٠﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٢١﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٢٢﴾

(قومِ) عاد نے تکذیب کی، پھر (دیکھو) میرا عذاب اور میرا ڈراوا کیسا تھا؟ ⑱ بلاشبہہ ہم نے ان پر ایک مستقل نحوست والے دن میں شدید طوفانی ہوا بھیجی ⑲ وہ لوگوں کو یوں اُکھاڑتی (پھینکتی) تھی، جیسے وہ جڑ سے اُکھڑے کھجور کے تنے ہیں ⑳ پھر میرا عذاب اور میرا ڈراوا کیسا تھا؟ ㉑ اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے، پھر کیا کوئی نصیحت پکڑنے والا ہے ㉒

قوم عاد کا قصہ:

پیہم منحوس دن کا مطلب ہے کہ نحوست نہ اٹھی جب تک تمام ہو چکی نحوست کا دن انہیں پر تھا، یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے منحوس تھا۔ انتہی۔

اللہ پاک عاد کی خبر دیتا ہے کہ جو ہود علیہ السلام کی قوم تھی، انھوں نے بھی اپنے رسول کو جھٹلایا جس طرح قومِ نوح نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بادِ صرصر بھیجی، یعنی نہایت سخت سرد ہوا، ایک نحوست والے دن میں، یعنی وہ دن ان پر نحس تھا۔ یہ قول امام ضحاک، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ کا ہے۔ ﴿ مُّسْتَمِرٍّ ﴾ یعنی ان پر اس کا نحس مستمر رہا اور ان کی بربادی اور ہلاکت، اس لیے کہ وہ ایسا دن تھا جس میں ان کے دنیوی اور اخروی عذاب مل گئے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ ہوا آتی اور ان میں سے ایک کو اٹھا لیتی، یہاں تک کہ اس کو آنکھوں سے غائب کر دیتی، پھر اس کو اوندھا کر کے اس کے دماغ پر گرا دیتی،

---

[1] فتح البیان (۲۹۱/۱۳۔۲۹۵)

پھر اس کا سر توڑ دیتی تو وہ ایک جسم سر کے بغیر باقی رہ جاتا۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿٢٠﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٢١﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾[1] (كذا في ابن كثير)۔

یہاں صرف یہ کہہ دیا کہ عاد نے تکذیب کی اور یہ ہود علیہ السلام کی قوم ہے اور انھوں نے جو ہود علیہ السلام کی تکذیب کی اس کی کیفیت پیش نہ کی، اس سے منظور اس عذاب کو جلدی سے بیان کرنا ہے جو ان پر نازل ہوا۔ اور "فَكَذَّبُوْا هُوْدًا" نہ فرمایا جیسا کہ نوح علیہ السلام کے قصے میں فرمایا تھا: ﴿ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا ﴾، اس لیے کہ قوم نوح علیہ السلام کی تکذیب میں زیادہ مبالغہ ہے، کیوں کہ وہ ان میں طویل مدت تک ٹھہرے اور ان کا عناد کثیر تھا۔ یا اس لیے کہ یہاں عاد کا قصہ مختصر طور پر ذکر ہوا ہے۔

﴿ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴾ یعنی پھر کیا تم نے سنا، یا پھر سنو کہ میرا عذاب اور ان پر کہ میرا ڈرانا کیسا ہوا۔ ﴿ نُذُرِ ﴾ مصدر بہ معنی "إِنْذَارٌ" ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور سوالیہ انداز عذاب کی ہولناکی اور عظمت ظاہر کرنے کے لیے ہے، اس سے غرض یہ ہے کہ سننے والوں کے دل اس شے کے اصغاء (سننے) کی طرف اس کے ذکر کے پہلے متوجہ ہو جائیں جو اُن کی طرف القا کی جاتی ہے۔ غرضیکہ جس عذاب کا پہلے اجمالاً ذکر کیا، اس کا اس جملہ مستانفہ سے بیان فرمایا کہ ﴿ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا ﴾۔ صرصر سردی کی شدت کو کہتے ہیں، یعنی ہم نے ان پر ایک سخت سرد ہوا بھیجی۔ کسی نے کہا ہے کہ صرصر شدتِ صوت ہے، یعنی ایسی ہوا جس کی آواز سخت تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے "صرصر" کی تفسیر "بَارِدَةٌ" فرمائی ہے،[2] اس کا بیان سورت حم السجدہ میں گزر چکا ہے۔[3]

﴿ فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس دن کی نحوست ابد تک دائم ہوئی۔ مستمر ہوا ان پر اپنی نحوست کے ساتھ اور اس میں عذاب ہلاکت کی طرف مستمر ہوا۔ وہ لوگ اس دن سے بدشگونی لیا کرتے تھے، اس کو شوم اور نحس جانتے تھے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی مہینے کے آخر میں چہار شنبہ کے روز،[4] یعنی ماہِ شوال کی آٹھ راتیں باقی تھیں تو گویا اس کی ۲۲ تاریخ تھی اور وہ سورج غروب ہونے تک مستمر رہا۔ مطلب یہ ہے کہ ماہ شوال کے آخری چہار شنبہ کے دن غروبِ شمس تک مستمر رہا۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سورۃ الحاقہ میں ﴿ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا ﴾ [الحاقة: ٧] "وہ لگاتار سات رات اور آٹھ دن تک (اللہ) نے مسلط رکھا" فرمایا اور حم سجدہ میں ﴿ فِيْۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ ﴾ [فصلت: ١٦] فرمایا۔ تو یہاں پر ﴿ يَوْمِ ﴾ سے مراد وقت و زمان ہے۔ انتہیٰ۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ دن "مر" تھا، یعنی تلخ کڑوا۔ اسی طرح امام کسائی رحمہ اللہ نے ایک قوم سے حکایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ ﴿ مُسْتَمِرٍّ ﴾ "مرارة" سے ماخوذ ہے،[5] یعنی وہ دن کڑوی شے کی طرح تھا

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣٣٧/٤)　[2] تفسیر الطبري (٥٨٥/٢٢)　[3] رقم الآية (١٦)

[4] معاني القرآن (٨٩/٥)　[5] تفسیر القرطبي (١٣٥/١٧)

جس کو جی مکروہ رکھتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ''مِرَّة'' سے ماخوذ ہے بہ معنی قوت سے، یعنی ایسے دن میں جس کی شومی اور نحوست قوی اور مستحکم تھی، جیسے کوئی شے محکم بٹی ہوئی ہو جس کے توڑنے کی طاقت نہیں رکھی جاتی۔ ظاہر یہ ہے کہ ﴿ مُسْتَمِرٍّ ﴾ استمرار سے ماخوذ ہے نہ کہ ''مرارۃ و مرۃ'' سے، یعنی اس میں ان پر عذاب دائم ہوا یہاں تک کہ ان کو ہلاک کر دیا اور اس کا ہلاک کرنا ان کے بڑے چھوٹے کو شامل ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ ''اِسْتَمَرَّ بِهِمْ إِلَى نَارِ جَهَنَّمَ'' یعنی مرور کرایا ان کو جہنم کی آگ کی طرف۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''فِيْ أَيَّامٍ شِدَادٍ''۔[1] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: ''يَوْمُ الْأَرْبِعَاءِ يَوْمُ نَحْسٍ مُسْتَمِرٌّ'' ہے۔[2] (أخرجه ابن المنذر و ابن مردويه و أخرجه هو عنه من وجه آخر مرفوعا و عن علي رضی اللہ عنہ أيضا مرفوعا وعن أنس رضی اللہ عنہ أيضا مرفوعا)

اس میں یہ الفاظ ہیں: کہا گیا اور کیونکر ہے یہ یا رسول اللہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے اس میں فرعون کو غرق کیا اور اس کی قوم کو اور اس میں عاد کو اور ثمود کو ہلاک کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ مہینے میں آخری چہار شنبہ ﴿ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴾ ہے۔[3] (أخرجه ابن مردويه والخطيب بسند قال السيوطي: ضعيف عنه)۔ (ان حدیثوں کا مطلب وہی ہے کہ مہینے کے آخر چہار شنبہ میں ان پر عذاب آیا سو وہ ان پر نحس تھا اور ان کے عذاب کا دن بتا دیا کہ یہ تھا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دن ہمیشہ کے لیے منحوس ہے جیسا کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فائدے میں فرمایا ہے، ٹھیک اور قابلِ اعتقاد بات یہی ہے)۔ جمہور نے یوں پڑھا ہے کہ ﴿ يَوْمِ ﴾ کی اضافت ﴿ نَحْسٍ ﴾ کی طرف ہے، ﴿ نَحْسٍ ﴾ مع سکونِ حاء۔ یہ یا تو ''إِضَافَةُ مَوْصُوْفٍ إِلَى الصِّفَةِ'' کے باب سے ہے، یا بر تقدیرِ مضاف ''أَيْ: فِيْ يَوْمِ عَذَابِ نَحْسٍ''۔ کسی نے (یعنی حسن رحمہ اللہ نے) تنوینِ ''یومٍ'' پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ نَحْسٍ ﴾ ﴿ يَوْمِ ﴾ کی صفت ہے اور کسی نے (یعنی ہارون نے) ﴿ نَحِسٍ ﴾ کو بہ کسرِ حاء پڑھا ہے۔[4]

جملۂ ﴿ تَنْزِعُ النَّاسَ ﴾ محلِ نصب میں ہے اس بنیاد پر کہ ''ریح'' کی صفت ہے، یا اس سے حال ہے اور مستانفہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں اسم ظاہر کو مضمر کی جگہ رکھا، تاکہ ان کے مردوں اور عورتوں کو عام ہو جائے، ورنہ اصل ''تَنْزِعُهُمْ'' ہے، یعنی وہ ہوا ان کو زمین سے اکھاڑتی تھی، پھر ان کو ان کے سروں کے بل پھینکتی تھی، پھر ان کی گردنیں توڑتی تھی اور اُن کے سر ان کے جسموں سے جدا کرتی تھی۔ کسی نے کہا کہ لوگوں کو ان کے گھروں سے کھینچتی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی قبروں سے کھینچتی تھی، اس لیے کہ انھوں نے گڑھے کھودے تھے اور اُن میں گھس گئے تھے۔ مروی ہے کہ وہ پہاڑوں کے گڑھوں اور دروں میں گھس گئے تھے اور ایک دوسرے کو خوب مضبوطی سے پکڑ لیا تھا، وہ ہوا ان کو وہاں سے کہیں لے جاتی اور مردہ کر کے ان کو پھینک دیتی تھی۔

---

(1) تفسير الطبري (٢٢/٥٨٦، ٥٨٧) (2) الدر المنثور (٧/٦٧٧)
(3) الدر المنثور (٧/٦٧٨) (4) فتح القدير (٥/١٦٥)

﴿ اَعْجَازُ ﴾ "عَجُزٌ" کی جمع ہے۔ "عَجُزٌ" ہر شے کے مؤخر کو کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "أُصُولُ النَّخْلِ".[1] ان کا دوسرا قول یہ ہے: "أَعْجَازُ سُوْدِ النَّخْلِ".[2] ﴿ مُنْقَعِرٍ ﴾ یعنی کھجور کے درخت کٹنے اکھڑنے والے اپنی جڑوں سے۔ جب کھجور کے درخت کو اس کی جڑ سے کاٹ ڈالو یہاں تک کہ گر پڑے تو کہو گے: "قَعَرْتُ النَّخْلَةَ" یعنی گویا وہ لوگ اور حال ان کا وہ ہے جو مذکور ہوا کہ بغیر سر کے مردہ ہو کر زمین پر پڑے ہوئے ہیں، جیسے: کھجور کی جڑیں ہیں جو اُکھڑی پڑی ہیں۔ چونکہ ان کے قد لمبے لمبے تھے، جب ہوا نے ان کو پچھاڑا اور اُن کو منہ کے بل پھینک دیا تو ایسے لگتے تھے جیسے کھجور کے درخت زمین پر گرے ہوئے ہیں جن کے سر نہیں ہیں۔ یہ اس لیے کہ ہوا نے پہلے تو اُن کے سر اکھاڑے، پھر ان کو منہ کے بل اوندھا دے مارا، چنانچہ یہ ان کے طولِ قد میں تشبیہ دی گئی ہے۔

یہ وہ قول ہے جس پر امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ چلے ہیں اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ قوی اور زور آور تھے اور اپنے جسموں سے زمین میں خوب جمے تھے تو گویا وہ اپنے جسموں کی بڑائی اور قوت کی وجہ سے ہوا کے ساتھ مقابلہ کرنے کا قصد کرتے تھے۔ جب ہوا نے ان کو پچھاڑا اور زمین پر ڈالا تو گویا اس نے ﴿ اَعْجَازُ نَخْلٍ ﴾ کو اکھاڑا۔ ﴿ اَعْجَازُ نَخْلٍ ﴾ سے مراد کھجور کا پورا درخت ہے بغیر سر کے، صرف اس کی جڑ مراد نہیں ہے۔

﴿ مُنْقَعِرٍ ﴾ کی تذکیر (مذکر کے طور پر ذکر کرنا) حالانکہ وہ ﴿ اَعْجَازُ نَخْلٍ ﴾ کی صفت ہے اور وہ مؤنث ہے تو یہ لفظ کے اعتبار سے کی ہے۔ معنی کے اعتبار سے اس کی تانیث (مؤنث کہنا) بھی جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴾ [الحاقة: 7] "کھجور کے کھوکھلے تنے۔" امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر وہ شے جو اس بارے میں تجھ پر وارد ہو اگر تو چاہے تو اس لفظ کی تذکیر کی طرف لے جائے، یا معنی کے لحاظ سے تانیث کی طرف لے جائے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ "نخل و نخیل" مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں۔

﴿ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴾ یعنی پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا، ان کے لیے اس کے نزول سے پہلے، یا ان کے عذاب کرنے میں جو میری انذارات ہیں (ڈرانے کی باتیں) ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد والے ہیں۔ اس آیت کو تہویل (ہولنا کی) کے لیے دوبارہ ذکر کیا ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تہویل عذاب و نذر کے لیے ہے اور ان کے بارے میں تعجب کرنے کے لیے ہے۔ ان کے بیان کے بعد تو اس میں تکرار کا شائبہ نہیں ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ پہلا تو اس عذاب کے لیے ہے جو دنیا میں ان پر نازل ہوا اور دوسرا اس عذاب کے لیے ہے جو آخرت میں ان پر نازل ہوگا تو ترتیب ثانی کی عذاب دنیوی پر اس قول کو رد کرتی ہے۔[4]

﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ انکار و نفی ہے اور زیادہ مؤثر اور مؤکد وجہ پر اس شخص

[1] الدر المنثور (٦٧٨/٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢١/١٠)
[3] فتح القدير (١٦٦/٥) [4] تفسير أبي السعود (١٧١/٨)

کے لیے جو نصیحت پکڑے۔ کیوں کہ یہ اس پر دال ہے کہ کوئی اس پر قادر نہیں ہے کہ استفہام کرنے والے کو ہاں میں جواب دے۔[1] (كذا في فتح البيان) پھر جب اللہ پاک نے عاد کی تکذیب کا ذکر کیا تو اس کے بعد ثمود کی تکذیب کا بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا:

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ﴿٢٣﴾ فَقَالُوا أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا لَّفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿٢٤﴾ أَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِن بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ ﴿٢٥﴾ سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ﴿٢٦﴾ إِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿٢٧﴾ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ ۖ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٠﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿٣١﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٣٢﴾

(قومِ) ثمود نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا (23) تو انھوں نے کہا: بھلا ایک ایسا آدمی جو ہم ہی میں سے ہے، ہم اس کی پیروی کریں؟ بلاشبہہ ہم تو تب گمراہی اور دیوانگی میں ہوں گے (24) کیا ہمارے درمیان سے اسی پر وحی نازل کی گئی ہے؟ (نہیں) بلکہ وہ سخت جھوٹا اور شیخی باز ہے (25) کل ہی وہ جان لیں گے کون کذاب اور شیخی باز ہے؟ (26) بلاشبہہ ہم ان کی آزمائش کے لیے اونٹنی بھیجنے (چٹان سے نکالنے) والے ہیں، لہٰذا (اے صالح!) تو ان (کے انجام) کا انتظار کر اور صبر کر (27) اور انھیں بتا دے کہ بے شک پانی ان کے (اور اونٹنی کے) درمیان تقسیم ہوگا، ہر ایک (اپنی) باری پر حاضر ہوگا (28) پھر انھوں نے اپنے (ایک) ساتھی کو پکارا تو اس نے (تلوار) پکڑی، پھر اس نے کونچیں کاٹیں (اور اسے مار ڈالا) (29) پھر (دیکھو) میرا عذاب اور ڈراوا کیسا تھا؟ (30) بلاشبہہ ہم نے ان پر ایک ہی چنگھاڑ بھیجی تو وہ باڑ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑ کی طرح (چور چور) ہوگئے (31) اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے تو کیا کوئی نصیحت پکڑنے والا ہے؟ (32)

---

[1] فتح البیان (۱۳/۲۹۵-۲۹۸)

قومِ ثمود کا قصہ:

وہ اونٹنی جس پانی پر جاتی سب جانور بھاگ جاتے تو اللہ نے ان کی باری ٹھہرا دی کہ ایک دن وہ جائے اور ایک دن باقی سب جانور۔ ایک بدکار عورت تھی، اس کے مویشی بہت تھے، اس نے اپنے ایک آشنا کو سکھا دیا، اس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ انتہی۔[1]

یہ ثمود کی خبر ہے کہ انھوں نے اپنے رسول صالح علیہ السلام کی تکذیب کی اور کہا کہ کیا ہم اپنے میں سے ایک اکیلے آدمی کی پیروی کریں، پھر تو ہم غلطی پر ہوں گے اور سودائی ہوں گے، یعنی البتہ ہم خائب و خاسر ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے، اگر ہم سب اپنی رسی اپنے میں سے ایک کو سونپ دیں۔ پھر اس بات پر تعجب کیا کہ ان کو چھوڑ کر خاص ایک آدمی پر وحی کا القا ہوا۔ پھر صالح علیہ السلام پر کذب کی تہمت لگائی اور کہا: بلکہ وہ جھوٹا ہے جو حدِ کذب سے بھی تجاوز کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ کل کو جان لیں گے کہ کون ﴿ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴾ ہے۔ یہ ان کے لیے ایک سخت دھمکی اور وعید ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم ان کی آزمایش کے لیے ایک اونٹنی بھیجنے والے ہیں۔ اللہ پاک نے ان کے لیے ایک بڑی سی دس ماہ کی گابھن اونٹنی ایک سخت پتھر میں سے نکالی ان کی فرمایش کے مطابق جو انھوں نے خود کی تھی، تاکہ وہ اللہ کی طرف سے ان پر صالح علیہ السلام کی اس معاملے میں تصدیق کی حجت ہو جائے جو وہ لے کر آئے۔ پھر فرمایا: ﴿ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴾ یعنی اپنے بندے اور رسول صالح علیہ السلام کو حکم دیا کہ تو ان کے کام کے انجام کا انتظار کر اور ان پر صبر کر، بے شک نیک انجام اور دنیا اور آخرت میں نصرت و مدد تیرے لیے ہے اور تو ان کو بتلا دے کہ ان کے درمیان پانی تقسیم کیا جاتا ہے، باقی دن اُن کے لیے اور ایک دن اونٹنی کے لیے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ [الشعراء: ١٥٥] ''آپ نے فرمایا: یہ ہے اونٹنی، پانی پینے کی ایک باری اس کی اور ایک مقررہ دن کی باری پانی پینے کی تمھاری۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴾ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت وہ غائب ہوتی تو وہ پانی کے لیے حاضر ہوتے اور وہ جب آتی تو وہ دودھ لینے کے لیے آتے۔[1] پھر فرمایا: ﴿ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴾ مفسروں نے کہا ہے کہ صاحب سے مراد عاقرِ ناقہ (جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹیں) ہے اس کا نام قدار بن سالف ہے اور یہ شخص اپنی قوم کا بدبخت تر آدمی تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴾ [الشمس: ١٢] ''جب ان میں سے بڑا بدبخت اٹھ کھڑا ہوا۔''

---

(1) تفسير الطبري (٢٢/٥٩٢)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴾ یعنی پھر وہ خاسر ہوا اور کونچیں کاٹیں، پھر میں نے ان کو سزا دی تو کیسی ہوئی ان کے لیے میری سزا اس بات پر کہ انھوں نے میرا انکار کیا اور میرے رسولوں کو جھٹلایا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴾ یعنی پھر وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے ان میں سے کوئی باقی نہ رہا اور وہ خامد و ہامد و ساکن ہو گئے، جیسے: سوکھی کھیتی اور روئیدگی ساکن ہو جاتی ہے، یعنی چورا چورا ہو گئے۔ مفسرین میں سے کئی ایک اہلِ علم کا یہی قول ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''محتظر'' چارا ہے جنگل میں جبکہ وہ سوکھ جائے، جل جائے اور ہوا اس کو اڑائے پھرے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ اونٹوں اور مویشیوں پر خشک کانٹوں کی باڑ بنایا کرتے تھے، چنانچہ ﴿ كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴾ سے یہی مراد ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''هشيم المحتظر'' وہ خاک ہے جو دیوار سے کھرتی ہے اور بکھرتی ہے، یہ قول غریب ہے۔[1] سب سے قوی قول پہلا ہے۔ واللّٰہ أعلم۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ نُذُرِ ﴾ جائز ہے کہ ''نَذِيْر'' کی جمع ہو، یعنی ثمود نے ان رسولوں کو جھٹلایا جو ان کی طرف بھیجے گئے۔ انھوں نے اپنے رسول صالح علیہ السلام کی تکذیب کی۔ یہ رسولوں کی تکذیب صرف اس لیے ہوئی کہ جس نے نبیوں میں سے ایک کی تکذیب کی تو اس نے درحقیقت باقی رسولوں کی تکذیب کی، کیوں کہ شریعتوں کے کلیات کی طرف دعوت دینے میں وہ سب متفق ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿ نُذُرِ ﴾ مصدر ہو بہ معنی ''إنذار'' یعنی ثمود نے اس انذار کی تکذیب کی جس کے ساتھ وہ ڈرائے گئے۔ تکذیب کا بیان یہ ہے: چنانچہ انھوں نے کہا: ﴿ اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ﴾ استفہام انکاری ہے، یعنی ہم کیوں کر پیروی کریں ایک ایسے آدمی کی جو ہماری جنس سے ہے، اکیلا و تنہا ہے، اس کا کوئی اس بات پر تابع نہیں جس کی طرف وہ بلاتا ہے۔

جمہور نے ''بَشَرًا'' کو بہ نصب پڑھا ہے بنا بر اشتغال ''أَيْ: أَنَتَّبِعُ بَشَرًا وَّاحِدًا'' یہ وجہ راجح ہے، اس لیے کہ جو اداۃ (لفظ) فعل کے ساتھ اولیٰ ہے، وہ متقدم ہو چکا ہے یعنی ہمزۂ استفہام۔ کسی نے (یعنی امام ابو السماک، دانی، ابو الاشہب اور ابن سمیفع رحمہم اللہ نے) ''بشر'' بہ رفع پڑھا ہے بنا بر ابتداء اور ''واحد'' اس کی صفت اور ﴿ نَتَّبِعُهٗٓ ﴾ خبر ہے۔ کسی نے (یہ امام ابو السماک رحمہ اللہ سے مروی ہے) بہ رفع ''بشر'' و نصب ''واحدا'' بنا بر حال ﴿ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴾ پڑھا ہے، یعنی جس وقت ہم اس کی پیروی کر لیں گے تو البتہ ہم خطا و ذہاب میں ہوں گے حق اور صحیح راستے سے اور عذاب، مشقت اور شدت میں۔ امام فراء رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا:

[1] تفسير الطبري (٢٩٤/٢٢) [2] تفسير ابن كثير (٣٣٧/٤)

﴿ سُعُرٍ ﴾ "سَعِیْرٌ" کی جمع ہے۔

"سَعِیْرٌ" آگ کا شعلہ ہے اور ﴿ سُعُرٍ ﴾ بہ معنی جنون ہے۔ اِدھر اُدھر جاتا ہے اس حدت اور تیزی کے سبب سے جو شعلے میں ہوتی ہے۔[1] چونکہ جنون میں اضطراب و بے قراری ہوتی ہے، اس لیے اس کو ﴿ سُعُرٍ ﴾ کہا، یعنی جیسے آگ کا شعلہ کہ حدت کے مارے مضطرب ہوتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا "بُعْدٌ عَنِ الْحَقِّ"، یعنی حق سے دوری۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "فِيْ احْتِرَاقٍ"، یعنی جلنے میں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ اس سے مراد جنون ہے "نَاقَةٌ مَسْعُوْرَةٌ" سے ماخوذ، گویا وہ اونٹنی اپنی شدتِ نشاط کے مارے دیوانی ہو رہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "فِيْ شِقَاءٍ"[3] یعنی بدبختی و مشقت میں۔

پھر انھوں نے انکار اور استبعاد کی تکرار کی اور کہا: کیا ہمارے درمیان میں سے اس پر ذکر القا کیا گیا، یعنی ہمارے درمیان میں سے وحی اور نبوت کے لیے وہ کیوں مخصوص کیا گیا، حالانکہ ہم میں ایسا شخص موجود ہے جو اس سے بڑھ کر اس کا مستحق ہے۔ پھر انکار سے بھی بڑھ کر اس بات کی طرف پھرے اور کہا کہ وہ ﴿ كَذَّابٌ أَشِرٌ ﴾ ہے۔ ﴿ أَشِرٌ ﴾ بہ معنی مرح ونشاط ہے، یا بطر وتکبر۔ اس کی تفسیر بطر وتکبر کے ساتھ زیادہ تر مناسب ہے مقام کے لحاظ سے۔ (ومنه قول الشاعر: أشرتم بلبس الخز لما لبستم ومن قبل لا تدرون من فتح القرى)

جمہور نے ﴿ أَشِرٌ ﴾ بروزن فرح پڑھا ہے بنا بر صفتِ مشبہ اور کسی نے (یعنی ابو قلابہ اور ابو جعفر نے) بہ فتحِ شین وتشدیدِ راء پڑھا ہے بنا بر افعل تفضیل اور امام کسائی رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے بہ ضمِ شین مع فتحِ ہمزہ نقل کیا ہے۔ پھر اللہ پاک نے ان کو یہ جواب دیا: ﴿ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ﴾۔ ﴿ مَنِ ﴾ استفہامیہ ہے، یعنی اب یہ کل کو جان لیں گے کہ کون سا فریق ﴿ كَذَّابٌ أَشِرٌ ﴾ متکبر بطر ہے، کیا یہ ثمود ہیں یا صالح علیہ السلام ہیں۔ حرفِ سین جملے کے مضمون کی تقریب اور تاکید کے لیے ہے اور ﴿ غَدًا ﴾ سے مراد عذاب کے نازل ہونے کا وقت ہے جو ان پر دنیا میں نازل ہوا یا قیامت میں نازل ہوگا۔ لوگوں کی عادت ہے کہ آیندہ کی بات کو "غد" کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، گو وہ بعید ہی کیوں نہ ہو جس طرح کہ عرب کے قول میں ہے: "إِنَّ مَعَ الْيَوْمِ غَدًا" (كما في قول الحُطيئة:

للموت فيها سهام غير مخطئة من لم يكن ميتا في اليوم مات غدا

ومنه قول أبي الطماح:

ألا علّلاني قبل نوح النائح و قبل اضطراب النفس بين الجوانح
وقبل غد يالهف نفسي على غد إذا راح أصحابي ولست برائح)[4]

[1] فتح القدير (١٦٦/٥) [2] تفسير القرطبي (١٣٩/١٧) [3] الدر المنثور (٦٧٩/٧) [4] فتح القدير (١٦٧/٥)

چنانچہ یہاں اسی بنا پر فرمایا ہے، لیکن قولِ اول اولیٰ ہے۔ جمہور نے بیائے تحتیہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کو ان پر ایک مدت کے بعد عذاب کے واقع ہونے کی خبر دی ہے بطریقِ التفات۔ کسی نے (یعنی ابو عمرو، ابن عامر اور حمزہ رحمہم اللہ نے) بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ صالح علیہ السلام کی طرف سے اپنی قوم کو خطاب ہے۔[1]

جملہ ﴿ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴾ مستانفہ ہے اس وعید کے بیان کے لیے لایا گیا ہے جس کا پہلے اجمالی طور پر ذکر ہو چکا ہے۔ اس کا مقصد اس شے کے مبادی (ابتدائی باتیں) کا بیان کرنا بھی ہے جس کا حتمی وعدہ کیا گیا ہے، یعنی ہم اس اونٹنی کو ان کی فرمایش کے مطابق پتھر سے نکالنے والے ہیں اور اس کو ان کے لیے ایک فتنہ یعنی آزمایش بنانے والے ہیں اور ان کا امتحان لینے والے ہیں۔ اور نصب بنا بر مفعول لہ ہے، یعنی ان کے آزمانے کے لیے۔ چنانچہ تو انتظار کر اس چیز کا جو وہ کرتے ہیں اور اس کا جو ان کے ساتھ کیا جائے گا اور اس ایذا پر صبر کر جو اُن کی طرف سے تجھے پہنچے اور تو جلدی مت کر، یہاں تک کہ ہمارا امر تیرے پاس آ جائے اور ان کو ایک امرِ عظیم کی خبرِ عظیم دے۔

وہ یہ ہے کہ پانی ان کے درمیان تقسیم کیا گیا ہے، یعنی ثمود کے اور اونٹنی کے درمیان۔ اس اونٹنی کے لیے ایک دن ہے، وہ سارا پانی پی جائے گی اور کنوئیں میں قطرہ بھر نہ چھوڑے گی جس کو ان میں سے کوئی لے سکے اور ان کے لیے ایک دن ہے جس میں وہ اونٹنی ان کی شریک نہ ہو گی، جیسا کہ آیت: ﴿لَهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ میں ہے۔ یہاں ﴿ بَيْنَهُمْ ﴾ بہ ضمیرِ عقلاء فرمایا واسطے تغلیب کے۔ جمہور نے ﴿ قِسْمَةٌ ﴾ بہ کسرِ قاف بہ معنی "مقسوم" پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی ابو عمرو رحمہ اللہ نے) ایک روایت کے مطابق بہ فتحِ قاف پڑھا ہے۔ ﴿ شِرْبٍ ﴾ بہ کسرِ شین پانی کا حصہ و نصیب و بہرہ ہے۔

﴿ مُّحْتَضَرٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس کے پاس اس دن وہ شخص حاضر ہو گا جس کی باری ہے، چنانچہ ایک دن اس کے پاس ناقہ حاضر ہو گی اور ایک دن وہ لوگ اس کے پاس حاضر ہوں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثمود پانی پر اپنی باری کے دن حاضر ہوں گے اور پییں گے اور اس کی باری کے دن حاضر ہوں گے تو اس کا دودھ دوھیں گے،[2] یعنی اس کی باری کے دن وہ تو ایک قطرہ نہیں چھوڑتی تھی کہ وہ پییں تو وہ لوگ اس دن اس کے دودھ پر اکتفا کرتے تھے۔ (کما ذکرہ الخطیب)

﴿ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴾ میں حرفِ فاء فصیحہ ہے اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ کلام میں محذوف ہے، وہ محذوف یہ ہے، یعنی پھر انھوں نے تعدی کی (انتہا کو پہنچے) یا پھر اس حال پر ایک مدت تک باقی رہے، پھر ان پر اور اُن کے مویشیوں پر پانی اور چارے کی تنگی ہوئی تو اس سے اکتا گئے۔ پھر سب نے اس کے قتل پر اتفاق کیا تو

[1] تفسير القرطبي (١٣٩/١٧) [2] تفسير الطبري (٥٩٢/٢٢)

اپنے رفیق کو پکارا۔ یہ شخص قدار بن سالف عاقرِ ناقہ ہے، اسے اس کی کونچیں کاٹنے پر آمادہ کرتے تھے تو اس نے اپنی تلوار سے ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ یا اس نے کونچیں کاٹنے کے اسباب کو جمع کرنے کی جرأت کی، پھر بے پروا ہو کر اس کی کونچیں کاٹیں۔ "تَعَاطٰی" کسی شے کو بہ تکلف لینے کو کہتے ہیں۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اس کے راستے پر اس کے لیے گھات میں بیٹھا ایک درخت کی جڑ میں، پھر اس کو ایک تیر سے مارا تو اس سے اس کی پنڈلی کا عضلہ پرو دیا، پھر اس پر تلوار سے حملہ کیا تو اس کی کونچ توڑ ڈالی، پھر اس کو ان کی موافقت کے لیے نحر کیا۔[1]

﴿ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ ﴾ یعنی پھر میرا عذاب اور میرا عذاب کے واقع ہونے سے پہلے ان کو ڈرانا کیسا ہوا، یعنی اپنے موقعے میں واقع ہوا یہ عذاب جس کا مجمل ذکر کیا۔ پھر اس کا یوں بیان فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ صَیْحَةً وَّاحِدَةً ﴾۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد جبریل علیہ السلام کا ﴿ صَیْحَةً ﴾ یعنی چیخ ہے۔ اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے چوتھے دن انھوں نے ان پر ایک چیخ ماری، کیوں کہ عقرِ ناقہ منگل کو ہوا اور ہفتے کے دن ان پر عذاب اترا۔ اس کا بیان سورت ہود اور اعراف میں گزر چکا ہے، غرضیکہ نزولِ عذاب کے بعد وہ "ھشیم محتظر" کی طرح ہو گئے۔ جمہور نے بہ کسرِ ظاء پڑھا ہے۔

"ھشیم" کہتے ہیں حطام و یابس شجر کو، یعنی درختوں کے سوکھے ریزے پرزے چورا چورا کیے ہوئے اور "محتظر" صاحبِ حظیرہ ہے، یہ وہ شخص ہے جو اپنی بکریوں کے لیے حظیرہ بناتا ہے جو ان کو ہوا کی سردی سے روکتا ہے، مثلاً چھپر جو کاہ وغیرہ سے بنایا جاتا ہے۔ بکریوں کی حفاظت کو جب کوئی درختوں کو جمع کرتا ہے اور ایک دوسرے پر رکھتا ہے تو محاورۂ عرب میں کہتے ہیں: "اِحْتَظَرَ عَلٰی غَنَمِهِ" صحاح میں کہا ہے "محتظر" وہ ہے جو حظیرہ بناتا ہے۔[2] یعنی سوکھے درختوں اور کانٹوں سے اپنی بکریوں کی درندوں اور بھیڑیوں سے حفاظت کرتا ہے۔ "حَظِیْرَةٌ: زَرِیْبَةُ الْغَنَمِ وَنَحْوِهَا" ہے۔ (گویا ایک احاطہ ہوا کہ کانٹوں اور درختوں کی باگڑ بنا کر لگا کر بنایا جاتا ہے۔)[3] (کما قالہ الشہاب) کسی نے (یعنی امام حسن، قتادہ اور ابو العالیہ رحمہم اللہ نے) بہ فتحِ ظاء پڑھا ہے: "أَيْ: کَهَشِیْمِ الْحَظِیْرَةِ"۔ چنانچہ جس نے بالکسر پڑھا تو اس کی مراد فاعلِ احتظار ہے اور جس نے بالفتح پڑھا تو اس کی مراد حظیرہ ہے۔ حظیرہ بروزن فعیلہ بہ معنی مفعولہ ہے، یعنی کانٹوں وغیرہ سے احاطہ کیا ہوا۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان درختوں کی طرح ہو گئے جو حظیرے میں سوکھ جائیں اور اُن کے گر پڑنے کے بعد بکریاں ان کو روند ڈالیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ھشیم" کھوکھلی جلی ہوئی ہڈیاں ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ خاک جو دیواروں سے کھرتی ہے ہوا کے دن میں۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا: وہ شے ہے جو حظیرے سے کھرتی

---

[1] تفسیر القرطبي (١٤١/١٧) [2] تفسیر القرطبي (١٤٢/١٧) فتح القدیر (١٦٨/٥)

[3] حاشیة الشهاب علی تفسیر البیضاوي (١٢٥/٨)

ہے جب تو اس کو لاٹھی سے مارے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ ہر اس شے کو جو تر ہو اور خشک ہو جائے۔ ''ھشیم'' نام رکھتے ہیں۔① ''متھشم'' بہ معنی ''متکسر'' ہے اور ''محتظر'' وہ ہے جو حظیرہ بناتا ہے اور جس شے کے ساتھ حظیرہ بنایا جاتا ہے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سوکھ جاتی ہے اور چوپائے اسے روند ڈالتے ہیں تو وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''كَحَظَائِرِ مِنَ الشَّجَرِ مُحْتَرِقَةٍ وَكَالْعِظَامِ الْمُحْتَرِقَةِ وَكَالْحَشِيْشِ تَأْكُلُهُ الْغَنَمُ''②

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ کی تکرار کا فائدہ یہ ہے کہ پہلے لوگوں کو ہر خبر سننے کے بعد سوچنے کی اور نصیحت پذیر ہونے کی تجدید کریں اور نئے سرے سے بیدار اور ہوشیار ہونا شروع کریں جس وقت کہ اس پر آمادہ و برانگیختہ کرنے کو سنیں۔ اسی طرح فی نفسہٖ خبروں اور قصوں کو بار بار لانا ہے، تاکہ وہ عبرت کے طور پر دلوں کے لیے اور ذہنوں کے لیے حاضر ہو جائیں اور صورت بن کر کھڑے ہو جائیں اور ہر وقت میں یاد رکھے ہوئے ہوں اور بھلائے نہ جائیں۔③ (كذا في فتح البيان) پھر اللہ پاک نے قومِ لوط کی خبر دی کہ انھوں نے بھی اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا جس طرح کہ دوسروں نے جھٹلایا۔ چنانچہ فرمایا:

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ۝۳۳ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّاۤ
اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۝۳۴ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ
نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۝۳۵ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا
بِالنُّذُرِ ۝۳۶ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَاۤ اَعْيُنَهُمْ
فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۳۷ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ
مُّسْتَقِرٌّ ۚ ۝۳۸ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۳۹ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ
لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۴۰

قومِ لوط نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا 33 اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ہوا بھیجی سوائے آلِ لوط کے، ہم نے انھیں بوقتِ سحر نجات دی 34 اپنے خاص فضل سے۔ ہم اسی طرح اسے جزا دیتے ہیں جو شکر کرے 35 اور بلاشبہ یقیناً لوط نے انھیں ہماری پکڑ سے ڈرایا تھا تو انھوں نے ڈراوے میں شک کیا 36 اور بلاشبہ یقیناً انھوں نے لوط سے اس کے مہمان مانگے تھے تو

---

① تفسير القرطبي (١٤٢/١٧) فتح القدير (١٦٨/٥) ② الدر المنثور (٦٧٩/٧) فتح القدير (١٦٩/٥)
③ فتح البيان (٢٩٨/١٣-٣٠٢)

ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں، چناں چہ تم میرے عذاب اور میرے ڈراوے کا مزہ چکھو (37)
اور بلاشبہہ یقیناً ان پر صبح کے وقت اٹل عذاب نے حملہ کر دیا (38) چناں چہ تم میرے عذاب اور میرے ڈراوے کا مزہ چکھو (39) اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا، پھر کیا کوئی نصیحت پکڑنے والا ہے (40)

قصہ قوم لوط کا:

اللہ پاک قومِ لوط کی خبر دیتا ہے کہ انھوں نے اپنے رسول کی کیسی تکذیب اور مخالفت کی اور مکروہ کام کے مرتکب ہوئے، یعنی مردوں سے بدفعلی۔ یہ وہ بے حیائی کا کام ہے کہ ان سے پہلے دنیا کے لوگوں میں سے کسی نے اس کو نہیں کیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا ہلاک کیا کہ پہلی امتوں میں سے کسی امت کو اس طرح سے ہلاک نہیں کیا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا تو انھوں نے ان کے شہروں کو اٹھایا، یہاں تک کہ ان کو لے کر ابرِ آسمان تک پہنچے، پھر ان کو ان پر اُلٹا دیا اور چھوڑ دیا اور اس کے بعد ﴿ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴾ کے پتھر ان پر برسائے گئے، اسی لیے یہاں یوں فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا ﴾

﴿ حَاصِبًا ﴾ بہ معنی حجارہ ہے، یعنی پتھر مگر آلِ لوط کہ وہ رات کے پچھلے حصے میں نکل گئے اور اس عذاب سے نجات پائی جو ان کی قوم کو پہنچا۔ لوط علیہ السلام کی قوم میں سے کوئی بھی ان پر ایمان نہیں لایا، یعنی ایک آدمی بھی اور نہ ان کی بیوی ایمان لائی۔ اس کو بھی وہی عذاب پہنچا جو اس کی قوم کو پہنچا اور اللہ کے نبی لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹیاں ان کے درمیان میں سے صحیح سالم نکل گئیں ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴾

﴿ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ قوم پر عذاب آنے سے پہلے ان کو اللہ تعالیٰ کی سزا اور عذاب سے ڈرا چکے تھے، چنانچہ انھوں نے اس طرف توجہ نہ کی اور نہ کان رکھا، بلکہ اس میں شک کیا اور اس سے مکر کیا۔ ﴿ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس رات جبریل، میکائیل اور اسرافیل لوط علیہ السلام پر بے ریش جوانوں کی صورت میں وارد ہوئے، اللہ کی طرف سے ان کا امتحان منظور تھا تو لوط علیہ السلام نے ان کی ضیافت کی اور ان کی بی بی بد بڑھیا نے اپنی قوم کی طرف آدمی بھیجا اور لوط علیہ السلام کے مہمانوں کی ان کو اطلاع دی، چنانچہ وہ ہر جگہ سے دوڑتے ہوئے ان کی طرف آئے۔

لوط علیہ السلام نے ان کا دروازہ بند کر دیا تو دروازہ توڑنے کا قصد کرنے لگے۔ یہ عشیہ کا وقت تھا، یعنی زوال کے بعد دن کا آخری حصہ تھا اور لوط علیہ السلام اپنے مہمانوں کے پاس سے ان کی مدافعت اور ممانعت کرتے تھے اور ان سے کہتے تھے: ﴿ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِيْۤ ﴾ [الحجر: ۷۱] ''اگر تمھیں کرنا ہی ہے تو یہ میری بچیاں موجود ہیں۔'' ''یَعْنِيْ نِسَاءَ

هُمُ". ﴿ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴾ (اصل میں اسی طرح ہے، فليحرر. شاید مطلب یہ ہو کہ بنات سے مراد ان کی قوم کی عورتیں ہیں۔ ان کو بنات اس لیے کہا کہ نبی اُمت کے لیے مثل باپ کے ہوتا ہے، یہ غرض نہیں کہ لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیاں ان کو پیش کیں، کیوں کہ وہ فاسق اور بدکار تھے، ان کو اپنی بیٹیاں کیوں دیتے، واقع میں یہ معنی نہایت خوب ہیں۔ واللہ أعلم)۔ ﴿ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ﴾ [هود: ٧٩] ''انھوں نے جواب دیا کہ تو بخوبی جانتا ہے کہ ہمیں تو تیری بیٹیوں پر کوئی حق نہیں ہے۔'' یعنی ہم کو ان میں کوئی حاجت نہیں ہے: ﴿ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴾ [هود: ٧٩] ''اور تو ہماری اصل چاہت سے بخوبی واقف ہے۔'' پھر جب حالت سخت ہوئی اور گھر میں گھسنا ہی چاہا تو جبریل علیہ السلام ان کے پاس آگئے اور اپنے بازو کی نوک سے ان کی آنکھوں کو مارا تو وہ مٹ گئیں۔

''يُقَالُ إِنَّهَا غَارَتْ مِنْ وُّجُوْهِهِمْ'' یعنی ان کے چہروں سے غایر (گہری) ہوگئیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی آنکھیں باقی نہ رہیں اور وہ اپنی پشت پر لوٹے دیواریں ٹٹولتے ہوئے اور لوط علیہ السلام کو صبح تک کی وعید سناتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴾ یعنی صبح سویرے ان کو ایک ایسے عذاب نے آ لیا جس سے ان کو نہ کوئی چھڑانے والا تھا، نہ اس سے بھاگ جانے کا کوئی راستہ اور نہ اس سے ان کو کسی طرح کا انفکاک (آزادی) تھی۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ نُذُرِ ﴾ سے مراد وہ امور ہیں جو لوط علیہ السلام کی زبان پر ان کو ڈرانے والے تھے۔ پھر اللہ پاک نے وہ شے بیان کی جس کے ساتھ ان کو عذاب کیا۔ فرمایا ہم نے ان پر حاصب بھیجی، یعنی ایک ایسی ہوا جو ان کو کنکروں سے مارتی تھی۔ امام ابو عبیدہ اور نضر بن شمیل رحمہ اللہ نے کہا: "اَلْحَاصِبُ: اَلْحِجَارَةُ فِي الرِّيْحِ" یعنی ہوا میں جو پتھر مارے جاتے ہیں وہ حاصب ہیں۔ صحاح میں کہا ہے: حاصب وہ سخت ہوا ہے جو کنکروں کو برانگیختہ کرتی ہے[2] اور حصب بفتحتین وہ شے ہے جس سے آگ جھونکی جاتی ہے، یعنی ایندھن۔ "وَكُلُّ مَا أَلْقَيْتَهُ فِي النَّارِ فَقَدْ حَصَبْتَهَا بِهِ" اس کا باب ضرب ہے۔ حاصب کو مذکر اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ عذاب کی تاویل میں ہے، حالانکہ وہ ریح کی طرف مسند ہے جو مؤنث سماعی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً ﴾ [الحجر: ٧٤] ''اور ہم نے ان پر پتھر برسائے۔'' اور اسی طرح ﴿ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً ﴾ [الذاريات: ٣٣] ''تاکہ ہم ان پر پتھر برسائیں۔'' یہ دونوں قول اس پر دال ہیں کہ جو شے ان پر بھیجی گئی وہ خود پتھر ہیں نہ کہ وہ ہوا جو ان کو پھینکتی ہے۔ مگر یہاں جو ﴿ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا ﴾ فرمایا تو یہ بات

---

[1] تفسير ابن كثير (٣٣٨/٤) [2] تفسير القرطبي (١٤٣/١٧)

بتانے کے لیے کہ پتھروں کو برسانا اور ان کو ان پر بھیجنا ہوا کے ذریعے سے تھا کہ ہوا نے ان پر پتھر چھوڑے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ﴾ سے مراد لوط علیہ السلام ہیں اور ان کی دو بیٹیاں اور جو کوئی ان کا تابع ہوا۔ اس استثناء میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ متصل ہے، یعنی حاصب سب پر بھیجا گیا مگر اہلِ لوط کہ ان پر نہیں بھیجا گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ منقطع ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں[1] اس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی (اس کی وجہ یہ ہے کہ "ما صدق" ضمیر مجرور کا، قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا ﴾ میں کفار قومِ لوط علیہ السلام ہیں اور اہلِ لوط اہلِ ایمان تھے اور اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کے درمیان انقطاع ظاہر ہے۔ از مصحح سلمه الله العزيز) کیونکہ انقطاع عبارت ہے عدمِ دخول مستثنیٰ سے مستثنیٰ منہ میں اور عدمِ انقطاع عبارت ہے دخول مستثنیٰ سے مستثنیٰ منہ میں، حالانکہ یہ داخل ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں، یعنی مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہے، اسی لیے کہا ہے کہ قول بانقطاعِ کلام مشکل ہے۔

بالجملہ اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم نے لوط علیہ السلام کے گھر والوں کو وقت سحر میں نجات دی، چنانچہ حرفِ باء بہ معنی "في" ہے، یا ملابسہ کے لیے ہے، یعنی اس حال میں کہ وہ متلبس ہونے والے تھے سحر کے ساتھ۔ سحر بمعنی آخر شب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں سحر کا مطلب رات کی سیاہی کا دن کے شروع کی سفیدی کے ساتھ مل جانا ہے، تو اس میں رات کے آثار بھی ہوتے ہیں اور دن کے آثار بھی۔ کسی نے کہا کہ سحر دو ہیں: ایک تو اعلیٰ، یہ فجر کے پھٹنے سے پہلے ہے اور ایک فجر کے پھٹنے کا آخری وقت ہے۔ "سحر" کا کلمہ منصرف ہوا اس لیے کہ نکرہ ہے۔ اس سے کسی شبِ معین و روزِ معین کی سحر مقصود نہیں ہے اور اگر معین مقصود ہوتی تو یہ کلمہ غیر منصرف ہوتا۔ امام اخفش اور زجاج رحمہما اللہ وغیرہما نے اسی طرح کہا ہے۔[2]

﴿ نِعْمَةً ﴾ منصوب ہے بنا بر مفعول لہ، یعنی ہم نے ان کو نجات دی انعام کرنے کے واسطے ہماری طرف سے لوط پر اور ان کے تابعین پر یا بنا بر مفعول مطلق ہے "نَجَّيْنا" کے معنی سے، کیوں کہ نجات دینا ایک انعام ہے، یعنی ہم نے انعام کیا جس طرح کہ ہماری طرف سے نجات دینے کا انعام دیا جاتا ہے۔ ﴿ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴾ یعنی جس طرح کہ ہم نے لوط کے گھر والوں کو جزا دی کہ ایمان اور اطاعت کی وجہ سے ان کو عذاب سے بچا لیا۔ ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں اس شخص کو جس نے ہماری نعمت کا شکر ادا کیا اور اس کی ناشکری نہ کی اصل ایمان کے ساتھ، یا جس نے ایمان کے ساتھ اپنے عملِ طاعات کو ملایا۔

﴿ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴾ یعنی البتہ تحقیق لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے بطشے سے، یعنی سخت عذاب اور سزا سے ڈرایا، چنانچہ انھوں نے ڈرانے میں شک کیا اور اس کی تصدیق نہ کی۔ "تَمَارَوْا" "مِرْيَةٌ" بہ معنی شک سے "تَفَاعَلُوْا" کا وزن ہے۔ یا "تَمَارَوْا" میں تکذیب کے معنی شامل ہیں، یعنی اس کے ڈرانے

[1] التبيان في إعراب القرآن (١١٩٥/٢) [2] فتح القدير (١٦٨/٥)

کا مجادلہ اور تکذیب کی۔ ﴿ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَاۤ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ قومِ لوط نے ان سے یہ ارادہ کیا کہ وہ ان کو اپنے مہمانوں پر، جو فرشتوں میں سے ان کے پاس آئے تھے، قدرت اور قابو دیں، تاکہ وہ ان سے فجور کریں جیسی کہ ان کی خبیث عادت تھی۔

"مُرَاوَدَةٌ" بہ معنی طلب ہے: "يُقَالُ: رَاوَدْتُهُ عَنْ كَذَا مُرَاوَدَةً وَرِوَادًا أَيْ: أَرَدْتُهُ رَادَ الْكَلَامَ يَرُوْدُهُ رَوْدًا أَيْ: طَلَبَهُ الْمَرَّةَ بَعْدَ الْمَرَّةِ" تو اب یہ معنی ہوں گے کہ قوم نے اس سے بار بار یہ بات طلب کی کہ مہمانوں میں اور ان میں تخلیہ کر دیں۔ "مُرَاوَدَةٌ" کی تفسیر سورت یوسف میں گزر چکی ہے۔[1] اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَطَمَسْنَاۤ اَعْيُنَهُمْ ﴾ "طُمُوْسٌ" بہ معنی "دُرُوْسٌ وَإِمْحَاءٌ" ہے، یعنی بوسیدہ ہونا، مٹنا جیسا کہ مختار میں کہا ہے،[2] یعنی پھر ہم نے ان کی آنکھوں کو ممسوحہ، یعنی پونچھی ہوئی کر دیا، ان کی کوئی دراڑ دکھائی نہیں دیتی تھی، جس طرح کہ ہوا خاک کے سبب سے جس کو کہ ان پر اڑاتی ہے، نشانات کو مٹا دیتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی آنکھوں کا نور لے گیا، ان کے اپنی صورت پر باقی رہنے کے ساتھ ساتھ۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر طمس کیا تو انھوں نے رسولوں کو نہ دیکھا، چنانچہ واپس لوٹ گئے۔[3]

﴿ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴾ یعنی پھر ہم نے فرشتوں کی زبان پر ان سے کہا، یا بنا بر ظاہر حال یہ کہا: "ذُوْقُوْا" یعنی تم میرا عذاب اور میرا ڈرانا چکھو۔ اس حکم سے مراد خبر ہے۔ "أَيْ: أَذَقْتُهُمْ" یعنی میں نے ان کو اپنا عذاب چکھایا۔ ﴿ نُذُرِ ﴾ سے مراد وہ عذاب ہے جس سے لوط علیہ السلام نے ان کو ڈرایا۔ ﴿ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً ﴾ یعنی البتہ تحقیق آیا ان کو غیر معین دن میں صبح کے وقت۔ ﴿ عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴾ یعنی ایک ایسا عذاب جو ان پر مستقر اور دائم ہونے والا تھا جو ان سے مفارق و منفک (دور) نہیں ہوگا، یہاں تک کہ ان کو آخرت کے عذاب کی طرف پہنچا دے گا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ ہر قصے میں جو اس کی تکرار کی گئی ہے تو اس سے اس بات کی خبر دینا منظور ہے کہ ہر رسول کی تکذیب کا تقاضا یہ ہے کہ عذاب نازل ہو۔ اور ہر قصے کا سننا نصیحت پذیر ہونے کی طرف دعوت دینا ہے اور نئے سرے سے تنبیہ اور ایقاظ (بیدار کرنا) کا شروع کرنا ہے، تاکہ ان پر سہو اور غفلت غالب نہ ہو جائے۔ اسی طرح قولہ تعالیٰ: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ [الرحمن: ۱۳] "پس (اے انسانو اور جنو!) تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔" نیز اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ [المرسلات: ۱۵] "اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے۔" کا بار بار ذکر کرنا ہے اور اسی طرح ان جیسے اور مکرر کلمات کا حال ہے۔

---

[1] رقم الآية (۲۳) [2] مختار الصحاح (۴۰۳/۱) [3] تفسير البغوي (۴۳۳/۷)

اس سورت میں جو یہ مکرر فرمایا ہے کہ ہم نے قرآن کو سوچنے کے لیے آسان کر دیا تو شاید اس کی وجہ اس بات سے آگاہ کرنا ہو کہ یہ ایک عظیم منت و احسان ہے، کسی کو لائق نہیں کہ اس کا شکر کرنے سے غافل ہو۔ پھر اللہ پاک نے فرعون کی قوم کی تکذیب کا ذکر فرمایا:[1]

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾

اور بلاشبہ یقیناً آلِ فرعون کے پاس (بھی) ڈرانے والے آئے (41) انھوں نے ہماری سب نشانیاں جھٹلائیں، تو ہم نے انھیں ایک زبردست قدرت والے کے پکڑنے کی طرح پکڑ لیا (42) (اے اہلِ عرب!) کیا تمھارے کافر ان (کافروں) سے بہتر ہیں، یا تمھارے لیے (سابقہ) صحیفوں میں کوئی نجات (لکھی ہوئی) ہے؟ (43) کیا وہ (مشرکین) کہتے ہیں کہ ہم بدلے لینے والی جماعت ہیں (44) عن قریب وہ جماعت شکست کھائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے (45) بلکہ قیامت ان کے وعدے کا وقت ہے اور قیامت بہت بڑی آفت اور نہایت تلخ ہے (46)

آلِ فرعون کا قصہ اور قریش کی سرزنش:

اللہ پاک فرعون کی اور اس کی قوم کی خبر دیتا ہے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے رسول موسیٰ اور ہارون علیہما السلام بشارت لے کر آئے اگر وہ ایمان لائیں، اور نذرات (ڈرانے کی چیزیں) لے کر آئے اگر وہ کفر کریں۔ اور بڑے بڑے معجزوں کی متعدد نشانیوں سے ان کی تائید کی، چنانچہ انھوں نے سب نشانیوں کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر ڈالا، ان میں سے نہ کوئی خبر دینے والا باقی رہا اور نہ عین واثر (یعنی چشم دید گواہ یا کوئی ساتھی)۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴾ یعنی او قریش کے مشرکو! کیا تم ان سے بہتر ہو جن کا ذکر ہو چکا ہے ان میں سے جو اس سبب سے ہلاک کر دیے گئے کہ انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی اور وہ کتابوں کے منکر ہوئے۔ کیا تم بہتر ہو یا وہ؟ کیا تمھارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی چٹھی ہے کہ تم کو کوئی عذاب اور سزا نہ پہنچے گی۔

[1] فتح البیان (۱۳/۳۰۲-۳۰۴)

پھر اللہ سبحانہ نے ان کی طرف سے خبر دی: ﴿ اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴾ یعنی کیا وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ان کی جمعیت اس شخص کے لیے کافی ہوگی جو ان سے کسی برائی کا ارادہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾ یعنی عن قریب ان کی جمعیت متفرق ہو جائے گی اور وہ مغلوب ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے دن اپنے ایک خیمے میں تھے: اے اللہ! میں تجھے تیرے عہد کی اور وعدے کی قسم دیتا ہوں، اگر تو چاہے کہ تو نہ پوجا جائے آج کے بعد کبھی بھی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ کو کافی ہے، آپ نے اپنے رب پر الحاح کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم زرہ میں جست کرتے تھے اور فرماتے جاتے تھے: ﴿ سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾۔[1] (أخرجه البخاري و كذا رواه والنسائي في غير موضع من حديث خالد وهو ابن مهران الحذاء به)

امام عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب ﴿ سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾ نازل ہوئی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "أَيُّ جَمْعٍ يُهْزَمُ"، یعنی کون سی جمعیت مغلوب ہوگی؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر جب بدر کا دن ہوا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ زرہ سے جست کرتے تھے اور فرماتے تھے: ﴿ سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾ چنانچہ میں نے اس دن اس کی تاویل پہچانی۔[2] (أخرجه ابن أبي حاتم) یوسف بن مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ام المومنین کے پاس تھا تو فرمایا کہ یہ آیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں نازل ہوئی اور میں ایک لڑکی تھی کھیل رہی تھی۔ ﴿ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴾۔[3] (هكذا رواه البخاري ههنا مختصرا و رواه في فضائل القرآن مطولا ولم يخرجه مسلم كذا في ابن كثير)

﴿ نُذُرِ ﴾ یا تو مصدر ہے بہ معنی "إنذار" کما تقدم۔ یا جمع ہے "نَذِيْرٌ" بہ معنی "مُنْذِرٌ" کی۔ یہ وہی نو نشانیاں ہیں جن کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ڈرایا۔ یہ قول زیادہ بہتر ہے بہ وجہ اس آیت کے: ﴿ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا ﴾ کیونکہ یہ اس کا بیان ہے۔ ان سے مراد وہی نو نشانیاں ہیں جن کا ذکر گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ نُذُرِ ﴾ سے مراد موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ہیں اور ان کے سوا اور انبیاء علیہم السلام ہیں، یعنی البتہ آیا فرعون والوں کو ڈرانا، یا آئے ان کو ڈرانے والے امور، یا ڈرانے والے رسول تو وہ ایمان نہ لائے، بلکہ ہماری ساری آیتوں کی تکذیب کی۔ چنانچہ ہم نے ان کو عذاب کے ساتھ پکڑا اس شخص کے پکڑنے کی طرح جو اپنے انتقام میں قوی اور غالب ہے اور ان کے ہلاک کرنے پر قادر ہے جس کو کوئی شے عاجز نہیں کرتی۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٥٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٧٧)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٢١) تفسير الطبري (٢٢/٦٠٢) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٩٥، ٤٧٠٧) تفسير ابن كثير (٤/٣٣٨، ٣٣٩)

پھر اللہ پاک نے کفارِ مکہ کو ڈرایا، چنانچہ فرمایا: کیا تمھارے کفار ان کفار سے بہتر ہیں۔ یہ استفہام انکاری بہ معنی نفی ہے، یعنی او مکے والو! یا او عرب کے گروہ! تمھارے کفار اگلی اُمتوں کے کفار سے بہتر نہیں ہیں جو کفر کی وجہ سے ہلاک کر دیے گئے۔ پھر تم عذاب سے بچ جانے کا طمع کیوں کرتے ہو، حالانکہ تم تو ان سے بدتر ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمھارے کفار قومِ نوح اور قومِ لوط علیہما السلام سے بہتر نہیں ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ قومِ عاد، ثمود، فرعون اور اس کی قوم سے بہتر نہیں ہیں۔

پھر اللہ پاک نے اس سے اضراب کیا (دوسری طرف پھرنا) اور بہ وجہ دیگر ان کے عاجز کرنے کی طرف انتقال کیا (یعنی کلام کو منتقل کیا)۔ یہ وجہ پہلی توبیخ سے زیادہ سخت ہے۔ چنانچہ فرمایا: کیا تمھارے لیے کوئی براءت، یعنی ان کتابوں میں کوئی فارغ خطی ہے جو انبیاء علیہم السلام پر اتاری گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے نبیوں کی کتابوں میں سے کسی کتاب میں ان کے لیے عذاب سے خلاصی نہیں ہے۔ جب بات ایسے ہے تو پھر نبی اور قرآن کی تکذیب کیوں کرتے ہو اور شرک اور کفر پر کیوں جمے ہوئے ہو۔

پھر اس سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ سے ہٹ کر بہ وجہ دیگر ایک اور سرزنش کی طرف انتقال کیا اور فرمایا: وہ کہتے ہیں: ﴿ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴾ یعنی ہم ایک ایسی جماعت ہیں کہ ہماری تعداد کی کثرت اور قوت کی وجہ سے کوئی ہمارے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا، یا یہ معنی ہیں کہ ہمارا کام مجتمع ہے ہم مغلوب نہ ہوں گے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "نَحْنُ جَمِيعٌ أَمْرُنَا نَنْتَصِرُ مِنْ أَعْدَائِنَا وَلَا نُرَامُ وَلَا نُضَامُ"[2] یعنی ہمارا کام مجتمع ہے، ہم اپنے دشمنوں سے بدلہ لیتے ہیں اور ہماری قوت اور شوکت کی وجہ سے کوئی ہم سے مقابلے کا قصد نہیں کرتا اور نہ ہم پر جور و ظلم کر سکتا ہے۔ لفظ ﴿ جَمِيْعٌ ﴾ کے اعتبار سے اور رؤسِ آیات کی موافقت سے ﴿ مُنْتَصِرٌ ﴾ کو صیغۂ واحد ذکر کیا ہے۔ یا یہ معنی لے لو کہ "نَحْنُ كُلُّ وَاحِدٍ مِنَّا مُنْتَصِرٌ"، یعنی ہم میں سے ہر ایک بدلہ لینے والا ہے۔

چنانچہ اللہ پاک نے اس قول کا یوں رد فرمایا: ﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾ یعنی کفارِ مکہ کا گروہ عن قریب ہزیمت دیا جائے گا یا علی العموم کفارِ عرب کا گروہ ہزیمت دیا جائے گا اور وہ پیٹھ دے کر بھاگیں گے۔ اللہ پاک نے بدر کے دن ان کو ہزیمت دی اور وہ پیٹھ دے کر بھاگے اور شرک کے سردار اور کفر کے عمائد قتل کیے گئے۔ فللہ الحمد۔ یہ بات علاماتِ نبوت میں سے ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ بدر کے دن تھا۔ انھوں نے کہا: ﴿ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴾ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

جمہور نے ﴿ سَيُهْزَمُ ﴾ بہ یائے تحتیہ بہ صیغۂ مجہول پڑھا اور کسی نے (یعنی ورش عن یعقوب نے)

---

[1] تفسیر الطبري (٦٠١/٢٢) [2] تفسیر البغوي (٤٣٣/٧) فتح البیان (٣٠٥/١٣) [3] تفسیر الطبري (٦٠٣/٢٢)

"سنھزم" بہ نون و کسرِ زائے و نصب "اَلْجَمْعَ" پڑھا ہے۔ اور کسی نے (یعنی امام ابو حیوہ اور ابن ابی عبلہ نے بہ یائے تحتیہ بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور کسی نے بہ تائے فوقیہ بنا بر خطاب بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ ﴿ يُوَلُّوْنَ ﴾ کو جمہور نے بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی عیسیٰ، ابن ابی اسحاق اور ورش عن یعقوب نے) بہ تائے فوقیہ بنا بر خطاب پڑھا ہے۔[1] ﴿ اَلدُّبُرَ ﴾ سے مراد جنس ہے اور وہ "إدبار" کے معنی میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ رؤسِ آیات کی وجہ سے واحد لایا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مفرد لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ پیٹھ دینے اور ہزیمت کھانے میں نفسِ واحد کی طرح ہیں، چنانچہ ہزیمت سے کوئی پیچھے نہ رہے گا اور نہ لڑائی کے لیے ثابت قدم رہے گا۔ چنانچہ وہ اس بات میں ایک شخص کی طرح ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ ﴾ یعنی بدر کے بعد قیامت کا دن ان کے اخروی عذاب کے وعدے کا وقت ہے اور دنیا میں قتل و قید و قہر کا ہونے والا عذاب وہ پورا عذاب نہیں ہے جس کا ان کو وعدہ دیا گیا ہے۔ یہ تو صرف ایک مقدمہ ہے اس کے مقدمات سے اور ایک طلیعہ ہے، یعنی ایک قطعۂ لشکر جو لشکر کے آگے چلتا ہے جاسوسی کے لیے، اس کے طلائع سے۔ اسی لیے یوں فرمایا ﴿ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴾ یعنی قیامت کا عذاب بڑا ہے ضرر میں، سخت تر ہے موقفِ بدر سے اور بہت زیادہ تلخ ہے عذابِ دنیا سے ﴿ اَدْهٰى ﴾ "دھاء" سے ماخوذ ہے بہ معنی نکر وفظاعہ ہے، یعنی شدید اور ہولناک امر ہے جو نہ پہچانا ہوا ہے۔ "يُقَالُ دَهَاهُ أَمْرُ كَذَا أَيْ: أَصَابَهُ دَهْوًا وَدَهْيًا وَالدَّاهِيَةُ: اَلْأَمْرُ الْمُنْكَرُ الَّذِيْ لَا يُهْتَدَى لِدَوَائِهِ" دَهِيَ أَدْهَى نہ فرمایا، بلکہ مقامِ ضمیر میں اسم ظاہر رکھا، اس سے قیامت کی ہولناکی کو زیادہ ظاہر کرنا منظور ہے۔[2] (كذا في فتح البيان)

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝۴۷ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝۴۸ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝۴۹ وَمَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝۵۰ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَاۤ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۵۱ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۝۵۲ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝۵۳ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝۵۴ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۵۵

بلاشبہ مجرمین گمراہی اور دیوانگی میں (پڑے) ہیں⑰ جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے (کہا جائے گا:) تم جہنم (کے عذاب) کا چھونا چکھو⑱ بلاشبہ ہم نے ہر

---

(1) تفسير القرطبي (١٤٥/١٧) (2) فتح البيان (٣٠٤/١٣۔٣٠٦)

چیز ایک مقرر اندازے کے مطابق پیدا کی ہے﴿49﴾ اور ہمارا حکم تو آنکھ جھپکنے کی طرح ایک (کلمہ) ہی ہوتا ہے﴿50﴾ اور (اے اہلِ عرب!) بلاشبہہ یقیناً ہم (پہلے) تم جیسوں کو ہلاک کر چکے ہیں، پھر کیا کوئی نصیحت پکڑنے والا ہے؟﴿51﴾ اور جو کچھ انھوں نے کیا ہے، وہ صحیفوں میں (درج) ہے﴿52﴾ اور ہر چھوٹا بڑا (عمل لوحِ محفوظ میں) لکھا ہوا ہے﴿53﴾ بلاشبہہ متقین باغات اور نہروں میں ہوں گے﴿54﴾ حقیقی عزت کی جگہ ہر طرح کی قدرت والے بادشاہ کے نزدیک﴿55﴾

مجرموں کا انجامِ بد:

اللہ تعالیٰ مجرموں کو خبر دیتا ہے کہ وہ حق سے گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں اور ان شکوک کی بنا پر جن میں وہ ہیں اور رایوں کے اضطراب کی وجہ سے سودائی ہو رہے ہیں۔ یہ بات ہر کافر کو اور سارے فرقوں میں سے ہر مبتدع کو شامل ہے جس میں یہ وصف موجود ہے۔ پھر فرمایا: جس دن آگ میں اوندھے منہ گھسیٹے جائیں گے، یعنی جیسے وہ سعر واضطراب و تردد میں تھے، اس نے ان کو آگ کا وارث بنایا اور جیسے وہ گمراہ تھے، اس میں اپنے منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے، وہ نہیں جانیں گے کہ کہاں جاتے ہیں اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے ان سے کہا جائے گا کہ آگ کا مزہ چکھو۔ انتہی[1]

تقدیرِ الٰہی کا ذکر:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴾ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴾ [الفرقان: ۲] ''اور ہر چیز کو اس نے پیدا کر کے ایک مناسب اندازہ ٹھہرا دیا ہے۔'' اور اس قول کی طرح ہے: ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ﴾ [الأعلیٰ: ۱۔ ۳] ''اپنے بہت ہی بلند اللہ کے نام کی پاکیزگی بیان کر جس نے پیدا کیا اور صحیح سالم بنایا اور جس نے (ٹھیک ٹھاک) اندازہ کیا اور پھر سیدھی راہ دکھائی۔'' یعنی اس نے تقدیر مقدر کی اور خلائق کو اس کی طرف راہ بتائی اور اسی لیے ائمۂ سنت اس آیتِ کریمہ سے اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اس کی خلق کے لیے پہلے سے مقرر ہو چکی ہے اور وہ اس طرح سے ہے کہ وہ اشیاء کے ہونے سے پہلے ان کو جانتا ہے اور ان کے پختہ ہونے سے پہلے ان کو لکھ دیتا ہے۔

اس آیت سے اور اس جیسی اور آیات سے اور ان معنی میں جو احادیثِ ثابتہ وارد ہوئی ہیں ان سب سے فرقۂ قدریہ پر رد کیا ہے جو عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے آخر میں نکلا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ مقام اور اس میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں، ان پر ہم نے کتاب الایمان صحیح بخاری کی شرح میں مفصل کلام کیا ہے۔ یہاں وہ احادیث ذکر کرتے ہیں جو اس آیتِ کریمہ سے متعلق ہیں:

① سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مشرکینِ قریش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقدیر کے بارے میں

جھگڑتے تھے، اس پر یہ آیت: ﴿ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿48﴾ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴾ نازل ہوئی۔[1]

2 عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کہتے ہیں کہ نہیں اتریں یہ آیتیں: ﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿47﴾ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿48﴾ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴾ مگر اہلِ قدر میں۔[2] (أخرجه البزار)

3 زرارہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿48﴾ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴾ اور فرمایا کہ یہ میری امت کے کچھ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو آخر زمانے میں ہوں گے اور اللہ کی تقدیر کی تکذیب کریں گے۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

4 امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور وہ زمزم سے پانی کے ڈول کھینچ رہے تھے اور ان کے نیچے کے کپڑے تر ہو گئے تو میں نے ان سے کہا کہ تحقیق قدر کے متعلق کلام کیا گیا تو فرمایا: کیا انھوں نے اس کو کیا؟ میں نے کہا: ہاں! چنانچہ فرمایا: اللہ کی قسم! نہیں اتری یہ آیت مگر ان کے حق میں: ﴿ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿48﴾ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴾ وہ لوگ اس امت کے بدترین لوگ ہیں سو تم ان کے بیماروں کی عیادت مت کرو اور ان کے مردوں پر نماز مت پڑھو، اگر میں ان میں سے کسی کو دیکھوں تو اس کی دونوں آنکھیں اپنی ان دو انگلیوں سے پھوڑ ڈالوں۔[4] (رواه ابن أبي حاتم وقد رواه الإمام أحمد من وجه آخر وفيه مرفوع)

5 محمد بن عبید مکی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ ان سے کہا گیا کہ ایک شخص نے ہم پر قدوم کیا ہے، وہ قدر کی تکذیب کرتا ہے تو فرمایا کہ تم مجھے اس کو بتاؤ اور آپ نابینا تھے۔ لوگوں نے کہا: ابو عباس! آپ اس کو کیا کریں گے؟ فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، البتہ اگر میں نے اس پر قابو پایا تو البتہ میں اس کی ناک کاٹ کھاؤں گا، یہاں تک کہ اسے کاٹ ڈالوں گا اور البتہ اگر اس کی گردن میرے ہاتھ میں پڑ جائے گی تو البتہ اس کو توڑ ڈالوں گا۔ بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: "كَأَنِّي بِنِسَاءِ بَنِي فِهْرٍ يَطُفْنَ بِالْخَزْرَجِ تَصْطَفِقُ أَلْيَاتُهُنَّ مُشْرِكَاتٍ" یہ اس امت کا پہلا شرک ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان البتہ ہے! ان کو ان کی سوء رائے (برے خیالات) لے کر ایسے مقام پر پہنچیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اس سے نکالیں گے کہ وہ ایسا ہو کہ اس نے مقدر کی ہو کوئی خیر جیسا

---

1 صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٦) مسند أحمد (٤٤٤/٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٧) سنن ابن ماجه (٨٣)

2 مسند البزار (٤٣٦/٦) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو "جید" کہا ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٣٩)

3 تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢١/١٠) المعجم الكبير (٢٧٦/٥) السلسلة الصحيحة (١٥٣٩) 4 تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢١/١٠)

کہ اس کو اس سے نکالا کہ اس نے کسی شر کو مقدر کیا ہو۔[1] (ثم رواه أحمد عن أبي المغيرة عن الأوزاعي عن العلاء ابن الحجاج عن محمد بن عبيد فذكره مثله لم يخرجوه)

6 امام نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک دوست تھا، اہلِ شام میں اس کے ساتھ خط کتابت کرتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کی طرف لکھا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تو نے قدر کے بارے میں کسی شے کے متعلق گفتگو کی ہے، چنانچہ تو اس سے ڈر کہ میری طرف لکھے، بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے، فرماتے تھے: عن قریب میری اُمت میں ایسی قومیں ہوں گی جو قدر کی تکذیب کریں گے۔[2] (رواه الإمام أحمد ورواه أبو داوٗد عن أحمد بن حنبل به)

7 عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر امت کے لیے ایک مجوس ہیں اور میری امت کے مجوس وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ قدر نہیں ہے۔ اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت مت کرو اور اگر وہ مر جائیں تو ان کے جنازے میں حاضر نہ ہو۔[3] (أخرجه الإمام أحمد. ولم يخرجه أحد من أصحاب الكتب الستة من هذا الوجه)

8 امام نافع عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے کہ اس امت میں مسخ ہوگا، خبردار! اور وہ تقدیر کے مکذبین میں ہے اور زندیقیہ میں۔[4] (أخرجه الإمام أحمد ورواه الترمذي و ابن ماجه من حديث أبي صخر حميد بن زياد به وقال الترمذي: حسن صحيح غريب)

9 طاؤس یمانی کہتے ہیں: میں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سنا، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ہر شے قدر کے ساتھ ہے، یہاں تک کہ عجز و کیس (عاجزی و عقلمندی)۔[5] (أخرجه الإمام أحمد ورواه مسلم متفردا به من حديث مالك)

10 صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مدد مانگ اور عاجز مت ہو، پھر اگر کوئی امر پہنچے تو کہہ « قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ » یعنی اللہ نے مقدر کیا اور جو چاہا وہ کیا اور ایسا مت کہہ: اگر میں ایسے کرتا تو البتہ ایسا ہوتا، بے شک "لو" شیطان کے عمل دخل کو کھولتا ہے۔[6]

11 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تو جان رکھ کہ امت اگر اس بات پر جمع ہوں کہ تجھے کسی شے کے ساتھ نفع پہنچائیں جس کو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے نہیں لکھا ہوا تو

---

1 مسند أحمد (٣٣٠/١) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

2 مسند أحمد (٩٠/٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢١٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٦٦٩)

3 مسند أحمد (٨٦/٢) اس کی سند میں عمر بن عبداللہ مولیٰ غفرہ" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٥٧١٤)

4 مسند أحمد (١٠٨/٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٦١) اس کی سند میں "رشدین بن سعد" ضعیف راوی ہے۔

5 صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٥) مسند أحمد (١١٠/٢) 6 صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٤)

وہ تجھے نفع نہیں پہنچائیں گے اور اگر وہ اس بات پر جمع ہوں کہ تجھے ضرر پہنچائیں کسی شے کے ساتھ جس کو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے نہیں لکھا تو وہ تجھے ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔ قلم سوکھ گئے اور صحیفے لپیٹ دیے گئے۔[1]

12 عبادہ بن ولید بن عبادہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے حدیث بیان کی، کہا: میں عبادہ پر داخل ہوا اور وہ بیمار تھے اور میں خیال کرتا تھا کہ ان کو موت آنے والی ہے تو میں نے کہا کہ میرے ابا جان! مجھے وصیت کریں اور میرے لیے کوشش کریں تو کہا: مجھے بٹھاؤ، پھر جب ان کو بٹھایا تو کہا: او میرے بیٹے! تو ایمان کا مزہ نہ پائے گا اور علم باللہ کی اصل حقیقت تک نہ پہنچے گا، یہاں تک کہ تو تقدیر پر ایمان لائے اس کی خیر اور شر میں۔ میں نے کہا: ابا جان! میں کیسے جان لوں کہ تقدیر کی خیر اور اس کا شر کیا ہے؟ کہا کہ تو یہ جانے کہ جو شے تجھ سے چوک گئی نہیں ہے وہ کہ تجھے پہنچے اور جو شے تجھے پہنچی نہیں ہے وہ کہ تجھ سے چوک جائے۔ او میرے بیٹے! بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ فرماتے تھے کہ پہلی جو شے اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ قلم ہے۔ پھر اس سے فرمایا کہ لکھ تو وہ چلا اس گھڑی میں اور قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے وہ لکھ دیا۔ اے میرے بیٹے! اگر تو مرا اور تو اس عقیدے پر نہیں ہے تو تو آگ میں داخل ہوا۔[2] (رواه الإمام أحمد، و رواه الترمذي عن يحيى بن موسى البلخي عن أبي داود الطيالسي عن عبد الواحد بن سليم عن عطاء بن أبي رباح عن الوليد بن عبادة عن أبيه به وقال: حسن صحيح غريب)

13 سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ''نہیں ایمان لائے گا کوئی یہاں تک کہ چار چیزوں پر ایمان لائے: گواہی دے اس بات کی کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور اس بات کی گواہی دے کہ بے شک میں اللہ کا رسول ہوں، اس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے اور ایمان لائے بعث بعد الموت پر اور ایمان لائے قدر پر اس کی خیر اور شر کا۔''[3] (وكذا رواه الترمذي من حديث النضر بن شميل عن شعبة عن منصور عن ربعي عن علي فذكره وقال: هذا عندي أصح و كذا رواه ابن ماجه من حديث شريك عن منصور عن ربعي عن علي).

14 صحیح مسلم میں عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما مرفوعاً ثابت ہوا ہے کہ اللہ نے مقادیرِ خلائق کو لکھا پچاس ہزار سال قبل اس کے کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرے۔ وہب نے اتنا اضافہ کیا: اور تھا اس کا عرش پانی پر۔[4] (ورواه الترمذي وقال: حسن صحيح غريب)

---

1. مسند أحمد (٢٩٣/١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٥٧)
2. مسند أحمد (٣١٧/٥) سنن الترمذي (٣٣١٩) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة (٢٤٣٩)
3. سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٥٨٤)
4. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٦)

حکم الٰہی نافذ ہو کر ہی رہنا والا ہے:

پھر اللہ پاک نے مخلوق میں اپنی نفوذِ مشیت کی خبر دی جس طرح کہ ان میں اپنی نفوذِ قدر کی خبر دی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ ﴾ یعنی ہم جو کسی شے کا حکم کرتے ہیں تو صرف ایک بار دیتے ہیں۔ دوسری دفعہ کی تاکید کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، چنانچہ جس شے کا ہم نے حکم دے دیا وہ حاصل وموجود ہو جاتی ہے، جیسے آنکھ جھپکنے میں تاخیر نہیں کرتی۔ بعض شعراء نے کیا خوب کہا ہے:

إِذَا مَا أَرَادَ اللّٰهُ أَمْرًا فَإِنَّمَا ... يَقُوْلُ لَهُ كُنْ قَوْلَةً فَيَكُوْنُ

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ ﴾ یعنی البتہ مقرر تمھاری طرح کے پہلی امتوں کے لوگ جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہم ان کو ہلاک کر چکے ہیں پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا اس عذاب سے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو رسوا کیا اور ان کے لیے مقدر فرمایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ﴾ [سباء: ۲] ''اور ان کے اور ان چیزوں کے درمیان جنھیں وہ چاہتے ہیں، آڑ حائل کر دی جائے گی، جیسے اس سے پہلے ان جیسوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴾ یعنی ہر شے جو انھوں نے کی وہ ان پر ان کتابوں میں لکھی ہوئی ہے جو ملائکہ کے ہاتھوں میں ہیں۔ ﴿ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴾ یعنی ان کے اعمال میں سے ہر چھوٹا بڑا عمل ان پر جمع کیا ہوا ہے، ان کے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے، وہ نہیں چھوڑتا کسی چھوٹے کو اور نہ کسی بڑے کو، مگر اس کا شمار کر لیا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: اے عائشہ! تو محقراتِ ذنوب سے بچ، بے شک ان کے لیے اللہ کی طرف سے ایک طالب ہے۔[1] (أخرجه الإمام أحمد ورواه النسائي وابن ماجه من طريق سعيد بن مسلم بن ماهك المدني وثقه أحمد وابن معين وأبو حاتم وغيرهم وقد رواه الحافظ ابن عساكر في ترجمة سعيد ابن مسلم هذا من وجه آخر)۔ پھر سعید نے کہا: چنانچہ میں نے یہ حدیث عامر بن ہشام سے بیان کی تو مجھ سے کہا: خرابی ہو تیری او سعید بن مسلم! البتہ تحقیق حدیث بیان کی مجھ کو سلیمان بن مغیرہ نے کہ اس نے کوئی گناہ کیا تو اس کو چھوٹا سمجھا، چنانچہ اس کے خواب میں ایک آنے والا آیا اور کہا: اے سلیمان!

لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الذُّنُوْبِ صَغِيْرًا ... إِنَّ الصَّغِيْرَ غَدًا يَعُوْدُ كَبِيْرًا
إِنَّ الصَّغِيْرَ وَلَوْ تَقَادَمَ عَهْدُهُ ... عِنْدَ الْإِلٰهِ مُسَطَّرٌ تَسْطِيْرًا
فَازْجُرْ هَوَاكَ عِنْدَ الْبِطَالَةِ لَا تَكُنْ ... صَعْبَ الْقِيَادِ وَشَمِّرَنْ تَشْمِيْرًا
إِنَّ الْمُحِبَّ إِذَا أَحَبَّ إِلٰهَهُ ... طَارَ الْفُؤَادُ وَأُلْهِمَ التَّفْكِيْرًا
فَاسْأَلْ هِدَايَتَكَ الْإِلٰهَ فَتَتَّئِدْ ... فَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا[2]

---

[1] مسند أحمد (۷۰/۶) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۴۲۴۳) السلسلة الصحيحة (۵۱۳) [2] تاريخ دمشق (۳۰۰/۲۱، ۳۰۱)

[چھوٹے گناہوں کو حقیر نہ سمجھ، چھوٹے گناہ کل کو بڑے بن جائیں گے، گو گناہ چھوٹے چھوٹے ہوں اور انھیں کیے ہوئے بھی عرصہ گزر چکا ہو، اللہ تعالیٰ کے پاس وہ صاف صاف لکھے ہوئے موجود ہیں۔ بدی سے اپنے نفس کو روکے رکھ اور ایسا نہ ہو کہ مشکل سے نیکی کی طرف آئے، بلکہ اونچا دامن کر کے بھلائی کی طرف لپک۔ جب کوئی شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو اس کا دل اڑنے لگتا ہے۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے غور وفکر کرنے کی عادت الہام کی جاتی ہے۔ اپنے رب تعالیٰ سے ہدایت طلب کر اور نرمی و ملائمت کر، ہدایت ونصرت کرنے والا رب تعالیٰ تجھے کافی ہوگا]

پرہیز گاروں کا اچھا انجام:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴾ یعنی اللہ سے ڈرنے والے باغوں میں اور نہروں میں ہیں۔ برخلاف اس کے جس میں بدبخت لوگ ہیں ضلال وسعر میں اور نار کے اندر ان کے منہ کے بل زجر وتوبیخ اور دھمکیوں کے ساتھ گھسیٹے جانے میں۔ ﴿ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے دارِ کرامت و رضوان وفضل وامتنان میں اور اس کی سخاوت، یعنی عطا واحسان میں۔

﴿ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴾ یعنی بڑے بادشاہ کے نزدیک جو اشیاء کا خالق ہے اور ان کا مقدر ہے اور قدرت رکھنے والا ہے اس شے پر جس کو چاہتا ہے ان اشیاء میں سے جن کو لوگ طلب کرتے ہیں اور چاہتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں کہ مقسطین اللہ تعالیٰ کے نزدیک رحمان کے سیدھے ہاتھ کی طرف نور کے منبروں پر ہیں اور اللہ کے دونوں ہاتھ سیدھے ہیں۔ مقسطین وہ لوگ ہیں جو اپنے حکم اور فیصلوں میں عدل کرتے ہیں اور اپنے گھر والوں میں اور اس میں جس کے وہ والی ہوئے۔[1] (أخرجه الإمام أحمد وانفرد بإخراجه مسلم والنسائي من حديث سفيان بن عيينة بإسناده مثله. آخر تفسير سورة اقتربت ولله الحمد والمنة وبه التوفيق والعصمة كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ بے شک مشرکین جانے میں اور دوری میں ہیں حق سے اور آگ میں ہیں جو ان پر دھکائی جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ گمراہی کے اندر ہیں دنیا میں اور آخرت میں دھکائی ہوئی آگ کے اندر ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ راہِ جنت سے گمراہی میں ہیں اور آخرت کے عذاب میں ہیں، یا ہلاکت میں ہیں اور آگوں کے اندر ہیں آخرت میں۔ ﴿ سُعُرٍ ﴾ کی تفسیر اسی سورت کے شروع میں گزر چکی ہے،[2] اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] صحيح مسلم (١٨٢٧) سنن النسائي (٥٣٧٩) مسند أحمد (١٦٠/٢) تفسير ابن كثير (٣٣٩/٤_٣٤٢) [2] رقم الآية (٢٤)

﴿ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴾ ظرف ہے ماقبل کا، یعنی مجرمین ضلال وسعر میں ہیں جس دن کہ آگ میں اپنے منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے، یا ظرف ہے قول کا جو اس کے بعد مقدر ہے۔ "أَيْ: يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ يُقَالُ لَهُمْ" یعنی جس دن گھسیٹے جائیں گے، اس دن ان سے کہا جائے گا: ﴿ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴾ یعنی تم اس کی گرمی اور اس کے عذاب کی شدت کو کھینچو۔ یہ عرب کے اس قول کی طرح ہے: "وَجَدَ مَسَّ الْحُمّٰى وَذَاقَ طَعْمَ الضَّرْبِ" یعنی تپ کی گرمی پائی اور مار کا مزہ چکھا۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَسَّ سَقَرَ ﴾ مجاز ہے اصابتِ نار سے سببیت کے لحاظ سے۔ تقریر کشاف سے یہ ظاہر ہے کہ استعارہ بالکنایہ کے باب سے ہے۔ ﴿ سَقَرَ ﴾ نام ہے جہنم کا، غیر منصرف ہے بہ سبب تانیث وتعریف کے، ماخوذ ہے: "سَقَرَتْهُ النَّارُ إِذَا لَوَّحَتْهُ" سے۔[1]

﴿ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴾ یعنی اللہ پاک نے ہر شے کو اشیاء میں سے پیدا کیا اس حال میں کہ متلبس ہے تقدیر کے ساتھ جس کو اس نے مقدر کیا اور قضا کے ساتھ جس کو اس نے قضا کیا، جو اس کے علم میں سابق ہوئی اور لوحِ محفوظ میں اس کے واقع ہونے سے پہلے ہی لکھی گئی۔ "قدر" بہ معنی تقدیر ہے۔ جمہور نے بہ نصبِ ﴿ كُلَّ ﴾ پڑھا ہے بنا بر اشتغال اور امام ابو السماک رحمہ اللہ نے بہ رفع پڑھا ہے۔[2] لوگوں نے نصب کو ترجیح دی ہے، بلکہ بعض نے اس کو واجب کیا ہے، کہا: اس لیے کہ رفع موہم ہے اس شے کا جو قواعدِ اہلِ سنت کی بنا پر جائز نہیں، یعنی جب ﴿ كُلُّ شَيْءٍ ﴾ مرفوع ہوگا تو مبتداء ٹھہرے گا اور "خَلَقْنَا" ﴿ كُلَّ ﴾ کی یا ﴿ شَيْءٍ ﴾ کی صفت ہوگی اور ﴿ بِقَدَرٍ ﴾ اس کی خبر ہوگی اور اب اس کا ایک مفہوم ہوگا جو غور کرنے والے پر مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ لازم آئے گا کہ وہاں ایک ایسی شے ہو جو نہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور نہ قدر کے ساتھ ہے۔ بعض نے اسی طرح اس کی تقریر کی ہے۔

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نصب صرف اس لیے اولیٰ ہوا کہ وہ عمومِ خلق پر دال ہے اور رفع اس کے عموم پر دال نہیں ہے، بلکہ اس کو مفید ہے کہ ہر شے جو مخلوق ہے وہ قدر کے ساتھ ہے[3] اور ﴿ كُلَّ ﴾ کا نصب جو عموم پر دال ہے تو صرف اس لیے کہ تقدیر یہ ہے: "إِنَّا خَلَقْنَا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ"۔ چنانچہ ﴿ خَلَقْنٰهُ ﴾ تاکید و تفسیر ہے، "خلقنا" مضمر کی جو ناصب ہے "كُلَّ شَيْءٍ" کا۔ چنانچہ یہ لفظ عام ہے عام ہوتا ہے ساری مخلوقات کو۔ اس جگہ سمین کا ایک مفصل کلام ہے، اس کی تطویل کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ﴿ بِقَدَرٍ ﴾ کے بارے میں صحیح اور ضعیف حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ایک حدیث جو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے یہ ہے: "تم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا یہاں تک کہ تقدیر کے ساتھ ایمان لائے۔"[4] (أخرجه الترمذي و استغربه)

[1] الكشاف (٤/٤٤٠) [2] تفسير القرطبي (١٧/٣٠٧) [3] التبيان في إعراب القرآن (٢/١١٩٢)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٥٨٥)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جان رکھو کہ اہلِ حق کا مذہب تقدیر کا اثبات ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو پہلے سے مقدر کیا اور اللہ پاک نے یہ جان لیا کہ وہ آیندہ ان وقتوں میں واقع ہوں گے جو اللہ کے نزدیک معلوم ہیں اور مخصوص صفت پر واقع ہوں گے۔ پس اشیاء واقع ہوتی ہیں، اس کے مطابق جو اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا ہے۔ فرقہ قدریہ نے اس کا انکار کیا اور یہ زعم کیا کہ اللہ پاک نے ان کو مقدر نہیں کیا اور نہ اس کو ان کا پہلے سے علم تھا اور وہ مستانفۃ العلم ہیں، یعنی اللہ پاک جو ان کو جانتا ہے تو صرف ان کے واقع ہونے کے بعد، اور جھوٹ بولے اللہ پاک پر۔ اللہ تعالیٰ ان کی باطل باتوں سے برتر اور منزہ ہے۔ اس فرقہ کا نام قدریہ رکھا گیا، اس لیے کہ وہ قدر کے منکر ہیں۔ متکلمین میں سے اصحابِ مقالات نے کہا ہے کہ فرقۂ قدریہ جو اس قولِ شنیع کے قائل ہیں وہ منقرض ہو چکے (یعنی ختم ہو چکے)۔

اہلِ قبلہ میں سے اس پر کوئی باقی نہیں رہا اور بعد کے زمانوں میں قدریہ ہو گئے جو اثباتِ قدر کا اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن یہ کہتے ہیں کہ خیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور شر اس کے غیر کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ ان کے قول سے منزہ و پاک ہے۔[1] امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہت سے لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ قضا و قدر کے معنی اللہ کا بندے کو جبر اور قہر کرنا ہے اس شے پر جس کو اس نے مقدر کیا ہے اور قضا کیا ہے، حالانکہ بات ویسی نہیں ہے جیسی وہ وہم کرتے ہیں۔ اس کے معنی جو ہیں سو صرف اس بات کی خبر دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ پہلے سے ہے جو بندوں کے اکساب اور افعال میں سے ہوتی ہے اور ان چیزوں کا صدور اس کی تقدیر سے ہوتا ہے، وہ خیر ہوں یا شر، وہ اسی نے پیدا کی ہیں۔ اور قدر اسم ہے اس شے کے لیے جو قادر کے فعل سے مقدر ہو کر صادر ہوئی۔ "يُقَالُ: قَدَرْتُ الشَّيْءَ أَوْ قَدَّرْتُهُ" بہ تخفیف و تشدید، یہ دونوں ایک معنی میں ہیں اور اس میں قضا کے معنی خلق کے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ ﴾ أَيْ: خَلَقَهُنَّ. اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تقدیر پر کتاب وسنت کے قطعی دلائل اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف وخلف کے اہلِ حل وعقد کا اجماع ظاہر وباہر ہے۔ نیز ائمۂ متکلمین نے نقلی اور عقلی دلائل کے ساتھ اسے خوب ثابت کیا ہے۔[2] (كذا ذكره الخازن)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ نہیں ہے ہمارا امر کسی شے کے لیے جس کے وجود کا ہم ارادہ کرتے ہیں مگر "مرة واحدة"، یعنی ایک بار یا "فعلة واحدة"، یعنی ایک فعل، مراد وجود میں لانا ہے بغیر کسی محنت و مشقت کے۔ یا کلمہ واحدہ سے مراد "کن" کہنا ہے، یعنی جب "کن" کہا تو فوراً وہ شے ہو گئی، اس میں کسی طرح کی مراجعت نہیں ہے، چنانچہ اس بنا پر جس وقت اللہ پاک نے کسی شے کا ارادہ کیا تو اس سے فرمایا: ہو جا، تو وہ ہو گئی۔ اب یہاں فرق ظاہر ہو گیا ارادہ اور قول میں۔ پس ارادہ تو قدر ہے اور قول قضاء ہے۔ ﴿ وَاحِدَةٌ ﴾ میں اس

---

[1] المنهاج للنووي (١/١٥٤) [2] تفسير الخازن (٦/٢٨٠)

بات کا بیان ہے کہ قول کی تکرار کی کچھ حاجت نہیں ہے، بلکہ یہ نفاذِ امر کی طرف اشارہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "أمر" سے مراد قیامت ہے۔

﴿ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴾ یعنی اللہ پاک کا امر اپنی سرعت میں پلک جھپکنے کی طرح ہے۔ "لمح" کہتے ہیں تیزی کے ساتھ نظر کرنے کو۔ صحاح میں کہا ہے۔ "لَمَحَهُ وَأَلْمَحَهُ إِذَا أَبْصَرَهُ بِنَظَرٍ خَفِيفٍ وَالِاسْمُ اللَّمْحَةُ"۔[1] چنانچہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم میں سے کسی کو اپنی پلک جھپکنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، اسی طرح ہمارے نزدیک سارے کام ہیں، بلکہ اس سے زیادہ سہل اور آسان ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں ہے قیامت کے آنے کے لیے ہمارا امر سرعت کے لحاظ سے مگر پلک مارنے کی طرح۔[2]

﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ ﴾ یعنی ہم ان کو، جو کفر میں تمھارے مشابہ اور تمھاری نظیر تھے پہلی اُمتوں میں سے، ہلاک کر چکے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ تمھارے اتباع اور مددگاروں کو ہلاک کر چکے ہیں اور ہمیں تم پر ویسی ہی قدرت ہے جیسی ان پر تھی، لہٰذا تم اس سے ڈرو کہ جو ان کو پہنچا ہے وہ تمھیں پہنچے اور اسی لیے اس سے یہ قول متسبب ہوا کہ ﴿ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ یعنی پھر ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا کہ نصیحت اور وعظ سے اثر پذیر ہو اور جانے کہ یہ حق ہے تو عقوبت سے اور اس بات سے ڈرے کہ اس پر وہ عذاب نازل ہو جو اگلی اُمتوں پر نازل ہو چکا ہے۔

﴿ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴾ یعنی جو کچھ خیر یا شر اُمتوں نے کیا ہے وہ سب لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ یا حافظین کی کتابوں اور دفتروں میں لکھا ہوا ہے۔ (اس ﴿ وَكُلُّ ﴾ کی رفع پر اتفاق ہے، اس لیے کہ اس کے نصب میں معنی کا فساد ہے۔ تقدیر یہ ہوگی: "فَعَلُوا كُلَّ شَيْءٍ فِي الزُّبُرِ"۔ یہ بات خلافِ واقع ہے، کیونکہ "زبر" میں نہایت درجہ اشیائے کثیر ہیں کہ انھوں نے ان کو نہیں کیا اور رفع کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ ہر شے جو انھوں نے کی وہ زبر میں ثابت ہے مقصود یہی ہے)۔ ﴿ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴾ "يُقَالُ: سَطَرَ يَسْطُرُ سَطْرًا كَتَبَ، وَأَسْطَرَ مِثْلُهُ"، یعنی ہر شے اعمال و اقوال و افعالِ خلق سے اور جو کچھ ہونے والا ہے یہ سب لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے، اس کا صغیر و کبیر و جلیل و حقیر۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ﴿ مُّسْتَطَرٌ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: "مَسْطُورٌ فِي الْكِتَابِ"۔[3]

پھر جب اللہ پاک اشقیاء کے ذکر سے فارغ ہوا تو سعداء (نیک بختوں) کا حال ذکر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴾ نہر سے مراد جنس ہے ﴿ جَنّٰتٍ ﴾ کی جمع کی مناسبت سے۔ لفظ میں ﴿ نَهَرٍ ﴾ کو جو مفرد لایا گیا تو وہ صرف رؤسِ آیات کی موافقت سے ہے۔ جمہور نے اسی طرح پڑھا ہے، یہ شامل ہے جنت کی نہروں کو جو پانی اور شراب اور دودھ اور شہد سے ہیں۔ کسی نے (یعنی مجاہد و اعرج و ابو السماک نے) بہ سکونِ ہاء پڑھا ہے، فتح و سکونِ ہاء دو لغت ہیں۔ کسی نے (یعنی ابو مجلز، ابو نہشل، اعرج، طلحہ بن مصرف اور قتادہ رحمہم اللہ نے) بہ ضمِ نون و ہاء بہ صیغۂ جمع

---

[1] الصحاح للجوهري (٤٢٥/٢) [2] تفسير البغوي (٤٣٦/٧) [3] فتح القدير (١٧٢/٥)

پڑھا ہے، یہ قراءت شاذ ہے، معنی یہ ہیں کہ متقی لوگ بُساتینِ مختلفہ و جناتِ متنوعہ و انہارِ متدفقہ، یعنی مختلف انواع و اقسام کے باغات اور اچھلتے پانی کی نہروں میں ہیں۔ کسی نے کہا کہ ﴿نَهَرٍ﴾ بہ معنی وسعت، فراخی اور روشنی ہے، اسی معنی سے "نہار" بہ معنی دن ہے، یعنی وہ باغوں میں اور فراخی اور روشنی میں ہیں، ان کے ہاں رات نہیں ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

﴿فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ﴾ اضافۃ موصوف إلی الصفۃ کے باب سے ہے، یعنی مجلسِ حق اور پسندیدہ جگہ میں ہیں، جس میں نہ لغو ہے نہ کذب نہ گناہ، یعنی جنت۔ ﴿مَقْعَدِ﴾ سے مراد جنس ہے۔ عثمان بتی نے "مَقَاعِدَ" بہ جمع پڑھا ہے۔[1] یہ قراءت شاذ ہے۔ ﴿عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ یعنی اس بادشاہ کے نزدیک جس کا ملک عزیز و واسع ہے، وہ قدرت والا ہے اس شے پر جس کو چاہتا ہے، کوئی شے اسے عاجز نہیں کرتی۔ اس جگہ کلمۂ ﴿عِنْدَ﴾ کنایہ ہے کرامت و شرفِ منزلت و تقریبِ رتبہ سے، یعنی وہ اس ذات پاک کے نزدیک مقرب ہیں جس کا امر ملک و اقتدار میں برتر ہے اس طور پر کہ فہم والوں پر مبہم رکھا گیا ہے۔ دونوں اسموں کے نکرہ لانے میں یہ فائدہ ہے کہ یہ بات معلوم ہو کہ کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی ملک و قدرت کے تحت میں نہ ہو۔ وھو علی کل شيء قدیر.[2] واللہ أعلم. (کذا في فتح البیان)

الحمد للہ والمنۃ کہ اس سورت کی تفسیر بروز ہفتہ ۷/ ربیع الاول ۱۳۱۵ ہجری وقت شب قریب دو ساعت تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہٗ قبول فرمائے اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے۔ آمین! لا حول ولا قوۃ إلا باللہ، والحمد للہ أولا وآخرا وظاھرا وباطنا، والصلاۃ والسلام علی سیدنا و مولانا سید المرسلین شفیع المذنبین سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین إلیٰ یوم الدین. آمین آمین آمین.

[1] فتح القدیر (۱۷۱/۵) [2] فتح البیان (۳۰۶/۱۳۔۳۱۰)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ

اس سورت مبارکہ کی چھہتر (۷۶) یا اٹھتر (۷۸) آیتیں ہیں اور یہ مکی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام حسن، عروہ بن الزبیر، عکرمہ، عطاء رحمہم اللہ اور جابر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ساری سورت مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سوائے اس کی ایک آیت کے، یعنی قولہ تعالیٰ: ﴿ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴾۔[1] صحیح اس قول کا یہ ہے: سوائے دو آیتوں کے جیسا کہ گازرونی نے اس کی صراحت کی ہے اور وہ دو آیتیں یہ ہیں: ﴿ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴾ یہ ایک آیت ہوئی۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ یہ دوسری آیت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ساری سورت مدنی ہے، لیکن پہلا قول سب سے صحیح ہے۔ اس پر یہ اقوال دال ہیں:

1. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۃ الرحمٰن مکہ میں نازل ہوئی۔ (أخرجه النحاس)
2. سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سورۃ الرحمٰن مکہ میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن مردويه)
3. سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ سورۃ ﴿ اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴾ مکہ میں نازل ہوئی۔[2] (أخرجه ابن مردويه)
4. سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے اور آپ رکن کی طرف نماز پڑھ رہے تھے، یعنی حجرِ اسود کی طرف، اس سے قبل کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شے کو ظاہر کریں جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر کیا جاتا ہے اور مشرکین سنتے تھے: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾۔[3] (أخرجه الإمام أحمد و ابن مردويه قال السيوطي بسند حسن) قولِ ثانی کا مؤید یہ قول ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۃ الرحمٰن مدینہ میں نازل ہوئی۔[4] (أخرجه ابن الضريس و ابن مردويه والبيهقي في الدلائل)

جمع بین القولین یوں ممکن ہے کہ بعض سورت مکہ میں نازل ہوئی اور بعض مدینہ میں۔

سورۃ الرحمٰن کی فضیلت:

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب پر نکلے اور ان پر سورۃ الرحمٰن شروع

---

[1] تفسير القرطبي (۱۵۱/۱۷) [2] الدر المنثور (۶۸۹/۷)

[3] مسند أحمد (۳۴۹/۶) الدر المنثور (۶۸۹/۷) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ [4] الدر المنثور (۶۸۹/۷)

سے لے کر آخر تک پڑھی۔ چنانچہ وہ ساکت رہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا ہے مجھے کہ میں تم کو سکوت کرنے والا دیکھتا ہوں! البتہ تحقیق میں نے اس کو شبِ جن میں جنوں پر پڑھا تو وہ جواب دینے میں تم سے اچھے رہے ہر دفعہ جب میں اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴾ پر آیا تو انھوں نے کہا: "لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ"، یعنی اے ہمارے رب! ہم تیری کسی نعمت کی تکذیب نہیں کرتے، چنانچہ تیرے لیے ہی حمد ہے۔[1] (رواه الترمذي وابن المنذر وأبو الشيخ في العظمة و الحاكم و صححه و ابن مردويه والبيهقي في الدلائل قال الترمذي: بعد إخراجه هذا حديث غريب لا نعرفه إلا من حديث الوليد بن مسلم عن زهير بن محمد و حكي عن الإمام أحمد أنه كان يستنكر روايته عن زهير)

(تفسیر ابن کثیر میں یوں ہے: "أنه كان لا يعرفه، ينكر رواية أهل الشام عن زهير بن محمد هذا") (وقال البزار: لا نعرفه يروى إلا من هذا الوجه وأخرجه البزار وابن جرير وابن المنذر والدارقطني في الأفراد و ابن مردويه والخطيب في تاريخ من حديث ابن عمر رضي الله عنهما و صحح السيوطي إسناده وقال البزار: لا نعرفه يروى إلا من هذا الوجه بهذا الإسناد) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ فرماتے تھے: ہر شے کے لیے ایک عروس ہے اور قرآن کی عروس سورت رحمٰن ہے۔[2] (أخرجه البيهقي في الشعب)۔ زر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا: تو اس حرف کو کیسا پہچانتا ہے: "مِنْ مَّاءٍ غَيْرِ يَاسِنٍ أَوْ آسِنٍ؟"، چنانچہ کہا: تحقیق میں نے سارا قرآن پڑھا، کہا: بے شک میں البتہ مفصل کو ایک رکعت میں پڑھتا ہوں تو کہا: "أَهَذًّا كَهَذِّ الشِّعْرِ لَا أَبَا لَكَ"، یعنی کیا تو جلدی پڑھتا ہے شعر کو جلدی پڑھنے کی طرح تیرا باپ نہ ہو! میں نے یقیناً نبی کریم ﷺ کی قرائن کو جانا ہے جن کو آپ قرین کرتے تھے دو قرین دو قرین اول مفصل سے، اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اول مفصل سورت رحمٰن تھی۔[3] (أخرجه الإمام أحمد عن عاصم عن زر)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴
اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝۵ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝۶
وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝۷ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝۸ وَاَقِيْمُوا
الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝۹ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩١) مستدرك الحاكم (٥١٥/٢) دلائل النبوة (٢٣٢/٢) مسند البزار (١٩٠/١٢) تفسير الطبري (٢٣/٢٣/٢٢) تفسير ابن كثير (٣٤٣/٤) الدر المنثور (٦٩٠/٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٥٠)

[2] شعب الإيمان (٤٨٩/٢) اس کی سند میں "احمد بن حسن دبیس" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١٣٥٠)

[3] مسند أحمد (٤١٢/١)

لِلْاَنَامِ ﴿۱۰﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۪ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿۱۱﴾ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿۱۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اللہ) رحمان نے ① قرآن سکھایا ② اسی نے انسان کو پیدا کیا ③ اسے بولنا سکھایا ④ سورج اور چاند ایک حساب سے (چلتے) ہیں ⑤ اور بیلیں اور درخت سجدہ کرتے ہیں ⑥ اور آسمان کو اسی (رحمان) نے بلند کیا اور اسی نے ترازو رکھی ⑦ تاکہ تم ترازو میں حد سے تجاوز نہ کرو ⑧ اور تم انصاف سے وزن کو دُرست رکھو اور تول میں کمی نہ کرو ⑨ اور اسی نے زمین کو مخلوق کے لیے بچھایا ⑩ اس میں لذیذ پھل اور کھجور کے درخت ہیں جن کے شگوفے غلافوں میں لپٹے ہوتے ہیں ⑪ اور بھوسے والے دانے (اناج) اور خوشبودار پھول ہیں ⑫ پھر (اے جن و انس!) تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ⑬

اللہ رحمان نے قرآن سکھایا ہے:

اللہ پاک اپنے فضل و رحمت کی خبر دیتا ہے جو اس کو اپنی مخلوق کے ساتھ ہے کہ اس نے اپنے بندوں پر قرآن شریف اتارا اور اس کے حفظ اور سمجھنے کو اس شخص کے لیے آسان کیا جس پر اس نے رحم کیا چنانچہ فرمایا: رحمان نے قرآن سکھایا، آدمی بنایا، اس کو بیان سکھایا۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: بیان سے مراد نطق (بولنے کی صلاحیت) ہے۔ ضحاک وقتادہ وغیرہما نے کہا: یعنی خیر وشر۔① حسن رحمہ اللہ کا قول یہاں احسن اور اقویٰ ہے، اس لیے کہ آیت کا سیاق اس میں ہے کہ اللہ پاک نے قرآن کی تعلیم فرمائی اور یہ اس کی تلاوت کا ادا کرنا ہے اور یہ اسی طرح سے ہوتا ہے کہ خلق پر نطق کی آسانی کی جائے اور حرفوں کا ان کے مواضع (جگہوں) سے نکلنا سہل کیا جائے جو حلق اور زبان اور دونوں ہونٹ ہیں مخارج کے اختلاف اور حرف کی مختلف اقسام کی بنا پر۔②

سورج، چاند اور زمین وآسمان اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں:

سورج و چاند کے حسبان کا یہ مطلب ہے کہ وہ دونوں ایک ایسے حساب سے چلتے ہیں اور ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہتے ہیں جس کا قانون مقرر کیا گیا ہے نہ وہ مختلف ہوتا ہے نہ مضطرب ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [يٰسٓ: ٤٠] ”نہ آفتاب کی یہ مجال ہے کہ چاند کو پکڑے اور نہ رات دن پر آگے بڑھ جانے والی ہے اور سب کے سب آسمان میں

① تفسير الطبري (٨/٢٣) ② تفسير ابن كثير (٤/٣٤٣)

تیرتے پھرتے ہیں‘‘۔ ﴿ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [الأنعام: ٩٦] ’’وہ صبح کا نکالنے والا ہے اور اس نے رات کو راحت کی چیز بنایا ہے اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے۔ یہ ٹھہرائی بات ہے ایسی ذات کی جو قادر ہے بڑے علم والا ہے۔‘‘ عکرمہ سے مروی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ انسانوں، جنوں، چارپایوں اور پرندوں کی آنکھوں کا نور کسی بندے کی دونوں آنکھوں میں کر دیتا، پھر ان سے ستر پردوں میں سے ایک پردہ کھول دیتا جو سورج کے ورے ہیں تو البتہ وہ طاقت نہ رکھتا کہ اس کی طرف نظر کرے اور سورج کا نور کرسی کے نور کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے اور کرسی کا نور عرش کے نور کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ اور عرش کا نور ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے نورِ ستر سے۔ اب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اس وقت کیا کچھ نور عطا فرمائے گا جب وہ اپنے رب کے ظاہر وجہ کریم کی طرف نظر کرے گا۔[1] رواه ابنُ أبي حاتم. اللهم ارزقنا النظر إلى وجهك الكريم، اللهم صل وسلم وبارك عليه وعلى آله وصحبه أحسن صلاة وأزكى تسليم إلى يوم الدين آمين۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس بات پر مفسرین کا اجماع ہے کہ ’’شجر‘‘ وہ ہے جو ساق پر یعنی تنے پر قائم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ’’نجم‘‘ کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ نجم وہ روئیدگی ہے جو روئے زمین پر پھیلتی ہے۔ امام سعید بن جبیر، سدی اور سفیان ثوری رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ’’نجم‘‘ وہ ہے جو آسمان میں ہے۔ اسی طرح امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے بھی کہا ہے۔[2] یہ قول زیادہ ظاہر ہے۔ والله أعلم. اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾ [الحج: ١٨] ’’کیا تو نہیں دیکھ رہا کہ اللہ کے سامنے سجدے میں ہیں سب آسمانوں والے اور سب زمینوں والے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی۔ ہاں بہت سے وہ بھی ہیں جن پر عذاب کا مقولہ ثابت ہو چکا ہے، جسے رب ذلیل کر دے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔‘‘

﴿ اَلْمِيْزَانَ ﴾ سے مراد عدل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ [الحديد: ٢٥] ’’یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔‘‘ نیز اسی طرح یہاں فرمایا ہے: ﴿ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق اور عدل کے ساتھ پیدا کیا،

---

[1] تفسير ابن كثير (٣٤٤/٤) [2] تفسير الطبري (١٢،١١/٢٣)

تاکہ ساری اشیاء حق وعدل کے ساتھ ہوں۔ اس لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ ...الآية ﴾ یعنی مت کم کرو تول کو بلکہ حق وانصاف کے ساتھ تولو، جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴾ [الشعراء: ۱۸۲] ''اورتم بالکل سیدھی ترازو سے تولو۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴾ یعنی جیسا اس نے آسمان کو اونچا کیا ویسا ہی زمین کو نیچا بنایا اور اس کو بچھایا اور جمے ہوئے اونچے اونچے پہاڑوں سے اس کو جمایا تاکہ جو مخلوق روئے زمین پر ہے اس پر قرار پکڑے۔ روئے زمین پر بہت سی خلائق ہیں کہ جن کی نوعیں، شکلیں، رنگ اور زبانیں مختلف ہیں اور وہ زمین کی ساری اطراف واقطار میں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا: ''أنام'' بہ معنی مخلوق ہے۔[1]

﴿ فِيْهَا فٰكِهَةٌ ﴾ یعنی زمین میں میوے ہیں جن کے رنگ اور مزے اور بو مختلف ہیں۔ ﴿ اَلنَّخْلُ ﴾ کا الگ سے اس لیے ذکر کیا کہ اس کو اَور میووں پر شرف حاصل ہے اور تری اور خشکی دونوں حال میں اس کا نفع حاصل ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ اَلْاَكْمَامِ ﴾ ''أَوْعِيَةُ الطَّلْعِ'' ہیں،[2] یعنی شگوفۂ خرما کے ظرف جن میں وہ ہوتا ہے (یہ الفاظ ابن جریج رحمہ اللہ نے ان سے روایت کیے ہیں)۔ اسی طرح اور مفسروں میں سے کئی ایک اہلِ علم نے بھی کہا ہے، طلع وہ ہے جس میں خوشہ طلوع کرتا ہے، پھر وہ خوشے سے شق ہوتا ہے تو ''بسر'' ہو جاتا ہے، یعنی گدر، پھر رطب، پھر پکتا ہے اور اس کا نفع اور درست ہونا منتہی ہو جاتا ہے۔

امام شعبی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ قیصر نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا: میں تم کو خبر دیتا ہوں کہ میرے پاس میرے قاصد تمھارے پاس سے ہو کر آئے تو یہ زعم کیا کہ تمھاری طرف ایک درخت ہے: ''لَيْسَتْ بِخَلِيْقَةٍ لِشَيْءٍ مِنَ الْخَيْرِ'' گدھے کے کانوں کی طرح نکلتا ہے، پھر موتیوں کی طرح شق ہوتا، پھر سبز ہوتا ہے تو زمرد سبز کی طرح ہو جاتا ہے، پھر سرخ پڑتا ہے تو یاقوت سرخ ہو جاتا ہے، پھر رسیدہ (رس والا) ہوتا ہے تو پک جاتا ہے، پھر پاک تر وعمدہ فالودے کی طرح ہو جاتا ہے جو کھایا گیا، پھر خشک ہوتا ہے تو عصمت ہوتا ہے (یعنی بھوک سے بچاؤ)، مقیم آدمی کے لیے اور مسافر کے لیے توشہ ہوتا ہے۔ پس اگر میرے قاصدوں نے مجھ سے سچ کہا ہے تو میں نہیں خیال کرتا ہوں اس درخت کو مگر جنت کے درختوں سے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو یہ خط لکھا: ''مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ عُمَرَ أَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِلَى قَيْصَرَ مَلِكِ الرُّوْمِ إِنَّ رُسُلَكَ قَدْ صَدَّقُوْكَ، هٰذِهِ الشَّجَرَةُ عِنْدَنَا، وَهِيَ الشَّجَرَةُ الَّتِيْ أَنْبَتَهَا اللّٰهُ عَلَى مَرْيَمَ حِيْنَ نَفِسَتْ بِعِيْسَى ابْنِهَا، فَاتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَتَّخِذْ عِيْسَى إِلٰهًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، فَإِنَّ مَثَلَ عِيْسَى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ، اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ''[3] (رواه ابن أبي حاتم)

(یعنی اللہ تعالیٰ کے بندے عمر امیر المومنین کی طرف سے روم کے بادشاہ قیصر کی طرف کہ بے شک تیرے قاصدوں نے

---

[1] تفسير الطبري (۲۳/۱۵، ۱۶) [2] تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۲۲) [3] تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۲۲، ۳۳۲۳)

واقعی تجھ سے سچ کہا ہے، یہ درخت ہمارے یہاں ہے، یہ وہی درخت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام پر اُگایا، جبکہ ان کو اپنے فرزند عیسیٰ علیہ السلام کا نفاس ہوا، چنانچہ تو اللہ سے ڈر اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے سوا معبود نہ ٹھہرا۔ بے شک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی مثال کی طرح ہے کہ اللہ کے نزدیک ان کو مٹی سے پیدا کیا، پھر ان سے کہا: ہو جا تو وہ ہو گئے۔ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے سو تو شک کرنے والوں سے مت ہو) کسی نے کہا ہے کہ ''أکمام'' رُفاتِ نخلہ ہے، یہ وہ پوست ہے جو درختِ خرما کی گردن پر ہوتا ہے۔ یہ قول امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ کا ہے۔

﴿ اَلْعَصْفِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے مراد تبن ہے، یعنی گھاس، تنکا۔ (یہ الفاظ علی بن ابی طلحہ نے روایت کیے ہیں)۔ ان کا دوسرا قول (بروایتِ عوفی) یہ ہے کہ عصف اس سبز کھیتی کے پتے ہیں جس کے سر کاٹے گئے، چنانچہ اس کا نام عصف رکھا جاتا ہے جبکہ وہ خشک ہو جائے۔ اسی طرح امام قتادہ، ضحاک اور ابو مالک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس کا عصف اس کا تبن ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا کہ ﴿ اَلرَّیْحَانُ ﴾ سے مراد ورق ہے، یعنی پتے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: وہ یہی تمھارا ریحان ہے، یعنی دونا مروی کا درخت خوشبو۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول (بروایتِ علی) یہ ہے ﴿ اَلرَّیْحَانُ ﴾ ''خضر الزرع''[1] یعنی سبز کھیتی۔ واللہ اعلم۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حب، یعنی اناج اور دانے، مثلاً: گیہوں اور جو اور ان جیسا اور اناج اپنی حالت روئیدگی میں ان کے لیے عصف ہوتا ہے، یہ وہ شے ہے جو بال پر ہوتی ہے اور ریحان وہ لپٹے ہوئے پتے ہیں جو اس کے تنے پر ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ عصف وہ پتے ہیں جو کھیتی پہلے پہل سبزی ہو کر اگتی ہے اور ریحان پتے ہیں، یعنی جبکہ وہ کھیتی کو چھپا لیں اور اس کا لباس بن جائیں اور اس میں دانے منعقد ہو جائیں جیسا کہ زید بن عمرو بن نفیل نے اپنے مشہور قصیدے میں کہا ہے: ؎

وَقُوْلَا لَهُ مَنْ يُّنْبِتُ الْحَبَّ فِيْ الثَّرٰى فَيُصْبِحُ مِنْهُ الْبَقْلُ يَهْتَزُّ رَابِيًا
وَيُخْرِجُ مِنْهُ حَبَّهُ فِيْ رُؤُوْسِهِ فَفِيْ ذَاكَ آيَاتٌ لِمَنْ كَانَ وَاعِيًا

یعنی اس سے کہو کہ دانوں کو خاکِ نمناک میں کون اُگاتا ہے، پھر ان سے ابھری ہوئی اور لہراتی ہوئی سبزی ہو جاتی ہے اور اس سے اس کے سروں میں اس کے دانے نکالتا ہے۔ چنانچہ اس میں اس کے لیے نشانیاں ہیں جو یاد رکھنے والا ہے۔

جن وانس پر رب تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ ''أَيْ: فَبِأَيِّ آلَاءِ يَا مَعْشَرَ الإِنْسِ وَالْجِنِّ تُكَذِّبَانِ''[2] (قاله مجاهد وغير واحد) یعنی اے انسانوں اور جنوں کے گروہ! پھر تم اپنے رب کی کیا کیا نعمتیں جھٹلاؤ گے۔ اس معنی پر اس کے بعد کا سیاق دال ہے، یعنی نعمتیں تم پر ظاہر ہیں اور تم ان میں ڈوبے ہوئے ہو، تم ان کے انکار کی طاقت نہیں

[1] تفسیر الطبري (۲۳/۱۷۔۲۱) تفسیر ابن کثیر (۴/۳۴۵) [2] تفسیر الطبري (۲۳/۲۲، ۲۳)

رکھتے۔ پس ہم کہتے ہیں جیسا کہ ان جنوں نے کہا جو اللہ پر ایمان لانے والے تھے: "اَللّٰهُمَّ وَلَا بِشَيْءٍ مِنْ آلَائِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ" یعنی اے ہمارے رب! ہم تیری نعمتوں میں سے کسی شے کو نہیں جھٹلاتے، سو تیرے لیے ہی حمد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: "لَا بِأَيِّهَا يَا رَبِّ"[1] یعنی ہم ان میں سے کسی شے کی تکذیب نہیں کرتے۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ اَلرَّحْمٰنُ ﴾ مبتداء ہے اور ما بعد کے افعال اس کی خبر ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہو۔ "أَيْ: اَللّٰهُ الرَّحْمٰنُ" یا مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے: "أَيْ: اَلرَّحْمٰنُ رَبُّنَا"۔ یہ دونوں وجہیں اس شخص کے نزدیک ہیں جو اس کا معتقد ہے کہ ﴿ اَلرَّحْمٰنُ ﴾ ایک آیت ہے مع اس مضمر کے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ﴿ اَلرَّحْمٰنُ ﴾ کو ایک آیت شمار کیا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں متصور ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ خبر یا مخبر عنہ ملے، کیونکہ آیت کا جملہ مفیدہ ہونا ضروری ہے (ضروری ہونا قابلِ غور ہے، کیوں کہ سورۃ الفاتحہ میں ﴿ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ قراءتِ مشہور پر جملہ نہیں ہے، مگر متفقہ طور پر یہ ایک آیت ہے۔ از مصحح سلمه الله تعالىٰ)۔ اور پہلی وجہ کی بنا پر ﴿ اَلرَّحْمٰنُ ﴾ آیت نہیں ہے، اس لیے کہ ﴿ اَلرَّحْمٰنُ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴾ خبر ہے، یعنی رحمان نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان کیا، تاکہ حفظ کیا جائے اور تلاوت کیا جائے۔ یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ کا ہے۔

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رحمان نے قرآن سکھایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور انھوں نے قرآن سکھایا اپنی امت کو۔[3] کسی نے کہا ہے کہ رحمان نے قرآن جبریل علیہ السلام کو سکھایا۔ کسی نے کہا ہے کہ انسان کو قرآن سکھایا۔ یہ اس کے عموم کی وجہ سے زیادہ مناسب ہے اور اس لیے کہ ﴿ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴾ اس پر دال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن کو اس شے کی ایک علامت ٹھہرایا جس کے ساتھ لوگ عبادت کرتے ہیں اور ایک نشان ٹھہرایا جس سے عبرت حاصل کی جاتی ہے۔ کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ مکہ کے جواب کے لیے نازل ہوئی، جب انھوں نے کہا کہ اس کو تو کوئی بشر ہی تعلیم کرتا ہے، چنانچہ فرمایا کہ کسی بشر نے اس کو تعلیم نہیں دی، بلکہ رحمان نے اس کو قران کی تعلیم کی۔

کسی نے کہا ہے کہ یہ ان کے اس قول کے جواب میں نازل ہوئی کہ "وَمَا الرَّحْمٰنُ" یعنی ہم نہیں جانتے کہ رحمان کیا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ رحمان وہ ہے جس نے قرآن سکھایا، چونکہ یہ سورت اللہ کی ان نعمتوں کو شمار کرنے کے لیے ہے جن کا اللہ پاک نے اپنے بندوں پر انعام کیا ہے، اس لیے پہلے اس نعمت کا ذکر کیا جو قدر و منزلت کے لحاظ سے سب سے بڑی ہے اور زیادہ نفع رساں ہے اور رتبے میں سب سے بڑھ کر ہے اور فائدے کے لحاظ سے مکمل ہے اور عائدے (لوٹ کر آنے) میں سب سے عظیم ہے۔ وہ نعمت قرآنِ عزیز کی تعلیم ہے، کیونکہ یہ دنیا اور آخرت کی

[1] تفسير الطبري (٢٣/٢٣) [2] تفسير ابن كثير (٣٤٣/٤_٣٤٥) [3] فتح القدير (١٧٤/٥)

سعادت کا مدار ہے اور خیرین کی آسیا کا قطب ہے اور امرین (کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ ﷺ) کا ستون ہے اور آسمانی کتابوں کا کوہان ہے اور افضل مخلوق پر نازل کیا گیا ہے۔ پھر اس نعمت کے بعد خلق کی نعمت کا احسان جتایا جو کل امور کا مناط (مدار) ہے اور ساری اشیاء کا مرجع ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ﴾ یعنی اس نے انسان کو پیدا کیا۔ امام قتادہ اور حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں مراد محمد ﷺ ہیں۔[1] زیادہ مناسب انسان کو جنسِ انسان پر محمول کرنا ہے۔

نکتہ:

قرآن کی تعلیم کو انسان کی پیدائش سے پہلے رکھا حالانکہ وجود کے لحاظ سے تعلیم اس کے بعد میں ہے، اس لیے کہ انسان کی پیدائش کے ایجاد کرنے کا سبب یہی تعلیم ہے۔ (كما أفاده السمين) پھر اللہ پاک نے تیسرا احسان یہ جتلایا کہ اس کو بیان سکھایا، کون سا بیان؟ وہ بیان جس سے ایک دوسرے کا مطلب سمجھتا ہے اور جس پر آپس میں ایک دوسرے سے بات چیت ہوتی ہے اور جس پر معاش اور معاد کی بہتری کا دارومدار ہے، اس لیے کہ جو کچھ دلوں میں ہے اس کو باہر لانا اور جو شے دل میں چکر کھاتی ہے اس کا اظہار کرنا صرف اسی بیان سے ممکن ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴾ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''انسان'' سے مراد آدم علیہ السلام اور ''بیان'' سے مراد ہر شے کے نام ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد ساری زبانیں ہیں۔

چنانچہ آدم علیہ السلام سات سو زبانیں بولتے تھے، ان میں سے افضل اور بہتر عربی زبان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''انسان'' اسم جنس ہے، اس سے مراد سارے لوگ ہیں اور ''بیان'' سے مراد نطق، یعنی اس کو نطق سکھایا جس کی وجہ سے وہ باقی حیوانوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انسان سے مراد محمد ﷺ ہیں، آپ ﷺ کو "مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ" کا بیان سکھایا، اس لیے کہ آپ اولین و آخرین کی خبر دیتے ہیں اور ''یوم الدین'' کی خبر دیتے ہیں۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''انسان'' سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا اور ''بیان'' سے مراد حلال و حرام کا اور ہدایت اور گمراہی کا بیان ہے۔ یہ قول بعید ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خیر و شر و حدود و احکام کا بیان ہے۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس شے کا بیان جو اسے نفع دے اس شے سے جو اس کو ضرر دے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ بیان قلم کے ساتھ لکھنا ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ انسان کو جنسِ انسانی پر محمول کیا جائے اور بیان کو اس پر محمول کیا جائے کہ ہر قوم کو ان کی زبان سکھائی جس سے وہ بولتے ہیں۔

"حسبان" کا مطلب یہ ہے کہ سورج و چاند ایک ایسے حساب سے چلتے ہیں جو معلوم ہے اور جس کا برجوں اور منزلوں میں اندازہ کیا ہوا ہے اور وہ ان سے تجاوز نہیں کرتے اور نہ ان سے کسی اور طرف مائل ہوتے ہیں اور اس

---

[1] تفسير القرطبي (١٥٢/١٧) [2] تفسير القرطبي (١٥٢/١٧)

سے مہینوں اور سالوں کی گنتی بتاتے ہیں اور اس سے کائناتِ سفلی کے امور کا انتظام ہوتا ہے اور فصلوں اور اوقات کا اختلاف ہوتا ہے۔ ابن زید و ابن کیسان رحمہما اللہ نے کہا کہ ان سے اوقات کا اور اجلوں کا اور عمروں کا حساب کیا جاتا ہے۔ اگر روز وشب اور سورج و چاند نہ ہوتے تو کوئی نہ جانتا کہ حساب کیسے کرے۔ اس لیے کہ کل زمانہ یا رات ہوتا یا دن۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بِحُسْبَانٍ ﴾ کے معنی ہیں: "بقدر" یعنی ایک مقدار اور اندازے سے چلتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بِحُسْبَانٍ ﴾ "کَحُسْبَانِ الرَّحٰی" یعنی دونوں کے قطب جس پر وہ دور کرتے ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حسبان" حساب کی جمع ہے، جیسے "شِهَابٌ وَشُهْبَانٌ"[1] یا مصدر مفرد ہے بہ معنی حساب، جیسے: "غُفْرَانٌ وَكُفْرَانٌ".

رہا "حُسْبَان" بہ ضم سورۃ الکہف میں[2] تو وہ عذاب ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "بِحِسَابٍ وَمَنَازِلَ يُرْسَلَانِ"[3] یعنی حساب و منزلوں کے ساتھ چھوڑے جاتے ہیں۔ "نجم" روئیدگی میں سے وہ ہے جس کا تنا نہیں ہوتا اور "شجر" وہ ہے جس کا تنا ہوتا ہے۔ ان دونوں کے سجدے سے مراد ان کا فرمانبردار اور مطیع ہونا ہے اللہ تعالیٰ کے امر کا جس طرح کہ مکلفین میں سے خوش ہو کر سجدہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: ان کا سجود یہ ہے کہ وہ سورج کا استقبال کرتے ہیں جب وہ طلوع ہوتا ہے، پھر اس کے ساتھ مائل ہوتے ہیں یہاں تک کہ سایہ منکسر ہوتا ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا سجدہ کرنا ان کے سائے کے ساتھ ساتھ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ ﴾ [النحل: ٤٨] "ان کے سائے ڈھلتے ہیں۔" امام حسن اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "نجم" سے مراد آسمان کا نجم ہے اور اس کا سجود اس کا طلوع ہونا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو ترجیح دی ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا سجود اس کا افول یعنی مائل ہونا ہے غروب کے لیے اور "شجر" کا سجود یہ ہے کہ وہ اس بات پر قابو دیتے ہیں کہ ان کے پھل چنے جاتے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سجود کی اصل اللہ تعالیٰ کے لیے استسلام و انقیاد ہے، یعنی مطیع اور فرمانبردار ہونا۔[4]

یہ جملہ اور اس سے پہلے کا جملہ دونوں ﴿ اَلرَّحْمٰنُ ﴾ کی خبر ہیں۔ رابطہ چوں کہ ظاہر ہے اس لیے ترک کیا گیا، گویا یوں کہا گیا: "وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانِهٖ، وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ لَهٗ" ﴿ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا ﴾ کو جمہور نے بہ نصب پڑھا ہے بنا بر اشتغال اور امام ابو السماک رحمہ اللہ نے بہ رفع پڑھا ہے بنا بر ابتداء۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے آسمان کو مرفوع و مسموک، یعنی اونچا زمین کے اوپر کیا۔ ﴿ وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ﴾ میزان سے مراد عدل ہے، یعنی زمین

---

[1] تفسير القرطبي (١٥٣/١٧) [2] رقم الآية (٤٠)

[3] تفسير الطبري (٩/٢٣) [4] تفسير القرطبي (١٥٤/١٧) فتح القدير (١٧٥/٥)

میں عدل کو رکھا اور ثابت کیا کہ جس کو مشروع کیا اور اس کا امر فرمایا۔ امام مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہما نے اسی طرح کہا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو عدل کا امر کیا اور اس قول پر یہ آیت دال ہے: ﴿ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ﴾ یعنی عدل سے تجاوز مت کرو۔

امام حسن اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد آلۂ وزن ہے، یعنی ترازو تاکہ اس سے انصاف اور انتصاف کی طرف توصل کیا جائے، یعنی اس شے میں زیادتی نہ کرو جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا: ''میزان'' قرآن شریف ہے، اس لیے کہ اس میں اس شے کا بیان ہے جس کی حاجت ہوتی ہے۔ حسین بن فضل اسی کے قائل ہیں۔[1] قولِ اول زیادہ بہتر ہے۔ ﴿ اَلَّا تَطْغَوْا ﴾ کے معنی ہیں: "لِئَلَّا تَطْغَوْا"، پس ''لا'' نافیہ ہے اور "تَطْغَوْا"، منصوب بہ "أن" ہے اور اس سے قبل لام مقدر ہے، یہ اولیٰ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "أن" مفسرہ ہے، اس لیے کہ وضع میں قول کے معنی ہیں اور "لا" نہی کا ہے اور طغیان حد سے بڑھنا ہے۔ چنانچہ جس نے کہا ہے کہ میزان عدل ہے تو اس نے کہا ہے کہ طغیان اس کا بخس ہے، یعنی کم کرنا۔ کسی نے کہا ہے کہ میزان ہر وہ شے ہے جس سے اشیاء کا وزن کیا جاتا ہے اور ان کی مقادیر پہچانی جاتی ہیں۔ میزان و قرسطون و مکیال و مقیاس یعنی اللہ تعالیٰ نے میزان کو پیدا کیا، درآنحالیکہ وہ زمین پر اس طرح سے رکھی گئی ہے کہ اس سے اس کے بندوں کے احکام متعلق کیے گئے ہیں، یعنی ان کے لینے اور دینے میں برابری و عدل کرنا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ اس نے ترازو آخرت میں رکھی اعمال کے وزن کے لیے۔

بالجملہ پہلے تو اللہ پاک نے اپنے بندوں کو یہ خبر دی کہ اس نے ان کے لیے عدل رکھا ہے، پھر ان کو عدل کے قائم کرنے کا حکم کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ ﴾ "أَيْ: قَوِّمُوْا وَزْنَكُمْ بِالْعَدْلِ" یعنی اپنی تول کو عدل کے ساتھ سیدھا رکھو۔ کسی نے کہا ہے کہ ترازو کا کانٹا عدل کے ساتھ قائم کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ اقامت تو ہاتھ سے ہوتی ہے اور ''قسط'' دل سے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "قسط" بہ معنی عدل ہے رومی زبان میں۔[2] صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ نے فرمایا، اسی معنی سے قسطاس بہ معنی میزان ہے۔[3] کسی نے کہا: آیت کے یہ معنی ہیں کہ عدل کے ساتھ وزن کرنے کے معاملے کو ہاتھ سے نہ جانے دو، یعنی برابر تولنے کا معاملہ قائم رکھو۔ غرض یہ کہ اللہ پاک نے پہلے برابری کرنے کا حکم دیا، پھر طغیان سے منع کیا جو زیادتی کے ساتھ حد سے بڑھنا ہے۔

پھر اخسار سے منع فرمایا جو نقص و بخس ہے، یعنی کم کرنا اور گھٹانا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴾ یعنی میزان کو ناقص مت کرو اور ماپ اور تول کو کم مت کرو۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ ﴾ [هود: ٨٤] ''اور تم ناپ تول میں بھی کمی نہ کرو۔'' کسی نے کہا ہے کہ اپنی حسنات کے ترازو کو قیامت کے

---

[1] تفسیر القرطبي (١٥٤/١٧) فتح القدير (١٧٥/٥) [2] تفسیر القرطبي (١٥٥/١٧) [3] فتح البيان (٣١٦/١٣)

دن کم مت کرو کہ یہ تم پر حسرت ہو۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: اے ابنِ آدم! تو عدل کر جیسا کہ تو چاہتا ہے کہ تیرے لیے عدل کیا جائے اور پورا کر جیسا کہ تو محبوب رکھتا ہے کہ تیرے لیے پورا کیا جائے۔ بے شک عدل لوگوں کی بہتری ہے۔ لفظِ میزان کے دوبارہ لانے میں کئی فائدے ہیں: ایک تو اس کے ساتھ وصیت کرنے کی سختی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ اس کے استعمال کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کی تقویت ہے۔ تیسرا اس پر آمادہ اور برانگیختہ کرنا ہے۔ جمہور نے ﴿ تُخْسِرُوا ﴾ کو "أخسر" سے پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی بلال بن ابی بردہ، ابان بن عثمان اور زید بن علی رحمہم اللہ نے) بہ فتحِ تاء وسین "خَسِرَ" سے پڑھا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں: "يُقَالُ: أَخْسَرْتُ الْمِيزَانَ وَخَسِرْتُهُ"[1]

پھر جب اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ اس نے آسمان کو اونچا کیا تو اب یہ ذکر کیا کہ زمین کو نیچا بنایا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ﴾ یعنی زمین کو پست کیا پھیلائی ہوئی اور اسے ساری ذی روح و حیات مخلوق کے لیے پانی پر بچھایا۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ "أنام" کی تخصیص جنوں اور انسانوں کے ساتھ ہی کی جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ لِلْأَنَامِ ﴾ "لِلنَّاسِ" یعنی اس سے لوگوں کے نفع لینے کے لیے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ "أنام" ہر وہ شے ہے جس میں روح ہے۔[2] جمہور نے ﴿ الْأَرْضَ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے بنا بر اشتغال اور امام ابو السماک رحمہ اللہ نے بہ رفع پڑھا ہے بنا بر ابتداء۔

جملۂ ﴿ فِيهَا فَاكِهَةٌ ﴾ حالِ مقدرہ ہے ﴿ الْأَرْضَ ﴾ سے۔ بہتر یہ ہے کہ جار و مجرور تو حال ہو اور ﴿ فَاكِهَةٌ ﴾ مرفوع بہ فاعلیت ہو (کسی نے کہا ہے کہ جملۂ مستانفہ ہے جملۂ ما قبل کے مضمون کی تقریر کے لیے ہے۔[3] كذا في الفتح)۔ ﴿ فَاكِهَةٌ ﴾ ہر وہ شے ہے جس کے ساتھ انسان تفکہ کرتا ہے پھلوں کی قسموں میں سے۔ یہ نکرہ لایا گیا اس لیے کہ ﴿ فَاكِهَةٌ ﴾ سے نفع لینا اس نفع کے لینے سے کم درجے کا ہے جو اس کے مابعد کی چیزوں سے نفع لیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ "ترقی من الأدنیٰ إلی الأعلیٰ" کے باب سے ہے۔ پھر نخل کو علاحدہ کر کے ذکر کیا اس کے باقی میووں پر مزید فائدے اور شرف کی وجہ سے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ﴾ یہ جمع ہے "كِمٌّ" بالکسر کی۔ "كِمٌّ" وعائے ثمر ہے، یعنی پھل کا غلاف۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "كِمٌّ" بالکسر اور "كِمَامَةٌ" وعاء الطلع وغطاء النور ہے (یعنی خرما کے پہلے شگوفے کا ظرف اور شگوفے کا غلاف)۔ اس کی جمع "كِمَامٌ وَأَكِمَّةٌ وَأَكْمَامٌ وَأَكَامِيمُ" ہے[4] اور "كِمٌّ" وہ شے ہے جو کسی شے کو چھپاتی ہے اسی معنی سے "كُمُّ قَمِيصٍ" بالضم ہے، یعنی کرتے کی آستین۔ اس کی جمع "كِمَامٌ وَكِمَمَةٌ" ہے (عبارت منتہی الارب کی یہ ہے: "كُمٌّ" بالضم آستین "أكمام وكممة كعنبة جمع انتهىٰ)۔ اور "كُمَّةٌ:

---

[1] تفسیر القرطبي (١٥٥/١٧) [2] تفسیر الطبري (١٥/٢٣) [3] فتح القدیر (١٧٦/٥) [4] الصحاح (٣٠٢/٦)

قَلَنْسُوَةٌ مُدَوَّرَةٌ"، یعنی گول ٹوپی ہے، اس لیے کہ وہ سر کو ڈھانکتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ شگوفۂ خرما کا غلاف جو اس کو چھپائے ہوتا ہے اس لیے اس کو "کِمٌّ" کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ زمین میں وہ معہود کھجور کے درخت ہیں جن کے شگوفوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اس درخت سے اور اس کے میوے سے اور اس کے غلافِ شگوفہ سے الگ الگ قسم کا نفع لیا جاتا ہے، گویا پورا درخت نعمتوں کا جھاڑ ہے۔ یہ تو اس بنا پر ہے کہ "أَكْمَامٌ" سے مراد شگوفوں کے غلاف ہیں یا "أَكْمَامٌ" سے ہر وہ شے مراد لی جائے جو اسے ڈھانکتی ہے، یعنی اس کا پوست اور اس کی شاخیں اور اس کا شگوفہ، یا غلاف یعنی وہ درختِ خرما جس کو یہ چیزیں ڈھانک رہی ہیں اور اُن سب سے نفع لیا جاتا ہے، جیسا کہ ان چیزوں سے نفع لیا جاتا ہے جو ڈھانکی گئی ہیں، یعنی اس کا میوہ کہ جس میں لذت اور غذا دونوں ہیں اور اس کا جُمّار، یعنی گابھا سفید لطیف شیریں اور اس کا تنا جو مکان وغیرہ میں کام آتا ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿ذَاتُ الْأَكْمَامِ﴾ "ذَاتُ اللِّيفِ"[1] (پوست درختِ خرما) اس لیے کہ خرما کا درخت لیف سے چھپایا جاتا ہے اور اس کا "کمام" وہ لیف ہے جو اس کی گردن میں ہوتی ہے، یعنی وہ درختِ خرما کہ پوست والا ہے جس کے میوے سے اور اس کے پوست سے الگ الگ نفع لیا جاتا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: "ذَاتُ الطَّلْعِ قَبْلَ أَنْ يَنْفَتِقَ"[2] یعنی خرما کا وہ درخت جو شگوفے والا ہے جس کا شگوفہ ابھی شق نہیں ہوا، اس کو دیکھنے سے اس کے مالک کا جی کیسا خوش ہوتا ہے، اس حالت میں اس کی صورت عجیب خوشنما نظر آتی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: "ذَاتُ الْأَحْمَالِ"[3] یعنی خرما کا وہ درخت کہ میوے کے بوجھ سے بھاری ہو رہا ہے اور جھکا پڑتا ہے، اس حالت میں اس کا اور ہی جمال ہوتا ہے، اس کی کیفیت کو کھجور والے ہی خوب جانتے ہیں۔

غرضیکہ پہلے تفکہ کا ذکر کیا، پھر اس شے کا ذکر کیا جو تفکہ اور غذا کی جامع تھی۔ اب اس کا ذکر کیا جو قوت اور غذا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ﴾ جن دانوں سے قوت کیا جاتا ہے، یعنی غذا لی جاتی ہے، وہ سب "حب" ہیں، جیسے گیہوں، جَو، جوار اور چاول۔ امام سدی اور فراء رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "عصف"، بقل الزرع ہے۔ یہ وہ شے ہے جو پہلے پہل کھیتی سے اُگتی ہے۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا: کھیتی پہلے پتے ہو کر ظاہر ہوتی ہے، پھر اس کا تنا نکلتا ہے، پھر اللہ پاک اس میں غلاف پیدا کرتا ہے، پھر غلافوں میں دانے پیدا فرماتا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ کھیتی میں سے اس کے پکنے سے پہلے کاٹتے ہیں تو یوں بولتے ہیں: "خَرَجْنَا نَعْصِفُ الزَّرْعَ"، یعنی نارسیدہ کشت کے کاٹنے کو عصف کہتے ہیں۔ اسی طرح صحاح میں بھی کہا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا "عصف"، تبن ہے، یعنی گھاس۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/٢٣) [2] تفسیر الطبري (١٧/٢٣) [3] تفسیر القرطبي (١٥٦/١٧)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: درختوں اور کھیتی کے پتے ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ سبز کھیتی کے پتے ہیں، جبکہ اس کا سر کاٹا جائے اور خشک ہو جائے۔ اس معنی سے ''کعصف مأکول'' ہے، یعنی اس کھیتی کے مثل کہ اس کے دانے تو کھا لیے گئے اور اس کی گھاس باقی رہ گئی۔ کسی نے کہا ہے کہ ''عصف'' بہ معنی ''زرع کثیر'' ہے۔ ''يُقَالُ: قَدْ أَعْصَفَ الزَّرْعُ إِذَا كَثُرَ وَمَكَانٌ مُعْصِفٌ أَيْ: كَثِيْرُ الزَّرْعِ'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''عصف'' تبن، یعنی گھاس ہے اور ''ریحان'' ''خُضرة الزرع'' یعنی سبزی کھیتی کی۔ دوسرا لفظ ان کا یہ ہے کہ ''عصف'' کھیتی کے پتے ہیں جبکہ خشک ہو جائیں اور ''ریحان'' وہ ریحان ہے جس کو زمین اُگاتی ہے جو سونگھا جاتا ہے۔ ان کا تیسرا قول یہ ہے کہ ''عصف'' وہ کھیتی ہے جو پہلے پہل سبزی ہو کر نکلتی ہے اور ''ریحان'' جبکہ اپنے تنوں پر سیدھی کھڑی ہوتی ہے اور ابھی اس کی بالیاں نہیں نکلیں۔ ان کا چوتھا قول یہ ہے کہ ہر ریحان جو قرآن میں ہے وہ رزق ہے۔[2] صحاح میں کہا ہے کہ ریحان ایک معروف ومشہور روئیدگی ہے اور ریحان رزق ہے۔ ''تَقُوْلُ: خَرَجْتُ أَبْتَغِيْ رَيْحَانَ اللّٰهِ''۔ کسی نے کہا ہے کہ ''ریحان'' ہر سبزی خوشبو ہے۔

امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا: ''يُقَالُ: شَيْءٌ رَيْحَانِيٌّ وَرَوْحَانِيٌّ أَيْ: لَهُ رَوْحٌ'' امام حسن، قتادہ، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا: یہ وہ ریحان ہے جو سونگھا جاتا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: ریحان وہ ہے جو تنے پر قائم ہو۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: ''عصف'' وہ پتے ہیں جو کھائے نہیں جاتے اور ''ریحان'' ''حب مأکول'' (وہ دانے جو کھائے جائیں) ہیں۔ نیز امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''عصف مأکول'' ہے کھیتی سے اور ''ریحان مالا یؤکل'' ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''عصف'' بہائم کا، یعنی چوپایوں کا رزق ہے اور ''ریحان'' آدمیوں کا رزق ہے اکثر کے قول کے مطابق اور حمیر کی لغت میں ''ریحان'' بہ معنی رزق ہے۔

جمہور نے ﴿ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴾ کو بہ رفع پڑھا، ﴿ فٰكِهَةٌ ﴾ پر عطف کیا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابن عامر، ابوحیوہ اور مغیرہ رحمہم اللہ نے) تینوں کو بہ نصب پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ الْاَرْضَ ﴾ پر عطف کیا ہے، یا فعلِ مقدر نکالا ہے۔ ''أَيْ: وَخَلَقَ الْحَبَّ'' اور کسی نے (یعنی امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے) ﴿ اَلْحَبُّ ﴾ اور ﴿ ذُو ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے بنا بر عطف بر ﴿ فٰكِهَةٌ ﴾ اور ﴿ اَلرَّيْحَانُ ﴾ کو جر دیا بنا بر عطف بر ﴿ اَلْعَصْفِ ﴾۔[3] اول کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ زمین میں دانے ہیں پتے والے تر یا خشک بنا بر اختلافِ اقوال اور روزی ہے۔ یا ﴿ اَلرَّيْحَانُ ﴾ جس کو سونگھتے ہیں، یعنی دانے وہ تو آدمیوں کا رزق ہے اور اس کا بھس اور پتے چوپایوں کا چارا ہے اور دوسرے کی بنیاد پر یہ معنی ہیں کہ ان سب اشیاء کو پیدا کیا۔ اور تیسرے کی بنا پر یہ معنی ہیں کہ زمین میں دانے بھس والے اور رزق والے۔ سو

---

[1] تفسير القرطبي (١٥٧،١٥٦/١٧) فتح القدير (١٧٦/٥) [2] تفسير الطبري (٢١_١٨/٢٣)

[3] تفسير القرطبي (١٥٨،١٥٧/١٧) فتح القدير (١٧٧،١٧٦/٥)

ان کا بھس تو چوپایوں کا چارہ ہے اور ان کا لب (خلاصہ، مغز) آدمیوں کی غذا ہے۔ ''عصف'' اور ''ریحان'' کے معنی میں جو مختلف اقوال ہیں جن کا پہلے ذکر ہوا اور یہاں مذکور ہیں کچھ تو مکرر ہیں اور بعض جدید ہیں۔ اگر آدمی پورے طور پر غور کرے تو تینوں قراءتوں کی بنا پر ان کو درست کر سکتا ہے۔ یہ اختلاف لغات کے اعتبار سے ہے۔

بالجملہ پہلے تو اللہ پاک نے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا اور ان کا احسان رکھا، پھر فرمایا: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ یعنی اس احسان وانعام کے بعد اور نعمتوں کے بعد پھر تم اپنے رب کی نعمتوں میں کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟ کیا ان نعمتوں کی تکذیب کرو گے جن کا یہاں ذکر ہوا، یا ان کے علاوہ نعمتوں کی تکذیب کرو گے۔ تکذیب سے مراد انکار ہے اور خطاب انسانوں اور جنوں کو ہے۔ اس لیے ''أنام'' کا لفظ ان کو اور ان کے غیر کو عام ہے، پھر اس خطاب کو عقلاء کے ساتھ خاص کیا۔

جمہور مفسرین اسی کے قائل ہیں اور اسی پر آیندہ کی آیت ﴿ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴾ [الرحمن: ٣١] دال ہے اور اسی پر وہ حدیث شریف دال ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے سورۃ الرحمٰن جنوں اور انسانوں پر پڑھی۔[1] کسی نے کہا ہے کہ خطاب انسانوں کو ہے اور اس کو عرب کے قاعدے کے مطابقہ تثنیہ کیا کہ وہ واحد کو بہ لفظِ تثنیہ مخاطب کرتے ہیں، چنانچہ ﴿ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ ﴾ [قٓ: ٢٤] میں اس پر کلام گزر چکا ہے، (قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزل میں بھی یہ ایک قول ہے)۔ ﴿ اٰلَآءِ ﴾ بہ معنی ''نعم'' ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سارے مفسروں کا قول ہے، اس کا واحد ''إِلًى'' مثل ''مِعًى وَعَصًا'' ہے اور ''إِلْيٌ وَأَلْيٌ'' یہ چار لغت ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے ان کو نقل کیا ہے۔ قاموس میں ''أَلْوٌ'' زیادہ کیا ہے۔[2] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: بہ معنی قدرت ہے: ''أَيْ: فَبِأَيِّ قُدْرَةٍ'' امام کلبی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''فَبِأَيِّ نِعْمَةِ اللّٰهِ'' اور فرمایا کہ مراد انسان اور جن ہیں۔[4] اللہ سبحانہ نے اس صورت میں اس آیت کی اکتیس (۳۱) جگہ تکرار فرمائی ہے، ایسا نعمت کی تقریر کے لیے اور نعمت کو یاد دلانے کے لیے کیا ہے بنا بر عادتِ عرب اتساع میں، یعنی وسعتِ کلام میں۔ ان میں سے آٹھ بار تو ان آیتوں کے بعد اس آیت کا ذکر کیا گیا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے عجائب و بدائع کا شمار ہے اور خلق کی ابتداء اور معاد کی تعداد کا ذکر ہے، پھر سات بار ان آیتوں کے بعد ذکر کی گئی ہے جن میں نار اور اس کی سختیوں کا ذکر ہے، یہ جہنم کے دروازوں کی گنتی کے مطابق ہے۔ ان کے بعد آلاء کا ذکر اس لیے حسین ہوا کہ بلاؤں کا دور کرنا اور سزا اور عذاب میں تاخیر کرنا بھی ان آلاء اور نعمتوں میں سے ہیں۔ ان سات کے بعد آٹھ بار دو جنتوں کے وصف میں اور ان کے اہل کے وصف

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] القاموس المحيط (١/١٦٢٧)
[3] تفسير القرطبي (١٧/١٥٩) [4] تفسير الطبري (٢٣/٢٣)

کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔ یہ جنت کے دروازوں کی تعداد کے مطابق ہے، ان کے بعد اور آٹھ دفعہ ذکر کی گئی ہے، ان دو جنتوں کے بیان کے ساتھ جو پہلے ذکر کی گئی دو جنتوں کے علاوہ ہیں۔ یہ بات ﴿ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴾ [الرحمن: ٦٢] سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا جس شخص نے پہلے کی آٹھ کا اعتقاد کیا اور ان کے مطابق عمل کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان دونوں آٹھوں کا مستحق ہوا اور اللہ تعالیٰ اس کو پہلی مذکورہ سات سے بچائے گا۔ (أفاده شيخ الإسلام في متشابه القرآن)

قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اس سورت میں اپنی نعمتوں کا شمار کیا ہے اور مخلوق کو اپنی نعمتیں یاد دلائی ہیں، پھر ہر خصلت جس کو وضع کیا ہے اس کے بعد اس آیت کو لایا ہے اور اس کو ہر دو نعمتوں کے درمیان فاصلہ ٹھہرایا ہے، تا کہ ان کو نعمتوں پر آگاہ کرے اور اُن سے ان کا اقرار کرائے، مثلاً: جس شخص پر تم نے پے در پے احسان کیا ہے اور وہ اس کی ناشکری کرتا ہے تو تم اس سے کہو: کیا تو فقیر نہ تھا تو میں نے تجھے غنی کیا؟ کیا پھر تو اس کا انکار کرتا ہے؟ کیا تو گمنام نہ تھا تو میں نے تجھے عزت دی، کیا پھر تو اس کا انکار کرتا ہے؟ کیا تو پیدل نہ تھا تو میں نے تجھے سواری دی، کیا پھر تو اِس کا انکار کرتا ہے؟ کیا تو ننگا نہ تھا تو میں نے تجھے کپڑے پہنائے، کیا پھر تو اس کا انکار کرتا ہے؟ ایسے مقام پر تکرار خوب و مرغوب ہوتی ہے۔ اشعارِ عرب میں اس قسم کی تکرار بہت آئی ہے اسی معنی سے شاعر کا قول ہے:

لَا تَقْتُلِي رَجُلًا إِنْ كُنْتِ مُسْلِمَةً   إِيَّاكِ مِنْ دَمِهِ إِيَّاكِ إِيَّاكِ

یعنی مت قتل کرو تو مرد کو اگر تو مسلمان ہے، بچ تو اس کے خون سے اور بچ تو، بچ تو۔

کلامِ عرب میں ایسا کلام شائع (عام، مشہور) ہے۔ یہاں اللہ پاک نے اس سورت میں وہ شے ذکر کی ہے جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے، یعنی انسان کو پیدا کرنا اور اس کو بیان سکھانا اور سورج چاند، زمین و آسمان وغیرہ کا بنانا من جملہ ان اشیاء کے جن کا اپنی خلق پر انعام کیا اور جنوں اور انسانوں کو اشیائے مذکورہ کے ساتھ مخاطب فرمایا، اس لیے کہ ان سب کا ان پر انعام کیا گیا ہے۔ حسین بن الفضل نے کہا ہے کہ تکریر کا مقصد غفلت کو بھگانا اور حجت کی تاکید کرنا ہے۔[1] ایک جماعت جس میں امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ ہیں، اس طرف گئی ہے کہ تکریر اس لیے ہے کہ مختلف نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اسی لیے ہر ایک کے ساتھ توقیف مکرر کی گئی ہے۔[2]

امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کو خطاب کے لفظ سے ذکر کیا گیا توجہ دلانے کے لیے اور اس سے مراد تقریر و زجر ہے۔[3] اور لفظ ﴿ رَبِّ ﴾ اس لیے ذکر کیا کہ یہ رحمت کو ظاہر کرتا ہے اور یہ لفظ اس سورت میں بار بار لایا گیا، یا تو تاکید کے لیے، اور خصوصِ عدد کے لیے کوئی معنی عقل میں نہیں آتے ہیں۔ جلال محلی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں استفہام تقریر کے لیے ہے، اس حدیث کے سبب سے جو حاکم نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر سورۃ الرحمٰن پڑھی۔ الحدیث۔[4] اس قسم کی حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔

---

[1] فتح القدير (١٧٧/٥) [2] اللباب في علوم الكتاب (٣١٢/١٨) [3] تفسير الرازي (٨٤/٢٩، ٨٥)

[4] تفسير الجلالين (٧٠٩/١) البتہ مرفوع روایت کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے یہ بات اَخذ کی جاتی ہے کہ اس سورت کو جو پڑھنے والا ہے، اس کے سامع کے لیے یہ مسنون ہے کہ قاری کو ہر بار جب وہ آیتِ مذکورہ کو پڑھے تو اسے وہ جواب دے جس کا ذکر کیا گیا جیسا کہ جنوں نے کیا اور نبی ﷺ نے ان کو اس پر برقرار رکھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے سکوت میں ان کو ملامت فرمائی۔ گازرونی نے اپنی تفسیر میں سُنّیت کی تصریح کی ہے۔[1] امام ابو السعود رحمہ اللہ کی صنیع (توجیہ) اس کی مقتضی ہے کہ استفہام توبیخ اور انکار کے لیے ہے۔

ان کا بیان یہ ہے کہ حرفِ فاء اس شے پر انکار و توبیخ کی ترتیب کے لیے ہے جس کی تفصیل کی گئی، یعنی طرح طرح کی نعمتیں اور قسم قسم کی مہربانیاں جو حتمی طور پر شکر و ایمان کی موجب ہیں اور تعرض ہیں عنوانِ ربوبیت کے لیے جو کل مالکیت اور تربیت کی خبر دے رہی ہے مع اضافت کے طرف ان کی ضمیر کے جو نکیر و تشدید و توبیخ کے لیے ہے۔ ان کا نعمتوں کو جھٹلانا اس کے معنی ہیں ان کا یا تو سرے سے ان کے نعمت ہونے کا انکار کرنا، جیسے قرآن کی تعلیم اور جو دینی نعمتیں اس کی طرف مستند ہوتی ہیں، یا اللہ کی طرف سے ان کے ہونے کا انکار کر کے مع اس اقرار کے کہ وہ فی نفسہٖ نعمت ہیں، جیسے دنیا کی نعمتیں۔[2]

ان کے کفرِ مذکور کی تعبیر کے ساتھ تکذیب کی، اس لیے کہ آلائے مذکورہ کا دلالت کرنا، اس کے وجوبِ ایمان وشکر پر شہادت ہے ان ﴿ اٰلَآءِ ﴾ کی طرف سے۔ تو ان کا ﴿ اٰلَآءِ ﴾ کا کفر اور انکار کرنا لا محالہ ان کی تکذیب ہوئی، یعنی پھر جب بات ایسی ٹھہری جس کی تفصیل کی گئی تو پھر اپنے مالک اور مربی کی ان نعمتوں میں سے کس نعمت کی تکذیب کرو گے، باوجود اس کے کہ ان میں سے ہر نعمت حق اور صداقت کی گواہی دیتی ہے۔ اور تمھارا مالک و مربی وہ ہے جس نے ان نعمتوں کے ساتھ تمھاری تربیت کی ہے۔ ساری سورت میں لفظ ﴿ اٰلَآءِ ﴾ اپنی اصل پر پڑھا گیا مد کے ساتھ، توسط کے ساتھ اور قصر کے ساتھ۔[3] (كذا في فتح البيان) پھر جب اللہ پاک نے عالمِ کبیر کا ذکر کیا، یعنی آسمان و زمین کا اور جو کچھ اُن میں ہے تو عالمِ صغیر کا ذکر کیا، یعنی انسان۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿١٤﴾ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿١٥﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿١٦﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿١٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿١٨﴾ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿٢٠﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢١﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿٢٢﴾ ﴾

---

[1] فتح البيان (١٣/٣٢٠)
[2] تفسير أبي السعود (١٧٨)
[3] فتح البيان (١٣/٣١٣-٣٢٠)

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾ وَلَہُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ
کَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾

اس نے انسان کو ٹھیکرے جیسی کھنکتی مٹی سے پیدا کیا⑭ اور اس نے جن کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا⑮ پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟⑯ (وہی) دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا رب ہے⑰ پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سے نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟⑱ رحمان نے دو سمندر جاری کیے جو باہم ملتے ہیں⑲ ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے، وہ دونوں (اس سے) تجاوز نہیں کرتے⑳ پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟㉑ ان دونوں سمندروں سے موتی اور مرجان (مونگے) نکلتے ہیں㉒ پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟㉓ اور اسی کے ہیں چلنے والے جہاز (اور کشتیاں) جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اُٹھے ہوئے ہیں㉔ پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے㉕

جن وانس کی تخلیق کا بیان:

﴿ مَارِجٍ ﴾ (بغیر دھوئیں کے آگ) بہ معنی طرفِ لہب نار ہے (یعنی آگ کے شعلے کا کنارہ، وہ دھوئیں سے خالص ہوتا ہے۔) یہ قول امام ضحاک رحمہ اللہ کا ہے جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے۔ امام عکرمہ، مجاہد، حسن اور ابن زید رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے ان کے یہ الفاظ روایت کیے ہیں: ''مِنْ لَهَبِ النَّارِ مِنْ أَحْسَنِهَا'' یعنی آگ کے شعلے سے اس کے خوب تر سے۔ ان کا تیسرا قول (یہ علی بن ابی طلحہ کی روایت ہے) یہ ہے کہ ''مِنْ خَالِصِ النَّارِ'' اسی طرح امام عکرمہ اور ضحاک رحمہما اللہ وغیرہم نے بھی کہا ہے۔[1] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے اور جن ﴿ مَارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴾ سے اور آدم علیہ السلام اس شے سے پیدا کیے گئے جس کا تمھارے لیے وصف کیا گیا، یعنی مٹی سے۔[2] (أخرجه الإمام أحمد ورواه مسلم عن محمد بن رافع وعبد بن حميد كلاهما عن عبد الرزاق)

دو مشرقوں اور مغربوں کا رب:

''مشرقین و مغربین'' سے مراد سردی و گرمی کے دو مشرق و مغرب ہیں۔ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴾ [المعارج: ٤٠] ''پس میں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی قسم کھاتا

① تفسير الطبري (٢٧،٢٦/٢٣) ② صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٦) مسند أحمد (١٥٣/٦)

ہوں، یقیناً ہم قادر ہیں۔'' یہ سورج کے طلوع ہونے کی مختلف جگہوں کے بارے میں ہے اور ہر روز اس کے اس نئی جگہ سے لوگوں کی طرف طلوع ہونے کے بارے میں ہے۔ اور آیت میں فرمایا ہے: ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴾ [المزمل: ۹] ''(وہ) مشرق و مغرب کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اسی کو کارساز بنا لیجیے۔'' اس سے مراد جنسِ مشارق اور مغارب ہے، چوں کہ ان مشرقوں اور مغربوں کے مختلف ہونے میں جنوں اور انسانوں کے لیے مصلحتیں ہیں اسی لیے فرمایا: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾۔

دو طرح کے سمندر اللہ تعالیٰ کا انعام:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ اَلْبَحْرَيْنِ ﴾ "أي: أرسلهما"[1] یعنی دو دریاؤں کو چھوڑ دیا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ يَلْتَقِيٰنِ ﴾ یعنی ان کو اس سے منع کیا کہ دونوں مل جائیں اس برزخ یعنی رکاوٹ کے سبب جو ان کے درمیان میں ٹھہرا دی ہے، جو اُن میں فاصل ہے، یعنی آڑ ہے۔[2] اور ''بحرین'' سے مراد کھارا اور شیریں دریا ہیں۔ شیریں تو یہی ندیاں ہیں جو لوگوں کے درمیان ظاہر اور جاری ہیں۔ سورۃ الفرقان میں زیرِ آیت: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَّجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾ [الفرقان: ۵۳] ''اور وہی ہے جس نے دو سمندر آپس میں ملا رکھے ہیں، یہ ہے میٹھا اور مزیدار اور یہ کھاری کڑوا، اور ان دونوں کے درمیان ایک حجاب اور مضبوط اوٹ کر دی۔'' اس پر کلام گزر چکا ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہاں یہ اختیار کیا ہے کہ ''بحرین'' سے مراد بحرِ سماء و بحرِ ارض' ہے اور وہ اس قول کو امام مجاہد، سعید بن جبیر، عطیہ اور ابن ابزیٰ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: اس لیے کہ موتی آسمان کے پانی سے اور زمینی دریا کی سیپیوں سے پیدا ہوتے ہیں،[3] گو یہ بات یوں ہے لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ جس طرف گئے ہیں وہ اس سے مراد نہیں ہے، اس لیے کہ لفظ اس کا ساتھ نہیں دیتا، کیونکہ اللہ پاک نے تو یوں فرمایا ہے: ﴿ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴾ یعنی ان کے درمیان میں ایک برزخ، یعنی رکاوٹ کر دی ہے زمین سے تاکہ یہ اس پر زیادتی نہ کرے اور وہ اس پر زیادتی نہ کرے اور ہر ایک دوسرے کو بگاڑ ڈالے اور جو صفت اس سے مقصود ہے اس سے زائل کر دے، حالانکہ ما بین السماء والأرض کا نام برزخ اور حجر محجور نہیں رکھا جاتا ہے۔

﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ موتی اور مونگا دونوں دریا کے مجموع سے نکلتا ہے۔ لہٰذا جب ان میں سے ایک سے یہ پایا گیا تو کافی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ﴾ [الأنعام: ۱۳۰] ''اے جنات اور انسانوں کی جماعت! کیا تمھارے پاس تم میں سے ہی پیغمبر

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۲۴/۱۰) [2] تفسیر الطبري (۳۱/۲۳) [3] تفسیر الطبري (۲۹/۲۳، ۳۰)

نہیں آئے تھے۔'' حالانکہ رسول جو تھے وہ خاص انسانوں سے تھے نہ کہ جنوں سے، یہ اطلاق بے شک صحیح ہے۔

''لؤلؤ'' تو معروف ہے جو سیپی میں پیدا ہوتا ہے۔ رہا ''مرجان'' تو کہا گیا ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے موتی ہیں۔

یہ قول امام مجاہد، قتادہ، ابو رزین اور ضحاک رحمہ اللہ کا ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مرجان بڑے بڑے اور جید موتی ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو بعض سلف سے روایت کیا ہے۔ (ورواه ابن أبي حاتم عن الربيع بن أنس وحكاه عن السدي عمن حدثه عن ابن عباس رضی اللہ عنہما وروى مثله عن علي ومجاهد أيضا ومرة الهمداني كذا في ابن كثير)

کسی نے کہا ہے کہ ''مرجان'' جواہر کی ایک قسم ہے سرخ رنگ کا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿ وَالْمَرْجَانُ ﴾ ''الْخَرَزُ الْأَحْمَرُ'' یعنی سرخ منکے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: فارسی میں بسد ہے۔[1] (رواه السدي عن أبي مالك عن مسروق)

اب رہی یہ آیت ﴿ وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ﴾ [الفاطر: ١٢] ''تم ان دونوں میں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور وہ زیورات نکالتے ہو جنھیں تم پہنتے ہو۔'' سو گوشت تو کھارے اور میٹھے ہر ایک سے ہوتا ہے اور زیور جو ہے وہ صرف کھارے سے ہوتا ہے نہ کہ میٹھے سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نہیں گرا کوئی قطرہ آسمان سے دریا میں، پھر وہ کسی سیپی میں پڑا مگر اس سے کوئی موتی بن گیا۔ اسی طرح عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے اور اتنا زیادہ کیا ہے کہ پھر اگر وہ کسی سیپی میں نہ پڑا تو اس سے عنبرہ اُگا۔[2] (وروي عن ابن عباس رضی اللہ عنہما من غير وجه نحوه عنبرہ یعنی عنبر کا کوئی درخت۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عنبر دریائی نبات ہے، عنبر کی ماہیت میں کئی قول ہیں)۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس وقت آسمان برسا تو دریا میں سیپیوں نے اپنے منہ کھول دیے، چنانچہ جو ان میں پڑا، یعنی کوئی قطرہ ان میں پڑ گیا تو وہ موتی ہے۔[3] اس کی اسناد صحیح ہے۔ چونکہ اس زیور کا بنانا زمین والوں کے لیے ایک نعمت تھی، اس لیے ان پر اس کا احسان رکھا اور فرمایا: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾۔

بادبانی کشتیاں اور بحری جہاز نعمتِ الٰہی ہیں:

﴿ اَلْجَوَارِ الْمُنْشَاٰتُ ﴾ سے مراد کشتیاں اور جہاز ہیں جو دریا میں چلتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن کشتیوں کے بادبان اٹھائے گئے وہ ''منشات'' ہیں اور جن کے بادبان نہیں اٹھائے گئے تو وہ ''منشات'' نہیں ہیں۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ﴿ الْمُنْشَاٰتُ ﴾ سے مراد مخلوقات ہیں، یعنی کشتیاں پیدا کی گئیں۔ ان کے غیر نے کہا: ''مُنْشِاٰت'' بہ کسرِ شین بہ معنی ''بادیات'' ہیں، یعنی کشتیاں ظاہر ہونے والی۔

﴿ كَالْاَعْلَامِ ﴾ یعنی وہ کشتیاں پہاڑوں کی طرح ہیں اپنی بڑائی ہیں اور ان میں جو کچھ تجارت اور کام کاج کا سامان ہے، جو ایک قطر سے دوسرے قطر کی طرف اور ایک اقلیم سے دوسرے اقلیم کی طرف منتقل کیا جاتا ہے، ان اشیاء

---

[1] تفسير الطبري (٣٣/٢٣) تفسير ابن كثير (٣٤٦/٤) [2] تفسير الطبري (٣٥/٢٣، ٣٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٤/١٠) [4] تفسير الطبري (٣٧/٢٣)

کے جن میں لوگوں کے لیے اچھائیاں ہیں اور فائدے ہیں اور ہر قسم کا سامان اور اسباب جس کی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے، یہ کشتیاں اس کو کھینچ لاتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴾۔ عمیرہ بن سعد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ فرات کے کنارے پر تھا کہ جس وقت ایک کشتی آئی، اس کے بادبان اٹھائے ہوئے تھے تو انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور کہا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: ﴿ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَاٰتُ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴾ قسم ہے اس کی جس نے ان کو اٹھایا ہے! وہ چلتی ہیں اس کے دریاؤں میں، نہیں قتل کیا میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو اور نہ میں نے اس کے قتل پر کسی قسم کا تعاون اور مدد کی۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

اللہ پاک نے جو یہاں انسان کی پیدایش کا ذکر فرمایا تو یہ اس بات پر توبیخ کی تمہید ہے کہ ثقلین میں سے ہر ایک کی ذات کے ساتھ جو نعمتیں متعلق ہیں، ان کے واجب شکر میں خلل اندازی کی۔ یہاں انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر اہلِ تاویل متفق ہیں۔[2] اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ انسان سے مراد جنس ہو، کیونکہ بنی آدم اپنے باپ آدم علیہ السلام کی پیدایش کے ضمن میں ﴿ صَلْصَالٍ ﴾ سے پیدا کیے گئے ہیں، یعنی اس خشک مٹی سے جس پر انگلی مارنے سے آواز سنائی دیتی ہے۔

انگلی یہ معلوم کرنے کے لیے مارتے ہیں کہ کیا اس میں کچھ عجیب ہے یا نہیں۔ (مٹی کے برتن کا امتحان اسی طرح کیا جاتا ہے کہ اس پر انگلی مارتے ہیں، اگر وہ برتن پھوٹا نہیں ہوتا تو ٹن ٹن بولتا ہے اور اگر وہ جوجرا ہوتا ہے تو ایسی آواز نہیں آتی۔) کسی نے کہا ہے کہ ﴿ صَلْصَالٍ ﴾ وہ مٹی ہے جو ریت سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "طِينٌ مُنْتِنٌ" ہے، یعنی بدبودار گارا۔ جب گوشت میں بو پیدا ہو جاتی ہے تو عرب کے محاورے میں بولتے ہیں: "صَلَّ اللَّحْمُ وَأَصَلَّ"، یعنی گوشت بُس گیا (خراب ہو گیا)۔ اس کا بیان سورۃ الحجر میں گزر چکا ہے۔[3] ﴿ كَالْفَخَّارِ ﴾ یعنی وہ مٹی ٹھیکری کی طرح خشک تھی جو آگ سے پکائی گئی۔ یعنی اللہ پاک نے انسان کو ایسی مٹی سے پیدا کیا جو اپنی خشکی میں ٹھیکری کی طرح تھی۔ اب اگر کہو گے کہ انسان کی پیدایش کے بارے میں، جو آدم علیہ السلام ہیں، مختلف عبارتیں آئی ہیں۔

چنانچہ اللہ پاک نے آلِ عمران میں تو فرمایا: ﴿ مِنْ تُرَابٍ ﴾ یعنی خاک سے۔ اور سورۃ الحجر میں فرمایا: ﴿ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴾ [الحجر: ٢٦] یعنی سیاہ سنے ہوئے گارے سے۔ اور سورۃ الصافات میں فرمایا: ﴿ مِنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴾ [الصافات: ١١] یعنی چپکتے گارے سے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے ایک اور زیادہ کیا۔ ﴿ مِنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ [السجدة: ٨] یعنی ایک ضعیف پانی سے اور یہاں فرمایا: ﴿ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴾ تو کہیں گے کہ ان عبارتوں میں کچھ اختلاف نہیں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٢٤) تفسير ابن كثير (٤/٣٤٥-٣٤٧) [2] تفسير القرطبي (١٧/١٦٠) [3] رقم الآية (٢٦)

ہے۔ بلکہ معنی متفق ہیں، اس لیے کہ اللہ پاک نے پہلے تو اس کو پیدا کیا ﴿ تُرَابٍ ﴾ سے، پھر اس کو ﴿ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴾ کیا جبکہ وہ پانی سے خلط ہوا۔ پھر ﴿ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴾ یعنی سیاہ بدبودار گارا ہوا، پھر جب وہ سوکھ گیا تو کھنکھناتی مٹی ہو گئی ٹھیکری کی طرح۔[1]

خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں جو مذکور ہے ان کی آخر تخلیق رحمانیت سے ہے یہ زیادہ تر مناسب ہے اور اس کے سوا اور سورتوں میں کبھی تو مبدائے خلق کا ذکر ہے اور کبھی اثنائے خلق کا، پس زمین تو ان کی ماں ہے اور پانی ان کا باپ ہے، یہ دونوں ہوا سے ملائے گئے جو اس گرمی کی حامل ہے جو جہنم کی بھاپ سے ہے، چنانچہ مٹی سے تو ان کا جسم اور نفس ہے اور پانی سے ان کی روح اور عقل اور آگ سے ان کی غوایت وحدت اور ہوا سے ان کی حرکت ہے اور ان کا اپنی تعریف اور مذمت کی باتوں میں لوٹنا پوٹنا ہے۔

ان کی جبلت میں مٹی غالب ہے، اسی لیے وہ اس کی طرف منسوب ہوئے، اگرچہ ان کی پیدائش چاروں عناصر سے ہوئی ہے جس طرح کہ جن چاروں عناصر سے بنا ہے، لیکن اس کی جبلت میں آگ غالب ہے، اس لیے وہ اس کی طرف منسوب ہوا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴾ یعنی پیدا کیا ابوالجن کو یا ابلیس کو یا جنسِ جن کو ایک خاص نار کے شعلے سے۔ پہلا ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائے غایت کا ہے اور دوسرا ﴿ مِنْ ﴾ بیانیہ ہے یا تبعیض کا۔ ﴿ نَارٍ ﴾ سے مراد مخصوص نار ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴾ [الليل: ١٤] ''میں نے تو تمھیں شعلے مارتی ہوئی آگ سے ڈرا دیا ہے۔'' ﴿ مَارِجٍ ﴾ لہب صافی ہے نار سے۔ کسی نے کہا ہے کہ خالص آگ۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی زبان جو اس کی طرف میں ہوتی ہے جبکہ وہ شعلہ مارتی ہے، یعنی زبانۂ آتش۔

امام لیث رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلشُّعْلَةُ الصَّاعِدَةُ ذَاتُ اللَّهَبِ الشَّدِيْدِ" یعنی اوپر کو چڑھنے والا سخت بھڑکنے والا شعلہ۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: "اَلنَّارُ الْمُرْسَلَةُ الَّتِيْ لَا تُمْنَعُ"۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "خلط النار" جو "مَرَجَ إِذَا اخْتَلَطَ وَاضْطَرَبَ" سے ماخوذ ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴾ "نَارٌ لَا دُخَانَ لَهَا، خُلِقَ مِنْهَا الْجَانُّ"۔[2] ''وہ آگ جس کا دھواں نہ ہو، اسی سے جنوں کو پیدا کیا گیا۔'' کسی نے کہا: وہ ہے جس کا بعض بعض سے مختلط ہوا۔ "لہب" سرخ و زرد و سبز جو آگ کے اوپر کو آتی ہے جب وہ جلائی جاتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ملی جلی آگ سے بنایا۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ پھر تم اپنے رب کی کیا کیا نعمتیں جھٹلاؤ گے؟ بے شک تمھارے رب نے جو تم کو ان چیزوں سے بنایا اس پیدا کرنے کی پیچیدگیوں میں تم پر ایسی نعمتوں کا انعام کیا جن کا شمار نہیں کیا جاتا تو پھر تم نے ان اصلوں سے عبرت کیوں نہیں لی تو آخرت کی تصدیق کرتے شاید تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات پاتے۔

جمہور نے ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر

---

[1] تفسير الخازن (٤/٧)
[2] تفسير القرطبي (١٦١/١٧)

ہے: "أَيْ: هُوَ رَبُّهُمَا" یا یہ مبتداء ہے اور ﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ ﴾ خبر ہے اور ما بین جملہ معترضہ ہے، لیکن قولِ اول زیادہ مناسب ہے۔ (ابن ابی عبلہ نے "رَبِّ" کو بہ جر پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ رَبِّكُمَا ﴾ کا بدل ہے یا بیان۔ مکی نے کہا کلام میں: جائز ہے خفض بنا بر بدل ﴿ رَبِّكُمَا ﴾ سے، گویا مکی نے اطلاع نہ پائی اس پر کہ یہ ایک قراءت منقولہ ہے، قالہ السمین)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورج کے لیے ایک مطلع اور ایک مغرب (غروب ہونے کی جگہ) سردی میں ہے اور ایک مطلع (طلوع ہونے کی جگہ) اور ایک مغرب گرمی میں ہے جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ مشرق فجر کا اور مشرق شفق کا اور مغرب شمس کا اور مغرب شفق کا۔[1] ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ یعنی اپنے رب کی کیا کیا نعمتیں جھٹلاؤ گے جس نے تمھارے لیے یہ عظیم تدبیر کی۔

کیا ان بے شمار فائدوں کی تکذیب کرو گے جو اس میں ہیں، مثلاً: ہوا کا اعتدال اور فصلوں کا اختلاف اور اس شے کا واقع ہونا جو ہر فصل کے لیے مناسب ہے، یا ان کے سوا اور فائدوں کی تکذیب کرو گے۔ بے شک اس میں بے شمار نعمتیں ہیں اور جو کوئی اپنے نفس سے انصاف کرے گا تو ان نعمتوں میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب اس سے نہ ہو سکے گی۔ ﴿ مَرَجَ ﴾ بہ معنی تخلیہ و ارسال (بھیجنا) ہے۔ "يُقَالُ: مَرَجْتُ الدَّابَّةَ إِذَا أَرْسَلْتَهَا"۔ اس کی اصل اہمال (یونہی چھوڑ دینا، دیر لگانا) جس طرح کہ جانور چراگاہ میں چھوڑا جاتا ہے۔

امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ دو دریا بحرِ فارس و روم ہیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کھاری دریا اور میٹھی ندیاں ہیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ بحرِ مشرق و مغرب ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ بحرِ لؤلؤ و مرجان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بحرِ سماء و ارض ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بحرِ روم اور بحرِ ہند ہیں اور تم ان کے درمیان میں حاجز ہو۔ معنی یہ ہیں کہ تخلیہ، اہمال و ارسال کیا ہے، ان میں سے ہر ایک باہم ایک دوسرے کے متجاور (ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے) اور متماس (ایک دوسرے کو چھونے والے) ہیں روئے زمین پر۔ بظاہر دیکھنے میں ان کے درمیان کوئی فصل (جدا ہونا، الگ ہونا) نہیں ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ دونوں ہر سال ملتے ہیں۔[3] (شاید یہ اس قول کی بناء پر ہو کہ ﴿ اَلْبَحْرَيْنِ ﴾ سے مراد ''بحر السماء'' اور ''بحر الأرض'' ہے) کسی نے کہا ہے کہ ان دونوں کی طرفیں ملتی ہیں اور اس کے باوجود وہ مختلط نہیں ہوتے، یعنی خلط ملط نہیں ہوتے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ ﴾ یعنی ایک حاجز ہے (آڑ ہے) جو ان کے درمیان رکاوٹ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بَرْزَخٌ ﴾ جزائر ہیں (یہ اس قول کی بنا پر ہے کہ مراد بحرِ فارس اور بحرِ روم ہے)۔

﴿ لَا يَبْغِيٰنِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتا ہے اس طرح کہ اس میں داخل ہو جائے اور اس سے مختلط ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ لوگوں کو غرق کرنے کے ساتھ طغیانی نہیں کرتے ہیں۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٢٣، ٣٣٢٤) [2] تفسير الطبري (٢٣/٣٠) تفسير القرطبي (١٧/١٦٢)
[3] تفسير القرطبي (١٧/١٦٢)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دو دریاؤں کو ارسال کیا ان کے درمیان ایک حاجز (آڑ) ہے۔ وہ آپس میں مختلط نہیں ہوتے، ان کے درمیان ایک ایسی دوری ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتا۔[1] خطیب میں ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس حد سے آگے نہیں بڑھتا جو اس کے خالق نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ نہ ظاہری طور پر نہ باطنی طور پر، یہاں تک کہ شیریں دریا جو کھاری دریا میں داخل ہوتا ہے، وہ اپنے حال پر باقی ہے وہ کھاری سے نہیں ملا، چنانچہ جب تم کھاری کے پہلو میں بعض جگہوں میں کھودو تو وہاں شیریں پانی کو پاؤ گے۔ امام بقاعی رحمہ اللہ نے کہا: بلکہ گڑھا کھاری کے جتنا قریب ہوگا، اتنا ہی اس سے نکلنے والا پانی زیادہ شیریں ہوگا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آنکھ کے دیکھنے میں تو ان کو خلط کر دیا ہے اور غیب قدرت میں ان کے درمیان ایک حاجز بنا دیا ہے۔ یہ تو ان کا حال ہے، حالاں کہ وہ جماد ہیں، نہ ان کو بولنے کی طاقت ہے اور نہ ادراک، پھر اے عاقلو! تمھارا بعض دوسرے پر کیوں زیادتی کرتا ہے۔[2] امام محلی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ دو دریاؤں کو ارسال کیا، ایک میٹھا اور ایک کھارا، وہ دیکھنے میں تو آپس میں ملے ہوئے ہیں، ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ایک حاجز ہے ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتا کہ اس سے مختلط ہو جائے۔[3]

علامہ نسفی رحمہ اللہ کا بیان یہ ہے کہ کھارے اور میٹھے دریا کا ارسال کیا، درآنحالیکہ وہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ظاہری طور پر ان کے پانیوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں، لیکن اللہ کی قدرت سے ان کے درمیان ایک حاجز ہے، وہ اپنی حدوں سے تجاوز نہیں کرتے اور ایک دوسرے پر ممازجت (مل جانا) کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے۔[4] قاضی صاحب کا بیان یہ ہے کہ کھارے اور میٹھے دریا کا ارسال کیا، وہ دونوں باہم متجاور ہوتے ہیں اور ان کی سطحیں ایک دوسرے کو چھوتی ہیں۔ یا بحرِ فارس اور بحرِ روم کو ارسال کیا اور وہ دریائے محیط میں ملتے ہیں، کیوں کہ وہ دو خلیج ہیں، اس سے منشعب (شاخ در شاخ۔ علاحدہ) ہوتے ہیں ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ایک حاجز ہے۔ ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتا ممازجت کرنے کے ساتھ جو اُن کے درمیان میں ہے۔[5]

مطلب یہ ہے کہ ﴿ اَلْبَحْرَيْنِ ﴾ سے مراد اگر کھارے اور میٹھے دریا ہوں گے تو ان کے آپس میں ملنے سے یہ مراد ہوگا کہ ایک کا دوسرے سے متصل ہونا اور تماس ان کی سطحوں کا بانتہائے عذب بہ سوئے مالح کہ عذب مالح کی طرف جاری ہو، کیوں کہ اس وقت اُن کے درمیان میں ایک آڑ ہو گی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کہ ایک دوسرے پر اس طرح سے زیادتی نہ کرے کہ اس سے مل جائے اور اس کی خاصیت کو باطل کر دے۔ اور اگر مراد بحرِ فارس و روم ہوں گے تو التقا سے مراد ان کا دریائے محیط میں ملنا ہوگا اور ان کے درمیان کی حاجز سے مراد زمین ہو گی اور بغی سے مراد اپنی حد

① تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۲٤) ② نظم الدرر للبقاعي (۷/۳۸۲) ③ تفسير الجلالين (۱/۷۰۹)
④ تفسير النسفي (٤/۲۰۱) ⑤ تفسير البيضاوي (٥/۲۷٥)

سے بڑھنا ہوگا، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی مقرر حد سے آگے نہیں بڑھتا اور روئے زمین پر پھیل نہیں جاتا، کون سی روئے زمین جو ان کے درمیان حاجز ہے اور نہ اس کو غرق کرتا ہے۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ یعنی اپنے رب کی کیا کیا نعمتیں جھٹلاؤ گے؟ پس بے شک یہ نعمت اور قدرت اور اس جیسی اور ایسی نعمتیں ہیں کہ ان کی تکذیب کسی حال میں بھی بن نہیں آتی۔

جمہور نے ﴿ يَخْرُجُ ﴾ کو بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام نافع اور ابوعمرو رحمہ اللہ نے) بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ لؤ لؤ دُر ہیں، یعنی موتی اور مرجان سرخ منکے جو معروف ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لؤ لؤ بڑے موتی ہیں اور مرجان چھوٹے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جمیع اہلِ لغت کا قول ہے۔ امام مقاتل، سدی اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: لؤ لؤ چھوٹے موتی ہیں اور مرجان بڑے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مرجان ”عظام اللؤلؤ“ یعنی بڑے موتی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لؤ لؤ وہ ہیں جو اس میں سے بڑے ہیں اور مرجان چھوٹے موتی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”مرجان خرز أحمر“ ہیں، یعنی سرخ منکے۔ ﴿ مِنْهُمَا ﴾ فرمایا، حالانکہ یہ صرف کھاری دریا سے نکلتے ہیں میٹھے سے نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ ان میں سے ایک سے نکلے تو درحقیقت دونوں سے نکلے۔ امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام ابوعلی فارسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حذفِ مضاف کے باب سے ہے۔ ”أَيْ: مِنْ أَحَدِهِمَا“ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [الزخرف: ۳۱] ”یہ قرآن ان دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔“ اور محاورے میں بولتے ہو کہ ”خَرَجْتُ مِنَ الْبَلَدِ“ یعنی میں شہر سے نکلا، حالانکہ تم کسی محلے سے نکلے ہو اس کے محلات میں سے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: ایک قوم نے زعم کیا ہے کہ موتی شیریں دریا سے نکلتے ہیں۔[1] کسی نے کہا: وہ دو دریا ہیں، ان میں سے ایک سے تو موتی نکلتے ہیں اور دوسرے سے مرجان۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ دونوں نہیں نکلتے مگر کھاری اور میٹھے کے ملنے کی جگہ سے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ بحرِ سماء و بحرِ ارض ہیں، چنانچہ جب آسمان کا پانی دریا کی سیپی میں پڑا تو موتی منعقد ہوا۔ پس وہ دونوں سے خارج ہوا۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اعتبار کے لحاظ سے اولیٰ ہے، بعض لوگوں کے کلام سے، چنانچہ من جملہ جائز یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ہانک لاتا ہے شیریں دریا سے کھاری دریا کی طرف اور اتفاق یہ ہوا کہ وہ ان کو نہیں نکالتے مگر کھاری سے اور جب خشکی میں ایسی اشیاء ہیں کہ تاجروں پر مخفی رہتی ہیں جو آمد و رفت رکھنے والے اور بیابانوں کو طے کرنے والے ہیں تو پھر اس شے کا کیا ذکر جو دریا کی تہہ میں ہے۔

[1] تفسير القرطبي (١٧/١٦٣) فتح القدير (٥/١٧٨)

امام ابن عادل رحمہ اللہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں سے خطاب نہیں کرتا اور نہ ان پر احسان رکھتا ہے، مگر اس شے کا جو ان کی جانی پہچانی اور دیکھی ہوئی ہوتی ہے۔[1] یہ جواب تکلف سے خالی نہیں ہے۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ پس بے شک موتی مونگے کے نکلنے میں وہ نشانیاں ہیں، ان کی تکذیب کی کوئی طاقت نہیں رکھتا اور نہ ہی کوئی ان کے انکار پر قادر ہے۔ ﴿ اَلْجَوَارِ ﴾ سے مراد وہ کشتیاں ہیں جو دریا میں چلنے والی ہیں۔ سفینہ کا نام جاریہ رکھا، اس لیے کہ اس کی شان سے جاری ہونا ہے، گو وہ کنارے میں ٹھہری ہوئی کیوں نہ ہو، چنانچہ دوسری جگہ اس کا نام جاریہ رکھا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴾ [الحاقة: ١١] ''جب پانی میں طغیانی آ گئی تو اس وقت ہم نے تمھیں کشتی میں چڑھا لیا۔'' اور اس کا نام فلک رکھا قبل اس کے کہ وہ ایسی نہ تھی، یعنی جاری نہ تھا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا ﴾ [هود: ٣٧] ''اور ایک کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے بنا۔''

پھر اس کے بعد کہ اس کو بنا چکے تو اس کا نام سفینہ رکھا، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ ﴾ [العنكبوت: ١٥] ''پھر ہم نے انھیں اور کشتی والوں کو نجات دی۔'' امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ پہلے فلک ہے، پھر سفینہ، پھر جاریہ۔[2] مملوکہ عورت کو بھی جاریہ کہتے ہیں، اس لیے کہ اس کی شان سے جری وسعی ہے، اپنے مالک کی حوائج میں بخلاف زوجہ کے۔ پس لفظ ''جارية'' من جملہ صفاتِ غالبہ ہے۔ جمہور نے ﴿ اَلْجَوَارِ ﴾ کو بہ کسر راء وحذفِ یاء پڑھا ہے، اس لیے کہ منقوص ہے بروزن فواعل اور حرفِ یاء لفظاً محذوف ہے اور حسن رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی سیدنا عبداللہ بن مسعود، ابو عمر ''في رواية عنه'') نے بہ رفعِ راء پڑھا ہے، اس لیے کہ محذوف کو بالکل بھلا دیا[3] اور کسی نے (یعنی یعقوب نے) بہ اثباتِ یاء پڑھا ہے[4] وقف میں۔ رسم (لکھنے) میں یہ حرف ثابت نہیں رکھا جاتا، اس لیے کہ یہ من جملہ یا آتِ زوائد ہے۔

﴿ اَلْمُنْشَاٰتُ ﴾ بہ معنی مرفوعات ہے، یعنی وہ کشتیاں کہ ان کی بعض لکڑیاں بعض پر اٹھائی گئی اور ترکیب دی گئی ہیں، یہاں تک کہ وہ بلند و دراز ہو گئیں کہ دریا میں پہاڑوں کی مثل بن گئیں۔ ''أعلام'' بہ معنی جبال ہے۔ ''علم'' کوہِ طویل کو کہتے ہیں۔ دریا میں کشتیوں کو پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دی، جو خشکی میں ہوتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْمُنْشَاٰتُ ﴾ بہ معنی ''مخلوقات للجري'' ہے، یعنی کشتیاں جو چلنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: بہ معنی ''مجریات'' ہیں[5] یعنی کشتیاں جو چلائی گئی ہیں۔ کسی نے کہا: ''محدثات مسخرات'' یعنی ایجاد کی گئیں کام میں لگائی گئیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ''الرافعات الشرع'' یعنی بادبانوں کو اٹھانے والی یا وہ کشتیاں جو اپنے چلنے سے موجوں کو اٹھاتی ہیں۔ سورۃ الشوریٰ میں اس پر کلام گزر چکا ہے۔[6] ''بحر'' کو مفرد اور

---

(1) اللباب في علوم الكتاب (١٨/٣١٩) (2) تفسير الرازي (٢٩/٩١) (3) اللباب في علوم الكتاب (١٨/٣٢١)
(4) تفسير القرطبي (١٧/١٦٤) (5) تفسير القرطبي (١٧/١٦٤) (6) رقم الآية (٣٢)

"أعلام" کو جمع کیا یہ عظمتِ بحر کی طرف اشارہ ہے۔ جمہور نے ﴿ اَلْمُنْشَاٰتُ ﴾ کو بہ فتحِ شین پڑھا ہے اور کسی نے یعنی حمزہ اور ابو بکر فی روایۃ عنہ نے بہ کسرِ شین پڑھا ہے۔[1] ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک یہ ایسی ظاہر اور واضح قدرت اور نعمت ہے جس کی تکذیب ممکن نہیں اور نہ ہی اس کا انکار ممکن ہے۔[2]

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٨﴾ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿٢٩﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٠﴾

ہر چیز، جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والی ہے (26) اور آپ کے رب ذوالجلال والاکرام کا چہرہ باقی رہے گا (27) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (28) جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، اسی سے مانگتا ہے، وہ ہر روز (ہر وقت) ایک (نئی) شان میں ہوتا ہے (29) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (30)

بقا ودوام صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ سارے زمین والے عن قریب جاتے رہیں گے اور سب کے سب مر جائیں گے۔ اسی طرح آسمان والے بھی مگر جن کو اللہ چاہے گا اور کوئی باقی نہ رہے گا سوائے اس کے وجہِ کریم کے۔ پس بے شک رب تعالیٰ وتقدس نہ مرے گا، بلکہ وہ تو ایسا حی ہے کہ کبھی نہ مرے گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس شے کی خبر دی جو پیدا کی پھر خبر دی کہ یہ سب فانی ہیں۔ دعائے ماثور میں ہے: "يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ يَا بَدِيعَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ بِرَحْمَتِكَ نَسْتَغِيثُ، أَصْلِحْ لَنَا شَأْنَنَا كُلَّهُ وَلَا تَكِلْنَا إِلَى أَنْفُسِنَا طَرْفَةَ عَيْنٍ وَلَا إِلَى أَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ" یعنی اے زندہ، اے تھامنے والے آسمانوں کے اور زمین کے نئے بنانے والے اور اے بزرگ وتعظیم والے! نہیں ہے کوئی معبود مگر تو۔ تیری رحمت کے ساتھ ہم فریاد رسی چاہتے ہیں، تو ہمارا سارا حال درست کر دے اور ہم کو ہمارے نفوس کی طرف مت سونپ طرفۃ العین اور نہ اپنی خلق میں سے کسی کی طرف۔

امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس وقت تو پڑھے: ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴾ تو چپ نہ رہ یہاں تک کہ تو پڑھے: ﴿ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴾[3] یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ﴾ [القصص: ٨٨] "ہر چیز فنا ہونے والی ہے مگر اس کا منہ۔" اللہ پاک نے اس آیتِ کریمہ میں اپنے وجہِ کریم

---

(1) تفسير القرطبي (١٦٤/١٧) (2) فتح البيان (٣٢٠/١٣_٣٢٥) (3) تفسير ابن كثير (٣٤٧/٤)

کی یہ صفت فرمائی کہ وہ ﴿ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ ہے، یعنی وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی بزرگی کی جائے تو اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے تو اس کی مخالفت نہ کی جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ [الكهف: ٢٨] ''اور اپنے آپ کو انہیں کے ساتھ رکھا کر جو اپنے پروردگار کو صبح شام پکارتے ہیں اور اسی کے چہرے کا ارادہ رکھتے ہیں (رضا مندی چاہتے ہیں)۔''

وکقوله تعالى: إخبارا عن المتصدقين: ﴿ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ ﴾ [الدهر: ٩] ''ہم تو تمھیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لیے کھلاتے ہیں۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''ذُوالْعَظْمَةِ وَالْكِبْرِيَاءِ''[1] اور جب یہ خبر دی کہ سارے زمین والے مرنے میں برابر ہیں اور وہ عن قریب دارِ آخرت کی طرف جائیں گے، پھر ان میں ذوالجلال والاکرام اپنے حکم سے فیصلہ کرے گا، تو فرمایا: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾۔

اللہ تعالیٰ غنی و بے پروا ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴾ میں اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ وہ اپنے ماسوا سے غنی اور بے نیاز ہے اور ساری خلائق ساری گھڑیوں اور وقتوں میں اس کی محتاج ہے، اس لیے کہ وہ اپنی زبانِ حال وقال سے اسی سے مانگتے ہیں اور ہر دن وہ ایک شان میں ہے۔ عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا: (قاله الأعمش عن مجاهد عنه) اس کی شان سے ہے کہ وہ پکارنے والے کو جواب دیتا ہے اور سائل کو عطا کرتا ہے، قیدی کو رہائی دیتا ہے یا بیمار کو شفا دیتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: (قاله ابن أبي نجيح عنه) ہر دن وہ کسی پکارنے والے کو جواب دیتا ہے، کسی کرب کو کھولتا ہے، کسی مضطر کو جواب دیتا ہے اور کسی گناہ کو بخشتا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سے آسمان والے اور زمین والے بے نیاز نہیں ہوتے ہیں۔ وہ کسی حی کو جلاتا ہے (زندہ رکھتا ہے) اور کسی میت کو مارتا ہے اور کسی صغیر کو پالتا ہے اور کسی قیدی کو رہا کرتا ہے اور وہ حاجاتِ صالحین کا منتہیٰ ہے اور ان کا فریاد رس ہے اور ان کے شکوے کا منتہیٰ ہے۔[2] سوید بن جبلہ فزاری کہتے ہیں کہ بے شک رب تمھارا ہر دن ایک شان میں ہے: ''فَيُعْتِقُ رِقَابًا وَيُعْطِي رِغَابًا وَيُقْحِمُ عِقَابًا'' یعنی وہ آزاد کرتا ہے گردنوں کو اور مرغوب چیزیں عطا کرتا ہے اور عذاب میں داخل کرتا ہے۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم)

منیب بن عبداللہ بن منیب ازدی عن ابیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی تو ہم نے عرض کی: یارسول اللہ! وہ کیا شان ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ہے کہ بخشتا ہے کسی گناہ کو، کھولتا ہے کسی کرب کو اور بلند کرتا ہے کسی قوم کو اور پست کرتا ہے دوسروں کو۔[4] (أخرجه ابن جرير وأخرجه الحسن بن سفيان في مسنده والبزار والطبراني وأبو الشيخ في العظمة و ابن منده و ابن مردويه و أبو نعيم و ابن عساكر۔ فتح البيان)

---

① تفسير الطبري (٨٦/٢٣) ② تفسير الطبري (٢٣/٣٨، ٣٩) ③ تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٢٤، ٣٣٢٥)

④ تفسير الطبري (٤٠/٢٣) مسند البزار (٣٩/١٠) المعجم الأوسط (٢٧٨/٣) فتح البيان (٣٢٨/١٣)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ان الفاظ میں روایت کیا ہے: ”قَالَ: قَالَ اللّٰهُ عزوجل: «﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ﴾ قَالَ: مِنْ شَأْنِهِ أَنْ يَّغْفِرَ ذَنْبًا وَيُفَرِّجَ كَرْبًا وَيَرْفَعَ قَوْمًا وَيَضَعَ آخَرِيْنَ » (وأخرجه البخاري في تاريخه و ابن ماجه و ابن أبي عاصم و زاد البزار ”ويحبيب داعيا“ كذا في فتح البيان، وقد رواه ابن عساكر من طرق متعددة عن هشام بن عمار به) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اسے موقوف روایت کیا گیا ہے، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے بہ صیغۂ جزم معلق روایت کیا ہے اور اسے ابو درداء رضی اللہ عنہ کا کلام قرار دیا ہے۔[1] فالله أعلم.

امام بزار رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ میں بیان کی ہے: « ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ﴾ قَالَ: يَغْفِرُ ذَنْبًا وَيَكْشِفُ كَرْبًا »[2] پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، بے شک اللہ عزوجل نے ایک سفید موتی سے ایک لوحِ محفوظ پیدا کی ہے، اس کی دو دفتیاں یاقوت سرخ ہے، اس کا قلم نور ہے اور اس کی کتاب نور ہے اور اس کا عرض مابین سماء وارض ہے، اس میں ہر روز تین سو ساٹھ مرتبہ نظر کرتا ہے، ہر نظر میں پیدا کرتا ہے اور جلاتا ہے اور مارتا ہے اور عزت دیتا ہے اور ذلیل کرتا ہے اور کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ زمین پر جو بھی حیوانات وغیرہ ہیں وہ سب ہلاک ہونے والے ہیں۔ عقلاء کو غیر عقلاء پر تغلیب دے کر سب کی تعبیر لفظ ﴿مَنْ﴾ کے ساتھ کر دی۔ اس معنی کی بنا پر اب اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آیت کی تخصیص جنت اور نار وحور و ولدان و حجب وعرش وارواح کے علاوہ اور چیزوں کے ساتھ کی جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد جن اور انسان ہیں جو زمین پر ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ یہ آیت ﴿يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ اٰنٍ﴾ تک اس میں نعمتیں نہیں ہیں، پھر کیوں ان میں سے ہر ایک کے بعد ﴿فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ کہا ہے؟ تو کہیں گے کہ روزِ قیامت کی ہولناکیاں اور مجرموں کو سزا جس کا وصف کیا گیا ہے، اس میں معاصی سے ڈرایا گیا ہے اور طاعات کی ترغیب دی گئی ہے اور یہ من جملہ اعظم احسانات ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نعمت کی وجہ فنائے خلق میں یہ ہے کہ موت دارِ جزا وثواب کی طرف منتقل ہونے کا سبب ہے۔

یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ نے کہا: موت کیا اچھی شے ہے، پس وہی تو حبیب کو حبیب کے قریب کرتی ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ایک پل ہے جو حبیب کو حبیب کی طرف پہنچا دیتا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: نعمت کی وجہ یہ ہے کہ خلق کے فنا کرنے میں تسویہ (برابری) ہے ان کے درمیان موت میں اور موت کے ساتھ سب اقدام برابر ہو جاتے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۲۵/۱۰) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۰۲) مسند البزار (۷۳/۱۰) فتح البيان (۳۲۸/۱۳) صحيح البخاري (۱۸٤٦/٤) تفسير ابن كثير (۳٤۸/٤)

[2] مسند البزار (۳۱٤/۱۲) [3] تفسير الطبري (٤٠/۲۳) تفسير ابن كثير (۳٤۸،۳٤۷/٤) [4] تفسير النسفي (۲۰۲/٤)

ہیں۔[1] ﴿ وَجْهُ ﴾ اللہ پاک کی ذات اور وجود سے عبارت ہے۔ سورۃ البقرہ میں اس کے معنی کا بیان گزر چکا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اس کی جہت باقی رہے گی جس سے اس کی طرف تقرب کیا جاتا ہے۔ قولِ اول زیادہ بہتر ہے۔

﴿ رَبِّكَ ﴾ کا خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، یا ہر اس شخص کو جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ میں تو دو کو مخاطب کیا اور یہاں واحد کو خطاب کیا، اس لیے کہ یہاں ہر ایک کی طرف اشارہ واقع ہوا ہے۔ تو فرمایا اور باقی رہے گا تیرے رب کا وجہ اے سامع! تاکہ ہر ایک یہ جان لے کہ اس (اللہ) کے علاوہ سب فانی ہیں پس اگر "يَبْقَى وَجْهُ رَبِّكُمَا" فرماتا تو ہر ایک اپنے نفس کو اور اپنے رفیق مخاطب کو فنا سے نکال لیتا۔ "وَيَبْقَى وَجْهُ الرَّبِّ" نہ فرمایا بغیر خطاب کے باوجود اس کے کہ یہ سب کے فنا ہونے پر زیادہ دال ہے، اس لیے کہ رب میں کاف خطاب کا اشارہ لطف (نرمی) کی طرف ہے ابقائے قہر کی طرف اشارہ ہے، حالاں کہ یہ جگہ لطف اور نعمتوں کے شمار کی جگہ ہے، اسی لیے بہ لفظِ "رب" و بہ کافِ خطاب فرمایا۔

﴿ ذُو الْجَلٰلِ ﴾ یعنی صاحبِ عظمت و کبریا ہے اور وہ صاحب ہے تمام تعریفوں کی صفات کے استحقاق کا۔ یعنی ہر قسم کی تعریفیں صرف اسی کی حق میں ہیں۔ جب شے عظیم ہوتی ہے تو بولتے ہیں: "جَلَّ الشَّيْءُ وَأَجْلَلْتُهُ أَيْ: أَعْظَمْتُهُ"، "جَلَالٌ" اسم ہے "جَلَّ" سے۔ جمہور نے ﴿ ذُو ﴾ پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ وَجْهُ ﴾ کی صفت ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "ذِيْ" پڑھا ہے اس بنیاد پر کہ ﴿ رَبِّكَ ﴾ کی صفت ہے۔[3] "ذو الإكرام" کے یہ معنی ہیں کہ وہ کریم اور بزرگ ہے ہر اس شے سے جو اس کے لائق نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے دوستوں کے لیے صاحبِ اکرام ہے۔

چنانچہ پہلے تو خلق کی فنا اور اپنی بقا کا ذکر فرمایا، اس کے بعد خود کو اکرام کے ساتھ موصوف کیا، تو اس میں اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ ان کے فنا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم کے آثار کا ان پر افاضہ فرمائے گا، یعنی فیض پہنچائے گا جس طرح کہ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ ﴾ اس کی خبر دے رہا ہے، کیونکہ ان کو حیاتِ ابدی کے ساتھ زندہ کرنا اور نعیمِ مقیم کے ساتھ ان کو ثواب دینا جلیل اور عظیم تر نعمتوں سے ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: « أَلِظُّوا بِيَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ »[4] (أخرجه الترمذي وقال الحاكم: حديث صحيح الإسناد) یعنی اس دعا کو لازم پکڑو اور اس کی کثرت کرو۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ پھر اپنے رب کی کیا کیا نعمتیں جھٹلاؤ گے؛ کیا ان نعمتوں کی تکذیب کرو گے، یعنی رب کا باقی رہنا کل کا فانی ہونا اور دائمی زندگی اور نعیمِ مقیم، یا ان کے علاوہ اور کچھ۔ سیدنا و شیخنا صاحب فتح البیان رحمہ اللہ نے اس معنی میں کیا خوب فرمایا ہے:

---

[1] تفسير القرطبي (١٦٥/١٧) [2] رقم الآية (١١٥) [3] فتح القدير (١٨٠/٥)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٢٥) مستدرك الحاكم (٦٧٦/١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٣٦)

تَفْنَى السُّقَاةُ وَتَفْنَى الْكَأْسُ وَالنَّادِيْ وَمَنْ تُلَاقِيْهِ مِنْ خِلٍّ وَمِنْ عَادِيْ
لَا تَرْكَنَنْ إِلَى الدُّنْيَا وَزَهْرَتِهَا يُغْنِيْ الْجَمِيْعَ وَيَبْقَى رَبُّنَا الْهَادِيْ

حقیقت میں یہ خواجہ میر درد دہلوی رحمہ اللہ کی رباعی کا ترجمہ ہے:

ساغر فانی و بزم و ساقی فانی با ہر کہ شدی درد ملاقی فانی
برادر دل از ہستی بی بود جہاں اللہ بود باقی و باقی فانی

''پلانے والے فانی ہیں اور مجلس و پیالہ بھی ختم ہو جانے والے ہیں۔ جس کسی کے ساتھ تو نے محبت سے ملاقات کی وہ بھی فنا ہو جانے والا ہے، دنیا کی بے بنیاد زندگی سے دل اٹھا لے۔ اللہ کو ہمیشہ بقا ہے، باقی سب فنا ہو جانے والے ہیں۔''

ترجمہ کی وجہ یہ ہے کہ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ کو یہ شعر بہت پسند تھے۔ شب کو حسبِ معمول احباب کا جلسہ تھا، ان میں قاضی زین العابدین مرحوم بھی تھے۔ سیدنا نے فرمایا کہ اس رباعی کا ترجمہ عربی کے چار مصرعوں میں ہونا چاہیے، چنانچہ قاضی صاحب مرحوم نے تو تین شعروں میں ترجمہ کیا اور سیدنا مرحوم نے ذرا تامل کے بعد دو ہی شعروں میں ترجمہ کیا اور خوب کیا۔ چونکہ ان کے لفظ و معنی میں دلچسپی تھی اور فتح البیان تالیف ہو رہی تھی، اس لیے اس میں درج کیے گئے۔ واقع میں دنیا ان شعروں کی پوری مصداق ہے۔ وہ ساری محفل تمام ہوگئی اور ساغر و بزم و ساقی و ملاقی سب فنا ہو گئے، اللہ تعالیٰ سب کو بخشے اور ہمارا خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین!

جملۂ ﴿ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ مستانفہ ہے یا حال ہے ﴿ وَجْهُ ﴾ سے اور عامل اس میں ﴿ يَبْقٰى ﴾ ہے۔ ''أَيْ: يَبْقَى مَسْؤُوْلًا مِمَّنْ فِيْهِمَا'' یعنی سارے آسمان و زمین والے اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ اس کے محتاج ہیں۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان والے تو اس سے مغفرت مانگتے ہیں اور اس سے رزق کا سوال نہیں کرتے ہیں اور زمین والے اس سے دونوں چیزیں مانگتے ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین والے اس سے مغفرت و رزق مانگتے ہیں اور فرشتے بھی ان کے لیے رزق اور مغفرت کا سوال کرتے ہیں۔ پس دونوں سوال اہلِ سماء اور اہلِ ارض کے اہلِ ارض کے لیے ہیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1]

کسی نے کہا ہے کہ اس سے رحمت مانگتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ اہلِ سماء و اہلِ ارض اس سے مستغنی نہیں ہوتے، یعنی اپنی ذات اور صفات میں اور ان تمام چیزوں میں جو ان کو فکر میں ڈالتی ہیں اور ان کو پیش آتی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے ہر مخلوق اس سے مانگتی ہے بہ زبانِ قال یا بہ زبانِ حال۔ وہ جو چیز طلب کرتے ہیں وہ دارین کی خیر ہے، یا ان میں سے ایک کی خیر۔ ''ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة

[1] تفسير القرطبي (١٦٦/١٧) فتح القدير (١٨٠/٥)

حسنة وقنا عذاب النار... آمین! سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کے بندوں کا اس سے سوال رزق، موت اور حیات کا ہے۔[1]

﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴾ یعنی اوقات میں سے ہر وقت اللہ پاک ایک شان میں مستقر ہے۔ ﴿ يَوْمٍ ﴾ عبارت ہے وقت سے اور ﴿ شَأْنٍ ﴾ بہ معنی امر ہے تمام حالوں میں۔ اللہ پاک اہلِ سموات و اہلِ ارض کو وہ شے عطا کرتا ہے جو وہ اس سے طلب کرتے ہیں باوجود ان کی حاجات کے مختلف ہونے کے اور ان کی اغراض کے ایک دوسرے سے بعید ہونے کے۔ مفسرین کہتے ہیں: اس کی شان سے یہ ہے کہ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور روزی دیتا ہے، فقیر کرتا ہے غنی کرتا ہے، عزت دیتا ہے ذلیل کرتا ہے، بیمار کرتا ہے شفا دیتا ہے، عطا کرتا ہے روکتا ہے، بخشتا ہے عذاب کرتا ہے، رحم کرتا ہے خفا ہوتا ہے، ان کے سوا اور بے شمار امور ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ہر وقت اور لمحے میں امور کا احداث کرتا ہے اور احوال کی تجدید کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تقدیروں کو ان کے اوقات کی طرف ہانکتا ہے۔

حسین بن فضل رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ یہ اس کی وہ شئون ہیں کہ ان کو ظاہر کرتا ہے نہ وہ شئون کہ ان کی ابتداء کرتا ہے۔ ابوسلیمان دارانی نے کہا ہے کہ ہر دن میں بندوں کی ایک بر جدید ہے،[2] یعنی نیا دن نیا احسان۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر دن زات میں تین لشکر نکالتا ہے، ایک لشکر تو باپوں کی پشتوں سے ماؤں کے رحموں کی طرف اور ایک لشکر رحموں سے دنیا کی طرف اور ایک لشکر دنیا سے قبروں کی طرف، پھر وہ سب اللہ کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یومِ مذکور سے مراد یومِ دنیا و یومِ آخرت ہے اور دنیا میں اس کی شان جزا و حساب و ثواب وعقاب وغیرہ ہے۔

ابن بحر اور سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کل زمانہ دو دن ہیں: ایک تو ایامِ دنیا کی مدت ہے اور دوسرا روزِ قیامت ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ مراد ایامِ دنیا سے ہر دن ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ شان دون شان کی تخصیص کی جائے، بلکہ آیت اس پر دال ہے کہ اللہ پاک ہر دن ایک شان میں ہے اور اپنی شانوں میں سے وہ کوئی سی شان ہو تعیین کیے بغیر۔ اللہ پاک کی شانوں کا شمار اور احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور ان کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔ تو اب قدرت اور کمالِ قدرت کے مقام سے زیادہ بہتر اور زیادہ مناسب عموم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیتِ کریمہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی، جبکہ انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہفتے کے دن کسی شان کی اور کسی شے کی قضا نہیں کرتا۔ اس پر فرمایا کہ وہ ہر دن ایک شان میں ہے۔ ﴿ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾ بے شک اللہ پاک کی شانوں کا اختلاف اپنے بندوں کے کام کی تدبیر میں ایک ایسی نعمت ہے جس کا انکار ممکن نہیں اور نہ کسی مکذب سے اس کی تکذیب ہو سکتی ہے۔[4] (كذا في فتح البيان)

---

[1] تفسیر الطبري (۲۳/۳۹)
[2] تفسیر البغوي (۷/۴٤۷)
[3] تفسیر البغوي (۷/٤٤٦) تفسیر القرطبي (۱۷/۱۶۶)
[4] فتح البیان (۱۳/۳۲۵-۳۲۸)

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ
اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ
نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾

اے دو بھاری گروہو! (جن و انس) عن قریب ہم تمھارے (حساب کے) لیے فارغ ہوں گے (31) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (32) اے گروہِ جن و انس! اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جانے کی طاقت رکھتے ہو تو نکل جاؤ، قوت اور غلبے کے بغیر تو تم نکل ہی نہیں سکتے (اور قوت تم میں کہاں!) (33) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (34) تم دونوں پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا، پھر تم (اس کے مقابلے میں) ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکو گے (35) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (36)

جن وانس کی سرزنش:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ﴾ کے بارے میں فرمایا ہے (یہ علی بن ابی طلحہ کے الفاظ ہیں) کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے ایک وعید ہے۔ اللہ کا کوئی شغل نہیں ہے کہ وہ فارغ ہو (مطلب یہ ہے کہ یہ تو مخلوق کی شان ہے کہ وہ کسی کام میں مشغول ہو اور اس سے فارغ ہو تو دوسرا کام کرے۔ اللہ پاک اس سے منزہ ہے۔ یہ جو فرمایا ہے تو محاورۂ عرب کے مطابق ایک تہدید یعنی دھمکی ہے)۔ اسی طرح امام ضحاک رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ یہ وعید ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تحقیق فراغت اللہ کے قریب ہوئی اپنی مخلوق کے لیے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: "سَنَقْضِيْ لَكُمْ"[1] یعنی اب ہم تمھارے لیے فیصلہ کر دیں گے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سَنُحَاسِبُكُمْ" یعنی اب ہم تم سے حساب لیں گے، اس کو کوئی شے کسی شے سے مشغول نہیں کرتی۔ یہ بات کلامِ عرب میں پہچانی ہوئی ہے کہ یوں بولتے ہیں: "لَأَتَفَرَّغَنَّ لَكَ" یعنی البتہ میں تیرے لیے فارغ ہوں گا، حالانکہ اس کو کوئی شغل نہیں ہوتا۔[2] مطلب یہ ہے کہ میں تجھے تیری غفلت کی حالت پر

---

(1) تفسير الطبري (٤٢،٤١/٢٣) تفسير ابن كثير (٣٤٨/٤) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤٦/٤)

پکڑوں گا، اس کا مقصد دھمکانا اور ڈانٹنا ہے۔ ﴿ اَلثَّقَلٰنِ ﴾ سے مراد انس و جن ہیں، جیسا کہ صحیح میں آیا ہے: «يَسْمَعُهَا كُلُّ شَيْءٍ إِلَّا الثَّقَلَيْنِ»۔[1] ایک روایت میں ہے۔« إِلَّا الْجِنُّ وَالإِنْسُ »یعنی ہر شے عذابِ قبر کو سنتی ہے سوائے جنوں اور انسانوں کے۔ حدیثِ صور میں ہے:« اَلثَّقَلَانِ الإِنْسُ وَالْجِنُّ »[2]

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴾ یعنی اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! تم اللہ تعالیٰ کے امر و تقدیر سے بھاگنے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ تمھارا احاطہ کیے ہوئے ہے، تم اس کے حکم سے خلاصی پانے پر قادر نہیں ہو اور نہ ہی تم اس کے حکم سے بھاگنے کی قدرت رکھتے ہو۔ تم جہاں کہیں جاؤ وہ تمھارا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ حشر کے مقام میں ہے۔ فرشتے سات صفیں بن کر ہر طرف سے خلائق کا احاطہ کرنے والے ہوں گے تو کوئی بھی وہاں سے جانے کی قدرت نہ رکھے گا، مگر سلطان، یعنی اللہ تعالیٰ کے امر کے ساتھ۔ ﴿ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ الْمُسْتَقَرُّ ﴾ [القيامة ١٠۔ ١٢] ''اس دن انسان کہے گا کہ آج بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ نہیں نہیں کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ آج تو تیرے پروردگار کی طرف ہی قرار گاہ ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [يونس: ٢٧] ''اور جن لوگوں نے بدکام کیے ان کی بدی کی سزا اس کے برابر ملے گی اور ان کو ذلت چھائے گی، ان کو اللہ تعالیٰ سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ گویا ان کے چہروں پر اندھیری رات کے پرت کے پرت لپیٹ دیے گئے ہیں۔ یہ لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اور اسی لیے اللہ سبحانہ نے یوں فرمایا: ﴿ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (بروایت علی بن ابی طلحہ) ﴿ شُوَاظٌ ﴾ لہبِ نار ہے، یعنی آگ کا شعلہ، یا زبانۂ آتش۔ ان کا دوسرا قول (بروایتِ سعید بن جبیر) دخان ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لہبِ سبز منقطع ہے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے، وہ لہب ہے جو آگ کے اوپر ہوتی ہے اور بغیر دھوئیں کے ہوتی ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لہبِ سبز کی سیل۔ ﴿ نُحَاسٌ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے (بروایتِ علی بن ابی طلحہ)، فرمایا کہ دخانِ نار ہے۔ امام ابو صالح، سعید بن جبیر اور ابو سنان رحمہم اللہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ دخان کا نام نحاس رکھتے ہیں، بہ ضم و کسرِ نون اور قراءت کا ضم پر اجماع کیا گیا ہے۔ نحاس بہ معنی دخان کے باب سے۔ نابغۂ بنی جعدہ کا قول ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٣) [2] مسند أحمد (٤٥٣/٥)

يُضِيءُ كَضَوءِ سِرَاجِ السَّلِيْـ ـطِ لَمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ فِيْهِ نُحَاسًا[1]

یعنی تیل کے چراغ کی روشنی کی طرح روشن ہوتا ہے۔ نہیں رکھا اللہ نے اس میں دھواں، یعنی دخان۔

(هكذا قال وقد روى الطبراني من طريق جويبر عن الضحاك إن رافع بن الأزرق... الخ)

امام نافع بن ازرق نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ شُوَاظٌ ﴾ کا پوچھا تو فرمایا: وہ "لہب" ہے جس کے ساتھ دھواں نہیں ہوتا، پھر اس نے لغت سے اس پر شاہد پوچھا تو امیہ بن ابی الصلت کی بیت اس کو پڑھ کر سنائی جو اس نے حسان کے حق میں کہی تھی:

أَلَا مَنْ مُبْلِغٌ حَسَّانَ عَنِّيْ مُغَلْغَلَةً تَدِبُّ إِلَى عُكَّاظِ

أَلَيْسَ أَبُوْكَ قَيْنًا كَانَ فِيْنَا لَدَى الْقَيْنَاتِ فَسْلًا فِيْ الْحُفَّاظِ

يَمَانِيًا يَظِلُّ يَشِبُّ كِيْرًا وَيَنْفُخُ دَائِبًا لَهَبَ الشُّوَاظِ

(قینہ کنیزک سرود گو، داب رنج دیدن درکار و عادت و کار)۔ کہا آپ نے سچ فرمایا۔ پھر نحاس کیا ہے؟ فرمایا: وہ دخان ہے جس کے لیے لہب نہ ہو، کہا پھر عرب اس کو پہچانتے ہیں؟ فرمایا: کیا تو نے نابغہ بنی ذبیان کو نہیں سنا، وہ کہتا ہے: "يُضِيءُ كَضَوءِ ... الخ"[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نحاس صفر ہے (بالضم والکسر روی یعنی تانبا، صفر پیتل کو بھی کہتے ہیں) پگھلایا جائے گا، پھر ان کے سروں پر ڈالا جائے گا۔ اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[3] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَنُحَاسٌ ﴾ یعنی نحاس کی سیل۔ ہر قول کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ اگر تم قیامت کے دن بھاگ کر جاؤ گے تو فرشتے زبانیہ (دوزخ کے دربان) تم کو پھیر لائیں گے، تم پر آگ کی لہب بھیج کر اور پگھلے ہوئے تانبے کے ساتھ، تا کہ تم لوٹ آؤ، اسی لیے فرمایا: ﴿ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ﴾[4] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ جنوں اور انسانوں کو مخاطب کر کے یہ کہنا کہ ہم تمھارے لیے فارغ ہوں گے، یہ ان کو اللہ پاک کی طرف سے ایک وعید شدید ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: محاورے میں بولتے ہیں: "فَرَغْتُ مِنَ الشُّغْلِ أَفْرُغُ فَرَاغًا وَفُرُوْغًا" یعنی میں کام سے فارغ ہوا۔ "أَوِ اسْتَفْرَغْتُ مَجْهُوْدِيْ فِيْ كَذَا أَيْ: بَذَلْتُهُ" یعنی میں نے اپنی طاقت فلاں کام میں خرچ کی۔ امام زجاج، کسائی، ابن الاعرابی اور ابو علی فارسی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ فراغ وہ فراغ نہیں جو کسی شغل سے ہوتا ہے، اس لیے کہ اللہ پاک کا کوئی ایسا شغل نہیں ہے کہ اس سے فارغ ہو اور نہ کوئی شان اس کو کسی شان سے مشغول کرتی ہیں، لیکن اس کی تاویل قصد ہے "أَيْ:

[1] تفسير الطبري (٢٣/٤٥-٤٩) تفسير ابن كثير (٣٤٩/٤) [2] المعجم الكبير (٢٤٨/١٠)

[3] تفسير الطبري (٤٨/٢٣) [4] تفسير ابن كثير (٣٤٨/٤، ٣٤٩)

سَنَقْصِدُ لِحِسَابِكُمْ"، یعنی ہم تمھارے حساب کے لیے یا تمھیں جزا دینے کے لیے یا تمھارے محاسبے کے لیے جلد قصد کرتے ہیں۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے مفسروں سے حکایت کیا ہے، ان میں سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے اپنے بندوں کو دھمکی ہے (چنانچہ یہ قول پہلے گزر چکا ہے)۔ اسی معنی سے کسی کا قول ہے اس شخص کے لیے جو کسی کی تہدید کا ارادہ کرتا ہے کہ "إِذَنْ أَتَفَرَّغُ لَكَ أَيْ: أَقْصِدُ قَصْدَكَ"، "فَرَغَ" بہ معنی "قصد" آیا ہے جو عرب کے اشعار میں موجود ہے۔ (اسی معنی سے شاعر کا یہ قول ہے:

اَلْآنَ قَدْ فَرَغْتُ إِلَى نُمَيْرٍ فَهٰذَا حِيْنَ كُنْتُ لَهُ عَذَابًا

أَيْ: قَدْ قَصَدْتُ. امام نحاس رحمہ اللہ نے یہ قول ذکر کیا ہے:

فَرَغْتُ إِلَى الْعَبْدِ الْمُقَيَّدِ فِيْ الْحَجَلِ

أَيْ: قَصَدْتُ كذا في الفتح) [1]

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "فراغ" لغت میں دو قسم ہے: ایک تو شغل سے فراغت اور دوسرا "قصد للشيء" [2] یعنی کسی شے پر متوجہ ہونا، جیسا کہ یہاں ہے۔ اور کلام تمثیل اور استعارے کے طور پر ہو گا۔ صاحبِ مفتاح اور زمخشری کا رجحان اسی طرف ہے [3] (چنانچہ کہا ہے کہ "فراغ" خلاص ہے مہام سے اور اللہ پاک کو کوئی شان کسی شان سے مشغول نہیں کرتی یہ بطور استعارہ واقع ہوا ہے، اس بات میں کہ اللہ پاک تنہا ہو کر جزا میں شروع کرے گا اور صاحبِ کشاف کے قول سے یہی مراد ہے۔ پس تمثیل کے طور پر اس کو ان کے لیے فارغ ہونا ٹھہرایا ہے)۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے تقویٰ پر وعدہ دیا اور معصیت پر وعید سنائی۔ پھر فرمایا: ہم تمھارے لیے اس شے سے جلد فارغ ہوتے ہیں جس کا ہم نے تم کو وعدہ دیا اور ہر ایک کو اس شے کی طرف پہنچاتے ہیں جس کا اسے وعدہ دیا ہے۔ امام حسن، مقاتل اور ابن زید رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔

جمہور نے ﴿ سَنَفْرُغُ ﴾ کو بہ نون وضمِ راء پڑھا ہے اور کسی نے بہ نون و فتحِ راء پڑھا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بنی تمیم کی لغت ہے اور کسی نے (یعنی اعرج، عیسیٰ ثقفی، اعمش، ابراہیم، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے) بہ کسرِ نون وفتحِ راء پڑھا ہے۔ کسی نے بہ ضمِ یائے تحتیہ وفتحِ راء بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔ اور کسی نے بہ یائے مفتوحہ وضمِ راء بہ صیغۂ معروف "أَيْ: سَيَفْرُغُ اللّٰهُ" پڑھا ہے۔ "أَيُّهُ" بغیر الف مرسوم ہے۔ (جمہور نے ﴿ اَيُّهَا ﴾ بہ فتحِ ہاء پڑھا ہے اور اہلِ شام نے بہ ضمِ ہاء پڑھا ہے۔ [4] كذا في فتح القدير) رہا نطق میں سو ابو عمرو اور کسائی نے ﴿ اَيُّهَا ﴾ بہ الف پڑھا

---

[1] تفسير القرطبي (١٦٨/١٧) فتح القدير (١٨١/٥) [2] معاني القرآن (٩٩/٥)

[3] الكشاف (٤٤٨/٤) [4] فتح القدير (١٨١/٥)

ہے وقف میں اور باقی قراء نے وقف کیا ہے بنا بر رسم "أَيَه"۔ بہ تسکینِ ہاء اور وصل میں ابن عامر نے "أَيُّهُ"۔ بہ ضمِ ہاء پڑھا ہے اور باقی نے بہ فتحِ ہاء پڑھا ہے۔[1]

"ثقلان" جن و انس کا نام کیا ہے دوسرے حیوانات کی نسبت ان کی عظمتِ شان کے سبب سے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس لیے کہ یہ زمین پر ثقل ہیں زندہ اور مردہ دونوں حالتوں میں ان کا اس پر بوجھ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴾ [الزلزال: ۲] ''اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔'' امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا: اس لیے کہ یہ گناہوں سے ثقیل کیے گئے ہیں۔[2] کسی نے کہا: اس لیے کہ تکالیف کے ساتھ بھاری کیے گئے ہیں اور تھکائے گئے ہیں۔ ﴿ لَكُمْ ﴾ میں تو بہ صیغۂ جمع کہا۔

پھر ﴿ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴾ فرمایا، اس لیے کہ یہ دو فریق ہیں اور ہر فریق جمع ہے۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ من جملہ نعم وہ نعمتیں ہیں جو اس تہدید میں ہیں، چنانچہ اس میں سے یہ ہے کہ اس تہدید کے سبب سے برائی کرنے والا تو اپنی برائی سے باز رہے گا اور نیکی کرنے والا اس سے اور زیادہ نیکی کرے گا تو یہ آخرت کی نعمت حاصل کرنے کا سبب بن جائے گا۔ اور حقیقت میں نعیم وہی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ﴾ ﴿ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴾ کے ترجمہ اور بیان کی طرح ہے۔ یہاں جن کا نام پہلے لیا، اس لیے کہ ان کے باپ کی پیدائش آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہے اور اس لیے کہ ان کی جنس کا وجود انسانوں کی جنس سے پہلے ہے۔ یہ خطاب کر کے ان سے آخرت میں کہا جائے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ دنیا میں کہا جائے گا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴾ اس کے آخرت میں ہونے کو ترجیح دیتا ہے، کیوں کہ یہ جو شواظ کا ارسال ہوگا تو یہ قیامت میں ہوگا، جیسا کہ آگے اس کا بیان آتا ہے۔ اور اسی طرح قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ ﴾ ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس بات پر قادر ہو کہ اللہ کی قضا و قدر سے آسمان و زمین کی جوانب و نواحی و اطراف سے بھاگ نکل جاؤ تو ان سے نکل جاؤ اور اپنی گردنوں کو رہا کرو، پس تم جہاں کہیں ہو گے موت تم کو پالے گی۔ جب کوئی شے کسی شے سے رہا ہو جائے جس طرح کہ تیر نکل جاتا ہے کمان سے تو بولتے ہیں: "نَفَذَ الشَّيْءُ مِنَ الشَّيْءِ"۔ نفوذ کا یہ امر، امرِ تعجیزی ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تم رہا ہونے پر قادر نہ ہو گے مگر قدرت و قہر کے ساتھ، حالانکہ تم کو اس پر نہ کسی طرح کی قدرت ہے نہ زور۔ سلطان وہ قوت ہے جس کے سبب سے اس کا صاحب امر پر متسلط ہوتا ہے۔

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٤/٣٦٣) [2] تفسير البغوي (٧/٤٤٧)

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: اس اثنا میں کہ لوگ اپنے بازاروں میں ہوں گے کہ اچانک آسمان کھل جائے گا اور فرشتے اتر آئیں گے تو جن اور انسان بھاگیں گے، پس فرشتے ان کو گھیر لیں گے چنانچہ یہ وہ قول ہے: ﴿ لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ ﴾۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے، اس قول کی بنا پر وہ دنیا میں ہوگا۔ امام ابن مبارک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آخرت میں ہوگا۔ نیز امام ضحاک رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ معنی یہ ہیں: اگر تم طاقت رکھو اس کی کہ موت سے بھاگ جاؤ تو بھاگ جاؤ۔[1] کسی نے کہا: اگر تم یہ طاقت رکھو کہ جان لو اس شے کو جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں تو اس کو جان لو، حالانکہ تم ہرگز اس کو نہ جانو گے مگر سلطان کے ساتھ، یعنی اللہ کی طرف سے بینہ کے ساتھ۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں تم نفوذ نہ کرو گے مگر ملک کے ساتھ، حالانکہ تمھارے لیے کچھ ملک نہیں ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ حرفِ باء، "إلیٰ" کے معنی میں ہے، یعنی تم نفوذ نہ کرو گے مگر سلطان کی طرف۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ تم نہ نکلو گے میری سلطان سے۔[3] ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴾ نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے جو تحذیر و تہدید سے حاصل ہوئی، بے شک وہ نیک کو نیکی کی زیادہ توفیق دیتی ہے اور برائی کرنے والے کو برائی کرنے سے روکتی ہے۔ باوجود اس کے کہ جس نے تم کو خوف دلایا ہے اور ڈرایا ہے، وہ اس پر قادر ہے کہ بغیر مہلت کے تم پر عذاب واقع کر دے۔

﴿ یُرۡسَلُ ﴾ کو جمہور نے بہ ضمہ تحتیہ بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی زید بن علی رحمہ اللہ نے) بہ نون اور نصبِ "شواظ" پڑھا ہے اور جمہور نے ﴿ شُوَاظٌ ﴾ کو بہ ضم شین اور کسی نے (یعنی ابن کثیر رحمہ اللہ نے) بہ کسرِ شین پڑھا ہے، یہ دونوں دو لغت ہیں: ایک ہی معنی میں۔ ﴿ شُوَاظٌ ﴾ کے بارے میں اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: وہ دخان ہے جو لہب سے نکلتا ہے ہیزم کا دخان نہیں ہے۔ امام اخفش اور ابو عمرو رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ شُوَاظٌ ﴾ سے آگ اور دھواں دونوں مراد ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ لہبِ خالص ہے۔ جمہور نے ﴿ وَّ نُحَاسٌ ﴾ کو بہ ضمِ نون پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام مجاہد، عکرمہ، حمید اور ابو العالیہ رحمہم اللہ نے) بہ کسرِ نون پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی مسلم بن جندب و حسن نے) "نحس" پڑھا ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ نُحَاسٌ ﴾ وہ دخان ہے جس کے لیے لہب نہیں ہے۔ خلیل بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: جوش دیے ہوئے تیل کی تلچھٹ ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا: وہ آگ ہے جس کے لیے سخت ہوا ہوتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان پر ایک بار یہ چھوڑا جائے گا، یعنی شواظ اور ایک بار یہ چھوڑا جائے گا یعنی نحاس۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں بیک وقت چھوڑے جائیں بغیر اس کے کہ ایک دوسرے سے ملیں۔ جمہور نے ﴿ وَّ نُحَاسٌ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے ﴿ شُوَاظٌ ﴾ پر عطف کیا ہے اور کسی نے (یعنی ابن کثیر، ابن محیصن، مجاہد اور ابو عمرو رحمہم اللہ

[1] تفسير القرطبي (١٧/١٧٠) [2] تفسير الطبري (٢٣/٤٤) [3] تفسير الطبري (٢٣/٤٣)

نے) بہ جر پڑھا ہے ﴿ نَارٍ ﴾ پر عطف کیا ہے اور دونوں سبعیہ ہیں، لیکن جر کی قراءت میں ﴿ شُوَاظٌ ﴾ کی شین کا کسرہ یا ﴿ نَارٍ ﴾ کا امالہ ضروری ہے۔ چنانچہ جس کسی نے بہ جر پڑھا بغیر احد الامرین کے تو بے شک وہ تلفیق میں پڑا، اس لیے کہ اس وجہ کو کسی نے نہیں پڑھا۔ مہدوی نے کہا: جس نے یہ کہا کہ ﴿ شُوَاظٌ ﴾ سے آگ اور دھواں دونوں مراد ہیں تو اس بنا پر نحاس میں جر متعین ہوگا۔

اب رہا جر اس شخص کے قول پر جس نے ﴿ شُوَاظٌ ﴾ کو لہب ٹھہرایا جس میں دخان نہیں ہے تو بعید ہے جائز نہ ہوگا مگر بر تقدیر حذفِ موصوف۔ پس گویا یوں کہا: "يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِنْ نَارٍ وَشَيْءٌ مِنْ نُحَاسٍ" ("وشيء" معطوف ہے ﴿ شُوَاظٌ ﴾ پر اور "من نحاس" جار ومجرور صفت "شيء" کی، چونکہ ﴿ مِنْ نَارٍ ﴾ میں کلمہ ﴿ مِنْ ﴾ مقدم ہو چکا ہے، اس لیے حذف کیا گیا تو ﴿ نُحَاسٌ ﴾ اس بنا پر "مِنْ" محذوف سے مجرور ہوگا۔[1] كما في القرطبي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ﴾ یعنی پھر تم قادر نہ ہو گے اللہ کے عذاب سے باز رہنے پر، یعنی شواظ ونحاس سے، بلکہ یہ تم کو محشر کی طرف ہانک لے جائے گا۔ خطیب نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ جس وقت وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے تو شواظ ان کو محشر کی طرف ہانک لے جائے گا۔[2] واللّٰه أعلم۔ ﴿ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾ بے شک من جملہ نعمتوں کے یہ وعید ہے کہ جس کے باعث شر سے انزجار (ہٹ جانا) ہوتا ہے اور خیر میں رغبت ہوتی ہے۔[3]

فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿٣٧﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٨﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ
وَلَا جَانٌّ ﴿٣٩﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٤٠﴾ يُعْرَفُ
الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ ﴿٤١﴾ فَبِأَيِّ
آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٤٢﴾ هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا
الْمُجْرِمُونَ ﴿٤٣﴾ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ ﴿٤٤﴾ فَبِأَيِّ
آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٤٥﴾

پھر جب آسمان پھٹ جائے گا تو وہ سرخ چمڑے کی طرح لال ہو جائے گا (37) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (38) پھر اس دن کسی انسان اور کسی جن سے اس

[1] تفسير القرطبي (١٨٢،١٨١/١٧) فتح القدير (١٨٢/٥) [2] الكشاف (٤٤٨/٤) [3] فتح البيان (٣٣٢-٣٢٨/١٣)

کے گناہ کی بابت نہیں پوچھا جائے گا (39) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (40) مجرم اپنے چہرے کی علامت ہی سے پہچان لیے جائیں گے، پھر وہ پیشانی کے بالوں اور قدموں سے پکڑے (اور گھسیٹ کر جہنم میں ڈالے) جائیں گے (41) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (42) (انھیں کہا جائے گا:) یہی وہ جہنم ہے جسے مجرم لوگ جھٹلاتے تھے (43) وہ جہنم کے درمیان اور سخت گرم کھولتے پانی کے درمیان چکر لگائیں گے (44) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (45)

روزِ قیامت کی ہولناکیاں اور مجرموں کی صورتِ حال کا ذکر:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: پھر جب قیامت کے دن آسمان پھٹ جائے گا، جیسا کہ یہ آیت اور اس جیسی اور آیتیں جو اس کے معنی میں وارد ہوئی ہیں، اس پر دال ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ١٦] ''اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن بالکل بودا ہو جائے گا۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴾ [الفرقان: ٢٥] ''اور جس دن آسمان بادل سمیت پھٹ جائے گا اور فرشتے لگاتار اتارے جائیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴾ [الانشقاق: ١-٢] ''جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے حکم پر کان لگائے گا اور اسی کے لائق وہ ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴾ یعنی پگھلے گا جیسے تیل کی تلچھٹ پگھلتی ہے اور چاندی گلانے میں پگھلتی ہے اور متلون ہوگا جیسے وہ رنگ متلون ہوتے ہیں جن سے طلا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو سرخ و زرد اور کبھی کبود و سبز ہوگا، روزِ قیامت کی ہولناکیوں اور شدتِ امر کے سبب سے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: «يُبْعَثُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمَاءُ تَطِشُّ عَلَيْهِمْ»[1] (أخرجه الإمام أحمد) یعنی لوگ مبعوث ہوں گے اور آسمان ان پر مطرِ ضعیف برسائے گا۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: طش مطرِ ضعیف ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''هُوَ الْأَدِيمُ الْأَحْمَرُ'' (قاله الضحاك) یعنی سرخ ادھوڑی۔ ان کے دوسرے قول کے الفاظ: ''كَالْفَرَسِ الْوَرْدِ'' ہیں۔ (قاله أبو كدينه عن قابوس عن أبيه عنه. فرس ورد بين الكميت والأشقر۔ اشقر اسبِ سرخ فش و دم و آنرا کہ فش و دم سیاہ و دیگر ہا سرخ کمیت خوانند۔ كذا في الصراح)۔ ان کا تیسرا قول ہے: ''تَغَيَّرَ لَوْنُهَا'' (بروایت عوفی یہ لفظ تغیر ہے تو یہ معنی ہیں کہ اس کا رنگ متغیر ہوگا اور جو تغیر ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ اس کا رنگ تیرہ ہوا یا غبار آلود ہوا۔ واللّٰه أعلم)۔

---

(1) مسند أحمد (٣/٢٦٦) (2) الصحاح (٤/١٤٦)

امام ابو صالح کا قول "كَالْبِرْذَوْنِ الْوَرْدِ" یعنی ستور ورد کی طرح، پھر اس کے بعد مثل دھان کے ہوگا۔[1]

امام بغوی رحمہ اللہ وغیرہ نے یہ بیان کیا ہے کہ فرس ورد ربیع میں تو زرد ہوتا ہے اور سردی میں سرخ، پھر جب سخت سردی ہوتی ہے تو اس کا رنگ تیرہ ہو جاتا ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: "تَكُوْنُ أَلْوَانًا" یعنی کئی رنگ ہو جائے گا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مثل خچر ورد کے ہوگا اور ہوگا مثل مہل کے مثل تیل کی تلچھٹ کے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كَأَلْوَانِ الدِّهَانِ"۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زردی میں ورد کے رنگ و روغن کی طرح۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ آج سبز ہے اور اس دن اس کا رنگ سرخی کی طرف مائل ہوگا۔ "يَوْمَ ذِي أَلْوَانٍ"۔ امام ابو الجوزاء نے کہا: "فِيْ صَفَاءِ الدُّهْنِ" یعنی روغن کی صفائی میں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: آسمان پگھلے ہوئے روغن کی طرح ہو جائے گا اور یہ اس وقت ہوگا جب اس کو جہنم کی گرمی پہنچے گی۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴾ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴾ [المرسلت: ٣٥۔ ٣٦] "آج (کا دن) وہ دن ہے کہ یہ بول بھی نہ سکیں گے، نہ انھیں معذرت کی اجازت دی جائے گی۔" چنانچہ یہ ایک حال میں ہے اور پھر ایک حال میں خلائق سے ان کے سارے اعمال کے متعلق سوال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الحجر: ٩٢۔ ٩٣] "قسم ہے تیرے پالنے والے کی! ہم ان سے ضرور باز پرس کریں گے ہر اس چیز کی جو وہ کرتے تھے۔"

اسی لیے امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ تحقیق سوال ہوا، پھر قوم کے منہ پر مہر کر دی گئی اور ان کے ہاتھ پاؤں بولے جو کچھ وہ کرتے تھے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (بروایتِ علی بن ابی طلحہ) ان سے پوچھے گا کہ آیا تم نے ایسا ایسا کیا، کیونکہ وہ ان سے بڑھ کر جانتا ہے، لیکن وہ کہے گا کہ تم نے ایسا ایسا کیوں کیا؟ چنانچہ پہلا ایک قول ہوا،[4] یہ دوسرا قول ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے مجرم کا نہ پوچھیں گے، ان کے چہرے سے ہی پہچان لیں گے۔[5] یہ تیسرا قول ہے اور یہ اس کے بعد ہے کہ ان کو نار کی طرف جانے کا حکم دیا جائے گا، چنانچہ یہ وہ وقت ہے کہ ان سے ان کے گناہوں کے متعلق نہ پوچھا جائے گا، بلکہ نار کی طرف کھینچے جائیں گے اور اس میں ڈال دیے جائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ ﴾ یعنی مجرم لوگ ان علامتوں سے پہچانے جائیں گے جو ان پر ظاہر ہوں گی۔

امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ان کو ان کے چہروں کے سیاہ ہونے سے پہچان لیں گے اور آنکھوں کی

---

[1] تفسیر الطبري (٢٣/٤٩۔٥٠) تفسير ابن كثير (٤/٣٥٠) [2] تفسير البغوي (٧/٤٩٨، ٤٩٩) تفسير ابن كثير (٤/٣٥٠)
[3] تفسير الطبري (٢٣/٥٢) [4] تفسير الطبري (١٧/١٥٠) [5] تفسير الطبري (٢٣/٥٢)

کبود رنگی سے پہچان لیں گے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: جیسے کہ مومن غرہ اور تحجیل کے آثارِ وضو سے پہچانے جائیں گے (یعنی جو اعضاء وضو میں دھوئے جاتے ہیں، وہ سب سفید نورانی ہوں گے)۔

﴿ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴾ یعنی زبانیہ فرشتے کافر کی پیشانی کے بال جمع کریں گے اس کے دونوں پاؤں کے ساتھ اس طرح کر کے انھیں آگ میں ڈال دیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے (بروایتِ اعمش) مروی ہے کہ اس کی پیشانی کے بالوں سے اور قدموں سے پکڑا جائے گا، پھر اسے توڑا جائے گا جیسے لکڑیاں تنور میں توڑی جاتی ہے۔[2] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمع کیا جائے گا اس کی ناصیہ (چوٹی کے بال) اور قدمین کے درمیان ایک زنجیر میں اس کی پس پشت سے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يُجْمَعُ بَيْنَ نَاصِيَةِ الْكَافِرِ وَقَدَمَيْهِ فَتُرْبَطُ نَاصِيَتُهُ بِقَدَمِهِ وَيُفْتَلُ ظَهْرُهُ"، (یعنی کافر کی پیشانی کے بالوں اور اس کے دونوں قدموں کو جمع کیا جائے گا، پھر اس کی پیشانی کے بال اس کے قدم سے باندھے جائیں گے اور اس کی پیٹھ بل دی جائے گی۔ واللّٰہ أعلم)۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بروایتِ ابن ابی حاتم یہاں ایک حدیث ذکر کی ہے، پھر کہا ہے: "یہ حدیث غریب ہے، اس میں منکر الفاظ ہیں، اس کی سند میں مجہول راوی ہیں، اس طرح کی روایت قابلِ حجت نہیں ہے۔ واللّٰہ أعلم"[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ یعنی ان کو ملامت اور سرزنش اور تصغیر و تحقیر کے طور پر کہا جائے گا: یہ وہ آگ ہے جس کے وجود کی تم تکذیب کرتے تھے، لو اب وہ یہ حاضر ہے جس کو اب تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ ﴿ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴾ ﴿ اٰنٍ ﴾ یعنی کبھی تو وہ جحیم میں عذاب کیے جائیں گے اور کبھی وہ حمیم سے پلائے جائیں گے، یہ وہ پینے کی شے ہے جیسے پگھلا ہوا تانبا۔ یہ انتڑیوں اور پیٹ کے اندر جو کچھ ہے سب کو ٹکڑے کر دے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ ۝ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ۷۱۔ ۷۲] "جبکہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور زنجیریں ہوں گی گھسیٹے جائیں گے کھولتے ہوئے پانی میں، پھر جہنم کی آگ میں جلائے جلائیں گے۔" ﴿ اٰنٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ایسا گرم ہوگا کہ حرارت میں انتہا کو پہنچا ہوگا۔ گرم ہونے کی شدت سے اس کو برداشت کرنے کی طاقت نہ رکھی جائے گی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "قَدِ انْتَهٰى غَلْيُهُ وَاشْتَدَّ حَرُّهُ"، یعنی اس کا جوش دینا انتہا کو پہنچا اور اس کی گرمی سخت ہوئی۔ امام مجاہد، سعید بن جبیر، ضحاک، سدی، حسن اور ثوری رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "قَدْ أَنٰى طَبْخُهُ مُنْذُ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ"[4] یعنی تحقیق اس کے پکنے کا وقت آ پہنچا جب

[1] تفسير الطبري (٢٣/٥٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٢٥)

[3] تفسير ابن كثير (٤/٣٥٠، ٣٥١) [4] تفسير الطبري (٢٣/٥٤، ٥٥)

سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بندہ پکڑا جائے گا، پھر اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر اس حمیم میں حرکت دیا جائے گا، یہاں تک کہ گوشت پگھل جائے گا اور ہڈیاں باقی رہ جائیں گی اور سر میں دونوں آنکھیں رہ جائیں گے۔

یہ اس آیت کی طرح ہے کہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٧٢] ''اور ﴿ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴾ سے مراد ''حار'' ہے۔ امام قرظی رحمہ اللہ سے ایک اور روایت ہے: ﴿ اٰنٍ ﴾ "أي: حاضر"۔ یہ قول ابن زید رحمہ اللہ کا بھی ہے۔[1] یہ قول ﴿ اٰنٍ ﴾ بمعنی حاضر اس قول کے خلاف نہیں ہے جو پہلے قرظی سے مروی ہوا کہ ﴿ اٰنٍ ﴾ بہ معنی "حار" ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴾ [الغاشية: ٥] ''نہایت گرم چشمے کا پانی ان کو پلایا جائے گا۔'' یعنی پلایا جائے گا ایک چشمے سے جو حاضر ہے، سخت حرارت والا ہے، جس کی طاقت نہیں رکھی جاتی۔ نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ﴾ [الأحزاب: ٥٣] ''اس کے پکنے کا انتظار نہ کرتے رہو۔'' یعنی "اِسْتِوَاءُهُ وَنَضْجُهُ"

پس قولہ تعالیٰ: ﴿ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ﴿ حَمِيْمٍ ﴾ نہایت درجہ گرم ہے۔ چونکہ گناہ گاروں اور مجرموں کو عذاب کرنا اور متقین کو عیش و آرام دینا، اپنی خلق پر اللہ پاک کے فضل و رحمت اور عدل و انصاف میں سے ہے اور اس کا ان کو اپنے عذاب اور سزا سے ڈرانا اس قسم سے ہے کہ ان کو اس شرک و معاصی سے زجر کرتا ہے جس میں وہ مبتلا ہیں، اسی لیے اپنی خلق پر اس کا احسان رکھ کر فرمایا: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ اِنْشَقَّتِ ﴾ بہ معنی "اِنْصَدَعَتْ" ہے یعنی جب قیامت کے دن فرشتوں کے اترنے کے ساتھ آسمان پھٹ جائے، یا قیامت قائم ہونے کے لیے اس کا بعض بعض سے "منفك" (جدا، الگ) ہو جائے، یا منفجر ہو جائے تو فرشتوں کے اترنے کے لیے دروازے بن جائے، تاکہ زمین کی ساری اطراف سے عالم کو گھیر لیں کہ ان میں سے کوئی محشر سے نہ بھاگے۔ کسی نے کہا ہے کہ تشقق سماء سے مراد آسمان کا خراب ہونا ہے (یہ یوں ہے کہ ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴾ [الرحمن: ٢٦] سے زمین والوں کی طرف اشارہ کیا تو اس آیت میں آسمان میں رہنے والوں کا حال بیان کیا۔[3] كذا في الخازن)۔

اس میں معاملے کی بڑی ہولناکی اور تعظیم کا بیان ہے، کیوں کہ اس میں اس شے کی طرف اشارہ ہے جو انسانوں اور جنوں پر ﴿ شُوَاظٌ ﴾ کے بھیجنے سے زیادہ عظیم ہے، یعنی آسمان کا شق ہونا اور اس کا پگھلنا جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴾۔ ﴿ فَكَانَتْ وَرْدَةً ﴾ یعنی پھر ہو جائے سرخ گل سرخ کی طرح۔ "ورد"، بمعنی گل

---

[1] تفسير الطبري (٥٥/٢٣) تفسير ابن كثير (٣٥١/٤) [2] تفسير ابن كثير (٣٥٠/٤، ٣٥١) [3] تفسير الخازن (٧/٧)

ہے، یعنی گلاب کا پھول۔ ﴿ كَالدِّهَانِ ﴾ "کانت" کی خبرِ ثانی ہے یا ﴿ وَرْدَةً ﴾ کی صفت ہے، یا "کانت" کے اسم سے حال ہے اور "دهان" کی جمع ہے۔ "دهن" تیل کو کہتے ہیں جیسے: "قرط" کی جمع "قراط" اور "رمح" کی جمع "رماح" ہے۔ یہ اس آیت کے معنی میں ہے: ﴿ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ ﴾ [المعارج: ٨] "جس دن آسمان مثل تیل کی تلچھٹ کے ہو جائے گا۔" "مهل" تیل کی تلچھٹ کو کہتے ہیں یا "دهان" کو۔ یہ اسم مفرد ہے۔ چنانچہ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: اسم ما يدهن به كا، جيسے: "حزام وأدام"۔[1] کسی نے کہا: بہ معنی ادیمِ احمر ہے، یعنی سرخ ادھوڑی اور "إذا" کا جوابِ محذوف ہے: "أَيْ: فَمَا أَعْظَمَ الْهَوْلَ"

مطلب یہ ہے کہ جس وقت آسمان پھٹے گا اور پھٹنے کے بعد "ورد" کی طرح سرخ ہوگا اور رقتِ قوام میں تیل کی طرح ہو جائے گا تو اس وقت کیا بڑی ہول ہو گی۔ امام سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ پھر آسمان سرخ ہو جائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ اسپِ ورد کے رنگ کی طرح ہو جائے گا۔ اسپِ ورد وہ سفید گھوڑا ہے جو سرخی اور زردی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ "دهان" کے معنی میں امام فراء اور ابو عبیدہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ شدتِ گرمی کے سبب سے آسمان مثل ادھوڑی کے ہو جائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول "كَالْأَدِيمِ الْأَحْمَرِ" گزر چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کا رنگ جو اس وقت ہے، یعنی کبود رنگ، اس دن اس کے خلاف ہو گا۔ امام فراء رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ آسمان کے رنگ برنگ ہونے کو اسپِ ورد کے رنگا رنگ ہونے سے تشبیہ دی ہے اور اسپِ ورد کی اس کے رنگوں میں تیل سے تشبیہ دی ہے اور اس کے رنگوں کے مختلف ہونے سے۔ (اس قول سے معلوم ہوا کہ ﴿ وَرْدَةً ﴾ سے تو اسپِ ورد کا رنگ مراد لیا اور ﴿ كَالدِّهَانِ ﴾ کو ﴿ وَرْدَةً ﴾ کی صفت ٹھہرایا اور "دهان" سے مراد دهن لیا اور وجہ تشبیہ الوان کے مختلف ہونے کو قرار دیا)۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كَصَبِّ الدُّهْنِ" یعنی آسمان مثل روغنِ ریختہ کے ہو جائے گا مثل عصیرِ زیت کے، یعنی عصارۂ روغن کی طرح۔

امام زجاج اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ آسمان آج کے دن سبز ہے اور آئندہ اس کا رنگ سرخ ہو گا۔ اس قول کو ثعلبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ متقدمین کا یہ زعم ہے کہ آسمان کا اصل رنگ سرخ ہے اور وہ جو کبود رنگ دکھائی دیتا ہے تو وہ کثرتِ حواجز وحوائل (پردوں اور درمیان میں حائل ہونے والی چیزوں) کے سبب سے اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے۔[2] اور ہمارے اور اس کے درمیان ہوا کے حائل ہونے کی وجہ سے ہے جس طرح کہ خون رگوں میں نیلگوں دکھائی دیتا ہے اور وہاں ہوا نہیں ہے کہ اصلی رنگ کے دکھائی دینے میں رکاوٹ ہو۔

[1] الكشاف (٤٤٩/٤) [2] تفسير القرطبي (١٧٣/١٧) فتح القدير (١٨٢/٥، ١٨٣)

یہ بات امام کرخی وعمادی وگازرونی نے ذکر کی ہے۔ غرضیکہ قیامت کا حال اور ہولناکیاں بیان کر کے ڈرانا ایک نعمت ہے اس لیے فرمایا: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾۔ بے شک نعمتوں میں سے وہ حسنِ انجام ہے جو اس ڈرانے اور خوف دلانے میں ہے، اس طرح سے کہ وہ خیر کی طرف توجہ کریں اور شر سے اعراض کریں۔

﴿ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴾ میں دو قول ہیں: یہ ایک ہے کہ حرفِ "فا" شرط کا جواب ہے: "أَيْ: ﴿ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ... ﴾ ﴿ فَيَوْمَىِٕذٍ... الآية ﴾" دوسرا یہ ہے کہ شرط کا جواب محذوف ہے: "أَيْ: ﴿ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ ﴾ رَأَيْتُ أَمْرًا مَهُوْلًا"۔ جواب محذوف کی ایک تقدیر پہلے گزر چکی ہے اور تنوین جملہ سے عوض ہے: "أَيْ: فَيَوْمَ تَنْشَقُّ السَّمَاءُ ﴿ لَا يُسْـَٔلُ... الآية ﴾ ﴿ ذَنْۢبِهٖۤ ﴾ کی ضمیر احد المذکورین کی طرف راجع ہے اور دوسرے کی ضمیر مقدر ہے: "أَيْ: وَلَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ جَانٌّ أَيْضًا"۔ ظرف کا ناصب ﴿ لَا يُسْـَٔلُ ﴾ ہے اور کلمہ ﴿ لَا ﴾ غیر مانعہ ہے۔

جان وانس ان میں سے ہر ایک اسم جنس ہے اس کے اور اس کے واحد کے درمیان حرفِ ''یاء'' سے فرق کیا جاتا ہے، جیسے: ''زنج و زنجي''، معنی یہ ہیں کہ جس دن آسمان پھٹے گا، اس دن نہ کوئی انسان اپنے گناہوں کے متعلق پوچھا جائے گا اور نہ کوئی جن اپنے گناہوں کے متعلق پوچھا جائے گا، اس لیے کہ وہ قبروں سے نکلنے کے وقت اپنے اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے۔ اس آیت سے تو سوال کا نہ کیا جانا معلوم ہوتا ہے اور دوسری آیات سے سوال کا مفہوم نکلتا ہے؟ سو دونوں قسم کی آیتوں میں علماء نے جمع کیا ہے۔ تین قول تو پہلے گزر چکے ہیں؛ کچھ یہ ہیں: کسی نے کہا ہے کہ عدمِ سوال تو ایک موقف میں ہوگا اور سوال دوسرے موقف میں قیامت کے مواقف میں سے۔ کسی نے کہا ہے کہ استفہامی سوال نہ ہوگا کہ ان سے ان کے گناہ کے متعلق پوچھیں، کیونکہ اللہ پاک بندوں کے اعمال کا احصار وحفظ (شمار اور حفاظت) کر چکا ہے، لیکن ان سے ملامت اور توبیخ کا سوال ہوگا۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غیر مجرم کو مجرم کے گناہ کے متعلق نہ پوچھا جائے گا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ بعث کے وقت سوال نہ ہوگا اور موقفِ حساب میں سوال ہوگا۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾۔ پس بے شک اللہ کی نعمتوں میں سے یہ وعید شدید ہے ان کثیر فائدوں کے سبب سے جو اس پر مرتب ہوتے ہیں۔

جملہ ﴿ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ ﴾ جاری مجریٰ تعلیل ہے عدمِ سوال کے لیے۔ "سیما" بہ معنی علامت ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: علامت ان کے چہروں کی سیاہی اور آنکھوں کی کبودی ہے[2] جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۰۲] ''ہم اس دن (دہشت کی وجہ سے) گناہ گاروں کو نیلی پیلی آنکھوں کے ساتھ گھیر لائیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ﴾ [آل عمران: ۱۰٦] ''جس دن بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض سیاہ۔'' کسی نے کہا ہے کہ ان کی علامت وہ حزن وملال وکآبہ (بدحالی،

[1] تفسیر البغوي (۴۵۰/۷) [2] تفسیر الطبري (۵۲/۲۳)

پریشانی) ہے جو ان پر چھا رہی ہوگی۔

﴿ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴾ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”یؤخذ“ متعدی ہے اور باوجود اس کے کہ حرفِ باء سے متعدی ہوا، اس لیے کہ اس میں ”یسحب“ کے معنی شامل کیے گئے ہیں۔ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”یسحب“ جو متعدی ہوتا ہے تو کلمۂ ”علٰی“ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ﴾ [القمر: ٤٨] ”جس دن وہ اپنے منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے۔“ تو لائق یہ تھا کہ یوں کہا جاتا کہ معنی ”یدفع“ کو شامل کیا گیا ہے: ”أَيْ: يُدْفَعُوْنَ بِالنَّوَاصِيْ“۔ مکی نے کہا ہے کہ بولا جو جاتا ہے تو اس طرح سے ”أَخَذْتُ النَّاصِيَةَ وَأَخَذْتُ بِهَا“ اور اگر تم کہو گے: ”أَخَذْتُ الدَّابَّةَ بِالنَّاصِيَةِ“ تو جائز نہ ہوگا۔ عرب سے ”أَخَذْتُ الْخِطَامَ وَأَخَذْتُ بِالْخِطَامِ“ دونوں ایک معنی میں نقل کیے گئے ہیں۔[1] (کما قاله الكرخي)

”نواصي“ مقدم سر کے بالوں کو کہتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ ان کے قدم نواصی کے ساتھ ملائے جائیں گے اور فرشتے ان کو آگ میں ڈال دیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ فرشتے ان کو گھسیٹیں گے آگ کی طرف، کبھی تو ان کی پیشانی کے بال پکڑیں گے اور اُن کو منہ کے بل کھینچیں گے اور کبھی ان کے قدم پکڑیں گے اور سر کے بل ان کو کھینچیں گے۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ پس بے شک اللہ کی نعمتوں میں سے یہ ترتیبِ شدید و وعیدِ بالغ ہے کہ جس سے دل کانپتے ہیں اور اس کی ہولناکی سے کلیجے مضطرب ہوتے ہیں۔

جملۂ ﴿ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ جملہ مستانفہ ہے جو سوالِ مقدر کا جواب ہے۔ گویا کسی نے کہا کہ جب ان کے نواصی اور اقدام پکڑے جائیں گے تو اس وقت ان سے کیا کہا جائے گا تو یہ اس کا جواب ہے کہ ان کو سرزنش کرنے کے لیے کہیں گے کہ یہ وہ جہنم ہے جس کا تم مشاہدہ کر رہے ہو اور اس کی طرف دیکھ رہے ہو، باوجود اس کے کہ تم اس کو جھٹلاتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ نہ ہوگی۔ پھر جہنم کے اندر ان کا جو حال ہوگا، اس کا ذکر فرمایا: ﴿ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴾ یعنی جہنم کے درمیان آتے جاتے اور دوڑتے پھرتے ہیں تو وہ ان کو جلاتی ہے اور وہ نہایت گرم پانی کے درمیان ہیں جو ان کے منہ کو لگتا ہے تو اس سے جلتے ہیں، پھر وہ جہنم سے استغاثہ کریں گے تو ان کو حمیم کی طرف دوڑا لے جائیں گے۔ ﴿ حَمِيْمٍ ﴾ گرم پانی ہے اور ﴿ اٰنٍ ﴾ وہ ہے جس کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ”أَنَى يَأْنِيْ أَنًى فَهُوَ آنٍ إِذَا انْتَهٰى فِي النَّضْجِ وَالْحَرَارَةِ“[2] یعنی آن وہ گرم پانی ہے جو پکنے میں اور گرمی میں انتہا کو پہنچا ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ جہنم کی وادیوں میں سے ایک وادی ہے اس میں دوزخیوں کی پیپ جمع کی جاتی ہے، سو وہ اس میں غوطہ دیے جائیں گے اپنے طوقوں کے ساتھ یہاں تک کہ ان کے جوڑ اور پیوند جدا ہو جائیں گے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ پھریں گے ایک بار

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٨/٣٣٧، ٣٣٨) فتح البيان (١٣/٣٣٤) [2] فتح القدير (٥/١٨٣)

درمیان حمیم کے اور ایک بار درمیان جحیم کے۔[1] "نعوذ بالله الكريم الرحيم من الجهيم" ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک اللہ کی نعمتوں سے وہ نعمت ہے جو اس تخویف (خوف دلانے) سے حاصل ہے اور وہ نعمت جو خیر کی ترغیب میں اور شر کے خوف کھانے کے لیے اس کے سبب سے حاصل ہوتی ہے۔[2] (كذا في فتح البيان) غرضیکہ ثقلین پر جو دنیوی اور اخروی نعمتیں ہیں، جب اللہ پاک ان کا شمار کر چکا تو ان پر جن مزید اخروی نعمتوں کا انعام کیا ہے ان کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿٤٦﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٧﴾
ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿٤٨﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٩﴾ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿٥٠﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥١﴾ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿٥٢﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٣﴾

اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا، اس کے لیے دو باغ ہیں (46) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (47) (وہ) دونوں بہت زیادہ شاخوں والے ہیں (48) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (49) ان دونوں (باغوں) میں دو چشمے جاری ہوں گے (50) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (51) ان دونوں (باغوں) میں ہر پھل کی دو دو قسمیں ہوں گی (52) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (53)

پرہیزگاروں کے حالات اور جنت میں انھیں دی جانے والی نعمتیں:

امام ابن شوذب اور عطاء خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت یعنی ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴾ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے عطیہ بن قیس سے روایت کیا ہے کہ اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے کہا تھا کہ مجھے آگ سے جلا ڈالنا، شاید میں اللہ سے گم ہو جاؤں، کہا: اس نے ایک دن اور ایک رات توبہ کی، اس کے بعد کہ یہ بات کہی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سے توبہ قبول کی اور اس کو جنت میں داخل کیا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ آیت عام ہے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے فرمایا ہے۔[3] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کوئی قیامت کے دن اللہ عزوجل کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا اور سرکشی نہ

---

[1] تفسير القرطبي (١٧/١٧٥) [2] فتح البيان (١٣/٣٣٢_٣٣٥) [3] تفسير ابن كثير (٤/٣٥١، ٣٥٢)

کی اور نہ ہی دنیا کی زندگی کو اختیار کیا اور یہ بات جان لی کہ آخرت بہتر ہے اور بہت باقی رہنے والی ہے۔

پھر اللہ کے فرائض ادا کیے اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچا تو اس کے لیے قیامت کے دن اپنے رب کے پاس دو باغ ہیں، جیسا کہ بخاری رحمہ اللہ نے ابو بکر بن عبد اللہ بن قیس عن ابیہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ دو باغ ہیں جن کے برتن اور جو کچھ اُن میں ہے وہ سب چاندی کے ہیں اور دو باغ سونے کے ہیں، یعنی ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب سونے کے ہیں اور قوم کے اور اس کے درمیان نہیں ہو گا کہ وہ اپنے رب عزوجل کی طرف نظر کریں، مگر اس کے منہ پر کبریا کی چادر ہو گی جنتِ عدن میں۔[1] (وأخرجه بقية الجماعة إلا أبا داود من حديث عبد العزيز به (یہ عبدالعزیز بخاری کے اُستاذ الاستاذ ہیں وقال حماد بن سلمة عن ثابت عن أبي بكر بن أبي موسى عن أبيه قال حماد: ولا أعلمه إلا قد رفعه في قوله تعالىٰ: ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴾ وفی قوله: ﴿ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴾ قال: جنتان من ذهب للمقربين وجنتان من ورق لأصحاب اليمين.[2] كذا في ابن كثير)۔

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن یہ آیت پڑھی تو میں نے عرض کی: گو اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴾ پھر میں نے عرض کی: گو اس نے زنا کیا اور چوری کی یا رسول اللہ ﷺ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگرچہ خاک آلود ہو ابو الدرداء کی ناک۔[3] (أخرجه ابن جرير ورواه النسائي من حديث محمد بن حرملة به، و رواه النسائي أيضا عن مؤمل بن هشام عن إسماعيل عن الجريري عن موسى عن محمد بن سعد بن أبي وقاص عن أبي الدرداء رضی اللہ عنہ به وقد روي موقوفاً على أبي الدرداء كذا في ابن كثير).

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بے شک جو کوئی اپنے رب کے آگے کھڑا ہونے سے ڈرا اس نے نہ زنا کیا اور نہ چوری کی۔[4] یہ آیتِ کریمہ انس وجن میں عام ہے تو یہ اس بات پر بڑی دلیل ہے کہ جن اگر متقی ہوں اور ایمان لائیں تو جنت میں داخل ہوں گے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ثقلین پر اس جزا کا احسان رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴾ پھر اللہ پاک نے ان دو باغوں کی یہ صفت ذکر فرمائی کہ ﴿ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴾ یعنی تروتازہ خوبصورت ٹہنیوں والے ہوں گے جو ہر پختہ اور عمدہ میوہ کا بار لاتی ہیں۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ اور ایک جماعت نے اسی طرح کہا ہے کہ افنان درختوں کی ٹہنیاں ہیں جو ایک دوسرے کو چھوتی ہیں، یعنی گنجان ٹہنیاں ہیں، ایک دوسرے سے لگی ہوئی۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴾ ”ظِلُّ الْأَغْصَانِ عَلَى الْحِيطَانِ“، یعنی افنان دیواروں پر ٹہنیوں کا سایہ ہے (یعنی باغ میں مکان اور مکان کی دیواروں پر درختوں کی ٹہنیوں کا سایہ) کیا تو نے شاعر کا قول نہیں سنا (یہ خطاب عبد اللہ بن نعمان کو ہے جو عکرمہ سے راوی ہیں)۔

---

[1] صحيح البخاري (٤٥٩٧) صحيح مسلم (١٨٠) سنن الترمذي (٢٥٢٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٤١٩/٤) سنن ابن ماجه (١٨٦)

[2] تفسير الطبري (٥٧/٢٣) تفسير ابن كثير (٣٥٢/٤)

[3] تفسير الطبري (٥٧/٢٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٧٨/٦) تفسير ابن كثير (٣٥٢/٤) [4] تفسير الطبري (٥٧/٢٣، ٥٨)

مَا هَاجَ شَوْقُكَ مِنْ هَدِيْلِ حَمَامَةٍ تَدْعُوْ عَلَى فَنَنِ الْغُصُوْنِ حَمَامًا

تَدْعُوْ أَبَا فَرْخَيْنِ صَادَفَ طَاوِيًا ذَا مِخْلَبَيْنَ مِنَ الصُّقُوْرِ قَطَامًا

(أخرجه ابن جرير)۔[1] (یعنی برانگیختہ نہیں ہوا تیرا شوق کبوتری کی آواز سے جو ٹہنیوں کی فنن پر پکار رہی ہے، یعنی باریک شاخ پر جس میں پتے اور میوے لگتے ہیں، کبوتر کو پکار رہی ہے۔ دو بچوں کے باپ کو جس نے پایا ہے صقور میں سے دو پنجے والے کو بھوکا گوشت کا آرزومند۔'' مطلب یہ ہے کہ چرغ شکاری پرندوں میں سے ہے، اس کو دیکھ کر کبوتری ڈری کہ وہ بھوکا ہے اور گوشت کا آرزومند ہے کہیں میرے کبوتر کو شکار نہ کر لے تو دو بچوں کو دانہ کون کھلائے گا، اس لیے فنن غصون پر بیٹھی ہوئی، اس کو بلا رہی ہے کہ ہوشیار ہو چرغ کے داؤ میں نہ آنا۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے: اے شخص! اس کبوتری کی آواز سے تیرا شوق برانگیختہ نہیں ہوا کہ تو بھی اپنے محبوب کو یاد کرتا اور اس کا مشتاق ہوتا جیسا کہ یہ کبوتری کہ محبت کی ماری اپنے کبوتر کو پکار رہی ہے کہ کہیں چرغ اس کو لقمہ نہ کر لے اور یار جانی ہاتھ سے جائے اور بچے بھی بھوکے مریں۔ یہاں اس شعر سے معلوم ہوا کہ فنن اور ہے اور غصن اور ہے۔ غصن بڑی ٹہنی ہے جو درخت سے پھوٹتی ہے اور فنن باریک باریک سیدھی شاخیں ہیں جو ٹہنی سے پھوٹتی ہیں۔ میوے اور پتے انھی میں لگتے ہیں اور سایہ انھی سے بڑھتا ہے۔ تو ﴿ذَوَاتَآ أَفْنَانٍ﴾ کا یہ مطلب ہوا کہ وہ دونوں باغ میں گھنے سائے والے ہیں جن کے درختوں کی ٹہنیوں کا سایہ ان کے مکانوں کی دیواروں پر پڑتا ہے۔ جس قدر ٹہنی میں باریک باریک شاخیں کثرت سے ہوں گی، اتنے ہی میوے اور پتے زیادہ ہوں گے اور اسی قدر سایہ دراز ہوگا۔ والله أعلم.)

امام بغوی رحمہ اللہ نے امام مجاہد، عکرمہ اور کلبی رحمہم اللہ سے حکایت کیا ہے کہ فنن غصنِ مستقیم،[2] یعنی سیدھی ٹہنی۔ نیز بہ سندِ خود عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے: "ذَوَاتَا أَلْوَانٍ"[3] یعنی وہ دو باغ قسم قسم کے درختوں اور میوں والے ہیں۔ کہا: اور اسی کے مثل امام سعید بن جبیر، حسن، سدی، خصیف، نضر بن عدی اور ابن سنان رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔ اس قول کے معنی یہ ہیں کہ ان باغوں میں قسم قسم کی مزیدار اور لذت والی چیزیں ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ٹہنی قسم قسم کے میوے جمع کرے گی۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ذَوَاتَآ أَفْنَانٍ﴾ "وَاسِعَتَا الْفِنَاءِ" یعنی دونوں باغوں کے میدان وسیع اور فراخ ہوں گے۔ یہ سب قول صحیح ہیں۔ ان میں کچھ منافاۃ (ایک دوسرے کی نفی) نہیں ہے۔ والله أعلم.[4]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ذَوَاتَآ أَفْنَانٍ﴾ یعنی یہ باغ دوسرے باغوں سے ہر لحاظ سے فراخ اور فضل و مرتبت

[1] تفسير الطبري (٥٩/٢٣) [2] تفسير البغوي (٤٥٢/٧)
[3] تفسير الطبري (٥٨/٢٣، ٥٩) [4] تفسير ابن كثير (٣٥٣/٤)

اور شرف میں بڑھ کر ہیں۔[1] امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود اسماء بنت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا اور آپ ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر کیا تو فرمایا کہ اس کی ٹہنی کے سائے میں سوار سو برس تک چلتا ہے، یا فرمایا کہ اس کی شاخ کے سائے میں سو سوار آ جاتے ہیں۔ اس میں سونے کے پروانے ہیں۔ گویا اس کے پھل مٹکے ہیں۔[2] (ورواه الترمذي من حديث يونس بن بكير به. وقال حماد بن سلمة عن ثابت عن أبي بكر بن أبي موسىٰ)

﴿ فِيهِمَا عَيْنَانِ تَجْرِيَانِ ﴾ یعنی ان دونوں میں دو چشمے ہیں جو اُن درختوں اور ٹہنیوں کو پلانے کے لیے چھٹ رہے ہیں، تا کہ وہ ہر قسم کے رنگ اور قسم سے بڑھیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ان میں سے ایک کو تسنیم کہا جاتا ہے اور دوسرے کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔ امام عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: ان میں سے ایک تو ﴿ مَآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ﴾ سے ہے، یعنی ایسا پانی جو متغیر نہیں ہوتا اور دوسرا ﴿ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴾[3] [محمد: ١٥] سے ہے، یعنی ایسی شراب جو پینے والوں کے لیے لذت ہے۔ اسی لیے اس کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ ﴾ یعنی ان میں تمام پھلوں میں سے ہیں اس قسم سے جس کو جانتے ہیں اور اس سے بہتر کہ جس کو جانتے ہیں اور اس قسم کے پھل ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھے اور نہ کسی کان نے سنے اور نہ ہی کسی بشر کے دل میں ان کا خیال گزرا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (قاله إبراهيم بن الحكم بن أبان عن أبيه عن عكرمة عنه) کہ نہیں ہے کوئی پھل دنیا میں میٹھا اور نہ کڑوا مگر حال یہ ہے کہ وہ جنت میں ہے یہاں تک کہ حنظل، یعنی اندارین کا پھل (کہتے ہیں کہ یہ وہاں شیریں ہوگا۔[4] كما في فتح البيان والله أعلم)۔ اور فرمایا کہ نہیں ہے دنیا میں اس چیز سے جو آخرت میں ہے مگر صرف نام،[5] یعنی ان کے درمیان بڑا فرق ہے اور فضیلت میں تو ایک فرق ظاہر ہے۔[6] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ ﴾ میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ خائفین لوگوں میں سے ہر ایک لیے دو باغ ہیں، یا ان سب کے لیے، یعنی کلام بر طریقِ توزیع (بانٹنا) اور تقسیم ہے، چنانچہ ایک جنت تو خائف انسی (انسان خائفین) کے لیے ہے اور دوسری جنت خائف جنی (جن خائفین) کے لیے ہے تو ہر خائف کے لیے ایک ہی جنت ہے، لیکن معتمد قول پہلا ہے۔ (كما اختاره شيخنا السيد مرحوم صاحب فتح البيان رحمہ اللہ)

﴿ مَقَامَ رَبِّهٖ ﴾ سے وہ وقوف کی جگہ مراد ہے جس میں بندے حساب کے لیے کھڑے رہیں گے، جیسا

---

[1] تفسير الطبري (٦٠/٢٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٤١) اس کی سند میں ''محمد بن اسحاق'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔

[3] تفسير البغوي (٤٥٢/٧) [4] تفسير البغوي (٤٥٣/٧) فتح البيان (٣٣٩/١٣)

[5] تفسير الطبري (٣٩٢/١) [6] تفسير ابن كثير (٣٥١/٤_٣٥٣)

کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [1] [المطففين: ٦] ''جس دن سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔'' کسی نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے ڈرا۔ یہ کھڑا ہونا اس کے احوال و افعال واقوال پر اللہ تعالیٰ کا مطلع ہونا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿ اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ﴾ [الرعد: ٣٣] ''آیا وہ اللہ جو نگہبانی کرنے والا ہے ہر شخص کی، اس کے کیے ہوئے اعمال پر۔'' یا مراد خائف کا اپنے رب کے پاس حساب کے لیے کھڑا ہونا ہے۔

اس تقریر کا حاصل ﴿ مَقَامَ ﴾ کی تفسیر میں تین احتمال ہیں: اول یہ ہے کہ ﴿ مَقَامَ ﴾ اسمِ مکان ہے، دوسرا یہ ہے کہ ﴿ مَقَامَ ﴾ مصدر ہے، اس کے تحت میں دو احتمال ہیں: یا تو اس معنی میں کہ قیام اللہ کا خلائق پر، یا بایں معنی کہ خلائق کا قیام اللہ پاک کے روبرو۔ امام مجاہد اور نخعی رحمہ اللہ نے کہا: یہ وہ شخص ہے جو معصیت کا ارادہ کرتا ہے۔ پھر اللہ پاک کو یاد کرتا ہے تو اسے چھوڑ دیتا ہے اس کے خوف سے۔ [2] اس میں دو باغ کے سببِ استحقاق کی طرف اشارہ ہے نفس الامر میں اور وہ یہ ہے کہ وہ صرف خوف نہیں ہے، بلکہ وہ خوف ہے جس سے معصیت کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ان دو جنتوں میں اختلاف کیا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے تو کہا ہے کہ مراد جنتِ نعیم اور جنتِ عدن ہیں۔ [3] کسی نے کہا ہے کہ ایک جنت تو وہ ہے جو اس کے لیے پیدا کی گئی ہے اور دوسری وہ ہے جس کا وارث ہوا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی ایک تو اس کی منزل ہے اور دوسری اس کی ازواج کی منزل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان میں سے ایک تو ان کے محلوں کی اسافل (نیچے کی طرف) ہیں اور دوسری ان کی اعالی (بلند) ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک تو ان کی اطاعت کے فعل کے سبب سے ہے اور دوسری معصیت کو چھوڑنے کے سبب سے ہے۔ کسی نے کہا: ایک تو اس عقیدے کے سبب سے ہے جو وہ رکھتا تھا اور ایک اس عمل کے سبب سے ہے جس کو وہ کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک تو عمل کے سبب سے ہے اور دوسری اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک جنت تو روحانی ہے اور ایک جسمانی۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک تو اس کے خوف کے سبب سے ہے اپنے رب سے اور ایک اس کے اپنی شہوت اور خواہش کو چھوڑنے کے سبب سے ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جو ہے تو صرف ایک جنت ہے اور تثنیہ رؤس آیات کی موافقت کے لیے ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی کتاب پر بہت بڑی غلطی سے ہے، کیونکہ اللہ پاک تو فرما رہا ہے ﴿ جَنَّتٰنِ ﴾ اور ان کا وصف کر رہا ہے۔ ﴿ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴾ کہہ کر۔ [4] کسی نے کہا ہے کہ وہ جو دو جنتیں ہوئیں، تو اس لیے کہ اس کے لیے سرور کئی گنا بڑھ جائے، ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف تنقل کے سبب سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے دو جنتوں کا وعدہ دیا ہے، ان مومنوں کو جو اس کے مقام سے

---

[1] فتح البيان (١٣/٣٣٥) [2] تفسير البغوي (٧/٤٥١) [3] تفسير البغوي (٧/٤٥١) [4] تفسير القرطبي (١٧/٣٣٦)

ڈرے، پھر اس کے فرائض ادا کیے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ ڈرا پھر تقویٰ کیا اور خائف وہ ہے جو اللہ کی طاعت پر سوار ہوا، یعنی اس کو خوب اچھی طرح بجا لایا اور اس کی معصیت چھوڑ دی۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ اس کے لیے ہے جو دنیا میں اس سے ڈرا۔[2] (أخرجه عبد بن حميد)

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔[3] ایک روایت یہ ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ تو سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: گو اس نے زنا کیا اور چوری کی یا رسول اللہ؟! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگرچہ اس نے زنا کیا اور اگرچہ اس نے چوری کی، گو خاک میں آلودہ ہو ناک ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی۔[4] (أخرجه ابن مردويه) یسار مولائے آلِ معاویہ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے کہا گیا، اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی، فرمایا: جو کوئی ڈرا اپنے رب کے مقام سے تو اس نے نہ زنا کیا نہ چوری کی۔[5] (أخرجه ابن جرير و ابن المنذر)

امام ابن شہاب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں ہشام بن عبدالملک کے پاس تھا۔ کہا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: «﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾» سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: گو اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ تو میں نے کہا کہ یہ جو تھا تو اس سے قبل تھا کہ فرائض نازل ہوں، پھر جب فرائض نازل ہوئے تو یہ جاتا رہا۔[6] (أخرجه ابن مردويه)

ایک روایت سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی پہلے گزر چکی ہے۔[7] دوسری روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنانِ فردوس چار ہیں: دو جنتیں تو سونے کی ہیں ان کا زیور اور اُن کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے سب سونے کا ہے اور دو جنتیں چاندی کی ہیں، ان کا زیور اور اُن کے برتن اور جو کچھ اُن میں ہے وہ سب چاندی کا ہے اور ان کے اور قوم کے درمیان نہیں ہے کہ اپنے رب کی طرف نظر کریں، مگر اس کے منہ پر کبریائی کی چادر ہے جنتِ عدن میں۔[8] (أخرجه البخاري و مسلم وغيرهما) ان کی تیسری روایت یہ ہے کہ سونے کی دو جنتیں سابقین کے لیے ہیں اور دو جنتیں چاندی کی ہیں تابعین کے لیے۔[9] (أخرجه ابن أبي شيبة وغيره) (وعبد بن حميد وابن المنذر والحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقي في البعث كذا في الفتح)۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ جس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر میں اہلِ جنت

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/٥٥، ٥٦) [2] الدر المنثور (٧/٧٠٦) [3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] الدر المنثور (٧/٧٠٧) [5] تفسير الطبري (٢٣/٥٧) الدر المنثور (٧/٧٠٧) [6] الدر المنثور (٧/٧٠٧)
[7] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[8] صحيح البخاري (٧٠٠٦) صحيح مسلم (١٨٠) مسند أحمد (٤/٤١٦) البتہ (جنانِ فردوس چار ہیں) یہ الفاظ صحیحین میں نہیں ملے ہیں۔
[9] مصنف بن أبي شيبة (٧/١٤١) مستدرك الحاكم (١/١٥٧) فتح القدير (٥/١٩٢)

میں سے نہ ہوں تو تجھے طلاق ہے تو وہ حانث (قسم توڑنے والا) نہ ہوگا، اگر اس نے معصیت کا ارادہ کیا اور اللہ کے خوف اور حیا کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ یہ سفیان ثوری رحمہ اللہ کا قول ہے اور انھوں نے اسی کا فتویٰ دیا۔[1] امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ حانث نہ ہوگا اگر وہ مسلمان ہو اور اسلام پر مرے۔ ﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے یہ ایک عظیم نعمت ہے، یعنی جو کوئی اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے ڈرا اس کو ایسی دو جنتیں عطا کرنا جو صفاتِ جلیلہ وعظیمہ کی حامل ہیں۔

﴿ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ﴾ "أَيْ: صَاحِبَتَا أَفْنَانٍ" یہ دو جنتوں کی صفت ہے اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے، وہ جملۂ معترضہ ہے، یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ "أَيْ: هُمَا ذَوَاتَا أَفْنَانٍ"۔ ذات کے تثنیہ میں دو لغت ہیں: ایک تو اصل کی طرف لوٹتی ہے، کیوں کہ اصل اس کی "ذویۃ" ہے، چنانچہ عین کلمہ تو واو ہے اور لام کلمہ حرفِ یاء ہے، اس لیے کہ یہ مونث ہے "ذَوَيٌ" کا۔ دوسرا تثنیہ ہے جو بنا بر لفظ تو "ذَاتَانِ" بولا جاتا ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ جلال محلی رحمہ اللہ کی عبارت یہ ہے: "تَثْنِيَةُ ذَوَاتٍ عَلَى الْأَصْلِ وَلَامُهَا يَاءٌ.[2] انتھی" (یعنی ذواتا، ذوات کا تثنیہ ہے جو مفرد ہے اور ذات کی اصل ہے۔ فصیح ذات کی تثنیہ میں یہ ہے کہ بہ حسبِ اصل تثنیہ کیا جائے، جیسا کہ آیت میں ہے، کبھی لفظ کی بنا پر بھی تثنیہ کر کے ذاتان بولتے ہیں۔ ذات کی اصل ذوات ہے فاء کلمہ ذال ہے اور عین کلمہ واو ہے اور لام کلمہ یاء ہے اصل ذوی ہے۔ یا متحرک ماقبل مفتوح یا الف سے بدلی گئی تو "ذوا" ہوا جیسے: "فتی"۔ چنانچہ یہ الف لام ہے، "یاء" کو الف سے بدلا واو کو نہ بدلا، حالانکہ ہر ایک ان میں سے متحرک ہے اور ماقبل مفتوح اس لیے کہ یاء طرف میں واقع ہوئی اور طرف تغیر کا محل ہوتا ہے اور تثنیہ میں اس الف کو یاء کی طرف رد نہ کیا "ذویتان" نہ کیا، جیسے کہ "فتیان" بولتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حرفِ تاء کو اس لفظ میں زیادہ کیا گیا تو الف یاء کی طرف رد کرنے سے محفوظ رہا۔ كما أفاده الكرخي)

﴿اَفْنَانٍ﴾ بہ معنی "أَغْصَان" ہے، اس کا واحد "فنن" ہے۔ مراد وہ باریک باریک شاخیں ہیں جو درخت کی ٹہنیوں سے نکلتی ہیں۔ خاص طور پر ﴿اَفْنَانٍ﴾ کا ذکر اس لیے کیا کہ پتے اور پھل یہی لاتی ہیں اور سائے کو لمبا یہی کرتی ہے، انھی سے سایہ دراز ہوتا ہے اور انھی سے میوے چنے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ برگ وبار وغیرہ جو درختوں میں ہوتا ہے، اس کی صاحب یہی افنان ہیں۔ پھر خاص کر جو ان کا ذکر کیا، اس لیے کہ ان کے ذکر میں پتوں، پھلوں اور سایوں کا ذکر ہے جو اصل مقصد ہیں، بر طریقِ اخصر وابلغ کیوں کہ یہ کنایہ ہیں، جیسا کہ شروح کشاف میں ہے۔[3] (كما ذكره الشهاب) امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿اَفْنَانٍ﴾ بہ معنی "ألوان" ہے اس کا واحد "فن" ہے[4]

---

[1] تفسير القرطبي (١٧٦/١٧)
[2] تفسير الجلالين (٧١١/١)
[3] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (١٣٦/٨)
[4] معاني القرآن (١٨٦/٥)

بروزن ”دنٌّ و سھم“۔ ”فن“ بہ معنی ضرب ونوع وقسم ہے ہر شے سے۔ امام عطاء اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور عطاء نے دونوں قولوں کو جمع کیا تو یوں کہا کہ ہر ”غصن“ میں ”فنون“ ہیں ”فاکھة“ سے، یعنی ہر ٹہنی میں قسم قسم کے میوے ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے تین قول ہیں: ایک تو ”ذَوَاتَا أَلْوَانٍ“۔[2] ”أَيْ: أَلْوَانُ الثِّمَارِ“ دوسرا ”اَلْفَنُّ: اَلْغُصْنُ“ تیسرا ”فَنَّ غُصُوْنُهَا يَمَسُّ بَعْضُهَا بَعْضًا“[3] کسی نے کہا: ﴿ اَفْنَانٍ ﴾ سے مراد ”ألوانِ نعم“ ہیں، یعنی وہاں انواع واقسام کی نعمتیں ہیں جن کو جی چاہتے ہیں اور آنکھیں لذت لیتی ہیں۔ کما قال قائلهم:

وَمِنْ كُلِّ أَفْنَانِ اللَّذَاذَةِ وَالصِّبَا لَهَوْتُ بِهِ وَالْعَيْشُ أَخْضَرُ نَاضِرُ

﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک ان نعمتوں میں سے ہر ایک نہ تو تکذیب کا محل ہے نہ انکار کی جگہ۔ پھر ﴿ جَنَّتَانِ ﴾ کی دوسری صفت بیان کی۔ ﴿ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴾ یعنی ان دونوں باغوں میں سے ہر ایک میں دو چشمے بہتے ہیں، جہاں وہ چاہیں اوپر کے مکانوں میں یا نیچے کے مکانوں میں۔ اس کے اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان میں ہر ایک دنیا کی طرح ہے، اس کو کئی گنا بڑھا چڑھا کر، ان کی کنکریاں یاقوت سرخ اور زمرد سبز ہیں اور مٹی ان کی کافور ہے اور ان کی سیاہ مٹی مشک اذفر ہے اور ان کے دونوں کنارے زعفران ہے۔

ابوبکر وراق نے کہا: وہ اس شخص کے لیے جاری ہوں گے جس کی دونوں آنکھوں سے اللہ عزوجل کے خوف سے آنسو جاری ہوتے تھے۔[4] چنانچہ وہ جاری ہوں گے ہر مکان میں جہاں ان کا صاحب چاہے گا، گو اس کا مکان بلند ہو جس طرح کہ درختوں میں پانی چڑھتا ہے، ان کی ہر شاخ میں پہنچتا ہے، خواہ ان کی بلندی کتنی ہی زیادہ ہو۔ کسی نے ترقی کا مضمون خوب نکالا ہے:

گر ترقی چاہتا ہے کر کسی کی پرورش خاک سے فرق شجر پر جا ملی ہے آب کو

(یہ شعر ناسخ کا ہے حقیقت میں یہ صائب کے فارسی شعر کا ترجمہ ہے جو اس وقت یاد نہیں آیا)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے یہ نعمت ہے جو اہلِ سعادت کو جنت میں میسر ہو گی۔ پھر تیسری صفت بیان فرمائی: ﴿ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴾ یعنی ”صِنْفَانِ وَنَوْعَانِ“ معنی یہ ہیں کہ ان دو باغوں میں ہر قسم کے وہ پھل جو دنیا میں حاصل کیے جاتے ہیں، دو دو قسمیں ہوں گی، اس کی قسموں میں سے ہر قسم سے وہ لذت لے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک قسم تر ہو گی اور ایک خشک۔ ان پر ہر ایک فضیلت و پاکیزگی وعمدگی میں دوسرے کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ دو قسمیں ہیں: ایک قسم تو جانی پہچانی ہو گی اور دوسری قسم عجیب وغریب ہو گی۔

---

[1] فتح القدير (١٨٦/٥) [2] تفسير الطبري (٥٨/٢٣، ٥٩) [3] الدر المنثور (٧٠٩/٧) [4] تفسير القرطبي (١٧٩/١٧)

﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴾ بے شک یہ نعمتیں جو کتابِ عزیز میں ذکر فرمائی ہیں، صرف ان کے شمار کرنے میں اور اُن کا وصف بیان کرنے میں جو اچھے کام کرنے کی ترغیب ہے اور برے کاموں سے جو ڈرایا گیا ہے، وہ سمجھنے والے پر مخفی نہیں ہے اور یہ خود ایک عظیم نعمت اور بڑا احسان ہے، پھر جب ان نعمتوں کے پاس پہنچ کر ان سے مزہ لیں گے، اس کا کیا کہنا کہ کیسا عیش و آرام ہو گا۔ پھر اور ناز ونعم کا ذکر فرمایا جو اہلِ جنت کو نصیب ہو گا۔[1]

مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَ جَنَا الْجَنَّتَیْنِ
دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ
یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾
کَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾
هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾

(اہلِ جنت) ایسی مسندوں پر تکیے لگائے (بیٹھے) ہوں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے، اور ان دونوں باغوں کے پھل قریب ہی ہوں گے (54) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (55) ان میں جھکی نظروں والی (شرمیلی اور با حیا حوریں) ہوں گی، ان سے پہلے انھیں کسی انسان اور کسی جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہو گا (56) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (57) گویا وہ ہیرے اور موتی (مونگے) ہیں (58) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (59) احسان کی جزا تو احسان ہی ہے (60) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (61)

جنتیوں کے بستروں اور جھکے ہوئے پھلوں کا بیان:

اللہ پاک فرماتا ہے کہ جنت والے متکئین ہوں گے۔ اتکاء سے مراد یہاں اضطجاع ہے، یعنی لیٹنا اور جو بیٹھنا تربیع کی صفت پر ہوتا ہے اس کو بھی اتکاء کہتے ہیں، یعنی چار زانو بیٹھنا، یعنی لیٹے ہوں گے یا چار زانو بیٹھے ہوں گے، ایسے بچھونوں پر جن کے استر استبرق کے ہوں گے۔ استبرق موٹے ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں۔ یہ قول امام عکرمہ، ضحاک اور قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔[2] ابو عمران جونی نے کہا ہے کہ دیباج مزین بدذہب ہے، یعنی ریشمی کپڑا جو سونے سے زینت دیا گیا ہو۔ اس استر کا شرف بیان کر کے اس کپڑے کے ابرے کے شرف سے آگاہ فرمایا۔ سو یہ تنبیہ بالادنیٰ علی الاعلیٰ کے باب سے ہے۔

---

(1) فتح البیان (۱۳/۳۳۵-۳۳۸) (2) تفسیر الطبری (۲۳/۶۱)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ تو استر ہیں، پھر کیسا حال ہوتا اگر تم ابروں کو دیکھ لیتے۔[1] (قاله أبو إسحاق عن هبيرة بن مريم عنه یا یوں کہو کہ یہ تو ان کے استروں کا حال ہے، پھر کیا حال ہو اگر تم ان کے ابروں کو دیکھو) امام مالک بن دینار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے استر تو استبرق کے ہیں اور ان کے ابرے نور جامد کے۔ اسی طرح سفیان ثوری رحمہ اللہ یا شریک رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے استر استبرق کے ہیں اور ان کے ابرے رحمت کے ہیں۔ ابوعبداللہ شامی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے استروں کا ذکر کیا ہے اور ابروں کا ذکر نہیں فرمایا، حالانکہ حسن اور خوبیاں ابروں پر ہوتی ہیں اور نیچے کے محاسن کو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ (رواه ابن شوذب عنه) یہ سب امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[2]

﴿ وَجَنَى الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے میوے ان کے قریب ہوں گے جب چاہیں گے ان کو لے لیں گے، وہ کسی بھی حالت میں ہوں یعنی کھڑے ہوں، بیٹھے ہوئے ہوں، لیٹے ہوئے ہوں، یا چلتے پھرتے ہوں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ٢٣] ”جس کے میوے جھکے پڑے ہوں گے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴾ [الدهر: ١٤] یعنی وہ میوے اس شخص سے ممتنع نہ ہوں گے جو اُن کی طرف ہاتھ بڑھائے گا، بلکہ اپنی شاخوں سے اس کی طرف نیچے اتر آئیں گے۔

جب بچھونوں اور اُن کی عظمت کا ذکر کیا تو اس کے بعد فرمایا: ﴿ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾ یعنی ان بچھونوں میں وہ عورتیں ہیں جو اپنے خاوندوں کے علاوہ دوسروں سے نگاہ نیچی کرنے والیاں ہیں تو نہ دیکھیں گی اپنے خاوندوں سے زیادہ حسین کسی چیز کو (اس سے معلوم ہوا کہ ﴿ فِيْهِنَّ ﴾ کی ضمیر ﴿ فُرُشٍ ﴾ کی طرف راجع ہے، یہ بھی ایک قول ہے، لیکن اس میں جو نقصان ہے وہ بعد میں مذکور ہوگا)۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ، عطاء خراسانی اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے۔[3] تحقیق وارد ہوا ہے کہ ان میں سے ایک اپنے خاوند سے کہے گی: واللہ! مجھے جنت میں تجھ سے زیادہ خوبصورت کوئی اور شے نظر نہیں آتی اور نہ ہی تجھ سے زیادہ محبوب کوئی شے ہے۔ چنانچہ تعریف ہے اللہ کے لیے جس نے تجھ کو میرے واسطے کیا اور مجھے تیرے لیے ٹھہرایا۔

پھر ان کی دوسری صفت بیان فرمائی: ﴿ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴾ بلکہ وہ تو کنواریاں اپنے خاوندوں کو چاہنے والیاں ہم عمر ہیں، ان کے خاوندوں سے پہلے کسی جن یا انسان نے ان سے جماع نہیں کیا۔ یہ آیت کریمہ بھی ان دلیلوں میں سے ہے جو اس پر دال ہیں کہ مومن جن بھی جنت میں داخل ہوں گے۔ ارطاۃ بن منذر کہتے ہیں کہ حمزہ بن حبیب سے کسی نے پوچھا: کیا جن جنت میں داخل ہوں گے؟ کہا: ہاں! جنوں کا تو جن

[1] تفسير الطبري (٦٢،٦١/٢٣) [2] تفسير ابن كثير (٣٥٣/٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٦/١٠) تفسير الطبري (٦٢/٢٣)

عورتوں سے نکاح کریں گے اور انسانوں کا نکاح انسان عورتوں سے کریں گے۔ اور یہ قول ہے اللہ پاک کا: ﴿ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴾[1]

پھر جو ان عورتوں سے منگنی کرنے والے ہیں، ان کے لیے ان کی یہ صفت بیان کی: ﴿ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ یعنی اے موحد اور نیک عمل کرنے والو! جن بیویوں کا تم پیام کرتے ہو، وہ ایسی ہیں جیسے یاقوت اور مرجان۔ امام مجاہد، حسن اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ یاقوت کی صفائی میں اور مرجان کی سفیدی میں۔[2] ان لوگوں نے مرجان کو لؤ لؤ ٹھہرایا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اہلِ جنت کی زنان میں سے عورت ایسی ہوگی کہ اس کی پنڈلی کی سفیدی ستر حلوں کے پرے سے دکھائی دے گی، یہاں تک کہ اس کا گودا دکھائی دے گا۔

﴿ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ چنانچہ یاقوت تو ایک پتھر ہے اگر تو داخل کرے اس میں کوئی چیز پھر اس کو تو صاف کرے تو البتہ تو دیکھے اس کو اس کے ورے سے۔[3] (رواه ابن أبي حاتم و هكذا رواه الترمذي، من حديث عبيدة بن حميد وأبي الأحوص عن عطاء بن السائب به ورواه موقوفا ثم قال: وهو أصح۔ كذا في ابن كثير)۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اہلِ جنت میں مرد کے لیے دو بیویاں حورِ عین میں سے ہیں، ہر ایک پر ستر حلے ہیں اس کی پنڈلی کا گودا کپڑوں کے پیچھے سے دکھائی دیتا ہے۔[4] (أخرجه الإمام أحمد و تفرد به من هذا الوجه)

امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں یا تو تفاخر کیا یا مذاکرہ کیا کہ جنت میں مرد زیادہ ہیں یا عورتیں تو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بولے: کیا ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا وہ چودھویں رات کے چاند کی صورت پر ہوگا اور وہ گروہ جو اس کے بعد ہوگا روشن تارے کی روشنی پر ہوگا جو آسمان میں ہے، ان میں سے ہر مرد کے لیے دو بیویاں ہیں، اس کی پنڈلی کا گودا گوشت کے پرے سے دکھائی دے گا اور جنت میں کوئی مرد مجرد (اکیلا) نہیں ہے۔[5] (رواه مسلم من حديث إسماعيل بن علية عن أيوب عنه، وهذا حديث مخرج في الصحيحين من حديث همام بن منبه و أبي زرعة عن أبي هريرة رضي الله عنه)۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ البتہ صبح کو یا شام کو ایک بار اللہ کی راہ میں جانا دنیا وما فیہا سے بہتر ہے اور جنت میں تم میں سے کسی کی کمان یا اس کے کوڑے کے برابر جگہ دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے اور اگر اہلِ جنت کی عورت میں سے کوئی عورت زمین کی طرف جھانک لیتی تو البتہ وہ آسمان اور زمین کے درمیان کی جگہ کو نور سے اور خوشبو سے بھر دیتی اور البتہ اس کے سر پر کی اوڑھنی دنیا وما فیہا سے بہتر ہے۔[6] (رواه الإمام أحمد. و رواه البخاري من حديث أبي إسحاق عن حميد عن أنس بنحوه)۔

---

① تفسير الطبري (٦٥/٢٣) ② تفسير الطبري (٦٧،٦٦/٢٣)

③ تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٧/١٠) سنن الترمذي (٢٥٣٣) تفسير ابن كثير (٣٥٤/٤) ④ مسند أحمد (٣٤٥/٢)

⑤ صحيح البخاري (٣٠٧٤) صحيح مسلم (٢٨٣٤) ⑥ صحيح البخاري (٢٦٤٣) مسند أحمد ١٤١/٣)

قولہ تعالیٰ: ﴿ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴾ یعنی نہیں ہے اس شخص کے لیے جس نے دنیا میں نیک عمل کیا مگر نیکی کرنا اس سے دارِ آخرت میں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ﴾[یونس: ۲۶] ''جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے لیے خوبی ہے اور مزید برآں بھی۔'' امام بغوی رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تمھارے رب نے کیا کہا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا کہ وہ فرماتا ہے: نہیں ہے جزا اس شخص کی جس پر میں نے توحید کے ساتھ انعام کیا مگر جنت۔[1] (وروي مثله عن ابن عمر رضي الله عنهما كما أخرجه ابن أبي حاتم وابن مردويه والبيهقي وضعفه وأخرجه البغوي في تفسيره وغيره في غيره عن أنس مرفوعا مثله وأخرج ابن النجار عن علي رضي الله عنه مرفوعاً مثل حديث ابن عمر رضي الله عنهما كذا في فتح البيان)

چونکہ جو شے ذکر کی گئی، اس میں ایک ایسی عظیم نعمت تھی کہ جس کے برابر کوئی عمل نہیں کرتا، مگر صرف اللہ کا فضل و کرم اور احسان تھا، اس لیے اس کے بعد فرمایا: ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ جو حدیثیں ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ ﴾ سے متعلق ہیں ان میں سے وہ حدیث ہے جو ترمذی اور بغوی رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ جو شخص ڈرا تو وہ آخری رات کو چلا اور جو کوئی آخری رات کو چلا تو منزل کو پہنچ گیا، خبردار بے شک اللہ کا سودا گراں قیمت ہے، بے شک اللہ کا سودا جنت ہے۔[2] (ثم قال الترمذي: غريب لا نعرفه إلا من حديث أبي النضر)۔ پھر بہ روایتِ بغوی وہی حدیث سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ذکر کی ہے۔[3] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

قاموس میں کہا ہے: ''تَوَكَّأَ عَلَيْهِ تَحَامَلَ وَاعْتَمَدَ وَاتَّكَأَ جَعَلَ لَهُ مُتَّكَأً''[4] اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک کہ «أَمَّا أَنَا فَلَا آكُلُ مُتَّكِئًا»[5] اس کے یہ معنی ہیں کہ ایسے بیٹھ کر نہیں کھاتا، جیسا کہ متمکن متربع شخص جم کر چارزانوں بیٹھ کر کھاتا ہے اور اس کی طرح کی بیٹھنے کی اور شکلیں جو زیادہ کھانے کی متدعی ہیں، بلکہ آپ کا کھانے کے لیے بیٹھنا مستوفز، مقعی، غیر متربع و متمکن ہو کر تھا، اس سے مراد کسی جانب پر مائل ہونا نہیں ہے، جیسا کہ عام طلبہ خیال کرتے ہیں۔ اتکاء کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ صحیح فارغ القلب متنعم البدن کا حال ہے بہ خلاف مریض و مہموم

---

① تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۲۷/۱۰) شعب الإيمان (۳۷۱/۱) تفسير البغوي (٤٥٦/۷) فتح البيان (۳٤٤/۱۳) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت کی سند میں ''ابراہیم بن محمد کوفی'' اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کی سند میں ''بشر بن حسین'' ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٩٨٤)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (۲٤٥۰) تفسير البغوي (٤٥۱/۷) صحيح الجامع ، رقم الحديث (٦۲۲۲)

③ تفسير البغوي (٤٥۲/۷) تفسير ابن كثير (۳٥۳/٤-۳٥٥) ④ القاموس المحيط (۷۱/۱)

⑤ سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۸۳۰) سنن النسائي الكبرىٰ (۱۷۱/٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (۱۳٤٦)

کے کہ وہ مرض اور حزن کے مارے اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتا۔

﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ ﴾ کا نصب بنا بر حال ہے ﴿ وَلِمَنْ خَافَ ﴾ کے فاعل سے، "مَنْ" کے معنی پر محمول کر کے جمع کر دیا ہے، یا منصوب ہے بنا بر مدح "أَيْ: أَعْنِيْ أَوْ أَمْدَحُ"، کسی نے کہا ہے کہ اس کا عامل محذوف ہے، تقدیر یہ ہے: "يَتَنَعَّمُوْنَ مُتَّكِئِيْنَ" یعنی وہ عیش و آرام کریں گے لذت لیں گے لیٹے ہوئے یا چار زانو بچھونوں پر بیٹھے ہوئے جن کے استر استبرق کے ہیں۔ ﴿ فُرُشٍ ﴾ جمع ہے فراش کی۔ فراش بہ معنی بستر ہے۔ "بطائن" "بطانة" کی جمع ہے، "بطانة" وہ ہے جو ظہارہ کے نیچے ہوتا ہے، بطانہ استر ہوا اور ظہارہ ابرہ۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بطائن وہ ہیں جو زمین سے لگے رہتے ہیں اور استبرق وہ ہے جو غلیظ وگندہ (موٹا) ہو پارچہ ریشمی سے اور جب بطائن استبرق کے ہوئے تو پھر ظہائر کیسے ہوں گے!

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے کسی نے کہا: بطائن تو استبرق کے ہیں، پھر ظہائر کیا ہیں؟ کہا ان میں سے ہیں جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾ [السجدة: ١٧] "کوئی نفس نہیں جانتا جو کچھ ہم نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے پوشیدہ کر رکھی ہے۔" اسی کے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی قائل ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ بطائن کے ذکر پر صرف اس لیے اکتفا کیا کہ زمین میں کوئی نہیں جو اس شے کو پہچانے جو ظہائر میں ہے۔ (محلی نے کہا ہے کہ بطائن استبرق کے اور ظہائر سندس کے[2] سندس باریک ریشمی کپڑا ہے)۔

حسن رحمہ اللہ کا قول تو مالک بن دینار رحمہ اللہ کے قول کی طرح ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بطائن ظہائر ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں اور کہا ہے کہ بطانہ کبھی ظہارہ ہوتا ہے اور ظہارہ کبھی بطانہ ہوتا ہے، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک ایک وجہ، یعنی ایک رخ ہوتا ہے اور عرب لوگ "هَذَا ظَهْرُ السَّمَاءِ وَهَذَا بَطْنُ السَّمَاءِ" کہتے ہیں (یعنی یہ آسمان کی پشت ہے اور یہ آسمان کا شکم ہے)۔ آسمان کے ظاہر کو جسے ہم دیکھتے ہیں، ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا کہ یہ نہیں ہوتا مگر ان دو رخوں میں جو متساوی ہوں۔[3]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک قول پہلے گزر چکا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ تم خبر دیے گئے بطائن کی، پھر ظہائر کیسے ہوں گے![4] کسی نے کہا ہے کہ ان کے ظہائر سندس کے ہیں، یعنی دیباج باریک نرم کے غرضیکہ ظہائر کا ذکر نہ کرنا ان بچھونوں کے انتہائی شرف پر دال ہے، کیوں کہ یہ ذکر کیا گیا کہ ان کے بطائن استبرق کے ہیں اور یہ ضروری بات ہے کہ ظہائر بطائن سے بہتر ہوتے ہیں، چنانچہ وہ اس قسم سے ہیں کہ بشر اس کو نہیں جانتے۔ جمہور نے ﴿ فُرُشٍ ﴾ کو بضمتین پڑھا ہے اور امام ابوحیوہ رحمہ اللہ نے بہ ضمِ فاء وسکونِ راء پڑھا ہے۔

---

[1] تفسیر البغوي (٧/٤٥٣)
[2] تفسیر الجلالین (١/٧١١)
[3] تفسیر القرطبي (١٧/١٧٩، ١٨٠)
[4] تفسیر الطبري (٢٣/٦١، ٦٢) الدر المنثور (٧/٧٠٩)

﴿ وَجَنَى الْجَنَّتَيْنِ ﴾ مبتداء ہے ﴿ دَانٍ ﴾ خبر ہے اس کی اصل "دانو" ہے مثل "غازو" کے پھر اسی کا سا اعلال کیا گیا۔ ﴿ جَنَى ﴾ فعل کا وزن بہ معنی مفعول ہے، جیسے: قبض بہ معنی مقبوض۔ جمہور نے بہ فتحِ جیم پڑھا ہے اور عیسیٰ بن عمر نے بہ کسرِ جیم و کسرِ نون پڑھا ہے بنا بر امالہ۔[1] بالجملہ ﴿ جَنَى ﴾ وہ میوے ہیں جو چنے جاتے ہیں۔ کہا ہے کہ درخت قریب ہو جائے گا، یہاں تک کہ جو کوئی اس کے میووں کا ارادہ کرے گا وہ ان کو چنے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ جَنَى ﴾ اس کے ثمر ہیں۔ "دانی" تجھ سے قریب ہیں تو اُن کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے پہنچے گا۔[2] (أخرجه عبد بن حميد وغيره) یعنی "متكئ و نائم" یعنی تکیہ لگانے والا اور لیٹا ہوا اس کو پہنچے گا برخلاف دنیا کے پھلوں کے کہ یہ بغیر کد وتعب (کوشش اور تکلیف) کے ہاتھ نہیں آتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ دوری اور کانٹے ان کے ہاتھوں کو میووں سے رد نہ کریں گے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آخرت کی جنت دنیا کی جنت سے تین وجہ سے مختلف ہے: ایک یہ ہے کہ دنیا میں میوہ درختوں کے سروں پر ہوتا ہے تکیہ لگا کر بیٹھے ہوئے آدمی سے دور ہوتا ہے اور جنت میں آدمی تکیہ لگا کر بیٹھے گا اور میوہ اس کی طرف لٹک آئے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دنیا میں آدمی میوے کی طرف جانے کے لیے سعی اور حرکت کرتا ہے اور آخرت میں میوہ اس کے قریب ہوگا اور اس پر دور کرے گا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ آدمی دنیا میں جب کسی درخت کے میوے سے قریب ہوتا ہے تو اس کے غیر سے دور ہوتا ہے اور جنت کے کل میوے ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ پر اس کے قریب ہوں گے۔[3]

﴿ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ کی یہ ساری نعمتیں ایسے موضع پر ہیں کہ کسی مکذب کے لیے ان میں سے کسی کی تکذیب کرنا آسان نہیں، ان فوائدِ عاجلہ و آجلہ کے سبب سے جن پر وہ مشتمل ہیں۔ ﴿ فِيْهِنَّ ﴾ کی ضمیر راجع ہے طرف دو جنتوں کے جو ذکر کی گئی ہیں، اس لیے کہ جمع کم از کم دو کے لیے ہے، یا اس لیے کہ وہ دو باغ مشتمل ہیں مکانات و بالاخانوں پر اور قصور و مجالس پر۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿ فِيْهِنَّ ﴾ جو فرمایا تو صرف اس لیے کہ مراد دو باغ ہیں اور وہ نعمتیں جو اُن کے صاحب کے لیے ان میں تیار کی گئی ہیں۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ضمیر بہت سی نعمتوں کی طرف پھرتی ہے، یعنی "جنتين وعينين وفاكهة و فرش وجنا" کی طرف۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فُرُشٍ ﴾ کی طرف راجع ہے (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں)۔[5]

امام ابوحیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قول میں بُعد ہے، اس لیے کہ استعمال میں یوں کہا جاتا ہے کہ "عَلَى الْفِرَاشِ كَذَا"۔ اور "فِي الْفَرَاشِ كَذَا" نہیں بولا جاتا مگر بہ تکلف (شاید وہ تکلف یہ ہو کہ "في" کو بہ معنی "على" ٹھہرائیں)

---

(1) فتح القدير (١٨٧/٥) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٦/١٠) الدر المنثور (٧١٠/٧) (3) تفسير الرازي (١١٢/٢٩)
(4) تفسير القرطبي (١٨٠/١٧) (5) تفسير ابن كثير (٣٥٤/٤)

اور اسی لیے امام زمخشری رحمہ اللہ نے ﴿فُرُش﴾ کے ساتھ اور چیزوں کو جمع کیا (یعنی "جنتین و عینین و فاکھة وجنا" اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کا وہی قول ہے) تا آنکہ اس کے لیے یہ صحیح ہوا کہ یہ کہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر موضعِ جنت میں ایک جنت ہے تو اسی لیے یہ صحیح ہوا کہ ﴿فِيْهِنَّ﴾ کہا جائے۔[1]

﴿قٰصِرٰتُ﴾ اسم فاعل ہے ﴿اَلطَّرْفِ﴾ کی طرف اس کی اضافت اسم فاعل کی اضافت ہے اپنے مفعول کی طرف تخفیف کے لیے، کیونکہ اس طرح بولتے ہیں: "قَصَرَ طَرْفَهُ عَلَى كَذَا" یعنی اپنی آنکھ فلاں شے پر روکی اور قصر کا متعلق حذف کیا گیا اس کے معلوم ہونے کے سبب سے، یعنی وہ عورتیں اپنی نگاہوں کو اپنے خاوندوں پر روکتی ہیں) جو جنوں اور انسانوں میں سے تکیہ لگانے والے ہیں، وہ ان کے غیر کی طرف نظر نہیں کرتیں اور ان کے سوا کسی اور کو نہیں دیکھتیں۔ یہ آیت ان کی شرم و حیا پر دال ہے، اس لیے کہ "طرف" "جفن" کی حرکت کو کہتے ہیں (یعنی پلکِ چشم یعنی پپوٹا یا آنکھ کا غلاف) اور حیا دار عورت اپنے "جفن" کو نہیں ہلاتی اور نہ ہی اپنے سر کو اٹھاتی ہے۔ اس کا بیان سورۃ الصافات میں گزر چکا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ اپنی آنکھ کو اپنے شوہروں کے علاوہ دوسروں سے روکنے والی ہیں۔[3]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس ترتیب کے حسن کی طرف تو ذرا نظر کرو کہ پہلے تو مسکن کا بیان کیا، یعنی جنت، پھر وہ شے بیان کی جس سے تنزہ (سیر و تفریح، تماشا) کیا جاتا ہے، یعنی باغ و بستان اور بہتے ہوئے چشمے، پھر کھانے کی شے کا ذکر کیا، پھر کھانے کے بعد آرام لینے کی جگہ کا بیان فرمایا، یعنی بچھونا، پھر اس شے کا ذکر کیا جو اس کے ساتھ بچھونے میں ہوگی،[4] یعنی خوبصورت بی بی میاں کو چاہنے والی۔ چونکہ کسی شے کا اختصاص بہت زیادہ لذت دینے والی چیزوں میں سے ہوتا ہے اس لیے یوں فرمایا: ﴿لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ﴾

﴿قَبْلَهُمْ﴾ کی ضمیر ازواج کی طرف راجع ہے جو "قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ" سے معلوم ہوتی ہیں یا ﴿مُتَّكِـِٕيْنَ﴾ کی طرف راجع ہے اور ﴿قٰصِرٰتُ﴾ کی جملہ صفت ہے، اس لیے کہ اس کی اضافت لفظی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ [الأحقاف: ٢٤] "کہنے لگے، یہ ابر اہم پر برسنے والا ہے۔" یا حال ہے اس لیے کہ اضافت سے نکرہ کی تخصیص ہوگئی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "طمث" بہ معنی "افتضاض" ہے، یعنی ایسا جماع کرنا جو خون نکالے۔ "يُقَالُ: طَمِثَ الْجَارِيَةَ إِذَا افْتَرَعَهَا" افتراع بکر توڑنے کو کہتے ہیں، اسی معنی سے فرزدق کا قول ہے:

دُفِعْنَ إِلَيَّ وَلَمْ يُطْمَثْنَ قَبْلِي ۔۔۔ وَهُنَّ أَصَحُّ مِنْ بَيْضِ النَّعَامِ

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (٣٤٩/١٨) [2] رقم الآية (٤٨)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٦/١٠) [4] تفسير الرازي ١١٢/٢٩)

یعنی وہ عورتیں میری طرف دفع کی گئیں اور وہ کنواریاں تھیں، کسی نے مجھ سے پہلے ان کا بکر نہیں توڑا تھا اور وہ زیادہ درست تھیں شتر مرغ کے انڈوں سے۔

کسی نے کہا ہے کہ ''طمث'' بہ معنی ''مس'' ہے، یعنی کسی نے ان کو چھوا نہیں یہ قول ابو عمرو کا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: ''لم یذللھن''۔ طمث بہ معنی تذلیل ہے،[1] یعنی کسی نے ان کو رام اور تابع نہیں کیا۔ سمین میں ہے کہ ''طمث'' کی اصل وہ جماع ہے جو خونِ بکر کے نکلنے کا باعث ہو۔ پھر ہر جماع پر ''طمث'' کا اطلاق کہا گیا گو اس کے ساتھ خون نہ ہو (جمل نے کہا ہے کہ یہاں مراد یہی ہے)۔ کسی نے کہا ہے کہ ''طمث'' خونِ حیض ہے، یا خونِ جماع۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے کہ کسی نے ان سے پہلے وطی وغشیان و جماع نہیں کیا اور نہ ہی کوئی ان پر متسلط ہوا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس لیے کہ وہ تو جنت میں پیدا کی گئیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ وہ دنیا کی عورتوں میں سے ہیں اور پیدایش کر کے کنواریاں پیدا کی گئیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ وہ انسان عورتیں ہیں جو کنواری مر گئیں۔ قولِ اول زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے: ''لَمْ يَدْنُ مِنْهُنَّ''۔[3] یا ''لَمْ يُدْمِهِنَّ''[4] (أخرجه ابن جرير وغيره) یعنی کسی نے ان سے قربت نہیں کی یا کسی نے ان کو خون آلود نہیں کیا۔

جمہور نے ﴿ يَطْمِثْهُنَّ ﴾ کو بہ کسرِ میم پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی جحدری اور طلحہ بن مصرف نے) بہ ضمِ میم پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام کسائی رحمہ اللہ نے) بہ فتحِ میم پڑھا ہے۔[5] اس آیتِ کریمہ میں بلکہ اس سورت کی بہت سی آیات میں اس بات پر دلیل ہے کہ جن جنات میں داخل ہوں گے، جبکہ وہ اللہ پاک پر ایمان لائیں اور فرائض کو بجا لائیں اور مناہی سے باز رہیں اور اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جن جماع کرتے ہیں جس طرح کہ انسان کرتے ہیں، کیونکہ مقامِ امتنان اسی کا مقتضی ہے، اس لیے کہ اگر وہ جماع نہ کرتے تو ان کے لیے امتنان حاصل نہ ہوتا۔

﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ ان نعمتوں میں جو ترغیب دی ہے تو اس ترغیب میں ایک نعمتِ جلیلہ واحسانِ عظیم ہے، کیوں کہ اس سے اعمالِ صالحہ کی حرص پیدا ہوتی ہے اور برے کاموں سے بچنے سے گریز کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، پھر جب ان نعمتوں کا حصول ہوگا اور نعمتوں والی جنتوں میں بغیر رکاوٹ اور بغیر کمی کے ان میں لطف اندوز ہوں گے تو اس کا کیا کہنا ہے۔ غرضیکہ ﴿ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾ کی ایک صفت تو یہ ہوئی کہ ان کے خاوندوں سے پہلے کسی نے ان سے جماع نہیں کیا، خاص انہی کے لیے کنواری اور اچھوتی رکھی گئیں، پھر ان کی دوسری صفت بیان کی: ﴿ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ یہ جملہ ﴿ قٰصِرٰتُ ﴾ کی صفت ہے، یا ان سے حال ہے۔ مکی رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور کوئی وجہ ذکر نہیں کی۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٨١/١٧) [2] فتح القدير (١٨٧/٥) [3] الدر المنثور (٧١١/٧)
[4] تفسير الطبري (٦٤/٢٣) [5] فتح القدير (١٨٧/٥)

یاقوت ایک جوہرِ نفیس ہے، کہتے ہیں کہ آگ اس پر اثر نہیں کرتی۔ اور جو باتیں اس کے متعلق معلوم ہیں، ان میں یہ ہے کہ یاقوت سرخ رنگ کا ہوتا ہے تو یہ تشبیہ اس کی مقتضی ہے کہ اہلِ جنت کا رنگ سفید سرخی آمیز ہو، چنانچہ یہ اس مقرر اور معلوم بات کے برعکس ہوگا کہ وہ سفید زردی آمیز ہے۔ چنانچہ جواب یہ ہے کہ یاقوت سے تشبیہ صفائی کے طور پر ہے نہ کہ سرخی کی وجہ سے اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ سفید زردی آمیز ہو، جیسا کہ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ عورتیں یاقوت جیسی صفائی اور مرجان جیسی سفیدی میں ہیں۔[1]

اب رہی یہ بات کہ مرجان کو خاص کر ذکر کیا، اس قول کی بنا پر کہ وہ چھوٹے موتی ہیں، اس لیے کہ ان کی صفائی بڑے موتیوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اس کے "خِدْر" میں اس کے چہرے کی طرف نظر کرے گا۔ ("خدر" وہ پردہ ہے جس میں کنواری عورت رہتی ہے) جو آئینے سے بھی زیادہ صاف ہوگا اور بے شک حال یہ ہے کہ اس پر ستر حلے، یعنی لباس ہوں گے اور اس کی نگاہ ان سے نفوذ کر جائے گی، یہاں تک کہ ان لباسوں کے پرے سے ان کی پنڈلی کا گودا دیکھ لے گا۔[2] (أخرجه الإمام أحمد و ابن حبان والحاكم وصححه والبيهقي في البعث) ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک اس کی ساری نعمتوں میں سے کسی شے کی تکذیب نہیں ہوسکتی وہ کوئی سی نعمت ہو، پھر بھلا ان جلیل القدر نعمتوں اور بڑے بڑے احسانات کی کیسے تکذیب ہوسکتی ہے۔

جملۂ ﴿ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴾ مضمونِ ما قبل کا مقرر ہے۔ کلمۂ "هَلْ" کلام میں چار طرح پر آتا ہے۔ "قد" کے معنی میں ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے ﴿ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ ﴾ [الدهر: ١] "یقیناً (ہر) انسان پر زمانے سے ایک ایسا وقت گزر چکا ہے۔" اور بہ معنی استفہام جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ﴾ [الأعراف: ٤٤] "سو تم سے جو تمھارے رب نے وعدہ کیا تھا تم نے بھی اس کو واقع کے مطابق پایا؟" اور امر کے معنی میں آتا ہے: ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ [المائدة: ٩١] "سو اب بھی باز آجاؤ۔" "أَيْ: اِنْتَهُوْا" اور جحد (انکار) کے معنی میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ [النحل: ٣٥] "تو رسولوں پر صرف کھلم کھلا پیغام کا پہنچا دینا ہے۔" اور جس طرح آیتِ باب میں ہے کہ معنی یہ ہیں کہ نہیں ہے جزا اس شخص کی جس نے دنیا میں نیک عمل کیا مگر اس کے ساتھ آخرت میں احسان کرنا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔

امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا: نہیں ہے جزا اس شخص کی جس پر میں نے ازل میں احسان کیا، مگر اس پر ابد

---

[1] الدر المنثور (٧١٢/٧)

[2] مسند أحمد (٧٥/٣) صحيح ابن حبان (٤٠٩/١٦) مستدرك الحاكم (٥١٦/٢) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم" ضعیف راوی ہے۔ ضعيف الترغيب والترهيب (٢٥٢/٢)

میں بھی احسان کا حفظ۔[1] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں وجوہِ کثیر ہیں، یہاں تک کہ کہا گیا ہے کہ قرآن شریف میں تین آیتیں ہیں، ان میں سے ہر ایک میں سو قول ہیں، ایک تو یہ آیت ہے: ﴿ فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ ﴾ [البقرة: ١٥٢] ''اس لیے تم میرا ذکر کرو، میں بھی تمھیں یاد کروں گا۔'' دوسری آیت یہ ہے: ﴿ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ﴾ [بني إسرائيل: ٨] ''ہاں اگر تم پھر بھی وہی کرنے لگے تو ہم بھی دوبارہ ایسا ہی کریں گے۔'' اور تیسری آیت ﴿ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴾۔[2]

امام محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت بر و فاجر کے لیے ہے۔ نیک کار کے لیے تو آخرت میں اور بدکار کے لیے دنیا میں۔[3] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: نہیں ہے جزا اس شخص کی جس پر ہم نے اسلام کے ساتھ انعام کیا مگر یہ کہ داخل کروں اس کو جنت میں۔ (أخرجه ابن مردويه) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نہیں ہے جزا اس شخص کی جس نے دنیا میں ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' کہا مگر جنت آخرت میں۔ (أخرجه عبد بن حميد وغيره) ان کی دوسری مرفوع روایت یہ ہے کہ اللہ نے سورۃ الرحمٰن میں مجھ پر یہ آیت کافر و مسلم کے لیے نازل کی: ﴿ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴾۔[4] (أخرجه ابن عدي وغيره)

• ابراہیم خواص رحمہ اللہ نے فرمایا: ''هَلْ جَزَاءُ الْإِسْلَامِ إِلَّا دَارُ السَّلَامِ''[5] یعنی نہیں ہے بدلہ اسلام کا مگر سلامتی کا گھر، مراد بہشتِ عنبر سرشت ہے۔ اللھم ارزقنا بفضلك ورحمتك الواسعة. آمین آیتِ کریمہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آخرت میں تکلیف (پابندی) رفع ہو گی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن سے احسان کا وعدہ کیا ہے اور وہ جنت ہے، چنانچہ اگر آخرت میں تکلیف (پابندی) باقی رہتی اور بندہ اس کو ترک کرتا تو ترکِ عمل پر سزا کا مستحق ہوتا اور سزا یہ ہے کہ احسان کو ترک کیا جائے۔ اس سے تو معلوم ہوا کہ وہاں کچھ تکلیف (پابندی) نہیں ہے۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے تم پر دنیا اور آخرت میں اس طرح سے احسان کرنا ہے کہ تم کو روزی دی، عملِ صالح کی راہ بتائی اور جس عمل کو وہ پسند نہیں کرتا اس سے تم کو منع کیا۔[6]

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۝٦٢ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٦٣ مُدْهَآمَّتٰنِ ۝٦٤
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٦٥ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۝٦٦
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٦٧ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ
وَّرُمَّانٌ ۝٦٨ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٦٩ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ

[1] تفسیر الطبري (٢٣/٦٨) تفسیر القرطبي (١٧/١٨٢، ١٨٣)
[2] تفسیر الرازي (٢٩/١١٥)
[3] تفسیر الطبري (٢٣/٦٨) فتح القدير (٥/١٨٨)
[4] الدر المنثور (٧/٧١٤)
[5] تفسير النسفي (٤/٢٠٥)
[6] فتح البيان (١٣/٣٣٩ـ٣٤٥)

حِسَانٌ ﴿٧٠﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧١﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ
فِي الْخِيَامِ ﴿٧٢﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٣﴾ لَمْ
يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿٧٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٥﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٧﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي
الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٧٨﴾

دو باغوں کے علاوہ دو باغ (اور) ہیں (62) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (63) (جو) گہرے سبز سیاہی مائل ہیں (64) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (65) ان میں جوش مارتے دو چشمے ہیں (66) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (67) ان دونوں میں لذیذ پھل ہوں گے، اور کھجوریں اور انار بھی (68) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (69) ان (سب باغوں) میں خوب سیرت (اور) خوب صورت عورتیں ہیں (70) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (71) حوریں جو خیموں میں محفوظ ہوں گی (72) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (73) ان سے پہلے انھیں کسی انسان اور کسی جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہو گا (74) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (75) سبز اور نہایت نفیس اور نادر قالینوں پر تکیے لگائے (بیٹھے) ہوں گے (76) پھر تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ (77) آپ کے رب ذوالجلال والاکرام کا نام بہت ہی برکت والا ہے (78)

دو مزید باغوں کا بیان:

ہر آیت میں نعمت جتائی، کوئی آپ نعمت ہے اور کسی کی خبر دینی نعمت ہے کہ اس سے بچیں۔ انتہیٰ۔

یہ دو جنتیں بہ نصِ قرآن پہلے کی دو جنتوں سے مرتبہ وفضیلت ومنزلت میں کم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴾۔ حدیث شریف میں گزر چکا ہے کہ دو جنتیں سونے کی ہیں، ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے سب سونے کا ہے اور دو جنتیں ایسی ہیں جن کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب چاندی کا ہے۔[1] پس پہلے کی دو

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠)

جنتیں تو مقربین کے لیے ہیں اور دوسری دو اصحابِ یمین کے لیے ہیں۔ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سونے کی دو جنتیں مقربین کے لیے اور چاندی کی دو جنتیں اصحابِ یمین کے لیے ہیں۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مِنْ دُوْنِهِمَا فِي الدَّرَجِ" یعنی یہ دو پہلے کی دو سے درجے میں کم ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فضیلت میں ان سے کم ہیں۔[2] یہ بات کہ پہلے کی دو کو بعد والی دو پر شرف حاصل ہے، اس کی دلیل میں کئی وجوہات ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ پہلی دو جنتوں کا وصف دوسری دو سے پہلے بیان کیا اور کسی کو پہلے رکھنا اس کی اہمیت کی دلیل ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴾ یہ دوسری دو پر ان کے شرف اور بلندی کو ظاہر کرتا ہے، وہاں فرمایا: ﴿ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴾ یعنی ٹہنیاں اور قسم قسم کی لذت کی چیزیں اور یہاں فرمایا: ﴿ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴾ یعنی پانی کی سیرابی کی شدت اور زیادتی سے سیاہ ہو رہی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ پانی کی شدتِ سیرابی کے مارے سبزی سے سیاہ ہوگئیں۔ ان کا دوسرا قول: "خَضْرَاوَانِ" ہے۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم) سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ وغیرہ (یعنی عبد اللہ بن الزبیر اور عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد فی احدی الروایات، عطاء العوفی، الحسن البصری، یحییٰ بن رافع اور سفیان الثوری رحمہم اللہ[4] كذا في ابن كثير) سے بھی اسی کے مثل مروی ہے امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: "مُمْتَلِئَتَانِ مِنَ الْخُضْرَةِ" یعنی وہ سبزی سے پر ہو رہی ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "خَضْرَاوَانِ مِنَ الرِّيِّ نَاعِمَتَانِ"[5] یعنی مارے سیرابی کے سبز ہو رہی ہیں۔

وہ ٹہنیاں جو ان درختوں پر ہیں جو جال کی طرح ایک دوسرے میں گھچ پچ ہو رہی ہیں، ان کی تروتازگی میں کسی طرح کا شک نہیں ہے اور وہاں فرمایا ہے: ﴿ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴾ اور یہاں فرمایا: ﴿ نَضَّاخَتٰنِ ﴾۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (یعنی بروایتِ علی بن ابی طلحہ): "فَيَّاضَتَانِ"۔[6] جری، نضخ سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مُمْتَلِئَتَانِ وَلَا تَنْقَطِعَانِ"[7] یعنی بھری ہوئی ہیں ٹوٹتی نہیں ہیں اور وہاں فرمایا ہے: ﴿ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴾ اور یہاں فرمایا ہے: ﴿ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴾ اس میں شک نہیں کہ پہلا ﴿ فَاكِهَةٌ ﴾ اعم و اکثر ہے افراد میں اور قسموں میں بہ نسبت ﴿ فَاكِهَةٌ ﴾ ثانی کے، اس لیے کہ یہ نکرہ ہے اور نکرہ سیاقِ اثبات میں عام نہیں ہوتا، اسی لیے ﴿ وَنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴾ فرما کر اس کی تفسیر کی۔ یہ عطف خاص علی العام کے باب سے ہے جس طرح کہ بخاری وغیرہ نے اس کی تقریر کی ہے۔ ﴿ نَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴾ کو علاحدہ کر کے اس لیے ذکر کیا کہ ان کو دوسرے پھلوں پر شرف حاصل ہے۔

---

1. تفسير ابن كثير (٣٥٥/٤)
2. تفسير الطبري (٦٩/٢٣)
3. تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٧/١٠)
4. تفسير ابن كثير (٣٥٥/٤، ٣٥٦)
5. تفسير الطبري (٧١/٢٣)
6. تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٨/١٠)
7. تفسير الطبري (٧٢/٢٣)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کچھ لوگ یہود کے رسول اللہ ﷺ کی طرف آئے اور عرض کی: یا محمد! کیا جنت میں فاکھہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں اس میں فاکھہ ہے اور نخل و رمان ہیں۔ عرض کی: کیا پھر کھائیں گے جس طرح دنیا میں کھاتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں و ''اضعاف''، یعنی کئی گنا زیادہ۔ عرض کی: تو پھر قضائے حوائج کریں گے؟ فرمایا: نہیں، نہیں ''وَلَكِنَّهُمْ يَعْرِقُوْنَ وَيَرْشَحُوْنَ''، یعنی لیکن عرق ناک ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے شکموں میں جو کچھ اذیٰ ہوگی، اس کو دور کرے گا۔[1] (أخرجه عبد بن حميد)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جنت کے درختِ خرما کے پتے اہلِ جنت کے لباس ہیں، انہی سے ان کی مقطعات ہیں (بفتح طائے مشددہ ''أي: ثياب قصار لأنها قطعت عن بلوغ التمام وقيل: هو كل ما يفصل ويخاط من قميص وغيره وما لا يقطع منها كالأزر والأردية''[2] كذا في مجمع البحار)۔ اور انہیں سے ان کے حلے ہیں اور کون اس کا زرِ سرخ ہے اور تنے اس کے زمرد سبز ہیں اور ثمر اس کے شہد سے بھی زیادہ شیریں ہیں اور مسکے سے زیادہ نرم ہیں اور اس کی گٹھلی نہیں ہے۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم) (''کون'': اصل میں اسی طرح ہے۔ واللہ أعلم۔ یہ کیا شے ہے۔ تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ میں ''وكونها ذهب أحمر'' ہے۔ خازن میں یوں ہے: ''وروى البغوي بسنده عن ابن عباس رضي الله عنهما موقوفا قال: نخل الجنة جذوعها زمرد أخضر وكرمها ذهب أحمر و سعفها كسوة لأهل الجنة منها حللهم وثمرها مثل القلال أو الدلاء أشد بياضا من اللبن وأحلى من العسل وألين من الزبد ليس له عجم''[4] حاشیہ خازن پر محشی مصر نے لکھا ہے کہ نسخوں میں اسی طرح ''كرمها ذهب أحمر'' ہے اور درست شاید ''كربها'' بیائے موحدہ ہو۔ صحاح میں ہے: ''كرب النخل'' بفتحتین ''اصول السعف'' سعف شاخہائے نخل ہیں اور کرب ان کے اصول، یعنی ان کی شاخوں کے اصول سرخ سونا ہے۔ والله أعلم)۔ ان کی دوسری روایت سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ ہے: فرمایا: میں نے جنت کی طرف نظر کی تو دیکھتا ہوں کہ ان کے انار پالان کسے ہوئے اونٹ کی طرح ہیں۔[5]

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ﴾ کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جنت میں خیراتِ کثیرہ حسنہ ہیں، یعنی بہت سی عمدہ خوبصورت چیزیں۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''خیرات''، ''خیرة'' کی جمع ہے اور وہ صالح عورت حسین خلق اور حسین چہرے والی ہے۔ یہ قول جمہور کا ہے اور یہی ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی

---

(1) مسند عبد بن حميد (١/٤٣) اس کی سند میں ''حصین بن عمر'' ضعیف راوی ہے۔ (2) مجمع بحار الأنوار (٤/٢٩٥)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٢٨) (4) تفسير الخازن (٧/١٢)

(5) تفسير ابن كثير (٤/٣٥٦) اس کی سند میں ''ابو ہارون عبدی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

ہے۔[1] دوسری حدیث جس کو ہم - إن شاء اللّٰہ- سورت واقعہ میں لائیں گے، اس میں یہ ہے کہ حورِ عین گائیں گی: "نَحْنُ الْخَيْرَاتُ الْحِسَانُ۔ خُلِقْنَا لِأَزْوَاجٍ كِرَامٍ" یعنی ہم خوش خلق خوبصورت بیبیاں ہیں جو عزت دار خاوندوں کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور اسی لیے بعض نے "خَيِّرَاتٌ" بہ تشدید پڑھا ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴾ اور وہاں فرمایا تھا: ﴿ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾ بے شک جس عورت نے خود اپنی آنکھ روکی وہ اس سے افضل ہے جو روکی گئی، اگرچہ وہ سب کی سب مخدرات پردہ نشین ہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر مسلم کے لیے ایک خیرہ ہے اور ہر خیرہ کا ایک خیمہ ہے اور ہر خیمے کے چار دروازے ہیں اور ہر روز اس پر ایسا تحفہ و کرامت و ہدیہ داخل ہوگا جو اس کے قبل نہ تھا۔ "لَا مَرِحَاتٍ وَلَا طَمِحَاتٍ وَلَا بَخِرَاتٍ وَلَا ذَفِرَاتٍ، حُوْرٌ عِيْنٌ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَكْنُوْنٌ" (یعنی نہ وہ اترائیں گی اور نہ غیر کی طرف نگاہ اٹھائیں گی اور نہ اُن کے منہ میں بدبو ہوگی اور نہ ان سے کریہ بو آئے گی، گوریاں ہیں، بڑی بڑی آنکھوں والی ہیں، گویا وہ چھپا کر رکھے ہوئے انڈے ہیں)۔[2] (أخرجه ابن أبي حاتم)

ابوبکر بن عبداللہ بن قیس عن ابیہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جنت میں ایک جوف دار موتی کا خیمہ ہے، اس کا عرض ساٹھ میل ہے، اس کے ہر کونے میں اہل ہیں جو دوسری کو نہیں دیکھتے، ان پر مومنین طواف کریں گے۔[3] (أخرجه البخاري و رواه أيضا من حديث عمران به) اور کہا: تیس میل۔[4] (أخرجه مسلم من حديث عمران به) اور اس کے الفاظ یہ ہیں: بے شک مومن کے لیے جنت میں البتہ ایک جوف دار موتی کا ایک خیمہ ہے، اس کا طول ساٹھ میل ہے، اس میں مومن کے لیے اہل ہیں، ان پر مومن طواف کرے گا، پس ان کا بعض دوسرے کو نہ دیکھے گا۔[5] سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: خیمہ ایک موتی ہے، اس میں موتی کے ستر دروازے ہیں۔ (أخرجه ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ فِي الْخِيَامِ ﴾ کی تفسیر میں ان کا دوسرا قول یہ روایت کیا ہے کہ موتیوں کے خیموں میں، اور جنت میں ایک خیمہ ہے ایک موتی کا جو چار مربع فرسخ ہے، اس پر سونے کے چار ہزار کواڑ ہیں۔[6] سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اہلِ جنت میں سے ادنیٰ درجے اور منزلت کا وہ ہے جس کے اسی (۸۰) ہزار خادم ہیں اور بہتر (۷۲) بیبیاں ہیں اور اس کے لیے موتی اور زبرجد و یاقوت کا ایک قبہ نصب کیا جائے گا جیسا کہ جابیہ وصنعاء کے درمیان فاصلہ ہے۔[7]

(ورواه الترمذي من حديث عمرو الحارث به، قاله عبد الله بن وهب، أخبرنا عمرو أن دراجا أبا السمح حدثه عن أبي الهيثم عنه)۔

---

[1] تفسير الطبري (۷۵/۲۳) المعجم الكبير (۳۶۷/۲۳) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه سليمان بن أبي كريمة وهو ضعيف" مجمع الزوائد (۷۷۲/۱۰)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۲۸/۱۰) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٩٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۰۷۰) [5] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸۳۸) [6] تفسير ابن كثير (۳۵۷/٤)

[7] سنن الترمذي (۲۵۶۲) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم" ضعیف راوی ہے۔ ضعيف الترغيب والترهيب (۲٤۳/۲)

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴾ اس کی مثل پہلے بیان ہو چکا ہے مگر پہلی عورتوں کی صفت میں یہ زیادہ کیا ہے: ﴿ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴾ ① سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (بروایتِ علی بن ابی طلحہ) کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ محابس ہیں (اس کے معنی آیندہ معلوم ہوں گے)۔ اسی طرح امام مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہ نے بھی کہا ہے کہ وہ محابس ہیں۔[1] ② علا بن زید نے کہا ہے کہ تخت پر ﴿رَفْرَفٍ﴾ محابس متدلی کی طرح ہے۔ ③ عاصم جدری نے کہا یعنی وسائد (جمع وسادۃ بالکسر بہ معنی بالیں یعنی تکیہ و مسند)۔ ایک روایت میں یہی حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے۔ ④ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا (قاله أبو داود الطيالسي عن شعبة عن أبي بشر عنه) کہ رفرف ریاضِ جنت ہیں،[2] یعنی اس کے چمن۔

① سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ زرابی ہیں، یعنی چھوٹے تکیے۔ ② امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عتاق الزرابی یعنی جیادھا۔ ③ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دیباج[3] یعنی ریشمی پارچہ۔ ④ حسن بصری رحمہ اللہ سے کسی نے ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ کا پوچھا تو کہا کہ وہ بسط اہلِ جنت ہیں، یعنی فرش تمھارا باپ نہ ہو؟ پس تم ان کو طلب کرو۔ ⑤ ان سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ مرافق ہیں (جمع مرفقہ بمعنی نازبالش یعنی نرم تکیہ)۔ ⑥ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ سرخ و زرد و سبز ہے۔ ⑦ علاء بن زید سے کسی نے ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ کے متعلق پوچھا تو کہا "البسط أسفل من ذلك" ⑧ ابن حرزہ یعقوب بن مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ اہلِ جنت کے کپڑوں سے ہے اس کو کوئی نہیں پہچانتا۔ ⑨ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "العبقري الطنافس المخملة إلى الرقة ما هي" ("طنافس"، جمع "طنفسة" یہ ایک فرش ہے جس کا باریک روتواں ہوتا ہے یعنی قالین)۔ ⑩ قیسی نے کہا ہے کہ عرب کے نزدیک ہر حاشیہ والا کپڑا عبقری ہے۔

⑪ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک زمین کی طرف منسوب ہے جس میں وشی بنایا جاتا ہے۔ (صراح میں کہا ہے کہ "عبقر" زمین پریاں وعرب ہر چیزی از مردم وستور و جامہ وفرس و جز آں را کہ در غایت قوت وحسن و لطافت باشد بوی نسبت کنند یقال: ثوب عبقري وهو واحد وجمع و الأنثى عبقرية) ⑫ خلیل بن احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شے نفیس جو رجال وغیرہ سے ہو عرب کے نزدیک اس کا نام عبقری رکھا جاتا ہے۔[4] اسی معنی سے نبی ﷺ کا عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ قول ہے: « فَلَمْ أَرَ عَبْقَرِيًّا يَفْرِيْ فَرِيَّهُ »[5] بر ہر تقدیر اگلی دو جنت والوں کی مرافق کی صفت اس صفت سے ارفع و اعلیٰ ہے (مرافق یعنی اسبابِ راحت و آرام وعیش و تنعم) کیونکہ وہاں فرمایا ہے: ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ﴾

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/٨٣، ٨٤) [2] تفسير الطبري (٢٣/٨٣) [3] تفسير الطبري (٢٣/٨٥)

[4] تفسير ابن كثير (٤/٣٥٧) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٣)

چنانچہ ان کے فرشوں کے استروں کی تو صفت بیان فرمائی اور ان کے ابروں سے سکوت کیا، اس شے کے ساتھ کفایت کرنے کے لیے جس کے ساتھ استروں کی مدح کی تو اس سے ان کی خوبی بطریقِ اولیٰ و احریٰ معلوم ہو گئی، کیونکہ ابرہ لازمی طور پر استر سے عمدہ ہوتا ہے اور خاتمے کا تمام اس پر کیا کہ صفاتِ متقدمہ کے بعد ﴿ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسٰنِ اِلَّا الْاِحْسٰنُ ﴾ فرمایا، پس ان کے لوگوں کو موصوف باحسان کیا اور احسان مراتب ونہایات کا اعلیٰ درجہ ہے، جیسا کہ حدیثِ جبریل علیہ السلام میں ہے، جبکہ انھوں نے اسلام کا سوال کیا، پھر ایمان کا، پھر احسان کا۔ چنانچہ یہ وجوہِ عدیدہ (بہت سی) ہیں اگلی دو جنتوں کی تفضیل میں ان دو اخیر پر۔ ونسأل اللّٰه الكريم الوهاب أن يجعلنا من أهل الأولين.

پھر فرمایا: ﴿ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ یعنی وہ اس کے لائق ہے کہ اس کا اجلال کیا جائے تو اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کا اکرام کیا جائے تو اس کی عبادت کی جائے۔ اور اس کا شکر کیا جائے اور اس کی ناشکری نہ کی جائے اور یاد کیا جائے تو بھولا نہ جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ عظمت و کبریا والا ہے۔[1] سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ تم اللہ کا اجلال کرو کہ وہ تمھاری مغفرت کرے۔[2] (أخرجه الإمام أحمد)

دوسری حدیث شریف میں ہے کہ بے شک بوڑھے کا اکرام کرنا اور صاحبِ سلطنت اور حاملِ قرآن جو غالی (حد سے بڑھنے والا) نہ ہو اور نہ ہی جافی ہو، کا اکرام کرنا بے شک اللہ تعالیٰ کے اجلال میں سے ہے۔[3] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «أَلِظُّوا بِيَا ذَالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ»[4] (رواه أبو يعلىٰ وكذا رواه الترمذي عن محمد بن غيلان عن موئل بن إسماعيل عن حماد بن سلمة به ثم قال: غلط الموئل فيه وهو غريب وليس بمحفوظ و إنما يروي هذا عن حماد بن سلمة عن حميد عن الحسن عن النبي ﷺ)

امام ربیعہ بن عامر رحمہ اللہ سے مرفوعاً مروی ہے: «أَلِظُّوا بِذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ»[5] (ورواه النسائي من حديث عبد اللّٰه بن المبارك به)۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "أَلَظَّ فُلَانٌ بِفُلَانٍ إِذَا لَزِمَهُ"[6] "وَقَوْلُ ابْنِ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہ: أَلِظُّوا بِيَا ذَالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ أَيْ: أَلْزِمُوا يُقَالُ: اَلْأَلْظَاظُ: اَلْإِلْحَاحُ" حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "وَكِلَاهُمَا قَرِيبٌ مِنَ الْآخَرِ واللّٰه أعلم" یعنی الظاظ والحاح ایک دوسرے سے قریب ہے۔ الظاظ مداومت اور الحاح لزوم ہے۔[7] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں (روي في صحيح مسلم و السنن الأربعة من حديث عبد اللّٰه بن الحارث عنها)

---

① تفسير الطبري (٨٦/٢٣)

② مسند أحمد (١٩٩/٥) اس کی سند میں ''ابو العذراء'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٨١٠)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٤٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١٩٩)

④ مسند أبي يعلىٰ (٤٤٥/٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٢٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٣٦)

⑤ سنن النسائي الكبرىٰ (٤٠٩/٤) السلسلة الصحيحة (١٥٣٦) ⑥ الصحاح (٣٢٤/٤) ⑦ تفسير ابن كثير (٣٥٨/٤)

کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت سلام پھیرتے تو نماز کے بعد نہ بیٹھتے تھے مگر اتنی دیر کہ فرماتے: «اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ»[1] آخر تفسیر سورۃ الرحمٰن وللہ الحمد والمنۃ۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

یہاں چار جنتوں کا ذکر فرمایا ہے، دو کا ذکر پہلے ہے اور دو کا آخر میں۔ مفسروں نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ پہلے والی دو افضل ہیں یا آخر والی۔ ایک قول تو یہ ہے کہ پہلے کی دو افضل ہیں، اس بنا پر دون کا کلمہ بہ معنی ادنیٰ ہے بہ معنی غیر نہیں ہے، یعنی وہ دو جنتیں جو صفاتِ متقدمہ کی حامل ہیں جن کا خائفین مقربین کے لیے وعدہ کیا گیا ہے۔ ان دو سے فضیلت و قدر میں کم درجے کی دو اور جنتیں ہیں ان لوگوں کے لیے جو پہلے والی دو جنت والوں سے کم درجے والے ہیں، یعنی اصحاب الیمین۔ اس قول کی تائید کرنے والے درج ذیل یہ اقوال ہیں:

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ چار جنتیں ہیں، ان میں سے دو تو سابقین مقربین کے لیے ہیں "فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ وَعَيْنَانِ تَجْرِيَانِ" اور دو جنتیں اصحاب الیمین کی: "فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ وَّفِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ"، امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے والی دو سونے کی ہیں مقربین کے لیے، دوسری دو چاندی کی ہیں اصحاب الیمین کے لیے۔[3] سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: دو جنتیں سونے کی ہیں مقربین کے لیے اور دو جنتیں چاندی کی ہیں اصحاب الیمین کے لیے۔[4] (أخرجه جرير و ابن أبي حاتم و ابن مردويه) حافظ ابن کثیر، قاضی اور نسفی رحمہم اللہ کا اختیار کردہ قول یہی ہے۔[5] (امام زمخشری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ ان کی عبارت یہ ہے: "ومن دونهما ومن دون تينك الجنتين الموعودتين للمقربين جنتان لمن دونهم من أصحاب اليمين")۔[6]

دوسرا قول یہ ہے کہ آخر کی دو افضل ہیں اول کی دو سے اس بنیاد پر ﴿مِنْ دُوْنِهِمَا﴾ کے معنی ہیں: "أَمَامَهُمَا وَقَبْلَهُمَا" یعنی اگلی دو جنتوں کے آگے دو اور جنتیں ہیں، وہ پہلے کی دو کی نسبت عرشِ معلیٰ کے زیادہ قریب ہیں تو یہ بعد والی اول سے افضل ہوئیں۔ اس قول کی تائید کرنے والے یہ قول ہیں۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر امام ضحاک رحمہ اللہ کا قول دال ہے کہ اول کی دو سونے اور چاندی کی ہیں اور آخر کی دو یاقوت و زمرد کی ہیں۔ اس بنا پر یہ دو جنتیں پہلے کی دو جنتوں سے افضل ہیں۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے کی دو جنت عدن اور جنتِ نعیم ہیں اور آخر کی دو جنت الفردوس اور جنت الماویٰ ہیں۔[7] حکیم ترمذی اسی قول کی طرف گئے ہیں۔ نوادر الاصول میں اس کی پوری وجوہ ذکر کی ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے

[1] صحيح مسلم (٥٩٢) سنن أبي داود (١٥١٢) سنن الترمذي (٢٩٨) سنن النسائي (١٣٣٨) سنن ابن ماجه (٩٢٤)
[2] تفسير ابن كثير (٣٥٥/٤-٣٥٨)
[3] تفسير البغوي (٤٥٦/٧) فتح القدير (١٨٨/٥)
[4] تفسير الطبري (٥٧/٢٣)
[5] تفسير ابن كثير (٣٥٥/٤) تفسير البيضاوي (٢٨١/٥) تفسير النسفي (٢٠٥/٤)
[6] الكشاف (٤٥١/٤)
[7] تفسير القرطبي (١٨٤/١٧)

اپنے تذکرے میں اور تفسیر میں ان کا پورا کلام نقل کیا ہے۔[1] جمل نے بھی تذکرے سے اس کو نقل فرمایا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿ مِنْ دُوْنِهِمَا ﴾ کے معنی ہیں: ''سِوَاهُمَا وَغَيْرُهُمَا'' اس بنا پر چاروں جنتیں کل اہلِ جنت کے لیے ہوں گی۔

محلی کا رجحان اسی طرف معلوم ہوتا ہے، ان کی عبارت یہ ہے: ﴿ وَمِنْ دُوْنِهِمَا ﴾ ''أَيْ: اَلْجَنَّتَيْنِ الْمَذْكُوْرَتَيْنِ ﴿ جَنَّتَانِ ﴾ أَيْضًا لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ''[2] یعنی جنتین مذکورتین کے سوا دو جنتیں اور بھی ہیں اس شخص کے لیے جو اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے ڈرا۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محلی اس پر چلے کہ مصداق ''أصحاب جنات أربع'' کا ایک ہے، یعنی ''مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ'' اور بعض نے صاحب سابقین کا ''من خاف مقام ربه'' کو ٹھہرایا ہے اور بعد والی دو کا صاحب اصحابِ یمین کو ٹھہرایا ہے۔ انتھی. ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک یہ کل حق ہیں اور ایسی نعمتیں ہیں جن کا انکار ممکن نہیں ہے۔

پھر اخیر کی دو جنتوں کا وصف بیان فرمایا: ﴿ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴾ اور درمیان کا کلام جملہ معترضہ ہے۔ امام ابو عبیدہ اور زجاج رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ سیراب ہونے کی وجہ سے اپنی سبزی سے سیاہ پڑ گئی ہیں۔ ہر شے جس پر سیرابی کی وجہ سے سیاہی پڑ جائے وہ عرب کے نزدیک ''مدهم'' ہے۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مُسْوَدَّتَانِ''[4] ''دُهْمَةٌ'' بہ معنی سواد ہے (''فرس أدهم وبعير أدهم'' جبکہ اس کی ورقہ سخت ہو یہاں تک کہ اس میں جو سفیدی ہے وہ جاتی رہے۔ ''وناقة دهماء'' یعنی شتر مادہ سیاہ و ''ادهام وإدهيماما أَيْ: اسواد''۔ عراق کے دیہاتوں کو سواد کہتے ہیں ان کی سبزی کے سبب سے اور بیڑی کو سیاہی کے سبب سے ''أدهم'' بولتے ہیں۔[5] كذا في فتح البيان)۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک وہ ساری ایسی ظاہر اور واضح نعمتیں ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

پھر ان کا دوسرا وصف بیان کیا کہ ان میں دو چشمے ﴿ نَضَّاخَتٰنِ ﴾ ہیں۔ نضخ چشمے سے پانی کے فوران اور جوش مارنے کو کہتے ہیں، یعنی جنتین مذکورتین میں دو چشمے ہیں ''فوارتان'' یعنی جوش مارنے والے ابلنے والے۔ اہلِ لغت نے کہا ہے کہ نضخ بہ خائے معجمہ اکثر ہے نضح بہ حائے مہملہ سے، اس لیے کہ حائے مہملہ والے کے معنی ہیں ''رش'' کے، یعنی چھڑکنا اور خائے معجمہ والے کے معنی ہیں فورانِ ماء، یعنی پانی کا جوش مارنا۔ (قاله السمين) امام حسن اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ وہ چشمہ اہلِ جنت کے گھروں میں اولیاء پر مشک وعنبر و کافور کا چھڑکاؤ کرے گا جس طرح کہ بادل سے بارش چھڑکاؤ کرتی ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ طرح طرح کے فواکھہ کے اور پانی کے ساتھ جوش مارے گا۔[6] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''فَائِضَتَانِ تَنْضَخَانِ بِالْمَاءِ'' یعنی بہنے والی ہیں، پانی کے ساتھ جوش ماریں گی۔ کسی نے کہا ہے کہ جنت والوں پر خیر و برکت کے ساتھ جوش مارے گا۔

---

[1] نوادر الأصول (٣١/٣) تفسير القرطبي (١٧٦/١٧) [2] تفسير الجلالين (٧١٢/١) [3] فتح القدير (١٨٨/٥)
[4] تفسير الطبري (٧١/٢٣) [5] فتح البيان (٣٤٦/١٣) [6] تفسير القرطبي (١٨٥/١٧)

﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک وہ نعمتیں نہ جائے تکذیب ہیں اور نہ مکانِ انکار، پھر ان کا اور وصف بیان فرمایا کہ ان میں ﴿ فٰكِهَةٌ ﴾ ہے اور نخل و رمان ہیں۔ یہ دونوں اگرچہ ﴿ فٰكِهَةٌ ﴾ ہی میں سے ہیں، لیکن باقی ﴿ فٰكِهَةٌ ﴾ کی نسبت ان کے زیادہ منافع اور حسن کی وجہ سے ان کو خاص طور پر ذکر کیا، جیسا کہ امام زجاج اور ازہری رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو بیان کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کو خاص طور پر صرف اس لیے ذکر کیا کہ سرزمینِ عرب میں ان کی کثرت ہے۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس وقت ان کے نزدیک یہ دونوں ایسے تھے، جیسے ہمارے نزدیک گیہوں، کیوں کہ کھجور تو ان کی عام غذا تھی اور انار مثل شراب کے تھا۔ اس لیے ان کے ہاں ان کی کاشت کثرت سے تھی اور ان کے نزدیک "فواکھة" وہ میوے تھے جن سے وہ خوش ہوتے تھے اور تعجب کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کو اس لیے خاص کیا کہ کھجور تو فاکہہ و طعام ہے اور رمان فاکہہ و دوا ہے۔

یہ بات کہ یہ دونوں فاکہہ میں سے ہیں، اس کی طرف جمہور اہلِ علم گئے ہیں اور اسی کے امام شافعی رحمہ اللہ قائل ہیں تو اس بنا پر جس شخص نے قسم کھائی کہ وہ فاکہہ نہ کھائے گا، پھر اس نے کھجور کھالی یا انار کھالیا تو اس سے وہ حانث (قسم توڑنے والا) ہو جائے گا اور اسی بنا پر ان دونوں کا فاکہہ پر عطف، عطفِ خاص علی العام کے باب سے ٹھہرے گا، تفضیل کے لیے۔ اس باب میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے سوا اور کوئی مخالف نہیں ہے۔ صاحبین امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہ اللہ نے ان کی مخالفت کی ہے۔ یہ ایک قول ہے جو اہلِ لغت کے قول کے خلاف ہے اور ان کے لیے آیت میں کوئی حجت نہیں ہے۔ (امام خازن رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے)[1] ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک اللہ کی نعمتوں میں سے جناتِ نعیم میں سے یہ نعمتیں ہیں اور صرف ان کا بیان کرنا ہی سننے والوں پر اثر کرتا ہے اور ان کو طاعتِ رب العالمین کی طرف کھینچتا ہے۔

بالجملہ جب دونوں جنتوں کے ساز و سامان کا (یعنی درختوں کی تر و تازگی کیوں کہ باغ کا اصلی سامان یہی ہے اور فرش وغیرہ کا ذکر آئندہ آئے گا) اور چشموں اور میوے کا ذکر ہو چکا تو وہ شے ذکر کی جس پر عیش کا دار و مدار ہے یعنی خوش اخلاق خوبصورت بیویاں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ﴾ جمہور نے بہ تخفیف یائے تحتیہ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام قتادہ، ابن سمیفع، ابو رجا عطاردی، بکر بن حبیب سہمی، ابن مقسم اور نہدی رحمہم اللہ نے) بہ تشدید پڑھا ہے۔ (كذا في الفتح)

چنانچہ اول کی بنا پر تو ﴿ خَیْرٰتٌ ﴾ "خیرة" کی جمع ہے بروزن فعلہ بہ سکونِ عین کے۔ یوں بولتے ہیں کہ "اِمْرَأَةٌ خَيْرَةٌ وَأُخْرَى شَرَّةٌ". یا جمع ہے "خیرة" مخفف "خیرة" کی اور دوسرے کی بنیاد پر جمع ہے: "خیرة" مشدد کی۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ ﴿ خَیْرٰتٌ ﴾ نیک اخلاق حسین چہرے والی عورتیں ہیں۔[2]

① تفسير الخازن (۱۲/۷) ② فتح القدير (۱۸۹/۵)

﴿ فِيهِنَّ ﴾ کی ضمیر کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ صفت چاروں جنتوں کی طرف رجوع ہوتی ہے، حالانکہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیوں کہ پہلے کی دو جنتوں کی عورتوں کی یہ صفت فرمائی ہے کہ وہ ﴿ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾، ﴿ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ ہیں اور دونوں صفتوں کے درمیان دور کا فرق ہے۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ بے شک ان نعمتوں میں سے کوئی شے کوئی سی ہو قابلِ تکذیب نہیں ہے۔

پھر ان کا اور وصف بیان فرمایا: ﴿ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴾ (اس کا رفع بنا بر بدلیت ہے ﴿ خَيْرٰتٌ ﴾ سے)۔ قصر حبس کو کہتے ہیں، اسی معنی سے محل کو قصر کہتے ہیں، کیونکہ وہ اس کو روکے رکھتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے، یعنی وہ حوریں خیموں میں روکی گئی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "مُخَدَّرَاتٌ مَسْتُوْرَاتٌ"، ہیں، نکلتی نہیں ہیں بہ سبب ان کی کرامت و شرف کے۔ عرب کی بول چال میں مخدرہ مستورہ عورت کو "اِمْرَأَةٌ قَصِيْرَةٌ وَقَصُوْرَةٌ وَمَقْصُوْرَةٌ" کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَقْصُوْرٰتٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ قصر کی گئی ہیں اپنے خاوندوں پر سو وہ ان کے غیر کو نہیں دیکھتی ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے اس قول کو مفسرین سے نقل کیا ہے، لیکن قولِ اول زیادہ بہتر ہے۔ امام ابوعبیدہ اور مقاتل رحمہما اللہ وغیرہما اسی کے قائل ہیں۔

صحاح میں کہا ہے کہ "قَصَرْتُ الشَّيْءَ أَقْصُرُهُ قَصْرًا حَبَسْتُهُ"، معنی یہ ہیں: "إِنَّهُنَّ خُدِّرْنَ فِي الْخِيَامِ"[1] یعنی وہ خیموں میں مستور رکھی گئی ہیں۔ "خِيَامٌ"، "خَيْمَةٌ"، کی جمع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "خِيَمٌ"، کی جمع ہے اور "خِيَمٌ"، جمع ہے "خَيْمَةٌ"، کی۔ "خَيْمَةٌ"، اصل میں کئی لکڑیاں ہیں جو نصب کی جاتی ہیں اور کپڑوں سے ان پر سایہ کیا جاتا ہے، پس خیام زیادہ تر سرد ہوتے ہیں "أخبية" سے۔ کہا ہے کہ خیمہ جنت کے خیموں میں سے ایک جوف دار موتی ہے جو ایک مربع فرسخ ہے۔ اس بارے میں احادیث پہلے گزر چکی ہیں۔

﴿ حُوْرٌ ﴾ "حَوْرَاءُ"، کی جمع ہے۔ "حَوْرَاءُ"، وہ عورت ہے جس کی آنکھ کی سفیدی و سیاہی شدید ہو، یعنی خوب گہری۔ اس کے معنی کا بیان اور اس کا اختلاف اوپر گزر چکا ہے۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ یعنی پھر اپنے رب کی کیا کیا نعمتیں جھٹلاؤ گے جس نے تمھاری صورت بنائی، پھر اچھی خوبصورت بنائی اور جنت میں تمھارے لیے وہ شے رکھی جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال گزرا، کیا ان نعمتوں کی تکذیب کرو گے یا ان کی غیر کی۔

اس میں اختلاف ہے کہ حسن و جمال میں زیادہ اور روشن تر کون سی ہوں گی، حوریں یا انسانی عورتیں۔ چنانچہ کسی نے تو کہا ہے کہ حوریں بڑھ کر ہوں گی، اس لیے کہ قرآن شریف میں اور سنتِ مطہرہ میں ان کی صفت بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے ایک میت کی نمازِ جنازہ میں یہ دعا فرمائی: « وَأَبْدِلْهُ زَوْجًا خَيْرًا مِنْ زَوْجِهِ »[2] یعنی اس کو

---

[1] فتح القدير (١٨٩/٥)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦٣)

بدلے میں دے ایک بیوی اس کی بیوی سے بہتر۔ کسی نے کہا ہے کہ آدمی عورتیں حورِ عین سے ستر ہزار گناہ افضل ہیں۔ یہ بات مرفوعاً بھی مروی ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ حورِ عین جو قرآن شریف میں مذکور ہیں یہ وہی مومن عورتیں ہیں، ازواج انبیاء و مومنین سے، وہ آخرت میں احسن صورت پر پیدا کی جائیں گی۔ (قاله الحسن)

اس قول میں بُعد بعید ہے، مشہور یہی ہے کہ حورِ عین دنیا کی عورتوں میں سے نہیں ہیں وہ تو جنت ہی میں پیدا کی گئی ہیں، اس لیے کہ اللہ پاک نے ان کے حق میں فرمایا ہے کہ ان سے پہلے ان سے کسی انسان یا کسی جن نے جماع نہیں کیا۔ حالانکہ اہلِ دنیا کی اکثر عورتیں جماع کی ہوئی ہیں اور اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "أقل ساکنین" جنت کی عورتیں ہیں[2] تو ان میں سے ہر ایک کو ان میں سے ایک ہی عورت پہنچے گی اور حورِ عین کا وعدہ ان کی جماعت کے لیے کیا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ دنیا کی عورتوں کے علاوہ ہیں۔[3] (ذکرہ القرطبي)

بالجملہ پھر ان کی اور صفت بیان فرمائی: ﴿ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴾ ﴿ قَبْلَهُمْ ﴾ کی ضمیر اصحابِ جنتین کی طرف راجع ہے۔ جنتین کا ذکر ان پر دال ہے، یعنی ان دو جنت والوں سے پہلے کسی انسان نے یا کسی جن نے ان سے جماع نہیں کیا۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴾ بے شک یہ سب نعمتیں ایسی ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جاتا ہے اور ایسے احسانات ہیں جن کی ناشکری نہیں کی جاتی ہے۔ پھر اخیر دو جنت والوں کا اور عیش و آرام کا ذکر فرمایا: ﴿ مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴾ (اس کا نصب بنا بر حال ہے، یا بنا بر مدح کما سبق۔ عامل حال مقدر ہوگا: "أَيْ: يَتَنَعَّمُونَ مُتَّكِئِينَ... الخ")

جمہور نے ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ مفرد پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، امام حسن اور جحدری رحمہ اللہ نے) "رَفَارِف" بہ صیغۂ جمع پڑھا ہے۔ اور جمہور نے ﴿ خُضْرٍ ﴾ کو بہ ضمِ خاء وسکونِ ضاد پڑھا ہے اور کسی نے بہ ضمِ ہر دو پڑھا ہے یہ لغت قلیل ہے۔ جمہور نے ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی عثمان رضی اللہ عنہ، امام حسن اور جحدری رحمہ اللہ نے) "عباقري" پڑھا ہے۔ "عباقري" عباقر نامی شہر کی طرف منسوب ہے اور کسی نے "عباقر" پڑھا ہے۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منسوب نہیں ہے، بلکہ "كُرْسِيٌّ وَكَرَاسِيٌّ وَبُخْتِيٌّ وَبَخَاتِيٌّ" کی طرح ہے۔[4]

① امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "رفارف" بسط ہیں، یعنی فرش۔ اسی کے امام حسن، مقاتل اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم قائل ہیں۔

② امام ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زرابی ہیں۔

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۸۸/۱۷) امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس روایت کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے اور اس کے علاوہ ان الفاظ کے ساتھ روایت کہیں نہیں ملی ہے۔

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۷۳۸) [3] تفسیر القرطبي (۱۸۸/۱۷) [4] فتح القدیر (۱۹۰/۵)

③ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرافق ہیں۔

④ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ حاشیۂ ثوب ہے۔

⑤ لیث رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سبز کپڑوں کی ایک قسم ہے۔

⑥ کسی نے کہا ہے کہ ”فُرُشٌ مُرْتَفِعَةٌ“ ہے۔

⑦ کسی نے کہا ہے کہ ہر پارچہ عریض ہے۔

⑧ صحاح میں کہا ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ سبز کپڑے ہیں، ان سے مجالس بنائے جاتے ہیں۔ واحد ”رَفْرَفَةٌ“ ہے (مجالس پہلے بھی گزر چکا ہے۔ مجالس مجلس بالکسر کی جمع ہے، اس کے تین معنی ہیں: ایک یہ ہیں کہ مجلس منقش پردہ ہے جس کو چیزوں پر ڈالتے ہیں۔ دوسرے وہ کپڑا جس کو بچھونے پر ڈال کر اس پر سوتے ہیں اور تیسرے جامہ گرد پوش کو کہتے ہیں۔ یہ معانی منتہی الارب سے معلوم ہوتے ہیں، گویا پلنگ پوش بستر پوش ہیں۔ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ میں جو بہت سے قول ہیں، اگر غور سے دیکھیں تو سب ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ کسی نے مطلق کہہ دیا، کسی نے کوئی قید بڑھا دی۔ اصل مادۂ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ میں حرکت ہے۔ تختوں پر فرش بچھے ہوئے ہیں اور ان پر قیمتی کپڑوں کے عریض منقش تخت پوش پڑے ہوئے ہیں جن کے کنارے جھالر کی طرح نیچے لٹکتے ہیں، ہوا کی حرکت سے ہلتے ہوئے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ کسی نے ان کو فرش کہہ دیا تو فرش بھی ہیں، کسی نے حاشیۂ ثوب کہا تو یہ بھی ان پر صادق آتا ہے۔ کسی نے سبز کپڑے کہا، کسی نے اور کچھ کہا۔ واللہ أعلم)۔

⑨ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ”قالوا“، یعنی مفسروں نے کہا ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ یہاں ریاضِ جنت ہیں۔

⑩ اور کہا کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ ”وسائد“ ہیں۔

⑪ اور کہا کہ مجالس ہیں۔[1] انتہیٰ یعنی صحاح کا قول پورا ہوا۔

⑫ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ رَفْرَفٍ خُضْرٍ ﴾ مجالس ہیں۔[2] (أخرجه ابن جرير وغيره)

⑬ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”فضول المحابس“ (أخرجه عبد بن حميد)

⑭ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ ”ریاض“ ہیں۔[3] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ اسم جنس ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسم جمع ہے۔ ان دونوں کو مکی نے نقل کیا ہے۔ واحد ”رَفْرَفَةٌ“ ہے۔ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ وہ غالی کپڑے ہیں جو تختوں سے لٹکتے ہیں۔ اس کا اشتقاق ”رفرف الطائر“ سے ہے۔ یعنی طائر ہوا میں مرتفع ہوا۔ انتہیٰ۔ ”رَفَّ يَرِفُّ“ بہ معنی ”اِرْتَفَعَ“ آتا ہے، اسی معنی سے ”رفرفة الطائر“ ہے یعنی طائر کا ہوا میں اپنے دونوں بازوؤں کو ہلانا۔

---

① تفسير القرطبي (١٧/١٩٠) فتح القدير (٥/١٨٩، ١٩٠) ② تفسير الطبري (٢٣/٨٣) ③ الدر المنثور (٧/٧٢٢، ٧٢٣)

﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ واحد وجمع ہے، اسی لیے اس کی صفت ﴿ حِسَانٍ ﴾ آئی ہے:

1 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ زرابی ہیں[1] (فتح الرحمان کا ترجمہ بساطہائے نفیس ہے۔ سعدی کا ترجمہ "فرشہا" ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ مسندیں ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ مخمل کے نہالچے ہے۔ صراح کا ترجمہ بالشچھا ہے)۔

2 امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: "كُلُّ وَشْيٍ مِنَ الْبُسُطِ عَبْقَرِيٌّ"[2] یعنی بساطوں میں سے ہر مخطط و منقش بساط عبقری ہے، یہ ایک زمین کی طرف منسوب ہے جس میں وشی بنایا جاتا ہے۔

3 امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "طنافس ثخان"[3] یعنی موٹے قالین ("طنافس" "طنفسة" کی جمع ہے "طنفسة" بکسرتین لغتِ عالیہ میں ہے اور ایک لغت میں بفتحتین ہے۔ وہ ایک بساط ہے جس کا خمل رقیق ہوتا ہے۔[4] كذا في المصباح)۔

4 کسی نے کہا ہے کہ باریک طنافس۔

5 کسی نے کہا ہے کہ "بسط" ہیں، یعنی بچھائیاں۔

6 کسی نے کہا ہے کہ دیباج ہیں (بالکسر دیباہ فارسی معرب ہے پارچہ ریشمی)۔

7 امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصل اس میں یہ ہے کہ عبقر ایک بستی ہے جس میں جن بستے ہیں۔ ہر شے فائق اس کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

8 خلیل نے کہا ہے کہ ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ عرب کے نزدیک ہر جلیل فاخر فاضل ہے مردوں اور عورتوں میں سے۔ اس کی سند میں زہیر کا شعر نقل کیا ہے۔

9 امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ ایک موضع ہے۔ عرب زعم کرتے ہیں کہ وہ جنوں کی زمین ہے، پھر اس کی طرف ہر ایسی شے کی نسبت کی جس کی حذق وجودتِ صنعت وقوت سے تعجب کیا۔ اور کہا کہ عبقری ہے۔ اس کی سند میں لبید کا شعر ذکر کیا ہے۔[5]

10 قاموس میں کہا ہے کہ عبقر موضع کثیر الجن ہے اور ایک بستی ہے جس کی بنا انتہائی حسن میں ہے اور ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ ہر شے سے کامل ہے۔[6]

یہ سب اقوال تو سن لیے اب یہ سنو کہ ان میں سے مفسروں نے کون کون سا قول اختیار کیا ہے۔ پس محلی کا اختیار کیا ہوا قول تو یہ ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ "بسط" ہیں، یا "وسائد" اور ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ "طنافس" ہیں۔[7]

---

[1] تفسير الطبري (٨٥/٢٣) [2] فتح القدير (١٩٠/٥) [3] تفسير القرطبي (١٩٢/١٧) [4] المصباح المنير (١٩٦/١)
[5] تفسير القرطبي (١٩٢/١٧) [6] القاموس المحيط (٥٥٩/١) [7] تفسير الجلالين (٧١٣/١)

علامہ نسفی رحمہ اللہ کا اختیار کیا ہوا قول یہ ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ ہر ثوبِ عریض ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''وسائد'' اور ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ ''دیباج'' ہے، یا ''طنافس''۔[1] قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ ''وسائد'' ہیں، یا ''نمارق''، ''رفرفة'' کی جمع ہے۔[2] (''نمارق'' جمع ''نمرقة'' ہے، ''نمرقة'' وسادۂ صغیر ہے اور کبھی اس طنفسہ کا نام ''نمرقة'' رکھا ہے جو فوق رحل ہوتا ہے۔ (کذا قال شیخزادہ) صراح کا ترجمہ ''بالشہای خرد ونہالین زین'' فتح الرحمٰن کا ترجمہ ''وسادھا'' ہے۔ ترجمہ سعدی ''بالشہا'' ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ تکیے ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قالینچے ہے)۔ کسی نے کہا ہے کہ ایک قسم ہے ''بسط'' سے، یا ذیلِ خیمہ ہے اور کبھی کہا جاتا ہے ہر ثوبِ عریض کے لیے اور ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ عبقر کی طرف منسوب ہے۔ عرب زعم کرتے ہیں کہ وہ جنوں کے بلد کا نام ہے، پھر اس کی طرف ہر عجیب شے کی نسبت کرتے ہیں، مراد اس سے جنس ہے اور اسی لیے معنی پر محمول کر کے ﴿ حِسَانٍ ﴾ جمع کیا گیا۔ انتہیٰ.

اب فارسی و اردو کے چار تراجم سنیں:

شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تکیہ زدہ باشند بر بالشہای سبز و بساطہاے نیک'' سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تکیہ زنندگان باشند بر بالشہای سبز و بساطہاے نیکو'' (ان دونوں صاحبوں نے ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کے اقوال میں سے ''وسائد'' کا قول لیا اور ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ کے اقوال میں سے ''بسط'' کا قول پسند کیا اور ﴿ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴾ کو ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ پر معطوف ٹھہرایا، یعنی سبز تکیوں پر اور خوبصورت فرش پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں)۔

شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تکیہ کیے ہوئے سبز قالینوں اور نادر نفیس کے اوپر۔ (انھوں نے ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کے اقوال میں نے ''نمارق'' کا قول لیا جس کو قاضی نے ذکر کیا ہے اور اس کا ترجمہ بالشہا ہے لیکن طنافس کے معنی میں بھی آیا ہے۔ طنفسہ قالین ہوا، چنانچہ انھوں نے اس قول کو پسند کیا اور ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ کے اقوال میں سے وہ قول لیا کہ ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ ہر عجیب و فائق شے کو کہتے ہیں اور ﴿ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴾ دونوں کو ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کی صفت ٹھہرایا تو معنی یہ ہوئے کہ قالینوں پر ایسی قالین کہ سبز ہیں اور نادر ونفیس وخوبصورت ہیں۔ واللّٰہ أعلم)۔

شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تکیہ لگائے ہوئے سبز چاندنیوں پر اور قیمتی بچھونوں پر جو بہت خوبصورت ہیں۔ انتہیٰ. (انھوں نے ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کے قولوں میں سے محابس کا قول لیا، یعنی تخت پوش پارچہ عریض جو بچھونے کے اوپر بچھایا جاتا ہے، کیونکہ چاندنی وہی ہے جو فرش و بساط کے اوپر بچھائی جاتی ہے اور ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ کے اقوال میں سے وہ قول پسند کیا کہ ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ ہر مخطط منقش بساط کو کہتے ہیں اور ہر شے فائق و عجیب کو۔ واللّٰہ أعلم)۔ بالجملہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ میں چار اقوال اور ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ میں بارہ اقوال نقل کیے ہیں۔[3] اور چودہ قول ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ میں اور دس ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ میں فتح البیان وغیرہ سے لکھے گئے ہیں۔ اکثر باہم ان

---

[1] تفسیر النسفي (٢٠٥/٤) [2] تفسیر البیضاوي (٢٨١/٥) [3] ان کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کی تکرار ہے لیکن کچھ فرق بھی ہے اور بعض میں کچھ تصحیف (لکھنے میں غلطی) معلوم ہوتی ہے۔ بنظرِ جمعیت سب کو ایک جگہ لکھ دیا ہے۔ تدبر کرنے والا ناظران سے اپنا کام نکال لے گا اور مفسروں مترجموں کا ماخذ سمجھ لے گا۔ ﴿ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ پس بے شک ان نعمتوں میں سے ہر نعمت اس سے بہت بڑی ہے کہ اس کی طرف تکذیب راہ پائے اور اس سے عظیم تر ہے کہ کوئی منکر اس کا انکار کرے۔ اس آیت کے بار بار آنے کی وجہ سورت کے شروع میں بیان ہو چکی ہے، اب اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ جمہور نے کلمۂ ﴿ ذِي ﴾ کو بہ جر پڑھا ہے اس بنا پر کہ "رَبِّ" سبحانہ کی صفت ہے اور ابن عامر نے "ذو" بہ رفع پڑھا ہے اس بنیاد پر کہ ﴿ اِسْمُ ﴾ کی صفت ہے۔[1] ﴿ تَبٰرَكَ ﴾ برکت سے تفاعل کا وزن ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿ تَبٰرَكَ ﴾ کی اصل "تبرك" سے ہے۔ "تبرك" بہ معنی دوام و ثبات ہے، اسی کے معنی سے برک البعیر اور برکۃ الماء ہے، کیوں کہ پانی اس میں دائم رہتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس کا نام دائم و ثابت ہے، یا اس کے نزدیک خیر دائم ہے، اس لیے کہ برکت اگرچہ ثبات سے ہے، لیکن وہ خیر میں مستعمل ہوتی ہے۔ یا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی شان اعلیٰ اور مرتفع ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اللہ پاک کی تنزیہ و تقدیس ہے اور جبکہ یہ ﴿ تَبٰرَكَ ﴾ اللہ عزوجل کے نام کی طرف منسوب ہوا تو پھر اس کی ذات پاک کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسم بہ معنی صفت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ اِسْمُ ﴾ زائد ہے۔ (محلی اسی کے قائل ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: شاید اسم سے مراد وہ اسم ہو جس سے سورت کو شروع کیا ہے، کیونکہ اللہ پاک نے سورت کو رحمٰن سے شروع فرمایا، پھر انسان و جن کی پیدائش کا اور آسمان و زمین کی پیدائش کا اور اپنی کاریگری کا ذکر کیا اور یہ ذکر فرمایا کہ وہ ہر روز ایک شان میں ہے، پھر ان میں اس کی جو تدبیر ہے اس کا ذکر کیا، پھر روزِ قیامت کا اور اس کی ہولناکیوں اور آگ کی صفت کا ذکر کیا، پھر جنان کی صفت پر اس کو ختم فرمایا، پھر سورت کے آخر میں فرمایا: ﴿ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ﴾ یعنی بابرکت ہے یہ نام جس سے اس سورت کو شروع کیا گیا۔ گویا اللہ پاک اس طرف اشارہ فرماتا ہے کہ یہ سب تمھارے لیے میری رحمت سے نکلا ہے، چنانچہ میں نے اپنی رحمت سے تم کو پیدا کیا اور تمھارے لیے آسمان و زمین بنایا، چنانچہ اسی لیے صفتِ رحمت پر ثنا فرمائی۔[3] والله أعلم. كذا ذكر الشيخ)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جس وقت اپنی نماز سے فارغ ہوتے تو تین بار استغفار کرتے تھے اور فرماتے: «اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالإِكْرَامِ»[4] (أخرجه مسلم) ﴿ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴾ کی تفسیر اسی سورت میں گزر چکی ہے۔

[1] تفسير القرطبي (١٧/١٩٣) [2] تفسير الرازي (٢٩/١٢٠) [3] تفسير القرطبي (١٧/١٩٣) [4] صحيح مسلم (٥٩١)

پہلے جو چار جنتوں کا ذکر ہو چکا ہے تو ان میں دو قول تھے: ایک قول یہ تھا کہ پہلے والی دو بعد والی دو سے افضل ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ پہلے قول کے قائل ہیں۔[1] انھوں نے ہر آیت کے تحت میں تفاوتِ جنتین کی طرف اشارہ کیا ہے، جیسا کہ پہلے اس کا بیان ہو چکا ہے۔ دوسرا قول یہ تھا کہ بعد والی دو افضل ہیں۔ اس قول کی تائید میں جو اقوال ہیں ان کا ذکر بھی ہو چکا ہے، لیکن تذکرۂ قرطبی میں ان آیتوں کی شرح کے متعلق ایک عمدہ تقریر ہے۔ جی میں آیا کہ وہ یہاں مذکور ہو جائے تو بہتر ہے۔ إن شاء اللّٰہ تعالیٰ۔ فوائد سے خالی نہ ہوگی، بلکہ نفائس سے بھری ہوگی۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے جب دو جنتوں کا ذکر فرمایا تو ان میں جو فرق ہے اس کی طرف اشارہ کیا، چنانچہ پہلی کی دو کے بارے میں تو یوں فرمایا: ﴿ فِيهِمَا عَيْنَانِ تَجْرِيَانِ ﴾ اور بعد والی دو میں فرمایا: ﴿ فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ ﴾ "أَيْ: فَوَّارَتَانِ بِالْمَاءِ"، لیکن یہ دو مثل عینین جاریتین کے نہیں ہیں، اس لیے کہ "نضخ" "جري" سے کم ہے۔ اور اول دو کے میوے میں یوں فرمایا: ﴿ فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ ﴾ چنانچہ یہاں میوے کا عموم ذکر کیا، کسی میوے کی تخصیص نہیں کی اور آخری دو جنتوں کے بارے میں فرمایا: ﴿ فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ﴾ اور ﴿ مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ ﴾ نہیں کہا۔ اور پہلی دو کے فرش کے بارے میں فرمایا: ﴿ مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ فُرُشٍ بَطَائِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ ﴾ "یعني مِنْ دِیْبَاجٍ" اور آخری دو کے بارے میں فرمایا: ﴿ مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴾

﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ موشی ہے، یعنی فرشِ مخطط منقش اور بلا شک دیباج اعلیٰ اور برتر ہے موشی سے اور ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کسرِ خباء ہیں، یعنی خیموں کے دامن (کسر بالکسر سفہ فرو دین خیمہ مکاسرۃ بالضم ہمسایہ دامن بدا امن خیمہ پیوستہ۔ صراح) اور بلاشک جو فرش اس لیے مہیا کیے گئے ہیں کہ ان پر تکیہ لگایا جائے اور اطمینان سے جلوس کیا جائے وہ افضل ہیں فضلِ خباء سے۔ پہلے والی دو جنتوں میں حور عین کی صفت میں فرمایا ہے: ﴿ كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ اور بعد والی دو میں فرمایا ہے: ﴿ فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ﴾ حالانکہ ہر حسن یاقوت و مرجان کے حسن کی طرح نہیں ہوتا۔

پہلی کی دو جنتوں کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿ ذَوَاتَا أَفْنَانٍ ﴾ اور بعد والی دو کے بارے میں فرمایا: ﴿ مُدْهَامَّتَانِ ﴾ "أَيْ: خُضْرَاوَانِ" گویا اپنی شدتِ سبزی سے سیاہ ہو رہی ہیں سو پہلے کی دو کا تو شاخوں کی کثرت سے وصف کیا ہے اور بعد والی دو کا صرف سبزی سے وصف کیا۔ پھر قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے ﴿ وَمِنْ دُونِهِمَا جَنَّتَانِ ﴾ سے جس معنی کا قصد کیا ہے یہ سب تقریر اس کی تحقیق میں ہے اور شاید جو تفاوت ان کے درمیان ہم نے نہیں ذکر کیا ہے، وہ اس سے زیادہ ہو جو مذکور ہوا (قاضی نے جو پہلی دو جنتوں کی بعد والی دو جنتوں پر فضیلت ثابت

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کی اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی دو جنتوں کا وصف تو کثرتِ اشجار و فوا کہہ کے ساتھ کیا اس طرح کہ فرمایا ﴿ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴾ اور بعد والی دو کا وصف کیا ہے کثرتِ نبات وریاحین کے ساتھ جو زمین پر منبسط ہیں، اس طرح سے کہ ﴿ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴾ فرمایا، یعنی سبزی کی وجہ سے سیاہی کی طرف مائل ہیں اور پہلی دو کے حق میں فرمایا ﴿ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴾ اور آخری دو کے بارے میں فرمایا: ﴿ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴾۔ "نضخ" "جري" سے کم ہے، کیوں کہ "نضخ" فوران ہے اس طرح سے کہ جب بھی اس سے کچھ لیا گیا تو اس کی جگہ ابل آیا اور جاری ہونے میں اس قدر کافی نہیں ہوتا۔

اور پہلے کی دو کے بارے میں فرمایا: ﴿ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴾ اور آخر کی دو میں فرمایا ﴿ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴾ کیوں کہ ﴿ فَاكِهَةٌ ﴾ کم ہے ﴿ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴾ سے اور اول کے دو میں فرمایا ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۢ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ﴾ اور ظہائر کا ذکر نہ کیا، اس لیے کہ ان کی شان بلند ہے اور وہ اس سے خارج ہیں کہ فہم اور عقلیں اس کی حقیقت کو پاسکیں۔ (كذا قال الشيخ) اور زمخشری نے مختصر طور پر بعد والی دو جنتوں کا کم درجے کا ہونا اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ﴿ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴾ فرمایا، ﴿ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴾ نہ کہا اور ﴿ نَضَّاخَتٰنِ ﴾ فرمایا، ﴿ تَجْرِيٰنِ ﴾ نہ کہا اور ﴿ فَاكِهَةٌ ﴾ فرمایا، ﴿ كُلِّ فَاكِهَةٍ ﴾ نہ کہا اور اسی طرح حور اور "متكأ" کی صفت کی۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی امام زمخشری کی تقلید کرتے ہوئے اسی طرح کہا ہے)۔[1]

پھر اگر کوئی کہے کہ ان اخیر کی دو جنتوں کے اہل کا کیوں ذکر نہیں کیا گیا، جیسا کہ پہلے کی دو کے اہل کا ذکر کیا گیا ہے؟ تو کہیں گے کہ چاروں جنتیں انھی کے لیے ہیں جو اپنے رب کے روبرو کھڑے ہونے سے ڈرے، مگر اتنی بات ہے ڈرنے والوں کے مرتبے ہیں۔ چنانچہ پہلے کی دو جنتیں تو ان بندوں کے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے میں اعلیٰ رتبے کے ہیں اور اخیر کی دو جنتیں ان کے لیے ہیں جن کا حال اللہ تعالیٰ سے ڈرنے میں کم ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ چنانچہ یہ ایک قول ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دو جنتیں جو ﴿ مِنْ دُوْنِهِمَا ﴾ میں مذکور ہیں یہ پہلی دو جنتوں سے اعلیٰ اور افضل ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں اور پہلی دو سونے اور چاندی کی ہیں اور اخیر کی دو یاقوت اور زمرد کی ہیں[2] اور ﴿ مِنْ دُوْنِهِمَا ﴾ کے معنی ہیں: "مِنْ أَمَامِهِمَا وَمِنْ قَبْلِهِمَا"

ابو عبد اللہ محمد بن علی ترمذی حکیم نوادر الاصول میں اسی قول کی طرف گئے ہیں۔ حکیم نے کہا: ﴿ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴾ "أَيْ: دُوْنَ هَاتَيْنِ إِلَى الْعَرْشِ"[3] یعنی عرش کی طرف ادنیٰ واقرب، یعنی زیادہ قریب ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے کی دو جنتیں جنتِ عدن اور جنتِ نعیم ہیں اور آخری دو جنت الفردوس اور جنت الماویٰ

---

[1] الكشاف (٤/٤٥٢) تفسير النسفي (٤/٢٠٥) [2] تفسير القرطبي (١٧/١٨٤) [3] نوادر الأصول (٣/٣٤)

ہیں۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس پر یہ حدیث شریف دال ہے کہ جس وقت تم اللہ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو۔[2] (الحدیث)

ترمذی نے کہا: ﴿ فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ ﴾ یعنی ان میں دو جوش مارنے والے اور ابلنے والے چشمے ہیں اور ان کے ساتھ الوانِ فواکہہ ونعیم و جوارِي مزینات و دوابِ مسرجات و ثیابِ ملونات ہیں[3] یعنی ان میں قسم قسم کے میوے اور عیش کی چیزیں اور عورتیں زیور وغیرہ سے آراستہ اور سواری کے جانور زین کسے ہوئے اور رنگین پوشاکیں ہیں۔ یہ اس پر دال ہے کہ نضخ بڑھ کر ہے ''جري'' سے، یعنی ''جري'' تو صرف یہ ہے کہ اشیائے مذکورہ سے پانی بہہ رہا ہے، ابلنے کا اس میں کچھ ذکر نہیں۔ قرطبی کہتے ہیں اس قول پر مفسروں کے اقوال دال ہیں:

1. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ﴿ نَضَّاخَتَانِ ﴾ ''أَيْ: فَوَارَتَانِ بِالْمَاءِ'' یعنی پانی سے جوش مار رہے ہیں۔ نضخ بہ خائے معجمہ نضح بہ حائے مہملہ سے اکثر ہے۔
2. ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ ''نَضَّاخَتَانِ بِالْخَيْرِ وَالْبَرَكَةِ'' یعنی خیر و برکت کے ساتھ جوش مار رہے ہیں۔ (وقاله الحسن و مجاهد)
3. سیدنا عبداللہ بن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ ''يُنْضَخُ عَلَى أَوْلِيَاءِ اللّٰهِ بِالْمِسْكِ وَالْعَنْبَرِ وَالْكَافُوْرِ فِيْ دُوْرِ أَهْلِ الْجَنَّةِ كَمَا يُنْضَخُ رَشُّ الْمَطَرِ'' یعنی اللہ کے اولیاء پر مشک وعنبر و کافور کے ساتھ اہلِ جنت کے گھروں میں چھڑکاؤ کیا جائے گا، جیسا کہ بادل میں سے بارش کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔
4. امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: ''بِأَنْوَاعِ الْفَوَاكِهِ وَالْمَاءِ''[4] یعنی قسم قسم کے میوں اور پانی کے ساتھ جوش ماریں گے۔ ان سب قولوں سے ''نضخ'' کا رتبہ ''جری'' سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴾ یعنی ''اَلنِّسَاءُ الْوَاحِدَةُ خَيْرَةٌ''، ترمذی نے کہا ہے کہ ''خیرة'' وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کو اختیار و برگزیدہ کیا تو اپنے اختیار اور پسند سے ان کا خلق بنایا، چنانچہ اللہ پاک کا اختیار اور پسند کرنا آدمیوں کے اختیار کی طرح نہیں ہے۔ پھر فرمایا ﴿ حِسَانٌ ﴾ تو حسن کے ساتھ ان کا وصف کیا اور جب کسی شے کو پیدا کرنے والا حسن کے ساتھ اس کا وصف کرے تو وہاں کیا کچھ حسن ہوگا، اب وہ کون ہے کہ اس بات پر قادر ہو کہ ان کے حسن کا وصف کرے۔ اور پہلی دو جنتوں کے بارے میں یہ ذکر کیا ہے کہ ﴿ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾ اور گویا وہ یاقوت و مرجان ہیں۔ اب تم دیکھو کہ ''خیرة'' میں جو اللہ کی مختار اور برگزیدہ کی ہوئی ہیں اور ﴿ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾ میں کتنا فرق ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٨٤/١٧) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧) التذكرة للقرطبي (٩٣٢/١، ٩٣٣)
[3] نوادر الأصول (٣٤/٣) [4] التذكرة (٩٣٣/١)

پھر فرمایا: ﴿ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴾ اور پہلے کی دو میں فرمایا ﴿ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ﴾ یعنی انھوں نے اپنی آنکھ خاوندوں پر روکی ہے اور یہ نہیں ذکر کیا کہ وہ مقصورات ہیں تو اس بات نے اس پر دلالت کی کہ مقصورات افضل اور اعلیٰ ہیں۔ اور تحقیقاً روایت میں ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ عرش سے ایک بدلی برسی تو وہ رحمت کے قطرات سے پیدا کی گئیں، پھر ہر ایک پر خیمہ نصب کیا گیا، نہروں کے کنارے پر جس کی فراخی چالیس میل کی ہے اور اس کا کوئی دروازہ نہیں، یہاں تک کہ جب اللہ کا ولی خیمے کے پاس پہنچے گا تو وہ خیمہ ایک دروازے سے شق ہو جائے گا، تا کہ ولی اللہ کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ فرشتوں اور خادموں میں سے کسی بھی مخلوق کی آنکھیں اس پر نہیں پڑیں، سو وہ مخلوق کی آنکھوں سے مقصورہ ہیں، یعنی بچائی گئی ہیں۔ واللہ أعلم.

پھر فرمایا: ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ ﴾. ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ میں اختلاف کیا گیا ہے کہ وہ کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کسرِ خباء ہیں، یعنی خیموں کے دامن اور کھیتی کے اطراف اور وہ شے جو اس سے لٹکتی ہے۔ واحد "رَفْرَفَةٌ" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ ایک شے ہے جس وقت اس کا صاحب اس پر مستوی ہوتا ہے تو اسے ہلاتی ہے اور اسے لے کر مرجاح کی طرح مائل ہوتی ہے، یعنی جھولے کی طرح اس کو دائیں بائیں اور اونچا نیچا کرتی ہے۔ وہ اپنی انیسہ کو ساتھ لیے ہوئے اس سے لذت لے گا۔ اس بنا پر ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کا اشتقاق "رَفَّ يَرُفُّ إِذَا ارْتَفَعَ" سے ہو گا۔ اسی معنی سے "رفرفة الطائر" ہے یعنی طائر کا اپنے دونوں بازوؤں کو ہوا میں ہلانا اور بعض اوقات اسی وجہ سے "ظلیم" کا نام ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ رکھا جاتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے دونوں بازوؤں کو ہلاتا ہے، پھر دوڑتا ہے۔ "ظَلِيْمٌ" "ذَكَرُ النَّعَامِ" ہے، یعنی نر شتر مرغ اور جب طائر کسی شے کے گرد اپنے دونوں بازوؤں کو ہلاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس پر بیٹھے تو اس وقت "رفرف الطائر" بولتے ہیں۔

حکیم ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ از روئے خطر کے فرش سے اعظم ہے، یعنی شرف میں اس کا رتبہ فرش سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ پہلے کی دو جنتوں میں فرمایا: ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۢ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ﴾ اور یہاں فرمایا: ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ ﴾ اور ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ مستقر ولی ہے ایک شے پر جس وقت ولی اس پر مستوی ہو گا تو "رَفْرَفَ بِهِ"، یعنی وہ جھولے کی طرح اس کو اڑا لے جائے گی، اس طرح اور اس طرح جہاں کہیں کا وہ ارادہ کرے گا۔

حدیثِ معراج شریف میں ہمارے لیے یہ بات روایت کی گئی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو آپ کے پاس رفرف آیا اور اس نے آپ ﷺ کو جبریل علیہ السلام سے لے لیا اور آپ کو لے کر مسندِ عرش کی طرف اڑا اور ذکر کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ مجھے لے کر اڑا، کبھی مجھے نیچا کرتا تھا اور کبھی اونچا کرتا تھا، یہاں تک

کہ مجھے میرے رب کے روبرو کھڑا کر دیا، پھر جب واپس لوٹنے کا وقت آیا تو اس نے آپ ﷺ کو لیا، پھر آپ ﷺ کو لے کر اڑا نیچے اور اونچا کرتا ہوا۔ آپ ﷺ کو نیچے کی جانب لاتا تھا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کو جبریل علیہ السلام کی طرف پہنچا دیا۔ صلوات اللّٰه علیهما اور جبریل علیہ السلام رو رہے تھے اور اپنی آواز اللہ کی حمد کے ساتھ بلند کر رہے تھے[1] اور رفرف اللہ تعالیٰ کے روبرو خادموں میں سے ایک خادم ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے قرب میں اور نزدیک میں خاص کام ہیں جس طرح کہ براق ایک سواری ہے جس پر انبیاء علیہم السلام سوار ہوتے ہیں، اس کے ساتھ زمین میں وہ کام مخصوص ہے۔ چنانچہ یہ وہ رفرف ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے "جنتين دانيتين" والوں کے لیے مسخر کیا ہے۔ یہ ان دو جنتوں کا متکا اور فرش ہے۔ ولی کو لے کر جہاں وہ چاہے گا، ان نہروں کے کناروں پر اپنی ازواج کے خیموں کی طرف اڑے گا۔ وہ ازواج جو ﴿ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴾ ہیں۔

پھر فرمایا: ﴿ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴾. ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ منقوش کپڑے ہیں جو بچھائے جاتے ہیں، پھر جب خالقِ نقوش نے فرمایا کہ وہ ﴿ حِسَانٌ ﴾ ہیں تو ان "عباقر" کے ساتھ تمھارا کیا خیال ہے کہ وہ کیسی حسین ہوں گی اور عبقر یمن کے کنارے پر ایک بستی ہے۔ اس خبر کے مطابق جو ہم کو ملی ہے وہاں منقوش بساط بنے جاتے ہیں، چنانچہ اللہ پاک نے ان منقوش حسین بساطوں کا اور رفرفِ خضر کا ذکر فرمایا ہے جن کو ان دو جنتوں میں پیدا کیا ہے اور ان کے لیے جنتوں میں صرف انہیں اشیاء کا ذکر فرمایا ہے جن کا نام وہ یہاں پہچانتے ہیں، چنانچہ اب ان دو جنتوں کا فرق ظاہر ہو گیا ہے۔ بعض مفسرین سے روایت کیا گیا ہے، تو وہ اس طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ یہ دو جنتیں ان سے دون ہیں، یعنی ان سے کم درجے کی ہیں، یعنی "أسفل و أدون" ہیں۔

بھلا ان صفتوں کے ہوتے ہوئے وہ کیسے "أدون" ہونے لگیں تو اب ان کے لیے یہی کہنا کافی ہے کہ وہ صفت کو نہیں سمجھے۔[2] (ذکر هذا کله في الأصل التاسع والثمانين من کتاب نوادر الأصول واللّٰه سبحانه وتعالی أعلم) یہ سب جمل سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ خاکسار۔عفي عنه۔ کی عرض ہے کہ حقیقت میں تو اللہ پاک ہی خوب جانتا ہے کہ افضل کون ہیں، پہلے کی جنتیں، یا بعد کی جنتیں لیکن جب فضیلت تفاوت کے اعتبار سے ہی معلوم ہونا ٹھہری تو حکیم جی کی بات دل کو خوب لگتی ہے۔ ان کے بیان کے بعد آخر والی دو جنتوں کے صفات بڑھ کر معلوم ہوتے ہیں آگے اللہ تعالیٰ جانے۔

تنبیہ:

چونکہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کے لفظ میں تکرار ہے، اس لیے اس کے معنی میں بھی تکرار ہے، اس میں حرکت و جنبش

---

[1] نوادر الأصول (۳/۳۶) حکیم ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو اسی طرح بغیر سند کے ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ ان الفاظ کے ساتھ روایت کہیں اور نہیں ملی ہے۔

[2] التذکرة للقرطبي (۱/۹۳۱۔۹۳۶) نوادر الأصول (۳/۳۴۔۳۷)

واضطراب وصوت وتدلی کے معنی ہیں، اس کا واحد جو "رفرفة" ہے، اس کے مقلوب (الٹا کیا ہوا) میں بھی جنبش کے معنی ہیں، یعنی فرفرہ بہ معنی "جنبانیدن" وسبکی اور نشاط آتا ہے، اسی لیے خیموں کے دامنوں کو اور زرہ کے کناروں کو، جو لٹکتے ہیں، ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کہتے ہیں اور طائر کے بازو پھڑ پھڑانے کو رفرفہ بولتے ہیں اور نرشتر مرغ کو رفرف کہتے ہیں۔ اور زرع کے جوانب اور اطراف کو بھی ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ بولتے ہیں۔

اب دیکھو کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کے چار معنی ذکر کیے تھے اور فتح البیان وغیرہ سے چودہ معنی لکھے گئے جن کا ذکر پہلے ہو چکا، ان سب میں سے دوبارہ آنے والے معانی حذف کر کے گیارہ قول باقی رہتے ہیں۔ غور سے دیکھو تو ان میں باہم کچھ بڑا اختلاف نہیں ہے، حقیقت میں ایک اصل سے متفرع (شاخیں نکلی ہوئی) ہیں۔ دیکھو اکثر کا تو یہ قول ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ محابس ہیں، یہ جمع ہے محبس بالکسر کی، اس کے معنی پہلے حاشیے میں لکھے گئے ہیں۔ گویا بستر پوش، پلنگ پوش، تخت پوش سمجھو۔ تخت پر پہلے بساط بچھایا جاتا ہے، پھر اس پر ایک پارچۂ عریض ڈالا جاتا ہے، گویا اسے چاندنی کہو جس کے کنارے نیچے لٹکتے ہوئے جھالر کی طرح ہوا سے ہلتے ہوئے نہایت خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔

دیکھو اس میں وہی حرکت وتدلی وغیرہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کے معنی کی موجود ہے۔ کسی نے ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کو یوں ادا کیا کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ تخت پر محابسِ متدلی کی طرح ہے۔ اس قول میں صرف ادا کا فرق ہے ورنہ وہی قول اول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ "بسط" ہیں، یہ بھی محابس پر صادق آیا ہے، کیونکہ محابس بھی بساط ہیں، گو بساط کے اوپر کی بساط ہی سہی۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ حاشیۂ ثوب ہے۔ گویا یہ بھی محابس ہیں ان کی اطراف اور حاشیے جو نیچے لٹکتے ہیں ان کو ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کہا، اسی کی مثل یہ قول ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ فضولِ محابس ہیں، یعنی محابس کے کنارے اور حاشیے جو نیچے لٹکتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ ہر ثوبِ عریض ہے۔ یہ بھی محابس پر صادق آتا ہے، کیوں کہ محابس اس کی ایک فرد ہے اور عریض ہے جب تو نیچے لٹکتا ہے۔ کسی نے کہا ایک قسم ہے سبز کپڑوں کی۔ یہ بھی محابس پر صادق آ سکتا ہے، کیونکہ محابس ایک قسم کے سبز کپڑے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وسائد ہیں، یعنی تکیے چونکہ یہ بھی بسط اور محابس سے متعلق ہیں، اس لیے ان پر بھی مجاورت کے سبب سے محابس صادق آ سکتا ہے۔ اور اگر جھالر دار ہوں تو رفرف کے اصل معنی بھی اس میں آ سکتے ہیں۔

کسی نے کہا ہے کہ مرافق ہیں۔ یہ بھی تکیے ہیں ان کا حال بھی وسائد کی طرح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "فرش مرتفعة" ہیں۔ ان پر بھی محابس صادق آ سکتی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ زرابی ہیں۔ اس کا ترجمہ یا فرش ہے یا مخمل کے نہالچے یا فرش پر چھوٹے تکیے تو محابس صادق آ سکتی ہیں اور آخر کے ترجموں کا حال وسائد کی طرح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "نمارق" ہیں۔ اس کا ترجمہ یا تو وسائد ہے یا قالینچے۔ یہ بھی متعلقاتِ محابس سے ہیں۔ کسی نے

کہا ہے کہ ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ اہلِ جنت کی ایک سواری ہے، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس پر تو رفرف کے معنی پورے صادق آتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ریاضِ جنت ہیں ان پر بھی ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کے معنی صادق آتے ہیں۔

اب رہا ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ سو بارہ قول اس کے بارے میں گزر چکا ہے۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ عرب کے ہاں ہر منقش کپڑا اور ہر نفیس، نادر، عجیب اور فائق شے عبقری ہے۔ پھر یہاں کسی نے تو کہا ہے کہ اہلِ جنت کے بسط، یعنی نفیس بچھونے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ دیباج ہیں، یعنی ریشمی نفیس بچھونے۔ کسی نے کہا ہے کہ طنافس ثخان یا رقاق یعنی موٹے باریک قالین۔ کسی نے کہا ہے کہ زرابی۔ کسی نے کہا ہے کہ عتاق الزرابی، یعنی عمدہ زرابی۔ اس کا ترجمہ یا تو فروش ہے یا مسندیں یا مخمل کے نہالچے یا چھوٹے تکیے، پھر جب ﴿ رَفْرَفٍ ﴾ کے معانی میں سے ایک معنی زرابی ہیں، اسی طرح ﴿ عَبْقَرِيٍّ ﴾ کے معانی میں ایک معنی زرابی آئے ہیں۔ تو پہلے زرابی سے بساط مراد لیں گے اور دوسرے زرابی سے منقش مسندیں یا مخمل کے نہالچے یا چھوٹے تکیے۔

حاصل سب کا یہ ہوا کہ تختوں پر عمدہ نفیس و نادر منقش ریشمی بساط یا عمدہ قالین موٹے یا باریک بہت خوبصورت بچھے ہوئے ہیں اور اُن پر سبز تخت پوش پڑے ہوئے ہیں جن کے پلو جھالر کی طرح نیچے لٹک رہے ہیں، نہایت حسن و جمال سے لہرا رہے ہیں، ان کے اوپر تکیے لگائے ہوئے اخیر کی دو جنت والے اپنی انیسہ و محبوبہ کے ساتھ اطمینان کے ساتھ فرحان اور شاداں تشریف فرما ہیں۔ اب کہو ان میں اور ﴿ مُتَّكِـِٔيْنَ عَلٰى فُرُشٍۢ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ﴾ میں کتنا فرق ہے اور باقی صفات کا فرق حکیم ترمذی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے، وہ پہلے گزر چکا ہے[1] اور پہلے ذکر کی گئی دو جنتوں کا صفات کے اعتبار سے افضل ہونا بھی پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ حافظ ابن کثیر، زمخشری، قاضی، نسفی اور قرطبی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2] ان سب نے جو فرق بیان کیا ہے، اس کا بیان کچھ تو متن میں اور کچھ حاشیہ میں لکھ دیا ہے، تا کہ تم اس میں غور کرو، سوچو اور بیان کے فرق کا موازنہ کرو۔

تنبیہ:

سورۃ الشعراور سورۃ القمر اور سورۃ الرحمٰن وغیرہ میں جو ایک آیت کی بار بار تکرار کی گئی ہے، اس کا فائدہ اپنی جگہ پر لکھ دیا گیا ہے۔ قرآن شریف چونکہ عرب کے اسلوبِ کلام پر نازل ہوا ہے، اس لیے ان سے ان کے کلام کے طرز پر خطاب کیا گیا ہے۔ عرب لوگ زجر و توبیخ و تنبیہ اور تاکید کے مقام میں ایسی تکرار کیا کرتے ہیں۔ دیکھو بکر و تغلب کی کتاب میں حارث نے اپنے فرزند بجیر کے مرثیہ میں ایک مصرع کی بہت تکرار کی ہے، اس کا مطلع یہ ہے:

كُلُّ شَيْءٍ مَصِيْرُهُ لِزَوَالٍ غَيْرُ رَبِّيْ وَصَالِحِ الْأَعْمَالِ

---

① اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ② اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

اس کے بعد بہت سے شعر لکھے ہیں، پھر یہ شعر ہے:

قَرِّبَا مَرْبِطَ النَّعَامَةِ مِنِّيْ لَقِحَتْ حَرْبُ وَائِلٍ عَنْ حِيَالِ

پھر چوالیس شعر تک مصرع اول کی تکرار کی ہے۔ نعامہ حارث کے گھوڑے کا نام ہے، اسی طرح مہلہل نے اس کے جواب میں کہا

قَرِّبَا مَرْبِطَ الْمُشْهَرِ مِنِّيْ كُلُّ شقر وَأَشْقَرَ ذِيَالِ

پھر چالیس شعر میں مصرع اول کی تکرار کی ہے۔ مشہر مہلہل کے گھوڑے کا نام ہے اسی طرح طرح مہلہل نے دوسرے قصیدے میں کہا ہے:

عَلَى أَنْ لَّيْسَ عَدْلًا مِنْ كُلَيْبٍ إِذَا خَافَ الْمُغَارُ مِنَ الْمُغِيْرِ

پھر پندرہ شعروں میں مصرعِ اول کی تکرار کی ہے۔ اسی طرح مہلل نے ایک اور قصیدے میں "عَلَى أَنْ لَّيْسَ يوفى مِنْ كليب" کی سولہ شعروں میں تکرار کی ہے۔ اس قسم کی تکرار پر وہی اعتراض کرتا ہے جو محاورۂ عرب سے بے خبر ہے۔ والله سبحانه أعلم بأسرار كلامه و محاسن نظامه.

الحمد لله و المنة کہ اس سورت مبارکہ کی تفسیر ۲۶ ماہ ربیع الاول ۱۳۱۵ ہجری کو شبِ جمعہ بوقت نیم شب تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہٗ اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائے، آمین اور آیندہ لکھنے کی توفیق دے۔ بیماروں کو شفا یابی، بے روزگاروں کو روزگار عطا فرمائے، بلاؤں اور قحط سالی کو دور کرے، اسلام، سلمه الله تعالىٰ، کا بول بالا فرمائے۔ ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه وأشياعه وأتباعه إلى يوم الدين. آمين آمين آمين.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ

اس سورت مبارکہ کی چھیانوے (۹۶) یا ستانوے (۹۷) یا ننانوے (۹۹) آیات ہیں اور یہ مکی ہیں۔ امام حسن، عکرمہ، جابر اور عطاء رحمہم اللہ کے قول کے مطابق عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا، لیکن اس میں سے ایک آیت مدینہ میں نازل ہوئی، وہ یہ ہے: ﴿ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴾۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: مکی ہے مگر اس کی چار آیتیں، وہ یہ ہیں: ﴿ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ یہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ کی طرف سفر کے دوران میں نازل ہوئیں اور ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾۔ یہ دونوں مدینہ کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر کے دوران میں نازل ہوئیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۃ الواقعہ مکہ میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس وغيره يعني والنحاس وابن مردويه والبيهقي في الدلائل)۔

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے ابن الزبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اس کے مثل روایت کیا ہے۔[2]

فضیلت:

[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: جس نے سورۃ الواقعہ ہر رات کو پڑھی تو اس کو کبھی فاقہ نہ پہنچے گا۔[3] (أخرجه البيهقي في الشعب وغيره يعني وأبو عبيد في فضائله وابن الضريس والحارث بن أبي أسامه وأبو يعلىٰ وابن مردويه)

[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۃ الواقعہ سورۃ الغنا ہے، چنانچہ تم اس کو پڑھو اور اپنی اولاد کو سکھاؤ۔[4] (أخرجه ابن عساكر)

[3] حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ اپنی عورتوں کو سورۃ الواقعہ سکھاؤ، بے شک وہ سورۃ الغنا ہے۔[5] (أخرجه الديلمي)

---

(1) تفسير القرطبي (۱۷/۱۹٤) (2) الدر المنثور (۸/۳)

(3) شعب الإيمان (۲/٤۹۱) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (۲۸۹)

(4) فتح القدير (۵/۱۹۵) (5) مسند الديلمي (۳/۱۰) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۳۸۸۰)

[4] اور نبی ﷺ کا یہ قول گزر چکا ہے کہ مجھ کو ہود اور واقعہ نے بوڑھا کر دیا۔[1]

[5] امام مسروق رحمہ اللہ نے کہا: جو کوئی یہ ارادہ کرے کہ اولین و آخرین کی خبر معلوم کرے اور اہلِ جنت اور اہلِ نار کی خبر اور اہلِ دنیا اور اہلِ آخرت کی خبر معلوم کرے تو چاہیے کہ سورۃ الواقعہ کو پڑھے۔[2] (كذا في فتح البيان)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: (قاله أبو إسحاق عن عكرمة عنه) کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ تو واقعی بوڑھے ہو گئے۔ فرمایا: مجھ کو ہود اور واقعہ اور مرسلات اور ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُونَ﴾ اور ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ نے بوڑھا کر دیا۔[3] (رواه الترمذي قال: حسن غريب)

ابو ظبیہ کہتے ہیں کہ عبداللہ، یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ مریض ہوئے، وہ مرض جس میں وفات دیے گئے تو عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ان کی عیادت کی۔ چنانچہ فرمایا: تو کیا شکایت رکھتا ہے؟ کہا: اپنے گناہوں کی۔ فرمایا: پھر کس چیز کی خواہش رکھتا ہے؟ کہا: اپنے رب کی رحمت کی۔ فرمایا: کیا میں تیرے لیے کسی طبیب کا حکم نہ دوں؟ کہا: طبیب نے تو مجھے بیمار کیا ہے۔ فرمایا: کیا میں تیرے لیے عطا کا حکم نہ دوں؟ کہا: مجھے اس میں کچھ حاجت نہیں ہے۔ فرمایا کہ وہ تیرے بعد تیری بیٹیوں کے لیے ہو گی، کہا: کیا تو میری بیٹیوں پر فقر کا خوف رکھتا ہے؟ میں نے تو اپنی بیٹیوں کو حکم دیا ہے کہ ہر رات سورۃ الواقعہ پڑھیں۔ بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ جس نے ہر رات کو سورۃ الواقعہ پڑھی، اس کو کبھی فاقہ نہ پہنچے گا۔[4] (أخرجه الحافظ ابن عساكر عن السري بن يحيى الشيباني عن أبي شجاع عن أبي ظبية ثم قال ابن عساكر: كذا قال، والصواب عن شجاع كما رواه عبد الله بن وهب عن السري و قال عبد الله بن وهب: أخبرني السري بن يحيى أن شجاعا حدثه عن أبي ظبية عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: «من قرأ سورة الوقعة كل ليلة لم تصبه فاقة أبدا» فكان أبو ظبية لا يدعها وكذا رواه أبو يعلىٰ عن إسحاق بن إبراهيم عن محمد ابن منيب عن السري بن يحيى عن شجاع عن أبي ظبية عن ابن مسعود رضي الله عنه به ثم رواه عن إسحاق بن أبي إسرائيل عن محمد بن منيب العدني عن السري بن يحيى عن أبي ظبية عن ابن مسعود رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: أمرت بناتي أن يقرأنها كل ليلة وقد رواه ابن عساكر أيضا من حديث حجاج بن نصير و عفان بن أبي اليمان عن السري بن يحيىٰ عن شجاع عن أبي فاطمة قال: مرض عبد الله رضي الله عنه فأتاه عثمان بن عفان رضي الله عنه يعوده فذكر الحديث بطوله قال عثمان بن اليمان: كان أبو فاطمة هذا مولى علي بن أبي طالب رضي الله عنه.[5] كذا في ابن كثير)۔ سیدنا جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نمازیں پڑھتے تھے لگ بھگ تمھاری نمازوں کے جو تم آج پڑھتے ہو، لیکن وہ تخفیف کرتے تھے، ان کی نماز تمھاری نماز سے زیادہ ہلکی ہوتی تھی اور وہ فجر میں سورۃ الواقعہ یا سورتوں میں سے اس جیسی سورت پڑھتے تھے۔[6] (أخرجه الإمام أحمد)

---

[1] سنن الترمذي (٣٢٩٧) صحيح الجامع (٣٧٢٣) [2] الدر المنثور (٤٠/٨) فتح البيان (٣٥٣/١٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩٧) صحيح الجامع (٣٧٢٣)

[4] تاريخ دمشق (١٨٦/٣٣) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہِ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٢٨٩)

[5] تاريخ دمشق (١٨٦/٣٣، ١٨٧) تفسير ابن كثير (٣٥٨/٤، ٣٥٩) [6] مسند أحمد (١٠٤/٥)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَۃُ ۙ﴿۱﴾ لَیۡسَ لِوَقۡعَتِہَا کَاذِبَۃٌ ۘ﴿۲﴾ خَافِضَۃٌ
رَّافِعَۃٌ ۙ﴿۳﴾ اِذَا رُجَّتِ الۡاَرۡضُ رَجًّا ۙ﴿۴﴾ وَّ بُسَّتِ الۡجِبَالُ
بَسًّا ۙ﴿۵﴾ فَکَانَتۡ ہَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۙ﴿۶﴾ وَّ کُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا ثَلٰثَۃً ؕ﴿۷﴾
فَاَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ ؕ﴿۸﴾ وَ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَۃِ ۬ۙ مَاۤ
اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَۃِ ؕ﴿۹﴾ وَ السّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ ۚۙ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِکَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ۚ﴿۱۱﴾
فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ ﴿۱۲﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

جب واقع ہونے والی (قیامت) واقع ہو گی ① اس کے واقع ہونے کے وقت کوئی بھی جھٹلانے والا نہ ہو گا ② پست کرنے والی، بلند کرنے والی ③ جب زمین نہایت بری طرح ہلائی جائے گی ④ اور پہاڑ (پھوڑ کر) بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے ⑤ تب وہ پراگندہ غبار (جیسے) ہو جائیں گے ⑥ اور تم (لوگ) تین قسمیں ہو جاؤ گے ⑦ سو دائیں ہاتھ والے، کیا (خوب) ہیں دائیں ہاتھ والے! ⑧ اور بائیں ہاتھ والے، کیا (حقیر) ہیں بائیں ہاتھ والے! ⑨ اور سبقت لے جانے والے تو سبقت لے جانے والے ہی ہیں ⑩ یہی لوگ مقرب ہیں ⑪ نعمت والے باغات میں ⑫

روزِ قیامت کے حالات وواقعات:

وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہے، یعنی ایک گروہ کو نیچے لے جاتی ہے اور ایک کو اوپر اٹھاتی ہے۔ آگے والے وہی ہیں جو ایمان میں آگے ہیں۔ نعمتوں والی جنت میں ہیں، یعنی اللہ کی رحمت میں مقرب ہیں۔ انتہی۔[1]

واقعہ قیامت کے دن کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ اس کا ہونا متحقق ہے، یعنی حتمی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَیَوۡمَئِذٍ وَّقَعَتِ الۡوَاقِعَۃُ ﴾ [الحاقۃ: ۱۵] ''اس دن میں ہو پڑنے والی (قیامت) ہو پڑے گی۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ لَیۡسَ لِوَقۡعَتِہَا کَاذِبَۃٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ اس کے ہونے کا ارادہ فرمائے گا تو اس کے پھیرنے والا کوئی نہ ہو گا کہ اسے پھیر دے نہ کوئی دفع کرنے والا ہو گا کہ اس کو دفع کر دے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ ﴾ [الشوریٰ: ۴۷] ''اپنے رب کا حکم مان لو اس سے پہلے کہ اللہ کی جانب سے وہ دن آ جائے جس کا ہٹ جانا ناممکن

ہے۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴾ [المعارج: ١۔ ٢] ’’ایک سوال کرنے والے نے اس عذاب کا سوال کیا جو واضح ہونے والا ہے۔ کافروں پر جسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔‘‘

نیز فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾ [الانعام: ٧٣] ’’جس دن اللہ تعالیٰ اتنا کہہ دے گا تو ہو جا بس وہ ہو پڑے گا۔ اس کا کہنا حق اور بااثر ہے اور ساری حکومت خاص اسی کی ہو گی جب کہ صور میں پھونک ماری جائے گی وہ جاننے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا اور وہی ہے بڑی حکمت والا پوری خبر رکھنے والا۔‘‘

﴿ كَاذِبَةٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ ضرور ہو گی۔ (كما قاله محمد بن كعب) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ’’لَيْسَ فِيهَا مَثْنَوِيَّةٌ وَلَا ارْتِدَادٌ وَلَا رَجْعَةٌ‘‘ یعنی اس میں نہیں ہے مڑنا، نہ پھرنا اور نہ رجوع ہونا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَاذِبَةٌ ﴾ مصدر ہے، جیسے: ’’عَاقِبَةٌ‘‘ اور ’’عَافِيَةٌ‘‘۔[1] ﴿ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴾ یعنی کئی قوموں کو نیچے لے جاتی ہے، جہیم کے اسفل سافلین کی طرف، گو وہ دنیا میں بڑی عزت والی تھیں اور دوسری قوموں کو اعلیٰ علیین اور نعیمِ مقیم کی طرف اوپر اٹھاتی ہے، اگرچہ وہ دنیا میں وضیع (کمینی) تھیں۔ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہما نے اسی طرح کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ پست کرتی ہے ایک لوگوں کو اور بلند کرتی ہے دوسروں کو۔ (أخرجه ابن أبي حاتم بسنده عن سماك عن عكرمة عنه)

عثمان بن سراقہ نے کہا: ((قال عبيد الله العتكي عن عثمان بن سراقة بن خالة عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ)) کہ قیامت نے اللہ کے دشمنوں کو آگ کی طرف پست کیا اور اللہ کے دوستوں کو جنت کی طرف بلند کیا۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پست کرے گی ان مردوں کو جو دنیا میں بلند تھے اور بلند کرے گی ان لوگوں کو جو دنیا میں پست تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ متکبرین کو پست کیا اور متواضعین کو بلند کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یعنی براویتِ عوفی یہ ہے کہ سنا دیا قیامت نے قریب و بعید کو۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پست کیا تو ان کو یعنی قریب کو سنا دیا اور بلند کیا تو اقصیٰ کو یعنی بعید کو سنا دیا۔ اسی طرح امام ضحاک اور قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[2]

﴿ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ﴾ یعنی جس وقت زمین اچھی طرح حرکت دی جائے گی اور اپنے طول و عرض کے ساتھ مضطرب ہو گی۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے: ’’أَيْ: زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالًا‘‘ یعنی اچھی طرح سے ہلائی جائے گی۔[3] امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ’’تُرَجُّ بِمَا فِيهَا كَرَجِّ الْغِرْبَالِ بِمَا فِيهِ‘‘[4] یعنی جنبش دی جائے گی اس شے کے ہمراہ جو اس میں ہے جس طرح چلنے کے

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/٨٧)
[2] تفسير الطبري (٢٣/٨٧_٩١) تفسير ابن كثير (٤/٣٥٩، ٣٦٠)
[3] تفسير الطبري (٢٣/٩١)
[4] تفسير ابن كثير (٤/٣٦٠)

لیے جنبش دیتے ہیں اس شے کے ساتھ جو اس میں ہے۔ یہ قول اس آیت کی طرح ہے: ﴿ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴾ [الزلزال: ۱] ''جب زمین پوری طرح جھنجھوڑ دی جائے گی۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ﴾ [الحج: ۱] ''لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، بلاشبہ قیامت کا زلزلہ بہت ہی بڑی چیز ہے۔''

﴿ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴾ ''أَيْ: فُتِّتَتْ فَتًّا''۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے، یعنی پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہاڑ اس طرح ہو جائیں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴾ [المزمل: ۱۴] ''بھربھری ریت کے ٹیلے۔''

﴿ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ﴾ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (قاله أبو إسحاق عن الحارث عنه) کہ گرد و غبار کی طرح جو بلند ہوتا ہے، پھر جاتا رہتا ہے تو اس سے کوئی شے باقی نہیں رہتی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ﴿ هَبَآءً ﴾ وہ ہے جو آگ سے اڑتا ہے جس وقت وہ جلتی ہے اور شعلہ مارتی ہے تو اس سے پتنگے اڑتے ہیں، پھر جب وہ گرتے ہیں تو کوئی شے نہیں ہوتے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مُنْبَثٌّ'' وہ شے ہے کہ ہوا نے اس کو اڑایا اور پریشان کر دیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ﴾ خشک درختوں کی طرح ہے جن کو ہواؤں نے اڑا دیا۔[1] یہ آیت اپنی امثال کے ساتھ اس پر دال ہے کہ قیامت کے دن پہاڑ اپنی جگہوں سے زائل ہو جائیں گے اور جاتے رہیں گے اور ان کے چلانے اور اڑانے پر، یعنی ان کے اکھاڑنے پر اور ان کی دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جانے پر۔

﴿ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴾ یعنی قیامت کے دن لوگ تین قسم کے ہو جائیں گے: ایک قوم تو عرش کی دائیں جانب ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو آدم علیہ السلام کی سیدھی طرف سے نکلے ہیں، ان کو ان کے نامۂ اعمال اپنے سیدھے ہاتھوں میں دیے جائیں گے اور ان کو سیدھی طرف لے جائیں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جمہور اہلِ جنت ہیں اور دوسری قسم کے عرش کی بائیں جانب میں ہیں، یہ وہ ہیں جو آدم علیہ السلام کی بائیں جانب سے نکلے، ان کو ان کے نامۂ اعمال بائیں ہاتھوں میں دیے جائیں گے اور ان کو بائیں جانب لے جائیں گے۔ یہ لوگ عامۂ اہلِ نار ہیں۔ عیاذا بالله من صنيعهم۔ اور ایک گروہ اللہ عزوجل کے روبرو سابقین ہیں۔ یہ لوگ دائیں ہاتھ والوں کے خاص تر اور زیادہ بہرہ مند اور زیادہ قریب ہیں۔ یہ ان کے سردار ہیں، ان میں رسول، انبیاء، صدیقین اور شہداء ہیں۔

اصحابِ یمین میں سے یہ لوگ گنتی میں بہت قلیل ہیں، اسی لیے اللہ پاک نے یہاں فرمایا ہے: ﴿ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴾ اور اسی طرح سورت کے آخر میں ان کی تقسیم تین نوع میں کی ہے، جبکہ ان کا مختصر ذکر فرمایا اور اسی طرح اس آیت میں ان کا ذکر کیا ہے: ﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ

[1] تفسیر الطبري (۲۳/۹۲-۹۴) تفسیر ابن کثیر (۴/۳۶۰)

﴿ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ [الفاطر: ٣٢]
''پھر ہم نے ان لوگوں کو (اس) کتاب کا وارث بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے پسند فرمایا۔ پھر بعض تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں متوسط درجے کے ہیں اور بعض ان میں اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کیے چلے جاتے ہیں۔ یہ بڑا فضل ہے۔''

﴿ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ میں جو دو قول ہیں ان کا بیان پہلے گزر چکا ہے، چنانچہ یہ ان میں سے ایک قول کی بنا پر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ وہی تین قسمیں ہیں جو سورۃ الملائکہ میں ہیں: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ...الآية﴾ [الفاطر: ٣٢] (قاله سفيان الثوري عن جابر الجعفي عن مجاهد عنه) ان کا دوسرا قول (یعنی بروایتِ ابن جریج) یہ ہے کہ یہ تین وہی ہیں جن کا سورت کے آخر میں ذکر کیا گیا ہے اور سورۃ الملائکہ میں۔ یزید رقاشی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو فرمایا: ''أَصْنَافًا ثَلَاثَةً''۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''فِرَقًا ثَلَاثَةً''۔ میمون بن مہران رحمہ اللہ نے کہا: ''أَفْوَاجًا ثَلَاثَةً''، سب سے مراد تین گروہ ہیں۔[1]

عثمان بن سراقہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو قسمیں تو جنت میں ہیں اور ایک قسم آگ میں۔[2] (قاله عبيد الله العتكي عنه) سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: ﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ [التكوير: ٧] ''اور جب جانیں (جسموں سے) ملا دی جائیں گی۔'' فرمایا: ''ضُرَبَاء'' (''ضرباء'' یعنی امثال ونظراء جمع ہے ضریب بمعنی مثل کی) فرمایا: ہر مرد ہر قوم سے جو عمل کرتے تھے اس کا عمل اور یہ اس طرح سے ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً﴾ فرمایا، وہ ضرباء ہیں۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم)

یعنی قیامت کے دن ہر شخص اس شخص کے ساتھ ملایا جائے گا جو اس جیسا عمل کرتا تھا۔ مثلاً جو کوئی اصحاب الیمین جیسا عمل کرتا ہوگا وہ ان کے ساتھ جوڑا جائے گا، اسی طرح اور فرقوں کا حال ہے۔ ''زوج'' سے مراد مثل ونظیر ہے۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ﴾ ﴿وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ﴾ پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دو مٹھیاں باندھیں اور فرمایا: یہ جنت کے واسطے ہے اور میں پروا نہیں کرتا اور یہ واسطے نار کے ہے اور میں پروا نہیں کرتا۔[4] (أخرجه الإمام أحمد)

یہ مضمون حدیثِ قدسی کا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ پاک کی طرف سے نقل فرمایا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مرفوعاً

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٩/١٠) تفسير ابن كثير (٣٦٠/٤، ٣٦١) ② تفسير الطبري (٩٨/٢٣)
③ تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٣٠) تفسير ابن كثير (٣٦١/٤) اس کی سند میں ''ولید بن ابی ثور'' ضعیف راوی ہے۔
④ مسند أحمد (٢٣٩/٥) اس کی سند میں انقطاع اور ضعف ہے۔ حسن رحمہ اللہ کا سماع سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے اور ''براء غنوی'' ضعیف راوی ہے۔

کہتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ قیامت کے دن اللہ کے سائے کی طرف سبقت کرنے والے کون ہیں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: وہ ہیں کہ جب ان کو حق دیا جائے تو اس کو قبول کریں اور جب اس کا ان سے سوال کیا جائے تو اس کا بذل کریں (عطا کریں) اور لوگوں کے لیے ویسا ہی حکم کریں (فیصلہ کریں) جیسا حکم وہ اپنی جانوں کے لیے کرتے ہیں۔[1] (اخرجه الإمام أحمد)

امام محمد بن کعب، ابو حزرہ یعقوب بن مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴾ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ علیین ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یوشع بن نون نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف سبقت کی اور مومن آلِ یٰس نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سبقت کی اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نبیِ مکرم ﷺ کی طرف سبقت کی۔[2] (قاله ابن نجيح عن مجاهد عنه، رواه ابن أبي حاتم، عن محمد بن هارون الفلاس عن عبد الله بن إسماعيل المدائني عن سفيان بن عيينة عن ابن أبي نجيح به)۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ہیں جنھوں نے دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ (قال ابن أبي حاتم و ذكر عن محمد بن أبي حماد حدثنا مهران عن خارجة عن قرة عن ابن سيرين ورواه ابن جرير من حديث خارجة به)۔

امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سابقین ہر امت میں سے ہیں۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے عثمان بن ابی سودہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴾۔ پھر کہا: ان میں سے جو سب سے پہلے مسجد میں جاتا ہے اور جو سب سے پہلے اللہ کی راہ میں نکلتا ہے۔[3] یہ سب قول صحیح ہیں، کیوں کہ سابقین سے مراد جلدی کرنے والے ہیں بھلائی کے کاموں میں جیسا کہ ان کو امر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ﴾ [آل عمران: ۱۳۳] ”اور اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الحدید: ۲۱] ”(آؤ) دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے برابر ہے۔“

چنانچہ جس نے اس دنیا میں سبقت کی اور سبقت خیر کی طرف کی تو وہ آخرت میں کرامت کی طرف سبقت کرنے والوں میں سے ہوگا، کیوں کہ جزاء عمل کی جنس سے ہوتی ہے۔ ”وَكَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ“، یعنی جیسا تو کام کرے گا ویسا تجھے بدلہ ملے گا اور اسی لیے اللہ عزوجل نے یوں فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: فرشتوں نے عرض کی: یا رب! تو نے بنی آدم کے لیے دنیا ٹھہرائی، چنانچہ

[1] مسند أحمد (٦/٦٧) اس کی سند میں ”ابن لھیعہ“ ضعیف راوی ہے۔ ضعیف الجامع (١٠١)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٢٩، ٣٣٣٠) تفسير ابن كثير (٤/٣٦١) [3] تفسير الطبري (٢٣/٩٧، ٩٦)

وہ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، بیاہ کرتے ہیں، لہٰذا تو ہمارے لیے آخرت ٹھہرا تو فرمایا: میں نہ کروں گا، پھر انھوں نے تین بار تکرار کی تو فرمایا کہ میں نہ ٹھہراؤں گا اس کو جسے میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اس کی طرح جس سے میں نے کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔ پھر عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴾[1] (رواه ابن أبي حاتم) اس اثر کو امام عثمان بن سعید دارمی نے بھی اپنی کتاب "الرد على الجهمية" میں روایت کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ میں اس شخص کی صالح اولاد کو جسے میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اس کی طرح ہرگز نہیں ٹھہراؤں گا جس سے میں نے کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

"واقعة" قیامت کا ایک نام ہے "آزفة" وغیرہ کی طرح۔ یہ نام اس لیے رکھا کہ وہ ضرور ہونے والی ہے، یا اس کے قربِ وقوع کے سبب سے، یا ان شداید کی کثرت کی وجہ سے جو اس میں واقع ہوں گے یہ نام رکھا۔ کلمۂ ﴿ اِذَا ﴾ یا تو ظرفِ محض ہے اس میں شرط کے معنی نہیں ہیں، کلمۂ ﴿ لَيْسَ ﴾ اس میں عامل ہے اس انداز سے کہ اس میں نفی کے معنی ہیں، گویا یوں کہا گیا کہ اس کے وقوع کے سبب سے تکذیب منفی (نیست) ہوگی جبکہ وہ واقع ہوگی۔ یا اس میں عامل "اُذْكُرْ" مقدر ہے، یعنی واقعہ کے وقوع کا وقت ذکر کر۔ یا ﴿ اِذَا ﴾ شرطیہ ہے اور اس کا جواب مقدر ہے۔ "أَيْ: إِذَا وَقَعَتْ كَانَ كَيْتَ كَيْتَ" اور یہی جواب اس میں عامل ہے، یعنی جب وہ واقع ہوگی تو ایسا ایسا ہوگا۔ یا شرطیہ ہے اور اس میں وہ فعل عامل ہے جو اس سے متصل ہے۔

امام ابوحیان رحمہ اللہ نے یہی وجہ اختیار کی ہے[3] اور اس میں مکی رحمہ اللہ کا اتباع کیا ہے۔ مکی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں عامل ﴿ وَقَعَتِ ﴾ ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے ان کے سوا پانچ قول اور ذکر کیے ہیں۔ امام جرجانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ اِذَا ﴾ زائد ہے: "أَيْ: وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ" جس طرح کہ یہ فرمایا ہے: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ ﴾ وَ ﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ ﴾ یہ ویسی بات ہے جو کہی جاتی ہے کہ "قَدْ جَاءَ الصَّوْمُ أَيْ: دَنَا وَاقْتَرَبَ"، یعنی روزوں کے آنے سے مراد ان کا قریب ہونا ہے۔

﴿ لِوَقْعَتِهَا ﴾ میں حرفِ لام بہ معنی "في" ہے جس طرح ﴿ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴾[الفجر: ٢٤] "کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا۔" "أَيْ: فِيْ حَيَاتِيْ" اور ﴿ كَاذِبَةٌ ﴾ مثل "عَاقِبَةٌ" کے مصدر ہے بہ معنی "كذب"، یعنی وقوعِ قیامت کے وقت کا ذکر کر اس کے آنے اور ظاہر ہونے میں اصلاً کچھ کذب نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْوَاقِعَةُ ﴾ سے مراد صیحۂ قیامت ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ نفخۂ اخیرہ ہے، معنی یہ ہیں کہ جس

[1] تفسير ابن كثير (٣٦١/٤) [2] تفسير ابن كثير (٣٥٩/٤-٣٦٢) [3] البحر المحيط (٢٠٣/٨)

وقت قیامت کا صیحہ نازل ہوگا اور بعث کے وقت نفخۂ آخرہ میں واقع ہوگا تو اصلاً اس کے لیے وہاں تکذیب نہ ہوگی۔ یا ﴿ كَاذِبَةٌ ﴾ اسم فاعل کا صیغہ ہے "نفس" مقدر کی صفت ہے: "أَيْ: نَفْسٌ كَاذِبَةٌ"، یعنی وہاں کوئی نفس کاذب نہ ہو گا کہ جھوٹ بولے اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے امور اور قیامت کے واقع ہونے کو جھٹلائے جس کی اس نے خبر دی ہے، کیونکہ اس وقت تو ہر نفس مومن ہوگا صادق و مصدق ہوگا اور آج اکثر نفس جھوٹے اور جھٹلانے والے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی ہیں کہ کوئی شے قیامت کو رد نہ کرے گی۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کے وقوع کی تکذیب کرے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں ہے، اس کے لیے تکذیب، یعنی یہ لائق نہیں ہے کہ کوئی اس کی تکذیب کرے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے: "لَيْسَ لَهُ مَرَدٌّ يَرُدُّ"[2]

جمہور نے ﴿ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے بنا بر اضمارِ مبتداء "أَيْ: هِيَ خَافِضَةٌ رَافِعَةٌ" اور کسی نے (یعنی حسن اور عیسیٰ ثقفی رحمہما اللہ نے) بہ نصبِ ہر دو پڑھا ہے[3] بنا بر حال۔ اس جملے سے قیامت کی عظمت کو ثابت کرنا منظور ہے اور اس کے امر کو ہولناک کرنا مقصود ہے، کیوں کہ بڑے بڑے واقعات کی شان ایسی ہی ہوتی ہے کہ بلند کو پست اور پست کو بلند کر دیتے ہے۔ یا اس امر کا بیان ہے جو اس دن ہوگا کہ اشقیاء (بدبختوں) کو تو جہنم کے نچلے طبقات کی طرف لے جائیں گے اور سعداء (نیک بختوں) کو جنت میں درجات کی طرف بلند کریں گے اور ساری اشیاء کو زلزلہ ہوگا، اجرامِ فلکی اپنی قرار گاہ سے زائل کر دیے جائیں گے اس طرح سے کہ تاروں کو پراگندہ کر دیں گے اور آسمان کو ٹکڑے کر کے گرا دیں گے۔ ان کے سوا اور امور ہوں گے۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ جو قومیں دنیا میں بلند تھیں ان کو پست کر دے گی اور جو پست تھیں ان کو بلند کر دے گی۔ عرب لوگ خفض و رفع کا استعمال مکان و مکانت وعز و اہانت میں کرتے ہیں۔ قیامت کی طرف جو خفض و رفع کی نسبت کی تو یہ مجاز کے طور پر ہے۔ حقیقت میں خافض اور رافع تو اللہ پاک ہی ہے۔

"رج" بہ معنی تحریک ہے جب کوئی شخص کسی شے کو حرکت دیتا ہے تو محاورے میں کہتے ہیں: "رَجَّهُ يَرُجُّهُ رَجًّا" اور "رَجَّةً" بہ معنی اضطراب ہے۔ دریا وغیرہ جب مضطرب ہوتا ہے تو بولتے ہیں: "اِرْتَجَّ الْبَحْرُ" وغیرہ، یعنی جس وقت زمین کو سخت حرکت دی جائے گی۔ مفسرین نے کہا ہے کہ مضطرب ہوگی جس طرح کہ بچہ گہوارے میں مضطرب ہوتا ہے، حرکت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر جو کچھ ہے وہ سب منہدم ہو جائے گا اور ہر شے پہاڑ وغیرہ ٹوٹ جائیں گے۔ "بَسَّ" بہ معنی "فَتَّ" ہے۔ "فَتَّ" ریزہ ریزہ کرنے کو کہتے ہیں۔ جب کوئی کسی شے کو پارہ پارہ کرے، یہاں تک کہ وہ ریزہ ریزہ ہو جائے تو کہیں گے: "بَسَّ الشَّيْءَ"۔ ستو کو جب گھی یا روغن میں گھولیں تو بولیں گے: "بَسَّ السَّوِيْقَ"۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "كُسِرَتْ كَسْرًا"، یعنی پہاڑ خوب توڑے جائیں گے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٩٥/١٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٩/١٠) [3] تفسير القرطبي (١٩٦/١٧)

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی جڑ سے اکھاڑے جائیں گے۔ مجاہد رحمہ اللہ کا ایک لفظ یہ ہے کہ "بُسَّتْ كَمَا يُبَسُّ الدَّقِيقُ بِالسَّمَنِ بِالزَّيْتِ" یعنی وہ گھولے جائیں گے جیسے آٹا گھی میں یا روغن میں گھولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خلط کیے جائیں گے تو گھولے ہوئے آٹے کی طرح ہو جائیں گے۔ امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بُسَّ" بہ معنی "سوق" ہے، اس بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ پہاڑ اچھی طرح ہانکے جائیں گے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "بُسَّ الْإِبِلُ وَابْتَسَّهَا لُغَتَانِ إِذَا زَجَرَهَا"۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هُدَّتْ هَدًّا"۔[1] "هَدَّ" بہ معنی شکستن ہے، یعنی جب وہ اچھی طرح سے توڑے جائیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ پھسلتی ریت کی طرح ہو جائیں گے اس کے بعد کہ وہ بلند تھے۔ کلمۂ ﴿ إِذَا ﴾ ﴿ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی زمین کو ہلانے اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے کے وقت قیامت پست کرے گی اور بلند کرے گی، کیونکہ اس وقت جو کچھ پست ہوگا وہ بلند ہو جائے گا اور جو کچھ بلند ہوگا وہ پست ہو جائے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ﴿ إِذَا ﴾ پہلے ﴿ إِذَا ﴾ سے بدل ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے تو اب یہ معنی ہوں گے کہ واقعہ کا وقوع وہ یہی زمین کا "رج" ہے اور جبال کا "بس"۔

﴿ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنۢبَثًّا ﴾ یعنی پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد بنفسہ ایک متفرق اور منتشر غبار ہو جائیں گے اس کے بغیر کہ اس کو ہوا کی حاجت ہو جو اسے متفرق کرے۔ تو وہ اس شے کی طرح ہے جو آفتاب کی شعاع میں دکھائی دیتی ہے جب وہ کسی سوراخ میں داخل ہو۔ اس کے بارے میں کچھ اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ اس کا پورا بیان سورۃ الفرقان کی آیت ﴿ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٢٣] کے تحت گزر چکا ہے۔ جمہور نے ﴿ مُّنۢبَثًّا ﴾ بہ تائے مثلثہ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام مسروق، نخعی اور ابو حیوہ رحمہم اللہ نے) بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے، بہ معنی "منقطعا" جو عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: "بَتَّهُ اللّٰهُ أَيْ: قَطَعَهُ"[2]

پھر اللہ پاک نے لوگوں کا احوال اور اختلاف ذکر کیا تو فرمایا: ﴿ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴾ (﴿ رُجَّتِ ﴾ پر معطوف ہے) یہ خطاب بطور تغلیب کے امتِ حاضرہ اور امم سابقہ سب کو ہے، یا فقط حاضرہ کو ہے، یعنی لوگو! تم اس دن تین صنف یعنی قسم کے ہو گے: دو قسم تو جنت میں جائیں گے اور ایک قسم آگ میں۔ کسی نے کہا ہے کہ تم کو تین قسم پر تقسیم کیا گیا ہے، اس شے کے سبب سے جو دنیا میں تمھاری جبلتوں اور طبیعتوں کے اندر تھی، ہر صنف اس شے کی ہم شکل ہوتی ہے جس سے وہ ہے۔ جیسے: "زوج" "زوجة" کو مشاکل ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر صنف جو ہوتی ہے یا ذکر کی جاتی ہے دوسری صنف کے ساتھ تو وہ زوج ہے۔

پھر اللہ پاک نے تین قسموں کی تفسیر ذکر فرمائی۔ ﴿ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴾ مبتداء ہے اس کی خبر ﴿ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴾ ہے، یا مبتداء کا بلفظہ مکرر لانا ضمیرِ رابطہ سے مغنی ہے، جیسا کہ ان دو آیتوں میں ہے: ﴿ اَلْحَاۤقَّةُ ۝ مَا

[1] فتح القدير (١٩٦/٥) [2] تفسير القرطبي (١٩٧/١٧)

﴿ اَلْحَآقَّةُ ﴾ [الحاقة: ١۔ ٢] اور قولہ: ﴿ اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ﴾ ایسی بات تعظیم وتفخیم کی جگہ کے سوا اور کہیں جائز نہیں ہے۔ ﴿ الْمَيْمَنَةِ ﴾ بہ معنی ناحیۂ یمین، یعنی دائیں طرف ہے مراد اصحاب الیمین ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اپنے نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں لیں گے۔ یا وہ ہیں جن کو دائیں طرف سے جنت کی طرف لے جائیں گے۔

﴿ وَ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴾ [الواقعة: ٤١] اس کا بیان ویسا ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو بائیں طرف سے آگ میں لے جائیں گے، یا اپنے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں لیں گے۔ مراد سامع کو فریقین کی عظمت اور قباحت پر تعجب دلانا ہے، یعنی سیدھے ہاتھ والے اپنے حال اور صفت اور سعادت میں کس طرح ہیں اور بائیں ہاتھ والے اپنے حال اور صفت اور بدبختی میں کس طرح ہیں! گویا یوں کہا گیا کہ اصحابِ یمین تو انتہا کی سعادت وحسنِ حال میں ہیں اور اصحاب الشمال انتہا درجے کی بدبختی اور بد حالی میں ہیں، پس یہ سوالیہ انداز دونوں جگہ تعجب دلانے کے لیے ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصحابِ میمنہ وہ ہیں جو آدم علیہ السلام کی دائیں جانب میں تھے، جبکہ ذریت ان کی پشت سے نکالی گئی اور اصحابِ مشئمہ وہ ہیں جو ان کی بائیں جانب میں تھے۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴾ وہ ہیں جو آدم علیہ السلام کی شقِ راست (دائیں طرف) سے لیے گئے اور ﴿ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴾ وہ ہیں جو آدم علیہ السلام کی بائیں جانب سے لیے گئے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴾ اصحاب الحسنات ہیں اور ﴿ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴾ اہلِ سیئات ہیں۔ امام حسن اور ربیع رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴾ یہ لوگ اپنے نفوس پر اعمالِ حسنہ کے سبب سے میامین ہیں (یعنی مبارک ہیں)۔ اور ﴿ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴾ یہ لوگ اپنے نفوس پر اپنے اعمالِ قبیحہ کے سبب مشائیم ہیں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴾ "أَصْحَابُ التَّقَدُّمِ" ہیں اور ﴿ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴾ "أَصْحَابُ التَّأَخُّرِ" ہیں۔ عرب لوگ یوں بولتے ہیں: "اِجْعَلْنِيْ فِيْ يَمِيْنِكَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ فِيْ شِمَالِكَ"، یعنی تو مجھے متقدمین میں سے کر اور مجھے متاخرین میں سے مت کر (اسی باب میں ابن الدمینہ کا قول ہے:

"أبيني أفي يمنى يَدَيْك جَعَلْتِنِيْ فأفرح أَمْ صيرتني في شمالك"[1])

کسی نے کہا ہے کہ مراد اصحابِ منزلت سنیہ رفیعہ ہیں اور اصحابِ منزلت دنیہ خسیسہ ہیں، یہ اس سے ماخوذ ہے کہ عرب لوگ میامن کو مبارک سمجھتے ہیں اور شمائل کو شوم اور نا مبارک خیال کرتے ہیں۔

پھر اللہ پاک نے تیسری قسم کا ذکر فرمایا: ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴾ اول مبتداء ہے اور دوسرا خبر، اس میں تکرار عظمت اور بڑائی کے لیے ہے، جیسا کہ پہلے کی دو قسموں میں گزر چکی ہے جس طرح کہ تم کہتے ہو: "أَنْتَ أَنْتَ وَزَيْدٌ زَيْدٌ"۔ اس میں دو تاویلیں ہیں: ایک تو اس معنی میں ہے کہ سابقین وہی ہیں جن کا حال سبقت کے ساتھ مشہور

[1] تفسير القرطبي (١٧/١٩٨، ١٩٩) فتح القدير (٥/١٩٧)

ہوا ہے اور ان کی خوبیاں معروف ہیں۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ دونوں سبق کا متعلق مختلف ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ ایمان کی طرف سبقت کرنے والے جنت کی طرف سبقت کرنے والے ہیں، پہلی تاویل زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ اس میں عظمت اور بڑائی پر دلالت ہے۔

امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ ہر امت میں سے حق کے ظاہر ہونے کے وقت ایمان کی طرف بغیر توقف اور سستی کے سبقت کرنے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ہیں جنھوں نے فضائل اور کمالات کے جمع کرنے میں سبقت کی۔ کسی نے کہا ہے کہ پانچوں نمازوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مسارعت کرنے والے ہیں خیرات میں، یعنی نیکیوں میں جلدی کرنے والے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: وہ ہیں جنھوں نے جہاد کی طرف سبقت کی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ توبہ کی طرف اور نیک اعمال کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جو اللہ کی اطاعت کی طرف سبقت کرنے والے ہیں، وہی اللہ کی رحمت کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول پہلے گزر چکا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ آیت آلِ فرعون کے مومن حزقیل اور حبیب نجار کے حق میں نازل ہوئی جس کا ذکر سورت یسٓ میں کیا گیا ہے اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حق میں اور ان میں کا ہر مرد سابقِ امت ہے اور سبقت کرنے کے لحاظ سے علی رضی اللہ عنہ ان سے افضل ہیں۔[2] کہا ہے کہ یہ تیسری قسم باوجود اس کے کہ پہلے کی دو قسموں میں سے شرف اور فضیلت میں اسبق واقدم (سب سے زیادہ سابق اور آگے) ہے، اس کو آخر میں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے سے بعد والوں کے قریب ہو جائے، یعنی ان سے مل جائے۔ یعنی قولہ تعالیٰ: ﴿ أُولَٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾ چنانچہ یہ اشارہ انہیں کی طرف ہے یعنی وہی سابقین اللہ تعالیٰ کے اجرِ جزیل اور کرامتِ عظیم کی طرف قریب کیے گئے ہیں، یا یہ وہ ہیں جن کے درجے عرشِ معلیٰ کے قریب کیے گئے اور ان کے مراتب بلند کیے گئے اور ان کے نفوسِ ذکیہ نے مقدس خیالات کی طرف ترقی کی۔ مشار الیہ ابھی قریب گزرا ہے۔ اور ﴿ أُولَٰٓئِكَ ﴾ فرمایا جس میں بُعد کے معنی ہیں۔ اس سے یہ بات بتانا منظور ہے کہ فضیلت میں ان کی منزلت ورتبہ بعید ہے۔

﴿ أُولَٰٓئِكَ ﴾ کا محل رفع ہے بنا بر ابتداء اور اس کی خبر اس کا ما بعد ہے۔ اس جملے کی ترکیب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس سب سے یہ وجہ زیادہ ظاہر اور مشہور ہے اور "تنزیل" کی جزالت (بزرگی، عظمت) اسی کی مقتضی ہے۔ ﴿ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾ دوسری خبر ہے یا حال ہے اس ضمیر سے جو مقربون میں ہے، یا اس سے متعلق ہے۔ یعنی وہ جناتِ نعیم میں اللہ کی رحمت کی طرف قریب ہوئے۔ جمہور نے ﴿ جَنّٰتِ ﴾ بہ جمع پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی طلحہ بن مصرف نے)

---

[1] فتح القدير (١٩٧/٥، ١٩٨) [2] الدر المنثور (٧/٨)

"جنة" بہ صیغۂ واحد پڑھا ہے۔ ﴿جَنّٰتِ﴾ کی اضافت جو نعیم کی طرف کی تو یہ مکان کی اس شے کی طرف اضافت ہے جو اس میں ہوتی ہے، جیسے کہتے ہیں: "دار الضیافة ودار الدعوة ودار العدل"، پھر آخری قسم کی تفصیل کا ذکر فرمایا:[1]

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿13﴾ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿14﴾ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿15﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿16﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿17﴾ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿18﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴿19﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿20﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿21﴾ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿22﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿23﴾ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿24﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿25﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿26﴾

بہت بڑی جماعت پہلوں میں سے ⑬ اور تھوڑے سے پچھلوں میں سے ⑭ وہ زر و جواہر سے جڑے تختوں پر (بیٹھے) ہوں گے ⑮ ان پر آمنے سامنے تکیے لگائے ہوئے (بیٹھنے والے) ⑯ ان کے پاس سدا لڑکے ہی رہنے والے لڑکے آتے جاتے ہوں گے ⑰ ساغر اور صراحیاں اور شراب کے جاری چشمے سے چھلکتے جام لیے ہوئے ⑱ وہ اس سے نہ سر درد میں مبتلا ہوں گے اور نہ مدہوش ⑲ اور ایسے پھل (لیے ہوئے) جو وہ پسند کریں گے ⑳ اور پرندوں کا گوشت جو وہ چاہیں گے ㉑ اور (ان کے لیے) غزال چشم حوریں (ہوں گی) ㉒ جیسے غلاف میں لپٹے ہوئے موتی ㉓ جزا ان عملوں کی جو وہ کرتے رہے ㉔ اور وہ اس (جنت) میں نہ لغو سنیں گے اور نہ کوئی گناہ کی بات ㉕ (ہاں!) مگر ایک بول ہے سلام ہے سلام ہے ㉖

سابقین مقربین کی جزاء:

اگلے لوگ پہلی امتوں کو کہا اور پچھلے لوگ اس امت کو۔ یا اگلے پچھلے اسی امت کے، یعنی اعلیٰ درجے کے لوگ پہلے بہت ہو چکے ہیں پچھلوں میں کم ہوتے ہیں۔ یعنی حوریں صدف میں چھپے ہوئے موتی کی مانند گرد پھریں۔ انتہی[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سابقین مقربین کے متعلق خبر دیتا ہے کہ وہ پہلوں میں سے ایک جماعت ہیں اور پچھلوں میں تھوڑے ہیں۔ اولین و آخرین سے جو مراد ہیں اس کے بارے میں اختلاف ہے۔

---

[1] فتح البیان (۱۳/۳۵۵۔۳۶۰)

کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْاَوَّلِیْنَ ﴾ سے مراد گزشتہ امتیں ہیں اور ﴿ اَلْاٰخِرِیْنَ ﴾ سے یہ امت مراد ہے۔ امام مجاہد اور حسن بصری رحمہ اللہ سے یہ ایک روایت ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ان سے اس روایت کو لیا ہے۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا اختیار کردہ ہے۔[1] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک سے اس کا استیناس کیا ہے کہ « نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ »[2] یعنی ہم پچھلے ہیں اور قیامت کے دن سبقت کرنے والے ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کے سوا اور کوئی قول نقل نہیں کیا اور نہ کسی کی طرف اس کی نسبت کی۔ من جملہ اس کے جس سے اس قول کے لیے استیناس کیا جاتا ہے یہ حدیث ہے جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿13﴾ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ﴾ نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میں البتہ امید کرتا ہوں کہ تم اہلِ جنت کا چوتھائی ہو بلکہ تم نصف اہلِ جنت ہو، یا شطر اہلِ جنت ہو اور تم دوسرے نصف کی ان سے باہم تقسیم کرو گے۔[3] (رواه أبو محمد بن أبي حاتم، ورواه الإمام أحمد عن أسود بن عامر عن شريك عن محمد بياع الملاء عن أبيه عن أبي هريرة رضي الله عنه فذكره وقد روي من حديث جابر نحو هذا كذا في ابن كثير)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب ﴿ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴾ نازل ہوئی تو اس میں ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿39﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ﴾ نازل ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! آ اور وہ شے سن جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے۔ ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿39﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ﴾ خبردار! اور بے شک آدم سے مجھ تک ایک ثلہ ہے اور میری امت ایک ثلہ اور یہ کہ ہم کامل کریں گے ہماری ثلہ کو یہاں تک کہ ہم استعانت کریں گے سودان کے اونٹوں کے چرواہوں کے ساتھ من جملہ ان کے جنھوں نے اس بات کی گواہی دی کہ نہیں کوئی معبود مگر صرف اللہ، نہیں ہے کوئی شریک اس کا۔[4] (رواه الحافظ ابن عساكر، من طريق هشام بن عمارة حدثنا عبد ربه بن صالح عن عروة بن رويم عن جابر بن عبد الله عن النبي صلى الله عليه وسلم... الخ هكذا أورده ابن عساكر في ترجمة عروة بن رويم إسنادا ومتنا ولكن في إسناده نظر وقد وردت طرق كثيرة متعددة بقوله صلى الله عليه وسلم "إني لأرجو أن تكونوا ربع أهل الجنة"[5] الحديث بتمامه وهو مفرد في صفة الجنة ولله الحمد والمنة.[6] كذا في ابن كثير)

یہ قول جو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہاں اختیار کیا ہے، اس میں نظر ہے بلکہ یہ ایک ضعیف قول ہے، کیوں کہ یہ امت تو بہ نصِ قرآن بہترین امت ہے تو یہ بعید ہے کہ اس کے علاوہ دوسری اُمتوں میں مقربین زیادہ ہوں۔ چنانچہ اس مقام میں راجح وہی قولِ ثانی ہے کہ ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ﴾ سے مراد یہ ہو کہ ﴿ ثُلَّةٌ ﴾ اس امت کے صدر (ابتداء) سے اور قلیل

---

[1] تفسير الطبري (٩٨/٢٣) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥٥)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٣٠/١٠) مسند أحمد (٣٩١/٢) تفسير ابن كثير (٣٦٢/٤) اس کی سند میں محمد اور اس کے والد مجہول ہیں۔

[4] تاريخ دمشق (٢٢٩/٤٠) اس کی سند میں انقطاع ہے "عمرو بن رویم" کا سماع سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٢) [6] تفسير ابن كثير (٣٦٢/٤)

اس امت کے پچھلوں سے۔ عبداللہ بن بکر مزنی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حسن رحمہ اللہ کو سنا کہ وہ اس آیت پر آئے ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴾ تو کہا کہ سابقین تو مقرر گزر گئے، لیکن اے اللہ! تو ہم کو اصحابِ یمین سے کر۔ (أخرجه ابن أبي حاتم)

پھر بہ سندِ خود سری بن یحییٰ سے روایت کیا ہے کہ حسن رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت پڑھی اور کہا کہ ﴿ ثُلَّةٌ ﴾ ان میں سے ہیں جو اس امت میں سے گزر گئے، پھر محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اس امت میں ہی ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ کہا: وہ کہتے تھے (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم) یا امید رکھتے تھے کہ وہ سب اس امت سے ہوں، پس یہ قول امام حسن اور ابن سیرین رحمہما اللہ کا ہے کہ جمیع اس امت سے ہیں۔[1] (یعنی ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾) اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ ہر امت کا اول اس کے آخر سے بہتر ہے۔ تو اب احتمال ہے کہ یہ آیت ہر امت کے حسبِ حال ساری امتوں کو عام ہو، اور اسی لیے صحاح وغیرہ میں ثابت ہوا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ زمانوں میں سے بہترین میرا زمانہ ہے، پھر وہ جو ان سے متصل ہے، پھر وہ جو ان سے متصل ہے۔[2] (الحديث بتمامه)

اب رہی وہ حدیث جو امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ میری امت کی مثل باران کی مثل ہے، نہیں جانا جاتا کہ اس کا اول بہتر ہے یا اس کا آخر۔[3] چنانچہ یہ حدیث اس کے بعد کہ اس کو صحیح ثابت کریں اس پر محمول ہوگی کہ جس طرح دین امت کے پہلے لوگوں کا اس بات میں محتاج ہے کہ وہ اسے ان لوگوں تک پہنچائیں جو اُن کے بعد ہیں، اسی طرح وہ ان لوگوں کا محتاج ہے جو آخر میں اس پر قائم ہوں اس بات میں کہ لوگوں کو سنت پر جمائیں اور اس کی روایت کریں اور اسے ظاہر کریں اور فضیلت متقدم کے لیے ہے اور اسی طرح کھیتی بارانِ اول کی محتاج ہے اور بارانِ ثانی کی محتاج ہے، لیکن بڑا عہدہ اور ذمہ تو بارانِ اول پر ہے اور کھیتی اس کی زیادہ محتاج ہے، کیوں کہ اگر وہ نہ ہو تو زمین میں کھیتی نہ اُگتی اور نہ اس کی بنیاد اس میں جمتی، اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر غالب رہنے والا رہے گا، نہ ضرر دے گا ان کو جو ان کا خذلان کرے گا، یعنی بے مدد چھوڑے گا اور نہ وہ جو ان کا مخالف ہوگا قیامت قائم ہونے تک۔ ایک روایت میں یوں ہے: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا امر آجائے اور وہ اسی طرح ہوں۔[4]

غرض یہ ہے کہ یہ امت باقی اُمتوں سے شریف تر ہے اور مقربین اس میں اکثر ہیں، دوسری امتوں کے مقابلے میں رتبے میں برتر ہیں اپنے دین کے شرف اور اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے سبب سے۔ اسی لیے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی کہ اس امت میں سے ستر ہزار بغیر حساب کے جنت

---

[1] تفسير ابن كثير (٣٦٢/٤، ٣٦٣) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٣)

[3] مسند أحمد (٣١٩/٤) صحيح الجامع (٥٨٥٤) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠)

میں داخل ہوں گے اور ایک روایت میں ہے کہ ہر ہزار کے ساتھ مزید ستر ہزار۔[1] اور ایک روایت میں یوں ہے کہ ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار۔[2] امام ابو مالک رحمہ اللہ مرفوعاً کہتے ہیں: خبردار! قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! البتہ تم میں سے قیامت کے دن ایک زمرہ مثل سیاہ رات کے مبعوث ہوگا، وہ سب زمین کا احاطہ کر لیں گے، فرشتے کہیں گے کہ البتہ وہ شے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئی، وہ ان سے بہت زیادہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ آئی۔[3]

(أخرجه الحافظ أبو القاسم الطبراني)

بہتر یہ ہے کہ یہاں وہ حدیث نقل کی جائے جو حافظ ابو بکر بیہقی رحمہ اللہ نے "دلائل النبوة" میں بہ سندِ خود ابن زمل جہنی سے روایت کی ہے (یعنی ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں) کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت صبح کی نماز پڑھتے تو فرماتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں پاؤں کو موڑے ہوتے: « سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا » ستر بار۔ پھر فرماتے: « سَبْعِيْنَ بِسَبْعِمَائَةٍ لَا خَيْرَ لِمَنْ كَانَتْ ذُنُوْبُهُ فِيْ يَوْمٍ وَّاحِدٍ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِمَائَةٍ »

پھر اس کو دو بار فرماتے، یعنی ایک بار کہنے سے دس گناہ مٹے اور دس بار سے سو گناہ مٹے تو ستر بار سے سات سو گناہ مٹے۔ نہیں ہے کوئی خیر اس شخص کے لیے جس کے گناہ ایک دن میں سات سو سے زیادہ ہوں۔ ("سبحان" منصوب ہے بنا بر مصدر "أَيُ: انزه الله تنزيها عما لا يليق به متلبسا بحمدي له أَيُ: من توفيقه للتسبيح أو سبحته وأتلبس فيه بحمدي" اول کی بنا پر واؤ حالیہ ہے اور ثانی کی بنا پر عطف کا ہے تسبیح صفاتِ جلالیہ کی طرف اشارہ ہے اور حمد صفاتِ وجودیہ اکرامیہ کی طرف اشارہ ہے۔ ایک قول یہ ہے: "أسبح تسبيحا وبحمده سبحت" یعنی حرفِ باء محذوف سے متعلق ہے۔ کسی نے کہا: واؤ زائد ہے۔ "أَيُ: سبحت بحمده" یعنی پاکی بولتا ہوں اللہ کی پاکی ان امور سے جو اس کی بارگاہِ عالی جاہ کے لائق نہیں ہیں اس کی حمد کو ساتھ لیے ہوئے، اس پر کہ اس نے پاکی بولنے کی توفیق دی اور مغفرت مانگتا ہوں اللہ سے بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے)۔

پھر اپنا چہرۂ مبارک لوگوں کے سامنے کرتے اور آپ کو خواب اچھا لگتا تھا۔ پھر فرماتے: کیا تم میں سے کسی نے کچھ دیکھا ہے۔ ابن زمل نے کہا: میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں نے، یعنی میں نے خواب دیکھا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو خیر سے ملے اور شر سے بچایا جائے اور خیر ہو ہمارے لیے اور شر ہو، ہمارے دشمنوں پر حمد ہے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٨٦) صحيح الجامع (٧١١١)

[2] مسند أحمد (٦/١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٤٨٤)

[3] المعجم الكبير (٢٩٧/٣) اس کی سند میں انقطاع ہے "شریح" کا سیدنا ابو مالک رضی اللہ عنہ سے اور محمد بن اسماعیل" کا اپنے والد سے سماع ثابت نہیں ہے۔

اللہ کی جو سارے جہانوں کا رب ہے، تو اپنا خواب بیان کر۔ چنانچہ میں نے کہا: میں نے سارے لوگوں کو ایک فراخ نرم راہ پر دیکھا اور لوگ شاہراہ پر جانے والے ہیں۔ پھر اس اثناء میں کہ وہ اسی طرح جا رہے تھے کہ اچانک مشرف ہوا وہ راستہ ایک چراگاہ پر (''إشفا'' بہ معنی اشراف ہے، یعنی اطلاع پانا کسی شے پر اور اوپر سے نیچے دیکھنا، یعنی اس راستے نے چراگاہ پر جھانکا، مطلب یہ ہے کہ وہ سامنے آ گئے) میری آنکھ نے اس جیسی سیراب وسبز و تازہ جگہ نہیں دیکھی، اس کی سبزی اور تازگی خوب لہرا رہی ہے، اس کا پانی ٹپک رہا ہے اور اس میں قسم قسم کی گھاس ہے۔ (ابن زمل نے کہا) اور گویا میں پہلے گروہ کے ساتھ ہوں، جبکہ انھوں نے اس چراگاہ پر جھانکا تو تعجب سے تکبیر کہی، چنانچہ انھوں نے اپنی سواریوں کو اس راستے پر لازم کیا، اس چراگاہ کو نہ دائیں جانب سے کم کیا نہ بائیں جانب سے، مطلب یہ ہے کہ سیدھے شاہراہ پر چلے گئے، اِدھر اُدھر مائل نہ ہوئے (ابن زمل نے کہا) گویا میں ان کی طرف نظر کر رہا ہوں اس حال میں کہ وہ جا رہے ہیں۔

پھر دوسرا گروہ آیا اور یہ پہلے گروہ سے اکثر تھے کئی گناہ، پھر جب انھوں نے اس چراگاہ کی طرف جھانکا تو تکبیر کہی اور اپنی سواریوں کو اس راہ پر لازم کیا، چنانچہ ان میں سے مرتع ہے اور اُن میں سے لینے والا ہے ضغث کا، یعنی بعض نے تو اپنی سواریوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور بعض نے مٹھی بھر ملا جلا گھاس لے لیا، یا اس کا گٹھا لیا اور گزر گئے، پھر ایک اور جماعت آئی کثیر لوگوں کی، جب انھوں نے اس چراگاہ کی طرف جھانکا تو تکبیر کہی اور کہا یہ بہتر منزل ہے۔ گویا میں ان کی طرف نظر کر رہا ہوں کہ وہ دائیں بائیں طرف مائل ہو رہے ہیں، یعنی اس چراگاہ کے دونوں طرف چرانے کے لیے جھک پڑے۔

پھر جب میں نے یہ دیکھا کہ لوگ اِدھر اُدھر جھک رہے ہیں تو میں نے وہ راستہ لازم پکڑا، یہاں تک کہ میں اس چراگاہ پر آ گیا، چنانچہ کیا دیکھتا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں یا رسول اللہ! آپ ایک منبر پر ہیں جس میں سات درجے ہیں اور آپ ان میں سے اوپر کے درجے پر ہیں اور ناگاہ آپ کی داہنی طرف ایک مرد ہے گندم گوں، درشت انگلیوں والا، لمبی ناک اور پتلے نتھنے والا اور ناک کا درمیانی حصہ بلند۔ جس وقت وہ بات کرتا ہے تو لوگ سنتے ہیں، چنانچہ وہ مردوں پر طول میں بلند ہوتا ہے، یعنی سب سے زیادہ اونچا ہے۔ اور ناگاہ آپ کی بائیں طرف ایک مرد ہے بھرے ہوئے بدن کا میانہ قد جس کے چہرے پر بہت خال (تل) ہیں، گویا اس کے بال سیاہ کیے گئے ہیں پانی کے ساتھ (اس لیے کہ بال جب پریشان ہوتے ہیں تو غبار آلودہ ہو جاتے ہیں ان کی سیاہی گہری نہیں رہتی، پھر جب پانی سے دھوئے جاتے ہیں تو ان کی سیاہی ظاہر ہو جاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ سر کے بال خوب سیاہ چمکتے ہوئے تھے) جس وقت وہ بات کرتا ہے تو تم اس کے سننے کے لیے اس کے اکرام کے لیے اپنے کان جھکاتے ہو اور ناگاہ اس شخص کے

آگے ایک بوڑھا مرد ہے وہ سب لوگوں سے بڑھ کر شکل وصورت میں آپ کے مشابہ ہے۔ تم سب اس کا قصد کرتے ہو، اس کا ارادہ کرتے ہو اور ناگاہ اس شخص کے آگے ایک بڑی عمر کی کمزور سی اونٹنی ہے اور ناگاہ یا رسول اللہ! آپ اس کو برانگیختہ کر رہے ہیں۔ راوی نے کہا: پھر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ گھڑی بھر کے لیے متغیر ہو گیا، پھر یہ حال آپ ﷺ سے دور ہو گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لیکن وہ جو تو نے دیکھا طریق رحب سہل لاحب (یعنی فراخ نرم راہ جو برابر چلی جاتی ہے منقطع نہیں ہوتی) تو یہ وہ ہدایت ہے جس پر میں نے تم کو آمادہ کیا ہے اور تم اس پر ہو اور وہ چراگاہ جو تم نے دیکھی وہ دنیا ہے اور اس کی گزران کی سبزی و تازگی ہے۔ میں اور میرے اصحاب چل دیے، ہم کسی شے کے ساتھ اس سے متعلق نہ ہوئے اور نہ وہ ہم سے متعلق ہوئی اور نہ ہم نے اس کا ارادہ کیا اور نہ اس نے ہمارا ارادہ کیا، پھر دوسرا گروہ آیا اور وہ ہم سے کئی گنا زیادہ تھے، چنانچہ ان میں سے بعض چرانے والے ہیں اور بعض گٹھے لینے والے اور انھوں نے اس پر نجات پائی۔

پھر لوگوں کی کثیر جماعت آئی تو وہ اس چراگاہ پر جھکی اس کے دائیں اور بائیں طرف، پس ”إنا للّٰه وإنا إليه راجعون“ اور تو جو ہے سو چلا نیک راہ پر، پھر تو ہمیشہ اس پر رہے گا، یہاں تک کہ مجھ سے ملے گا اور وہ منبر جو تو نے دیکھا جس میں سات درجے ہیں اور میں اس کے اوپر کے درجے میں ہوں سو دنیا سات ہزار برس ہے، میں اس کے آخر ہزار میں ہوں اور وہ مرد جو تو نے میری دائیں طرف دیکھا گندم گوں درشت انگلیوں والا تو وہ موسیٰ علیہ السلام ہیں جس وقت وہ بات کرتے ہیں تو مردوں پر بلند ہوتے ہیں، اللہ کے ان کے ساتھ کلام کرنے کی فضیلت کی وجہ سے اور وہ جو تو نے میری بائیں طرف دیکھا پُر بدن میانہ قد جس کے چہرے پر بہت سے تل ہیں گویا اس کے بال پانی سے سیاہ کیے گئے تو وہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہیں، ہم ان کا اکرام کرتے ہیں اللہ کے ان کو اکرام کرنے کے سبب سے اور وہ بوڑھا مرد جو تو نے دیکھا کہ سب سے زیادہ میرے ساتھ مشابہ ہے پیدائش میں اور چہرے میں تو وہ ہمارے باپ ابراہیم علیہ السلام ہیں، ہم سب ان کا قصد کرتے ہیں اور اُن کی پیروی کرتے ہیں اور وہ اونٹنی جو تو نے دیکھی اور مجھے دیکھا کہ میں اسے برانگیختہ کر رہا ہوں تو وہ قیامت ہے، وہ ہم پر قائم ہو گی میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور نہ کوئی اُمت میری امت کے بعد ہے۔ راوی نے کہا، پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے خواب کا کسی سے سوال نہیں کیا مگر یہ کہ کوئی شخص آتا تو تبرع و تطوع کر کے، یعنی خود بہ خود آپ ﷺ سے اس کو بیان کرتا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”أَيْ: مَرْمُوْلَةٌ بِالذَّهَبِ“، یعنی سابقین لوگ جنت میں ایسے تختوں پر ہیں جو سونے سے بنے ہوئے ہیں۔ امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، زید بن اسلم،

[1] دلائل النبوة للبيهقي (٣٦/٧۔٣٨) اس کی سند میں ”سلیمان بن عطاء“ سخت ضعیف اور ”مسلمہ اور ابومشجعہ“ مجہول راوی ہیں۔

قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنے ہوئے سونے اور موتیوں سے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مُشَبَّكَةٌ بِالدُّرِّ وَالْيَاقُوتِ"، یعنی جال بنائے ہوئے موتیوں اور یاقوت سے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: اسی معنی سے اونٹنی کی تنگ کا نام وضین رکھا جاتا ہے جو اس کے پیٹ کے نیچے ہوتا ہے، یعنی اس لیے کہ وہ بنی ہوئی نوار ہوتی ہے۔ "وضین" بروزن فعیل بہ معنی مفعول ہے،[1] کیوں کہ وہ مضفور ہوتا ہے، یعنی بنا ہوا۔ اسی طرح جنت میں تخت ہیں سونے اور موتیوں سے بنے ہوئے۔

﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴾ یعنی ان تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے اس حال میں بیٹھے ہیں کہ بعض کے چہرے بعض کی طرف ہیں، کوئی کسی کے پیچھے نہیں ہے۔ ﴿ مُخَلَّدُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ لڑکے ایک صفت پر ہمیشہ رکھے گئے ہیں، نہ اس سے بڑے ہوں گے نہ بوڑھے ہوں گے نہ حلیے تبدیل ہوں گے۔ ﴿ بِاَكْوَابٍ ﴾ وہ کوزے ہیں جن کی نہ خراطیم ہیں نہ "آذان" (ان کی نہ ٹوٹیاں ہیں نہ دستی کڑے، مراد آبخورے ہیں)۔ ﴿ اَبَارِيْقَ ﴾ وہ جو دونوں وصفوں کے حامل ہیں (یعنی جن کی ٹوٹیاں ہیں اور کڑے بھی ہیں، اس لیے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تہتیان ترجمہ فرمایا ہے)۔ اور "کؤس" ہنایات ہیں (اصل میں اسی طرح ہے۔ واللّٰه أعلم۔ یہ کیا لفظ ہے "کؤس"، تو "کأس" کی جمع ہے اور "کأس"، شراب کے بھرے ہوئے پیالے کو کہتے ہیں)۔ یہ سب شراب کے جاری چشمہ کے ظروف ہیں، ان ظروف سے نہیں ہیں جو منقطع اور خالی ہو جائیں، بلکہ ظاہر بہتے چشموں سے ہیں۔

﴿ لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴾ یعنی اس شراب سے ان کے سر دکھیں گے اور نہ ان کی عقلیں جائیں گی، بلکہ وہ ثابت رہیں گے باوجود اس لذت اور راحت کے جو ان کو حاصل ہوگی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ شراب میں چار خاصیتیں ہیں: نشہ، دردِ سر، قے اور پیشاب۔ اللہ پاک نے جنت کی شراب کا ذکر کیا اور ان خصال سے اس کو پاک فرمایا۔ امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، عطیہ، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس میں ان کو دردِ سر نہیں ہوگا۔ ﴿ وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ ان کی عقلوں کو نہ لے جائے گی۔[2]

﴿ وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴾ یعنی وہ لڑکے ان کے پاس وہ میوے لیے پھریں گے جن کو وہ اختیار اور پسند کریں گے، ان میں سے چن لیں گے۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ ﴿ فَاكِهَةٍ ﴾ کو برصفتِ تخیر کھانا جائز ہے، (مثلاً: میوے کا طباق چند آدمیوں کے سامنے رکھا ہے تو ہر شخص کے لیے جائز ہے کہ جو اسے پسند ہو اس کو کھائے، گو کسی اور کے آگے ہو، اس میں وہ شرط نہیں ہے کہ اپنے ہی آگے سے کھائے۔ یہ شرط ایک قسم کے کھانے میں ہے۔)

اس میں عکراش بن ذویب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث دال ہے جس کو امام ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں روایت

---

[1] تفسیر الطبري (۲۳/۹۸۔۱۰۰) [2] تفسیر الطبري (۲۳/۱۰۳۔۱۰۵) تفسیر ابن کثیر (۴/۳۶۵)

کیا ہے، کہا: مجھے مرہ نے اپنے اموال کے صدقات دے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا تو میں مدینے میں آیا، دیکھا تو آپ ﷺ مہاجرین اور انصار کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے اور میں آپ ﷺ کے پاس ایسے اونٹ لے کر آیا گویا وہ ارطیٰ کی جڑیں ہیں (ارطیٰ ریت کے درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کی جڑیں سرخ ہوتی ہیں) فرمایا کون شخص ہے؟ میں نے عرض کی: عکراش بن ذویب۔ فرمایا کہ اپنا حسب ونسب بیان کرو، میں نے اپنا نسب آپ ﷺ سے بیان کیا، مرہ بن عبید تک اور کہا کہ یہ مرہ بن عبید کا صدقہ ہے۔ آپ ﷺ نے تبسم فرمایا اور کہا: یہ اونٹ ہیں میری قوم کے، یہ صدقات ہیں میری قوم کے، پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ان اونٹوں کو صدقہ کے اونٹوں کی میسم سے نشان لگایا جائے (میسم لوہے کا ایک آلہ ہے جس سے داغ دیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ داغ دے کر صدقہ کا نشان ان پر کیا جائے) اور ان کے ساتھ ملا دیے جائیں۔

پھر میرا ہاتھ پکڑا اور ہم بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی طرف چلے۔ پھر فرمایا: کچھ کھانا ہے؟ چنانچہ ہمارے سامنے ایک جفنہ قصعہ کی طرح کا لائے (جفنہ بڑا کاسہ اور قصعہ وہ کاسہ جو دس آدمیوں کو سیر کر دے، یعنی ایک بڑا گھڑا لائے) جس میں ثرید اور گوشت کے ٹکڑے بہت تھے، پھر آپ ﷺ اس میں سے کھانے لگے تو میں متوجہ ہوا اور اپنا ہاتھ اس کے چاروں طرف اِدھر اُدھر گھماتا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے بائیں ہاتھ سے میرے دائیں ہاتھ کو پکڑا اور فرمایا: او عکراش! ایک جگہ سے کھا۔ بے شک یہ کھانا ایک ہی طرح کا ہے۔ پھر ہمارے آگے ایک طباق لائے جس میں خشک یا تر کھجوریں تھیں۔ عبیداللہ (یعنی عکراش کے بیٹے جو اپنے باپ سے راوی ہیں) نے شک کیا کہ تر تھیں یا خشک تھیں، چنانچہ میں اپنے آگے سے کھانے لگا اور رسول ﷺ کے دستِ مبارک نے اس طباق میں جولان کیا، یعنی اِدھر اُدھر پڑتا تھا اور فرمایا: اوعکراش! کھا جہاں سے تو چاہے، بے شک یہ غیر لون واحد ہے، یعنی ایک قسم کا نہیں ہے، پھر ہمارے پاس پانی لائے تو آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک دھویا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی تری سے اپنے منہ کو اور دونوں ہاتھوں کو اور سر کو تین بار مسح کیا۔ پھر فرمایا: اوعکراش! یہ وضو ہے اس شے سے جس کو آگ نے تغیر دیا۔[1] (وهكذا رواه الترمذي وابن ماجه جميعا عن محمد بن بشار عن أبي الهذيل العلاء بن الفضل به وقال الترمذي: غريب لا نعرفه إلا من حديثه)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب کا سننا اچھا لگتا تھا۔ بعض اوقات کوئی شخص خواب دیکھتا تو اس کے متعلق پوچھتا تھا اگر اس کو خود نہیں جانتا تھا، پھر جب اسے اس کی اچھی تعبیر کی گئی تو اس کے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہوتی، چنانچہ آپ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے دیکھا ہے گویا میرے پاس کوئی آیا اور میں مدینے سے نکال لی گئی، پھر میں جنت میں داخل کی گئی تو میں نے ایک وجبہ سنا (یعنی گر پڑنے کی آواز، جیسے: دیوار وغیرہ کا گرنا) اس کے لیے جنت با آوازِ بلند روئی، پھر میں نے نظر کی تو فلاں بن فلاں اور

[1] المعجم الكبير (۷۲/۱۸) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۸۴۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۲۸۴) اس کی سند میں "علاء بن فضل اور عبیداللہ بن عکراش" ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۵۰۹۸)

فلاں بن فلاں ہیں، پھر اس نے بارہ آدمیوں کے نام لیے۔

نبی کریم ﷺ اس سے قبل لشکر کا ایک ٹکڑا بھیج چکے تھے۔ چنانچہ ان کو لائے، ان کے کپڑے میلے غبار آلود ہیں، ان کی گردن کی رگیں بہہ رہی ہیں، پھر کہا گیا کہ ان کو بیدخ کی یا بیذخ کی نہر کی طرف لے جاؤ، پھر وہ اس میں غوطہ دیے گئے اور وہ اس سے ایسے ہو کر نکلے کہ ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح تھے، پھر ان کے پاس سونے کی ایک رکابی لائے، اس میں گدر کھجوریں تھیں، انھوں نے اس کی گدر کھجوروں میں سے کھایا جو چاہا، پھر وہ اس جنت میں نہیں لوٹتے تھے مگر جو میوے چاہتے وہ کھاتے تھے اور میں نے بھی ان کے ساتھ کھایا، پھر اس لشکر سے خوش خبری دینے والا آیا تو کہا: جو کچھ کہ خواب تھا ایسا ایسا، پس فلاں وفلاں مصیبت پہنچائے گئے، یعنی شہید ہوئے، یہاں تک کہ بارہ مرد شمار کیے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو بلایا اور فرمایا کہ تو اپنا خواب بیان کر تو اس نے اس کو بیان کیا اور کہنے لگی: پھر فلاں وفلاں کو لائے، جیسا کہ کہا۔[1] (أخرجه الحافظ أبو يعلىٰ وهذا لفظه قال الحافظ الضياء: وهذا على شرط مسلم)

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: بے شک مرد جس وقت کھینچے گا جنت میں سے کوئی میوہ تو اس کی جگہ دوسرا عود کر آئے گا۔[2] (أخرجه أبو القاسم الطبراني) ﴿لَحْمِ طَيْرٍ﴾ کی تفسیر میں امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ بے شک جنت کے طیور بختی اونٹوں کی طرح ہیں، جنت کے درختوں میں چرتے ہیں۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ”إِنَّ هَذَا لَطَيْرٌ نَاعِمَةٌ“ (”أَيْ: سمان مترفهة“ یعنی بے شک یہ البتہ طیور فربہ ہیں اور ترفہ وتن آسانی میں ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کا کھانے والا اُن سے بڑھ کر فربہ اور تن آسانی میں ہے)۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: « أَكَلَتُهَا أَنْعَمُ مِنْهَا » اس کلمے کو تین بار فرمایا اور بے شک یہ البتہ اُمید کرتا ہوں کہ تو ان میں سے ہو جو ان سے کھائیں گے۔[3] (أخرجه أحمد و انفرد به من هذا الوجه)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے نزدیک طوبیٰ کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکر! کیا تجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ طوبیٰ کیا ہے؟ عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے، کوئی نہیں جانتا اس کے طول کو مگر اللہ۔ اس کی ٹہنیوں میں سے ایک ٹہنی کے نیچے ایک سوار ستر خریف (سال) تک چلتا رہے گا۔ اس کے پتے چلے ہیں، ان پر ایسے پرندے ہوں گے جو بختی اونٹوں کی طرح ہوں گے، چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! بے شک وہاں البتہ طیر ناعم ہیں، یعنی فربہ پرندے۔

---

[1] مسند أبي يعلىٰ (٦/٤٤) مسند أحمد (١٣٥/٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله رجال الصحيح“ مجمع الزوائد (٣٦٥/٧)

[2] المعجم الكبير (١٠٢/٢) اس کی سند میں ”عباد بن منصور“ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣١٤٦)

[3] مسند أحمد (٢٢١/٣) صحيح الترغيب والترهيب (٢٦٦/٣) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣١٤٦)

آپ ﷺ نے فرمایا: ان سے زیادہ فربہ وہ ہیں جو ان کو کھائیں گے اور تو اُن میں سے ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔[1] (أخرجه أبو عبد الله المقدسي في كتابه صفة الجنة)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! بے شک میں اس کے طیور کو اور اس کے لوگوں کو زیادہ ناعم (فربہ) خیال کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی ان کو کھائے گا، واللہ! اے ابوبکر! وہ ان سے انعم (زیادہ ناعم) ہے اور بے شک وہ البتہ بختی اونٹوں کی طرح ہیں اور بے شک البتہ احتساب کرتا ہوں اللہ پر، یعنی ثواب کی امید کرتا ہوں کہ اے ابوبکر! تو ان سے کھائے گا۔[2] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے کوثر کا پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ ایک نہر ہے جو میرے رب عزوجل نے مجھے جنت میں عطا کی ہے، وہ دودھ سے زیادہ سفید ہے اور شہد سے زیادہ میٹھی ہے، اس میں پرندے ہیں جن کی گردنیں اُونٹوں کی گردنوں کی طرح لمبی ہیں۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: بے شک وہ البتہ ناعم ہیں، یعنی فربہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو کھانے والا ان سے زیادہ فربہ ہے۔[3] (رواه أبو بكر بن أبي الدنيا وكذا رواه الترمذي، عن عبد بن حميد عن القعنبي عن محمد بن عبد الله بن مسلم بن شهاب عن أبيه عن أنس وقال: حسن)

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: بے شک جنت میں البتہ طیر ہے، اس میں ستر ہزار پر ہیں، پھر وہ اہلِ جنت میں سے ایک شخص کی رکابی پر واقع ہوگا اور پر جھاڑے گا تو ہر پر سے ایک لون (ایک قسم کا کھانا) نکلے گا جو دودھ سے زیادہ سفید اور مسکے سے زیادہ نرم ہوگا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا۔ ان میں سے کوئی لون اس کے صاحب کے لون کے مشابہ نہ ہوگا، پھر وہ اڑ جائے گا۔[4] یہ حدیث امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کی ہے اور نہایت درجہ غریب ہے۔ عبیداللہ بن ولید وصافی اور اس کے شیخ عطیہ عوفی دونوں ضعیف ہیں۔ پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کعب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جنت کے طائر بختی اُونٹوں کی طرح ہیں، وہ جنت کے میووں سے کھاتے ہیں اور جنت کی نہروں سے پیتے ہیں اور وہ اس کے لیے صف باندھیں گئے، پھر جب وہ ان میں سے کسی کی خواہش کرے گا تو وہ آئے گا، یہاں تک کہ اس کے آگے واقع ہوگا، پھر وہ اس کے باہر سے اور اندر سے کھائے گا، پھر وہ اڑ جائے گا کہ اس سے کچھ کم نہ ہوا۔[5] یہ کعب تک صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تو البتہ جنت میں طیر کی طرف نظر کرے گا اور اس کی خواہش کرے گا تو وہ بھنا ہوا تیرے آگے گر پڑے گا۔[6] (أخرجه الحسن بن عرفة)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣٦٦/٤) [2] تفسیر ابن کثیر (٣٦٦/٤) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٤٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٥١٤)

[4] تفسیر ابن کثیر (٣٦٦/٤) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی اور عبیداللہ بن ولید'' ضعیف راوی ہیں۔ [5] تفسیر ابن کثیر (٣٦٦/٤)

[6] تفسیر ابن کثیر (٣٦٦/٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجۂ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٦٧٨٤)

﴿ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴾ کو بعض نے بہ رفع پڑھا ہے۔ تقدیر یہ ہے: ”وَلَهُمْ فِيهَا حُورٌ عِينٌ“ اور ان کے لیے جنت میں حورِ عین ہے اور جر کی قراءت دو معنوں کی محتمل ہے: ایک یہ ہے کہ اعراب بنا بر اتباع ما قبل ہو، یعنی اکواب وغیرہ جو بہ حرفِ باء مجرور ہیں، انہیں کے یہ بھی تابع کر دیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ ﴾ [المائدۃ: ٦] ”اپنے سروں کو مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو۔“ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ﴾ [الدھر: ٢١] ”ان کے جسموں پر سبز باریک اور موٹے ریشمی کپڑے ہوں گے۔“ دوسرا احتمال یہ ہے کہ جن چیزوں کے لیے غلمان ان پر پھریں گے، ان میں سے حورِ عین بھی ہیں، لیکن یہ قصور میں ہوگا، بعض بعض کے درمیان میں نہ ہوگا، بلکہ خیموں میں خادم لوگ حورِ عین کو ان پر لیے پھریں گے۔ والله أعلم.

﴿ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴾ یعنی حورِ عین اپنی سفیدی و صفائی میں گویا تر و تازہ موتی ہیں، جیسا کہ سورۃ الصافات میں گزر چکا ہے: ﴿ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ [الصافات: ٤٩] سورۃ الرحمٰن میں بھی ان کا وصف مذکور ہو چکا ہے اور اسی لیے یوں فرمایا ہے: ﴿ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی یہ جو ہم نے ان کو تحفہ دیا یہ ان کو اس بات پر جزا دینے کے لیے ہے کہ انھوں نے اچھے عمل کیے۔ پھر فرمایا: ﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴾ یعنی جنت میں کوئی کلام عبث نہ سنیں گے جو معنی سے خالی ہو، یا کسی حقیر یا ضعیف معنی پر مشتمل ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴾ [الغاشیۃ: ١١] ”جہاں کوئی بے ہودہ بات نہیں سنیں گے۔“ یعنی کلمۂ ﴿ لَاغِيَةً ﴾ عبث و بے سود ﴿ وَلَا تَاْثِيْمًا ﴾ اور نہ سنیں گے کوئی ایسا کلام جس میں قباحت ہو۔ ﴿ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴾ یعنی مگر ان میں بعض کا بعض کو سلام کرنا سنیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴾ [یونس: ١٠] ”اور ان کا باہمی سلام یہ ہوگا ”السلام علیکم“۔ اور ان کا کلام بھی لغو اور گناہ کی باتوں سے پاک ہوگا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی: ”أَيْ: هُمْ ثُلَّةٌ“، ﴿ ثُلَّةٌ ﴾ وہ جماعت ہے جس کا شمار نہیں ہوسکتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی فرقہ ہے۔[2] ماخوذ ہے ”ثَلَلْتُ الشَّيْءَ إِذَا قَطَعْتَهُ“ سے (”أَيْ: جماعة السابقين مع كثرتهم مقطوعة من جملة بني آدم“)۔ اولین سے مراد آدم علیہ السلام سے لے کر سابقہ امتیں ہیں، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک، یعنی وہ سابقین اگلی امتوں میں سے ایک جماعت ہیں بے شمار اور وہ اس اُمت سے قلیل ہیں۔ ان کا نام قلیل رکھا گیا، ان لوگوں کی نسبت جو ان سے قبل تھے اور وہ کثیر ہیں، اس لیے کہ انبیاء کی ان میں کثرت ہے اور ان لوگوں کی کثرت جنھوں نے ان کو مانا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ گذشتہ لوگوں کے سابقین ہمارے سابقین سے زیادہ ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: وہ لوگ جنھوں نے سارے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٣٦٢۔٣٦٧)
[2] معاني القرآن (٥/١٠٩)

انبیاء کا معائنہ کیا اور ان کی تصدیق کی، وہ ان لوگوں سے زیادہ ہیں جن لوگوں نے نبی کریم ﷺ کا معائنہ کیا۔[1]

یہ بات اس حدیث کی مخالف نہیں ہے جو صحیح میں ثابت ہوئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں البتہ امید کرتا ہوں کہ تم اہلِ جنت کا ایک چوتھائی ہو۔ پھر فرمایا کہ اہلِ جنت کے ایک تہائی ہو۔ پھر فرمایا کہ اہلِ جنت کے نصف ہو،[2] اس لیے کہ ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ جو ہے وہ فقط سابقین کی تفصیل ہے، جیسا کہ اصحابِ یمین کے ذکر میں آگے آتا ہے کہ وہ اولین سے ایک ثلہ ہیں اور آخرین سے ایک ثلہ ہیں تو یہ بات اس کے مانع نہیں ہے کہ اس امت کے اصحابِ یمین میں وہ لوگ ہوں گے جو دوسری اُمتوں کے اصحابِ یمین سے اکثر ہوں۔

چنانچہ اس امت کے قلیل سابقین میں سے اور اس کے ثلۃ اصحابِ یمین میں سے وہ لوگ ہوں گے جو اہلِ جنت کے نصف ہو جائیں گے اور اصحابِ یمین کے دو ثلہ کے درمیان مقابلہ اس بات کو لازم قرار نہیں دیتا کہ دونوں برابر ہوں گے، کیوں کہ یہ جائز ہے اگر یہ کہا جائے کہ یہ ثلۃ اس ثلۃ سے اکثر ہے جس طرح کہ کہا جاتا ہے کہ یہ جماعت اس جماعت سے اکثر ہے اور یہ فرقہ اس فرقے سے اکثر ہے اور یہ قطعہ اس قطعے سے اکثر ہے۔ تم اس تقریر سے پہچان لو گے کہ جس نے یوں کہا کہ یہ آیت حدیثِ مذکور (یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منسوخ ہے تو وہ صحیح نہیں، بلکہ چوک گیا۔

جمہور نے ﴿ سُرُرٍ ﴾ کو بہ ضمِ سین ورائے اولیٰ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابو السماک اور زید بن علی رحمہما اللہ نے) بہ فتحِ راء پڑھا ہے،[3] یہ بھی ایک لغت ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ یہ جمع ہے "سریر" کی، یہ وہ بلند نشست گاہیں ہیں جو انسان کے لیے بنائی جاتی ہے، یہ راحت اور کرامت کے لیے وضع کی گئی ہیں۔ ﴿ مَّوْضُوْنَةٍ ﴾ بہ معنی "مَنْسُوْجَةٌ" ہے: "وضن" نسج مضاعف کو کہتے ہیں۔ "يُقَالُ: وَضَنَ الشَّيْءَ يَضِنُهُ فَهُوَ مَوْضُوْنٌ وَوَضِيْنٌ، ثَنَّى بَعْضَهُ عَلَى بَعْضٍ وَضَاعَفَهُ، وَالْغَزْلُ نَسَجُهُ" اور ﴿ مَّوْضُوْنَةٍ ﴾ درع منسوجہ ہے، یا جس کی بناوٹ باہم قریب ہے، یا دو دو حلقے کر کے بنائی گئی ہے، یا جواہر کے ساتھ (یہ محذوف سے متعلق ہے: "أي: مشبكة بالجواهر كما صرح به غيره") (كذا في القاموس) امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ وہ تخت بنے گئے سونے کی ٹہنیوں سے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ در و یاقوت و زبرجد سے پروئے گئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَّوْضُوْنَةٍ ﴾ بہ معنی "مَصْفُوْفَةٌ" ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے۔[5]

بالجملہ اللہ پاک نے سابقین مقربین کی ایک اور حالت ذکر فرمائی کہ وہ تختوں پر قرار پذیر ہیں (﴿ ثُلَّةٌ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی: "أي: هم ثلة" اور ﴿ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ صفت ہے ﴿ ثُلَّةٌ ﴾ کی ﴿ عَلٰى سُرُرٍ ﴾ اس

[1] فتح القدير (١٩٨/٥) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢١)
[3] فتح القدير (١٩٨/٥) [4] فتح القدير (١٩٨/٥) [5] تفسير الطبري (١٠٠/٢٣)

مبتدائے محذوف کی خبرِ ثانی ہے باعتبار متعلق کے: "أي: استقروا علی سرر" اور ﴿ مُتَّكِـِٕيْنَ ﴾ اور ﴿ مُتَقٰبِلِيْنَ ﴾ دونوں حال ہیں اسی فعل سے) تختوں پر جو سونے سے یا در و یاقوت وغیرہ سے جڑے ہوئے ہیں، اس حال میں کہ ان پر اپنے پہلو پر تکیہ لگائے ہیں، یا کسی اور چیز پر اس شخص کے حال کی طرح جو کرسی پر ہوتا ہے تو اس کے نیچے ایک اور شے رکھی جاتی ہے، تاکہ اس پر تکیہ کرے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر تخت کا طول تین سو گز ہے، پھر جب بندہ اس پر بیٹھنے کا ارادہ کرے گا تو وہ اس کے لیے پست ہو جائے گا، پھر جب وہ اس پر بیٹھ جائے گا تو بلند ہو جائے گا۔ ﴿ مُتَقٰبِلِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض کی گدی کی طرف نظر نہ کرے گا، یہ ان کی حسنِ عشرت وتہذیبِ اخلاق وصفائے مودت کی صفت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ مومن اور اس کی زوجہ اور اہل کے حق میں ہے۔[1]

جملہ ﴿ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال مقربین سے یا مستانفہ ہے بعض نعیم کے بیان کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تیار کیا ہے، یعنی ان کے گرد خدمت کے لیے لڑکے دور کریں گے جن کی شکل ہمیشہ لڑکوں کی شکل جیسی رہے گی۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ﴿ مُخَلَّدُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں "لَا يَمُوْتُوْنَ" یعنی وہ نہیں مریں گے، حسن اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا کہ وہ بوڑھے نہ ہوں گے اور نہ متغیر ہوں گے اور نہ نقل کریں گے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف، ہمیشہ باقی رکھے جائیں گے۔ جب مرد بڑی عمر کا ہو جائے اور اس کے سیاہ بال سفیدی آمیز نہ ہوں تو عرب اس کو کہتے ہیں: "إِنَّهُ لَمُخَلَّدٌ". امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مُقَرْطُوْنَ" یعنی ان کے کانوں میں بالی ڈالی گئی ہے، گویا حلقہ بگوش ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کوئی اپنی لونڈی کو محلی بخلدہ کرتا ہے تو محاورے میں بولا جاتا ہے: "خَلَّدَ جَارِيَتَهُ إِذَا أَحَلَاهَا بِالْخُلْدِ وَهُوَ الْقُرْطَةُ" قرطہ وہ حلقہ ہے جو کان میں لٹکایا جاتا ہے۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مُنَعَّمُوْنَ" یعنی ناز ونعمت میں رکھے گئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ زیور سے ستر کیے گئے ہیں، اسی کے مثل امام فراء رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ "مُمَنْطَقُوْنَ" یعنی ان کی کمر میں خدمت کا پٹکا باندھا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ غلمان مسلمانوں کے بچے ہیں جو چھوٹے چھوٹے مر جاتے ہیں جن کی نہ کوئی نیکی ہوتی ہے نہ بدی۔ یہ قول ضعیف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مشرکوں کے بچے ہیں جو قبل تکلیف (مکلّف ہونے کے) مر گئے ہیں اور بعید نہیں کہ یہ ابتداً جنت میں حورِ عین کی طرح بغیر ولادت کے مخلوق ہوں، اس لیے کہ اس خدمت کو انجام دیتے رہیں، یہ دنیا کی اولاد سے نہیں ہیں۔ صحیح قول یہی ہے۔

ان پر ﴿ وِلْدَانٌ ﴾ کا نام بولا گیا، اس لیے کہ عرب لوگ غلام کا نام ولید رکھتے ہیں، جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو اور لونڈی کا نام ولیدہ رکھتے ہیں گو وہ مسن ہو۔ "أكواب" أقداح متديرة الأفواه ہیں، یعنی گول منہ کے کٹورے جن کے نہ اذان ہیں نہ عری، یعنی نہ ٹونٹیاں ہیں نہ کڑے، اس کا بیان سورۃ الزخرف میں گزر چکا ہے۔[3] أباريق عری وخراطیم

---

[1] تفسير القرطبي (٢٠٢/١٧) [2] تفسير القرطبي (٢٠٢/١٧) فتح القدير (١٩٩/٥) [3] رقم الآية (٧١)

والے ہیں، یعنی ان کے کڑے اور ٹونٹیاں دونوں ہیں اس کا واحد "إبريق" ہے۔

ابریق وہ ہے جس کا رنگ چمکتا ہے، اس کی صفائی سے اس کا باطن اس طرح دکھائی دیتا ہے جس طرح اس کا ظاہر دکھائی دیتا ہے۔ ﴿ كَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴾ سے مراد شراب جاری کا ظرف ہے، یا آبِ جاری کا ظرف۔ یہاں مراد وہ شراب ہے جو ایسے منبع سے جاری ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ ﴿ كَأْسٍ ﴾ کے معنی کا بیان سورۃ الصافات میں گزر چکا ہے۔[1]

﴿ لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا ﴾ یعنی اس کے پینے سے ان کے سر نہ دکھیں گے، جیسا کہ دنیا کی شراب پینے سے دکھتے ہیں۔ ﴿ عَنْهَا ﴾ کی ضمیر راجع ہے ﴿ كَأْسٍ ﴾ کی طرف یعنی کاسۂ شراب کے سبب سے ان کو دردِ سر نہ ہو گا۔ "صداع" مشہور درد ہے جو انسان کو اس کے سر میں لاحق ہوتا ہے اور شراب اس میں اثر کرتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لَا يُصَدَّعُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں: "لَا يَتَفَرَّقُوْنَ" یعنی وہ متفرق نہ ہوں گے جس طرح کہ دنیا کے شرابی متفرق ہو جاتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کی قراءت بہ فتح یاء وتشدیدِ صاد اس معنی کو تقویت دیتی ہے۔ اصل "يَتَصَدَّعُوْنَ" ہے: "أَيْ: يَتَفَرَّقُوْنَ"[2] یہ جملہ مستانفہ ہے جو اللہ پاک کی ان نعمتوں کے بیان کے لیے ہیں جو اُن کے لیے مہیا کر رکھی ہیں۔

جملۂ ﴿ وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴾ جملۂ ما قبل پر معطوف ہے، زائے معجمہ کی کسر و فتح دونوں سے پڑھا گیا ہے اور دونوں سبعیہ ہیں۔ جب شراب پینے والے کی عقل یا اس کی شراب فنا ہو جاتی ہے تو بولتے ہیں: "أَنْزَفَ الشَّارِبُ وَنَزَفَ" یعنی وہ مست نہ ہوں گے کہ ان کی عقلیں جاتی رہیں، اس سے ان کو عقل کا ذہاب حاصل نہ ہو گا بہ خلاف دنیا کی شراب کے جو عقل کو کھو دیتی ہے۔ جمہور نے ﴿ وَفَاكِهَةٍ ﴾ کو اور اسی طرح ﴿ وَلَحْمِ ﴾ کو بہ جر پڑھا ہے ﴿ بِاَكْوَابٍ ﴾ پر عطف کیا ہے۔ یعنی وہ لڑکے ان پر لیے پھریں گے یہ چیزیں کھانے پینے کی اور تفکہ کی۔ کسی نے دونوں کو بہ رفع پڑھا ہے۔ بنا بر ابتدا (یعنی زید بن علی و ابو عبد الرحمان نے) "أَيْ: وَلَهُمْ فَاكِهَةٌ وَلَحْمُ طَيْرٍ" ﴿ يَتَخَيَّرُوْنَ ﴾ بہ معنی "يَخْتَارُوْنَ" ہے، یعنی اور میوہ اس قسم سے جس کو وہ اختیار کر لیں گے، چن لیں گے۔ جب تم زیادہ اچھی چیز لو گے تو یوں کہو گے کہ "تَخَيَّرْتُ الشَّيْءَ"

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس قسم کے پرندوں کا گوشت جس کی وہ تمنا کریں گے اور جس کو ان کے جی چاہیں گے ﴿ فَاكِهَةٍ ﴾ کی جو تخیر کے ساتھ تخصیص کی ہے اور ﴿ لَحْمِ ﴾ کی اشتہا کے ساتھ تو اس میں بلاغتِ کلام ہے۔ اس لیے کہ بھوکا تو مشتہی ہوتا ہے اور پیٹ بھرا غیر مشتہی، بلکہ وہ مختار ہوتا ہے، اس لیے ﴿ فَاكِهَةٍ ﴾ کو ﴿ لَحْمِ ﴾ پر مقدم کیا ہے۔ اس بارے میں حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔

جمہور نے ﴿ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے (محلی نے ﴿ حُوْرٌ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: "نساء شديدات سواد العيون وبياضها" اور ﴿ عِيْنٌ ﴾ کے بعد کہا ہے: "ضخام العيون"[3] انتھی. امام حقانوی رحمہ اللہ نے

---

[1] رقم الآية (٤٥) [2] تفسير القرطبي (١٧/٢٠٣) [3] تفسير الجلالين (١/٧١٤)

اول تفسیر کے بعد کہا کہ یہ من جملہ تفسیر ﴿ عِیْنٌ ﴾ ہے، سو محلی اگر اس کو مؤخر کرتے اس کے بعد تو البتہ واضح تر ہوتا۔ چنانچہ ﴿ عِیْنٌ ﴾ وہ ہیں جن کی آنکھوں کی سفیدی شدید ہو اُن کی فراخی کے ساتھ۔ اب رہیں ﴿ حُوْرٌ ﴾ تو یہ وہ عورتیں ہیں جن کی سفیدی شدید ہو، یعنی ان کے جسموں کی سفیدی، تامل۔ انتھیٰ. جمل نے اس قول کو نقل کرنے کے بعد کہا کہ پھر میں نے مختار میں دیکھا، اس کی عبارت یہ ہے: "والحور بفتحتين شدة بياض العين في شدة سوادها" یعنی حور یہ ہے کہ آنکھ کی سفیدی و سیاہی دونوں شدید ہوں۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا: میں نہیں جانتا کہ حُور آنکھ میں کیا ہے۔ ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا: حور یہ ہے کہ ساری آنکھ سیاہ ہو مثل چشمہائے ظباء و بقر (ہرن و گائے) کہا اور بنی آدم میں حور نہیں ہے اور عورتوں کو جو حور العیون کہا گیا ہے تو صرف اس لیے کہ ظباء و بقر سے ان کو تشبیہ دی ہے)[1] "ولدان" پر عطف کیا ہے یا بر تقدیر مبتدا "أَيْ: وَنِسَاءُهُمْ حُوْرٌ عِيْنٌ" یا بر تقدیرِ خبر "أَيْ: وَلَهُمْ حُوْرٌ عِيْنٌ" اور کسی نے (یعنی امام حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے) بہ جر پڑھا ہے ﴿ بِأَكْوَابٍ ﴾ پر معطوف کیا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا اور جائز ہے کہ جنات پر معطوف ہو: "أَيْ: هُمْ فِيْ جَنَّاتٍ وَفِيْ حُوْرٍ" بر تقدیر مضاف "أَيْ: وَفِيْ مُعَاشَرَةِ حُوْرٍ"۔ (امام فراء رحمہ اللہ نے "أكواب" پر عطف کرنے کی توجیہ میں کہا ہے کہ جر جائز ہے بنا بر اتباع در لفظ، گو معنی میں دونوں مختلف ہیں، اس لیے کہ حوروں کو، نہیں لیے پھرتے ہیں۔ کما في قول شاعر: ؎

إذا ما الغانيات برزن يوما وزججن الحواجب والعيونا

آنکھوں کو باریک نہیں کرتی ہیں ان میں تو سرما لگایا جاتا ہے۔

اسی باب سے یہ قول ہے: "علفتها تبنا وماء باردا" کسی اور کا قول ہے: "متقلدا سيفا ورمحا") قطرب نے کہا ہے کہ "أکواب" پر معطوف ہے بغیر معنی پر محمول کیے ہوئے۔ کہا: اور اس کا انکار نہیں کیا جاتا کہ ان پر حوروں کو لیے پھریں اور ان کے لیے اس میں لذت ہو۔ کسی نے (یعنی اشہب، عقیلی، نخعی اور عیسیٰ بن عمر رحمہم اللہ نے) "وَحُوْرًا عِيْنًا" بہ نصب پڑھا ہے بر تقدیرِ اضمارِ فعل۔ گویا یوں کہا گیا: "وَيُزَوَّجُوْنَ أَوْ وَيُعْطَوْنَ حُوْرًا عِيْنًا" (امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے جمہور کی قراءت کو اختیار کیا ہے)۔[2] اس کی تفسیر سورۃ الطّور وغیرہ میں خوب گزر چکی ہے۔[3]

پھر اللہ پاک نے ان کو تشبیہ ﴿ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴾ سے دی۔ یعنی صاف اور نقی ہونے میں وہ ایسی ہیں جیسے موتی مصون و محفوظ۔ ﴿ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴾ وہ ہیں جن کو ہاتھوں نے نہیں چھوا، نہ ان پر غبار پڑا اور نہ ان کو دھوپ اور ہوا لگی اور وہ نہایت درجہ صاف ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ اَلْمَكْنُوْنِ ﴾ "اَلْمَخْزُوْنُ الَّذِيْ فِيْ الصَّدَفِ"[4] یعنی وہ موتی جو سیپیوں میں رکھ چھوڑے گئے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: موتیوں کی طرح ہیں جس وقت وہ نکالے جائیں اپنی سیپ سے، ان کو زمانے نے تغیر نہیں دیا اور نہ ان کو استعمال کیا گیا ہے۔[5] مروی ہے

[1] مختار الصحاح (١/١٦٧) [2] تفسیر القرطبي (١٧/٢٠٤، ٢٠٥) فتح القدير (٥/١٩٩، ٢٠٠) [3] رقم الآية (٢٠)
[4] الدر المنثور (٨/١١) فتح البيان (١٣/٣٦٤) [5] معاني القرآن (٥/١١١)

کہ جنت میں ایک نور بلند ہوا تو کہا گیا: یہ کیا ہے؟ کہا گیا کہ ایک حور کا دانت ہے جو ہنسی ہے۔

﴿ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ کا نصب بنا بر مفعول لہ ہے، یعنی یہ سب ہم ان کے ساتھ کریں گے ان کے اعمال کی جزا دینے کے لیے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول مطلق ہو "أَيْ: يُجْزَوْنَ جَزَاءً"، یعنی وہ پوری پوری جزا دیے جائیں گے۔ ﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴾ لغو بہ معنی کلام باطل ہے اور تاثیم گناہ کی طرف نسبت کرنا ہے۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: "لَا يُؤَثِّمُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا"، یعنی ایک دوسرے کو گناہ کی نسبت نہ کرے گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ گالی گلوچ سنیں گے اور نہ ماثم کو، معنی یہ ہیں کہ ایک دوسرے سے یہ نہ کہے گا کہ تو نے گناہ کیا، کیوں کہ وہ اس بات کے ساتھ کلام نہ کریں گے جس میں گناہ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "لَغْوًا بَاطِلًا وَلَا تَأْثِيمًا كَذِبًا"[1] ﴿ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴾ "قیل" بہ معنی قول ہے اور استثناء منقطع ہے، اس لیے کہ سلام لغو و تاثیم کے تحت میں مندرج نہیں ہے: "أَيْ: لٰكِنْ يَقُوْلُوْنَ قِيْلًا أَوْ يَسْمَعُوْنَ قِيْلًا"، یعنی لیکن کہیں گے قول یا سنیں گے قول۔ ﴿ سَلٰمًا سَلٰمًا ﴾ کا نصب بنا بر بدل ہے ﴿ قِيْلًا ﴾ سے، یا اس کی صفت ہے یا اس کا مفعول بہ ہے: "أَيْ: إِلَّا أَنْ يَّقُوْلُوْا سَلَامًا سَلَامًا"، یعنی مگر یہ کہیں گے سلام سلام۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔[2] کسی نے کہا: اس بنا پر کہ منصوب ہے فعل سے جو محکی بقیل ہے: "أَيْ: إِلَّا قِيْلًا سَلِّمُوْا سَلَامًا سَلَامًا" آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہ سنیں گے مگر بعض کا بعض کے لیے تحیہ، یعنی سلام۔

امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تحیہ کرے گا ان کا بعض بعض کو سلام کے ساتھ۔[3] کسی نے کہا ہے کہ وہ سلام کا افشا کریں گے اپنے درمیان تو سلام کریں گے سلام بعد سلام کے۔ کسی نے کہا ہے کہ فرشتے ان پر سلام کریں گے یا اللہ تعالیٰ سلام لے کر ان کی طرف بھیجے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کا قول لغو سے سالم ہو گا۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ کسی نے استثناء متصل بھی کہا ہے، لیکن یہ قول انتہائی بعید ہے۔ کسی نے "سَلَامٌ سَلَامٌ" بہ رفع پڑھا ہے: "أَيْ: هُوَ سَلَامٌ سَلَامٌ"، یعنی وہ قول سلام سلام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان معنوں میں رفع جائز ہے کہ "سَلَامٌ عَلَيْكُمْ" کہا جائے (یعنی مبتداء وخبر ہے۔ یہ قول مکی کا ہے)۔ بالجملہ جب اللہ پاک احوالِ سابقین کے ذکر سے فارغ ہوا اور ان نعمتوں کو بیان کر چکا جو اُن کے لیے تیار کی ہیں تو اصحاب الیمین کا ذکر کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:[4]

---

[1] تفسير القرطبي (٢٠٦/١٧) [2] معاني القرآن (١١٢/٥)
[3] تفسير البغوي (١١/٨) [4] فتح البيان (٣٦٠/١٣_٣٦٥)

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ۬ مَاۤ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِؕ ﴿۲۷﴾ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍۙ ﴿۲۸﴾
وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍۙ ﴿۲۹﴾ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍۙ ﴿۳۰﴾ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍۙ ﴿۳۱﴾
وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍۙ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍۙ ﴿۳۳﴾ وَّفُرُشٍ
مَّرْفُوْعَةٍؕ ﴿۳۴﴾ اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءًۙ ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًاۙ ﴿۳۶﴾
عُرُبًا اَتْرَابًاۙ ﴿۳۷﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِؕ ﴿۳۸﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَۙ ﴿۳۹﴾
وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَؕ ﴿۴۰﴾

اور دائیں ہاتھ والے، کیا (خوب) ہیں دائیں ہاتھ والے! ﴿27﴾ وہ بے خار بیریوں میں ہوں گے ﴿28﴾ اور تہ بہ تہ کیلوں میں ﴿29﴾ اور لمبے سایوں میں ﴿30﴾ اور (ہردم) بہتے پانی (کی آبشاروں) میں ﴿31﴾ اور وافر پھلوں میں ﴿32﴾ جو نہ تو کبھی ختم ہوں گے اور نہ ممنوع ﴿33﴾ اور اونچی اونچی نشست گاہوں میں ﴿34﴾ بلاشبہہ ہم ان (کی بیویوں) کو ایک نئے سرے سے ہی پیدا کریں گے ﴿35﴾ پس ہم انھیں کنواریاں بنائیں گے ﴿36﴾ من موہنی، ہم عمر ﴿37﴾ دائیں ہاتھ والوں کے لیے ﴿38﴾ کثیر جماعت پہلوں میں سے ﴿39﴾ اور کثیر جماعت پچھلوں میں سے ﴿40﴾

اصحاب الیمین اور ان کی جزاء:

دایاں اور بایاں یہ کہ جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں آیا وہ بہشتی ہے اور جس کے بائیں ہاتھ میں آیا وہ دوزخی ہے۔ انتھیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ پاک نے جب سابقین کے مآل اور انجام کا ذکر کیا اور یہ مقربین ہیں تو اصحاب الیمین کا ذکر ان پر عطف کیا، یہ ابرار نیکوکار ہیں، جیسا کہ میمون بن مہران نے کہا ہے کہ اصحابِ یمین مرتبے میں مقربین سے کم ہیں۔ چنانچہ فرمایا: اصحاب الیمین کیا ہیں، اصحاب الیمین کس شے کی طرف ہیں، اصحابِ یمین اور ان کا کیا حال ہے اور ان کا مآل اور انجام کار کیسا ہے۔ پھر اس کی یہ تفسیر فرمائی: ﴿فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ﴾ ''أَيْ: اَلَّذِيْ لَا شَوْكَ فِيْهِ''، یعنی بیر کے درختوں میں ہیں جن میں کانٹے نہیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ، مجاہد، ابوالاحوص، قسامہ بن زہیر، سفر بن نسیر، حسن، قتادہ، عبداللہ بن کثیر، سدی اور ابوحرزہ رحمہم اللہ وغیرہم کا یہی قول ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ ''هُوَ الْمُوَقَّرُ بِالثَّمَرِ''، یعنی وہ بیر کا درخت ہے کہ پھل کے ساتھ بھاری ہو رہا ہے۔ امام عکرمہ اور مجاہد رحمہما اللہ سے بھی یہ ایک روایت ہے۔ اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا

ہے کہ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ وہ موقر ہے جس میں کانٹے نہیں ہیں۔[1] ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی مراد ہے اور یہ بھی، کیوں کہ دنیا کے بیر کے درختوں میں کانٹے بہت ہوتے ہیں اور میوہ کم اور آخرت میں اس کے برعکس ہے کہ ان میں کانٹے نہیں ہیں اور میوہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کے اصل کو بھاری کر دیا ہے، جیسا کہ حافظ ابو بکر احمد بن سلیمان نجار نے سلیم بن عامر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کہا کرتے تھے کہ بے شک اللہ تعالیٰ البتہ ہم کو بدوی لوگوں سے نفع دیتا ہے اور ان کے مسائل سے۔

کہا: ایک دن ایک بدو آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! جنت میں اللہ نے ایک ایسے درخت کا ذکر کیا ہے جو اپنے صاحب کو ایذا دیتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ عرض کی کہ ﴿ سِدْرٍ ﴾۔ بے شک اس کے موذی کانٹے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا: ﴿ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴾ اللہ نے اس کے کانٹے جھاڑ دیے ہیں، پھر ہر کانٹے کی جگہ ایک پھل کر دیا ہے۔ بے شک وہ اُگاتی ہیں میووں کو اس کا میوہ شق ہوتا ہے، بہتر قسم کے کھانے سے، ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو دوسری سے مشابہ ہو۔[2]

طریقِ دیگر:

ابوبکر بن ابی داود نے عتبہ بن عبد سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک دیہاتی آیا تو عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو سنتا ہوں کہ آپ جنت میں ایک ایسے درخت کا ذکر کرتے ہیں جس سے زیادہ کانٹوں والا کوئی درخت مجھے معلوم نہیں، یعنی ﴿ طَلْحٍ ﴾۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ اس کے ہر کانٹے کی جگہ ایک پھل کر دے گا۔ "مثل خصوة التيس الملبود" (یعنی پر گوشت بکرا جس کا گوشت تہہ پر تہہ ہے اور وہ خوب فربہ و تیار ہے)۔ اس میں ستر قسم کا کھانا ہوگا، اس میں ایک دوسرے کے مشابہ نہ ہو گا۔[3] ﴿ طَلْحٍ ﴾ بڑے بڑے درخت ہیں جو زمین حجاز میں ہوتے ہیں عضاہ (درختانِ بلند باخار كذا في الصراح) کے درختوں سے۔ ﴿ طَلْحٍ ﴾ کا واحد طلحہ ہے ان کے کانٹے بہت ہوتے ہیں۔

بَشَّرَهَا دَلِيْلُهَا وَقَالَا غَدًا تَرَيْنَ الطَّلْحَ وَالْجِبَالَا [4]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض حداة (جمع ہے حادی کی، حادی شتر ران وحدی خوان ہے جو خوش آواز سے اونٹوں کو ہانکتا ہے۔ کہتا ہے خوش خبری دی اس کو اس کے راہبر نے اور کہا کہ کل تو دیکھے گی درختانِ بلند خاردار کو اور پہاڑوں کو۔ شاید اس سے مراد آبادی ہے کہ کل تو وہاں پہنچ جائے گی) کی بیت پڑھی ہے:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَّنْضُوْدٍ ﴾ بہ معنی "مُتَرَاكِمُ الثَّمَرِ" ہے، یعنی اس طلح کے پھل تہہ بہ تہہ ہوں

---

(1) تفسير الطبري (١١١،١١٠/٢٣) تفسير ابن كثير (٣٦٧/٤) (2) مستدرك الحاكم (٥١٨/٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢٦٦/٣)

(3) المعجم الكبير (١٣٠/١٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٣٤) (4) تفسير الطبري (١١٢/٢٣)

گے۔ اللہ پاک قریش سے اس کا ذکر کرتا ہے، اس لیے کہ وہ "وج" سے اور اس کے ظلال سے تعجب کرتے تھے ("وج" طائف کے کنارے پر ایک جگہ ہے) "وج" کے سائے "طلح" و "سدر" کے تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَنْضُوْدٍ ﴾ "مصفوق" ہے (شاید اس سے یہ مراد ہو کہ جنت کا طلح کانٹوں سے صاف ہوگا، واللّٰه أعلم)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ طلح دنیا کے طلح کے مشابہ ہوگا، لیکن اس کے پھل شہد سے زیادہ میٹھے ہوں گے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ طَلْحٍ ﴾ ایک لغت ہے: "طلع" میں ("طلع" اصل میں کھجور کے پہلے شگوفے کو کہتے ہیں)۔

حافظ ابن کثیر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے بہ سندِ خود ہمدان کے ایک شیخ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سنا، انھوں نے ﴿ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴾ کے بارے میں کہا: "طَلْعٍ مَنْضُوْدٍ"۔[1] چنانچہ اس بنا پر یہ ﴿ سِدْرٍ ﴾ کی صفت سے ہوگا تو گویا ﴿ سِدْرٍ ﴾ کا یہ وصف کیا ہے کہ وہ ﴿ مَخْضُوْدٍ ﴾ ہے۔ ﴿ مَخْضُوْدٍ ﴾ وہ ہے جس کے کانٹے نہیں ہیں اور "طلع" اس کا ﴿ مَنْضُوْدٍ ﴾ ہے اور یہ اس کے پھل کی کثرت ہے۔ واللّٰه أعلم۔ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ﴿ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴾ "موز" ہے، یعنی کیلے تہ بہ تہ۔ (أخرجه ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، امام حسن، عکرمہ، قسامہ بن زہیر، قتادہ اور ابو حزرہ رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اور امام مجاہد اور ابن زید رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اتنا زیادہ کہا ہے کہ اہلِ یمن "موز" کا نام طلح رکھتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کے سوا اور کوئی قول بیان نہیں کیا۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے کہ سوار اس کے سائے میں سو برس چلے گا، پھر بھی اس کو عبور نہ کرے گا، اگر چاہو تو تم پڑھو: ﴿ وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴾ (و رواه مسلم من حديث الأعرج به)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی معنی میں طرق و بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ امام احمد اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ وغیرہ سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں، پھر کہا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہی نہیں، بلکہ تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ اس کے تعددِ طرق، قوتِ اسانید اور ثقاہتِ رجال کی وجہ سے یہ حدیث کے ائمۂ نقاد کے ہاں قطعی طور پر صحیح ہے۔ شبیب نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ جنت میں ایسے درخت ہیں کہ ان پر پھل نہیں ہوگا، ان سے سایہ لیا جائے گا۔ (رواه ابن أبي حاتم) امام ضحاک، سدی اور ابو حزرہ رحمہم اللہ نے کہا: ﴿ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴾ یعنی وہ منقطع نہ ہوگا۔ جنت میں نہ سورج ہے نہ گرمی، طلوعِ فجر سے قبل جیسا ہوگا (اصل میں اسی طرح مگر طلوعِ شمس سے قبل معلوم ہوتا ہے)۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جنت "سجسج" ہے (یعنی جنت کا سایہ معتدل ہے نہ گرمی ہے نہ سردی) جیسا کہ طلوعِ فجر سے لے کر طلوعِ شمس تک ہوتا ہے۔[3] اس معنی کی آیات گزر چکی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا

[1] تفسير ابن كثير (٤/٣٦٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٣٠) تفسير الطبري (٢٣/١١٢، ١١٣)

[3] تفسير ابن كثير (٤/٣٦٨-٣٧٠)

فرمان ہے: ﴿ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴾ [النساء: ۵۷] ''اور ہم انھیں گھنی چھاؤں میں لے جائیں گے۔'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ أُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ﴾ [الرعد: ۳۵] ''اس کا میوہ ہمیشگی والا ہے اور اس کا سایہ بھی۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فِي ظِلٰلٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴾ [المرسلات: ۴۱] ''سایوں میں ہیں اور بہتے چشموں میں۔'' ان کے سوا اور آیات ہیں۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے ﴿ مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ پانی جاری ہوگا۔ "غير أخدود" میں،[1] یعنی گڑھے میں نہ بہے گا، جیسا کہ دنیا میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ فِيهَآ أَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ﴾ [محمد: ۱۵] کی تفسیر میں پوری طرح کلام گزر چکا ہے، یہاں اس کے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴾ یعنی ان کے پاس بہت سے میوے ہیں قسم قسم کے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھے، نہ کسی کان نے سنے اور نہ کسی بشر کے دل میں ان کا کوئی تصور گزرا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ﴾ [البقرۃ: ۲۵] ''جب بھی انھیں اس میں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا تھا اور ان کو اس سے ملتا جلتا (پھل) دیا جائے گا۔'' یعنی شکل تو شکل سے ملتی جلتی لیکن مزہ اور ہوگا۔

صحیحین میں سدرۃ المنتہی کے ذکر میں ہے کہ پتے اس کے ہاتھی کے کانوں کی طرح ہیں اور اس کے بیر ہجر (ایک گاؤں کا نام جہاں بڑے بڑے مٹکے بنتے تھے) کے مٹکوں کی طرح ہیں۔[2] نیز ان کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورج گرہن ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ پھر نماز کا ذکر کیا اور اس میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے ہاتھ بڑھا کر اپنی اس جگہ میں کوئی چیز لی، پھر ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ پیچھے ہٹ آئے۔ فرمایا: بے شک میں نے جنت کو دیکھا، پھر میں نے اس سے ایک خوشے کو پکڑنا چاہا، اگر میں اس کو لے لیتا تو البتہ تم اس کو کھاتے رہتے جب تک دنیا باقی رہتی۔[3] پھر جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بروایت ابو یعلیٰ ذکر کی ہے، وہ بھی اسی کے مثل ہے، الفاظ کا فرق ہے۔[4] (وروى مسلم من حديث أبي الزبير عن جابر نحوه)

پھر کہا ہے: عتبہ بن عبد سلمی کہتے ہیں کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حوض کے متعلق پوچھا اور جنت کا ذکر کیا، پھر اس اعرابی نے عرض کی کہ کیا اس میں فاکہہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اور اس میں ایک درخت ہے وہ طوبیٰ پکارا جاتا ہے، پھر کوئی شے ذکر کی، میں نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے۔ اعرابی نے کہا کہ ہماری زمین کے کون سے درخت سے مشابہ ہے؟ فرمایا: وہ تیری زمین کے درختوں میں سے کسی شے کے مشابہ نہیں ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو ملک شام کو گیا ہے؟ کہا: نہیں، فرمایا: وہ ایک درخت کے مشابہ ہے جو شام میں ہے، وہ جوزہ

---

[1] تفسير الطبري (۲۳/۱۱۷)
[2] صحيح البخاري (۳۰۳۵) صحيح مسلم (۱۶۲)
[3] صحيح البخاري (۱۰۰۴) صحيح مسلم (۹۰۷)
[4] صحيح مسلم (۹۰۴)

پکارا جاتا ہے (معرب کوز)۔ وہ ایک تنے پر اُگتا ہے اور اس کا اوپر کا حصہ منفرش ہوتا ہے۔ عرض کی: اس کے خوشے کی بڑائی کیا ہے؟ فرمایا: ایک ماہ کی راہ ہے سیاہ وسفید کوے کے لیے جو سست نہ ہو، یعنی برابر اڑتا جائے۔ کہا: کیا بڑائی ہے اس کی اصل کی؟ فرمایا کہ اگر تیرے گھر والوں کے اونٹوں میں سے ایک جذعہ (پانچویں برس آیا ہوا اونٹ) کوچ کرتا تو وہ اس کے اصل کا احاطہ نہ کرسکتا، یہاں تک کہ بوڑھا ہو جاتا اور اس کی قوت منکسر ہو جاتی۔ کہا: کیا اس میں انگور ہیں؟ فرمایا: ہاں! کہا: پھر دانے کی بڑائی کیا ہے؟ فرمایا: کیا کبھی تیرے باپ نے کوئی بڑا بکرا ذبح کیا ہے اپنی بکریوں میں سے؟ کہا: ہاں! فرمایا: پھر اس کی کھال اتاری، پھر اسے تیری ماں کو دیا اور کہا کہ ہمارے لیے اسے ایک ڈول بنا؟ کہا: ہاں! اعرابی نے کہا: بے شک وہ دانہ البتہ مجھ کو اور میرے گھر والوں کو سیر کر دے گا۔ فرمایا: ہاں! تیرے سارے کنبے کو سیر کر دے گا۔[1]

﴿ لَا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴾ یعنی وہ منقطع نہ ہوں گے سردی میں نہ گرمی میں، بلکہ اس کے پھل ہمیشہ دائم و مستمر رہیں گے۔ جب کبھی طلب کریں گے تو پائیں گے۔ اللہ پاک کی قدرت سے کوئی شے ان پر سرتابی نہ کرے گی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو ان کے کھانے سے نہ کوئی لکڑی روکے نہ کانٹا اور نہ دوری۔[2] حدیث شریف میں پہلے گزر چکا ہے کہ جب کوئی شخص کوئی پھل لے گا تو اس کی جگہ دوسرا عود کر آئے گا۔[3]

﴿ وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴾ "أَيْ: عَالِيَةٍ وَطِيئَةٍ نَاعِمَةٍ" یعنی بلند اور نرم بچھونے۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ بلندی ان کی ایسی جیسے کہ زمین و آسمان کے درمیان ہے اور ان کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے۔[4] (رواه النسائي و أبو عيسى الترمذي) پھر ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے، ہم اس کو نہیں پہچانتے مگر رشدین بن سعد سے مروی حدیث سے۔ کہا اور بعض اہلِ معانی نے کہا: اس حدیث کے معنی فرش کا درجات میں بلند ہونا ہے اور دو درجوں کے درمیان فاصلہ ایسے ہے جیسے آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ (هكذا قال أنه لا يعرف إلا من رواية رشدين بن سعد وهو المصري وهو ضعيف، هكذا رواه أبو جعفر بن جرير عن أبي كريب عن رشدين به ثم رواه هو و ابن أبي حاتم كلاهما عن يونس بن عبد الأعلى عن ابن وهب عن عمرو بن الحارث فذكره وكذا رواه ابن أبي حاتم أيضا عن نعيم بن حماد عن ابن وهب وأخرجه الضياء في صفة الجنة من حديث حرملة عن ابن وهب به مثله و رواه الإمام أحمد عن حسن بن موسى عن ابن لهيعة حدثنا دراج فذكره كذا في ابن كثير)۔[5] حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اہلِ جنت کے ایک شخص کے بچھونے کی بلندی اسّی (۸۰) برس کی راہ ہے۔[6] (رواه ابن أبي حاتم)

[1] مسند أحمد (۱۸۳/٤) صحيح الترغيب والترهيب (۲٦۳/۳) [2] تفسير ابن كثير (۳۷۱/٤)

[3] المعجم الكبير (۱۰۲/۲) اس کی سند میں "عباد بن منصور" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۳۱٤٦)

[4] سنن الترمذي (۲٥٤۰) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم اور رشدین بن سعد" ضعیف راوی ہیں۔ ضعيف الجامع (٦۱۰۹)

[5] تفسير الطبري (۱۱۸/۲۳) تفسير ابن كثير (۳۷۱/٤) [6] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۳٦/۱۰)

﴿ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴾ میں ضمیر عورتوں کی طرف راجع ہے، حالاں کہ پہلے ان کا ذکر نہیں ہوا لیکن چونکہ سیاقِ کلام یعنی فرش کا ذکر دال ہے ان عورتوں پر جن سے ان پر مضاجعت کی جائے گی (ہم بستری کی جائے گی) اس لیے ان کے ذکر سے اسی پر اکتفا کیا ہے اور ضمیر ان کی طرف راجع ہو گئی ہے۔ جس طرح کہ ﴿ حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴾ [ص: ٣٢] میں ضمیر شمس کی طرف راجع ہے۔ مفسرین کے دو قولوں میں سے مشہور قول یہی ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَنْشَاْنٰهُنَّ ﴾ کی ضمیر عورتوں کی طرف راجع ہے اور اس سے قبل ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا ہوا کرتا ہے کوئی بعید بات نہیں ہے، ان کا ذکر سیاق سے معلوم ہوتا ہے۔

امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴾ میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔[1] بالجملہ مطلب یہ ہے کہ پھر کر دیا ہم نے ان عورتوں کو کنواریاں دوسری اٹھان میں اس کے بعد کہ وہ ثیبہ بڑھیاں ہو چکی تھیں، ان کی آنکھوں سے کیچ بہتا تھا۔ اب وہ جوان کنواری پاکیزہ ہو گئیں۔ "عربا" یعنی اپنے خاوندوں کو پیار دلانے والی شیریں کلامی ولطیفہ گوئی و بذلہ سنجی ونمکین باتوں سے۔ بعض نے کہا ہے کہ "عرب" بہ معنی "غنجات" ہے، یعنی ناز و کرشمہ و ادا کرنے والیاں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: « نِسَاءٌ عَجَائِزُ كُنَّ فِي الدُّنْيَا عُمْشًا رُمْصًا » یعنی وہ عورتیں جو دنیا میں بڑھیاں تھیں چندھی، کمزور نظر والی جن کی آنکھوں سے کیچ بہتی تھی۔[2] (رواه موسى بن عبيدة الربذي عن يزيد الرقاشي عنه أخرجه الترمذي و ابن جرير و ابن أبي حاتم ثم قال الترمذي: غريب، وموسى ويزيد ضعيفان)

سلمہ بن یزید رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ مراد وہ ثیب وابکار عورتیں ہیں جو دنیا میں تھیں۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم)

امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک بڑھیا آئی تو عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے جنت میں داخل کرے تو آپ ﷺ نے فرمایا: او فلاں کی ماں! جنت میں کوئی بڑھیا نہ داخل ہو گی۔ راوی نے کہا: اس نے روتے ہوئے پیٹھ پھیری۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسے خبر دو کہ بے شک وہ اس میں داخل نہ ہو گی اس حال میں کہ بڑھیا ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴾[4] (رواه عبد بن حميد و هكذا رواه الترمذي في الشمائل عن عبد بن حميد)

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا مرفوعاً کہتی ہیں: میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ حُوْرٌ عِيْنٌ ﴾ کے متعلق بتائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "حُوْرٌ بِيْضٌ" یعنی گوریاں ہیں۔ "عِيْنٌ ضِخَامُ الْعُيُوْنِ" یعنی بڑی بڑی آنکھوں والیاں ہیں۔ "شَفْرُ الْحَوْرَاءِ بِمَنْزِلَةِ جَنَاحِ النَّسْرِ" یعنی ان کی پلکوں کے بال ایسے ہیں

---

① تفسير الطبري (١١٨/٢٣)

② تفسير الطبري (١١٩/٢٣) اس کی سند میں "یزید اور موسیٰ" ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٢٠٤)

③ المعجم الكبير (٤٠/٧) اس کی سند میں "جابر جعفی" ضعیف راوی ہے۔

④ الشمائل للترمذي (١٩٧/١، ١٩٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٩٨٧)

جیسے گدھ کے پر۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے متعلق بتائیں: ﴿ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُوِ الْمَكْنُوْنِ ﴾ فرمایا کہ ان کی صفائی ان موتیوں کی صفائی کی طرح ہے جو سیپوں میں ہیں، جن کو ہاتھوں نے نہیں چھوا۔ میں نے کہا: آپ مجھے اس قول کے متعلق بتائیں: ﴿ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴾ [الرحمن: ٧٠] فرمایا: "خَيْرَاتُ الْأَخْلَاقِ حِسَانُ الْوُجُوهِ" یعنی خوش اخلاق خوبصورت۔

میں نے کہا کہ آپ مجھے اس قول کے متعلق بتائیں: ﴿ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴾ [الصافات: ٤٩] فرمایا ان کی رقت اس جھلی کی رقت کی طرح ہے جو انڈے کے اندر ہے، جو چھلکے سے لگی ہوتی ہے اور وہ جھلی غرقی ہے۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے اللہ کے قول ﴿ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴾ کے متعلق بتائیں۔ فرمایا: یہ وہ عورتیں ہیں جو دارِ دنیا میں بڑھیاں قبض کی گئیں، "رُمْصًا شُمْطًا" یعنی آنکھوں سے کیچ بہتیاں، کڑ بڑے بالوں والیاں، اللہ نے ان کو بڑھاپے کے بعد پیدا کیا، پھر ان کو کنوارا کر دیا۔ "عُرُبًا مُتَعَشِّقَاتٍ مُحَبَّبَاتٍ" یعنی خاوندوں سے عشق و محبت رکھنے والیاں۔

"أَتْرَابًا عَلَى مِيلَادٍ وَّاحِدٍ" یعنی ایک عمر کی۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا دنیا کی عورتیں افضل ہیں یا حورِ عین؟ فرمایا: بلکہ دنیا کی عورتیں افضل ہیں حورِ عین سے جس طرح ابرہ استر سے افضل ہوتا ہے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ کس سبب سے ہے؟ فرمایا: ان کی نماز اور ان کے روزے اور ان کے اللہ عزوجل کو پوجنے کے سبب سے، اللہ نے ان کے چہروں کو نور پہنا دیا اور ان کے جسموں کو حریر، وہ گورے رنگ کی سبز لباس والی صفر الحلی، یعنی سنہری زیور والیاں۔ عود دان ان کے موتی اور کنگھیاں ان کی سونا، وہ کہیں گی: "نَحْنُ الْخَالِدَاتُ فَلَا نَمُوتُ أَبَدًا ۔وَنَحْنُ النَّاعِمَاتُ فَلَا نَبْأَسُ أَبَدًا۔ وَنَحْنُ الْمُقِيمَاتُ فَلَا نَظْعَنُ أَبَدًا ۔وَنَحْنُ الرَّاضِيَاتُ فَلَا نَسْخَطُ أَبَدًا۔ طُوبَى لِمَنْ كُنَّا لَهُ وَكَانَ لَنَا" یعنی ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں سو ہم کبھی نہ مریں گی اور ہم آسودہ وخوشحال ہیں سو ہم کبھی محتاج نہ ہوں گی اور ہم رہنے والیاں ہیں سو کبھی کوچ نہ کریں گی اور ہم خوش رہنے والیاں ہیں سو کبھی خفا نہ ہوں گی۔ خوشی ہو اس کو جس کے لیے ہم ہوں اور وہ ہمارے لیے ہوں۔

میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم میں عورت دو خاوند کرتی ہیں اور تین اور چار پھر مرے گی تو جنت میں داخل ہو گی اور وہ بھی داخل ہوں گے تو اس کے ساتھ اس کا کون سا خاوند ہو گا؟ فرمایا: اوامِ سلمہ! بے شک اسے اختیار دیا جائے گا تو وہ اس کو اختیار کرے گی جو سب سے بڑھ کر نیک خلق ہو گا اور کہے گی: اے رب! یہ میرے ساتھ سب سے اچھا تھا خلق میں تو میرا اس سے جوڑا کر دے۔ اوامِ سلمہ! حسنِ خلق دنیا اور آخرت کی خیر لے گیا۔[1] (أخبرنا أبو القاسم الطبراني، حدثنا بكر بن سهل الدمياطي، حدثنا عمرو بن هاشم البيروتي، أخبرنا سليمان بن أبي كريمة عن هشام بن حسان عن الحسن عن أمه عن أم سلمة رضي الله عنها)

---

(1) المعجم الكبير (٣٦٧/٢٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه سليمان بن أبي كريمة وهو ضعيف" مجمع الزوائد (٢٥٥/٧)

صور کی طویل و مشہور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سب مومنوں کی جنت میں داخل ہونے کی شفاعت کریں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تحقیق میں نے تیری شفاعت قبول کی اور میں نے ان کے جنت میں داخل ہونے کا اذن دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ فرماتے تھے: قسم ہے اس کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! تم دنیا میں اپنی بیویوں کو اور اپنے گھروں کو اس سے زیادہ پہچاننے والے نہیں ہو جتنا کہ اہلِ جنت اپنی بیویوں کو اور اپنی رہایش گاہوں کو پہچانیں گے۔ چنانچہ ان میں کا ایک مرد ان بہتر (۷۲) بیویوں پر داخل ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ پیدا کرے گا اور دو بیویوں پر جو اولادِ آدم میں سے ہوں گی، ان کی فضیلت ہے ان پر جن کو اللہ تعالیٰ نے وہاں پیدا کیا۔

اللہ تعالیٰ کی اس عبادت کے سبب سے جو انھوں نے دنیا میں کی۔ وہ ان میں سے پہلی بیوی پر داخل ہوگا، یاقوت کے بالاخانے میں سونے کے ایک تخت پر، جو موتیوں سے جڑا ہوا ہوگا، اس پر ستر بیویاں سندس اور استبرق کا لباس پہنے ہوئے ہوں گی، وہ اپنا ہاتھ اس کے دونوں شانوں کے درمیان رکھے گا، پھر اپنے ہاتھ کی طرف نظر کرے گا، اس کے سینے سے اس کے لباس و جلد و گوشت کے پرے سے، اور بے شک وہ البتہ اس کی پنڈلی کے گودے کی طرف دیکھے گا، جیسے تم میں سے کوئی یاقوت کی نلکی میں رشتے کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کا یعنی مرد کا جگر اس کی بیوی کے لیے آئینہ ہے، اور اس کی بیوی کا جگر اس کے خاوند کے لیے ایک آئینہ ہے۔

چنانچہ اس اثنا میں کہ خاوند بیوی کے پاس ہوگا، نہ خاوند بیوی سے ملول ہوگا اور نہ بیوی خاوند سے اور وہ اس کے پاس جب بھی آئے گا تو اس کو کنواری پائے گا۔ اس کا "ذکر" سست نہ پڑے گا اور نہ ہی اس کی "قُبل" دردمند ہوگی مگر حال یہ ہے کہ "لَا مَنِيَّ وَلَا مَنِيَّةَ" (یعنی جماع خوب ہوگا اور منی نہ نکلے گی۔ "منية" بہ معنی موت ہے اور "منية" بہ معنی آرزو ہے اور وہ ایام ہیں جن میں اونٹنی کا گابھن ہونا معلوم ہو جاتا ہے، ظاہر یہ ہے کہ وہاں نہ منی ہے نہ موت ہے، واللّٰہ أعلم)۔ پھر اس اثنا میں کہ وہ ایسا ہوگا کہ یہ ندا کی جائے گی، بے شک ہم نے واقعی پہچان لیا کہ نہ تو ملول ہوتا ہے نہ وہ ملول ہوتی ہے، مگر تیرے لیے اس کے علاوہ بھی بیویاں ہیں تو وہ نکلے گا، پھر وہ ان کے پاس آئے گا ایک ایک کر کے۔ جب بھی وہ کسی کے پاس آئے گا تو وہ کہے گی: واللہ! جنت میں تجھ سے زیادہ حسین کوئی شے نہیں اور تجھ سے زیادہ محبوب کوئی شے نہیں ہے۔[1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: (قال عبد اللّٰه بن وهب أخبرني عمرو بن الحارث عن دراج عن أبي حجيرة عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ) کیا ہم جنت میں وطی کریں گے؟ فرمایا: ہاں، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! "دَحْمًا دَحْمًا" (''دحم'' وطی بدفع وانزعاج ہے: "أَيُ: يدحمون

---

[1] البعث والنشور للبيهقي (۷۵۲/۱، ۷۵۳) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ ضعيف الترغيب والترهيب (۲۵۲/۲)

دحما" تکرار تاکید کے لیے ہے یا بمعنی دحم بعد دحم ہے۔ فارسی میں دحم بہ معنی سخت سپوختن ہے، یعنی چیزے را در چیزے بعنف وتعدی وزور فرو بردن وبرد آوردن باشد، ایں لغت از اضداد ست) پھر جب وہ اس سے کھڑا ہو جائے گا تو وہ پاک صاف کنواری ہو کر رجوع کر آئے گی۔[1] سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اہلِ جنت جب اپنی عورتوں سے جماع کر چکیں گے تو وہ پھر کنواریاں ہو جائیں گی۔[2] (رواه الطبراني)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ مومن جنت میں ایسی اور ایسی قوت عورتوں میں دیا جائے گا۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اور وہ اس کی طاقت رکھے گا؟ فرمایا: عطا کیا جائے سو مرد کی قوت۔[3] (أخرجه الطيالسي ورواه الترمذي من حديث أبي داود وقال: صحيح غريب) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا ہم جنت میں اپنی عورتوں کی طرف پہنچیں گے؟ (یعنی ان سے جماع کریں گے۔ "وصول إلى النساء" جماع سے کنایہ ہے)۔ فرمایا: بے شک البتہ دن بھر میں مرد ایک سو کنواریوں کی طرف پہنچے گا۔[4] (أخرجه أبو القاسم الطبراني عن محمد بن سيرين عنه) حافظ ابو عبداللہ مقدسی نے کہا: یہ حدیث میرے نزدیک صحیح کی شرط پر ہے۔ واللّٰہ أعلم.

﴿ عُرُبًا ﴾ کی تفسیر میں امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول روایت کیا ہے کہ "أَيْ: مُتَحَبِّبَاتٍ إِلَى أَزْوَاجِهِنَّ أَلَمْ تَرَ إِلَى النَّاقَةِ الضَّبْعَةِ هِيَ كَذٰلِكَ" ("الضبعة" بالتحریک سخت آرزو مند شدن ناقہ بفحل) یعنی خاوندوں کو خوب چاہنے والیاں ہوں گی، ان کی سخت آرزو مند ہوں گی، کیا تو نے نہیں دیکھا اونٹنی کو جو اونٹ کی سخت آرزو مند ہوتی ہے، وہ ایسے ہی ہوں گی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے ان کا یہ قول روایت کیا ہے کہ "اَلْعُرُبُ: اَلْعَوَاشِقُ لِأَزْوَاجِهِنَّ وَأَزْوَاجُهُنَّ لَهُنَّ عَاشِقُوْنَ" یعنی وہ خاوندوں کی عاشق ہوں گی اور ان کے خاوند ان کے عاشق ہوں گے۔

عبداللہ بن سرجس، مجاہد، عکرمہ، ابو العالیہ، یحییٰ بن ابی کثیر، عطیہ، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ثور بن زید عکرمہ سے راوی ہیں کہ کسی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے "عُرُب" کا پوچھا تو فرمایا کہ وہ "مَلِقَةٌ" ہے خاوند کے لیے (تودد وتلطف کنندہ)۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ "غَنِجَةٌ" ہے۔ (قاله شعبة عن سماك عنه) (ناز وکرشمہ کنندہ) ان کا دوسرا قول "شَكِلَةٌ" ہے، (ناز کنندہ)۔ صالح بن حیان نے عبد اللہ بن بریدہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿ عُرُبًا ﴾ "شَكِلَةٌ" ہے اہلِ مکہ کی لغت میں اور "غَنِجَةٌ" ہے اہلِ مدینہ کی لغت میں۔ تمیم بن حدلم نے کہا: وہ "حَسَنُ التَّبَعُّلِ" ہے (یعنی اپنے خاوند سے اچھی مصاحبت ومعاشرت کرے گی، خوش گزران ہو گی، لعب وبازی سے اس کو خوب خوش رکھے گی)۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ اور اُن کے فرزند

---

(1) صحيح ابن حبان (١٦/٤١٥) السلسلة الصحيحة (٣٣٥١) (2) المعجم الصغير (١/١٦٠) السلسلة الصحيحة (٣٣٥١)

(3) مسند الطيالسي (١/٢٦٩) سنن الترمذي (٢٥٣٦) (4) المعجم الأوسط (٥/٢٦٣) السلسلة الصحيحة (٣٦٧)

عبدالرحمان نے کہا ہے کہ "حَسَنَاتُ الْكَلَامِ" ہیں، یعنی اچھی اچھی باتیں کریں گی۔[1] جعفر بن محمد عن ابیہ عن جدہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ان کا کلام عربی ہے۔ (أخرجه ابن أبي حاتم)

﴿ اَتْرَابًا ﴾ امام ضحاک رحمہ اللہ کی روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ "فِيْ سِنٍّ وَاحِدَةٍ ثَلَاثٍ وَّثَلَاثِيْنَ سَنَةً"[2] یعنی ایک سن کی ہوں گی تینتیس (۳۳) سال کی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلْمُسْتَوِيَاتِ"، یعنی برابر ہوں گی۔ ان کا دوسرا لفظ "أَمْثَالٍ" ہے۔ عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: "أَقْرَانٍ" ہے۔ سدی رحمہ اللہ نے کہا اخلاق میں برابر ہوں گی۔ آپس میں بہناپا رکھتی ہوں گی۔ ان کے آپس میں نہ بغض ہوگا نہ حسد ہوگا، یعنی ویسی نہ ہوں گی جیسی سوتنیں آپس میں دشمنی رکھتی ہیں۔ امام حسن اور محمد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ برابر سن کی ہوں گی (یعنی ﴿ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴾ کی تفسیر میں کہا) باہم سب الفت کریں گی اور سب کھیلیں گی۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ بے شک جنت میں البتہ ایک جگہ ہے حورِ عین کے جمع ہونے کے لیے، وہ ایسی آوازیں بلند کریں گی کہ خلائق نے ویسی نہ سنی ہوں گی، وہ کہیں گی: "نَحْنُ الْخَالِدَاتُ فَلَا نَبِيْدُ، وَنَحْنُ النَّاعِمَاتِ فَلَا نَبْأَسُ، وَنَحْنُ الرَّاضِيَاتِ فَلَا نَسْخَطُ، طُوْبَى لِمَنْ كَانَ لَنَا وَكُنَّا لَهُ"[4] (أخرجه الترمذي ثم قال: هذا حديث غريب) (یعنی ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں ہلاک نہیں ہوں گی اور ہم آسودہ رہنے والیاں ہیں محتاج نہیں ہوں گی اور ہم راضی رہنے والیاں ہیں خفا نہیں ہوں گی، خوشی ہو اس کے لیے جو ہمارے لیے ہوا اور ہم اس کے لیے ہوئیں)۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ بے شک حورِ عین جنت میں گائیں گی کہیں گی: "نَحْنُ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ خُبِئْنَا لِأَزْوَاجٍ كِرَامٍ" (یعنی ہم خوش اخلاق خوبصورت ہیں چھپا کر رکھ چھوڑی گئیں عزت دار خاوندوں کے لیے)۔ (رواه الحافظ أبو يعلىٰ) (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اسماعیل بن عمر، یعنی ابویعلیٰ کے استاذ الاستاذ یہ شخص ابوالمنذر واسطی "أحد الثقات الأثبات" ہیں)۔[5] سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت مرفوعاً یہ ہے کہ حورِ عین جنت میں گائیں گی: "نَحْنُ الْجَوَارِيْ الْحِسَانُ خُلِقْنَا لِأَزْوَاجٍ كِرَامٍ"[6] ہم خوب صورت لڑکیاں ہیں اور معزز خاوندوں کے لیے تخلیق کی گئی ہیں۔ (رواه الإمام عبد الرحيم إبراهيم الملقب بدحيم عن ابن أبي فديك عن ابن أبي ذئب عن عون بن الخطاب بن عبد الله بن رافع عن ابن لأنس عن أنس... الخ)

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴾ یعنی وہ عورتیں پیدا کی گئیں یا رکھ چھوڑی گئیں یا اصحابِ یمین کے لیے جوڑا بنائی

---

① تفسير الطبري (۲۳/۱۲۱۔ ۱۲٤) تفسير ابن كثير (۳۷۳) ② تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۳۲) ③ تفسير ابن كثير (٤/۳۷۳)
④ سنن الترمذي (۲٥٦٤) اس کی سند میں "عبدالرحمان بن اسحاق" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (۱۹۸۲)
⑤ تفسير ابن كثير (٤/۳۷٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
⑥ تفسير ابن كثير (٤/۳۷٤) المعجم الكبير (٦/۳۱۲)

گئیں۔ ظاہر تو یہ ہے کہ ﴿ لِاَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴾ ﴿ اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً ﴾ سے متعلق ہے، پس تقدیر یہ ہے: ''إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ'' یعنی ہم نے ان کا انشا کیا اصحاب یمین کے لیے، یہ توجیہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کی ہے۔[1]

حکایت:

امام ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں نے ایک رات نماز پڑھی، پھر میں بیٹھا دعا کرتا تھا، سردی سخت تھی تو میں ایک ہاتھ سے دعا کرنے لگا، پھر مجھے نیند آ گئی تو میں سو گیا۔ میں نے ایک حور دیکھی ویسی کبھی نہ دیکھی گئی اور وہ کہہ رہی ہے: او ابو سلیمان! کیا تو ایک ہاتھ سے دعا کرتا ہے اور میں تیرے لیے پانچ سو برس سے نعیم میں غذا دی جاتی ہوں۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ بھی احتمال ہے کہ ﴿ لِاَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴾ اپنے ما قبل سے متعلق ہو، یعنی ﴿ اَتۡرَابًا ۝ لِّاَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴾ یعنی وہ ہم عمر ہوں گی اصحاب یمین کی۔ (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ہم سنی کی تائید میں بیان کیا ہے، مگر ان الفاظ موجودہ میں اسنان کا ذکر نہیں۔ مصحه سلمه الله تعالیٰ) جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے۔ پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی وہ چودھویں رات کے چاند کی صورت پر ہوں گے اور وہ لوگ جوان کے متصل ہوں گے، وہ روشنی میں آسمان کے سخت روشن ستارے کی طرح ہوں گے، وہ وہاں نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ پھریں گے، نہ تھوکیں گے اور نہ ناک سنکیں گے، ان کی کنگھیاں سونا ہیں اور ان کا پسینہ مشک ہے اور ان کی عود (خوشبو) الوہ ہے، (یعنی چوب عود) ان کے اخلاق یعنی پیدائش اپنے باپ آدم کی صورت پر ہوگی ساٹھ گز آسمان میں یعنی لمبائی میں۔[3] (أخرجه البخاري و مسلم، من حديث جرير عن عمارة بن القعقاع عن أبي زرعة عنه)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: اہل جنت، جنت میں « جُرْدًا مُرْدًا بِيضًا جِعَادًا » داخل ہوں گے (''جعادا'' جمع ہے ''جعد'' کی۔ ''جعد'' مردوں کی صفات میں مدح و ذم دونوں ہوتا ہے۔ مدح میں تو اس کے معنی ہیں: ''شديد الأسر و الخلق'' یا ''جعد الشعر'' یہ ضد ہے: ''سبط الشعر'' کے کہ اکثر عجم کے بالوں میں سبوطت ہوتی ہے اور ذم میں اس کے معنی قصیر و بخیل کے آتے ہیں۔ یہاں مراد مدح یعنی قوی جسم) ''مُكَحَّلِيْنَ أَبْنَاءُ ثَلَاثٍ وَّثَلَاثِيْنَ وَهُمْ عَلَى خَلْقِ آدَمَ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا فِيْ عَرْضِ سَبْعَةِ أَذْرُعٍ »[4] (رواه الإمام أحمد، حدثنا يزيد بن هارون و عفان قالا: حدثنا حماد بن سلمة و روى الطبراني و اللفظ له من حديث حماد بن سلمة عن علي بن زيد بن جدعان عن سعيد بن المسيب عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ... الخ)۔ یعنی ان کے بدن پر بال نہ ہوں گے اور نہ

---

[1] تفسير الطبري (١٢٥/٢٣) [2] تفسير ابن كثير (٣٧٤/٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٤)

[4] مسند أحمد (٢٩٥/٢) المعجم الصغير (٧٥/٢) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہے۔

چہرے پر ہوں گے۔ گورے قوی سرگیں چشم ہوں گے، تینتیس (۳۳) سال کی عمر کے اور وہ آدم علیہ السلام کی خلق پر ہوں گے ساٹھ گز کے، سات گز کے عرض میں۔

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: «يَدْخُلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ جُرْدًا مُرْدًا مُكَحَّلِيْنَ بَنِيْ ثَلَاثٍ وَّثَلَاثِيْنَ سَنَةً »① (رواه الترمذي من حديث أبي داود الطيالسي بسنده ثم قال: حسن غريب) سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اہلِ جنت میں سے جو کوئی فوت ہوا چھوٹا یا بڑا وہ تینتیس (۳۳) برس کی عمر میں روکے جائیں گے جنت میں، اس عمر سے زیادہ کبھی نہ ہوں گے اور اسی طرح اہلِ نار بھی ہوں گے۔② (رواه ابن وهب بسنده، رواه الترمذي عن سويد بن نصر عن ابن المبارك عن رشدين بن سعد عن عمرو الحارث)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: "يَدْخُلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ عَلَى طُوْلِ آدَمَ علیہ السلام سِتِّيْنَ ذِرَاعًا بِذَرْعِ الْمَلَكِ عَلَى حُسْنِ يُوْسُفَ علیہ السلام وَعَلَى مِيْلَادِ عِيْسَى علیہ السلام ثَلَاثٍ وَّثَلَاثِيْنَ سَنَةً وَعَلَى لِسَانِ مُحَمَّدٍ جُرْدٌ مُرْدٌ مُكَحَّلُوْنَ"③ (رواه ابن أبي الدنيا) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت مرفوعاً یہ ہے کہ اہلِ جنت، جنت میں آدم علیہ السلام کی صورت پر بھیجے جائیں گے تینتیس برس کی عمر میں جرد مرد مکحل ہو کر۔ پھر ان کو ایک درخت کی طرف لے جائیں گے، پھر ان کو وہاں سے لباس پہنایا جائے گا جو پرانا نہ ہوگا اور ان کی جوانی فنا نہ ہوگی۔④ (أخرجه أبو بكر بن أبي داود)

﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہاں ایک طویل حدیث بروایت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ذکر کی ہے (اس کا مخرج ابن ابی حاتم ہیں) جس میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرنے کا ذکر ہے۔⑤ اس کے بعد کہا ہے کہ صحاح وغیرہ میں اس کے سوا اور بہت طریق ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ دونوں جمیعاً میری امت سے ہیں۔⑥ (أخرجه ابن جرير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴾ مبتداء ہے اور جملہ ﴿ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴾ خبر ہے، اس میں جو تعظیم و تفخیم ہے اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے اور ﴿ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴾ خبرِ ثانی ہے، یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے "أَيْ: هُمْ". ظرفیت

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٤٥) صحيح الترغيب والترهيب (٣/٢٥٦)

② سنن الترمذي (٢٥٦٢) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم اور رشدین" ضعیف راوی ہیں۔ ضعيف الجامع (٥٨٥٢)

③ تفسير ابن كثير (٤/٣٧٤، ٣٧٥) اس کی سند میں راوی "ہارون بن رئاب" کے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے سماع میں اختلاف ہے۔ نیز "رواد بن جراح" ضعیف راوی ہے۔

④ تفسير ابن كثير (٤/٣٧٥) اس کی سند میں راوی "ہارون بن رئاب" کے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے سماع میں اختلاف ہے۔

⑤ تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٣٢، ٣٣٣٣)

⑥ تفسير الطبري (٢٣/١٢٨) تفسير ابن كثير (٣٦٧-٣٧٥) اس کی سند میں "ابان بن ابی عیاش" سخت ضعیف راوی ہے۔

سے منظور تنعم میں اور اس سے نفع لینے میں مبالغہ ہے، یعنی اصحابِ یمین جنت کی اشیاء ﴿ سِدْرٍ ﴾ وغیرہ سے خوب خوب نفع لیتے ہیں۔ گویا یہ سب اشیاء ظرف ہیں اور وہ مظروف۔ ﴿ سِدْرٍ ﴾ درختوں میں سے ایک قسم کا درخت ہے، کہتے ہیں کہ اس کے پھل مٹکوں سے زیادہ بڑے ہیں، اس کے پھل کو ''نبق'' کہتے ہیں، یعنی بیر۔ ﴿ مَخْضُوْدٍ ﴾ وہ ہے جس کے کانٹے قطع کیے گئے، چنانچہ اس میں کانٹے نہیں ہیں (امیہ بن ابی الصلت جنت کی صفت کرتا ہے:

إِنَّ الْحَدَائِقَ فِيْ الْجِنَانِ ظَلِيْلَةٌ فِيْهَا الْكَوَاعِبُ سِدْرُهَا مَخْضُوْدٌ)

اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں ﴿ طَلْحٍ ﴾ سے مراد کیلے کے درخت ہیں۔ ایک جماعت نے کہا ہے کہ کیلے کے درخت نہیں ہیں، لیکن وہ تو یہی ﴿ طَلْحٍ ﴾ معروف ہے جو عرب کے درختوں میں سے سب سے بڑا درخت ہوتا ہے۔ امام فراء اور ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ طَلْحٍ ﴾ بڑے بڑے درخت ہیں، ان کے کانٹے ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ طَلْحٍ ﴾ وہ درخت ہیں جن کا سایہ ٹھنڈا اور بہت اچھا ہوتا ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ طَلْحٍ ﴾ ام غیلان ہے، یعنی ببول کا درخت اور اس کے پھول طیب ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ خطاب کیے گئے اور وعدہ دیے گئے ایسی چیز کا جس کو وہ محبوب رکھتے ہیں، لیکن اس کی فضیلت دنیا کی چیزوں پر ایسی ہے جیسی جنت کی تمام چیزوں کی دنیا کی اشیاء پر فضیلت ہے اور جائز ہے کہ ﴿ طَلْحٍ ﴾ جنت میں ہو اور اس کے کانٹے دور کر دیے گئے ہوں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے ویسا کہا ہے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔[1]

﴿ مَنْضُوْدٍ ﴾ وہ متراکب (ایک پر ایک چڑھا ہوا) ہے جس کا اول وآخر واسفل واعلیٰ میوے کے ساتھ تہہ بہ تہہ کیا گیا ہے۔ اس کے تنے کھلے ہوئے نہیں ہیں، یعنی نیچے سے اوپر تک میوے سے لدا ہوا ہے۔ امام مسروق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت کے درخت اپنی جڑوں سے ٹہنیوں تک ''نضید'' ہیں، سب کے سب میوے ہیں۔ جب کبھی تو کوئی پھل لے گا تو اس سے بہتر اور اس کی جگہ پر آ جائے گا۔[2] جنت کے میووں میں سے کوئی شے دنیا کے میووں کی طرح غلاف میں نہیں ہے، جیسے: ''بَاقِلَا وَجَوْز'' اس طرح کے اور، بلکہ وہ تو سب کے سب کھائے اور پیے جانے والے اور نظر آنے والے ہیں۔

﴿ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴾ یعنی سایہ دائم و باقی رہنے والا، نہ وہ زائل ہوگا اور نہ اسے سورج مٹائے گا جس طرح کہ اہلِ دنیا کا سایہ زائل ہو جاتا ہے۔ وہ سایہ ممتد و منبسط رہے گا، جیسا کہ طلوعِ فجر اور طلوعِ شمس کے درمیانی وقت میں سایہ ہوتا ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طویل ہر شے جو منقطع نہیں ہوتی عرب لوگ اس کو ممدود کہتے ہیں، اسی باب سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ﴾ [الفرقان: ٤٥] ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ

---

[1] تفسير القرطبي (١٧/٢٠٧، ٢٠٨)
[2] تفسير القرطبي (١٧/٢٠٩)

کے رب نے سائے کو کس طرح پھیلا دیا ہے؟"[1] جنت سب کی سب ایک ایسا سایہ ہے کہ اس کے ساتھ سورج نہیں ہے۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد سایۂ عرش ہے۔[2] ﴿ مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴾ یعنی آبِ ریزیدہ و جاری کہ رات اور دن بہتا رہے گا (یعنی ہمیشہ ورنہ وہاں رات دن کہاں ہیں) جہاں کہیں وہ چاہیں گے، ان سے منقطع نہ ہو گا۔ پس وہ ﴿ مَسْكُوْبٍ ﴾ ہے، اللہ پاک اس کو اس کے جاری ہونے کی جگہ میں بہائے گا۔ "سکب" کی اصل صب ہے، یعنی ریختن "يُقَالُ: سَكَبَهُ سَكَبًا أَيْ: صَبَّهُ" یعنی وہ جاری ہے بلاحد و بلاخد، مطلب یہ ہے کہ وہ گڑھے میں نہ بہے گا، جیسے دنیا کا پانی بہتا ہے۔

﴿ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴾ اور قسم قسم کے بہت سے میووں میں ہیں۔ ﴿ لَّا مَقْطُوْعَةٍ ﴾ ﴿ فَاكِهَةٍ ﴾ کی تعریف ہے اور حرفِ ﴿ لَا ﴾ نفی کا ہے، جیسے کہتے ہو کہ "مَرَرْتُ بِرَجُلٍ لَا طَوِيْلٍ وَلَا قَصِيْرٍ" اور اسی لیے اس کی تکرار ضروری ہوئی، یعنی ایسے میوے کہ وہ کسی بھی وقت میں قطع کیے ہوئے نہیں ہیں، جس طرح کہ دنیا کے پھل بعض اوقات میں منقطع ہو جاتے ہیں۔ ﴿ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴾ یعنی اور ایسے میوے کہ وہ منع کیے گئے نہیں ہیں، وہ اس شخص پر رکتے نہیں ہیں جو کسی صفت پر کسی وقت میں بھی ان کا ارادہ کرے، بلکہ وہ تو اس شخص کے لیے تیار رکھے گئے ہیں جو ان کا ارادہ کرے۔ اس کے اور اُن کے درمیان کوئی شے حائل نہیں ہوتی، وہ قیمت ہو یا دیوار یا دروازہ یا سیڑھی یا دوری۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴾ [الدھر: ۱۴] "اور ان کے (میوے اور) گچھے نیچے لٹکائے ہوئے ہوں گے۔" امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ان پر کوئی رکاوٹ نہیں کی گئی، جیسے دنیا میں باغوں پر رکاوٹ کی جاتی ہے۔[3]

﴿ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴾ یعنی ان بچھونوں میں سے ایسے بچھونے ہیں کہ بعض بعض کے اوپر اٹھائے گئے ہیں، یا تختوں پر مرفوع ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں فرش کنایہ ہے ان عورتوں سے جو جنت میں ہیں، ان کا بلند ہونا یہ ہے کہ وہ تختوں پر ہیں، یا یہ کہ حسن و کمال میں ان کی قدریں اور مرتبے مرتفع اور بلند ہیں۔

﴿ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴾ یعنی ہم نے ان کی اچھی طرح سے انشا و ایجاد کی کہ یہ حورِ عین ہیں۔ اللہ پاک نے ان کو انشا و ایجاد کیا ان پر ولادت واقع نہیں ہوئی اور نہ خلق ان پر سابق ہوئی۔ یہ آدم کی اولاد سے نہیں ہیں، بلکہ اختراع کی ہوئی نو پیدا شدہ ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ وغیرہ اسی قول پر چلے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ بنی آدم کی عورتیں مراد ہیں، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے موت کے بعد جوانی کی حالت میں ان کا اعادہ کر دیا، یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دنیا کی عورتوں کو ایک نئی خلق کر کے پیدا کر دے گا بغیر ولادت کے واسطے سے۔ یہ پیدا کرنا ایسا ہوگا جو دوام اور بقا کے مناسب ہے اور یہ اس کو مستلزم ہے کہ ہر لحاظ سے مکمل پیدائش ہو جس میں پوری قوتیں ہوں اور نقص کی کوئی

---

[1] اس معنی میں لبید کا قول ہے: غلب العزاء وكان غير مغلب دهر طويل دائم معدود

[2] تفسير القرطبي (۲۰۹/۱۷) [3] فتح القدير (۲۰۳/۵)

علامت نہ ہو جس طرح کہ حورِ عین اسی طرح پر پیدا کی گئی ہیں۔ اگر چہ عورتوں کا ذکر پہلے نہیں گزرا لیکن وہ اصحاب الیمین میں داخل ہیں اور جس نے یہ کہا ہے: ﴿ وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴾ عورتوں سے کنایہ ہے تو اب ضمیر کا مرجع ظاہر ہے۔

﴿ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴾ یعنی پھر ہم نے ان کو ابکار کر دیا۔ ان سے پہلے ان کو نہ کسی انسان نے چھوا اور نہ کسی جن نے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ اَبْكَارًا ﴾ "عَذَارَی" ہیں،[1] یعنی کنواریاں جب کبھی ان کے خاوند ان کے پاس آئیں گے تو ان کو کنواریاں پائیں گے۔ ازالۂ بکارت کا ان کو کچھ درد نہ ہوگا۔ ﴿ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴾ "عُرُبٌ"، "عَرُوْبٌ" کی جمع ہے، یعنی اپنے خاوندوں کی چاہنے والی ان سے اچھا برتاؤ رکھنے والی۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے خاوند کی عاشق۔

جمہور نے "عُرُبٌ" کو بہ ضمِ عین و راء پڑھا ہے اور امام حمزہ رحمہ اللہ وغیرہ نے (یعنی ابوبکر عن عاصم نے) بہ اسکانِ راء پڑھا ہے، یہ فعول کی جمع میں دو لغت ہیں[2] اور دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ "أَتْرَابٌ"، "تِرْبٌ" کی جمع ہے۔ "تِرْبٌ" وہ ہے جو عمر میں تمھارا مساوی ہو، اس لیے کہ ایک وقت میں دونوں کی جلد کو خاک چھوتی ہے۔ ہم سن ہونا، باہم الفت ہونے کے لیے زیادہ تر مؤثر ہوتا ہے۔ "ترب" ان اسموں میں سے ہے جو اضافت سے معرفہ نہیں بنتے، کیوں کہ صفت کے معنی میں ہے، اس لیے کہ "تِرْبُكَ"، کے معنی "مُسَاوِيْكَ" ہیں، اسی کے مثل "خِدْنُكَ"، ہے، کیوں کہ "صَاحِبُكَ"، کے معنی میں ہے۔ عورتوں میں تو "أَتْرَابٌ" بولا جاتا ہے اور مردوں میں "أَقْرَانٌ"۔

﴿ لِاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴾ متعلق ہے ﴿ اَنْشَاْنٰهُنَّ ﴾ سے، یا "جَعَلْنَا" سے، یا "أَتْرَاب" سے، یعنی ہم نے ان کو انشا کیا یا پیدا کیا اصحابِ یمین کے لیے، یا وہ ان کے مساوی ہیں سن (عمر) میں، یا خبر ہیں مبتدائے محذوف کی "أَيْ: هُنَّ لِأَصْحَابِ الْيَمِيْنِ"، یا "هٰذَا الَّذِيْ ذُكِرَ لَهُمْ" ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿39﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ یہ راجع ہے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ مَاۤ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴾ کی طرف "أَيْ: هُمْ ثُلَّةٌ... الخ"۔ ﴿ ثُلَّةٌ ﴾ کی تفسیر سابقین کی تفسیر کے تحت گزر چکی ہے، معنی یہ ہیں کہ اصحابِ یمین ایک جماعت ہیں، یا ایک امت، یا ایک فرقہ، یا ایک قطعہ ہیں اولین سے اور یہ آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک ہیں اور ایک جماعت، یا ایک امت، یا ایک فرقہ، یا ایک قطعہ ہیں آخرین سے اور یہ لوگ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی امام مجاہد، عطاء بن ابی رباح اور ضحاک رحمہم اللہ) نے کہا ہے کہ ایک ثلۃ اولین سے اس معنی میں کہ اس امت کے سابقین سے اور ایک ثلۃ آخرین سے اس معنی میں کہ اس امت کے آخر سے۔[3] سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جمیع ثلتین اس امت سے ہیں۔ (أخرجه مسدد وغيره يعني ابن المنذر والطبراني بسند حسن)

[1] فتح القدير (۲۰۷/۵) [2] فتح القدير (۲۰۳/۵) [3] تفسير القرطبي (۲۱۲،۲۱۱/۱۷)

ان کا دوسرا قول یہ ہے: ''هُمَا جَمِيعًا مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ''.[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت یہ ہے:

«هُمَا جَمِيعًا مِنْ أُمَّتِي»[2] (أخرجه عبد بن حميد وغيره يعني وابن عدي والفريابي وغيرهم قال السيوطي: بسند ضعيف) ان کا دوسرا قول یہ ہے: ''اَلثُّلَّتَانِ جَمِيعًا مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ''. امام ابوالعالیہ رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی امام مجاہد، عطاء بن ابی رباح اور ضحاک رحمہم اللہ) بھی اسی کے قائل ہیں[3] اور یہی امام زجاج رحمہ اللہ کا مختار ہے۔[4]

اب اگر کوئی کہے کہ اس سے قبل ﴿ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ کیوں فرمایا؟ پھر یہاں ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ کہا؟ تو کہیں گے کہ وہ تو سابقین اولین میں ہیں اور آخرین میں سے جو ان کے ساتھ لاحق ہوں گے وہ قلیل ہیں اور یہ اصحاب یمین میں ہے اور یہ اولین و آخرین دونوں میں سے کثیر ہوں گے۔ پھر جب اللہ پاک اس شے کے بیان سے فارغ ہوا جو اصحابِ یمین کے لیے تیار کی گئی ہے تو اس شے کا ذکر شروع کیا جو اصحابِ شمال کے لیے مہیا کی گئی ہیں۔ چنانچہ فرمایا:[5]

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿41﴾ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿42﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿43﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿44﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿45﴾ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿46﴾ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿47﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿48﴾ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿49﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿50﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿51﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿52﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿53﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿54﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿55﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿56﴾

اور بائیں (ہاتھ) والے، کیا (حقیر) ہیں بائیں ہاتھ والے! (41) (وہ) سخت گرم ہوا اور کھولتے پانی میں (ہوں گے) (42) اور سیاہ ترین دھویں کے سائے میں (43) نہ (وہ) ٹھنڈا ہوگا اور نہ فرحت بخش (44) بلاشبہ وہ اس سے پہلے نازوں میں پلے تھے (45) اور وہ بڑے گناہ (شرک) پر اصرار کرتے تھے (46) اور وہ کہتے تھے: کیا جب ہم مرجائیں گے اور ہم مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا فی الواقع ہم دوبارہ اُٹھائے جائیں گے؟ (47) کیا (ہم) اور ہمارے پہلے باپ دادا

[1] الدر المنثور (١٩/٨) فتح القدير (٢٠٧/٥)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] تفسیر القرطبي (٢١١/١٧، ٢١٢)
[4] معاني القرآن (١١٣/٥)
[5] فتح البيان (٣٦٥/١٣ـ٣٧٠)

بھی؟ (48) (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: بلاشبہ پہلے بھی اور پچھلے بھی (49) یقیناً ایک معلوم دن کے مقرر وقت پر (سب) جمع کیے جائیں گے (50) پھر یقیناً تم اے گمراہو! جھٹلانے والو! (51) (تم) تھوہر کے درخت سے ضرور کھانے والے ہو گے (52) پھر اس سے اپنا پیٹ بھرنے والے ہو گے (53) پھر اس پر کھولتے پانی سے پینے والے ہو گے (54) تو پیاسے اونٹوں کے پینے کی طرح پینے والے ہو گے (55) روزِ قیامت یہ ہو گی ان کی مہمانی (56)

اصحابِ شمال اور ان کا انجامِ بد:

شمال اور مشئمہ کے ایک معنی ہیں۔ ﴿ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ﴾ مبتداء ہے اور ﴿ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ﴾ خبرِ اول اور ﴿ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ﴾ خبرِ ثانی ہے۔ یا مبتدائے محذوف کی خبر ہے ''أَيْ: هُمْ''، یعنی بائیں والے، کیا ہیں بائیں والے، یعنی وہ کس شے میں ہیں؟ پھر اس کی تفسیر فرمائی کہ وہ سموم اور حمیم میں ہیں۔ ﴿ سَمُوۡمٍ ﴾ گرم ہوا یا آگ کی گرمی۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ گرم ہوا ہے جو بدن کے مسام میں گھستی ہے۔ ﴿ حَمِیۡمٍ ﴾ وہ گرم پانی ہے جس کی گرمی شدید ہو۔ ان دونوں کا بیان گزر چکا ہے۔ ''یحموم'' یفعول کا وزن ہے ''أحم'' سے ''أحم'' بہ معنی ''أسود'' ہے۔ جب کوئی شے سخت سیاہ ہوتی ہے تو عرب لوگ اس کو ''أسود یحموم'' کہتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ دوزخی لوگ گھبرا کر سائے کی طرف جائیں گے تو اسے جہنم کے نہایت سیاہ دھوئیں کا سایہ پائیں گے۔ کسی نے کہا: ﴿ یَحۡمُوۡمٍ ﴾ ماخوذ ہے ''حم'' سے۔ ''حم'' اس چربی کو کہتے ہیں جو آگ کے جلانے سے سیاہ پڑ جاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''حمم'' سے ماخوذ ہے، یعنی کوئلہ اور راکھ۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آگ سیاہ ہے اور اس کے لوگ کالے ہیں اور ہر شے جو اس میں ہے وہ سیاہ ہے۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: ﴿ یَحۡمُوۡمٍ ﴾ سیاہ دھواں ہے۔ ایک قول کے مطابق دخانِ جہنم ہے۔ تیسرا قول ''ظل الدخان'' ہے۔ اسی طرح امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی امام عکرمہ، ابو صالح، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم) نے بھی کہا ہے۔ [2] کسی نے کہا ہے کہ جہنم میں ایک وادی ہے، یا نار کے ناموں میں سے ایک نام ہے، لیکن زیادہ ظاہر یہی قول ہے کہ ﴿ یَحۡمُوۡمٍ ﴾ سخت سیاہ دھواں ہے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰی مَا کُنۡتُمۡ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۲۹﴾ اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰی ظِلٍّ ذِیۡ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِیۡلٍ وَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ اللَّہَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّہَا تَرۡمِیۡ بِشَرَرٍ کَالۡقَصۡرِ ﴿۳۲﴾ کَاَنَّہٗ جِمٰلَتٌ صُفۡرٌ ﴿۳۳﴾ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴾ [المرسلات: ۲۹۔ ۳۴] ''اس دوزخ کی طرف جاؤ جسے تم جھٹلاتے رہے تھے، چلو تین شاخوں والے سائے کی طرف جو در اصل نہ سایہ دینے والا ہے اور نہ

---

(1) تفسیر القرطبي (۱۷/۲۱۳) (2) تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۳۳)

شعلے سے بچا سکتا ہے۔ یقیناً دوزخ چنگاریاں پھینکتی ہے جو مثل محل کے ہیں، گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں۔ آج ان جھوٹ جاننے والوں کی درگت ہے۔''

پھر اللہ پاک نے اس ظل کا یہ وصف بیان کیا: ﴿لَا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيمٍ﴾ یعنی یہ سایہ ان سایوں کی طرح نہیں جو سرد ہوتے ہیں، بلکہ یہ تو گرم اور ضرر رساں ہے، اس لیے کہ نارِ جہنم کے دھوئیں سے ہے۔ کریم نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں حسنِ منظر نہیں ہے اور ہر شے جس میں کسی طرح کی خیر وخوبی نہیں ہوتی تو وہ کریم نہیں ہے۔ یہ قول امام سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کا ہے، یا یوں کہو کہ وہ نہ طیب الهبوب ہے اور نہ حسن المنظر،[1] جیسا کہ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے: ''وَلَا كَرِيمِ الْمَنْظَرِ'' یعنی اس کی صورت اچھی نہیں ہے آنکھوں کو بھلی نہیں لگتی۔

چنانچہ خود اللہ پاک نے اس کی ہولناک صورت آیتِ مذکورہ میں بیان فرما دی ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر پینے کی شے جو شیریں نہیں ہوتی تو وہ کریم نہیں ہے۔[2] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ کریم کو ہر اس شے کے تابع ٹھہراتے ہیں جس سے کسی وصف کی نفی کرتے ہیں، اس سے ان کی مراد مذمت ہوتی ہے۔ یوں بولتے ہیں: ''مَا هُوَ بِسَمِينٍ وَلَا كَرِيمٍ وَمَا هَذِهِ الدَّارُ بِوَاسِعَةٍ وَلَا كَرِيمَةٍ''[3] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ عرب اس لفظ کو نفی کا تابع کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ''هَذَا الطَّعَامُ لَيْسَ بِطَيِّبٍ وَلَا كَرِيمٍ ـ هَذَا اللَّحْمُ لَيْسَ بِسَمِينٍ وَلَا كَرِيمٍ، وَهَذَا الدَّارُ لَيْسَتْ بِنَظِيفَةٍ وَلَا كَرِيمَةٍ''[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿لَا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيمٍ﴾ ﴿ظِلٍّ﴾ کی دو صفتیں ہیں: ﴿يَحْمُومٍ﴾ کی نہیں ہیں۔ اب اگر کوئی کہے کہ اس بنا پر یہ بات لازم آئے گی کہ صفتِ غیر صریح مقدم ہو صریح پر (یعنی ''من يحموم أي: ظل كائن من يحموم'' اور صریح صفت ﴿لَا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيمٍ﴾ ہے) تو کہیں گے کہ یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا، اس لیے کہ صفات میں ترتیب واجب نہیں ہے۔ رضی نے اس پر نص کی ہے باوجود اس کے کہ یہاں ترتیب اس بات کی طرف مفضی ہوگی کہ دو فاصلے باہم ہم وزن نہ ہوں۔ دوسرے یہ ہے کہ ان کو ﴿يَحْمُومٍ﴾ کی دو لغتیں ٹھہرانا بلاغتِ قرآنی کے مناسب نہیں ہے۔

نکتہ:

ظاہر کا حق یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: ''وَظِلٍّ حَارٍّ ضَارٍّ'' سو اس کو چھوڑ کر ﴿وَظِلٍّ مِّن يَحْمُومٍ﴾ فرمایا۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ پہلے پہل ذہن میں جلدی سے ظلِ متعارف آ جائے تو سننے والا طمع کرے، پھر سردی اور راحت کی طلب جو ظل سے مطلوب ہے، جب اس کی اس سے نفی کی گئی تو سخریہ وتہکم (تمسخر اور مذاق) آ گیا اور اس بات کی

[1] تفسير الطبري (٢٣/١٢٩ـ١٣٠) [2] تفسير الطبري (٢٣/١٣٠، ١٣١) تفسير ابن كثير (٤/٣٧٦)
[3] فتح القدير (٥/٢٠٤) [4] تفسير الطبري (٢٣/١٣٠)

تعریض ہوئی کہ جس سائے میں بردو اکرام ہے اس کے مستحق ان کے سوا اور لوگ ہیں تو یہ بات زیادہ تر ان کو تکلیف دے گی اور اُن کے حسرت کرنے کے لیے زیادہ سخت ہوگی۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان تین امور میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے، کیوں کہ اگر وہ ہوا چلنے کی جگہ کے سامنے آئیں گے تو ان کو سموم لگے گی اور اگر وہ بچاؤ طلب کریں گے جس طرح وہ کرتا ہے جو اپنے نفس سے سموم کو دفع کرتا ہے، اس طرح سے کہ بچاؤ کی جگہ میں چھپ جاتا ہے تو وہ سیاہ دھوئیں کے سائے میں ہوں گے۔ چنانچہ عذاب سے ان کو کسی طرح کی چھٹی نہیں ہے، یا یوں کہا جائے کہ سموم کافر کو مارے گی تو پیاسا ہوگا اور سموم کی آگ اس کے پیٹ میں شعلہ زن ہوگی تو پانی پیے گا، پھر وہ اس کی آنتیں کاٹ ڈالے گا، پھر چاہے گا کہ کوئی سایہ طلب کرے تو وہ سایہ سیاہ دھواں ہوگا۔[1] ﴿ سَمُوْمٍ وَّ حَمِیْمٍ ﴾ کا ذکر کیا نار کا ذکر نہیں فرمایا؟ تو یہ ادنیٰ سے اعلیٰ پر تنبیہ ہے۔ گویا یوں کہا ہے کہ ان کے نزدیک دنیا میں جو بہت ٹھنڈی اشیاء تھیں، وہ یہاں گرم ہیں تو پھر دنیا میں جو بہت گرم شے ہے وہ کیسی ہوگی! (كذا ذكر الخطيب)

پھر اللہ پاک نے ان کے اعمال کا ذکر کیا جن کی وجہ سے وہ اس عذاب کے مستحق ہوئے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِیْنَ ﴾ یعنی ان کے عذاب کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ عذاب جو ان پر نازل ہوا اس سے پہلے وہ دنیا میں اس شے کے ساتھ متنعمین تھے جو ان کو حلال نہیں تھی۔ اپنی جانوں کے مزوں کی طرف توجہ دیتے تھے اور جس شے کو رسول لے کر آئے اس پر کوئی توجہ نہیں کرتے تھے۔ دنیا کی اور نفسانی لذتوں، نعمتوں اور عیش و عشرت میں ڈوبے رہتے تھے، چنانچہ ان سب چیزوں نے ان کو باز رہنے سے روکا اور عبرت حاصل کرنے سے باز رکھا۔ یہاں جو دولت مندی، آسودگی اور نعمتوں کی مذمت ہوئی، وہ صرف اس اعتبار سے کہ انھوں نے اطاعت سے ہٹ کر اور منہ موڑ کر بیٹھ رہنے کو اس کے جملے سے ٹھہرایا تو اس اعتبار سے ان کی مذمت ٹھیک ہوئی، کیوں کہ آسودگی اپنی حد سے اندر رہتے ہوئے قابلِ مذمت نہیں ہے۔

﴿ مُتْرَفِیْنَ ﴾ بہ معنی ''مُتَنَعِّمِیْنَ'' ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکین۔[2] کسی نے کہا کہ متکبرین۔ قولِ اول زیادہ بہتر ہے۔ یہ بات کہ اصحابِ شمال میں تو ان کے عذاب کے سبب کا ذکر کیا اور اصحابِ یمین میں ان کے ثواب کا سبب ذکر نہیں فرمایا؟ تو اس کی حکمت یہ ہے کہ اس بات پر آگاہ کرنا منظور ہے کہ ثواب تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل ہے اور سزا اس کی جانب سے عدل ہے اور فضل کے لیے بہتر ہے کہ اس کے سبب کا ذکر کیا جائے یا نہ کیا جائے، اس تفضّل کرنے والے کی شان میں نہ کسی نقصان کا خیال ہوسکتا ہے نہ ظلم کا۔

---

[1] تفسير الرازي (١٤٧/٢٩) [2] تفسير القرطبي (٢١٣/١٧)

اب رہا عدل تو اگر سزا کا سبب ذکر نہ کیا جائے تو یہ خیال کیا جائے گا کہ وہ ظالم ہے اور اس پر یہ بات دال ہے کہ اللہ پاک نے اصحابِ یمین کے حق میں ﴿ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ نہیں کہا جیسا کہ سابقین کی شان میں فرمایا ہے، اس لیے کہ اصحابِ یمین نے تو فضلِ عظیم کے سبب سے نجات پائی نہ کہ بوجۂ عمل کے بہ خلاف اس شخص کے جس کی نیکیاں کثیر ہوئیں، بے شک اس شخص کے حق میں جزا کا اطلاق اچھا ہوتا ہے۔[1] (كذا قال الإمام الرازي)

بالجملہ عقاب کا دوسرا سبب یہ ہے: ﴿ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴾ "حنث" بہ معنی گناہ ہے، یعنی وہ گناہِ عظیم پر قائم رہتے تھے اور توبہ کی نیت نہیں کرتے تھے۔ مراد اللہ پاک کے ساتھ کفر کرنا اور اوثان و انداد کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب ٹھہرانا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہلِ تفسیر نے کہا ہے کہ اس سے مراد شرک ہے،[2] کیوں کہ یہ عہدِ میثاق کو توڑنا ہے اور حنث اس عہد کو توڑنا ہے جو قسم کے ساتھ پکا کیا گیا ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ حنثِ عظیم شرک ہے۔ اسی طرح امام حسن، ضحاک، ابن زید، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی کہا ہے۔ امام قتادہ اور مجاہد رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ عظیم گناہ ہے جس سے توبہ نہیں کرتے ہیں۔

امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یمینِ غموس ہے،[3] یہ یوں ہے کہ وہ اس بات پر قسم کھاتے تھے کہ مبعوث نہ ہوں گے اور اس میں جھوٹ بولے۔ اس پر یہ آیت دال ہے: ﴿ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَىِٕذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴾ ہمزہ دونوں جگہ انکار اور استبعاد کا ہے۔ ظرف میں عامل وہ شے ہے جس پر "مَبْعُوْثُوْنَ" دال ہے اس لیے کہ استفہام کا مابعد اس کے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ "أَيْ: أَ نُبْعَثُ ءَإِذَا مِتْنَا... الخ" اور ﴿ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴾ معطوف ہے۔ "مَبْعُوْثُوْنَ" کے اندر ضمیر پر، اس لیے کہ ہمزہ کی فصل واقع ہوگئی ہے۔ سورۃ الصافات اور سورۃ الرعد میں اس پر کلام گزر چکا ہے، یعنی انھوں نے انکار کیا اور اس بات کو بعید سمجھا کہ موت کے بعد مبعوث ہوں گے اس حال میں کہ ان کے گوشت اور چمڑے مٹی ہو گئے اور ان کی ہڈیاں کھوکھلی اور بوسیدہ ہوگئیں، کیا ان کے اگلے باپ دادا بھی مبعوث ہوں گے، یعنی یہ تو اور بھی زیادہ بعید ہے اس سبب سے کہ ان کی موت تو بہت پہلے واقع ہو چکی ہے (کسی نے "و آباؤنا" بھی پڑھا ہے۔[4] كذا في فتح القدير)۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم کیا کہ ان کو جواب دیں اور ان کے اس بات کو بعید سمجھنے کی تردید کریں، چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴾ یعنی اے محمد! ان کے انکار کے رد کرنے کے لیے اور حق کے ثابت کرنے کے لیے تو ان سے کہہ دے کہ بے شک اگلی اُمتیں اور پچھلی اُمتیں جن میں سے تم ہو البتہ جمع کی جائیں گی موت کے بعد اس دن کے ایک وقت پر جو اللہ کے نزدیک معین اور مقرر ہے۔ وہ دن قیامت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگلے پچھلے بنی آدم عرصاتِ قیامت کی طرف عن قریب جمع کیے جائیں گے، ان میں سے کوئی بھی نہ چھوڑا جائے

---

[1] تفسير الرازي (١٤٨/٢٩) [2] فتح القدير (٢٠٤/٥) [3] تفسير ابن كثير (٣٧٦/٤) [4] فتح القدير (٢٠٤/٥)

گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿١٠٣﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿١٠٤﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ﴾ [ھود: ١٠٣- ١٠٥] ''وہ دن جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ، وہ دن ہے جس میں سب حاضر کیے جائیں گے اسے ہم جو ملتوی کرتے ہیں وہ صرف ایک مدتِ معین تک ہے جس دن وہ آ جائے گی مجال نہ ہو گی کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات بھی کر لے سو ان میں کوئی بد بخت ہو گا اور کوئی نیک بخت۔''

اسی لیے یہاں یوں فرمایا: ﴿لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ یعنی ایک وقتِ محدود کے ساتھ مقرر کیا گیا ہے، نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے، نہ زیادہ ہو نہ کم۔ ﴿مِيْقَاتِ﴾ وہ ہے جس کے ساتھ کسی شے کی حد مقرر کی جاتی ہے، اسی معنی سے مواقیتِ احرام ہیں۔ اضافت بہ معنی ''من'' ہے، جیسے: ''خَاتَمُ فِضَّةٍ'' یعنی وہ حشر کیے جائیں گے اس شے کی طرف جس کے ساتھ دنیا موقت کی گئی ہے روزِ حساب سے۔ ﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ﴾ یہ اور اس کا مابعد اس شے کے جملے سے ہے جو قول کے تحت میں داخل ہے اور ﴿اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ﴾ پر معطوف ہے کلمۂ ﴿ثُمَّ﴾ تراخیِ زمانہ کے لیے ہے، یا تراخیِ رتبہ کے لیے ''اَلضَّآلِّيْنَ'' ''الْمُكَذِّبِيْنَ'' سے مراد اہلِ مکہ ہیں اور وہ لوگ جو ان جیسے حال میں ہیں۔

اللہ پاک نے دو قبیح وصفوں کے ساتھ ان کو موصوف کیا ہے، ایک تو حق سے گمراہ ہونا اور دوسرا بعث کو جھٹلانا۔ دنیا کے اندر تہامہ کی زمین میں جو کڑوے درخت اگتے ہیں ان سب سے بڑھ کر خبیث زقوم کا درخت ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ جحیم میں اس کو اُگائے گا، وہ انتہائی درجے کی کراہت و بدصورتی و بدبو میں ہو گا۔ اس کی تفسیر سورۃ الصافات میں گزر چکی ہے۔[1] پہلا ﴿مِنْ﴾ ابتدائے غایت کا ہے اور دوسرا بیانیہ، یا پہلا زاید اور دوسرا بیانیہ، یا دوسرا زاید اور پہلا ابتدائیہ ہے۔

﴿مِنْهَا﴾ کی ضمیر ﴿شَجَرٍ﴾ کی طرف راجع ہے، اس لیے کہ شجر اسمِ جنس ہے اور اس کی تذکیر اور تانیث جائز ہے۔ دونوں لغت ہیں (کسی نے ''شجرۃ'' بافراد پڑھا ہے) یعنی پھر بعث کے بعد اے مکے والو! جو ضال اور مکذب ہو، البتہ تم زقوم کے درخت سے کھانے والے ہو جس کی صورت اور مزہ کریہ ہے، پھر تم اس درخت سے اپنے پیٹ بھوک کی شدت سے بھرنے والے ہو جو بھوک تم کو وہاں لاحق ہو گی۔ ﴿عَلَيْهِ﴾ کی ضمیر زقوم ماکول کی طرف راجع ہے، یا ﴿شَجَرٍ﴾ کی طرف، اس لیے کہ مذکر و مؤنث دونوں پر مستعمل ہوتا ہے، یا طرف ''اکل'' کے جو ﴿لَاٰكِلُوْنَ﴾ سے سمجھا جاتا ہے۔

﴿حَمِيْمٍ﴾ وہ گرم پانی ہے جس کی گرمی انتہا کو پہنچی ہو، یعنی پھر تم پینے والے ہو پیاسے اونٹوں کی طرح۔

---

[1] رقم الآیة (٦٢)

جمہور نے ”شرب“ کو بہ فتحِ شین پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام نافع، حمزہ اور عاصم رحمہم اللہ نے) بہ ضمِ شین پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام مجاہد اور ابو عثمان نہدی رحمہما اللہ نے) بہ کسرِ شین پڑھا ہے یہ سب لغات ہیں۔ امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا: میں نے عرب کو سنا ہے کہ وہ شین کو ضم و فتح و کسر سے بولتے ہیں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فتح تو اصل مصدر ہے اور ضم اسم مصدر ہے۔ ”هِيْم“ وہ پیاسے اونٹ ہیں جو اس بیماری کے سبب سے جو ان کو لگتی ہے سیراب نہیں ہوتے۔ ”هِيْم“ کا مفرد ”أَهْيَم“ ہے اور انثیٰ ”هَيْمَاء“ ہے[1] (”هائم و هائمة“ بھی بولتے ہیں۔ كذا في ابن كثير)۔[2]

صحاح میں کہا ہے کہ ”هُيَام“ بالضم سخت تر پیاس ہے اور ”هيام“ عشق سے جنون کی طرح ہے (قیس بن ملوح نے کہا ہے ؎

يقال به داء الهيام أصابه وقد علمت نفسي مكان شفائها)

اور ”هيام“ ایک بیماری ہے جو اونٹوں کو پکڑ لیتی ہے تو زمین میں سر مارتے پھرتے ہیں چرتے نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: ”نَاقَةٌ هَيْمَاءُ“ اور نیز ”هيماء“ وہ مفازہ ہے جس میں کچھ پانی نہیں ہوتا اور ”هيام“ بالفتح وہ ریت ہے جو اپنی نرمی کی وجہ سے ہاتھ میں نہیں تھمتی، جمع ”هِيْم“ ہے، جیسے: ”قَذَال وقِذَل“ اور ”هيام“ بالکسر پیاسے اونٹ ہیں۔ یہ جملہ ماقبل کا بیان ہے، یعنی نہیں ہوگا شرب تمھارا شربِ معتاد، بلکہ ان اونٹوں کے پینے کی طرح ہوگا جو پیاسے ہوتے ہیں اور پانی پینے سے سیراب نہیں ہوتے۔

امام ضحاک، ابن عیینہ، اخفش اور ابن کیسان رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ”هيم“ ریتلی نرم زمین ہے، معنی یہ ہیں کہ وہ پئیں گے۔ جیسے یہ زمین پانی کو پیتی ہے اور اس میں اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر اور عکرمہ رحمہم اللہ نے کہا: ﴿ اَلْهِيْمِ ﴾ ”اَلإِبِلُ الْعِطَاشُ الظِّمَاءُ“ امام عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ”هيم“ وہ مریض اونٹ جو پانی کو چوستے ہیں اور سیراب نہیں ہوتے۔ سدی رحمہ اللہ نے کہا ”هيم“ ایک بیماری ہے جو اونٹوں کو پکڑ لیتی ہے، پھر وہ کبھی سیراب نہیں ہوتے، یہاں تک کہ مر جاتے ہیں، سو اسی طرح جہنم والے ہیں کہ گرم پانی سے کبھی سیراب نہ ہوں گے (”هيم“ اصل میں اسی طرح ہے، لیکن ”هيام“ صحیح معلوم ہوتا ہے)۔

خالد بن معدان سے مروی ہے کہ وہ اس بات کو مکروہ سمجھتے تھے کہ ”هيم“ کی طرح پئیں ”عبة واحدة“ یعنی ایک ہی بار بغیر تین بار سانس لینے کے۔[4] علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ”شاربين“ کا عطف جو صحیح ہوا شاربین پر، حالانکہ وہ دونوں ذواتِ متفقہ کے لیے ہیں اور دو صفتیں متفق ہیں تو صرف اس لیے کہ ان کا شاربینِ حمیم ہونا، اس حال پر جس پر وہ ہے کہ انتہا کا گرم ہے اور آنتوں کو کاٹتا ہے، ایک امرِ عجیب ہے اور ان کا اس کو اس حال پر پینا جس طرح کہ پیاسے اونٹ پانی پیتے ہیں، یہ بھی ایک امرِ عجیب ہے، پس اب وہ دونوں صفتیں مختلف ہوگئیں۔[5]

---

① تفسير القرطبي (١٧/٢١٤، ٢١٥) ② تفسير ابن كثير (٣٧٦/٤) ③ تفسير القرطبي (١٧/١٥) فتح القدير (٥/٢٠٥)
④ تفسير الطبري (٢٣/١٣٥) تفسير ابن كثير (٣٧٦/٤) ⑤ تفسير النسفي (٤/٢٠٩، ٢١٠)

﴿هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ﴾ جمہور نے ''نُزُل'' کو بہ ضمتین پڑھا ہے اور کسی نے یعنی ''وروي عن أبي عمرو و ابن محيصن'' نے بہ ضم وسکون پڑھا ہے۔[1] یعنی یہ زقومِ ماکول و حمیمِ مشروب جس کا ذکر ہوا ان کا رزق اور غذا ہے، روزِ جزا میں جو روزِ قیامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شجرۂ زقوم اور شرابِ حمیم جس کا ذکر ہوا یہ وہ شے ہے جو ان کے لیے تیار کی جائے گی اور وہ اس کو قیامت کے دن کھائیں گے۔ اس میں ان کے ساتھ ٹھٹھا کرنا ہے، کیونکہ ''نُزُل'' تو وہ شے ہے جو مہمانوں کے لیے ان کی تعظیم اور تکریم کے لیے مہیا کی جاتی ہے، اسی کے مثل یہ آیت ہے:
﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [آل عمران: ۲۱] ''تو اے نبی! انھیں دردناک عذاب کی خبر دے دیجیے۔''

غرضیکہ یہ تو اہلِ نار کا ''نُزُل'' ہے اور مومنین کے حق میں یوں فرمایا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ [الکھف: ۱۰۷] ''جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے کام بھی اچھے کیے یقیناً ان کے لیے الفردوس کے باغات کی مہمانی ہے۔'' ''أَيْ: ضِيَافَةٌ وَكِرَامَةٌ''۔ جملہ ﴿هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ﴾ اللہ پاک کی طرف سے ہے بطور فذلکہ واجمال کے مضمونِ کلام کا مقرر و مؤکد ہے قول کے تحت میں داخل نہیں ہے۔[2] (كذا في فتح البيان و ابن كثير مع المزج والخلط) پھر اللہ پاک نے خطاب کا رخ کفار کی طرف پھیرا ان کو عاجز کرنے کے لیے اور حجت کے لازم کرنے کے لیے۔ چنانچہ فرمایا:

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾

ہم ہی نے تمھیں پیدا کیا پھر تم (دوبارہ جی اُٹھنے کی) تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ (57) بھلا بتاؤ تو! جو منی تم ٹپکاتے ہو (58) کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم (اس کے) خالق ہیں؟ (59) ہم ہی نے تمھارے درمیان موت مقدر کر دی ہے، اور ہم عاجز نہیں (60) (بلکہ قادر ہیں) اس بات پر کہ تم جیسی اور مخلوق بدل کر لے آئیں، اور تمھیں ایسی صورت میں پیدا کریں جو تم نہیں جانتے (61) اور یقیناً تم پہلی پیدائش کو جان چکے ہو، پھر تم نصیحت کیوں نہیں پکڑتے؟ (62)

---

[1] فتح القدير (۲۰۵/۵) [2] تفسير ابن كثير (۳۷۶/٤) فتح البيان (۳۷۰/۱۳۔۳۷٤)

قیامت کے ثبوت کے دلائل:

اللہ پاک معاد (قیامت) کی تقریر وتثبیت کرتا ہے اور اس کے جھٹلانے والوں پر رد فرماتا ہے جو اہلِ زیغ والحاد ہیں، جنھوں نے یوں کہا: ﴿ اَىِٕذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴾ اور ان سے یہ بات تکذیب اور استبعاد کے طور پر صادر ہوئی تو اللہ سبحانہ نے فرمایا: ﴿ نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ ﴾ یعنی ہم نے ہی تمھاری پیدایش کی ابتداء کی، اس کے بعد کہ تم کوئی شے نہ تھے جس کا ذکر کیا جائے، پھر کیا جو ذات پاک پہلی بار بنانے پر قادر ہے وہ دوسری بار بنانے پر قادر نہیں ہے؟ بلکہ وہ تو اس پر بطریقِ اولیٰ واحریٰ قادر ہے، اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴾ یعنی جب تم پہلی بار کے قائل ہو تو پھر دوسری بار کی تصدیق کیوں نہیں کرتے ہو۔

پھر اس قول سے ان پر دلیل قائم کی: ﴿ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿58﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴾ یعنی کیا پھر تم منی کو رحموں میں قرار پذیر کرتے ہو اور ان میں اس کو بناتے ہو یا اللہ اس کو بنانے والا ہے؟ پھر فرمایا: ﴿ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ ﴾ "أَيْ: صَرَّفْنَا بَيْنَكُمْ"، یعنی ہم نے تم میں موت کو گردش دی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ برابری کی موت میں اہلِ آسمان و زمین کے درمیان۔[1] ﴿ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴾ اور ہم اس بات سے عاجز نہیں ہیں کہ قیامت کے دن تمھاری پیدایش کو متغیر کر دیں اور تمھیں ایسی صفات اور حالت میں کھڑا کریں جن کو تم جانتے نہیں ہو۔

پھر فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی تم جان چکے ہو کہ اللہ نے تمھاری انشاء وایجاد کی، اس کے بعد کہ تم کوئی شے مذکور نہ تھے اور تمھارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، پھر تم یہ بات کیوں نہیں جانتے اور اس پر یقین کیوں نہیں کرتے کہ جو پاک ذات پہلی بار اٹھانے پر قادر ہوا ہے وہ دوسری اٹھان پر بطریقِ اولیٰ واحریٰ قادر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ [الروم: ۲۷] ''وہی ہے جو پہلی بار مخلوق پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ تو اس پر بہت ہی آسان ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿77﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿78﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴾ [یٰسٓ: ۷۷۔ ۷۹] ''اور اس نے ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی (اصل) پیدایش کو بھول گیا، کہنے لگا: ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ آپ جواب دیجیے! کہ انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انھیں اول مرتبہ پیدا کیا ہے، جو سب طرح کی پیدایش کا بہ خوبی جاننے والا ہے۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳۷/٤)

نیز فرمایا: ﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴾ [القيامة: ٣٦۔ ٤٠] ''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے بے کار چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ ایک گاڑھے پانی کا قطرہ نہ تھا جو ٹپکایا گیا تھا؟ پھر وہ لہو کا لوتھڑا ہو گیا، پھر اللہ نے اسے پیدا کیا اور درست بنایا، پھر اس سے جوڑے یعنی نر و مادہ بنائے۔ کیا (اللہ تعالیٰ) اس (امر) پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے۔''[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

''لَوْلَا'' بہ معنی ''هَلَّا'' ہے جو کسی شے پر آمادہ کرنے کے لیے آتا ہے۔ اب اگر کوئی کہے: یوں کیوں فرمایا کہ ہم نے تم کو بنایا، پھر بنانے کی تصدیق کیوں نہیں کرتے ہو، حالانکہ وہ اپنی مخلوق ہونے کے قائل تھے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [الزمر: ٣٨] ''اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقیناً وہ یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے۔''؟ تو کہیں گے کہ اگرچہ انھوں نے اپنی زبانوں سے اس کی تصدیق کی، لیکن تصدیق جس بات کی مقتضی ہے جبکہ ان کا مذہب اس کے خلاف تھا تو وہ گویا اس کے مکذب ہوئے، اس لیے ان کی تصدیق کو تصدیق کے آثار گم ہونے کے سبب سے تصدیق نہ ہونے کی طرح ٹھہرایا گیا، وہ آثار جو اس کو ثابت کرتے ہیں اور اس پر دال ہیں۔ یا یوں کہیں گے کہ یہ تو ان کو خلقِ اول سے استدلال کر کے بعث بعد الموت کی تصدیق پر آمادہ کیا ہے تو گویا یوں کہا کہ تمھارے اپنے اقرار کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تم کو پہلی دفعہ بنایا، پس یہ اس پر مشکل نہیں ہے کہ دوبارہ تم کو پیدا کر دے، پھر تم بعث کی تصدیق کیوں نہیں کرتے، کیوں کہ جو پہلی دفعہ بنانے پر قادر ہے وہی دوبارہ بنانے پر بھی قادر ہے۔ محلی رحمہ اللہ کا حاصل یہی ہے۔[2] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ہم نے تم کو پیدا کیا اور تم کوئی شے نہ تھے اور تم اس کو جانتے ہو، پھر تم بعث کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟[3]

﴿ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴾ یعنی تم مجھے بتاؤ: کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یا اپنے دلوں سے جانا ہے، ان نطفوں کو جو تم اپنی عورتوں کے رحموں میں ڈالتے ہو، کیا تم اس منی کو پورا صحیح سالم آدمی مقدر و مصور کرتے ہو یا ہم اس کی تقدیر اور تصویر کرنے والے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ یہ سب اللہ پاک ہی نے کیا ہے، وہی اس کے دوبارہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ جمہور نے ﴿ تُمْنُوْنَ ﴾ کو بہ ضم فوقیہ پڑھا ہے: ''أَمْنَى يُمْنِيْ'' سے اور کسی نے (یعنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو السماک، محمد بن سمیفع اور اشہب عقیلی رحمہ اللہ۔ كما في فتح القدير) نے بہ فتحِ تاء پڑھا ہے: ''مَنَى يَمْنِيْ'' سے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ دونوں کے معنی مختلف ہیں، جب آدمی کو جماع سے انزال ہو تو

---

[1] تفسير ابن كثير (٣٧٧/٤) [2] تفسير الجلالين (٧١٦/١) [3] تفسير البغوي (١٩/٨)

"أَمْنَى" کہا جاتا ہے اور جب احتلام سے انزال ہو تو "مَنٰى" بولا جاتا ہے۔ منی کا نام منی اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ بہائی جاتی ہے۔ "يُمْنٰى" بہ معنی "يُرَاقُ" ہے۔

جمہور نے ﴿ قَدَّرْنَا ﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے اور کسی نے یعنی امام مجاہد، حمید، ابن محیصن اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے) بہ تخفیف پڑھا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں اور دونوں سبعیہ ہیں۔ "يُقَالُ: قَدَّرْتُ الشَّيْءَ وَقَدَرْتُهُ". معنی یہ ہیں کہ ہم نے قسمت کیا موت کو تم پر اور اس کا تمھارے افراد میں سے ہر فرد کے لیے ایک وقت مقرر کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ "قَضَيْنَا"۔ کسی نے کہا ہے کہ "كَتَبْنَا". کسی نے کہا ہے کہ "أَوْحَيْنَا". یہ معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: پس کوئی تو تم سے بڑا ہو کر مرتا ہے اور کوئی تم سے چھوٹا ہی مر جاتا ہے۔

﴿ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ہم مغلوب و عاجز نہیں ہیں، بلکہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ تمھارے جیسی ایک اور خلق لے آئیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر ہم ارادہ کریں کہ تمھارے سوا اور کوئی اور مخلوق پیدا کریں تو کوئی سابق ہم سے سبقت نہ کرے اور نہ وہ کام ہم سے فوت ہو، یعنی ہو نہ سکے۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَمْثَال"، جمع "مِثْل" ہے بہ کسرِ میم و سکونِ ثاء کے، یعنی ہم اس بات پر قادر ہیں کہ تم کو معدوم کر دیں اور ایک اور قوم تمھاری مثل پیدا کر دیں۔ اس کی مؤید یہ آیت ہے: ﴿ إِنْ يَّشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِاٰخَرِيْنَ ﴾ [النساء: ۱۳۳] "اگر اسے منظور ہو تو اے لوگو! وہ تم سب کو لے جائے اور دوسروں کو لے آئے۔"

یا جمع ہے "مَثَلٌ"، بہ فتحتین کی۔ مثل بہ معنی صفت ہے، یعنی ہم اس پر قادر ہیں کہ تم کو متغیر کر دیں، تمھاری دونوں صفتیں یعنی صورت اور سیرت کو لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں، معنی یہ ہیں کہ ہم نے تمھارے درمیان موت کو مقدر کیا اس پر کہ تمھاری موت کے بعد تمھاری جنس میں سے تمھاری مثل بدل کر لے آئیں اور ہم تمھاری اجلوں میں مسبوق نہیں ہیں، یعنی نہ آگے ہوتا ہے کوئی پیچھے رہنے والا اور نہ پیچھے رہتا ہے کوئی آگے ہونے والا۔[2]

﴿ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اور تم کو ان صورتوں اور ہیئتوں پر انشاء و ایجاد کر دیں جن کو تم جانتے نہیں ہو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: یعنی ہم کر دیں تم کو بندر اور سؤر، جیسا کہ تم سے پہلی قوموں کے ساتھ کیا ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اٹھا کر کھڑا کریں ہم تم کو بعث میں تمھاری ان صورتوں کے علاوہ کسی اور صورت پر کہ جس میں تم دنیا میں تھے۔ امام سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا: یعنی سیاہ پرندوں کے پوٹوں میں جو برہوت میں ہوتی ہیں، گویا وہ خطاطیف ہیں (خطایف جمع ہے خطاف بالضم والتشدید کی۔ اس کی فارسی فرستوک بروزن و معنی پرستوک ہے۔ یہ ایک سیاہ رنگ کا پرندہ ہے۔ صراح)۔ برہوت یمن میں ایک وادی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جس خلق میں ہم چاہیں،[3] اور جو

---

[1] فتح القدير (۲۰۹،۲۰۸/۵) [2] تفسير القرطبي (۲۱۷،۲۱٦/۱۷) [3] تفسير البغوي (۲۰/۸)

ذات پاک اس پر قادر ہے تو وہ بعث پر بھی قادر ہے۔

﴿ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى ﴾ یعنی اور البتہ مقرر تم جان چکے ہو پہلی اُٹھان کو وہ یہ ہے کہ خلق کی ابتدا نطفے سے کی، پھر علقہ سے، پھر مضغہ سے، حالاں کہ تم اس سے پہلے کوئی شے نہ تھے، یا ﴿ اَلنَّشْاَةَ الْاُوْلٰى ﴾ سے مراد مٹی سے پیدا کرنا ہے تمھارے باپ آدم علیہ السلام کا اور گوشت سے بنانا ہے تمھاری ماں حوا کا اور نطفے سے تمھارا بنانا ہے۔ ان میں سے ہر کام ایک شے سے دوسری شے کی طرف منتقل کرنا ہے۔ امام قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کا مٹی سے پیدا کرنا ہے۔[1]

﴿ فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ پھر تم اللہ پاک کی قدرت کو کیوں یاد نہیں کرتے ہو، یعنی دوسری پیدایش پر قدرت کو اور اس کا پہلی پیدایش پر قیاس کیوں نہیں کرتے، کیونکہ جو پاک ذات پہلی پیدایش پر قادر ہے وہی دوسری پر بھی قادر ہے، اس لیے اس کی سنت کے لحاظ سے یہ تو پہلی پیدایش سے کلفت میں کم ہے۔ جمہور نے "نشأة" کو بہ قصر پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام مجاہد، حسن، ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہم اللہ نے) بہ مد پڑھا ہے۔[2] اس کی تفسیر سورۃ العنکبوت میں گزر چکی ہے۔[3] آیتِ کریمہ میں قیاس کے صحیح ہونے پر دلیل ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے ان کو اس بات سے جاہل بنایا ہے کہ انھوں نے "نشأة اولیٰ" پر "نشأة أخرى" کا قیاس ترک کیا۔[4] (كذا في فتح البيان) پھر اور قدرت بیان فرمائی:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿63﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿64﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿65﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿66﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿67﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿68﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿69﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿70﴾ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿71﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿72﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿73﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿74﴾

بھلا بتاؤ تو جو کچھ تم بوتے ہو ﴿63﴾ کیا اسے تم اُگاتے ہو یا ہم ہی اُگانے والے ہیں؟ ﴿64﴾ اگر ہم چاہیں تو اسے ضرور ریزہ ریزہ کر دیں، پھر تم پشیمان ہونے والے ہو جاؤ ﴿65﴾ کہ بلاشبہ ہم پر چٹی ڈال دی گئی ﴿66﴾ (نہیں) بلکہ ہم محروم ہی رہ گئے ﴿67﴾ بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو تم پیتے ہو ﴿68﴾ کیا وہ تم نے بادلوں سے نازل کیا ہے یا ہم نازل کرنے والے ہیں؟ ﴿69﴾ اگر ہم چاہیں تو اسے کھارا

---

[1] تفسير القرطبي (217/17) [2] فتح القدير (209/5) [3] رقم الآية (20) [4] فتح البيان (375/13-377)

کر دیں، پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ (70) بھلا بتاؤ تو! وہ آگ جو تم جلاتے ہو (71) کیا اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ (72) ہم ہی نے اسے یاد دہانی کا ذریعہ اور مسافروں کے لیے فائدہ بنایا ہے (73) لہٰذا آپ اپنے ربِ عظیم کے نام کی تسبیح کیجیے (74)

اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور نعمتوں کا بیان اور آخرت کے مزید دلائل:

کئی ایسے سبز درخت ہیں جن کو رگڑنے سے آگ نکلتی ہے، سورت یٰسٓ میں اس کا بیان گزر چکا ہے، ہم نے اسے سببِ نصیحت بنایا تاکہ اس آگ سے دوزخ کی آگ یاد آئے اور جنگل والوں کو آگ سے بہت کام ہیں، جاڑے کے موسم میں اس سے گرمی حاصل کرتے ہیں اور دوسرے کام بھی اس سے چلتے ہیں۔ انتھیٰ.

"حرث" زمین کے چیرنے، پھاڑنے، ابھارنے اور اس میں بیج ڈالنے کو کہتے ہیں۔ یہ معنی لغوی ہیں، جیسا کہ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حرث" زمین کو زراعت کے لیے مہیا کرنا ہے اور اس میں بیج ڈالنا ہے۔[1] کلمۂ ﴿ مَا ﴾ سے مراد زمین ہے، یعنی تم مجھے اپنی زمین کی خبر دو جس کو تم چیرتے ہو، ابھارتے ہو، پھر اس میں بیج ڈالتے ہو۔ لیکن یہاں کلمۂ ﴿ مَا ﴾ کی تفسیر بذر کے ساتھ مناسب ہے اور "حرث" سے مراد بیج ڈالنا ہے تو گویا یوں کہا: تم مجھے اس بیج کی خبر دو جس کو تم مٹی میں ڈالتے ہو، کیا تم اس کو اُگاتے ہو اور کھیتی کرتے ہو، پھر اس میں بالیاں اور دانے ہو جاتے ہیں، یا اس کو اُگانے والے اور کھیتی کرنے والے ہم ہیں؟ یعنی یہ کام تمھارا نہیں ہے، بلکہ ہمارا ہے کہ ہم اس کو جماتے ہیں، اس کے جمنے کی جگہ میں اور زمین میں اس کو اُگاتے ہیں۔ مختار میں کہا ہے کہ "زرع" بیج ڈالنا ہے اور انبات کے معنی میں بھی ہے: "يُقَالُ: زَرَعَهُ اللّٰهُ أَيْ: أَنْبَتَهُ"[2] انتھیٰ.

امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "زَرَعَهُ اللّٰهُ أَيْ: أَنْمَاهُ"[3] انتھیٰ. یہاں کے مناسب یہی ہے کہ "زرع" بہ معنی "إنبات وإنماء" ہو، جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ تم میں کوئی ہرگز "زَرَعْتُ" نہ کہے لیکن کہے "حَرَثْتُ"۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تم اللہ تعالیٰ کو سنتے نہیں ہو کہ وہ فرماتا ہے: ﴿ أَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُونَ ۝ ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهٗٓ أَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴾[4] (أخرجه البزار وغيره) (امام ابن جریر، ابن مردویہ، ابو نعیم، بیہقی اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت ابو عبدالرحمان سے یہ ہے: "لَا تَقُوْلُوْا زَرَعْنَا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا حَرَثْنَا")۔[5] حجر مدری سے مروی ہے کہ جب وہ آیتِ مذکور اور اس جیسی اور آیتیں پڑھتے تو کہتے: "بَلْ أَنْتَ يَا رَبِّ"[6] یعنی تو ہی اُگاتا ہے اے میرے رب!

---

(1) المفردات في غريب القرآن (112/1) (2) مختار الصحاح (280/1) (3) فتح القدير (205/5)

(4) مسند البزار (308/17) تفسير الطبري (139/23) سنن البيهقي الكبرىٰ (138/6) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (2801)

(5) تفسير ابن أبي حاتم (3334/10) (6) مصنف عبدالرزاق (452/2)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے اس کا اقرار کر لیا تو پھر بعث کا انکار کیوں کرتے ہو۔ جو ذات پاک اس پر قادر ہے کہ دانوں کو زمین میں جماتا ہے، پھر اُن کو اُگاتا ہے، بڑھاتا ہے، پھر ان میں بالیاں لاتا ہے اور ایک دانے سے بہت سے دانے پیدا کرتا ہے، وہی اس پر بھی قادر ہے کہ مردوں کو زمین سے پھر دوبارہ اٹھا کر کھڑا کر دے، یہ تو اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

پھر اگر کوئی دشمن یہ کہے کہ ہم زمین میں بیج ڈالتے ہیں اور وہ خود ہی کھیتی ہو جاتا ہے اور یہ نہ ہمارے فعل سے ہے نہ ہی ہمارے علاوہ کسی اور کے فعل سے ہے تو اللہ پاک نے اس پر یوں رد فرمایا ہے: ﴿ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطٰمًا ﴾ یعنی اگر ہم چاہیں تو جو کچھ بوتے ہو اس کو متحطم ومتفتت ومتکسر، یعنی سوکھی گھاس کر دیں جس میں دانے نہ ہوں، یا اس کو اس کے پکنے سے پہلے اور کٹنے کا وقت آنے سے پہلے ہی سکھا ڈالیں، تو کیا تم اس کی حفاظت پر قادر ہو، یا وہ کھیتی خود اس پر قادر ہے کہ اپنے آپ سے اس آفتوں کو دور کر دے جو اس کو لگتی ہیں، حالاں کہ اس میں کوئی شک نہیں کرتا کہ آفتیں دور نہیں ہوتیں مگر اللہ پاک کے اذن اور حفاظت سے۔ "حطام" وہ سوکھی روئیدگی ہے جس سے نفع نہیں لیا جاتا اور نہ اس سے دانے حاصل ہوتے ہیں اور نہ وہ شے حاصل ہوتی ہے جو کھیتی سے مطلوب ہوتی ہے۔

﴿ فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴾ یعنی جب یہ آفت تم پر پڑے تو تم تعجب کرنے لگ جاؤ، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔[1] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تعجب کرتے ہو اس شے پر جو تمھاری کھیتی میں تم پر نازل ہوئی۔ صحاح میں کہا ہے کہ "تَفَكَّهَ" بہ معنی تعجب ہے اور کہا جاتا ہے کہ "تَنَدَّمَ"۔ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہما نے فرمایا: معنی یہ ہیں پھر تم اس کے جانے سے تعجب کرنے والے ہو جاؤ اور اس شے پر ندامت کرنے والے جو تم پر نازل ہوئی۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگ جاتے اور اللہ کی اس معصیت پر نادم ہوتے جو تم سے گزر چکی ہے۔ امام ابو عمرو اور کسائی رحمہ اللہ نے کہا "تفکہ" "تلهف" ہے "ما فات" پر، یعنی فوت شدہ شے پر افسوس کرنا۔

جمہور نے "ظَلْتُمْ" بہ فتحِ ظاء مع یک لام پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابو حیوہ، ابو بکر فی روایۃ عنہ نے) بہ کسرِ ظاء مع یک لام پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور جحدری نے) دو لام کے ساتھ پڑھا ہے جن میں سے پہلا مکسور ہے بنا بر اصل اور اس کا فتحہ بھی مروی ہے (یعنی جحدری سے) یہ بھی ایک لغت ہے۔ جمہور نے ﴿ تَفَكَّهُوْنَ ﴾ بہ ہائے "هوّز" پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی ابو حرام عکلی نے) بہ نون بجائے "ها" پڑھا ہے: "أَيْ: تَنَدَّمُوْنَ" امام ابن خالویہ نے کہا ہے "تَفَكَّهَ" بہ معنی تعجب ہے اور "تَفَكَّنَ" بہ معنی "تَنَدَّمَ" ہے۔

صحاح میں کہا ہے کہ "تَفَكَّنَ" بہ معنی "تَنَدَّمَ" ہے[2] ﴿ تَفَكَّهُوْنَ ﴾ کے معنی میں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا ایک قول تو "تَعْجَبُوْنَ" ہے اور دوسرا قول یہ ہے: "تَفْجَعُوْنَ وَتَحْزَنُوْنَ عَلٰى مَا فَاتَكُمْ مِنْ زَرْعِكُمْ"[3] یعنی

[1] تفسیر الطبري (۱۳۹/۲۳) [2] تفسیر القرطبي (۲۱۹/۱۷) فتح القدیر (۲۰۹/۵) [3] تفسیر ابن کثیر (۳۷۸/٤)

دردمند اور رنجیدہ ہوتے ہو اپنی کھیتی پر جو تم سے فوت ہوگئی۔ یہ قول پہلے قول کی طرف راجع ہے، یعنی تعجب اس سبب سے کہ جس کی وجہ سے اپنے مال میں مصیبت زدہ ہوئے۔ یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] بیضاوی میں ہے کہ "تفکہ" تنقل ہے فاکہہ کی صنوف کے ساتھ اور کبھی حدیث میں تنقل کے لیے استعارہ کیا جاتا ہے۔[2] یہ معنی بھی یہاں بنتے ہیں، یعنی پھر تم سارا دن طرح طرح کی باتیں بناتے رہتے ہو، کبھی تو یوں کہتے ہو: ﴿ إِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴾ (جمہور نے بہ یک ہمزہ پڑھا ہے بنا بر خبر اور ابو بکر و مفضل اور "زر" نے دو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے بنا بر استفہام اور جملہ بہ تقدیرِ قول ہے: "أي: تقولون إنا لمغرمون")۔ کبھی اس سے اعراض کر کے یوں کہتے ہو۔ ﴿ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴾

"مُغْرَمُوْنَ" کے معنی یہ ہیں کہ تاوان کے لیے لازم کیے گئے ہماری کھیتی کے سبب سے جو ہلاک ہوگئی۔ امام ضحاک، ابن کیسان اور کرخی رحمہم اللہ نے کہا: "مغرم" وہ ہے جس کا مال بغیر عوض جاتا رہا۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: لازم کیے گئے تاوان اس شخص کا جو ہم نے خرچ کی۔ کسی نے کہا "مغرمون" بہ معنی "معذبون" ہے۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "لَمُولَعٌ بِنَا، يُقَالُ: أُغْرِمَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ أَيْ: أُولِعَ بِهِ" امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مھلکون" یعنی ہمارے رزق کے ہلاک ہونے کے سبب سے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "غرام" بہ معنی ہلاک سے ماخوذ ہے۔[3]

ظاہر سیاق سے پہلے ہی معنی ہیں، یعنی بے شک ہم تاوان زدہ ہیں، اس لیے کہ جو ہم نے بویا تھا وہ جاتا رہا اور روندن ہوگیا، بلکہ ہم محروم ہیں، یعنی ہم اپنی کھیتی کے تباہ ہو جانے کی وجہ سے اپنے رزق سے محروم کیے گئے۔ محروم وہ ہے جو اس رزق سے روکا گیا جس میں اس کا کچھ حصہ اور نصیب نہیں ہے۔ محارف بھی یہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "محارفون محدودون لا مجدودون" (محارف وہ ہے جس کی روزی اس سے کنارے کی گئی، یعنی بے بخت و محدود بہ معنی ممنوع الرزق ہے اور مجدود بہ معنی محظوظ و صاحبِ بخت و نصیب والا ہے)۔

پھر مزید قدرت اور نعمت کا ذکر فرمایا: ﴿ أَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿68﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴾ یعنی تم مجھے اس پانی کی خبر دو جس کو تم پیتے ہو، پھر اس سے اپنی پیاس بجھاتے ہو جو تم کو لاحق ہوتی ہے۔ کیا تم نے اس کو بادل سے اتارا ہے یا ہم اس کو اتارنے والے ہیں نہ کہ ہمارا غیر۔ جب تم نے اس کو پہچان لیا تو پھر تم توحید کا اقرار کیوں نہیں کرتے اور بعث کی تصدیق کیوں نہیں کرتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا کہ "مزن" بادل ہے۔[4] امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مزنة" سفید بادل ہے اور "مزن" جمع

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/١٤٠، ١٤١)
[2] تفسير البيضاوي (٥/٢٩٠)
[3] تفسير القرطبي (١٧/٢١٩، ٢٢٠) فتح القدير (٥/٢٠٩، ٢١٠)
[4] تفسير الطبري (٢٣/١٤٣)

ہے اور ''مزنة'' بہ معنی ''مطر'' ہے۔[1] (قاله في الصحاح) یہاں جو صرف پینے کا ذکر فرمایا، باوجود اس کے کہ پانی کے فائدے اور منافع بہت ہیں تو اس لیے کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہی پینا ہے۔ پھر یہ بیان فرمایا کہ اگر وہ چاہے تو ان سے اس نعمت کو سلب کر لے۔

﴿ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴾ ''أجاج'' وہ سخت کھارا پانی ہے جس کا پینا ممکن نہیں ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ کڑوا پانی ہے جس سے پینے میں اور کھیتی میں اور کسی اور کام میں نفع نہیں لیتے۔[2] یعنی اگر ہم چاہیں تو اس کو کھارا کر دیں، پھر تم اللہ کی نعمت کا شکر کیوں نہیں کرتے کہ اس نے تمھارے لیے آبِ شیریں زلال پیدا کیا جس کو تم پیتے ہو اور اس سے فائدہ لیتے ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [النحل: ۱۰۔ ۱۱] ''جسے تم پیتے ہو اور اسی سے اُگے ہوئے درختوں کو تم اپنے جانوروں کو چراتے ہو۔ اسی سے وہ تمھارے لیے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے، بے شک ان لوگوں کے لیے تو اس میں بڑی نشانی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں۔'' امام ابن ابی حاتم نے عن جابر عن أبي جعفر رحمہ اللہ عن النبي ﷺ روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ جب پانی پیتے تو فرماتے تھے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ سَقَانَا عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِهِ وَلَمْ يَجْعَلْهُ مِلْحًا أُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا''[3] ''سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنی رحمت کی بدولت ہمیں یہ میٹھا اور خوشگوار پانی پلایا اور اسے ہمارے گناہوں کی پاداش میں کھاری اور نمکین نہیں کر دیا۔''

پھر مزید قدرت اور نعمت کا ذکر فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴾ ''إیراء'' چقماق کے ساتھ آگ نکالنے کو کہتے ہیں۔ جب تم چقماق کے ساتھ آگ نکالو گے تو یوں بولو گے: ''أَوْرَيْتُ النَّارَ''۔ عرب لوگ دو لکڑیوں سے آگ نکالتے ہیں، ایک کو دوسری پر رگڑتے ہیں۔ اوپر کی لکڑی کا نام ''زند'' اور نیچے والی لکڑی کا ''زَنْدَة'' رکھتے ہیں۔ دونوں کو نر اور مادہ سے تشبیہ دی ہے، یعنی تم مجھے خبر دو اس آگ کی جس کو تم چقمق جھڑا کر گیلے درخت سے نکالتے ہو، کیا تم اس کا انشاء و ایجاد کیا ہے؟ وہ درخت جس سے چقماق کی لکڑیاں ہوتی ہیں وہ درخت مَرخ و عَفار ہیں۔

عرب کہتے ہیں: ''فِيْ كُلِّ شَجَرٍ نَارٌ وَاسْتَمْجَدَ الْمَرْخُ وَالْعَفَارُ'' (اس مثل کے معنی پہلے گزر چکے ہیں، یعنی ہر درخت میں آگ ہے مگر بہ نسبت سب درختوں کے ان دو میں زیادہ آگ ہے)۔ جلال محلی رحمہ اللہ نے کلخ کا درخت زیادہ کہا ہے۔ سلیمان جمل رحمہ اللہ نے اپنے شیخ سے نقل کیا ہے کہ ہم نے اس کو قاموس میں نہیں پایا اور نہ مختار میں مگر اتنی بات ہے کہ بعض اہلِ مغرب و شام نے خبر دی ہے کہ وہ ان کے ہاں موجود و معروف ہے۔ بانس کے مشابہ ہے، اس کے دو ٹکڑے لیے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے مارا جاتا ہے تو آگ نکل آتی ہے۔ غرضیکہ کیا تم نے اس کے

[1] تفسیر القرطبي (۱۷/۲۲۱) [2] تفسیر القرطبي (۱۷/۲۲۱) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۳٤) یہ روایت مرسل ہے۔

درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم اس کو پیدا کرنے والے ہیں اپنی قدرت سے، تم نہیں ہو۔

مطلب یہ ہے بلکہ وہ ہم ہی ہیں کہ ہم نے اس آگ کو اس کی جگہ میں ودیعت کر رکھا ہے۔ یہاں "إنشاء" بہ معنی ''خلق'' ہے۔ ''خلق'' کو ''اِنشاء'' کے پیرائے میں اس لیے ادا کیا ہے کہ جو عجیب وغریب قدرت اور کاریگری اس میں ہے اس پر دال ہو۔ پھر آگ پیدا کرنے کے دو فائدے ذکر فرمائے: ﴿ نَحۡنُ جَعَلۡنٰهَا تَذۡكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِيۡنَ ﴾ یعنی ہم نے اس آگ کو جو دنیا میں ہے جہنم کی بڑی آگ کے لیے تذکرہ ٹھہرایا۔ أعاذنا الله منها بفضله ورحمته آمین. اس لیے کہ معاش کے اسباب ہم نے اس سے متعلق کیے اور اس کی طرف حاجت ہونے کا عمومِ بلوہ کیا، تاکہ وہ لوگوں کے سامنے حاضر رہے اور وہ اس کی طرف نظر کرتے رہیں اور جس آگ کا ان کو وعدہ دیا گیا ہے اس کو یاد کریں۔

امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے اس کو لوگوں کے لیے تاریکی میں تبصرہ ٹھہرایا، یعنی اندھیرے میں راستہ سمجھانے والی بنایا کہ اس کی روشنی میں اپنے کام کریں۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو موعظہ بنایا کہ مومن اس سے نصیحت پذیر ہوں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "تَذْكِرَةً لِلنَّارِ الْكُبْرٰى"[2] یعنی بڑی آگ کو یاد دلانے والی۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ تمھاری یہ آگ جو تم جلاتے ہو جہنم کی آگ کے ستر اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: واللہ! اے اللہ کے رسول! بے شک وہ البتہ کافی تھی۔ فرمایا: بے شک وہ تو اس پر انہتر (٦٩) اجزاء کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے، وہ سب اجزاء اس کی گرمی کی طرح ہیں۔[3] (أخرجه البخاري و مسلم)

تفسیر ابن کثیر میں امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ "أَيْ: تُذَكِّرُ النَّارَ الْكُبْرٰى"، یعنی یہ آگ بڑی آگ کی یاد دلاتی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے میری قوم! تمھاری یہ آگ جو تم جلاتے ہو جہنم کی آگ کے ستر اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! بے شک وہ البتہ کافی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تحقیق ماری گئی ہے دریا کے ساتھ دو ضرب یا دو بار، یہاں تک کہ بنی آدم اس سے فائدہ اٹھائیں اور اس کے قریب ہوں۔[4]

امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی اس مرسل حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ بے شک تمھاری یہ آگ جہنم کی آگ کے ستر اجزاء میں سے ایک جز ہے اور دریا کے ساتھ دو دفعہ ماری گئی ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ اس میں کسی کے لیے کوئی فائدہ نہ رکھتا۔[5] امام مالک رحمہ اللہ کی روایت عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ مرفوعاً یہ ہے: «نَارُ بَنِيْ آدَمَ الَّتِيْ يُوْقِدُوْنَ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِيْنَ جُزْءًا مِنْ نَارِ جَهَنَّمَ

---

[1] فتح القدير (٢١٠/٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٣٤/١٠)
[3] صحيح البخاري (٣٠٩٢) صحيح مسلم (٢٨٤٣) [4] تفسير الطبري (١٤٤/٢٣)
[5] مسند أحمد (٢٤٤/٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢٤٥/٣)

فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنْ كَانَتْ لَكَافِيَةً فَقَالَ: إِنَّهَا قَدْ فُضِّلَتْ عَلَيْهَا بِتِسْعَةٍ وَّسِتِّيْنَ جُزْءًا»[1] (رواه البخاري من حديث مالك و مسلم من حديث أبي الزناد و رواه مسلم من حديث عبد الرزاق عن معمر عن همام عن أبي هريرة رضي الله عنه به)۔

ایک روایت میں یوں ہے: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَقَدْ فُضِّلَتْ عَلَيْهَا بِتِسْعَةٍ وَّسِتِّيْنَ جُزْءًا كُلُّهُنَّ مِثْلُ حَرِّهَا»[2]

طبرانی رحمہ اللہ کی روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ ہے کہ کیا تم جانتے ہو کہ تمھاری اس آگ کی مثال نارِ جہنم کے مقابلے میں کیا ہے؟ البتہ وہ تمھاری اس آگ سے از روئے سیاہی ستر گنا ہے۔[3] ضیاء مقدسی نے کہا: اسے ابو مصعب نے مالک سے روایت کیا ہے مگر مرفوع بیان نہیں کیا، جب کہ وہ میرے نزدیک صحیح کی شرط پر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے (یعنی امام مجاہد، قتادہ، ضحاک اور نضر بن عربی نے) فرمایا کہ "مقوین" سے مراد "مسافرین" ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ اسی معنی سے عرب کا قول ہے کہ جب گھر والے کوچ کر جاتے ہیں تو کہتے ہیں "أَقْوَتِ الدَّارُ"۔ ابن جریر نے کہا "قِيّ و قواء" بے آب و گیاہ بیابان، خالی اور آبادی سے دور ہے۔ عبد الرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مقوی یہاں بہ معنی "جائع" یعنی بھوکا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ (يعني قال ليث بن سليم عن مجاهد) یعنی نفع لینا ہے حاضر و مسافر کے لیے ہر طعام کے لیے، اصلاح نہیں کرتی ہے اس کی مگر آگ۔ (وكذا روى سفيان عن جابر الجعفي عنه)

امام مجاہد رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے (یعنی بروایتِ ابن نجیح) یعنی "مقوین" سے مراد سب لوگوں میں سے فائدہ لینے والے ہیں۔ اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔[4] یہ تفسیر دوسری تفسیروں سے زیادہ تر عام ہے، کیوں کہ شہری اور دیہاتی وغنی ہوں یا فقیر سب پکانے، تاپنے، روشنی کرنے اور دوسرے منافع کے لیے آگ کے محتاج ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے لطف اور مہربانی سے یہ ہے کہ اس نے پتھروں میں اور خالص لوہے میں اس کو ودیعت کر رکھا ہے، اس طرح پر کہ مسافر اس پر قادر ہوتا ہے کہ اسے اپنے سامان اور کپڑوں میں اٹھا لے جائے، پھر جب اپنی منزل میں اس کی ضرورت محسوس کرے تو اپنی چقماق نکالے اور اس کو رگڑ کر اپنی آگ جلا لے، پھر اسے پکائے، تاپے، گوشت بھونے اور اس سے انس حاصل کرے اور سارے فائدے حاصل کرے۔

چنانچہ اس لیے تنہا مسافروں کا ذکر کیا ہے، گو یہ سارے لوگوں کے حق میں عام ہے۔ اس لیے کہ اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے مرفوعاً روایت کی ہے (یعنی عن رجل من المهاجرين من قرن) کہ مسلمان تین چیزوں میں شریک ہیں: آگ اور گھاس اور پانی میں۔[5] ابن ماجہ کی روایت بہ سندِ جید سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

---

[1] صحيح البخاري (٣٠٩٢) صحيح مسلم (٢٨٤٣) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٣)

[3] المعجم الأوسط (١٥٥/١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح"، مجمع بحار الأنوار (٧٨/١٠)

[4] تفسير الطبري (١٤٤/٢٣_١٤٦) تفسير ابن كثير (٣٧٩/٤)

[5] سنن أبي داود (٣٤٧٧) مسند أحمد (٣٦٤/٥) صحيح الجامع (٦٧١٣)

سے مرفوعاً یہ ہے کہ تین چیزیں ہیں جن سے منع نہ کیا جائے: پانی، گھاس اور آگ۔[1] (وله من حديث ابن عباس ﷺ مرفوعًا مثل هذا و زيادة "وثمنه" ولكن في إسناده عبد الله بن حراش بن حوشب وهو ضعيف.[2] والله أعلم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ "مقوین" سے مراد "مسافرین" ہیں۔ (كما قال ابن عباس ﷺ)، یعنی ہم نے آگ کو ان لوگوں کے لیے منفعت ٹھہرایا جو اترتے ہیں قواء میں ("قواء" بہ کسرِ قاف ہے "بقصر هو أو بمد" (كذا قال الخطيب) مختار میں ہے: "مع كسر القاف يمد ويقصر" مصباح میں ہے: "أنه مع فتح القاف يمد لا غير" كذا في الجمل)۔ "قواء" بے آب و گیاہ زمین ہے، جیسے: مسافر لوگ اور جنگل والے لوگ جو اراضی مقفرہ میں نازل ہوتے ہیں۔ "أَرْضٌ قِوَاءٌ وَقِوَى بِمَدٍّ وَقَصْرٍ" دونوں طرح بولا جاتا ہے اور جب کوئی سفر کرے تو کہا جاتا ہے۔ "أَقْوَى أَيْ: نَزَلَ الْقِوَى" خاص کر کے مسافروں کا ذکر اس لیے کیا کہ مقیم لوگوں کی نسبت اس سے ان لوگوں کو زیادہ فائدہ ہے، کیوں کہ وہ رات کو آگ جلاتے ہیں، تاکہ درندے بھاگیں اور راہ بھولا ہوا رہ پائے۔ ان کے سوا اور منافع ہیں۔

امام ثعلبی رحمہ اللہ نے اکثر مفسروں سے یہی قول بیان کیا ہے اور یہی ظاہر ہے۔ "مقوی" بہ معنی "جائع" اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ "أَقْوَيْتُ مُنْذُ كَذَا وَكَذَا" بولا جاتا ہے، یعنی میں نے اتنی اتنی مدت سے کچھ نہیں کھایا۔ "وَبَاتَ فُلَانٌ الْقِوَى أَيْ: جَائِعًا"۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا: "قِوَى" من جملہ اضداد ہے فقر و غنا دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ جب کسی کے پاس زاد و توشہ نہیں ہوتا تو کہتے ہیں: "أَقْوَى الرَّجُلُ" اور کسی کے دواب (جانور) قوی ہوتے ہیں اور اس کا مال بہت ہوتا ہے، تب بھی "أَقْوَى الرَّجُلُ" بولتے ہیں، معنی یہ ہیں کہ ہم نے آگ کو غنی لوگوں اور فقیروں کے لیے متاع و منفعت ٹھہرایا، کسی کو اس سے بے نیازی نہیں ہے۔ امام مہدوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت سب کے لیے صلاحیت رکھتی ہے، کیوں کہ آگ کا ہر کوئی محتاج ہوتا ہے، وہ مسافر ہو یا مقیم ہو یا فقیر۔[3]

﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾ حرفِ فاء مابعد کو ماقبل پر مرتب کرنے کے لیے ہے۔ مابعد تو اللہ پاک کا ذکر اور اس کی تنزیہ ہے اور ماقبل وہ نعمتیں ہیں جن کا شمار کیا ہے اور اپنے بندوں پر ان کا انعام فرمایا ہے اور مشرکین نے ان کا انکار کیا ہے اور ان کو جھٹلایا ہے، یعنی جب مشرکین ان نعمتوں کا انکار اور تکذیب کرتے ہیں تو تو اپنے رب کے نام کی پاکی بول جو سب سے بڑا ہے جس نے اپنی قدرت سے یہ مختلف اور متضاد اشیاء پیدا کیں۔

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٧٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٤٨)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٧٢) اس کی سند میں "عبداللہ بن خراش" ضعیف راوی ہے۔ ضعيف الجامع (٥٩٣٥)

[3] تفسير القرطبي (١٧/٢٢٢)

صاف شیریں ٹھنڈا پانی بنایا اگر چاہتا تو اس کو کڑوا کر دیتا جس طرح کہ غرق کرنے والے دریا ہیں۔ اور جلانے والی آگ پیدا کی اس کو تو بندوں کی مصلحت کے لیے پیدا کیا اور اس کو ان کے لیے فائدہ مند ٹھہرایا ان کے معاشِ دنیا میں اور آخرت میں انھیں عذاب کرنے کے لیے۔ کسی نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو امر فرمایا کہ تو کہہ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمُ"۔ مرفوعاً آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو اپنے رکوع میں ٹھہراؤ۔[1] (ذكره النسفي رحمه الله)

﴿ بِاسْمِ ﴾ کا کلمہ زاید ہے اور "سبح" بہ نفسہ اور بہ حرفِ جر دونوں طرح متعدی ہوتا ہے تو اب معنی "سَبِّحْ رَبَّكَ" ہیں، چنانچہ حرفِ باء زاید ہے اور اسم اپنے معنی پر باقی ہے، یا بہ معنی ذات، یا بہ معنی ذکر، یا حرفِ باء محذوف سے متعلق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ باء زائد ہے۔ حلبی نے اس کا یوں تعقب کیا کہ یہ خلافِ اصل ہے اور اس کا حال کے لیے ہونا جائز رکھا ہے۔ "أَيْ: عَلَى سَبِيْلِ التَّبَرُّكِ بِاسْمِ رَبِّكَ"، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ ﴾ [البقرة: ٣٠] "اور ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔" یا تعدیت کے لیے ہے۔ (كذا في الجمل)

امام کرخی رحمه الله نے کہا اور اسی جگہ سے درج ذیل اللہ تعالیٰ کے فرمان کے بارے میں لوگوں نے کہا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی نقائص سے تنزیہ واجب ہے ویسی ہی تنزیہ واجب ہے ان الفاظ سے جو ان کے لیے وضع کیے گئے ہیں: ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴾ [الاعلی: ١] "اپنے بہت ہی بلند اللہ کے نام کی پاکیزگی بیان کر"۔ اور یہ ابلغ ہے اس لیے کہ وہ بطریقِ اولیٰ لازم آتی ہے بر سبیلِ کنایہ رمزیہ کے۔ یہاں ﴿ اِسْمَ رَبِّكَ ﴾ میں الف کو ثابت رکھا ہے، اس لیے کہ اس کا دور کثیر نہیں ہے، جیسا کہ "بِسْمِ اللّٰهِ" میں اس کی کثرت ہے۔[2] (كذا في الفتح)

نکتہ:

اول اللہ پاک نے انسان کی پیدایش کا ذکر کیا تو فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴾ کیونکہ اس میں جو نعمت ہے وہ ساری نعمتوں پر سابق ہے۔ پھر اس شے کا ذکر کیا جس سے اس کا قوام ہے، یعنی دانہ وغلہ تو فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴾ پھر اس شے کا ذکر کیا جس سے وہ گوندھا جاتا ہے اور اس پر پیا جاتا ہے، یعنی پانی۔ پھر اس شے کا ذکر کیا جس سے اس کی روٹی پکائی جاتی ہے، یعنی آگ، چنانچہ طعام کا حصول ان تین کے مجموع سے ہوتا ہے اور جسم اس سے مستغنی نہیں ہے، جب تک کہ زندہ ہے۔[3] (كذا ذكر النسفي)

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٨٧) تفسير النسفي (٢١١/٤) اس کی سند میں "إیاس بن عامر" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: ضعيف أبي داود، رقم الحديث (٣٣٧/١)

[2] فتح البيان (٣٨٠/١٣) [3] تفسير النسفي (٢١١/٤)

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾
اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا
الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ
اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾

پھر میں ستاروں کے گرنے کی قسم کھاتا ہوں ⑮75 اور بلاشبہہ اگر تمھیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے 76 کہ بلاشبہہ یہ قرآن نہایت معزز ہے 77 ایک محفوظ کتاب میں 78 اسے بس پاک (فرشتے) ہی ہاتھ لگاتے ہیں 79 (یہ) رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے 80 کیا پھر تم اس کلام (قرآن) سے بے پروائی کرنے والے ہو؟ 81 اور تم (اللہ کی اس نعمت میں) اپنا حصہ یہ ٹھہراتے ہو کہ تم (اسے) جھٹلاتے ہو 82

عظمتِ قرآن کا بیان:

قسم کے ایک معنی یہ ہیں کہ پیغمبروں کے دل میں آیتیں اترنے کی قسم۔ پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں، یعنی اس کتاب کو فرشتے ہاتھ لگاتے ہیں، وہ کتاب یہی قرآن جو فرشتوں کے ہاتھ میں ہے یا لوحِ محفوظ لکھا ہوا ہے۔ انتہیٰ.

قرآن مجید کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد بعث ونشور کا مقصد ہے، چنانچہ کفار نے اس کا انکار کیا اور قرآن شریف کے بھی منکر ہوئے اس کو سحر اور کہانت کی طرف منسوب کیا اور ایک عظیم الشان نعمت کی ناشکری اور بے قدری کی۔ چنانچہ اللہ پاک نے اس کے اثبات میں انسان کی پیدایش کی ابتداء کا ذکر فرمایا اور ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جن کے بغیر انسان کی بقا نہیں ہوسکتی اور ان کے ضمن میں ان قدرتوں کا بیان فرمایا، جن سے بعث کا ہونا ظاہر معلوم ہوتا ہے، بلکہ ان کا مقتضا بعث کا ضروری ہونا ہے، کیوں کہ جس کی پیدایش اور بقا کے لیے اتنا اہتمام کیا جائے، پھر وہ قلیل مدت کے بعد بالکل فنا ہو جائے تو یہ سارا جھگڑا ایک کھیل ہوا جس کی کچھ معتد بہ غرض و غایت نہیں ہے، بلکہ موت کے بعد مبعوث ہو کر ایسی ابدا الآباد کی بقا ہو کہ پھر فنا نہ ہو، اسی لیے اللہ پاک نے کتابیں دے کر رسول بھیجے، جن میں دنیا وآخرت کی سعادت ہے، کیوں کہ مقتضائے رحمت یہی ہے کہ بندوں کو بے فائدہ نہ چھوڑے اور اوامر و نواہی کے ساتھ مکلّف کرے، تاکہ بندے ان کے موافق عمل کر کے سعادت بقائے ابدی کے مستحق ہوں۔

حقیقت میں کتابوں کا نازل کرنا ساری نعمتوں سے بڑی نعمت ہے، اس لیے کہ اور نعمتوں سے تو جسم کی بقا ایک قلیل مدت کے لیے ہوتی ہے اور اس نعمت سے ہمیشہ کے لیے جسم اور روح کی بقا اور اس کی اصلاح اور درستی ہوتی

ہے۔ کھانے پینے کی تو دن میں صرف دو چار بار حاجت ہوتی ہے اور کتاب کے احکام کی ضرورت ہر دم پڑتی ہے، بلکہ کھانے پینے میں بھی کتاب کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، چونکہ کفار نے اس نعمتِ عظیم کی قدر نہ کی اور انکار کے ساتھ پیش آئے اور شکر کے بجائے ناشکری کی، اس لیے اللہ پاک نے بقائے جسمانی کی نعمتوں کے ذکر کے بعد اس روحانی نعمت کا ذکر بڑی تاکید اور اہتمام کے ساتھ کیا۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴾ عرب کی عادت ہے کہ جب کسی امرِ عظیم کی عظمت بیان کرنا منظور ہوتا ہے تو کسی عظیم شے کی قسم کھا کر اس کو بیان کرتے ہیں اور جب انتہا کا مبالغہ منظور ہوتا ہے تو خود اسی امر کی قسم کھا کر اس کی عظمت بیان کرتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی عظیم نہیں ہے کہ اس کی قسم کھائی جائے۔ پس یہاں اول تو کلمۂ ''لا'' زائد تاکید کے لیے ذکر کیا، جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے۔ پھر خود قسم کا لفظ ذکر فرمایا، پھر آیاتِ قرآنی کے وقوع اور نزول کی قسم کھائی، پھر جملہ معترضہ سے اس قسم کی عظمت بیان کی اور اس جملے کی تاکید ''إن'' و ''لام'' اور اسمیت سے فرمائی، پھر مقسم علیہ کو بہ جملہ اسمیہ ''إِنَّ'' اور لام کی تاکید کے ساتھ ذکر کیا۔ کلمۂ ''لا'' میں جمہور کا مذہب یہ ہے کہ تاکید کے لیے زیادہ کیا گیا ہے۔ ''فاء'' کے معنی قسم ہیں مابعد کا قول ﴿ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ ﴾ اس کا موید ہے۔

مفسرین میں سے ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ ''لا'' نفی کے لیے ہے اور جس کی اس سے نفی کی گئی ہے وہ محذوف ہے اور وہ کفار جاحدین کا کلام ہے۔ اور لوگوں نے کہا کہ ''لا'' ایسا زائد نہیں ہے جس کے کچھ معنی نہ ہوں، بلکہ قسم کے شروع میں اس کو لاتے ہیں، جبکہ منفی پر قسم کھائی جاتی ہے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے: ''لَا وَاللّٰهِ مَا مَسَّتْ يَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَدَ امْرَأَةٍ قَطُّ''[1] اسی طرح یہاں ہے۔ تقدیرِ کلام یہ ہے: ''لَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ لَيْسَ الْأَمْرُ كَمَا زَعَمْتُمْ فِي الْقُرْآنِ إِنَّهُ سِحْرٌ أَوْ كَهَانَةٌ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ كَرِيْمٌ'' امام فراء رحمہ اللہ نے کہا حرفِ ''لا'' نفی ہے۔ معنی یہ ہیں: ''لَيْسَ الْأَمْرُ كَذٰلِكَ'' پھر استیناف کر کے کہا: ﴿ اُقْسِمُ ﴾ (تفسیر ابن کثیر میں یوں ہے: ''قال ابن جرير وقال بعض أهل العربية: معنى قوله: فلا أقسم فليس الأمر كما تقولون ثم استانف القسم بعد فقيل أقسم'')۔[2]

اس کی یوں تضعیف کی ہے کہ ''لا'' کے اسم وخبر کا حذف کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ امام ابو حیان رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے۔[3] کسی نے کہا کہ لام ابتداء ہے اصل ''فَلَأُقْسِمُ'' ہے، پھر فتحہ کا اشباع کیا گیا تو اس سے الف پیدا ہو گیا (جیسا کہ شاعر کا قول ہے: ''أعوذ بالله من العقراب'')۔ اور اسی طرح کسی نے بغیر الف کے پڑھا ہے،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٦٦)

[2] تفسير الطبري (١٤٧/٢٣) تفسير ابن كثير (٣٨٠/٤) [3] البحر المحيط (٢١٢/٨)

(یعنی امام حسن، حمید اور عیسیٰ بن عمر رحمہ اللہ نے) اس قول کی بنا پر مبتداء مقدر ہوگا: "أَيْ: فَلَأَنَا أُقْسِمُ"[1] اس لیے کہ ابتدا کا لام اسم پر آتا ہے۔ کسی نے کہا یہاں حرفِ "لَا" بہ معنی "أَلَا" ہے جو تنبیہ کے طور پر ہوتا ہے۔ یہ قول بعید ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ "لَا" اپنے ظاہر پر ہے اور قسم کی نفی کے لیے ہے: "أَيْ: فَلَا أُقْسِمُ عَلَى هَذَا لِأَنَّ الْأَمْرَ أَوْضَحُ مِنْ ذَلِكَ" اس کو یوں دفع کیا ہے کہ ما بعد میں ﴿ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ ﴾ ہے مع تعیین مقسم بہ و مقسم علیہ کے، تو اب قسم کی نفی کیسے ہوسکتی ہے۔

﴿ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ ﴾ میں کئی قول ہیں:

1 یہ ہے کہ مساقطِ نجوم مراد ہیں، یعنی تاروں کے مغارب۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے،[2] اس کی خاص کرنے کی یہ وجہ ہے کہ تاروں کے غروب میں ان کے اثر کا زوال ہے اور ایسے موثر کے وجود پر دلالت ہے جس کی تاثیر زائل نہیں ہوتی، یا آخر شب میں جس وقت تاروں کا مغرب کی طرف انحطاط ہوتا ہو تو شاید اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص و عظیم افعال ہوں، یا فرشتوں کے لیے عباداتِ موصوفہ ہوں، یا اس لیے کہ وہ تہجد والوں کے قیام کا وقت ہے اور ان پر رحمت و رضوان کے نزول کا وقت ہے۔

2 امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منازلِ نجوم ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں یہی ہے۔ (كما ذكره ابن كثير)

3 امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ مواقعِ نجوم آسمان میں ان کے مطالع و مشارق ہیں۔ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے، یہ قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار ہے۔

4 امام حسن رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ قیامت کے دن نجوم کا انکدار و انتثار ہے، یعنی تاروں کا بے نور ہو جانا اور جھڑ پڑنا۔

5 امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ انواء ہیں کہ جس وقت پانی برستا تھا تو جاہلیت والے کہتے تھے: "مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا"[3] یعنی ہم کو فلاں فلاں نچھتر سے پانی ملا۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بنا پر ﴿ فَلَا أُقْسِمُ ﴾ اپنی حقیقت میں مستعمل ہوگا جو قسم کی نفی ہے۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا: یہ ایک قسم ہے اور اللہ تعالیٰ کو حق پہنچتا ہے کہ جس شے کی چاہے قسم کھائے اور ہم کو لائق نہیں ہے کہ ہم اللہ کے سوا اور اس کی صفاتِ قدیمہ کے سوا کسی کی قسم کھائیں[4] (یہ قول صحیح ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ انواء کا خیال کر کے نفیِ قسم کے قائل ہیں، انواء پر کیا موقوف ہے انواء و غیر انواء سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اللہ کو اختیار ہے جس کی چاہے قسم کھائے)۔

---

[1] تفسير القرطبي (٢٢٣/١٧) [2] تفسير الطبري (١٤٨/٢٣)

[3] تفسير الطبري (١٤٨/٢٣) تفسير ابن كثير (٣٨٠/٤) [4] تفسير القرطبي (٢٢٤/١٧)

6 کسی نے کہا: مراد قرآن شریف کا نزول ہے نجم نجم کر کے لوحِ محفوظ سے۔ امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس میں کئی قول ہیں: ایک یہ ہے کہ مراد نجومِ قرآن ہیں۔ (رواه حكيم بن جبير عن سعيد بن جبير عنه)۔ بے شک وہ نازل ہوا جملۃً یعنی اکٹھا شبِ قدر میں اوپر کے آسمان سے آسمانِ دنیا کی طرف، پھر اس کے بعد تھوڑا تھوڑا کر کے کئی برسوں میں نازل ہوا، پھر یہ آیت پڑھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آسمانِ دنیا سے زمین کی طرف نجم نجم ہو کر نازل ہوا، پھر یہ آیت پڑھی۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نجومِ قرآن ہیں جس وقت کہ وہ اترتا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ قرآن اللہ کے پاس لوحِ محفوظ سے جملۃً نازل ہوا سمائے دنیا میں سفرۂ کرام کاتبین کی طرف پھر سفرہ نے اس کو بیس رات میں جبریل علیہ السلام پر نجم نجم کیا اور جبریل علیہ السلام نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بیس برس میں نجم نجم کیا، چنانچہ وہ اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴾ "نجوم القرآن"۔[1] (رواه الضحاك عنه) اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی امام مجاہد، سدی اور ابوحزرہ رحمہم اللہ نے) بھی کہا ہے۔

7 امام فراء رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حکایت کیا ہے کہ مواقع النجوم محکم قرآن ہیں۔

جمہور نے "مواقع" بہ جمع پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام نخعی، حمزہ، کسائی، ابن محیصن اور ورش عن یعقوب) نے "موقع" بافراد پڑھا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موقع یہاں مصدر ہے واحد و جمع دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے اس قسم کی عظمت کی خبر دی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴾ جملہ ﴿ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ ﴾ معترضہ ہے مقسم بہ اور مقسم علیہ کے درمیان اس سے مقسم بہ کی تعظیم و تاکید منظور ہے، اسی لیے بہ حرفِ "إن" و لام اس کو موکد کیا۔ اصل میں "إِنَّهُ لَقَسَمٌ عَظِيمٌ لَوْ تَعْلَمُونَ" ہے، اس کو مقدم کرنے کا لفظی فائدہ تو یہ ہے کہ عظیم و کریم کا فاصلہ برابر ہو جائے اور معنوی فائدہ یہ ہے کہ صفت کے ذکر سے پہلے جلدی سے کفار کی جہالت معلوم ہو جائے۔ واللّٰہ أعلم۔ ﴿ اِنَّهٗ ﴾ کی ضمیر قسم کی طرف راجع ہے جس پر "أُقْسِمُ" دال ہے، یعنی بے شک مواقعِ نجوم کی قسم ایک بڑی قسم ہے، اگر تم علم والوں میں سے ہوتے تو البتہ اس قسم کی عظمت کو جانتے یا اگر تم اس کی عظمت کو جانتے تو اس سے فائدہ حاصل کرتے۔ "مواقع نجوم" میں جو کئی قول گزر چکے ہیں، اگر ان میں سے تاروں کے مغارب یا منازل یا مطالع و مشارق یا انواء مراد لیے جائیں تو اس قسم کے عظیم ہونے کی یہ وجہ ہے کہ مقسم بہ ہیں، اللہ پاک کی عظیم قدرت و کمال حکمت و فرطِ رحمت پر دلالت ہے کہ کیسا بڑی قدرت والا اور کامل حکمت والا اور بڑا مہربان ہے کہ اتنا بڑا کارخانہ برابر چل رہا ہے، ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔ جن باتوں کو اس کی رحمت مقتضی ہے ان میں سے یہ ہے کہ اپنے بندوں کو مہمل و بے کار نہ چھوڑ رکھے، بلکہ ان کو اوامر و نواہی کا مکلف کر کے سعادتِ ابدی کا مستحق بنائے

[1] تفسير الطبري (١٤٧/٢٣) الدر المنثور (٢٥/٨) [2] تفسير القرطبي (٢٢٤/١٧) فتح القدير (٢١٢/٥)

اور اپنے رسول پر اپنے احکام کی کتاب نازل کر کے ہدایت کی راہ بتائے، یہ سب قدرت و رحمت کا کارخانہ یہی چاہتا ہے کہ آسمانی کتاب نازل ہو جس سے معاش و معاد کی اصلاح و درستی ہو جائے۔

وہ کتاب یہی قرآن کریم اللہ سبحانہ کا کلامِ قدیم ہے جس کو کفار اپنی جہالت سے سحر اور کہانت وغیرہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اگر وہ سمجھ رکھتے تو اس کی قدر و عظمت کرتے اور اپنی سعادت سمجھتے۔ اگر مواقع نجوم سے تاروں کا بے نور ہونا اور جھڑ پڑنا قیامت میں مراد لیا جائے تو بھی مقسم بہ ہیں، اللہ پاک کی عظمت، قدرت اور کمال حکمت پر دلالت ہے کہ جس ذات پاک نے ایسا بڑا کارخانہ پہلی بار بنایا اور ایک مدت تک اپنی قدرت وحکمت سے ٹھیک ٹھاک چلایا، وہی ایک دن سب کو فنا کر کے دوبارہ خلق کو مبعوث کرے گا جس کی خبر قرآنِ کریم دے رہا ہے اور اگر نجوم سے مراد نجومِ قرآن اور مواقع سے نزولِ قرآن کے اوقات مراد لیے جائیں تو مقسم علیہ کے ساتھ مناسبت ظاہر ہے۔

اسی لیے امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس پر دال ہے کہ مواقع نجوم سے مراد نزولِ قرآن ہے،[1] اسی طرح مقسم بہ کی عظمت و بزرگی بھی ظاہر ہے، کیوں کہ جس وقت میں قرآنِ کریم وعظیم نازل ہوا تو وہ وقت بھی عظیم ہوا، وہ اس قابل ہے کہ اس کی عظمت ظاہر کرنے کو مقسم بہ ٹھہرایا جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ نجوم سے مراد آیاتِ کتاب اور مواقع سے مراد انبیاء علیہم السلام کے قلوب ہیں، جہاں آیتوں کا وقوع و نزول ہوتا ہے جن پر کلامِ الٰہی کی تجلی پڑتی ہے۔ یہ دل بھی عظمتِ کلام عظیم کے سبب سے عظیم اور کریم ہوئے کہ ان کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے انھیں مقسم بہ ٹھہرایا جائے۔ شاہ عبدالقادر صاحب۔قدس سرہ۔نے فائدے میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ واللہ أعلم.

بالجملہ مقسم بہ کے بیان اور تعظیم کے بعد اللہ پاک نے مقسم کا ذکر فرمایا: ﴿ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ﴾ یعنی بے شک وہ کتاب جو تم پر پڑھی جاتی ہے، یا وہ کتاب جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، البتہ ایک قرآنِ کریم ہے، یہ پہلی صفت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کو مکرم و معزز کیا ہے اور ساری کتابوں پر اس کی قدر بلند کی ہے اور اس کو مکرم و مبرا کیا ہے اس سے کہ سحر ہو یا کہانت یا کذب۔ کسی نے کہا ہے کہ کریم اس لیے ہے کہ اس میں کرمِ اخلاق و معالی امور ہیں۔ کسی نے کہا: اس لیے کہ اس کے حافظ کا اکرام کیا جاتا ہے اور اس کے قاری کی تعظیم کی جاتی ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے اہلِ معانی سے بیان کیا ہے کہ قرآن کی صفت کریم اس لیے ہوئی کہ اس کی شان سے یہ ہے کہ وہ ان دلیلوں کے سبب سے جو دینِ حق کی راہنمائی کرتی ہیں، خیرِ کثیر عطا کرتا ہے۔

امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کریم ایک اسم جامع ہے اس شے کے لیے جو محمود ہے اور قرآن کریم ہے، حمد کیا جاتا ہے اس ہدایت و بیان وعلم وحکمت کے سبب سے جو اس میں ہے،[2] چنانچہ فقیہ تو اس کے ساتھ استدلال کرتا ہے

[1] فتح القدير (٢١٢/٥)
[2] فتح القدير (٢١٣/٥)

اور اس سے اَخذ کرتا ہے اور حکیم اس سے مدد لیتا ہے اور اس کے ساتھ حجت پکڑتا ہے اور ادیب اس سے مستفید ہوتا ہے اور اس کے ساتھ قوت پاتا ہے۔ چنانچہ ہر عالم اپنا اصل علم اس سے طلب کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حسن مرضی ہے اپنی جنس میں، یا نفاع جم المنافع ہے (ہر قسم کے منافع اس میں اکٹھے ہیں) یا عزیز و مکرم ہے۔ کثرتِ تلاوت کے سبب سے سبک نہیں ہوتا اور نہ کثرتِ تکرار سے بوسیدہ پڑتا ہے اور نہ سننے والے اس سے ملول ہوتے ہیں اور نہ زبانوں پر ثقیل ہوتا ہے، بلکہ تر و تازہ ہے، ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا۔

﴿ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴾ یہ قرآن کی دوسری صفت ہے۔ کتاب میں چار قول ہیں: ایک یہ ہے کہ کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ ﴿ مَكْنُوْنٍ ﴾ سے مراد مستور و مصون ہے، یعنی ایسا قرآن کہ مکتوب ہے۔ ایک ایسی کتاب جو ستر کی گئی اور صیانت کی گئی ہے نظرِ خلائق سے، یا باطل سے یا غیر مقرب فرشتوں سے۔ سوائے مقربین کے اور کوئی اس پر مطلع نہیں ہوتا۔ یہ قول ایک جماعت کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کتاب سے مراد مصحف ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے یہ قول امام قتادہ اور مجاہد رحمہ اللہ کا ہے،[1] یعنی ایسا قرآن کہ مکتوب میں ہے، ایسا مکتوب کہ محفوظ ہے تغیر و تبدل و تحریف سے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر: ٩] ''ہم نے ہی اس قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

محلی نے اسی قول کو اختیار کیا ہے[2] اور امام خازن رحمہ اللہ نے پہلے قول کو زیادہ صحیح کہا ہے۔[3] امام بیضاوی اور نسفی رحمہما اللہ نے دونوں کا ذکر کیا ہے،[4] لیکن مختار ان کا یہی قولِ اول ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ کتاب سے مراد تورات اور انجیل ہیں، ان میں قرآن شریف کا ذکر ہے اور اس کا ذکر ہے جس پر وہ نازل ہوا۔ یہ قول امام عکرمہ رحمہ اللہ کا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ کتاب سے مراد زبور ہے، یہ قول امام سدی رحمہ اللہ کا ہے۔[5]

جملہ ﴿ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ خبر یہ ہے ﴿ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴾ کی صفت ہے بنا بر قولِ اول کہ کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر مفسرین اس پر ہیں کہ ﴿ لَا يَمَسُّهٗٓ ﴾ کی ضمیر ﴿ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴾ کی طرف راجع ہے اس بنیاد پر کہ ﴿ الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ سے مراد جنسِ ملائکہ ہیں جو جسمانی کدورتوں سے پاک ہیں، یا شرک اور ذنوب وغیرہ کے میل کچیل سے منزہ و صاف ہیں، جیسا کہ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول مروی ہے۔ (رواہ ابن جریر)۔ ﴿ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ فرمایا: ''اَلْكِتَابُ الَّذِيْ فِيْ السَّمَاءِ''، یعنی نہیں چھوتے اس کتاب کو جو آسمان میں ہے مگر مطہرون۔ امام عوفی رحمہ اللہ کی روایت ان سے یہ ہے یعنی فرشتے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ وغیرہ نے (یعنی امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ضحاک، ابو الشعثاء، جابر بن زید، ابونہیک،

---

[1] تفسير القرطبي (١٧/٢٢٥) [2] تفسير الجلالين (١/٧١٧) [3] تفسير الخازن (٧/٢٥)
[4] تفسير البيضاوي (٥/٢٩٢) تفسير النسفي (٤/٢١٢) [5] تفسير القرطبي (١٧/٢٢٥)

سدی اور عبدالرحمان بن زید بن ارقم وغیرہم نے) بھی اسی طرح کہا ہے۔[1] یہ سب تو اس بنا پر ہے کہ ﴿ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴾ سے مراد لوحِ محفوظ ہے اور ﴿ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ جملہ خبریہ کتاب کی صفت ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ﴿ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴾ سے مراد مصحف ہو بنا بر قولِ ثانی اور ﴿ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ قرآن کی تیسری صفت ہو اور ﴿ لَا يَمَسُّهٗۤ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہو تو اس بنا پر چار احتمال ہیں: ایک یہ کہ ﴿ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ خبریہ ہے قرآن کی صفت ہے اور ﴿ اَلْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ سے مراد فرشتے ہیں۔ معنی یہ ہیں ایسا قرآن کہ نہیں لے کر اترتے اس کو مگر پاک لوگ، یعنی فرشتے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے امام قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اس کو اللہ کے پاس مس نہیں کرتے مگر مطہرون۔ لیکن دنیا میں تو بے شک مس کرتا ہے اس کو مجوس نجس اور منافق رجس۔ کہا اور یہ آیت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: "مَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ"

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ تم نہیں ہو۔ تم تو اصحاب الذنوب ہو۔[2] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفارِ قریش نے یہ زعم کیا کہ اس قرآن کو شیاطین لے کر اترتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ ﴿ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴾ [الشعراء: ۲۱۰۔ ۲۱۲] "اس قرآن کو شیطان نہیں لائے، نہ وہ اس قابل ہیں، نہ انھیں اس کی طاقت ہے، بلکہ وہ تو سننے سے بھی محروم کر دیے گئے ہیں۔"

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول جید ہے اور اقوال ماقبل سے خارج نہیں ہوتا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ جملہ خبریہ ہے قرآن کی صفت ہے اور مطہرون سے مراد مومنین ہیں، یعنی ایسا قرآن کہ اس کا نفع و برکت صرف مومن ہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ قول امام فراء رحمہ اللہ کا ہے۔[3] (فتح البیان میں اسی طرح ہے اور تفسیر ابن کثیر میں فراء رحمہ اللہ کا قول ان الفاظ میں ہے: نہیں پاتا ہے اس کا مزہ اور نفع مگر وہ شخص جو اس پر ایمان لایا ہے[4])۔ امام حسین بن فضل رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ نہیں پہچانتا اس کی تفسیر اور تاویل مگر وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے شرک اور نفاق سے مطہر کیا ہے۔[5]

تیسرا احتمال یہ ہے کہ قرآن کی صفت ہے اور ﴿ يَمَسُّهٗۤ ﴾ کے معنی ہیں: "لَا يَنْبَغِي أَنْ يَّمَسَّهُ"، جیسے یہ حدیث شریف ہے: «اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ»[6] "أَيْ: لَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَّظْلِمَهُ أَوْ يُسْلِمَهُ"، معنی یہ ہیں: ایسا قرآن کہ لائق نہیں ہے کہ اس کو چھوئے مگر وہ شخص جو لوگوں میں سے طہارت پر ہو اور

---

[1] تفسیر الطبري (۲۳/۱۵۰، ۱۵۱) تفسیر ابن کثیر (۴/۳۸۰)
[2] تفسیر الطبري (۲۳/۱۵۲، ۱۵۱)
[3] تفسیر ابن کثیر (۴/۳۸۰)
[4] تفسیر ابن کثیر (۴/۳۸۰) فتح البیان (۱۳/۳۸۳)
[5] تفسیر القرطبي (۱۷/۲۲۶)
[6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۳۱۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۸۰)

امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ کا قول کہ ﴿ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ "مِنَ الْأَحْدَاثِ وَالْأَنْجَاسِ" اور امام کلبی رحمہ اللہ کا قول ﴿ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ "مِنَ الشِّرْكِ" اور امام ربیع بن انس رحمہ اللہ کا قول ﴿ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ "مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَايَا" اور محمد بن فضل وغیرہ کا قول "لَا يَقْرَأُهٗ إِلَّا الْمُوَحِّدُوْنَ"[1] شاید ان سب اقوال کی بنیاد قولِ مذکور پر ہو۔ واللّٰہ أعلم.

چوتھا احتمال یہ ہے کہ ﴿ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ خبر ہے نہی کے معنی میں۔ امام محلی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں،[2] یعنی ایسا قرآن جس کے حق میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کو مس نہ کریں مگر وہ لوگ جو حدث اور نجس سے پاک ہیں۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ان کا اس کو بغیر طہارت کے مس کرنا حرام ہے۔ یہ جملہ صریحاً اپنی خبریت پر باقی نہیں رہا، تاکہ اللہ پاک کی خبر میں اختلاف لازم نہ آئے، کیوں کہ اس کو تو بہت سے بغیر طہارت کے چھوتے ہیں، حالانکہ اللہ پاک کی خبر میں خلف محال ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے دوسری وجہ یہ ذکر کی ہے کہ کلمۂ "لا" ناہیہ ہے اور اس کے بعد فعل مجزوم ہے، اس لیے کہ اگر وہ ادغام سے فک کیا جاتا تو جزم اس میں ظاہر ہوتا جس طرح کہ اس آیت میں ہے "لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْءٌ"، لیکن حرفِ سین دوسری میں ادغام کیا گیا ہے اور جب مدغم ہوا تو اس کے آخر کو متحرک بہ ضم کیا بہ سبب ہائے ضمیر مذکر غائب کے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے امام ابن عطیہ رحمہ اللہ سے نہی کی تضعیف نقل کی ہے مگر یہ تضعیف خود ضعیف ہے۔ امام جمل رحمہ اللہ نے اس کی وجہ ذکر کی ہے۔

بالجملہ جو اس کے قائل ہیں کہ خبر نہی کے معنی میں ہے ان کے نزدیک مصحف کو صرف وہ شخص چھوئے جو حدث و جنابت و نجاست سے پاک ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن سے مراد مصحف ہے، جیسا کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ دشمنوں کی سرزمین کی طرف قرآن کو ساتھ لے کر سفر کیا جائے، اس بات کے خوف کی وجہ سے کہ اس کو دشمن پائیں۔[3] جمہور اسی طرف گئے ہیں کہ محدث کو مصحف کے چھونے سے منع کیا جائے۔

سیدنا علی، ابن مسعود، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم، امام سعید بن زید، عطاء، زہری، نخعی، حکم اور حماد (خازن نے حکم و حماد کو ان میں لکھا ہے جو محدث کے لیے مصحف کو مس کرنا جائز کہتے ہیں، شاید ان کے دو قول ہوں۔[4] واللّٰہ أعلم) اور فقہاء کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے۔ ان میں سے امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ ہیں۔[5] اس مذہب کی حدیثوں میں سے جو دلیلیں ہیں وہ یہ ہیں:

1. امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی مؤطا میں عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے روایت کیا ہے کہ اس کتاب میں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کے لیے لکھا، اس میں یہ ہے: "لَا يَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ"[6]

---

[1] تفسير القرطبي (٢٢٦/١٧) [2] تفسير الجلالين (٧١٧/١) [3] صحيح البخاري (٢٨٢٨) صحيح مسلم (١٨٦٩)
[4] تفسير الخازن (٢٦/٧) [5] تفسير القرطبي (٢٢٦/١٧) [6] الموطأ (١٩٩/١)

امام ابو داود نے مراسیل میں زہری کی حدیث سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کے صحیفے میں پڑھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قرآن کو صرف پاک ہی چھوئے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک عمدہ وجادہ ہے جو زہری وغیرہ نے پڑھا۔ اس طرح کی چیز کو اخذ کرنا لائق ہے۔ یقیناً امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے عمرو بن حزم، عبداللہ بن عمر اور عثمان بن ابی العاص سے باسند بیان کیا ہے مگر ان دونوں کی اسناد محلِ نظر ہے۔ واللّٰہ أعلم''[1] انتھٰی.

② سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''إِنَّهُ كَانَ لَا يَمَسُّ الْمُصْحَفَ إِلَّا مُتَوَضِّأً''، ''مصحف تو صرف باوضو ہی چھوئے۔'' (أخرجه ابن المنذر)

③ عبدالرحمان بن زید سے مروی ہے، کہا: ہم سلمان کے ہمراہ تھے، چنانچہ وہ قضائے حاجت کے لیے چلے تو ہم سے چھپ گئے، پھر ہم پر نکلے۔ ہم نے کہا کہ اگر تم وضو کر لیتے تو ہم تم سے قرآن میں سے کئی اشیاء کا پوچھتے، کہا: تم مجھ سے پوچھو، بے شک میں اس کو چھوؤں گا نہیں اس کو تو صرف مطہرون چھوتے ہیں، پھر یہ آیت پڑھی۔[2] (أخرجه سعيد بن منصور و ابن أبي شيبة في المصنف و ابن المنذر وغيرهم)

④ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «لَا يَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ»''[3] ''قرآن کو صرف طاہر ہی چھوئے۔'' (أخرجه الطبراني و ابن مردويه)

⑤ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب ان کو یمن کی طرف بھیجا تو ان کے لیے ان کے عہد نامے میں لکھا کہ نہ چھوئے قرآن کو مگر طاہر۔[4] (أخرجه ابن مردويه)

دوسرا قول یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام شعبی رحمہ اللہ اور ایک جماعت سے مروی ہے جن میں سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہیں کہ محدث کے لیے مصحف کو مس کرنا جائز ہے[5] (مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک غلاف کے ساتھ مس کرنا درست ہے علی الاطلاق مس درست نہیں جس طرح کہ اس عبارت سے سمجھا جاتا ہے۔ از مصحح سلمه)

① سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا، وہ کتاب جو آسمان سے نازل کی گئی اس کو نہیں چھوتے مگر فرشتے۔ (أخرجه عبد بن حميد و ابن جرير و ابن المنذر و البيهقي في المعرفة من طرق عنه)

② سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ﴿ اَلْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ کی تفسیر میں ''اَلْمَلَائِكَةُ'' مروی ہے۔[6] (أخرجه سيعد بن منصور وابن المنذر كما تقدم)

③ علقمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے، کہا: ہم سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو وہ ہم پر پاخانے سے نکلے۔ چنانچہ ہم

① تفسير ابن كثير (٣٨١/٤) ② الدر المنثور (٢٧/٨) ③ المعجم الكبير (٣١٣/١٢) صحيح الجامع (٧٧٨٠)
④ الدر المنثور (٢٨/٨) ⑤ تفسير القرطبي (٢٢٦/١٧) ⑥ الدر المنثور (٢٦/٨)

نے ان سے کہا: اے ابوعبداللہ! اگر آپ وضو کر لیتے، پھر ہم پر فلاں فلاں سورت پڑھتے، کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے تو وہ ﴿ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ ہے اور یہ وہ ہے جو آسمان میں ہے، نہیں چھوتے اس کو مگر فرشتے، پھر ہم نے قرآن میں سے جو چاہا، وہ ہم پر پڑھا۔[1] (أخرجه عبدالرزاق و ابن المنذر)

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے شرح منتقیٰ میں اس مسئلے کی تقریر کی ہے اور جو اس بارے میں حق ہے اس کو بیان کیا ہے۔[2] امام خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ظاہرِ آیت نفی ہے اور اس کے معنی نہی ہیں۔ علماء نے کہا ہے کہ جنب کے لیے جائز نہیں ہے نہ حائض کے لیے اور نہ محدث کے لیے کہ وہ مصحف کو اٹھائے یا اسے مس کرے۔ امام عطاء، طاؤس، سالم، قاسم اور اکثر اہلِ علم کا یہی قول ہے اور اسی کے امام مالک، امام شافعی اور اکثر فقہاء رحمہم اللہ قائل ہیں۔ پھر اس قول کی دلیلیں ذکر کی ہیں۔ پھر کہا ہے کہ قرآن سے مراد مصحف ہے، اس کا نام قرآن رکھا بنا بر قرب و جوار و اتساع۔

پھر ذکر کیا کہ حماد اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ نے فرمایا کہ محدث اور جنب کے لیے مصحف کو اس کے غلاف کے ساتھ اٹھانا اور مس کرنا جائز ہے، پھر اگر تم کہو کہ جب زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے اور ﴿ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ سے مراد فرشتے ہیں اور اگر مراد حدث کی نفی ہوتی تو "لَا یَمَسُّهُ إِلَّا الْمُتَطَهَّرُوْنَ" فرماتا "تطهر" سے۔ پھر امام شافعی رحمہ اللہ کا قول کیسے صحیح ہوگا کہ محدث کے لیے مصحف کو مس کرنا صحیح نہیں ہے تو کہیں گے: جس نے یوں کہا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کو صریح آیت سے لیا ہے تو اس نے اس کو تفسیر ثانی پر محمول کیا ہے، وہ یہ قول ہے کہ کتاب سے مراد مصحف ہے اور جس نے یہ کہا ہے کہ انھوں نے اس کو استنباط کے طریق سے اخذ کیا ہے تو اس نے کہا ہے کہ طہارت کے ساتھ مس کرنا ایک صفت ہے جو اس کی تعظیم پر دال ہے اور بغیر طہارت کے مس کرنا ایک طرح کی استہانت ہے اور مصحف کریم کے ساتھ ملنے کے لیے یہ لائق نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کو سنت سے اَخذ کیا ہے اور اُن کی دلیل وہ احادیث ہیں جو پہلے گزر چکی ہیں۔ واللّٰه أعلم.[3] انتھیٰ.

جمہور نے ﴿ اَلْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ کو بہ تخفیفِ طاء وتشدیدِ ہائے مفتوحہ بہ صیغۂ اسم مفعول پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے) بہ کسرِ ہاء بہ صیغۂ اسمِ فاعل پڑھا ہے: "أَيْ: اَلْمُطَهِّرُوْنَ أَنْفُسَهُمْ" اور کسی نے (یعنی امام نافع اور ابو عمرو رحمہما اللہ نے "روایة عنهما" اور عیسیٰ بن عمر رحمہ اللہ نے) بہ سکونِ طاء وفتحِ ہائے خفیفہ پڑھا ہے، اسم مفعول "أطهر" کا اور کسی نے (یعنی امام حسن، زید بن علی اور عبداللہ بن عوف رحمہم اللہ نے) بہ تشدیدِ طاء و کسرِ ہاء پڑھا ہے، اصل میں "اَلْمُتَطَهِّرُوْنَ" ہے۔[4]

﴿ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ جمہور نے بہ رفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ قرآن کی تیسری یا چوتھی صفت ہے، یا

---

[1] مصنف عبد الرزاق (۳۴۰/۱) [2] نیل الأوطار (۲۵۶/۱) [3] تفسیر الخازن (۲۶/۷) [4] فتح القدیر (۲۱۳/۵)

مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: هُوَ تَنْزِيْلٌ" کسی نے بہ نصب پڑھا ہے بنا بر حال۔ ﴿ تَنْزِيْلٌ ﴾ سے مراد منزل ہے، منزل کا نام تنزیل رکھا بنا بر اتساعِ لغت۔ مقدور کو قدر اور مخلوق کو خلق بولتے ہیں اس میں اس پر رد ہے، جس نے کہا کہ قرآن شعر ہے یا سحر یا کہانت ہے، یعنی یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جو رب العالمین ہے۔

عالم کا سارا کارخانہ اس کے نازل کرنے کا مقتضی ہے، کیوں کہ اس میں معاش اور معاد کی پوری اصلاح ہے اور صفتِ ربوبیت اس کے انزال کی مقتضی ہے، ویسا نہیں ہے، جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ سحر یا کہانت یا شعر ہے، بلکہ یہ تو حق ہے جس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی اور حق نافع ہے۔ جب قرآن شریف کے اوصافِ جلیلہ بیان ہو چکے جو اس کی عزت اور تعظیم کو اور اس پر ایمان لانے کو واجب کرتے ہیں تو کفار کو ملامت اور سرزنش کر کے فرمایا: ﴿ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴾ یعنی کیا پھر تم اس قرآن میں جو مذکورہ اوصاف کا حامل ہے سستی کرتے ہو، یعنی اس کی بے قدری کرتے ہو اور اس پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ وہ بڑی معزز و مکرم شے ہے۔ معاش و معاد کی اصلاح و درستی کا اس پر دار و مدار ہے۔

"مدھن" کے معنی میں بہت سے قول ہیں:

1. امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ "مدھن و مداھن" بہ معنی منافق ہے۔
2. امام عطاء رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ کذاب ہے۔
3. امام مقاتل بن سلیمان اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُدْهِنُوْنَ ﴾ بہ معنی "کافرون" ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴾[1] [القلم: ۹] "وہ تو چاہتے ہیں کہ تو ذرا ڈھیلا ہو تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔"
4. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مُكَذِّبُوْنَ غَيْرُ مُصَدِّقِيْنَ بِهِ"[2] (یہ الفاظ عوفی کے ہیں)۔ اسی طرح امام ضحاک، ابو حزرہ اور سدی رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔
5. امام ضحاک رحمہ اللہ کا دوسرا قول "مُعْرِضُوْنَ" ہے۔
6. امام مجاہد رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ "تُرِيْدُوْنَ أَنْ تُمَالِئُوْهُمْ فِيْهِ وَتَرْكَنُوْا إِلَيْهِمْ"[3] ("ممالاۃ" یارمندے کردن برکاری "تمالئوا على الأمر اجتمعوا عليه وتعاونوا" كذا في الصراح)۔ دوسرا قول یہ ہے: "مُمَالِئُوْنَ الْكُفَّارَ عَلَى الْكُفْرِ" یعنی تم چاہتے ہو کہ کفار کی معاونت کرو قرآن کے بارے میں اور ان کی طرف مائل ہو یا تم معاونت کرنے والے ہو کفار کی کفر پر۔
7. امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مدھن" وہ ہے جو اپنے اوپر اللہ کا حق نہیں سمجھتا (اصل میں "لا يعقل

[1] فتح القدير (۲۱۳/۵) [2] تفسير الطبري (۱۵۳/۲۳) [3] تفسير الطبري (۱۵۳/۲۳)

حق الله عليه" ہے، عینی میں "لم يفعل ما يحق عليه" ہے۔ والله أعلم) اور علتوں بہانوں سے اس کو دفع کرتا ہے۔[1] فتح البیان میں پہلے قول کو زیادہ مناسب کہا ہے، اس لیے کہ "مدھن" وہ ہے جس کا ظاہر اس کے باطن کے خلاف ہوتا ہے، گویا وہ "دُھن" (یعنی روغن و تیل) کے مشابہ ہے، اس کی سہولت اور نرمی میں۔

⑧ مورج نے کہا: "مدھن" منافق ہے، جو اپنی جانب کو نرم کرتا ہے، تاکہ اپنا کفر چھپائے۔ ادہان و مداہنت بہ معنی تکذیب و کفر و نفاق ہے، اس کی اصل لین و نرمی ہے اور یہ کہ جس شے کو ظاہر کرتا ہے اس کے خلاف چھپائے۔[2] کشاف میں کہا ہے: "مُدْهِنُوْنَ: مُتَهَاوِنُوْنَ بِهِ كَمَنْ يُدْهِنُ فِيْ الْأَمْرِ أَيْ: يَلِيْنُ جَانِبُهٗ وَلَا يَتَصَلَّبُ فِيْهِ تَهَاوُنًا بِهِ"[3] انتہیٰ. امام راغب رحمہ اللہ نے کہا: "ادھان" اصل میں "تدھین" کے مثل ہے، یعنی کسی شے پر تیل لگانا، تاکہ چکنی ہو جائے، لیکن یہ مراد ٹھہرایا گیا ہے مدارات و ملاینت و ترکِ جد سے جس طرح کہ تقرید اس سے عبارت ٹھہرائی گئی ہے۔ تقرید "قراد" کے کھینچنے کو کہتے ہیں ("قراد" بہ معنی چیچڑیاں) فتح میں فرمایا ہے کہ مدارات و ملاینت کا نام مداہنت رکھا گیا ہے، یہ استعارہ و مجاز معروف ہے اور اس کی وجہ سے شہرت کی حقیقت عرفی ہو گیا ہے۔ اسی لیے یہاں اس کے ساتھ "تہاون" سے بھی مجاز کیا گیا ہے، کیونکہ جو متہاون بالامر ہو جاتا ہے تو وہ اس میں سختی اور درشتی نہیں کرتا۔ بعض لغت والوں نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم قرآن کے قبول کرنے میں حزم کے تارک ہو۔[4]

﴿ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ یہاں مضاف محذوف ہے جیسا کہ امام واحدی رحمہ اللہ نے مفسروں سے حکایت کیا ہے۔ "أَيْ: تَجْعَلُوْنَ شُكْرَ رِزْقِكُمْ... الآية" یعنی تم اپنے رزق کا شکر یہ یہ ٹھہراتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی تکذیب کرتے ہو، سو تکذیب کو شکر کی جگہ پر رکھتے ہو۔ امام ہیثم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قبیلہ از دشنوء ہ کہتے ہیں: "مَا رَزَقَ فُلَانٌ أَيْ: مَا شَكَرَ" یعنی ان کی بولی میں رزق بہ معنی شکر ہے۔ اس لغت کی بنا پر آیت میں مضاف محذوف نہ ہوگا، بلکہ رزق کے معنی شکر ہیں۔ رزق کی جو شکر کے ساتھ تعبیر کی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شکر رزق کی زیادتی کا مقتضی ہے تو سبب کی ساتھ مسبب کے تعبیر کر کے شکر رزق ہوتا ہے۔ اس آیت کے تحت میں جو امور داخل ہیں ان میں سے کفار کا قول ہے کہ جب اللہ پاک ان کو پانی دیتا ہے اور ان پر بارش نازل کرتا تو کہتے کہ "سُقِيْنَا بِنَوْءِ كَذَا، مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا" یعنی ہم کو فلاں نچھتر سے پانی پلایا گیا۔

امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں: "وَتَجْعَلُوْنَ بَدَلَ شُكْرِكُمْ رِزْقَكُمُ الَّذِيْ رَزَقَكُمُ اللّٰهُ التَّكْذِيْبَ بِأَنَّهٗ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الرَّزَّاقِ" یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تم کو رزق دیا اس کے شکر کا بدلہ اس کی تکذیب کو ٹھہراتے ہو کہ وہ اللہ رزاق کے پاس سے ہے۔ سیدنا علی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے (فتح البیان میں سیدنا علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے

---

[1] تفسير القرطبي (١٧/٢٢٨) [2] فتح البيان (١٣/٣٨٥) [3] الكشاف (٤/٤٦٨) [4] فتح البيان (١٣/٣٨٥)

درمیان بیاض ہے، اس لیے محشی مصر نے حاشیے پر لکھا ہے کہ بیاض باصلہ درحقیقت وہ صحیح البیاض ہے کچھ ساقط نہیں ہوا ہے۔ فليعلم منه مدظله) "تَجْعَلُوْنَ شُكْرَكُمْ" پڑھا ہے۔ ﴿ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ کو جمہور نے بہ تشدید پڑھا ہے، تکذیب سے اور کسی نے (یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور امام عاصم فی روایۃ عنہ نے) بہ تخفیف پڑھا ہے "کذب" سے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ پانی برسائے گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبح کی لوگوں میں سے شاکر نے اور ان میں سے کافر نے۔ کہا کہ یہ رحمت ہے اس کو اللہ نے رکھا۔ ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ تحقیق سچ ہوا کہ فلاں فلاں ستارے کے سبب بارش ہوئی۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝75 وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝76 اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝77 فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝78 لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝79 تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝80 اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝81 وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴾[2]

(أخرجه مسلم وابن المنذر وابن مردويه عنه وأصل الحديث بدون ذكر أنه سبب نزول الآية ثابت في الصحيحين من حديث زيد بن خالد الجهني ومن حديث أبي سعيد الخدري رضي الله عنه. وعن علي رضي الله عنه عنه ﷺ في الآية قال "شكركم تقولون: مطرنا بنوء كذا وكذا وبنجم كذا وكذا"[3] أخرجه أحمد والترمذي وحسنه والضياء في المختارة وغيرهم. يعني عبد بن حميد وابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم وابن مردويه)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ تفسیر نہیں فرمائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن سے مگر آیاتِ یسیرہ کی۔ ﴿ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ ﴾ فرمایا: "شُكْرَكُمْ"۔[4] (رواه ابن عساكر في تاريخه) سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا: "وَتَجْعَلُوْنَ شُكْرَكُمْ"[5] (رواه ابن مردويه كذا في فتح البيان) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس بات کی حدیثیں امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ سے ذکر کی ہیں: جو ان تمام کو جاننا چاہتا ہے وہ اس کی طرف رجوع کر لے۔[6]

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝83 وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝84 وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝85 فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۝86 تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝87 فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝88 فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝89 وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝90 فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝91 وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۝92 فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۝93 وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۝94 اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝95 فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝96

[1] فتح القدير (٢١٤/٥) [2] صحيح البخاري (٨١٠) صحيح مسلم (٧١) [3] مسند أحمد (٨٩/١) سنن الترمذي (٣٢٩٥)
[4] تاريخ دمشق (٢٤٧/٤٣) [5] الدر المنثور (٣٠/٨) فتح البيان (٣٨٦/١٣) [6] تفسير ابن كثير (٣٨١/٤، ٣٨٢)

پھر کیوں نہیں (تم روح کو پھیر لیتے) جب وہ حلق تک پہنچتی ہے ﴿83﴾ اور تم اس وقت دیکھ رہے
ہوتے ہو ﴿84﴾ اور ہم تمھاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں، لیکن تم دیکھتے نہیں ﴿85﴾ پھر
اگر تم کسی کے محکوم نہیں، تو کیوں نہیں ﴿86﴾ اس (روح) کو پھیر لاتے، اگر تم سچے ہو؟ ﴿87﴾ پس لیکن
اگر وہ (مردہ) مقربین میں سے ہو ﴿88﴾ تو (اس کے لیے) راحت اور خوشبو اور نعمتوں والا باغ
ہے ﴿89﴾ اور لیکن اگر وہ اصحابِ یمین میں سے ہوا ﴿90﴾ (کہا جائے گا:) تیرے لیے سلامتی ہے،
(کیوں کہ) تو اصحابِ یمین میں سے ہے ﴿91﴾ اور لیکن اگر وہ تکذیب کرنے والے گمراہوں میں
سے ہوا ﴿92﴾ تو (اس کی) مہمانی کھولتے پانی سے ہوگی ﴿93﴾ (اسے) جہنم میں داخل کیا جانا ہے ﴿94﴾
بلاشبہہ یہی ہے وہ سچ جو یقینی ہے ﴿95﴾ لہٰذا آپ اپنے ربِ عظیم کے نام کی تسبیح کیجیے ﴿96﴾

موت کے وقت انسان کی بے بسی اس کے محاسبے کی دلیل:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق کو پہنچے۔ یہ حال احتضار کے وقت کا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿26﴾ وَقِيْلَ مَنْ ٚ رَاقٍ ﴿27﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿28﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿29﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ِالْمَسَاقُ ﴾ [القيامة: ٢٦۔ ٣٠] ''نہیں نہیں جب روح ہنسلی تک پہنچے گی اور کہا جائے گا کہ کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے؟ اور جان لیا اس نے کہ یہ وقتِ جدائی ہے۔ اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔ آج تیرے پروردگار کی طرف چلنا ہے۔''

اسی لیے یہاں فرمایا: اور تم اس وقت دیکھتے ہو، یعنی محتضر کی طرف اور سکراتِ موت کی طرف جس کی وہ مشقت اٹھا رہا ہے اور ہم اس کی طرف تم سے زیادہ قریب ہیں، یعنی ہمارے فرشتے لیکن تم ان کو نہیں دیکھتے ہو، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿61﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٦١۔ ٦٢] ''اور وہی اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے برتر ہے اور تم پر نگہداشت رکھنے والے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچتی ہے، اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے قبض کر لیتے ہیں اور وہ ذرا کوتاہی نہیں کرتے، پھر سب اپنے مالکِ حقیقی کے پاس لائے جائیں گے۔ خوب سن لو فیصلہ اللہ ہی کا ہوگا اور وہ بہت جلد حساب لے گا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿86﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے، پھر تم اس نفس کو جو حلق تک پہنچ گیا ہے، تم کیوں نہیں پھیر لیتے ہو اس کے جسم میں پہلی جگہ اور قرار گاہ کی طرف اگر ہو

تم ﴿ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴾ یعنی "غَيْرَ مُحَاسِبِيْنَ"۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ، ضحاک، سدی اور ابوحزرہ رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[1] امام سعید بن جبیر اور حسن بصری رحمہما اللہ نے کہا: پھر اگر تم اس بات کی تصدیق کرنے والے نہیں ہو کہ تم اٹھائے جاؤ گے اور اپنے اعمال کی جزا دیے جاؤ گے تو اپنے اس نفس کو واپس کیوں پھیر نہیں لیتے۔ مجاہد سے "غَيْرَ مُوْقِنِيْنَ" مروی ہے، میمون بن مہران نے کہا: "غَيْرَ مُعَذَّبِيْنَ مَقْهُوْرِيْنَ"[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ "لَوْلَا" بہ معنی "هَلَّا" ہے اور حلقوم کھانے اور پینے کی گزرگاہ ہے۔ ﴿ بَلَغَتِ ﴾ کی ضمیر نفس کی طرف راجع ہے یا روح کی طرف، حالاں کہ اس کا ذکر پہلے نہیں گزرا، اس کی یہ وجہ ہے کہ عرب لوگ جب ایسی عبارت لاتے ہیں تو ان کے نزدیک اس کے معنی سمجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ (كما قال حاتم طی: إذا حشرجت يوما وضاق بها الصدر. اس میں نفس کی طرف ضمیر راجع ہے، حالانکہ پہلے اس کا ذکر نہیں ہوا)۔ ﴿ حِيْنَئِذٍ ﴾ کی تنوین جملے کے عوض ہے جس کی طرف ﴿ إِذَا ﴾ مضاف ہوا ہے: "أَيْ: إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ"

امام اخفش رحمہ اللہ کا اس میں اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں: تنوین صرف کی ہے اور کسرہ اعراب کا ہے۔ ﴿ إِذَا ﴾ میں عامل ﴿ تَرْجِعُوْنَهَآ ﴾ ہے اور دوسرا "لَوْلَا" پہلے کی تاکید لفظی ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: بعض اوقات عرب دو حرف کا اعادہ کرتے ہیں اور ان کے معنی ایک ہوتے ہیں،[3] معنی یہ ہیں: پھر کیوں نہیں جس وقت روح یا نفس موت کے وقت حلق کو پہنچ جائے اور حال یہ ہے کہ تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو، اس حالت کو جس میں وہ شخص ہوتا ہے جس کی روح حلق کو پہنچتی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اور تم اے میت والو! تم اس میت کو اس حال میں دیکھتے ہو جس میں اس کی روح نکل رہی ہوتی ہے۔[4] مطلب یہ ہے کہ اس حال میں ان کے لیے روح کو لوٹانا ممکن نہیں ہے اور نہ ان میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ اس مرنے والے کو کوئی فائدہ پہنچا سکیں، یا جس حال میں وہ ہے اس سے اس کی تکلیف کو ہلکا کر سکیں۔

﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ ﴾ یعنی اور ہم تمھاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہیں، اپنے علم و قدرت و رویت کے اعتبار سے۔ یا یہ مراد ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے جو اس کی روح کو قبض کرنے پر مقرر ہیں، اس کے زیادہ قریب ہیں۔ ﴿ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴾ یعنی لیکن تم اپنی جہالت کے سبب سے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اللہ دھڑکتی رگ سے بھی زیادہ اپنے بندے کے قریب ہے۔ یا تم موت کے فرشتوں کو نہیں دیکھتے جو میت کے پاس حاضر ہوتے ہیں اور اس کی

---

[1] تفسير الطبري (۲۳/۱۵۷، ۱۵۸) [2] تفسير ابن كثير (۴/۳۸۲) [3] تفسير القرطبي (۱۷/۲۳۲) [4] فتح القدير (۵/۲۱۴)

روح کو قبض کرنے پر مامور ہوتے ہیں، یا تم اس مشقت اور کرب کو نہیں جانتے جس میں وہ ہے (اس بنا پر بصر علمی ہوگی)۔

﴿ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴾ بادشاہ جس وقت اپنی رعیت کی سیاست کرتا ہے اور ان کو غلام بناتا ہے تو اس وقت محاورے میں یوں بولتے ہیں کہ "دَانَ السُّلْطَانُ رَعِيَّتَهُ"، امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "دِنْتُهُ" بہ معنی "مَلَكْتُهُ" ہے۔[1] "وَيُقَالُ: دَانَهُ إِذَا أَذَلَّهُ وَاسْتَعْبَدَهُ" ﴿ مَدِيْنِيْنَ ﴾ کے معنی محاسبین و مجزّین پہلے گزر چکے ہیں، لیکن پہلے معنی آیت کے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ معنی یہ ہیں: پھر کیوں نہیں اگر تم مربوب و مملوک نہیں ہو تو پھیر لاؤ اس نفس کو جو حلق کو پہنچ چکا ہے، اس کی اس قرارگاہ کی طرف جس میں وہ تھا اگر تم سچے ہو اور تم اس کو ہرگز پھیر نہ لاؤ گے تو تمھارا یہ زعم بالکل باطل ہو گیا کہ تم مربوب اور مملوک نہیں ہو۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر تم سچے ہو بعث کی نفی کرنے میں تو محتضر کی روح کو اس کے جسم کی طرف پھیر لو، تاکہ موت اس سے دور اور نیست ہو جائے۔

موت کے وقت لوگوں کے حالات اور انجام:

پھر اللہ پاک نے موت کے وقت اور موت کے بعد خلق کے طبقات کا ذکر کیا، فرمایا: ﴿ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴾ یعنی اگر وہ مرنے والا جس کا حال بیان کیا گیا ان تین قسموں میں سے، جن کی تفصیل گزر چکی ہے، سابقین میں سے ہوا تو اس کے لیے دنیا سے راحت ہے اور اس کے احوال سے استراحت ہے اور رزق اور نعمت کا باغ ہے۔ جمہور نے "رَوْحٌ" کو بالفتح پڑھا ہے، اس کے معنی راحت ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "رَوْحٌ" فَرَحٌ ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: "رَوْحٌ" رحمت ہے۔ کسی نے (یعنی سیدہ عائشہ، ابن عباس رضی اللہ عنہم، امام حسن، قتادہ، نصر بن عاصم، حجدری اور یعقوب رحمہم اللہ نے) بہ ضمِ راء پڑھا ہے۔ کہا ہے کہ اس قراءت کے معنی رحمت کے ہیں، اس لیے کہ رحمت مرحوم کے لیے حیات کی طرح ہے۔ اسی لیے حسن رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ قاموس میں یوں ہے کہ "رَوْحٌ" بالفتح راحت ورحمت ونسیمِ ریح ہے۔[2] ﴿ رَيْحَانٌ ﴾ جنت میں رزق ہے۔ یہ قول امام مجاہد، سعید بن جبیر اور مقاتل رحمہم اللہ کا ہے اور کہا ہے کہ وہ رزق ہے حمیر کے لغت میں۔ "يُقَالُ: خَرَجْتُ أَطْلُبُ رَيْحَانَ اللّٰهِ أَيْ: رِزْقَهُ"

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رَيْحَانٌ ﴾ ریحانِ جنت ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رحمت ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ یہی ریحان معروف ہے جو سونگھا جاتا ہے۔ امام قتادہ اور ربیع بن خثیم رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ موت کے وقت ہے اور جنت اس کے لیے مخبوء ہے، یعنی چھپا کر رکھی گئی ہے، یہاں تک کہ مبعوث ہو۔ اسی طرح امام ابو الجوزاء اور ابو العالیہ رحمہما اللہ نے بھی کہا ہے۔[3] ﴿ وَجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ جنت تنعم والی ہے۔ کلمۂ ﴿ جَنَّتُ ﴾ یہاں پر بہ تائے دراز لکھا گیا ہے۔ امام ابن کثیر اور کسائی رحمہما اللہ وغیرہما نے اس پر بہ ہا وقف کیا ہے اور باقی قراء نے بہ تا وقف کیا ہے بنا بر رسم۔

[1] تفسیر القرطبي (۲۳۱/۱۷) [2] القاموس المحیط (۲۸۲/۱) [3] تفسیر القرطبي (۲۳۲/۱۷، ۲۳۳)

﴿ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴾ یعنی اور جو اگر وہ مرنے والا دائیں والوں میں سے ہوا جو اپنے نامۂ اعمال اپنے دائیں ہاتھوں میں لیں گے تو تو اُن میں صرف سلامتی دیکھے گا جس کو تو دوست رکھتا ہے چنانچہ تو ان کی وجہ سے غمگین نہ ہو، اس لیے کہ اللہ کے عذاب سے سالم رہیں گے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تیرے لیے ان سے سلام ہے، یعنی تو غمگین نہ ہو، اس لیے کہ اللہ کے عذاب سے سالم رہیں گے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تیرے لیے ان سے سلام ہے، یعنی تو غمگین ہونے سے سالم ہے بسبب ان کے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ وہ تیرے لیے دعا کریں گے اور تجھ پر سلام کریں گے۔ کسی نے کہا کہ نبی کریم ﷺ تحیہ کیے جائیں گے سلام کے ساتھ عزت واکرام کے طور پر۔ کسی نے کہا کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے یہ اطلاع ہے کہ بعض بعض کو سلام کرے گا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اے صاحبِ یمین! تیرے لیے تیرے اصحابِ یمین بھائیوں کی طرف سے سلام ہے۔ یعنی یہ صیغۂ غائب سے صیغۂ خطاب کی طرف پھرنا ہے، بہ تقدیرِ قول۔ اور حرف ﴿ مِنْ ﴾ ابتدائیہ ہے جس طرح کہ "سَلَامٌ مِنْ فُلَانٍ عَلَى فُلَانٍ" کہا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تجھ سے کہا جائے گا: "سَلَامٌ لَكَ"۔ امام محلی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس کے لیے عذاب سے سلامتی ہے: "مِنْ جِهَةِ أَنَّهُ مِنْهُمْ" اس جہت سے کہ وہ اصحابِ یمین سے ہے۔[1] اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سلام بہ معنی سلامتی ہے اور کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ علت کا ہے۔ علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ تفسیر غریب ہے۔ اصحابِ یمین کا ذکر اور ان کے حال کی تفصیل اور اللہ پاک نے ان کے لیے جو جزا تیار کر رکھی ہے، یہ سب پہلے گزر چکا ہے۔

﴿ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ یعنی اور اگر وہ بعث کے جھٹلانے والوں میں سے ہوا جو ہدایت سے گمراہ ہیں، یہ وہی اصحابِ شمال ہیں جن کا ذکر اور ان کے احوال کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے تو اس کے لیے "نُزُل" ہے جو اس کے نزول کے لیے تیار کیا جائے گا حمیم سے، یعنی وہ گرم پانی جس کی گرمی انتہا کو پہنچی ہو گی اور یہ اس کے بعد زقوم سے کھائے گا جس طرح کہ اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اس عذاب کو جو "نُزُل" کہا تو یہ ان کے ساتھ مذاق اور استہزاء ہے۔ اور ﴿ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴾ ہے، یعنی اور ڈالا جانا ہے آگ میں، جب کوئی کسی کو آگ کے اندر ڈال دے تو اس وقت کہا جاتا ہے کہ "أَصْلَاهُ النَّارَ وَصَلَاهُ"۔ یہ مصدر کی مفعول کی طرف اضافت ہے، یا مکان کی طرف اضافت ہے۔

جمہور نے ﴿ تَصْلِيَةُ ﴾ کو بہ رفع پڑھا ہے "نُزُل" پر معطوف کیا ہے اور کسی نے (یعنی ابو عمرو نے "فِي رواية عنه") بہ جر پڑھا ہے اور ﴿ حَمِيْمٍ ﴾ پر معطوف ٹھہرایا ہے۔[2] یہاں ظاہر کا مقتضا یہ تھا کہ یوں کہا جاتا: "وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الشِّمَالِ" لیکن ایسا نہ کیا، بلکہ ان کو ان کے افعال کے ساتھ موصوف کر کے ﴿ اَلْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ فرمایا تو یہ صرف اس لیے کہ اس سے ان کو ان افعال کی وجہ سے ڈانٹ ڈپٹ کرنا منظور ہے۔ اور جس

---

[1] تفسیر الجلالین (۷۱۸/۱) [2] فتح القدير (۲۱٦/۵)

شے نے ان کے لیے یہ عذاب واجب کیا ہے، اس کی خبر دینا منظور ہے۔ وہ شے یہی ان کی تکذیب اور گمراہی ہے جو اس عذاب کی موجب ہوئی۔

ان آیتوں میں اس طرف اشارہ ہے کہ کفر سب کا سب ایک ملت ہے اور کبائر والے بھی اصحاب یمین سے ہیں، اس لیے کہ وہ مکذبین نہیں ہیں۔ ﴿ اَمَّآ ﴾ کے جواب میں تین قول ہیں: ایک یہ ہے کہ مذکور ﴿ اَمَّآ ﴾ کا جواب ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا اور جوابِ شرط تینوں جگہ محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے: "مَهْمَا يَكُنْ مِنْ شَيْءٍ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ... الخ"[1] بعض نے اسی کو ترجیح دی ہے، اس لیے کہ ان کا جواب جب انفراد کی حالت میں بہت محذوف ہوتا ہے تو دوسری شرط کے ساتھ اس کا دعویٰ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ ﴿ اِنْ ﴾ کا جواب ہے۔ امام ابو اسحاق رحمہ اللہ کے نزدیک ﴿ اَمَّآ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ایک شے سے دوسری شے کی طرف نکلنا، یعنی جس بات میں تم لگے ہو اسے چھوڑ دو اور اس کے غیر میں شروع کرو، اس بنا پر جواب فقط "إِنْ" کا ہوگا، کیونکہ ﴿ اَمَّآ ﴾ شرط نہیں ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ ﴿ اَمَّآ ﴾ اور "إِنَّ" دونوں کا جواب ہے، جیسا کہ اخفش نے کہا ہے کہ حرفِ فاء تینوں جگہ جواب ہے ﴿ اَمَّآ ﴾ کا اور جواب ہے حرفِ شرط کا۔

امام ربیع بن خثیم رحمہ اللہ سے آیت کی تفسیر میں مروی ہے: ﴿ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿88﴾ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ﴾ کہا: یہ موت کے وقت ہے۔ ﴿ وَجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴾ کہا: چھپا رکھی جائے گی جنت اس کے لیے یہاں تک کہ وہ مبعوث ہو۔ ﴿ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ کہا: یہ موت کے وقت ہے۔ ﴿ وَتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴾ کہا: ﴿ جَحِيْمٍ ﴾ اس کے لیے چھپا رکھی جائے گی، یہاں تک کہ وہ مبعوث ہو۔[2] (أخرجه ابن أبي شيبة وأحمد في الزهد وعبد بن حميد وابن المنذر عنه اس کا اول ٹکڑا پہلے بھی گزر چکا ہے)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس کے بارے میں کئی قول ہیں۔ ﴿ فَرَوْحٌ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: "رَاحَةٌ" اور ﴿ رَيْحَانٌ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: استراحت۔ (أخرجه ابن جرير وابن أبي حاتم)۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مستریح ہے دنیا سے۔ ﴿ وَجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴾ یعنی مغفرت و رحمت۔[3] (أخرجه ابن جرير)۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ریحان رزق ہے۔ (أخرجه ابن المنذر)

﴿ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴾ میں فرمایا کہ فرشتے اس کے پاس اللہ کی طرف سے سلام لے کر آئیں گے۔ اس پر سلام کریں گے اور اسے خبر دیں گے کہ وہ اصحابِ یمین سے ہے۔[4] (أخرجه ابن المنذر وابن جرير)۔

﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ فِي هٰذِهِ السُّوْرَةِ"[5] (أخرجه ابن أبي حاتم)۔ یعنی جو کچھ اس سورت میں شروع سے آخر تک ذکر کیا گیا ہے یا محتضرین کا حال اور قصہ جو ابھی ابھی بیان ہوا، بے شک یہ البتہ یہی محض و خالص یقین یہی ہے۔ حق کی اضافت یقین کی طرف "إضافة الشيء

[1] فتح القدير (٢١٥/٥) [2] الدر المنثور (٣٦/٨) [3] تفسير الطبري (١٥٩/٢٣)
[4] الدر المنثور (١٣٧/٨، ١٣٨) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٣٥/١٠)

إلى نفسه" کے باب سے ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: یہ ایسے ہے جیسے کہتے ہو: عین الیقین اور محض الیقین۔ یہ کوفیوں کے نزدیک ہے اور انھوں نے لفظ کے مختلف ہونے کی وجہ سے اس کو جائز رکھا ہے۔ رہے بصری تو وہ مضاف الیہ کو محذوف ٹھہراتے ہیں۔ تقدیر یہ ہے: "حق الأمر اليقين" اور "الخبر اليقين"[1]

﴿ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴾ حرفِ فاء ماقبل پر مابعد کی ترتیب کے لیے ہے، یعنی اپنے رب کی اس شے سے پاکی کے لیے ہے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ حرفِ باء محذوف سے متعلق ہے: "أَيْ: فَسَبِّحْ مُتَلَبِّسًا بِاسْمِ رَبِّكَ لِلتَّبَرُّكِ بِهِ" یعنی تو اپنے ربِ عظیم کے نام کے ساتھ تسبیح کر تبرک کے لیے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں: "فَصَلِّ بِذِكْرِ رَبِّكَ" یعنی پس اپنے رب کے ذکر کے ساتھ نماز پڑھ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ ﴾ یعنی اپنے رب کے لیے نماز پڑھ۔[2] (أخرجه ابن أبي حاتم)۔ کسی نے کہا ہے کہ تعدیت کے لیے ہے، اس لیے کہ "سَبِّح" کبھی تو بہ نفسہٖ متعدی ہوتا ہے اور کبھی بہ حرفِ جر۔ کسی نے کہا ہے کہ زائد ہے اور اسم بہ معنی ذات ہے، لیکن زیادت کا دعویٰ کرنا خلاف الاصل ہے اور پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ ﴿ الْعَظِيمِ ﴾ اسم کی یا ﴿ رَبِّكَ ﴾ کی صفت ہے، اس لیے کہ ہر ایک مجرور ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یہ تین حالتیں وہی لوگوں کی حالتیں ہیں موت کے حاضر ہونے کے وقت۔ اس وقت یا تو مرنے والا مقربین سے ہوگا، یا ان سے کم رتبہ والوں میں سے جو اصحاب الیمین ہیں، یا ان میں سے ہوگا جو حق کی تکذیب کرنے والے، گمراہ اور امرِالٰہی کے جاہل ہیں۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴾ یعنی پھر اگر وہ جس کو موت آ گئی مقربین میں سے ہوا، یہ وہ ہیں جنھوں نے واجبات و مستحبات ادا کیے اور محرمات و مکروہات اور بعض مباحات کو ترک کیا تو ان کے لیے روح اور ریحان وجنتِ نعیم ہے اور فرشتے ان کو موت کے وقت اس کی خوش خبری دیتے ہیں جس طرح کہ سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزر چکا ہے کہ رحمت کے فرشتے کہتے ہیں: اے پاک روح! پاک جسم میں تو اس کو آباد رکھتی تھی تو روح اور ریحان اور ربِ غیر غضبان کی طرف جانے کے لیے نکل۔[3]

اس کے بعد ان اقوال کا ذکر کیا ہے جو روح و ریحان کے بارے میں ہیں اور جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ پھر کہا ہے کہ یہ سب قول ایک دوسرے کے قریب قریب اور صحیح ہیں، کیوں کہ جو کوئی مقرب ہو کر مرا تو اس کو یہ سب کچھ حاصل ہوگا یعنی رحمت، راحت، استراحت، فرحت، سرور، رزقِ حسن اور جنتِ نعیم۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مقربوں میں سے کوئی شخص جب بھی دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کے پاس ریحانِ جنت کی ایک شاخ لاتے

---

[1] تفسير القرطبي (٢٣٤/١٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٣٥/١٠)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٣٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٢)، صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٩٠) ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا براء رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملی ہے۔

ہیں اور اس کی روح اس میں قبض کی جاتی ہے۔[1] امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں میں سے کوئی شخص مرتا نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ جان لیتا ہے کہ آیا وہ اہلِ جنت سے ہے یا اہلِ نار سے۔[2] سورت ابراہیم زیرِ تفسیر آیت: ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ ﴾ [إبراهيم: ٢٧] ''ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ پکی بات کے ساتھ مضبوط رکھتا ہے۔'' ہم احتضار کی حدیثیں ذکر کر چکے ہیں، اگر وہ یہاں لکھی جاتیں تو خوب ہوتا ان میں سے سب سے جلیل وہ حدیث ہے جس کو تمیم داری نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ ملک الموت سے فرماتا ہے کہ تو فلاں کی طرف جا اور اس کو میرے پاس لے آ۔ بے شک میں نے اس کو خوشی اور تکلیف کے ساتھ مارا ہے (اصل کے الفاظ ''قد ضربته'' ہیں، مطلب یہ ہے کہ خوشی اور ناخوشی سے میں نے اس کا خوب امتحان کر لیا ہے) چنانچہ میں نے اس کو ایسی جگہ میں پایا جس کو میں دوست رکھتا ہوں تو اسے میرے پاس لے آ۔ البتہ میں اس کو راحت دوں گا۔ کہا: پھر ملک الموت اس کی طرف جاتے ہیں اور ان کے ساتھ پانچ سو فرشتے ہوتے ہیں، ان کے پاس کفن کے کپڑے اور جنت کا حنوط (خوشبو) ہوتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ریحان کے دستے ہوتے ہیں۔

ریحان کی جڑ تو ایک ہوتی ہے اور اس کے سر میں بیس قسمیں ہوتی ہیں، ہر قسم کی ایک الگ خوشبو اپنے صاحب کی خوشبو کے سوا اور ان کے ساتھ سفید حریر اور اس میں مشک ہوتی ہے۔[3] اور تتمۂ حدیث کو بطولہ ذکر کیا ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اور اس آیت کے متعلق حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے سنا رسول اللہ ﷺ کو کہ آپ ﷺ ﴿ فَرُوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ﴾ کو بہ رفع پڑھتے تھے، یعنی بہ ضمِ راء۔[4] (رواه الإمام أحمد وكذا رواه أبو داود والترمذي والنسائي من حديث هارون وهو ابن موسى الأعور وبه وقال الترمذي: لا نعرفه إلا من حديثه) یہ قراءت تنہا یعقوب کی ہے، باقی قراء رحمہ اللہ نے ان کی مخالفت کی ہے تو بہ فتحِ راء پڑھا ہے۔

ام ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا جب ہم مر جائیں گے تو ہم ایک دوسرے کی زیارت و ملاقات کریں گے اور ہم میں کوئی کسی کو دیکھے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ «نَسَمٌ» (ہوا کا نرم چلنا) یعنی روحیں طیور ہوں گی چریں گی (اصل کا لفظ ''یعلق بالشجر'' ہے ''یعلق'' بہ معنی ''یأکل'' ہے)۔ درختوں میں، یہاں تک کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ہر نفس اپنے جسم میں داخل ہو جائے گا۔[5] (أخرجه الإمام أحمد) اس حدیث میں ہر مومن کے لیے بشارت ہے، اس کی صحت کی وہ حدیث شہادت دیتی ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے

---

[1] تفسير الطبري (١٦٠/٢٣) [2] تفسير ابن كثير (٣٨٣/٤)

[3] تفسير ابن كثير (٣٨٣/٤) اس کی سند میں ''یزید رقاشی'' ضعیف راوی ہے۔ یہ روایت مکمل سورت ابراہیم آیت نمبر (۲۷) کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

[4] مسند أحمد (٦٤/٦)، (٣٩٩١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٣٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٨٠/٦)

[5] مسند أحمد (٤٢٤/٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٧٩)

عن الإمام محمد بن إدريس الشافعي عن الإمام مالك بن أنس رحمه الله عن الزهري عن عبد الرحمن بن كعب ابن مالك عن أبيه عن رسول الله ﷺ روایت کیا ہے کہ «إِنَّمَا نَسَمَةُ الْمُؤْمِنِ طَائِرٌ يَعْلُقُ فِي شَجَرِ الْجَنَّةِ حَتَّى يُرْجِعَهُ اللّٰهُ إِلَى جَسَدِهِ يَوْمَ يَبْعَثُهُ»[1]

یہ ایک اسنادِ عظیم ومتنِ قویم ہے۔ صحیح میں ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز طیور کے پوٹوں میں ہیں، وہ جنت میں جہاں چاہیں چرتی ہیں، پھر قندیلوں میں بسیرا کرتی ہیں جو عرش سے لٹکی ہوئی ہیں۔[2] الحدیث۔ امام عطاء بن سائب سے مروی ہے کہ پہلا دن جس میں، میں نے عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ کو پہچانا، وہ دن ہے جب میں نے ایک شیخ کو دیکھا کہ جس کا سر اور ڈاڑھی سفید تھی، ایک گدھے پر سوار ایک جنازے کے پیچھے جا رہا تھا تو میں نے سنا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ مجھے فلاں بن فلاں نے حدیث کی، اس نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ فرماتے تھے: «مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهُ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهُ»

کہا: پھر قوم سرنگوں ہوئی اور روتی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم کو کون سی شے رلاتی ہے؟ عرض کی کہ بے شک ہم موت کو مکروہ رکھتے ہیں۔ فرمایا: یہ وہ نہیں ہے، لیکن یہ تو اس وقت ہے کہ جب اس کو موت حاضر ہوتی ہے تو اگر تو وہ مقربین سے ہوا تو روح و ریحان و جنتِ نعیم ہے، چنانچہ جب وہ اس کی بشارت دیا جاتا ہے تو اللہ عزوجل کی ملاقات کو محبوب رکھتا ہے اور اللہ عزوجل اس کی ملاقات کو زیادہ تر دوست رکھنے والا ہوتا ہے اور اگر وہ مکذبین ضالین میں سے ہوا تو اس کے لیے جلتے پانی کی مہمانی ہے، پھر جب وہ اس کی بشارت دیا جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو مکروہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو زیادہ تر مکروہ رکھتا ہے۔[3] (هكذا رواه الإمام أحمد) صحیح میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کے معنی کا شاہد مروی ہے۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴾ یعنی فرشتے اس کی ان کو بشارت دیتے ہیں، ان میں سے ایک کو کہتے ہیں: "سَلَامٌ لَكَ" یعنی تجھ پر کوئی باس اور خوف نہیں ہے، تو سلامتی کی طرف ہے، تو اصحابِ یمین سے ہے۔ امام قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سالم رہا اللہ کے عذاب سے اور سلام کیا اس پر فرشتوں نے،[5] جیسا کہ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے اس پر سلام کرتے ہیں اور اسے یہ خبر دیتے ہیں کہ وہ اصحابِ یمین سے ہے۔[6] یہ معنی خوب ہیں اور یہ قول اس آیت کی طرح ہوگا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۞ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ

---

[1] مسند أحمد (٤٥٥/٣) صحيح الجامع (٢٣٧/٣)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٨٧)
[3] مسند أحمد (٢٥٩/٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٩٦٤)
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٨٤)
[5] تفسير الطبري (١٦٢/٢٣)
[6] تفسير ابن كثير (٣٨٤/٤)

الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿٣١﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴾ [حم السجدة: ٣٠- ٣٢] ''(واقعی) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اسی پر قائم رہے ان کے پاس فرشتے (یہ کہتے ہوئے) آتے ہیں کہ تم کچھ بھی اندیشہ اور غم نہ کرو (بلکہ) اس جنت کی بشارت سن لو جس کا تم وعدہ دیے گئے ہو۔ تمھاری دنیوی زندگی میں بھی ہم تمھارے رفیق تھے اور آخرت میں بھی رہیں گے، جس چیز کو تمھارا جی چاہے اور جو کچھ تم مانگو سب تمھارے لیے (جنت میں موجود) ہے۔ غفور ورحیم (معبود) کی طرف سے یہ سب کچھ بطور مہمانی کے ہے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے ﴿ فَسَلٰمٌ لَّكَ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا ہے: "أَيْ: مُسَلَّمٌ لَكَ أَنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِيْنِ، وَالغيت إِنَّ وَهُوَ مَعْنَاهَا كَمَا تَقُوْلُ أَنْتَ مُصَدَّقٌ مُسَافِرٌ عَنْ قَلِيْلٍ إِذَا كَانَ قَدْ قَالَ إِنِّيْ مُسَافِرٌ عَنْ قَلِيْلٍ، وَقَدْ يَكُوْنُ كَالدُّعَاءِ لَهُ كَقَوْلِكَ فَسَقْيًا مِنَ الرِّجَالِ إِنْ رَفَعْتَ السَّلَامَ فَهُوَ مِنَ الدُّعَاءِ" [1] انتهى. ("فَسَقْيًا أَيْ: سقاك الله سقيا" یعنی تجھے رجال میں اللہ تعالیٰ بالکل تروتازہ رکھے)۔ یعنی تیرے واسطے یہ بات مانی گئی ہے کہ بے شک تو اصحابِ یمین سے ہے اور کلمۂ ﴿ إِنْ ﴾ لغو کیا گیا، یعنی گو وہ محذوف ہوا مگر اس کے معنی مراد ہیں، پھر اس کی مثال بیان کی کہ مثلاً کوئی شخص تم سے کہہ چکا ہے کہ میں عن قریب مسافر ہوں تم اس سے کہو "أَنْتَ مُصَدَّقٌ مُسَافِرٌ أَيْ: مُصَدَّقٌ أَنَّكَ مُسَافِرٌ"، یعنی تیری یہ بات تصدیق کی گئی ہے کہ تو مسافر ہے۔

غرضیکہ جس طرح یہاں کلمۂ ﴿ إِنْ ﴾ محذوف ہے اور اس کے معنی مراد ہیں، اسی طرح آیت میں بھی ہے اور کبھی سلام کا لفظ دعا کی طرح ہوتا ہے، اس شخص کے لیے جس کو خطاب کیا ہے اصحابِ یمین نے، یعنی ان کی طرف سے اس کو دعا ہے کہ تجھے سلامتی ہو اور اگر تم سلام کو رفع دو گے تو وہ دعا کے باب سے ہوگا (رفع سلام کا بنا بر ابتداء ہے گو نکرہ ہے، اس لیے کہ دعا ہے اور دعا من جملہ "مخصصات" ہوتی ہے معنی "سَلَّمْتُ سَلَامًا" ہیں، پھر فعل حذف کیا گیا اور مصدر مرفوع ہوا۔ اگر کوئی کہے کہ سلام کو بہ نصب کسی نے نہیں پڑھا تو "إن رفعت" کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ چنانچہ کہیں گے کہ "سقیا" تو بہ نصب دعا ہوتا ہے بہ خلاف سلام کے کہ یہ بہ رفع دعا ہے اور بہ نصب دعا نہیں ہے کما قال العيني رحمہ اللہ)۔ غرضیکہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے قول بخاری کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض اہلِ عربیت سے (شاید اس بعض سے مراد فراء ہو، کیوں کہ بخاری کا قول بعینہٖ امام فراء رحمہ اللہ کا قول ہے۔ کما ذکره الحافظ في الفتح) اس کو اسی طرح حکایت کیا ہے اور اس کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ [2] واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٩٢﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴾ یعنی اور اگر وہ مرنے والا شخص ان میں سے ہے جو حق کی تکذیب کرنے والے اور ہدایت سے بھٹکنے والے ہیں تو ﴿ حَمِيْمٍ ﴾ سے ان کی ضیافت ہے، یہ وہ گرم پانی ہے جس سے وہ سب کچھ گلا ڈالا جائے گا جو ان کے شکموں میں ہوگا اور ان کے چمڑے۔

[1] صحيح البخاري (١٨٤٩/٤)
[2] تفسير الطبري (١٦٣،١٦٢/٢٣)

﴿ وَتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴾ یعنی مکذب کی پہلی مہمانی تو یہ ہوگی کہ بطور ماحضر نہایت درجے کا گرم پانی اسے پلائیں گے، اس کے بعد اس کو ایسی آگ میں داخل کریں گے جو ہر طرف سے اس کو ڈھانک لے گی۔ نعوذ باللّٰه منها.

پھر فرمایا: ﴿ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴾ یعنی بے شک یہ خبر یہی حق یقین ہے جس میں کچھ شک نہیں ہے اور نہ کسی کو اس سے مفر ہے۔ سیدنا عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پر ﴿ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴾ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس کو اپنے رکوع میں کرلو اور جب ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ﴾ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو اپنے سجود میں ٹھہرا لو۔[1] (أخرجه الإمام أحمد وكذا رواه أبو داود وابن ماجه من حديث عبدالله بن المبارك عن موسى بن أيوب) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے کہا: « سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهِ » تو اس کے لیے ایک نخل، یعنی کھجور کا درخت لگایا گیا۔[2] (رواه روح بن عبادة هكذا رواه الترمذي من حديث روح و رواه هو و النسائي أيضا من حديث حماد بن سلمة عن جابر رضي الله عنه عن النبي ﷺ به وقال الترمذي: حسن غريب لا نعرفه إلا من حديث أبي الزبير رضي الله عنه)

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی آخر کتاب میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ » (أَيْ: انزهه عما لا يليق به متلبسا بحمدي له أَيْ: من توفيقه للتسبيح أو سبحته وألتبس فيه بحمدي فالواو على الأول للحال و على الثاني للعطف والتسبيح إشارة إلى الصفات الجلالية والحمد إلى الصفات الوجودية الإكرامية وكلمتان خبر مبتدأ هو سبحان الله وحبيبتان صفة الخبر كذا في مجمع البحار)[3] (ورواه بقية الجماعة إلا أبا داود من حديث محمد بن فضيل بإسناده مثله) یعنی دو کلمے ہیں: زبان پر ہلکے ترازو میں بھاری، رحمان کو پیارے، وہ یہ ہیں « سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ »

آخر سورة الواقعه ولله الحمد والمنة یازدہم ماہِ جمادی الآخرہ ۱۳۱۵ ہجری شبِ دوشنبہ (سوموار) وقت نیم شب تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آیندہ کی توفیق دے۔ ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار آمين، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم والحمد لله أولا وآخر وظاهراً وباطنا، والصلاة والسلام على سيدنا و مولانا سيد المرسلين شفيع المذنبين وعلى آله وصحبه وأتباعه إلى يوم الدين.

---

[1] مسند أحمد (٤/١٥٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٨٧) اس کی سند میں "إیاس بن عامر" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: ضعيف أبي داود (١/٣٣٧)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٦٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٢٠٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٤)

[3] صحيح البخاري (٧١٢٤) صحيح مسلم (٢٦٩٤) سنن الترمذي (٣٤٦٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٢٠٧) سنن ابن ماجه (٣٨٠٦) مجمع بحار الأنوار (٣/١٤، ١٥) تفسير ابن كثير (٤/٣٨٣، ٣٨٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْحَدِيْد

اس سورت مبارکہ کی انتیس (۲۹) آیات ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق یہ مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۃ الحدید مدینہ میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس والنحاس و ابن مردويه والبيهقي) سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] (أخرجه ابن مردويه)۔ جمہور اسی پر ہیں۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکی ہے۔ اس قول کی تائید اس قصے سے ہوتی ہے جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے سبب میں منقول ہے کہ انھوں نے جب اس سورت کی شروع سے لے کر ﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ تک آیتیں پڑھیں، وہ ایک صحیفے میں لکھی ہوئی تھیں جو ان کی بہن کے پاس تھا تو وہ مسلمان ہو گئے۔ یہ اس کا مقتضی ہے کہ یہ آیتیں مکی ہیں۔ چنانچہ اس قصے کی بنا پر یہ آیتیں مستثنیٰ ہوں گی بنا بر قول اول کہ سورت مدنی ہے۔[3] تامل۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ سورۃ الحدید سہ شنبہ (منگل) کو نازل ہوئی اور سہ شنبہ میں لوہا پیدا کیا گیا اور سہ شنبہ کو ابن آدم نے اپنے بھائی کو قتل کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سہ شنبہ میں سنگی لگانے سے منع فرمایا۔[4]

(أخرجه الطبراني وابن مردويه قال السيوطي بسند ضعيف)

فضیلت:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ روزِ سہ شنبہ میں سنگی مت لگاؤ، بے شک سورۃ الحدید مجھ پر سہ شنبہ کو نازل کی گئی۔[5] (أخرجه الديلمي) سیدنا عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ مسبحات کو سونے سے قبل پڑھتے تھے اور فرمایا کہ ان میں ایک آیت ہزار آیتوں سے افضل ہے۔[6] (أخرجه أحمد والترمذي و حسنه والنسائي وغيرهم (يعني ابن مردويه و البيهقي في الشعب) وفي إسناده بقية بن الوليد وفيه مقال معروف وأخرجه النسائي عن

---

① تفسير القرطبي (۲۳۵/۱۷۔ ط: دار الكتب المصرية، القاهرة) ② الدر المنثور (۴۵/۸) ③ فتح البيان (۳۹۱/۱۳)

④ الدر المنثور (۴۵/۸) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني وفيه مسلمة بن علي الخشني وهو ضعيف" مجمع الزوائد (۱۵۴/۵)

⑤ الدر المنثور (۴۵/۷)

⑥ مسند أحمد (۱۲۸/۴) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۲۱) سنن النسائي الكبرىٰ (۱۶/۵) شعب الإيمان (۴۹۳/۲) اس کی سند میں "ابن ابی بلال" مجہول راوی ہے۔

خالد بن معدان قال: كان رسول اللهﷺ ولم يذكر العرباض بن سارية فهو مرسل)[1] یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نہیں سوتے تھے، جب تک کہ مسبحات کو نہ پڑھ لیتے اور فرماتے تھے کہ ان میں ایک آیت ہے ہزار آیتوں سے افضل۔ یحییٰ نے کہا: پس ہم خیال کرتے ہیں اس کو وہ آیت جو سورۃ الحشر کے آخر میں ہے۔[2] (أخرجه ابن الضريس) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: جس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا۔ واللّٰہ أعلم۔ وہ یہ ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [الحديد] مسبحات یہ سورتیں ہیں: سورة الحديد، الحشر، الصف، الجمعة، التغابن.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۳

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے، اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور وہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے (1) آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے اور وہ ہر شے پر خوب قادر ہے (2) وہی اول بھی ہے اور آخر بھی، اور ظاہر بھی اور باطن بھی، اور وہی ہر شے کو خوب جاننے والا ہے (3)

ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی تسبیح خواں ہے:

اللہ پاک خبر دیتا ہے اس بات کی کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ حیوانات ہوں یا نباتات، سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور پاکی بولتے ہیں، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''ساتوں آسمان اور زمین اور جو بھی ان میں ہے اسی کی تسبیح کر رہے ہیں ایسی کوئی چیز نہیں جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ تم اس کی تسبیح سمجھ نہیں سکتے۔ وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے۔''

---

(1) سنن النسائي الكبرىٰ (١٧٩/٦) یہ روایت مرسل ہے۔ (2) الدر المنثور (٤٦/٨)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ یعنی اور وہی ایسا عزت والا ہے کہ اس کے سامنے ہر شے خاضع (ذلیل) ہے، وہ اپنی خلق اور اپنے حکم اور شریعت میں حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، یعنی وہی اپنی مخلوق میں مالک اور متصرف ہے۔ چنانچہ وہ زندہ رکھتا ہے جس کو چاہتا ہے اور مارتا ہے اور جس کو جو کچھ چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے، یعنی جو کچھ اس نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ کی پاکی اور بزرگی بیان کی ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین دونوں میں ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ذی روح وغیرہ میں سے ہر شے نے۔[2] جمادات کے تسبیح کرنے کے بارے میں جو گفتگو ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ إِنَّهُ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] کے زیرِ تفسیر گزر چکی ہے۔ "سَمٰوٰت وأرض" میں جو عقلاء وغیرہم اور حیوانات و جمادات ہیں، ان کی طرف جو تسبیح منسوب ہے اس سے مراد عام ہے زبانِ مقال کے ساتھ تسبیح، جیسے ملائکہ، انسانوں اور جنوں کی تسبیح اور زبانِ حال کے ساتھ تسبیح، جیسے ان کے غیر کی تسبیح، اس لیے کہ ہر موجود شے صانع کی ذات پر دال ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا ہے کہ غیر عقلاء کی تسبیح' تسبیحِ دلالت ہی ہے اور کہا کہ اگر یہ دلالت وظہور آثار صنعت کی تسبیح ہوتی تو البتہ وہ سمجھی جاتی، پھر کیوں فرمایا: ﴿ وَلَٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] یہ تو یہی تسبیحِ مقال ہے اور اس آیت سے استدلال کیا ہے: ﴿ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ ﴾ [الأنبياء: ٧٩] "اور داود کے تابع ہم نے پہاڑ کر دیے تھے جو تسبیح کرتے تھے۔"

چنانچہ اگر یہ تسبیح جبال کی تسبیحِ دلالت ہوتی تو داود علیہ السلام کی تخصیص کے لیے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔[3] فعلِ تسبیح کبھی تو بنفسہٖ متعدی ہوتا ہے جس طرح کہ ﴿ سَبِّحُوْهُ ﴾ میں ہے اور کبھی لام کے ساتھ متعدی ہوتا، جیسے یہ آیت ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ بنفسہٖ متعدی ہو، اس لیے کہ "سَبَّحْتُهُ" کے معنی ہیں: "بَعَّدْتُهُ عَنِ السُّوْءِ"۔ یعنی میں نے اس کو برائی سے دور کیا۔ پھر جب لام کے ساتھ مستعمل ہو تو یا تو وہ زاید ہوگا تاکید کے لیے، جیسے: "شَكَرْتُهُ وَشَكَرْتُ لَهُ" میں ہے، یا تعلیل کے لیے ہوگا: "أَيْ: أَفْعَلُ التَّسْبِيْحَ لِأَجْلِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ وَخَالِصًا لَهُ"

یہ فعل ان سورتوں کے بعض فواتح میں تو بہ صیغۂ ماضی آیا ہے، جیسے: یہ سورت اور سورۃ الحشر و سورۃ الصّف اور بعض میں بہ صیغۂ مضارع آیا ہے، جیسے: سورۃ الجمعہ و سورۃ التغابن اور بعض میں بہ صیغۂ امر آیا ہے، جیسے: سورۃ الاعلیٰ،

---

[1] تفسير ابن كثير (٣٨٥/٤) [2] فتح القدير (٢٢٠/٥) [3] فتح القدير (٢٢٠/٥)

اور سورت بنی اسرائیل میں یہ لفظِ مصدر واقع ہوا ہے۔ اس سے منظور اس کلمے کا اس کی ساری مشہور جہتوں سے اس کا استیعاب اور استیفاء (پورا کرنا) ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اشیاء تمام اوقات میں تسبیح کرنے والی ہیں۔ ان کی تسبیح ایسی نہیں کہ کسی وقت کے ساتھ خاص ہو اور کسی کے ساتھ نہ ہو، بلکہ یہ تو ہمیشہ کو تسبیح کرنے والے ہیں ماضی میں اور آیندہ زمانے میں بھی ہمیشہ تسبیح کرنے والے رہیں گے۔ (اس میں اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ جس کی شان تسبیح اختیاری ہے، وہ اس کا مستحق ہے کہ اپنے سارے اوقات میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرے جیسا کہ ملائے اعلیٰ کا حال ہے کہ وہ رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں سست نہیں ہوتے)۔

سورۃ الاسراء میں مصدر کے ساتھ ابتداء کی اس لیے کہ یہ اصل ہے اور ابلغ ہے، اس لحاظ سے کہ مشعر ہے اپنے اطلاق کے سبب سے فاعل وزمان کے تعرض سے۔ پھر ماضی کا ذکر کیا، اس لیے کہ اس کا زمانہ پہلے ہے، پھر مضارع کا صیغہ ذکر کیا، اس لیے کہ اس میں حال اور مستقبل شامل ہے، پھر امر کا صیغہ استعمال کیا، اس لیے کہ وہ مستقبل کے ساتھ خاص ہے، اس بات کے ساتھ کہ صرفیوں کے قول میں جو وہ یعنی فعل امر بولا جاتا ہے تو وہ ماضی اور مضارع کے بعد ہے، یوں بولتے ہیں: "فَعَلَ يَفْعَلُ اِفْعَلْ".

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہی ایسا قادر غالب ہے کہ کوئی جھگڑا کرنے والا اس سے جھگڑا نہیں کرتا اور نہ کوئی روکنے والا اسے روکتا ہے، وہ کوئی بھی ہو۔ وہ ایسا حکیم ہے کہ حکمت اور صواب (درستی) کے کام کرتا ہے۔ کلمۂ ﴿ وَهُوَ ﴾ کو قالون، ابو عمرو (اور کسائی رحمہم اللہ نے) حرفِ ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ ضم پڑھا ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی بادشاہی میں وہی اکیلا تصرف کرتا ہے، یعنی غلبہ واختیار رکھتا ہے اور ان میں اس کے تصرف و امر کے سوا کسی کا تصرف و امر نافذ نہیں ہوتا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد بارش و سبزہ اور ہر قسم کے رزق کے تمام خزانے ہیں۔

اس قول کو جو دو بار ذکر کیا ہے یہ کچھ تکرار نہیں ہے، اس لیے کہ پہلا قول دنیا میں ہے، جیسا کہ تقریر میں اس طرف اشارہ کیا ہے اور دوسرا آخرت میں ہے، اس لیے کہ اس کے بعد یوں فرمایا: ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ جملہ مستانفہ ہے، اس کے لیے اعراب کا کوئی محل نہیں ہے۔ ﴿ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ یہ دونوں فعل محلِ رفع میں ہیں اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہیں "أَيْ: هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ" اور جملہ مستانفہ ہے "ملك" کے بعض احکام کے بیان کے لیے۔ یا حال ہے ﴿ لَهٗ ﴾ کی ضمیر سے اور عامل استقرار ہے، معنی یہ ہیں وہ دنیا میں انشاء و ایجاد کے ساتھ زندہ کرتا ہے اور اس کے بعد مارتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ زندہ کرتا ہے نطفوں کو جو مردہ ہیں اور مارتا ہے زندوں کو۔ کسی نے کہا کہ مردوں کو بعث کے لیے زندہ کرے گا۔ ﴿ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ یعنی وہ ہر شے پر قادر ہے کوئی شے اس کو عاجز نہیں کرتی وہ کوئی سی بھی شے ہو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْاٰخِرُ﴾ یعنی وہ ہر شے سے پہلے ہے بغیر بدایت کے، یعنی ابتداء کے، یا وہ سارے موجودات پر سابق ہے (آگے بڑھنے والا، اگلا) اس لحاظ سے کہ وہ ان کا ایجاد کرنے والا اور احداث کرنے والا ہے۔ ﴿وَالْاٰخِرُ﴾ یعنی اور وہ ہر شے کے بعد ہے بغیر انتہاء کے۔ یا وہ موجودات کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک کی ابدیتِ بقا اور اس کے سوا ہر موجود کا فنا ہونا یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ بعض موجودات ایسی ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو ایجاد کیا تو وہ فنا نہ ہوں گے، جیسے: جنت اور نار اور جو ان میں ہیں اس وجہ کے سبب سے جو ثابت کی گئی ہے، اس لیے کہ مراد یہ ہے کہ وہ موجودات فی حد ذاتہا فانیہ ہیں، اگر چہ اس طرف نظر کر کے کہ اپنے موجد کی طرف مستند ہیں باقی ہیں، جیسا کہ ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ [الرحمن: ٢٦] میں گزرا ہے۔[1] (کما قالہ الشہاب)

یا یہ معنی ہیں کہ وہ ایسا اول ہے کہ تمام اسباب اس سے شروع ہوتے ہیں اور تمام مسببات اس کی طرف منتہی ہوتے ہیں، یعنی اللہ پاک کی اولیت سے یہ مراد ہے کہ وہ ایسا ہے کہ جو موجوداتِ مرتبہ وجود میں ہیں جب ان کے سلسلے پر غور کیا جائے گا تو اللہ پاک اسباب کے سلسلے کا مبداء ٹھہرے گا اور اس کی آخریت سے یہ مراد ہے کہ وہ ایسا ہے کہ مسببات کا سلسلہ اسی کی طرف منتہی ہوتا ہے، کیوں کہ وجود کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے اور وہ نزول کرتا رہتا ہے، پھر نازل ہوتا ہے، یہاں تک کہ آخر وجود کی طرف منتہی ہوتا ہے وہ وجود جو کل ما سوا کے لیے سبب ہوتا ہے اور وہ کسی اور شے کا مسبب نہیں ہوتا۔

چنانچہ حق سبحانہ ان معنوں میں اول ہے۔ پھر جب تم اس اخیر وجود سے درجہ درجہ ترقی کرنا شروع کرو گے، حتیٰ کہ آخر ترقی میں اللہ تعالیٰ کی طرف منتہی ہو گے۔ چنانچہ اللہ پاک اول ہے اس میں کہ اس سے ممکنات کی طرف وجود کا نزول ہے اور آخر ہے ممکنات سے اس کی طرف صعود کے وقت۔ یا یہ معنی ہیں کہ خارج میں اول ہے اور ذہن میں آخر ہے، اس لیے کہ جب تم ترتیبِ سلوک کی طرف نظر کرو گے اور سالکین کے منازل کا ملاحظہ کرو گے جو اللہ پاک کی طرف سیر کرنے والے ہیں تو اللہ پاک اس شے کا آخر ہے جس کی طرف عارفوں کے درجے چڑھتے ہیں اور ہر معرفت جو اس کی معرفت سے پہلے حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کی معرفت کی طرف زینہ ہے اور پرلے سرے کی منزل وہ اللہ پاک کی معرفت ہے، چنانچہ وہ آخر ہے باب معارف میں ارتقاء کے درجوں میں سلوک کی طرف نسبت کرنے کے ساتھ اور اول ہے وجودِ خارجی کی طرف نسبت کرنے کے ساتھ۔ چنانچہ اسی کی طرف مبداء ہے اول میں اور اسی کی طرف مرجع ہے آخر میں۔ (کذا قال الشیخ)

﴿وَالظَّاهِرُ﴾ یعنی ہر شے پر عالی اور غالب، یا اس کا وجود بادلۂ واضحہ ظاہر ہے۔ ﴿وَالْبَاطِنُ﴾ یعنی وہ اس

[1] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (١٥٢/٨)

شے کا عالم ہے جو باطن ہوئی۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: "فُلَانٌ يُبْطِنُ أَمْرَ فُلَانٍ أَيْ: يَعْلَمُ دَاخِلَةَ أَمْرِهِ" یعنی فلاں فلاں کا باطن امر جانتا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ اس کی ذات کی حقیقت محتجب و مستتر ہے، یعنی آنکھوں وحواس اور عقلوں کے ادراک سے پردے میں اور چھپی ہوئی ہے۔ سو عقلیں اس کی حقیقت کو نہیں جانتیں نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ اب وہ بات جو کشاف میں ہے کہ اس میں اس شخص پر حجت ہے جس نے اللہ پاک کا ادراک حاسہ کے ساتھ جائز رکھا ہے، مضمحل و نابود ہوگئی، کیونکہ حق مذہب یہی ہے کہ اللہ پاک بوجوہ ظاہر ہے اور بکنہ (حقیقت کے ساتھ) باطن ہے اور وہ ازل اور ابد میں ان دونوں صفتوں کا حامل ہے۔

اور اس کا باطن ہونا ان معنوں میں آخرت میں اس کی رویت ہونے کی نفی نہیں کرتا، کیونکہ رؤیتِ حاسہ کا یہ تقاضا نہیں کہ حقیقی رویت ہو اور اسی بنا پر یہ اس قول کے ذیل میں آئے گا، یعنی ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ اللہ پاک کا اشیاء سے باطن ہونا اس بات کو لازم کرتا ہے کہ اشیاء بھی اللہ تعالیٰ سے باطن ہیں، جیسا کہ "شاهد" میں ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک ہر شے کو جانتا ہے اس کے علم سے کوئی معلوم شے غائب نہیں ہوتی۔ اس کے نزدیک ظاہر یا پوشیدہ دونوں برابر ہیں۔ یہاں تین واؤ ہیں پہلے اور تیسرے نے تو مفرد کا عطف کیا ہے مفرد پر اور دوسرے واؤ نے مجموع امرین کا مجموع امرین پر عطف کیا ہے۔ مفردات میں یہ واؤ اس واؤ کے مثل ہے جو ایک قصے کا دوسرے جملوں میں قصے پر عطف کرتا ہے، کیوں کہ اگر وہ تنہا ظاہر کا عطف دو اول کے ایک پر کرتا تو خوبصورت نہ لگتا، کیوں کہ ان میں تناسب نہیں ہے۔ اور مجموع دو امر متقابل پر مجموع کے مشتمل ہونے میں مناسب ہے۔[1] (كما ذكره الشهاب)

بالجملہ اسمائے مذکورہ کی تفسیر میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے، حالاں کہ خود نبی کریم ﷺ نے ان چار اسموں کی ایسی تشریح فرما دی ہے کہ ہر قائل کے قول سے بے نیاز کرتی ہے تو اب اس کی طرف رجوع کرنا متعین ہے: "إِذَا جَاءَ نَهْرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلٍ" وہ یہ ہے:

(1) ابن ابی شیبہ، مسلم، ترمذی اور بیہقی نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور آپ ﷺ سے خادم کا سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہو: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، وَرَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ، مُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْفُرْقَانِ، فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰى، أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْءٍ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ، اِقْضِ عَنَّا الدَّيْنَ وَأَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ»[2] (وأخرج أحمد و مسلم وغيرهما من حديث أبي هريرة رضي الله عنه من وجه آخر مرفوعاً مثل هذا في الأربعة الأسماء المذكورة و تفسيرها)۔

---

(1) حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (١٥٢/٨)

(2) صحيح مسلم (٢٧١٣) سنن الترمذي (٣٤٠٠) مسند أحمد (٣٨١/٢) مصنف ابن أبي شيبة (٣٩/٦)

2 سیدنا عبداللہ بن عمر اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ ہمیشہ ہر شے کا سوال کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ یہ کہیں گے کہ اللہ تھا ہر شے کے قبل، پھر اللہ کے قبل کیا تھا؟ چنانچہ اگر وہ تم سے یہ کہیں تو تم کہو: ''هُوَ الْأَوَّلُ قَبْلَ كُلِّ شَيْءٍ، وَالْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَهُ شَيْءٌ، وَهُوَ الظَّاهِرُ فَوْقَ كُلِّ شَيْءٍ، وَهُوَ الْبَاطِنُ دُوْنَ كُلِّ شَيْءٍ، وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ''[1] (أخرجه أبو الشيخ في العظمة)

3 ابو زمیل سے مروی ہے کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا تو کہا کہ کیا چیز ہے جس کو میں اپنے سینے میں پاتا ہوں؟ فرمایا: وہ کیا ہے؟ میں نے کہا: واللہ! میں اس کے ساتھ تکلم نہیں کرتا ہوں۔ کہا: پھر مجھ سے فرمایا: کیا کچھ شک ہے؟ کہا: اور ہنسے، فرمایا: اس سے کسی نے نجات نہیں پائی، کہا: یہاں تک کہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ فَإِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴾ [يونس: ٩٤] ''پھر اگر آپ اس کی طرف سے شک میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے تو آپ ان لوگوں سے پوچھ دیکھیے جو آپ سے پہلی کتابوں کو پڑھتے ہیں، بے شک آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے سچی کتاب آئی ہے آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔'' اور مجھ سے فرمایا: جس وقت تو اپنے نفس میں کوئی شے پائے تو کہہ: ﴿ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظّٰهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾[2] (أخرجه أبو داود)

4 سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس اثنا میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے اصحاب تھے کہ اچانک ان پر ایک بدلی آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: یہ عنان ہے، یہ ''روایا الأرض'' ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ اس قوم کی طرف کھینچ لے جاتا ہے جو اس کا شکر نہیں کرتے اور نہ اس کو پکارتے ہیں۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تمھارے اوپر کیا ہے؟ عرض کی کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: بے شک وہ رقیع ہے سقفِ محفوظ ہے اور موجِ مکفوف ہے۔

پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تمھارے اور اس کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ علم رکھتے ہیں۔ فرمایا: تمھارے اور اس کے درمیان پانچ سو برس ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے؟ عرض کی: اللہ اور اس کا رسول زیادہ علم رکھتے ہیں۔ فرمایا: دو آسمان ہیں، ان کے درمیان کی دوری پانچ سو برس ہے، یہاں تک کہ سات آسمان گنے۔ ہر آسمان کے درمیان ویسا ہی فاصلہ ہے جیسا کہ آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو، اس کے اوپر کیا ہے؟ عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ علم رکھتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: بے شک

[1] الدر المنثور (٨/٤٨، ٤٩) [2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١١٠)

اس کے اوپر عرش ہے اور اس کے اور آسمان کے درمیان اتنی دوری ہے جتنی دو آسمانوں کے درمیان ہے۔

پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو وہ شے کیا ہے جو تمھارے نیچے ہے؟ عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: بے شک اس کے نیچے ایک اور زمین ہے، ان کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے، یہاں تک کہ سات زمینوں کا شمار کیا اور ہر دو زمین کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے۔ پھر فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اگر مقرر تم کوئی رسی ساتویں زمین کی طرف لٹکاتے تو البتہ وہ گرتی اللہ پر، پھر پڑھا: ﴿ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴾۔[1] (أخرجه الترمذي وقال: غريب، قال الترمذي: قال بعض أهل العلم في تفسير هذا الحديث إنما أراد لهبط على علم الله وقدرته وسلطانه وعلم الله وقدرته وسلطانه في كل مكان، وهو على العرش كما وصف نفسه في كتاب)

عنان سحاب کا نام ہے۔ "روايا الأرض" کے معنی حوافل ہیں، یعنی پانی بھری بدلیاں زمین کو سیراب کرنے والی۔ "رقيع" آسمان کا نام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سمائے دنیا کا ایک نام ہے۔[2] (كذا في فتح البيان) تفسیر ابن کثیر میں ابو زمیل کی حدیث کے ذکر کے بعد کہا ہے کہ اس آیت میں مفسرین کی عبارات واقوال مختلف ہوئے ہیں اور دس سے کچھ زیادہ قول ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: یحییٰ نے کہا ہے: "اَلظَّاهِرُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا، وَالْبَاطِنُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا"[3] (فراء کا بھی یہی قول ہے۔ كما ذكره العيني)۔

حافظ مزی ہمارے شیخ نے کہا ہے کہ یہ یحییٰ وہی ابن زیاد الفراء ہے: ("نزهة الالبا" میں فراء کا خوب ترجمہ لکھا ہے اور یوں کہا ہے: ابو زکریا یحییٰ بن زیاد الفراء کسائی کے شاگرد ہیں، امام ثقہ ہیں۔ ۲۰۷ میں ۶۳ سال کی عمر میں راہِ مکہ بہ خلافتِ مامون میں وفات پائی)۔ اس کی ایک کتاب ہے جس کا نام معانی القرآن رکھا ہے۔ پھر کہا ہے کہ اس بارے میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں، پھر ان کا ذکر کیا ہے۔ ان میں وہ احادیث بھی ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے اور ان کے دیگر طرق بھی ذکر کیے ہے۔[4]

هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۖ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٤﴾ لَهُ

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ ضعيف الجامع، رقم الحديث (٦٠٩٤)

[2] فتح البيان (١٣/٣٩٦، ٣٩٧) [3] صحيح البخاري (٤/١٨٥١) [4] تفسير ابن كثير (٤/٣٨٦، ٣٨٧)

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۞ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔ وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے، اور جو چیز آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے۔ اور تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ تمھارے ساتھ ہے۔ اور اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو④ اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں⑤ وہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے⑥

اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت اور ملک کی وسعت کا بیان:

اللہ پاک فرماتا ہے کہ اسی نے آسمانوں کو اور زمین کو چھے دن میں پیدا کیا، یعنی دنیا کے دنوں میں۔ ان دنوں میں سے پہلا یوم الاحد (اتوار کا دن) اور ان کا آخری دن جمعہ ہے، جیسا کہ امام محلی وغیرہ نے کہا ہے[1] اور اگر وہ چاہتا کہ ان کو پلک جھپکنے میں بنائے تو بنا ڈالتا، لیکن اس نے چھے دنوں کو ایک اصل ٹھہرایا ہے، تا کہ ان پر مدار ہو۔ اللہ پاک جو آسمان اور زمین کا مالک ہے تو اس سے مراد اس کے بعض ملک کے پیدا کرنے کا بیان کرنا ہے۔ پھر ان کی خلق کے بعد اپنے عرش پر مستوی ہونے کی خبر دی (فتح البیان میں استویٰ علی العرش کے بیان میں عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ اوعال لکھی ہے، اس کا ذکر ہو چکا ہے)۔ امام محلی رحمہ اللہ نے عرش کی تفسیر کرسی سے کی ہے، یعنی پھر اس پر مستوی ہوا، ایسا مستوی ہونا جو اس کی ذات پاک کے لائق ہے۔[2] اس آیت کی تفسیر سورۃ الاعراف وغیرہ میں پورے طور پر گزر چکی ہے[3] اور استواء پر بھی کئی بار کئی جگہ پر کلام گزر چکا ہے۔

اس بارے میں مستقل کتابیں اور رسائل ہیں جو اہلِ علم کے نزدیک مشہور ومعروف ہیں۔ بالجملہ اپنی قدرتِ تامہ کے ذکر کے بعد اپنے علمِ تام کا ذکر فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا﴾ یعنی جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اسے جانتا ہے، یعنی بارش، قطرے اور بیج اور خزانے اور مردے وغیرہ اور وہ ان دانوں اور قطروں کی گنتی جانتا ہے جو اس میں داخل ہوتے ہیں اور جانتا ہے جو کچھ اس سے نکلتا ہے نباتات اور کھیتی اور پھل اور معدنیات وغیرہ جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ

① تفسير الجلالين (٧١٨/١) ② تفسير الجلالين (٧١٨/١) ③ رقم الآية (٥٤)

﴿وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الأنعام: ۵۹]

''اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں غیب کی کنجیاں (خزانے) ان کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ کے اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہیں اور جو کچھ دریاؤں میں ہیں اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر یہ سب کتابِ مبین میں ہیں۔''

اور جانتا ہے جو کچھ آسمان سے اترتا ہے، یعنی فرشتے اور رحمت و عذاب اور بارش اور اولے اور برد، یعنی برف اور اَولے اور اقدار و احکام ملائکہ کرام کے ساتھ۔ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے کہ نہیں نازل ہوتا کوئی قطرہ آسمان سے مگر حال یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اس کو اس جگہ میں قرار پذیر کرتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ اس کو امر کرتا ہے جہاں وہ چاہتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ اس کی طرف چڑھتا ہے، یعنی فرشتے اور دعائیں اور بندوں کے اعمال جیسا کہ صحیح میں آیا ہے کہ اس کی طرف رات کا عمل دن سے پہلے پہلے اٹھایا جاتا ہے اور دن کا عمل رات سے پہلے پہلے اٹھایا جاتا ہے۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: ''كَالْأَعْمَالِ الصَّالِحَةِ وَالسَّيِّئَةِ''[2] اس پر علی قاری نے یوں اعتراض کیا ہے کہ اعمال میں سے جو اٹھایا جاتا ہے وہ عملِ صالح ہی ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ﴾ [الفاطر: ۱۰] ''تمام ترستھرے کلمات اسی کی طرف چڑھتے ہیں اور نیک عمل ان کو بلند کرتا ہے''۔ اس کی تفسیر سورت سبا میں گزر چکی ہے۔[3]

پھر جب آسمان و زمین کا علم ثابت کر چکا تو آدمیوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ یعنی اور وہ اپنی قدرت و سلطان و علم سے عموماً اور اپنے فضل و رحمت سے خصوصاً تمھارے ساتھ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''عَالِمٌ بِكُمْ''[4] یعنی اس کو تمھارا علم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ حفظ و حراست تمھارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا علم و قدرت ہر ایک کے ساتھ متعلق ہے، کوئی اس سے جدا نہیں ہوتا، کہیں ہو آسمان میں یا زمین میں، خشکی میں یا دریا میں۔ یہ اس بات کی تمثیل ہے کہ جو کچھ ان سے صادر ہوتا ہے اللہ پاک کا علم اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے، وہ کہیں پر پھریں زمین میں، خشک جگہ پر یا دریا میں۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ یعنی اور اللہ تم پر رقیب اور نگہبان ہے، تمھارے اعمال پر شہید ہے ان میں سے کچھ بھی اس سے مخفی نہیں ہے، تم جہاں کہیں بھی ہو، خشکی میں یا تری میں، رات میں یا دن میں، گھروں میں یا جنگلوں میں اس کے علم میں سب برابر ہے اور اس کی بصر و سمع کے تحت میں ہے، چنانچہ وہ تمھاری باتیں سنتا ہے اور تمھاری جگہ کو دیکھتا ہے اور تمھاری پوشیدہ باتوں اور سرگوشیوں کو جانتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ [هود: ۵] ''یاد رکھو وہ لوگ اپنے سینوں کو دوہرا کیے دیتے ہیں تاکہ اپنی باتیں (اللہ) سے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۹) [2] تفسير الجلالين (۷۱۸/۱) [3] رقم الآية (۲) [4] الدر المنثور (۴۹/۸)

چھپا سکیں۔ یاد رکھو کہ وہ لوگ جس وقت اپنے کپڑے لپیٹتے ہیں وہ اس وقت بھی سب جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ بالیقین وہ دلوں کے اندر کی باتیں جانتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ مِّنۡكُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَمَنۡ جَهَرَ بِهٖ وَمَنۡ هُوَ مُسۡتَخۡفٍۢ بِالَّيۡلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴾ [الرعد: ١٠] ''تم میں سے کسی کا اپنی بات کو چھپا کر کہنا اور با آوازِ بلند اسے کہنا اور جو رات کو چھپا ہوا ہو اور جو دن میں چل رہا ہو، سب اللہ پر برابر اور یکساں ہیں۔''
فَلَا إِلٰهَ غَيْرُهُ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ.

صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا، جبکہ انھوں نے آپ سے احسان کے متعلق پوچھا کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، پھر اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی کہ آپ مجھے ایک ایسی حکمت کا توشہ دیں کہ میں اس سے زندگی بسر کروں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِسْتَحْيِ اللّٰهَ كَمَا تَسْتَحْيِ رَجُلًا مِنْ صَالِحِيْ عِشْرَتِكَ لَا يُفَارِقُكَ)) یعنی تو اللہ تعالیٰ سے اس طرح شرم کر جیسے تو اپنے کنبے کے صالح مردوں میں سے کسی مرد سے شرم کرتا ہے جو تجھ سے کبھی مفارقت نہیں کرتا، یعنی علاحدہ نہیں ہوتا۔[2] (رواه الحافظ أبوبكر الإسماعيلي بسنده عن عبد الرحمن بن عامر عنه هذا حديث غريب)

حافظ ابونعیم نے عبداللہ ابن معاویہ غاضری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ تین چیزیں ہیں جس نے ان کو کیا تو اس نے واقعی ایمان کا مزہ پایا: یہ کہ اللہ وحدہ کی عبادت کی اور اپنے مال کی زکات دے، اس حال میں کہ اس سے اس کا جی خوش ہو اور نہ دے ہر کہ ومہ کو اور نہ ردیہ اور نہ شرطیہ کو اور نہ لئیمہ اور نہ مریضہ کو، لیکن اپنے اوسط اموال سے اور اپنے نفس کو مزکیٰ کیا، یعنی تزکیۂ نفس کیا اور ایک شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ! کسی کا اپنے کو مزکیٰ کرنا کیا ہے؟ تو فرمایا کہ وہ یہ بات جان لے کہ اللہ اس کے ساتھ ہے، وہ کہیں بھی ہو۔[3] نعیم بن حماد نے سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: بے شک افضل ایمان یہ ہے کہ تو یہ بات جان لے کہ اللہ تیرے ساتھ ہے تو جہاں کہیں بھی ہو۔[4] یہ غریب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ یہ دو بیتیں پڑھا کرتے تھے:

إِذَا خَلَوْتَ الدَّهْرَ يَوْمًا فَلَا تَقُلْ ... خَلَوْتُ وَلٰكِنْ قُلْ عَلَيَّ رَقِيْبُ
وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ يَغْفُلُ سَاعَةً ... وَلَا أَنَّ مَا يَخْفٰى عَلَيْهِ يَغِيْبُ[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨)

[2] تفسير ابن كثير (٣٨٨/٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ذکر کے بغیر دیگر مصادر سے نقل کر کے اس کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٧٤١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٨٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (٩٥/٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٤٦)

[4] المعجم الأوسط (٣٣٦/٨) حلية الأولياء (١٦٤/٦) اس کی سند میں ''نعیم بن حماد'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٥٨٩)

[5] تفسير ابن كثير (٣٨٩/٤)

(یخفی: أَيْ: مَا يَظْهَرُ عَلَيْهِ۔ یہ شعر پہلے بھی گزر چکے ہیں)۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ پہلے اس کی توجیہ گزر چکی ہے کہ یہ مکرر نہیں ہے، یا یوں کہو کہ یہ تکرار تاکید کے لیے ہے اور اس کا ذکر اعادے کے ساتھ کیا، جیسا کہ "ابداء" کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اس لیے کہ یہ اعادہ و ابداء کے لیے مقدمے کی طرح ہے، کیونکہ اس کا ماقبل اعادے کی طرف اشارہ ہے، اس انداز سے کہ مجازاۃ سے کنایہ ٹھہرایا گیا ہے (یعنی ﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ اور اسی طرح مابعد بھی ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾۔) اور اول قول کا مابعد (یعنی ﴿ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾) ابداء کی طرف اشارہ ہے۔

﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ یعنی اسی کا ہے ملک آسمانوں کا اور زمین کا اور امور اللہ ہی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا و آخرت کا مالک وہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴾ [اللیل: ۱۳] ''اور ہمارے ہی ہاتھ آخرت اور دنیا ہے۔'' اور وہی اس پر محمود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ﴾ [القصص: ۷۰] ''وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی اور لائقِ عبادت نہیں، دنیا اور آخرت میں اسی کی تعریف ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾ [سبا: ۱] ''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے سزاوار ہیں جس کی ملکیت میں وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے آخرت میں بھی تعریف اسی کے لیے ہے، وہ (بڑی) حکمتوں والا اور (پورا) خبردار ہے۔''

چنانچہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کی ملک ہے اور ان کے اہل اس کے غلام ہیں اور اس کے روبرو ذلیل اور فرمانبردار ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴾ [مریم: ۹۳۔ ۹۵] ''آسمان و زمین میں جو بھی ہیں سب کے سب اللہ کے غلام بن کر ہی آنے والے ہیں۔ ان سب کو اس نے گھیر رکھا ہے اور سب کو پوری طرح گن بھی رکھا ہے۔ یہ سارے کے سارے قیامت کے دن اکیلے اکیلے اس کے پاس حاضر ہونے والے ہیں۔''

اسی لیے فرمایا: ﴿ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ یعنی قیامت کے دن اسی کی طرف مرجع ہے تو وہ اپنی خلق میں جو چاہے گا فیصلہ کرے گا اور وہ ایسا عادل ہے کہ ذرہ بھر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا، بلکہ اگر ان میں سے کسی کا عمل حسنہ ہو گا تو اس کے اجر کو کئی گنا کر دے گا، اس کے دس گنا تک اور اپنے پاس سے بڑا اجر دے گا اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾ [الأنبیاء: ۴۷] ''قیامت کے دن ہم درمیان میں لا رکھیں گے ٹھیک ٹھیک تولنے والی ترازو کو پھر کسی پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہو گا ہم اسے لا حاضر

کریں گے، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔" ﴿ تُرْجَعُ ﴾ کو اخوان و ابن عامر بہ فتح تاء و کسر جیم بہ صیغۂ معروف پڑھتے ہیں اور باقی قراء بہ صیغۂ مجہول پڑھتے ہیں[1] سارے قرآن شریف میں اسی طرح پڑھتے ہیں۔(کما ذکرہ السمین)

﴿ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ خلق میں متصرف وہی ہے۔ شب و روز کو لوٹتا پوٹتا ہے اور اپنی حکمت سے ان کا اندازہ کرتا ہے جیسا چاہتا ہے۔ پس کبھی تو رات طویل ہوتی ہے اور دن چھوٹا اور کبھی اس کے الٹ اور کبھی دنوں کو معتدل چھوڑتا ہے۔ کبھی فصل شتا ہوتی ہے پھر ربیع (بہار) پھر قیظ (موسم گرما) پھر خریف (ساون کا موسم) اور یہ سب اسی کی حکمت اور تقدیر سے ہے، اس بات کے سبب سے جس کا اپنی خلق کے ساتھ ارادہ کرتا ہے اور وہ خفیہ باتوں کو جانتا ہے، اگرچہ وہ بہت دقیق اور خفی ہوں اور سینے کے ضمائر (خیالات) اور اعتقادات اور بھیدوں کو جانتا ہے ان میں سے کوئی مخفی شے بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔[2] (كذا في فتح البيان و ابن كثير مع المزج والخلط)

بالجملہ جب ان دلیلوں کا ذکر کر چکا جو اللہ پاک کی توحید و علم و قدرت پر دال ہیں، جب ان میں سے کئی نوع ذکر کر چکا تو کفار قریش کو خطاب کرنا شروع کیا، (خازن نے اسی طرح کہا ہے کہ اللہ پاک کفار قریش کو خطاب کرتا ہے اور ان کو حکم دیتا ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان لائیں اور دنیا سے اعراض کریں اور نیکی کے تمام کاموں میں خرچ کریں۔[3] محلی نے یہ مومنوں کو خطاب ٹھہرایا ہے، یعنی ایمان پر ہمیشہ قائم رہو۔[4] واللّٰہ أعلم) تو فرمایا:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ
فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۞۷ وَمَا لَكُمْ
لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ
اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞۸ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ
عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى
النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۞۹ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا يَسْتَوِيْ
مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ
دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ

---

[1] فتح القدير (٢٢١/٥) [2] تفسير ابن كثير (٣٨٩،٣٨٨/٤) فتح البيان (٣٩٧_٣٩٩)

[3] تفسير الخازن (٣١/٧) [4] تفسير الجلالين (٧١٩/١)

اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۰ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ
اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۱

اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اس (مال) میں سے خرچ کرو جس میں اس نے تمھیں جانشین بنایا ہے، پھر تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے خرچ کیا، ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے ⑦ اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے؟ حالاں کہ رسول تمھیں بلاتا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اور یقیناً وہ تم سے پختہ وعدہ لے چکا ہے اگر تم مومن ہو؟ ⑧ وہی تو ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات نازل کرتا ہے، تاکہ وہ تمھیں اندھیروں سے اُجالے کی طرف نکالے، اور بلاشبہ اللہ تم پر نہایت شفیق، خوب رحم کرنے والا ہے ⑨ اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟ جبکہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا یہ (ان لوگوں کے) برابر نہیں ہیں، (جنھوں نے فتح مکہ کے بعد یہی کام کیے۔) یہ (پہلے کرنے والے) لوگ درجے میں ان لوگوں سے عظیم تر ہیں جنھوں نے اس (فتح) کے بعد خرچ کیا اور لڑائی کی، اور اللہ نے ہر ایک سے نیک جزا کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو ⑩ کون ہے وہ جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے، پھر وہ اسے اس کے لیے بڑھا دے؟ اور اس کے لیے عمدہ اجر ہے ⑪

ایمان لانے کا حکم اور خرچ کرنے کی ترغیب:

تم سے مضبوط عہد و پیمان لے چکا ہے، یعنی دنیا میں آنے سے پہلے قرار لے چکا ہے اور اس کا اثر دل میں رکھ دیا ہے۔ یہ جو فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں کی میراث کا مالک اکیلا اللہ ہے، یعنی سب کچھ بچ رہتا ہے، یعنی مالک فنا ہو جاتا ہے اور ملک اللہ کو بچ رہتی ہے اور ہمیشہ اسی کا مال تھا۔ فتح سے پہلے، یعنی جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا، وہ بڑے درجے لے گئے۔ قرض کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت تم جہاد میں خرچ کرو، پھر تمھیں دولتیں استعمال کرو گے اور یہی معنے بڑھانے کے ہیں۔ مالک اور غلام میں بیاج نہیں جو دیا سو اس کا جو نہ دیا سو اس کا۔ انتھٰی.

﴿ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ کا خطاب کفارِ عرب کو ہے یا سب کو، یعنی توحید کی اور رسالت کے صحیح ہونے کی تصدیق کرو۔ مسلمانوں کے حق میں امر بایمان سے مراد اس پر ہمیشہ قائم رہنا اور اس میں اور آگے بڑھنا ہے، یعنی ایمان پر ہمیشہ قائم رہو اور اخلاص کے ساتھ اعمالِ صالحہ کر کے اس کو اور زیادہ کرو۔ پھر جب ان کو ایمان کا حکم دیا تو

ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا امر فرمایا: ﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۖ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴾ یعنی اس مال میں سے کچھ خرچ کرو جس میں اس نے تم کو نائب ٹھہرایا ہے اس کے اندر تصرف کرنے میں تم نائب ہو اس کے بغیر کہ تم اس کے حقیقی مالک ہو، کیونکہ مال تو اللہ کا مال ہے اور بندے اللہ کے خلفاء اور نواب ہیں اس کے اموال پر تو ان کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ اس کو اس شے میں خرچ کریں جو اس کو راضی کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس نے تم کو ان لوگوں کا خلیفہ بنایا ہے جو تم سے پہلے تھے اور جن کے تم وارث ہوئے ہو اور عن قریب وہ مال دوسروں کی طرف منتقل ہو جائے گا جو تمھارے وارث ہوں گے، پس تم اس کے ساتھ بخل مت کرو۔

امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ مال تمھارے پاس عاریت کے طور پر ہے، کیوں کہ وہ تو تم سے پہلے لوگوں کے ہاتھوں میں تھا، پھر تمھاری طرف منتقل ہو گیا۔ پس اللہ پاک مال کے استعمال کی ان کو راہ بتاتا ہے کہ جس مال میں ان کو پہلے لوگوں کا نائب کیا ہے، اسے اس کی اطاعت میں استعمال کریں اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو اس پر ان سے محاسبہ کرے گا اور ان کو سزا دے گا، اس لیے کہ جو امور اس میں واجب تھے، انھوں نے ان کو ترک کیا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اے شخص! عنقریب کوئی اور تیرے بعد اس کا خلیفہ ہوگا تو شاید تیرا وارث اس مال میں اللہ کی اطاعت کرے اور اسے اس کی مرضی کے کاموں میں خرچ کرے تو وہ تجھ سے اس شے کے ساتھ زیادہ بہرہ مند ہو جس کا اللہ نے تجھ پر انعام کیا۔ یا وہ اس میں اللہ کی نافرمانی کرے اور اسے گناہ کے کاموں میں خرچ کرے تو تو ایسا ہو کہ تو نے اس کی ''اثم و عدوان'' پر اس کی معاونت کی سعی کی۔ مطرف بن عبداللہ بن شخیر اپنے باپ سے راوی ہیں، کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا اور آپ ﷺ فرما رہے تھے: ﴿ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ﴾۔ « يَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ: مَالِيْ مَالِيْ وَهَلْ لَكَ مِنْ مَالِكَ إِلَّا مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ أَوْ تَصَدَّقْتَ فَأَمْضَيْتَ »[2] (رواه الإمام أحمد ورواه مسلم من حديث شعبة به و زاد "وما سوى ذلك فذاهب و تارك للناس").

غرض یہ کہ آیت میں خیر کی راہوں میں خرچ کرنے کی ترغیب ہے اور اس کو نفس پر آسان کرنا ہے، اس سے پہلے کہ مال ان سے منتقل ہو کر دوسروں کی طرف چلا جائے۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت کے معنی خیر میں خرچ کرنے کی ترغیب ہے اور اس شے میں خرچ کرنے کی جس کو عام طور پر اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ حکم فرض زکاۃ کے ساتھ خاص ہے، حالانکہ اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ محلی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کا نزول غزوۂ عسرہ میں ہوا ہے، یعنی غزوۂ تبوک۔[3] لیکن

---

[1] تفسير القرطبي (١٧/٢٣٨) فتح القدير (٥/٢٢٢) [2] صحيح مسلم (٢٩٥٨، ٢٩٥٩) مسند أحمد (٤/٢٤)

[3] تفسير الجلالين (١/٧١٩)

یہ بات مشکل ہے اس قول پر کہ یہ سورت مکی ہے۔ اسی طرح اس قول پر بھی کہ سورت مدنی ہے ان آیات کے مستثنیٰ ہونے کی بنا پر جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ غزوہ ۹ ہجری میں ہے نبی ﷺ کے طائف سے رجوع کے بعد۔ یہ آپ ﷺ کا آخری غزوہ ہے، اس میں قتال واقع نہیں ہوا، بلکہ جزیہ دینے پر صلح واقع ہوگئی۔ اس قصے کی وضاحت سورت براءت میں ہے اگر تفصیل جاننا چاہو تو اس کی طرف مراجعت فرما لو۔ پھر اللہ پاک نے ان کا ذکر کیا جنھوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... الآية ﴾ یعنی پھر جنھوں نے یہ باتیں جمع کیں کہ اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا ان کے لیے بڑا اجر ہے، یعنی جنت ہے۔ محلی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس میں عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ ہے،[1] یعنی انھوں نے تین سو اونٹ ان کے اقتاب و احلاس و احمال کے ساتھ تیار کر دیے اور ایک ہزار دینار لا کر نبی ﷺ کے سامنے لا کر رکھ دیے۔

﴿ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ ﴾ میں ملامت اور توبیخ کا استفہام ہے اور کفار کو خطاب ہے، یعنی کون سا عذر ہے اور کون سی چیز تم کو اللہ پر ایمان لانے سے مانع ہے اور تم سے تمام علتیں اور بہانے بالکل دور کر دیے جا چکے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ جبکہ تم ایمان نہ لاؤ گے تو تمھارے لیے آخرت کے ثواب میں کون سی شے ہے۔ حال یہ ہے کہ رسول تم کو ایمان کی طرف بلا رہا ہے اور اس پر تم کو اجاگر کر رہا ہے اور تم پر وہ کتاب پڑھ رہا ہے جو برہانوں اور حجتوں کو پیش کرتی ہے اور حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمھارا عہد لے چکا۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے لیے ایمان کو ترک کرنے کا کوئی عذر نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے اصحاب سے فرمایا: «أَيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ أَعْجَبُ إِلَيْكُمْ إِيْمَانًا؟» یعنی کون سے مومنین ازروئے ایمان تم کو سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ فرشتے۔ فرمایا: کیا ہے ان کو کہ وہ ایمان نہ لائیں حالانکہ وہ اپنے رب کے پاس ہیں۔ عرض کی تو پھر انبیاء، فرمایا: کیا ہے ان کو کہ وہ ایمان نہ لائیں اور ان پر وحی نازل ہوتی ہے، عرض کی تو پھر ہم، فرمایا: تم کو کیا ہے کہ تم ایمان نہ لاؤ حالاں کہ میں تمھارے درمیان میں ہوں، لیکن ازروئے ایمان سب سے پسندیدہ مومنین وہ قوم ہیں جو تمھارے بعد آئیں گے اور صحیفے پائیں گے اور اس شے پر ایمان لائیں کے جو ان میں ہے[2] (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "وقد روينا في الحديث من طرق في أوائل شرح كتاب الإيمان من صحيح البخاري وقد ذكرنا طرفا من هذه في أول سورة البقرة عند قوله تعالىٰ: ﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾[3] [البقرة: ٣]")۔

---

[1] تفسير الجلالين (٧١٩/١)

[2] دلائل النبوة للبيهقي (٥٣٧/٦) اس کی سند میں "مغیرہ بن قیس اور اسماعیل بن عیاش" ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٤٧)

[3] تفسير ابن كثير (٤٧٢/٤)

﴿ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمھارا اقرار لیا، جبکہ تم کو تمھارے باپ آدم کی پشت سے نکالا عالمِ ذر میں جب تم کو تمھاری جانوں پر گواہ کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى ﴾ [الأعراف: ۱۷۲] ”کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا: کیوں نہیں۔“ یا یہ معنی ہیں کہ تمھارا عہد لیا ان دلیلوں کے ساتھ جن کو تمھارے لیے قائم کیا جو توحید اور وجوبِ ایمان پر دال ہیں اور مرکب کیں تم میں عقلیں اور تم کو دلیلوں میں غور کرنے کی قدرت دی، چنانچہ جب عقلی دلائل اور رسول کے آگاہ کرنے کے بعد تمھارے لیے کوئی علت باقی نہ رہی تو پھر تمھیں کیا ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے: یہ قول کشاف کی طرح قاضی کا مختار ہے۔[1] پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اخذِ میثاق کی تفسیر میں کہا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ﴾ [المائدة: ۷] ”تم پر اللہ کی جو نعمتیں نازل ہوئی ہیں انھیں یاد رکھو اور اس کے اس عہد کو بھی جس کا تم سے معاہدہ ہوا ہے جبکہ تم نے کہا ہم نے سنا اور مانا۔“ اور اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی بیعت ہے۔ ابن جریر کا یہ زعم ہے کہ اس سے مراد وہ میثاق ہے جو آدم علیہ السلام کی پشت میں ان پر لیا۔ یہ مجاہد رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔[2] فاللّٰہ أعلم. جمہور نے ﴿ اَخَذَ ﴾ کو بہ صیغۂ ماضی معروف پڑھا ہے، فاعل اللہ پاک ہے اور کسی نے (یعنی ابو عمرو نے) بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔

﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ یعنی اگر تم اس عہد پر ایمان لاتے ہو جو تم سے لیا، یا ان حجتوں دلیلوں پر ایمان لاتے ہو، یا اگر تم اسباب میں سے کسی سبب پر ایمان لانے والے ہو تو یہ اس کے اعظم اسباب سے اور واضح موجبات میں سے ہے جس پر مزید کوئی اور سبب نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر تم موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانے والے ہو تو بے شک ان کی شریعت اس بات کی مقتضی ہے کہ محمد پر ایمان لاؤ۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر تم اس پر ایمان لانے کا ارادہ رکھتے ہو تو اس کی طرف مبادرت (جلدی) کرو، اب تم کو اس سے کون مانع ہے، حالانکہ رسول اس کی طرف بلا رہا ہے اور برہان قائم کر چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ بہ معنی ”إذ“ ہے، یعنی تمھارا عہد لیا جبکہ تم مومن تھے۔

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی وہی ہے جو اپنے بندے پر قرآن کی واضح اور ظاہر آیتیں اتارتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اٰيٰتٍ ﴾ سے مراد معجزات ہیں اور قرآن ان میں سے سب سے بڑا معجزہ ہے، تاکہ ان آیتوں کے سبب سے یا دعوت کے ذریعے سے تم کو اللہ یا رسول شرک کی تاریکیوں سے نکال کر نورِ ایمان کی طرف لے آئے۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں کفر سے نکال کر ایمان کی طرف لانے میں بہت ہی بڑا نرمی اور رحمت والا ہے۔ جبھی تو اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے کتابیں نازل کیں اور رسول بھیجے اور تمھارے لیے جو عقلی حجتیں قائم کیں صرف ان پر اکتفا نہیں کیا۔

[1] الكشاف (٤/٤٧٢) تفسير البيضاوي (٥/٢٩٧) [2] تفسير الطبري (٢٣/١٧٢) تفسير ابن كثير (٤/٣٩٠)

اب اس سے بڑھ کر کوئی نرمی اور رحمت نہیں ہے۔

بالجملہ جب پہلے ان کو ایمان اور انفاق (خرچ کرنے) کا امر کیا پھر ایمان پر آمادہ کیا اور یہ بیان فرمایا کہ ایمان سے منع کرنے والی باتیں ان سے دور کر چکا ہے تو پھر ان کو خرچ کرنے پر برانگیختہ کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (اصل میں "في أن لا تنفقوا" ہے۔ "أن" موضع نصب یا جر میں ہے زائد نہیں ہے جس طرح کہ ابوالحسن اس کو زائد خیال کرتے ہیں، بلکہ مصدریہ ہے اور معنی فی عدم الانفاق ہیں) اس میں استفہام ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کا ہے، یعنی تمھیں کون سا عذر ہے اور کون سی شے تم کو منع کرتی ہے کہ اللہ کی اطاعت میں اور اس شے میں خرچ کرو جو اس کی طرف قریب کرے۔ چنانچہ ﴿سَبِیْلِ﴾ سے مراد ہر وہ خبر ہے جو ان کو اللہ کی طرف موصل ہو (پہنچائے) تو یہ استعارہ تصریحیہ ہے۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ جس انفاق کا اس آیت میں حکم کیا گیا ہے: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ﴾ [الحديد: ٧] وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔

غرض یہ کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے تم کو کون مانع ہے، حالانکہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے، وہ عالم کے تمام ہونے کی وجہ سے اللہ کی طرف رجوع ہونے والا ہے، جیسے: میراث وارث کی طرف رجوع ہوتی ہے اور اس میں سے ان کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ یہ تقریر ڈانٹ ڈپٹ میں زیادہ دخل رکھتی ہے اور ملامت اور دھمکی میں کامل تر ہے، اس لیے کہ ان امور کا ایسا ہونا کہ اپنے لوگوں سے نکل جائیں گے اور ان کے مالکوں میں سے کوئی باقی نہ رہے گا، یہ بات ان پر انفاق کو واجب کرنے کے لیے زیادہ مضبوط ہے، بہ نسبت اس کے کہ یوں کہو کہ وہ اموال حقیقت میں اللہ کے ہیں اور وہ لوگ ان کے اندر تصرف کرنے میں اللہ کے خلفاء ہیں۔

معنی یہ ہیں کہ خرچ کرو اور مال کے کم ہو جانے سے اور فقر سے مت ڈرو، کیونکہ جس کی راہ میں تم نے خرچ کیا، وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، اس کے ہاتھوں میں ان کی کنجیاں ہیں، اس کے پاس ان کے خزانے ہیں اور وہ عرش کا مالک ہے، اس شے کے ساتھ جس کا وہ حاوی ہے اور وہی یہ بات کہتا ہے: ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ﴾ [سبا: ٣٩] "تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اللہ اس کا (پورا پورا) بدلہ دے گا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔" نیز اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے: ﴿مَا عِنْدَكُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾ [النحل: ٩٦] "تمھارے پاس جو کچھ ہے سب فانی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے باقی ہے۔" لہٰذا جس نے اللہ پر توکل کیا اس نے خرچ کیا اور صاحبِ عرش سے کسی کمی کا خوف نہ کیا اور یہ بات جان لی کہ عن قریب اللہ اس کا عوض اسے دے گا۔

فتح مکہ سے پہلے خرچ کرنے کی فضیلت:

پھر جنھوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی سبقت کی ہے ان کی فضیلت اور خرچ کرنے والوں کے درجوں کا فرق بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ﴾ یہاں عبارت میں حذف ہے۔ تقدیر یہ ہے برابر نہیں ہوتا وہ شخص جس نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور لڑا اور وہ شخص جس نے فتح کے بعد خرچ کیا اور لڑا، پس اخیر ٹکڑا اس کے ظہور کے سبب سے حذف کیا گیا اور اس لیے کہ بعد کا کلام اس پر دال ہے، یعنی ﴿ اُولٰٓىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً ﴾ حذف ماننے کی وجہ یہ ہے کہ استواء کا فعل دو شے کے درمیان میں ہوتا ہے اور دو کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

نفقہ وقتال فتح سے پہلے اس لیے افضل ہے فتح کے بعد نفقہ وقتال سے کہ اس وقت لوگوں کی حاجت زیادہ تھی اور وہ قلیل تعداد میں اور ضعیف تھے اور اس وقت کے مومنین صدیقین تھے۔ انفاق کو قتال سے پہلے اس لیے ذکر کیا کہ اس کی فضیلت ظاہر ہو، اس لیے کہ وہ محتاجی کے حال پر تھے چنانچہ وہ اپنے نفوس کے ساتھ جود (سخاوت) کرتے تھے اموال نہیں پاتے تھے جن کے ساتھ جود کریں اور قتال کا انفاق پر عطف کیا یہ بات بتانے کے لیے کہ وہ زیادہ ترمہم مواد انفاق ہے، باوجود اس کے کہ فی نفسہٖ افضل عبادات میں سے ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے: وَالْجُوْدُ بِالنَّفْسِ أَقْصَى غَايَةِ الْجُوْدِ.

غرض یہ کہ فتح سے پہلے کا انفاق اور قتال فتح کے بعد کے انفاق اور قتال سے افضل ہے، اس لیے کہ فتح کے بعد تو اسلام کا ظہور اور غلبۂ عظیم ہوا، لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگے، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً ﴾۔ (﴿ اُولٰٓىِٕكَ ﴾ ﴿ مِنْ ﴾ کی طرف اشارہ ہے باعتبار معنی اور مبتداء ہے اس کی خبر ﴿ اَعْظَمُ دَرَجَةً ﴾ ہے۔ فتح)

یعنی فتح سے پہلے خرچ اور قتال کرنے والے درجے میں بڑے ہیں اور قدر و منزلت میں بلند ہیں اور رتبے میں اعلیٰ ہیں ان لوگوں سے جنھوں نے فتح کے بعد اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کیے اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ہو کر لڑے۔ فتح سے مراد فتحِ مکہ ہے۔ جمہور اور اکثر مفسرین اسی کے قائل ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو قسم کے قتال تھے، ایک دوسرے سے افضل تھا اور دو طرح کے نفقے تھے ایک دوسرے سے افضل تھا۔ فتحِ مکہ سے پہلے کا قتال اور نفقہ اس سے بعد کے قتال اور نفقہ سے بہتر اور افضل تھا۔ اسی طرح امام مقاتل رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی کہا ہے۔[1]

امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت کے درجے ایک دوسرے سے افضل ہیں، چنانچہ جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا، وہ ان کے افضل درجے میں ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اس لیے کہ پہلے لوگوں کو اس سے زیادہ مشقت

---

(1) تفسير الطبري (١٧٤/٢٣) فتح القدير (٢٢٣/٥)

پہنچی جو ان سے بعد والوں کو پہنچی اور ان کی بصیرتیں بھی زیادہ تر نافذ تھیں (اور خود نبی کریم ﷺ نے اس فضیلت کی طرف یوں ارشاد فرمایا ہے اس حدیث میں جو آپ سے صحیح ہوئی ہے:« لَوْ أَنْفَقَ أَحَدُكُمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ »[1] اور یہ خطاب آپ نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو کیا ہے جو صحبت میں بعد میں آئے تھے، چنانچہ اس کی طرف وہ سبب ارشاد کرتا ہے جس میں یہ حدیث شریف وارد ہوئی ہے۔[2] كما في الفتح) امام شعبی اور زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ راجح یہی ہے۔[3] (كما قاله الكرخي) اور قتال کا ذکر استطراد کے لیے ہے۔

اس قول کی دلیل وہ حدیث ہے جو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ اور عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ گفتگو ہوئی تھی تو خالد رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم ہم پر استطالت کرتے ہو (یعنی ہم کو حقیر جانتے ہو اور ہم پر ترفع اور تکبر کرتے ہو) ان ایام کے سبب سے جن سے تم ہم سے سبقت لے گئے ہو، چنانچہ ہم کو یہ بات پہنچی کہ اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: میرے واسطے میرے اصحاب کو چھوڑ دو، چنانچہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم اُحد کی مثل یا جبال کی مثل سونا خرچ کرتے تو ان کے اعمال کو نہ پہنچتے۔[4] (أخرجه الإمام أحمد)

یہ بات معلوم ہے کہ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ جن سے اس خطاب کا مواجہہ کیا گیا، ان کا اسلام صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان تھا اور ان دونوں کے درمیان یہ جھگڑا بنی جذیمہ میں تھا جن کی طرف آپ ﷺ نے خالد رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا، فتح کے بعد۔ چنانچہ وہ "صَبَأْنَا صَبَأْنَا" کہنے لگے تو اچھی طرح "أَسْلَمْنَا" نہیں کہتے تھے تو خالد نے ان کے قتل کا حکم دیا اور جو اُن میں قید ہوئے تھے ان کو قتل کیا تو عبدالرحمان بن عوف اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہما نے ان کی مخالفت کی، پھر سیدنا خالد اور عبدالرحمان رضی اللہ عنہما اس کے سبب سے جھگڑے۔[5] صحیح میں جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے اصحاب کو گالی مت دو۔ « فَوَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ أَنْفَقَ أَحَدُكُمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ »[6] (أخرج هذا الحديث البخاري ومسلم وغيرهما من حديث أبي سعيد الخدري رضي الله عنه كما في فتح البيان)

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حدیبیہ کے سال ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نکلے، یہاں تک کہ ہم عسفان میں آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: قریب ہے کہ ایک قوم آئے گی جن کے اعمال کے سامنے تم اپنے اعمال کو حقیر جانو گے، چنانچہ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ کیا وہ قریش ہیں؟ فرمایا: نہیں، لیکن وہ اہلِ یمن ہیں، وہ

---

[1] صحيح البخاري (٣٤٧٠) صحيح مسلم (٢٥٤٠)
[2] فتح القدير (٥/٢٢٣، ٢٢٤)
[3] تفسير القرطبي (١٧/٢٣٩)
[4] مسند أحمد (٣/٢٦٦) السلسلة الصحيحة (١٩٢٣)
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٨٤)
[6] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

ازروئے افئدہ (دل) اور قلوب بہت نازک اور نرم ہیں۔ پھر ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا وہ ہم سے بہتر ہیں؟ فرمایا: اگر ان میں سے کسی کے پاس ایک پہاڑ سونے کا ہوتا، پھر وہ اس کو خرچ کر دیتا تو وہ تمھارے ایک مد یا اس کے نصف کو نہ پاتا۔ خبردار! بے شک یہ فاصلہ ہے ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان: ﴿ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ﴾[1] (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم و ابن مردويه و أبو نعيم كما في فتح البيان)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس اسناد سے غریب ہے (مطبوعہ مصر میں اسناد کے بجائے سیاق ہے)۔ اور جو صحیحین میں جماعت کی روایت سے ہے وہ یہ ہے: "عن عطاء بن يسار عن أبي سعيد" خوارج کا ذکر کیا کہ حقیر جانو گے تم اپنی نماز کو ان کی نماز کے ساتھ اور اپنی روزی کو ان کی روزی کے ساتھ، وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔[2] الحدیث۔ لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بوجہ دیگر اس حدیث کو سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اس میں حدیبیہ کا ذکر نہیں ہے۔ (فإن كان ذاك محفوظا كما تقدم فيحتمل أنه أنزل قبل الفتح إخبارا عما بعده كما في قوله تعالىٰ في سورة المزمل وهي مكية من أوائل ما نزل ﴿ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ﴾ [المزمل: ٢٠] فهي بشارة بما يستقبل و هكذا هذه والله أعلم.[3] كذا في ابن كثير)۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی مت دو، البتہ ان میں کسی کا گھڑی بھر کا قیام بہتر ہے تم میں سے کسی کے عمر بھر کے عمل سے۔[4] (أخرجه ابن أبي شيبة)

پھر فضیلت کے ذکر کے بعد فرمایا: ﴿ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ﴾ ("أَيْ: كُلُّ وَاحِدٍ مِنَ الْفَرِيقَيْنِ وَعَدَ اللّٰهُ الْمَثُوبَةَ الْحُسْنَى وَهِيَ الْجَنَّةُ مَعَ تَفَاوُتِ دَرَجَاتِهِمْ فِيهَا" جمہور نے ﴿ كُلًّا ﴾ پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مفعول بہ مقدم ہے اور ابن عامر نے بہ رفع پڑھا ہے، بنا بر ابتداء اور جملہ ما بعد اس کی خبر اور عائد محذوف، یا اس بنا پر کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ اسی کے مثل یہ شعر ہے:

قد أصبحت أم الخيار تدعي علي ذنبا كله لم أصنع[5])

یعنی اللہ نے ہر ایک خرچ کرنے والے کو، خواہ وہ فتح سے پہلے کا ہو یا بعد کا، نیک ثواب کا وعدہ دیا ہے۔

سب کے لیے ثواب ہے اس کام پر جو انھوں نے کیا، گو ان کی جزا میں فضیلت کے لحاظ سے فرق ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ

---

[1] تفسير الطبري (١٧٥/٢٣، ١٧٦) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٣٦/١٠) فتح البيان (٤٠٢/١٣، ٤٠٣)

[2] صحيح البخاري (٦٥٣٢) صحيح مسلم (١٠٦٤)

[3] تفسير ابن كثير (٣٩١/٤)

[4] مصنف ابن أبي شيبة (٤٠٥/٦)

[5] فتح القدير (٢٢٤/٥)

الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٩٥] ''اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مومن اور بغیر عذر کے بیٹھ رہنے والے مومن برابر نہیں، اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے درجوں میں بہت فضیلت دے رکھی ہے۔''

اسی طرح وہ حدیث ہے جو صحیح میں ہے کہ قوی مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضعیف مومن سے زیادہ بہتر اور محبوب ہے اور ہر ایک میں خیر ہے۔[1] اس سے صرف اس لیے آگاہ فرمایا کہ پہلی جانب کی تعریف کرنے کی وجہ سے دوسری جانب بے کار نہ کر دی جائے اور کوئی وہم کرنے والا اس کی مذمت کا وہم نہ کرے، اسی لیے دوسرے کا اس پر عطف کیا اور اس کی تعریف کی اس کے ساتھ کہ اس کے پہلے کو اس پر فضیلت دی۔ اسی لیے اللہ پاک نے یوں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ یعنی اللہ کو تمھارے کاموں کی خبر ہے، چنانچہ اس نے اپنے باخبر ہونے کی وجہ سے فریقین کے ثواب میں فرق رکھا ہے اور یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ پہلی جانب والوں کے دلی ارادے اور مکمل اخلاص کو اور ان کے انتہائی شدت، قلت اور تنگی کی حالت میں خرچ کرنے کو جانتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ سبقت کر گیا ایک درہم ایک لاکھ پر۔[2] کسی نے کہا کہ یہ آیت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی، اس لیے کہ پہلے یہی ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور کفار سے جھگڑے، یہاں تک کہ ان پر سخت مار پڑی، یہاں تک کہ مرنے کے قریب ہوگئے۔[3] (كذا في البيضاوي على ما نقله الجمل)۔ اس میں ان کی فضیلت اور سب سے آگے ہونے کی دلیل ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بے شک اہلِ ایمان کے نزدیک اس آیت میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے وافر حصہ ہے، اس لیے کہ وہ ان لوگوں کے سردار ہیں جنھوں نے سارے انبیاء کی امتوں میں سے اس حکم پر عمل کیا، کیوں کہ انھوں نے اپنا سارا مال اللہ عزوجل کی خوشنودی کی خاطر خرچ کیا اور کسی کا ان پر کوئی احسان نہ تھا کہ اسے اس کا بدلہ دیں۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تھا اور آپ کے پاس سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور ان پر ایک عبا تھا جس کو اپنے سینے میں خلال سے جمع کر لیا تھا (یعنی لکڑی کی خلال یا لوہے کی۔ واللّٰه أعلم)۔ چنانچہ جبریل علیہ السلام نازل ہوئے تو کہا: مجھے کیا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کہ اس پر ایک عبا ہے جس کو اپنے سینے میں خلال سے جمع کر لیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے فتح سے قبل اپنا سارا مال مجھ پر خرچ کر ڈالا۔ کہا: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس پر سلام پڑھ اور اس سے کہہ: کیا تو اپنے اس فقر میں مجھ سے راضی ہے یا ناخوش ہے؟ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو بکر! بے شک اللہ تجھ پر سلام پڑھتا ہے اور تجھ سے فرماتا ہے: کیا تو اپنے اس فقر میں مجھ سے راضی ہے یا ناخوش

[1] صحیح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٤) [2] سنن النسائي الكبرىٰ (٢٥٢٧) [3] تفسير البيضاوي (٢٩٨/٥)

ہے؟ تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: بھلا میں اپنے رب عزوجل سے خفا ہوں گا؟ بے شک میں اپنے رب سے راضی ہوں۔ یہ حدیث اس وجہ سے ضعیف الاسناد ہے۔[1] واللّٰہ أعلم.

صدقے کی ترغیب:

پھر اللہ پاک نے صدقے میں رغبت دلائی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ ﴾ یعنی کون ہے وہ جو خرچ کرے اپنا مال اللہ کی راہ میں، کیوں کہ وہ اس شخص کی طرح ہے جو اس کو قرض دیتا ہے۔ (﴿ مَنْ ﴾ استفہامیہ مرفوعۃ المحل ہے بنا بر ابتداء اور ﴿ ذَا ﴾ اس کی خبر اور موصول اس کی صفت یا اس سے بدل ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ﴿ مَنْ ذَا ﴾ مبتداء ہو اور موصول اس کی خبر۔[2] كذا في الفتح)۔ ہر شخص جو کوئی فعلِ حسن کرے تو عرب اس کے لیے بولتے ہیں: "قَدْ أَقْرَضَ"۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر انتہائی لطف واحسان مَیں ہے اس لحاظ سے کہ اس نے ہم کو اموال عطا کیے اور اُن اموال کا ہم سے اپنی طرف رجوع ہونا قرض ٹھہرایا، باوجود اس کے کہ حقیقی مالک وہی ہے۔

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ سے یہ مراد ہے کہ صدقہ دے اس حال میں کہ طلب کرنے والا ہو اجر کا بغیر احسان رکھنے کے اور بغیر ایذا دینے کے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: حسن یہ ہے کہ اس سے اس کا جی خوش ہو۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: قرضِ حسن یہ ہے کہ اپنے اہل، یعنی گھر والوں پر خرچ کرے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تطوع عبادات ہے،[3] یعنی فرض عبادات سے زیادہ عبادات کرنا۔ کسی نے کہا ہے کہ عملِ خیر ہے۔ عرب لوگ بولتے ہیں: "لِيْ عِنْدَ فُلَانٍ قَرْضُ صِدْقٍ وَقَرْضُ سُوْءٍ"۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔[4]

بالجملہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے لفظ قرض استعارہ کیا گیا ہے، تا کہ جزا کو لازم کرنے پر دال ہو۔ اس میں اس لحاظ سے استعارہ تصریحیہ تبعیہ ہے کہ خرچ کرنے کی تشبیہ قرض دینے سے دی اور جامع عطا کرنا شے کا ہے بعوض۔ یا یوں کہو کہ اس خرچ کرنے کا نام رکھا اللہ کو قرض دینا قرض سے تشبیہ دے کر، اس لحاظ سے کہ اللہ پاک نے اس کے عوض میں جنت کا وعدہ دیا ہے۔ یا یوں کہو کہ اس کا نام قرض اس لیے رکھا کہ قرض مال کا اس کے بدل کے عوض نکالنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کون ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے، یہاں تک کہ اللہ اس کو کئی گنا زیادہ بدلہ دے، یعنی اس کو اس کے خرچ کرنے کا اجر اپنے فضل سے کئی گنا زیادہ کر کے عطا کرے۔ اس آیت کی تفسیر سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔[5]

﴿ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴾ یعنی اور خرچ کرنے والے کے لیے باوجود اس کو کئی گنا زیادہ بدلہ دینے کے اجرِ کریم ہے، یعنی جنت ہے۔ اس جگہ مضاعفت سے مراد یہ ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ملے گا،

---

[1] تفسير البغوي (٣٤/٨) تفسير ابن كثير (٣٩٢/٤) اس کی سند میں "علاء بن عمرو" ضعیف راوی ہے۔ [2] فتح البيان (٤٠٣/١٣)

[3] تفسير القرطبي (٢٤٢/١٧) [4] تفسير ابن كثير (٣٩٢/٤) [5] رقم الآية (٢٤٥)

احوال و اشخاص و اوقات کے مختلف ہونے کی بنا پر بدلہ بھی مختلف ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے لیے مضاعفت کے باوجود اور زیادہ اجر ہے، مضاعفت پر سات سو گنے تک۔ اس زائد کا اندازہ اللہ ہی جانتا ہے، چنانچہ یہ سورۃ البقرہ کی ان دو آیتوں کی طرح ہے: ﴿ فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ﴾[البقرة: ٢٤٥] ''پس اللہ اسے بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے گا۔''
نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾[البقرة: ٢٦١] ''اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بڑھا چڑھا کر دے۔''

ابن عامر و ابن کثیر رحمہ اللہ نے ﴿ فَيُضَعِّفَهٗ ﴾ بہ رفعِ فاء پڑھا ہے باب تفعیل سے اور ابن عامر و یعقوب رحمہما اللہ نے بہ نصبِ ''فَاء'' پڑھا ہے اور امام نافع، اہلِ کوفہ اور بصرہ نے ﴿ فَيُضٰعِفَهٗ ﴾ بہ رفعِ ''فَاء'' پڑھا ہے باب مفاعلہ سے اور عاصم نے بہ نصبِ ''فَاء'' پڑھا ہے۔ یہ چار قراءتیں ہیں اور سب سبعیہ ہیں (امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفع تو ﴿ يُقْرِضُ ﴾ پر عطف کی بنا پر ہے، یا بنا بر استیناف ہے اور نصب اس بنا پر ہے کہ استفہام کے جواب میں مضارع معہ حرفِ ''فَاء'' ہے۔ امام ابوعلی فارسی نے نصب کی تضعیف کی ہے،[1] لیکن نصب والوں نے اس کو معنی پر محمول کیا ہے۔ گویا یوں کہا: ''يقرض الله أحد فيضاعفه له'')۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ قرض حسن نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس میں دس اوصاف جمع ہوں: ① مال حلال سے ہو۔ ② بہترین مال میں سے ہو۔ ③ اس کو صدقہ کرے اس حال میں کہ خود اس کا محتاج ہو۔ ④ اپنا صدقہ اس کو دے جو سب سے بڑھ کر اس کا حاجت مند ہو۔ ⑤ صدقے کو جہاں تک ہو سکے چھپائے۔ ⑥ صدقہ دینے پر احسان نہ جتلائے اور ایذا نہ دے۔ ⑦ اس سے مقصود اللہ پاک کی ذات ہو، لوگوں کے دکھانے کے لیے نہ ہو۔ ⑧ جو مال دیتا ہے اس کو حقیر سمجھے خواہ وہ کثیر ہو۔ ⑨ اپنے محبوب تر مال میں سے ہو۔ ⑩ اپنے نفس کی عزت اور فقیر کی ذلت خیال نہ کرے۔ چنانچہ یہ دس باتیں جب صدقے میں جمع ہوں تب کہیں وہ قرضِ حسن ہوتا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے مذکورہ اقوال میں سے دو قول ذکر کر کے (یعنی اہل پر خرچ کرنا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول) پھر کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ قرضِ حسن اس سے عام تر ہے۔ چنانچہ جس کسی نے اللہ کی راہ میں خالص نیت اور سچے عزم کے ساتھ خرچ کیا تو وہ یقیناً اس آیت کے عموم میں داخل ہوا، اسی لیے اللہ پاک نے ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ ﴾ فرمایا: جیسا کہ دوسری آیت میں ﴿ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ﴾[البقرة: ٢٤٥] فرمایا ہے۔
﴿ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴾ ''أَيْ: جَزَاءٌ جَمِيْلٌ وَرِزْقٌ بَاهِرٌ'' یعنی جنت جو قیامت کے دن ملے گی۔[2] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ ... ﴾ تو سیدنا ابوالدحداح انصاری رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اور بے شک اللہ تعالیٰ ہم سے قرض کا ارادہ کرتا ہے؟ فرمایا: ہاں اے ابوالدحداح! عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے اپنا ہاتھ دکھائیں، کہا: پھر آپ ﷺ نے

[1] فتح القدير (٢٢٤/٥) [2] تفسير ابن كثير (٣٩٢/٤)

اپنا ہاتھ اس کو دیا تو کہا: بے شک میں نے اپنے رب کو اپنا باغ واقعی قرض دے دیا۔

ان کا ایک باغ تھا، اس میں چھ سو کھجور کے درخت تھے اور اس میں ام الدحداح رضی اللہ عنہا اور اس کے اہل و عیال تھے۔ کہا: پھر سیدنا ابو الدحداح رضی اللہ عنہ آئے اور اپنی بی بی کو پکارا: او ام الدحداح! اس نے کہا: "لَبَّیْکَ"، یعنی میں حاضر ہوں۔ کہا: تو اس باغ میں سے نکل جا میں نے اسے اپنے رب عزوجل کو قرض دے دیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ام الدحداح رضی اللہ عنہا نے اس سے کہا: "رَبِحَ بَيْعُكَ يَا أَبَا الدَّحْدَاحِ"، یعنی او ابو الدحداح! تیری بیع سود مند ہوگئی اور اپنا سامان اور بچے اٹھا کر وہاں سے نکل گئی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كَمْ مِنْ عَذْقٍ ("عذق" بہ فتح عین بہ معنی درختِ خرما اور بہ کسرِ عین بہ معنی خوشۂ خرما کما في الصراح) وَدَّاحٍ ("أودحت الإبل: سمنت وحسنت حالها" والله اعلم یہاں یہی معنی مراد ہیں یا اور کچھ) فِي الْجَنَّةِ لِأَبِي الدَّحْدَاحِ» یعنی بہت سے موٹے اور حسین کھجور کے درخت جنت میں ابو الدحداح کے لیے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے: «رُبَّ نَخْلَةٍ مَدْلَاةٍ عُرُوقُهَا دُرٌّ وَيَاقُوتٌ لِأَبِي الدَّحْدَاحِ فِي الْجَنَّةِ»[1] یعنی بہت سے کھجور کے درخت جن کے عروق لٹکتے ہوئے موتی اور یاقوت جنت میں وہ ابو الدحداح کے لیے ہیں۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُورُهُمْ بَيْنَ
أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يَقُولُ
الْمُنٰفِقُونَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِينَ اٰمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ
نُورِكُمْ ۚ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا ۖ فَضُرِبَ
بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ ۖ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ
مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ قَالُوا بَلٰى
وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ
الْأَمَانِيُّ حَتّٰى جَاءَ أَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُورُ ﴿۱۴﴾
فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِينَ
كَفَرُوا ۚ مَأْوٰىكُمُ النَّارُ ۖ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۖ وَبِئْسَ
الْمَصِيرُ ﴿۱۵﴾

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۳۸، ۳۳۳۹)

اس دن آپ ایمان والوں اور ایمان والیوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑتا ہوگا۔ (کہا جائے گا:) آج تمھیں ایسے باغات کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے⑫ اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے، کہیں گے: تم ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمھارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں۔ (ان سے) کہا جائے گا: اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ، پھر نور تلاش کرو۔ تب ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا، اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہوگا⑬ وہ (منافق) ان (مومنوں) کو پکاریں گے: کیا ہم (دنیا میں) تمھارے ساتھ نہیں تھے؟ وہ کہیں گے (ہاں) کیوں نہیں! لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں ڈال لیا تھا، اور تم نے (اہلِ ایمان کی بابت گردشِ زمانہ کا) انتظار کیا، اور تم نے شک کیا۔ اور تمھیں (جھوٹی) خواہشوں نے فریب دیا، حتی کہ اللہ کا حکم آپہنچا، اور تمھیں دھوکے باز (شیطان) نے اللہ کی بابت دھوکا دیا⑭ لہٰذا آج تم سے کوئی فدیہ نہ لیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تمھارا ٹھکانا آگ ہے، یہی تمھارے لیے زیادہ موزوں ہے اور وہ لوٹ جانے کی بہت بری جگہ ہے⑮

مومنوں کو اعمال کے مطابق روزِ قیامت ملنے والا نور:

جس وقت پل صراط پر چلنا ہے سخت اندھیرا ہوگا، اپنے ایمان کی روشنی ساتھ ہے آگے کی طرف اور داہنی طرف۔ نیک عمل داہنی طرف جمع ہوتے ہیں۔ پل صراط پر کافر نہ چلیں گے وہ پہلے ہی دوزخ میں پڑیں گے۔ جو کسی نبی کی امت ہیں سچے یا کچے وہ پل صراط پر چلیں گے جب اندھیرا گہرا ہوگا، ایمان والوں کے ساتھ روشنی ہوگی، منافق ان کی روشنی میں چلنے کی کوشش کریں گے، مگر وہ جلدی آگے نکل جائیں گے، یہ پیچھے رہ جائیں گے اور پکاریں گے کہ ہمیں بھی روشنی دو۔ کسی نے کہا کہ پیچھے سے روشنی لاؤ وہ پیچھے ہٹیں گے تو ان کے درمیان دیوار حائل ہوگی، یعنی روشنی دنیا میں کمائی جاتی ہے، وہ جگہ پیچھے چھوڑ آئے۔ انتھیٰ.

کلمۂ ﴿ يَوْمَ ﴾ میں عامل "اُذْكُرْ" مقدر ہے تو اس کا مفعول ہوگا، یا "يؤجرون" ہے جو اجر سے سمجھ میں آتا ہے، یا ﴿ يَسْعٰى ﴾ ہے، یا ﴿ فَيُضٰعِفَهٗ ﴾ ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] (یا کلمۂ ﴿ كَرِيْمٌ ﴾ ہے، یا وہ ہے جو ﴿ لَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴾ میں عامل ہے، یعنی استقرار "أي: استقر له أجر كريم"۔ ﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

---

① التبيان في إعراب القرآن (٢/١٢٠٧، ١٢٠٨)

ان سب وجوہ میں یوم اپنی اصل پر ظرف ہے)۔ ﴿ تَرَى ﴾ رویتِ بصری سے ہے اور ہر اس شخص کو خطاب ہے جو رویت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ﴿ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ ﴾ حال ہے مفعول ﴿ تَرَى ﴾ سے (اس لیے کہ رویتِ بصری ہے)۔ جبکہ اس کو ﴿ يَوْمَ ﴾ میں عامل نہ ٹھہرائیں۔

﴿ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ ﴾ ظرف ہے ﴿ يَسْعٰى ﴾ کا اور ﴿ نُوْرُهُمْ ﴾ سے حال بھی ہو سکتا ہے۔ جمہور نے ﴿ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ کو بہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے جمع "یمین" ہے بہ معنی دایاں ہاتھ۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ حرفِ باء بہ معنی "في" ہے: "أَيْ: فِيْ جِهَةِ أَيْمَانِهِمْ" کسی نے کہا: بہ معنی "عن" ہے: "أَيْ: عَنْ جَمِيْعِ جِهَاتِهِمْ"۔ "أیمان" کا ذکر خاص کر کے صرف اس لیے کیا کہ "أیمان" اشرف جہات ہے اور مراد ساری سمتیں ہیں، بعض کے ساتھ کل سے تعبیر کی ہے۔ کسی نے (یعنی سہل بن سعد ساعدی۔ (كذا في فتح القدير وفي الجمل سهل بن شعيب والله أعلم) اور امام ابو حیوہ رحمہ اللہ نے) بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ مراد ایمان کفر کی ضد ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ مراد قرآن ہے اور یہ مصدر معطوف ہے ماقبل کے ظرف پر اور حرفِ باء سببیہ ہے: "أَيْ: يَسْعَى نُوْرُهُمْ كَائِنًا بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَكَائِنًا بِأَيْمَانِهِمْ"۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "وَبِأَيْمَانِهِمْ اِسْتَحَقُّوْهُ أَوْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يُقَالُ: لَهُمْ بُشْرَاكُمْ"[2]

بالجملہ نور وہ روشنی ہے جو اُن کے آگے اور داہنے دکھائی دے گی، مراد توحید اور اطاعت کا نور ہے۔ یعنی ذکر کر اس دن کا جس میں تو مومنین و مومنات کو اس حال میں دیکھے کہ وہ دوڑ رہے ہیں، یا چل رہے ہیں اور روشنی ان کے آگے اور دائیں طرف ہو گی۔ یہ قیامت کے دن پل صراط پر ہو گا اور یہ روشنی جنت کی طرف ان کی رہبر ہو گی۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین اور متصدقین کی خبر دیتا ہے کہ قیامت کے دن ان کی روشنی عرصاتِ قیامت میں ان کے آگے دوڑ رہی ہے، ان کے اعمال کے مطابق جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ وہ صراط پر اپنے اعمال کے اندازے پر گزریں گے، ان میں سے وہ ہے جس کا نور پہاڑ کی طرح ہے اور ان میں سے وہ ہے جس کا نور کھجور کے درخت کی طرح ہے اور اُن میں سے وہ ہے جس کا نور مردِ قائم کی طرح ہے اور اُن میں سے سب سے کم نور اس کا ہے جس کا نور اس کی نرانگشت (پاؤں کے انگوٹھے) میں ہے، کبھی تو روشن ہوتا ہے اور کبھی بجھ جاتا ہے۔[3] (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے کہ مومنوں میں سے وہ ہے جس کا نور مدینے سے عدن ابین اور صنعاء تک روشن ہو گا، پھر اس سے کم یہاں تک کہ مومنوں میں سے وہ ہے جس کا نور اس کے دونوں قدموں کی جگہ روشن ہو گا۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ کی ایک روایت یہ ہے: «إِنَّ الْمُؤْمِنَ يُضِيْءُ لَهُ نُوْرٌ كَمَا

---

(1) فتح القدير (٢٢٥/٥)
(2) التبيان في إعراب القرآن (١٢٠٨/٢)
(3) تفسير الطبري (١٧٩/٢٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٣٦)
(4) تفسير الطبري (١٧٨/٢٣)

بَيْنَ عَدَنٍ إِلَى صَنْعَاءَ حَتَّى إِنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ مَنْ لَا يُضِيءُ لَهُ نُورُهُ إِلَّا مَوْضِعَ قَدَمَيْهِ » امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا اور ان کے سیدھے ہاتھوں میں ان کی کتابیں، یعنی نامۂ اعمال ہوں گے جو ان کو دیے جائیں گے، تو ان کی کتابیں تو داہنے ہاتھوں میں ہوں گی اور ان کا نور ان کے آگے ہوگا۔[1] یہ بھی امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ نُوْرُهُمْ ﴾ "هُدَاهُمْ"، ﴿ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ "كُتُبُهُمْ"۔ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے،[2] یعنی ان کا ایمان اور عملِ صالح ان کے آگے دوڑے گا اور ان کے داہنے ہاتھوں میں ان کے اعمال کی کتابیں ہوں گی۔

امام ضحاک رحمہ اللہ کی تیسری روایت یہ ہے کہ نہیں ہے کوئی مگر وہ قیامت کے دن نور دیا جائے گا، پھر جب وہ صراط کے پاس پہنچیں گے تو منافقوں کا نور بجھ جائے گا، پھر جب مومن یہ دیکھیں گے تو ڈریں گے کہ کہیں ان کا نور نہ بجھ جائے، جیسا کہ منافقوں کا بجھ گیا تو کہیں گے: ﴿ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا ﴾ [التحريم: ٨] "اے ہمارے رب ہمیں کامل نور عطا فرما۔" امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ان کا نور ان کے آگے دوڑے گا، یعنی صراط پر۔ جنادہ بن ابی امیہ نے کہا: "قال سفيان الثوري عن حصين عن مجاهد" بے شک تم لکھے ہوئے ہو اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے ناموں اور علامات کے ساتھ اور اپنے حلیوں اور اپنی سرگوشیوں اور مجلسوں کے ساتھ۔ پھر جب قیامت کا دن ہوگا تو کہا جائے گا: اے فلاں یہ تیرا نور ہے اور اے فلاں تیرے لیے نور نہیں ہے اور ﴿ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ ﴾ الآية. پڑھی۔[3]

سیدنا ابو الدرداء اور ابو ذر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خبر دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جس کو قیامت کے دن سجدہ کرنے کا اذن دیا جائے گا اور سب سے پہلا شخص ہوں گا جس کو اپنا سر اٹھانے کا اذن دیا جائے گا، چنانچہ میں نظر کروں گا اس کی طرف جو میرے آگے ہے اور میرے پیچھے ہے اور میری داہنی طرف ہے اور میری بائیں طرف ہے، پھر میں اپنی امت کو دوسری اُمتوں میں سے پہچان لوں گا۔ ایک شخص نے آپ سے عرض کی: اے نبی اللہ! آپ اپنی امت کو کیسے پہچانیں گے، نوح علیہ السلام سے لے کر آپ کی امت تک کی امتوں میں سے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان کو پہچان لوں گا، وہ وضو کے اثر سے محجلون ہوں گے اور دوسری امتوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا۔ وہ اپنے اعمال نامے اپنے داہنے ہاتھوں میں دیے جائیں گے اور میں ان کو ان کے چہروں کی علامت سے پہچانوں گا اور میں ان کو ان کے نور سے پہچانوں گا جو "يَسْعٰى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ"[4] (أخرجه ابن أبي حاتم) امام ضحاک رحمہ اللہ نے ﴿ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ کی تفسیر میں کہا: "أَيْ: وَبِأَيْمَانِهِمْ كُتُبُهُمْ"[5] جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴾ [بني إسرائيل: ٧١] "پھر جن کا بھی اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دے دیا گیا۔"

---

① فتح القدير (٥/٢٢٥) ② تفسير الطبري (١٧٩/٢٣) ③ تفسير ابن كثير (٣٩٣/٤)

④ تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٣٦، ٣٣٣٣٧) اس کی سند میں "سعد بن مسعود" مجہول اور "ابوعبیداللہ ابن اخی ابن وھب" ضعیف راوی ہے۔

⑤ تفسير الطبري (١٧٩/٢٣)

قولہ تعالیٰ: ﴿ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ ﴾ ﴿ بُشْرٰىكُمُ ﴾ مبتداء ہے ﴿ جَنّٰتٌ ﴾ خبر ہے بنا بر حذف مضاف: "أَيْ: دُخُولُ جَنَّاتٍ" اس لیے کہ بشارت کا وقوع اُحداث پر ہوتا ہے جثوں پر نہیں ہوتا اور جملہ قولِ مقدر کا مقولہ ہے: "أَيْ: يُقَالُ لَهُمْ" اور قائل وہ فرشتے ہیں جو اُن کو لینے آئیں گے (مکی نے کہا: فراء نے نصب ﴿ جَنّٰتٌ ﴾ کا جائز رکھا ہے، بنا بر حال اور ﴿ اَلْيَوْمَ ﴾ خبر ہے ﴿ بُشْرٰىكُمُ ﴾ کی، یہ قول نہایت درجہ بعید ہے۔[1] كما في الفتح)۔

﴿ خٰلِدِيْنَ ﴾ حالِ مقدرہ ہے ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ نور و بشارتِ جناتِ مخلدہ کی طرف ہے، یہ اس صورت میں ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ اللہ پاک کا قول ٹھہرایا جائے، مقولۂ ملائکہ کے جملے سے قرار نہ دیا جائے اور جب اس کے جملے سے ہوگا تو اس وقت جنت کی طرف اشارہ ٹھہرے گا۔ جنت کو مذکور کی تاویل میں کہیں گے، یا اس لیے کہ جنت کامیابی ہے۔ (كما ذكره الكرخي)۔ اور ﴿ اَلْيَوْمَ ﴾ سے مراد جمیع زمانۂ مستقبل ہے، معنی یہ ہیں کہ فرشتے ان سے کہیں گے: تم کو سارے زمانۂ آئندہ میں بڑی بشارت ہے باغوں میں داخل ہونے کی جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس حال میں کہ تمھارا وہاں ہمیشہ رہنا مقدر کیا گیا ہے، یہ وہی بڑی کامیابی ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ اس کے سوا کوئی کامیابی نہیں اور نہ اس کے ماسوا کا کچھ اعتبار اور شمار ہے۔ پھر قیامت کے دن عرصات میں جو بے چین کرنے والی ہولناکیاں اور بڑے بڑے زلزلے اور سخت امور ہوں گے ان سے اس وقت وہی نجات پائے گا جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لایا اور اس کے اوامر پر عمل کیا اور نواہی سے بچا رہا۔

اللہ پاک نے اس کی خبر دی اور فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ﴾۔ کلمۂ ﴿ يَوْمَ ﴾ یا تو بدل ہے ﴿ يَوْمَ ﴾ اول سے یا "أُذْكُرْ" مقدر کا معمول ہے، یا اس میں ﴿ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ عامل ہے۔ گویا یوں کہا ہے کہ مومنین اور مومنات اس دن رحمت کے ساتھ کامیاب ہوں گے جس دن منافقوں کو ایسے ایسے امور پیش آئیں گے، اس لیے کہ آدمی کا اپنے دشمن کی پستی کے دن بلند ہونا زیادہ نمایاں اور عظیم ہوتا ہے۔ حرفِ لام اپنے نظائر کی طرح تبلیغ کا ہے۔

جمہور نے ﴿ اُنْظُرُوْنَا ﴾ کو بہ وصلِ ہمزہ وضمِ ظاء پڑھا ہے۔ نظر انتظار کے معنی سے مشتق ہے، یعنی منافق لوگ جب دیکھیں گے کہ مومنین کو جلد جنت کی طرف لے جا رہے ہیں تو ان سے کہیں گے: ہمارا انتظار کرو کہ ہم تمھارے نور سے روشنی لے لیں (اس لیے کہ مومن تو خالص نو عمر عمدہ اونٹنیوں پر ہوں گے تو منافق کہیں گے: ہمارا انتظار کرو ہم تو پیدل ہیں تم سے نہیں مل سکتے)۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں: "اُنْظُرُوْا إِلَيْنَا" یعنی تم ہماری طرف نظر کرو، اس لیے کہ جب مومنین ان کی طرف نظر کریں گے تو اپنے چہروں سے ان کی طرف متوجہ ہوں گے، چنانچہ وہ ان کے نور سے روشنی لیں گے، یہ معنی ﴿ نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ﴾ کے زیادہ مناسب ہیں، مگر امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ

---

[1] فتح القدير (٥/٢٢٦)

نظر بہ معنی "إِبْصَار" خود متعدی نہیں ہوتا مگر شعر میں۔ نثر میں صرف کلمۂ "إِلَى" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ امام اعمش رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی حمزہ و یحییٰ بن وثاب) نے بہ قطعِ ہمزہ و کسرِ ظاء پڑھا ہے ماخوذ "إنظار" سے۔[1] "إنظار" بہ معنی "إمهال" (مہلت) و "استنظار" بہ معنی "استمهال" آتا ہے: "أَيْ: أَمْهِلُوْنَا وَأَخِّرُوْنَا" یعنی تم ہمارے لیے ذرا ٹھہرو کہ ہم تم سے آ ملیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ "أَنْظِرْنِيْ" بہ معنی "اِنْتَظِرْنِيْ" عرب بولتے ہیں (اور عمرو بن کلثوم کا یہ شعر پڑھا ہے:

أبا هند فلا تعجل علينا　　وأنظرنا نخبرك اليقينا[2]

كما في الفتح)۔ چنانچہ اس بنا پر یہ قراءت اول کے معنی میں ہوگی۔ "قبس" بہ سکون اور "اقتباس" بہ معنی آتش گرفتن ہے اور "قبس" بہ تحریک پارۂ آتش ہے۔ (كذا في الصراح) اور "قبس" آگ و سراج کا شعلہ ہے۔

بالجملہ جب منافقوں نے یہ بات کہی تو کہا گیا: ﴿اِرْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا﴾۔ یہ بات ان سے مومنوں نے کہی یا فرشتوں نے جو اُن پر مقرر ہیں ان کو زجر کرنے اور ان سے ہنسنے کے لیے کہی کہ اس جگہ کی طرف لوٹ جاؤ، جہاں سے ہم نے نور لیا ہے اور وہاں سے اپنے لیے نور طلب کرو، کیوں کہ وہ تو وہاں سے لیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ دنیا کی طرف لوٹ جاؤ اور اس شے سے نور طلب کرو جس سے ہم نے طلب کیا، یعنی ایمان اور عملِ صالح۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے کے لیے نور سے مراد وہ ظلمت لی جو ان کے پیچھے ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس اثنا میں کہ لوگ ظلمت میں ہوں گے کہ ناگاہ اللہ تعالیٰ نور بھیجے گا۔ چنانچہ جب مومن لوگ نور دیکھیں گے تو اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور نور ان کا اللہ کی طرف سے دلیل ہوگا جنت کی طرف جانے کے لیے۔

پھر جب منافق لوگ مومنوں کو دیکھیں گے کہ وہ نور کی طرف چل دیے تو یہ بھی ان کے پیچھے چل دیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ منافقوں پر تاریکی کر دے گا تو اس وقت کہیں گے: ہمارا انتظار کرو، ہم تمھارے نور سے لے لیں، چنانچہ ہم تو دنیا میں تمھارے ساتھ تھے۔ مومنین کہیں گے: اپنے پیچھے لوٹ جاؤ جس ظلمت سے تم آئے ہو اور وہاں جا کر نور کو طلب کرو۔[3] (أخرجه ابن جرير وابن مردويه والبيهقي في البعث) ان کی دوسری روایت مرفوعاً یہ ہے کہ اللہ لوگوں کو قیامت کے دن ان کی ماؤں کے نام سے پکارے گا، اس کی طرف اپنے بندوں سے پردے کے طور پر، لیکن پل صراط کے پاس البتہ اللہ تعالیٰ ہر مومن کو نور عطا کرے گا اور ہر منافق کو، پھر جب وہ صراط پر چلنا شروع کریں گے، یعنی مستوی ہوں گے تو منافقین اور منافقات کا نور سلب کرے گا، چنانچہ منافق کہیں گے: ﴿اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ اور مومن کہیں گے: ﴿رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا﴾ [التحريم: ٨] "(اے) ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر۔" چنانچہ اس وقت کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔[4] (أخرجه الطبراني و ابن مردويه) اس بارے میں احادیث وآثار وارد ہوئے ہیں۔[5] (كذا في الفتح)

---

[1] البحر المحيط (٢٢٠/٨)　[2] فتح القدير (٢٢٦/٥)　[3] تفسير الطبري (١٨٢/٢٣)

[4] المعجم الكبير (١٢٢/١١) اس کی سند میں "اسحاق بن بشر" سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٣٤)

[5] فتح القدير (٢٢٨/٥)

سلیم بن عامر کہتے ہیں: ہم بابِ دمشق میں ایک جنازے پر نکلے اور ہمارے ساتھ ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ تھے، پھر جب جنازے پر نماز ہو چکی اور لوگ میت کو دفن کرنے لگے تو سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ بولے: لوگو! بے شک تم نے صبح کی اور شام کی ایک مقام پر اس میں تم حسنات اور سیئات کرتے ہو اور قریب ہو کہ اس سے کوچ کر جاؤ، ایک اور منزل کی طرف اور وہ یہ ہے، وہ قبر کی طرف اشارہ کر رہے تھے، تنہائی کا اور ظلمت کا گھر، کیڑوں اور تنگی کا گھر، مگر وہ جو اللہ وسیع کر دے، پھر تم اس سے قیامت کے دن مواطن کی طرف منتقل ہو گے (یعنی مقامات و جاہا کی طرف)۔ بے شک تم بعض ان مقامات میں ہو گے یہاں تک کہ لوگوں کو اللہ کی طرف سے ایک امر چھائے گا تو کتنے چہرے سفید ہو جائیں گے اور کتنے سیاہ پڑ جائیں گے۔

پھر تم اس سے ایک اور منزل کی طرف منتقل ہو گے تو لوگوں پر ایک سخت تاریکی چھا جائے گی، پھر نور بانٹا جائے گا تو مومن کو نور عطا کیا جائے گا اور کافر و منافق کو چھوڑ دیا جائے گا، انھیں کچھ عطا نہ کیا جائے گا اور یہ وہی مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے: ﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ [النور: ٤٠] ''یا مثل ان اندھیروں کے ہے جو نہایت گہرے سمندر کی تہ میں ہوں گے جسے اوپر تلے موجوں نے ڈھانپ رکھا ہو پھر اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں۔ الغرض اندھیریاں ہیں جو اوپر تلے پے در پے ہیں۔ جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی قریب ہے کہ نہ دیکھ سکے، اور (بات یہ ہے کہ) جسے اللہ تعالیٰ ہی نور نہ دے اس کے پاس کوئی روشنی نہیں ہوتی۔''

چنانچہ کافر اور منافق مومن کے نور سے روشنی حاصل نہ کرے گا جس طرح کہ نابینا بینا کی آنکھ سے روشنی حاصل نہیں کرتا۔ ﴿ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ﴾ یہ اللہ کا وہ خدعہ ہے جس سے منافقوں کو فریب دیا (یعنی فریب کی جزا دی) اس لیے کہ فرمایا ہے: ﴿ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ﴾ [النساء: ١٤٢] ''وہ چالبازیاں کر رہے ہیں اور وہ انھیں اس چالبازی کا بدلہ دینے والا ہے۔'' یعنی وہ اپنے خیال میں اللہ کو فریب دیتے ہیں اور اللہ ان کو ان کے فریب کا بدلہ دینے والا ہے، چنانچہ وہ لوٹ کر اس جگہ آئیں گے، جہاں نور بانٹا گیا تھا، وہاں کچھ نہ پائیں گے، پھر وہ ان کی طرف لوٹ کر آئیں گے۔

﴿ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ﴾ صفوان بن عمرو کہتے ہیں (جو سلیم کے شاگرد ہیں) مگر حال یہ ہے کہ سلیم بن عامر کہتے تھے، چنانچہ منافق ہمیشہ فریب خوردہ رہے گا، یہاں تک کہ نور بانٹا جائے گا اور اللہ منافق اور مومن میں تمیز کر دے گا۔ (أخرجه ابن أبي حاتم) پھر بہ سندِ دیگر عن یوسف بن الحجاج عن ابی امامہ روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک ظلمت بھیجے گا تو کوئی مومن اور کوئی کافر ایسا نہیں ہوگا کہ جو اپنی ہتھیلی کو دیکھ سکے، یہاں تک کہ

اللہ مومنوں کی طرف ان کے اعمال کے مطابق نور بھیجے گا اور ان کے پیچھے منافق ہوں گے جو کہیں گے: ﴿ اُنۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِكُمۡ ﴾ ۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَضُرِبَ بَيۡنَهُمۡ بِسُوۡرٍ ﴾ جمہور نے بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور نائب فاعل ﴿ بِسُوۡرٍ ﴾ ہے۔ ظاہر یہی قول ہے اور حرفِ باء زائد ہے۔[2] (كما قاله الكسائي) ''أَيْ: ضُرِبَ بَيْنَهُمْ سُوْرٌ'' کسی نے (یعنی زید بن علی و عمرو بن عبید نے) بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور فاعل اللہ پاک ہے۔[3] ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ معطوف ہے، جملۂ ﴿ قِيۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَكُمۡ ﴾ پر اور اس پر متفرع ہے، اس لیے کہ جب مومنوں نے یا فرشتوں نے منافقوں کو اس سے منع کیا کہ ان کے ساتھ مل جائیں اور اُن کے معارف اور اعمال سے روشنی حاصل کریں تو منافق اپنے نفاق کی تاریکی میں ہی رہ گئے اور وہ اس وجہ سے گویا ایسے ہو گئے کہ ان کے اور اس نور کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی گئی، کون سا نور وہ نور جو ان کو جنت کی طرف پہنچا دے، چنانچہ اس بنا پر ضربِ سور استعارہ تمثیلہ کے قبیل سے ٹھہرے گا۔ (كما قيل) سور وہ شے ہے جو دو شے کے درمیان حاجز و مانع ہوتی ہے، اس سے مراد جنت اور نار کے درمیان حاجز (پردہ، روک) ہے، یا اہلِ جنت اور اہلِ نار کے درمیان رکاوٹ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کی جائے گی جس کی صفت آئندہ بیان کی جائے گی۔ کسی نے کہا ہے کہ اعراف کا حجاب (پردہ) ہے۔ واللّٰه أعلم.

پھر اللہ پاک نے اس دیوار کا وصف ذکر فرمایا: ﴿ لَهٗ بَابٌ ۢ بَاطِنُهٗ فِيۡهِ الرَّحۡمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنۡ قِبَلِهِ الۡعَذَابُ ﴾ یعنی وہ دیوار ایسی ہے جس کا ایک دروازہ ہے اور ایسی ہے جس کا باطن یعنی وہ جانب جو اہلِ جنت سے متصل ہے اس میں رحمت ہے، یعنی جنت یا نور اور ظاہر اس کا وہ جانب ہے جو اہلِ نار سے لگی ہوئی ہے، اس کی طرف سے عذاب ہے، یعنی نارِ جہنم یا ظلمت۔ کسی نے کہا ہے کہ مومنین ان سے آگے بڑھیں گے تو جنت میں داخل ہو جائیں گے اور منافق لوگ عذاب میں ہوں گے اور ان کے درمیان دیوار ہو گی۔ کسی نے کہا ہے کہ جو رحمت اس کے باطن میں ہے وہ تو مومنوں کا نور ہے اور جو عذاب اس کے ظاہر میں ہے وہ منافقوں کی ظلمت ہے۔

امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا: ''سُوۡرٍ'' ایک دیوار ہے جنت اور نار کے درمیان۔ عبد الرحمان (یعنی ابن زید بن اسلم رحمہ اللہ) نے کہا: یہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَبَيۡنَهُمَا حِجَابٌ ﴾ [الأعراف: ٤٦] ''اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہو گی۔'' اسی طرح امام مجاہد اور کئی ایک اہلِ علم سے بھی مروی ہے۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: صحیح یہی قول ہے۔ ﴿ بَاطِنُهٗ فِيۡهِ الرَّحۡمَةُ ﴾ یعنی جنت اور جو کچھ اس میں ہے۔ ﴿ وَظَاهِرُهٗ مِنۡ قِبَلِهِ الۡعَذَابُ ﴾ یعنی ''نار''۔ یہ قول امام قتادہ اور ابن زید وغیرہما کا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تحقیق کہا گیا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٣٧)
[2] فتح القدير (٥/٣٣٣٧)
[3] اللباب في علوم الكتاب (١٨/٤٧٣)
[4] تفسير الطبري (٢٣/١٨٢، ١٨٣)

ہے کہ یہ سور وادیِ جہنم کے نزدیک بیت المقدس کی سور ہے۔ پھر بہ سندِ خود عن ابی العوام موذن بیت المقدس سے راویت کیا ہے، کہا: میں نے سنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو، وہ کہتے تھے کہ جس سور کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ذکر فرمایا ہے: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ﴾ وہ سور شرقی ہے اس کا باطن تو مسجد ہے اور وہ جو اس سے متصل ہے اور اس کا ظاہر وادیِ جہنم ہے۔ پھر عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ و کعب احبار و علی بن الحسین و زین العابدین (تفسیر ابن کثیر میں بواو ہے، ظاہر یہ ہے کہ علی بن الحسین وہی زین العابدین ہیں۔ واللہ أعلم) سے اس کے مثل روایت کیا ہے۔[1] (عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے: «إنه كان على سور بيت المقدس فبكى فقيل: ما يبكيك؟ قال: ههنا أخبرنا رسول الله ﷺ أنه رأى جهنم»[2] كذا في الفتح).

یہ بات ان لوگوں کی طرف سے اس پر محمول ہے کہ انھوں نے اس سے معنی کی تقریب اور اس کی مثال کا ارادہ کیا ہے، نہ یہ کہ قرآن شریف سے جس شے کا ارادہ کیا گیا ہے، وہ یہی دیوارِ معین و نفسِ مسجد ہے اور "ما وراء" اس کے وہ وادی جو وادیِ جہنم کے نام سے معروف ہے، اس لیے کہ جنت تو آسمانوں میں اعلیٰ علیین میں ہے اور نار اسفل السافلین کے درکات میں۔ اور کعب کا یہ قول کہ جو باب قرآن میں مذکور ہے، وہ بابِ رحمت ہے جو مسجد کے ابواب میں سے ایک باب ہے۔ سو یہ قول ان کی اسرائیلیات وترہات سے ہے۔

اس سے مراد تو صرف وہ سور ہے جو قیامت کے دن نصب کی جائے گی، تا کہ مومنین اور منافقین کے درمیان آڑ ہو۔ پھر جب مومنین اس تک پہنچیں گے تو اس میں داخل ہو جائیں گے اس کے دروازے سے، پھر جب وہ سب کے سب اچھی طرح داخل ہو جائیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا اور منافق اس کے پرے حیرت وظلمت و عذاب میں باقی رہ جائیں گے جس طرح کہ دنیا میں کفر و جہالت اور شک و حیرت میں تھے۔

فتح البیان میں بھی قولِ مذکور کو خوب رد کیا ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ اگر ایسی تفسیر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو جائے تو ہم اس کو قبول کر لیں گے اور اس پر ایمان لے آئیں گے، ورنہ پھر اس کی کوئی کرامت اور قبولیت نہیں ہے اور شاید یہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔ بے شک شریح نے کہا ہے کہ کعب اس باب کے بارے میں کہتے تھے جس کا نام باب الرحمت رکھا جاتا ہے بیت المقدس میں کہ یہ وہی باب ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ﴾ کعب رحمہ اللہ اور اسی طرح وہب رحمہ اللہ بنی اسرائیل سے کثیر روایات لیتے ہیں، حالانکہ اہلِ سنت کے نزدیک ان روایات کو قبول کرنے کے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔[3]

بالجملہ جب مومنوں اور منافقوں کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے گی تو اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی

[1] تفسیر الطبري (۲۳/۱۸۳، ۱۸٤) تفسیر ابن کثیر (٤/۳۹٤، ۳۹٥) [2] فتح القدیر (٥/۲۲۸) [3] فتح البیان (۱۳/٤۰۹)

جس کو منافق اس وقت کہیں گے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ﴾ (یا تو تفسیر ہے ندا کی یا منصوب ہے قولِ مقدر سے۔ قاله السمين)۔ یہ جملہ حال ہے ﴿ بَيْنَهُمْ ﴾ کی ضمیر سے، یا استیناف ہے، ظاہر یہی ہے گویا کسی نے کہا ہے کہ ضربِ سور اور مشاہدۂ عذاب کے بعد پھر وہ کیا کریں گے؟ تو یہ اس کا جواب ہے کہ منافق مومنوں کو اس دیوار کے پرے سے پکاریں گے، جب وہ ان کے درمیان میں رکاوٹ بن جائے گی، کیا ہم تمھارے مطابق نہیں تھے۔ ظاہر میں تمھاری نماز کے ساتھ تمھاری مسجدوں میں نماز پڑھتے تھے اور اسلام کے اعمال بجا لاتے تھے تمھاری طرح اور تمھارے ساتھ غزوات میں حاضر ہوتے تھے اور تمھارے ساتھ سارے واجبات ادا کرتے تھے۔

پھر جو مومنوں نے ان کو جواب دیا اللہ پاک نے اس کی خبر دی: ﴿ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ ﴾ یعنی مومنوں نے کہا: کیوں نہیں تم ظاہر میں ہمارے ساتھ تھے، لیکن تم نے اپنے نفوس کو نفاق میں مبتلا کر لیا اور کفر کو چھپایا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم نے ان کو نفاق کے ساتھ ہلاک کر ڈالا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ شہوات اور لذات کے ساتھ اپنی جانوں کو ہلاک کر ڈالا۔[2] (كما قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما) کسی نے کہا ہے کہ معاصی کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔[3] (كما قاله ابن سنان) کسی نے کہا ہے کہ تم نے ان سے فتنے میں کام لیا۔

﴿ وَتَرَبَّصْتُمْ ﴾ یعنی اور تم نے محمد ﷺ کے اور مومنوں کے ساتھ جو ان کے ساتھ تھے حوادثِ دہر کا اور زمانے کی گردشوں کا انتظار کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تم نے توبہ کے ساتھ انتظار کیا۔[4] ﴿ وَارْتَبْتُمْ ﴾ اور تم نے امرِ دین میں شک کیا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں توحید کے بارے میں احکام نازل کیے ان کی تصدیق نہ کی اور نہ ہی ظاہری معجزوں کو مانا۔

﴿ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ ﴾ اور تم کو باطل آرزوؤں نے دھوکا دیا جن میں سے انتظار کرنا ہے۔ وہ باطل آرزوئیں جن میں تم تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ طولِ امل (لمبی لمبی آرزوئیں اور تمنائیں) ہے اور لمبی عمروں اور وقت کا طمع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مومنین کے ضعف کی جو تمنا کیا کرتے تھے، اس نے ان کو دھوکا دیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَمَانِيُّ" اس جگہ شیطان کا دھوکا ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ دنیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مغفرت کا طمع یہ سب امور "أَمَانِيُّ" کی تعریف میں شامل ہیں۔

﴿ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ ﴾ یہاں تک کہ اللہ کا امر آ گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ اَمْرُ ﴾ سے مراد موت ہے۔[6] کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کریم ﷺ کو نصرت دینا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ان کا نار میں ڈالنا ہے۔[7] ﴿ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴾۔ جمہور نے بہ فتح غین پڑھا ہے بہ صیغۂ صفت

---

(1) فتح القدير (٥/٢٢٧) (2) شعب الإيمان (٥/٤٦٢) الدر المنثور (٨/٥٦) (3) تفسير القرطبي (١٧/٢٤٦)
(4) شعب الإيمان (٥/٤٦٢) (5) تفسير الطبري (٢٣/١٨٥) (6) شعب الإيمان (٥/٤٦٢) (7) تفسير الطبري (٢٣/١٨٥)

بروزن فعول، مراد شیطان ہے۔[1] (کما قالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما) یعنی فریب دیا تم کو اللہ کے حلم اور مہلت دینے کے ساتھ شیطان نے۔ کسی نے کہا ہے کہ تم کو شیطان نے فریب دیا اس طرح سے کہ اللہ غفور اور کریم ہے تم کو عذاب نہ کرے گا اور تمھارے گناہ اس کے نزدیک کیا ہوں گے؟ (یعنی اس کی مغفرت کے سامنے تمھارے گناہوں کی کیا ہستی ہے) اور وہ عظیم ومحسن وحلیم وغفور ورحیم ہے۔ چنانچہ وہ انسان کو ہمیشہ ایسے دھوکے دیا کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کو گرا دیتا ہے۔ یا اس طرح سے فریب دیا کہ نہ بعث ہے نہ حساب ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شیطان کی طرف سے ہمیشہ دھوکے میں رہے، یہاں تک کہ اللہ نے ان کو نار میں پھینک دیا۔[2] کسی نے (یعنی امام ابو حیوہ، محمد بن سمیفع اور سماک بن حرب رحمہم اللہ نے) بہ ضمِ غین پڑھا ہے بنا بر مصدر۔

﴿ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ ﴾ (امام ابن عامر رحمہ اللہ نے "تؤخذ" بہ تائے تانیث بلحاظ لفظ ﴿ فِدْيَةٌ ﴾ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے، اس لیے کہ تانیث مجازی ہے اور فصل یہی ہے۔[3] کما قالہ السمین)۔ یعنی آج کے دن اے منافقو! نہ لیا جائے گا تم سے فدیہ کہ تم اسے دے کر اپنی جانوں کو آگ سے چھڑاؤ۔ فدیہ وہ ہے جو چھڑوائی میں دیا جاتا ہے۔ کسی نے کہا: عوض وبدل ہے۔ کسی نے کہا: ایمان وتوبہ، پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

﴿ وَلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ یعنی اور نہ ہی فدیہ ان لوگوں سے لیا جائے گا جو ظاہراً و باہراً کافر ہوئے، یعنی اللہ پاک کا انکار کیا۔ منافق اگرچہ حقیقت میں کافر ہے۔ کافر کا عطف منافق پر صرف اس لیے ہوا کہ منافق نے کفر چھپایا اور کافر نے ظاہر کیا، سو اس اعتبار سے وہ منافق کے علاوہ ہوگیا تو اس کا عطف منافق پر اچھا رہا۔

﴿ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی تمھاری منزل جس پر تم ٹھکانہ پکڑو گے وہ نار ہے وہ اولیٰ ہے تمھارے ساتھ اور پھر جانے کی بری جگہ ہے جس کی طرف تم جاؤ گے وہ نار ہے۔ مولی اصل میں وہ شخص ہے جو انسان کی بہتری کا متولی ہوتا ہے، پھر اس کا استعمال اس شخص کے لیے کیا گیا جو اس کا ملازم رہتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَوْلٰىكُمْ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ عن قریب تمھارا مکان ہے، ماخوذ ہے ولاء بہ معنی قرب سے۔ یا معنی ہیں "ذَاتُ وِلَايَتِكُمْ" اس بنا پر مولیٰ مصدر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نار میں حیات اور عقل مرکب کر دے گا تو وہ غیظ وغضب کے مارے کفار پر پھٹ پڑے گی۔ کسی نے کہا: مولی بہ معنی ناصر ہے، یعنی نار تمھاری ناصر ہے برطریقِ قولِ شاعر: "تَحِيَّةُ بَيْنِهِمْ ضَرْبٌ وَّجِيْعٌ"

مطلب یہ ہے کہ تمھارا کوئی ناصر نہیں ہے مگر نار جس طرح کہ بیت کے معنی یہ ہیں کہ ان کے لیے کوئی تحیت نہیں ہے مگر ضرب بنا بر تہکم واستہزاء یعنی مذاق اور استہزاء کی بنا پر اور مراد ناصر کی اور تحیت کی نفی ہے۔[4] (کذا في الفتح)

---

[1] شعب الإيمان (٤٦٢/٥) [2] تفسير الطبري (١٨٥/٢٣)
[3] اللباب في علوم الكتاب (٤٧٦/١٨) [4] فتح البيان (٤١٠/١٣)

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ بعض سلف نے کہا ہے، یعنی تم نے اپنی جانوں کو لذات و معاصی وشہوات میں مبتلا کر کے فتنے میں ڈالا اور توبہ کو تم ایک وقت سے دوسرے وقت کی طرف موخر کرتے رہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم نے حق کا اور اہلِ حق کا انتظار کیا اور تم نے "بعث بعد الموت" میں شک کیا اور تم کو امانی نے دھوکا دیا، یعنی تم نے کہا کہ عن قریب ہمارے لیے مغفرت کی جائے گی۔ کسی نے کہا ہے کہ دھوکا دیا تم کو دنیا نے، یہاں تک کہ اللہ کا امر آ گیا، یعنی تم ہمیشہ اس میں رہے یہاں تک کہ موت آ گئی اور تم کو اللہ کے ساتھ شیطان نے دھوکا دیا۔

یہ بات جو مومنوں نے منافقوں سے کہی، اس کے یہ معنی ہیں کہ تم ہمارے ساتھ ایسے جسموں کے ساتھ تھے جن کے لیے نہ نیت تھی اور نہ ان کے ساتھ دل تھے اور تم تو بس حیرت اور شک میں تھے، چنانچہ پس تم لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے تھے اور نہیں ذکر کرتے تھے مگر تھوڑا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافقین مومنین کے ساتھ تھے زندہ رہ کر، باہم ان سے شادی بیاہ کرتے، ان کے پاس آتے جاتے اور ان سے ملتے جلتے تھے اور ان کے ساتھ تھے مردہ ہو کر۔ قیامت کے دن سب کو نور عطا کیا جائے گا، منافقوں کا نور بجھ جائے گا، جب وہ سور کے پاس پہنچیں گے اس وقت ان کے درمیان جدائی کر دی جائے گی۔[1]

مومنین کا یہ قول ان کے اس قول کے خلاف نہیں ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے خبر دی ہے اور وہ فرماتا ہے درآنحالیکہ وہ تمام قائلین سے زیادہ سچا ہے: ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴾ [المدثر: ۳۸۔ ۴۷] "ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔ مگر دائیں ہاتھ والے کہ وہ بہشتوں میں (بیٹھے ہوئے) گناہ گاروں سے سوال کرتے ہوں گے۔ تمھیں دوزخ میں کس چیز نے ڈالا؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم نمازی نہ تھے نہ مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے اور ہم بحث کرنے والے (انکاریوں) کا ساتھ دے کر بحث مباحثہ میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ ہمیں موت آ گئی۔"

چنانچہ یہ جو ان سے خارج ہوا تو ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کی وجہ سے۔ پھر فرمایا: ﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴾ [المدثر: ۴۸] "انھیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہ دے گی۔" جیسا کہ یہاں فرمایا ہے: ﴿ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ یعنی اگر آج کے دن تم میں سے کوئی زمین بھر سونا لے آتا اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور لے آتا، تاکہ اللہ کے عذاب سے چھٹکارا پانے کے لیے فدیہ دے تو اس سے یہ قبول نہ کیا جاتا۔

[1] تفسیر الطبري (۲۳/ ۱۸۴)

﴿مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ یعنی آگ تمھارا مصیر ہے اور اسی کی طرف تمھارا مرجع ہے، وہی تمھارے کفر و شرک پر تمھاری ہر منزل میں تمھارے لیے اولیٰ ہے۔[1]

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ
اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ
قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝16 اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ
يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝17 اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا
اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝18
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖۗ
وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝19

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل ذکرِ الٰہی کے لیے جھک جائیں اور (اس کے لیے) جو حق (اللہ) کی طرف سے نازل ہوا، اور وہ ان لوگوں کے مانند نہ ہوں، جنھیں اس سے پہلے کتاب دی گئی؟ پھر ان پر مدت لمبی ہوگئی تو ان کے دل سخت ہوگئے اور اُن میں سے بہت سے فاسق ہیں 16 تم جان لو کہ بلاشبہ اللہ ہی زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ یقیناً ہم نے تمھارے لیے آیات بیان کیں، تاکہ تم عقل کرو 17 بلاشبہ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جنھوں نے اللہ کو قرضِ حسنہ دیا تو وہ ان کے لیے بڑھایا جائے گا اور ان کے لیے عمدہ اجر ہے 18 اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، وہی لوگ اپنے رب کے ہاں راست باز اور گواہی دینے والے ہیں۔ ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہی دوزخی ہیں 19

[1] تفسیر ابن کثیر (٣٩٥/٤)

خشوع کی ترغیب اور اہلِ کتاب جیسا بننے کی ممانعت:

ایمان وہی ہے کہ جس سے دل نرم ہو۔ اہلِ کتاب پیغمبروں کی صحبت میں یہ پاتے تھے۔ مدت کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے۔ اب نرم دلی کی صفت مسلمانوں میں ہونی چاہیے۔ عرب لوگ جاہل تھے، جیسے: مردہ زمین۔ اب ان کو جلایا ان میں سب کمال پیدا کر دیے۔ انتھیٰ.

جمہور نے ﴿ أَلَمْ يَأْنِ ﴾ پڑھا ہے (بہ سکونِ ہمزہ و کسرِ نون مضارع "أَنَى" کا باب رمی سے۔ حرفِ یاء جو لام کلمہ ہے جازم کی وجہ سے محذوف ہوا)۔ "يُقَالُ: أَنَى الْأَمْرُ يَأْنِي أَنْيًا مِثْلُ رَمَى يَرْمِي رَمْيًا إِذَا جَاءَ إِنَاهُ أَيْ: وَقْتُهُ" اور کسی نے "يَئِنَ" بہ کسرِ ہمزہ و سکونِ نون پڑھا ہے (مضارع "آنَ" کا باب باع سے۔ اس کا جزم بہ سکونِ نون ہوا۔ حرفِ یاء جو اس کا عین کلمہ ہے بہ وجہ التقائے ساکنین حذف ہوا تو اب "أَلَمْ يَئِنْ" بروزن "أَلَمْ يَبِعْ" ہو گیا یہ قراءت حسن و ابوسماک رحمہ اللہ کی ہے۔ ابن سکیت نے یہ شعر پڑھا ہے:

ألما يأن لي أن تجلى عمايتي واقصر عن ليلي بلىٰ قد أنا ليا[1]

كذا فى الفتح)

قولہ تعالیٰ: ﴿ أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ ﴾ فاعل ہے ﴿ يَأْنِ ﴾ کا۔ "أَيْ: أَلَمْ يَحْضُرْ خُشُوعُ قُلُوبِهِمْ وَلَمْ يَجِيءْ وَقْتُهُ" یعنی کیا مومنوں کے لیے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم پڑیں اور خاضع و ساکن و ذلیل و مطمئن ہوں (كما في هذا الشعر:

ألم يأن لي يا قلب أن أترك الجهلا وأن يحدث الشيب المنير لنا عقلا؟)

خشوع دل کے نرم اور رقیق ہونے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے لائق یہ ہے کہ اللہ کا ذکر ان میں خشوع اور رقت پیدا کرے اور اس شخص کی طرح نہ ہوں جس کا دل ذکر کے لیے نرم نہیں ہوتا اور نہ اس کے لیے خضوع اور فروتنی کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ خطاب اس شخص کو ہے جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لایا۔

امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کیا ان لوگوں کے لیے وقت نہیں آیا جو ظاہری طور پر ایمان لائے اور اپنے کفر کو چھپایا،[2] اس بات کا کہ ان کے دل ڈر جائیں اور نرم ہو جائیں اللہ کے ذکر کے لیے۔ غرض یہ ہے کہ اس سے مراد منافق ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومنوں کے ایک گروہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، ان کو رقت اور خشوع پر برانگیختہ اور آمادہ کیا ہے۔ اب رہے وہ لوگ جن کی صفت اللہ تعالیٰ نے رقتِ قلب اور خشوع کے ساتھ فرمائی ہے تو یہ طبقہ عام مومنوں سے فوق (یعنی درجے کے لحاظ سے بلند) ہے۔[3]

---

[1] فتح القدير (٥/٢٢٩) [2] تفسير القرطبي (١٧/٢٤٩) [3] معاني القرآن (٥/١٢٥)

یہ قول کہ اس آیت کا نزول مومنوں کے حق میں ہوا ہے، اس کی دلیلیں یہ ہیں:

1 سیدنا انس رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِسۡتَبۡطَأَ اللّٰهُ قُلُوۡبَ الۡمُهَاجِرِيۡنَ بَعۡدَ سَبۡعَ عَشۡرَةَ سَنَةً مِنۡ نُزُوۡلِ الۡقُرۡآنِ فَأَنۡزَلَ اللّٰهُ ﴿ اَلَمۡ يَاۡنِ ... الآية ﴾» یعنی اللہ نے نزولِ قرآن کے سترہ سال بعد مہاجروں کے دلوں کو بطی و دیر کرنے والا شمار کیا، سو یہ آیت نازل فرمائی۔ (أخرجه ابن مردويه)

2 سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ایک گروہ پر نکلے مسجد میں اور وہ ہنس رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر کھینچی اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک سرخ ہو رہا تھا۔ پھر فرمایا: کیا تم ہنستے ہو اور تمھارے رب سے تمھیں اس بات پر امان نہیں آئی کہ اس نے واقعی تمھارے لیے مغفرت کر دی اور البتہ تحقیق اس نے تمھارے ہنسنے میں مجھ پر ایک آیت نازل کی ہے: ﴿ اَلَمۡ يَاۡنِ ... الآية ﴾۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! پھر اس کا کفارہ کیا ہے؟ فرمایا کہ تم روؤ جتنا کہ تم ہنسے ہو۔[1] (أخرجه ابن مردويه)

3 سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمارے اسلام اور ﴿ اَلَمۡ يَاۡنِ ... الآية ﴾ کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو عتاب کیا، اس کے درمیان چار سال کی مدت گزری تھی۔[2] (أخرجه مسلم والنسائي وابن ماجه وابن المنذر وغيرهم يعني ابن مردويه)

4 نیز ان سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم ایک دوسرے پر متوجہ ہوئے کہ ہم نے کیا شے احداث کی (یعنی ایسی کون سی غلطی ہم سے سرزد ہوئی)۔[3] (أخرجه أبو يعلىٰ وابن مردويه)

5 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے دلوں کو بطی شمار کیا (یعنی دیر کرنے والا) تو ان کو نزولِ قرآن کے تیرھویں سال کے شروع میں عتاب کیا یہ آیت نازل فرما کر: ﴿ اَلَمۡ يَاۡنِ ... الآية ﴾[4] (أخرجه ابن أبي حاتم و ابن مردويه)

6 عبدالعزیز بن ابی رواد سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں خوش طبعی وہنسی ظاہر ہوئی تو یہ آیت اتری: ﴿ اَلَمۡ يَاۡنِ ... الآية ﴾۔[5] (أخرجه ابن أبي شيبة في المصنف)

7 حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: "يَسۡتَبۡطِئُهُمۡ وَهُمۡ أَحَبُّ خَلۡقِهِ إِلَيۡهِ"، یعنی اللہ تعالیٰ ان کو بطی شمار کرتا ہے، حالاں کہ وہ ان کو ساری خلق سے زیادہ محبوب ہیں۔[6]

8 قاسم سے مروی ہے (قال سفيان الثوري عن المسعودي عن القاسم الخ) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک بار ملول ہوئے (ملال یہ ہے کہ کسی شے کو اس کی حرص کے بعد، اسے ترک کر دے اس کو ثقیل سمجھ

---

[1] الدر المنثور (٥٧/٨) [2] صحيح مسلم (٣٠٢٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٨١/٦) [3] مسند أبي يعلىٰ (١٦٧/٩)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٣٨/١٠) [5] مصنف ابن أبي شيبة (٢٤٤/٧) [6] تفسير القرطبي (٢٤٩/١٧)

کر۔ ہندی میں اس کو اکتانا کہتے ہیں) تو عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ ہم پر کوئی حدیث کریں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ نازل کیا: ﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ ﴾ [یوسف: ۳] ''ہم آپ کے سامنے بہترین بیان پیش کرتے ہیں۔'' کہا: پھر ایک بار ملول ہوئے تو عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ ہم کو حدیث کریں تو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا: ﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ ﴾ [الزمر: ۲۳] ''اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے۔'' پھر ایک بار ملول ہوئے تو عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ ہم کو حدیث کریں تو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا: ﴿ اَلَمْ يَاْنِ... الآية ﴾۔[1]

9 امام قتادہ رحمہ اللہ سے اس آیت کے بارے میں مروی ہے کہ ہم سے ذکر کیا گیا کہ سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی جو شے لوگوں سے اٹھالی جائے گی وہ خشوع ہے۔[2]

﴿ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ﴾ معطوف ہے ''ذکر الله'' پر، یعنی کیا مومنوں پر وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہوں اور اس حق کے لیے جو نازل ہوا۔ اس سے مراد قرآن ہے تو اب ''ذکر'' معطوف علیہ کو اس شے پر محمول کریں گے جو قرآن کے ماسوا ہے جس میں اللہ پاک کا ذکر ہے، زبان سے یا دل کے خیالات سے۔ کسی نے کہا کہ ذکر سے مراد یہی قرآن ہے تو اب یہ عطف بابِ عطفِ تفسیر سے ہوگا، یا یوں کہو کہ عطف مختلف مفہوم کے اعتبار سے ہے۔ جمہور نے ﴿ نَزَلَ ﴾ کو مشدد بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی نافع اور حفص نے) مخفف بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی جحدری، ابو جعفر اور اعمش رحمہم اللہ نے ''رواية عنه'') مشدد بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ كما في الفتح۔ نے) ''أنزل'' بہ الف بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔

﴿ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ جمہور نے بہ یائے تحیہ بنا بر غیبت بہ لحاظ ماقبل پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابو حیوہ اور ابن ابی عبلہ رحمہما اللہ نے) بہ تائے خطاب بطور التفات پڑھا ہے اور ''أمد'' کو جمہور نے بہ تخفیفِ دال پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی ابن کثیر رحمہ اللہ في رواية عنه نے) بہ تشدیدِ دال پڑھا ہے، یعنی زمن طویل[3] (طویل مدت)۔ کسی نے کہا ہے کہ پہلے کی بنا پر اس سے مراد اجل اور انتہا ہے۔ ''يُقَالُ: أَمَدَ فُلَانٌ كَذَا أَيْ: غَايَةٌ''، اور جملہ ﴿ تَخْشَعَ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی کیا وقت نہیں آیا ان پر اس بات کا کہ ان کے دل نرم ہوں اور اس بات کا کہ وہ نہ ہوں ان لوگوں کی طرح جو کتاب دیے گئے، یعنی وہ یہود ونصاریٰ کی چال نہ چلیں جن کو اس قرآن کے نزول سے پہلے تورات اور انجیل ملیں، پھر ان کے اور ان کے انبیاء کے درمیان زمانہ دراز ہوا تو ان کے دل اس وجہ سے سخت پڑ گئے اور اسی لیے انھوں نے تحریف اور تبدیلی کی، چنانچہ اللہ پاک امتِ محمدیہ کو اس بات سے منع فرماتا ہے کہ ان کی طرح نہ ہو جائیں۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/٣٩٦) [2] تفسير الطبري (٢٣/١٨٨) [3] فتح القدير (٥/٢٢٩)

﴿ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ یعنی ان میں سے بہت سے اللہ کی طاعت سے نکلنے والے ہیں، اس لیے کہ جو شے ان کی طرف اتاری گئی اس پر عمل کرنا ترک کر دیا اور اس میں تحریف اور تبدیلی کی اور جو نبی کریم ﷺ پر اتارا گیا اس پر ایمان نہ لائے۔ کسی نے کہا: یہ وہ ہیں جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ پر ایمان لانے کو ترک کیا۔ کسی نے کہا کہ یہ وہ ہیں جنھوں نے رہبانیت نکالی، یہ لوگ اصحابِ صوامع (بت خانے، گرجے) ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو منع کیا کہ ان لوگوں کی مشابہت اختیار کریں جو اُن سے پہلے اللہ کی کتابوں کے حامل بنائے گئے، یعنی یہود و نصاریٰ۔

جب ان پر مدت دراز ہوگئی تو انھوں نے وہ کتاب بدل ڈالی جو ان کے ہاتھوں میں تھی اور اس کے بدلے تھوڑا مول لیا اور اس کو اپنے پسِ پشت ڈال دیا، مختلف آراء اور جھوٹ گھڑے ہوئے اقوال پر جھکے، اللہ کے دین میں لوگوں کی تقلید کی، اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے سوا رب بنا لیا تو اس وقت ان کے دل سخت پڑ گئے، وہ نہ کسی کی نصیحت قبول کرتے ہیں اور نہ ہی وعدے اور وعید سے ان کے دل نرم پڑتے ہیں اور اُن میں سے بہت سے فاسق ہیں، یعنی اعمال میں نافرمان ہیں، چنانچہ ان کے دل تو فاسد ہیں اور ان کے اعمال باطل ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ﴾ [المائدۃ: ۱۳] ''پھر ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر اپنی لعنت نازل فرما دی اور ان کے دل سخت کر دیے کہ وہ کلام کو اس کی جگہ سے بدل ڈالتے ہیں اور جو کچھ نصیحت انھیں کی گئی تھی اس کا بہت بڑا حصہ بھلا بیٹھے۔'' یعنی ان کے دل فاسد ہوئے تو سخت پڑ گئے اور کلام کو اس کی جگہ سے بدلنا ان کی عادت اور طبیعت بن گیا، جن اعمال کا ان کو حکم ہوا ان کو ترک کیا اور جس شے سے ان کو ممانعت ہوئی تھی اس کے مرتکب ہوئے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ان کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا، وہ مشابہت کسی شے میں ہو؛ امورِ اصلیہ میں اور فرعیہ میں، یعنی اصل احکام ہوں یا ان کی جزء ہو۔[1]

ربیع بن ابی عمیلہ فزاری سے مروی ہے، کہا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ہم کو ایک ایسی حدیث بیان کی کہ میں نے اس سے بڑھ کر کوئی حدیث نہیں سنی جو مجھے پسند ہو سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی کتاب سے ہو، یا کوئی ایسی بات ہو جو نبیِ کریم ﷺ نے فرمائی ہو۔ انھوں نے کہا کہ جب بنی اسرائیل پر مدت دراز ہوئی تو اُن کے دل سخت ہو گئے تو انھوں نے اپنی طرف سے ایک کتاب اختراع کی جس کی ان کے دلوں نے خواہش کی اور اُن کی زبانوں نے اس کو شیریں اور لذیذ سمجھا اور اُن کے اور اُن کی بہت سی خواہشات کے درمیان حق حائل ہوتا تھا۔ پھر کہا: آؤ بنی اسرائیل کو اپنی اس کتاب کی طرف بلائیں اور جو کوئی اس پر ہماری متابعت کرے تو ہم اسے چھوڑ دیں اور جو ہماری اتباع کرنے پر راضی نہ ہو تو ہم اسے مار ڈالیں۔ پھر انھوں نے یہ کیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳۹٦/٤)

ان میں سے ایک مرد فقیہ (عالم، دانا شخص) تھا، اس نے جب وہ کچھ دیکھا جو وہ کرتے تھے تو اس نے اس شے کا قصد کیا جو اللہ کی کتاب میں مشہور تھی، پھر اس کو ایک لطیف شے پر لکھا اور اس کو لپیٹ کر ایک قرن (سینگ) میں رکھا اور اسے اپنی گردن میں لٹکا لیا، چنانچہ جب بہت سے لوگ اس قتل و غارت گری میں مبتلا ہو گئے تو بعض نے بعض سے کہا: اولوگو! بے شک تم نے بنی اسرائیل میں قتل کو پھیلا دیا، اب تم فلاں کو بلاؤ اور اپنی کتاب اس کو پیش کرو، بے شک اگر اس نے تمھاری متابعت کر لی تو عن قریب باقی لوگ تمھاری متابعت کر لیں گے اور اگر وہ انکار کرے تو تم اس کو مار ڈالنا۔ پھر اس نے فقیہ کو بلایا اور کہا: کیا ہم اس شے پر ایمان لائیں جو ہماری اس کتاب میں ہے؟ اس نے کہا: اس میں کیا ہے تم اس کو مجھ پر پیش کرو تو انھوں نے وہ کتاب اسے پیش کی آخر تک۔ پھر کہا: کیا ہم اس پر ایمان لائیں؟ اس نے کہا: ہاں میں ایمان لایا اس شے پر جو اس میں ہے اور اس قرن کی طرف اشارہ کیا، چنانچہ اسے چھوڑ دیا، پھر جب وہ مر گیا تو اس کی تلاشی لی تو اس نے اس قرن کو لٹکایا ہوا تھا، انھوں نے اس میں وہ شے پائی جو اللہ کی کتاب میں مشہور و معروف تھی چنانچہ بعض نے بعض سے کہا: اولوگو! جو کچھ ہم سنتے تھے یہ ہے اس کو فتنہ پہنچا۔ (اصل کے الفاظ "يا هؤلاء ما كنا نسمع هذا أصابه فتنة" ہیں)۔

پھر بنی اسرائیل بہتر (۷۲) ملتوں پر متفرق ہو گئے اور ان کی بہترین ملت اصحابِ ذی القرن کی ملت ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قریب ہے اگر تم باقی رہے یا باقی رہے تم میں سے جو کوئی باقی رہے، یہ کہ تم ایسے امور کو دیکھو گے جن کو برا جانو گے، تم میں ان کو تبدیل کرنے کی طاقت نہ ہو گی تو تم میں سے آدمی کے لیے یہ کافی کہ اللہ اس کے دل سے یہ بات جان لے کہ وہ ان امور کو ناپسند کرتا ہے۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم)

ابراہیم سے مروی ہے کہ عتریس بن عرقوب سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف آیا اور کہا: او ابوعبداللہ! (اصل میں اسی طرح ہے، لیکن یہ معلوم ہے کہ ان کی کنیت ابوعبدالرحمان ہے ابوعبداللہ نہیں۔ هكذا في كتب الحديث والرجال۔ مصحح سلمه الله تعالىٰ)۔ وہ ہلاک ہوا جس نے معروف کا امر نہ کیا اور منکر سے نہی نہ کی۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ بولے: وہ ہلاک ہوا جس کے دل نے کسی معروف کو نہ پہچانا اور اس کے دل نے کسی منکر کا انکار نہ کیا، بے شک جبکہ بنی اسرائیل پر مدت دراز ہو گئی اور ان کے دل سخت پڑ گئے تو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے ایک کتاب اختراع کی، یعنی اپنی طرف سے بنائی، اس میں وہ باتیں لکھیں جو اُن کے دلوں کی خواہشات کے مطابق تھیں اور ان کی زبانوں کو میٹھی لگتی تھیں اور کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے سامنے یہ کتاب رکھیں اور جو کوئی اس پر ایمان لائے تو اس کو چھوڑ دیں اور جو کوئی اس کا منکر ہو تو اسے مار ڈالیں، پھر ان میں سے ایک شخص نے اللہ کی کتاب ایک قرن (سینگ) میں رکھی اور اس قرن کو اپنے گلے میں لٹکا کر اپنے سینے کے برابر رکھا، پھر جب اس

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۳۹، ۳۳٤۰)

شخص سے کہا گیا کہ کیا تو اس پر ایمان لاتا ہے تو وہ بولا کہ میں ایمان لایا اس پر اور اس نے اس قرن کی طرف اشارہ کیا جو لٹکایا ہوا تھا اور کہا کہ مجھے کیا ہے کہ میں اس کتاب پر ایمان نہ لاؤں، چنانچہ آج ان کے فرقوں میں سے بہترین فرقہ اس صاحبِ قرن کی ملت ہے۔[1] (أخرجه أبو جعفر الطبري)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کو ان کی سختی کے بعد نرم کر دیتا ہے اور حیران پھرنے والوں کو ان کے بے راہ ہونے کے بعد راہ بتا دیتا ہے اور تکالیف کو ان کے شدید ہونے کے بعد دور کر دیتا ہے۔ چنانچہ جس طرح وہ مردہ اور قحط زدہ زمین کو جو دبی پڑی ہوتی ہے بارانِ رحمت کے قطرہ سے زندہ کر دیتا ہے، اسی طرح سخت دلوں کو قرآن کے براہین اور دلائل سے ہدایت کرتا ہے اور اُن میں نور کو داخل کر دیتا ہے، اس کے بعد کہ ان پر تالے لگے ہوئے تھے اور ان کی طرف کوئی پہنچ نہیں سکتا تھا۔ فسبحان الهادي لمن يشاء بعد الضلال والمضل لمن أراد بعد الكمال الذي هو لما يشاء فعال وهو الحكيم العدل في جميع الفعال اللطيف الخبير الكبير المتعال.

صدقہ کرنے والے، سچ بولنے والے اور شہداء کا اجر وثواب:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴾ اللہ تعالیٰ اس شے کی خبر دیتا ہے جس کے ساتھ ان مردوں اور عورتوں کو ثواب دے گا جو اپنے مال خیرات کرتے ہیں اہلِ حاجت پر اور فقراء اور مساکین پر اور اللہ کو قرض دیتے ہیں اچھا قرض، یعنی اس کو خلوصِ نیت سے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر دیتے ہیں۔ اور جس کو مال دیا اس سے نہ اس کا بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکر چاہتے ہیں۔ اسی لیے یوں فرمایا کہ ان کو دوگنے ملنے ہیں، یعنی ان کی نیکی کا مقابلہ دس گناہ اجر کے ساتھ کیا جائے گا اور اس سے بھی زیادہ دیا جائے گا سات سو گنا تک اور اس سے بھی بڑھ کر اور اُن کو بہت عزت دی جائے گی، یعنی ثوابِ جزیل، کثیر، حسن، مرجع صالح اور مآب حسن ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ﴾۔ مومنین کے جملہ اوصاف کا تتمہ ہے، یعنی جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں، ان کا وصف یہ ہے کہ وہ صدیقین ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (یعنی بہ روایتِ عوفی) کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ﴾ یہ مفصولہ ہے ﴿ وَالشُّهَدَاۗءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ﴾ (یعنی اول آیت مضمون صدیقون پر تمام ہوگئی اور شہداء سے دوسری بات شروع ہوئی)۔ ابو الضحیٰ کا بھی یہی قول ہے اور امام مسروق، ضحاک اور مقاتل بن حیان رحمہ اللہ وغیرہم بھی اسی کے قائل ہیں۔[2]

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/١٨٨، ١٨٩)
[2] تفسير الطبري (٢٣/١٩١)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ (قاله الأعمش عن أبي الضحى عن مسروق عنه) کہ یہ لوگ تین قسم کے ہیں، یعنی مصدقین و صدیقین و شہداء جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [1] [النساء: ٦٩] ''اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول (ﷺ) کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے، جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ۔''

چنانچہ صدیقین اور شہداء کے درمیان فرق کیا، تو یہ اس پر دال ہے کہ یہ دونوں دو الگ الگ صنف ہیں اور بلاشک صدیق مقام اور رتبے میں شہید سے اعلیٰ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ بے شک اہلِ جنت باہم غرفوں والوں کو دیکھیں گے اپنے اوپر، جیسے: تم باہم چمکتے ہوئے تارے کو دیکھتے ہو جو مشرق یا مغرب کی طرف اُفق میں باقی رہ جاتا ہے، اس شے کی فضیلت کی وجہ سے جو اُن کے درمیان ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! وہ تو انبیاء کے منازل ہیں، ان کو ان کے علاوہ کوئی نہیں پہنچ سکے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں؟ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ان میں کچھ لوگ ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور رسولوں کی تصدیق کی۔ [2] (رواه إمام مالك بن أنس واتفق البخاري ومسلم على إخراجه من حديث مالك به) (اس سے یہ نکلا کہ صدیقین مومنین میں سے ایک اعلیٰ قسم ہیں)۔

دوسروں نے کہا ہے کہ ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ سے مراد مومنین ہیں۔ چنانچہ جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے انہیں کی یہ خبر دی ہے کہ صدیقین اور شہداء وہی ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو امام مجاہد رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے۔ [3] پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ مومنین میری اُمت کے شہداء ہیں۔ کہا: پھر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ ... الآية ﴾ [4] یہ حدیث شریف غریب ہے۔ امام ابو اسحاق رحمہ اللہ نے عن عمرو بن میمون اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ وہ قیامت کے دن آئیں گے اکٹھے دو انگلیوں کی طرح۔ [5]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ شہداء جنت النعیم میں ہیں، جیسا کہ صحیحین میں آیا ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوتی ہیں، وہ جنت میں جہاں چاہیں چرتی پھرتی ہیں، پھر ان قندیلوں میں جا کر ٹھکانہ پکڑتی ہیں جو عرش کے نیچے لٹکتی ہیں۔ چنانچہ ان پر تیرے رب نے ایک بار جھانکا اور فرمایا: تم کیا چاہتے ہو؟ تو عرض کی کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تو ہم کو دنیا کے گھر کی طرف لوٹا دے اور ہم تیری راہ میں لڑیں۔ پھر

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣٩٨/٤) [2] صحیح البخاري (٣٠٨٣) صحیح مسلم (٢٨٣١) [3] تفسیر الطبري (١٩٢/٢٣)
[4] تفسیر الطبري (١٩٢/٢٣) اس کی سند میں ''اسماعیل بن یحییٰ'' ضعیف راوی ہے۔ [5] تفسیر ابن کثیر (٣٩٨/٤)

ہم اس طرح مارے جائیں جیسے پہلی دفعہ مارے گئے۔ چنانچہ فرمایا: بے شک میں تحقیق یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ وہ دنیا کی طرف رجوع نہ کریں گے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ﴾ یعنی ان کے لیے اللہ کے پاس اجرِ جزیل اور نورِ عظیم ہے جو اُن کے آگے دوڑے گا اور وہ اس میں اپنے ان اعمال کے مطابق جو وہ دنیا میں کرتے تھے آپس میں مختلف ہوں گے، جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ شہداء چار قسم کے ہیں: ایک مردِ مومن جید الایمان ہے اور دشمن سے لڑا اور اللہ کو سچا جانا اور مارا گیا۔ چنانچہ یہ وہ ہے کہ لوگ اس کی طرف اس طرح سے نظر کریں گے، یہ کہہ کر اپنا سر مبارک اٹھایا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ٹوپی گر پڑی۔ اور دوسرا ایک مومن ہے جو دشمن سے اس طرح ملا کہ اس کی پشت پر گویا ببول کے کانٹے چبھوئے جا رہے ہوں، اور پھر اس کو ایک ایسا تیر آ کر لگا جس کے پھینکنے والا معلوم نہیں اور اس کو مار ڈالا۔ یہ شہید دوسرے درجے میں ہے۔ اور تیسرا ایک مومن ہے جس نے عملِ صالح اور برے اعمال ملے جلے کیے، وہ دشمن سے ملا اور اللہ کو سچا جانا، یہاں تک کہ مارا گیا، چنانچہ وہ تیسرے درجے میں ہے اور چوتھا ایک مردِ مومن کہ اس نے اپنے نفس پر بہت اسراف کیا، وہ دشمن سے ملا اور اللہ کو سچا جانا، یہاں تک کہ مارا گیا تو یہ چوتھے درجے میں ہے۔[2] (أخرجه الإمام أحمد، و هكذا رواه علي بن المديني عن أبي داود الطيالسي عن ابن المبارك عن ابن لهيعة وقال: هذا إسناد مصري صالح ورواه الترمذي من حديث ابن لهيعة وقال: حسن غريب)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ اِعْلَمُوْٓا... الآية ﴾ کا خطاب مومنین مذکورین کو ہے، یہ وہ صحابہ ہیں جنھوں نے خوش طبعی کی کثرت کی تھی تو اب کلام میں غیبت سے خطاب کی طرف التفات ہوگا، یعنی تم جان رکھو کہ اللہ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ یہ اس کی تمثیل ہے کہ اللہ سخت دل والوں کو ذکر و تلاوت سے زندہ کر دیتا ہے، یا اس کی تمثیل ہے کہ مردوں کو زندہ کرے گا۔ اس میں خشوع و خضوع میں رغبت دلانا مقصود ہے اور سخت دل ہونے پر دھمکی اور ملامت ہے، یہ استعارہ تمثیلیہ ہے، تمثیل پر صرف اس لیے محمول کیا گیا ہے کہ یہ آیت پہلے والی آیت کے ساتھ مرتبط ہو جائے۔ معنی یہ ہیں کہ جو ذات پاک زمین کے زندہ کرنے پر قادر ہے تو وہی اس پر بھی قادر ہے کہ جسموں کو ان کے مرنے کے بعد مبعوث کرے اور دلوں کو ان کی سختی کے بعد نرم کر دے۔

پھر فرمایا کہ ہم نے یقیناً تمھارے لیے نشانیاں بیان کر دیں جن میں سے یہ نشانیاں ہیں، شاید تم سمجھ جاؤ، یعنی

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٨٧)

[2] مسند أحمد (٢٣/١) مسند الطيالسي (١٠/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٤٤) تفسير ابن كثير (٣٩٦/٤-٣٩٩) اس کی سند میں ''ابو یزید خولانی'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٠٠٤)

ان مواعظ اور نصیحتوں کو جو ان میں شامل ہیں اور ان کے موافق عمل کرو، تاکہ تمھاری عقلیں کامل ہو جائیں۔ جمہور نے "مُصَّدِّقِيْنَ وَمُصَّدِّقَات" کو بہ تشدیدِ صاد پڑھا ہے، "صدقة" سے ماخوذ۔ اصل میں "مُتَصَدِّقِيْنَ وَمُتَصَدِّقَات" ہے، حرفِ تاء کو صاد میں ادغام کر دیا ہے اور کسی نے (یعنی سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے) بہ اثباتِ تاء پڑھا ہے، بنا بر اصل اور کسی نے (یعنی امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے) بہ تخفیفِ صاد پڑھا ہے ماخوذ ہے تصدیق سے (یعنی جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شے میں تصدیق کی جس کو وہ لے کر آئے)۔

جملۂ ﴿ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ معطوف ہے اسم فاعل پر جو "مصدقین ومصدقات" میں ہے، کیوں کہ جب وہ الف و لام موصولہ کا صلہ واقع ہوا تو فعل کے قائم مقام ہو گیا۔ گویا یوں کہا کہ "إِنَّ الَّذِيْنَ تَصَدَّقُوْا وَأَقْرَضُوْا"۔ امام ابوعلی فارسی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ موصول محذوف کا صلہ ہے "أَيْ: وَالَّذِيْنَ أَقْرَضُوْا"۔ کسی نے کہا ہے کہ جملہ معترضہ ہے اسمِ "إِنَّ" اور اس کی خبر کے درمیان۔ جملۂ ﴿ يُضٰعَفُ لَهُمْ ﴾ ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر ہے۔ جمہور نے بہ فتحِ عین پڑھا ہے بہ صیغۂ مجہول، نائب فاعل یا تو جار و مجرور ہے یا ضمیر ہے جو "مصدقین" کی طرف پھرتی ہے، بنا بر حذف مضاف "أَيْ: يُضَاعَفُ ثَوَابُهُمْ" اور کسی نے (یعنی اعمش نے) "يُضَاعِفُهُ" بہ کسرِ عین وزیادتِ "ها" کے ساتھ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابن کثیر، ابن عامر اور یعقوب رحمہم اللہ نے) بہ تشدید وفتحِ عین پڑھا ہے۔[2]

قرضِ حسن سے مراد اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے، خلوصِ نیت اور ارادے کی صحت اور اجر وثواب حاصل کرنے کی غرض سے خرچ کرنا ہے اور یہاں پر مضاعفت یہ ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کے دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ہے اور اجرِ کریم سے مراد جنت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ہر وہ شخص جو اللہ پر ایمان لایا اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا تو وہ صدیق ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہر مومن صدیق اور شہید ہے۔[4] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ بے شک ایک شخص اپنے بچھونے پر مرتا ہے اور وہ شہید ہوتا ہے، پھر یہ آیت پڑھی۔[5]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی طرح مروی ہے۔[6] عمرو بن مرہ جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے بتائیں کہ اگر میں اس بات کی گواہی دوں کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور اس بات کی کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں اور پانچوں نمازیں پڑھوں اور زکات ادا کروں اور رمضان کے روزے رکھوں اور اس کا قیام کروں تو میں کون ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو صدیقین اور شہداء سے ہے۔[7] (أخرجه ابن حبان)

---

① فتح القدير (٢٣٠/٥) ② تفسير القرطبي (٢٥٢/١٧) ③ تفسير البغوي (٣٨/٨)
④ فتح القدير (٢٣١/٥) ⑤ تفسير الطبري (١٩٢/٢٣) ⑥ الدر المنثور (٦٠/٨)
⑦ صحيح ابن حبان (٢٢٣/٨) صحيح الترغيب والترهيب (٨٧/١)

مقاتلان (یعنی مقاتل بن حیان رحمہ اللہ اور مقاتل بن سلیمان رحمہ اللہ) نے کہا ہے کہ یہ وہ ہیں جنھوں نے رسولوں پر شک نہیں کیا، جب کہ انھوں نے ان کو خبر دی اور ان کی تکذیب نہیں کی۔ امام مقاتل بن سلیمان رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ ہیں جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ کا ایک لفظ یہ ہے کہ یہ آیت خاص طور پر شہداء کے لیے ہے اور یہ انبیاء ہیں جو اُمتوں کے لیے گواہی دیں گے۔ امام فراء اور زجاج رحمہما اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ یہ رسولوں کی اُمتیں ہیں جو قیامت کے دن اپنے انبیاء کی تبلیغ کی گواہی دیں گی۔ کسی نے کہا ہے کہ صدیقین وہ ہیں جو صدق میں مبالغہ کرنے والے ہیں، جبکہ وہ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے سارے رسولوں کی تصدیق کی اور اللہ پاک کی خاطر اس کی توحید پر قائم ہونے والے ہیں۔

ظاہر یہ ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کے سارے رسولوں پر ایمان لائے وہ بہ منزلہ صدیقین اور شہداء ہیں جو اللہ کے نزدیک بلند درجے والے مشہور ہیں۔ بالجملہ جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے کے ساتھ متصف ہوئے، اس کی وجہ سے جو خیر و خوبی ان کے لیے ہے اللہ پاک نے اس کا ذکر کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ﴾۔

پہلی ضمیر موصول کی طرف راجع ہے اور آخر کی دو ضمیریں صدیقین اور شہداء کی طرف پھرتی ہیں، یعنی ان کے لیے صدیقین اور شہداء کی طرح اجر اور نور ہے۔ اور جس نے یوں کہا ہے کہ "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" خود صدیقین اور شہداء ہیں تو اس کے قول کی بنا پر تینوں ضمیریں سب کی سب ایک شے کی طرف راجع ہوں گی، معنی یہ ہیں کہ ان کے لیے اجر اور نور ہیں جن کا ان کے لیے وعدہ کیا گیا ہے۔

پھر جب اللہ پاک نے مومنوں کا حال اور ان کا ثواب ذکر کیا تو کافروں کا حال اور ان کا عقاب ذکر فرمایا، چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا ... الآیۃ ﴾ یعنی جنھوں نے کفر بھی کیا اور تکذیبِ آیت بھی کی وہی دوزخ والے ہیں، اس سے ان کو عذاب کیا جائے گا اور ان کے لیے نہ کچھ اجر ہے نہ نور ہے، بلکہ ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب اور ہمیشہ کی ظلمت ہے۔ پھر جب اللہ پاک نے دوسرے فریق کا حال ذکر کیا اور ان سے جو کفر اور تکذیب واقع ہوئی اس کا بیان فرمایا اور یہ اس سبب سے ہوا کہ انھوں نے دنیا کی طرف میلان کیا اور اس کو اختیار کر بیٹھے۔ ان کے لیے اس کی حقارت بیان کی اور یہ ذکر کیا کہ وہ اس سے زیادہ حقیر ہے کہ دارِ آخرت پر اختیار کی جائے۔[2] چنانچہ فرمایا:

---

[1] فتح القدير (٥/٢٣٠)

[2] فتح البيان (١٣/٤١٣۔٤١٥)

اِعْلَمُوْۤا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾ سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾

تم جان لو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل تماشا اور زینت ہے اور آپس میں فخر کرنا اور ایک دوسرے پر اموال و اولاد میں کثرت جتانا ہے۔ (اس کی مثال یوں ہے) جیسے بارش کہ اس سے (پیدا شدہ) نباتات کسانوں کو خوش کرتی ہیں، پھر وہ خشک ہو جاتی ہیں تو آپ اسے زرد شدہ دیکھتے ہیں، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہیں اور آخرت میں (کفار کے لیے) شدید عذاب ہے، اور (مومنوں کے لیے) اللہ کی طرف سے مغفرت اور رضا مندی ہے اور دنیاوی زندگی تو بس دھوکے کا سامان ہے⑳ تم اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمان اور زمین کے عرض کی طرح ہے، وہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے یہ دیتا ہے، اور اللہ عظیم فضل والا ہے㉑

دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا ہے:

دنیا کی زندگی کے مختلف ادوار کو ترتیب وار ذکر کیا ہے۔ آدمی کو اول عمر میں کھیل چاہیے، پھر تماشا، پھر بناؤ سنگھار کرنا، پھر آپس میں فخر و غرور کرنا اور نام حاصل کرنا اور جب مرنے کا وقت قریب آئے تو مال اور اولاد کا فکر کہ بعد میں میرا گھر آسودہ بنا رہے، یہ سب دھوکے کی جنس ہے کہ یہ آگے کچھ کام آئے گا۔ حالانکہ یہ کچھ کام نہ آئے گا۔ انتھٰی۔

اللہ تعالیٰ دنیا کی زندگی کی حقارت اور ذلت بیان فرماتا ہے کہ اس کا حاصل امر اس کے اہل کے نزدیک صرف یہی لہو و لعب وغیرہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ

وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴾ [آل عمران: ۱۴] ''مرغوب چیزوں کی محبت لوگوں کے لیے مزین کر دی گئی ہے، جیسے: عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان دار گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی، یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور لوٹنے کا اچھا ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔''

پھر حیاتِ دنیا کی مثل بیان فرمائی اس بات میں کہ وہ ایک فنا ہونے والی تازگی اور خوبی ہے اور ایک زائل ہونے والی نعمت ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ كَمَثَلِ غَيْثٍ ... الآیة ﴾ غیث وہ بارش ہے جو لوگوں کے ناامید ہونے کے بعد آتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا ﴾ [الشوریٰ: ۲۸] ''اور وہی ہے جو لوگوں کے ناامید ہونے کے بعد بارش برساتا ہے۔'' یعنی حیاتِ دنیا کی کہاوت ایک مینہ کی طرح ہے کہ کسانوں کو اس کھیتی کا سبزہ اچھا لگتا ہے جو اس مینہ سے اگے اور جس طرح یہ کسانوں کو بھلا لگتا ہے، اسی طرح کفار کو دنیا کی زندگی بھلی لگتی ہے، کیوں کہ وہ تو سب شے سے بڑھ کر اس کے زیادہ حریص ہیں اور سب لوگوں سے زیادہ اس کی طرف مائل ہیں۔ پھر وہ کھیتی زور پر آتی ہے۔ پھر تو اس کو دیکھے کہ سبز اور تر وتازہ ہونے کے بعد زرد ہوگئی اور پھر اس کے بعد وہ خشک اور ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح دنیا کی زندگی ہے کہ پہلے تو جوانی ہوتی ہے، پھر میانہ سالی ہوتی ہے، پھر بڑھاپا اور بدصورتی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آدمی اپنی شروع کی عمر اور عنفوانِ شباب میں تر وتازہ ہوتا ہے، اس کے اعطاف اور جوانب نرم ہوتے ہیں، شکل وصورت بارونق ہوتی ہے، پھر میانہ سالی شروع ہوتی ہے تو اس کی طبیعت متغیر ہو جاتی ہے اور اپنے بعض قویٰ کو گم پاتا ہے، پھر بوڑھا ہو جاتا ہے، پھر بڑا بوڑھا ضعیف القویٰ قلیل الحرکت ہو جاتا ہے، ذرا سی چیز اس کو عاجز کر دیتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴾ [الروم: ۵۴] ''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری کی حالت میں پیدا کیا پھر اس کمزوری کے بعد توانائی دی، پھر اس توانائی کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا، جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ سب سے پورا واقف ہے اور سب پر پورا قادر ہے۔''

چونکہ یہ مثال اس پر دال تھی کہ دنیا لازمی طور پر زائل اور ختم اور فارغ ہو جائے گی اور آخرت ضرور ہونے والی ہے، اس لیے اس حال سے ڈرایا اور جو خیر وخوبی اس کے اندر ہے اس میں رغبت دلائی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ یعنی آخرت جو آنے والی اور قریب ہے، اس میں یا تو عذابِ شدید ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رضا مندی ہے۔

﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ یعنی دنیا کی زندگی تو صرف یہی ایک متاعِ فانی ہے اور اس کو دھوکا دینے والی ہے جو اس کی طرف مائل ہوا، اس لیے کہ وہ تو اس سے دھوکا کھاتا ہے اور وہ اسے اچھی لگتی ہے، یہاں

تک کہ وہ یہ اعتقاد کر بیٹھتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور گھر نہیں ہے اور نہ اس کے بعد معاد، یعنی قیامت ہے، حالاں کہ دنیا کی زندگی دارِ آخرت کی نسبت ایک حقیر اور قلیل شے ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جنت میں ایک کوڑے کے برابر جگہ دنیا وما فیہا سے بہتر ہے، تم پڑھو: ﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ (أخرجه ابن جرير)[1] یہ حدیث شریف اس اضافے کے بغیر صحیح میں ثابت ہے۔[2] واللّٰه أعلم.

سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ البتہ جنت تم میں سے کسی کے شراکِ نعل، یعنی جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے اور نار بھی اسی کے مثل ہے۔[3] (أخرجه الإمام أحمد و انفرد بإخراجه البخاري في الرقاق من حديث الثوري عن الأعمش به) چنانچہ اس حدیث شریف میں اس پر دلیل ہے کہ خیر اور شر انسان سے قریب ہے۔ جب بات یوں ٹھہری تو اسی لیے اللہ پاک نے انسان کو اس پر آمادہ کیا کہ خیرات کی طرف دوڑے، یعنی اطاعت بجا لائے اور محرمات کو ترک کرے، یہ ایسے کام ہیں کہ گناہوں کو اور لغزشوں کو اس سے دور کرتے ہیں اور اس کے لیے ثواب اور درجات کو حاصل کر دیتے ہیں۔

حصولِ بخشش و جنت کی ترغیب:

چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ سماء و ارض سے مراد جنسِ آسمان و زمین ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۳۳] ''اور اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔'' اور یہاں یوں فرمایا: ﴿ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ یعنی یہ اجر و ثواب جس کا اللہ تعالیٰ نے ان کو اہل بنایا، ان پر اس کے فضل اور امتنان اور احسان سے ہے، جیسا کہ صحیح میں ہے (اصل کے الفاظ ''كما قدمنا في الصحيح'' ہیں، شاید اس سے یہ غرض ہو کہ ہم اس مضمون کو شرح بخاری میں پہلے لکھ چکے ہیں، اس لیے کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی بخاری پر شرح ہے۔ واللّٰه أعلم) کہ فقرائے مہاجرین نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! دولت مند لوگ بلند درجات اور نعیمِ مقیم لے گئے، فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کی کہ وہ نماز پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں اور وہ خیرات کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے اور وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے، فرمایا کہ کیا پھر میں تمھیں ایک ایسی شے سے آگاہ نہ کر دوں کہ جب تم اس کو کر لو تو تم اس سے آگے بڑھ جاؤ جو تمھارے بعد ہے اور نہ ہو تم سے کوئی افضل مگر

[1] تفسير الطبري (۷/۴۵۳، ۴۵٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۰۷۸)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٢٣) مسند أحمد (۱/۳۸۷)

وہ جس نے تمھاری طرح کیا، تم ہر نماز کے بعد تینتیس (۳۳) بار تسبیح کرو اور تکبیر کہو اور حمد کرو، چنانچہ وہ لوٹ گئے۔ پھر عرض کی کہ ہمارے مال دار بھائیوں نے بھی سن لیا اور جو کچھ ہم نے کیا انھوں نے بھی ویسا ہی کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ لعب تو باطل ہے اور لہو ہر وہ شے ہے جس سے لہو کیا جائے، پھر وہ جاتی رہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: لعب ولہو کھانا پینا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ہر لعب لہو ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ لعب وہ شے ہے جس نے دنیا میں راغب کیا اور لہو وہ ہے جس نے آخرت سے غافل اور مشغول کیا۔ کسی نے کہا: لہو اقتنا ہے، یعنی مال کا ذخیرہ کرنا اور لعب عورتیں ہیں۔ اس کی تحقیق سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔[3] زینت متاعِ دنیا سے بناؤ سنگار کرنا ہے لباس وزیور اور ان جیسی دوسری چیزوں کے ساتھ اور آخرت کے لیے عمل کیے بغیر۔ ﴿ تَفَاخُرٌ ﴾ کو جمہور نے بہ تنوین پڑھا ہے اور ظرف، یعنی ﴿ بَيْنَكُمْ ﴾ اس کی صفت اور اس کا معمول ہے اور سلمی نے بہ اضافت، یعنی اس کے ساتھ فخر کرتا ہے بعض تمھارا بعض پر۔ کسی نے کہا کہ خلقت وقوت کے ساتھ تفاخر کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ حسب ونسب کے ساتھ فخر کرتے ہیں جس طرح کہ عرب لوگ کرتے تھے۔

﴿ تَكَاثُرٌ ﴾ ادعائے استکثار ہے اموال واولاد میں، یعنی اپنے مال اور اولاد کی بہتات کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس سے تکبر کرتے ہیں، ان لوگوں پر جو اُن سے کم تر ہیں۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جان رکھو کہ دنیا کی زندگی تو یہی ایک لعب ہے بچوں کی کھیل کی طرح، اور لہو ہے جوانوں کی لہو کی طرح اور بناؤ ہے عورتوں کے بناؤ سنگار کی طرح اور آپس میں اقران (قریبی لوگ) کی طرح ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے اور دہقان (کسان) کی طرح ایک دوسرے پر کثرتِ پیداوار کی بنا پر فخر کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل کا دنیا کے کاموں میں مشغول ہونا انہیں پانچ امور میں ہی چکر کھاتا ہے، یہ سب امور جمع ہوں یا نہ ہوں۔ امام قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دنیائے مذموم وہی شے ہے جو بندے کو آخرت سے غافل کرتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ شے جو اس کو آخرت سے باز رکھے تو وہی دنیا ہے۔

رہی طاعات اور وہ شے جو اُن پر اعانت کرتی ہے تو یہ آخرت کے امور سے ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے فرمایا: تو دنیا پر رنج مت کر، بے شک دنیا تو پانچ چیزیں ہیں: ماکول، مشروب، ملبوس، مشموم، مرکوب اور منکوح۔ پس اس کا بہترین طعام تو شہد ہے، حالاں کہ وہ مکھی کی تھوک ہے اور اس کے پینے کی اکثر شے پانی ہے، حالاں کہ اس میں سارے حیوان برابر ہیں اور اس کا بہترین لباس دیباج ہے، حالانکہ وہ کیڑے کا بنایا ہوا ہے اور اس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٥) تفسير ابن كثير (٣٩٩/٤، ٤٠٠)

[2] تفسير القرطبي (٢٥٤/١٧) [3] رقم الآية (٣٢)

کا افضل مشموم مشک ہے، حالاں کہ وہ ایک چوہے کا خون ہے اور بہترین سواری گھوڑا ہے، حالاں کہ مرد اس پر مارے جاتے ہیں، رہا منکوح سو وہ عورتیں ہیں، حالاں کہ وہ مبال فی مبال ہیں[1] (یعنی نکاح کا حاصل یہ ہے کہ ایک پیشاب کی جگہ دوسرے پیشاب کی جگہ میں گھسائی جاتی ہے جو سب لذتوں کی راس اور رئیس ہے اس کا یہ حال ہے)۔

پھر اللہ سبحانہ نے اس حیات کی ایک مثال اور ایک تشبیہ بیان کی، چنانچہ فرمایا: ﴿ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ﴾ کفار جمع ہے کافر کی۔ کافر کھیتی کرنے والے کو کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ بیج کو مٹی سے چھپاتا ہے۔ کفر بہ معنی ستر و تغطیہ ہے، جیسے کافر ایمان کے انوار کو چھپاتا ہے، اس انکار اور سرکشی سے جو اس سے حاصل ہوتی ہے، یعنی حیاتِ دنیا کی مثال باران (بارش) کی طرح ہے کہ کھیتی کرنے والے کو وہ سبزہ اچھا لگا جو اس بارش سے حاصل ہوا۔

﴿ ثُمَّ يَهِيْجُ ﴾ یعنی پھر وہ سبزہ اپنی تازگی اور سبزی کے بعد خشک ہوتا ہے۔ یہ قول امام ابو السعود رحمہ اللہ کا ہے۔[2] کسی نے "یَیْبَسُ" کہا ہے: (﴿ يَهِيْجُ ﴾ کے معنی "یجف" امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہے اور کسی نے "ییبس" کہے، حاصل ایک ہے، یہ معنی واقع میں خشک ہیں آیت کے مناسب نہیں ہیں)۔ ان دونوں قولوں میں تسامح ہے، کیوں کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ پھر وہ سبزہ حرکت کرتا رہتا ہے، اس حالت کی طرف جو انتہا کی اس کو حاصل ہوتی ہے تو اب یہ معنی ہوئے کہ پھر وہ خوب لمبا ہوتا ہے، یعنی جس قدر لمبا ہونے کی اس میں لیاقت ہے۔ ﴿ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ﴾ (کسی نے "مصفرا" بھی پڑھا ہے)۔ یعنی پھر تو اس کو دیکھتا ہے اس سبزی اور رونق سے متغیر ہو کر صفرت و ذبول کی طرف منتقل ہوتا ہے، یعنی پیلا اور کمزور ہو جاتا ہے۔

﴿ ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ﴾ یعنی پھر وہ سوکھنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ دنیا کے حال کی اور اس کے جلد ختم ہو جانے کی باوجود اس کی قلتِ نفع کی تشبیہ اس روئیدگی سے دی ہے جس کو مینہ نے اگایا، پھر وہ سیدھی اور قوی ہوئی اور جو اس کی طرف نظر کرنے والے ہیں ان کو اچھی لگی اس کی سبزی اور تازگی کی وجہ سے، پھر وہ نہیں ٹھہرتی کہ ریزہ ریزہ خشک گھاس ہو جاتی ہے گویا وہ تھی ہی نہیں۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ دنیا کی حیات کھیتی کی مثل ہے جس کو مینہ نے اُگایا اور کفار اس سے خوش ہوئے جو اللہ کی نعمت اس بارش کے منکر ہیں اور اس روئیدگی کے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی۔ پھر اللہ سبحانہ نے اس پر آفت بھیجی تو وہ سوکھ گئی اور زرد پڑ گئی اور ریزہ ریزہ ہوگئی، ان کے انکار کی سزا کے طور پر جیسا کہ باغ والوں کے اور دو باغ والے کے ساتھ کیا۔ اس مثل کی تفسیر سورت یونس[3] اور سورۃ الکہف[4] میں گزر چکی ہے۔

پھر اللہ سبحانہ نے دنیا کی حقارت اور اس کا جلد زائل ہونا ذکر کیا تو جو شے دارِ آخرت میں نافرمانوں کے لیے تیار کی ہے اور جو چیز فرمانبرداروں کے لیے مہیا کر رکھی ہے اس کا بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ﴾ خبر دی کہ آخرت میں سخت عذاب ہے اور اللہ سے مغفرت ہے اور

---

[1] تفسير القرطبي (١٧/٢٥٥) [2] تفسير أبي السعود (٨/٢١٠) [3] رقم الآية (٢٤) [4] رقم الآية (٤٥)

رضوان ہے۔ یہ خوب معنی ہیں، یعنی عذاب کا مقابلہ دو چیزوں سے کیا: ایک تو مغفرت ہے اور دوسری رضوان۔ تو اب یہ "لَنْ يَغْلِبَ عُسْرٌ يُسْرَيْنِ" کے باب سے ہے اور دونوں کو جو نکرہ رکھا ہے تو یہ تعظیم کے لیے ہے۔ (خطیب نے خوب فرمایا ہے، جبکہ اللہ پاک نے ظلِ زائل کا ذکر کیا تو اس کے بعد اس کی دو قسمیں کر کے ثابت دوائم کا ذکر فرمایا، چنانچہ ارشاد کیا: ﴿ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾ یہ ایک قسم ہوئی۔ دوسری قسم یہ ذکر کی: ﴿ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ﴾)۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذابِ شدید اللہ کے دشمنوں کے لیے ہے اور اللہ سے مغفرت اور رضوان اس کے دوستوں اور اہلِ طاعت کے لیے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقدیر آیت میں یہ ہے: "إِمَّا عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَإِمَّا مَغْفِرَةٌ"، تو اب ﴿ شَدِيْدٌ ﴾ پر وقف نہ کیا جائے گا۔[1]

پھر اللہ پاک نے ترہیب و ترغیب کے بعد دنیا کی حقارت ذکر کی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ یہ جملہ بیان کی گئی مثال کے لیے مقرر و موکد ہے، یعنی دنیا کی زندگی تو یہی دھوکے کی جنس ہے، اس کے لیے جس نے اس سے دھوکا کھایا اور اس کی طرف مائل ہوا اور اس پر بھروسا کر بیٹھا اور اس کے لیے عمل کیا اور آخرت کے واسطے عمل نہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ فی نفسہٖ دھوکا ہے، اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ یہ معنی اس کے مقتضی ہیں کہ اضافت بیانی ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ نہیں ہے تمتع دنیا کے ساتھ مگر متاع، یعنی تمتع جو غرور ہے، یعنی دھوکا کھانا۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: متاعِ غرور ہے اس کے لیے کہ جو آخرت کی طلب میں مشغول نہ ہوا اور جو اس کی طلب میں مشغول ہوا تو اس کے لیے متاعِ بلاغ ہے، یعنی اسے اس شے کی طرف پہنچا دے گی جو اس سے بہتر ہے۔[2]

ذوالنون مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں او مریدوں کے گروہ! تم دنیا کو مت طلب کرو اور اگر تم اسے طلب کرو تو اسے محبوب مت رکھو، بے شک توشہ اس سے ہے اور مقیل اس کے غیر میں[3] (مقیل یعنی خواب گاہ۔ کسی نے خوب کہا ہے: "دنیا را بازی دادیم نان اینجا خوردیم و کار آنجا کردیم")۔

بالجملہ جب یہ قرار پایا کہ آخرت میں عذابِ شدید ہے اور مغفرت اور رضوان بھی ہے اور یہ سب دائم و باقی ہے اور حیاتِ دنیا صرف دھوکے کی ایک جنس ٹھہری تو اللہ پاک نے اپنے بندوں کو اس طرف بلایا کہ توبہ و عملِ صالح کی طرف دوڑیں جو مغفرت کے موجب ہیں، اس لیے کہ یہ جنت کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ یعنی اے لوگو! تم عملِ صالح کرنے میں جلدی کرو جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں نے عملِ صالح کرنے کے لیے جلدی کی، وہ عملِ صالح جو تمھارے لیے تمھارے رب کی مغفرت کا سبب بنیں اور تم ان گناہوں سے توبہ کرو جو تم سے ہو چکے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آیت سے مراد امام کے ساتھ پہلی تکبیر کہنا ہے، یہ قول مکحول ریحانۃ الشام

---

[1] فتح القدير (٢٣٣/٥) [2] تفسير البغوي (٣٩/٨) [3] تفسير النسفي (٢١٩/٤)

کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز کی پہلی صف میں شامل ہونا ہے۔

یہ باتیں بلا شک عمدہ اور ثوابِ عظیم کا سبب ہیں، لیکن جو مضمون آیت میں ہے، اس کی ایسے امور سے تخصیص کرنا بلا وجہ ہے، بلکہ یہ امور تو ان امور میں سے ہیں جن پر آیت صادق آتی ہے بطور صدقِ شمولی یا بدلے کے۔ حاصل معنی یہ ہیں کہ تمھاری مفاخرت اور مکاثرت دنیاوی امور میں نہ ہو، جیسا کہ تمھارا طرزِ عمل ہے، بلکہ تمھیں چاہیے کہ تمھاری مسابقت (ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ و دو) آخرت کی طلب میں ہو۔

﴿ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ﴾ یعنی اور مسابقت کرو ایسی جنت کی طرف جس کا عرض آسمان اور زمین کے عرض کی طرح ہے، جب اس کے عرض کا یہ اندازہ ہے تو پھر اس کے طول کا تم کیا خیال کر سکتے ہو! امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس طرح سے کہ سات آسمان اور سات زمینیں پھیلائی ہوئی ہوں ایک دوسرے سے ملا کر۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد اس جنت سے جس کا عرض یہ عرض ہے، وہ جنت ہے ہر ایک اہلِ جنت کے لیے ہے۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد تمام جنات میں سے ایک جنت ہے اور عرض طول سے کم ہوتا ہے۔ یہ بات عرب کی عادت سے ہے کہ وہ کسی شے کی تعبیر اس کے عرض سے کرتے ہیں نہ کہ اس کے طول کے ساتھ۔[1] کسی نے کہا ہے کہ عرض سے مراد وسعت اور فراخی ہے، طول کی ضد مراد نہیں ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴾ [حم السجدة: ٥١]۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ تو بندوں کے لیے ایک تمثیل ہے اس شے کے ساتھ جس کو وہ سمجھتے ہیں اور یہ چیز ان کے دلوں اور سوچوں میں واقع ہوتی ہے، مگر پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ اس کی تفسیر سورت آلِ عمران میں گزر چکی ہے۔[2]

پھر اللہ پاک نے اس جنت کی ایک اور صفت بیان فرمائی: ﴿ أُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ﴾ یعنی وہ ایسی جنت ہے جو ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جملہ مستانفہ ہو۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جنت مخلوق ہے اور اس بات کی کہ صرف اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے سے جنت کا استحقاق ہو جاتا ہے، لیکن یہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ اس کا مستحق وہی ہوتا ہے جس نے اس شے کے ساتھ عمل کیا جو اللہ تعالیٰ نے اس پر فرض کی اور بچتا رہا اس شے سے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منع فرمایا ہے۔ اس کے دلائل کتاب و سنت میں بہت ہیں۔

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ یعنی یہ جو اللہ پاک نے مغفرت اور جنت کا ذکر فرمایا ہے، یہ اللہ کا فضل ہے وہ ازراہِ تفضّل و احسان جس کو دینا چاہتا ہے اسے عطا کرتا ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ کوئی جنت میں داخل نہ ہو گا مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے نہ کہ اپنے عمل سے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ چنانچہ وہ تفضّل فرماتا ہے جس پر چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے۔ ولا مانع لما أعطى ولا معطي لما

[1] تفسیر القرطبي (١٧/٢٥٦) [2] رقم الآية (١٣٣)

منع والخير كله بيده وهو الكريم المطلق والجواد الذي لا يبخل فلا يبعد منه التفضل بذلك وإن عظم قدره. پھر اللہ پاک نے بیان کیا کہ بندوں کو جو مصائب پہنچتے ہیں، ان کے ساتھ اس کی قضا اور قدر سابق ہو چکی، یعنی پہلے سے طے ہو چکی ہے اور ام الکتاب میں وہ ثبت ہو چکی ہے۔[1] چنانچہ فرمایا:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٢٢﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ﴿٢٣﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٤﴾

زمین میں اور تمھاری جانوں پر جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ تو کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے (22) تاکہ تم اس (چیز) پر غم نہ کھاؤ، جو تم سے جاتی رہے اور تم اس پر نہ اتراؤ، جو وہ تمھیں عطا کرے اور اللہ ہر اِترانے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا (23) وہ لوگ جو (خود بھی) بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل (کرنے) کا حکم دیتے ہیں اور جو شخص (احکامِ الٰہی سے) منہ پھیرے تو بلاشبہہ اللہ تو وہی بے پروا، نہایت قابلِ تعریف ہے (24)

انسان کو پہنچنے والی مصیبت تقدیرِ الٰہی سے ہے:

اللہ تعالیٰ اپنی تقدیر کی خبر دیتا ہے جو اس کی خلق میں سابق ہو چکی ہے، یعنی جو بھی مصیبت آفاق میں یا تمھاری جانوں میں پہنچتی ہے وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم خلیقہ کو اور نسمہ کو پیدا کریں (خلیقہ کے معنی خلق ہیں اور نسمہ کے معنی روح اور نفس ہے)۔ بعض نے کہا کہ ﴿ نَّبْرَاَهَا ﴾ کی ضمیر نفوس کی طرف راجع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مُّصِيْبَةٍ ﴾ کی طرف راجع ہے، بہتر یہ ہے کہ بریہ و خلیقہ کی طرف پھرے، اس لیے کہ کلام اس پر دال ہے، جیسا کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود منصور بن عبدالرحمان سے روایت کیا ہے۔ کہا: میں حسن رحمہ اللہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص نے کہا کہ تو ان سے اس آیت کے متعلق پوچھ، چنانچہ میں نے ان سے اس آیت کے متعلق

[1] فتح البیان (۱۳/۴۱۵_۴۱۸)

پوچھا تو فرمایا: اس میں کون شک کرتا ہے کہ ہر مصیبت جو آسمان و زمین کے درمیان ہے وہ اللہ کی کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ وہ نسمہ کو پیدا کرے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ ﴾ تو سنون ہے، یعنی قحط سالی اور ﴿ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ﴾ اوجاع و امراض ہیں۔ کہا: اور ہم کو یہ بات پہنچی ہے، کوئی نہیں ہے کہ اس کو کسی لکڑی کی خراش پہنچے اور نہ رنج کسی قدم کا (یعنی درد یا چوٹ وغیرہ) اور نہ پھڑکنا کسی رگ کا مگر کسی گناہ کے سبب سے اور جو کچھ اللہ درگزر فرما دیتا ہے، وہ بہت زیادہ ہے۔[1] یہ آیتِ کریمہ وعظیمہ قدریہ پر سب دلیلوں سے بڑھ کر دلیل ہے جو علمِ سابق کی نفی کرنے والے ہیں۔قبحهم الله تعالیٰ۔سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: « قَدَّرَ اللّٰهُ الْمَقَادِيْرَ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ »[2] (رواه الإمام أحمد ورواه مسلم في صحيحه من حديث عبد الله بن وهب وحيوة بن شريح و نافع بن زيد، وثلاثتهم عن أبي هاني به و زاد ابن وهب "وَكان عرشه على الماء" و رواه الترمذي وقال: حسن صحيح)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے مقادیر کو مقدر کیا۔

﴿ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ یعنی اللہ پاک کا اشیاء کو جاننا اور ان کو اس کے مطابق لکھنا جو وہ اپنے وقت میں پائی جائیں گی سہل و آسان ہے، کیوں کہ وہ تو اس شے کو جانتا ہے جو ہو گئی اور جو آئندہ ہو گی اور جو نہیں ہوئی اگر وہ ہوتی تو کیسے ہوتی۔

صبر و شکر کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ﴾ یعنی یہ بات کہ ہمارا علم متقدم ہو چکا ہے اور ہمارا لکھنا اشیاء کو ان کے ہونے سے قبل اور ہمارا کائنات کو مقدر کرنا اس کے وجود سے قبل پہلے سے طے ہو چکا ہے۔ ہم نے تم کو یہ بات بتا دی، تا کہ تم یہ جان لو کہ جو شے تم کو پہنچی وہ تم سے چوکنے والی نہیں تھی اور جو شے تم سے چوک گئی وہ تم کو لگ نہیں سکتی تھی تو اب تم غم نہ کھایا کرو اس شے پر جو تم سے فوت ہو گئی، کیوں کہ اگر کوئی شے مقدر کی جاتی ہے تو وہ ضرور ہوتی ہے اور تم نہ خوش ہوا کرو اس شے سے جو تم کو آئی۔ کسی نے "اٰتٰكُمْ" پڑھا ہے "أَيْ: أَعْطَاكُمْ" یعنی جو تم کو دی۔ یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں، یعنی تم لوگوں پر اس شے کے ساتھ فخر نہ کرو جس کا اللہ نے تم پر انعام کیا، کیوں کہ یہ کچھ تمھاری سعی سے نہیں ہے اور نہ تمھاری محنت و مشقت سے وہ تو اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہے اور اس کی روزی سے ہے جو تم کو دی، اس لیے اب تم اللہ کی نعمتوں کو اشر و بطر نہ ٹھہراؤ کہ ان سے لوگوں پر فخر کرو اور بڑائیاں مارو۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہر اترانے والے اور اپنے

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/١٩٦)
[2] صحيح مسلم (٢٦٥٣) مسند أحمد (٢/١٦٩) سنن الترمذي (٢١٥٦)

غیر پر اپنے جی میں بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: کوئی نہیں ہے مگر حال یہ ہے کہ وہ خوش ہوتا ہے اور رنج کرتا ہے، لیکن تم فرح کو تو شکر ٹھہراؤ اور حزن کو صبر ٹھہراؤ۔[1]

بخل کی مذمت:

پھر فرمایا: ﴿ اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴾ یعنی وہ جو برا کام کرتے ہیں اور لوگوں کو اس پر برانگیختہ کرتے ہیں اور جو کوئی اللہ کے امر اور اطاعت سے منہ موڑے تو بے شک اللہ خود ہی بے پروا ہے اور تمام خوبیوں اور حمد والا ہے، جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴾ [إبراهيم: ٨] ”اگر تم سب اور روئے زمین کے تمام انسان اللہ کی ناشکری کریں تو بھی اللہ بے نیاز اور تعریفوں والا ہے۔“[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ مصیبتِ ارضی سے مراد یہ امور ہیں: زلزلہ، قحطِ باران، خشک سالی، پیداوار کی کمی وضعف، پھلوں کی کمی اور زراعت کی آفت۔ مصیبت کا لفظ شر میں غالب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سارے حوادث مراد ہیں جو خیر و شر سے ہوتے ہیں۔ پہلے قول کی بنا پر جو خاص کر کے مصیبت کا ذکر کیا خیر کا نہ کیا تو صرف اس لیے کہ وہ انسان کے لیے زیادہ اہم ہے۔ مصیبتِ انفسی سے مراد دکھ اور بیماریاں ہیں۔ (كما قاله قتادة) امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حدوں کا قائم کرنا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ معاش کی تنگی ہے۔[3] کسی نے کہا کہ اولاد کا مرنا ہے۔ لفظ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

﴿ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ ﴾ حال ہے ﴿ مُصِیْبَةٍ ﴾ سے اور ﴿ كِتٰبٍ ﴾ سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ ﴿ نَّبْرَاَهَا ﴾ کی ضمیر یا تو مصیبت کی طرف پھرتی ہے یا ”انفس“ کی طرف (سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک شے ہے کہ جس سے فراغت کی جا چکی اس سے پہلے کہ نفوس پیدا کیے جائیں[4])۔ یا ”ارض“ کی طرف، یا ان سب کی طرف راجع ہے۔[5] (كما قاله المهدوي) یہ قول خوب ہے۔ معنی یہ ہیں: نہیں پہنچتی کوئی مصیبت زمین میں اور نہ تمھاری جانوں میں مگر حال یہ ہے کہ وہ لوحِ محفوظ میں اس سے بھی پہلے سے لکھی ہوئی ہے کہ ہم اس کو پیدا کریں بے شک اس کا کتاب میں ثبت کرنا باوجود اس کی کثرت کے اللہ پر آسان ہے کچھ مشکل نہیں ہے۔

﴿ لِّكَیْلَا ﴾ کا لام محذوف سے متعلق ہے: ”أَيْ: أَخْبَرْنَاكُمْ“، یعنی ہم نے تم کو یہ خبر دی کہ ہم تقدیر سے

---

(1) تفسير البغوي (٤٠/٨) (2) تفسير ابن كثير (٤٠٠/٤، ٤٠١) (3) فتح القدير (٢٣٤/٥)

(4) تفسير الطبري (١٩٥/٢٣، ١٩٦) (5) اللباب في علوم الكتاب (٤٩٢/١٨)

فارغ ہو چکے، تا کہ تم اس شے پر رنج نہ کرو جو تم سے فوت ہو چکی، یعنی دنیا اور اس کی فراخی یا عافیت اور اس کی صحت۔ اور خوشی نہ کرو ایسی خوشی جو اِترانے والے اور فخر کرنے والے کرتے ہیں، اس شے کی وجہ سے جو تم کو دنیا میں سے عطا کی، کیوں کہ یہ تو عن قریب زائل ہو جائے گی اور اس کی مستحق نہیں ہے کہ اِس کے حاصل ہونے پر خوشی کی جائے اور نہ اس کے فوت ہونے پر رنج کیا جائے۔ جمہور نے "آتاکم" بہ مد پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابو العالیہ، نصر بن عاصم اور ابو عمرو رحمہم اللہ نے) بہ قصر پڑھا ہے۔ "أَيْ: جَاءَكُمْ"

امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے پہلی کو اختیار کیا ہے اور امام ابو عبید رحمہ اللہ نے دوسری قراءت کو۔[1] کسی نے کہا ہے کہ فرح وحزن جن سے نہی کی گئی، یہ وہ ہیں جن میں تجاوز کیا جاتا ہے اس شے کی طرف جو جائز نہیں، ورنہ کوئی ایسا نہیں ہے جو رنج نہیں کرتا اور خوش نہیں ہوتا، لیکن ہونا یہ چاہیے کہ فرح تو شکر ہو اور حزن صبر ہو۔ حزن سے جو لازم آتا ہے وہ جزع ہے جو صبر کے منافی ہے اور فرح سے جو انسان سرکش اور ملہی ہوتا ہے شکر سے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کو غمی یا خوشی نہ آئے۔

یہ جو فرمایا کہ دنیا میں اور تمھاری جانوں میں جو مصیبت آتی ہے، وہ پہلے سے ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے، یہ اس لیے ہے کہ جس شخص کو کوئی مصیبت پہنچی تو اس کے لیے صبر ٹھہرایا اور جس شخص کو کوئی بھلائی پہنچے تو اس کے لیے شکر قرار دیا۔[2] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ معاش کے مصائب مراد ہیں، دین کے مصائب مراد نہیں ہیں، ان کو یہ امر فرمایا ہے کہ سیئہ پر رنج کریں اور حسنہ سے خوش ہوں۔[3] امام جعفر باقر بن محمد صادق رحمہ اللہ نے فرمایا: "يَا ابْنَ آدَمَ مَالَكَ تَأْسَفُ عَلَى مَفْقُودٍ لَا يَرُدُّهُ إِلَيْكَ الْفَوْتُ، وَمَا لَكَ تَفْرَحُ بِمَوْجُودٍ وَلَا يَتْرُكُ فِي يَدَيْكَ الْمَوْتُ"[4] یعنی اے ابن آدم! تجھے کیا ہے کہ تو ایسی گم شدہ شے پر غمگین ہوتا ہے جس کو فوت (نیست ہو جانا، گم ہو جانا) تیری طرف پھیر نہیں لاتا اور کیا ہے تجھے کہ تو خوش ہوتا ہے ایسی موجود شے سے جس کو موت تیرے ہاتھوں میں نہ چھوڑے گی۔

بالجملہ وہ خوشی جو شکر سے خالی ہوتی ہے وہ مذموم ہے، اسی لیے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو دوست نہیں رکھتا جو اختیال (اترانا) اور افتخار (شیخی مارنا) کے ساتھ متصف ہے۔ کسی نے کہا: یہ اس خوشی کی مذمت ہے جس میں کوئی شخص تکبر کرتا ہے اور اتراتا ہے۔ کسی نے کہا کہ جو شخص دنیا کی بہرہ مندیوں سے خوش ہوا اور وہ اس کے دل میں زیادہ اہم ہوئیں تو وہ شخص اترایا اور ان پر فخر کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ مختال وہ ہے جو اپنے نفس کی طرف نظر کرتا ہے اور ﴿ فَخُوْرٍ ﴾ وہ ہے جو حقارت سے لوگوں کی طرف نظر کرتا ہے۔ ان دو صفتوں کی بہتر تفسیر اُن کے شرعی معنوں کے ساتھ اور پھر لغوی معنوں کے ساتھ ہے، چنانچہ جس میں یہ دونوں حاصل ہوں تو اسی کو اللہ تعالیٰ محبوب نہیں رکھتا۔

---

[1] تفسير القرطبي (۲۵۸/۱۷) [2] تفسير الطبري (۱۹۸/۲۳) [3] الدر المنثور (۶۲/۸) [4] تفسير البغوي (۴۰/۸)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ﴾ محلِ رفع میں ہے بنا بر ابتداء اور خبر محذوف ہے "أَيْ: اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ فَاللّٰهُ غَنِيٌّ عَنْهُمْ" (اس پر یہ آیت دال ہے: ﴿ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾) اور ایک علاحدہ کلام ہے۔ ماقبل سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے، یعنی جو لوگ بخل کرتے ہیں تو اللہ ان سے بے پروا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ محلِ جر میں ہے ﴿ مُخْتَالٍ ﴾ سے بدل ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ محلِ جر میں ہے ﴿ مُخْتَالٍ ﴾ کی صفت ہے۔ یہ دونوں قول بعید ہیں، اس لیے کہ جو شے ہاتھ میں ہے اس کے ساتھ بخل کرنا اور لوگوں کو بخل کا امر کرنا یہ ﴿ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴾ کے معنی نہ تو لغتاً ہیں نہ شرعاً۔

معنی یہ ہیں کہ جو اس شے کے ساتھ بخل کرتے ہیں جو اُن پر مال سے واجب ہے، جیسے: زکات و کفارہ یا علم کا سکھانا اور اس کا پھیلانا، جیسا کہ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علم کے ساتھ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا امر کرتے ہیں، تاکہ لوگوں کو کچھ نہ سکھائیں یا نبیِ کریم ﷺ کے اوصاف ظاہر کرنے میں بخل کرتے ہیں، جیسا کہ امام سدی اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہودیوں کے سردار ہیں جنھوں نے نبی اکرم ﷺ کی صفت بیان کرنے کا بخل کیا جو ان کی کتابوں میں لکھی ہوئی تھی، تاکہ لوگ ان پر ایمان نہ لائیں تو ان کے کھانے پینے کے اسباب جاتے رہیں۔

امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ کا حق ادا کرنے سے بخل کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صدقہ دینے میں بخل کرنا ہے۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس شے میں بخل کرنا جو اس کے ہاتھ میں ہے۔[1] غرض یہ کہ جو لوگ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں کوئی سا بھی بخل ہو تو اللہ ان سے بے پروا ہے اس کو کسی کی حاجت نہیں ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ یعنی اور جو کوئی بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنے سے اعراض کرے تو بے شک اللہ اس سے بے نیاز ہے۔ اپنی خلق کے نزدیک محمود ہے، یہ اس کو کچھ ضرر نہیں دیتا۔

جمہور نے "بخل" کو بہ ضمِ باء و سکونِ خاء پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی سیدنا انس رضی اللہ عنہ، عبید بن عمیر، یحییٰ بن یعمر، مجاہد، حمید، ابن محیصن اور حمزہ و کسائی رحمہم اللہ نے) بہ فتحِ ہر دو پڑھا ہے۔ یہ لغت انصار کا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابو العالیہ اور ابن سمیفع رحمہما اللہ نے) پہلے حرف کو فتح کے ساتھ اور دوسرے کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور کسی نے (یعنی نصر بن عاصم نے) دونوں حروف کو ضم کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ سب لغات ہیں اور جمہور نے بہ اثباتِ ضمیرِ فصل پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی نافع و ابن عامر رحمہما اللہ نے) اس کو حذف کیا ہے۔[2] کلمۂ ﴿ هُوَ ﴾ مصاحفِ مدینہ و شام میں ساقط ہے اور باقی قراء کے مصاحف میں ثابت ہے، چنانچہ ہر ایک نے اپنے مصحف امام کا اتباع کیا ہے۔ (كذا في شيخ وزاده) بالجملہ جب اللہ پاک نے اس بات پر آمادہ کیا کہ جو شے مغفرت و جنت کی موجب ہے اس کی طرف دوڑیں اور ان کی موجبات کی تفصیل نہیں فرمائی کہ وہ کیا ہیں تو اس لیے یوں ارشاد فرمایا:[3]

[1] تفسير القرطبي (٢٥٩/١٧) [2] تفسير القرطبي (٢٥٩/١٧، ٢٦٠) [3] فتح البيان (١٣/٤١٩-١٢٠)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٢٥﴾

البتہ تحقیق ہم نے اپنے رسول واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی، تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا، اس میں سخت لڑائی (کا سامان) اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں، اور تا کہ اللہ اسے جان لے جو بن دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ قوی وعزیز ہے ﴿25﴾

رسولوں کو معجزات اور عدل وحق کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے:

کتاب اور ترازو شاید اسی ترازو کو کہا جو تولنے کے لیے ہے اور یہ انصاف کا سبب ہے۔ یا شریعت کو فرمایا جس سے جھوٹے اور سچے کی تمیز ہو جائے۔ انتہٰی

یعنی رسولوں کو بینات دے کر بھیجنا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کا اتارنا اس لیے ہے کہ دین و دنیا کی تمام مصلحتیں پوری ہو جائیں۔ چنانچہ جس شخص نے اپنے عقائد و اخلاق واعمالِ جوارح اللہ کی کتاب کی تعلیمات کے مطابق بنا لیے اور خلق کے معاملے میں میزان کو استعمال کیا تو واقعی اس نے ایسی شے کی طرف مسارعت (جلدی کی یا پیش قدمی کی) جس سے مغفرت اور جنت واجب ہوتی ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ ''بینات'' سے مراد معجزات اور واضح حجتیں اور قطعی دلائل ہیں اور ''کتاب'' نقلِ صدق ہے، یعنی اس میں سچے احکام منقول ہیں اور ''میزان'' عدل ہے۔ یہ قول امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہما کا ہے[1] اور یہ وہ حق ہے جس کی صحیح اور مستقیم عقلیں اور مخالف اور کمزور آراء گواہی دیتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ ﴾ [هود: ١٧] ''کیا وہ شخص جو اپنے رب کے پاس کی دلیل پر ہو اور اس کے ساتھ اللہ کی طرف کا گواہ ہو۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ﴾ [الروم: ٣٠] ''اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ﴾ [الرحمن: ٧] ''اسی نے آسمان کو بلند کیا اور اسی نے ترازو رکھی۔''

اسی لیے اس آیت میں یوں فرمایا: ﴿ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ یعنی تا کہ لوگ حق و عدل کے ساتھ قائم

[1] تفسیر ابن کثیر (٤٠١/٤)

ہوں اور یہ رسولوں کی پیروی کرنا ہے اس شے میں جس کی انھوں نے خبر دی ہے اور اس شے میں ان کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے جس کا انھوں نے امر کیا۔ بے شک جو شے وہ لے کر آئے وہ ایسا حق ہے کہ اس کے علاوہ کوئی حق نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ [الأنعام: ۱۱۵] ''آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے۔'' یعنی صدق تو اخبار میں اور عدل اوامر ونواہی میں، اسی لیے جب مومن جنت کے غرفوں میں اور بلند منزلوں میں اور سررِ مصفوفہ میں متمکن ہوں گے تو خوش ہو کر یوں کہیں گے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ﴾ [الأعراف: ٤٣] ''اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتا واقعی ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے۔''

لوہے کے فوائد:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اور ہم نے لوہے کو اتارا اس شخص کو روکنے والا ہے جس نے حق کا انکار کیا اور اس کے ساتھ دشمنی رکھی، اس پر حجت قائم ہونے کے بعد اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے نبوت کے بعد تیرہ برس مکے میں اقامت فرمائی۔ آپ کی طرف مکی سورتوں کی وحی کی جاتی تھی، وہ سب کی سب مشرکوں کے ساتھ بحث ومباحثہ وجدال ہیں اور توحید کا بیان اور وضاحت ہیں اور بینات اور دلائل ہیں، پھر جب اس پر حجت قائم ہو چکی جس نے مخالفت کی تو اللہ پاک نے ہجرت مشروع فرمائی اور ان کو تلواروں سے لڑنے کا حکم دیا اور جن لوگوں نے قرآن شریف کی مخالفت اور تکذیب کی اور اس سے دشمنی رکھی ان کی گردنیں مارنے کا اور کھوپڑیاں اڑانے کا حکم دیا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ میں قیامت سے پہلے تلوار دے کر مبعوث ہوا ہوں، یہاں تک کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی جائے۔ اور میرا رزق میرے نیزے کے سائے تلے ٹھہرایا گیا ہے اور اس شخص پر ذلت و رسوائی ڈال دی گئی جس نے میرے امر کی مخالفت کی اور جو شخص کسی قوم کے مشابہ ہوا تو وہ ان میں سے ہے۔ (رواه الإمام أحمد و أبو داود)[1] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ ﴾ مراد ہتھیار ہیں، جیسے: تلواریں، برچھیاں، نصال (جمع نصل بہ معنی پیکاں وتیغ وکارد ونیزہ۔ وسنان سر نیزہ وعصا وتیزے ہر چیزے۔ کذا في الصراح)۔ وسنان ودروع (زرعیں) اور ان جیسی اور چیزیں۔

﴿ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ یعنی لوگوں کے لیے ان کے معاش میں اور فائدے ہیں، جیسے: سکین (چھری اور چاقو،

---

[1] مسند أحمد (۲/۵۰) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٠٣١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغلیل (۱۰۹/۵)

فاس، کڑہالی، قدوم بسولا منشار آرہ۔ ازمیل رانپی مجرفہ بیل جس سے باغبان زمین کھودتے ہیں) وفاس وقدوم ومنشار و ازمیل و مجرفہ اور وہ آلات جن سے زراعت میں اور کپڑا بننے میں مدد لی جاتی ہے اور کھانا اور روٹی پکانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور وہ شے جس کے بغیر لوگوں کے لیے قوام نہیں ہے اور اس کے سوا اور بہت کچھ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تین چیزیں آدم علیہ السلام کے ساتھ نازل ہوئیں: سندان، کلبتان، و میقعہ (سندان نہائی، کلبتان آ بنور آہنگر میقعہ ہتھوڑا) یعنی مطرقہ۔[1] (رواہ ابن جریر و ابن أبي حاتم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ یعنی اور تاکہ جان لے اللہ تعالیٰ اس شخص کو جس کی نیت ہتھیار کے اٹھانے میں اللہ اور اس کے رسول کی نصرت ہے، بے شک اللہ قوی عزیز ہے، وہ مدد کرتا ہے اس شخص کی جس نے اس کی مدد کی بغیر اس کے کہ اس کو لوگوں کی طرف کوئی حاجت ہو اور اس نے جو جہاد مشروع کیا تو صرف اس لیے کہ تمھارے بعض کو بعض سے آزمائے۔[2] (کذا في ابن کثیر)

فتح البیان کا بیان:

﴿ لَقَدْ ﴾ میں حرفِ لام توطیہ قسم کا ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ "رسل" سے مراد ملائکہ ہیں[3] یعنی قسم ہے اللہ کی ہم نے اپنے فرشتے قطعی حجتیں دے کر انبیاء کی طرف بھیجے۔ محلی رحمہ اللہ سے پہلے امام زمخشری رحمہ اللہ بھی اسی قول کے قائل ہیں،[4] لیکن اس قول میں بُعد ہے، اس لیے کہ کتابیں اور احکام لے کر سوائے جبریل علیہ السلام کے اور کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوا۔ امام محلی اور زمخشری رحمہما اللہ کی مذکورہ تفسیر کا باعث جو بات ہوئی وہ یہ ہے کہ ﴿ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ ﴾ میں جو معیت ہے وہ صحیح ہو جائے اس لیے کہ کتابیں تو فرشتوں ہی کے ساتھ نازل ہوئی ہیں اور جمہور مفسر اس بات پر ہیں کہ "رسل" سے مراد انسان رسول ہیں اور معیت میں ان معنوں سے تاویل کرتے ہیں کہ ہم نے کتاب نازل کی، درآں حالانکہ وہ آئل و صائر ہوگی اس طرف کہ رسولوں کے ساتھ ہوگی جب کہ وہ ان کی طرف زمین میں پہنچے گی۔ یا یوں کہیں گے کہ "مع" بہ معنی "إلی" ہے جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ کے کلام میں اس طرف اشارہ ہے۔[5]

بالجملہ "بینات" سے مراد واضح معجزے اور ظاہری شریعتیں ہیں اور "کتاب" سے مراد جنس ہے تو اب ہر رسول کی کتاب اس میں شامل ہوگی۔ امام قتادہ اور مقاتل بن حیان رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "میزان" عدل ہے[6] اور معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو عدل کے ساتھ امر کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ﴾ [الرحمن: ۷] "اسی نے آسمان کو بلند کیا اور اسی نے ترازو رکھی"۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ﴾ [الشوریٰ: ۱۷] "اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے اور ترازو بھی۔"

---

[1] تفسیر الطبري (۲۰۱/۲۳) [2] تفسیر ابن کثیر (۴۰۱/۴، ۴۰۲) [3] تفسیر الجلالین (۷۲۳/۱)
[4] الکشاف (۴۷۸/۴) [5] تفسیر القرطبي (۲۶۰/۱۷) [6] تفسیر الطبري (۲۰۰/۲۳) تفسیر البغوي (۴۱/۸)

امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شے ہے جس سے وزن اور معاملہ کیا جاتا ہے۔[1]

﴿ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ میں حرفِ لام ﴿ اَنْزَلْنَا ﴾ سے متعلق ہے، یعنی ہم نے ان کے ساتھ کتاب نازل کی اور ان کو عدل کا امر کیا، تا کہ لوگ اس عدل کی پیروی کریں جس کا ان کو حکم ہوا تو آپس میں انصاف کے ساتھ معاملہ کریں۔ ''قسط'' بہ معنی عدل ہے، یہ اس پر دال ہے کہ ''میزان'' سے مراد عدل ہے اور انزالِ عدل کے یہ معنی ہیں کہ اس کے اسباب و موجبات نازل کیے۔ اس قول کی بنا پر کہ میزان سے مراد آلۂ وزن ہے تو اب انزالِ میزان کے یہ معنی ہوں گے کہ لوگوں کو اس کی ہدایت فرمائی اور اس سے تولنے کا الہام فرمایا اور کلام ''عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَّمَاءً بَارِدًا'' کے باب سے ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ﴾ بہ معنی ''خَلَقْنَاهُ'' ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ﴾ [الزمر: ٦] ''اور تمھارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ (نر و مادہ) اتارے۔'' یہ قول امام حسن رحمہ اللہ کا ہے،[2] یعنی اللہ تعالیٰ نے لوہے کو پیدا کیا اور اس کو معدنوں سے نکالا اور لوگوں کو اس کی صنعت کا علم دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ لوہا آدم علیہ السلام کے ساتھ نازل ہوا، اب انزال اپنے ظاہر معنی پر ہوگا۔

﴿ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ ﴾ یعنی اس میں سخت لڑائی ہے، اس لیے کہ اس سے آلاتِ حرب بنائے جاتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے امتناع کیا جاتا ہے (دشمن کو روکا جاتا ہے) اور لڑائی کی جاتی ہے۔[3] مطلب یہ ہے کہ اس سے ایک آلہ تو دفاع کے لیے بنایا جاتا ہے اور ایک آلہ مارنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''فِيْهِ جُنَّةٌ وَسِلَاحٌ''[4] یعنی اس میں بچاؤ ہے اور ہتھیار ہے اور قوت و شدت ہے۔

﴿ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ لوگ بہت سے کاموں میں اس سے نفع لیتے ہیں جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے، جیسے: چھری، چاقو، کڑاہی، سوئی اور زراعت و تجارت و عمارت کے آلات۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے: کوئی بھی صنعت نہیں ہے مگر حال یہ ہے کہ لوہا اس کا آلہ ہے،[5] یعنی اسے اس کے آلات میں دخل ہے یہ حصرِ کلی ہے، چناں چہ یہ بات مشاہدے میں آتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ ﴾ معطوف ہے ﴿ لِيَقُوْمَ ﴾ پر، یعنی البتہ تحقیق ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ایسا ایسا کیا، تا کہ لوگ عدل کے ساتھ قائم ہوں اور تا کہ اللہ تعالیٰ جان لے مشاہدے کا جاننا۔ یا معطوف ہے مقدر علت پر، گویا یوں کہا: ''لِيَسْتَعْمِلُوْهُ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ'' یعنی ہم نے لوہا نازل کیا جس میں فلاں فلاں صفت ہے، تا کہ لوگ اس کو کام میں لائیں اور تا کہ اللہ تعالیٰ جان لے۔ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو

---

(1) تفسير الطبري (٢٠٠/٢٣) (2) تفسير القرطبي (٢٦١/١٧) (3) معاني القرآن (١٢٩/٥)

(4) تفسير الطبري (٢٠١/٢٣) (5) تفسير البيضاوي (٣٠٤/٥)

کتاب نازل کی اس میں امر فرمایا ہے اپنے دین اور اپنے رسولوں کی مدد کا۔ جس نے اس کے دین کی اور اس کے رسولوں کی نصرت کی تو اس کو نصرت کرنے والا جانا اور جس نے نافرمانی کی تو اس کو اس کے برخلاف جانا۔ ﴿ بِالْغَيْبِ ﴾ یا تو ﴿ يَنْصُرُهٗ ﴾ کے مفعول سے حال ہے "أَيْ: غَائِبًا عَنْهُمْ" یا اس کے فاعل سے "أَيْ: غَائِبِيْنَ عَنْهُ"

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ یعنی بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے، وہ ہر شے کا مغلوب کرنے والا ہے۔ اس کو اس بات کی کچھ حاجت نہیں ہے کہ اس کے بندوں میں سے کوئی اس کی مدد کرے اور اس کے رسولوں کی نصرت کرے، بلکہ ان کو اس کا مکلّف کیا ہے، تاکہ وہ اس سے نفع پائیں، جب اس کے حکم کی فرمانبرداری کریں اور اپنے مطیع بندوں کو جس شے کا وعدہ دیا ہے، وہ ان کو حاصل ہو۔

یا آیت کے معنی کی یوں تقریر کی جائے کہ اللہ پاک نے حجتیں اور معجزات دے کر رسول بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی، تاکہ حق ظاہر ہو جائے اور درست عمل غلط عمل سے متمیز ہو جائے اور میزان نازل کی، تاکہ اس سے حقوق برابر کیے جائیں اور عدل قائم کیا جائے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ یعنی کتاب و میزان اس لیے نازل کی کہ جس عدل کا لوگوں کو حکم دیا گیا ہے، اس کے ساتھ قائم ہوں، کتاب کا اتباع اور میزان کا استعمال کر کے تاکہ صراطِ مستقیم جو مغفرت اور رضوان اور جنت کے درجات کی طرف پہنچانے والا ہے اس پر چلنے کے سبب سے ان کے دین و دنیا کے کام منتظم ہو جائیں۔

اس معنی کی بنا پر "میزان" سے مراد آلۂ وزن ہے۔ چونکہ یہ آلہ آسمان سے اتارا ہوا نہیں ہے، بلکہ انسان کی بنائی ہوئی اشیاء سے ہے، اس لیے اس کے نازل کرنے سے مراد اس کے اسباب کا نازل کرنا ہے اور اس کے تیار کرنے کا امر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں "إنزال" "إنشاء" کے معنی میں ہے۔ كما في قوله تعالىٰ: ﴿ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ﴾ [الزمر: ٦] کسی نے کہا ہے کہ اس کا فعلِ ناصب مقدر ہے: "أَيْ: أَنْزَلْنَا الْكِتَابَ وَوَضَعْنَا الْمِيزَانَ"

اس کی صحت پر یہ آیت دال ہے: ﴿ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ﴾ [الرحمن: ٧] وضعِ میزان سے مراد اس کے استعمال کا امر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام میزان لے کر اترے، پھر نوح علیہ السلام کو دی اور کہا کہ اپنی قوم کو حکم کر کہ اس سے وزن کیا کریں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ "میزان" سے مراد عدل ہے اور اس کے نازل کرنے سے مراد اس کے حکم کا نازل کرنا ہے، یعنی تاکہ عدل سے سیاست قائم کی جائے اور دشمن دور کیے جائیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ﴾ اور جملۂ ﴿ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ ﴾ حالیہ ہے، یعنی ہم نے نازل کیا لوہا درآنحالیکہ اس میں قتل کے خوف سے شدید خوف ہے۔ یا اس میں لڑائی کے لیے قوتِ شدید ہے۔

صحاح میں ہے کہ ﴿ بَأْسٌ ﴾ عذاب اور لڑائی میں شدت ہے،① یعنی اس لیے کہ آلاتِ حرب اس سے بنائے جاتے ہیں۔ اہلِ معانی نے کہا کہ ﴿ أَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ﴾ کے معنی ہیں: "أَحْدَثْنَاهُ وَأَنْشَأْنَاهُ"، كما في قوله تعالیٰ: ﴿ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ أَزْوَاجٍ ﴾ [الزمر: ٦] نیز قولہ تعالیٰ: ﴿ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا ﴾ [الأعراف: ٢٦] "ہم نے تمھارے لیے لباس پیدا کیا۔" اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک کے احکامات آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے چار برکتیں آسمان سے زمین کی طرف نازل کیں: آگ اور لوہا اور پانی اور نمک۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اس بارے میں پہلے گزر چکا ہے۔

بالجملہ پہلے اللہ پاک نے ﴿ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ فرمایا، اس کے بعد ﴿ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ ﴾ ارشاد کیا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ کتاب کے قوانین کا جاری کرنا اور جس آلے سے وزن کیا جاتا ہے اس کا استعمال کرنا یہ دونوں صاحبِ تلوار کے والی پر موقوف ہیں، یعنی صاحبِ اقتدار پر جو اس سے امرِ سیاست کو قائم کرے اور جو کوئی عدل سے آگے بڑھے اور ظلم و زیادتی کرے اس کو تلوار کے ساتھ مقہور و مغلوب فرمائے۔ اس لیے کہ ظلم نفسِ امارہ کی خصلتوں میں سے ہے اور تلوار اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے جس نے زیادتی کی اور ظلم کیا۔

پھر فرمایا: ﴿ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ عدل کے ساتھ قائم ہونا جس طرح کہ سیف کے ساتھ قائم ہونے والے کا محتاج ہے اسی طرح اس شے کا بھی نیاز مند ہے جس پر زندگی اور اس کی گزران موقوف ہے، یعنی مختلف پیشہ کے لوگوں کے آلات اور صنائع۔ (كذا قال الشيخ) ابو النصر عتبی نے تاریخ یمینی میں اس آیت کی خوب تقریر کی ہے، چنانچہ فتح البیان میں اس کو نقل فرمایا ہے، لیکن چونکہ حاصل اس کا وہی ہے جو مذکور ہوا، اس لیے یہاں ذکر نہیں کی گئی۔ پھر جب اللہ پاک نے رسولوں کے بھیجنے کا اجمالاً ذکر کیا تو اس کے بعد ایک قسم کی تفصیل کی طرف اشارہ فرمایا، چنانچہ ارشاد کیا:②

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّإِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْإِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَأْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا

① الصحاح للجوهري (٤/٤٤) ② فتح البيان (١٣/٤٢١-٤٢٣)

كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور یقیناً ہم نے نوح کو اور ابراہیم کو (رسول بنا کر) بھیجا اور ہم نے ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی، پھر ان میں سے کچھ ہدایت پانے والے ہیں اور ان میں سے بہت سے فاسق ہیں (26) پھر ہم نے ان کے پیچھے لگا تار اپنے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو (ان سب کے) پیچھے بھیجا، اور ہم نے اسے انجیل دی، اور ہم نے ان کے دلوں میں جنھوں نے اس کی پیروی کی، شفقت اور مہربانی رکھ دی، اور رہبانیت تو انھوں نے از خود ہی ایجاد کر لی تھی، ہم نے تو ان پر اسے فرض نہیں کیا تھا، مگر یہ کہ رضائے الٰہی تلاش کریں، پھر انھوں نے اس کا خیال نہ رکھا، جیسا اس کا خیال رکھنے کا حق تھا، پھر ہم نے ان لوگوں کو جو اُن میں سے ایمان لائے، ان کا اجر دیا، اور ان میں سے بہت سے فاسق ہیں (27)

سابقہ نافرمان امتوں اور رہبانیت کی بدعت کا ذکر:

یہ فقیری اور تارکِ دنیا بننا نصاریٰ نے رسم نکالی۔ جنگل میں تکیہ بنا کر بیٹھتے، نہ بیوی رکھتے، نہ بچے، نہ کماتے، نہ جمع کرتے، محض عبادت میں رہتے، مخلوق سے نہ ملتے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو یہ حکم نہیں دیا۔ مگر جب ترکِ دنیا کی پھر اس پردے میں دنیا چاہنا بڑا وبال ہے۔ انتہیٰ۔[1]

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ جب سے اس نے نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا تو ان کے بعد کوئی رسول اور کوئی نبی نہیں بھیجا جو ان کی اولاد سے نہ ہو۔ اس طرح ابراہیم خلیل الرحمان علیہ السلام کا حال ہے کہ ان کے بعد آسمان سے کوئی کتاب اتاری گئی اور نہ کوئی رسول بھیجا گیا اور نہ کسی بشر کی طرف وحی کی گئی، مگر وہ ان کی نسل سے تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ﴾ [العنکبوت: ۲۷] ”اور ہم نے نبوت اور کتاب ان کی اولاد میں ہی کر دی۔“ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے آخری نبی عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہوئے، جنھوں نے اپنے بعد محمد ﷺ کی بشارت دی۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ۬ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِيَّةَ ١ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا ﴾ انجیل سے مراد وہ کتاب ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی۔ ان کے متبعین سے مراد حواری لوگ ہیں۔ اللہ پاک نے ان کے دلوں میں رقت اور خشیت رکھی اور خلق سے رحمت اور محبت کا برتاؤ کرنا رکھا۔ رہبانیت کو

امتِ نصاریٰ نے بنا نکالا، اللہ تعالیٰ نے اس کو ان کے لیے مشروع نہیں فرمایا، صرف انھوں نے اپنی طرف سے اس کو لازمی کرلیا تھا۔

﴿ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوٰنِ اللّٰهِ ﴾ میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ انھوں نے اس سے اللہ کی رضا مندی چاہی۔ یہ قول امام سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہما اللہ کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ہم نے اس کو ان پر نہیں لکھا، جو ہم نے ان پر لکھا وہ یہی اللہ کی رضا مندی چاہنا تھا۔[1]

﴿ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ﴾ یعنی پھر وہ اس شے پر قائم نہ رہے جس کا التزام کیا، جیسا کہ قائم کرنے کا حق ہے۔ یہ ان کی مذمت ہے دو وجہ سے: ایک تو اس بات میں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے دین میں وہ نئی بات نکالی جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں فرمایا، دوسرے اس میں کہ جس شے کا خود التزام کیا تھا، اس پر بھی قائم نہ رہ سکے۔ جس کے بارے میں یہ زعم کیا تھا کہ وہ ایک قربت ہے جو انھیں اللہ عزوجل کے قریب کر دے گی۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اوابن مسعود! میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔ فرمایا: کیا تو نے جانا کہ بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے، ان میں سے صرف تین فرقوں نے نجات پائی۔ ایک فرقہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے بعد ملوک اور جابر لوگوں کے درمیان قائم ہوا اور اللہ اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے دین کی طرف دعوت دی، پھر جابر لوگوں سے لڑے اور مار ڈالے گئے، چنانچہ انھوں نے صبر کیا اور نجات پائی۔ پھر اور طائفہ قائم ہوا جس کو لڑنے کی قوت نہ تھی، چنانچہ وہ ملوک اور جابر لوگوں کے درمیان قائم ہوا اور انھوں نے اللہ اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے دین کی طرف دعوت دی، پس وہ طائفہ قتل کیا گیا اور آروں سے کاٹا گیا اور آگ سے جلایا گیا، چنانچہ انھوں نے صبر کیا اور نجات پائی۔ پھر ایک طائفہ قائم ہوا جس میں لڑنے کی قوت نہ تھی اور ان میں عدل کے ساتھ قائم ہونے کی طاقت تھی تو وہ طائفہ پہاڑوں پر چلا گیا اور وہاں پر عبادت اور رہبانیت میں مصروف رہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ﴾[2] (رواه ابن أبي حاتم)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے دوسرے الفاظ کے ساتھ اس کو ایک اور طریق سے راویت کیا ہے: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: «اِخْتَلَفَ مَنْ كَانَ قَبْلَنَا عَلَى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ فِرْقَةً نَجَا مِنْهُمْ ثَلَاثٌ وَهَلَكَ سَائِرُهُمْ»[3] وذكر نحو ما تقدم. اس میں یہ اور ہے: ﴿ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ﴾، یہ وہ ہیں جو مجھ پر ایمان لائے اور میری تصدیق کی ﴿ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾، یہ وہ ہیں جنھوں نے مجھ کو جھٹلایا اور میری مخالفت کی۔ (تفسیر ابن کثیر میں ہے: ولا يقدح في هذه المتابعة لحال داود بن المحبر فإنه

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٠٢) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٤٠، ٣٣٤١) المعجم الكبير (١٠/١٧١)
[3] تفسیر الطبري (٢٣/٢٠٤، ٢٠٥)

أحد الوضاعين للحديث لكن قد أسنده أبو يعلىٰ عن شيبان بن فروخ عن الصعق بن حزن به مثل ذلك فقوى الحديث من هذا الوجه)۔ ①

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے رہبانیت کے بارے میں اس کے سوا اور حدیثیں نقل کی ہیں: ایک تو امام ابن جریر اور نسائی رحمہ اللہ سے بہ روایتِ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے۔ ② اس کے آخر میں کہا ہے کہ اس کے سیاق میں غرابت ہے۔ دوسری حدیث بہ روایتِ سہل بن ابی امامہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ہے۔ ③ تیسری حدیث امام احمد سے انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے ان الفاظ میں: ”لِكُلِّ نَبِيٍّ رَهْبَانِيَّةٌ وَرَهْبَانِيَّةُ هَذِهِ الْأُمَّةِ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ“۔ ④ چوتھی حدیث امام احمد رحمہ اللہ سے مروی ہے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ ”إِنَّ رَجُلًا جَاءَهُ فَقَالَ: أَوْصِنِي فَقَالَ: سَأَلْتَ عَمَّا سَأَلْتُ عَنْهُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مِنْ قَبْلِكَ، أُوصِيكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ فَإِنَّهُ رَأْسُ كُلِّ شَيْءٍ وَعَلَيْكَ بِالْجِهَادِ فَإِنَّهُ رَهْبَانِيَّةُ الْإِسْلَامِ وَعَلَيْكَ بِذِكْرِ اللّٰهِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ فَإِنَّهُ رُوحُكَ فِي السَّمَاءِ وَذِكْرُكَ فِي الْأَرْضِ“ ⑤ (تفرد به أحمد) والله تعالىٰ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

﴿ لَقَدْ ﴾ میں قسم کی تکرار فرمائی تاکید کے لیے اور یہ بات ظاہر کرنے کے لیے کہ ارسال کا امر مزید اعتناء (مہربانی) اور اہتمام ہے۔ نوح علیہ السلام سارے انسانوں کے لیے دوسرے باپ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام عرب و روم و بنی اسرائیل کے باپ ہیں، یعنی البتہ ہم نے نوح اور ابراہیم علیہما السلام کو بھیجا اور ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی، یعنی وہ چار کتابیں ان میں سے جو بعض انبیاء ہوئے ان پر اتاری گئیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے بعض کو تو نبی کیا اور بعض کتاب پڑھتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ کتاب قلم سے لکھنا ہے۔ اس کی سند یہ ہے کہ محاورے میں ”كَتَبَ كِتَابَةً وَكِتَابًا“ بولا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ اللہ پاک نے تو ان پر یہ انعام فرمایا کہ ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی اور اولاد کا یہ حال ہوا جو فرمایا: ﴿ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ﴾ یعنی پھر ان میں سے وہ ہے جو راہ یاب ہوا۔ ان دونوں کے طریقے سے انہیں کی چال پر چلا اور ان میں سے بہت سے طاعت سے خارج ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں: پھر انبیاء علیہم السلام کی قوم جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے، ان میں سے اس ہدایت سے راہ پانے والے ہیں جس کو انبیاء علیہم السلام لائے۔ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر

① تفسير ابن كثير (٤٠٣/٤) ② تفسير الطبري ٢٠٣/٢٣، ٢٠٤ سنن النسائي، رقم الحديث (٥٤٠٠)

③ مسند أبي يعلىٰ (٣٦٥/٦) اس کی سند میں ”سعید بن عبدالرحمان“ مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٣٤٦٨)

④ مسند أحمد (٢٦٦/٣) اس کی سند میں ”زید العمی“ ضعیف راوی ہے۔ ضعيف الجامع، رقم الحديث (٤٧٣٩)

⑤ مسند أحمد (٨٢/٣) تفسير ابن كثير (٤٠٢/٤۔٤٠٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٥٥)

ہے۔ اس لیے کہ ذریت کا ذکر لفظاً پہلے ہو چکا ہے اور دوسرے قول کی یہ وجہ ہے کہ ﴿ أَرْسَلْنَا ﴾ اور مرسلین اس پر دال ہے۔ فاسق طاعت سے نکلنے والے کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ ہے جس نے کبیرہ کا ارتکاب کیا، خواہ وہ کافر ہو یا نہ ہو اسم فاسق کے اطلاق کے سبب سے اور یہ کافر وغیرہ کو شامل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ فاسق سے مراد کافر ہے، اس لیے کہ فساق مہتدین کی ضد ٹھہرائے گئے ہیں۔

اب اگر یہ وہم ہو کہ فاسقوں کی کثرت شاید اس لیے ہوئی کہ ان کے بعد رسول آنا بند ہو گیا ہو، چنانچہ فرما دیا: ﴿ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ﴾ یعنی پھر ہم نے ذریت کے پچھاڑی پر، یا نوح اور ابراہیم علیہما السلام کے آثار پر، یا ان کے آثار پر جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے اپنے رسول بھیجے اُمتوں کی طرف، جیسے: موسیٰ، الیاس، داود اور سلیمان علیہم السلام وغیرہم اور آخر میں ہم نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو بھیجا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم رسول کے بعد رسول بھیجتے رہے، یہاں تک کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام پر انتہا ہوئی۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ ماجدہ کی طرف سے ابراہیم علیہ السلام کی ذریت سے ہیں۔

پھر ان کو خالی نہیں بھیجا، بلکہ کتاب دے کر بھیجا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ ﴾ یعنی اور ہم نے اس کو انجیل دی۔ یہ وہی کتاب ہے جو اللہ پاک نے ان پر نازل فرمائی۔ اس کے اشتقاق کا ذکر سورت آلِ عمران میں گزر چکا ہے، جمہور نے بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے اور حسن رضی اللہ عنہ نے بہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے۔[1] پھر عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کا ذکر فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً ﴾ یعنی ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں مودت اور رحمت رکھی، جنھوں نے اس کے دین پر اس کی پیروی کی۔ یہ لوگ حواری ہیں اور ان کے پیروکار، چنانچہ یہ ایک دوسرے کو دوست رکھتے تھے اور رحمت کے سبب سے آپس میں رحم کرتے تھے۔ کسی نے کہا: یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انجیل میں ان کو صلح کا اور لوگوں کو ایذا نہ دینے کا امر کیا گیا تھا، چنانچہ اللہ پاک نے ان کے دل اس کے لیے نرم کر دیے تھے، بہ خلاف یہود کے کہ ان کے دل سخت پڑ گئے تھے اور انھوں نے کلموں کی ان کے مواضع سے تحریف کی۔ ﴿ رَأْفَةً ﴾ رافت کی اصل لین ہے، یعنی نرمی اور رحمت شفقت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ رَأْفَةً ﴾ "أَشَدَّ الرَّحْمَةِ" ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا ﴾ کے نصب میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ رَأْفَةً وَرَحْمَةً ﴾ پر معطوف ہے اور "جعل" بہ معنی "خلق" ہے، یا بہ معنی "صیر" ہے اس بنا پر ﴿ ابْتَدَعُوهَا ﴾، ﴿ رَهْبَانِيَّةً ﴾ کی صفت ٹھہرے گی، اس کو ابتداع کے ذکر سے اس لیے مخصوص کیا کہ رافت اور رحمت تو دل میں ایک غریزی طبعی امر ہے، اس میں انسان کی کوشش کا عمل دخل نہیں ہے، بہ خلاف رہبانیت کے کہ یہ بدن کے افعال سے ہے اور انسان کا

[1] فتح القدیر (۲۳۷/۵)

اس میں عمل دخل ہوتا ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس وجہ کو منع کیا ہے اس طرح سے کہ جو شے اللہ پاک کی مجعول (کی گئی) ہے، اس کا وہ ابتداع نہ کریں گے۔ جواب اس کا وہی ہے جو گزر چکا ہے کہ جب انسان کا اپنا عمل مکتسب ہے تو ابتداع اس میں صحیح ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فعلِ مقدر سے منصوب ہے جس کی تفسیر فعل ظاہر کر رہا ہے تو اب یہ اشتغال کے باب سے ٹھہرے گا۔ امام فارسی، ابو البقاء اور زمخشری رحمہم اللہ اور ایک جماعت کا میلان اسی طرف ہے مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اعراب معتزلہ کا ہے۔ معتزلہ اس کے قائل ہیں کہ جو شے انسان کے فعل سے ہے تو وہ اسی کی مخلوق ہے، چونکہ رافت و رحمت اللہ کے فعل سے تھیں تو ان کی پیدایش اس کی طرف منسوب ہوئی اور رہبانیت چونکہ اللہ تعالیٰ کے فعل سے نہ تھی، بلکہ بندے کے فعل سے تھی، بندہ اس کے فعل کے ساتھ مستقل ہوتا ہے، اس لیے اس کا ابتداع اس کی طرف منسوب ہوا۔[1] (كذا في السمين)

بالجملہ رہبانیت عبادت و ریاضت میں مبالغہ کرنا اور لوگوں سے منقطع ہو جانا ہے۔ یہ رہبان کی طرف منسوب ہے، رہبان خوف میں مبالغہ کرنے والے کو کہتے ہیں۔ یہ "رهب" سے ماخوذ ہے جس طرح "خشيان" "خشي" سے ماخوذ ہے۔ یہ تو فتحِ راء کی بنا پر ہے اور کسی نے بالضم بھی پڑھا ہے، گویا "رُهْبَانٌ" کی طرف منسوب ہے جو "رَاهِبٌ" کی جمع ہے، جیسے: "رَاكِبٌ وَرُكْبَانٌ"[2] (كذا قال القاضي) ان لوگوں نے عبادت میں غلو کیا اور اپنی جانوں پر مشقتیں اٹھائیں، کھانے پینے پہننے اور نکاح سے باز رہے۔ قوت لا یموت پر کفایت کی۔ غاروں اور صوامع اور دیروں میں جم کر بیٹھے، اس لیے کہ ان کے بادشاہوں نے دین میں بہت تغیر و تبدل کیا اور ان میں سے ایک قلیل گروہ باقی رہ گئے، اس لیے وہ راہب بن گئے اور تبتل اختیار کیا، یعنی گوشہ نشینی (ذكر معناه الضحاك وقتادة وغيرهما[3] لیکن یہ ترجمہ ان کے قول کا پورا نہیں ہے۔ حاصل مطلب ہے اور کچھ کمی و زیادتی ہے)۔

جملۂ ﴿مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ ﴿رَهْبَانِيَّةً﴾ کی صفتِ ثانی ہے یا مستانفہ ہے جو اس مضمون کی تقریر و تاکید کرتا ہے کہ وہ خود اُن کی طرف سے نکالی ہوئی ہے، یعنی ہم نے اس کو ان پر فرض نہیں کیا۔ ﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ میں استثنا منقطع ہے۔ "أَيْ: مَا كَتَبْنَاهَا نَحْنُ عَلَيْهِمْ رَأْسًا وَلٰكِنِ ابْتَدَعُوْهَا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ" امام قتادہ اور ایک جماعت اسی طرف گئے ہیں یعنی ہم نے تو سرے ہی سے اس کو ان پر نہیں لکھا، لیکن خود انھوں نے اس کو بنا نکالا اللہ کی رضا مندی چاہنے کے لیے۔[4] کسی نے کہا: متصل ہے: "أَيْ: كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ لِشَيْءٍ مِنَ الْأَشْيَاءِ إِلَّا ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ" یعنی ہم نے اس کو ان پر کسی شے کے لیے نہیں لکھا اشیاء میں سے مگر اللہ کی رضا مندی چاہنے کے لیے۔ اس بنا پر "كتب" بہ معنی "قضی" ہے۔ یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔[5] (كما قال السمين)

---

(1) اللباب في علوم الكتاب (٥٠٤/١٨) (2) تفسير البيضاوي (٣٠٥/٥) (3) فتح القدير (٢٣٧/٥)

(4) تفسير الطبري (٢٠٣/٢٣) (5) اللباب في علوم الكتاب (٥٠٦/١٨)

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی ہیں: "لَمْ نَكْتُبْ عَلَيْهِمْ شَيْئًا اَلْبَتَّةَ" کہا: اور ﴿ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ ﴾ ہاء والف سے بدل ہوگا جو ﴿ كَتَبْنٰهَا ﴾ میں ہے۔ معنی یہ ہیں: "مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ"[1] یعنی ہم نے ان پر نہیں لکھا، مگر اللہ کی رضا مندی کا چاہنا۔ ﴿ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ﴾ یعنی یہ رہبانیت جسے خود اپنی طرف سے بنا نکالا اس کو نباہا نہیں اور نہ اس کے ساتھ قائم رہے، جیسا کہ قائم رہنے کا حق تھا، بلکہ اس کو ضائع کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کے دین کے منکر ہوئے اور اس کی طرف تثلیث شامل کی اور ملوک کے دین میں شامل ہو گئے، جنھوں نے دین میں تغیر و تبدل کیا تھا اور ترہب کو ترک کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر باقی نہ رہے مگر ان میں سے بہت تھوڑے لوگ، اس آیت سے یہی مراد ہیں: ﴿ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ﴾ یعنی پھر ہم نے ان میں سے مومنوں کو وہ اجر دیا جس کے وہ ایمان کے سبب سے مستحق تھے، یہ اس لیے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور ان کے دین پر ثابت رہے، یہاں تک کہ جب اللہ پاک نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو ان پر ایمان لائے۔

﴿ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ یعنی ان میں سے بہت سے اس پر ایمان لانے سے خارج ہونے والے ہیں جس پر ایمان لانے کا ان کو حکم دیا گیا تھا۔ استثناء کی جو دو وجہیں پہلے گزر چکی ہیں تو منقطع کی تقدیر پر مذمت کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی جانوں پر رہبانیت کو یہ اعتقاد کر کے لازم کر لیا تھا کہ وہ اطاعت ہے اور اللہ اس کو پسند کرتا ہے۔ اس کا ترک اور اس کے نباہنے کا جس طرح حق ہے اس طرح نہ نباہنا اس بات پر دال ہے کہ جس چیز کو وہ دین سمجھتے تھے اس کی پروا نہ کی۔ اور متصل کی بنا پر مذمت کی وجہ ظاہر ہے۔ بالجملہ جو لوگ اگلے رسولوں پر ایمان لائے اللہ پاک نے ان کو تقوے کا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم فرمایا:[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۸ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۹

اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تمھیں اپنی رحمت سے دو حصے (اجر) دے گا، اور تمھارے لیے ایسا نور بنائے گا کہ تم اس کے ساتھ چلو گے، اور وہ تمھیں

[1] معاني القرآن (١٣٠/٥) [2] فتح البيان (١٣/٤٢٣-٤٢٨)

بخش دے گا، اور اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ﴿28﴾ تا کہ اہلِ کتاب یہ جان لیں کہ بلاشبہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی شے پر قدرت نہیں رکھتے اور بلاشبہ تمام فضل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہے یہ (فضل) عطا کرتا ہے اور اللہ عظیم فضل والا ہے ﴿29﴾

اہلِ کتاب کے مومنین کا دوہرا اجر:

یعنی اس رسول کے تابع ہو کر یہ نعمتیں پاؤ ہر عمل کا دوسروں سے دوگنا ثواب حاصل کرو اور روشنی لیے پھرو، یعنی اپنا وجود نورانی ہو جائے۔ اہلِ کتاب پیغمبروں کے احوال سن کر پچھتاتے کہ ہم ان سے دور پڑے، ہم کو وہ درجے ملنے مشکل ہیں، سو یہ رسول اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے، اس کی صحبت میں پہلے سے دوگنا کمال مل سکتا ہے اور اللہ کا فضل بند نہیں ہو گیا۔ انتھی۔

اس آیتِ کریمہ میں مفسروں کے دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ عام ہے ان لوگوں کے لیے جو پہلے رسولوں پر ایمان لائے، یعنی یہود و نصاریٰ اس کے دلائل یہ ہیں: ① نسائی اور ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت میں ہے (یہ پوری روایت تفسیر ابن کثیر اور فتح البیان میں الفاظ کے بعض اختلاف کے ساتھ مذکور ہے) کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے مومنین کے بارے میں ہے، ان کو ان کا اجر دو بار ملے گا۔[1] ② جیسا کہ اس آیت میں ہے جو سورۃ القصص میں ہے۔[2] ③ اور جس طرح کہ شعبی سے عن ابی بردہ عن ابیہ ابی موسیٰ الاشعری مرفوعاً مروی ہے کہ تین آدمی اپنا اجر دو بار دیے جائیں گے، ایک تو اہلِ کتاب کا وہ شخص جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور مجھ پر ایمان لایا، چنانچہ اس کے لیے دو اجر ہیں۔[3] إلى آخر الحديث. أخرجاه في الصحيحين.

امام ضحاک اور عتبہ بن ابی حکیم رحمہ اللہ وغیرہما نے اس تفسیر پر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی موافقت کی ہے اور یہی قول امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار ہے[4] اور اسی کو قاضی صاحب نے بھی اختیار کیا ہے[5] اور اسی طرح علامہ نسفی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[6] اب اگر کوئی کہے کہ جو شخص عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا اور ان کے دین کو نباہا یہاں تک کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس کے حق میں تو دو بار اجر عطا کرنا ظاہر ہے، اس لیے کہ وہ دینِ حق پر چلتا رہا، یہاں تک کہ منسوخ ہو گیا اور اس کے نزدیک دینِ ناسخ کی حقیقت ظاہر ہو گئی اور جس وقت یہ اسے ظاہر ہو گئی تو اس نے حقِ ثانی کا اتباع کیا، چنانچہ وہ اس وجہ سے اس کا مستحق ہوا کہ اسے دو بار اجر دیا جائے بہ خلاف یہود کے کیوں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے مبعوث

① سنن النسائي، رقم الحديث (٥٤٠٠) تفسير الطبري ٢٣/٢٠٨) ② رقم الآية (٥٤)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٤)

④ تفسير الطبري (٢٣/٢١٠، ٢١١) ⑤ تفسير البيضاوي (٥/٣٠٥) ⑥ تفسير النسفي (٤/٢٢١)

ہونے سے یہودیت تو منسوخ ہو چکی، چنانچہ یہود دینِ حق پر نہیں ہیں، جب وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے، پھر وہ کیسے اپنے پہلے دین پر ثواب دیے جائیں گے؟ تو اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ اسلام کی برکت سے اپنے سابق دین پر ثواب دیے جائیں گو وہ منسوخ ہو گیا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ خطاب ان نصاریٰ کو ہے جو نبیِ مکرم ﷺ کے عہد میں تھے۔

ملتِ محمدیہ ﷺ کے ظہور سے پہلے ان کی ملت منسوخ نہ تھی، لیکن قاضی نے دوسرے جواب کو "قیل" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔[1] امام زادہ اور شہاب رحمہ اللہ نے تضعیف کی یہ وجہ ذکر کی ہے کہ آیتِ مذکور ان کے حق میں نازل ہوئی ہے جو یہود میں سے مسلمان ہوئے، جیسا کہ احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوا ہے، جیسے سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان جیسے اور لوگ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں تخصیص پر کوئی دلیل نہیں ہے،[2] مگر امام محلی رحمہ اللہ نے اسی تخصیص کو اختیار کیا ہے اور ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے بعد ﴿ بِعِيْسٰى ﴾ مقدر نکالا ہے۔[3]

بالجملہ کفل کی اصل حصہ و نصیب ہے، یعنی بہرہ و حصہ۔ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿ كِفْلَيْنِ ﴾ بہ معنی "ضعفین" ہے اور یہ حبشی زبان میں ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ کی رحمت سے تین سو پچاس جزء ہے۔[5] معنی یہ ہیں کہ اے وہ لوگو جو اگلے رسولوں پر ایمان لائے! اللہ سے اس طرح سے ڈرو کہ جس شے سے اس نے تم کو منع کیا اس کو چھوڑ دو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ پر تو اللہ تم کو اپنی رحمت کے دو بڑے حصے دے گا، اس سبب سے کہ تم اس کے رسول پر ایمان لائے اس کے بعد کہ تم اس سے پہلے کے رسولوں پر ایمان لائے اور وہ تمھارے لیے ایک نور کر دے گا جس سے تم چلو گے یعنی پل صراط پر، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ ﴾ [التحريم: ٨] کسی نے کہا ہے کہ نور قرآن ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہدایت اور بیان ہے، یعنی وہ تمھارے لیے دین میں ایک واضح راہ کر دے گا جس سے تم راہ پاؤ گے اور تمھارے لیے تمھارے گناہ بخش دے گا جو نبیِ کریم ﷺ پر ایمان لانے سے پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے۔

1 دوسرا قول امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا یہ ہے کہ جب اہلِ کتاب نے اس بات پر فخر کیا کہ ان کو دوبارا اجر دیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ ﴾۔ ﴿ كِفْلَيْنِ ﴾ سے مراد "ضعفین" ہیں اور یہ ان کو زیادہ دیا۔ ﴿ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ ﴾ یعنی تمھارے لیے ایک نور کر دے گا، یعنی ایک ایسی ہدایت جس سے نابینائی و نادانی سے بصیرت لی جاتی ہے۔ اور بخش دے گا تمھارے لیے، چنانچہ ان کو نور اور مغفرت کے ساتھ فضیلت دی۔[6] (رواه ابن جرير عنه) یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ

---

① تفسير البيضاوي (٣٠٥/٥) ② حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (١٦٣/٨) ③ تفسير الجلالين (٧٦٤/١)
④ تفسير الطبري (٢١٠/٢٣) ⑤ تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٤١/١٠) ⑥ تفسير ابن كثير (٤٠٥/٤)

﴿ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ [الأنفال: ٢٩]

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا اور تم سے تمھارے گناہ دور کر دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔''

2 سعید بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہودی احبار میں سے ایک حبر سے پوچھا کہ تمھارے لیے جو حسنہ کی تضعیف کی گئی ہے، اس کا افضل کیا ہے؟ اس نے کہا: کفل ہے تین سو پچاس حسنہ کا۔ کہا: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی حمد کی اس پر کہ اس نے ہم کو دو کفل عطا کیے۔ پھر سعید نے اللہ عزوجل کے قول: ﴿ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ ﴾ کا ذکر کیا۔ سعید نے کہا: اور دو کفل جمعہ میں اس کے مثل ہیں۔[1] (رواہ ابن جریر)

3 اور اس قول کی مویدات میں سے یہ حدیث ہے جو نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً مروی ہے: « مَثَلُكُمْ وَمَثَلُ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَعْمَلَ عُمَّالًا » (الحدیث) اس کے آخر میں یہ ہے۔ پھر کہا: کون عمل کرے میرے لیے نمازِ عصر سے سورج ڈوبنے تک دو دو قیراط پر؟ فرمایا: خبردار! پس تم وہ ہو کہ تم نے عمل کیا، چنانچہ یہود و نصاریٰ خفا ہوئے اور کہا کہ ہم عمل میں اکثر ہیں اور عطا میں اقل (سب سے زیادہ قلیل) ہیں۔ کہا: کیا میں نے تم پر تمھارے اجر میں کسی شے کا ظلم کیا؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا سوا اس کے نہیں کہ وہ میرا فضل ہے، میں وہ دیتا ہوں جس کو چاہتا ہوں۔ (رواہ أحمد) نیز امام احمد رحمہ اللہ نے بہ سندِ دیگر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی طرح روایت کیا ہے۔[2] (انفرد بإخراجه البخاري فرواه عن سليمان بن حرب عن حماد عن نافع بمثله و عن قتيبة عن الليث عن نافع بمثله)

امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک اور حدیث سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے، جس کے آخر میں یہ ہے۔ پھر انھوں نے عمل کیا اپنے باقی دن میں، یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا تو انھوں نے دونوں فریق کا کامل اجر لیا۔ چنانچہ یہ ہے ان شے کی مثال جو انھوں نے قبول کی اس نور سے۔[3] (انفرد به البخاري) اس لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ یعنی تا کہ تحقیق و یقین کر لیں اس بات کا کہ وہ اس شے کے رد کرنے پر قادر نہیں ہیں جو اللہ نے عطا کی اور نہ ہی وہ شے کے دینے پر قادر ہیں جو اللہ نے نہیں دی اور اس بات کا یقین کر لیں کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لِئَلَّا يَعْلَمَ ﴾ بہ معنی ''لِيَعْلَمَ'' ہے اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے ''لِكَيْ يَعْلَمَ'' پڑھا ہے۔ اسی طرح عطا بن عبداللہ اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ نے بھی پڑھا ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٢١٠/٢٣) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٤٨، ٣٢٧٢) مسند أحمد (٦/٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٥١)

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کی یہ وجہ ہے کہ عرب لوگ کلمہ ''لا'' کو زائد ٹھہراتے ہیں ہر کلام میں جس کے اول یا آخر میں جحد غیر مصرح داخل ہوا ہو۔ چنانچہ پہلے کی مثال تو یہ آیتیں ہیں:

﴿ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ ﴾ [الأعراف: ١٢] ''تو جو سجدہ نہیں کرتا تو تجھ کو اس سے کون سا امر مانع ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَا اِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٠٩] ''تم کو اس کی کیا خبر کہ وہ نشانیاں جس وقت آ جائیں گی یہ لوگ تب بھی ایمان نہ لائیں گے۔''[1] ﴿ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩٥] ''اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا اس پر لازم ہے کہ وہاں کے لوگ پلٹ کر نہیں آئیں گے۔'' (كذا في ابن كثير) اسی طرح امام فراء اور اخفش رحمہ اللہ وغیرہما بھی ''لا'' کے اضافے کے قائل ہیں۔[2] اور حرفِ لام فعلِ مقدر سے متعلق ہے (یعنی جو جملہ طلبیہ منفی شرط کے معنی ہیں تقدیر یہ ہے: "إن تتقوا الله وتؤمنوا برسوله يؤتكم كذا وكذا ليعلم أهل الكتاب الخ")۔ "أَيْ: أَعْلَمَكُمْ بِذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ...الخ" ﴿ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ ﴾ میں کلمہ ''أَنْ'' مخففہ ہے مثقلہ سے اور اس کا اسم ضمیرِ شان محذوف ہے: "أَيْ: أَنَّهُ لَا يَقْدِرُوْنَ"۔

جملہ: ﴿ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ﴾ جملہ ماقبل پر معطوف ہے: "أَيْ: لِيَعْلَمُوْا أَنَّهُ لَا يَقْدِرُوْنَ وَلِيَعْلَمُوْا أَنَّ الْفَضْلَ... الخ" یہاں ''فضل'' سے مراد وہ اجرِ مضاعف ہے (کئی گنا) جس کا اللہ تعالیٰ نے ان پر تفضّل کیا جو اس سے ڈرے اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اللہ کا رزق ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی نے کہا کہ مراد اسلام ہے۔ جملہ ﴿ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ ظاہر یہ ہے کہ مستانفہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''فضل'' کی خبرِ ثانی ہے۔

جملہ ﴿ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ جملہ مقررہ و موکدہ ہے جو ماقبل کے مضمون کے لیے ہے، کہا گیا ہے (اس قول کو خازن رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے) جب ان لوگوں نے جو اہلِ کتاب میں سے ایمان نہیں لائے اس آیت کو سنا: ﴿ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ ﴾ [القصص: ٥٤] ''یہ اپنے کیے ہوئے صبر پر دوہرا دوہرا اجر دیے جائیں گے۔'' تو مسلمانوں سے کہا کہ جو کوئی ہم میں سے تمھاری کتاب پر ایمان لایا تو اس کے لیے اس کا اجر دو بار ہے، اس کے تمھاری کتاب پر اور اپنی کتاب پر ایمان لانے کے سبب سے اور جو کوئی ایمان نہ لایا تو اس کے لیے تمھارے اجر کی طرح ایک اجر ہے، پھر تمھیں ہم پر کیسی فضیلت ہے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ ﴾ "أَيْ: لِيَعْلَمَ... الخ"

معنی یہ ہیں کہ اللہ نے تم کو یہ خبر کر دی کہ اجر کا دوبار عطا کرنا اللہ کے تقوے پر اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایمان لانے کے ساتھ مشروط ہے، تاکہ وہ اہلِ کتاب جنھوں نے نہ تقویٰ اختیار کیا اور نہ اس کے رسول ﷺ پر ایمان

---

[1] تفسير الطبري (٢١٥،٢١٤/٢٣) تفسير ابن كثير (٤٠٦،٤٠٥/٤) [2] فتح القدير (٢٣٨/٥) [3] تفسير القرطبي (٢٦٨/١٧)

لائے، اس بات کو جان لیں کہ تحقیق حقیقت یہ ہے کہ وہ اس پر قادر نہیں ہیں کہ اللہ کے فضل سے کسی شے کو پائیں، وہ فضل جس کا اس نے اس شخص پر تفضل فرمایا جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لایا، یعنی ان کے لیے کچھ اجر اور حصہ نہیں ہے اور نہ وہ اس بات پر قادر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو فضل اس کے مستحقین پر کیا ہے اس کو دور کر سکیں، اس لیے کہ وہ اس کے رسول پر ایمان نہیں لائے اور یہ فضل و کرم اس کے رسول پر ایمان لانے کے ساتھ مشروط ہے اور وہ اس بات کو جان لیں کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اس پر کسی کا زور نہیں چلتا اور اللہ بڑے فضل والا ہے اس کے یہاں کچھ کمی نہیں۔ یہ معنی تو اس بنا پر تھے کہ کلمۂ ''لا'' زائد ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ ﴾ میں ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی طرف راجع ہے اور ﴿ لِئَلَّا ﴾ میں کلمۂ ''لا'' زاید نہیں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو تم کو یہ فضیلت دی کہ اپنی رحمت سے دو کفل عطا کیے اور نور و مغفرت عطا فرمائی، تا کہ اہلِ کتاب اس بات کا اعتقاد نہ کریں کہ اللہ کا نبی اور مومنین اللہ کے فضل میں سے کسی شے پر قادر نہیں، وہ فضل جو عبارت ہے اس شے سے جو ان کو دی گئی۔ یہ معنی اسی بنا پر ہیں کہ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ... الآية ﴾. کے مخاطب اس امت کے مومنین ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ فتح البیان میں ہے کہ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔[1] واللّٰه سبحانه وتعالىٰ أعلم.

الحمد للّٰه والمنة کہ سورۃ الحدید کی تفسیر ماہِ شعبان ۱۳۱۵ ہجری روز شنبہ (ہفتہ) وقت عشاء امیر گنج میں تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور بقیہ کو مکمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔ والحمد للّٰه أولا وآخرا وظاهرا وباطنا وصلى اللّٰه و سلم وبارك على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه مِلأ ما علم وزنة ما علم وعدد ما علم. آمين.

---

[1] فتح البيان (۴۲۹/۱۳)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ

اس سورت مبارکہ کی بائیس (۲۲) آیتیں ہیں اور مدنی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق مدنی ہے، مگر عطا رحمہ اللہ سے ایک یہ روایت ہے کہ اس کا عشرِ اول مدنی ہے اور باقی سورت مکی ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساری سورت مدینے میں نازل ہوئی سوائے اس آیت کے: ﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ جو مکے میں نازل ہوئی۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مدینے میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس والنحاس و أبو الشيخ في العظمة و ابن مردويه)۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] (أخرجه ابن مردويه)۔ مجادلہ بہ کسرِ دال ہے جیسا کہ سعد نے حواشیِ کشاف میں ذکر کیا ہے۔ شہاب میں ہے کہ بہ فتح وکسرِ دال ہے اور معروف ثانی ہی ہے، جیسا کہ کشاف میں ہے،[3] یہ سورت قرآن کے اجزاء کے عدد کے اعتبار سے اس کے عشرِ اخیر میں سے پہلی ہے، اس میں کوئی بھی آیت ایسی نہیں جس میں اللہ پاک کا اسمِ ذات ایک بار یا دو یا تین بار مذکور نہ ہو۔ کل ۳۵ بار مذکور ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ①

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اے نبی!) یقیناً اللہ نے اس عورت (خولہ بنت ثعلبہ) کی بات سن لی جو اپنے خاوند (اوس بن صامت) کے متعلق آپ سے جھگڑ رہی تھی اور وہ اللہ کی طرف شکایت کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے ①

سببِ نزول کا بیان:

اسلام سے پہلے کوئی شخص اگر اپنی بیوی سے کہتا کہ تو میری ماں ہے تو وہ ساری عمر کے لیے اس پر حرام سمجھی

[1] تفسير القرطبي (۲۷۰/۱۷) [2] الدر المنثور (۶۹/۸) [3] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (۱٦٤/۸)

جاتی۔ نبی کریم ﷺ کے وقت میں ایک مسلمان اپنی بیوی کو ماں کہہ بیٹھا، پھر دونوں پچھتائے۔ وہ عورت نبیِ مکرم ﷺ کے پاس آئی اور آپ ﷺ سے ماجرا بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اب تم کیسے مل سکتے ہو۔ وہ شکایت کرنے لگی کہ گھر ویران ہوتا ہے، اولاد پریشان ہوتی ہے۔ اس کے متعلق یہ حکم اترا، فرمایا کہ جس نے جنا نہ ہو وہ ماں کیسے ہو سکتی ہے! مگر گستاخی کا بدلہ کفارہ کی صورت میں دے تو اس عورت کے پاس جائے ورنہ نہ جائے، لیکن عورت اسی کی رہی۔ اسے ماں یا بہن کہنے کو ظہار کہتے ہیں۔ انتہی

فتح البیان کا بیان:

کلمۂ ﴿قَدْ﴾ تحقیق کا ہے۔ جس نے کہا کہ ﴿قَدْ﴾ تقریب وتوقع کے لیے ہے تو اس کی بات کا معنی سے کوئی تعلق نہیں لگتا۔ دال کا اظہار اور اس کا سین میں ادغام دونوں سبعیہ ہیں (امام ابو عمر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے یہ ادغامِ دال سین میں پڑھا ہے اور باقی قراء نے یہ اظہارِ دال پڑھا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جس نے سین کے پاس دال کا اظہار کیا تو اس کی زبان اعجمی ہے عربی نہیں ہے۔[1] كذا في فتح القدير)۔

سببِ نزول:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ پاک نے واقعی اس عورت کے اقوال اور سوال کا اس طرح سے جواب دیا کہ اس کے مطلب کے مطابق ظہار کا حکم نازل کیا۔ وہ عورت اپنے خاوند کی شان میں تجھ سے تکرار کرتی تھی اور اللہ تعالیٰ کے آگے ان تکالیف، یعنی ناپسندیدہ بات اور فاقہ اور تنہائی کو ظاہر کرتی تھی جو اسے پیش آئی تھیں۔ اس مجادلہ وشکوہ کا بیان یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اس سے فرماتے تھے کہ تو یقیناً اس پر حرام ہو چکی تو وہ یہی کہتی تھی کہ واللہ! اس نے طلاق کا ذکر نہیں کیا۔ پھر کہتی: میں اللہ تعالیٰ سے اپنے فاقے اور تنہائی کا شکوہ کرتی ہوں اور اس بات کا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، اگر میں ان کو اس کے ساتھ کر دوں تو وہ ضائع ہو جائیں گے اور اگر اپنے پاس رکھوں تو بھوکے مر جائیں گے۔ اس عورت نے شکایت شروع کی تو اپنا سر آسمان کی طرف اٹھاتی اور کہتی تھی: الٰہی! بے شک میں تیرے آگے شکوہ کرتی ہوں۔

امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت سیدہ خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اتری ہے۔ اس کا خاوند سیدنا اوس بن صامت رضی اللہ عنہ ہے، اس کو فسادِ عقل یا جنون تھا، چنانچہ ایک دن اس کا جنون اس پر سخت تھا تو وہ اس پر ظہار کر بیٹھا پھر اس پر نادم ہوا۔ جاہلیت میں ظہار طلاق تھی۔[2] کسی نے کہا ہے کہ خولہ بنت حکیم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کا نام جمیلہ ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ بنت خویلد ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کبھی وہ منسوب ہوئی اپنے باپ کی طرف اور کبھی اپنے دادا کی طرف، دونوں میں سے ایک باپ ہے اور دوسرا دادا ہے، چنانچہ وہ خولہ بنت ثعلبہ بن خویلد ہے۔ مروی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے عہدِ خلافت میں

---

[1] فتح القدير (٥/٢٤٠)
[2] فتح القدير (٥/٢٤٠)

اس کے پاس سے گزرے اور آپ گدھے پر سوار تھے اور لوگ آپ کے ارد گرد تھے، چنانچہ سیدہ خولہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو ٹھہرایا اور نصیحتیں کیں، پس کسی نے آپ سے عرض کی: کیا آپ اس بڑھیا کے لیے اتنی دیر ٹھہرتے ہیں؟ تو فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ بڑھیا کون ہے؟ یہ خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا ہے جس کی بات اللہ نے سات آسمانوں کے اوپر سے سن لی۔ کیا رب العالمین تو اس کی بات کو سنے اور عمر اس کو نہ سنے۔[1]

جملہ ﴿ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ﴾ مستانفہ ہے ماقبل کی تعلیل کے قائم مقام ہے، یا جملہ حالیہ ہے لیکن یہ بعید ہے۔ یہ ''حَاوَرَ إِذَا رَاجَعَ'' یا ''حَوَرَ إِذَا رَجَعَ'' سے ماخوذ ہے۔ یعنی اور اللہ تم دونوں کی باتوں کی تکرار کو سنتا ہے، بے شک اللہ بڑا سننے والا ہے، وہ ہر سننے والی بات کو سنتا ہے اور ہر دیکھنے والی شے کو دیکھتا ہے، اسی کے جملے سے وہ بات ہے جس کے ساتھ یہ عورت تجھ سے جھگڑی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: بابرکت ہے وہ جس کے کان نے ہر شے کو سما لیا، بے شک میں البتہ سن رہی ہوں خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کا کلام اور اس کا بعض مجھ پر مخفی رہتا ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے خاوند کی شکایت کر رہی ہے اور وہ کہہ رہی ہے: اے اللہ کے رسول! اس نے میری جوانی کھا لی اور میں نے اس کے لیے اپنا پیٹ پھیلا لیا، یہاں تک کہ جب میری عمر بڑی ہوئی اور میری اولاد منقطع ہوگئی تو اس نے مجھ سے ظہار کیا۔ الٰہی! بے شک میں تیرے آگے شکوہ کرتی ہوں۔ فرمایا: پھر وہ نہ ٹلی، یہاں تک کہ جبریل علیہ السلام یہ آیتیں لے کر اترے: ﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا ﴾ یہ شخص سیدنا اوس بن صامت رضی اللہ عنہ ہے۔[2] (أخرجه ابن ماجه و الحاكم و صححه و البيهقي وغيرهم. كذا في فتح البيان)

تفسیر ابن کثیر میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: حمد ہے اللہ کے لیے جس کے کان نے آوازیں سما لیں۔ البتہ آئی وہ عورت جھگڑنے والی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، آپ سے باتیں کرتی تھی اور میں گھر کے ایک کنارے پر تھی، میں نہیں سنتی تھی جو وہ کہتی تھی، پس اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی۔[3] (أخرجه الإمام أحمد وهكذا رواه البخاري في كتاب التوحيد تعليقا) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ قصہ کچھ اضافے کے ساتھ روایت کیا ہے[4] اور یہ بھی عامر سے روایت ہے کہ جو عورت اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑی وہ خولہ بنت صامت ہے اور اس کی ماں معاذہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ﴾ [النور: ۳۳] ''تمھاری جو لونڈیاں پاک دامن رہنا چاہتی ہیں انھیں دنیا کی زندگی کے فائدے کے لیے بدکاری پر مجبور نہ کرو۔'' صحیح یہ ہے کہ اس کا نام خولہ زوجہ اوس بن الصامت ہے۔[5] بالجملہ پھر اللہ پاک نے ظہار کا حال فی نفسہ اور اس کا حکم استیناف کے طور پر بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا:

---

[1] تفسير القرطبي (۱۷/۲۷۰، ۲۷۱)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۰۶۳) مستدرك الحاكم (۲/۵۲۳) سنن البيهقي الكبرىٰ (۷/۳۸۸۲) فتح البيان (۱۴/۱۰) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (۷/۱۷۵)

[3] صحيح البخاري (۶/۲۶۸۹) مسند أحمد (۶/۴۶) [4] تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۴۲) [5] تفسير ابن كثير (۴/۴۰۶، ۴۰۷)

الَّذِينَ يُظٰهِرُونَ مِنكُم مِّن نِّسَائِهِم مَّا هُنَّ أُمَّهٰتِهِمْ ۖ إِنْ
أُمَّهٰتُهُمْ إِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنكَرًا
مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ ﴿٢﴾ وَالَّذِينَ
يُظٰهِرُونَ مِن نِّسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ
رَقَبَةٍ مِّن قَبْلِ أَن يَتَمَاسَّا ۚ ذٰلِكُمْ تُوعَظُونَ بِهِ ۚ وَاللَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٣﴾ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ
مُتَتَابِعَيْنِ مِن قَبْلِ أَن يَتَمَاسَّا ۖ فَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ
سِتِّينَ مِسْكِينًا ۚ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ وَتِلْكَ حُدُودُ
اللَّهِ ۗ وَلِلْكٰفِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٤﴾

تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ’’ظہار‘‘ کرتے ہیں، وہ ان کی مائیں نہیں، ان کی مائیں وہی ہیں جنھوں نے انھیں جنا اور بے شک وہ ناگوار بات اور جھوٹ کہتے ہیں اور بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے ② اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں، پھر اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کرتے ہیں، تو ایک گردن آزاد کرنی ہے، اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں، اس (حکم) کی تمھیں نصیحت کی جاتی ہے اور اللہ (اس سے) خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو ③ پھر جو شخص نہ پائے (غلام) تو دو ماہ کے لگا تار روزے (رکھنے) ہیں، اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں، پھر جو شخص (اس کی) استطاعت نہ رکھتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا دینا ہے۔ یہ (حکم) اس لیے ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور کافروں کے لیے نہایت دردناک عذاب ہے ④

یہ جو کہا کہ اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کر لیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ صحبت کرنا چاہیں تو پہلے غلام آزاد کر لیں۔ غلام آزاد کرنے کی قدرت ہو تو روزہ نہیں رکھ سکتا اور اگر روزہ رکھ سکتا ہے تو مسکینوں کو کھانا کھلانا نہیں ہے۔ آخر میں کھانا کھلانا ہے۔ کھانا جب کھلائے تو دو وقت سالن اور روٹی پیٹ بھر کر کھلائے اور اگر اناج دے تو ہر ایک کو دو دو سیر گیہوں دے۔ انتہی[1]۔

فتح البیان کا بیان:

عاصم وغیرہ نے ﴿ يُظْهِرُوْنَ ﴾ پڑھا ہے یاء کے ضمے کے ساتھ اور تخفیفِ ظاء اور کسرِ ہاء کے ساتھ اور جمہور نے "یَظَّهَّرُوْنَ" بہ تشدید ظاء مع فتح حرفِ یاء پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے) بہ فتحِ یاء وتشدید ظاء وزیادتِ الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی کے مثل سورۃ الاحزاب میں بھی گزر چکا ہے[1] اور سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے "یَتَظَاهَرُوْنَ"[2] بہ فکِ ادغام پڑھا ہے اور یہ سب سبعیہ ہیں۔ ظہار کے شرعی معنی یہ ہیں کہ مرد اپنی بیوی سے کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے اور تو مجھ سے یا میرے ساتھ یا میرے نزدیک میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے، اس کے ظہار ہونے میں کچھ اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف اس میں ہے جب کہے: تو مجھ پر میری بیٹی کی پشت کی طرح ہے، یا میری بہن کی پشت کی طرح ہے، یا ان کے علاوہ اور محرمات میں سے ہے۔ چنانچہ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ سب ظہار ہے۔

من جملہ ان کے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ و امام مالک رحمہ اللہ اور حسن رحمہ اللہ و نخعی رحمہ اللہ و زہری رحمہ اللہ و اوزاعی رحمہ اللہ و ثوری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ ظہار نہیں ہے، ان میں سے امام قتادہ اور شعبی رحمہما اللہ ہیں، بلکہ ظہار صرف ماں کے ساتھ خاص ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے روایت مختلف ہے۔ پس ان سے پہلے اور دوسرے قول کی مثل مروی ہے۔ اصل "ظہار"، "ظہر" سے مشتق ہے "ظہر" لغتاً علو کے معنی میں ہے۔ ظہرِ انسان سے نہیں ہے جو بہ معنی پشت ہے (یہ ایک قول ہے، امام خازن رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت مرد کے لیے مرکب ہے اور سواری ہے۔ عرب کا طلاق کے بارے میں قول اس پر دال ہے کہ "نزلت عن امرأتي أَيْ: طلقتها")۔[3]

ایک قول یہ ہے کہ "ظہر" بہ معنی پشت سے مشتق ہے۔ اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ جب مرد اپنی عورت سے کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کے سر کی طرح ہے یا اس کے ہاتھ یا پاؤں یا اور اعضاء کی طرح ہے تو کیا یہ ظہار ہوگا یا نہیں؟ اور اسی طرح جب یوں کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کی مثل ہے اور ظہر کا ذکر نہیں کیا؟ ظاہر یہ ہے کہ جب وہ اس سے ظہار کا قصد کرے گا تو ظہار ہو جائے گا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جب اس کو اپنی ماں کے کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ دے گا جس کی طرف اس کو نظر کرنا حلال ہے تو ظہار نہ ہوگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ظہار نہیں ہوتا مگر صرف ظہر میں، اور اختلاف کیا ہے کہ اپنی عورت کی تشبیہ کسی اجنبی عورت کے ساتھ دے تو کسی نے تو کہا کہ ظہار ہوگا اور کسی نے کہا کہ نہیں۔ اس کے متعلق گفتگو کتبِ فروع میں تفصیل سے دی گئی ہے۔[4]

﴿ مِنْكُمْ ﴾ حال ہے موصول سے اور ﴿ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ﴾ متعلق ہے ﴿ يُظْهِرُوْنَ ﴾ سے اور جملۂ ﴿ مَا

[1] رقم الآية (٤) [2] تفسير البغوي (٥٠/٨) [3] تفسير الخازن (٤٣/٧) [4] فتح القدير (٢٤١/٥)

﴿هُنَّ أُمَّهٰتِهِمْ﴾ خبر ہے موصول کی، یعنی جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کرتے ہیں درآنحالیکہ اے عرب لوگو! وہ تم میں سے ہیں۔ یہ ان کو ملامت ہے اور ان کی عادت کو معیوب ٹھہرانا ہے، اس لیے کہ ظہار عرب کے ساتھ خاص تھا باقی امتوں میں نہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو اپنے اوپر حرام کرتے ہیں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ماؤں کی پشتوں کو ان پر حرام کیا ہے، وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم ہماری ماؤں کی پشتوں کی طرح ہو۔ فرمایا کہ ان کی عورتیں ان کی مائیں نہیں ہیں، یہ تو اُن کی طرف سے سراسر جھوٹ ہے اور ایک ناپسندیدہ بات ہے۔ اس میں بھی ظہار کرنے والوں کو ملامت اور سرزنش کرنا ہے۔

جمہور نے ﴿أُمَّهٰتِهِمْ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے حجازی لغت کی بنا پر۔ حجاز والے کلمۂ ''ما'' کو ''لیس'' کا عمل دیتے ہیں اور کسی نے (یعنی امام ابوعمرو اور سلمی رحمہ اللہ نے) بہ رفع پڑھا ہے بنا بر عدمِ اعمال، یہ نجد اور بنی اسد کا لغت ہے۔[1] پھر جو ان کی حقیقی مائیں ہیں، اللہ پاک نے ان کا بیان فرمایا ہے: ﴿إِنْ أُمَّهٰتُهُمْ إِلَّا الّٰٓئِيْ وَلَدْنَهُمْ﴾ یعنی ان کی مائیں وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا۔ مراد یہ ہے کہ حقیقت میں امہات والدات میں اور مرضعات (دودھ پلانے والیاں) رضاعت کے واسطے سے والدات کے ساتھ ملحق ہیں۔ اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات اس لیے کہ ان کی حرمت زیادہ ہے۔ رہیں جورُوئیں سو یہ تو ماں پن سے بہت درجہ دور پڑی ہیں۔

اسی لیے اللہ پاک نے ان کی ملامت اور سرزنش میں زیادتی کر کے ارشاد فرمایا: ﴿وَإِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا﴾۔ ﴿مُنْكَرًا﴾ ﴿وَزُوْرًا﴾ کا نصب بنا بر صفتِ مصدر محذوف ہے: ''أَيْ: قَوْلًا مُنْكَرًا وَّزُوْرًا''، یعنی اور بے شک ظہار کرنے والے اپنے اس قول کے سبب سے ایک بہت بری اور ناپسندیدہ بات کہتے ہیں جس کا شریعت انکار کرتی ہے اور اس کو ناپسند رکھتی ہے اور یہ ایک ایسا جھوٹ اور باطل ہے جو حق سے منحرف اور ہٹا ہوا ہے۔ ﴿وَإِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ﴾ یعنی اور بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا بڑا بخشنے والا ہے، جب کہ اس نے اس ناپسند بات سے رہائی دلانے والا کفارہ ان کے لیے مقرر کر دیا۔ جب اللہ پاک نے ظہار کا اجمالاً ذکر کیا اور اس کے کرنے والوں کو ملامت کی تو اب اس کے احکام کی تفصیل کا بیان شروع کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ یعنی جو لوگ یہ ناپسند اور جھوٹ بات کہتے ہیں اور اس بات کی وجہ سے اپنی بیویوں سے جماع کرنے سے باز رہتے ہیں، پھر اس بات سے رجوع کرتے ہیں جو وہ کہہ چکے تدارک اور تلافی کے ساتھ۔ یہاں کلمۂ لام بہ معنی ''إلیٰ'' ہے جس طرح کہ ان آیتوں میں ہے: ① ﴿أَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖ﴾ [النور: ۱۷] ''أَيْ: إِلَى مِثْلِهِ''۔ ''پھر کبھی بھی ایسا کام نہ کرنا۔'' امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: ﴿لِمَا قَالُوْا﴾ ''إِلٰى مَا قَالُوْا''[2] باہم ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں۔ ② نیز فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا

---

[1] فتح القدير (٥/٢٤١)
[2] تفسير القرطبي (١٧/٢٨٣)

لِهٰذَا ﴾ [الأعراف: ٤٣] ''اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا۔'' ③ نیز فرمایا: ﴿ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴾ [الصافات: ٢٣] ''انھیں دوزخ کی راہ دکھا دو۔'' ④ نیز فرمایا ﴿ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ﴾ [الزلزال: ٥] ''اس لیے کہ تیرے رب نے اسے حکم دیا ہو گا۔'' ⑤ نیز فرمایا: ﴿ وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ ﴾ [هود: ٣٦] ''نوح علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی گئی۔''

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لام بہ معنی عن ہے۔ معنی یہ ہیں: پھر رجوع کرتے ہیں اس شے سے جو کہی اور وطی کا ارادہ کرتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ پھر اس بات کے سبب سے جو کہی جماع کے ارادے کی طرف عود کرتے ہیں۔ نیز امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے معنی یہ ہیں: ''وَالَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاءِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا كَانُوْا عَلَيْهِ مِنَ الْجِمَاعِ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ لِمَا قَالُوْا أَيْ: فَعَلَيْهِمْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِنْ أَجْلِ مَا قَالُوْا'' پس حرفِ جار جو ﴿ لِمَا قَالُوْا ﴾ میں ہے محذوف سے متعلق ہے جو مبتداء یعنی ''فَعَلَيْهِمْ'' کی خبر ہے۔

اہلِ علم نے عود مذکور میں کئی قول پر اختلاف کیا ہے: ① یہ ہے کہ وطی پر عزم ہے۔ عراق والے امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ ② کسی نے کہا ہے کہ نفسِ وطی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ ③ کسی نے کہا ہے کہ ظہار کر کے اس کو بیوی کر کے روک رکھے باوجود طلاق دینے کی قدرت کے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ ④ کسی نے کہا ہے کہ کفارہ ہے، معنی یہ ہے کہ اس کی وطی کو مباح نہیں سمجھتا مگر کفارے کے ساتھ۔ امام لیث بن سعد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ ⑤ کسی نے کہا ہے کہ ظہار کا مکرر کرنا ہے بلفظہ۔ اہلِ ظاہر اسی کے قائل ہیں اور بکیر بن اشج، ابو العالیہ اور فراء رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔ معنی یہ ہیں: پھر عود کرتے ہیں، وہ بات کہنے کی طرف جو کہی۔[1] ⑥ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کی طرف عود کرتے ہیں نقض و رفع و ازالہ کے ساتھ۔ اکثر مجتہدین اسی احتمال کی طرف گئے ہیں۔ ⑦ کسی نے کہا ہے کہ عود کے معنی ظہار کے بعد طلاق کے بارے میں سکوت ہے۔ ⑧ کسی نے کہا ہے کہ عود ندامت ہے، یعنی نادم ہوتے ہیں تو اُلفت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

بالجملہ موصول مبتداء ہے اور اس کی خبر ﴿ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ﴾ ہے برتقدیر ''فَعَلَيْهِمْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ أَيْ: فَالْوَاجِبُ عَلَيْهِمْ إِعْتَاقُ رَقَبَةٍ يُقَالُ: حَرَّرْتُهُ أَيْ: جَعَلْتُهُ حُرًّا'' یعنی تو ان پر ایک غلام کو آزاد کرنا واجب ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ کوئی سا رقبہ ہو، کافی ہو جائے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ شرط ہے کہ وہ مومنہ ہو جیسا کہ قتل کے کفارے میں ''رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ'' ہے۔ پہلی بات کے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب قائل ہیں اور دوسری بات کے قائل امام مالک و امام شافعی رحمہما اللہ ہیں، ان دونوں نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ وہ رقبہ ہر عیب سے صحیح سالم ہو اور مدبر و امِ ولد جائز نہیں ہے اور نہ وہ مکاتب جو اپنی آزادی کے لیے کچھ ادا کر چکا ہے۔[2]

① تفسير القرطبي (١٧/٢٨١، ٢٨٢) فتح القدير (٥/٢٤٢) ② تفسير القرطبي (١٧/٢٨٣) فتح القدير (٥/٢٤٢)

﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ﴾ یعنی غلام کا آزاد کرنا اس سے پہلے ہے کہ ایک دوسرے کو چھوئیں۔ یہاں چھونے سے مراد جماع ہے، جمہور اسی کے قائل ہیں، چنانچہ مظاہر کو وطی کرنا جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ کفارہ ادا کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد استمتاع ہے جماع کے ساتھ، یا لمس ہے، یعنی ہاتھ لگانا یا شہوت کے ساتھ فرج کی طرف نظر کرنا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کے دو قولوں میں سے ایک قول ہے۔

﴿ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ﴾ یعنی یہ حکم مذکور جس کا تمھیں کہا جاتا ہے، یا ظہار کا ارتکاب کرنے پر جس کے ساتھ تمھیں ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی ہے، اس لیے کہ زجر کرنے والی باتیں جنایات میں خوض کرنے سے باز رکھنے والی ہیں۔ اس میں اس شے کا بیان ہے جو کفارے کے مشروع کرنے سے مقصود ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں کہ کفارے میں یہ سختی کرنا اس لیے ہے کہ اس کے ساتھ تمھیں وعظ و نصیحت ہو۔[1] یعنی کفارے کا سخت اور درشت کرنا تمھارے لیے وعظ ہے، تاکہ تم ظہار کو ترک کرو، کیوں کہ کفارے کا حکم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ گناہ کا ارتکاب ہوا ہے، اس لیے واجب ہے کہ اس حکم سے نصیحت حاصل کرو، یہاں تک کہ پھر ظہار کبھی نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کے عقاب سے ڈرو جو اس پر ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمھارے کاموں کی خوب خبر ہے۔ تمھارے کاموں میں سے اس پر کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔ وہ تمھیں ان پر جزا دینے والا ہے۔

پھر اللہ پاک نے اس شخص کے متعلق حکم بیان کیا جو کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ﴾ یعنی جو کوئی اپنی ملکیت میں کوئی غلام نہ پائے اور نہ اس کی قیمت ادا کرنے پر قادر ہو تو اس پر دو مہینے کے لگاتار روزے ہیں۔ ان میں افطار نہ کرے، پھر اگر افطار کرے تو نئے سرے سے رکھے اگر افطار بغیر عذر کے ہو، اور اگر کسی عذر، مرض یا سفر کی وجہ سے افطار ہو تو امام سعید بن مسیّب، حسن، عطا بن ابی رباح، عمرو بن دینار، شعبی، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ وہ باقی ماندہ مکمل کرے اور نئے سرے سے نہ رکھے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نئے سرے سے رکھے۔ یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔

بالجملہ یہ دو مہینے کے روزے لگاتار رکھنا ہے، اس سے پہلے کہ آپس میں ایک دوسرے کو چھوئیں۔ اس کے معنی عنقریب گزر چکے ہیں۔ پھر اگر اس نے رات میں دن میں عمداً یا خطأً وطی کی تو نئے سرے سے روزے رکھے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نئے سرے سے نہ رکھے، اگر رات میں وطی کرے، کیوں کہ رات روزے کا وقت نہیں۔[2] قولِ اول زیادہ بہتر ہے۔

﴿ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر اگر کوئی دو مہینے کے لگاتار روزے

---

[1] معاني القرآن (٥/١٣٥) [2] تفسير القرطبي (١٧/٢٨٤، ٢٨٥)

رکھنے کی طاقت نہ رکھے تو اس پر یہ ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے ہر مسکین کو دو مد دے یہ دو مد آدھا صاع ہوا۔ امام ابو حنیفہ اور اُن کے اصحاب رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ ہر مسکین کو ایک مد اُس غذا میں سے دے جو شہر کے زیادہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ ان کو کھلائے، یہاں تک کہ وہ ایک بار میں سیر ہو جائیں، یا ان کو وہ شے دے دے جو اُن کو سیر کر دے اور اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ان کو ایک بار میں جمع کرے، بلکہ اسے یہ جائز ہے کہ ساٹھ میں سے بعض کو تو ایک دن کھلائے اور بعض کو دوسرے دن کھلائے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین کفارے ہیں جن میں ایک مد ہے: قسم کا کفارہ اور ظہار کا کفارہ اور روزے کا کفارہ۔[1]

﴿ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ﴾، ﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتدا ہے اور خبر مقدر ''أَيْ: ذٰلِكَ وَاقِعٌ'' یا محلِ نصب میں ہے ''أَيْ: فَعَلْنَا ذٰلِكَ''، یعنی یہ بیان وتعلیم احکام اور ان سے آگاہ کرنا جس کا بیان مذکور ہوا واقع ہے، یا ہم نے اس کو مقرر کیا، تاکہ تم اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول ﷺ پر یقین کرو اور اس کے شرائع واحکام جن کو تمھارے لیے مشروع کیا، ان پر تم عمل کرو اور اس بات کی تصدیق کرو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا حکم دیا ہے، تاکہ اوامر ونواہی میں اللہ تعالیٰ کی اور اس کی رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ اور شرعی حدود کے نزدیک ٹھہرو اور اُن سے آگے نہ بڑھو اور ظہار کی طرف دوبارہ نہ لوٹو جو ایک ناپسندیدہ بات اور جھوٹ ہے۔

﴿ تِلْكَ ﴾ مبتدا ہے ﴿ حُدُوْدُ اللّٰهِ ﴾ اس کی خبر ہے، یعنی یہ احکام جن کا ظہار اور کفارے میں ذکر کیا گیا ہے اللہ کی حدیں ہیں، چنانچہ تم ان سے آگے نہ بڑھو۔ کون سی حدیں؟ جن کو تمھارے لیے مقرر کر دیا ہے، چنانچہ اس نے تمھارے لیے بیان کر دیا کہ ظہار معصیت ہے اور اس کا کفارہ جو بیان کیا گیا ہے وہ عفو اور مغفرت کا موجب ہے۔ ﴿ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ یعنی اور وہ منکر جو اللہ کی حدوں کے نزدیک نہیں ٹھہرتے اور جو شے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مقرر کر دی ہے، اس پر عمل نہیں کرتے تو ان کے لیے دردناک عذاب ہے، یعنی قیامت کے دن جہنم کا عذاب ہے۔ حدودِ الٰہی پر نہ ٹھہرنے کا نام تغلیظ وتشدید (سختی کرنے) کے لیے کفر رکھا۔

ظہار اور اس کے کفارے کا بیان:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے، یعنی ﴿ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا ﴾ کی تفسیر میں۔ یہ وہ مرد ہے جو اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے۔ پس جب اس نے یہ کہہ دیا تو اسے حلال نہیں کہ اس کے قریب ہو نکاح کے ساتھ اور نہ بغیر نکاح کے یہاں تک کہ ایک غلام آزاد کر کے کفارہ دے، پھر اگر غلام نہ پائے تو دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے، اس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے کو مس کریں۔

---

[1] الدر المنثور (٨/٧٦)

مس نکاح ہے (یعنی جماع و وطی)، پھر اگر روزے رکھنے کی طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھلائے اور اگر اس سے اس طرح کہا کہ اگر میں فلاں کام کروں تو تُو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے تو اس میں ظہار واقع نہ ہوگا، یہاں تک کہ حانث ہو (یعنی قسم کو توڑ دے)، پھر اگر حانث ہوا تو اس سے قربت نہ کرے، یہاں تک کہ کفارہ دے اور ظہار میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔[1] (أخرجه ابن المنذر والبيهقي)۔

نیز ان سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی مکرم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: بے شک میں نے اپنی عورت سے ظہار کیا، پھر میں نے اس کے خلخال (پازیب) کی سفیدی چاند کی روشنی میں دیکھ لی تو میں اس پر واقع ہو گیا، اس سے پہلے کہ کفارہ دوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا﴾ نہیں فرمایا؟ عرض کی: اے اللہ کے رسول! مقرر میں نے تو کر لیا۔ فرمایا کہ رک رہ اس سے، یہاں تک کہ کفارہ دے۔[2] (أخرجه البزار والطبراني والحاكم وابن مردويه والبيهقي)۔ اسی طرح امام ابو داود، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ وغیرہ نے ان سے روایت کیا ہے۔[3] (كذا في فتح البيان)

یوسف بن عبد اللہ بن سلام خویلہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا سے راوی ہیں، کہا: واللہ! مجھ میں اور اوس بن صامت رضی اللہ عنہ میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ المجادلہ کی ابتدائی آیات نازل فرمائی ہیں، کہا: میں اس کے پاس تھی، وہ ایک بڑا بوڑھا تھا۔ اس کا خلق درحقیقت برا ہو گیا تھا، کہا: وہ ایک دن میرے پاس آیا تو میں نے کسی شے کے ساتھ اس سے تکرار کی تو وہ خفا ہو گیا، چنانچہ کہہ بیٹھا کہ تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے۔ کہا: پھر وہ نکلا تو تھوڑی دیر کے لیے اپنی قوم کی مجلس میں بیٹھا، پھر مجھ پر داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ مجھ سے میرے نفس کا ارادہ کر رہا ہے، یعنی صحبت کرنا چاہتا ہے، کہا: میں بولی: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں خویلہ کی جان ہے! تو مجھ تک نہ پہنچے گا، حالاں کہ تو کہہ چکا جو کچھ کہہ چکا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ ہمارے حق میں اپنے حکم سے فیصلہ کرے۔

کہا: پھر اس نے مجھ پر جست کی اور میں اس سے باز رہی، پھر میں اس پر اس شے کے ساتھ غالب ہو گئی جس سے عورت بوڑھے ضعیف پر غالب ہوتی ہے تو میں نے اس کو اپنی طرف سے ڈال دیا۔ کہا: پھر میں اپنی بعض ہمسایہ عورتوں کی طرف نکلی تو میں نے ان سے عاریتاً کپڑے لیے، پھر میں نکلی، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور آپ کے روبرو بیٹھ گئی، پھر جس طرح میں اس سے پیش آئی تھی اس کا آپ ﷺ سے ذکر کیا اور اس کی بدخلقی جو مجھے پیش آئی تھی اس کی آپ ﷺ سے شکایت کرنے لگی۔ کہا: رسول اللہ ﷺ فرمانے لگے: اے خویلہ! تیرے چچا کا بیٹا بڑا بوڑھا ہے چنانچہ تو اس کے بارے میں اللہ سے ڈر۔ مگر میں نہ ٹلی، یہاں تک کہ میرے بارے میں قرآن

---

1. الدر المنثور (٨/٧٥)
2. مسند البزار (١١/١١٣) المعجم الكبير (١١/١٥) مستدرك الحاكم (٢/٢٢٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/٣٨٦)
3. سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٢١) سنن الترمذي (١١٩٩) سنن النسائي (٣٤٥٧) فتح البيان (١٤/١٤، ١٥)

نازل ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس حالت نے ڈھانک لیا جو آپ ﷺ کو ڈھانکا کرتی تھی، پھر وہ حالت آپ ﷺ سے دور ہوگئی تو مجھ سے فرمایا: اے خویلہ! اللہ نے واقعی تجھ میں اور تیرے خاوند کے بارے میں قرآن نازل فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے پڑھا: ﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ ... إلىٰ قوله تعالىٰ: وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

کہا: آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ تو اس کو جا کر امر کر کہ وہ ایک بردہ (غلام) آزاد کرے۔ کہا: میں نے عرض کی: اس کے پاس وہ شے نہیں ہے جو آزاد کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر چاہیے کہ دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔ کہا: پھر میں نے عرض کی: واللہ! بے شک وہ البتہ ایک بڑا بوڑھا ہے۔ "مَا بِهِ مِنْ صِيَامٍ" یعنی اسے روزوں کی طاقت نہیں ہے۔ فرمایا: تو چاہیے کہ ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجوریں کھلائے۔ کہا: پھر میں نے عرض کی: واللہ! اے اللہ کے رسول! یہ اس کے پاس نہیں ہے۔ کہا: پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اب ہم ایک فرق کھجوروں سے اس کی اعانت کریں گے۔ کہا: میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اور اب میں اس کی اعانت ایک اور فرق سے کروں گی۔ فرمایا: تو یقیناً صواب کو پہنچی یعنی تو نے صحیح کام کیا اور تو نے احسان کیا، لہٰذا تو جا اور اس کو اس کی طرف سے خیرات کر دے، پھر تو اپنے چچا کے بیٹے کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت قبول کر۔ کہا: میں نے قبول کی۔[1] (أخرجه الإمام أحمد ورواه أبو داود في كتاب الطلاق من طريقين عن محمد بن إسحاق بن يسار به و عنده خولة بنت ثعلبة و يقال فيها خولة بنت مالك بن ثعلبة وقد تصغر فيقال: خويلة ولا منافاة بين هذه الأقوال فالأمر فيها قريب، والله أعلم)

حافظ ابن کثیر ؒ کہتے ہیں کہ در سببِ نزولِ صدرِ این سورہ صحیح یہی حدیث ہے۔ اب رہی سلمہ بن صخر ؓ سے مروی حدیث تو اس میں یہ نہیں ہے کہ وہ سببِ نزول ہے، لیکن اس کو اس شے کا حکم دیا گیا جو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نازل فرمائی، یعنی بردہ آزاد کرنا، یا روزے رکھنا یا کھانا کھلانا۔ اس حدیث کو امام احمد ؒ نے روایت کیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں پوری مذکور ہے۔[2] پھر کہا ہے کہ ظہار مشتق ہے ظہر سے، جاہلیت میں جب کوئی اپنی بیوی سے ظہار کرتا تو اس سے کہتا: "أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّيْ" پھر شرع میں ظہار ظہر پر قیاس کر کے باقی اعضاء میں ہوگیا۔ جاہلیت میں ظہار طلاق تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے لیے رخصت دی اور اس میں کفارہ مقرر کر دیا اور اس کو طلاق نہ ٹھہرایا جس طرح کہ وہ لوگ جاہلیت میں اس کا اعتقاد اور قصد رکھتے تھے۔ سلف میں سے کئی ایک اہلِ علم نے اسی طرح کہا ہے۔ امام سعید بن جبیر ؒ کہتے ہیں کہ ایلاء وظہار جاہلیت کی طلاق میں سے تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایلاء کو تو چار ماہ کے ساتھ مقید کر دیا اور ظہار میں کفارہ مقرر کر دیا۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

امام مالک ؒ نے ﴿ مِنْكُمْ ﴾ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ کافر اس آیت میں داخل نہیں ہیں۔

---

[1] مسند أحمد (٤١٠/٦) سنن أبي داود (٢٢١٤) امام البانی ؒ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (١٧٣/٧)

[2] مسند أحمد (٣٧/٤) تفسير ابن كثير (٤٠٨/٤) [3] تفسير ابن كثير (٤١٠/٤)

چنانچہ خطاب مومنوں کو ہے۔ جمہور نے یوں جواب دیا کہ یہ خارج مخرجِ غالب ہے تو اب اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں ہے۔ جمہور نے ﴿مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ﴾ سے اس پر استدلال کیا ہے کہ لونڈی سے ظہار نہیں ہے اور وہ اس خطاب میں داخل نہیں ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے، اس شے کو جو جاہلیت میں ہوئی اور اسی طرح اس شے سے بھی معاف کرنے والا ہے جو سبقتِ زبان سے نکل گئی اور بات کرنے والے کا ارادہ وہ کہنے کا نہیں تھا۔ جیسا کہ امام ابو داود رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے (اصل میں بیاض ہے، راوی کا نام رہ گیا ہے) کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے: او میری بہن! تو آپ ﷺ نے فرمایا: تیری بہن ہے وہ؟[1] چنانچہ یہ انکار ہے، لیکن صرف اس کے کہنے سے آپ ﷺ نے اس کو اس پر حرام نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اس نے اس کا قصد نہیں کیا تھا اور اگر وہ اس کا قصد کرتا تو البتہ وہ اس پر حرام ہو جاتی، کیوں کہ صحیح قول کی بنا پر ماں اور اس کے سوا باقی محرمات، یعنی بہن، پھوپھی، خالہ اور جو اُن کے مشابہ ہیں، ان کے درمیان کچھ فرق نہیں ہے۔

پھر ﴿لِمَا قَالُوْا﴾ کی تفسیر میں جو سلف و ائمہ کا اختلاف ہے، اس کو ذکر کیا ہے۔ بعض کا جو یہ قول ہے کہ لفظ ظہار کی طرف عود کرے تو اس کو مکرر کہے، اس کے بعد یوں کہا ہے کہ یہ قول باطل ہے اور یہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا اختیار کردہ ہے اور داود رحمہ اللہ کا قول ہے۔ ابو عمر بن عبد البر رحمہ اللہ نے بکیر بن اشج، فراء اور اہلِ کلام کے ایک فرقے سے اس کو روایت کیا ہے، اس کے بعد اور قول ذکر کیے ہیں، پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ مس نکاح ہے۔ اسی طرح امام عطاء، زہری، قتادہ اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے لیے جائز نہیں کہ اس کا بوسہ لے اور اس کو چھوئے، یہاں تک کہ کفارہ دے۔[2] (وقد روى أهل السنن من حديث عكرمة عن ابن عباس رضي الله عنهما أن رجلا قال: يا رسول الله! إني ظاهرت من امرأتي فوقعت عليها قبل أن أكفر فقال: ما حملك على ذلك يرحمك الله؟ قال: رأيت خلخالها في ضوء القمر قال: فلا تقربها حتى تفعل ما أمرك الله عزوجل. وقال الترمذي: حسن غريب صحيح و رواه أبو داود والنسائي من حديث عكرمة مرسلا قال النسائي: وهو أولى بالصواب)[3]

پھر رقبہ کے اطلاق و تقیید کا ذکر کیا، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اس کے بعد بہ روایتِ بزار عن طاؤس عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قصہ مذکورہ ذکر کیا ہے، پھر بزار کا یہ قول نقل کیا ہے: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سے احسن روایت مروی نہیں ہے۔ اسماعیل بن مسلم پر کلام کیا گیا ہے۔ اہلِ علم کی ایک بہت بڑی جماعت نے ان سے روایت کی ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسے صرف ایک ہی کفارے کا حکم دیا ہے۔[4] قولہ تعالیٰ: ﴿ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ١ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ یعنی اس کے ساتھ تم زجر کیے جاتے ہو اور اللہ اس شے کی خبر رکھنے والا ہے جو

---

[1] سنن أبي داود (٢٢١٠) یہ روایت مرسل ہے۔ دیکھیں: (ضعيف أبي داود: ٢/٢٤٠) [2] تفسیر ابن کثیر (٤/٤١٠)

[3] سنن أبي داود (٢٢٢٣) سنن الترمذي (١١٩٩) سنن النسائي (٣٤٥٨) سنن ابن ماجه (٢٠٦٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: (إرواء الغليل: ٧/١٧٩)

[4] مسند البزار (١١/١١٣)

تمھاری اصلاح کرتی ہے اور جاننے والا ہے تمھارے احوال کا۔

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے محارم ہیں سو تم ان کی بے حرمتی مت کرو اور جو لوگ ایمان نہیں لائے اور نہ ہی اس شریعت کے احکام کی پابندی کی، ان کے بارے میں تم یہ اعتقاد مت کرو کہ وہ نجات پانے والے ہیں، ہرگز نہیں بات ویسی نہیں ہے جیسا کہ انھوں نے زعم کیا ہے، بلکہ ان کے لیے دنیا اور آخرت میں عذابِ الیم ہے۔[1] (كذا في ابن كثير باختصار) بالجملہ جب کہ اللہ پاک نے ان مومنوں کا ذکر کیا جو اس کی حدوں کے پاس ٹھہر جانے والے ہیں تو ان کا ذکر کیا جو محادین (مخالفت کرنے والے) ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ قَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌۚ۝۵ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۝۶ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَ لَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَ لَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۝۷

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہ ذلیل کیے جائیں گے، جیسے وہ لوگ ذلیل کیے گئے جو اُن سے پہلے تھے اور یقیناً ہم نے واضح آیات اُتاری ہیں، اور کافروں کے لیے رسوا کن عذاب ہے ⑤ جس دن اللہ ان سب کو اُٹھائے گا (زندہ کرے گا)، پھر ان کو بتلائے گا جو انھوں نے عمل کیے۔ اللہ نے ان کو گن رکھا ہے، جبکہ وہ انھیں بھول گئے، اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے ⑥ (اے نبی!) کیا آپ نے نہیں دیکھا، بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تین (افراد) کی کوئی سرگوشی نہیں ہوتی، مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ آدمیوں کی، مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور

---

① تفسیر ابن کثیر (٤/٤٠٧_٤١١)

نہ زیادہ، مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، جہاں کہیں بھی وہ ہوں، پھر وہ روزِ قیامت انھیں بتائے گا جو انھوں نے عمل کیے تھے، بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے ⑦

دشمنانِ دین کا انجام بد:

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے متعلق خبر دیتا ہے کہ جنھوں نے اس کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور اس کی شرع سے دشمنی کی کہ وہ ذلیل و رسوا ہو گئے اور ملعون ہوئے، جیسا کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا جو اُن سے پہلے ان کے مشابہ تھے اور تحقیق ہم نے واضح آیتیں نازل کیں جن سے کوئی عناد نہیں کرتا اور نہ مخالفت کرتا ہے سوائے کافر، فاجر اور مکابر کے اور منکروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اس کے بدلے میں کہ انھوں نے اللہ کی شرع کے اتباع سے اور اس کے لیے فرمانبردار ہونے سے اور اس کے سامنے فروتنی کرنے سے تکبر کیا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اگلوں پچھلوں کو ایک زمین میں جمع کرے گا، پھر ان کو اس خیر اور شر کی خبر دے گا جو انھوں نے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خیر و شر کو ان کے لیے لکھ رکھا ہے اور محفوظ کیا ہوا ہے اور وہ اس کو بھول گئے۔ اللہ کے سامنے ہر چیز ہے۔ کوئی شے اس سے غائب نہیں ہوتی اور نہ مخفی رہتی ہے اور نہ وہ کسی شے کو بھولتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا علم مخلوق کو گھیرے ہوئے ہے:

پھر یہ خبر دی کہ اس کا علم مخلوق کو گھیرے ہوئے ہے، وہ ان پر مطلع ہے، ان کی باتیں سنتا ہے، ان کے مکان کو دیکھتا ہے، وہ جس جگہ ہوں جہاں کہیں ہوں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ... ﴾ اور باوجود اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ خود سنتا اور جانتا ہے، اس کے قاصد بھی ان کی سرگوشی کو اور جو کچھ وہ کرتے ہیں، اسے لکھتے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ [التوبة: ۷۸] ''کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کا بھید اور ان کی سرگوشی سب معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ غیب کی تمام باتوں سے خبردار ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ۭ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۸۰] ''کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں کو اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے، (یقیناً ہم برابر سن رہے ہیں) بلکہ ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔''

اسی لیے کئی ایک اہلِ علم نے اس بات پر اجماع بیان کیا ہے کہ اس آیت سے اللہ پاک کی معیت علمی مراد ہے اور یہ مراد لینے میں کچھ شک نہیں ہے، لیکن اس کے علم کے ساتھ اس کی سماعت بھی ہے اور اس کی بصر ان میں نافذ ہے۔ چنانچہ اللہ پاک اپنی مخلوق پر مطلع ہے، ان کے امور میں سے کوئی شے اس سے غائب نہیں ہے۔ پھر فرمایا:

﴿ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کو علم کے ساتھ شروع کیا اور اسی کے ساتھ اس کو ختم فرمایا۔[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ محادہ کہتے ہیں: مشاقہ، معاداۃ اور مخالفت کو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محادۃ یہ ہے کہ تو اس حد میں ہو جو تیرے صاحب کے مخالف ہو تو یہ معاداۃ و دشمنی سے کنایہ ہے۔ اس لیے کہ یہ دشمنی کو لازم ہے، اس کی اصل ممانعت ہے۔ اسی معنی سے حدید بھی ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ ممانعت کی جاتی ہے اور اسی معنی سے بواب و دربان کو حداد کہتے ہیں۔[2] یہ محادین اہلِ مکہ ہیں، اس لیے کہ یہ آیت غزوۂ احزاب میں وارد ہوئی ہے۔ یہ غزوہ ۴ ہجری یا ۵ ہجری میں ہوا، اس سے رسول اللہ ﷺ کو اور مومنین کو اس بات کی بشارت دینا مقصود ہے کہ ان کے دشمن جو جتھے بن کر ان پر آنے والے ہیں، وہ ذلیل وخوار کیے جائیں گے اور ان کی جمعیت متفرق ہو جائے گی۔

مستقبل کو ماضی کے لفظ سے ادا کیا، اس سے یہ آگاہ کرنا مقصود ہے کہ یہ درحقیقت وقوع پذیر ہونے والا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی ماضی کی بنا پر ہیں اور اس سے مراد وہ معاملہ ہے جو بدر کے دن مشرکوں کے ساتھ واقع ہوا، کیوں کہ اللہ پاک نے ان کو قتل، قید اور قہر سے ذلیل کیا۔ ﴿ كُبِتَ ﴾ ذلیل و رسوا کرنے کو کہتے ہیں۔ "يُقَالُ: كَبَتَ اللّٰهُ فُلَانًا إِذَا أَذَلَّهُ" اور جو کوئی ذلت کے ساتھ مردود ہوتا ہے اس کو مکبوت بولتے ہیں۔ دونوں امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسوا کیے گئے، جیسے ان سے پہلے کے مشرکین رسوا کیے گئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام ابوعبیدہ اور اخفش رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ كُبِتُوْا ﴾ بہ معنی "أُهْلِكُوْا" ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عُذِّبُوْا"۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لُعِنُوْا"۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أُغِيْظُوْا يَوْمَ الْخَنْدَقِ"۔[3]

﴿ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ سے مراد اگلی اُمتوں کے کفار ہیں جو اللہ کے رسولوں کے دشمن تھے۔ جملۂ ﴿ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال ﴿ كُبِتُوْا ﴾ کے واو سے، یعنی وہ ذلیل و رسوا کیے گئے، درآنحالیکہ ہم نے اگلی اُمتوں کے بارے میں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کی مخالفت کی تھی واضح آیتیں نازل کیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آیات سے مراد فرائض ہیں جن کو اللہ پاک نے نازل فرمایا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد وہ معجزات ہیں جو رسول ﷺ کے صدق اور راستی پر دال ہیں۔

﴿ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ یعنی اور جو لوگ ہر اس شے کا انکار کرنے والے ہیں جس پر ایمان لانا واجب ہے، چنانچہ وہ آیات جن کا یہاں ذکر ہوا، وہ اس کے تحت بدرجہ اولیٰ داخل ہوں گی۔ تو ان کے لیے ذلیل

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/٤١١، ٤١٢) [2] تفسير القرطبي (١٧/٢٨٨) [3] تفسير القرطبي (١٧/٢٨٨) فتح القدير (٥/٢٤٦)

کرنے والا عذاب ہے جو اپنے صاحب کو ذلیل کر دے گا اور اس کی عزت کو لے جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے نفوس کی عزت کی وجہ سے ہی انھوں نے آیات کا انکار کیا، اس لیے ان کے لیے عذاب بھی ایسا ہونا چاہیے جو ان کو ذلیل ورسوا کر دے، کیوں کہ جزا عمل کے مطابق ہوتی ہے۔

﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ﴾ (﴿ جَمِيْعًا ﴾ منصوب ہے بنا بر حال ﴿ يَبْعَثُهُمْ ﴾ کی ضمیر منصوب سے "أَيْ: مجتمعين في حالة واحدة") میں ظرف "اُذْكُرْ" محذوف سے متعلق ہے، یا اس سے جس سے ﴿ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ کا لام متعلق ہے یا ﴿ مُهِيْنٌ ﴾ سے، یعنی وہ عذاب ان کو ذلیل کرنے والا ہے، اس دن جس دن اللہ ان کو مبعوث کرے گا، اس حال میں کہ وہ سب ایک حالت میں مجتمع ہوں گے، یا ان سب کو مبعوث کرے گا ان میں کوئی بھی ایسا باقی نہ رہے گا جو مبعوث نہ ہو۔

﴿ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ﴾ یعنی صرف مبعوث کر کے نہیں چھوڑ دے گا، بلکہ پھر ان کو ان اعمالِ قبیح کی خبر دے گا جو انھوں نے دنیا میں کیے تھے، یہ خبر دینا یا تو یوں ہوگا کہ ان کی ملامت اور سرزنش کرنے کے لیے اور ان پر حجت کامل کرنے کے لیے بیان کر دے گا کہ وہ اعمال ان سے صادر ہوئے، یا ان اعمال کو ایک قبیح اور ہولناک صورت بنا کر کھڑا کر دے گا، تاکہ ان کو ذلیل کرے اور ان کی حالت کی خوب تشہیر کرے اور ان کا عذاب سخت کرے۔

پھر اگر کوئی یہ کہے کہ ان کے اعمال تو کثیر ہیں اور مختلف طرح کے ہیں ان سب کی خبر ان کو کیسے کرے گا؟ تو جملہ مستانفہ سے اس کا یہ جواب ارشاد فرمایا کہ ﴿ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سب اعمال کا شمار کر رکھا ہے، ان میں سے کچھ بھی اس سے غائب نہیں ہوا، حالانکہ وہ ان کو بھول گئے اور انھیں یاد نہیں رکھا۔ پھر ایک اور جملے سے اپنے اس شمار کرنے کی تقریر اور تاکید فرمائی: ﴿ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ یعنی ان کے اعمال کی کیا ہستی ہے، بلکہ اللہ تو ہر شے پر شہید ہے۔ کوئی بھی شے اس پر مخفی نہیں ہے۔ ساری اشیاء کی اس کو اطلاع ہے اور ان پر اس کی نظر ہے۔

پھر اس بیان کی تاکید کی کہ وہ ہر شے کا عالم ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ یعنی کیا تو نے نہیں جانا کہ اس کا علم مکمل ہے اور ہر اس شے کو گھیرے ہوئے ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، اس طرح سے کہ جو کچھ اُن میں ہے اس میں سے کچھ بھی اس پر مخفی نہیں ہے۔

پھر جملہ مستانفہ سے اس بات کی تقریر اور تاکید کی کہ اس کا علم وسیع ہے اور تمام معلومات کو گھیرے ہوئے ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ ﴾ جمہور نے ﴿ يَكُوْنُ ﴾ کو بہ تحتیہ اور کسی نے (یعنی ابوجعفر، اعرج اور ابوحیوہ رحمہم اللہ نے) بہ فوقیہ پڑھا ہے[1] اور دونوں کی بنا پر

---

[1] تفسير القرطبي (٢٨٩/١٧)

"كَانَ" تامہ ہے۔کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے تاکید کے لیے اور ﴿ نَجْوٰى ﴾ ﴿ يَكُوْنُ ﴾ کا فاعل ہے۔ ﴿ نَجْوٰى ﴾ مصدر ہے۔قوم کے بھیدوں کے معنی میں ﴿ نَجْوٰى ﴾ بولا جاتا ہے: "أَيْ: ذُوُو نَجْوَى"

یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ نَجْوٰى ﴾ کا اطلاق باہم سرگوشی کرنے والے لوگوں پر کیا جائے، غرض یہ کہ ﴿ نَجْوٰى ﴾ یا تو اپنی مصدریت پر ہے، یا مضاف مقدر ہے: "أَيْ: مِنْ ذَوِيْ نَجْوَى"، یا بہ معنی اشخاص متناجین ہے، چنانچہ پہلے کی بنا پر تو ﴿ ثَلٰثَةٍ ﴾ کا جر اس وجہ سے ہے کہ ﴿ نَجْوٰى ﴾ اس کی طرف مضاف ہے: "أَيْ: مِنْ تَنَاجِيْ ثَلَاثَةٍ" اور آخر کی دو وجہ کی بنا پر اس کا جر بنا بر بدل ہے ﴿ نَجْوٰى ﴾ سے، یا اس کی صفت ہے۔امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ ثَلٰثَةٍ ﴾ ﴿ نَجْوٰى ﴾ کی صفت ہے، چنانچہ وہ اس بنا پر مجرور ہوا اور اگر تم چاہو تو ﴿ نَجْوٰى ﴾ کو اس کی طرف مضاف کرو اور اگر نصب دو بنا بر اضمار فعل تو جائز ہے (یہ قراءت ابن ابی عبلہ کی ہے[1] اور رفع بھی جائز ہے بنا بر بدل ﴿ نَجْوٰى ﴾ کے محل سے)۔ اور تینوں جملے یعنی ﴿ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ ﴾، ﴿ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ ﴾، ﴿ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ ﴾ محل نصب میں ہیں بنا بر حال اور استثناء مفرغ ہے اعم احوال سے۔

﴿ رَابِعُهُمْ ﴾، ﴿ سَادِسُهُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ کرنے والا ہے تین کو چار اور پانچ کو چھے۔معنی یہ ہیں کہ نہیں پایا جاتا ہے سرگوشی کرنا تین آدمیوں کا، یا نہیں پائے جاتے سرگوشی کرنے والے تین آدمی کسی بھی حال میں مگر حالت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے علم سے چار کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سرگوشی کو جانتا ہے، گویا ان کے ساتھ حاضر ہے، ان کا مشاہدہ کرنے والا ہے جس طرح کہ ان کی سرگوشی چوتھے آدمی کو معلوم ہوتی ہے جو اُن کے ساتھ ہوتا ہے۔ خازن اور ابو السعود میں اسی طرح ہے۔[2] اور نہیں پایا جاتا سرگوشی کرنا پانچ کا مگر حال یہ ہے کہ وہ ان کو چھے کرنے والا ہے، اس انداز سے کہ اس سرگوشی کو جاننے میں وہ ان کا شریک ہے۔

ان دو عددوں کو خاص کر کے ذکر کیا، اس لیے کہ سرگوشی کرنے والوں کی زیادہ تر عادت یہ ہے کہ وہ تین ہوتے ہیں یا پانچ ہوتے ہیں یا جو واقعہ آیت کے نزول کا سبب ہے، وہ ان سرگوشی کرنے والوں کے بارے میں تھا جو ایک جگہ تین تھے اور ایک جگہ پانچ، یا اس لیے کہ طاق عدد اشرف ہے جفت عدد سے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وتر کو محبوب رکھتا ہے۔ ان دونوں اعداد کو خاص کر ذکر کیا، تا کہ اس بات سے آگاہ کرے کہ سارے کاموں میں امورِ الٰہیہ کی رعایت کرنا لازمی ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عدد مقصود نہیں ہے، کیوں کہ اللہ پاک تو ہر عدد کے ساتھ ہے قلیل ہو یا کثیر، وہ خفیہ اور ظاہر شے کو جانتا ہے، اس پر کوئی پوشیدہ شے بھی مخفی نہیں ہے۔[3] اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ یعنی اس عدد سے کم ہو،

---

[1] تفسیر القرطبي (۲۸۹/۱۷) [2] تفسیر الخازن (٤٨/٧) تفسیر أبي السعود (۲۱۸/۸) [3] فتح القدیر (۲٤٧/٥)

یعنی ایک اور دو اور اس سے زیادہ ہو، جیسے: چھے اور سات، وہ ہر حال میں ان کا مصاحب ہے جو کچھ وہ سرگوشی کرتے ہیں اس کو وہ جانتا ہے، اس میں سے کچھ بھی اس پر چھپا ہوا نہیں ہے، وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ یعنی اس کے علم نے ان کی ہر سرگوشی کا احاطہ کر رکھا ہے، وہ مکانوں میں سے کسی مکان میں ہو، گو وہ زمین کے نیچے ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ اس کا اشیاء کے متعلق علم کچھ اس جگہ کے قریب ہونے کی وجہ سے نہیں ہے کہ جگہ کے قریب اور دور ہونے کی وجہ سے اس کا علم مختلف ہو جائے۔ پھر وہ ان کو قیامت کے دن ان کاموں کی خبر دے گا جو انھوں نے کیے۔ اس سے منظور ان کو ملامت اور سرزنش کرنا اور ان پر حجت قائم کرنا ہوگا۔

پھر پہلے کے مضمون کی تقریر اور تاکید کرنے کے لیے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی بے شک اللہ کو ہر شے کی خبر ہے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے، وہ کوئی سی شے ہو۔ جمہور نے ﴿ اَكْثَرَ ﴾ کو بہ جر بہ فتحہ پڑھا ہے، لفظ ﴿ نَجْوٰى ﴾ پر عطف کیا ہے اور کسی نے (یعنی امام حسن، اعمش، ابن ابی اسحاق، ابوحیوہ، یعقوب، ابوالعالیہ، نصر، عیسیٰ بن عمر اور سلام رحمہم اللہ نے) بہ رفع پڑھا ہے۔ ﴿ نَجْوٰى ﴾ کے محل پر معطوف ٹھہرایا ہے اور نیز جمہور نے ﴿ اَكْثَرَ ﴾ بثائے مثلثہ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام زہری اور عکرمہ رحمہما اللہ نے) اکبر بہ بائے موحدہ پڑھا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے کہ منافقین و یہود آپس میں سرگوشی کیا کرتے تھے اور مومنوں کو اس بات کے وہم میں ڈالتے تھے کہ وہ باہم اس بات کی سرگوشی کرتے ہیں جو اُن کو بری لگے تو وہ اس سے غمگین ہوتے تھے، پھر جب یہ بات طول پکڑ گئی اور کثرت سے ہوئی تو مومنوں نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کے علاوہ آپس میں سرگوشی نہ کریں۔ وہ باز نہ آئے اور اپنی سرگوشی کی طرف عود کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں:[1]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ
لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ
الرَّسُوْلِ ۡ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ
وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ
حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۸ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ؕ

[1] تفسير القرطبي (۱۷/۲۹۰) فتح القدير (۵/۲۴۷) فتح البيان (۱۴/۱۷-۱۹)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ
الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَاۗرِّهِمْ شَيْـــًٔا اِلَّا
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا، جنھیں سرگوشیاں کرنے سے روکا گیا تھا، پھر وہ اسی چیز کی طرف لوٹتے ہیں، جس سے انھیں روکا گیا تھا، اور وہ گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اور جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اس (کلمے) کے ساتھ سلام کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کے ساتھ آپ کو (کبھی) سلام نہیں کہا، اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں: اللہ ہمیں اس کی وجہ سے کیوں عذاب نہیں دیتا جو ہم کہتے ہیں؟ ان کے لیے جہنم کافی ہے، وہ اس میں داخل ہوں گے، پس وہ برا ٹھکانا ہے⑧ اے ایمان والو! جب تم سرگوشیاں کرو، تو گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں مت کرو، اور تم نیکی اور تقویٰ کی سرگوشیاں کرو، اور اللہ سے ڈرو جس کے پاس تمھیں اکٹھا کیا جائے گا⑨ (بری) سرگوشی تو ہے ہی شیطان کی طرف سے، تاکہ وہ ایمان والوں کو غمگین کرے، اور وہ انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا، مگر اللہ کے حکم سے اور لازم ہے کہ مومن اللہ ہی پر توکل کریں⑩

یہودیوں کی شرارتوں کا ذکر:

نبی اکرم ﷺ کی مجلس میں بیٹھ کر منافق کان میں باتیں کرتے، مجلس کے لوگوں پر ٹھٹھے کرتے اور عیب جوئی کرتے اور نبی کریم ﷺ کی بات سن کر کہتے: یہ مشکل کام ہم سے کب ہو سکے گا۔ پہلے سورۃ النساء میں اس کی ممانعت آ چکی تھی، پھر وہی کرتے تھے اور دعا اس طرح سے کرتے کہ یہود آتے تو "سَلَامٌ عَلَيْكَ" کے بجائے "اَلسَّامُ عَلَيْكَ" کہتے۔ یہ بد دعا ہے کہ تجھ پر مرگ پڑے۔ پھر آپس میں یہ کہیں کہ اگر یہ رسول ہے تو اس کہنے سے ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا؟ کوئی منافق بھی یہ کہتا ہوگا۔ سورۃ النساء میں گزر چکا ہے کہ کان میں کون سی بات کہنی چاہیے۔ (بری) سرگوشی شیطان کا کام اس طرح سے ہے کہ مجلس میں دو شخص کان میں بات کریں تو دیکھنے والے کو غم ہوتا ہے کہ مجھ سے کیا حرکت ہوئی، جو یہ چھپ کر بات کرتے ہیں۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ ﴾ کی تفسیر میں مجاہد سے مروی ہے (قال ابن أبي نجیح عن مجاهد) کہ یہ لوگ یہود ہیں۔ اسی طرح امام

مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ اتنا اضافہ کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کوئی شخص ان پر گزرتا تو وہ بیٹھ جاتے اور آپس میں کانا پھوسی کرتے، تا کہ مومن یہ خیال کرے کہ وہ اس کے قتل کی یا اس شے کی سرگوشی کرتے ہیں جس کو وہ مومن مکروہ جانتا ہے۔ چنانچہ جب وہ مومن یہ دیکھتا تو اُن سے ڈرتا اور اپنا راستہ تبدیل کر لیتا اور اُن کے پاس سے نہ گزرتا، چنانچہ آپ نے ان کو سرگوشی سے منع فرمایا تو وہ باز نہ آئے اور سرگوشی کی طرف عود کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ مذکورہ نازل فرمائی۔ دوسری روایت امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی بیان کی ہے، اس میں صحابہ کی سرگوشی کا ذکر ہے، لیکن آخر میں کہا ہے کہ یہ اسناد غریب ہے اور اس میں بعض ضعفاء ہیں۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں اثم کی باتیں کرتے ہیں۔ "إثم" وہ ہے جو ان کے ساتھ خاص ہے اور "عدوان" وہ ہے جو ان کے غیر سے متعلق ہے، اسی میں سے رسول کی معصیت اور مخالفت ہے، اس پر جمے رہتے ہیں اور باہم ایک دوسرے کو اس کی وصیت کرتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ﴾ کے تحت میں یہ روایتِ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کیا ہے، فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر یہود داخل ہوئے تو کہا: "اَلسَّامُ عَلَيْكَ يَا أَبَا الْقَاسِمِ" تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "وَعَلَيْكُمُ السَّامُ"، کہا: آپ ﷺ نے فرمایا: او عائشہ! بے شک اللہ فحش کو اور تفحش کو دوست نہیں رکھتا۔ میں نے عرض کی کہ کیا آپ ان کو نہیں سنتے کہ وہ کہتے ہیں: "السَّامُ عَلَيْكَ" تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے نہیں سنا کہ میں نے کہا: "وَعَلَيْكُمْ"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ مذکورہ نازل فرمائی۔[2] صحیح کی ایک روایت میں یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے فرمایا: "عَلَيْكُمُ السَّامُ وَالذَّامُ وَاللَّعْنَةُ" اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک شان یہ ہے کہ ان کے حق میں ہماری بات قبول کی جاتی ہے اور ہمارے حق میں ان کی بات قبول نہیں کی جاتی۔[3] پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت سے اسی معنی کی ایک حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ذکر کی ہے،[4] پھر کہا کہ انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کی اصل صحیح میں ہے اور یہ حدیث صحیح میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی مثل مروی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ کرتے ہیں اور وہ کلام و ابہامِ سلام کہتے ہیں، جس کی تحریف کرتے ہیں، حالاں کہ وہ باطن میں ایک گالی ہے اور اس کے باوجود اپنے جی میں کہتے ہیں کہ اگر یہ نبی ہوتا تو اللہ ہم کو اس بات کے سبب سے، جو ہم باطن میں اس کے لیے کہتے ہیں، ہمیں عذاب کرتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو اس شے کو جانتا ہے جسے ہم چھپاتے ہیں، چنانچہ اگر وہ نبی برحق ہوتا تو البتہ قریب تھا کہ اللہ ہم کو جلد ہی دنیا میں سزا دیتا۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٤٣) تفسير ابن كثير (٤١٢/٤) [2] صحيح مسلم (٢١٦٥) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٤٣)
[3] صحيح البخاري (٥٦٧٨) صحيح مسلم (٢١٦٥، ٢١٦٦) [4] تفسير الطبري (٢٣/٢٤٠)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ﴾ یعنی دارِ آخرت میں جہنم ان کے لیے کافی ہے، وہ اس میں بیٹھیں گے اور وہ پہنچنے کی بری جگہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہود نبی کریم ﷺ کو "اَلسَّامُ عَلَيْكَ" کہتے تھے، پھر اپنے جی میں کہتے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کہنے کے سبب سے عذاب کیوں نہیں کرتا، اس پر آیتِ مذکورہ نازل ہوئی۔[1] (أخرجه الإمام أحمد و إسناده حسن ولم يخرجوه) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (یعنی بہ روایتِ عوفی) کہ منافق جب رسول اللہ ﷺ کو سلام کرتے تو "اَلسَّامُ عَلَيْكَ" کہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾[2]

آدابِ سرگوشی کا بیان:

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو ادب سکھایا کہ کافروں اور منافقوں کی طرح نہ ہو جائیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴾ یعنی اے ایمان والو! جس وقت تم سرگوشی کرو تو گناہ کی اور زیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی نہ کرو، یعنی جس طرح کہ اہلِ کتاب کے جاہل کافر لوگ سرگوشی کرتے ہیں اور وہ منافق کرتے ہیں جنھوں نے ان کی معاونت اور مدد کی ہے، بلکہ تم نیکی اور تقوے کے ساتھ سرگوشی کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے، یعنی اس وقت وہ تم کو تمھارے سب اعمال اور اقوال کی خبر دے گا جن کو تمھارے اوپر شمار کر رکھا ہے اور عن قریب تم کو ان کا بدلہ دے گا۔

صفوان بن محرز کہتے ہیں کہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا کہ ایک شخص ان کے سامنے آیا اور کہا کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے قیامت کے دن نجویٰ کے بارے میں کیا سنا ہے؟ کہا: میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: بے شک اللہ مومن کو قریب کرے گا، پھر اس پر اپنا کنف (طرف) رکھے گا اور اس کا لوگوں سے ستر کرے گا اور اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا اور اس سے فرمائے گا: کیا تو فلاں گناہ کو پہچانتا ہے؟ کیا تو فلاں گناہ کو پہچانتا ہے؟ کیا تو فلاں گناہ کو پہچانتا ہے؟ یہاں تک کہ جب اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرا لے گا اور وہ اپنے جی میں خیال کرے گا کہ واقعی ہلاک ہو گیا تو فرمائے گا کہ بے شک ان گناہوں کا میں نے تجھ پر دنیا میں ستر (پردہ) کیا اور میں ان کو آج تیرے لیے بخشتا ہوں، پھر وہ اپنے حسنات کا نامۂ اعمال دیا جائے گا، لیکن کفار اور منافقین کے گواہ کہیں گے: ﴿ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [هود: ١٨] "یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا، خبردار ہو کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔"[3] (أخرجاه في الصحيحين من حديث قتادة)

---

[1] مسند أحمد (١٧٠/٢) [2] تفسير الطبري (٢٣٩/٢٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٨) مسند أحمد (٧٤/٢)

پھر فرمایا: ﴿ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی کانا پھوسی کرنا جو ہے جہاں کوئی مومن اس سے برائی کا توہم کرے تو یہ شیطان سے ہے، تاکہ مومنین کو غمگین کرے۔ اس کا صدور تو صرف منافقوں سے ہوتا ہے۔ شیطان کی تسویل اور تزئین کی وجہ سے، تاکہ مومنوں کو برا لگے اور یہ ان کو ضرر دینے والا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کے اذن سے اور جو کوئی اس سے کچھ محسوس کرے تو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرے، بے شک شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن اور فضل و کرم سے اس کو کوئی شے ضرر نہ دے گی۔ حدیث شریف میں سرگوشی کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، جہاں کہ اس سے کسی مومن کو تکلیف پہنچتی ہو، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس وقت تم تین ہو تو ان میں دو آدمی تیسرے ساتھی کے بغیر سرگوشی نہ کریں، بے شک ایسا کرنا اسے غمگین کرتا ہے۔[1] (أخرجاه من حديث الأعمش) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے عبدالرزاق کی روایت مرفوعاً یہ ہے: «إِذَا كُنْتُمْ ثَلَاثَةً فَلَا يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُوْنَ الثَّالِثِ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَإِنَّ ذٰلِكَ يَحْزُنُهُ»[2] (انفرد باخراجه مسلم عن أبي الربيع وأبي كامل كلاهما عن حماد بن زيد عن أيوب به، كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ﴾ سے مراد وہی منافقین اور یہود ہیں جن کا ذکر گزر چکا ہے۔ پھر امام مقاتل رحمہ اللہ کا قول مذکور اختصار کے ساتھ مذکور ہے۔ تیسرا قول امام ابن زید رحمہ اللہ کا ہے کہ کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حاجت کا سوال کرتا اور سرگوشی کرتا اور زمین اس وقت حرب تھی، چنانچہ لوگ یہ وہم کرتے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کے بارے میں، یا کسی مصیبت کے بارے میں، یا اہم کام کے بارے میں سرگوشی کرتا ہے تو وہ اس سے گھبراتے تھے۔[3]

﴿ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ ﴾ میں مضارع کا صیغہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ ان کا عود متمکن (برقرار) و متجدد ہے اور اس کی عجیب صورت کو پیش کرنے کے لیے ہے۔ جمہور نے ﴿ يَتَنٰجَوْنَ ﴾ بروزن "يَتَفَاعَلُوْنَ" پڑھا ہے، اس لیے کہ آگے یوں فرمایا ہے: ﴿ اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا ﴾ (اسی لیے امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے اس قراءت کو اختیار کیا ہے)۔ اور کسی نے (یعنی امام حمزہ اور خلف اور ورش عن یعقوب نے) "ينتجون" بروزن "يَفْتَعِلُوْنَ" پڑھا ہے۔ (یہ قراءت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اور ان کے اصحاب کی ہے)۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے کہ "تَفَاعَلُوْا وَافْتَعَلُوْا" ایک معنی میں آتے ہیں، جیسے: "تَخَاصَمُوْا وَاخْتَصَمُوْا وَتُقَاتِلُوْا وَاقْتَتَلُوْا"

---

[1] صحيح البخاري (٥٩٣٠) صحيح مسلم (٢١٨٤) مسند أحمد (٣٧٥/١)

[2] صحيح مسلم (٢١٨٣) [3] تفسير القرطبي (٢٩١/١٧)

"اِثْمٌ" کے معنی ہیں وہ شے جو فی نفسہ اثم ہے۔ اور عدوان وہ ہے جس میں مومنوں پر زیادتی ہے۔ معصیت بہ معنی مخالفت ہے۔ جمہور نے بافراد پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ضحاک، حمید اور مجاہد نے) بہ جمع پڑھا ہے۔[1] (رسمت معصيت هذا والتي بعدها بالتاء المجرورة وإذا وقف عليها فأبو عمرو وابن كثير والكسائي يقفون عليها بالهاء غير أن الكسائي يقف بالإمالة على أصله والباقون يقفون بالتاء على الرسم واتفقوا في الوصل على التاء)۔ ﴿مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے ان کو نجویٰ سے منع فرمایا تھا، سو آپ ﷺ کی نافرمانی کی اور اس کی طرف عود کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کا بعض بعض کو رسول ﷺ کی معصیت کی وصیت کرتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ﴾ امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہود ہیں۔ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آتے تو کہتے: "اَلسَّامُ عَلَيْكَ" ظاہر میں اس سے سلام کا ارادہ کرتے اور باطن میں موت مراد لیتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ فرماتے: "عَلَيْكُمْ"۔ ایک روایت میں "وَعَلَيْكُمْ" ہے۔[2] اس بارے میں حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت آپ ﷺ کے پاس سے نکل جاتے تو آپس میں کہتے کہ ہمارے اس کہنے سے اللہ تعالیٰ ہم کو عذاب کیوں نہیں کرتا، اگر محمد ﷺ نبی ہوتا تو ہم کو اللہ تعالیٰ ضرور عذاب کرتا اس سب کے کرنے کی وجہ سے جو ہمارے قول کا مقصد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں: اگر وہ نبی ہوتا تو اس کی دعا ہمارے بارے میں ضرور قبول ہو جاتی جبکہ وہ "وَعَلَيْكُمْ" کہتا ہے اور اس وقت ہم پر موت واقع ہو جاتی۔

فرمایا: ﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ یعنی از روئے عذاب ان کو جہنم کافی ہے، وہ اس میں داخل ہوں گے، چنانچہ وہ یعنی جہنم برا مرجع ہے۔ جب اللہ پاک یہود اور منافقین کو سرگوشی کرنے سے منع کر چکا تو مومنین کو ارشاد کیا کہ جب وہ سرگوشی کریں تو اس شے کے ساتھ کانا پھوسی نہ کریں جس میں گناہ وسرکشی ہو اور رسول ﷺ کی معصیت ہو جیسے کہ یہود اور منافق کرتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ منافقوں کو خطاب ہے، معنی یہ ہیں کہ اے وہ لوگو جو ظاہر میں یا اپنے زعم میں ایمان لائے ہو! یہ قول امام زجاج رحمہ اللہ کا اختیار کردہ ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ یہود کو خطاب ہے، یعنی اے وہ لوگو جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے! لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ دوسرے قول کی تائید سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے ہوتی ہے جس کو امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کوئی لشکر کا ٹکڑا بھیجتے تو منافق ملتے اور اپنے سر مسلمانوں کے پاس جھکاتے اور کہتے کہ وہ قوم قتل کی گئی اور جب آپ کو دیکھتے تو سرگوشی کرتے اور غم ظاہر کرتے، چنانچہ یہ بات جب نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو پہنچی تو آپ ﷺ کو بری معلوم ہوئی۔ اس پر

[1] تفسير القرطبي (٢٩١/١٧) فتح القدير (٢٤٨/٥) [2] تفسير القرطبي (٢٩٢/١٧) [3] فتح القدير (٢٤٨/٥)

اللہ تعالیٰ نے: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ﴾ نازل فرمائی۔[1] واللہ اعلم اس کی سند کیسی ہے۔

پھر مومنوں کے لیے وہ بات بیان کر دی جس کی وہ اپنی محفلوں اور خلوتوں میں سرگوشی کریں: ﴿ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ﴾ یعنی اور سرگوشی کرو اللہ کی اطاعت کی اور معصیت کو چھوڑنے کی۔ پھر ان کو خوف دلایا اور فرمایا: ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴾ یعنی اور اس اللہ سے ڈرو جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے، پھر وہ تم کو تمھارے اعمال کا بدلہ دے گا۔ پھر اس سرگوشی کے متعلق کہا جو یہود اور منافق کرتے ہیں کہ وہ شیطان کی طرف سے ہے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی جو سرگوشی اثم و عدوان اور معصیتِ رسول کے ساتھ کی جاتی ہے وہ شیطان ہی کی تزیین (زینت دی گئی) سے ہے، تاکہ مومنوں کے دلوں میں وہم ڈال کر انھیں غم میں ڈالے اور شیطان یا وہ سرگوشی جس کی وہ تزیین کرتا ہے، مومنوں کو کچھ ضرر اور غم نہیں پہنچا سکتا۔ یعنی یہ سب ان کو کچھ نقصان نہ دے گا مگر اللہ کی مشیت سے، یا اس کے علم سے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے اور اپنے سارے کام اسی کے سپرد کرنے چاہییں۔ اور اللہ کے ساتھ شیطان سے پناہ مانگیں اور جس سرگوشی کو وہ مزین کرتا ہے، اس کی کچھ پروا نہ کریں۔

امام نافع رحمہ اللہ نے "يُحْزِنَ" کو بہ ضمِ یاء و کسرِ زاء پڑھا ہے "أَحْزَنَهُ" سے اور باقی قراء نے بہ فتحِ یاء وضمِ زاء پڑھا ہے، "حَزَنَ" سے۔ "يُقَالُ: حَزَنَهُ وَأَحْزَنَهُ بِمَعْنًى. قَالَ فِي الْقَامُوْسِ: أَحْزَنَه جَعَلَهُ حَزِيْنًا وَالْقِرَاءَةُ الْأُوْلَى أَسَدُّ فِي الْمَعْنَى"، (جمل میں اس قول کو خطیب سے نقل کیا ہے۔ قاموس کی عبارت صرف اتنی ہے۔ حزنه الأمر حزنا بالضم وأحزنه أو أحزنه جعلہ حزينا وحزنه جعل فيه حزنا فهو محزون ومحزن وحزين وحزن بكسر الزاء وضمها.[2] انتهى مصحح سلمه الله تعالىٰ)۔ پھر اللہ پاک نے مومنوں کو مجلس کے آداب کی تعلیم فرمائی:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱ ﴾

اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل بیٹھو، تو تم کھل بیٹھا کرو، اللہ تمھیں

[1] الدر المنثور (۸/۸۱) [2] القاموس المحيط (۱/۱۵۳۵) فتح البيان (۱۴/۲۰۔۲۳)

کشادگی دے گا، اور جب کہا جائے: اُٹھ کھڑے ہو، تو اُٹھ کھڑے ہوا کرو۔ تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنھیں علم دیا گیا ہے، اللہ ان کے درجات بلند کرے گا، اور اللہ (اس سے) باخبر ہے جو تم کرتے ہو (11)

یہ مجلس کے آداب ہیں کہ کوئی آئے اور جگہ نہ پائے تو چاہیے کہ سب تھوڑا تھوڑا ہٹیں اپنی جگہ پر، تاکہ حلقہ کشادہ ہو جائے۔ یا اٹھ کر پرے حلقہ کر لیں، اتنی سی حرکت میں غرور نہ کریں۔ نیک خو پر اللہ تعالیٰ مہربان ہے اور بدخوئی پر بیزار ہے۔ انتھٰی.

فتح البیان کا بیان:

"فسح" وسعت اور فراخی کرنے کو کہتے ہیں۔ "يُقَالُ: فَسَحَ لَهُ يَفْسَحُ فَسْحًا أَيْ: وَسَّعَ لَهُ وَمِنْهُ قَوْلُهُمْ بَلَدٌ فَسِيحٌ أَيْ: وَسِيعٌ"۔ جمہور نے "فِي الْمَجْلِسِ" بافراد پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی سلمی و زرّ اور عاصم رحمہم اللہ نے) ﴿ فِي الْمَجٰلِسِ ﴾ بہ جمع پڑھا ہے، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کی مجلس ہوتی ہے اور جمہور نے ﴿ تَفَسَّحُوْا ﴾ کو بابِ تفعل سے پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام قتادہ، حسن، داود بن ابی ہند اور عیسیٰ بن عمر رحمہم اللہ نے) "تَفَاسَحُوْا" بابِ تفاعل سے پڑھا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجلس کے ایک ہونے کی ایک وجہ ہے، اس لیے کہ اس سے مراد نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس ہے۔

امام قتادہ، مجاہد اور ضحاک رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ وہ، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں رغبت کرتے تھے اس لیے ان کو یہ حکم کیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کھل کر بیٹھیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن اور یزید بن حبیب رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ یہ مجلس قتال کی ہے، جب لڑائی کے لیے صف باندھیں۔ وہ لوگ پہلی صف پر جھگڑتے تھے اور ایک دوسرے کے لیے وسعت نہیں کرتا تھا، کیونکہ لڑ کر شہادت حاصل کرنے کی رغبت ان سب میں تھی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں صحیح یہ ہے کہ یہ ہر مجلس کے لیے عام ہے جس میں مسلمان خیر و اجر کے لیے جمع ہوں برابر ہے کہ مجلس لڑائی کی ہو یا روزِ جمعہ کی یا ذکر کی۔ ہر شخص اس جگہ کا زیادہ حق دار ہے جس میں وہ پہلے آتا ہے، لیکن اپنے بھائی کے لیے وسعت کر دے، جب تک کہ اس کی جگہ اتنی تنگ نہ ہو جائے کہ اس کو اپنی جگہ سے نکال دے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث اس کی تائید کرتی ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص کسی کو اس کی جگہ سے کھڑا نہ کرے، تاکہ اس میں خود بیٹھ جائے، لیکن فسحت و وسعت کرو۔[2] (أخرجه مسلم والبخاري وغيرهما)

---

(1) تفسير القرطبي (٢٩٧/١٧) فتح القدير (٢٥٠/٥) (2) صحيح البخاري (٥٩١٥) صحيح مسلم (٢١٧٧)

امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت جمعہ کے دن نازل کی گئی اور اس روز رسول اللہ ﷺ صفہ میں تھے اور جگہ تنگ تھی اور آپ ﷺ بدر والوں کا اکرام فرماتے تھے جو مہاجرین اور انصار میں سے تھے، پس کچھ لوگ اہلِ بدر میں سے آئے اور وہ مجالس کی طرف سبقت کیے گئے تھے (یعنی اورلوگ ان کے آنے سے پہلے مجالس میں بیٹھ چکے تھے) تو وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑے رہے۔ پھر کہا: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ'' تو آپ ﷺ نے ان کو جواب دیا، پھر اس کے بعد انھوں نے قوم کو سلام کیا تو انھوں نے جواب دیا، پھر وہ اپنے پاؤں پر کھڑے رہے، اس بات کا انتظار کرتے تھے کہ ان کے لیے وسعت کی جائے۔

جو بات ان کے کھڑے رہنے کا سبب تھی، آپ ﷺ اس کو پہچان گئے، پھر بھی ان کے لیے وسعت نہ کی گئی تو یہ امر آپ ﷺ پر شاق گزرا، چنانچہ اہلِ بدر کے علاوہ جو مہاجرین اور انصار آپ ﷺ کے آس پاس تھے ان سے آپ ﷺ نے فرمایا: او فلاں! تو کھڑا ہو جا، او فلاں! تو کھڑا ہو جا، پھر آپ ﷺ ان کو اٹھاتے رہے، اس گروہ کی گنتی کے برابر جو اہلِ بدر کے لوگوں میں سے کھڑے ہوئے تھے، چنانچہ جو لوگ اپنی مجلس سے اٹھائے گئے، ان پر یہ بات شاق گزری، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] یعنی اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل کر بیٹھو تو کھل جاؤ، اللہ تمھارے لیے جنت میں یا ہر اس شے میں وسعت دے گا جس کے اندر تم فراخی کرنا چاہتے ہو، یعنی مکان اور رزق وغیرہ۔

جمہور نے ﴿ اُنْشُزُوْا ﴾ کو دونوں جگہ بہ کسرِ شین پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام نافع، ابن عامر اور عاصم رحمہم اللہ نے) بہ ضمِ شین پڑھا ہے۔ یہ دونوں دو لغت ہیں: ایک معنی میں اور دونوں سبعیہ ہیں۔ ''يُقَالُ: نَشَزَ أَيْ: اِرْتَفَعَ، يَنْشِزُ وَيَنْشُزُ'' جیسے: ''عَكَفَ يَعْكِفُ وَيَعْكُفُ''۔ غرض یہ کہ ''نشز'' بہ معنی ارتفاع ہے اور اسی طرح ''نَشَزَ يَنْشِزُ إِذَا تَنَحَّى عَنْ مَوْضِعِهِ وَمِنْهُ اِمْرَأَةٌ نَاشِزَةٌ أَيْ: مُتَنَحِّيَةٌ عَنْ زَوْجِهَا، وَأَصْلُهُ مَأْخُوذٌ مِنَ النَّشْزِ وَهُوَ مَا ارْتَفَعَ مِنَ الْأَرْضِ وَتَنَحَّى''[2] (ذکر معناه النحاس)

جمہور مفسرین کہتے ہیں: ''أَيْ: اِنْهَضُوْا إِلَى الصَّلَاةِ وَالْجِهَادِ وَعَمَلِ الْخَيْرِ'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔ یعنی جب تم سے کہا جائے کہ اُٹھ کھڑے ہو، نماز و جہاد و عملِ خیر کی طرف تو اٹھ کھڑے ہو۔ امام عکرمہ، مجاہد اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ کچھ لوگ نماز میں سستی کرتے تھے تو ان کو کہا گیا کہ جب نماز کے لیے اذان دی جائے تو کھڑے ہو جاؤ۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اِنْهَضُوْا إِلَى الْحَرْبِ'' امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نبیِ کریم ﷺ کے گھر کے بارے میں ہے، ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ آخری عہد اس کا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا ﴾ ''أَيْ: عَنِ النَّبِيِّ، فَانْشُزُوْا فَإِنَّ لَهُ خَوَائِجَ فَلَا تَمْكُثُوْا''

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۴۳، ۳۳۴۴) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسیر القرطبي (۱۷/۲۹۹)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جواب دو، جب کہ تم امر بالمعروف کی طرف بلائے جاؤ۔[1] ظاہر یہ ہے کہ آیت کو عموم پر محمول کیا جائے، معنی یہ ہیں کہ جس وقت تم سے کہا جائے کہ دینی امور میں سے کسی امر کی طرف اُٹھ کھڑے ہو تو کھڑے ہو جاؤ اور بوجھل مت بنو۔ نزول کے سبب کا خاص ہونا اس سے مانع نہیں کہ اس کو عموم پر محمول کیا جائے، کیوں کہ اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہوتا ہے خصوصیتِ سبب کا نہیں۔ چنانچہ حق بات یہی ہے اور جو سببِ نزول ہے تو وہ بھی بدرجہ اولیٰ اس میں مندرج ہے۔ اور اسی طرح "تفسیح في المجلس" جس میں آیت کا سیاق ہے، وہ بھی بدرجہ اولیٰ اس میں مندرج ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تم میں ایمان لائے، اس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ کے اور اس کے رسول ﷺ کے مطیع ہوئے اور اس کے حکموں کی بجا آوری کی اس طرح کہ اپنی مجلسوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے بھائیوں کے لیے وسعت کی تو اللہ تعالیٰ ان کے درجے دنیا اور آخرت میں بلند کرے گا، اس طرح سے کہ دونوں جہانوں سے عزت و توقیر ان کے حصے میں کرے گا اور خاص کر جو ان میں سے عالم ہیں، ان کے درجے دنیا کی عزت اور کرامت میں اور آخرت کے ثواب میں بہت بہت بلند کرے گا۔

آیت کے معنی یہ ٹھہرے کہ ان کو جو ایمان لائے درجوں میں ان پر بلند کرے گا جو ایمان نہ لائے۔ اور جو لوگ علم دیے گئے، ان کو ان لوگوں سے بلند کرے گا جو ایمان لائے اور علم نہیں دیے گئے۔ لہٰذا جس نے ایمان اور علم کو جمع کیا تو اللہ اس کے درجے کو اس کے ایمان کے سبب سے بلند کرے گا، پھر اس کے علم کی وجہ سے اس کے درجے کو اور بلند کرے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اور اسی طرح ﴿ اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ سے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴾ سے مراد وہ ہیں جنھوں نے قرآن پڑھا۔

زیادہ مناسب یہ ہے کہ آیت کو عموم پر محمول کیا جائے ہر مومن اور ہر صاحبِ علم کے لیے جو من جملہ علومِ دین ہے، اس ملت کے سارے لوگوں میں سے۔ اس پر کوئی دلیل دال نہیں ہے کہ آیت کو بعض کے ساتھ خاص کیا جائے اور بعض کے ساتھ نہ کیا جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مومنوں کو درجوں میں بلند کرے گا جو علم دیے گئے ان لوگوں پر جو علم نہیں دیے گئے۔[2]

ان کا دوسرا قول یہ ہے: "يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَأُوْتُوا الْعِلْمَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُؤْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ"[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو قرآن سے کسی شے کے ساتھ اتنا خاص نہیں کیا جتنا کہ ان کو اس آیت میں خاص کیا۔ اللہ نے ان کو فضیلت دی جو ایمان لائے اور علم

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/٢٤٥، ٢٤٦) تفسير القرطبي (١٧/٢٩٩) [2] مستدرك الحاكم (٢/٥٢٣) [3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٤٤)

دیے گئے ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور علم نہیں دیے گئے۔[1] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ جب وہ اس آیت کو پڑھتے تو فرماتے: اے لوگو! اس آیت کو سمجھو، تا کہ یہ تمھیں علم کی طرف راغب کرے۔[2] علم اور علماء کی فضیلت میں احادیث و اخبار وآیات بہت سی ہیں۔ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "حطة في ذكر الصحاح الستة" میں ان کا ایک جملہ صالحہ ذکر فرمایا ہے۔ فجزاه الله عنا وعن سائر المسلمين خيراً. آمين

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمھارے اعمال کی خوب خبر ہے۔ تمھارے خیر اور شر کے کاموں میں سے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے اور وہ تم کو جزا دینے والا ہے خیر کی خیر جزا اور شر کی شر جزا۔[3] (كذا في الفتح)

آدابِ مجلس کا ذکر:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو ادب سکھاتا ہے اور ان کو امر فرماتا ہے کہ مجلسوں میں ایک دوسرے پر احسان کریں۔ ﴿ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ یعنی تم وسعت کرو اللہ تمھارے لیے وسعت کرے گا۔ یہ اس لیے فرمایا کہ جزا عمل کی جنس سے ہوتی ہے، یعنی عمل کے حساب سے ہوتی ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے لیے مسجد بنائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنائے گا۔[4]

دوسری حدیث شریف میں ہے جو کوئی کسی تنگ حال پر آسانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا میں اور آخرت میں آسانی کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد میں ہے۔[5] اس کی اور بہت مثالیں ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مجالسِ ذکر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ لوگ جب کسی کو آتا ہوا دیکھتے تو رسول اللہ ﷺ کے قریب بیٹھنے کی جگہ کے ساتھ بخل کرتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ ان کا بعض بعض کے لیے کھل کر بیٹھے۔[6] پھر امام مقاتل رحمہ اللہ کا قولِ مذکور کچھ اضافے کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ذکر کی ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔[7]

پھر یہی مضمون سیدنا جابر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سے ذکر فرمایا ہے (اول کے مخرج امام شافعی رحمہ اللہ[8] اور دوسرے کے امام احمد رحمہ اللہ ہیں)۔[9] امام احمد رحمہ اللہ سے مروی حدیث کی ایک روایت یہ لکھی ہے کہ کوئی مرد کسی دوسرے مرد کے لیے اپنی مجلس سے کھڑا نہ ہو۔ "وَلٰكِنِ افْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ"[10] (انفرد به أحمد) یہ بات کہ آنے والے کے لیے جب وہ آئے کھڑا ہونا جائز ہے یا نہیں اس بارے میں فقہاء نے تین قول پر اختلاف کیا ہے۔

---

① الدر المنثور (٨٣/٨) ② تفسير البغوي (٥٨/٨) ③ فتح البيان (١٤/٢٤-٢٧)
④ صحيح البخاري (٤٣٩) صحيح مسلم (٥٣٣) ⑤ صحيح مسلم (٢٦٩٩) ⑥ تفسير الطبري (٢٤٤/٢٣)
⑦ ان کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ⑧ صحيح مسلم (٢١٧٨) مسند الشافعي (٦٩/١)
⑨ مسند أحمد (٥٢٣/٢) ⑩ مسند أحمد (٣٣٨/٢)

بعض نے تو اس میں رخصت دی ہے اس حدیث کی دلیل سے:« قُوْمُوْا إِلٰى سَيِّدِكُمْ »[1] بعض نے اس سے منع کیا ہے اس حدیث کی دلیل سے:« مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَّتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ »[2]

بعض نے تفصیل کی تو اس طرح کہا کہ سفر سے آنے کے وقت جائز ہے اور حاکم کے لیے اس کی جائے حکومت میں کھڑا ہونا جائز ہے، جیسا کہ سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا قصہ اس پر دال ہے، کیوں کہ جب نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ میں حاکم کر کے انھیں بلایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آتے ہوئے دیکھا تو مسلمانوں سے فرمایا:« قُوْمُوْا إِلٰى سَيِّدِكُمْ »[3] اور یہ صرف اس لیے تھا تا کہ ان کے فیصلے کو نافذ کیا جا سکے۔ واللّٰه أعلم۔ اب رہا اس کو عادت بنا لینا تو یہ عجم کے دستور سے ہے۔ اور سنن میں آ چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی شخص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو محبوب نہ تھا، حالاں کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اس سے آپ ناخوش ہوتے ہیں۔[4]

جو حدیث سنن میں مروی ہے، اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ جاتے تھے، جہاں آپ کی مجلس منتہی ہوتی تھی، لیکن آپ جہاں بیٹھ جاتے تو اس مجلس کے صدر آپ ہی ہو جاتے تھے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اپنے مرتبے پر بیٹھ جاتے تھے۔ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب بیٹھتے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بائیں جانب بیٹھتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے غالباً سیدنا عثمان اور علی رضی اللہ عنہما، اس لیے کہ یہ دونوں کاتبینِ وحی میں سے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اس کا حکم دیتے تھے،[5] جیسا کہ امام مسلم نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:« لِيَلِيَنِيْ مِنْكُمْ أُولُوا الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ »[6] مطلب یہ ہے کہ پہلے درجے میں وہ لوگ بیٹھیں جو دانشمند ہوشیار ذی فہم ہیں، پھر وہ جو ان سے کم درجے کے ہیں، پھر وہ جو ان سے کم رتبہ ہیں۔ اس سے صرف یہ بات مقصود تھی کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوب سمجھ لیں۔ صلوات اللّٰه وسلامه عليه و علىٰ آله وصحبه أجمعين.

اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو کھڑے ہونے کا امر فرمایا، تا کہ بدر والوں میں سے جو لوگ آئے ہیں وہ بیٹھ جائیں، یا ان کو کھڑے ہونے کا اس لیے حکم دیا کہ انھوں نے بدر والوں کے حق میں کمی کی، یا اس لیے کہ بدری لوگ علم سے اپنا حصہ لیں، جیسا کہ ان سے قبل انھوں نے لیا، یا اس بات کی تعلیم دینا منظور تھا کہ افضل لوگوں کو امام کی طرف آگے کرنا چاہیے۔ ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (اصل میں اسی طرح ہے۔ واللّٰه أعلم۔ یہ ابو مسعود رضی اللہ عنہ

---

[1] صحيح البخاري (٢٨٧٨) صحيح مسلم (١٧٦٨)
[2] سنن أبي داود (٥٢٢٩) سنن الترمذي (٢٨٥٥)
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] سنن الترمذي (٢٧٥٤) السلسلة الصحيحة (٣٥٨)
[5] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ تفسیر ابن کثیر (۴/۴۱۵)
[6] صحيح مسلم (٤٣٢)

بدری ہیں یا ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ اول حدیث کا اسناد یہ ہے: ’’من حديث الأعمش عن عمارة بن عمير عن أبي معمر عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ... الخ‘‘۔ اور دوسری حدیث کا اسناد یہ ہے: ’’قال الإمام أحمد: حدثنا وكيع عن الأعمش عن عمارة بن عمير التيمي عن أبي معمر عن أبي مسعود رضی اللہ عنہ ... الخ‘‘۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ والله أعلم) ’’ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَمْسَحُ مَنَاكِبَنَا فِي الصَّلَاةِ وَيَقُوْلُ: اِسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُكُمْ لِيَلِيَنِي مِنْكُمْ أُولُوا الْأَحْلَامِ وَالنُّهَى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ. قَالَ أَبُوْ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ فَأَنْتُمُ الْيَوْمَ أَشَدُّ اخْتِلَافًا‘‘[1] (وكذا رواه مسلم و أهل السنن إلا الترمذي من طرق عن الأعمش به) اور جب یہ آپ ﷺ کا امر اُن کو نماز میں ہو کہ آپ سے متصل عقلاء ہوں، پھر علماء تو نماز کے علاوہ کی مجلس میں اس کا ہونا تو اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

امام ابو داود نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ’’أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: أَقِيْمُوا الصُّفُوْفَ وَحَاذُوْا بَيْنَ الْمَنَاكِبِ وَسُدُّوا الْخَلَلَ وَلِيْنُوْا بِأَيْدِي إِخْوَانِكُمْ وَلَا تَذَرُوْا فُرُجَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللّٰهُ‘‘۔[2] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سید القراء جب پہلی صف کی طرف پہنچتے تو اس سے کسی ایسے شخص کو کھینچ لیتے جو افنادِ ناس سے ہوتا (یعنی ضعیف الرائے لوگوں میں سے) اور خود اگلی صف میں داخل ہو جاتے اور اس حدیث شریف سے حجت پکڑتے: «لِيَلِيَنِي مِنْكُمْ أُولُوا الْأَحْلَامِ وَالنُّهَى»[3] اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے جس سے اس کا صاحب ان کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس سے منظور یہ تھا کہ اس حدیث پر عمل کیا جائے جس کے وہ خود راوی ہیں۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’ولنقتصر على هذا المقدار من الأنموذج المتعلق بهذه الآية وإلا فبسطه يحتاج إلى غير هذا الموضع‘‘)۔[4]

صحیح حدیث میں ہے کہ اس اثنا میں کہ رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے کہ تین شخص آئے، ان میں سے ایک نے تو حلقے میں تھوڑی سی دراڑ پائی وہ اس میں گھس گیا۔ رہا دوسرا تو وہ لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا اور تیسرا پیٹھ پھیر کر چلا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو ان تینوں میں سے بہتر کی خبر نہ دوں۔ پہلا جو تھا اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف ٹھکانا پکڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹھکانا دیا اور لیکن دوسرا تو اس نے شرم کی تو اللہ تعالیٰ اس سے شرمایا اور لیکن تیسرا تو اس نے اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے اعراض فرمایا۔[5] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ

---

[1] صحيح مسلم (٤٣٢) مسند أحمد (١٢٢/٤) سنن أبي داود (٦٧٤) سنن النسائي (٨٠٧) سنن ابن ماجه (٩٧٦)

[2] سنن أبي داود (٦٦٦) صحيح الجامع (١١٨٧)

[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[4] تفسير ابن كثير (٤١٦/٤)

[5] صحيح البخاري (٦٦) صحيح مسلم (١١٧٦)

نے فرمایا کہ کسی مرد کے لیے حلال نہیں ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جدائی ڈالے مگر ان کے اذن سے۔[1] (رواه الإمام أحمد و رواه أبو داود و الترمذي من حديث أسامة بن زيد الليثي به وحسنه الترمذي)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِذَا قِيلَ انشُزُوا فَانشُزُوا ﴾ کی تفسیر میں عبدالرحمان بن زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ جب نبی اکرم ﷺ کے پاس آپ ﷺ کے گھر میں ہوتے، پھر واپس جانے کا ارادہ کرتے تو ان میں ہر ایک چاہتا کہ آپ ﷺ کے پاس سے نکلنے میں وہی سب سے آخری ہو۔ بسا اوقات یہ امر آپ ﷺ پر شاق ہوتا اور کبھی آپ ﷺ کو کوئی حاجت ہوتی تو ان کو یہ حکم دیا گیا کہ جب ان کو جانے کا امر کیا جائے تو چلے جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا ﴾[2] [النور: ۲۸] ''اور اگر تم کو لوٹ جانے کو کہا جائے تو تم لوٹ ہی جاؤ۔''

علم اور اہلِ علم کے فضائل:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت تم میں ایک اپنے بھائی کے لیے وسعت کر دے، جبکہ وہ آئے یا جب اس کو نکلنے کا حکم کیا جائے اور وہ نکل جائے تو تم اس سے یہ نہ سمجھو کہ اس کے حق میں کچھ نقص ہے، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک رفعت اور رتبہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہ کرے گا بلکہ اس کی اسے جزا دے گا دنیا اور آخرت میں بے شک جس نے تواضع اور فروتنی کی اللہ تعالیٰ کے امر کے لیے تو اللہ تعالیٰ اس کی قدر بلند کرے گا اور اس کا ذکر نشر کرے گا، اسی لیے فرمایا ﴿ يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے جو اس کا مستحق ہے اور ان کی جو اس کے مستحق نہیں ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ راوی ہیں کہ نافع بن حارث رحمہ اللہ عمر رضی اللہ عنہ سے عسفان میں ملے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مکے پر عامل بنایا تھا تو ان سے فرمایا کہ اہلِ وادی پر تو نے کس کو خلیفہ کیا؟ عرض کی کہ میں نے ابن ابزیٰ کو ان پر خلیفہ کیا ہے۔ فرمایا تو نے ان پر ابن ابزیٰ کو خلیفہ کیا؟ ایک شخص بولا کہ ہمارے موالی میں سے ہے، فرمایا کہ تو نے ان پر ایک مولیٰ کو خلیفہ کیا تو کہا: یا امیر المومنین! بے شک وہ کتاب اللہ کا قاری اور فرائض کا عالم اور واعظ ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سنتے ہو، بے شک تمھارے نبی کریم ﷺ نے واقعی فرمایا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ اس کتاب کے سبب سے ایک قوم کو بلند کرے گا اور اس کی وجہ سے دوسروں کو پست کرے گا۔[3] (وهكذا رواه مسلم من غير وجه عن الزهري وروي من غير وجه عن عمر بنحوه وقد ذكرت فضل العلم وأهله وما ورد في ذلك من الأحاديث مستقصاة في شرح كتاب العلم من صحيح البخاري، ولله الحمد والمنة)

---

[1] مسند أحمد (۲/۲۱۳) سنن أبي داود (٤٨٤٥) سنن الترمذي (۲۷۵۲) صحيح الجامع (۷٦٥٦)

[2] تفسير الطبري (۲۳/۲٤٦) تفسير ابن كثير (٤/٤١٦) [3] صحيح مسلم (۸۱۷) مسند أحمد (۱/۳٥) تفسير ابن كثير (٤/٤١٤-٤١٦)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ
نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ
تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا
بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا
وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

اے ایمان والو! جب تم رسول سے خفیہ بات کرو تو اپنی خفیہ بات سے پہلے صدقہ پیش کرو، یہ تمھارے لیے بہت بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ پھر اگر تم (صدقے کی ہمت) نہ پاؤ تو بے شک اللہ غفور رحیم ہے ⑫ کیا تم (اس سے) ڈر گئے ہو کہ اپنے خفیہ مشوروں سے پہلے صدقات پیش کرو؟ چناں چہ جب تم نے (یہ) نہ کیا اور اللہ نے (بھی) تمھیں معاف کر دیا تو (اب) تم نماز قائم کرو اور زکات دو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم کرتے ہو ⑬

منافق بے فائدہ باتیں نبی کریم ﷺ سے کان میں کرتے، تا کہ لوگوں کو اپنی بڑائی جتائیں، آپ ﷺ اخلاقی طور پر منع نہ کرتے۔ جب یہ حکم اترا تو منافقوں نے بخل کے مارے وہ عادت چھوڑ دی، اس کے بعد یہ حکم موقوف ہو گیا۔ یعنی وہ حکم جو ہرگز موقوف نہیں انھیں پر لگے رہو۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے یہ حکم نہیں کیا کہ موقوف ہوا۔ انتہیٰ

فتح البیان کا بیان:

مناجاۃ بہ معنی مسارہ ہے، یعنی باہم پوشیدہ باتیں کرنا۔ معنی یہ ہیں: اے ایمان والو! جب تم اپنے کاموں میں سے کسی کام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے کان میں بات کرنے کا ارادہ کرو تو اپنی سرگوشی سے پہلے خیرات آگے دھر لو۔ یعنی صدقے کا آگے دھر لینا سرگوشی سے پہلے تمھارے لیے بہتر ہے، اس لیے کہ اس میں اللہ کی اطاعت ہے اور تمھاری جانوں کے لیے پاک تر ہے، اس لیے کہ صدقہ پاک کرنے والا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ امر وجوبی ہے یا استحبابی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ اس پر دال ہے کہ یہ امر استحبابی ہے وجوبی نہیں ہے، یعنی جو کوئی تم میں سے ایسا ہے کہ نہیں پاتا اس صدقے کو جس کا اسے امر کیا گیا ہے سرگوشی کرنے سے پہلے تو اس

پر بغیر صدقے کے سرگوشی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بالجملہ اس امر میں کئی فائدے ہیں۔ ایک تو رسول اللہ ﷺ کی تعظیم ہے۔ دوسرا فقراء کا نفع پانا ہے۔ تیسرا سوال میں افراط کرنے کی نہی ہے۔ چوتھے مخلص اور منافق کے درمیان اور دنیا کو چاہنے والے اور آخرت کو چاہنے والے کے درمیان فرق ہے۔

شانِ نزول کا بیان:

1 امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا سببِ نزول یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک قوم نبی مکرم ﷺ سے تنہائی چاہتی تھی، آپ ﷺ سے سرگوشی کرتی تھی۔ مسلمانوں کی ایک قوم نے ان کے ساتھ یہ گمان کیا کہ وہ ان کو سرگوشی کرنے میں گھٹاتے ہیں، اس لیے ان پر یہ بات شاق گزری، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سرگوشی کے وقت صدقے کا حکم دیا، تاکہ آپ ﷺ کے تنہا کرنے سے ان کو دور کرے۔

2 زید بن اسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نزول کا سبب یہ ہے کہ منافق اور یہود نبیِ مکرم ﷺ سے سرگوشی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ تو کان ہے، اس سے جو بات بھی کہی جاتی ہے، اس کو سن لیتا ہے اور اپنی سرگوشی کرنے سے کسی کو منع نہیں کرتا اور یہ بات مومنوں پر شاق گزرتی تھی، کیوں کہ شیطان ان کے دلوں میں یہ بات ڈالتا تھا کہ انھوں نے آپ سے یہ سرگوشی کی ہے کہ جماعتیں آپ ﷺ سے لڑنے کے لیے جمع ہوگئی ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت نازل فرمائی تو وہ باز نہ آئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری تو اہلِ باطل باز آئے، اس لیے کہ انھوں نے اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ آگے نہ رکھا اور اہلِ ایمان پر یہ بات شاق ہوئی اور سرگوشی سے منع ہو گئے، اس لیے کہ صدقے سے ان کو ضعفِ کثیر تھا، چنانچہ اللہ پاک نے ان سے اس آیت کے ذریعے سے تخفیف فرمائی جو اس کے بعد ہے۔[1]

3 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوالات کی کثرت کی، یہاں تک کہ یہ لوگ آپ ﷺ پر شاق ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ اپنے نبی مکرم ﷺ سے تخفیف کرے۔ پھر جب یہ فرمایا تو بہت سے لوگوں نے بخل کیا اور سوال کرنے سے رک گئے، پھر اللہ پاک نے اس کے بعد ﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا... الآیۃ﴾ نازل فرمائی تو ان پر وسعت کی اور تنگی نہ رکھی۔[2]

اس بات میں اختلاف ہے کہ اس صدقے کا حکم کتنی مدت رہا۔ ① چنانچہ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ صرف دس رات رہا، پھر منسوخ ہوگیا۔ ② امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صرف ایک رات کے لیے تھا۔ ③ کسی نے کہا ہے کہ باقی نہیں رہا مگر ایک دن۔ ④ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: نہیں تھا مگر دن کی ایک گھڑی۔[3] سیدنا علی رضی اللہ عنہ

---

① تفسیر القرطبي (۳۰۱/۱۷) ② تفسیر الطبري (۲۴۹/۲۳) ③ تفسیر القرطبي (۳۰۳/۱۷)

سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ صدقے کی مقدار کے متعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ ایک دینار کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کی کہ اس کی طاقت نہ رکھیں گے۔ فرمایا: تو پھر آدھا دینار؟ میں نے کہا: اس کی بھی طاقت نہ رکھیں گے۔ فرمایا: تو پھر کتنا ہو؟ میں نے فرمایا: ایک شعیرہ۔ فرمایا: « إِنَّكَ لَزَهِيدٌ » یعنی بے شک تو البتہ قلیل المال ہے، تو نے اپنے حال کے مطابق اندازہ کیا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا ...الآیۃ﴾ چنانچہ میرے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس امت سے تخفیف کی۔ (یہاں شعیرہ سے مراد جو بھر سونے کا وزن ہے۔ جَو کے دانوں میں سے ایک دانہ مراد نہیں ہے۔)[1] (أخرجه الترمذي وحسنه أبو يعلىٰ وابن جرير و ابن المنذر وغيرهم) اس آیت پر کس نے عمل کیا:

1. سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا، یہاں تک کہ منسوخ ہوگئی اور نہیں تھی مگر گھڑی بھر، یعنی آیتِ نجویٰ۔[2] (أخرجه عبدالرزاق وغيره يعني عبد بن حميد وابن المنذر وابن أبي حاتم و ابن مردويه)
2. ان سے مروی ہے کہ بے شک کتاب اللہ میں البتہ ایک آیت ہے جس پر مجھ سے پہلے کسی نے عمل نہیں کیا اور نہ ہی میرے بعد اس پر کوئی عمل کرے گا۔ وہ آیتِ نجویٰ ہے۔ میرے پاس ایک دینار تھا اس کو میں نے دس درہم کے عوض بیچا، چنانچہ میں جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرتا تو اپنی سرگوشی سے پہلے ایک درہم آگے رکھ دیتا تھا، پھر وہ آیت منسوخ ہوگئی تو اس پر کسی اور نے عمل نہیں کیا۔ چنانچہ یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی: ﴿ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا... الآیۃ﴾[3] (أخرجه سعيد بن منصور وغيره، يعني ابن راهويه وابن أبي شيبة وعبد بن حميد وابن المنذر وابن أبي حاتم والحاكم وصححه وابن مردويه)۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے جو یہ مروی ہے کہ آیتِ نجویٰ نازل ہوئی تو میں نے ایک شعیرہ آگے رکھا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّكَ لَزَهِيدٌ » پھر دوسری آیت نازل ہوئی، یعنی ﴿ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا... الآیۃ﴾۔ چنانچہ امام طبرانی اور ابن مردویہ رحمہما اللہ نے اس کو روایت کیا ہے۔ حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا: بہ سندِ ضعیف۔[4]

خازن نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے، اب اگر تم کہو کہ اس آیت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لیے ایک منقبتِ عظیم ہے، کیوں کہ ان کے سوا کسی نے اس پر عمل نہیں کیا تو میں کہوں گا کہ بات ویسی ہے جو آپ نے فرمائی، لیکن ان کے سوا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، ان پر اس بات میں کسی طرح کا طعن نہیں ہے، اس لیے کہ وہ وقت اتنا فراخ نہیں ہوا کہ وہ اس آیت پر عمل کریں اور اگر وقت وسیع ہوتا تو وہ اس پر عمل کرنے سے

---

[1] سنن الترمذي (۳۳۰۰) مسند أبي يعلىٰ (۳۲۲/۱) تفسير الطبري (۲۴۹/۲۳) اس کی سند میں "علی بن علقمہ" مجہول راوی ہے۔
[2] تفسير الصنعاني (۲۸۰/۳) الدر المنثور (۸۴،۸۳/۸) [3] تفسير الطبري (۲۴۸/۲۳) الدر المنثور (۸۴/۸)
[4] المعجم الكبير (۱۴۷/۱) الدر المنثور (۸۴/۸) اس کی سند میں "سلمہ بن فضل الابرش" متکلم فیہ راوی ہے۔

پیچھے نہ رہتے اور وقت کے کم ہونے کی وجہ سے جوانھوں نے اس پر عمل نہ کیا تو یہ فقراء کے دلوں کی رعایت کے لیے تھا جنھوں نے وہ چیز نہ پائی جس کو خیرات کریں، اگر وہ مناجات کے حاجت مند ہوتے۔

پھر یہ فقراء کے حزن کا سبب ہوتا، اس لیے کہ ان کے پاس وہ شے نہ تھی جس کو مناجات کے وقت خیرات کریں۔ دوسری وجہ یہ مناجات کچھ مفروضات سے نہ تھی اور نہ واجبات سے اور نہ نفلی طاعات سے تھی، بلکہ ان کو تو اس صدقے کی تکلیف صرف اس لیے دی گئی تھی کہ اس سرگوشی کو ترک کر دیں۔ چونکہ زیادہ مناسب یہ تھا کہ اس سرگوشی کو ترک کر دیا جائے، اس لیے انھوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ اس بات میں صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی پر کچھ طعن نہیں ہے۔[1]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ذکر کرنے کے بعد اتنا زیادہ ذکر کیا ہے: میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس سوال پوچھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ان کے جواب ارشاد فرمائے۔ ایک سوال میں نے یہ پوچھا کہ وفا کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: توحید یعنی اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ فساد کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر وشرک کرنا۔ میں نے پوچھا: حق کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام، قرآن اور ولایت جو تمھیں مل جائے۔ میں نے پوچھا: حیلہ کیا ہے؟ فرمایا: حیلے کو ترک کرنا۔ میں نے پوچھا: مجھ پر کیا لازم ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا۔ میں نے پوچھا: میں دعا کیسے کیا کروں؟ فرمایا: صدق ویقین کے ساتھ۔ میں نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ سے میں کیا مانگا کروں؟ فرمایا: عافیت کا سوال کیا کر۔ میں نے پوچھا کہ میں اپنی نجات کے لیے کیا کروں؟ فرمایا: حلال کھاؤ، سچ کہو۔ میں نے پوچھا: سرور کیا ہے؟ فرمایا: جنت۔ میں نے پوچھا کہ راحت کیا ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ملاقات۔ جب میں ان سوالوں کے پوچھنے سے فارغ ہوا تو ان کا نسخ نازل ہوگیا۔[2] انتہیٰ۔ واللہ اعلم اس کی سند کیسی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ﴾ استفہام تقریر کا ہے اور اشفاق مکروہ اور ناپسندیدہ شے سے ڈرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں صدقات بہ جمع فرمایا، مخاطبین کے اعتبار سے، یعنی کیا تم نے فقر اور محتاجی کا خوف کیا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ کیا تم نے اس بات سے بخل کیا کہ اپنی سرگوشی سے پہلے خیراتیں دو۔ ﴿ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا ﴾ (کلمہ "إذ" میں تین وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ اپنے باب پر ہے، یعنی دلالتِ ماضی پر ہے۔ "أي: أنكم تركتم ذلك فيما مضى فتداركوه بإقامة الصلاة"[3] (قاله أبو البقاء)۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بہ معنی "إذا" ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بہ معنی "أن" شرطیہ ہے، مگر "أن" اور "إذا" میں فرق معروف ہے۔ كذا في السمين) میں اس کو خطاب ہے جس کے پاس وہ شے تھی جو خیرات کرے مگر نہ کی، رہا وہ شخص جس نے کوئی شے نہ پائی تو اس کے لیے رخصت پہلے یوں بیان ہو چکی ہے: ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾۔ ﴿ وَتَابَ

[1] تفسير الخازن (٥٢/٧، ٥٣) [2] تفسير النسفي (٢٢٦/٤) [3] التبيان في إعراب القرآن (١٢١٤/٢)

اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ﴾ جملہ حالیہ ہے (یا معترضہ ہے شرط و جزا کے درمیان، یا معطوف ہے: "لم تفعلوا" پر "أي: وإذ لم تفعلوا وإذ تاب اللّٰه عليكم")۔

﴿ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ یعنی پھر جب تم نے وہ نہ کیا جس کا تم کو امر کیا گیا، یعنی سرگوشی سے پہلے صدقہ کرنا اور حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر رجوع ہوا اس طرح سے کہ تم کو صدقہ ترک کرنے کی رخصت دی تو اب تم صلاۃِ مفروضہ کو قائم رکھنے پر اور زکاتِ واجبہ دینے پر ثابت رہو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر قائم رہو، اس طرح سے کہ جس کا تم کو امر کیا جائے اسے بجا لاؤ اور جس سے تم کو نہی کی جائے اس سے باز آ جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ کو تمھارے کاموں کی خبر ہے، ان میں سے اس پر کچھ بھی مخفی نہیں ہے اور وہ تم کو بدلہ دینے والا ہے۔ جو شخص اس کا قائل ہے کہ فعل کے امکان سے قبل اس کا منسوخ کیا جانا جائز ہے، اس نے اس آیت سے استدلال کیا ہے، حالاں کہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہاں نسخ واقع نہیں ہوا مگر امکانِ فعل کے بعد اور نیز اس کو بعض نے کر بھی لیا، یعنی اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ آگے رکھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اس آیت میں وہ بات نہیں ہے جو اس پر دال ہو کہ مومنین نے امتثالِ امر (حکم ماننا) میں کچھ کمی کی۔ ان کے فقراء کا معاملہ تو واضح ہے۔ رہے اس کے علاوہ دوسرے مومنین جو آسودہ حال تھے تو ان کے لیے سرگوشی کرنا لازمی قرار نہیں دیا گیا تھا کہ ان پر صدقہ واجب ہو جاتا، بلکہ ان کو تو صدقہ کا حکم اس وقت کے لیے دیا گیا تھا، جب وہ سرگوشی کا ارادہ کر لیں، چنانچہ جس نے سرگوشی ترک کی تو وہ صدقہ کا حکم ماننے میں کسی قصور کا مرتکب نہ ہو گا، اس پر طرہ یہ ہے کہ خود آیت میں وہ شے ہے جو اس پر دال ہے کہ امر ندب کے لیے ہے، یعنی حکم استحبابی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔[1] (كذا في الفتح)

رسول اللہ ﷺ سے سرگوشی کی فیس:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو امر فرماتا ہے کہ جس وقت ان میں سے کوئی رسول اللہ ﷺ سے سرگوشی کرنا چاہے تو سرگوشی سے پہلے صدقہ کرے جو اس کو پاک صاف کر دے اور اس کو اس لائق بنا دے کہ وہ اس مقام کے قابل ہو جائے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ﴾۔ پھر فرمایا: ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی مگر وہ شخص جو اپنے فقر کی وجہ سے صدقہ کرنے سے عاجز ہو تو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ چنانچہ صدقے کا حکم اسی کو دیا گیا ہے جو اس پر قادر ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا... الآية ﴾ یعنی کیا تم اس سے ڈر گئے کہ سرگوشی سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم ہمیشہ کے لیے ہو۔ پھر جب تم نے اس پر عمل نہ کیا اور اللہ تعالیٰ تم پر رجوع ہوا تو تم نماز کو قائم رکھا کرو اور زکات دیتے رہو اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اللہ تعالیٰ کو تمھارے کاموں کی خوب خبر ہے۔ چنانچہ

---

[1] فتح القدير (٢٥٢/٥)

صدقے کا واجب ہونا ان سے منسوخ ہوا۔ تحقیق یہ کہا گیا ہے کہ اس آیت پر اس کے منسوخ ہونے سے پہلے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے عمل نہیں کیا۔ امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ کی مجاہد رحمہ اللہ سے روایت یہ ہے: چنانچہ وہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے منع کیے گئے، یہاں تک کہ صدقہ دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی نہ کی مگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے۔ انھوں نے ایک دینار صدقہ کیا، پھر نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس باتوں کے متعلق سوال کیا۔ پھر رخصت نازل کی گئی۔[1]

امام عوفی رحمہ اللہ کی روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ مسلمان سرگوشی سے پہلے صدقہ آگے رکھا کرتے تھے، پھر جب زکات کا حکم نازل ہوا تو یہ منسوخ ہو گیا۔ امام عکرمہ اور حسن بصری رحمہما اللہ نے آیتِ صدقہ کے بارے میں کہا ہے کہ اس کو اس آیت نے منسوخ کیا جو اس کے بعد ہے: ﴿ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا... الآیة ﴾۔[2]

امام سعید بن ابی عروبہ رحمہ اللہ نے امام قتادہ اور مقاتل بن حیان رحمہما اللہ سے روایت کیا ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ سوال کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے ان کو باز رکھا۔ یعنی کثرت سے ان کا سوال کرنا روک دیا، پھر جب کسی شخص کو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حاجت ہوتی اور وہ طاقت نہ رکھتا کہ وہ ان سے سوال کرے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے صدقہ رکھے، چنانچہ یہ ان پر سخت ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد رخصت نازل فرمائی: ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ معمر قتادہ رحمہ اللہ سے راوی ہیں کہ ﴿ اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ... الخ ﴾ منسوخ ہے، یہ نہیں تھی مگر دن میں سے ایک گھڑی۔[3]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ
مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ
يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۶﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ
وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا
يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ
الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ

[1] تفسیر الطبري (٢٤٨/٢٣) تفسیر ابن کثیر (٤١٧/٤) [2] تفسیر الطبري (٢٥٠،٢٤٩/٢٣)

[3] تفسیر الطبري (٢٤٩،٢٤٨/٢٣) تفسیر ابن کثیر (٤١٨،٤١٧/٤)

أُولَٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَٰنِ ۚ أَلَآ إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَٰنِ هُمُ الْخَٰسِرُونَ ﴿١٩﴾

کیا آپ نے ان لوگوں (منافقین) کو نہیں دیکھا، جنھوں نے اس قوم (یہود) سے دوستی کی، جن پر اللہ غصے ہوا۔ نہ وہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے۔ اور وہ جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں، حالاں کہ وہ جانتے ہیں⑭ اللہ نے ان کے لیے شدید عذاب تیار کیا ہے۔ بے شک یہ (لوگ) برے ہیں، جو وہ عمل کرتے رہے ہیں⑮ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے، پھر انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا، لہٰذا ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے⑯ ان کے مال اور ان کی اولاد انھیں اللہ (کے عذاب) سے ہرگز کچھ فائدہ نہیں دیں گے، یہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے⑰ جس دن اللہ ان سب کو دوبارہ اُٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے، جیسے تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک وہ ایک شے (اچھی راہ) پر ہیں۔ خبردار! بے شک وہی جھوٹے ہیں⑱ ان پر شیطان غالب آ گیا ہے، پھر اس نے انھیں اللہ کا ذکر بھلا دیا۔ یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ خبردار! بے شک شیطانی گروہ ہی خسارہ پانے والا ہے⑲

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کیا تو نے ان لوگوں کو دیکھا جو ایک قوم کے دوست ہوئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ لوگ منافقین ہیں جو یہود کے دوست ہوئے۔[1] امام سدی اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا: یہ یہود ہیں منافقوں کے دوست ہوئے۔[2] پہلے قول پر یہ آیت دال ہے۔ ﴿ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ اس لیے کہ جن پر غضب کیا گیا وہ یہود ہیں۔ دوسرے قول پر یہ آیت دال ہے: ﴿ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ﴾ (یہ جملہ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال، یا مستانفہ ہے) کیوں کہ یہ منافقوں کی صفت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ﴾ [النساء: ۱۴۳] ''وہ درمیان میں ہی معلق ڈگمگا رہے ہیں۔ نہ پورے ان کی طرف نہ صحیح طور پر ان کی طرف۔''

جملہ ﴿ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ ﴾ معطوف ہے تو ﴿ تَوَلَّوْا ﴾ پر ان کے فعل سے تعجب دلانے کے حکم میں

---

① تفسیر الطبري (۲۵۲/۲۳) ② تفسیر القرطبي (۳۰۴/۱۷)

داخل ہے، یعنی وہ اس بات پر قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں، یا اس بات پر کہ انھوں نے یہود کی طرف خبریں نہیں پہنچائیں۔ جملۂ ﴿ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ حالیہ ہے، یعنی حال یہ ہے کہ اس بات کے جھوٹ ہونے کو جانتے ہیں جس پر قسمیں کھائی ہیں اور وہ جھوٹ بے حقیقت ہے، چنانچہ ان کی قسم یمینِ غموس ہے ان کو اس میں کچھ عذر نہیں ہے۔

﴿ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ﴾ یعنی اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے، ان کی اس دوستی اور باطل پر قسم کھانے کے سبب سے۔ ﴿ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی بے شک وہ بداعمال برے ہیں جو یہ زمانۂ ماضی میں کرتے تھے۔ یا یہ اس بات کا بیان ہے جو آخرت میں ان سے کہی جائے گی۔

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ﴾ جمہور نے بہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے "یمین" کی جمع ہونے کی بنا پر۔ یہ وہ جھوٹ ہے جس پر قسمیں کھاتے تھے کہ وہ مسلمانوں میں سے ہیں، تاکہ قتل ہونے سے بچ جائیں، چنانچہ ان قسموں کو اپنے خونوں کے آگے ڈھال (بچاؤ) ٹھہرایا، جس طرح کہ لڑنے والا ڈھال سے اپنا بچاؤ کرتا ہے کہ کہیں اس کو تیر یا تلوار یا نیزہ نہ لگ جائے۔ کسی نے (یعنی امام حسن اور ابو العالیہ رحمہ اللہ نے) بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے،[1] یعنی انھوں نے اپنی تصدیق اور ایمان کو قتل سے بچنے کے لیے ڈھال بنایا۔ ان کی زبانیں تو ایمان لائیں اور ان کے دل ایمان نہیں لائے۔

﴿ فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ یعنی پھر انھوں نے لوگوں کو اسلام سے روکا ان کو دنیا کے کاموں میں مشغول کر کے اور مسلمانوں کے امر اور شان و شوکت کو ضعیف کر کے، وہ شان و شوکت جو مسلمانوں کی اصل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسلام ظاہر کر دینے سے مسلمانوں کو اپنے ساتھ لڑنے سے روکا۔ ﴿ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ یعنی ان کے لیے ایسا عذاب ہے جو ان کو ذلیل و رسوا کرے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ تاکید کے طور پر ﴿ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ﴾ کی تکرار ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ پہلا تو عذابِ قبر ہے اور یہ عذابِ آخرت ہے، تکرار کے قائل ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کیوں کہ شدت والا عذاب اور ہے اور اہانت والا عذاب اور۔

﴿ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ﴾ یعنی ان کے اموال اور ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کچھ بھی ہرگز کام نہ آئیں گے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ منافقوں نے کہا کہ محمد ﷺ زعم کرتے ہیں کہ قیامت کے دن اُن کی مدد کی جائے گی۔ البتہ تحقیق اب تو ہم بدبخت ہوئے۔ چنانچہ اللہ کی قسم! البتہ ہم قیامت کے دن مدد کیے جائیں گے اپنے نفوس اور اموال اور اولاد کے ساتھ اگر قیامت ہوگی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

﴿ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ یعنی یہ لوگ جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہیں دوزخ والے ہیں، وہ اس سے علاحدہ نہیں ہوں گے اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور اس سے کبھی نہ نکلیں گے۔

---

[1] فتح القدير (٢٥٥/٥) [2] تفسير القرطبي (٣٠٥/١٧)

﴿ یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ ﴾ (یہ ظرف ﴿ مُهِیْنٌ ﴾ سے متعلق ہے یا ”اذکر“ محذوف سے متعلق ہے)۔ یعنی یاد کر اس دن کو جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کے سب کو اٹھا کھڑا کرے گا، پھر وہ اس کے آگے قسمیں کھائیں گے کہ وہ مومن ہیں، جیسے تمھارے سامنے دنیا میں قسمیں کھاتے ہیں، یہ اس وجہ سے کہ ان کی بدبختی شدید ہے اور اُن کے دلوں پر خوب مہر کر دی گئی ہے، کیوں کہ قیامت کے دن تو حقائق کھل چکے اور امور معلوم ہو گئے، سب کچھ مشاہدے میں آ گیا، پھر وہ کیسے جرأت کریں گے اس بات کی کہ اس موقف (قیامت میں کھڑے ہونے کی جگہ) میں جھوٹ بولیں اور جھوٹ پر قسمیں کھائیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجروں میں سے کسی حجرے کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مسلمانوں کا ایک گروہ تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک ابھی تمھارے پاس ایک انسان آئے گا، وہ تمھاری طرف شیطان کی آنکھ سے دیکھے گا، چنانچہ جب وہ تمھارے پاس آئے تو تم اس سے بات نہ کرنا، چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ان کے پاس ایک مرد ظاہر ہوا، کبود چشم، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ مجھ کو تو اور تیرے اصحاب کس بات پر گالی دیتے ہیں؟ تو وہ بولا: تو مجھے چھوڑ، مَیں ان کو تیرے پاس لاتا ہوں۔ پھر انھوں نے قسمیں کھائیں اور عذر کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور وہ آیت جو اس کے بعد ہے۔[1]

(أخرجه الإمام أحمد والبزار وابن المنذر وابن أبي حاتم والحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقي في الدلائل)

﴿ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَیْءٍ ﴾ یعنی اور آخرت میں اس بات کا خیال کریں گے کہ وہ ان جھوٹی قسموں کے سبب سے کسی شے پر ہیں جو کہ کوئی نفع پہنچاتی ہیں، یا کوئی ضرر دور کرتی ہیں جیسے دنیا میں اس کا خیال کرتے تھے۔ فرمایا: ﴿ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴾ یعنی سنتے ہو! بے شک وہی جھوٹ میں کامل ہیں اس پر جان دینے والے ہیں اس حد تک پہنچنے والے ہیں جہاں کوئی اور نہیں پہنچا اس وجہ سے کہ انھوں نے اس پر پیش قدمی کی اور قیامت کے دن موقف میں رحمان کے سامنے بھی جھوٹی قسمیں کھائیں۔

﴿ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ ﴾ یعنی ان پر شیطان غالب و مستعلی و مستولی (بلند اور غالب) ہو گیا۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا کہ ”اِسْتَحْوَذَ عَلَى الشَّيْءِ“ بہ معنی ”حَوَاهُ وَأَحَاطَهُ بِهِ“[2] ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان پر قوی ہو گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کو جمع کر لیا۔ ”يُقَالُ: أَحْوَذَ الشَّيْءَ أَيْ: جَمَعَهُ وَضَمَّ بَعْضَهُ إِلَى بَعْضٍ“۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں، کیوں کہ جب اس نے ان کو جمع کر لیا تو واقعی وہ ان پر قوی اور غالب اور بلند ہو گیا اور ان کا احاطہ کر لیا۔ ﴿ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ﴾ یعنی پھر ان کو اللہ کے اوامر بھلا دیے اور اس کی فرمانبرداری کے ساتھ عمل کرنا فراموش کرا دیا، چنانچہ انھوں نے ان میں سے کچھ یاد نہ رکھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی

[1] مسند أحمد (٢٦٧/١) مستدرك الحاكم (٥٢٤/٢) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [2] فتح القدير (٢٥٥/٥)

وہ طعن و ملامت جو اس کے معاصی سے منع کرنے میں ہیں ان کو بھلا دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ نہ ان کو اپنے دلوں سے یاد کیا اور نہ اپنی زبانوں سے۔

﴿ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ﴾ یعنی یہ لوگ جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہیں، وہ شیطان کے لشکر اور اس کے پیروکار اور اس کے گروہ ہیں ﴿ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ سنتے ہو! بے شک شیطان کے لشکر اور اس کے پیروکار ہی کامل زیاں کاری اور نقصان میں ہیں، اس طرح کہ ان کے علاوہ دوسروں کا خسران ان کے خسران کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے، کیوں کہ انھوں نے جنت کو نار کے بدلے میں اور ہدایت کو گمراہی کے بدلے میں بیچا اور اللہ تعالیٰ پر اور اس کے نبی پر جھوٹ بولا اور دنیا اور آخرت میں جھوٹی قسمیں کھائیں اور اپنے نفوس کو ابدی نعمتوں سے محروم کر دیا اور ان کو ہمیشہ کے عذاب میں ڈال دیا۔[1]

منافقوں کی مذمت:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ ﴿ قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ سے یہود مراد ہیں اور ﴿ اَلَّذِيْنَ تَوَلَّوْا ﴾ سے مراد منافق ہیں۔ یہ ان کی مدد کرتے تھے اور باطن میں ان سے دوستی رکھتے تھے۔ اللہ پاک نے اس باب میں ان پر انکار فرمایا اور وہ درحقیقت نہ ان کے ساتھ ہیں اور نہ مومنوں کے ساتھ ہیں۔ نہ اِدھر نہ اُدھر، بلکہ بیچ میں ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴾ [النساء: ١٤٣] ''وہ درمیان میں ہی معلق ڈگمگا رہے ہیں، نہ پورے ان کی طرف نہ صحیح طور پر ان کی طرف اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دے تو تو اس کے لیے کوئی راہ نہ پائے گا۔''

پھر فرمایا: ﴿ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی منافق لوگ جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ وہ اس بات میں جس کی قسم کھائی جھوٹے ہیں۔ یہ یمینِ غموس ہے اور خصوصاً ان جیسے حالات میں۔ عیاذا باللّٰہ تعالیٰ۔ بے شک وہ جب مومنوں سے ملتے تو کہتے ہم ایمان لائے ہیں اور جب رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تو آپ ﷺ کے سامنے اللہ کی قسم کھا کر کہتے کہ وہ مومن ہیں اور وہ یہ جانتے تھے کہ وہ اس بات میں جھوٹے ہیں جس کی قسم کھائی ہے، کیوں کہ جو بات انھوں نے کہی، اس کے سچا ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے، گو وہ بات قسم کے مطابق ہو، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی شہادت دی کہ وہ اپنی قسموں میں اور اس کے لیے گواہی دینے میں جھوٹے ہیں۔

پھر فرمایا: ﴿ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے ان کے اعمالِ بد کے لیے عذابِ الیم اور وہ اعمال کافروں سے دوستی رکھنا اور مومنوں سے دشمنی کرنا اور ان کو دھوکا

---

[1] فتح البیان (١٤/٢٩۔٣٢)

دینا ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ یعنی ایمان کو ظاہر کیا اور کفر کو چھپایا اور جھوٹی قسموں کے ساتھ اپنا بچاؤ کیا۔ جو لوگ ان کی حقیقتِ امر کو نہیں جانتے ان میں سے بہت سے لوگوں نے ان کی سچائی کا گمان کر لیا اور ان سے فریب کھا بیٹھے، چنانچہ اس وجہ سے بعض لوگوں کو ﴿ فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ حاصل ہوا۔ ﴿ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ یعنی انھوں نے جو اللہ عظیم کے نام سے جھوٹی قسم کھا کر بے حرمتی کی تو اس کے بدلے میں ان کو ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ یعنی ان کے اموال اور اولاد ان سے ہرگز عذاب کو ہٹا نہ سکیں گے جب وہ ان کو آ جائے گا۔ پھر فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا، پھر ان میں سے کسی کو نہ چھوڑے گا تو اللہ عزوجل کے سامنے وہ قسم کھا جائیں گے کہ وہ ہدایت اور استقامت پر تھے جس طرح کہ دنیا میں لوگوں کے سامنے قسم کھا جاتے تھے، اس لیے کہ جو کوئی جس شے پر جیتا ہے، وہ اسی پر مرتا ہے اور اسی پر مبعوث ہوگا۔ وہ اعتقاد کریں گے کہ یہ اللہ کے نزدیک ان کو فائدہ دے گا، جیسا کہ دنیا میں لوگوں کے نزدیک ان کو فائدہ دیتا تھا اور وہ ان کو ان کی ظاہری حالت کے مطابق سمجھتے تھے، اسی لیے فرمایا: ﴿ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰي شَيْءٍ ﴾ "أَيْ: حَلْفُهُمْ ذٰلِكَ لِرَبِّهِمْ عَزَّ وَجَلَّ" یعنی یہ خیال کریں گے کہ ان کا رب عزوجل کے سامنے قسم کھانا فائدہ مند ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کا ان پر انکار کر کے فرمایا: ﴿ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴾ چنانچہ ان کی طرف سے ان کے کاذب ہونے کی خبر دی ہے۔ پھر بروایت امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث مذکور کی ہے، مگر کچھ الفاظ میں فرق ہے۔[1] پھر کہا کہ ان لوگوں کا حال ویسا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی طرف سے خبر دی ہے، جہاں فرماتا ہے: ﴿ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤي اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣۔ ٢٤] ''پھر ان کے شرک کا انجام اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے کہ قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی ہم مشرک نہ تھے۔ ذرا دیکھو تو انھوں نے کس طرح جھوٹ بولا اپنی جانوں پر اور جن چیزوں کو وہ جھوٹ موٹ تماشا کرتے تھے، وہ سب غائب ہو گئے۔''

پھر فرمایا: ﴿ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰٓىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ یعنی ان کے دلوں پر شیطان غالب ہو گیا، یہاں تک کہ ان کو یہ بھلا دیا کہ اللہ عزوجل کو

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

یاد کریں اور شیطان اسی طرح کرتا ہے اس کے ساتھ جس پر وہ غالب ہوا۔ اسی لیے ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ فرماتے تھے کہ جس بستی میں یا جنگل میں تین آدمی ہوں اور اُن میں نماز قائم نہیں کی جاتی تو اُن پر یقیناً شیطان غالب ہو گیا، چنانچہ تم جماعت کو لازم پکڑو۔ چنانچہ سوا اس کے نہیں کہ بھیڑیا قاصیہ کو کھاتا ہے، یعنی اس بکری کو جو گلے سے دور ہوتی ہے۔ (قال زائدة: قال السائب: يعني الصلاة في الجماعة)[1]

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ﴿٢٠﴾
كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٢١﴾
لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ
اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ
أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ
بِرُوحٍ مِنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ
اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٢٢﴾

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہی ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں (20) اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے، بے شک اللہ قوی، بڑا زبردست ہے (21) (اے نبی!) آپ (ایسی) کوئی قوم نہیں پائیں گے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، کہ وہ ان سے دوستی کریں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں، اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کا کنبہ قبیلہ ہو۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور ان کی تائید کی ہے اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ، اور وہ انھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں، یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں، جان لو! بے شک (جو) اللہ کا گروہ ہے، وہی فلاح پانے والا ہے (22)

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٤٧) تفسير ابن كثير (٤/٤١٧، ٤١٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٧٠١)

یعنی جو اللہ تعالیٰ کے مخالف سے دوستی نہیں رکھتے اگرچہ وہ باپ ہو یا بیٹا ہو، وہی سچے ایمان والے ہیں، ان کے یہ درجے ہیں۔ انتھیٰ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ جملہ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ﴾ تعلیل ہے ماقبل کی۔ "محادة لله وللرسول" کے معنی سورت کے شروع میں گزر چکے ہیں، یعنی کامل زیاں کار شیطان کا جتھا ہے، اس لیے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اور اس کے رسول ﷺ کے مخالف ہوتے ہیں اور جن میں صفات ہوتی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں وہی ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل وخوار کیا ہے، اگلی اور پچھلی اُمتوں میں سے۔ ان سے بڑھ کر ذلیل تم کسی کو نہ دیکھو گے، کیوں کہ جب وہ اللہ کے اور اس کے رسول ﷺ کے مخالف ہوئے تو ذلت کے اس مرتبے میں ہو گئے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد دنیا میں ذلت اور آخرت میں رسوائی ہے۔

جملہ ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ مستانفہ ہے جو ماقبل کی تقریر اور تاکید کے لیے ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَتَبَ ﴾ بہ معنی "قَالَ" ہے۔ (اور کلمہ "أنا" تاکید ہے۔ پھر قولِ زجاج کی طرح ذکر کیا ہے۔[1] كذا في الفتح)۔ ماقبل میں یہی ذکر تھا کہ وہ لوگ اذلین میں سے ہیں۔ پھر اس کی تاکید کی۔ فرمایا کہ اللہ لوحِ محفوظ میں لکھ چکا ہے اور اپنے علمِ سابق میں حکم جاری کر چکا ہے۔ یا اللہ نے کہہ دیا ہے کہ البتہ میں اور میرے رسول غالب رہیں گے، یعنی حجت اور سیف کے ساتھ، یا ان میں سے ایک چیز کے ساتھ۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسولوں کے غلبہ کے معنی دو نوع پر ہیں۔ ان میں سے وہ ہیں جو مبعوث بہ حرب (جنگ کے ساتھ) ہوئے تو وہ حرب میں غالب ہیں اور ان میں وہ ہیں جو مبعوث بغیر حرب ہوئے تو وہ حجت کے ساتھ غالب ہیں۔[2] بے شک اللہ اپنے دوستوں کی مدد کرنے پر زور آور ہے۔ وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہے اور کوئی اس پر غالب نہیں ہوتا ہے۔

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ (جملہ ﴿ يُوَآدُّوْنَ ﴾ محلِ نصب میں ہے اس بنا پر کہ ﴿ تَجِدُ ﴾ کا مفعولِ ثانی ہے اگر وہ دو مفعول کی طرف متعدی ہو۔ یا محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اگر وہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہو۔ یا ﴿ قَوْمًا ﴾ قوما کی دوسری صفت ہے: "أَيْ: جامعون بين الإيمان والمودة لمن حاد الله") میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے، یا ہر اس شخص کو خطاب ہے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یعنی نہ پائے گا تو کسی قوم کو جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر پختہ یقین رکھتے ہوں، وہ صحیح ہوں اس طور پر کہ ان کا ظاہر اور باطن آپس میں موافق ہو کہ وہ دوستی اور رفاقت کریں ان لوگوں سے جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول ﷺ سے دشمنی کی اور ان کے مخالف ہوئے، یعنی جملہ ممتنع سے ہے (ایسا جملہ جس میں روکا گیا ہے) یہ کہ تو

---

[1] فتح القدير (٢٥٦/٥) [2] معاني القرآن (١٤١/٥)

مومنوں میں سے کسی قوم کو پائے کہ وہ مشرکوں کے رفیق اور دوست ہوں۔ مراد یہ ہے کہ ایسی بات ہو نہیں سکتی اور حق اس کا یہ ہے کہ ممتنع ہو اور کسی حال میں یہ بات نہ پائی جائے۔ اس بیان سے منظور اس امر کی وصیت کرنے میں مبالغہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے علاحدہ اور دور رہنے میں اور ان کی صحبت اور میل جول سے بچنے میں خوب سختی کریں۔

پھر اس کی اور زیادہ تاکید اور سختی فرمائی: ﴿ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ﴾ یعنی اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے مخالف ان دوستی کرنے والوں کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے کنبے والے ہوں، اس لیے کہ ایمان اس دوستی اور رفاقت سے منع کرتا ہے اور زجر کرتا ہے اور ایمان کی رعایت کسی کے باپ ہونے یا بیٹا ہونے یا بھائی ہونے یا کنبے والا ہونے کی رعایت سے زیادہ مضبوط اور قوی ہے۔ "آباء" کا ذکر پہلے اس لیے کیا کہ ان کی اطاعت واجب ہے، پھر "أبنا" کا ذکر اس لیے کیا کہ ان کو دل سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے، پھر "إخوان" کا ذکر کیا، اس کی یہ وجہ ہے کہ ان سے فریاد رسی چاہی جاتی ہے اور ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ (کما افادہ السمین)

مطلب یہ ہے کہ آدمی کو دنیا میں ان لوگوں سے حسبِ مراتب دوستی اور محبت ہوتی ہے اور زندگی بسر کرنے میں ان سے تعلق قوی ہوتا ہے، لیکن جب یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مخالف ہوں تو ان سے دوستی اور رفاقت توڑ دینی چاہیے، پھر دوسروں کا کیا ذکر۔ یہ کام حقیقت میں سچے اور پکے ایمان والوں کا ہے۔ دیکھو عبداللہ بن شوذب سے مروی ہے کہ سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے والد نے شروع کیا کہ وہ ابو عبیدہ کے لیے بدر کے دن خوب قصد کرتا تھا، یعنی اس کو تلاش کرتا تھا اور ابو عبیدہ نے شروع کیا کہ اس سے بھاگتے تھے، پھر جب اس نے قصد کی کثرت کی تو ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کا قصد کیا اور اس کو مار ڈالا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] (أخرجه البيهقي في سننه و ابن أبي حاتم والطبراني والحاكم و أبو نعيم في الحلية)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں مروی ہے۔ فرمایا: ﴿ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ ﴾ یعنی ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ جراح کو قتل کر ڈالا۔ ﴿ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بدر کے دن اپنے بیٹے کو میدان میں آنے کے لیے بلایا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے چھوڑ دیں کہ میں "رعلِ اول" میں ہوؤں (سواروں کے ٹکڑے کو رعلہ کہتے ہیں اور گھوڑوں کی جماعت کو رعیل کہتے ہیں۔[2] كذا في المجمع) تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: «مَتِّعْنَا بِنَفْسِكَ يَا أَبَا بَكْرٍ» یعنی اے ابوبکر! تو ہم کو اپنے نفس سے تمتع لینے دے۔[3]

﴿ اَوْ اِخْوَانَهُمْ ﴾ یعنی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو اُحد کے دن قتل کیا۔ ﴿ اَوْ

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (۲۷/۹) المعجم الكبير (۱۵۴/۱) مستدرك الحاكم (۹۶/۳) حلية الأولياء (۱۰۱/۱) امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "هذا منقطع"

[2] مجمع بحار الأنوار (۳۴۲/۲)

[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (۱۸۶/۸)

عَشِيْرَتَهُمْ ﴾ یعنی سیدنا عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما نے بدر کے دن اپنے ماموں عاصی بن ہشام بن مغیرہ کو قتل کیا اور علی بن ابی طالب، حمزہ اور عبیدہ رضی اللہ عنہم (یہ عبیدۃ الحارث ابن المطلب ہیں) نے بدر کے دن اپنے بنی عم کو عتبہ وشیبہ فرزندانِ ربیعہ کو اور ولید بن عتبہ کو قتل کیا۔[1] ثوری سے مروی ہے کہ وہ خیال کرتے تھے، یعنی صحابہ اور تابعین کہ یہ آیت اس شخص کے متعلق نازل ہوئی جو سلطان کی مصاحبت کرتا ہے۔[2] (رواه أبو أحمد العسكري كما قال الحافظ ابن كثير)

عبدالعزیز بن ابی رواد سے مروی ہے کہ منصور ان سے ملا، پھر جب انھوں نے اس کو پہچان لیا تو اس سے بھاگے اور یہ آیت پڑھ دی۔ سہل فرماتے ہیں کہ جس نے اپنا ایمان صحیح کیا اور اپنی توحید خالص کر لی تو بے شک وہ کسی مبتدع (بدعتی) سے محبت نہیں کرتا اور نہ اس کی مجالست کرتا ہے اور اپنے نفس سے اس کے لیے عداوت ظاہر کرتا ہے اور جس نے کسی مبتدع سے مداہنت کی تو اللہ تعالیٰ اس سے سنت کی حلاوت چھین لیتا ہے اور جس نے طلبِ دنیا کی خاطر اور عزت اور اس کی غنا کے لیے کسی مبتدع کی اجابت کی (دعوت قبول کی) تو اللہ تعالیٰ اس عزت کے سبب سے اس کو ذلیل کر دے گا اور اس غنا کے سبب سے اس کو فقیر کر دے گا اور جو کوئی کسی مبتدع کی طرف ہنسا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے ایمان کا نور کھینچ لے گا اور جو کوئی ان باتوں کی تصدیق نہ کرے تو چاہیے کہ تجربہ کر کے دیکھ لے۔[3] (ذكره النسفي) کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ بدع واھواء کے حق میں ہے۔ واللّٰہ أعلم.

﴿ أُولَٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْإِيْمَٰنَ ﴾ (جمہور نے ﴿ كَتَبَ ﴾ بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے و نصب ﴿ الْإِيْمَٰنَ ﴾ بنا بر مفعولیت اور زر نے اور مفضل نے عن عاصم بہ صیغۂ مجہول ورفع ﴿ الْإِيْمَٰنُ ﴾ بنا بر نیابت فاعل پڑھا ہے اور نیز زر نے "عشیراتهم" بہ جمع ورويت هذا لقراءة عن عاصم۔[4] كذا في الفتح)۔ ﴿ كَتَبَ ﴾ بہ معنی "خلق" ہے۔ یا اثبت یا جعل یا حکم یا جمع یا سب معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں، یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین سے دوستی نہیں کرتے ان کے دلوں میں ایمان کو پیدا کیا یا جما دیا۔ قلوب کا ذکر صرف اس لیے فرمایا کہ وہ ایمان کی جگہ ہیں۔

﴿ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ﴾ یعنی ان کو اپنی طرف سے دنیا میں ان کے دشمنوں پر مدد دی۔ ان کے لیے جو اپنی مدد ہے اس کا نام روح رکھا، اس لیے کہ اس سے ان کا امر زندہ ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نورِ قلب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قرآن وحجت۔[5] (قاله ربيع بن أنس) کسی نے کہا ہے کہ کتاب جس کو نازل کیا اس میں ان کے لیے حیات ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مِّنْهُ ﴾ کی ضمیر ایمان کی طرف راجع ہے۔ "أَيْ: بِرُوْحٍ مِنَ الْإِيْمَانِ"۔ اس بنا پر کہ ایمان فی نفسہ ایک روح ہے حیاتِ قلوب کے لیے۔

---

[1] تفسير البغوي (٦٣/٨) [2] تفسير ابن كثير (٤٢١/٤) [3] تفسير النسفي (٢٢٨/٤)
[4] فتح القدير (٢٥٦/٥) [5] تفسير القرطبي (٣٠٨/١٧، ٣٠٩)

﴿ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ﴾ یعنی اور ان کو باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ ﴾ یعنی ان کے اعمال قبول فرمائے اور ان پر رحمتِ عاجلہ و آجلہ کے آثار کا افاضہ (فیض) فرمایا۔ ﴿ وَ رَضُوْا عَنْهُ ﴾ اور وہ ان چیزوں سے خوش ہوئے جو عاجلاً و آجلاً ان کو عطا فرمائیں۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ﴾ یعنی وہ اللہ کے لشکر ہیں جو اس کے احکامات کا امتثال (حکم برداری) کرتے ہیں اور اس کے دشمنوں سے لڑتے ہیں اور اس کے دوستوں کی مدد کرتے ہیں۔ ﴿ حِزْبُ ﴾ کو جو اللہ پاک کی طرف مضاف کیا تو اس میں ان کے لیے بڑا شرف، بڑی عظمت اور تکریم ہے۔

﴿ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ سنتے ہو! بے شک اللہ کے جتھے ہی دنیا اور آخرت کی سعادت سے کامیاب اور بامراد ہونے والے ہیں وہی فلاح اور کامیابی میں کامل ہیں کہ جن کی فلاح فردِ کامل (مکمل) ہوگئی، یہاں تک کہ گویا ان کے غیر کی فلاح کوئی فلاح نہیں ہے۔[1] واللّٰه سبحانه أعلم بأسرار كتابه الكريم.

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا غلبہ اور مخالفوں کی ذلت ورسوائی کا بیان:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کی خبر دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے معاندین (دشمن) اور محادین (جھگڑا کرنے والے مخالفت کرنے والے) ہیں یعنی وہ ایک حد میں ہیں، اور شرع ایک حد میں۔ مطلب یہ ہے کہ حق سے کنارہ کرنے والے اس کے مخالف ہیں۔ وہ ایک کنارے میں ہیں اور ہدایت دوسرے کنارے میں ہے۔ وہ بدبخت اور شقی لوگوں میں سے ہیں جو صواب سے، یعنی صحیح راستے سے دور کیے گئے ہیں اور دنیا اور آخرت میں ذلیل وخوار ہیں۔

اللہ تعالیٰ تحقیق اپنی کتاب میں پہلے سے لکھ چکا ہے اور مقدر کر چکا ہے جس کی نہ تو مخالفت کی جاتی ہے نہ ممانعت اور نہ وہ بدلی جاتی ہے اور وہ یہ بات ہے کہ نصرت اس کے لیے ہے اور اس کی کتاب کے لیے اور اس کے رسولوں کے لیے اور اس کے مومن بندوں کے لیے دنیا اور آخرت میں اور نیک انجام پرہیز گاروں کے لیے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿٥١﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴾ [المؤمن: ٥١۔ ٥٢] ''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانیِ دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جس دن گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔ جس دن ظالموں کو ان کی (عذر) معذرت کچھ نفع نہ دے گی ان کے لیے لعنت ہی ہوگی اور ان کے لیے برا گھر ہو گا۔'' اور یہاں فرمایا: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ یعنی قوی عزیز لکھ چکا ہے کہ

---

[1] فتح البيان (١٤/٣٢۔٣٤)

وہ اپنے اعداء پر غالب ہے اور یہ ایک قدرِ محکم وامرِ مبرم ہے کہ نیک انجام اور نصرت دنیا اور آخرت میں مومنوں کے لیے ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ یعنی جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مخالفین سے دوستی نہیں رکھتے، اگرچہ وہ ان کے رشتے داروں میں سے ہوں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ﴾ [آل عمران: ٢٨] ''مومنوں کو چاہیے کہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حمایت میں نہیں مگر یہ کہ ان کے شر سے کسی طرح بچاؤ مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ خود تمھیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [التوبة: ٢٤] ''آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے لڑکے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے کنبے اور تمھارے کمائے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جنھیں تم پسند کرتے ہو اگر یہ تمھیں اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ کے جہاد سے بھی زیادہ عزیز ہیں، تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب لے آئے۔ اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

سعید بن عبد العزیز وغیرہ نے کہا ہے کہ آیت: ﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ ... الآية ﴾ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ عامر بن عبد اللہ بن جراح کے حق میں نازل کی گئی، جب انھوں نے بدر کے دن اپنے باپ کو قتل کیا، اسی لیے جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد امرِ خلافت کو چھے آدمیوں کی شوریٰ کے سپرد کیا تو فرمایا کہ اگر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ زندہ ہوتا تو میں اس کو خلیفہ بناتا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ ﴾ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی کہ انھوں نے بدر کے دن اپنے باپ کو قتل کیا اور ﴿ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی کہ اس دن انھوں نے اپنے بیٹے کے قتل کا ارادہ کیا اور ﴿ اِخْوَانَهُمْ ﴾ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ انھوں نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا اور ﴿ عَشِيْرَتَهُمْ ﴾ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی کہ انھوں نے بھی اس دن اپنے ایک قریبی کو قتل کیا اور سیدنا علی، حمزہ اور عبید بن حارث رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی کہ انھوں نے اس دن عتبہ و شیبہ و ولید بن عتبہ کو قتل کیا۔[1] واللہ أعلم.

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٢٠)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور وہ بھی اسی قبیل سے ہے جب رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں مسلمانوں سے مشورہ لیا تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان کا فدیہ لیا جائے اور جو شے ان سے لی جائے گی وہ مسلمانوں کے لیے قوت ہوگی اور وہ چچا کے بیٹے اور گھرانے کے لوگ ہیں اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت کرے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میری وہ رائے نہیں ہے جو اُن کی رائے ہے۔ کیا آپ فلاں کو میرے ہاتھ میں دیتے ہیں کہ میں اسے قتل کر ڈالوں، یہ شخص سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ایک رشتہ دار تھا اور کیا آپ عقیل پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو قابو دیتے ہیں اور فلاں کو فلاں کے قابو میں دیتے ہیں، تا کہ اللہ اس بات کو جان لے کہ ہمارے دلوں میں مشرکوں کی کچھ دوستی نہیں۔ اَلْقِصَّةَ بِكَامِلِهَا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ أُولَٰٓئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ﴾ یعنی جو لوگ ان صفتوں کے حامل ہیں کہ وہ دوستی نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے مخالفوں سے اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بھائی، چنانچہ یہ لوگ ان میں سے ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان لکھا ہے، یعنی ان کے لیے سعادت لکھی ہے اور اس کو ان کے دلوں میں قرار پذیر کر دیا ہے اور اُن کی بصیرت میں ایمان کو مزین کیا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَتَبَ ﴾ بہ معنی "جَعَلَ" ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ أَيَّدَهُمْ ﴾ بہ معنی "قَوَّاهُمْ" ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ﴾ میں ایک سرِ بدیع (عجیب بھید) ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے رشتے داروں اور کنبے والوں پر خفا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عوض دیا کہ وہ ان سے راضی ہوا اور خود سے ان کو راضی کیا، اس نعیمِ مقیم و بڑی کامیابی اور فضل کے سبب سے جو اُن کو عطا فرمایا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ أُولَٰٓئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ﴾ یعنی وہ لوگ ہیں اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کی کرامت وعزت والے ﴿ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ یہ ان کی فلاح و سعادت و نصرت کا نام بلند کرنا اور چرچا کرنا ہے دنیا اور آخرت میں ان لوگوں کے مقابلے میں جن کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ "إِنَّهُمْ حِزْبُ الشَّيْطَانِ" پھر فرمایا: ﴿ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴾۔

ذیال بن عباد سے مروی ہے کہ امام ابو حازم اعرج رحمہ اللہ نے زہری رحمہ اللہ کو لکھا: جاہ دو قسم کی ہے: ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کے ہاتھوں پر جاری کرتا ہے، جو عام لوگوں کی نگاہوں میں نہیں جچتے، جن کی شہرت عام نہیں ہوتی، جن کی صفت رسول اللہ ﷺ نے بھی بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو گمنام، متقی اور نیکو کار ہیں، اگر وہ نہ آئیں تو پوچھ گچھ نہ ہو اور آ جائیں تو آؤ بھگت نہ ہو، ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں، ہر فتنے سے نکلتے ہیں۔

[1] تفسیر ابن کثیر (٤٢٠/٤)

(اصل میں اسی طرح ہے مگر تصحیف ہے اس قسم کا قول اول کسی جگہ گزر چکا ہے۔ والسلام) وہ فتنہ جو سیاہ رنگ اندھیرے والا ہوتا ہے۔ یہ ہیں وہ اولیاء جن کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿ أُولَٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۚ أَلَآ إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾" (أخرجه ابن أبي حاتم) ''یہی لوگ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہیں، جان لو! بے شک (جو) اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے، وہی فلاح پانے والا ہے۔'' نعیم بن حماد میں حدثنا محمد بن ثور عن یونس عن الحسن کے واسطے سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! کسی فاسق وفاجر کا کوئی احسان مجھ پر نہ رکھ، اس لیے کہ میں نے تیری نازل کردہ وحی میں پڑھا ہے: ﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَآدُّونَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ ﴾[1] ''(اے نبی!) آپ (ایسی) کوئی قوم نہیں پائیں گے جو اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، کہ وہ ان سے دوستی کریں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں۔''

الحمد لله والمنة کہ سورۃ المجادلہ کی تفسیر دوازدہم (۱۲) ماہ رمضان المبارک ۱۳۱۵ ہجری کو بشبِ شنبہ (ہفتہ) قریب نیم شب تمام ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آیندہ کی توفیق دے۔ ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم، وصلى الله على سيدنا ومولانا سيد الخلائق أجمعين، وعلى آله وصحبه الأكرمين، وسلم وبارك وكرم وعظم إلى يوم الدين، ملء ما علم وزنة ما علم وعدد ما علم آمين، والحمد لله وأولا وآخرا وظاهرا وباطنا.

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٤١٩۔٤٢١) یہ روایت مرسل ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ الْحَشْرِ

اس سورت مبارکہ میں چوبیس (۲۴) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق یہ مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس والنحاس و ابن مردويه والبيهقي) عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] (أخرجه ابن مردويه) امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ سورۃ الحشر، فرمایا "سورة بني النضير"[3] (أخرجه البخاري ومسلم وغيرهما) یعنی وہ بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی جس طرح کہ بعض روایات میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۝۱ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا
اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ
حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۗ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ
بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي
الْاَبْصَارِ ۝۲ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي
الدُّنْيَا ؕ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝۳ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ۝۴ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى

[1] تفسير القرطبي (۱/۱۸۔ ط: دار الكتب المصرية، القاهرة) [2] الدر المنثور (۸۸/۸)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۸۰۵) صحيح مسلم، رقم الحديث (۳۰۳۱)

اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحمت والا ہے۔

اللہ کے لیے تسبیح کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور وہی غالب ہے،
خوب حکمت والا ① وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کے کافروں کو پہلی جلاوطنی کے وقت ان کے
گھروں سے نکال دیا، تم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ (وہاں سے) نکلیں گے اور انھوں
نے سمجھا تھا کہ بے شک ان کے قلعے انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچا لیں گے، پھر ان کے
پاس اللہ (کا عذاب) آیا، جہاں سے انھوں نے گمان بھی نہیں کیا تھا، اور اس نے ان کے
دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں اجاڑتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی، تو
اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو ② اور اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ان کا جلا وطن ہونا لکھ دیا تھا تو وہ
انھیں ضرور دنیا ہی میں عذاب دیتا، اور ان کے لیے آخرت میں آگ کا عذاب ہے ③ یہ اس
لیے کہ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، اور جو کوئی اللہ کی مخالفت
کرے تو بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے ④ تم نے جو بھی کھجور کا درخت کاٹا یا اسے اس
کی جڑوں پر کھڑا چھوڑ دیا تو (یہ) اللہ کے حکم سے ہے، تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے ⑤

بنو نضیر کے حالات و واقعات:

مدینے سے چار پانچ کوس کے فاصلے پر ایک قوم یہود کی کثرت تھی، ان کا نام بنی نضیر تھا۔ شروع میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ صلح رکھتے تھے، پھر مکہ کے کافروں سے رابطہ کرنے اور پیغام دینے اور لینے لگے۔ نبی مکرم ﷺ جہاں بیٹھے تھے اوپر سے بہت بھاری چکی ڈال دی، اگر وہ لگ جائے تو آدمی مر جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بچایا۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور ارادہ کیا کہ ان سے لڑیں، جب ان کی بستیوں کو گھیر لیا تو ڈر گئے اور التجائیں کرنے لگے نبیِ کریم ﷺ نے ان کی جان بخشی کی اور ان کو اجازت دی کہ اپنا جو مال اٹھا کر لے جا سکیں لے جائیں اور گھر اور باغ اور کھیت مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔ حق تعالیٰ نے وہ زمین وغیرہ غنیمت کی طرح تقسیم نہ کروائی، بلکہ نبیِ مکرم ﷺ کے اختیار پر رکھی۔ نبیِ کریم ﷺ نے وہ اکثر مہاجرین میں تقسیم کی جن کا خرچ انصار کے ذمے تھا، اس سے مہاجرین اور انصار دونوں کو فائدہ ہوا اور اپنے گھر کا اور آنے والے مہمان کا خرچ اس پر رکھا۔ اس سورت میں وہی ذکر ہے۔

وہ اپنے گھر اجاڑنے لگے، دروازے کھڑکیاں اور چھتیں اکھاڑنے لگے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اور

مسلمانوں نے بھی مدد کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو وہاں سے پہنچا جہاں سے خیال تک نہ تھا، یعنی ان کے دلوں کے اندر رعب ڈال دیا۔ جب یہ قوم ملکِ شام سے بھاگ کر آئی تھی جس وقت وہاں پر نصاریٰ کا قبضہ ہوگیا تھا تو اُن کے بڑوں نے کہا تھا کہ تم کو یہاں سے ویران ہو کر پھر ملکِ شام میں جانا ہوگا۔ اس وقت اجڑ کر خیبر میں رہے، پھر وہاں سے اجڑ کر شام کو گئے۔ جب وہ قلعے میں بند ہوئے تو نبیِ مکرم ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے باغ کاٹو اور کھیت اجاڑو، تاکہ اس وجہ سے باہر نکل کر لڑیں، پھر جب مسلمان درخت کاٹنے لگے تو وہ طعن کرنے لگے کہ ہم کو تو کافر کہتے ہو، اس لیے مارتے ہو کیا درخت بھی کافر ہیں جو اُن کو کاٹ رہے ہو۔ بعض مسلمانوں کے دل میں شبہہ پیدا ہونے لگا اس پر آیت اتری۔

فتح البیان کا بیان:

تسبیح کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ﴾ بہ معنی "نَزَّهَ اللّٰهَ" ہے تو اب حرفِ لام زائد ہوگا۔ کلمۂ ﴿مَا﴾ غیر ذوی العقول کے لیے ہے، چوں کہ زبانِ حال سے تسبیح کہنے والے زبان سے تسبیح کہنے والوں سے زیادہ ہیں، اس لیے ان کو ان پر تغلیب دے کر (ان کے زیادہ ہونے کی وجہ سے) کلمۂ ﴿مَا﴾ استعمال فرمایا ہے اور قولہ تعالیٰ: ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ جملہ حالیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں کامیابی پانے والے وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے گروہ ہیں، اس لیے کہ اللہ پاک کی ہستی ایسی عظیم الشان ہے کہ سارے آسمان والے اور زمین والے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، اس حال میں کہ وہ اپنے ملک اور کام میں زبردست حکمت والا ہے، جس کی شان یہ ہے تو اس کے لوگ کیسے بہرہ مند نہ ہوں گے۔

پھر اپنی عزت اور حکمت کے بعض آثار ذکر فرمائے، وہ یہ ہیں: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾ حرفِ لام ﴿اَخْرَجَ﴾ سے متعلق ہے اور یہ لام توقیت کا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ [بني إسرائيل: ۷۸] "آفتاب کے ڈھلنے کے وقت سے۔" "أَيْ: عِنْدَ دُلُوْكِ الشَّمْسِ"، تو ﴿لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾ کے معنی "عِنْدَ أَوَّلِ الْحَشْرِ" ہوئے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ ویسا لام ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ﴾ [الفجر: ۲۴] اور اس قول میں "جِئْتُ لِوَقْتِ كَذَا"[1] اور "أول" کی اضافت حشر کی طرف ایسے ہے، جیسے صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہوتی ہے۔ "أَيْ: فِيْ وَقْتِ الْحَشْرِ الْأَوَّلِ"، یعنی وہ ایسا عزیز حکیم ہے جس نے ان لوگوں کو نکالا جو منکر ہوئے، حالاں کہ ان کو تو چاہیے تھا کہ سب سے پہلے ایمان لاتے۔ جب ایمان نہ لائے بلکہ منکر ہوئے تو اُن کی سزا یہ ہوئی کہ ان کو حشرِ اول کے وقت ان کے گھروں سے نکالا۔

---

(1) الكشاف (۴/۴۹۹)

یہاں اہلِ کتاب سے مراد بنی نضیر ہیں، یہ یہود کے ایک گروہ تھے بنی اسرائیل کے فرقوں میں سے۔ ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے منتظر ہو کر مدینے میں آ کر رہایش پذیر ہو گئے تھے کہ جب وہ معبوث ہوں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے۔ پھر جب آپ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو آپ ﷺ سے معاہدہ کیا، پھر بدعہدی کی اور آپ ﷺ پر حملہ کرنے میں مشرکوں کے ساتھ مل گئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا، یہاں تک کہ وطن چھوڑنے پر راضی ہو گئے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذمیوں میں سے سب سے پہلے یہی لوگ جزیرۂ عرب سے جلا وطن کیے گئے اور اُن کے بعد والے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں نکال دیے گئے۔[1] ان کا اجڑنا مدینہ سے اول حشر تھا اور آخر حشر ان کو عمر رضی اللہ عنہ کا جلا وطن کر دینا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آخر حشر سارے لوگوں کا حشر ہے زمینِ محشر کی طرف اور وہ شام ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی اس میں شک کرے کہ قیامت کے دن حشر شام میں ہے تو چاہیے کہ اس آیت کو پڑھ لے اور نبیِ مکرم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ نکل جاؤ، وہ بولے: کدھر نکل جائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: زمینِ محشر کی طرف۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] امام ابن العربی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حشر کا اول ہے، اوسط اور آخر ہے۔ اول تو بنی نضیر کا نکال دینا ہے اور اوسط اہلِ خیبر کا جلا وطن کرنا ہے اور آخر روزِ قیامت کا حشر ہے۔

مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ لوگ جن کا اس آیت میں ذکر ہے وہ بنی نضیر ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کے سوا اور کوئی اس میں مخالف نہیں ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ بنی قریظہ ہیں،[3] حالاں کہ یہ قول غلط ہے، اس لیے کہ بنی قریظہ نکالے نہیں گئے، بلکہ وہ تو قتل کیے گئے سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم سے جبکہ وہ ان کے فیصلے پر راضی ہوئے تو انھوں نے ان کے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ ان کے لڑنے والے تو قتل کیے جائیں اور ان کی بیوی بچے قیدی بنائے جائیں اور اُن کے مال غنیمت میں لیے جائیں تو نبیِ مکرم ﷺ نے سعد رضی اللہ عنہ سے فرمایا: البتہ تو نے وہ فیصلہ کیا ہے جو فیصلہ سات آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ نے کیا۔[4] ایک دلیل تو یہ ہوئی۔

دوسری یہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بنی نضیر کا واقعہ غزوۂ بدر کے چھ مہینے کے بعد ہوا، یہ یہود کے ایک گروہ تھے، ان کے گھر اور کھجوریں مدینے کے کنارے میں تھیں، پس رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا، یہاں تک کہ وہ وطن چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے اور اس بات پر کہ جو سامان، اسباب، اموال اور اونٹ ساتھ لے جا سکیں وہ ان کا ہے سوائے حلقہ کے، یعنی ہتھیار۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں آیت: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ ... إِلٰى قوله ... لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾ نازل فرمائی۔ چنانچہ نبیِ مکرم ﷺ ان سے لڑے، یہاں تک کہ ان سے وطن چھوڑنے

[1] تفسير البغوي (٦٩/٨)

[2] كشف الأستار عن زوائد البزار (٦٩/٨) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٤٥/١٠، ٣٣٤٦) اس کی سند میں "ابوسعد بقال" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير القرطبي (٣/١٨) [4] صحيح البخاري (٢٨٧٨) صحيح مسلم (١٧٦٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٦٥/٣)

پر مصالحت کی اور ان کو ملکِ شام کی طرف نکال دیا۔ یہ لوگ اس سبط (گروہ) سے تھے جو ماضی میں جلا وطن نہیں ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ ان پر جلا وطنی لکھ چکا تھا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو البتہ ان کو دنیا میں قتل و قید کا عذاب کرتا۔ اب رہا اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ﴾ تو ان کا یہ جلا وطن کیا جانا دنیا میں شام کی طرف پہلا حشر تھا۔[1] (أخرجه الحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقي في الدلائل)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا، یہاں تک کہ ان کو خوب تنگ کیا، یہاں تک کہ انھوں نے جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا، وہ مان لیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس بات پر مصالحت کی کہ ان کے خون معاف کر دیے جائیں اور ان کو ان کی زمین اور وطن سے نکال دیں اور ان کو شام کی اذرعات کی طرف روانہ کر دیں اور ان میں سے ہر تین کے لیے ایک اونٹ اور ایک مشک مقرر کی۔[2] (أخرجه ابن جرير وغيره يعني ابن مردويه والبيهقي في الدلائل و ابن عساكر)

پھر اللہ پاک مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: ﴿ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا ﴾ یعنی اے مسلمانو! تم نے یہ خیال نہیں کیا تھا کہ بنی نضیر اپنے گھروں سے نکل جائیں گے بہ سبب ان کی عزت و منعت و شوکت کے، کیوں کہ بستیاں مضبوط روکنے والی تھیں اور زمینیں اور لمبے چوڑے کھجوروں کے باغ تھے اور آدمیوں کی بہت تعداد تھی اور ساز و سامان کی کثرت تھی۔

﴿ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ ﴾، ﴿ مَانِعَتُهُمْ ﴾ خبرِ مقدم ہے اور ﴿ حُصُوْنُهُمْ ﴾ مبتدائے مؤخر، جملہ مل کر ﴿ اَنَّهُمْ ﴾ کی خبر ہے (یا ﴿ مَانِعَتُهُمْ ﴾، ﴿ اَنَّهُمْ ﴾ کی خبر ہے اور ﴿ حُصُوْنُهُمْ ﴾، ﴿ مَانِعَتُهُمْ ﴾ کا فاعل۔ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے اس کو راجح کہا ہے۔ فتح القدیر میں پہلی وجہ کو زیادہ بہتر بتایا ہے۔[3] واللّٰه أعلم) اصل مضمون یہ ہے: "ظَنَّ بَنُوْ النَّضِيْرِ أَنَّ حُصُوْنَهُمْ تَمْنَعُهُمْ مِنْ بَأْسِ اللّٰهِ" یعنی بنی نضیر نے یہ خیال کیا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے روک رکھیں گے۔

اب دیکھو اس ترکیب میں اور قرآن شریف کی ترکیب میں کیا فرق ہے، وہ یہ ہے کہ خبر کو جو مبتداء سے پہلے رکھا سو اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو قلعوں کی مضبوطی اور ان کے روکنے کا نہایت درجہ وثوق اور اعتماد تھا اور "هم" کی ضمیر کو جو "أَنَّ" کا اسم ٹھہرایا اور جملے کو اس کی طرف مسند کیا تو اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے دل میں یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ ایسی عزت اور منعت میں ہیں جس کے ہوتے ہوئے کسی کی پروا نہیں کی جاتی کہ ان سے تعرض کرے یا ان کے لوٹنے میں طمع رکھے۔ دیکھو جو بات اس میں ہے وہ "ظَنُّوْا أَنَّ حُصُوْنَهُمْ تَمْنَعُهُمْ" میں نہیں ہے۔

---

[1] مستدرك الحاكم (٥٢٥/٢) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير الطبري (٢٦٨/٢٣) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [3] فتح القدير (٢٥٩/٥)

بالجملہ جب مومنوں نے تو بنی نضیر کے عزت و منعت پر نظر کر کے یہ خیال کیا کہ وہ نہیں نکلیں گے اور خود اُن کا یہ خیال کہ ہمارے قلعے محکم ہیں کوئی ہمارا کیا کر سکتا ہے تو اللہ پاک کی صفت عزت اور حکمت نے کام کیا اور ان کو امر ایسی جگہ سے آیا، جہاں سے اُن کے دل میں خیال تک نہ تھا کہ وہاں سے ان کو امر آئے گا، وہ یہ کہ اللہ پاک نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اُن سے لڑنے اور ان کو جلا وطن کرنے کا حکم دے دیا اور ان کو اس کا خیال نہ تھا۔ امام ابن جریج، سدی اور ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ امر اُن کے سردار کعب بن الاشرف کا قتل ہے،[1] اس لیے کہ اس کے قتل نے ان کی شان و شوکت کو کمزور کر ڈالا۔

کسی نے کہا کہ ﴿ فَاَتٰىهُمُ ﴾ اور ﴿ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ﴾ میں ضمیر مومنین کی طرف راجع ہے، یعنی پھر مومنوں کو اللہ کی نصرت اور مدد وہاں سے آئی جہاں سے ان کو خیال نہ تھا، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے اس آیت کی دلیل سے: ﴿ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ اس لیے کہ رعب کا ڈالنا بنی نضیر کے دلوں میں تھا، مسلمانوں کے دلوں میں نہ تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے دلوں میں رعب ڈالنا اس وجہ سے تھا کہ ان کا سردار کعب بن اشرف مارا گیا۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ رعب ڈالنے کو اس کے ساتھ مقید نہ کریں اور نہ اس سے اس کی تفسیر کریں، بلکہ اس سے مراد وہ رعب ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ڈالا۔ جو صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ »[2] یعنی ایک ماہ کی راہ تک رعب سے میری مدد کی گئی ہے۔

لغت والے کہتے ہیں: "اَلرُّعْبُ الْخَوْفُ الَّذِيْ يَرْعَبُ الصَّدْرَ أَيْ: يَمْلَأُهُ" یعنی رعب وہ خوف ہے جو کہ سینے کو پر کر دیتا ہے۔ قذف دل میں رعب کو ثابت کرنا اور جمانا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دلوں میں اس کا غصہ نازل کرنا ہے۔ گویا ان میں پتھر پھینک دیے۔ اصل میں قذف پتھر پھینکنے کو کہتے ہیں۔ ﴿ اَلرُّعْبَ ﴾ بہ سکون و ضم عین دونوں سبعیہ ہیں۔ غرضیکہ جب ان کے دلوں میں رعب ڈالا گیا تو ان کا یہ حال ہوا۔

﴿ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (یہ جملہ حال ہے ﴿ قُلُوْبِهِمُ ﴾ کی ضمیر سے یا ﴿ اَلرُّعْبَ ﴾ کی تفسیر ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے پہلی بات کو "ليس بذاك" کہا ہے)۔ جمہور نے ﴿ يُخْرِبُوْنَ ﴾ بہ تخفیف پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی حسن، سلمی، نصر بن عاصم، ابو العالیہ اور ابو عمرو رحمہ اللہ نے) بہ تشدید پڑھا ہے۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے جو تشدید کی قراءت کو اختیار کیا تو اس لیے کہ اخراب کسی شے کے خراب چھوڑ دینے کو کہتے ہیں اور انھوں نے جو اپنے گھروں کی تخریب کی تھی تو وہ ہدم کے ساتھ کی تھی۔ یہ قول مسلم نہیں ہے، اس لیے کہ لغت والوں کے نزدیک تخریب اور اخراب کے ایک ہی معنی ہیں۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا: "إِنَّ مَعْنَى فَعَّلْتُ وَأَفْعَلْتُ يَتَعَاقَبَانِ نَحْوُ أَخْرَبْتُهُ خَرَّبْتُهُ وَأَفْرَحْتُهُ وَفَرَّحْتُهُ" انتهى.

[1] تفسير القرطبي (۱۸/۳)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۲۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۲۱)

امام ابوعبیدہ اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے۔[1] معنی یہ ہیں کہ جب بنی نضیر کے دلوں میں رعب بھر گیا اور جلا وطنی کا یقین کر لیا تو مسلمانوں پر حسد کیا کہ وہ ان کے گھروں میں رہیں بسیں گے۔ چنانچہ وہ ان کو اندر سے خراب کرنے لگے اور مسلمان باہر سے خراب کرنے لگے۔ امام قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مومن تو باہر سے خراب کرتے تھے، تا کہ داخل ہوں اور یہود اندر سے خراب کرتے تھے، تا کہ جو شے ان کے قلعے کی خراب ہوگئی تھی، اس سے اس کو بنائیں۔[2] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: مومنین کے ہاتھوں سے گھروں کے خراب کرنے کے یہ معنی ہیں کہ یہود نے گھروں کو خراب کرنے کے لیے پیش کیا،[3] یعنی عہد توڑا جس کا یہ انجام ہوا تو گویا اس کے باعث وہ خود ہی ہوئے۔

امام زہری، ابن زید اور عروہ بن زبیر رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ جب نبی مکرم ﷺ نے بنی نضیر سے اس بات پر صلح کی کہ ان کے لیے وہ شے ہے جس کو اونٹ اٹھالیں تو وہ لکڑی کو یا ستون کو خوبصورت سمجھتے تھے، چنانچہ اپنے گھروں کو ڈھاتے اور اس کو اپنے اونٹوں پر لادتے تھے اور اُن کے باقی بچے ہوئے گھروں کو مومنین خراب کرتے تھے۔ نیز امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اپنے گھروں کو معاہدے کے توڑنے کے ساتھ خراب کرتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں سے خراب کرتے تھے مقاتلت (باہم لڑائی کرنا) کے ساتھ۔ امام ابو عمرو رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ بِأَيْدِيهِمْ ﴾ "فِيْ تَرْكِهِمْ لَهَا وَبِأَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ إِجْلَائِهِمْ عَنْهَا"[4] یعنی اپنے ہاتھوں سے گھروں کا اجاڑنا یہ ہے کہ ان کو چھوڑ کر جا رہے ہیں اور مومنوں کے ہاتھوں سے اجاڑنا یہ ہے کہ وہ ان کو ان سے نکالتے ہیں۔

﴿ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ یعنی بنی نضیر کو اپنی عزت، منعت، قوت، کثرت اور اپنے قلعوں کی مضبوطی پر پورا وثوق تھا، مگر وہ ان کے کچھ کام نہ آیا، مرعوب ہو کر وطن چھوڑ گئے تو اے اہلِ عقول و بصائر! اب تم نصیحت پذیر ہو، سوچو، غور کرو، اس بلا میں جو اُن پر نازل ہوئی اور غیر اللہ پر اعتماد مت کرو۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امور میں نظر اور غور کرنا اعتبار ہے، تا کہ ان سے انہی کی جنس کی ایک اور شے پہچانی جائے۔[5] علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قیاس کے جواز پر دلیل ہے۔[6] انتہیٰ.

اعتبار عبور و مجاوزت سے ماخوذ ہے، یعنی ایک شے سے دوسری شے کی طرف گزر جانا، اسی لیے عبرہ کا نام (عبرہ یعنی اشک اور آنسو) عبرہ رکھا گیا ہے، اس لیے کہ وہ آنکھ سے نکل کر گال کی طرف آتا ہے۔ اور علم تعبیر اس لیے نام رکھا گیا ہے کہ تعبیر والا خیالی چیز سے معقول کی طرف نقل کرتا ہے۔ الفاظ کا عبارات نام رکھا گیا ہے، اس لیے کہ وہ کہنے والے کی زبان سے معانی کو سننے والے کی عقل کی طرف منتقل کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے: "اَلسَّعِيْدُ مَنِ اعْتَبَرَ بِغَيْرِهِ" اس لیے کہ وہ عقل کے واسطے سے خود نقل کرتا ہے اس غیر کے حال سے اپنے حال کی طرف "وَمَنْ

[1] تفسير القرطبي (٤/١٨) [2] تفسير الطبري (٢٦٥/٢٣) البحر المحيط (٢٤٢/٨) [3] معاني القرآن (١٤٤/٥)
[4] تفسير القرطبي (٥،٤/١٨) [5] فتح القدير (٢٦٠/٥) [6] تفسير النسفي (٢٣٠/٤)

لَمْ يَعْتَبِرْ بِغَيْرِهِ اِعْتَبَرَ بِهِ غَيْرُهُ" اور اسی لیے قشیری نے فرمایا ہے: "اَلِاعْتِبَارُ هُوَ النَّظْرُ فِي حَقَائِقِ الْأَشْيَاءِ وَجِهَاتِ دَلَالَتِهَا لِيُعْرَفَ بِالنَّظْرِ فِيهَا شَيْءٌ آخَرُ"

﴿ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ﴾ یعنی اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ان پر ان کے وطنوں سے اہل وعیال کے ساتھ نکلنا لکھ چکا تھا اور اس کا ان پر حکم جاری کر چکا تھا تو البتہ ان کو دنیا میں قتل اور قید سے عذاب کرتا، جیسا کہ بنی قریظہ کے ساتھ کیا۔ ﴿ اَلْجَلَآءَ ﴾ وطن چھوڑنے کو کہتے ہیں۔ "يُقَالُ: جَلَا بِنَفْسِهِ وَأَجْلَاهُ غَيْرُهُ إِجْلَاءً" اگرچہ جلاء و اخراج کے معنی دور کرنے میں ایک ہیں (جلاء لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے[1] كما في المختار) لیکن دونوں میں دو جہت سے فرق ہے: ایک یہ ہے کہ جلاء وہ ہے جو اہل وعیال کے ساتھ ہو اور اخراج کبھی مع بقائے اہل وعیال کے ہوتا ہے۔ دوسری یہ ہے کہ جلا نہیں ہوتا مگر جماعت کے لیے اور اخراج جماعت کے لیے اور واحد کے لیے ہوتا ہے۔[2] (كذا قال الماوردي) جملہ ﴿ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ﴾ مستانفہ ہے ﴿ لَوْلَآ ﴾ کے جواب سے متعلق نہیں ہے۔ اس میں وہ عذاب شامل ہے جو آخرت میں ان کو حاصل ہوگا گو وہ دنیا کے عذاب سے بچ گئے۔

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ ﴾ یعنی یہ دنیا میں وطن سے نکلنا اور آخرت کا عذاب اس سبب سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اور اس کے رسول ﷺ کے مخالف ہوئے اس طرح سے کہ ان کے مطیع نہ ہوئے اور کفار کے ساتھ مل گئے اور عہد کو توڑ ڈالا۔ ﴿ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ یہاں اللہ کی مشاقت کہنے پر اکتفا کیا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی مخالفت بعینہٖ اس کے رسول ﷺ کی مخالفت ہے۔ جمہور نے ﴿ يُشَآقِّ ﴾ بادغام پڑھا ہے اور کسی نے (طلحہ بن مصرف اور محمد بن سمیفع نے) بہ فکِ ادغام پڑھا ہے۔[3]

﴿ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا ﴾ میں ضمیر ﴿ مَا ﴾ کی طرف راجع ہے، اس لیے کہ اس کی تفسیر ﴿ لِيْنَةٍ ﴾ سے کی گئی ہے۔ اسی طرح ﴿ قَآئِمَةً عَلٰۤى اُصُوْلِهَا ﴾ میں یعنی تم نے جو کھجور کا درخت کاٹ ڈالا یا چھوڑ رکھا اس کو اس حال پر جس پر وہ ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہے۔ ﴿ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ حرفِ لام محذوف سے متعلق ہے اور حرفِ واؤ علتِ محذوف پر عاطف ہے، تقدیر یہ ہے: "أُذِنَ فِي قَطْعِهَا لِيَسُرَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَيُعِزَّهُمْ وَيُخْزِيَ الْفَاسِقِيْنَ" یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے کاٹنے میں یا چھوڑ رکھنے میں اختیار دیا تاکہ مومنوں کو خوش کرے اور ان کو غالب کرے اور نافرمانوں کو ذلیل کرے۔

مطلب یہ ہے کہ یہود لوگ جو طاعت سے نکلنے والے ہیں ان کو ذلیل کرے اور کچھ درختوں کے کاٹنے سے اور کچھ کو چھوڑ دینے سے انھیں غصہ دلائے، کیوں کہ جب وہ مومنوں کو دیکھیں گے کہ ان کے مالوں میں تحکم (جبر) کر

---

[1] مختار الصحاح (١/ ١١٩) [2] تفسير القرطبي (١٨/ ٥، ٦) [3] فتح القدير (٥/ ٢٦١)

رہے ہیں، یعنی جس طرح چاہتے ہیں کسی کو کاٹتے ہیں اور کسی کو چھوڑتے ہیں تو ان کا غیظ وغضب اور بڑھے گا۔
امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تا کہ فاسقوں کو اس طرح سے ذلیل کرے کہ ان کو ان کے مال دکھا دے کہ ان میں مومن زبردستی کر رہے ہیں جس طرح سے چاہتے ہیں کاٹتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض مہاجرین کھجوروں کے کاٹنے میں مصروف ہوئے تو بعض نے ان کو منع کیا اور کہا کہ یہ تو مسلمانوں کی غنیمتیں ہیں اور جنھوں نے درخت کاٹے وہ بولے: بلکہ یہ دشمنوں کے لیے غیظ ہے۔ چنانچہ قرآن اس شخص کی تصدیق لے کر نازل ہوا جس نے درخت کاٹنے سے منع کیا اور اس شخص کے گناہ کی معافی لے کر جس نے ان کو کاٹا۔ ''فَقَالَ: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا﴾[1]

امام قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے ان کھجوروں میں سے چھے درخت کاٹ ڈالے اور جلا دیے۔
امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کھجور کا ایک درخت جلایا اور ایک کاٹ ڈالا تو بنونضیر بولے اور یہ اہلِ کتاب ہیں کہ اے محمد! کیا تو یہ زعم نہیں کرتا کہ تو نبی ہے اور بہتری کا ارادہ کرتا ہے، کیا کھجور کے درختوں کا کاٹنا اور درختوں کا جلانا بھلائی کا کام ہے اور کیا تجھ پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس میں زمین میں فساد کرنا جائز ہے؟ چنانچہ یہ بات رسول اللہ ﷺ پر شاق گزری اور مسلمانوں نے اپنے دل میں حزن و رنج محسوس کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی نضیر کے کھجور کے درختوں کو جلایا اور کاٹا اور یہ بویرہ ہے اسی لیے حسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

وَهَانَ عَلَى سُرَاةِ بَنِي لُؤَيٍّ حَرِيْقٌ بِالْبُوَيْرَةِ مُسْتَطِيْرُ

(''بويرة'' تصغیر ہے ''بورة'' کی۔ یہ مدینے کے قریب ایک جگہ ہے اور کھجور کے درخت ہیں بنی نضیر کے۔[3] كذا في مجمع البحار) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا﴾ نازل فرمائی۔[4] (أخرجه البخاري ومسلم وغيرهما)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿لِّيْنَةٍ﴾ ''نخلة'' ہے اور ﴿وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ کی تفسیر میں فرمایا کہ انھوں نے ان کو ان کے قلعوں سے اتارا اور کھجوروں کے کاٹنے کا حکم دیا، پھر یہ بات ان کے سینوں میں کھٹکی تو مسلمان بولے کہ ہم نے واقعی بعض کو کاٹ ڈالا اور بعض کو چھوڑ دیا اور اب ہم رسول اللہ ﷺ سے پوچھیں گے کہ کیا ہمارے لیے اس میں کچھ اجر ہے جو ہم نے کاٹا اور کیا ہم پر کوئی گناہ ہے اس پر جو ہم نے چھوڑ دیا؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآىِٕمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ﴾

[1] تفسير الطبري (٢٧٢/٢٣) فتح القدير (٢٦١/٥) [2] تفسير القرطبي (٦/١٨) [3] مجمع بحار الأنوار (٢٢٦/١)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤٦)

نازل فرمائی۔[1] (أخرجه الترمذي وحسنه والنسائي وابن أبي حاتم و ابن مردويه و رواه الترمذي أيضا عن سعيد بن جبير مرسلا ولم يذكر فيه عن ابن عباس ﷺ)

اس بارے میں اور حدیثیں ہیں۔ بنی نضیر کی صلح میں سیرت کی کتابوں میں مفصل کلام موجود ہے۔ ﴿ لِّيْنَةٍ ﴾ کی اصل "لِوْنَةٌ" ہے واؤ بہ سبب کسرۂ ما قبل کے "یاء" سے قلب ہوا، اس کی جمع "لِيْنٌ" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "لِيَانٌ"۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "وَلَا تَرَكْتُمْ قَوْمًا عَلَى أُصُوْلِهَا" پڑھا ہے: "أَيْ: قَائِمَةٌ عَلَى سُوْقِهَا" اور کسی نے "عَلَى أَصْلِهَا" پڑھا ہے اور کسی نے "قَائِمًا عَلَى أُصُوْلِهِ" پڑھا ہے۔ مفسرین نے ﴿ لِّيْنَةٍ ﴾ کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ پس امام زہری، مالک، سعید بن جبیر، عکرمہ اور خلیل رحمہم اللہ نے کہا کہ ﴿ لِّيْنَةٍ ﴾ تمام کھجوریں ہیں سوائے عجوہ کے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ "كُلُّ نَخْلٍ" ہیں اور نہ عجوہ کا نہ کسی اور کا استثناء کیا۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كِرَامُ النَّخْلِ" ہیں، یعنی عمدہ کھجور کے درخت۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عجوہ و برنی کے سوا کھجور کی تمام قسمیں ہیں۔ امام جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ خاصۃً عجوۃ ہے۔ کسی نے کہا کہ "لینة" کھجور میں سے ایک قسم ہے، اس کے ثمر کو "لون" کہا جاتا ہے، اس کی کھجوریں بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "دقل" ہے[2] یعنی ردی کھجور۔

اس آیتِ کریمہ سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ کفار کے قلعے اور ان کے گھر بے کھٹکے گرائے جائیں اور جلائے جائیں اور منجنیق سے مارے جائیں اور اسی طرح ان کے درختوں وغیرہ کا کاٹنا، اور اجتہاد کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے اور مجتہدین کے صحیح ہونے پر دلیل لی گئی ہے۔ اس کی بحث کتبِ اصول میں پورے طور پر تحریر کی گئی ہے۔[3] (كذا في فتح البيان)

ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح خواں ہے:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے وہ سب اس کی تسبیح و تمجید و تقدیس کرتا ہے۔ اس کے لیے نماز پڑھتا ہے اس کی توحید کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] "ساتوں آسمان اور زمین اور جو بھی ان میں ہے اسی کی تسبیح کر رہے ہیں۔ ایسی کوئی چیز نہیں جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو۔"

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٠٣) سنن البيهقي الكبرى (١٨٢/٥)

[2] تفسير القرطبي (٩،٨/١٨) [3] فتح البيان (٣٧/١٤ـ٤٤)

بنو نضیر کی عہد شکنی اور جلا وطنی کا تذکرہ:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ منیع الجناب ہے، اس کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا، وہ اپنی تقدیر اور شریعت میں حکمت والا ہے، اسی نے ان کو نکالا جو اہلِ کتاب میں سے منکر ہوئے، مراد بنی نضیر کے یہود ہیں۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور زہری اور کئی ایک اہلِ علم کا ہے۔[1] رسول اللہ ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو ان سے صلح کی اور اُن کو اس بات پر عہد اور ذمہ دیا کہ نہ آپ ﷺ ان سے لڑیں گے اور نہ وہ آپ ﷺ سے لڑیں گے۔ پھر انھوں نے اس عہد کو توڑ ڈالا جو اُن کے اور آپ ﷺ کے درمیان تھا تو اللہ تعالیٰ نے ایسا عذاب نازل کیا جو کسی طرح سے واپس نہیں ہونا تھا اور اُن پر اپنی وہ قضا نازل کی جو روکی نہیں جاتی۔

چنانچہ نبی ﷺ نے ان کو جلا وطن کیا اور ایسے مضبوط قلعوں سے نکالا جن سے نکلنے کی نہ مسلمانوں کو امید تھی اور نہ ہی خود انھوں نے یہ خیال کیا تھا کہ یہ قلعے ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا نہیں سکیں گے۔ سو کوئی چیز ان کے کچھ کام نہ آئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو وہ شے آئی جو اُن کے دلوں میں نہ تھی اور رسول اللہ ﷺ نے مدینے سے ان کو جلا وطن کر دیا تو ان میں سے ایک گروہ تو اذرعات کی طرف چلا گیا جو شام کی بلند زمین سے ہے اور شام محشر و منشر کی زمین ہے اور ایک گروہ خیبر کی طرف چل دیا اور آپ ﷺ نے ان کو قلعوں سے اس شرط پر اتارا تھا کہ جو شے کہ اونٹ لاد لیں وہ ان ہی کی ہے، اس لیے ایسی اشیاء جو اُن کے گھروں میں تھیں اور ان کو اپنے ساتھ لاد کر لے جا سکتے تھے ان کو اجاڑتے تھے، یعنی توڑ کر اونٹوں پر لادتے تھے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ یعنی اے بینائی والو! تم غور و فکر کرو اس شخص کے انجام کار کے متعلق جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے امر کی مخالفت کی اور اس کی کتاب کو جھٹلایا تو اس پر وہ عذاب کیسے اترتا ہے جو دنیا میں اس کو ذلیل کرنے والا ہے اس عذابِ الیم کے ساتھ جو اس کے لیے آخرت میں تیار رکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد بنی نضیر کے قصے میں امام ابو داود رحمہ اللہ سے مروی ایک حدیث ذکر کی ہے،[2] پھر اس غزوے کے اسباب مختصر طور پر اصحابِ مغازی و سیر سے ذکر کیے ہیں۔

پھر کہا ہے کہ بنی نضیر رسول اللہ ﷺ کے لیے مال چھوڑ گئے، وہ خاص آپ ﷺ کے لیے تھے، جہاں چاہیں ان کو رکھیں تو وہ مال آپ ﷺ نے شروع شروع کے مہاجرین میں تقسیم کر دیا سوائے انصار کے۔ انصار میں سے سہل بن حنیف اور ابو دجانہ سماک بن خرشہ رضی اللہ عنہما کو بھی آپ ﷺ نے اس مال میں سے عطا فرمایا، کیوں کہ انھوں نے اپنے فقر کا ذکر کیا تھا۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنی نضیر میں سے کوئی مسلمان نہیں ہوا، مگر دو شخص یامین بن عمیر بن

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٢٢) [2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٠٤)

عم عمرو بن جحاش اور ابو سعد بن وہب، یہ دونوں اپنے اموال پر مسلمان ہوئے تو وہ ان کو مل گئے۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو بنی نضیر کا چھے دن تک محاصرہ کیا تو اس محاصرے کی قلیل مدت میں ان کے قلعوں کی مضبوطی اور منعت کی وجہ سے تمھارا خیال نہیں تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور اس مضبوطی کی وجہ سے ان کا یہ خیال تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچالیں گے، مگر یہ مضبوطی ان کے کچھ کام نہ آئی۔ اللہ تعالیٰ کے امر سے ان کو وہ شے آ گئی جو اُن کے دل میں نہ تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ قَدۡ مَكَرَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَاَتَی اللّٰهُ بُنۡیَانَهُمۡ مِّنَ الۡقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیۡهِمُ السَّقۡفُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَاَتٰىهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴾ [النحل: ٢٦] ''ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی مکر کیا تھا، (آخر) اللہ نے ان (کے منصوبوں) کی عمارتوں کو جڑوں سے اکھیڑ دیا اور اُن (کے سروں) پر (ان کی) چھتیں اوپر سے گر پڑیں اور ان کے پاس عذاب وہاں سے آ گیا جہاں کا انھیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَقَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ ﴾ یعنی ان کے دلوں میں خوف اور گھبراہٹ ڈال دی اور ایسا کیوں نہ ہوتا، کیونکہ ان کا محاصرہ تو اس ذاتِ مبارکہ نے کیا تھا جس کی مدد رعب کے ساتھ ایک مہینے کی راہ تک کی گئی، صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ، قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمُ الۡجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمۡ فِی الدُّنۡیَا ﴾ یعنی اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ جلاوطنی لکھ دی تھی، یعنی اپنے گھروں اور مالوں سے نکال دیا جانا تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور عذاب قتل اور تکلیف کا ہوتا اور اسی طرح کا عذاب ہوتا۔ (قاله الزهري عن عروة والسدي و أبو زيد) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان پر یہ لکھ چکا تھا کہ عن قریب ان کو عذاب کرے گا، دنیا میں اس عذاب کے ساتھ جو ان کے لیے آخرت میں تیار کیا گیا ہے، یعنی نارِ جہنم کا عذاب۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ﴾ یعنی ان کے لیے آخرت میں آگ کا عذاب حتمی اور لازمی ہے اس کا ان کے لیے ہونا ضروری ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اُن کے ساتھ معاملہ کیا ہے اور اپنے رسول کو اور اپنے مومن بندوں کو ان پر مسلط کیا تو صرف اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اور اس کے رسول ﷺ کے مخالف ہوئے اور اس شے کی تکذیب کی جو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کی بشارت کے طور پر پہلے رسولوں پر نازل کی، حالاں کہ وہ اس کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿ وَمَنۡ یُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴾ یعنی جو کوئی اللہ کا مخالف ہوا تو بے شک اللہ تعالیٰ کی سزا سخت ہے۔

بہ وقتِ ضرورت باغات کو جلانے کی اجازت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا قَطَعۡتُمۡ مِّنۡ لِّیۡنَةٍ اَوۡ تَرَكۡتُمُوۡهَا قَآئِمَةً عَلٰۤی اُصُوۡلِهَا فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ وَلِیُخۡزِیَ

[1] تفسير ابن كثير (٤/٤٢٣، ٤٢٤)

﴿ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں ﴿ لِيْنَةٍ ﴾ کے معنی کا اختلاف اور شانِ نزول کی روایتیں ذکر کی ہیں اور "بویرۃ" کے بیان میں بہت سے شعر ذکر کیے ہیں، پھر کہا ہے: ابن اسحاق نے اس مقام پر بہت سے ایسے اشعار ذکر کیے ہیں جو آداب، مواعظ، حِکَم اور اس قصے کی تفصیلات سے لبریز ہیں، ہم نے اختصار کے پیشِ نظر ان کو نظر انداز کر دیا ہے اور جو ذکر کیے انہیں پر اکتفا کیا ہے۔ وللہ الحمد والمنة۔ پھر ابن اسحاق رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ بنی نضیر کا واقعہ احد کے واقعے کے بعد بئر معونہ کے بعد ہوا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے عن الزہری عن عروہ بیان کیا ہے کہ بنی نضیر کا واقعہ بدر سے چھے مہینے بعد ہوا۔[1]

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

اور اللہ نے ان سے اپنے رسول کی طرف جو مال لوٹایا تو اس کے لیے تم نے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے، لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے غلبہ دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ⑥ اللہ اپنے رسول کی طرف بستیوں والوں (کے مال) سے جو کچھ لوٹا دے، تو وہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور (اس کے) قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، تاکہ وہ (مال) تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے ⑦

مالِ غنیمت اور فیئ میں فرق:

غنیمت اور "فیئ" میں فرق ہے، جو مال لڑائی کرنے سے ہاتھ لگا وہ غنیمت ہے، اس کا پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ

[1] صحيح البخاري (١٤٧٦/٤) تفسير ابن كثير (٤٢٢/٤_٤٢٧)

کی نیاز ہے اور چار حصے لشکر کو بانٹے جائیں اور جو مال بغیر جنگ کے ہاتھ لگے وہ سارا بیت المال میں جائے گا، مسلمانوں کے ضروری کام پر خرچ ہو گا۔ یعنی "فیئ" پر رسول کا قبضہ اور رسول کے بعد سردار کا، کیوں کہ سردار پر سارے اخراجات پڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی سب کا مالک ہے۔ کعبہ کا اور مسجدوں کا خرچ بھی اس میں آ گیا۔ ناتے والے سے مراد نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں ان کے ناتے والے اور بعد میں بھی وہی لوگ ہیں، ان پر خرچ کرنا چاہیے۔ اگر سردار دولت مند کو دے تو اس کو چاہیے کہ لے لے اور منع نہ کرے۔ انتہی۔

فتح البیان کا بیان:

"فیئ" بہ معنی رجوع ہے۔ "یُقَالُ: فَاءَ يَفِيءُ إِذَا رَجَعَ"۔ اور "وَجَفَ" تیز چلنے کو کہتے ہیں۔ "یُقَالُ: وَجَفَ الْفَرَسُ وَالْبَعِيرُ يَجِفُ وَجفًا وَأَوْجَفَهُ صَاحِبُهُ إِذَا حَمَلَهُ عَلَى السَّيْرِ السَّرِيعِ" ﴿فَمَآ اَوْجَفْتُمْ﴾ کا کلمہ ﴿مَا﴾ نافیہ ہے اور حرفِ شرط کا جواب ہے جبکہ ﴿مَآ اَفَآءَ﴾ کا ﴿مَآ﴾ شرطیہ ہو اور اگر موصولہ ہو گا تو زائد ٹھہرے گا۔ ﴿مِنْ خَيْلٍ﴾ کا ﴿مِنْ﴾ زاید ہے جو تاکید کے لیے ہے۔ ﴿رِكَابٍ﴾ وہ اونٹ ہیں جن پر سوار ہوتے ہیں خاصتاً۔ امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: عرب لوگ "راکب" کے لفظ کا اطلاق صرف اونٹ کے سوار پر کرتے ہیں اور گھوڑے کے سوار کا نام فارس رکھتے ہیں[1] اور ﴿مِنْهُمْ﴾ کی ضمیر بنی نضیر کی طرف راجع ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے جو مال اللہ تعالیٰ نے بنی نضیر سے اپنے رسول ﷺ کے پاس پھیر لایا، اے مسلمانو! تم ان اموال کو حاصل کرنے کے لیے نہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور نہ اونٹوں پر اور نہ تم نے ان کی طرف کوئی مسافت طے کی اور نہ ان کے لیے سفر کا تکلف کیا اور نہ ان میں کسی لڑائی اور مشقت کا سامنا کیا وہ تو مدینہ سے صرف دو میل پر تھے۔[2] (کما قال الفراء)

لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں میں سے جس پر چاہتا ہے، اپنے رسولوں کو اس طرح سے مسلط کر دیتا ہے کہ نہ انھیں حوادث کی تنگیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور نہ لڑائیوں کی سختیوں سے گزرنا پڑتا ہے، بلکہ وہ غیر معتاد طریقہ ہوتا ہے، یعنی عام طریقے سے ہٹ کر۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے روک لیتا ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا اور دوسرے لوگوں سے پوچھا جاتا ہے۔ اللہ پاک نے اسی سبب سے بنی نضیر کے مال خاص اپنے رسول کے لیے ٹھہرائے، کیوں کہ آپ ﷺ نے ان کو بطور صلح فتح کیا تھا اور ان کے مال لیے تھے۔ مسلمانوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ وہ مال ان میں تقسیم کر دیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ مال خاص نبی ﷺ کے لیے ہیں، آپ ﷺ کے اصحاب کے لیے نہیں ہیں، کیوں کہ انھوں نے ان پر گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ، بلکہ ان کی طرف صرف چل کر گئے، اس لیے اس مال میں ان کا کچھ حق نہیں ہے اور وہ نبی مکرم ﷺ کے ساتھ اور ان

---

[1] تفسیر الرازي (۲۹/۲۴۷) [2] تفسیر القرطبي (۱۸/۱۰، ۱۱)

کے ساتھ خاص ہیں جن کا آپ ﷺ کے ساتھ دوسری آیت میں ذکر ہے، یعنی وہ چار قسمیں جن کی بنا پر آپ ﷺ وہ مال تقسیم کیا کرتے تھے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بنی نضیر کے اموال وہ تھے جن کے متعلق ﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ فرمایا گیا اور جو "مِمَّا لَمْ يُوْجِفْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُوْنَ بِخَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ" کے تھے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھے۔ پس آپ ﷺ ان میں سے اپنے گھر والوں کا سال بھر کا نفقہ لیتے اور جو باقی رہتا اس کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کی تیاری کے لیے گھوڑوں اور ہتھیاروں کے لیے رکھتے۔[1] (أخرجه البخاري و مسلم وغيرهما)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بنونضیر کے ساتھ وہ شے ملے کی جو آپ ﷺ نے پائی کہ حکم کریں اس میں جو چاہیں اور اس وقت گھوڑے اور اونٹ نہیں تھے کہ ان کو دوڑایا جائے۔ فرمایا: "وَالْإِيْجَافُ أَنْ يُّوْضِعُوْا السَّيْرَ" یعنی ایجاف تیز چلانے کو کہتے ہیں اور وہ اموال رسول اللہ ﷺ کے لیے تھے ان اموال میں سے خیبر و فدک وعرینہ کے دیہات تھے اور آپ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ینبع کا قصد کریں تو آپ ﷺ اس کی طرف آئے اور اس سب پر قبضہ کر لیا تو کچھ لوگ بولے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تقسیم کیوں نہیں کی؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا عذر نازل کیا اور یوں فرمایا: ﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى﴾۔[2] (أخرجه ابن مردويه)

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اگرچہ غنیمت کی مثل تھا، کیوں کہ وہ لوگ کئی دن کے بعد نکلے، لڑے اور مصالحت کی، لیکن ان کی قلتِ تکلیف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو فیئ کے قائم مقام ٹھہرایا۔ بالجملہ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان کی کہ وہ اموال خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کے لیے ہیں اس کے بعد فیئ کے مصارف کا بیان کیا۔ ﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى﴾ اور تکرار تقریر اور تاکید کے لیے ہے۔ "مِنْهُمْ" کے بجائے جو ﴿اَهْلِ الْقُرٰى﴾ یعنی "مِنْ بَنِي النَّضِيْرِ" کے بجائے جو ﴿اَهْلِ الْقُرٰى﴾ فرمایا تو اس سے یہ بات بتانا منظور ہے کہ یہ حکم صرف بنی نضیر کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہ حکم ہر بستی کے لیے ہے جس کو رسول اللہ ﷺ بطور صلح فتح کریں اور مسلمان اس پر گھوڑے اور اُونٹ نہ دوڑائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "قریٰ" سے مراد بنی نضیر و بنی قریظہ ہیں، یہ دونوں تو مدینے میں ہیں اور فدک یہ مدینے سے تین میل کے فاصلے پر ہے اور خیبر اور عرینہ کے دیہات اور ینبع ہیں۔

اہلِ علم نے اس آیت میں اور اس سے پہلے کی آیت میں کلام کیا ہے کہ آیا دونوں کے معنی متفق ہیں یا مختلف۔ کسی نے تو کہا ہے کہ متفق ہیں (اسی لیے حرفِ عطف بھی ترک کیا ہے، کیوں کہ ما قبل سے اجنبی نہیں ہے)۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مختلف ہیں، اس میں اہلِ علم کی ایک طویل گفتگو ہے۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ

---

[1] صحيح البخاري (٢٧٤٨) صحيح مسلم (١٧٥٧) [2] تفسير الطبري (٢٧٤/٢٣)

علم برادرِ مالکیہ کہتے ہیں: کچھ اشکال نہیں ہے، تینوں آیتوں کے تین معنی ہیں۔ پہلی آیت جو یعنی ﴿ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ ﴾ ہے تو یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص اور آپ ﷺ کے لیے خالص ہے اور وہ بنی نضیر کے اموال ہیں، یا اور جو اُن کے مثل ہو۔

رہی دوسری آیت یعنی ﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ تو یہ ابتدائی کلام ہے کلام کے علاوہ ایک مستحق کے لیے جو پہلے سے علاحدہ ہے گو یہ آیت اور پہلی آیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شے بغیر لڑائی جھگڑے کے حاصل ہوئی ہے اور انفال کی ایک آیت جو تیسری ہے وہ اس کی مقتضی ہے کہ وہ شے لڑائی سے حاصل ہوئی ہے۔

اور دوسری آیت یعنی ﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ اس ذکر سے خالی ہے کہ اس کا حصول لڑائی سے ہو یا بغیر لڑائی کے۔ پس یہاں سے اختلاف پیدا ہوا تو ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ پہلی آیت سے ملحق ہے اور وہ صلح کا مال ہے اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ تیسری آیت سے ملحق ہے، یعنی انفال کی آیت سے اور جو اس کے قائل ہوئے کہ یہ انفال کی آیت سے ملحق ہے تو اختلاف کیا کہ آیا یہ منسوخ ہے یا محکم۔ یہ ابن العربی کے کلام کا حاصل ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کی پہلی آیت تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے اور دوسری بنی قریظہ کے بارے میں ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ اس کے معنی آیتِ انفال کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ "فئ" کے خمس کا طریقہ بھی وہی ہے جو غنیمت کے خمس کا ہے اور اس کے چار خمس نبی اکرم ﷺ کے لیے تھے اور آپ ﷺ کے بعد وہ مسلمین کے مصالح کے لیے ہیں۔[1] ﴿ لِلّٰهِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں جو چاہے وہ حکم کرے۔ ﴿ لِلرَّسُوْلِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول ﷺ کی ملکیت ہو جاتا ہے۔

﴿ وَلِذِى الْقُرْبٰى ﴾ سے مراد رسول اللہ ﷺ کے قرابت والے ہیں، یہ لوگ بنی ہاشم و بنی مطلب ہیں، ان کو اس لیے دیا جائے کہ یہ صدقہ لینے سے منع کیے گئے ہیں، اس لیے فَے میں اس کا حق ٹھہرایا گیا۔ ﴿ اَلْيَتٰمٰى ﴾ سے مراد مسلمانوں کے بچے ہیں جن کے باپ مر گئے۔ ﴿ اَلْمَسٰكِيْنِ ﴾ سے مراد حاجت مند مسلمان ہیں۔ ﴿ اِبْنِ السَّبِيْلِ ﴾ یعنی مسلمانوں میں سے مسافر جو سفر میں اپنے مال سے منقطع ہو رہے۔ کہا ہے کہ اس مال کی تقسیم اس طرح سے ہے کہ اس کے چار خمس تو رسول اللہ ﷺ کے لیے ہوں اور جو باقی ایک خمس بچا اس کے پانچ حصے کیے جائیں، ان میں سے ایک حصہ رسول ﷺ کے لیے اور باقی کے چار مذکورہ قسموں میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک حصہ۔ کسی نے کہا ہے کہ اس مال کے چھ حصے کیے جائیں، اس میں سے ایک حصہ اللہ پاک کا، وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے وجوہ میں خرچ کیا جائے، جیسے: مساجد کا آباد رکھنا اور اس طرح کی اور جگہوں یا مدوں میں خرچ کرنا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خیبر سے جو اپنے رسول ﷺ کے ہاتھ لگایا اس میں

[1] فتح القدير (٢٦٢/٥، ٢٦٣)

سے نصف تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے تھا اور دوسرا نصف مسلمانوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ اور اس رسول ﷺ کے لیے تھا، اس میں کتبہ وسلالم وخدہ ہے۔ (الكثبة موضع و الوطيح كشريف حصن بخيبر وسلالم كعلابط أيضا حصن و الشق بكسر الشين المعجمة موضع بخيبر أو دادية و بفتح أو الصواب الفتح في اللغة و زاد في منتهى الأرب أو قلعة من قلاع خيبر و نطاة بفتح النون والطاء المهملة بلا لام خيبر أو عين بها أو حصن بها أو حماها،[1] (كذا في القاموس). ووخدة بفتح الواو وسكون الخاء المعجمة قرية من قرى خيبر.[2] (كما في مجمع البحار) ولم أقف عليه عند تصحيح فتح البيان وقد مضى عليه زيادة على عشرين سنة وقد وقفت عليه في هذا الآن عند تحريري لهذا المقام ١٨ رمضان ١٣١٥ هجرى في نصف ليلة الجمعة فلله الحمد والمنة والسلام) اور جو مسلمانوں کے لیے تھا وہ شق ہے اور شق تیرہ حصے ہیں اور نطاۃ پانچ حصے۔ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے مال میں سے مسلمانوں کو کچھ تقسیم نہیں کیا، مگر ان لوگوں کے لیے جو حدیبیہ میں حاضر ہوئے اور آپ نے غزوۂ خیبر میں کسی ایسے مسلمان کو شامل ہونے کی اجازت نہ دی جو آپ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ کی طرف نکلنے کے وقت پیچھے رہ گیا تھا سوائے جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری رضی اللہ عنہما کو۔[3] (أخرجه ابن مردويه)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نضیر، خیبر اور فدک میں رسول اللہ ﷺ کے صفایا تھے، (''صفایا'' صفیہ کی جمع ہے، صفی وصفیہ وہ ہے جو غنیمت کی تقسیم سے پہلے لشکر کا سردار اپنے لیے لیتا ہے)۔ تو بنی نضیر تو آپ ﷺ کے نوائب کے لیے روکا ہوا تھا، یعنی جو کام آپ کو پیش آتے تھے، وہ ان میں خرچ ہوتا تھا۔ اور فدک ابن السبیل کے لیے تھا اور خیبر کے تین حصے کیے تھے، ان میں سے دو حصے مسلمانوں میں بانٹ دیے تھے اور ایک حصہ اپنے نفس کے لیے اور اپنے اہل کے نفقہ کے لیے روک رکھا تھا، پھر جو اپنے اہل کے نفقہ سے بچتا اس کو فقراء اور مہاجرین کو دے دیتے تھے۔[4] (أخرجه أبو داود) امام بقاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے یہ خیال کیا کہ ان اشیاء میں سے جو اس سورت میں ہیں، کوئی شے سورۃ الانفال میں دی ہوئی کسی شے سے منسوخ ہوئی تو اس نے واقعی غلطی کی، اس لیے کہ انفال تو بدر میں نازل ہوئی ہے اور وہ اس سورت سے ایک مدت پہلے ہے۔ (هكذا ذكر الخطيب)

﴿ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ﴾ حرفِ ﴿ كَيْ ﴾ بہ معنی لامِ تعلیل ہے اور جس شے کی یہ علت ہے وہ ماقبل سے حاصل ہوئی ہے، یعنی اللہ نے فَے کو ان لوگوں کے لیے ٹھہرا دیا جن کا ذکر ہوا، تاکہ وہ دولت مندوں کے درمیان ہی نہ گردش کرتا رہے کہ ان میں سے جو غالب ہو وہ اسے لے بیٹھے اور خود مختار ہو جائے، جیسا کہ

[1] القاموس المحيط (١٧٢٦/١) [2] مجمع بحار الأنوار (٢٦/٥) [3] الدر المنثور (١٠٠/٨)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٦٧)

جاہلیت کا طریقہ تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے رسول کے لیے ٹھہرایا کہ وہ اس کو اس طرز پر تقسیم کریں جس کا ان کو امر فرمایا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں: تاکہ غنی لوگ فقراء پر غالب نہ ہو جائیں اور اس کو اپنے آپس میں بانٹ لیں۔[1] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ روئے زمین پر جتنے بھی مسلمان ہیں ان سب کے لیے اس فَے میں حق ہے سوائے ان کے جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہیں، یعنی غلام۔[2] (أخرجه عبد الرزاق وغيره)

﴿ دُوْلَةً ﴾ اس شے کا نام ہے جس کو لوگ آپس میں لیتے دیتے ہیں، کبھی تو وہ اس کے لیے ہوتی ہے اور کبھی اس کے لیے۔ جمہور نے ﴿ يَكُوْنَ ﴾ کو بہ تحتیہ اور ﴿ دُوْلَةً ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے۔ "أَيْ: كَيْ لَا يَكُوْنَ الْفَيْءُ دُوْلَةً" اور کسی نے (یعنی امام ابو جعفر، اعرج، ہشام اور ابو حیان رحمہم اللہ نے) "تکون" بہ تائے فوقیہ اور ﴿ دُوْلَةٌ ﴾ بہ رفع "أَيْ: كَيْ لَا تَقَعَ أَوْ تُوْجَدَ دُوْلَةٌ" اس بنا پر "کان" تامہ ہے۔ نیز جمہور نے ﴿ دُوْلَةً ﴾ کو بہ ضم دال پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابو حیوہ اور سلمی رحمہما اللہ نے) بہ فتحِ دال پڑھا ہے۔

امام عیسیٰ بن عمر اور یونس اصمعی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ہی معنی میں دو لغت ہیں۔ ابو عمرو بن العلاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "دَوْلَةً" بالفتح وہ اموال ہیں جن کا تداول کیا جاتا ہے اور بالضم فعل ہے۔ اسی طرح امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ بالضم مال میں ہے اور بالفتح لڑائی میں۔ "دَالَتِ الْأَيَّامُ تَدُوْلُ" مثل "دَارَتِ الْأَيَّامُ تَدُوْرُ" کے ہے وزن اور معنی میں۔ کسی نے کہا ہے کہ بالفتح ملک بضم المیم سے ہے اور بالضم ملک بکسر المیم سے۔ مفتوح کی جمع "دِوَلٌ" آتی ہے، جیسے: "قِطْعَةٌ وَقِطَعٌ" اور مضموم کی جمع "دُوَلٌ"، جیسے: "غُرْفَةٌ وَغُرَفٌ"

پھر جب اللہ تعالیٰ اس مال کے مصارف بیان کر چکا تو ان کو امر کیا کہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ یعنی غنیمت اور فَے کے مال میں سے جو کچھ تم کو رسول عطا کرے تو اس کو لے لو اور جس کے لینے سے تم کو منع کرے تو اس سے باز رہو اور اس کو مت لو۔ امام حسن اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مالِ فے میں سے جو تم کو عطا کرے تو اس کو قبول کرو اور جس سے تم کو منع کرے اس کو مت طلب کرو۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: "مَا أَعْطَاكُمْ مِنْ طَاعَتِيْ فَافْعَلُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ مِنْ مَعْصِيَتِيْ فَاجْتَنِبُوْهُ"[4] یعنی میرے اطاعت کا جو حکم تم کو دے تو اس کو کرو اور میری جس معصیت سے تم کو منع کرے اس سے بچو۔

حق یہ ہے کہ یہ آیت عام ہے ہر اس شے کے متعلق جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائیں، وہ امر ہو یا نہی، قول ہو یا فعل۔ گو سبب خاص ہے مگر اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ شرع کی ہر شے جو آپ ہمارے

---

[1] فتح القدير (٥/٢٦٣)
[2] مصنف عبد الرزاق (١١/١٠١)
[3] تفسير القرطبي (١٨/١٦) فتح القدير (٥/٢٦٣)
[4] تفسير القرطبي (١٨/١٧)

پاس لائے تو تحقیق آپ نے وہ ہم کو عطا کی اور ہم کو پہنچا دی۔ یہ آیت نہایت نفع دینے والی اور بہت فائدہ مند ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کے سارے اوامر ونواہی میں عموم پر محمول ہے۔آپ ﷺ حکم نہیں کرتے مگر بھلائی کا اور نہی نہیں کرتے مگر فساد سے۔ امام مہدوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک کا یہ فرمان اس بات کو واجب کرتا ہے کہ جس شے کا حکم نبیِ مکرم ﷺ فرمائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے، اگرچہ یہ آیت غنیمتوں کے بارے میں خاص ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے سارے اوامر ونواہی اس میں داخل ہیں۔[1] (ذكره القرطبي)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے "واشمات ومستوشمات ومتنمصات و متفلجات للحسن المغيرات خلق الله" پر۔ پس یہ بات بنی اسد کی ایک عورت کو پہنچی، اس کا نام اُم یعقوب تھا تو وہ اُن کے پاس آئی اور کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم نے فلاں فلاں پر لعنت کی ہے۔فرمایا: مجھے کیا ہے کہ میں اس پر لعنت نہ کروں جس پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے۔ وہ بولی: البتہ میں نے پورا قرآن پاک، جو دو دفتیوں کے درمیان ہے، پڑھا ہے اور میں نے اس میں ایسا کوئی حکم نہیں پایا تو عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ البتہ اگر تو اس کو پڑھتی تو اس کو ضرور پا لیتی۔ کیا تو نے نہیں پڑھا: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾؟ بولی: کیوں نہیں؟ تو فرمایا: بے شک واقعی انھوں نے اس سے منع فرمایا ہے۔[2] (أخرجه البخاري و مسلم وغيرهما بالجملة)

جب اللہ پاک نے ان کو حکم کیا کہ جس شے کے لینے کا رسول ﷺ ان کو حکم دے تو اس کو لے لیں اور جس سے ان کو منع کرے اسے ترک کر دیں تو پھر اپنے تقویٰ کا ان کو حکم دیا اور اپنے سخت عذاب سے ان کو ڈرایا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ یعنی اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اس کی سزا سخت ہے۔ لہٰذا جس شخص نے وہ شے نہ لی جو رسول ﷺ نے اسے دی اور وہ شے ترک نہ کی جس سے رسول ﷺ نے اسے منع کیا تو اللہ تعالیٰ اسے سزا دینے والا ہے۔ سیدنا ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں تم میں کسی کو ایسا نہ پاؤں کہ وہ اپنے اریکہ (تخت) پر تکیہ لگائے ہوئے ہو اور اس کے پاس ان امور میں سے کوئی امر آئے جس کا میں نے حکم کیا ہو، یا اس سے میں نے منع کیا ہو اور وہ کہے کہ میں نہیں جانتا ہوں، ہم نے تو جو اللہ کی کتاب میں پایا اس کا اتباع کیا۔[3] (أخرجه أبو داود والترمذي وقال: هذا حديث أحسن) اریکہ ہر وہ شے ہے جس پر تکیہ لگایا گیا، وہ تخت ہو یا بچھونا یا چوکی یا اس جیسی اور چیز۔ اس بارے میں اور حدیثیں بھی ہیں۔[4] (كذا في فتح البيان)

---

[1] تفسير القرطبي (١٧/١٨)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٢٥)
[3] سنن أبي داود (٤٦٠٥) سنن الترمذي (٢٦٦٣) صحيح الجامع (٧١٧٢)
[4] فتح البيان (١٤/٤٤-٤٨)

مالِ فے اور اس کے مصارف کا بیان:

تفسیر ابنِ کثیر میں ہے: اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ ''فيْ'' کیا ہے اور اس کی صفت کیا ہے اور اس کا حکم کیا ہے؟ پس ''فيْ'' ہر وہ مال ہے جو کفار سے بغیر لڑائی کے یا بغیر گھوڑے اور اونٹ دوڑائے لیا گیا، جیسے: بنی نضیر کے یہ مال ہیں، کیوں کہ یہ اس قسم سے ہیں جس پر مسلمانوں نے نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ، یعنی اس میں دشمنوں سے اس طرح سے نہیں لڑے کہ میدان میں آئیں اور باہم مقابلہ اور حملہ کریں، بلکہ وہ لوگ اس رعب کی وجہ سے اتر آئے جو اللہ نے ان کے دلوں میں ڈال دیا، یا رسول اللہ ﷺ کی ہیبت سے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مال کو اپنے رسول کے ہاتھ لگایا، اسی لیے انھوں نے اسے جیسے چاہا خرچ کیا۔ اس مال کو مسلمانوں میں ان مدوں اور مصالح کی وجوہ پر تقسیم کر دیا جن کا اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں ذکر فرمایا ہے تو ارشاد کیا: ﴿ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ ﴾ ''أَيْ: مِنْ بَنِي النَّضِيرِ'' ﴿ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ ﴾ ''يَعنِي الإِبِلَ'' ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾''۔ یعنی اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والا ہے، کوئی اس پر غالب نہیں ہوتا، نہ اس کی ممانعت کر سکتا ہے بلکہ ہر شے پر وہی قاہر و غالب ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ یعنی سارے شہر جو اس طرح فتح کیے جائیں تو ان کا حکم وہی ہے جو بنی نضیر کے اموال کا حکم ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ اور جو اس کے بعد ہے چنانچہ یہ ''في'' کے۔ مصارف ہیں اور اس کے وجوہ ہیں۔ اس کے بعد مصارفِ فے کے بارے میں عمر رضی اللہ عنہ کا قول بہ روایتِ امام احمد رحمہ اللہ اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔[1] پھر مالک بن اوس سے مروی طویل حدیث بہ روایتِ ابو داود ذکر کی ہے جس میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے کہ یہ سب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔[2] اس سے غرض ''في'' کے مصارف ہی کا بیان کرنا ہے۔ پھر کہا ہے کہ یہ مصارف جو اس سورت میں مذکور ہیں وہی مصارف ہیں جو غنیمت کے خمس میں مذکور ہیں۔ ہم نے سورت انفال میں اس پر کلام کیا ہے، لہٰذا اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ وللہ الحمد.

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے فے کے مال کے یہ مصارف مقرر کیے تا کہ وہ مال خورد برد نہ ہو جائے کہ غنی لوگ اس پر غالب آئیں اور محض اپنی خواہشوں اور رائے سے اس کو خرچ کرتے رہیں اور فقراء کو اس میں سے کچھ بھی نہ دیں۔

---

① اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

② صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۹۲۷) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۵۷) سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۹۶۳)

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ جس شے کا رسول تم کو حکم دے اس کو بجا لاؤ اور جس سے تم کو منع کرے اس سے بچو، کیوں کہ وہ تو خیر ہی کا حکم دیتا ہے اور شر ہی سے منع کرتا ہے۔ اس میں وہی قصہ ذکر کیا ہے کہ ایک عورت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئی، اس میں دو روایتیں ذکر کی ہیں، ایک تو ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت عن مسروق ہے[1] اور دوسری علقمہ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہے،[2] ان میں کچھ الفاظ کا فرق ہے۔

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس وقت میں تم کو کسی معاملے میں حکم کروں تو تم اس کو اپنی پوری طاقت سے بجا لاؤ اور جس شے سے میں تم کو منع کروں تم اس سے بچو۔[3]

امام نسائی رحمہ اللہ نے بہ روایتِ سعید بن جبیر عمر رضی اللہ عنہ وعبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ دونوں نے اس بات کی گواہی دی کہ رسول اللہ ﷺ نے "دباء وحنتم ونقیر ومذفت" سے منع فرمایا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾[4] ان سب احادیث کے ذکر سے غرض یہ ہے کہ آیت ہر امر و نہی کے بارے میں عام ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم اس سے ڈرو اس کے احکامات کو بجا لانے میں اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں کو ترک کرنے میں، بے شک وہ سخت سزا والا ہے اس شخص کے لیے جس نے اس کے حکم کی نافرمانی کی، یا اس کے خلاف کیا اور اس کا انکار کیا اور جس نے اس شے کا ارتکاب کیا جس سے اس نے زجر اور نہی کی۔[5]

لِلْفُقَرَاۗءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ
يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ
اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ۚ8 وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ
مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ
فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ

① تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٤٦) ② صحيح البخاري (٤٦٠٤) صحيح مسلم (٢١٢٥) مسند أحمد (١/٤٣٣)
③ صحيح البخاري (٦٨٥٨) صحيح مسلم (١٣٣٧) ④ سنن النسائي (٥٦٤٣) ⑤ تفسير ابن كثير (٤/٤٢٨-٤٣٠)

وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝٩ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ
فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝١٠

(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے، جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں⑧ اور (ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو اُن کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے، جو اُن (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو، اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا، تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں⑨ اور (فَے ان کے لیے ہے) جو اُن (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت نرمی والا، نہایت رحم کرنے والا ہے⑩

پہلی آیت سے مہاجرین مراد ہیں اور اس آیت سے مراد انصار ہیں جو اس گھر میں یعنی مدینے میں پہلے سے رہتے ہیں اور اپنی حاجت کو روک کر مہاجرین کی خدمت کرتے ہیں اور ان کو اگر دیا جائے تو اس پر حسد نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ یہ آیت سب مسلمانوں کے لیے ہے جو اگلوں کا حق مانیں اور انہی کے پیچھے چلیں اور اُن سے بیر (دشمنی) نہ رکھیں۔ انتہیٰ

فتح البیان کا بیان:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ ﴾ کے متعلق کئی قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ لِذِی الْقُرْبٰی ﴾ سے بدل ہے (علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے)[1] اور جو اس پر معطوف ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس قول کو اور اقوال پر فوقیت دی ہے۔[2]

---

① تفسير النسفي (٢٣١/٤) ② التبيان في إعراب القرآن (١٢١٥/٢)

اس بدل کا یہ مقتضا ہے کہ ذی القربیٰ میں فقر شرط ہو، جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور اسی لیے امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس کو بدل ٹھہرایا ہے[1] اور کلام کو اس میں طول دیا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ تقدیر یہ ہو: "لِكَيْلَا لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً وَلَكِنْ يَكُوْنُ لِلْفُقَرَاءِ"۔ تیسرا یہ ہے کہ تقدیر: "وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ لِلْفُقَرَاءِ" ہے: "أَيْ: لِلْكُفَّارِ بِسَبَبِ الْفُقَرَاءِ"۔ چوتھا یہ ہے کہ معطوف ہے ما قبل پر بہ تقدیرِ واؤ، جیسے بولتے ہیں کہ "اَلْمَالُ لِزَيْدٍ لِعُمَرَ وَلِبَكْرٍ"۔ پانچواں یہ ہے کہ تقدیر "أَعْجِبُوْا لِلْفُقَرَاءِ" ہے اس شخص کو خطاب ہے جو مہاجرین کے حال میں تعجب و تامل کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یعنی لوگوں کے حال میں تعجب کرو اور سوچو کہ انھوں نے اپنے وطن اور مال چھوڑے اور نبی اور اسلام کی محبت میں تنگی اور غربت برداشت کی۔

اس میں ایک طرح کی ملامت اور دھمکی ہے کفار اور منافقین کو جو امن اور فراوانیِ مال کے ساتھ اپنے وطن میں مقیم ہیں اور ایمان نہیں لائے، سو کاش وہ مہاجرین سے عبرت لیتے۔ اس فعلِ تعجب کی تقدیر امام ابو البقا رحمہ اللہ نے بھی ذکر کی ہے[2] اور کواشی ان کے تابع ہوئے ہیں۔ اس تقدیر کی یہ بات تائید کرتی ہے کہ آگے جو منافقوں کا حال آتا ہے، اس کو اللہ پاک نے کلمۂ ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ سے شروع فرمایا ہے جو تعجب کا کلمہ ہے، اس لیے کہ ان کا ذکر ہوا، پھر ان کے مقابلے میں ان کی اضداد کا ذکر آیا تو مناسب یہ ہوا کہ جس عنوان سے ان کا ذکر ہوا، اسی عنوان سے ان اضداد کا بھی ذکر ہو۔

امام محلی رحمہ اللہ نے بھی یہی تقدیر اختیار کی ہے[3] اور یہ ان کے مذہب کے امام یعنی امام شافعی اور اُن کے اصحاب فَے کے مال میں ذی القربیٰ کا استحقاق قرابت کے سبب سے کہتے ہیں، حاجت اور فقر کی شرط نہیں لگاتے۔ سو حاجت کا شرط کرنا اور قرابت کا اعتبار نہ کرنا متضاد و مخالف ہے استحقاق بالقرابت کو۔ اور اس لیے کہ آیت میں اس بات میں نص ہے کہ استحقاق کا ثبوت ان کے شرف اور عزت کے لیے ہے۔ پس جس نے استحقاق کو معلل بہ حاجت ٹھہرایا تو اس نے اس معنی کو فوت کیا۔ (حاجت و فقر کی طرف اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم گئے ہیں اور ان کے متبعین میں امام اعظم بھی ہیں، باشارہ نصِ قرآن قیدِ فقر کو ثابت کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نصرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ذو القربیٰ کو ملتا تھا، چنانچہ یہ مضمون بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے اور یہ وجہ وفات کے بعد باقی نہیں رہی۔ واللہ تعالیٰ أعلم بمراد كتابه . از مصحح سلمه الله تعالیٰ)

اب رہا ﴿ لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ ﴾ سے بدل ٹھہرانا سو لفظِ "اللّٰه" سے تو اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس کا تو سب ہی ہے، اپنا ذکر صرف اپنے رسول کی تعظیم کے لیے کر دیا ہے اور لفظِ "رسول" سے اس لیے ٹھیک نہیں ہے کہ یہ ان کے فقر کے ساتھ موصوف ہونے کو مستلزم ہے، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن فقر کے غبار سے پاک صاف ہے۔ اور اللہ پاک نے

---

[1] الکشاف (٥٠٣/٤) [2] التبيان في إعراب القرآن (١٢١٥/٢) [3] تفسير الجلالين (٧٣١/١)

﴿ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ﴾ فرما کر آپ ﷺ کو جملہ فقراء سے نکال لیا ہے، اس کی پوری بحث خواہاں طول ہے، اب اسی پر بس کر دیا۔

بالجملہ مہاجرین وہ ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے دین پر رغبت کر کے اور آپ ﷺ کی نصرت ومدد کرنے کے لیے ہجرت کی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ مہاجرین وہ ہیں جنھوں نے اپنے گھر اور مال اور گھر والے چھوڑے،[1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ ﴾ یعنی وہ ہیں جن کو کفارِ مکہ نے مکہ سے نکالا اور نکلنے پر انھیں مضطر و مجبور کیا۔ یہ لوگ سو مرد تھے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ کفار مسلمانوں کے اموال کے مالک ہو جاتے ہیں استیلاء اور غلبے کے سبب سے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کا نام فقراء رکھا باوجود اس کے کہ ان کے گھر اور مال تھے۔[2]

﴿ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ﴾ حال ہے ﴿ اُخْرِجُوْا ﴾ سے، یعنی وہ نکالے گئے اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بات طلب کرتے تھے کہ ان کا دنیا میں تو رزق کے ساتھ اپنا فضل اور مہربانی فرمائے اور آخرت میں اپنی رضا مندی عطا کر کے اپنا فضل کرے۔ ﴿ وَ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ﴾ جملہ ما قبل پر معطوف ہے اور حال ہے، مگر پہلا جملہ حالِ مقارنہ ہے اور دوسرا حالِ مقدرہ۔ اس لیے کہ ان کے نکلنے کے وقت نصرت بالفعل نہ تھی، یعنی نکالے گئے اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی نصرت کی نیت رکھنے والے تھے۔ یہ جملہ حالِ مقارنہ بھی ہوسکتا ہے، اس لیے کہ خود ان کا اس صفت پر نکلنا اللہ و رسول کی نصرت تھا۔

﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ یعنی وہ لوگ جو مذکورہ صفات کے حامل ہیں وہی صدق اور راستی میں کامل و راسخ و پختہ ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہی مہاجرین ہیں جنھوں نے اپنے گھر اور مال اور کنبے والے چھوڑے اور اللہ و رسول ﷺ کی محبت کی خاطر نکل کھڑے ہوئے اور اسلام کو اختیار کر لیا باوجود اس شدت کے جس میں تھے۔ یہاں تک کہ ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ کوئی شخص بھوک کے مارے اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا تھا، تاکہ اس سے اپنی پشت سیدھی کرے اور کوئی شخص سردی میں گڑھا بناتا تھا، اس کے پاس اوڑھنے کے لیے کوئی کپڑا نہیں ہوتا تھا جس سے سردی سے بچاؤ کرے تو وہ اس گڑھے سے سردی کا بچاؤ حاصل کرتا تھا۔[3] سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ مفلس مہاجروں کو نورِ تام کی بشارت دو۔ قیامت کے دن وہ آسودہ حال لوگوں سے آدھا دن پہلے اس میں داخل ہوں گے اور یہ پانچ سو برس کے برابر ہے۔[4] (أخرجه أبو داود) پھر جب اللہ تعالیٰ مہاجرین کی تعریف کر چکا تو انصار کی خصائلِ حمیدہ کے ساتھ تعریف کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

[1] تفسیر القرطبي (١٩/١٨) [2] تفسیر النسفي (٢٣١/٤) [3] تفسیر القرطبي (١٨/١٩، ٢٠)

[4] سنن أبي داود (٣٦٦٦) اس کی سند میں ’’العلاء بن بشیر مزنی‘‘ مجہول راوی ہے۔ (ضعیف الجامع: ٤٠)

﴿ وَالَّذِیْنَ تَبَوَّءُ و الدَّارَ وَالْاِیْمَنَ ﴾ موصول مبتدا اور ﴿ یُحِبُّوْنَ ﴾ خبر ہے (اس بنا پر باب عطفِ جمل کے ہوگا۔ دوسری یہ وجہ ہے کہ فقراء پر معطوف ہو تو اب عطفِ مفردات سے ٹھہرے گا)۔ دونوں مل کر جملہ مستانفہ ہے۔ ﴿ الدَّارَ ﴾ سے مراد مدینہ ہے اور مدینہ دارِ ہجرت ہے۔ ﴿ تَبَوَّءُ و الدَّارَ وَالْاِیْمَنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ انصار نے مدینہ والوں کو مباءۃ ٹھہرایا۔ یعنی ان کو منزل اور ٹھکانا ٹھہرایا۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان ہو کر مدینے میں اور ایمان میں خوب جمے اور ان کو خوب مضبوط پکڑا جس طرح آدمی اپنی منزل اور ٹھکانے میں خوب جمتا ہے، اسی طرح وہ بھی ایمان میں خوب جمے اور خوب پختہ ہوئے۔

اصل میں "تبوؤ" مکان کے لیے ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ ایمان میں متمکن اور قرار پذیر ہوئے، اس لیے حال کو جائے محل ٹھہرا کر ایمان کو مکان کی مثل ٹھہرایا جس میں آدمی رہایش پذیر ہوتا ہے، یہ معنی تو بطور مجاز کے ہیں، اس میں مبالغہ اور لطافت ہے۔ کسی نے کہا: ﴿ وَالْاِیْمَنَ ﴾ کا فعل مقدر ہے، چنانچہ امام ابو علی فارسی رحمہ اللہ نے تو کہا ہے کہ تقدیر یہ ہے: "اِعْتَقَدُوْا الإِيْمَانَ أَوْ أَخْلَصُوْا الإِيْمَانَ"۔[1] کسی نے کہا ہے کہ "أَلْفَوُ الإِيْمَانَ"۔ کسی نے کہا ہے کہ "اِخْتَارُوْا الْإِيْمَانَ"۔ کسی نے کہا ہے کہ اسی ﴿ تَبَوَّءُ و ﴾ میں "لَزِمُوْا" کے معنی شامل ہیں۔ "أَيْ: لَزِمُوْا الدَّارَ وَالإِيْمَانَ"۔

﴿ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ میں مضاف کی تقدیر ضروری ہے۔ "أَيْ: مِنْ قَبْلِ هِجْرَةِ الْمُهَاجِرِيْنَ"۔ اس لیے کہ انصاری جو ایمان لائے ہیں تو مہاجرین کے ایمان کے بعد۔ یعنی انصار لوگ اپنے گھروں میں اسلام لائے اور ایمان کو اختیار کیا، مسجدیں بنائیں، مہاجرین کی ہجرت سے دو سال پہلے اور نبی مکرم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے۔ کسی نے کہا ہے کہ مضاف کی تقدیر کی ضرورت نہیں ہے۔ ﴿ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ بہ معنی "مِنْ قَبْلِ الْمُهَاجِرِيْنَ" ہے، اس لیے کہ انصار نے "تبوّی دار" میں ان سے سبقت کی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: میں اپنے سے بعد والے خلیفہ کو اس بات کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ مہاجرین اولین کے لیے ان کا حق پہچانے اور اُن کی عزت و حرمت پر نگاہ رکھے اور انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں جنھوں نے اس گھر میں اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ پکڑی، اس بات کی کہ ان کی اچھائیوں کو قبول کرے اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرے۔[2] (أخرجه البخاري)

﴿ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ ﴾ یعنی اس کو دوست رکھتے ہیں جس نے ان کی طرف ہجرت کی۔ یہ یوں ہے کہ انھوں نے مہاجرین پر احسان کیا اور ان کو اپنے مالوں میں اور اپنے گھروں میں شریک کیا۔ ﴿ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا ﴾ یعنی انصار اپنے سینوں میں اس شے کے بارے میں کسی طرح کا حسد نہیں پاتے جو ان کے علاوہ مہاجرین کو فے میں سے دی گئی، بلکہ ان کے دل اس سے خوش ہوئے۔

---

[1] فتح القدير (٥/٢٦٧)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٨)

مہاجرین انصار کے گھروں میں تھے، چنانچہ جب نبیِ کریم ﷺ نے بنی نضیر کی غنیمت لی تو انصار کو بلایا اور ان کا شکریہ ادا کیا اس امر میں جو انھوں نے مہاجرین کے ساتھ سلوک کیا کہ ان کو اپنے گھروں میں جگہ دی اور ان کو اپنے اموال میں شریک کیا۔ پھر فرمایا کہ اگر تم پسند کرو تو اللہ تعالیٰ نے بنی نضیر سے جو میرے ہاتھ لگایا ہے اس کو تم میں اور مہاجرین میں بانٹ دوں اور مہاجرین اسی حالت میں رہیں جس پر وہ ہیں، یعنی تمھارے گھروں میں رہتے رہیں اور تمھارے مالوں میں شریک رہیں اور اگر تم چاہو تو میں یہ ان کو دے دوں اور وہ تمھارے گھروں سے نکل جائیں۔ چنانچہ انصار اس سے خوش ہوئے کہ وہ مال مہاجرین میں بانٹ دیا جائے اور ان کے دل خوش ہوئے۔ ﴿حَاجَةً﴾ بہ معنی حسد و غصہ و حزازة ہے، پس حاجت سے یہ سب معنی مراد ہیں ان پر لفظِ حاجت کا اطلاقِ ملزوم کے لازم پر اطلاق کے باب سے ہے بر طریقِ کنایہ، کیوں کہ غالباً یہ معنی حاجت سے جدا نہیں ہوتے، یہاں کلام میں مضاف محذوف ہے: ”أَيْ: مَسُّ حَاجَةٍ أَوْ أَثَرُ حَاجَةٍ“ اور ہر شے جس کو انسان اپنے سینے میں پاتا ہے ان اشیاء میں سے جن کی اس کو حاجت ہوتی ہے تو وہ حاجت ہے۔

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ یعنی اپنی جانوں پر دوسروں کو اختیار کرتے ہیں اسبابِ معاش کی ہر شے میں، اگرچہ ان کو خود اس کی حاجت ہو اور وہ خود فقیر ہوں۔ ایثار دوسروں کو اپنے نفس پر دنیا کے حظوظ میں مقدم کرنے کو کہتے ہیں اور مقصد آخرت میں حصہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یہ بات یقین کی قوت سے اور پکی و سچی محبت سے اور مشقت پر صبر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ”يُقَالُ: أَثَرْتُهُ بِكَذَا أَيْ: خَصَصْتُهُ بِهِ وَفَضَّلْتُهُ“ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے حظوظ میں مہاجرین کو اپنی جانوں پر مقدم کرتے ہیں، اگرچہ ان کو خود حاجت ہو۔

جملۂ ﴿وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ حالیہ ہے۔ ﴿خَصَاصَةٌ﴾ بہ معنی فقر و حاجت ہے ”خَصَاصُ الْبَيْتِ“ سے ماخوذ ہے۔ خصاص وہ دراڑیں ہیں جو گھر میں ہوتی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ اختصاص سے ماخوذ ہے، یعنی کسی امر کے ساتھ منفرد و متبد ہونا، تو ﴿خَصَاصَةٌ﴾ حاجت کے ساتھ منفرد ہونا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو عرض کی: اے اللہ کے رسول! مجھے تکلیف پہنچی ہے، یعنی بھوک۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کی طرف آدمی بھیجا تو ان کے پاس کچھ نہ پایا۔

چنانچہ فرمایا: کیا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس کو آج کی رات مہمان رکھے اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے؟! انصار میں سے ایک شخص بولا، ایک روایت میں ہے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بولے: میں اسے مہمان رکھوں گا یا رسول اللہ! پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے مہمان کا اکرام کر اور اس سے کوئی چیز نہ چھپا، وہ بولی: واللہ! میرے پاس صرف بچوں کے کھانے کے لیے تھوڑا سا کھانا ہے۔ چنانچہ کہا کہ جس وقت بچے رات کے کھانے کا ارادہ کریں تو تُو اُن کو سلا دے اور چراغ گل کر دینا اور ہم آج کی رات اپنے پیٹ کو خالی رکھیں گے۔ رسول اللہ ﷺ

کے مہمان کی خاطر تو اس نے ایسا ہی کیا، پھر وہ مہمان صبح کو رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”لَقَدْ عَجِبَ اللّٰهُ اللَّيْلَةَ مِنْ فُلَانٍ وَفُلَانَةٍ“ یعنی البتہ اللہ تعالیٰ آج کی رات فلاں مرد اور فلاں عورت سے خوش ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔[1] (أخرجه البخاري و مسلم وغيرهما)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک شخص کی طرف بکری کے سر کا ہدیہ بھیجا گیا تو کہا کہ میرا فلاں بھائی اور اس کے عیال اس کے زیادہ حاجت مند ہیں، چنانچہ اس کو اس کی طرف بھیجا، پھر ایک دوسرے کی طرف بھیجتا رہا، یہاں تک کہ وہ سات گھر والوں میں بھیجا گیا، یہاں تک کہ پہلے کی طرف لوٹ آیا، چنانچہ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔[2] (أخرجه الحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقي في الشعب)

جمہور نے ﴿ شُحَّ ﴾ کو بہ ضمِ شین پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما و ابی عیلہ رحمہ اللہ نے) بہ کسرِ شین پڑھا ہے۔ شح بخل مع حرص ہے۔ (كذا في الصحاح) کسی نے کہا ہے کہ سخت قسم کا بخل ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ شُحَّ نَفْسِهٖ ﴾ ”حرص نفسہ“ ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شحِ نفس حرام کا لینا اور زکات کا روکنا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص نے وہ شے نہ لی جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منع کیا ہے اور وہ شے نہ روکی جس کے ادا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم فرمایا ہے تو وہ یقیناً اپنے نفس کے شح سے بچایا گیا۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا: بخل یہ ہے کہ انسان اس شے کے ساتھ بخل کرے جو اس کے ہاتھ میں ہے اور ﴿ شُحَّ ﴾ یہ ہے کہ اس شے کے ساتھ شح کرے جو لوگوں کے ہاتھ میں ہے، وہ یہ چاہتا ہے کہ جو کچھ اُن کے ہاتھ میں ہے، وہ اس کے لیے ہو، خواہ وہ حلال طریقے سے ہو یا حرام طریقے سے، قناعت نہیں کرتا۔ امام ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ شُحَّ ﴾ ظلم ہے۔ لیث رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرائض کو ترک کرنا اور حرام کردہ چیزوں میں منہمک ہونا ہے۔[3]

بالجملہ ﴿ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ ﴾ کلامِ عام ہے اور ﴿ مَنْ ﴾ شرطیہ اور ﴿ يُوْقَ ﴾ فعل شرط اور ﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ شرط کی جزا ہے۔ شرط میں لفظ ﴿ مَنْ ﴾ کی رعایت کی ہے اور جزا میں ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی کی۔ فلاح ہر مطلوب کو حاصل کرنے میں کامیابی اور ظفر ہے، یعنی جو کوئی اپنے دل کے لالچ سے بچایا گیا تو وہی اس شے کو پانے والے ہیں جو بھی وہ چاہیں۔ آیت سے یہ ظاہر ہے کہ فلاح اس بات پر ترتیب ہے کہ نفس کا بخل ان اشیاء میں سے کسی شے میں نہ ہو جن میں بخل کرنا شرعی لحاظ سے قبیح ہو، یعنی زکات و صدقہ یا صلہ رحم، یا اس کے مثل، چنانچہ ﴿ شُحَّ ﴾ کی اضافت نفس کی طرف یہی بات ظاہر کرتی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٥٤)

[2] مستدرك الحاكم (٥٢٦/٢) شعب الإيمان (٢٥٩/٣) اس کی سند میں ”عبیداللہ بن ولید“ ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير القرطبي (٢٩/١٨، ٣٠) فتح القدير (٢٦٧/٥، ٢٦٨)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ بے شک میں ڈرتا ہوں اس سے کہ میں واقعی ہلاک ہو جاؤں۔ فرمایا: یہ کیا ہے؟ عرض کی: بے شک میں نے سنا اللہ تعالیٰ کو کہ فرماتا ہے: ﴿ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ اور میں ایک شحیح (لالچی) شخص ہوں کوئی شے مجھ سے نکل کر جا نہیں سکتی تو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا کہ یہ شح نہیں ہے، لیکن یہ بخل ہے اور بخل میں کچھ خیر نہیں ہے اور شح جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ذکر فرمایا ہے یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا مال ظلماً کھا جائے۔[1] (أخرجه الفريابي والحاكم وصححه وغيرهما)۔ (یعنی سعید بن منصور و ابن ابی شیبہ وعبد بن حمید و ابن جریر و ابن منذر و ابن ابی حاتم وطبرانی و ابن مردویہ و بیہقی فی الشعب كذا في فتح القدير)۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ شح یہ نہیں ہے کہ مرد اپنا مال روکے، لیکن یہ بخل ہے اور بے شک یہ البتہ برا ہے۔ شح تو یہی ہے کہ مرد کی آنکھ اس شے کی طرف بلند ہو جو اس کی نہیں ہے۔ (أخرجه المنذر و ابن مردويه) سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس نے اپنے مال کی زکات دی تو وہ یقیناً اپنے نفس کے شح سے بچایا گیا۔[2] (أخرجه ابن المنذر) سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ کسی شے نے کبھی اسلام کو نہیں مٹایا جتنا کہ شح نے مٹایا۔[3] (أخرجه الحكيم الترمذي وأبو يعلىٰ وابن مردويه)۔ (اصل میں اس جگہ حکیم ترمذی کا نام نہیں ہے مگر فتح القدیر میں ہے۔ مصحح سلمه الله تعالىٰ)۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ظلم سے بچو، بے شک ظلم قیامت کے دن تاریکیاں ہیں اور شح سے بچو، بے شک شح نے ان لوگوں کو ہلاک کیا جو تم سے پہلے تھے، ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے خون بٹوئے اور اپنی حرام کردہ چیزوں کو حلال کیا۔[4] (أخرجه أحمد والبخاري في الأدب ومسلم والبيهقي) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ شح اور ایمان بندے کے دل میں کبھی اکٹھے نہیں ہوتے۔[5] (أخرجه النسائي) جامع صغیر میں ہے کہ شحیح جنت میں داخل نہ ہوگا۔[6] (رواه الخطيب في كتاب البخلاء عن ابن عمر) شح کی مذمت میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔

---

1. مستدرك الحاكم (٥٣٢/٢) مصنف ابن أبي شيبة (٣٣٢/٥) تفسير الطبري (٢٨٥/٢٣، ٢٨٦) المعجم الكبير (٢١٨/٩) شعب الإيمان (٤٢٦/٧) فتح القدير (٢٦٩/٥)
2. الدر المنثور (١٠٧/٨، ١٠٨)
3. مسند أبي يعلىٰ (٢٠٩/٦) اس کی سند میں ''علی بن ابی سارۃ'' ضعیف اور ''عمرو بن حصین'' سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ١٢٨١)
4. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٨) مسند أحمد (٣٢٣/٣) الأدب المفرد (١٧٠/١) شعب الإيمان (٤٢٤/٧)
5. سنن النسائي، رقم الحديث (٣١١٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦١٦)
6. المعجم الأوسط (٢٣٤/٤) اس کی سند میں ''یحییٰ بن مسلمہ قعنبی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٤٠٢)

پھر جب اللہ تعالیٰ مہاجرین اور انصار کی تعریف سے فارغ ہوا تو وہ بات بیان کی جو اس کے لائق ہے کہ اسے وہ لوگ کہیں جو ان کے بعد ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ...الآية ﴾ یہ لوگ روزِ قیامت تک آنے والے تابعین باحسان ہیں۔ کسی نے کہا: وہ ہیں جنھوں نے اسلام کے قوی ہونے کے بعد ہجرت کی۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت میں وہ لوگ شامل ہیں جو سابقین کے بعد آئے، یعنی وہ صحابہ جن کا اسلام متاخر ہوا زمانۂ نبوت میں اور جو لوگ زمانۂ نبوت کے بعد ان کے پیرو ہوئے روزِ قیامت تک کے مسلمانوں میں سے اس لیے کہ کل پر یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ لوگ مہاجرین اولین اور انصار کے بعد آئے۔

"إخوان" جمع ہے "أخ" کی۔ "أخ" کا لام کلمہ محذوف ہے، یعنی واؤ بنا بر اشہر۔ تثنیہ میں پھیر لایا جاتا ہے تو "أخوان" بولتے ہیں اور ایک لغت میں منقوص مستعمل ہوتا ہے تو "أخان" بولتے ہیں، جمع "إخوة وإخوان" بہ کسرِ ہمزہ ہے دونوں میں اور ضمِ ہمزہ بھی ایک لغت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی جمع واؤ اور نون کے ساتھ ہے اور "آخاء" بروزن "آباء" اقل ہے۔ انثیٰ اخت ہے اور جمع اخوات، یہ جمع مؤنث سالم ہے۔[1] (كذا في المصباح)

یہاں "إخوة" سے مراد دین کی اخوۃ ہے اللہ پاک نے بعد کے لوگوں کو حکم فرمایا کہ خود اپنے لیے مغفرت مانگیں اور اُن لوگوں کے لیے جو ان سے پہلے مہاجرین اور انصار گزر چکے ہیں۔ پھر مہاجرین اور انصار کے لیے مغفرت مانگنے کے بعد ان کو حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ طلب کریں کہ ان کے دلوں سے مومنین کا حسد، بغض، کینہ اور فریب دور کر دے۔ چنانچہ یوں کہیں کہ اے ہمارے رب! ہمارے دل میں ایمان والوں کی دشمنی نہ رکھ، بے شک تیری مہربانی اور رحمت بہت زیادہ اور مؤثر ہے، اس کے لیے جو تیرے بندوں میں سے اس کا مستحق ہے۔

﴿ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے مراد صرف مومنین ہیں تو اب صحابہ تو بدرجۂ اولی اس میں داخل ہیں، اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ شرف والے مومن ہیں اور اس لیے کہ سیاق ان میں ہے۔ چنانچہ اب جس نے علی العموم صحابہ کے لیے مغفرت نہ مانگی اور اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی طلب نہ کی تو اس نے واقعی اس بات کی مخالفت کی جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حکم دیا۔ پھر اگر اپنے دل میں ان کا کینہ پایا تو بے شک اس کو شیطان کا نزغ لگا (یعنی تباہی ڈالنا اور ورغلانا اور وسوسہ ڈالنا) اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ایک وافر حصہ اس پر آ اترا، اس سبب سے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے اور اُن لوگوں سے عداوت کی جو اس کے نبیِ کریم ﷺ کی بہترین اُمت ہیں اور اس کے لیے "خذلان"، یعنی ذلت اور خواری کا ایک دروازہ کھل گیا جو اس کو جہنم کی آگ پر وارد کرے گا، اگر اس نے اس طرح سے اپنے نفس کا تدارک نہ کیا کہ اللہ پاک سے التجا و استغاثہ کرے کہ اس اُمت کے بہترین قرون اور سب سے زیادہ شرف والے لوگوں کا جو کینہ اس کے دل میں بیٹھ گیا ہے، وہ اس کو اس سے کھینچ ڈالے۔

---

[1] المصباح المنير (١/١٠)

پھر جو کینہ اس کے دل میں ہے اگر اس نے ان پاک باز ہستیوں میں سے کے سب وشتم (برا بھلا کہنا) کی طرف تجاوز کیا تو وہ شخص یقیناً شیطان کی مہار کا تابع ہو گیا اور اللہ پاک کے غضب اور غصے میں جا پڑا۔ یہ سخت بیماری اسی کو لگتی ہے جو کسی سکھانے والے کی باتوں میں آ گیا، یا اُمت کے بہترین لوگوں کے دشمنوں میں سے جن کے ساتھ شیطان نے بازی کی ہے ان کے ہتھے چڑھ گیا۔ جن دشمنوں نے گھڑے ہوئے قصے اور وضع کردہ خرافات ان کو اچھی کر دکھائیں اور کتاب اللہ سے ان کو پھیر دیا ہے، وہ کتاب اللہ جس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے نہ پیچھے سے اور ان کو رسول اللہ ﷺ کی سنت سے پھیر دیا ہے، وہ سنت جو ہر زمانے کے اکابر ائمہ کی روایت سے ہم تک منتقل کی گئی ہے۔

سو انھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لے لی اور وافر نفع کے عوض خسرانِ عظیم بدل لیا اور شیطانِ رجیم ان کو ایک درجے سے دوسرے درجے کی طرف اور ایک رتبے سے دوسرے رتبے کی طرف منتقل کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ کتاب اللہ کے اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے اور بہترین اُمت کے اور عبادِ صالحین کے اور سارے مومنوں کے دشمن ہو گئے، اللہ تعالیٰ کے فرائض کو چھوڑ دیا، دین کے شعائر کو ترک کر دیا، اسلام اور اہلِ اسلام کو دھوکا دینے میں ہر طرح کی سعی کی، دین اور اہلِ دین کو ہر پتھر اور کلوخ سے مارا۔ انھوں نے تو یہ سب کچھ کیا اور اللہ تعالیٰ ان کو احاطہ کرنے والا ہے، اس سے بچ کر کہاں جا سکتے ہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اس آیت میں تو ان کو یہ حکم کیا گیا کہ اصحابِ نبی ﷺ کے لیے مغفرت مانگیں اور انھوں نے ان کو گالیاں دیں، پھر یہ آیت پڑھی۔[1] (أخرجه عبد بن حميد وغيره) (یعنی امام ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن الانباری فی المصاحف اور ابن مردویہ رحمہ اللہ) سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا کہ لوگ تین منازل پر ہیں دو منزلت تو واقعی گزر چکے ہیں اور ایک منزلت باقی رہی، اس میں سے بہت سے بہتر جس پر تم ہونے والے ہو یہ ہے کہ تم اس منزلت پر ہو جو باقی رہا، پھر ﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا... الآیۃ ﴾ پڑھی۔[2] (أخرجه الحاكم وصححه وابن مردويه)

امام سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے کہا گیا کہ تم سیدنا عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے حق میں کیا کہتے ہو؟ کہا: میں وہ کہتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہلوایا ہے اور یہ آیت پڑھ دی۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو سنا جو بعض مہاجرین کی برائی کر رہا تھا تو انھوں نے اس کے سامنے پڑھا: ﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا... الآیۃ ﴾ پھر فرمایا: یہ مہاجرین ہیں کیا پھر تو ان میں سے ہے؟ کہا: نہیں پھر اس پر پڑھا: ﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ... الآیۃ ﴾ پھر فرمایا: یہ انصار ہیں، کیا پھر تو ان میں سے ہے؟ کہا: نہیں۔ پھر اس پر پڑھا

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٢٢) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٤٧/١٠) الدر المنثور (١١٣/٨)

(2) الدر المنثور (١١٣/٨) (3) تفسير النسفي (٢٣٢/٤)

﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ... الآية ﴾ پھر فرمایا: کیا تو اُن میں سے ہے؟ کہا: میں اُمید کرتا ہوں، فرمایا: ان میں سے وہ نہیں ہے جس نے ان کو گالیاں دیں۔[1] (أخرجه ابن مردويه كذا في فتح البيان مع بعض الزيادة والتغير)

فے کے مستحق لوگوں کا بیان اور مہاجرین وانصار کی فضیلت:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ جو فقراء فے کے مال کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا حال بیان فرماتا ہے کہ یہ وہ ہیں جو اپنے گھروں اور مالوں سے اس حال میں نکالے گئے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور رضا مندی طلب کرتے ہیں، یعنی اپنے گھروں سے نکلے اور اپنی قوم کی مخالفت کی اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول ﷺ کی مدد کرتے ہیں۔ یہ لوگ سچے ہیں، یعنی یہ وہ ہیں جنھوں نے اپنے قول کی اپنے فعل کے ساتھ تصدیق کی اور یہ لوگ مہاجرین کے سردار ہیں۔ پھر انصار کی تعریف کی اور اُن کا فضل اور شرف اور عزت کا بیان کیا اور اس بات کا بیان کیا کہ وہ حسد نہیں کرتے اور اپنی حاجت کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُ و الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ یعنی مہاجرین سے پہلے دار الہجرت میں ساکن ہوئے اور ان میں سے بہتوں سے پہلے ایمان لائے۔

انصار مہاجرین سے حسد نہیں کرتے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے کرم اور شرف سے یہ بات ہے کہ وہ مہاجرین کو دوست رکھتے ہیں اور اپنے مالوں سے ان کی غم خواری اور خبر گیری کرتے ہیں۔ ﴿ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا ﴾ یعنی اپنے دلوں میں مہاجرین کے لیے اس شیے میں حسد نہیں پاتے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو فضیلت دی، یعنی منزلت وشرف اور ذکر و رتبے میں ان کی تقدیم کی۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ﴿ حَاجَةً ﴾ سے مراد حسد ہے۔[2]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مِّمَّآ اُوْتُوْا ﴾ سے یہ مراد ہے کہ وہ اس شے میں حسد نہیں پاتے جو اُن کے بھائیوں کو عطا کی گئی ہے۔ اسی طرح امام ابن زید رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[3] جن امور سے اس معنی پر استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے وہ امر ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم پر ابھی اہلِ جنت میں سے ایک شخص ظاہر ہوگا۔ چنانچہ ایک انصاری شخص ظاہر ہوا جس کی ڈاڑھی سے اس کے وضو کا پانی ٹپک رہا تھا اور وہ اپنی دونوں جوتیاں اپنے بائیں ہاتھ میں لٹکائے ہوئے تھا۔ پھر جب دوسرا دن ہوا تو آپ ﷺ نے ویسا ہی فرمایا، پھر وہی شخص پہلی بار کی طرح ظاہر ہوا۔

پھر جب تیسرا دن ہوا تو آپ ﷺ نے پھر وہی بات فرمائی، پھر وہی شخص اسی حال میں ظاہر ہوا۔ پھر جب

---

[1] الدر المنثور (۸/۱۱۳) فتح البيان (۱۴/۴۹۔۵۶) [2] تفسير الطبري (۲۳/۲۸۴) [3] تفسير ابن كثير (۴/۴۳۱)

رسول اللہ ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے تو عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما اس شخص کے پیچھے ہوئے اور اس سے کہا کہ میں نے اپنے باپ کے ساتھ جھگڑا کیا ہے اور میں قسم کھا بیٹھا ہوں کہ تین رات اس پر داخل نہ ہوں لہٰذا اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے پاس ٹھکانا دے، تاکہ وہ دن گزر جائیں، اس نے کہا: ہاں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: چنانچہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے تھے کہ انھوں نے وہ تین راتیں اس کے ساتھ بسر کیں اور اسے نہ دیکھا کہ وہ رات کو قیام کرے سوائے اس کے کہ جس وقت وہ جاگتا (اصل کے الفاظ ''إذا تعارر'' ہے ''تعارر''خواب سے بیدار ہونا ہے اذان یا آواز سے۔ كذا في الصراح) تو اپنے بچھونے پر لوٹتا پوٹتا، یعنی کروٹیں لیتا اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا اور تکبیر کہتا، یہاں تک کہ فجر کی نماز کے لیے کھڑا ہوتا۔

سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے اس کو سوائے خیر بات کہنے کے نہیں سنا، پھر جب وہ تین راتیں گزر گئیں اور میں اس کے عمل کو حقیر سمجھنے کے قریب تھا تو میں نے کہا: اے اللہ کے بندے! میرے اور میرے باپ کے درمیان کچھ غصہ نہیں تھا اور نہ کوئی غلط بات تھی، لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو تیرے بارے میں تین دفعہ یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم پر ایک شخص اہلِ جنت میں سے ظاہر ہوگا اور تو ہی ان تین بار میں ظاہر ہوا، اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ تیرے پاس ٹھکانا پکڑوں، تاکہ دیکھوں کہ تیرا کیا عمل ہے، تاکہ میں بھی ویسا ہی کروں، میں نے تجھے نہ دیکھا کہ تو کوئی بڑا عمل کرتا ہے، پھر وہ کون سا عمل ہے جو تجھے اس رتبے تک لے پہنچا جس کا رسول اللہ ﷺ نے ذکر فرمایا؟ اس نے کہا کہ نہیں ہے کوئی اور عمل مگر جو تو نے دیکھا، پھر جب میں مڑ کر چلا تو مجھے بلایا پھر کہا، نہیں ہے وہ مگر جو تو نے دیکھا سوا اس کے کہ میں نے اپنے دل میں مسلمانوں میں کسی کے لیے کوئی غش (کینہ) نہیں پایا اور کسی کا کسی چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی میں حسد نہیں کرتا۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: پس یہ وہی خصلت ہے جو تجھے لے پہنچی ہے اور اسی کی طاقت نہیں رکھی جاتی۔[1] (ورواه النسائي في اليوم والليلة عن سويد بن نصر عن ابن المبارك عن معمر به وهذا إسناد صحيح على شرط الصحيحين رواه عقيل وغيره عن الزهري عن رجل عن أنس رضي الله عنه فالله أعلم)

انصار کا ایثار:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلَى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ ''أَيْ: حَاجَةٌ''، یعنی وہ حاجت مندوں کو اپنے نفسوں کی حاجت پر مقدم رکھتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ ابتداء کرتے ہیں اپنے سے پہلے اس حال میں کہ خود اس کے حاجت مند ہوتے ہیں۔ صحیح میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « أَفْضَلُ الصَّدَقَةِ جُهْدُ الْمُقِلِّ »[2] یہ مقام ان لوگوں کے حال سے اعلیٰ ہے جن کا یہ وصف فرمایا ہے: ﴿ وَيُطْعِمُوْنَ

---

[1] مسند أحمد (١٦٦/٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٢١٥/٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٤٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (١١١٢)

﴿ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ [الدھر: ٨] ''اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ [البقرة: ١٧٧] ''جو دے مال اس کی محبت کے باوجود۔''

کیوں کہ ان لوگوں نے اس حال میں صدقہ دیا کہ اس شے کو دوست رکھتے ہیں جو صدقہ دی اور کبھی ان کو اس کی کوئی حاجت وضرورت بھی نہیں ہوتی ہے اور اُن لوگوں نے تو اپنے نفوس پر اختیار کیا، باوجود اس کے کہ جو شے خرچ کی اس کے وہ خود حاجت مند ہوتے ہیں۔ اسی مقام سے صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال خیرات کر ڈالا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تو نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا باقی رکھا؟ تو عرض کی کہ میں نے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی رکھا۔[1] اور اسی طرح وہ پانی ہے جو یرموک کے دن عکرمہ پر اور اُن کے اصحاب پر پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک کہتا تھا کہ یہ میرے ساتھی کو دے دو، حالاں کہ وہ خود زخموں سے چور ہو رہا تھا اور سب سے بڑھ کر اس پانی کا حاجت مند تھا تو دوسرے نے اس کو تیسرے کی طرف رد کیا، پھر وہ تیسرے تک نہ پہنچا، یہاں تک کہ وہ سب کے سب مر گئے اور ان میں سے کسی نے اس کو نہ پیا۔

امام ابو الہیاج اسدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے: ''اَللّٰهُمَّ قِنِي شُحَّ نَفْسِي'' اس سے اور کچھ زیادہ نہیں کہتا تھا، چنانچہ میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ جب میں اپنے نفس کے شح سے بچا لیا گیا تو میں چوری نہ کروں گا، زنا نہ کروں گا اور کوئی اور برا کام نہ کروں گا، ناگاہ وہ شخص عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ تھے۔[2] (رواہ ابن جریر) سیدنا انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: وہ شخص شح سے بری ہوا جس نے زکات ادا کی اور مہمان کی مہمانی کی اور نائبہ میں دیا[3] (یعنی جب کوئی ضروری دینی حادثہ پیش آ گیا)۔ (رواہ ابن جریر)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ ﴾ یہ ان میں سے تیسری قسم ہیں جن کے مالِ فے میں سے فقراء مستحق ہیں۔ یہ لوگ مہاجرین ہیں، پھر انصار، پھر اُن کے تابعین باحسان جیسا کہ سورت براءت کی آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [التوبة: ١٠٠] ''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے۔'' پس ان کے تابعین باحسان وہی ان کے آثارِ حسنہ و اوصافِ جمیلہ کے پیرو ہیں ان کے لیے ظاہری اور باطنی طور پر دعا کرنے والے ہیں۔ اسی لیے اس

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٧٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٧٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح أبي داود: ٥/٣٦٥، ٣٦٦)

[2] تفسير الطبري (٢٣/٢٨٦) [3] تفسير الطبري (٢٣/٢٨٦) اس کی سند میں ''اسماعیل بن عیاش عن مجمع'' ضعیف راوی ہے۔

آیتِ کریمہ میں فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ ﴾ "أي: قَائِلِيْنَ" ﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا ﴾ "أي: بُغْضًا وَحَسَدًا" ﴿ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾

امام مالک رحمہ اللہ نے اس آیتِ کریمہ سے کیا خوب استنباط کیا ہے کہ رافضی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گالیاں دیتا ہے اس کا فَے کے مال میں کچھ حصہ نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں وہ صفت نہیں ہے جس کے ساتھ اللہ پاک نے اپنے اس قول میں ان لوگوں کی مدح کی ہے، یعنی ﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ... الآية ﴾۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ تم کو اصحابِ محمد ﷺ کے لیے مغفرت مانگنے کا حکم کیا گیا اور تم نے ان کو گالیاں دیں۔ میں نے تمھارے نبی مکرم ﷺ کو سنا ہے، وہ فرماتے تھے، نہ جائے گی یہ اُمت یہاں تک کہ اس کا آخر اس کے پہلوں کو لعنت کرے گا۔[1] (رواه البغوي) جب اللہ پاک مومنوں کے تین طبقوں کا ذکر کر چکا تو وہ گفتگو بیان کی جو منافقین اور یہود کے درمیان واقع ہوئی، تاکہ مومن اُن کے حال سے تعجب کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَىِٕنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿11﴾ لَىِٕنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَىِٕنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَىِٕنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿12﴾ لَاَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿13﴾ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَاۗءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿14﴾ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿15﴾

[1] تفسير البغوي (٨٠/٨) تفسیر ابن كثير (٤٣٠/٤-٤٣٤) اس کی سند میں "اسماعیل بن ابراہیم بن مہاجر" ضعیف راوی ہے، البتہ اس کا پہلا جملہ (تم کو اصحاب محمد ﷺ کے لیے .... گالیاں دیں۔) صحیح ہے جیسا کہ زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکا ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾

(اے نبی!) کیا آپ نے وہ لوگ نہیں دیکھے، جنھوں نے منافقت کی؟ وہ اپنے ان بھائیوں سے، جو اہلِ کتاب میں سے کافر ہوئے، کہتے ہیں: اگر تم (مدینہ سے) نکالے گئے تو ہم ضرور تمھارے ساتھ نکلیں گے، اور ہم تمھارے معاملے میں کبھی کسی کی اطاعت نہیں کریں گے، اور اگر تم سے لڑائی کی گئی تو ہم ضرور تمھاری مدد کریں گے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ جھوٹے ہیں ⑪ اگر وہ (یہود) نکالے گئے تو یہ (منافقین) ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے لڑائی کی گئی تو یہ اُن کی مدد نہیں کریں گے، اور اگر ان کی مدد کو پہنچے بھی تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی ⑫ (اے مسلمانو!) یقیناً ان کے سینوں میں اللہ کی نسبت تمھارا ڈر زیادہ ہے، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ⑬ وہ سب مل کر بھی تم سے نہیں لڑ سکیں گے، مگر ایسی بستیوں میں جو قلعہ بند ہیں یا دیواروں کی اوٹ سے، ان کی آپس کی لڑائی (دشمنی) بہت سخت ہے، آپ انھیں اکٹھے سمجھتے ہیں، جبکہ ان کے دل جدا جدا ہیں، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں، جو عقل نہیں رکھتے ⑭ (ان کی مثال) ان لوگوں کی سی ہے جو اُن سے پہلے قریب ہی (بدر میں) اپنی بد اعمالی کا وبال چکھ چکے ہیں، اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے ⑮ ان کی مثال شیطان کی سی ہے، جب وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، پھر جب وہ کفر کرتا ہے تو شیطان کہتا ہے: بے شک میں تجھ سے بَری ہوں، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں ⑯ لہٰذا ان دونوں کا انجام یہی ہوگا کہ بے شک وہ ہمیشہ (دوزخ کی) آگ میں رہیں گے، اور ظالموں کی سزا یہی ہے ⑰

یہ منافق ان کافروں کو چھپ چھپ کر پیغام دیتے تھے آخر وہ نکالے گئے اور ان سے کچھ نہ ہوا۔ ان لوگوں کی طرح جو ان سے کچھ ہی پہلے گزرے ہیں، یعنی نزدیک ہے، مکہ والے بدر کے دن سزا پا چکے ہیں، وہی حال ان کا بھی

ہوگا۔ شیطان آخرت میں یہ کہے گا کہ میں تجھ سے بری ہوں۔ بدر کے دن بھی ایک کافر کی صورت میں لوگوں کو لڑواتا تھا جب فرشتے نظر آئے تو بھاگا۔ سورۃ الانفال میں اس کا ذکر گزر چکا ہے، یہ منافقوں کی مثال ہے۔ انتہی[1]

فتح البیان کا بیان:

﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ میں خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے یا اس شخص کو جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ﴿ اَلَّذِیْنَ نَافَقُوْا ﴾ سے مراد عبداللہ بن ابی ابن سلول اور اس کے ساتھی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اور رفاعہ بن تابوت، عبداللہ بن نبتل اور اوس بن قیظی۔[1] (رواہ ابن مردویہ)۔ جملۂ ﴿ یَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ ﴾ مستانفہ ہے اس شے کے بیان کے لیے ہے جس سے تعجب کیا گیا ہے اور حرفِ لام تبلیغ کا لام ہے۔ بجائے "قَالُوْا" جو مضارع کا صیغہ فرمایا تو اس سے منظور صورت کو سامنے لانا ہے، یا استمرار کا بتانا ہے۔ ﴿ اِخْوَانِهِمُ ﴾ سے مراد بنی نضیر ہیں۔[2] (کما قالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما)

ان کو منافقین کا بھائی ٹھہرایا، اس لیے کہ کفر نے ان کو اکٹھا کر دیا ہے، اگرچہ ان کے کفر کی قسم مختلف ہے، چنانچہ وہ کفر میں بھائی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ قول بنی نضیر کا ہے بنی قریظہ کے لیے، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ بنی نضیر اور بنی قریظہ دونوں یہود ہیں اور منافقین ان کے غیر ہیں۔ ﴿ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ ﴾ مقولہ ہے قول کا اور حرفِ لام توطیہ قسم کا ہے، اس کو موذنہ بھی کہتے ہیں۔ أَيْ: وَاللّٰهِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ. ﴿ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ﴾ قسم کا جواب ہے ﴿ اَبَدًا ﴾ نفی کا ظرف ہے منفی کا نہیں ہے۔

﴿ وَاِنْ قُوْتِلْتُمْ ﴾ سے توطیہ قسم کا لام حذف کیا گیا ہے۔ یہ حذف کلامِ عرب میں قلیل ہے اور کثیر اس کا اثبات ہے۔ اگرچہ یہ بات ہے لیکن چونکہ ﴿ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ ﴾ گزر چکا ہے اور خود اس کے جواب میں ﴿ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ﴾ کا حرفِ لام ہے، اس لیے یہاں اس کا حذف بہت حسین ہے۔ معنی یہ ہیں کہ او مخاطب! کیا تو ان منافقوں کے حال سے تعجب نہیں کرتا کہ وہ اپنے بھائیوں سے جو اہلِ کتاب میں سے ہیں، یہ کہتے ہیں: قسم ہے اللہ کی! اگر تم اپنے گھروں سے نکالے جاؤ گے تو ہم بھی تمھاری ہمراہی میں اپنے گھروں سے نکلیں گے اور تمھارے بارے میں کسی کا کہنا نہ مانیں گے، یعنی ان لوگوں میں سے جو ہم کو تمھارے ساتھ نکلنے سے منع کریں گے گو زمانہ دراز ہی کیوں نہ ہو۔ پھر جب انِ کے ساتھ نکلنے کا وعدہ کیا تو اُن کی مدد کرنے کا بھی ان کو وعدہ دیا اور یوں کہا: قسم ہے اللہ کی! اگر تم سے لڑائی کی جائے گی تو البتہ ہم تمھارے دشمنوں پر تمھاری مدد کریں گے۔

اللہ پاک نے ان سب باتوں میں ان کی تکذیب کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾

---

[1] الدر المنثور (۸/۱۱۵) [2] الدر المنثور (۸/۱۱۵)

یعنی اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ البتہ اس بات میں جھوٹے ہیں جس کا ان کو وعدہ دیا کہ ان کے ساتھ نکلیں گے اور ان کی مدد کریں گے، غرضیکہ انھوں نے جو تین باتوں کا جھوٹا وعدہ کیا تھا یہ تو ان کی اجمالی طور پر تکذیب ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹے وعدوں کی تفصیل فرمائی: ﴿ لَئِنْ أُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ﴾ یعنی البتہ اگر وہ یہودی نکالے جائیں گے تو یہ منافق ان کے ساتھ نہ نکلیں گے۔ یہ ان کی پہلی بات کی تکذیب ہے۔

﴿ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ﴾ یعنی اور البتہ اگر ان سے لڑائی کی جائے گی تو یہ ان کی مدد نہ کریں گے۔ یہ ان کی تیسری بات کی تکذیب ہے۔ رہی دوسری بات تو اس کی تکذیب کا ذکر تفصیل میں نہیں ہوا، اس لیے کہ وہ تو صرف پہلی بات کا تتمہ تھی۔ اس میں نبوت کی صحت پر دلیل ہے، اس لیے کہ یہ غیب کی خبر دینا ہے اور یہ اس پر مبنی ہے کہ آیت واقعہ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور نظم قرآنی بھی اسی پر دال ہے، کیوں کہ "إِنْ" کا کلمہ مستقبل کے لیے ہے۔ اور قرآن مجید کا اعجاز اس لحاظ سے ہے کہ غیب کی خبر دے اور جیسی خبر دے ویسا ہی واقع ہوا، اس لیے کہ جو یہود نکالے گئے، یعنی بنی نضیر اور اُن کے ساتھی۔ ان کے ساتھ منافق نہیں نکلے اور جن یہود سے لڑائی کی گئی، یعنی بنی قریظہ اور اہلِ خیبر ان کی منافقوں نے مدد نہ کی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بنی عوف بن حارث کا ایک گروہ جن میں عبد اللہ بن ابی بن سلول و ودعیہ بن مالک وسوید و داعس ہیں، انھوں نے بنی نضیر کو کہلا بھیجا کہ تم ثابت قدم رہو اور رکے رہو۔ پس بے شک ہم تم کو دشمن کے حوالے نہ کریں گے اور اگر تم سے لڑائی کی جائے گی تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے۔ پس بنی نضیر نے ان کی مدد کا انتظار کیا اور انھوں نے مدد نہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ ان کو جلا وطن کر دیں اور ان کا خون بہانے سے باز رہیں، اس شرط پر کہ جس شے کو ان کے اونٹ لاد لیں وہ اُن کے لیے ہے سوائے ہتھیاروں کے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تو ان میں سے ہر شخص اپنے گھر کو گراتا تھا اور اس کو اپنے اونٹ کی پشت پر رکھتا، پھر اس کو لے جاتا تھا۔ پس وہ خیبر کی طرف نکلے اور ان میں سے کچھ لوگ شام کی طرف روانہ ہوئے۔[1] (أخرجه ابن إسحاق وغيره)

﴿ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾ (﴿ لَيُوَلُّنَّ ﴾ میں ضمیر یہودی کی طرف راجع ہے جیسے کہ ﴿ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾ میں انہی کی طرف راجع ہے۔ یہ قول تو محلی کا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ دونوں ضمیریں منافقوں کی طرف پھرتی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان میں سے ہر ضمیر یہود و منافقین کے مجموعہ کی طرف ایک ساتھ راجع ہے) یہ کلام تیسری بات کے تتمۂ تکذیب سے ہے۔ "أَيْ: لَئِنْ جَاءُوا لَنَصَرَهُمْ"[3] (قاله المحلي) یعنی اگر وہ منافق یہود کی مدد کے لیے آئیں گے تو البتہ بھاگتے ہوئے پیٹھ دیں گے۔ کسی نے کہا: "لَوْ قَدَرَ وُجُوْدَ

[1] الدر المنثور (١١٥/٨) [2] تفسير الجلالين (٧٣٢/١) [3] تفسير الجلالين (٧٣٢/١)

نَصْرِهِمْ إِيَّاهُمْ" (یہ تاویل اس لیے کی ہے کہ جس شے کی اللہ نے نفی فرمائی اس کا وجود میں آنا جائز نہیں) یعنی اگر منافقین کے یہود کی نصرت کرنے کا وجود مقدر کیا جاتا تو وہ پیٹھ دے کر بھاگتے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر وہ یہود کی مدد کا قصد کرتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگتے، پھر یہود مدد نہ کیے جائیں گے اور نہ منصور ہوں گے جبکہ ان کے ناصر یعنی منافقین منہزم ہو گئے[1] (یعنی بھاگ گئے)۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد منافق منصور نہ ہوں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو ذلیل کرے گا اور ان کا نفاق ان کو کچھ فائدہ نہ دے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ "لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ طَائِعِيْنَ وَلَئِنْ نَصَرُوْهُمْ مُكْرِهِيْنَ لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ" یعنی وہ ان کی خوشی ہو کر مدد نہ کریں گے اور اگر زبردستی سے ان کی مدد کریں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ﴾ کے معنی ہیں: "لَا يَدُوْمُوْنَ عَلٰى نَصْرِهِمْ" یعنی ان کی نصرت پر ہمیشگی نہ کریں گے۔ بعض نے دوسرے معنی کو زیادہ بہتر کہا ہے اور ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ ﴾ [الأنعام: ٢٨] کے باب سے ٹھہرایا ہے۔

﴿ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ ﴾ یہ جملہ معنی میں گویا ﴿ لَيُوَلُّنَّ ﴾ کی تعلیل ہے یعنی وہ پیٹھ دے کر بھاگیں گے، اس لیے کہ اے مسلمانوں کی جماعتو! تم از روئے خوف و ڈر منافقوں کے یا یہود کے یا دونوں کے سینوں پر بہت سخت ہو اللہ تعالیٰ کی رہبت سے۔ اس میں ان کے نفاق پر دلالت ہے، یعنی وہ تمھارے سامنے ظاہری طور پر تو اللہ تعالیٰ کا خوف ظاہر کرتے ہیں، حالاں کہ ان کے سینوں میں تمھارا خوف زیادہ ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے۔ یہاں ﴿ رَهْبَةً ﴾ مصدر مجہول بہ معنی "مَرْهُوْبِيَّة" ہے، اس لیے کہ مخاطب لوگ "مَرْهُوْبٌ مِنْهُمْ" ہیں "رَاهِبِيْنَ" نہیں ہیں۔ ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴾ یعنی مخاطبین کا یہ خوف اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اس سبب سے ہے کہ وہ ایک ایسی قوم ہے جو کسی شے کو نہیں سمجھتی۔ اگر ان کو کچھ سمجھ ہوتی تو جان لیتے کہ اللہ پاک ہی ہے جس نے تم کو ان پر مسلط کر دیا تو وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے خوف کیا جائے تم اس کے مستحق نہیں ہو۔

پھر اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ وہ بڑے بزدل ہیں اور ان کی لڑائی کمزور ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ﴾ یعنی یہود و منافق تم سے لڑنے کے لیے جمع ہو کر میدان میں نہ آئیں اور نہ وہ اس پر قدرت رکھتے ہیں مگر بستیوں میں جن کی بڑے بڑے دروازوں اور گھروں اور خندقوں سے مضبوطی کی گئی ہے یا دیواروں کے پیچھے سے جن کے ساتھ وہ چھپتے ہیں وہ ایسا بزدلی اور خوف کے مارے کرتے ہیں۔ جمہور نے ﴿ جُدُرٍ ﴾ بہ جمع پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ابن محیصن، ابن کثیر اور ابو عمرو نے) "جدار" صیغۂ واحد سے پڑھا ہے۔ پہلے کو امام ابو حاتم اور ابو عبید رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، اس لیے کہ وہ

---

[1] فتح القدير (٥/٢٧١)

﴿ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ ﴾ کے مطابق ہے اور دونوں سبعیہ ہیں۔ اور کسی نے (یعنی بعض مکیین نے) ”جدر“ بہ فتحِ جیم وسکونِ دال پڑھا ہے یہ ”جدار“ میں ایک لغت ہے۔[1]

﴿ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ﴾ (بیضاوی میں یہ قول ”لا یقاتلونکم“ کی طرف راجع ہے، یعنی ان کا تمھارے قتال سے عاجز ہونا ان کی بزدلی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ وہ انتہائی قوت اور شجاعت میں ہیں، جب وہ آپس میں لڑتے ہیں، لیکن جب تم سے لڑتے ہیں تو اس خوف کی وجہ سے جو تمھارا ان کے دلوں میں ہے، وہ ضعیف اور بزدل ہو جاتے ہیں)[2] یعنی بعض ان کے بعض پر سخت گو اور درشت خو ہیں اور ان کے دل مختلف ہیں اور ان کی نیتیں بھی ایک دوسرے سے دور ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: مراد ان کے دلوں کا اختلاف ہے، یہاں تک کہ وہ ایک بات پر متفق نہیں ہوتے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی آپس کی لڑائی، کلام اور وعید کے ساتھ سخت ہے، وہ کہتے ہیں البتہ ہم ایسا کریں گے، ویسا کریں گے۔[3] معنی یہ ہیں کہ جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو اپنے نفوس کو شدت اور بأس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جب دشمن سے ملتے ہیں تو ذلیل اور عاجز ہوتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی لڑائی بہ نسبت اپنے ہمسروں کے سخت ہے اور ان کا جو ضعف ہے وہ تمھاری نسبت کر کے ہے اس رعب کے سبب سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے اس آیت کی دلیل سے: ﴿ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ﴾ اس لیے کہ یہ اس پر دال ہے کہ ان کا جو اجتماع ہے وہ صرف ظاہری طور پر ہے اور دلوں کے باطن میں باہمی اختلاف موجود ہے، یہ اختلاف ان کے آپس کے باس کا ہے جس کو شدید کہا گیا ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو یہود اور منافقوں کو اکٹھا خیال کرتا ہے اور دل ان کے شتی ہیں، یعنی ان کے عقائد کے افتراق اور ان کے مقاصد کے اختلاف کی وجہ سے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ مراد منافق ہیں۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکین اور اہلِ کتاب ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: تو اُن کو ایک امر اور رائے پر اکٹھا خیال کرتا ہے اور ان کے دل متفرق ہیں، پس اہلِ باطل کی رائیں مختلف ہیں ان کی شہادت مختلف ہے، ان کی خواہشیں مختلف ہیں اور وہ اہلِ حق کی دشمنی میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ مشرکین ہیں۔[5]

جملۂ ﴿ وَقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ﴾ حالیہ ہے، یا مستانفہ ہے، اس سے مقصود ان کے دلوں کے متفرق ہونے کی خبر دینا ہے۔ ﴿ شَتّٰى ﴾ کے معنی ہیں متفرق۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ”قُلُوبُهُمْ أَشَتُّ“ پڑھا ہے ”أَيْ: أَشَدُّ اخْتِلَافًا“[6] اور جمہور نے ﴿ شَتّٰى ﴾ کو بلاتنوین پڑھا ہے اس لیے کہ الف تانیث کا ہے ﴿ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا

---

[1] تفسير القرطبي (٣٥/١٨) [2] تفسير البيضاوي (٣٢٢/٥) [3] تفسير القرطبي (٣٦/١٨)

[4] تفسير الطبري (٢٩٢/٢٣، ٢٩٣) تفسير القرطبي (٣٦/١٨) [5] الدر المنثور (١١٦/٨) [6] تفسير الطبري (٢٩٣/٢٣)

﴿ يَعْقِلُوْنَ ﴾ یعنی یہ اختلاف اور تشتت اس سبب سے ہے کہ وہ ایک ایسی قوم ہیں جو اُن میں سے کسی شے کو نہیں سمجھتے جن میں ان کی بھلائی اور درستی ہے۔ اس لیے کہ دلوں کا متشتت ہونا، ان کے قویٰ کو کمزور کر دیتا ہے اور اگر وہ عقل رکھتے تو حق کو پہچان لیتے اور اس کے پیرو ہو جاتے۔

نکتہ:

پہلے خاص کر کے ﴿ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴾ فرمایا اور دوسری جگہ ﴿ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴾ فرمایا، اس کی یہ وجہ ہے کہ پہلا تو ﴿ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ سے متصل ہے، یعنی اس لیے کہ وہ ظاہر شے کو سمجھتے ہیں نہ اس کے باطن کو اور فقہ ظاہر اور باطن کی معرفت ہے تو وہاں فقہ کی نفی کرنا مناسب ہوا اور دوسرا ﴿ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ﴾ سے متصل ہے، اس لیے کہ اگر وہ عقل رکھتے تو حق پر اکٹھے ہو جاتے، پس یہاں عقل کی نفی مناسب ہے (كذا قال الكرخي)

بالجملہ اس آیت سے مقصود مومنوں کا دلیر کرنا ہے اور ان سے لڑنے کے لیے ان کے دلوں کا بہادر کرنا ہے۔

﴿ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی "أَيْ: مَثَلُهُمْ"، مثل سے مراد صفت اور حال ہے جو غرابت میں مثل کی مانند ہے۔ ﴿ اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ سے مراد کفار مشرکین و اہلِ مکہ ہیں۔ ﴿ قَرِيْبًا ﴾ فعل محذوف کا ظرف ہے: "أَيْ: يُشْبِهُوْنَهُمْ فِيْ زَمَنٍ قَرِيْبٍ" یا ﴿ ذَاقُوْا ﴾ اس میں عامل ہے۔ "أَيْ: ذَاقُوْا فِيْ زَمَنٍ قَرِيْبٍ"، معنی یہ ہیں کہ بنی نضیر کا عجیب حال اپنے کفر کی سزا پانے میں ان لوگوں کے حال کی طرح ہے جو اُن سے پہلے ہیں، یعنی مشرکینِ مکہ جنھوں نے زمانۂ قریب میں بدر کے دن اپنے کفر کا برا انجام اس طرح چکھا کہ دنیا میں قتل ہوئے اور اس کے باوجود ان کے لیے آخرت میں عذابِ الیم ہے۔

زمانۂ قریب اس لیے فرمایا کہ بدر کا واقعہ ۲ ہجری ماہِ رمضان میں ہوا اور بنی نضیر کا واقعہ ۴ ہجری ماہ ربیع الاول میں واقع ہوا، دونوں میں تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت ہے۔ ایک قول تو یہ ہوا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا یہ قول ہے کہ بدر کا واقعہ بنی نضیر سے چھے مہینے پہلے ہوا۔[1] کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ "مثل"، بنی قریظہ کی بنی نضیر کی مثل کی طرح ہے دونوں میں دو برس کی مدت ہے (یہ قول خازن میں ہے،[2] بنی قریظہ کا واقعہ ۵ ہجری میں ہوا۔ كما في خاتمة مجمع البحار)۔

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد بنونضیر ہیں۔ (قاله قتادة) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد بنوقریظہ ہیں۔ (قاله الضحاك) (یہ دونوں قول فتح القدیر و فتح البیان میں منقول ہیں، مگر ان کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا ہے)۔[3] کسی نے کہا ہے کہ یہ ہر اس شخص کے بارے میں عام ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کے کفر کی وجہ سے انتقام لیا۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

[1] فتح القدير (٥/٢٧٢) [2] تفسير الخازن (٧/٦٦) [3] فتح القدير (٥/٢٧٢) فتح البيان (١٤/٦٠)

پھر اللہ پاک نے یہود و منافقوں کی ایک اور مثل ذکر فرمائی: ﴿ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسٰنِ اكْفُرْ ﴾ خبر ہے مبتدائے محذوف کی "أَيْ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ" یا اس مبتداء کی دوسری خبر ہے جو ﴿ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ ﴾ کے قبل مقدر ہے برتقدیر اس کے کہ حرفِ عطف کو حذف کر دیا ہے، جیسے کہتے ہو: "أَنْتَ عَاقِلٌ أَنْتَ كَرِيْمٌ أَنْتَ عَالِمٌ" کسی نے کہا ہے کہ پہلی مثل تو یہود کے ساتھ خاص ہے اور دوسری منافقوں کے ساتھ خاص ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مثل ثانی بیان ہے مثل اول کا۔

شیطان سے مراد حقیقت شیطان ہے۔ شیطانِ انس مراد نہیں ہے اور انسان سے مراد یہاں اس شخص کی جنس ہے جس نے شیطان کی اطاعت کی انسان کی نوع سے، جیسا کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں انسان سے مراد سارے لوگ ہیں شیطان کے دھوکا دینے میں ان کو۔[1] کسی نے کہا کہ مراد ابوجہل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ بنی اسرائیل میں سے ایک عابد تھا شیطان نے اس کو کفر پر آمادہ کیا تو اس نے اس کا کہا مانا یہ شخص برصیصا ہے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ بالجملہ یہود کو لڑائی پر اُبھارنے اور پھر اُن کی مدد نہ کرنے میں منافقوں کی مثال شیطان کی طرح ہے کہ جب اس نے انسان سے کہا ہے کہ کافر ہو جا، یعنی اس کو کفر پر آمادہ کیا اور کفر کو اس کے لیے اچھا کر دکھایا۔

﴿ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ ﴾ یعنی پھر جب وہ انسان شیطان کی بات مان کر اور اس کی تزئین کو قبول کر کے کافر ہو گیا تو شیطان بولا: بے شک میں تجھ سے بے زار ہوں۔ اگر انسان سے جنس مراد لی جائے تو یہ شیطان کا بے زار ہونا قیامت کے دن ہوگا۔ اس سے اس خوف سے بے زار ہوگا کہ کہیں عذاب میں اس کا شریک ہو جس طرح کہ یہ قول اسی بات کی خبر دیتا ہے: ﴿ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اور اگر انسان سے مراد ابوجہل لیا جائے تو ﴿ اُكْفُرْ ﴾ سے مراد ابلیس کا یہ قول ہوگا جو اس نے بدر کے دن کہا تھا: ﴿ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [الأنفال: ٤٨] "میں تو تم سے بری ہوں میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے، میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔"

بالجملہ ﴿ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ﴾ کا جملہ انسان کے کافر ہو جانے کے بعد اس سے بیزار ہونے کی تعلیل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ شیطان کا یہ کہنا کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اپنی حقیقت پر نہیں ہے یہ تو از راہِ کذب وریا انسان سے براءت کرنے کے لیے ہے ورنہ وہ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا۔ تو اب یہ تاکید ہوگی: ﴿ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ ﴾ کی۔ جمہور نے ﴿ اِنِّيْٓ ﴾ کو بہ سکونِ یاء پڑھا ہے بنا بر حال اور کسی نے (یعنی نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو) بہ فتحِ یاء پڑھا ہے۔ ﴿ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ ﴾ یعنی پھر انجام شیطان کا اور اس انسان کا جو کافر ہوا کہ دونوں جانے والے ہیں طرف نار کی، ہمیشہ رہیں گے اس میں۔ جمہور نے ﴿ عَاقِبَتَهُمَآ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے بنا بر خبر "كَانَ"

---

[1] تفسير القرطبي (١٨/٤٢)

اور ﴿ اَنَّهُمَا فِی النَّارِ ﴾ اسم ہے اور کسی نے (یعنی حسن اور عمرو بن عبید) بہ رفع پڑھا ہے اس بنا پر کہ ''کان'' کا اسم ہے اور مابعد خبر ہے اور ﴿ خٰلِدَیْنِ ﴾ کو جمہور نے بہ نصب بنا بر حال اور کسی نے (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام اعمش، زید بن علی اور ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ نے) بہ رفع پڑھا ہے بنا بر خبر ''أَنّ'' اور ظرف اس سے متعلق ہے۔[1] ﴿ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ﴾ یعنی یہ ہمیشہ آگ میں رہنا ظالمین کا بدلہ ہے اور یہ لوگ ان میں بدرجۂ اُولیٰ داخل ہیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرد کسی صومعہ میں عبادت کیا کرتا تھا اور ایک عورت کے کئی بھائی تھے، چنانچہ اس عورت کو کوئی شے عارض ہوگئی، یعنی کچھ جنون سا ہوگیا تو اس کے بھائی اس کو اس عابد کے پاس لائے، چنانچہ اس کے نفس نے اس کے لیے یہ کام اچھا کر دکھایا کہ اس عورت سے زنا کرے، چنانچہ وہ حاملہ ہوگئی تو اس کے پاس شیطان آیا اور کہا کہ تو اس کو مار ڈال، کیوں کہ اگر اس کے بھائیوں کو اس کا پتا چل گیا تو وہ تیری بے عزتی کریں گے۔ چنانچہ اس نے اس کو مار ڈالا اور دفن کر دیا، پھر وہ اس کے پاس آئے اور اس کو پکڑا، پھر اسے لے گئے۔ اس اثنا میں کہ وہ جا رہے تھے کہ شیطان اس کے پاس آیا اور کہا: بے شک میں نے ہی تیرے لیے اچھا کر دیا تھا، اب تو مجھے ایک سجدہ کر لے، میں تجھے بچالوں گا، چنانچہ اس نے اس کو سجدہ کر لیا۔ تو یہ وہی اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ كَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ... الآیة ﴾۔[2] (أخرجه أحمد في الزهد و البخاري في تاريخه والحاكم و صححه والبيهقي وغيرهم)

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ یہ اس پر دال نہیں ہے کہ آیت سے مقصود یہی انسان ہے، بلکہ اس پر دال ہے کہ یہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جن پر آیت صادق آتی ہے۔ (وقد أخرجه ابن أبي حاتم عن ابن عباس رضی اللہ عنہما بأطول من هذا وليس فيه ما يدل على أنه مقصود بالآية و أخرجه بنحوه ابن جرير عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ)[3] ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار اور منافقین کی مثال بیان کی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے شیطان کی مثال کی طرح کہ جب انسان سے کہا: کافر ہو جا۔[4] (أخرجه ابن مردويه۔ كذا في الفتح)

منافقوں کا بنونظیر سے جھوٹا وعدہ:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقوں کی خبر دیتا ہے جیسا کہ عبداللہ بن ابی اور اس جیسے اور منافق جبکہ انھوں نے بنی نضیر کے یہود کو اپنی طرف سے مدد کا وعدہ دے کر پیغام بھیجا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ نَافَقُوْا ... الآیة ﴾ پھر فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ یعنی اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ منافق البتہ جھوٹے ہیں اس بات میں جس کا ان سے وعدہ کیا، یا تو اس لیے کہ ان سے ایک بات کہہ دی اور ان کی نیت یہ تھی کہ

---

[1] فتح القدير (٥/٢٧٣) [2] مستدرك الحاكم (٢/٥٢٦) شعب الإيمان (٤/٣٧٣) الدر المنثور (٨/١١٦، ١١٧)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٤٨) تفسير الطبري (٢٣/٢٩٥) فتح البيان (١٤/٦١، ٦٢)
[4] الدر المنثور (٨/١١٩) فتح البيان (١٤/٥٧-٦٢)

اس کو ان کے لیے پورا نہ کریں گے، یا اس لیے کہ جو بات ان سے کہی وہ ان سے واقع نہ ہو گی، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ﴾ یعنی اگر وہ لڑائی کیے جائیں گے تو یہ منافق ان کے ساتھ ہو کر نہ لڑیں گے۔ ﴿ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ﴾ یعنی اگر یہ منافق ان کے ساتھ ہو کر لڑیں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ ﴿ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾ یہ بہ نفسہ ایک مستقل بشارت ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ یعنی ان کو جتنا خوف اللہ تعالیٰ کا ہے اس سے بڑھ کر تمھارا خوف ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ﴾ [النساء: ٧٧] ''اسی وقت ان کی ایک جماعت لوگوں سے اس قدر ڈرنے لگی جیسے اللہ تعالیٰ کا ڈر ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ نیز اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ﴾ [الأنعام: ٦٥] ''اور تمھارے ایک کو دوسرے کی لڑائی چکھا دے۔'' اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ﴾ یعنی تو ان کو اکٹھے دیکھتا ہے اور ان کو باہم الفت رکھنے والے خیال کرتا ہے، حالانکہ وہ حد درجہ آپس میں اختلاف رکھنے والے ہیں۔ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اہلِ کتاب اور منافقین ایسے ہیں۔ ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴾

پھر فرمایا: ﴿ كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ امام مجاہد، سدی اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ نے کہا: یعنی اس شے کی مثال کی طرح جو کفارِ قریش کو بدر کے دن پہنچی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ سے مراد بنی قینقاع کے یہود ہیں (یہ واقعہ ۲ ہجری نصف ماہ شوال میں ہوا۔ على ما في مجمع البحار)۔ اسی طرح امام قتادہ اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[1] یہ قول زیادہ صحیح لگتا ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے قبل بنی قینقاع کے یہود کو جلا وطن کر دیا تھا۔

منافقوں اور یہودیوں کے باہمی تعلقات کی مثال:

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ ﴾ یعنی ان منافقوں سے دھوکا کھانے میں جنھوں نے ان کو مدد کا وعدہ دیا اور یہ کہا: ﴿ وَاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ﴾ پھر جب حقائق ثابت ہو گئے اور ان پر محاصرہ اور جنگ سخت ہو گئی تو ان سے الگ ہو گئے اور ان کو ہلاکت کے سپرد کر دیا، اس معاملے میں ان کی مثال شیطان کی طرح ہے کہ جب اس نے انسان کو کفر اچھا کر دکھایا۔ والعیاذ باللّٰہ۔ پھر جب وہ اس شے میں داخل ہو گیا جس کو اس کے لیے اچھا کر دکھایا تھا تو اس سے بے زار ہوا اور صاف نکل گیا اور کہا: ﴿ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یہاں بعض نے بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں کا قصہ بیان کیا ہے، وہ اس مثال کی طرح ہے نہ یہ کہ وہی اس

[1] تفسير الطبري (٢٩٣/٢٣) تفسير ابن كثير (٤٣٥/٤)

کی مثال ہے، بلکہ وہ اس قسم کی مثالوں میں سے ہے، دوسرے واقعات کے ساتھ جو اس طرح کے ہیں۔

پھر سیدنا علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت سے بہ تخریج ابن جریر اس قصے کو ذکر کیا ہے، الفاظ اور عبارت میں فرق ہے۔[1] پھر کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام طاؤس اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک مشہور ہے کہ یہ عابد برصیصا ہے۔ واللہ أعلم۔ یہ قصہ جریج عابد کے قصے سے مختلف ہے، اس لیے کہ ایک زانیہ عورت نے جریج کو اپنے نفس کے ساتھ تہمت لگائی اور دعویٰ کیا کہ اس کا حمل اس سے ہے اور اس کا مقدمہ حاکم کی طرف پہنچایا۔ چنانچہ اس نے حکم دیا تو جریج اپنے صومعہ (عبادت گاہ) سے اتارا گیا اور اس کا صومعہ خراب کر دیا گیا اور وہ یہ کہتا تھا کہ "مَالَکُمْ مَالَکُمْ" یعنی تم کو کیا ہوا ہے، وہ بولے: او اللہ کے دشمن! تو نے اس عورت سے ایسا ایسا کیا تو جریج نے کہا: تم صبر کرو، پھر اس کے بیٹے کو پکڑا، وہ بہت ہی ذرا سا تھا اور کہا: او لڑکے! تیرا باپ کون ہے؟ وہ بولا کہ میرا باپ راعی ہے۔ اس عورت نے راعی کو اپنے نفس پر قابو پانے دیا تھا تو وہ اس سے حاملہ ہو گئی، پھر جب بنی اسرائیل نے یہ دیکھا تو سب نے اس کی بہت زیادہ تعظیم کی اور کہا کہ ہم تیرے صومعہ کو سونے سے پھر بنا دیں گے، کہا: نہیں، بلکہ تم اس کو پھر مٹی سے بنا دو، جیسا کہ وہ تھا۔[2]

بالجملہ جب اس سورت میں منافقین اور یہود کا پورا وصف ہو چکا تو اللہ پاک نے مومنین کو خطاب کرنے کی طرف رجوع کیا اور ان کو موعظۂ حسنہ کے ساتھ وعظ کیا، اس لیے کہ مصیبت کے بعد وعظ دلوں پر زیادہ اثر کرتا ہے دلوں کے نرم ہونے کے سبب سے اور اس شے سے ڈرنے کی وجہ سے جو سزا کی موجب ہوتی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١٩﴾ لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٢٠﴾ لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۚ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١﴾ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۖ هُوَ الرَّحْمَٰنُ

[1] ان کی تخریج زیر تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٠) تفسير ابن كثير (٤/٤٣٤-٤٣٦)

الرَّحِيْمُ ﴿٢٢﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ
الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ
الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٢٣﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ
الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٤﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور (ہر) شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے اور تم اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ کو خوب خبر ہے جو تم عمل کرتے ہو ⑱ اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، تو اللہ نے انھیں اپنا آپ بھلوا دیا، یہی لوگ نافرمان ہیں ⑲ آگ والے (دوزخی) اور باغ والے (جنتی) کبھی برابر نہیں ہو سکتے، جنتی ہی کامیاب ہیں ⑳ (اے نبی!) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا (اور) پھٹ جاتا، اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں، شاید کہ وہ غور وفکر کریں ㉑ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے، وہ رحمان ہے، رحیم ہے ㉒ اللہ وہ ہستی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ ہے، نہایت پاک، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان، زبردست، زور آور، بڑائی والا، پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں ㉓ وہ اللہ ہے، خالق ہے، موجد، صورت گر، اسی کے لیے ہیں اسمائے حسنیٰ، اسی کی تسبیح پڑھتی ہے، جو چیز آسمانوں اور زمین میں ہے، اور وہ غالب ہے، خوب حکمت والا ㉔

تقوے اور آخرت کی تیاری کا حکم:

اللہ نے بھی ان کو اپنی جانوں سے غافل کر دیا یعنی اپنے جی کے بچاؤ کی فکر نہ کی (فکر مؤنث و مؤنث بولا جاتا ہے لکھنو والے مؤنث بولتے ہیں اس پر لکھنوی کہتے ہیں: دے کے دل فکرِ پیش و پس کیسی۔ ابتداء انتہا نکالی ہے۔ داغ دہلوی فرماتے ہیں:

قرار آ ہی گیا غم میں جی سنبھل ہی گیا   گئے وہ دن جو تھا فکر جان جانے کا

۔كذا في أرمغان۔ احبابِ رسالہ مذکر و مؤنث منشی قادر علی صفی پوری، سلمه الله تعالیٰ، شاہ عبد القادر

صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے ترجمۂ خاص میں یوں ہے: بچاؤ کا فکر نہ کیا)۔ یعنی کافروں کے دل بڑے سخت ہیں کہ یہ کلام سن کر ایمان نہیں لاتے، وہ کلام اگر پہاڑ سمجھے تو وہ بھی دب جائے۔

منذر بن جریر اپنے باپ سے راوی ہیں کہ ہم دن کے شروع میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے کہ ایک قوم آئی جو ننگے پاؤں اور ننگے بدن تھے صرف مخطط (لکیروں والی) چادریں یا عبا پہنے ہوئے، تلواریں گلے میں ڈالے ہوئے۔ ان میں سے عام لوگ بلکہ سب لوگ مضر قبیلے میں سے تھے۔ نبیِ مکرم ﷺ نے جب ان کی فاقہ زدہ حالت دیکھی تو آپ ﷺ کا چہرہ متغیر ہو گیا، پھر آپ ﷺ اندر گئے، پھر باہر آئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا، انھوں نے اذان دی اور تکبیر کہی، چنانچہ آپ ﷺ نے نماز پڑھی، پھر خطبہ دیا تو فرمایا: ﴿ يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴾ [النساء: ١] ''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں، اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور رشتے ناطے توڑنے سے بھی بچو، بے شک اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے۔''

اور وہ آیت پڑھی جو سورۃ الحشر میں ہے: ﴿ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ﴾ تو لوگوں نے اپنے دینار سے، اپنے درہم سے، اپنے کپڑے سے، اپنے صاع گندم سے، اپنے صاع خرما سے صدقہ دیا، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگرچہ کھجور کا ٹکڑا ہو۔ پھر ایک انصاری شخص ایک تھیلی لے کر آیا، قریب تھا کہ اس کی ہتھیلی اسے اٹھائے ہوئے عاجز ہو جائے، بلکہ وہ عاجز ہو گئی۔ پھر لوگ لاتے رہے، یہاں تک کہ میں نے کھانے اور کپڑوں کے دو ڈھیر دیکھے، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک چمک رہا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: جس کسی نے اسلام میں کوئی نیک طریقہ نکالا تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اور اس شخص کا اجر جس نے اس کے بعد اس پر عمل کیا، اس کے اجر میں سے کچھ کم کیے بغیر اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ نکالا تو اس پر اس کا گناہ ہے اور اس شخص کا گناہ جس نے اس پر عمل کیا بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں سے کچھ کم ہو۔[1] (أخرجه الإمام أحمد وانفرد بإخراجه مسلم من حديث شعبة بإسناده مثله)

بالجملہ اللہ پاک نے ﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ میں اپنے تقویٰ کا حکم دیا ہے اور یہ شامل ہے اس شے کے کرنے کو جس کا حکم دیا اور اس شے کے چھوڑنے کو جس سے منع فرمایا۔ ﴿ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تم خود اپنے آپ سے حساب لو اس سے پہلے کہ تم سے حساب لیا جائے اور تم دیکھو کہ تم نے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٧) مسند أحمد (٣٥٧/٤)

اعمالِ صالحہ کا کیا ذخیرہ کیا ہے اپنے نفوس کے لیے جس دن کہ تم مبعوث ہو گے اور اپنے رب کے سامنے پیش کیے جاؤ گے۔ ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ تاکید ثانی ہے پہلے حکم کی۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی تم جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے سارے اعمال و احوال کا جاننے والا ہے، اس سے تمھاری کوئی مخفی شے پوشیدہ نہیں اور نہ تمھارے امور میں سے کوئی بڑی یا چھوٹی اور حقیر شے اس سے غائب ہوتی ہے۔

﴿ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ﴾ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے ذکر کو مت بھولو کہ کہیں اس سے تم اس عملِ صالح کو بھلا دیے جاؤ جو قیامت کے دن تم کو فائدہ دے گا، کیوں کہ جزا جنسِ عمل سے ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ یعنی جو اللہ تعالیٰ کی یاد کو بھولنے والے ہیں وہی اللہ کی اطاعت سے نکلنے والے، قیامت کے دن ہلاک ہونے والے اور زیاں کار ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [المنافقون: ٩]
''اے مسلمانو! تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تمھیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کریں وہ بڑے ہی زیاں کار لوگ ہیں۔''

طبرانی نے نعیم بن نحہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خطبے میں یہ تھا: کیا تم نہیں جانتے ہو کہ تم صبح کو جاتے ہو اور شام کو جاتے ہو ایک مدت معلوم کے لیے اور پس جو کوئی یہ طاقت رکھے کہ اجل کم کی جائے اس حال میں کہ وہ اللہ عزوجل کے اختیار میں ہو تو چاہیے کہ کرے اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے مگر اللہ عزوجل کی مدد سے، بے شک ایک قوم نے اپنی اجلیں اپنے غیر کے لیے ٹھہرائیں۔ اللہ عزوجل نے تم کو منع کیا کہ تم ان کی طرح ہو۔ ﴿ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ﴾ کہاں ہیں وہ جن کو تم اپنے بھائیوں میں سے پہچانتے ہو، وہ آ پہنچے اس شے پر جو انھوں نے آگے بھیجی، ان دنوں کے اعمال میں سے جو گزر گئے اور وہ تنہا رہ گئے بدبختی یا نیک بختی کے ساتھ۔ کہاں ہیں وہ اگلے جبار جنھوں نے شہر بنائے اور دیواروں سے ان کو مضبوط کیا اور خود پتھروں اور کنوؤں کے نیچے ہو گئے۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس کے عجائب فنا نہیں ہوتے سو تم اس سے تاریک دن کے لیے روشنی حاصل کرو اور چلو اس کی روشنی اور بیان میں (اصل کے الفاظ: ''وانتضحوا بسنائه وبيانه'' ہیں، شاید یہ لفظ ''امضوا'' ہو۔ والله أعلم)۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے زکریا علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کی تعریف کی ہے: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩٠] ''یہ لوگ نیک کاموں کی طرف جلدی کرتے تھے اور ہمیں لالچ طمع اور ڈر خوف سے پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔''

اس قول میں کوئی خیر نہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کی خوشنودی حاصل کرنے کا ارادہ نہ ہو اور نہیں ہے کوئی خیر اس مال میں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کیا جاتا اور اس شخص میں کوئی خیر نہیں ہے جس کی جہالت اس کے علم پر غالب ہوتی ہے اور اس شخص میں کوئی خیر نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے حق میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ اسناد جید ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔ جریر بن عثمان کے شیخ نعیم بن نحمہ کو میں نفی اور اثبات سے نہیں پہچانتا، سوائے اس کے کہ ابو داود سجستانی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جریر کے جملہ شیوخ ثقہ ہیں، اس خطبے کے دیگر وجوہ سے بھی شواہد موجود ہیں۔[1] واللّٰه أعلم''

جنتی اور جہنمی برابر نہیں ہیں:

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ﴾ یعنی دوزخ والے اور بہشت والے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حکم میں برابر نہیں ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ [الجاثیة: ۲۱] ''کیا ان لوگوں کا جو برے کام کرتے ہیں، یہ گمان ہے کہ ہم انھیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے کہ ان کا مرنا جینا یکساں ہو جائے، برا ہے وہ جو فیصلہ کر رہے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ۵۸] ''اندھا اور بینا برابر نہیں نہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور بھلے کام کیے بدکاروں کے برابر ہیں، تم (بہت) کم نصیحت حاصل کر رہے ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴾ [صٓ: ۲۸] ''کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے برابر کر دیں گے جو (ہمیشہ) زمین میں فساد مچاتے رہے یا پرہیز گاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے۔'' ان کے سوا اور آیات ہیں جو اس پر دال ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کی عزت کرے گا اور فجار کی اہانت فرمائے گا۔ اسی لیے یہاں فرمایا: ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ یعنی بہشت کے لوگ نجات پانے والے ہیں اور اللہ عزوجل کے عذاب سے سلامت رکھے گئے ہیں۔

عظمتِ قرآن کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ اللہ پاک قرآن پاک کی تعظیم کرتا ہے اور اس کی بلند قدر بیان کرتا ہے اور وہ اس لائق ہے کہ اس کے لیے دل دب جائیں اور

[1] المعجم الکبیر (۶۰/۱) تفسیر ابن کثیر (۴۳۷/۴)

اس کو سن کر پھٹ جائیں، اس لیے کہ اس میں وعدۂ حق اور وعیدِ اکید ہے۔ اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو اس کو دیکھتا کہ اللہ سے ڈر سے دبنے والا اور پھٹنے والا ہے، یعنی جب پہاڑ اپنی سختی اور درشتی کے باوجود ایسا ہے کہ اگر اس قرآن کو سمجھتا، پھر اس شے کو سوچتا جو اس میں ہے تو البتہ اللہ عزوجل کے خوف سے دب جاتا پھٹ جاتا۔ پھر اے انسانو! تم کو یہ کیسے لائق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے تمھارے دل نرم نہ پڑیں اور نہ دبیں اور نہ پھٹیں، حالاں کہ تم اللہ تعالیٰ سے اس کے امر کو سمجھ چکے ہو اور اس کی کتاب کو سوچ چکے ہو۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثٰلُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں مروی ہے (یعنی بروایتِ عوفی) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اگر میں اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتا اور اس پر لادتا تو البتہ وہ پھٹ جاتا اور اس کے بوجھ اور اللہ تعالیٰ کی حشمت سے دب جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حکم دیا کہ جس وقت قرآن ان پر نازل ہو تو سخت ڈر اور خوف کے ساتھ اس کو لیں۔ پھر فرمایا: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثٰلُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾۔ اسی طرح امام قتادہ اور ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[1]

حدیثِ متواتر میں ثابت ہوا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے منبر بنایا گیا اور آپ خطبے کے دن جذوعِ مسجد میں سے ایک جذع کے پاس ٹھہرتے تھے (جذع بالکسر درخت کے تنے کو کہتے ہیں۔ مسجدِ نبوی کے ستون کھجور کے تنے کے تھے، ان میں سے ایک ستون کے پاس کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے تھے، اس کو ستونِ حنانہ کہتے تھے)۔ پھر جب منبر پہلی بار رکھا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھنے کے لیے آئے اور آپ اس جذع سے گزر کر منبر کی طرف گئے تو اس وقت وہ جذع رویا (اصل کے الفاظ "حن الجذع وجعل يئن كما يئن الصبي الذي يسكت" ہیں "أنين و حنين" بہ معنی نالہ و نالیدن ہے، ایک قسم کا بچے کا رونا ٹھنکنا کہلاتا ہے، وہ یہ ہے) اور سسکنے لگا جس طرح وہ بچہ سسکتا ہے جو چپ کرایا جاتا ہے، اس ذکر اور وحی کے سبب سے جس کو اپنے پاس سنا کرتا تھا۔[2] چنانچہ اس حدیث کی بعض روایتوں میں ہے کہ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو لانے کے بعد یوں فرمایا کہ تم زیادہ مستحق ہو اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ مشتاق ہو اس جذع کی نسبت۔[3]

اور اسی طرح یہ آیتِ کریمہ ہے کہ جب سخت پہاڑ اگر اللہ کا کلام سنتے اور اس کو سمجھتے تو دب جاتے اور اس کے خوف سے پھٹ جاتے، پھر تم کیوں کر نہ دبو، حالاں کہ تم سن چکے ہو اور سمجھ چکے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۭ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۭ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ

[1] تفسير الطبري (٢٣/ ٣٠٠، ٣٠١) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٩٠)

[3] صحيح ابن حبان (١٤/ ٤٣٦) تفسير ابن كثير (٤/ ٤٣٨)

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴾ [الرعد: ٣١] ''اگر (بالفرض) کسی قرآن (آسمانی کتاب) کے ذریعے پہاڑ چلا دیے جاتے یا زمین ٹکڑے ٹکڑے کر دی جاتی یا مردوں سے باتیں کرا دی جاتیں (پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے)، بات یہ ہے کہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں تو کیا ایمان والوں پر اس بات پر دلجمعی نہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمام لوگوں کو ہدایت دے دے۔ کفار کو تو ان کے کفر کے بدلے ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی سخت سزا پہنچتی رہے گی یا ان کے مکانوں کے قریب نازل ہوتی رہے گی، تاوقتیکہ وعدۂ الٰہی آ پہنچے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔''

پہلے گزر چکا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ البتہ یہ قرآن ہوتا۔ نیز فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٧٤] ''بعض پتھروں سے تو نہریں بہہ نکلتی ہیں اور بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے اور بعض اللہ کے ڈر سے گر گر پڑتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور بزرگی کا بیان:

پھر فرمایا: ﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ وہ ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر وہ، چنانچہ اس کے سوا نہ کوئی رب ہے اور نہ اس کے سوا وجود کا کوئی معبود ہے اور ہر شے جو اس کے سوا پوجی جاتی ہے، وہ باطل ہے اور وہ عالم الغیب والشہادہ ہے، یعنی ساری کائنات کو جانتا ہے جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کو بھی جانتا ہے جو ہم سے غائب ہے۔ پس اس پر کوئی شے مخفی نہیں زمین میں نہ آسمان میں، نہ کوئی جلیل چیز نہ حقیر چیز نہ کوئی چھوٹی اور نہ بڑی چیز، یہاں تک کہ اندھیروں میں جو ذرات ہیں ان کو بھی جانتا ہے۔

﴿ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾ پر تفسیر کے شروع میں ایسے طور پر کلام گزر چکا ہے کہ یہاں اس کے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ ایسی رحمت والا ہے جو وسیع ہے اور ساری مخلوقات کو شامل ہے، چنانچہ وہ دنیا اور آخرت کا رحمان ورحیم ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ [الأعراف: ١٥٦] ''اور میری رحمت تمام اشیاء پر محیط ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ [الأنعام: ٥٤] ''تمھارے رب نے مہربانی فرمانا اپنے ذمے مقرر کر لیا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾ [یونس: ٥٨] ''آپ کہہ دیجیے کہ بس لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔''

پھر فرمایا: ﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ ﴾ یعنی وہ مالک ہے ساری چیزوں کا، ان میں بغیر روک ٹوک کے تصرف کرنے والا ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا: قدوس بہ معنی طاہر ہے یعنی پاک۔ امام مجاہد اور

قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مبارک۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملائکہ کرام اس کی تقدیس کرتے ہیں، یعنی سارے عیوب اور نقائص سے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، اس کے اپنی ذات وصفات وافعال میں کمال کے سبب سے۔
﴿ اَلْمُؤْمِنُ ﴾ کی تفسیر میں ضحاک کی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت یہ ہے کہ اپنی خلق کو اس سے امن دیا کہ ان پر ظلم کرے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''أَمِنَ بِقَوْلِهِ أَنَّهُ حَقٌّ''، یعنی یہ کہہ کر امن دیا کہ وہ حق ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے مومن بندوں کی ان کے ایمان لانے پر تصدیق کی۔

﴿ اَلْمُهَيْمِنُ ﴾ کے بارے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ اپنی خلق پر ان کے اعمال کا شاہد ہے اس معنی میں کہ وہ ان پر رقیب، یعنی نگہبان ہے،[1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ [المجادلة: ٦] ''اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ [یونس: ٤٦] ''پھر اللہ ان کے سب افعال پر گواہ ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
﴿ اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴾ [الرعد: ٣٣] ''آیا وہ اللہ جو نگہبانی کرنے والا ہے ہر شخص کی، اس کے کیے ہوئے اعمال پر، ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرائے ہیں، کہہ دیجیے ذرا ان کے نام تو لو، کیا تم اللہ تعالیٰ کو وہ باتیں بتاتے ہو جو وہ زمین میں جانتا ہی نہیں، یا صرف اوپری اوپری باتیں بتا رہے ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ کفر کرنے والوں کے لیے ان کے مکر سجا دیے گئے ہیں اور وہ صحیح راہ سے روک دیے گئے ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اس کو راہ دکھانے والا کوئی نہیں۔''

﴿ اَلْعَزِيْزُ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر شے پر غالب ہے، چنانچہ اس کو مقہور کیا ہے اور اشیاء پر غالب ہوا ہے سو اس کی جانبِ عالی کو مارے اس کی عزت، عظمت، جبروت اور کبریائی کے کوئی نہیں پہنچتا، اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اَلْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ﴾ یعنی وہ ایسا ہے کہ صرف اس کے لیے جبریت اور تکبر لائق ہے اس کی عظمت کے لیے، جیسا کہ صحیح میں پہلے گزر چکا ہے کہ «اَلْعَظَمَةُ إِزَارِيْ وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ وَاحِدًا مِنْهُمَا عَذَّبْتُهُ»[2]
امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: جبار وہ ہے جس نے اپنی خلق کو جس شے پر چاہتا ہے مجبور کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی مخلوق کے امور کی اصلاح و درستی کرنے والا ہے۔ ان میں اس شے کے ساتھ تصرف کرنے والا ہے جس میں ان کی بہتری ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر برائی سے متکبر ہے۔[3]

پھر فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾۔ خلق بہ معنی تقدیر ہے، یعنی اندازہ کرنا۔ ''برء'' بہ معنی ''فری''

---

[1] تفسیر الطبري (٢٣/٣٠٢_٣٠٤) تفسیر ابن کثیر (٤/٤٣٨، ٤٣٩)
[2] صحیح مسلم (٢٦٢٠) سنن أبي داود (٤٠٩٠) سنن ابن ماجه (٤١٧٤)
[3] تفسیر الطبري (٢٣/٣٠٤)

ہے۔ ”فري“ تنفیذ کو کہتے ہیں یعنی نافذ کرنا، یعنی جاری کرنا، جس شے کو مقدر ومقرر کیا ہے، اس کو وجود کی طرف باہر لے آیا۔ ہر کوئی جس نے کوئی شے مقدور و مرتب کی ہے، وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ اس کو نافذ کر دے، وجود میں لے آئے سوائے اللہ عزوجل کے۔ شاعر نے کہا ہے: وہ کسی اور کی مدح کرتا ہے۔

وَلَأَنْتَ تَفْرِيْ مَا خَلَقْتَ وَبَعْضُ الْقَوْمِ يَخْلُقُ ثُمَّ لَا يَفْرِيْ

یعنی اے ممدوح! یعنی تو اس شے کو نافذ کرتا ہے جو تو نے مقدر کی اور اندازہ کی اور ٹھہرائی بخلاف اس کے جو تیرا غیر ہے، وہ اس شے کو نہیں کرسکتا جس کا ارادہ کرتا ہے۔ پس ”خلق“ تو تقدیر ہے اور ”فری“ تنفیذ ہے۔ اس معنی سے بولا جاتا ہے: ”قَدَّرَ الْجَلَّادُ ثُمَّ فَرَىٰ أَيْ: قَطَعَ عَلَى مَا قَدَّرَهُ بِحَسْبِ مَا يُرِيْدُهُ“

اب قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلْخٰلِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے کہ جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ اسی دم ہو جاتی ہے اسی صفت پر جس کا ارادہ کرتا ہے اور اسی صورت پر جو پسند فرماتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ﴾ [الانفطار: ۸] ”جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔“ اور اسی لیے فرمایا: ﴿ اَلْمُصَوِّرُ ﴾ یعنی وہ ہے کہ نافذ کرتا ہے اس شے کو جس کی ایجاد کا وہ ارادہ کرتا ہے اس صفت پر جس کا ارادہ فرماتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ پر سورۃ الاعراف میں کلام گزر چکا ہے[1] اور وہ حدیث ذکر کی گئی ہے جو صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں سو میں سے ایک کم، جس شخص نے ان کا احصا کیا (شمار کیا) تو وہ جنت میں داخل ہوا اور وہ وتر ہے وتر کو دوست رکھتا ہے۔[2] ترمذی میں ان ناموں کی صراحت بھی آئی ہے جو نام یہ ہیں: اللہ نہیں کوئی معبود مگر وہی رحمان، رحیم، اَلْمَلِكُ، اَلْقُدُّوْسُ، اَلسَّلَامُ، اَلْمُؤْمِنُ، اَلْمُهَيْمِنُ، اَلْعَزِيْزُ، اَلْجَبَّارُ، اَلْمُتَكَبِّرُ، اَلْخَالِقُ، اَلْبَارِئُ، اَلْمُصَوِّرُ، اَلْغَفَّارُ، اَلْقَهَّارُ، اَلْوَهَّابُ، اَلرَّزَّاقُ، اَلْفَتَّاحُ، اَلْعَلِيْمُ، اَلْقَابِضُ، اَلْبَاسِطُ، اَلْخَافِضُ، اَلرَّافِعُ، اَلْمُعِزُّ، اَلْمُذِلُّ، اَلسَّمِيْعُ، اَلْبَصِيْرُ، اَلْحَكَمُ، اَلْعَدْلُ، اَللَّطِيْفُ، اَلْخَبِيْرُ، اَلْحَلِيْمُ، اَلْعَظِيْمُ، اَلْغَفُوْرُ، اَلشَّكُوْرُ، اَلْعَلِيُّ، اَلْكَبِيْرُ، اَلْحَفِيْظُ، اَلْمُقِيْتُ، اَلْحَسِيْبُ، اَلْجَلِيْلُ، اَلْكَرِيْمُ، اَلرَّقِيْبُ، اَلْمُجِيْبُ، اَلْوَاسِعُ، اَلْحَكِيْمُ، اَلْوَدُوْدُ، اَلْمَجِيْدُ، اَلْبَاعِثُ، اَلشَّهِيْدُ، اَلْحَقُّ، اَلْوَكِيْلُ، اَلْقَوِيُّ، اَلْمَتِيْنُ، اَلْوَلِيُّ، اَلْحَمِيْدُ، اَلْمُحْصِيُّ، اَلْمُبْدِئُ، اَلْمُعِيْدُ، اَلْمُحْيِيْ، اَلْمُمِيْتُ، اَلْحَيُّ، اَلْقَيُّوْمُ، اَلْوَاجِدُ، اَلْمَاجِدُ، اَلْوَاحِدُ، اَلصَّمَدُ، اَلْقَادِرُ، اَلْمُقْتَدِرُ، اَلْمُقَدِّمُ، اَلْمُؤَخِّرُ، اَلْأَوَّلُ، اَلْآخِرُ، اَلظَّاهِرُ، اَلْبَاطِنُ، اَلْوَالِيْ، اَلْمُتَعَالِيْ، اَلْبَرُّ، اَلتَّوَّابُ، اَلْمُنْتَقِمُ، اَلْعَفُوُّ، اَلرَّؤُوْفُ، مَالِكُ الْمُلْكِ، ذُوالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ، اَلْمُقْسِطُ، اَلْجَامِعُ، اَلْغَنِيُّ، اَلْمُغْنِيُّ، اَلْمَانِعُ، اَلضَّارُّ، اَلنَّافِعُ، اَلنُّوْرُ، اَلْهَادِيْ، اَلْبَدِيْعُ، اَلْبَاقِيْ، اَلْوَارِثُ، اَلرَّشِيْدُ، اَلصَّبُوْرُ۔[3] ابن ماجہ میں

---

(1) رقم الآية (۱۸۰) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۵۸۵) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۶۷۷)

(3) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۵۰۷) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۸۶۱)

بھی یہ حدیث ہے اور اس میں کچھ تقدیم وتاخیر اور کمی وزیادتی بھی ہے۔ الغرض ان تمام حدیثوں وغیرہ کا بیان پوری طرح سورت اعراف میں گزر چکا ہے جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہر چیز اللہ تعالیٰ کے لیے تسبیح خواں ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''ساتوں آسمان اور زمین اور جو بھی ان میں ہے اسی کی تسبیح کر رہے ہیں۔ ایسی کوئی چیز نہیں جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ تم اس کی تسبیح سمجھ نہیں سکتے۔ وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی وہ ایسا عزیز ہے کہ اس کے جنابِ عالی کا قصد نہیں کیا جاتا کہ کوئی اس تک پہنچ کر اسے ایذا دے۔ وہ اپنی شریعت اور تقدیر میں حکمت والا ہے۔ سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں جس شخص نے صبح اٹھ کر تین بار کہا: ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ'' پھر سورۃ الحشر کی آخری تین آیتیں پڑھیں تو اللہ تعالیٰ اس پر ستر ہزار فرشتے مقرر کرے گا جو اس پر شام تک درود بھیجتے رہیں گے اور اگر وہ اس دن مر گیا تو شہید مرا اور جس نے شام کو ایسا کیا تو وہ بھی اسی رتبے میں ہوگا۔[1] (أخرجه الإمام أحمد ورواه الترمذي عن محمود بن غيلان عن أبي أحمد الزبيري به وقال: غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه، وأخرجه البيهقي والدارمي والطبراني وابن الضريس كذا في فتح البيان) آخر تفسير سورة الحشر ولله الحمد والمنة كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ یعنی اے ایمان والو! اللہ کی سزا سے ڈرو اس طرح سے کہ جس شے کا تم کو حکم دیا ہے اس کو کرو اور جس سے تم کو منع کیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ ﴿ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ﴾ یعنی چاہیے کہ ہر نفس نظر کرے کہ اعمال میں سے کیا شے قیامت کے دن کے لیے آگے بھیجی ہے۔ عرب کے لوگ ''غد'' کا کلمہ بولتے ہیں اس سے زمانہ مستقبل کا کنایہ کرتے ہیں۔

اصل میں ''غد'' سے مراد وہ دن ہے جس کے اور تمھارے درمیان ایک رات ہے۔ ''غد'' کا اسم روزِ قیامت پر صرف اس کے قریب کرنے کے لیے اطلاق کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ ﴾ [النحل: ٧٧] ''اور قیامت کا امر تو ایسا ہی ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا۔''

---

[1] مسند أحمد (٢٦/٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٢٢) المعجم الكبير (٢٢٩/٢٠) فتح البيان (٧٠/١٤) تفسير ابن كثير (٤٣٦/٤_٤٤٠) اس کی سند میں ''خالد بن طہمان'' ضعیف راوی ہے۔ ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٧٣٢)

تو گویا روزِ قیامت کے قریب ہونے کی وجہ سے اس کی تشبیہ اس دن کے ساتھ دی گئی جس کے اور تمھارے درمیان صرف ایک رات ہے۔ یا اس لیے کہ دنیا کا زمانہ ایک دن کی طرح ہے اور آخرت ایسی ہے جیسے اس کا کل کا دن، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک متشابہ احکام اور احوال کے ساتھ مختص ہے اور ثانی اول کے بعد آتا ہے تو اب لفظ ''غد'' کا استعارہ ہوگا۔

﴿ لَنَفْسٌ ﴾ کو جو نکرہ ذکر فرمایا تو اس کا فائدہ اس بات کا بیان ہے کہ جو نفوس قیامت میں نظر کرنے والے اور غور وفکر کرنے والے ہیں وہ حد درجہ تھوڑے ہیں۔ گویا یوں کہا گیا: چاہیے کہ ایک نفس ہی اس میں نظر کرے اور وہ نفس بھی کہاں ہے۔ ''غد'' کے نکرہ لانے کا فائدہ اس کی تعظیم اور اس کے حال کا ابہام ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ ایسے ''غد'' کے لیے جس کی عظمت اور ہولناکی کی حقیقت کو نفس پہچانتا ہی نہیں ہے تو اب اس میں تنکیر (نکرہ لانا) تعظیم کے لیے ہوگی اور نفس میں تقلیل کے لیے۔ یا اس بات کی تعریض (اشارہ) ہے کہ وہ سب اس نظرِ واجب سے غافل ہو رہے ہیں۔ (أفاده الكرخي رحمه الله)

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ میں تقویٰ کے حکم کی تکرار تاکید کے لیے ہے، یا یوں کہو کہ اول ادائے واجبات میں ہے، اس لیے کہ وہ عمل سے مقرون (پیوستہ) ہے، کیوں کہ ﴿ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ﴾ سے مراد اعمالِ خیر ہیں اور ثانی ترکِ محارم (حرام کردہ چیزوں کو ترک کرنا) میں ہے، اس لیے کہ اس کو مقرون کیا ہے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ سے۔ اس وجہ کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ تاسیس کو تاکید پر فضیلت ہے۔ تم کو خبر ہے کہ تقویٰ واجبات کے ادا کرنے اور حرام کردہ چیزوں کو ترک کرنا دونوں کو شامل ہے، کیوں کہ اس تقریر کی بنا پر، جو سورۃ البقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے، تقویٰ یہ ہے کہ ہر اس شے سے پرہیز کی جائے جو گناہ گار کرتی ہے، وہ کام کرنا ہو یا ترک کرنا۔ اور توزیع (بانٹنا، پراگندہ کرنا) اور تقسیم کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک کو واجبات ادا کرنے سے جوڑو اور دوسری کو ترکِ محارم سے لگاؤ، بلکہ یہ مقام تو امرِ تقویٰ کے اہتمام کا مقام ہے تو زیادہ بہتر اور قوی بات تاکید ہی ہے۔ (كما ذكره الكرخي) معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر تمھارے اعمال سے کوئی مخفی شے بھی پوشیدہ نہیں ہے، وہ تم کو تمھارے اعمال کا بدلہ دے گا خیر ہے تو خیر اور شر ہے تو شر۔

﴿ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ﴾ یعنی تم ان جیسے مت ہو جاؤ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اطاعت کو ترک کیا، یا اس کی قدر نہ کی، جیسا کہ اس کی قدر کا حق تھا، یا اس سے نہ ڈرے، یا یہ سب کیا تو اس نے اس کو اپنے نفوس کو بھولنے والے کر دیا، اس وجہ سے کہ وہ اس کو بھول گئے تو جو اعمال اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کو بچاتے ہیں ان میں اپنے آپ کو نہ لگایا اور جو گناہ ان کو اس عذاب میں ڈالنے والے ہیں ان سے باز نہ رہے۔

اس معنی کی بنا پر مضاف محذوف ہے: ''أَيْ: أَنْسَاهُمْ حُظُوظَ أَنْفُسِهِمْ أَوْ تَقْدِيمَ خَيْرٍ لِأَنْفُسِهِمْ''، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے نفوس کے فائدے ان کو بھلا دیے یا ان کو اپنے نفوس کے لیے بھلائی کا آگے بھیجنا بھلا دیا۔

سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اللہ کا حق بھول گئے تو ان کو ان کی اپنی جانوں کا حق بھلا دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کو رخا میں بھول گئے، یعنی راحت و آرام میں اللہ کو بھول گئے تو سختیوں میں ان کو ان کے نفوس بھلا دیے۔[1] کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا شکر اور تعظیم ترک کر کے بھول گئے تو ان کو ان کے نفوس بھلا دیے کہ بعض ان کا بعض کو یاد دلائے۔ (حکاہ ابن عیسیٰ)

سہل بن عبداللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو گناہوں کے وقت بھول گئے تو توبہ کے وقت ان کو ان کے نفوس بھلا دیے۔[2] اللہ تعالیٰ نے ﴿ فَاَنْسٰهُمْ ﴾ میں فعل کو اپنے نفسِ مقدس کی طرف یہ بات بتانے کے لیے منسوب فرمایا کہ یہ اس کے امر و نہی کے سبب سے ہے جیسا کہ اس کا قول ہے: "أَحْمَدْتُ الرَّجُلَ إِذَا وَجَدْتُهُ مَحْمُودًا" ﴿ نَسُوا ﴾ کی اصل "نَسِيُوا" ہے۔ "يُقَالُ: نَسِيَ يَنْسَى كَرَضِيَ يَرْضَى"۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ یعنی یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کو بھولنے والے ہیں وہی مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکلے ہوئے ہیں۔

پہلے تو تقویٰ کا حکم دیا پھر غفلت سے منع فرمایا۔ یہ دو فرقے ہوئے: ایک تو اللہ سے ڈرنے والا۔ دوسرا اللہ سے غافل تو اس کے بعد ان کی جزا میں جو فرق ہے اس کا ذکر فرمایا: ﴿ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ﴾ یعنی دوزخ والے اور بہشت والے فضل اور رتبے میں برابر نہیں ہیں۔ مراد دونوں فریق علی العموم ہیں تو اب جو کوئی اللہ کو بھول گیا تو وہ تو فریق اہلِ نار میں بدرجہ اولیٰ داخل ہوگا۔ اسی طرح جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرے وہ اہلِ جنت کے فریق میں بدرجہ اولیٰ داخل ہوں گے، اس لیے کہ آیت کا سیاق ان میں ہے۔ سورۃ السجدہ و مائدہ وص میں اس قسم کی آیت کے معنی پر کلام گزر چکا ہے۔

پھر جب اللہ پاک اہلِ جنت اور اہلِ نار کے درمیان برابری کی نفی کر چکا تو اصحابِ جنت کے متعلق یہ خبر دی کہ ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ یعنی جنت کے لوگ وہی ظفر مند (کامیاب) ہیں، ہر مطلوب کو حاصل کرنے والے اور ہر ناپسندیدہ چیز سے نجات پانے والے ہیں۔ یہ جملہ مستانفہ ہے (امام ابو السعود رحمہ اللہ نے یہ بات صرف ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ کے بارے میں کہی ہے،[3] ظاہر یہ ہے کہ ﴿ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ﴾ پورا جملہ مستانفہ ہے)۔ یہ دونوں فریق کے درمیان برابری نہ ہونے کی کیفیت کو بیان کرتا ہے تو اب یہ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ﴾ کے لیے تذییل کے مثل ہے، کیوں کہ جب اللہ پاک نے مومنوں کو تقویٰ کا حکم دیا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ عزت کا سبب ہے، جیسا کہ اس نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٣] ''اللہ کے نزدیک تم سب میں باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔'' اور عاقبت پر نظر کرنے اور غور و فکر کرنے اور اس کے لیے ہوشیار اور بیدار ہونے کا

[1] تفسير الطبري (٣٠/٢٣) [2] تفسير القرطبي (٤٣/١٨) [3] تفسير أبي السعود (٢٣٣/٨)

اور عمل میں مشغول ہونے کا حکم دیا، پھر ان کو غافلوں میں ہونے سے منع کیا کہ جو اللہ تعالیٰ کو بھول گئے اور عذاب سے بچنے کے لیے عمل کرنا چھوڑ دیا۔

پھر اللہ پاک نے ان کو ان کے نفوس بھلا دیے، یہاں تک کہ عاقبت میں وہ ہولناکیاں دیکھیں جن میں اپنے نفوں کو بھول گئے تو ﴿ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴾ سے کلام کی تذییل فرمائی، تاکہ انھیں اس شے میں رغبت پیدا ہو جو اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف قریب کرے اور اس کے دارِ کرامت میں ان کو داخل کرے اور اُن کو اس کے اصحاب سے کر دے۔ اسی جگہ سے اس آیت کے ساتھ شافعیہ نے لطیف استدلال کیا ہے کہ مسلم کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے اور کافر مسلم کے مال کا مالک نہیں ہوتا استیلاء (غالب ہونے) سے اور قاضی کا کلام حسین ہوا، جب یوں کہا کہ وہ لوگ جنھوں نے اپنے نفوس کامل کیے اور جنت کے لائق ہو گئے، وہ ان کے برابر نہیں ہوتے جنھوں نے اپنے نفوس ذلیل کیے، یعنی ان کو ذلت اور خواہشوں میں استعمال کیا اور نار کے مستحق ہو گئے۔[1] (كما قال الكرخي)

اس آیت میں دوسرا بیان یہ ہے کہ یہ لوگوں کو اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ وہ جو انتہائی غافل ہو رہے ہیں اور عاقبت کی فکر کم کرتے ہیں اور عاجلہ (دنیا) کے اختیار کرنے پر اور خواہشوں کی پیروی کرنے میں جان دیے ڈالتے ہیں تو وہ اس وجہ سے ایسے ہیں گویا جو جنت اور نار میں اور ان کے لوگوں میں فرق ہے، اس کو پہچانتے ہی نہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ کامیابی اصحابِ جنت کے ساتھ ہے اور عذابِ الیم اصحابِ نار کے ساتھ تو ایسے لوگ اس کے مستحق ہیں کہ ان کو اس کا فرق بتایا جائے اور اس پر ان کو آگاہ کیا جائے جس طرح کوئی اپنے باپ کی نافرمانی کرتا ہے تو تم اس سے کہتے ہو کہ وہ تیرا باپ ہے، اس کو اس شخص کی مثل ٹھہراتے ہو جو اپنے باپ کو پہچانتا نہیں ہے۔ پس تم یہ کہہ کر باپ پن کے حق سے اس کو آگاہ کرتے ہو، وہ حق جو احسان، حسنِ سلوک، نرمی اور مہربانی کا مقتضی ہے (یہ بیان علامہ نسفی رحمہ اللہ کا ہے اور استدلالِ شافعیہ کے بارے میں کہا ہے: "قد أجبنا عن مثل هذا في أصول الفقه والكافي)۔[2]

پھر جب اللہ پاک اہلِ جنت واہلِ نار کے ذکر سے فارغ ہوا اور یہ بیان کر چکا کہ وہ باہم برابر نہیں تو اپنی کتابِ کریم کی تعظیم کا اور جلالت کا ذکر کیا اور اس بات کی خبر دی کہ وہ اس قابل ہے کہ دل اس کے لیے دبیں اور نرم پڑیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ یعنی قرآن ایسا عظیم الشان جید الالفاظ قوی المبانی بلیغ المعانی ہے اور ایسے مواعظ پر مشتمل ہے جن سے دل نرم پڑتے ہیں، اگر وہ زمین کے پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ پر اتارا جاتا اور انسان کی طرح اس میں تمیز رکھ دی جاتی تو تو اس کو دیکھتا کہ اس کے انتہائی سخت اور درشت اور عظیم الجثہ ہونے کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت یعنی اس کے عذاب سے ڈر کے اور

[1] تفسير البيضاوي (٣٢٣/٥) [2] تفسير النسفي (٢٣٤/٤)

اس خوف سے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کے کلام کی کما حقہ تعظیم نہ کر سکے، وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا۔

یہ بیان ایک تمثیل ہے جو اس کی علوِ شان اور دلوں میں اس کی تاثیر کا مقتضی ہے (اس بات پر قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثٰلُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ دلالت کرتا ہے)۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ نبیِ مکرم ﷺ کو خطاب ہے، یعنی اے محمد! اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو وہ ثابت نہ رہتا اور اس کے اترنے سے پھٹ جاتا حالانکہ ہم نے تحقیق اس کو تجھ پر نازل کر دیا اور تجھ کو اس کے لیے ثابت رکھا اور تجھے اس پر قوت دی اس بنا پر یہ آیت بابِ امتنان سے ہو گی۔ اللہ پاک نبیِ مکرم ﷺ پر احسان رکھتا ہے، اس لیے کہ اس نے آپ ﷺ کو اس شے کے لیے ثابت رکھا جس کے سامنے جمے ہوئے پہاڑ بھی ثابت نہیں رہ سکتے۔ کسی نے کہا ہے کہ اُمت کو خطاب ہے۔

﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثٰلُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی یہ مثالیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں، شاید وہ سوچ کریں اس شے کے بارے میں جس میں ان پر سوچ کرنا واجب ہے، تاکہ نصیحت سے نصیحت پذیر ہوں اور دھمکیوں کا اثر قبول کریں۔ اس میں کفار کو ملامت اور دھمکی ہے، اس لیے کہ وہ نہ قرآن کے لیے دبے نہ اس سے نصیحت حاصل کی اور نہ ہی اس کی دھمکیوں کا کوئی اثر قبول کیا۔

جب کہ اللہ پاک نے قرآن شریف کو موصوف بہ عظمت کیا اور یہ بات معلوم ہے کہ صفت کی عظمت موصوف کی عظمت کے تابع ہوتی ہے تو اس کے بعد ہی اپنی عظمت کا وصف فرمایا اور کہا: ﴿ هُوَ ﴾ یعنی وہی جو ایسا ہے کہ اس کا وجود اپنی ذات سے ہے۔ پس کسی بھی وجہ سے اس کے لیے عدم (نہ ہونا) نہیں ہے۔ جب وہ ایسا ہے تو کوئی اور شے ایسی نہیں جو اس کے علاوہ کلمۂ ﴿ هُوَ ﴾ سے موصوف ہو، اس لیے کہ ہمیشہ کے لیے ازل سے ابد تک موجود وہی ہے، چنانچہ پس وہ ہر ضمیر میں حاضر ہے اور اپنی عظمت کے سبب سے ہر حس سے غائب ہے، اسی لیے اس کی خشیت سے پہاڑ پھٹ پڑا۔

جب اللہ پاک نے اپنے خاص الخاص ناموں سے اپنی تعبیر کی تو ہم پر لطف و مہربانی کر کے اور ہمارے لیے متنزل ہو کر سب سے مشہور نام کے ساتھ اپنی خبر دی جو سارے اسماء کا مسمی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ ﴾ یعنی وہ ایسا معبود ہے کہ عبادت و الوہیت اس کے سوا کسی کے لائق نہیں ہے۔ ﴿ اَلَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ یعنی وہ ایسا ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، پس بے شک اس کا کوئی ہم جنس نہیں ہے اور نہ یہ بات لائق اور صحیح ہے اور نہ ہی تصور کی جا سکتی ہے کہ کوئی شے اس کے جوڑ کی ہو، یا اس کے مشابہ ہو۔ (كذا في الخطيب)

﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ یعنی اس شے کو جاننے والا ہے جو محسوس بھی نہیں ہوتی اور اس شے کو جو حاضر ہوئی۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ چھپی ہوئی اور علانیہ چیز کا جاننے والا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس شے کا عالم ہے جو ہو گئی اور جو ہو گی۔ کسی نے کہا کہ آخرت و دنیا کا عالم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ غیر موجود اور موجود کا عالم ہے۔ ﴿

﴿ اَلْغَيْبِ ﴾ کو ﴿ اَلشَّهَادَةِ ﴾ سے پہلے اس لیے رکھا کہ وہ وجود میں بھی مقدم ہے۔ ﴿ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾ اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ تاکید اور تقریر کے لیے دوبارہ ذکر کیا ہے، اس لیے کہ توحید اسی کے لائق ہے۔ ﴿ اَلْمَلِكُ ﴾ یعنی ایسا بادشاہ ہے کہ اس کا ملک زائل نہیں ہوتا ہے، اپنی ساری مخلوق میں امرونہی کے ساتھ تصرف کرنے والا ہے، ان کا مالک ہے، چنانچہ وہ اس کے زیرِ ملک ہیں اور اس کے قہر و ارادے کے تحت ہیں۔ ﴿ اَلْقُدُّوْسُ ﴾ یعنی ہر عیب سے طاہر و پاک ہے اور ہر نقص سے منزہ، یعنی پاک ہے۔ ''قدس'' بہ تحریک اہلِ حجاز کی لغت میں ''سطل'' کو کہتے ہیں، اس لیے کہ اس سے طہارت کی جاتی ہے، اسی معنی سے قادوس ہے: ''لَوَاحِدُ الْأَوَانِيْ الَّتِيْ يُسْتَخْرَجُ بِهَا الْمَاءُ''

غرض یہ کہ ق۔د۔س کا مادہ طہارت و پاکی میں مستعمل ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قدوس وہ ہے جس کی برکت بہت زیادہ ہوئی۔ جمہور نے بہ ضمِ قاف پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام ابو ذر اور ابو السماک رحمہ اللہ نے) بہ فتحِ قاف پڑھا ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''سبوح و قدوس'' دونوں بہ فتحِ اول ہیں۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے یعقوب رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے کہ یعقوب رحمہ اللہ نے کسائی رحمہ اللہ کے پاس ایک فصیح اعرابی کو سنا کہ وہ قدوس کو بہ فتحِ قاف پڑھتا تھا۔ امام ثعلب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر اسم جو فعول کے وزن پر ہے وہ مفتوح الاول ہے مگر، ''سبوح و قدوس'' کہ ان میں زیادہ تر ضمہ ہے اور کبھی مفتوح ہوتے ہیں۔

﴿ اَلسَّلٰمُ ﴾ امام ابن العربی رحمہ اللہ علم برادرِ مالکیہ فرماتے ہیں۔ علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ہمارا قول ﴿ اَلسَّلٰمُ ﴾ ہے، اس کے معنی نسبت ہیں، تقدیر ''ذُوْ السَّلَامَةِ'' ہے۔ پھر ترجمہ نسبت میں تین قول پر اختلاف کیا ہے۔ پہلا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر عیب سے سالم ہوا اور ہر نقص سے بری ہوا۔ دوسرا اس کے معنی ''ذُوْ السَّلَامِ'' ہیں، یعنی اپنے بندوں پر جنت میں سلام کرنے والا ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴾ [یٰسٓ: ۵۸] ''مہربان پروردگار کی طرف سے انھیں ''سلام'' کہا جائے گا۔'' تیسرا وہ ایسا ہے کہ خلق اس کے ظلم سے سالم رہے۔ یہ قول امام خطابی رحمہ اللہ کا ہے (یا سالم رکھا خلق کو اپنے ظلم سے)۔ اور اسی کے اکثر قائل ہیں۔[1] اس قول کی بنا پر اور اس سے پہلے قول کی بنا پر سلام فعل کی صفت ہوگا اور اس قول کی بنا پر کہ وہ عیوب و نقائص سے بری ہے وہ ذات کی صفت ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَلسَّلٰمُ ﴾ کے معنی ''المسلم لعبادہ'' یعنی اپنے بندوں کے لیے سلامتی رکھنے والا ہے۔ مبالغے کے لیے مصدر کے ساتھ وصف کیا گیا ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (٤٦،٤٥/١٨) فتح القدير (٢٧٦،٢٧٥/٥)

﴿ اَلْمُؤْمِنُ ﴾ یعنی وہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو اپنے عذاب سے امن بخشا ہے۔ یا معجزات ظاہر کر کے اپنے رسول ﷺ کی تصدیق کرنے والا ہے۔ یا مومنوں سے جو ثواب کا وعدہ کیا ہے اس کو سچا کرنے والا ہے اور عذاب کی وعید کو سچا کرنے والا ہے جو اُن کو سنائی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مومن وہ ہے کہ اس کے دوست اس کے عذاب سے امن میں ہوتے ہیں اور اس کے بندے اس کے ظلم سے امن میں ہوتے ہیں۔ "یُقَالُ: آمَنَهٗ، مِنَ الْأَمَانِ الَّذِيْ هُوَ ضِدُّ الْخَوْفِ" جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴾ [قریش: ٤] "جس نے ان کو ڈر (اور خوف) میں امن (وامان) دیا۔" "فَهُوَ مُؤْمِنٌ"

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: مومن وہ ہے جس نے اپنے اس قول سے اپنے نفس کی توحید کی: "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ"، جمہور نے مومن بہ کسرِ میم پڑھا ہے اسم فاعل "آمن" بہ معنی "أمن" (آمن کو بہ معنی "أمّن مشدد کے لینا اس کی طرف احتیاج بہ اعتبار معانی سابقہ کے کچھ بھی نہیں اور جمہور کی طرف اس قراءت کی نسبت اس فعل خاص کے معنی میں۔ یہ بھی کما ینبغی نہیں۔ مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔ کسی نے بہ فتح میم پڑھا ہے، (یعنی ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین نے)۔ بہ معنی مومن بنا بر حذف، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ ﴾ أَيْ: مِنْ قَوْمِهِ" امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت جائز نہیں، اس لیے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خائف تھا اور کسی اور نے اس کو امن دیا۔[1] خاکسار ۔عفی اللّٰه۔ کہتا ہے کہ یہ قراءت جائز ہے، اس لیے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی خلق اس پر ایمان لائی ہے، اس کو مانا ہے، اس پر ایمان لایا گیا ہے۔ امام ابو حاتم رحمہ اللہ کو دھوکا ہوا کہ مومن کو امن سے سمجھے، حالاں کہ وہ ایمان سے ہے۔

﴿ اَلْمُهَيْمِنُ ﴾ ماخوذ ہے "هَيْمَنَ يُهَيْمِنُ" سے، یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی شے پر رقیب ونگہبان ہو، یعنی اللہ پاک اپنے بندوں پر ان کے اعمال کے ساتھ شہید (گواہ) ہے اور ان پر رقیب ونگہبان ہے۔ امام مجاہد، قتادہ اور مقاتل رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بہت سے مفسر ادھر گئے ہیں کہ اس کی اصل "مؤیمن" ہے "آمن یومن" سے، تو اب مومن کے معنی میں ہوگا[2] لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ جب مومن کے معنی میں ہوا تو ایک نام ہی کم ہوگیا۔ کسی نے کہا: "اَلْقَائِمُ عَلٰى خَلْقِهٖ بِرِزْقِهٖ" یعنی اپنی خلق کی روزی کا بندوبست کرنے والا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ معنی رقیب، یعنی حافظ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مصدق ہے یہ وہی ہے جو امام واحدی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قاضی۔ کسی نے کہا ہے کہ امین ومؤتمن۔ کسی نے کہا ہے کہ علی۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ پاک کے اسماء سے ایک اسم ہے، وہی اس کی تاویل کو خوب جانتا ہے۔ سورۃ المائدہ میں اس اسم مبارک پر کلام گزر چکا ہے۔[3]

---

[1] فتح القدير (٢٧٦/٥) [2] فتح القدير (٢٧٦/٥) [3] رقم الآية (٤٨)

﴿ اَلْعَزِیْزُ ﴾ یعنی اس کا نظیر نہیں پایا جاتا۔ کسی نے کہا ہے کہ "قاهر"۔ کسی نے کہا ہے کہ غالب غیر مغلوب۔ کسی نے کہا ہے کہ قوی، مطلب یہ ہے کہ اپنی عزت، قہر، غلبہ اور قوت میں بے ہمتا، یعنی بے مثال ہے۔ ﴿ اَلْجَبَّارُ ﴾ اللہ پاک کی جبروت اس کی عظمت و بزرگی ہے، چنانچہ اس بنا پر وہ صفتِ ذات ہے۔ عرب لوگ فلک کا نام جبار رکھتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ "جَبَرَ إِذَا أَغْنَى الْفَقِيْرَ وَأَصْلَحَ الْكَسِيْرَ" سے ہو، یعنی فقیر کا غنی کرنے والا ٹوٹے ہوئے کا جوڑنے والا اس بنا پر فعل کی صفت ہے۔ یا "جَبَرَهُ عَلَى كَذَا إِذَا أَكْرَهَهُ عَلَى مَا أَرَادَ" سے ہو، یعنی اس نے اپنی خلق کو اس شے پر مجبور کیا جس کا ان کے ساتھ ارادہ کیا۔ امام سدی اور مقاتل رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام زجاج اور فراء رحمہ اللہ کا یہی مختار ہے، کہا کہ یہ "أَجْبَرَهُ عَلَى الْأَمْرِ أَيْ: قَهَرَهُ" سے ماخوذ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے "فعال" کو "أفعل" سے نہیں سنا مگر "جبار" میں "أجبر" سے اور "دراك" میں "أدرك" سے۔[1]

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جبر ثلاثی بھی مستعمل ہوتا ہے، یعنی اب اسی قاعدے کے ماتحت ہو گیا کہ مزید سے "فعال" نہیں آتا۔ کسی نے کہا ہے کہ جبار وہ ہے جس کی سطوت کی طاقت نہیں رکھی جاتی۔ کسی نے کہا ہے کہ جبار وہ قہار ہے کہ جب اس نے کسی کام کا ارادہ کیا تو کوئی روکنے والا اس کو اس سے نہیں روکتا۔ کسی نے کہا ہے کہ "اَلَّذِيْ لَا يَنَالُ وَلَا يُدَانِيْ"، یعنی وہ ہے کہ اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا نہ اس کے قریب ہو سکتا ہے۔ "جبر" اللہ پاک کی صفت میں مدح (تعریف) ہے اور آدمیوں کی صفت میں ذم (مذمت) ہے۔[2]

﴿ اَلْمُتَكَبِّرُ ﴾ یعنی وہ ایسا ہے کہ متکبر ہے ہر نقص سے اور ہر اس شے سے بلند ہے جو اس کے لائق نہیں ہے۔ تکبر کی اصل امتناع و عدمِ انقیاد (بات نہ ماننا) ہے۔ "کبر" اللہ پاک کی صفات میں تعریف ہے، اس لیے کہ اس کے لیے ساری صفاتِ علو، عظمت، عز اور کبریا کی ہیں۔ چنانچہ اگر اس نے اس کو ظاہر کیا تو یہ ایک کمال کا دوسرے کمال کی طرف ملانا ہوا۔ اور مخلوق کی صفات میں کبر قابلِ مذمت ہے، کیوں کہ متکبر وہ ہے جو اپنے نفس سے کبر کو ظاہر کرتا ہے اور یہ اس کے حق میں نقص ہے اس لیے کہ اس کے لیے نہ کبر ہے نہ علو ہے، جبکہ اس کے لیے تو حقارت اور ذلت ہے، پس جب اس نے کبر کا اظہار کیا تو اپنے فعل میں کاذب ہوا، اس لیے اس وجہ سے لوگوں کے حق میں وہ مذموم ہے۔

امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا: "اَلْمُتَكَبِّرُ هُوَ ذُو الْكِبْرِيَاءِ وَهُوَ الْمَلِكُ"[3] کسی نے کہا ہے کہ وہ ہے کہ متکبر ہوا اپنی ربوبیت کے ساتھ، چنانچہ کوئی شے اس کی مثل نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ظلم سے متکبر ہے۔ بالجملہ جب اللہ پاک کے لیے علو اور عظمت کی ساری صفات ہیں اور باوجود اس کے مشرک لوگ اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں، اس لیے اپنے نفسِ کریم کی مشرکوں کے شرک سے تنزیہ فرمائی۔ ﴿ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ یعنی اللہ اس چیز سے پاک ہے جس کو شریک کرتے ہیں، یا ان کے اس کے ساتھ شریک کرنے سے پاک ہے۔

---

(1) تفسير القرطبي (٤٧/١٨) فتح القدير (٢٧٦/٥) (2) فتح البيان (٦٨/١٤) (3) فتح القدير (٢٧٦/٥)

﴿ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ ﴾ "خلق" کی اصل تقدیر ہے، یعنی اندازہ کرنا۔ جب تم مشک بنانے کے لیے ادھوڑی کا اندازہ کرتے ہو تو محاورۂ عرب میں بولتے ہیں کہ "خَلَقْتُ الْأَدِيْمَ لِلسَّقَاءِ" یعنی وہ اللہ تعالیٰ ہے اشیاء کا اندازہ کرنے والا اور اس شے کا اندازہ کرنے والا ہے جس کو اپنے ارادے اور مشیت کے مطابق ایجاد کرتا ہے۔ یہ قول صفتِ ارادہ کی طرف اور اس کے تعلق تنجیزی قدیم کی طرف راجع ہے۔ ﴿ اَلْبَارِئُ ﴾ یعنی اشیاء و اعیان کا انشاء و ابتداء و اختراع و ایجاد کرنے والا ہے، عدم سے وجود کی طرف لانے والا ہے۔ یہ قول تاثیرِ قدرت کی طرف راجع ہے جو حادث ہے لیکن خصوص اعیان میں۔ کسی نے کہا ہے کہ بعض اشیاء کو بعض سے متمیز کرنے والا ہے۔

﴿ اَلْمُصَوِّرُ ﴾ یعنی صورتوں کا ایجاد کرنے والا اور ان کی مختلف ہیئتوں پر ترکیب دینے والا ہے۔ چنانچہ تصویر آخر میں ہے اور تقدیر شروع میں اور "برء" ان کے درمیان میں۔ (كذا قال الكرخي) یا یوں کہو کہ تصویر مترتب ہے "خلق" پر اور "برء" پر اور ان دونوں کے تابع ہے۔ تصویر کے معنی تخطیط و تشکیل کے ہیں۔ سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے "اَلْمُصَوَّرُ" بہ فتحِ واؤ ونصبِ راء پڑھا ہے، اس بنا پر کہ ﴿ اَلْبَارِئُ ﴾ کا مفعول بہ ہے: "أَيْ: اَلَّذِيْ بَرَءَ الْمُصَوَّرَ أَيْ: مَيَّزَهُ"۔[1] ﴿ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ یعنی اللہ پاک کے لیے خاصے ننانوے نام ہیں جن کا ذکر حدیث شریف میں ہے۔ "حُسْنَى" مؤنث ہے۔ اس "أحسن" کا جو افعل تفضیل ہے۔ اس احسن کا مؤنث نہیں ہے جو "امرأة حسناء" کا مقابل ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اسمائے حسنیٰ ہیں جو تمام اسماء سے زیادہ اچھے ہیں، اس لیے کہ وہ اچھے معانی پر دال ہیں[2] یعنی تحمید و تقدیس وغیرہ زیرِ تفسیر۔ ﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ﴾ [الأعراف: ١٨٠] اس پر کلام گزر چکا ہے۔[3]

﴿ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی ہر شے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے وہ زبانِ حال سے یا لسانِ مقال سے، اس کی تنزیہ و تقدیس و پاکی بولتی ہے اور وہ اپنے غیر پر ایسا غالب ہے کہ کوئی مغالب اس پر غالب نہیں آ سکتا، وہ تمام امور میں حکیم ہے جن کا حکم کرتا ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرد کو حکم کیا کہ جس وقت وہ اپنے بستر پر آئے تو سورۃ الحشر کا آخری حصہ تلاوت کرے اور فرمایا کہ اگر تو مر جائے گا تو شہید مرے گا۔[4] (أخرجه ابن السني في عمل اليوم والليلة و ابن مردويه)

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شیطان سے تین دفعہ پناہ مانگی، پھر سورۃ الحشر کا آخر پڑھا تو اللہ تعالیٰ ستر فرشتے بھیجے گا تو اگر رات ہو گی تو وہ انسانوں اور جنوں کے

---

[1] تفسير القرطبي (٤٨/١٨) فتح القدير (٢٧٧/٥) [2] الكشاف (١٦٩/٢) [3] رقم الآية (١٨٠)

[4] الدر المنثور (١٢٢/٨) اس کی سند میں "یزید بن ابان قرشی" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٢٢١٧)

شیطانوں کو بھگائیں گے، یہاں تک کہ صبح کرے اور اگر دن ہو گا تو وہ ان کو بھگائیں ہیں، یہاں تک کہ شام کرے۔[1] (أخرجه ابن مردویه) نیز ان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے خواتیم حشر کو رات میں یا دن میں پڑھا، پھر اپنے اس دن یا رات میں مر گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت واجب کرے گا۔[2]

(أخرجه البيهقي في الشعب و ابن عدي و ابن مردويه و الخطيب۔ أخرج الديلمي عن ابن مسعود رضي الله عنه وعلي رضي الله عنه مرفوعاً في قوله تعالىٰ: ﴿لو انزلنا هذا القرآن على جبل...﴾ إلى آخر السورة. قال هي رقية الصداع ورواه الديلمي بإسنادين لا ندري كيف حال رجالهما و أخرج الخطيب في تاريخه بإسناده إلى إدريس بن الكريم الحداد قال: قراءت على خلف فلما بلغت هذه الآية قال: ضع يدك على رأسك فإني قراءت على حمزة فلما بلغت هذه الآية، قال: ضع يدك على رأسك فإني قرأت على الأعمش ثم ساق الإسناد مسلسلا هكذا إلى ابن مسعود رضي الله عنه فقال: فإني قراءت على نبي ﷺ۔ فلما بلغت هذه الآية، قال لي: ضع يدك على رأسك فإن جبريل لما نزل بها قال لي: ضع يدك على رأسك فإنها شفاء من كل داء إلا السام والسام الموت۔ قال الذهبي هو باطل)۔[3]

الحمد للّٰه والمنة کہ تفسیر سورۃ الحشر شبِ سہ شنبہ (منگل) وقت دو ساعت سی ام (تیسویں) ماہِ رمضان ۱۳۱۵ ہجری کو تمام ہوئی، اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آئندہ کی توفیق دے۔ ولا حول ولا قوة إلا باللّٰه العلي العظيم، ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار، اللهم إنك عفو تحب العفو فاعف عنا. آمين، وصلى اللّٰه على سيدنا ومولانا سيد المرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين، والحمد للّٰه أولا وآخرا وظاهرا وباطنا عدد ما علم وزنة ما علم وملأ ما علم فقط.

---

[1] الدر المنثور (۱۲۲/۸)

[2] شعب الإیمان (٤٩٢/٢) اس کی سند میں ''سلیم بن عثمان'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٦٣١)

[3] الدر المنثور (۱۲۱/۸) فتح القدير (٢٧٧/٥) فتح البيان (٦٢/١٤-٧٠)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَة

اس سورت مبارکہ کی تیرہ (۱۳) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق یہ مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس والنحاس وابن مردويه والبيهقي) سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] (أخرجه ابن مردويه) ''مُمْتَحِنَةٌ'' بہ کسر حائے مہملہ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ ''أَيْ: اَلْمُخْتَبِرَةُ'' یعنی امتحان کرنے والے جانچنے والے۔ بطور مجاز فعل کی نسبت سورت کی طرف کی گئی جس طرح کہ سورۃ البراءت کا نام معبثرہ و فاضحہ رکھا گیا ہے، اس وجہ سے کہ منافقوں کے عیوب ظاہر کرتی ہے۔ اس بنا پر سورت کی اضافت ممتحنہ کی طرف بیانی ہوگی: ''أَيْ: اَلسُّوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةُ''۔ کسی نے کہا ہے کہ بہ فتحِ حاء اسم مفعول کا صیغہ ہے، اس معنی میں کہ سورت کی اضافت اس عورت کی طرف کی ہے جس کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ﴾ یعنی وہ عورتیں امتحان لی گئی ہوئیں، اس بنیاد پر اضافت بیانی نہ ہوگی۔ معنی یہ ہیں کہ سورت اس مہاجر عورت کی جس میں امتحان کی آیت نازل ہوئی۔ یہ عورت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کی بیوی، ابراہیم بن عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ
تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ
يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ
كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۖۗ تُسِرُّوْنَ
اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖۗ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَمَاۤ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَمَنْ
يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝۱ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا

[1] تفسير القرطبي (۱۸/۴۹) [2] الدر المنثور (۸/۱۲۴)

لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝۲ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۳

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالاں کہ وہ حق (سچے دین) کے منکر ہوئے ہیں جو تمھارے پاس آیا ہے، وہ رسول کو اور تمھیں بھی جلا وطن کرتے ہیں، اس لیے کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر تم میرے راستے میں نکلے ہو، جہاد اور میری رضا ڈھونڈنے کے لیے (تو کفار کو دوست نہ بناؤ)، تم ان کو دوستی کا خفیہ پیغام بھیجتے ہو، اور میں خوب جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو، اور تم میں سے جو کوئی ایسا کرے گا، تو یقیناً وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا① اگر وہ تمھیں (کہیں) پائیں تو تمھارے دشمن ہو جائیں اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں تمھاری طرف دراز کریں، برائی (کی نیت) سے، اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم بھی (دینِ حق کے) منکر ہو جاؤ② تمھارے رشتے ناتے قیامت کے دن تمھیں ہرگز نفع نہیں دیں گے اور نہ تمھاری اولاد، وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا، اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو③

نبی کریم ﷺ کی مکہ والوں سے صلح ہوئی جس کا بیان ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا ﴾ [الفتح: ۱] میں ہو چکا ہے۔ دو برس گزرے، پھر وہ صلح کافروں کی طرف سے ٹوٹی، تب نبیِ مکرم ﷺ نے فوج جمع کر کے مکہ کا ارادہ کیا اور اس کو خفیہ رکھا کہ کہیں کافر پھر نہ لڑنے لگیں اور حرم میں لازمی لڑائی ہو۔ ایک مسلمان تھے جن کا نام حاطب رضی اللہ عنہ تھا، انھوں نے مکہ والوں کو خط لکھ بھیجا، نبیِ کریم ﷺ کو وحی کے ذریعے معلوم ہوا، اس خط کو راستے سے پکڑ کر منگوایا۔ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ نے عذر کیا کہ میرے اہل و عیال مکہ میں ہیں، میں ان کافروں سے سلوک رکھتا ہوں، تاکہ میرے عیال کی خبر گیری کریں، یہ خطا بڑی ہوئی، لیکن حاطب رضی اللہ عنہ جنتی ہیں، بدر کے لوگوں میں سے ہیں۔ اس پر یہ سورت اتری۔ انتھی۔

فتح البیان کا بیان:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے یہ نکلا کہ کبیرہ گناہ ایمان سلب نہیں کر لیتا۔ ﴿ لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ﴾ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی بھی وجہ سے کفار کے ساتھ دوستی نہیں کرنی چاہیے۔ ''عدوّ'' کا کلمہ واحد

تثنیہ وجمع پر بولا جاتا ہے۔ اللہ پاک نے جو اپنے نفسِ مقدس کی طرف عدو کی نسبت فرمائی تو اس سے ان کے جرم کو عظیم ظاہر کرنا ہے اور اس میں شدت اور تغلیظ بیان کرنا ہے۔

جملہ ﴿ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ﴾ حال ہے ﴿ تَتَّخِذُوْا ﴾ کی ضمیر سے، یا مستانفہ ہے، اس سے مقصود اس بات کی خبر دینا ہے جو اس میں شامل ہے، یا کفار سے دوستی رکھنے کی تفسیر ہے، یا ﴿ اَوْلِيَآءَ ﴾ کی صفت ہے۔ ﴿ تُلْقُوْنَ ﴾ بہ معنی "تُوْصِلُوْنَ" ہے اس بنا پر ﴿ بِالْمَوَدَّةِ ﴾ کا حرف باء زائد ہوگا، یعنی تم ان کی طرف دوستی کو پہنچاتے ہو۔ یا سببیہ ہے، یعنی تم ان کی طرف نبی اکرم ﷺ کی خبریں القا کرتے ہو اس دوستی کے سبب سے جو تمھارے اور اُن کے درمیان ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تم آپس کی محبت کی وجہ سے انھیں نبی مکرم ﷺ کی خبریں اور راز بتاتے ہو۔[1]

جملہ ﴿ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ﴾، ﴿ تُلْقُوْنَ ﴾ کے فاعل سے حال ہے، یا ﴿ لَا تَتَّخِذُوْا ﴾ کے فاعل سے حال ہے، یا مستانفہ ہے کفار کا حال بیان کرنے کے لیے۔ جمہور نے ﴿ بِمَا ﴾ بہ حرفِ باء پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی جحدری و عاصم فی روایۃ عنہ نے) "لِمَا" بہ حرفِ لام پڑھا ہے اس بنا پر کہ جس شے کے ساتھ کفر کیا گیا وہ محذوف ہو، یعنی اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ کفر کیا، بہ سبب اس حق کے جو اُن کے پاس آیا، یعنی دینِ اسلام اور قرآن، یا اس بنا پر کہ جو چیز ایمان کا سبب ہے وہ ان کی توبیخ کے لیے کفر کا سبب ٹھہرایا جائے۔[2]

جملہ ﴿ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ ﴾ مستانفہ ہے انھی کے کفر کو بیان کرنے کے لیے یعنی ان کے کفر کو تو دیکھو کہ اللہ کا رسول جو اُن کی اصلاحِ معاش و معاد کے لیے آیا ہے اس کو نکالتے ہیں اور تم کو جو اس پر ایمان لائے ہو نکالتے ہیں۔ یا جملہ حالیہ ہے۔ جو کوئی ضمیر کا انفصال جائز رکھتا ہے باوجود اس کے اتصال کی قدرت رکھنے کے اس نے اس سے استدلال کیا ہے، اس لیے یوں کہنا جائز تھا: "يُخْرِجُوْنَكُمْ وَالرَّسُوْلَ"، لیکن رسول کے شرف کے لیے رسول کو ﴿ اِيَّاكُمْ ﴾ سے پہلے رکھا ہے۔

جملہ ﴿ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ﴾ اخراج کی تعلیل ہے، یعنی تم کو اس وجہ سے نکالتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ جو تمھارا پروردگار ہے۔ یا اس بات کی کراہت سے تمھیں نکالتے ہیں کہ تم ایمان لاؤ۔ جملہ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ﴾ شرط ہے اور جواب محذوف۔ ﴿ جِهَادًا ﴾ اور ﴿ اِبْتِغَآءَ ﴾ کا نصب بنا بر علت ہے، یا بنا بر حالیت "أَيْ: حَالَ كَوْنِكُمْ مُجَاهِدِيْنَ وَمُبْتَغِيْنَ"، یعنی اگر تم مکہ سے نکلے ہو میری راہ میں لڑنے کے لیے اور میری رضا چاہنے کے لیے، یا اس حال میں کہ تم لڑنے والے ہو اور طلب کرنے والے ہو تو ان کی طرف دوستی کا ہاتھ نہ بڑھاؤ۔ چنانچہ تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت پکڑو۔

---

[1] معاني القرآن (۵/۱۵۵) [2] فتح القدير (۵/۲۸۰)

جملہ ﴿ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ﴾ مستانفہ ہے دھمکی اور ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر ہے یعنی ان کا وہ حال جس کا ذکر ہوا اور تم اپنی دوستی کے سبب سے ان کی طرف خبریں بھیجتے ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ جملہ ﴿ تُلْقُوْنَ ﴾ سے بدل ہے۔

جملہ ﴿ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَمَاۤ اَعْلَنْتُمْ ﴾ حالیہ ہے، یعنی تم ان کو چھپ کر خبریں بھیجتے ہو، حالانکہ میں اس شے کو جانتا ہوں جو تم نے اپنے سینوں میں چھپا رکھی ہے اور جو اپنی زبانوں سے ظاہر کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے احوال سے کچھ بھی مجھ پر مخفی نہیں ہے۔ ﴿ بِمَا ﴾ میں حرفِ باء زاید ہے۔ يُقَالُ: عَلِمْتُ كَذَا وَبِكَذَا۔ یہ تو اس بنا پر ہے کہ ﴿ اَعْلَمُ ﴾ مضارع متکلم ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اَعْلَمُ ﴾ افعل تفضیل ہے: "أَيْ: أَعْلَمُ مِنْ كُلِّ وَاحِدٍ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ"، قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴾ یعنی اور جو کوئی تم میں سے یہ کام کرے، یعنی میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست پکڑے اور دوستی کی بنا پر چھپ کر ان کو خبریں پہنچائے تو وہ واقعی راہِ حق سے چوک گیا اور درمیانی راہ سے بہک گیا۔

﴿ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً ﴾ یعنی اگر وہ تم سے ملیں تو تمھارے لیے وہ عداوت ظاہر کر ڈالیں جو ان کے دلوں میں ہے۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں کہ اگر وہ تم پر ظفر مند ہوں اور تم پر قابو پا لیں۔ دونوں معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ﴿ وَيَبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ ...الآية ﴾ یعنی تمھاری طرف تمھیں مارنے کے لیے اپنے ہاتھ پھیلائیں اور اپنی زبانیں تمھیں گالی گلوچ کرنے کے لیے استعمال کریں۔ ﴿ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ﴾ اور دوست رکھیں کہ کاش! تم منکر ہو جاؤ، یعنی تمھارے مرتد ہونے کی اور کفر کی طرف تمھارے رجوع ہونے کی تمنا کریں۔ یہ جملہ معطوف ہے جوابِ شرط پر، یا جملہ شرط و جزا پر۔ ابو حیان نے اس کے سوا اور احتمالوں پر اس کو ترجیح دی ہے۔[1] یعنی اللہ پاک نے دو خبریں دیں: ایک تو وہ جس میں شرط و جزا شامل ہے اور دوسری یہ ہے کہ وہ تمھارے کافر ہونے کو دوست رکھتے ہیں۔

﴿ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ ﴾ یعنی تم کو تمھارے ناتے عام طور پر ہرگز نفع نہ دیں گے وہ ناتے کسی قسم کے ہوں اور نہ تمھاری اولاد کوئی فائدہ دے گی۔ باوجود اس کے کہ اولاد "أرحام" میں داخل ہے، پھر اس کا خاص طور پر ذکر کیا، اس لیے کہ آدمی کو اولاد سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور شفقت ان پر بہت ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن تمھارے کچھ کام نہ آئیں گے کہ کہیں ان کی وجہ سے تم کفار کو دوست رکھو اور ان سے موالات کرو، جیسا کہ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کے قصے میں واقع ہوا، بلکہ جو شے تمھارے کام آئے گی، وہ کفار کی معادات (دشمنی) ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے اور ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو ترک کرنا ہے۔

﴿ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ﴾ جملہ مستانفہ ہے اس سے یہ بیان کرنا منظور ہے کہ اس دن رشتہ دار اور اولاد نفع نہ دیں گے۔ معنی یہ ہیں کہ قیامت کے دن تمھارے درمیان فرق کر دے گا۔ چنانچہ اپنے فرمانبرداروں کو تو

[1] البحر المحيط (٢٥١/٨، ٢٥٢)

جنت میں داخل کرے گا اور اہلِ معصیت کو آگ میں داخل کرے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے درمیان فصل کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان میں ہر کوئی دوسرے سے ڈر اور ہول کی شدت سے بھاگے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴾ [عبس: ٣٤۔ ٣٦] ''اس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔'' یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ ماقبل سے متعلق ہو، یعنی تم کو تمھارے ناتے اور تمھاری اولاد قیامت کے دن ہرگز نفع نہ دیں گے۔ پس اب ﴿ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ پر وقف ہوگا اور ﴿ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ﴾ سے کلام کی ابتدا ہوگی۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ﴿ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ مابعد سے متعلق ہو، جیسا کہ ذکر کیا گیا۔

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ یعنی اللہ پاک پر تمھارے اقوال و افعال میں سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے، چنانچہ وہ تم کو اس پر بدلہ دینے والا ہے۔ جمہور نے ﴿ يَفْصِلُ ﴾ بہ ضم یاء و تخفیف فاء و فتح صاد بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام حمزہ اور کسائی رحمہ اللہ نے) بہ ضم یاء و فتح فاء و کسرِ صاد مشددہ تفصیل سے پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام قتادہ اور ابو حیوہ رحمہ اللہ نے) بہ ضم یاء و کسرِ صاد مخففہ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی علقمہ نے) بہ نون پڑھا ہے۔[1]

مفسرین نے کہا ہے کہ ﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... إلٰى قوله ...بَصِيْرٌ ﴾ سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، جبکہ انھوں نے مشرکینِ قریش کو یہ خبر دینے کے لیے خط لکھا کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔

جیسا کہ بخاری و مسلم وغیرہما نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اور زبیر و مقداد رضی اللہ عنہما کو بھیجا اور فرمایا کہ تم جاؤ، یہاں تک کہ روضۂ خاخ میں پہنچو، بے شک وہاں ایک زنانی سواری ہے، اس کے پاس ایک خط ہے، وہ خط تم اس سے لے کر میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ ہم نکلے یہاں تک کہ اس روضے میں آئے تو ہمیں وہ زنانی سواری ملی۔ ہم نے کہا کہ خط نکال۔ وہ بولی: میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ پھر ہم نے کہا کہ تو وہ خط نکالے گی یا ہم تیرے کپڑے اتار دیں تو اس نے وہ خط اپنے جوڑے سے نکالا۔ پھر ہم اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تو اس میں یہ تھا: ''مِنْ حَاطِبِ بْنِ أَبِي بَلْتَعَةَ إِلَى أُنَاسٍ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ بِمَكَّةَ،'' ''حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے مشرکینِ مکہ کے نام'' اس خط میں انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ پر حملے کی مخبری کی تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: او حاطب! یہ کیا ہے؟ حاطب نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھ پر جلدی نہ کریں، بے شک میں قریش میں ملا ہوا ایک مرد تھا اور اُن کی ذات میں سے نہ تھا اور آپ کے ساتھ جو مہاجرین ہیں ان کی رشتے داریاں ہیں، جن کی وجہ سے وہ ان کے گھر والوں کی اور مالوں کی مکہ میں حفاظت کرتے ہیں۔

[1] تفسير القرطبي (١٨/٥٥)

لہٰذا جب یہ بات ان میں نسب نہ ہونے کی وجہ سے مجھے حاصل نہ ہوئی تو میں نے یہ چاہا کہ ان پر کوئی احسان کروں جس کی وجہ سے وہ میری قرابت کی حمایت اور حفاظت کریں۔ میں نے یہ کام کافر ہو کر نہیں کیا اور نہ اپنے دین سے پھر کر کیا ہے۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: سچ کہا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بولے: آپ مجھے چھوڑیں (یعنی اجازت دیں) کہ میں اس کی گردن ماروں۔ پس آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک وہ تو بدر میں حاضر ہوا ہے اور تجھے کس شے نے معلوم کرایا (یعنی تو نہیں جانتا) شاید اللہ مطلع ہوا ہے اہلِ بدر پر تو اس نے فرما دیا ہے کہ کرو جو چاہو، بے شک میں نے تمھارے لیے بخشش کر دی اور یہ آیت نازل ہوئی۔[1] اس بارے میں مسند و مرسل حدیثیں ہیں جن میں اس قصے کا بیان شامل ہے اور اس بات کا کہ یہ آیتیں ﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ اسی بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ (كذا في فتح البيان)

آیات کا شانِ نزول:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اس سورتِ کریمہ کے شروع کی آیتوں کا نزول حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے۔ یہ حاطب مہاجرین میں سے ایک شخص تھے اور اہلِ بدر میں سے بھی تھے۔ مکہ میں ان کی اولاد تھی اور ان کا مال تھا اور وہ قریش کے خاندان سے نہ تھے، بلکہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے حلیف تھے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کا ارادہ فرمایا، جب اہلِ مکہ نے عہد توڑا تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان پر چڑھائی کرنے کے لیے تیاری کی جائے اور فرمایا: « اَللّٰهُمَّ عَمِّ عَلَيْهِمْ خَبَرَنَا » یعنی اے اللہ! تو ہماری خبر کو ان پر مبہم کر دے۔ لہٰذا ان حاطب نے ارادہ کیا، پھر ایک خط لکھا اور قریش کی ایک عورت کے ہاتھ وہ خط اہلِ مکہ کو بھیجا۔ آپ ﷺ نے جو اُن پر چڑھائی کرنے کا عزم فرمایا تھا اس کا ان کو اعلام کرتی تھی (خبر دیتی تھی) تاکہ اس سے ان پر اپنا ایک احسان رکھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنے رسول ﷺ کو مطلع فرما دیا آپ ﷺ کی دعا کو قبول کرتے ہوئے۔

پھر آپ ﷺ نے اس عورت کے پیچھے آدمی بھیجا اور وہ خط اس سے لے لیا، یہ بات اس حدیث میں بیان کی گئی ہے جس کی صحت پر اتفاق کیا گیا ہے۔ پھر امام احمد رحمہ اللہ کی روایت سے وہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بیان کی ہے، الفاظ کا کچھ فرق ہے، پھر آخر میں کہا ہے:[2] وهكذا أخرجه الجماعة إلا ابن ماجة من غير وجه عن سفيان بن عيينة به وزاد البخاري في كتاب المغازي فأنزل الله السورة: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ... الآية ﴾ وقال في كتاب التفسير: قال عمرو: ونزلت فيه ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... الآية ﴾ قال: لا أدري الآية في الحديث أو قال عمرو. قال البخاري: قال علي يعني

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٤) فتح البيان (١٤/٧٣۔٧٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٢٥،٤٦٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٤) مسند أحمد (79/1) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٥٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٠٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٨٧)

ابن المديني: قيل لسفيان: في هذا نزلت ﴿ لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي... الآية ﴾؟ فقال سفيان: هذا في حديث الناس حفظته من عمر وما تركت منه حرفا وما أدري أحدا حفظه غيري.

پھر بروایتِ صحیحین حدیثِ مذکور ذکر کی ہے۔[1] آخر میں کہا ہے کہ یہ الفاظ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب المغازی، غزوۃ البدر میں ذکر کیے ہیں اور اسے دیگر سند سے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے بعد امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت ذکر کی ہے، اس میں یہ ہے کہ اس نے اپنی دمچی سے خط نکال کر دیا، جب کہ حبیب بن ابی ثابت نے کہا کہ اس نے اپنی قبل سے اسے نکالا۔ آخر میں ہے کہ حبیب بن ابی ثابت نے کہا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا... الآية ﴾۔[2] (وهكذا رواه ابن جرير عن ابن حميد بن مهران عن أبي سنان سعيد بن سنان بإسناده مثله)

پھر کہا ہے کہ اصحابِ مغازی و سیر نے اس کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد بہ روایتِ محمد بن اسحاق قصے کا بیان کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ محمد بن جعفر نے کہا کہ وہ عورت مزینہ کی تھی۔ کسی اور نے کہا ہے کہ عبدالمطلب کی مولاۃ سارہ نام کی تھی۔ اس میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل فرمایا: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ... قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ... إلىٰ قوله.. وَحْدَهُ... ﴾ إلىٰ آخر القصة. (وروى معمر عن الزهري عن عروة نحو ذلك) اور اسی طرح امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیتیں سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں کہ انھوں نے بنی ہاشم کی مولاۃ سارہ کو بھیجا اور اس کو دس درہم دیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پیچھے سیدنا عمر اور علی رضی اللہ عنہما کو بھیجا تو انھوں نے اس کو جحفہ میں پایا۔[3] (وذكر تمام القصه كنحو ما تقدم وعن السدي قريبا منه وهكذا قال العوفي عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ومجاهد وقتادة وغير واحد إن هذه الآيات نزلت في حاطب)

کافروں سے دشمنی رکھنے اور دوستی ترک کرنے کا حکم:

پھر آیت کی مثال میں کہا ہے کہ یہ آیت اس فرمانِ باری تعالیٰ کی طرح ہے: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ﴾ [المائدة: ٥١] ''اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں، تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے وہ بے شک انہی میں سے ہے۔'' یہ ایک شدید دھمکی ہے اور سخت پکی وعید ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾ [المائدة: ٥٧] ''مسلمانو! ان لوگوں کو دوست

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٤)
[2] تفسير الطبري (٣١٢/٢٣، ٣١٣)
[3] تفسير الطبري (٣١٣/٢٣-٣١٥) تفسير ابن كثير (٤٤٢/٤، ٤٤٣)

نہ بناؤ جو تمھارے دین کو ہنسی کھیل بنائے ہوئے ہیں (خواہ) وہ ان میں سے ہوں جو تم سے پہلے کتاب دیے گئے یا کفار ہوں اگر تم مومن ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔‘‘

نیز فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴾ [النساء: ١٤٤] ’’اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی صاف حجت قائم کر لو۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ﴾ [آل عمران: ٢٨] ’’مومنوں کو چاہیے کہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حمایت میں نہیں مگر یہ کہ ان کے شر سے کسی طرح بچاؤ مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ خود تمھیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے۔‘‘ اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کا عذر قبول فرمایا، جب انھوں نے یہ ذکر کیا کہ یہ کام انھوں نے صرف قریش کی مصانعت (مدد حاصل کرنا) کے لیے کیا ہے، اس سبب سے کہ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کے اموال اور اولاد اُن کے پاس تھے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ ﴾ مع آیات ماقبل۔ اس میں کفار کی عداوت پر اور ان کی دوستی ترک کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے، اس لیے کہ انھوں نے رسول کو اور اُن کے اصحاب کو اپنے درمیان سے نکالا اس شے کو مکروہ جان کر جس پر وہ قائم تھے یعنی توحید پر اور اللہ وحدہ کے لیے عبادت کو خالص کرنے پر۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ﴾ یعنی ان کے نزدیک تمھارا کوئی گناہ نہ تھا، مگر تمھارا اللہ رب العالمین پر ایمان لانا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴾ [البروج: ٨] ’’یہ لوگ ان مسلمانوں (کے کسی اور گناہ کا) بدلہ نہیں لے رہے تھے، سوائے اس کے کہ وہ اللہ غالب لائقِ حمد کی ذات پر ایمان لائے تھے۔‘‘ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾ [الحج: ٤٠] ’’یہ وہ ہیں جنھیں ناحق اپنے گھروں سے نکالا گیا صرف ان کے اس قول پر کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے۔‘‘

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اگر تم میری راہ میں مجاہد ہو کر نکلے ہو اور میری مرضی چاہ کر نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں سے دوستی مت کرو، حالانکہ انھوں نے تم پر خفا ہو کر اور تمھارے دین سے ناخوش ہو کر تم کو تمھارے گھروں سے نکال دیا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ ... الآية ﴾ یعنی تم یہ کام کرتے ہو حالانکہ میں تمام چھپی ہوئی اور

خفیہ چیزوں کا اور دل کے اندر کے خیالات کا عالم ہوں اور ظاہری چیزوں کو بھی جانتا ہوں۔

﴿ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً ... الآية﴾ یعنی اگر وہ قادر ہوتے تو تم کو اپنے قول وفعل سے کوئی ایذا پہنچانا نہ چھوڑتے اور وہ یہ حرص رکھتے ہیں کہ تم کسی بھلائی کو حاصل نہ کرو، پس تمھارے لیے ان کی عداوت پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی، پھر تم کیوں ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہو۔ یہ بھی ان کی دشمنی پر مومنوں کو آمادہ کرنا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ ... الآية﴾ یعنی تمھارے ناتے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمھارے کام نہ آئیں گے جب اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کرے گا اور جب تم ان کو اس شے سے راضی کرو گے جو اللہ تعالیٰ کو خفا کرتی ہے تو ان کا کوئی فائدہ تمھیں نہیں پہنچے گا۔ اور جس کسی نے اپنے گھر والوں کے کفر پر ان کی موافقت کی، تاکہ ان کو خوش کرے تو یقیناً وہ خائب و خاسر ہوا اور اس کا عمل ضائع گیا اور اس کو اس کی کسی کے ساتھ قرابت اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی، اگرچہ وہ انبیاء میں سے کسی نبی کے قریب ہو۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! میرا باپ کہاں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نار میں۔ پھر جب اس نے پیٹھ پھیری تو اس کو بلایا۔ پھر فرمایا کہ بے شک میرا باپ اور تیرا باپ نار میں ہیں۔[1] (ورواه مسلم و أبو داود من حديث حماد بن سلمة به) جب اللہ پاک نے مشرکین کی دوستی سے منع فرمایا اور اس شخص کی مذمت فرمائی جس سے وہ واقع ہوئی تو ان کے لیے ابراہیم علیہ السلام کی مثال بیان فرمائی، جب وہ اپنی قوم سے بے زار ہوئے۔ چنانچہ فرمایا:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ
اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ
وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ
اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ
مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝
رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ

[1] صحيح مسلم (٢٠٣) سنن أبي داود (٤٧١٨) مسند أحمد (٢٦٨/٣) تفسير ابن كثير (٤٤٠/٤-٤٤٤)

حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶

یقیناً تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: بے شک ہم تم سے اور ان سے بَری ہیں، جن کی تم عبادت کرتے ہو سوائے اللہ کے، ہم تم سے منکر ہوئے، ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہوگیا ہے، حتی کہ تم اللہ اکیلے پر ایمان لے آؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں ضرور تیرے لیے بخشش مانگوں گا اور میں تیرے لیے اللہ (کی طرف) سے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا، اے ہمارے رب! ہم نے تجھی پر توکل کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹنا ہے④ اے ہمارے رب! تو ہمیں ان لوگوں کے لیے فتنہ (آزمایش) نہ بنا، جنھوں نے کفر کیا، اور ہمیں بخش دے، اے ہمارے رب! بے شک تو ہی بڑا زبردست، خوب حکمت والا ہے⑤ بلاشبہہ تمھارے لیے ان میں بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ (سے ملنے) اور یومِ آخرت کی اُمید رکھتا ہو، اور جو کوئی (حق سے) منہ موڑے تو بے شک اللہ ہی بے پروا، نہایت قابلِ تعریف ہے⑥

ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کی، پھر اپنی قوم کی طرف منہ نہ کیا، تم بھی وہی کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے باپ کے لیے دعا مانگنی چاہی تھی، جب تک انھیں معلوم نہیں ہوا تھا۔ تم کو معلوم ہو چکا ہے تم کافر کی بخشش نہ مانگو۔ ہمیں کافروں کی آزمایش میں نہ ڈال، یعنی ہم کو کافروں کے لیے محلِ آزمایش نہ بنا۔ انتہیٰ.

فتح البیان کا بیان:

جمہور نے ﴿ اُسْوَةٌ ﴾ کو بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے اور عاصم نے بہ ضمِ ہمزہ پڑھا ہے، یہ دونوں دو لغت اور دو قراءتِ سبعیہ ہیں۔ ﴿ اُسْوَةٌ ﴾ بالکسر و الضم کی اصل "قُدْوَةٌ" ہے۔ "يُقَالُ: هُوَ أُسْوَتُكَ أَيْ: مِثْلُكَ وَأَنْتَ مِثْلُهُ وَيُقَالُ: لِي بِهِ أُسْوَةٌ فِي هَذَا الْأَمْرِ أَيْ: اِقْتِدَاءٌ"۔ ﴿ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ ﴿ اُسْوَةٌ ﴾ سے متعلق ہے۔ امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے اس کو منع کیا ہے، یا ﴿ حَسَنَةٌ ﴾ سے متعلق، یا ﴿ اُسْوَةٌ ﴾ کی دوسری صفت ہے، یا حال ہے ضمیر سے جو مستتر ہے ﴿ حَسَنَةٌ ﴾ میں، یا "کان" کی خبر ہے اور ﴿ لَكُمْ ﴾ تبیین ہے۔① ﴿ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ﴾ سے مراد ابراہیم علیہ السلام کے اصحاب مومنین ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد انبیاء ہیں۔② کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ "کان" کی خبر

① التبيان في إعراب القرآن (٢/١٢١٨) ② تفسير الطبري (٣١٧/٢٣)

ہے، یا اس کی خبر سے متعلق ہے، یہ دونوں امام ابو البقاء رحمہ اللہ کے قول ہیں[1] اور جس نے "کان" کا ظرف میں عمل کرنا جائز رکھا ہے تو اس کو "کان" سے متعلق کیا ہے۔ یہ تو وہ ہے جو سمین میں ہے۔ امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: ظرف بدلِ اشتمال ہے ﴿ اِبْرٰهِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ ﴾ سے یہ بہترین تراکیب ہے جو یہاں ذکر کی گئی ہیں۔

﴿ بُرَءٰٓؤُا ﴾ جمع ہے "بَرِيءٌ" کی جیسے: "شَرِيكٌ" کی جمع "شُرَكَاءُ" اور "ظَرِيفٌ" کی جمع "ظُرَفَاءُ" ہے۔ جمہور نے بہ ضم باء و فتحِ راء و بہ الف بین الہمزتین پڑھا ہے، جیسے: "كَرِيمٌ" کی جمع "كُرَمَاءُ" ہے اور کسی نے (یعنی عیسیٰ بن عمرو اور ابن ابی اسحاق رحمہما اللہ نے) بہ کسرِ باء و فتحِ راء پڑھا ہے، جیسے: "كِرَامٌ" جمع "كَرِيمٌ" کی اور کسی نے (یعنی ابو جعفر نے) بہ ضمِ باء و ہمزہ بعد الف پڑھا ہے۔[2]

﴿ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد اصنام ہیں۔ اللہ پاک مومنوں کو ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرنے کا ارشاد کرتا ہے کہ تم کو ابراہیم کی جیسی اچھی چال چلنی ہے، اس کے افعال و اقوال میں اور ان مومنوں کی چال جو اس کے ساتھ تھے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے حاطب! پھر تو نے ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کیوں نہ کی کہ تو اپنے گھر والوں سے بے زار ہو جاتا، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے بے زار ہوئے[3] جب اپنی کافر قوم سے کہا، حالاں کہ وہ تمھارے دشمنوں سے زیادہ تھے اور زیادہ قوی تھے اور اُن کے ان میں ناتے اور رشتے تھے، انھوں نے اس کے باوجود اُن کی کچھ پروا نہ کی، بلکہ کہا: ہم تمھارے دین سے اور اُن بتوں سے بے زار ہیں جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، ہم ان بتوں کے منکر ہوئے جن پر تم ایمان لائے ہو۔ یا تمھارے دین کے منکر ہوئے۔ یا تمھارے افعال کے، یعنی ہم نہ تمھاری پروا کرتے ہیں اور نہ تمھارے معبودوں کی اور ہم میں اور تم میں افعال کے ساتھ عداوت ظاہر ہوگئی اور دلوں میں ہمیشہ کے لیے بغض ظاہر ہو گیا۔ یعنی تمھارے ساتھ ہمارا یہ حال ہے اس وقت تک جب تک تم اپنے کفر پر قائم ہو یہاں تک کہ تم اکیلے اللہ پر ایمان لے آؤ اور اس شرک کو چھوڑ دو جس پر تم جمے ہوئے ہو اور جب تم یہ کر لو گے تو وہ عداوت موالات اور دوستی ہو جائے گی اور بغض محبت ہو جائے گا۔ ﴿ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ ﴾ یہ استثناء متصل ہے ﴿ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ ﴾ سے، بہ تقدیرِ مضاف محذوف، تاکہ استثناء صحیح ہو جائے۔ "أَيْ: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي مَقَالَاتِ إِبْرَاهِيمَ كُلِّهَا إِلَّا قَوْلَهُ لِأَبِيهِ... الخ"۔ یعنی تمھارے لیے یقیناً ابراہیم علیہ السلام کی ساری باتوں میں اقتدائے نیک ہے مگر اس کی اس بات میں نہیں جو اس نے اپنے باپ سے کہی کہ میں تیرے لیے معافی مانگوں گا۔ یا ﴿ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ سے استثناء ہے۔ یہ اس لیے صحیح ہے کہ قول بھی ﴿ اُسْوَةٌ ﴾ میں سے ہے۔ گویا یوں کہا گیا: "قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي جَمِيعِ أَقْوَالِهِ وَأَفْعَالِهِ إِلَّا قَوْلَهُ لِأَبِيهِ"

---

[1] التبيان في إعراب القرآن (١٢١٨/٢) [2] فتح القدير (٢٨٢/٥) [3] فتح القدير (٢٧٢/٥)

صاحب فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول میرے نزدیک واضح ہے، اس کو تقدیر مضاف کی حاجت نہیں اور نہ یہ استثناء کو اتصال سے نکالتا ہے جو انقطاع کی طرف اس کی اصل ہے۔ اسی لیے امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور کوئی وجہ ذکر نہیں کی۔[1] یا استثناء ہے تبری وقطعیت سے جس کا ذکر کیا گیا ہے: ''أَيْ: لَمْ يُوَاصِلْهُ إِلَّا قَوْلَهُ''. یہ قول امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے مواصلت نہ کی، مگر اس قول میں کہ میں تیرے لیے معافی مانگوں گا۔ یا استثناء منقطع ہے: ''أَيْ: لَكِنْ قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ'' یعنی لیکن ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کو کہنا کہ میں تیرے لیے معافی مانگوں گا، پس تم پیروی مت کرو اس کی کہ مشرکوں کے لیے مغفرت مانگنے لگو، اس لیے کہ وہ تو ایک وعدے کے سبب سے تھا جس کا اس سے وعدہ کر لیا تھا۔ یا یوں کہو کہ ان سے اس کا وقوع صرف اس لیے ہوا کہ انھوں نے یہ خیال کیا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، پھر جب ان پر یہ بات کھل گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو اس سے بے زار ہو گئے۔[2]

کفار ومشرکین سے اظہارِ براءت کے لیے ابراہیم علیہ السلام کا نمونہ:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ وہ اس بات سے منع کیے گئے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اپنے باپ کے لیے استغفار کا اقتداء کریں، اس حال میں کہ وہ مشرک ہے۔[3] اس کی تحقیق سورت براءت میں گزر چکی ہے۔[4] ﴿ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ جملہ حالیہ ہے ﴿ لَاَسْتَغْفِرَنَّ ﴾ کے فاعل سے اور قول مستثنیٰ کے تتمہ سے ہے۔ پس استثناء استغفار کی طرف متوجہ ہے نہ کہ اس قید کی طرف کیوں کہ یہ تو اظہار عجز ہے اور امر کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے اور یہ اچھی خصلتوں میں سے ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں تیرے کام نہ آؤں گا اور نہ تجھ سے اللہ تعالیٰ کا ثواب وعذاب کچھ دور کر سکوں گا۔

﴿ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴾ یہ قول ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اصحاب کی دعا سے ہے اور ان امور میں سے ہے جن میں اقتدائے نیک ہے کہ ان میں ان کی پیروی کی جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ مومنوں کو اس بات کی تعلیم ہے کہ یہ دعا کیا کریں۔ توکل تو کاموں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ انابت رجوع کے معنی میں ہے۔ ﴿ اَلْمَصِيْرُ ﴾ بہ معنی ''مرجع'' ہے، یعنی لوٹ کر جانے کی جگہ۔ جار ومجرور کے مقدم کرنے سے مقصود توکل وانابت ومصیر کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کرنا ہے، یعنی اے ہمارے رب! تجھی پر ہم نے توکل کیا، تیرے ہی سپرد ہم نے اپنے سارے کام کر دیے اور ہم تیری ہی طرف رجوع ہوئے اور تیری ہی طرف پھر جانا ہے۔

﴿ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ ظاہر یہ ہے کہ یہ متعدد دعائیں ہیں، ہر ایک کو اپنے سے پہلی دعا

---

(1) الكشاف (٥١٣/٤) (2) فتح البيان (٧٨/١٤) (3) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٤٩/١٠) (4) رقم الآية (١١٤)

کے ساتھ ارتباط (ربط) نہیں ہے۔ (اس دعا کو سابق دعا کی طرح مضمونِ ما قبل سے یہ ارتباط ہے کہ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے جب کفار کے لیے دشمنی کے کلمات ان کے روبرو ظاہر کیے، حالاں کہ وہ کافر اہلِ سلطنت و مال تھے تو ظاہر حال کے مطابق اس کا مقتضا یہ ہوا کہ اب یہ کافر اہلِ اسلام کو ایسی سخت تکلیف پہنچائیں گے جس کو وہ اپنی ظاہری قوت سے دور نہیں کر سکتے، لہٰذا پہلی دعا میں اپنا توکل اور انابت ظاہر کی اور اس دعا میں درخواست کی کہ ہم کو کافروں کے تکلیف دینے کا محل نہ بنانا)۔ جس طرح کہ چند جملے ہوتے ہیں اور یہ اور اس کا مابعد ما قبل سے بدل نہیں ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے، اس لیے کہ دو معنوں کا اتحاد نہیں ہے، نہ بطور کل اور نہ بطریقِ جزء اور سوائے دعا ہونے کے دونوں میں کسی طرح کی ملابست (مشابہت) نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ ان کو ہم پر غالب مت کر کہ وہ یہ خیال کریں کہ وہ حق پر ہیں تو اس سے مفتون ہوں۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو ان کے ہاتھوں سے عذاب نہ کر اور نہ اپنے پاس سے کوئی عذاب کر کہ وہ یہ کہیں کہ اگر یہ لوگ حق پر ہوتے تو یہ عذاب ان کو نہ پہنچتا۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ تو ان کو ہم پر مسلط نہ کر کہ وہ ہم کو مفتون کریں۔[4] ﴿ وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ یعنی اے ہمارے رب! ہم کو بخش دے، بے شک تو ہی ایسا غالب ہے کہ جس پر کوئی اور غالب نہیں ہو سکتا تو اپنے ملک اور کاموں میں صاحبِ حکمتِ بالغہ ہے۔

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ یعنی البتہ تحقیق تمھارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور اس کے ساتھ والوں میں اقتدائے نیک ہے، یعنی کفار سے بے زار ہونے میں۔ یہ جملہ جو دوبارہ لایا گیا ہے اس سے منظور ان کی اقتداء کے حکم پر آمادہ کرنے میں مبالغہ کرنا ہے اور اس بات کی تاکید ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اور ان کی قوم کا اقتداء کریں اور اسی لیے اس کو قسم کے ساتھ مصدر کیا، یعنی اس کے شروع میں قسم لائے جو حرفِ لام سے معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ قسم تاکید کرنے کا ایک انتہائی ذریعہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت پہلی آیت سے ایک مدت بعد نازل ہوئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: البتہ یقینی طور پر تمھارے لیے ابراہیم علیہ السلام کے سارے کام میں اقتدائے نیک ہے سوائے ان کے اپنے باپ کے حق میں استغفار میں اس حال میں کہ وہ مشرک ہے۔[5]

﴿ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ﴾ یعنی یہ اسوۂ حسنہ اور اقتدائے نیک جو ہوتا ہے تو اسی کے لیے ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے اور آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ یا جو اللہ تعالیٰ سے خیر کا طمع کرتا ہے دنیا و آخرت میں۔ یہ جملہ "کم" سے بدلِ اشتمال ہے جار کے اعادے سے۔[6] (قاله المحلي تبعا للكواشي) امام ابوحیان رحمہ اللہ وغیرہ نے

---

(1) معاني القرآن (١٥٨/٥) (2) تفسير الطبري (٣١٩/٢٣، ٣٢٠) (3) مستدرك الحاكم (٥٢٧/٢)
(4) تفسير الطبري (٣٢٠/٢٣) (5) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٤٩/١٠) (6) تفسير الجلالين (٧٣٥/١)

کہا ہے کہ بدلِ بعض ہے کل سے۔[1] ﴿ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴾ یعنی اور جو کوئی ابراہیم علیہ السلام اور اس کی امت کا اقتداء کرنے سے اعراض کرے تو بے شک اللہ اپنی خلق سے بے پروا ہے اور اپنے دوستوں کی طرف محمود ہے۔ تاکید کی کوئی قسم نہیں چھوڑی مگر اس کو لایا۔[2] (كذا في فتح البيان)

اللہ پاک نے جو اپنے مومن بندوں کو یہ حکم دیا کہ کافروں سے قطع تعلقی و دشمنی اور کنارہ کشی کریں اور ان سے بیزار ہوں۔ اب ان سے فرماتا ہے کہ تمھارے لیے واقعی ابراہیم علیہ السلام میں اور اس کے متبعین میں اقتدائے نیک تھا جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے بے زار ہوئے اور اس شے سے جس کو تم پوجتے ہو۔ ہم تمھارے دین اور طریقے کے منکر ہوئے اور اب سے یقینی طور پر ہم میں اور تم میں عداوت اور بغض مشروع ہوئی، جب تک کہ تم اپنے کفر پر رہو۔ پس ہم ہمیشہ کے لیے تم سے بیزار ہوتے ہیں اور بغض رکھتے ہیں، یہاں تک کہ تم اللہ تعالیٰ کی توحید کرو اور اسی وحدہ لاشریک کو پوجو اور اس کے ساتھ جن بتوں اور شریکوں کو پوجتے ہو ان کو چھوڑ دو۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم کو ابراہیم علیہ السلام اور اس کی قوم میں اقتدائے نیک ہے کہ تم اس کی پیروی کرو، مگر ابراہیم علیہ السلام کی اپنے باپ کے لیے استغفار میں اقتداء نہیں ہے، بے شک وہ صرف ایک وعدے کی وجہ سے تھا جو ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کر لیا تھا، پھر جب اس کو ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو اس سے بے زار ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مومنین اپنے آباء کے لیے دعا کرتے تھے جو شرک پر مر گئے اور ان کے لیے مغفرت مانگتے اور کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے لیے مغفرت مانگتے تھے، اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴾ [التوبة: ١١٣۔ ١١٤] ”پیغمبر کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت مانگنا وہ صرف وعدے کے سبب سے تھا جو انھوں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا۔ پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہو گئے۔ واقعی ابراہیم علیہ السلام بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔“ اور اس آیت کریمہ میں یوں فرمایا: ﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ

[1] البحر المحيط (٨/٢٥٣) [2] فتح البيان (١٤/٧٧۔٨٠)

وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ یعنی تمھارے لیے مشرکوں کے لیے مغفرت ماننے میں اقتداء نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ، مقاتل بن حیان، ضحاک اور کئی ایک اہلِ علم رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1]

پھر اللہ پاک نے ابراہیم علیہ السلام کے قول کی خبر دی اور ان کے ساتھیوں کی کہ جب انھوں نے اپنی قوم سے علاحدگی اختیار کی اور ان سے بیزار ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف پناہ پکڑی اور اس سے زاری کی۔ چنانچہ کہا: ﴿ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی ہم نے سارے کاموں میں تجھ پر توکل کیا اور اپنے کام تجھ کو سپرد کیے اور تیری طرف دارِ آخرت میں لوٹ کر جانا ہے۔ ﴿ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ کی تفسیر میں امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: تو ان کو ہم پر غالب مت کر کہ وہ اس سے فتنے میں پڑیں اور یہ خیال کریں کہ وہ ہم پر غالب ہوئے تو اس وجہ سے کہ جس پر وہ ہیں وہ حق ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی ہمارے گناہوں کا اپنے غیر سے ستر کر اور ہمارے اور اپنے درمیان ان کو معاف کر، بے شک تو تو ایسا عزیز ہے کہ جس نے تیری بارگاہِ عالی جاہ سے پناہ پکڑی تو اس پر کوئی ظلم نہیں کر سکتا اور تو اپنے اقوال و افعال و شریعت و تقدیر میں حکمت والا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ یہ اول کی تاکید ہے اور اس سے بھی وہی بات مستثنیٰ ہے جس کا پہلے سے استثنیٰ کیا گیا ہے، کیونکہ یہ اقتداء جس کا یہاں اثبات کیا گیا ہے وہی بعینہٖ اول ہے۔

﴿ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ﴾ اس میں ابراہیم علیہ السلام کی اتباع پر ہر اس شخص کو آمادہ کرنا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانے والا ہے۔ ﴿ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾ [إبراهيم: ٨] ”اگر تم سب اور روئے زمین کے تمام انسان اللہ تعالیٰ کی ناشکری کریں تو بھی اللہ تعالیٰ بے نیاز اور تعریفوں والا ہے۔“

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (یعنی بروایتِ علی بن ابی طلحہ) وہ ایسا غنی ہے کہ وہ یقینی طور پر اپنی غنا میں کامل ہوا ہے اور وہ اللہ ہے۔ یہ اس کی صفت ہے جو اس کے سوا کسی اور کے لائق نہیں ہے اس کا کوئی کفو (ہمسر، جوڑ) نہیں اور نہ اس کے مثل کوئی شے ہے۔ ”سُبْحَانَ اللّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ الْحَمِيْدُ الْمُسْتَحْمَدُ إِلَى خَلْقِهِ أَيْ: هُوَ الْمَحْمُوْدُ فِيْ جَمِيْعِ أَقْوَالِهِ وَأَفْعَالِهِ لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ.“[3] (كذا في ابن كثير)

---

[1] تفسير الطبري (٣١٨/٣٢) تفسير ابن كثير (٤٤٥/٤) [2] تفسير الطبري (٣٢٠/٢٣، ٣١٩) [3] تفسير ابن كثير (٤٤٤/٤، ٤٤٥)

بالجملہ جب آیتِ مذکورہ نازل ہوئی تو مومنین نے اپنے آباء وابناء ومشرکین کے تمام قریبیوں کی عداوت میں تشدد کیا تو اللہ پاک نے ان کو اس بات کا طمع دیا کہ شاید یہ حال بدل جائے۔ چنانچہ فرمایا:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

امید ہے کہ اللہ تمھارے اور اُن لوگوں کے درمیان دوستی (پیدا) کر دے جن سے تمھاری دشمنی ہے اور اللہ بہت قدرت والا ہے، اور اللہ غفور رحیم ہے ⑦ اللہ تمھیں ان لوگوں کی بابت نہیں روکتا جو تم سے دین پر نہیں لڑے اور انھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا، کہ تم ان سے بھلائی کرو اور اُن سے انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ⑧ بے شک اللہ تو تمھیں ان لوگوں کی بابت روکتا ہے جو تم سے دین پر لڑے اور انھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالنے میں مدد کی کہ تم ان سے دوستی کرو، اور جو کوئی ان سے دوستی کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں ⑨

عن قریب تم میں اور تمھارے دشمنوں میں محبت پیدا کر دے، یعنی ان کو مسلمان کر دے پھر دوستی تمھاری بجا رہے، ایسا ہی ہوا، اس سفر میں مکہ کے سارے لوگ مسلمان ہو گئے۔ مکہ کے لوگوں میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ خود مسلمان نہ ہوئے اور مسلمان ہونے والے سے ضد بھی نہ کی۔ انتہی[1].

فتح البیان کا بیان:

﴿عَسٰی﴾ کا کلمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہوتا ہے بادشاہوں کی عادت کی طرح، جب وہ بعض حاجات میں ﴿عَسٰی﴾ یا "لَعَلَّ" کہہ دیتے ہیں تو اس کے پورے ہونے میں محتاج کو کچھ شبہہ باقی نہیں رہتا۔ یا اس سے مراد مومنوں کو طمع دینا ہے یا امید دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم میں اور ان میں جن سے تم نے دشمنی کی ہے دوستی کر دے اور

اللہ تعالیٰ کی قدرت دلوں کو مائل کر دینے میں بہت مؤثر اور وسیع ہے اور حالات کو تبدیل کرنے میں اور دوستی کے اسباب آسان کر دینے میں اس کی قدرت بہت وسیع ہے اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت بھی بہت زیادہ ہے اس شخص کے لیے جو مشرکوں میں سے مسلمان ہو گیا۔ تم میں اور تمھارے دشمنوں میں دوستی کر دینے کا یہ مطلب ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں تو تمھارے دین والے ہو جائیں گے۔ فتح مکہ کے بعد ان میں سے ایک قوم مسلمان ہوگئی اور ان کا اسلام اچھا ہوا اور ان میں اور ان سے پہلے جو مسلمان ہو گئے تھے ان میں دوستی ہوگئی اور جہاد کیا اور ایسے کام کیے جو اللہ تعالیٰ کی طرف قریب کرنے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَوَدَّةً ﴾ سے یہاں مراد نبی مکرم ﷺ کا اُمِ حبیبہ سے نکاح کر لینا ہے جو بنت سفیان تھیں تو وہ تو اُم المومنین ہوگئیں اور معاویہ رضی اللہ عنہ اس رشتے سے مومنین کے ماموں ہو گئے۔

یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے[1] لیکن اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ گو یہ ان باتوں میں سے ہے جو مودت (محبت) کا سبب بن گئی، کیوں کہ اس کے بعد ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی عداوت ترک کر دی جس پر وہ پہلے قائم تھے، لیکن وہ دوستی حاصل نہیں ہوئی مگر فتح مکہ کے دن ان کے اسلام لانے سے اور اس کے مابعد میں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس نے سب سے پہلے مرتدین سے جنگ کی اللہ تعالیٰ کا دین قائم ہونے پر وہ ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ ہیں اور انھی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۚ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾[2] (أخرجه ابن مردويه عن الزهري عن أبي سلمة بن عبد الرحمن)

امام زہری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب کو بعض یمن پر عامل بنایا۔ پھر جب آپ ﷺ مقبوض ہوئے (یعنی وفات پائی) تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ متوجہ ہوئے اور ذوالخمار سے اس حال میں ملے کہ وہ مرتد تھا، پس وہ ان میں سے سب سے پہلے ہیں جس نے ردت (مرتد ہونے والوں) میں جنگ کی (ابن کثیر میں اس کے بعد "فقاتله" ہے، یعنی پھر ابوسفیان رضی اللہ عنہ ذوالخمار سے لڑے) اور دین کی طرف سے لڑا، کہا: اور وہ ان میں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۚ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾[3] (أخرجه ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے تین چیزیں عطا فرمائیں۔ فرمایا: ہاں! عرض کی کہ آپ مجھے امیر بنائیں، یہاں تک کہ میں کفار سے لڑوں، جیسا کہ میں مسلمانوں سے لڑا کرتا تھا۔ فرمایا: ہاں۔ عرض کی: اور معاویہ ہے، آپ اسے اپنی روبکاری میں منشی بنائیں (کاتب)

---

① دلائل النبوة للبيهقي (٤٥٩/٣) ② الدر المنثور (١٣٠/٨)
③ تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٤٩/١٠) تفسير ابن كثير (٤٤٦/٤) یہ روایت مرسل ہے۔

بنائیں۔ فرمایا: ہاں! عرض کی: اور میرے پاس عرب کی سب سے حسین وجمیل ام حبیبہ بنت ابوسفیان ہے، میں آپ کا اس سے نکاح کر دوں۔[1] (الحديث أخرجه مسلم)

علامہ محمد بن ابراہیم وزیر نے تنقیح میں فرمایا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں: ابن حزم نے کہا کہ یہ موضوع ہے اس کے وضع میں کچھ شک نہیں۔ اس میں آفت عکرمہ بن عمار کی طرف سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے جو بات ذکر کی ہے، حفاظ نے اس کو رد کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کے کلام کے ضعف کو بیان کرنے میں ایک الگ جزو جمع کیا ہے۔ حدیث میں غلط ہے اور وہم ہے اور اس عورت کے نام کے بارے میں جس کے لیے نبیِ مکرم ﷺ کا پیام کیا گیا، وہ عزہ اخت اُم حبیبہ ہے۔ سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پیام کیا اور اس کی بہن اُم حبیبہ نے آپ سے اس کے لیے پیام کیا، جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہوا ہے۔[2] پس نبیِ مکرم ﷺ نے ان دونوں کو خبر دی کہ دو بہنوں کا جمع کرنا حرام ہے اور اس کے لیے بہت سی تاویلیں بیان کی ہیں، یہ تاویل ان سب میں قریب تر ہے اور تاویل کی موجب یہ بات ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ کا ابوسفیان کے اسلام لانے سے پہلے اُم حبیبہ سے نکاح کرنا معلوم ہے۔[3]

پھر جب اللہ پاک نے کافروں سے دشمنی رکھنا اور ان کی دوستی کو چھوڑ دینا بیان فرمایا جو مومنوں کو لائق ہے تو ان میں سے جس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا جائز ہے اور جس کے ساتھ جائز نہیں ہے، اس بارے میں تفصیل بیان کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ ﴾۔ ﴿ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ ﴾ بدلِ اشتمال ہے موصول سے، یعنی اللہ تم کو اس سے منع نہیں کرتا کہ ان لوگوں سے جو تم سے نہ تمھارے دین میں لڑے اور نہ تم کو تمھارے گھروں سے نکالا نیکی اور عزت کرو۔ اسی طرح ﴿ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ﴾ بھی بدل ہے موصول سے، یعنی اور اللہ تم کو اس سے منع نہیں کرتا کہ تم ان کو مال کا ایک حصہ پہنچاؤ اور ان میں اس طرح سے عدل کرو کہ ان سے احسان و نیکی کرو۔ ”يُقَالُ: أَقْسَطْتُ إِلَى الرَّجُلِ إِذَا عَامَلْتَهُ بِالْعَدْلِ“

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں اور اللہ تعالیٰ تم کو اس سے منع نہیں کرتا کہ اس عہد کے وفا کرنے میں عدل کرو جو تمھارے اور اُن کے درمیان ہے۔ اور ان پر ظلم مت کرو اور جب اللہ پاک نے مشرک کے حق میں ظلم سے منع کیا ہے تو پھر مسلم کے حق میں ظلم کی ممانعت کا کیا حال ہوگا۔[4] امام ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یعنی اس سے کہ تم ان کو اپنے اموال سے صلہ کے طریق پر ایک قسط ادا کرو، اس قسط سے مراد عدل نہیں ہے، کیوں کہ عدل تو اس شخص کے حق میں واجب ہے جو لڑا اور اس کے حق میں جو نہیں لڑا۔[5]

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ آیت کے

[1] صحيح مسلم (٢٥٠١) [2] صحيح البخاري (٤٨١٣) صحيح مسلم (١٤٤٩) [3] فتح البيان (١٤/٨١)
[4] فتح القدير (٥/٢٨٣) فتح البيان (١٤/٨٣) [5] تفسير القرطبي (١٨/٥٩)

معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک منع نہیں کرتا ان اہلِ عہد سے احسان کرنے سے جو کفار میں سے ہیں۔ جنھوں نے مومنوں سے اس بات پر معاہدہ کیا ہے کہ وہ نہ خود جنگ کریں گے اور نہ ان کے خلاف کفار کی مدد کریں گے اور نہیں منع کرتا ان کے معاملے میں عدل کرنے سے۔ ابن زید نے کہا کہ یہ اسلام کے شروع میں تھا جب موادعت (پر امن رہنے) کا اور ترک امر بالقتال کا وقت تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قول سے منسوخ ہوا: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] ''مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔'' کسی نے کہا کہ یہ حکم اس صلح میں ثابت تھا جو نبی ﷺ اور قریش کے درمیان تھی۔ پھر جب وہ صلح فتح مکہ سے زائل ہو گئی تو وہ حکم منسوخ ہو گیا۔ کسی نے کہا کہ یہ آیت نبی ﷺ کے خلفاء میں اور ان میں خاص ہے جن کے اور آپ کے درمیان عہد تھا۔ (قاله الحسن) امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ خزاعہ و بنی الحارث بن عبد مناف ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بارے میں خاص ہے، جو ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ عورتوں بچوں کے متعلق خاص ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اکثر اہلِ تاویل سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ زیادہ مناسب یہی ہے کہ بدلیلِ حدیث اسماء رضی اللہ عنہا کے جو متفق علیہ ہے۔[1]

سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: قتیلہ (فتح البیان و فتح القدیر میں قتیلہ بہ تائے مثناۃ فوقیہ ہے اور ابن کثیر میں ایک جگہ تو بتیلہ بہ یائے موحدہ ہے اور دوسری جگہ قبیلہ بہ یائے موحدہ بنت عبد العزی ابن اسعد من بنی مالک بن حسل ہے۔ واللہ أعلم) بنت عبد العزی اپنی بیٹی اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کے پاس تحفے لے کر آئی۔ گوہیں اور پنیر اور گھی اور وہ مشرک تھی تو اسماء نے اس سے تحفہ قبول کرنے سے انکار کیا، یا اس کو اپنے گھر میں داخل کرنے سے انکار کیا، یہاں تک کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف کہلا بھیجا کہ تو رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھ، پس انھوں نے آپ ﷺ سے پوچھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی تو اسماء رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ اس کا تحفہ قبول کرے اور اس کو اپنے گھر میں داخل کرے۔ (أخرجه أحمد والبزار وأبو يعلىٰ وغيرهم)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کیا کہ اس مدت میں جو قریش کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تھی۔[2]

بخاری و مسلم وغیرہما میں ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میرے پاس میری ماں راغب ہو کر (یعنی مجھے دینے کے لیے اور صلہ رحمی کے لیے) آئی اور وہ مشرک تھی عہدِ قریش میں جبکہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ کیا تھا۔ تو میں نے آپ ﷺ سے پوچھا: کیا میں اس سے صلہ رحمی کروں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

---

[1] تفسیر القرطبي (٥٩/١٨) البتہ متفق علیہ روایت آگے آئے گی۔

[2] مسند أحمد (٤/٤) مسند البزار (١٦٧/٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٣٣٤٩/١٠) فتح البیان (٨٢/١٤) اس کی سند میں ''مصعب بن ثابت'' ضعیف راوی ہے۔

﴿ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ... الآية ﴾ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں « صِلِي أُمَّكِ »[1] یعنی تو اپنی ماں سے صلہ رحمی کر۔ چنانچہ اللہ پاک نے ان لوگوں کا حال بیان کیا جن کے ساتھ نیکی کرنا حلال نہیں اور نہ ان کے معاملے میں عدل کرنا۔ پس فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ... الآية ﴾

﴿ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ﴾ بدلِ اشتمال ہے موصول سے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تو تم کو صرف اس سے منع کرتا ہے کہ تم ان سے دوستی کرو جو تم سے لڑے اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا، یہ لوگ قریش میں سے صنادید کفار (کافروں کے سردار) اور اہلِ مکہ کے سرکش لوگ ہیں اور ان لوگوں سے بھی دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے اس نکالنے پر ان کی معاونت کی جو تم سے لڑے اور تم کو نکالا۔ یہ باقی اہلِ مکہ ہیں اور وہ جو اُن کے ساتھ ان کے عہد میں داخل ہوئے۔ ﴿ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ یعنی اور جو کوئی ان سے دوستی کرے تو وہی لوگ ظلم میں کامل ہیں، کیوں کہ انھوں نے اس سے دوستی کی جو عداوت کا مستحق ہے، اس وجہ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول ﷺ کا اور اس کی کتاب کا دشمن ہے اور ان کو اپنے لیے دوست ٹھہرایا۔ ﴿ يَتَوَلَّهُمْ ﴾ میں تو ﴿ مَنْ ﴾ کے لفظ کی رعایت کی اور ﴿ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ میں اس کے معنی کی رعایت فرمائی۔[2] (كذا في فتح البيان)

اللہ تعالیٰ مومنوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر سکتا ہے:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے مومن بندوں کو کفار سے عداوت رکھنے کا حکم دیا، اس کے بعد ان سے فرماتا ہے: ﴿ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ ﴾ یعنی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم میں اور تمھارے دشمنوں میں بغض کے بعد محبت پیدا کر دے اور نفرت کے بعد مودت کر دے اور فرقت کے بعد الفت کر دے اور اللہ تعالیٰ اس شے پر قدرت والا ہے جس کو چاہتا ہے، یعنی جو اشیاء آپس میں نفرت کرنے والی ایک دوسرے سے علاحدہ اور مختلف ہیں ان کو اکٹھا کر دیتا ہے، پس عداوت اور سختی کے بعد دلوں میں اُلفت پیدا کر دیتا ہے، پھر وہ اکٹھے اور متفق ہو جاتے ہیں، جیسا کہ انصار پر احسان رکھ کے فرمایا ہے: ﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْھَا ﴾ [آل عمران: ۱۰۳] ''اور اللہ تعالیٰ کی اس وقت کی نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' تو اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی، پس تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے تو اس نے تمھیں بچا لیا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمھارے لیے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''

---

[1] صحيح البخاري (٢٤٧٧) صحيح مسلم (١٠٠٣) شعب الإيمان (٦/٢١٠) [2] فتح البيان (١٤/٨٠-٨٣)

اور اسی طرح نبیِ مکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: «أَلَمْ أَجِدْكُمْ ضُلَّالًا فَهَدَاكُمُ اللّٰهُ بِي وَكُنْتُمْ مُتَفَرِّقِينَ فَأَلَّفَكُمُ اللّٰهُ بِي »[1] ''کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمھیں ہدایت نصیب فرمائے اور کیا تم منتشر نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمھارے درمیان الفت پیدا کر دی۔'' اور اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ۝ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [الأنفال: ٦٢۔ ٦٣] ''اسی نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے تیری تائید کی ہے۔ ان کے دلوں میں باہمی الفت بھی اسی نے ڈالی ہے، زمین میں جو کچھ ہے تو اگر سارے کا سارا خرچ کر ڈالتا تو بھی ان کے دل آپس میں نہ ملا سکتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جس نے ان میں الفت ڈال دی ہے وہ غالب حکمتوں والا ہے۔'' حدیث شریف میں ہے: «أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَا فَعَسَى أَنْ يَكُونَ بَغِيضَكَ يَوْمًا مَا وَأَبْغِضْ بَغِيضَكَ هَوْنًا مَا فَعَسَى أَنْ يَكُونَ حَبِيبَكَ يَوْمًا مَا »۔[2] مطلب یہ ہے کہ دوستی اور دشمنی میں مبالغہ خوب نہیں ہے، شاید دوست کبھی دشمن ہو جائے اور دشمن کبھی دوست بن جائے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

وَقَدْ يَجْمَعُ اللّٰهُ الشَّتِيتَيْنِ بَعْدَ مَا   يَظُنَّانِ كُلَّ الظَّنِّ أَنْ لَّا تَلَاقِيَا

یعنی کبھی اللہ تعالیٰ دو متفرق کو جمع کر دیتا ہے، اس کے بعد کہ ان کا پکا خیال تھا کہ وہ نہیں ملیں گے۔

﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے ان کا کفر بخش دیتا ہے جب وہ اس سے توبہ کرتے ہیں اور اپنے رب تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور اس کے مطیع اور فرمانبردار ہو جاتے ہیں اور وہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے اور ہر اس شخص پر جو اس کی طرف رجوع ہوا کسی بھی گناہ سے ہو۔ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوسفیان صخر بن حرب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی بیٹی سے نکاح کر لیا تو یہ آپ ﷺ میں اور ان میں مودت ہو گئی،[3] لیکن اس قول میں نظر ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ نے اُم حبیبہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا سے فتح مکہ سے پہلے نکاح کیا اور ابوسفیان فتح کی شام میں مسلمان ہوئے بغیر کسی خلاف کے۔ پھر ''وأحسن من هذا'' کہہ کر بروایت امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ وہی قصہ ابوسفیان کے عامل بنانے کا ذکر کیا ہے جو مذکور ہو چکا ہے۔ پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیثِ مذکور ذکر کی ہے۔[4]

جنگ نہ کرنے والے کفار سے احسان کرنے کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ان کافروں پر احسان کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے معاملے میں نہیں لڑے، جیسے: عورتیں اور ان میں سے ضعیف لوگ۔ یہ کہ تم ان پر احسان کرو اور عدل

[1] صحيح البخاري (٤٠٧٥) صحيح مسلم (١٠٦١)
[2] سنن الترمذي (١٩٩٧) صحيح الجامع (١٧٨)
[3] تفسير ابن كثير (٤٤٦/٤)
[4] ان دونوں کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کرو۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ پھر بروایتِ امام احمد رحمہ اللہ اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث دو طریق سے ذکر کی ہے۔[1] اس کے بعد سیدہ عائشہ اور اسماء رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ دونوں نے کہا ہے کہ ہماری ماں ہمارے پاس مدینے میں آئی اور وہ مشرک تھی... الخ۔ یہ روایت امام بزار رحمہ اللہ کی ہے۔ پھر امام بزار رحمہ اللہ نے کہا: ''ہم اس حدیث کو عن الزهري عن عروة عن عائشة کی سند سے صرف اس واسطے سے جانتے ہیں۔''[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس سیاق سے منکر ہے، کیوں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ ام رومان ہیں اور وہ مسلمان اور مہاجر ہیں اور اسماء رضی اللہ عنہا کی والدہ اور ہیں، چنانچہ اس کے نام کی تصریح احادیثِ مقدمہ میں کی گئی ہے۔ ﴿ اَلْمُقْسِطِيْنَ ﴾ کی تفسیر سورۃ الحجرات میں گزر چکی ہے، وہاں یہ صحیح حدیث وارد کی گئی تھی: «اَلْمُقْسِطُوْنَ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ عَنْ يَمِيْنِ الْعَرْشِ الَّذِيْنَ يَعْدِلُوْنَ فِيْ حُكْمِهِمْ وَأَهَالِيْهِمْ وَمَا وَلُوْا»[3] ''انصاف کرنے والے عرشِ الٰہی کی دائیں جانب نورانی منبروں پر براجمان ہوں گے، جو لوگ اپنے فیصلے، اہل وعیال اور جن کے وہ والی ہیں، ان کے بارے میں عدل وانصاف کرتے رہے۔''

جنگجو مشرکین سے دوستی کی ممانعت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو تم کو ان لوگوں کے ساتھ موالات (دوستی) سے منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے عداوت قائم کی، پھر تم سے لڑے اور تم کو نکالا اور تمھارے نکالنے پر معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ موالات سے تم کو منع کرتا ہے اور ان سے دشمنی رکھنے کا تم کو حکم دیتا ہے۔ پھر ان کی دوستی پر سخت قسم کی وعید کی، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾[4] [المائدۃ: ٥١] ''اے ایمان والو! تم یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں، تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے وہ بے شک انہی میں سے ہے، ظالموں کو اللہ تعالیٰ ہرگز راہِ راست نہیں دکھاتا۔'' بالجملہ جب اللہ پاک نے کفار کے دو فریق کے متعلق حکم ذکر کیا کہ پہلے فریق کے لیے نیکی اور احسان وعدل جائز ہے اور دوسرے فریق کے لیے ناجائز تو اب ان لوگوں کے بارے میں حکم ذکر کیا جو ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

---

[1] ان دونوں کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[2] مسند البزار (١٧٠/١٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه البزار عن شيخه عبد الله بن شبيب وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٢٦٥/٨)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٢٧) [4] تفسیر ابن کثیر (٤٤٥/٤-٤٤٧)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ
اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ
اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ
وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ
اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا
مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ
بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ
اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ
اَنْفَقُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

اے ایمان والو! جب تمھارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کا امتحان لو، اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے، پھر اگر تم انھیں مومن جانو تو انھیں کفار کی طرف نہ لوٹاؤ، نہ وہ (عورتیں) ان (کفار) کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) ان (عورتوں) کے لیے حلال ہیں اور تم ان (کفار) کو دے دو جو (مہر) انھوں نے خرچ کیا اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان سے نکاح کر لو، جب تم انھیں ان کے مہر دے دو اور تم کافر عورتوں کی عصمتیں قبضے میں نہ رکھو اور مانگ لو جو (مہر) تم نے خرچ کیا اور چاہیے کہ وہ (کفار) بھی مانگ لیں جو (مہر) انھوں نے خرچ کیا، یہ اللہ کا حکم (فیصلہ) ہے، وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے ⑩ اور اگر تمھاری بیویوں میں کوئی تم سے کفار کی طرف چلی جائیں، پھر تم (کفار سے) بدلہ لو (اور غنیمت ہاتھ لگے) تو جن کی بیویاں چلی گئیں، انھیں اس (مہر) کے برابر دے دو جو انھوں نے خرچ کیا اور تم اللہ سے ڈرو، جس پر تم ایمان رکھتے ہو ⑪

یہ حکم ہوا کہ کسی کافر کی عورت مسلمان ہو کر آئے اس مرد نے جو اس پر خرچ کیا تھا وہ اسے لوٹا دینا چاہیے جو مسلمان اس کے ساتھ نکاح کرے وہ لوٹائے اور اس عورت کو مہر الگ سے دے، پھر نکاح کرے اور اس کے مقابل یہ حکم ہوا کہ جس مسلمان کی عورت کافر رہ گئی وہ اس کو چھوڑ دے، پھر جو کافر اس کے ساتھ نکاح کرے، وہ اس مسلمان

کا خرچ کیا ہوا لوٹائے۔ یہ حکم اترا تو مسلمان دینے کے لیے بھی اور لینے کے لیے بھی تیار ہو گئے لیکن کافروں نے دینا قبول نہ کیا، تب اگلی آیت اتری کہ اگر تمھارے ہاتھ سے تمھاری کوئی عورتیں کافروں کی طرف چلی جائیں تو تم گھا مارو اور ان کو جن کی عورتیں جاتی رہیں اتنا دو جتنا انھوں نے خرچ کیا تھا اور اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم کو یقین ہے۔ یعنی جس مسلمان کی عورت گئی اور کافر اس پر خرچ کیا ہوا واپس نہیں کرتے تو جس کافر کی عورت آئی اس کا خرچ دینا تھا وہ اس کو نہ دیں اسی مسلمان کو دیں۔ یہ مال اس مال کے بدلے میں رکھا۔

یہ حکم اس وقت تھا جب کافروں سے صلح ٹھہر گئی تھی مال کے واپس دینے پر۔ اب یہ حکم نہیں ہے، ہاں اگر تمھیں ایسی صلح کا اتفاق ہو جائے تو پھر ہو سکتا ہے۔ اور عورتوں کا امتحان لینے کے لیے فرما دیا کہ دل کی خبر اللہ کو ہے مگر ظاہری طور پر امتحان لینا چاہیے کہ اگلی آیت میں جو حکم ہیں وہ قبول کریں تو ان کا ایمان ثابت سمجھو۔ یہ آیت بیعت کی ہے۔ نبیِ مکرم ﷺ سے عورتیں بیعت کرتی تھیں تو یہی اقرار لیتے تھے۔ انتہیٰ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے جب حدیبیہ کے دن اس شرط پر صلح کی کہ آپ ﷺ اس شخص کو جو اُن میں سے مسلمان ہو کر آئے قریش کی طرف لوٹا دیں۔ پھر جب عورتوں نے آپ کی طرف ہجرت کی تو اللہ پاک نے یہ نہ مانا کہ مشرکوں کی طرف پھیر دی جائیں اور اُن کے امتحان کا حکم دیا، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما اور مروان بن حکم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حدیبیہ کے دن کفارِ قریش سے معاہدہ کیا تو آپ ﷺ کے پاس مسلمان عورتیں آئیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾

تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس دن دو عورتوں کو طلاق دے دی جو ان کی بیویاں تھیں اور شرک پر تھیں۔[1] (وأخرجه أيضا من حديثهما بأطول من هذا) مسور رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ اُم کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط ان عورتوں میں سے تھی جو رسول اللہ ﷺ کی طرف نکلی تھیں اور وہ عاتق تھی، یعنی اپنے ماں باپ کے گھر میں جوان تھی تو اس کے گھر والے آئے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کرتے تھے کہ آپ اس کو ان کی طرف پھیر دیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مومنات کے حق میں یہ آیت نازل کی: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ﴾[2]۔

ان عورتوں کا نام مومنات رکھا، اس لیے کہ انھوں نے کلمہ شہادت زبان سے ادا کیا، یا اس لیے کہ وہ اس کے قریب ہونے والی تھیں۔ امتحان لینے سے ان کا ایمان ثابت ہو جائے گا، یعنی اے ایمان والو! جس وقت تمھارے پاس ایمان والی عورتیں کفار کے درمیان سے وطن چھوڑ کر آئیں تو تم ان کا امتحان لو، ان کو جانچو۔ اس میں اختلاف ہے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٨١) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٦٤)

کہ کس چیز کے ساتھ ان کا امتحان لیتے تھے۔ چنانچہ کسی نے تو کہا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی قسم لیتے تھے کہ وہ خاوند کے بغض سے نہیں نکلی ہیں اور نہ ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف اعراض کر کے آئی ہیں اور نہ دنیا کی تلاش میں آئی ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اور اس کے دین کی رغبت کے لیے آئی ہیں۔

پھر جب اس نے ایسی قسم کھا لی تو نبی مکرم ﷺ اس کے خاوند کو اس کا مہر ادا کرتے اور وہ جو اس نے اس پر خرچ کیا وہ ادا کرتے اور اسے اس کی طرف واپس نہیں کرتے تھے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ جس وقت عورت نبی مکرم ﷺ کے پاس آئی تو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس کو قسم کھلاتے تھے کہ ”بِاللّٰهِ مَا خَرَجْتُ رَغْبَةً بِأَرْضٍ عَنْ أَرْضٍ، وَبِاللّٰهِ مَا خَرَجْتُ مِنْ بُغْضِ زَوْجٍ، وَبِاللّٰهِ مَا خَرَجْتُ لِالْتِمَاسِ دُنْيَا، وَبِاللّٰهِ مَا خَرَجْتُ إِلَّا حُبًّا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهِ“[1] (أخرجه الطبراني وغيره بسند حسن) کسی نے کہا ہے کہ امتحان یہ ہے کہ وہ اس بات کی گواہی دے کہ ”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ“

پھر جب وہ جان لیتے کہ یہ ان کی طرف سے حق ہے تو کفار کی طرف لوٹائی نہ جاتیں اور اس کا خاوند اگر ان کافروں میں سے ہوتا جن کے لیے رسول اللہ ﷺ نے عہد کیا تو اس کو اس عورت کا مہر دیا جاتا جو اس نے اس کو دیا تھا اور ان عورتوں کو مومنوں کے لیے حلال کر دیتے جب وہ ان کو ان کے مہر دے دیں۔[2] (قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما) کسی نے کہا کہ امتحان صرف یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان پر یہ آیت پڑھ دیتے، یعنی ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ ... ﴾ اہل علم نے دو باتوں میں اختلاف کیا ہے کہ عورتیں عہد ہدنہ (صلح نامہ) میں داخل ہیں یا نہیں۔ پہلے قول کی بنا پر تو یہ آیت اس عہد کی مخصص ہوگی، اکثر اسی کے قائل ہیں اور دوسرے قول کی بنا پر نہ نسخ ہے نہ تخصیص۔

﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ﴾ جملہ معترضہ ہے اس سے یہ بات بیان کرنا منظور ہے کہ ان کی حقیقتِ حال کو سوا اللہ پاک کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اس نے تم کو اس کا مکلف نہیں کیا ہے، تم کو تو صرف اس کی تکلیف دی ہے کہ تم ان کا امتحان لے لو، یہاں تک کہ تم کو وہ بات ظاہر ہو جائے جو اس پر دال ہو کہ انھوں نے جو اسلام کی طرف راغب ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اس میں ان کا دعویٰ سچا ہے۔

﴿ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ﴾ یعنی پھر اگر امتحان کے بعد جس کا تم کو حکم دیا گیا ہے، ظاہری طور پر تم ان کو مومن جان لو تو اُن کو ان کے کافر خاوندوں کی طرف مت پھیرو۔ ”علم“ سے مراد ظنِ غالب ہے جو علامات کے ظاہر ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ ظن کا نام علم رکھنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ظنِ غالب اور وہ شے جس کی طرف قیاس لے جاتا ہے وہ علم کے قائم مقام ہے اور اس کا صاحب اللہ تعالیٰ کے اس

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٠/١٠) تفسير الطبري (٣٢٥/٢٣) المعجم الكبير (١٢٧/١٢) [2] الدر المنثور (١٣٤/٨)

قول کے تحت میں داخل نہیں ہے: ﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ [بني إسرائيل: ٣٦] ''جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑ۔''

امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علم سے مراد ظن ہے، اس کا نام علم یہ بات بتانے کے لیے رکھا گیا کہ اس پر عمل واجب ہونے میں وہ علم کے مثل ہے۔ اس بنا پر کلام میں استعارہ تبعیہ ہو گا۔ یہ آیت عورتوں کی نسبت رد کرنے کی شرط کو منسوخ کرتی ہے اس شخص کے مذہب کے مطابق جو سنت کا نسخ قرآن سے جائز سمجھتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ نسخ کے قبیل سے نہیں ہے، یہ تو تخصیص کے قبیل سے ہے، یا تقییدِ مطلق کے باب سے ہے، اس لیے کہ عقد کا اطلاق اس شخص کے پھیرنے میں کیا گیا جو مسلمان ہو گیا تو ظاہر ہوا عموم رجال میں عورتوں کے ساتھ۔

پھر اللہ پاک نے اس کے عموم سے عورتوں کا نکلنا بیان کیا اور مردوں اور عورتوں میں اس طرح سے فرق کیا جاتا ہے کہ پھیر دینے میں جو فتنے کا خوف عورت پر ہے وہ مرد پر نہیں ہے۔ عورت پر یہ خوف ہے کہ مشرک اس سے صحبت کرے گا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ عورت پر مرتد ہو جانے سے امن نہیں ہے جبکہ وہ خوف دلائی جائے اور اس پر زبردستی کی جائے، اس لیے کہ اس کا دل ضعیف ہے اور یہ وجہ ہے کہ عورت کو یہ بات کم سوجھتی ہے کہ اس سے نکل جائے اس طریقے سے کہ کفر کا کلمہ مع توریہ ظاہر کر دے اور ایمان کا کلمہ پوشیدہ رکھے، یا دل ایمان پر مطمئن ہو اور مرد پر اس بات کا خوف نہیں کیا جاتا، اس لیے کہ وہ قوی دل ہوتا ہے اور اس کو ویسی بات سوجھتی ہے۔ (كذا في الخطيب)

بالجملہ اگر تم کو ان کے مومن ہونے کا ظنِ غالب ہو جائے تو ان کو کافروں کی طرف مت پھیرو۔ پھر اس نہی کی یہ علت بیان فرمائی: ﴿ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ﴾ یعنی اس لیے نہ پھیرو کہ نہ وہ عورتیں ان مردوں کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ مرد ان عورتوں کے لیے حلال ہیں۔ اس سے یہ نکلا کہ مومن عورت کسی کافر کے لیے حلال نہیں ہے اور عورت کا اسلام لے آنا اس کی اپنے خاوند سے علاحدگی کا سبب ہوتا ہے اگر خاوند اسلام نہ لائے، نہ کہ صرف ہجرت۔ اس کی تکرار اس کی حرمت کی تاکید کے لیے ہے۔ یا پہلا جملہ زمانہ حال میں ممانعتِ حِل کے لیے ہے اور دوسرا جملہ زمانہ آئندہ میں حلال ہونے کی ممانعت کے لیے ہے۔ یا پہلا جملہ نکاح کے ٹوٹ جانے کا بیان کرتا ہے اور دوسرا جملہ نئے نکاح کی ممانعت کے لیے ہے۔

پھر والیانِ امور کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ﴾ یعنی اے حاکمو! ان عورتوں کے خاوندوں کو جو کہ ہجرت کر آئی ہیں اور اسلام لائی ہیں، ان کے مہروں کے جتنا دو جو انھوں نے ان پر خرچ کیے ہیں۔ امر وجوب کے لیے ہے تو اب منسوخ ہو کر ندب (نفل) نہیں ہو جائے گا، جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ تو منسوخ نہ ہو گا دینے کا وجوب یا استحباب، یہ جو ہے تو صرف اہلِ ذمہ کی عورتوں کے سلسلے میں ہے جیسا کہ آیت کا وارد ہونا یہی ہے، اس لیے کہ آیت ان اہلِ مکہ کی عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن سے نبیِ مکرم ﷺ نے صلح کی تھی۔

رہیں حربیوں کی عورتیں جن کے لیے عہد عقد نہیں کیا گیا تھا تو نہ ان کے مہر کا لوٹانا بالاتفاق واجب ہے نہ مسنون ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ بھی اتفاقاً اسی کے قائل ہیں اور بات ویسی ہی ہے جو انھوں نے کہی۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا اور جب اس عورت کے خاوند کے علاوہ کوئی اور رشتہ دار اسے طلب کرے تو وہ بغیر عوض کے اس سے روکی جائے، یعنی واپس نہ کی جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۃ الممتحنہ اس صلح کے بعد نازل ہوئی ہے، اس لیے ان کی جو عورت اسلام لاتی تو اس سے پوچھا جاتا کہ تجھے کس شے نے نکالا؟ پھر اگر وہ اپنے خاوند سے بھاگ کر اور اعراض کر کے نکلی ہوتی تو پھیر دی جاتی اور اگر اسلام میں رغبت کر کے نکلی ہوتی تو روک رکھی جاتی اور اس کے خاوند کو وہ رقم یا مال پھیر دیا جاتا جو اس نے خرچ کیا۔[1] (أخرجه ابن مردويه)

﴿ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ ﴾ یعنی تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تم ان مومن عورتوں سے نکاح کرو۔ نکاح کے وقت ان شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے، یعنی عدت کا پورا ہونا اس صورت میں کہ عورت مدخول بہا ہو اور ولی اور دو گواہ ہوں اور مدخول بہا وغیرہ کی جو باقی شرطیں ہیں وہ پوری ہوں، اس لیے کہ وہ عورتیں اب تمھارے اہلِ دین میں سے ہوگئیں گو ان کے کافر خاوندوں نے ان کو طلاق نہیں دی، اس لیے کہ اسلام لانے سے وہ نکاح فسخ ہو گیا۔

﴿ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ﴾ یعنی ان کے ساتھ نکاح کرنے میں کچھ گناہ نہیں ہے، اگر تم ان کو ان کے مہر دے دو، اس لیے کہ مہر بضع کی اُجرت ہے اور یہ نکاح اور مہر دینا اُن کی عدت کے پورا ہونے کے بعد ہے جس طرح کہ وجوبِ عدت کی دلیلیں اس پر دال ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مہاجر عورت پر کچھ عدت نہیں ہے اور اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔

فتح البیان میں ہے کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ امام اوزاعی، لیث، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ یہ آیت اس وہم کا رد ہے کہ ان کے کافر خاوندوں کی طرف ان کے مہر کے پھیرنے سے ان کے لیے نیا مہر مقرر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی جب مسلمان مردان سے نکاح کریں، چنانچہ فرما دیا کہ جو مہر کفار کو دیا گیا، وہ اس مہر کے قائم مقام نہیں ہوتا جو مسلمان پر واجب ہے، جب کہ وہ ان سے نکاح کرے۔ مہر دینے سے مراد اس کا لازم مقرر کر لیا جائے گو بالفعل نہ دیا جائے۔[2]

﴿ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾ جمہور نے ﴿ تُمْسِكُوْا ﴾ کو بہ تخفیف پڑھا ہے امساک سے۔ امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اس کو اختیار کیا ہے اس کی دلیل سے: ﴿ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ [البقرة: ٢٣١] ”تو اب انھیں اچھی طرح بساؤ۔“ اور کسی نے (یعنی امام حسن، ابو العالیہ اور ابو عمرو رحمہم اللہ نے) بہ تشدید پڑھا ہے ”تمسک“ سے یہ دونوں سبعیہ ہیں۔ ”عِصَمٌ“، جمع ہے ”عِصْمَةٌ“ کی ”وَهِيَ مَا يُعْتَصَمُ بِهِ مِنْ عَقْدٍ وَّسَبَبٍ“[3] یعنی جس شے کے

[1] الدر المنثور (٨/١٣٦) [2] فتح البيان (١٤/٨٧) [3] تفسير القرطبي (١٨/٦٥)

ساتھ چنگل مارا جاتا ہے وہ عصمہ ہے گرہ اور رسی۔ یہاں مرادِ عقدِ نکاح کی عصمت ہے۔ "کَوَافِر" جمع ہے "کَافِرَةٌ" کی، یہ وہ عورت ہے جو دار الحرب میں باقی رہ گئی، یا مرتد ہو کر دار الحرب سے لاحق ہو گئی، یعنی تم میں اور ان کافر عورتوں میں کوئی عصمت اور زوجیت کا تعلق نہ ہو۔

مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی کوئی کافر عورت (بیوی) تھی تو وہ اس کی عورت نہیں ہے، اس لیے کہ دین کے اختلاف کی وجہ سے اس کی عصمت منقطع ہو گئی، زوجیت کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہ مسلمان عورت ہے جو دار الحرب سے لاحق ہوتی ہے، پھر کافر ہو جاتی ہے۔ کافر مسلمان عورتوں کو اور مسلمان مشرک عورتوں کو بیاہتے تھے، پھر یہ بات اس آیت سے منسوخ ہو گئی[1] اور یہ آیت کافر مشرک عورتوں کے لیے خاص ہے نہ کہ اہلِ کتاب کی کافر عورتوں کے لیے۔ کسی نے کہا ہے کہ ساری کافر عورتوں کے لیے عام ہے، ان میں سے خاص طور پر اہلِ کتاب کی عورتوں کو خارج کیا گیا ہے۔

جمہور اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ جب کوئی بت پرست یا اہلِ کتاب اسلام لائے تو بیوی اور خاوند کے درمیان علاحدگی عدت پوری ہونے کے بعد ہی کی جائے۔ بعض اہلِ علم نے یوں کہا ہے کہ دونوں میں صرف زوج کے اسلام لانے پر ہی علاحدگی کی جائے اور یہ صرف اسی وقت ہوگا کہ عورت مدخول بہا ہو۔ اور جب وہ غیر مدخول بہا ہو تو اہلِ علم کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسلام کے سبب سے دونوں میں عصمت منقطع ہو گئی، اس لیے کہ اس پر کچھ عدت نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے اور ان کی بیوی پیچھے مشرکوں میں رہ گئی، اس پر اللہ تعالیٰ نے ﴿ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾ نازل فرمائی۔[2]

(أخرجه ابن منيع من طريق الكلبي عن أبي صالح)

﴿ وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ﴾ یعنی تم اپنی عورتوں کے مہر طلب کرو جو کفار کے ساتھ لاحق ہونے والی ہیں اس شخص سے جس نے ان سے نکاح کیا اور چاہیے کہ وہ اپنی عورتوں کے مہر طلب کریں جو ہجرت کر آئی ہیں ہم میں سے اس شخص سے جس نے ان سے نکاح کیا ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ مسلمان عورتوں میں سے جو کوئی مرتد ہو کر ان کفار کی طرف چلی جاتی جو اہلِ عہد سے ہیں تو کفار سے کہا جاتا کہ لاؤ اس کا مہر اور مسلمانوں سے کہا جاتا جب کافروں کی کوئی عورت مسلمانوں کی طرف آتی اور مسلمان ہو جاتی کہ اس کا مہر اس کے خاوند کو لوٹا دو۔ خطیب نے کہا ہے کہ یہ امر دونوں حالوں کے درمیان انصاف اور عدل تھا۔ سلیمان جمل رحمہ اللہ نے اس کے بیان میں طول دیا ہے۔

﴿ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ﴾ یعنی یہ دونوں طرف سے مہروں کا پھیرنا جس کا ذکر ہوا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ ﴿ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ﴾ جملہ مستانفہ ہے یا حالیہ ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ بلیغ العلم ہے کوئی خفی شے اس پر

---

[1] تفسير القرطبي (٦٥/١٨) [2] الدر المنثور (١٣٧/٨)

پوشیدہ نہیں ہے۔ بلیغ الحکمت ہے اپنے اقوال و افعال میں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ امر اس زمانے کے ساتھ مخصوص تھا اس نازل ہونے میں خاص طور پر بہ اجماع مسلمین کے لیے۔[1] بالجملہ جب آیتِ متقدمہ نازل ہوئی تو مسلمانوں نے کہا: ہم اللہ کے حکم سے راضی ہوئے اور مشرکوں کو لکھا تو وہ باز رہے راضی نہ ہوئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا ﴾

یعنی اگر تم سے تمھاری بیویوں سے کوئی شے کفار کی طرف فوت ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کے جو مہر تم نے کفار کو دیے اس میں سے اگر کچھ تم سے فوت ہو جائے۔ کسی نے کہا کہ تمھاری عورتوں میں سے کوئی عورت اگر کفار کی طرف چھٹ بھاگے اور وہ مسلمان عورت مرتد ہو جائے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ اسی قول کی طرف مائل ہیں۔[2] پھر تم کافروں کو لڑائی میں کچھ عقوبت پہنچاؤ۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین نے کہا ہے: "أَيْ: فَغَنِمْتُمْ" یعنی پھر تم غنیمت لو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اس کی تاویل یہ ہے: "وَكَانَتِ الْعُقْبٰى لَكُمْ أَيْ: كَانَتِ الْغَنِيْمَةُ لَكُمْ حَتّٰى غَنِمْتُمْ"[3] یعنی پھر تمھارے لیے غنیمت ہو، حتی کہ تم غنیمت لو۔ کسی نے کہا: یہ معنی ہیں: "ظَهَرْتُمْ وَكَانَتِ الْعَاقِبَةُ لَكُمْ" یعنی تم غالب ہو اور انجام خیر تمھارے لیے ہو۔ (امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: "فغزوتم وغنمتم"[4] یعنی پھر تم چڑھائی کرو اور غنیمت لو۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا: "غزوتم فغنمتم وأصبتم من الكفار عقبى وهي الغنيمة"[5] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: "فأصبتموهم في القتال بعقوبة حتى غنمتم عن الزجاج"[6] شاہ ولی اللہ صاحب نے کہا: پس "عقوبت رسانید کافران را"۔ شیخ سعدی نے کہا: پس "شما غزا کنید وغنیمت گیرید"۔ شاہ رفیع الدین صاحب نے کہا: پس عذاب کرو تم ان کافروں کو) تو ان لوگوں کو جن کی بیویاں جاتی رہیں، اس مہاجر عورت کے مہر جتنا دو، جس سے انھوں نے نکاح کیا ہے اور وہ اس کے کافر خاوند کو مت دو برابر ہے کہ وہ عورت دخول سے پہلے مرتد ہوئی ہو یا دخول کے بعد، چنانچہ حکم ہوا کہ اس خاوند کے لیے پورا مہر غنیمت میں سے ادا کرنا واجب ہے۔

امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ ان کو صرف یہ حکم ہوا کہ اس خاوند کو جس کی عورت جاتی رہی فے وغنیمت میں سے اس کے برابر دیں جو اس نے خرچ کیا۔ یہ آیت منسوخ ہے اس کا حکم منقطع ہو گیا اور فتح کے بعد مرتفع ہو گیا،[7] یعنی اُٹھ گیا اس کی دونوں شقوں کے ساتھ۔ تو جو عورت مسلمان ہو کر آئے اس کا مہر ادا کرنا واجب نہیں واسطے کفار کے اور نہ اس عورت کا مہر اس کے خاوند کو دینا واجب ہے جو مرتد ہو گئی۔ امام عطاء، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ ایک قوم نے کہا ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہے اور ان کو لوٹایا جائے جو انھوں نے خرچ کیا، آیت کے معنی کا

---

1. تفسیر القرطبي (٦٨/١٨) 2. الكشاف (٥١٨/٤) 3. فتح القدير (٢٨٧/٥)
4. تفسیر الجلالين (٧٣٧/١) 5. تفسير الخازن (٨٠/٧) 6. تفسير النسفي (٢٤٠/٤) 7. تفسير القرطبي (٦٩/١٨)

حاصل یہ ہے کہ ﴿ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ ﴾ میں دو احتمال ہیں:

یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ فَاتَكُمْ ﴾ سے متعلق ہو: "أَيْ: مِنْ جِهَةِ أَزْوَاجِكُمْ" اور شے سے مراد وہ مہر ہو جس کی چٹی خاوند نے اُٹھائی، اس لیے کہ تفسیر یوں وارد ہوئی ہے کہ جس وقت مسلمان مرد کی عورت کفار کی طرف بھاگ جائے تو اللہ پاک نے مومنوں کو یہ امر فرمایا کہ جو چٹی اس نے اٹھائی ہے، وہ اس کو دیں۔ نبیِ مکرم ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ یہ کام کیا۔ تفاسیر میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ ﴾ محذوف سے متعلق ہو اس بنا پر ﴿ شَيْءٌ ﴾ کی صفت ٹھہرے۔ پھر یہ جائز ہے کہ ﴿ شَيْءٌ ﴾ سے مہر مراد لیا جائے، لیکن اس بنا پر مضاف محذوف کا ہونا ضروری ہے: "أَيْ: مِنْ مَهْرِ أَزْوَاجِكُمْ" تاکہ موصوف اور صفت باہم مطابق ہو جائیں اور یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ شَيْءٌ ﴾ سے عورتیں مراد لی جائیں: "أَيْ: نَوْعٌ وَّصِنْفٌ مِنْهُنَّ" اور یہ اس قول کا ظاہر ہے: ﴿ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ ﴾ اور اس کا: ﴿ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ ﴾۔ معنی یہ ہیں کہ جس شخص کی عورت مشرکوں کی طرف چلی گئی پھر کافر ہوگئی اور مشرکوں نے اس عورت کا مہر اس کو نہیں پھیرا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو مومنین اس کو اس مہر کے جتنا دیں جو اس نے اس پر خرچ کیا ہے، یہ غنیمت میں سے دیں۔ ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی تم ڈرو اس بات سے کہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا تعرض کرو جو تم پر عقوبت کو واجب کرتی ہے، اس لیے کہ جس ایمان کے ساتھ تم متصف ہو وہ اپنے صاحب پر اس کو واجب کرتا ہے۔[1]

معاہدۂ حدیبیہ کے بعد مہاجر خواتین کو واپس نہ کرنے کی ہدایت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: سورت فتح میں صلح حدیبیہ کا ذکر گزر چکا ہے جو رسول اللہ ﷺ اور قریش کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اس میں یہ ہے کہ اس شرط پر ہوئی تھی کہ ہم میں سے کوئی شخص جو تیرے پاس آئے گا اگرچہ وہ تیرے دین پر ہو تو اس کو ہماری طرف پھیر دے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ صلح اس پر ہوئی تھی کہ نہ آئے ہم میں سے تیرے پاس کوئی، اگرچہ تیرے دین پر ہو، مگر تو اس کو ہماری طرف پھیر دے اور یہ قول امام عروہ، ضحاک، عبدالرحمان بن زید، زہری مقاتل بن حیان اور سدی رحمہم اللہ کا ہے۔ چنانچہ اس آیت کی بنا پر یہ آیت سنت کی مخصص ہو گی "وَهٰذَا مِنْ أَحْسَنِ أَمْثِلَةِ ذٰلِكَ" اور بعض سلف کے طریقے پر ناسخ ہو گی، اس لیے کہ اللہ عزوجل نے اپنے مومن بندوں کو جب ان کے پاس عورتیں وطن چھوڑ کر آئیں، اس بات کا حکم دیا کہ ان کا امتحان لیں اور اگر ان کو مومن سمجھیں تو ان کو کفار کی طرف نہ پھیریں۔ نہ وہ عورتیں ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ مرد ان کے لیے حلال ہیں۔

[1] فتح البیان (۱۴/۸۴۔۸۹)

عبد اللہ بن ابی احمد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اُم کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط نے اپنے وطن سے ہجرت کی تو اس کے دو بھائی عمارہ اور ولید نکلے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں گفتگو کی اور کہا ہے کہ آپ اسے ان کی طرف پھیر دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے بارے میں خاص کر وہ عہد توڑ ڈالا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور مشرکوں کے درمیان تھا اور ان کو منع کیا کہ ان کو مشرکوں کی طرف پھیریں اور اللہ تعالیٰ نے امتحان کی آیت نازل فرمائی۔[1] (ذكره الحافظ ابن كثير في ترجمة عبد الله بن أحمد بن جحش من المسند الكبير من طريق أبي بكر بن أبي عاصم عن محمد بن يحيى الذهلي عن يعقوب بن محمد عن عبدالعزيز بن عمران عن مجمع بن يعقوب عن حنين بن أبي أبانة عن عبد الله... الخ)

اس کے بعد امتحان کا بیان کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ﴾ میں اس بات پر دلالت ہے کہ ایمان پر اطلاع یقیناً ممکن ہے۔ (آیت کی دلالت اس مضمون پر محلِ خفا میں ہے۔ آیت تو اس پر دال ہے کہ بحکمِ امتحان اگر تم ان کو ایمان والیاں جان لو بقرینہ اس کے کہ امتحان صریحاً مذکور ہے اور بقرینہ اس کے کہ ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ﴾ میں حقیقتِ ایمان پر اطلاع ممنوع کی گئی ہے اور بدلیل دلائل کتاب وسنت دیگر کہ جو اس باب میں صریح ہیں کہ غیب پر کسی کو اطلاع نہیں اور ایمان ایک شے قلبی غائب ہے۔ "أَفَلَا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهِ"[2] اس بارے میں نصِ صریح ہے اور بدلیل اس کے کہ اجماعاً بجز منصوص علیہم بالایمان کے کسی کو قطعی کافر یا مومن نہ کہا جائے، اگر اطلاع یقیناً ممکن ہوتی تو یہ اجماع بے محل ہوتا۔ از مصحح)

مسلمان عورتیں مشرکین کے لیے اور مشرک عورتیں مسلمین کے لیے حرام ہیں:

آیت ﴿ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ﴾ یہ وہی آیت ہے جس نے مسلمان عورتوں کو مشرکوں پر حرام کر دیا۔ اسلام کے ابتدا میں یہ جائز تھا کہ مشرک مومن عورت سے نکاح کرے۔ اسی لیے ابو العاص بن ربیع کا قصہ ہوا۔ یہ شخص سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے خاوند اپنی قوم کے دین پر تھے۔ پھر جب وہ بدر کے دن قیدیوں میں پکڑے ہوئے آئے تو ان کی بیوی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے خاوند کے فدیہ میں اپنا ایک قلادہ، یعنی گردن بند بھیجا۔ یہ ان کی والدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تھا۔

پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے شدید رقت ہوئی اور مسلمانوں سے فرمایا: اگر تمھاری یہ رائے ہو کہ اس کے لیے اس کا قیدی چھوڑ دو تو ایسا کرو، چنانچہ مسلمانوں نے ایسا کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

[1] تفسير ابن كثير (٤٤٧/٤، ٤٤٨) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦)

اس کو اس شرط پر چھوڑا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیج۔ چنانچہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ

بات پوری کی اور جو وعدہ آپ ﷺ سے کیا تھا اس میں آپ ﷺ سے سچا برتاؤ کیا اور سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ آپ ﷺ کی طرف بھیج دیا۔① پھر وہ واقعۂ بدر کے بعد سے مدینے میں مقیم رہیں، یہ واقعہ ۲ ہجری میں ہوا، یہاں تک کہ ان کے خاوند ابوالعاص ۸ ہجری میں مسلمان ہوئے تو آپ ﷺ نے پہلے نکاح پر ہی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے خاوند کی طرف پھیر دیا اور ان کے لیے نیا مہر مقرر نہیں فرمایا، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (حدثنا يعقوب، حدثنا أبي، حدثنا ابن إسحاق، حدثنا داود بن الحصين عن عكرمة عن ابن عباس) کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاحبزادی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو بہ نکاحِ اول ابوالعاص کو پھیر دیا اور ان کی ہجرت اپنے خاوند کے اسلام لانے سے چھے سال پہلے تھی اور نہ نئی گواہی کی اور نہ نیا مہر باندھا۔② (ورواه أبو داود وابن ماجه والترمذي)

ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ دو برس کے بعد۔ یہ قول صحیح ہے، اس لیے کہ جب مسلمات کو مشرکین کے لیے حرام کر دیا گیا تو اس سے دو برس بعد ان کے خاوند کا اسلام ہوا۔ ترمذی نے کہا: ''اس حدیث کی سند میں کوئی حرج نہیں، لیکن ہم اس حدیث کی توجیہ نہیں جانتے۔ شاید یہ اختلاف داود بن حصین کے کمزور حافظے کے سبب پیدا ہوا ہے۔ مجھے یہ حدیث عبد بن حمید نے بھی یزید بن ہارون کے واسطے سے محمد بن اسحاق سے سنائی۔ حجاج کی عمرو بن شعیب کی سند سے حدیث ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے اپنی بیٹی سیدہ زینب، ابوالعاص بن ربیع کو نئے مہر اور نئے نکاح سے لوٹائی تو اس کے بارے میں یزید بن ہارون نے کہا: سند کے اعتبار سے عبداللہ بن عباس کی حدیث عمدہ اور اعلیٰ ہے، لیکن عمل عمرو بن شعیب کی حدیث پر ہے۔''③

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''پھر میرا کہنا یہ ہے کہ حجاج بن ارطاۃ عن عمرو بن شعیب کی روایت کو امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام احمد وغیرہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ واللہ أعلم. جمہور نے عبداللہ بن عباس کی حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ عین قضیہ ہے جس میں اس بات کا احتمال ہے کہ ان کی عدت اس سے مکمل نہ ہوئی ہو، کیوں کہ اکثر اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ جب عدت پوری ہو جائے اور وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ جب اس کی عدت پوری ہو جائے تو اسے اختیار ہے، چاہے تو اپنے نکاح پر برقرار رہے اور چاہے تو اسے فسخ کر دے اور نیا نکاح کر لے، چنانچہ انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۶۹۲) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (۴۳/۵)

② مسند أحمد (۲۶۱/۱) سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۲۴۰) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱۴۳) سنن ابن ماجه (۲۰۰۹) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (إرواء الغليل: ۳۳۹/۶)

③ مسند أحمد (۲۰۷/۲) سنن الترمذي (۱۱۴۲) اس کی سند میں ''حجاج بن ارطاۃ'' مدلس ہے۔ مزید دیکھیں: (إرواء الغليل: ۳۴۱/۶)

اسی پر محمول کیا ہے۔'' واللہ أعلم.[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ ﴾ امام مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ یہ ان کافروں کے لیے ہے جن کے لیے عہد نہیں ہے۔[2] جب ان کی طرف کوئی عورت بھاگ جائے اور وہ اس کے خاوند کو کچھ نہ دیں تو جس وقت ان میں سے کوئی عورت آ جائے تو اس کے خاوند کو کچھ نہ دیں یہاں تک کہ جو عورت اُن کی طرف چلی گئی ہے اس کے خاوند کو اس جیسا دے جو اس نے اس پر خرچ کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بہ سندِ خود زہری رحمہ اللہ سے راویت کیا ہے کہ مسلمانوں نے اللہ کے حکم کا اقرار کیا تو مشرکوں کے اخراجات ان کی اپنی عورتوں پر ہوئے تھے جن کی ادائیگی کا اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا تو مومنوں نے تو وہ اخراجات مشرکوں کو ادا کر دیے اور مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا اقرار کرنے سے انکار کر دیا اور مسلمانوں کے وہ اخراجات ادا کرنے سے انکار کر دیا جن کا ادا کرنا اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے فرمایا: ﴿ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ ﴾

چنانچہ اس آیت کے بعد اگر مومنوں کی عورتوں میں سے کوئی عورت مشرکوں کی طرف چلی جائے وہ مومنین اس کے خاوند مومن کو وہ خرچہ پھیر دیں، جو اس نے اس عورت پر کیا ہے اس عقب میں سے جو ان کے قبضہ میں ہے۔ یہ وہ عقب ہے جس کا مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اس کو مشرکوں پر ان اخراجات کے بدلے میں پھیر دیں جو انھوں نے اپنی ان عورتوں پر کیے تھے جو ایمان لائیں اور ہجرت کر آئیں۔ ''ثُمَّ رَدُّوْا إِلَى الْمُشْرِكِيْنَ فَضْلًا إِنْ كَانَ بَقِيَ لَهُمْ وَالْعَقْبُ مَا كَانَ بَقِيَ مِنْ صِدَاقِ نِسَاءِ الْكُفَّارِ حِيْنَ آمَنَّ وَهَاجَرْنَ'' یعنی کسی مومن کی عورت جو مشرکوں کی طرف چلی گئی ہے، اس کے خاوند کو عقب کی جائیداد سے اس کا خرچہ دے دیں، پھر اگر اس جائیداد سے مشرکوں کا کچھ حصہ باقی رہا ہو تو وہ انہیں کو پھیر دیں۔

عقب وہ مال ہے جو کفار کی عورتوں کے مہر سے باقی رہا، جبکہ وہ ایمان لائیں اور ہجرت کی۔ امام عوفی رحمہ اللہ کی روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ اگر مہاجرین میں سے کسی مرد کی عورت کفار سے جا ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرد کے لیے یہ حکم دیا کہ جو کچھ اس نے خرچ کیا ہے، اس جتنا غنیمت میں سے اس کو دیا جائے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ﴿ فَعَاقَبْتُمْ ﴾ ''أَيْ: أَصَبْتُمْ غَنِيْمَةً مِنْ قُرَيْشٍ وَغَيْرِهِمْ''[3] یعنی پھر تم قریش سے یا اس کے علاوہ سے غنیمت پاؤ۔

﴿ مِثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا ﴾ سے مراد اس عورت کا مہرِ مثل ہے۔ اسی طرح امام مسروق، ابراہیم، قتادہ، مقاتل، ضحاک، سفیان بن حسین اور زہری رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے۔ یہ قول پہلے قول کے خلاف نہیں ہے۔ (لينظر ما القول الأول في المقام) اس لیے کہ اگر پہلا ممکن ہو تو زیادہ بہتر وہی ہے، ورنہ پھر ان غنائم سے دیں جو کفار کے ہاتھوں سے لی جاتی

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٤٨، ٤٤٩) [2] تفسیر الطبري (٢٣/٣٣٦) [3] تفسیر الطبري (٢٣/٣٣٧، ٣٣٨)

ہیں۔ یہ بات اوسع ہے، یعنی اس میں وسعت زیادہ ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہی ہے۔[1] وللّٰہ الحمد والمنة.

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ۝۱۳

اے نبی! جب آپ کے پاس مومن عورتیں آئیں (اور) وہ آپ سے (ان امور پر) بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی، اور نہ چوری کریں گی، اور نہ زنا کریں گی، اور نہ اپنی اولاد قتل کریں گی، اور نہ بہتان لگائیں گی جو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے سامنے گھڑ لیں، اور نہ نیک کام میں آپ کی نافرمانی کریں گی، تو آپ ان سے بیعت لے لیں اور اُن کے لیے اللہ سے مغفرت مانگیں، بے شک اللہ غفور رحیم ہے⑫ اے ایمان والو! تم اس قوم سے دوستی نہ کرو، جن پر اللہ نے غضب (نازل) کیا، وہ آخرت سے مایوس ہو گئے ہیں، جیسے کفار قبروں والوں (کے جی اُٹھنے) سے مایوس ہو گئے⑬

بہتان باندھنا خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے یہ ہے کہ کسی پر جھوٹا دعویٰ کریں، یا جھوٹی گواہی دیں، یا کسی معاملے میں جھوٹی قسم کھا جائیں اپنی عقل سے بنا کر۔ اور ایک معنی یہ کہ بیٹا جنا کسی اور سے اور لگا دیں کسی اور کو۔ یا بغیر جنے ہوئے ڈال لیں اور باپ پر لگا دیں۔ حدیث میں فرمایا: جو عورت کسی کا بیٹا کسی اور کے نام لگا دے تو اس پر بہشت کی بو حرام ہے۔ اہلِ قبر سے نا امید ہیں، یعنی منکروں کو توقع نہیں کہ قبر سے کوئی اٹھے گا۔ یہ کافر بھی ویسے ہی نا امید ہیں۔ انتھیٰ

فتح البیان کا بیان:

﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا ﴾ اس ترکیب کا ظاہر یہ ہے کہ عورتوں نے

---

① تفسیر الطبري (٣٣٩/٢٣) تفسیر ابن کثیر (٤٤٧/٤_٤٥٠)

مذکورہ شرائط پر بیعت طلب کی، یعنی انھوں نے ان کو لازمی کر لیا اس سے پہلے کہ نبی مکرم ﷺ ان سے بیعت لیں اور آپ ﷺ کو اس کے بعد ان کی بیعت لینے کا حکم کیا گیا ان شرطوں پر جن کا انھوں نے التزام کر لیا تھا، باوجود اس کے کہ سیرت کی کتابوں میں جو بات قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے بیعت لینے کی ابتداء فرمائی، یہ شرطیں ٹھہرا کر اور اس کے بعد آپ ﷺ نے بیعت لی، انھوں نے ان کی پابندی کی۔ مع بُعد کے ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ آیت میں تقدیر یہ ہے: ”إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ فَبَايِعْهُنَّ عَلَى أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا... الآية تأمل“ (كذا قال سليمان الجمل)

بالجملہ یہ بیعت فتح مکہ کے دن ہوئی، اس لیے کہ مکے والوں کی عورتیں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں کہ آپ ﷺ سے بیعت کریں تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے یہ عہد لیں کہ کسی بھی شے کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ کریں وہ کوئی سی شے ہو۔ چوری نہ کریں اور زنا نہ کریں اور اپنی اولاد کو مار نہ ڈالیں، یہ وہ ہے جو جاہلیت والے کیا کرتے تھے کہ لڑکیوں کو عار اور فقر کے خوف سے زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اور نہ لائیں بہتان کہ اس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان باندھیں، یعنی اپنے خاوندوں سے وہ بچہ لاحق نہ کریں جو ان کا نہیں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عورت بچہ اٹھا لاتی، پھر اپنے خاوند سے کہتی کہ یہ تجھ سے میرا بچہ ہے، چنانچہ یہ وہ بہتان ہے جو اُن کے ہاتھ پاؤں کے درمیان باندھا گیا ہے۔[1] اس کی یہ وجہ ہے کہ جس وقت ماں بچے کو جنتی ہے تو وہ اس کے دونوں ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گر پڑتا ہے۔ یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اپنے بچے کو زنا سے اپنے خاوند کی طرف منسوب کرتی ہے، اس لیے کہ یہ تو زنا کی ممانعت کے تحت داخل ہو چکا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حرہ آزاد عورت کے لڑکی پیدا ہوتی تو اس کی جگہ لڑکا رکھ دیتے تھے۔[2] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ اپنے خاوندوں سے ان کے غیر کی اولاد کو لاحق نہ کریں۔[3] اور نافرمانی نہ کریں تیری کسی معروف کام میں، یعنی ہر امر میں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور لوگوں کی طرف احسان اور نیکی ہے اور ہر امر جس کا شریعت نے حکم دیا ہے، یا اس سے منع فرمایا ہے۔ معروف وہ ہے جس کا حسن شریعت کی طرف سے پہچانا گیا ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر بر (نیکی) اور تقویٰ میں۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ تو صرف ایک شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ عورتوں پر لگائی ہے۔[5]

دونوں مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ معروف سے مراد نوحہ کرنے، کپڑے پھاڑنے، بال کاٹنے، گریباں پھاڑنے، منہ نوچنے، ویل پکارنے کی ممانعت ہے۔ امام قتادہ، سعید بن میب، محمد بن سائب اور زید بن اسلم رحمہم اللہ نے بھی اسی

---

[1] فتح القدير (٢٨٧/٥) [2] الدر المنثور (١٤١/٨) [3] تفسير الطبري (٣٤٠/٢٣)
[4] فتح القدير (٢٨٧/٥) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٢/١٠)

طرح کہا ہے۔ جو کچھ اُن لوگوں نے کہا، قرآن شریف کے معنی اس سے زیادہ وسیع ہیں،[1] اس میں نوح (نوحہ) کو داخل کرنے کے ساتھ۔ کسی نے کہا ہے کہ معروف کی جو قید لگائی، باوجود اس کے کہ نبی کریم ﷺ تو اسے معروف کا حکم دیتے ہیں تو اس کی وجہ اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

﴿ فَبَايِعْهُنَّ ﴾ جواب ہے ﴿ إِذَا ﴾ کا، یعنی جس وقت وہ عورتیں ان امور پر تجھ سے بیعت کریں تو تو ان سے بیعت لے، یعنی تو ان کے لیے اس ثواب دینے کا ملتزم ہو جا جس کا ہم نے اس بات پر ان سے وعدہ کیا ہے کہ انھوں نے ان ان طاعتوں کو اپنی جانوں پر لازم کر لیا ہے، پس یہ لغوی بیع ہے۔ لغت میں بیع ایک شے کا دوسری شے کے ساتھ عوضیت کی بنا پر مقابلہ ہے۔ معاہدے کا نام مبایعت رکھا، اس لیے کہ معاہدے کی تشبیہ مبایعت سے دی، گویا ان میں سے ہر ایک اس شے کو بیچنے والا ہے جو اس کے پاس ہے، اس چیز کے عوض جو دوسرے کے پاس ہے۔

اللہ عزوجل نے اور اس کے رسول ﷺ نے بیعت کی صفت میں چھے خصلتوں کا ذکر فرمایا جن میں دین میں ان ارکان کی تصریح کی گئی ہے جن سے ممانعت کی گئی ہے اور ان کی بیعت میں ان کا ذکر نہیں کیا جن کا امر ہے، حالاں کہ وہ بھی چھے ہیں، یعنی دو شہادتیں، نماز، زکات، صیام، حج، جنابت سے نہانا۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ ارکانِ دین اور اسلام کے شعائر سے یہ امور اور ان جیسے امور واضح اور ظاہر ہیں۔ اور یہ وجہ ہے کہ نہی تمام زمانوں میں اور تمام حالات میں دائم ہے تو دائم امور پر تنبیہ کرنے کے لیے ان کی شرط کرنا زیادہ تر ہوتا ہے۔ شرافتِ نسب ان کو ان امور سے نہیں روکتی۔

﴿ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی اس بیعت کے بعد ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر ان امور کی جو گزر چکے ہیں اور ان امور کی جو اُن سے آئندہ واقع ہوں، بے شک اللہ وسیع مغفرت والا ہے، اس طرح سے کہ اگلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور کثیر رحمت والا ہے، اس طرح سے کہ آئندہ میں خیر کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان مومن عورتوں کا جو آپ ﷺ کی طرف ہجرت کر آئیں، اس آیت کے ساتھ امتحان لیتے تھے: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... إلىٰ قوله ...غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾۔ چنانچہ مومنات میں سے جس عورت نے اس شرط کا اقرار کر لیا تو آپ ﷺ اس سے فرما دیتے: « قَدْ بَايَعْتُكِ » یعنی تحقیق میں نے تجھ سے بیعت لے لی۔ یہ بیعت صرف کلام تھا۔ واللہ! آپ ﷺ کے ہاتھ نے کبھی بیعت کرنے والی عورتوں میں سے کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔ آپ ﷺ نے ان سے اپنے اس قول سے بیعت لی: « قَدْ بَايَعْتُكِ عَلٰى ذٰلِكِ »[2] (أخرجه البخاري والترمذي وغيرهما)

---

[1] فتح القدير (٢٨٨،٢٨٧/٥) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٦٦)

امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، کہا: میں عورتوں کے ساتھ نبی مکرم ﷺ کے پاس آئی، کہا: ہم آپ ﷺ سے بیعت کریں، چنانچہ آپ ﷺ نے ہم سے اس شے کا قرار لیا جو قرآن میں ہے کہ ہم شریک نہ کریں اللہ تعالیٰ کا کسی شے کو، یہاں تک کہ آپ ﷺ پہنچے ﴿ لَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ ﴾ پر تو فرمایا: « فِيمَا اسْتَطَعْتُنَّ وَأَطَقْتُنَّ » یعنی اس شے میں جس کی تم طاقت رکھو، چنانچہ ہم نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہم پر ہمارے نفوس سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔ اے اللہ کے رسول! آپ ہم سے مصافحہ کیوں نہیں کرتے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ میرا عورتوں سے کہہ دینا اس طرح ہے جس طرح میں نے ایک عورت سے کہا۔[1] (أخرجه أحمد والترمذي وصححه والنسائي و ابن ماجه) اس بارے میں اور حدیثیں ہیں۔

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی ﷺ کے پاس تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ کسی شے کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ کرو اور چوری نہ کرو اور زنا نہ کرو اور عورتوں کی آیت پڑھی، چنانچہ جس نے تم سے پورا کیا اس کا اجر اللہ پر ہے اور جو کوئی ان ممنوعہ چیزوں میں سے کسی چیز کو پہنچا، پھر دنیا میں عذاب کیا گیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو کوئی کسی شے کو پہنچا، پھر اس کا اللہ تعالیٰ نے ستر کیا، یعنی چھپایا تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، اگر چاہے تو اس کو عذاب کرے اور اگر چاہے تو اسے بخش دے۔[2] (أخرجه البخاري و مسلم وغيرهما)

سیدہ ام سلمہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ عورتوں میں سے ایک عورت نے کہا ہے کہ وہ کون سی معروف ہے جس میں ہمیں اجازت نہیں کہ ہم آپ کی نافرمانی کریں؟ فرمایا: نوحہ مت کرو۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! بنی فلاں نے میری مدد کی ہے (یعنی نوحہ کرنے میں) میرے چچا پر۔ میرے لیے ان کا بدلہ دینا ضروری ہے (یعنی وہ عورتیں جو میرے یہاں آ کر روئی ہیں مجھے ان کا بدلہ دینا ضروری ہے کہ میں بھی ان کی مصیبت میں شریک ہوں اور نوحہ میں ان کا ساتھ دوں) تو آپ ﷺ نے مجھ پر انکار کیا، پھر میں نے کئی بار ان سے وہ بات دہرائی تو مجھے ان کی قضا کا اذن دیا، پھر میں نے اس کے بعد نوحہ نہیں کیا اور ان عورتوں میں سے کوئی عورت ایسی نہ تھی جس نے نوحہ نہ کیا ہو سوائے میرے۔[3] (أخرجه أحمد والترمذي وحسنه و ابن ماجه وغيرهم)

نیاحت (نوحہ کرنا) کی نہی میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس وقت کی بیعت کرنے والی عورتوں کی گنتی کی گئی تو وہ کل چار سو ستاون عورتیں بیعت کرنے والی تھیں۔ آپ ﷺ نے کسی سے

---

(1) مسند أحمد (٦/٣٥٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٩٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٤١٨١) سنن ابن ماجه (٢٨٧٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٢٩)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠٩)

(3) مسند أحمد (٦/٣٢٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٧٩)

مصافحہ نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے اس آیت کے ذریعے ان سے بیعت لی۔ انتہی۔[1]

سیدہ عائشہ اور امیمہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں مصافحہ نہ کرنے کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اسماء بنت یزید بن سکن رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ہے، اس میں بھی مصافحہ نہ کرنا مذکور ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ حائل یعنی کپڑے کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا۔ یہ بھی مروی ہے کہ جس وقت آپ ﷺ عورتوں سے بیعت کرتے تو پانی کا ایک پیالہ منگواتے، پھر اس میں اپنا دستِ مبارک ڈبو دیتے، پھر عورتیں اپنے ہاتھ اس میں ڈبو دیتی تھیں،[3] لیکن پہلا قول زیادہ بہتر اور صحیح ہے۔ یہ وہی بیعت ہے جو اسلام میں سنت سے ثابت ہوئی ہے۔ فتح البیان میں فرمایا ہے: جاہل صوفیہ اور مشائخ نے جو بیعت ایجاد کر رکھی ہے وہ کسی شرعی دلیل سے ثابت نہیں ہے، بلکہ وہ کتاب وسنت کے دلائل کے مخالف ہے۔[4]

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ جب کہ اللہ پاک نے اس سورت کو یوں شروع فرمایا تھا کہ کفار کو دوست ٹھہرانے سے منع کیا تھا، اسی طرح اس کو ختم بھی فرمایا، اس سے منظور یہ ہے کہ ان سے دوستی نہ رکھنے کی تاکید کی جائے اور مسلمانوں کو اس سے نفرت دلائی جائے۔[5] (''كما قاله أبو حيان وهذا على منوال رد العجز على الصدر من حيث المعنى'')۔ ''قوم مغضُوب عَلَيهِمْ'' سے مراد کفر کی تمام جماعتیں ہیں۔ کسی نے کہا کہ خاص طور پر یہود ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ کفر کے تمام فرقے اس بات کے ساتھ متصف ہیں کہ اللہ پاک نے ان پر غصہ کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر اور زید بن حارث رضی اللہ عنہم یہود کے ایک شخص سے دوستی رکھتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[6]

﴿ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴾ یعنی کفر کی جماعتیں اپنے کفر کی وجہ سے آخرت کا بالکل یقین نہیں کرتیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اس کی امید رکھتے ہیں[7] جیسا کہ کافر قبر والوں سے نا امید ہوئے، یعنی جس طرح وہ اپنے مردوں کے دوبارہ جی اٹھنے سے ناامید ہیں، اس لیے کہ وہ بعث نہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ کسی نے کہا: جیسے وہ کفار آخرت سے ناامید ہو چکے جو اُن میں سے مر چکے ہیں، اس لیے کہ وہ حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں اور جان چکے ہیں کہ آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔

پس پہلی وجہ پر کلمۂ ﴿ مِنَ ﴾ تو ابتدائیہ ہے (یعنی ﴿ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴾ کا ﴿ مِنْ ﴾ اور ﴿ مِنَ

---

[1] زاد المسير لابن الجوزي (٨/٢٤٤_٢٤٦)

[2] المعجم الكبير (٢٤/١٦٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فيه إبراهيم بن الحكم بن أبان وهو متروك'' مجمع الزوائد (٦/٤٤)

[3] الدر المنثور (٨/١٤٣) [4] فتح البيان (١٤/٩٣) [5] البحر المحيط (٨/٢٥٦)

[6] الدر المنثور (٨/١٤٤) [7] الدر المنثور (٨/١٤٤)

﴿الْاٰخِرَةِ﴾ کا ﴿مِنْ﴾ ابتدائیہ ہے) اور دوسری وجہ پر کلمۂ ﴿مِنْ﴾ بیانیہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿مِنْ﴾ تبعیضیہ ہے، یعنی جیسے کافر نا امید ہوئے اس حال میں کہ وہ اہلِ قبور میں سے بعض ہیں۔ اس لیے کہ جو لوگ قبروں میں ہیں ان میں کافر اور مومن دونوں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسے کافر نا امید ہوا جب وہ مرا اور اپنے ثواب کو دیکھا، یعنی اپنے عمل کے بدلے پر مطلع ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ کفار اہلِ قبور ہیں جو آخرت سے نا امید ہوئے۔[1] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ جو شخص ان لوگوں میں سے مرا جو کافر ہوئے تو ان کافر لوگوں میں سے زندہ لوگ واقعی اس بات سے نا امید ہوئے کہ وہ ان کی طرف لوٹ کر آئیں گے یا اللہ تعالیٰ ان کو مبعوث کرے گا۔[2] جب قومِ مغضوب سے مراد یہود ہوں گے تو اس پر یہ بات وارد ہوگی کہ وہ تو آخرت کے ثواب میں طمع رکھنے والے ہیں، اس لیے کہ ان کا اعتقاد ہے کہ وہ حق پر ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے ان کا تمسک کرنا ان کو نفع دے گا تو اب وہ نا امید نہ ہوں گے۔ ممکن ہے یوں جواب دیا جائے کہ نا امیدی سے مراد محرومیت ہے، یعنی واقعی آخرت کے ثواب سے محروم ہوئے۔[3] (كذا في فتح البيان)

عورتوں سے کن امور پر بیعت لی جائے:

تفسیر ابن کثیر میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث بیان کی ہے، پھر بروایت امام احمد امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ذکر کی اس کے بعد کہا ہے:[4] ''اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ اسے امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے سفیان بن عیینہ کے واسطے سے اور نسائی نے بھی ثوری اور مالک کے واسطے سے، وہ اسے محمد بن منکدر سے روایت کرتے ہیں۔ امام ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے، ہم اسے صرف محمد بن منکدر کے واسطے سے جانتے ہیں۔ امام احمد نے بھی اسے محمد بن إسحاق عن محمد بن منكدر عن أميمة کے واسطے سے روایت کیا اور یہ اضافہ کیا ہے: ہم میں سے کسی عورت نے مصافحہ نہیں کیا تھا۔[5]

اسی طرح ابن جریر نے اسے موسیٰ بن عقبة عن محمد بن منكدر کے واسطے سے بیان کیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے اسے أبو جعفر رازي عن محمد بن منكدر کے واسطے سے بیان کیا ہے کہ مجھے امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا اور وہ خدیجہ کی بہن اور فاطمہ کی خالہ تھی رضی اللہ عنہا۔[6]

پھر بروایتِ امام احمد سلمی بنت قیس رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ذکر کی ہے، یہ بی بی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خالاؤں میں سے ایک خالہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی اور بنی عدی بن النجار کی عورتوں میں سے ایک

[1] فتح القدير (٥/٢٩٠) [2] تفسير الطبري (٣٤٦/٢٣، ٣٤٧) [3] فتح البيان (٨٩/١٤۔٩٤)
[4] ان دونوں کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [5] مسند أحمد (٣٥٧/٦) السلسلة الصحيحة (٥٢٩)
[6] تفسير ابن كثير (٤٥٠/٤، ٤٥١)

عورت ہیں۔ اس حدیث میں چھے امورِ مذکورہ کے بعد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « وَلَا تَغْشُشْنَ أَزْوَاجَكُنَّ » ''تم اپنے خاوندوں سے غش نہ کروگی۔'' کہا: چنانچہ ہم نے آپ ﷺ سے بیعت کی، پھر ہم لوٹ آئیں تو میں نے اُن میں سے ایک عورت سے کہا کہ تو واپس جا اور نبی کریم ﷺ سے پوچھ کہ ہمارے خاوندوں کا غش کیا ہے۔ راوی نے کہا: پھر اس نے آپ ﷺ سے پوچھا تو فرمایا کہ اس کا مال لے، پھر اس سے اس کے غیر کی محاباۃ کرے[1] (باہم محبت و دوستی کرنا ہونا)۔

پھر بروایتِ امام احمد رحمہ اللہ عائشہ بنت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث[2] اور بروایتِ بخاری اُم عطیہ سے مروی حدیث[3] اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث[4] اور بروایتِ امام احمد امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ذکر کی ہے،[5] اس کے بعد چند اور حدیثیں ذکر کی ہیں۔ پھر آیت کی تفسیر کی ہے کہ اے نبی! جس وقت تیرے پاس مومن عورتیں آئیں، تا کہ تجھ سے بیعت کریں، یعنی ان میں سے جو کوئی بھی تیرے پاس آئے کہ ان شرطوں پر بیعت کرے تو تُو اس سے بیعت کر اس بات پر کہ کسی شے کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ کریں اور چوری نہ کریں، یعنی اجنبی لوگوں کے مال نہ چرائیں۔ اب رہا خاوند تو اگر وہ اس کے نفقے میں تنگی کرنے والا ہو تو اسے جائز ہے کہ اس کے مال میں سے معروف کے ساتھ کھائے، یعنی وہ شے جس کے ساتھ اس جیسی عورتوں کی عادت جاری ہوئی ہے، یعنی رواج اور دستور کے مطابق اس کے مال سے لے لے اگرچہ اس کے علم کے بغیر ہو۔ یہ عمل ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث کے مطابق ہے۔ اس نے کہا تھا: اے اللہ کے رسول! ابوسفیان ایک بخیل انسان ہے، مجھے اتنا نفقہ نہیں دیتا جو میرے اور میرے بیٹوں کے لیے کافی ہو، تو کیا مجھے گناہ ہوگا اگر میں اس کے علم کے بغیر اس کے مال میں سے لے لوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے مال میں سے دستور کے مطابق اتنا مال لے لے جو تیرے لیے اور تیرے بیٹوں کے لیے کافی ہو۔[6] (أخرجاه في الصحيحين)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَزْنِيْنَ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٣٢] ''خبردار! زنا کے قریب بھی نہ بھٹکنا، کیوں کہ وہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی بری راہ ہے۔'' سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں زانیوں کی سزا نارِ جحیم میں عذابِ الیم کے ساتھ ذکر کی ہے۔[7] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ فاطمہ بنت عتبہ نبی کریم ﷺ سے بیعت کرنے کے لیے آئی تو آپ ﷺ نے اس پر یہ شرط کی کہ کسی شے کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ کریں اور چوری نہ کریں اور زنا نہ کریں۔ راوی نے کہا: پس اس نے حیا کے

---

[1] مسند أحمد (٣٧٩/٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" مجمع الزوائد (٤٢/٦)

[2] مسند أحمد (٣٦٥/٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦١٠)

[4] صحيح البخاري (٤٦١٣)

[5] ان دونوں کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[6] صحيح البخاري (٢٠٩٧) صحيح مسلم (١٧١٤)

[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٠)

مارے اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا تو آپ ﷺ کو اس کی یہ حرکت اچھی لگی، پس سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بولیں او عورت! اقرار کر لے، پس قسم ہے اللہ کی! ہم نے بھی ان باتوں پر بیعت کی ہے۔ وہ عورت بولی: تو اب ہاں۔ پھر آپ ﷺ نے اس سے آیت کے ساتھ بیعت لی۔[1] (أخرجه الإمام أحمد)

عامر شعبی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے بیعت کی اور آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر ایک کپڑا تھا جس کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ لیا تھا۔ پھر فرمایا: اور مت مار ڈالو اپنی اولاد کو تو ایک عورت بولی کہ آپ ان کے باپوں کو قتل کرتے ہیں اور اُن کی اولاد کی وصیت کرتے ہیں۔ کہا: اور اس کے بعد آپ ﷺ ایسا کرتے کہ جس وقت عورتیں آپ ﷺ سے بیعت کرنے کے لیے آتیں تو آپ ﷺ ان کو جمع کرتے، پھر ان پر شرائط پیش کرتے، پس جب وہ اقرار کر لیتیں تو لوٹ جاتیں۔[2] (أخرجه ابن أبي حاتم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَٰدَهُنَّ ﴾ یہ بچے کو اس کے وجود کے بعد قتل کو شامل ہے جس طرح کہ جاہلیت والے اپنی اولاد کو قتل کیا کرتے تھے فقر کے ڈر سے اور یہ عام ہے کہ اس کو اس حال میں قتل کیا جائے کہ وہ جنین ہے جس طرح کہ بعض جاہل عورتیں کبھی ایسا کرتی ہیں اپنے نفس کو گرا دیتی ہیں تا کہ حاملہ نہ ہوں، کسی فاسد غرض کے لیے یا اس جیسی اور غرض کے لیے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَٰنٍ يَفْتَرِينَهُۥ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ ﴾ کے تحت میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول گزر چکا ہے کہ اپنے خاوندوں کے ساتھ ان کے غیر کی اولاد کو نہ ملائیں۔ اسی طرح امام مقاتل رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[3] اس کی تائید وہ حدیث کرتی ہے جو امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ فرماتے تھے جب آیتِ ملاعنہ نازل ہوئی کہ جس کسی عورت نے کسی قوم پر اس شخص کو داخل کیا جو اُن میں سے نہیں ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے کسی شے میں نہیں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کو کچھ تعلق نہیں)۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو ہرگز اپنی جنت میں داخل نہ کرے گا اور جس کسی مرد نے اپنے بچے سے انکار کیا (یعنی جان بوجھ کر)، حالاں کہ وہ اس کی طرف نظر کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے حجاب کرے گا اور اس کو تمام اگلوں اور پچھلوں کے سامنے رسوا کرے گا۔[4]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ ﴾ یعنی اس معروف میں جس کا تو نے ان کو امر کیا اور اس برائی میں جس سے تو نے ان کو منع کیا تیری نافرمانی نہ کریں۔ میمون بن مہران رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی

---

① مسند أحمد (١٥١/٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٤١/٦)

② تفسیر ابن أبي حاتم (٣٣٥١/١٠) یہ روایت مرسل ہے۔ ③ تفسیر الطبري (٣٤٠/٢٣) تفسیر ابن کثیر (٤٥٣/٤)

④ سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٢٦٣) اس کی سند میں "عبداللہ بن یونس" مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ١٤٢٧)

اطاعت صرف معروف میں ٹھہرائی ہے اور معروف طاعت ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی طاعت کا حکم کیا معروف میں، حالاں کہ وہ اس کی خلق میں سے "خیرة اللّٰه" ہیں۔ یعنی باوجود اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور چنے ہوئے اور پسندیدہ ہیں، پھر بھی ان کی اطاعت معروف میں رکھی۔

غیر ابن زید نے سیدنا عبداللہ بن عباس، انس بن مالک رضی اللہ عنہم، سالم بن ابی الجعد رحمہ اللہ سے روایت کیا اور ابو صالح رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس دن ان عورتوں کو نوحہ کرنے سے منع فرمایا۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے راویت کیا ہے، کہا: ہم سے ذکر کیا گیا کہ نبیِ مکرم ﷺ نے ان عورتوں سے نیاحت (یعنی نوحہ نہ کرنے) کا عہد لیا اور اس بات کا کہ مت بات کرو مردوں سے مگر تم میں سے محرم مرد سے۔ پس سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ بولے: اے اللہ کے رسول! ہمارے تو مہمان ہوتے ہیں اور ہم اپنی عورتوں سے غائب رہتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَيْسَ أُولَئِكَ عَنَيْتُ لَيْسَ أُولَئِكَ عَنَيْتُ»[2] یعنی وہ میری مراد نہیں ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جن امور کا نبی مکرم ﷺ نے عہد لیا ان میں سے ایک امر یہ تھا کہ باتیں نہ کریں مرد مگر یہ کہ ہو وہ ذاتِ محرم، پس بے شک مرد عورت سے باتیں کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ مذی سے اس کی دونوں رانیں آلودہ ہو جاتی ہیں۔[3] پھر چند حدیثیں نوحہ کی ممانعت میں ذکر کی ہیں۔

کفار سے دوستی کی ممانعت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ ﴾

اللہ پاک سورت کے آخر میں کافروں کی دوستی سے منع فرماتا ہے جس طرح کہ اس کے شروع میں اس سے منع فرمایا تھا، یعنی یہود و نصاریٰ اور تمام کافروں سے دوستی مت کرو جن پر اللہ تعالیٰ خفا ہوا ہے اور ان کو ملعون کیا ہے اور وہ اس کی طرف سے بہت دور ہٹائے جانے کے مستحق ہوئے ہیں، پھر تم کیوں ان سے دوستی کرتے ہو اور ان کو اپنا دوست ٹھہراتے ہو اور واقعی وہ اللہ عزوجل کے حکم کے مطابق آخرت کے ثواب و نعیم سے نا امید ہوئے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ كَمَا يَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴾ میں دو قول ہیں: ایک تو یہ ہے جیسے زندہ کفار اپنے ان رشتہ داروں سے نا امید ہوئے جو قبروں میں ہیں کہ اس کے بعد وہ ان کے ساتھ اکٹھے ہوں، اس لیے کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے کا اور اکٹھے ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ چنانچہ اپنے اعتقاد کے مطابق ان کی امید ان سے منقطع ہو گئی۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا: جیسے زندہ کافر مردوں سے نا امید ہو گئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: جیسے کافر اس بات سے نا امید ہو گئے کہ ان کی طرف قبروں والے لوٹ کر آئیں جو مر گئے۔ اسی طرح امام ضحاک رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ یہ سب قول

[1] تفسير الطبري (٣٤١/٢٣) تفسير ابن كثير (٤٥٤/٤) [2] تفسير الطبري (٣٤٢/٢٣) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٢/١٠) یہ روایت مرسل ہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جیسے وہ کافر جو قبروں میں ہیں ہر قسم کی خیر سے نا امید ہو گئے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے (فیما رواہ الأعمش عن أبي الضحیٰ عن مسروق): جیسے نا امید ہوا یہ کافر جبکہ مرا اور اپنا ثواب معائنہ کیا اور اس پر مطلع ہوا۔ اور یہ امام مجاہد، عکرمہ، مقاتل، ابن زید، کلبی اور منصور رحمہم اللہ کا قول ہے اور یہی امام ابن جریر رحمہ اللہ کا اختیار کردہ ہے۔[1]

آخر تفسیر سورة الممتحنة ولله الحمد والمنة۔ ۹/ ماہ شوال ۱۳۱۵ ہجری شبِ جمعہ قریب نیم شب اس سورت کی تفسیر تمام ہوئی اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آئندہ کی توفیق دے۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار، ولا حول ولا قوة إلا بالله، والحمد لله أولا وآخرا وظاهرا وباطنا، وصلى الله وسلم و بارك على سيدنا ومولانا محمد شفيع المذنبين وعلى آله وصحبه أجمعين إلى يوم الدين ملأ ما علم وزنة ما علم وعدد ما علم آمين.

[1] تفسير الطبري (۲۳/۳۴۷، ۳۴۸) تفسير ابن كثير (۴/۴۵۰ـ۴۵۶)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَةُ الصَّفِّ

اس سورت مبارکہ کی چودہ (۱۴) آیتیں ہیں اور مدنی ہے۔ یہی قول مختار ہے اور جمہور کی طرف منسوب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مدینے میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس وابن مردويه والبيهقي) سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ (أخرجه ابن مردويه) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ مکے میں نازل ہوئی۔[1] (أخرجه النحاس) یہ قول شاید ان سے صحیح نہیں ہے۔ امام عکرمہ، حسن اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم اسی کے قائل ہیں۔ امام زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر جزم کیا ہے۔ مدنی ہونے کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ کہا کہ ہم نے تذکرہ کیا کہ تم میں سے کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے کہ اعمال میں سے کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے تو ہم میں سے کوئی کھڑا نہ ہوا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف ایک آدمی بھیجا اور ہم کو جمع کیا، پھر ہم پر پوری سورۃ الصف پڑھی۔ (وأخرجه ابن أبي حاتم) اور اس کے آخر میں کہا: چنانچہ ان میں یہ سورت نازل ہوئی۔[2] (وأخرجه أيضا الترمذي وابن حبان والحاكم وقال: صحيح على شرط الشيخين والبيهقي في الشعب والسنن)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٢﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٣﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿٤﴾

① فتح القدير (٢٩١/٥)

② تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٣/١٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٠٩) صحيح ابن حبان (٤٥٤/١٠) مستدرك الحاكم (٧٨/٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (١٦٠/٩) شعب الإيمان (٦/٤)

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔
اللہ کی تسبیح کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے اور وہ بڑا زبردست، خوب حکمت والا ہے ① اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں؟ ② اللہ کے ہاں بڑی ناراضی (والی بات) ہے کہ تم وہ بات کہو جو تم کرتے نہیں ③ بے شک اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں صفیں باندھے لڑتے ہیں، گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں ④

بندے کو اپنا دعویٰ کرتے ہوئے ڈرنا چاہیے کہ اس پر عمل کرنا مشکل پڑتا ہے، ایک جگہ مسلمان جمع تھے، کہنے لگے: اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کو کون سا کام بہت پسند ہے تو وہی اختیار کریں۔ تب یہ آیت اتری۔ انتھٰی.

فتح البیان کا بیان:

تسبیح پر پہلے کلام گزر چکا ہے۔ یہ بات کہ بعض سورتوں میں تو تسبیح کی صیغۂ ماضی کے ساتھ تعبیر فرمائی، جیسے یہ سورت ہے اور بعض میں صیغۂ مضارع سے اور بعض میں صیغۂ امر سے تو اس سے منظور یہ ارشاد کرنا ہے کہ تسبیح ماضی ومستقبل وحال سب اوقات میں مشروع ہے، اسی کے مثل سورت حدید میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اور سورۃ الحشر، جمعہ اور تغابن میں اصل پر چل کر کلمۂ ﴿ مَا ﴾ کا اعادہ فرمایا اور حدید میں اس کو اس آیت کی موافقت کے لیے ساقط کیا: ﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الحدید: ۲] ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے۔'' اور اس آیت کی موافقت کے لیے: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ﴾ [الحدید: ٤] ''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔'' یوں نہ فرمایا: ''سَبَّحَ لِلّٰهِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَا فِيْهَا'' کہ مبالغہ اکثر ہوتا۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ سماء سے مراد علو کی جہت ہے جو ''سماء وما فیہا'' کو شامل ہے اور ارض سے سفل کی جہت مراد ہے تو اس میں ''أرض وما فیہا'' شامل ہے۔

﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی جو کچھ آسمان وزمین میں ہے، وہ سب زبانِ حال یا زبانِ قال سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہے۔ جو امور اس کی بارگاہِ عالی جاہ کے لائق نہیں ہیں، ان سے اس کو منزہ ومبرا سمجھ کر یاد کرتا ہے اور وہ ایسا غالب ہے کہ کوئی اس پر غالب نہیں ہو سکتا، وہ اپنے افعال اور اقوال میں حکمت والا ہے۔ جس ذات پاک کی یہ صفت ہو، وہ اسی کا مستحق ہے کہ سارے آسمانوں اور زمین والے تمام نقصانوں سے اس کو پاک وصاف سمجھ کر اس کی یاد کریں۔

بھلا جس شہنشاہِ بے پروا کا وصف عزیز حکیم ہے، اس سے کسی شے کی فرمایش کرنا، کیسا وہ حکمت والا ہے جو کام اس نے کہہ دیا، اسے کیے جاؤ، اپنے قصور کے معترف رہو، اپنی طرف سے کسی کام کی کیوں درخواست کرو۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ یعنی ایمان والو! تم وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے

نہیں ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کچھ لوگ مومنوں میں سے جہاد کے فرض کیے جانے سے پہلے یہ کہتے تھے کہ ہم نے یہ چاہا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو بہترین اعمال کی خبر دیتا تو ہم اس پر عمل کرتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ سب سے زیادہ پسندیدہ عمل اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے جس میں کوئی شک نہ ہو اور اس کے اہلِ معصیت سے لڑنا ہے جو ایمان کے مخالف ہوئے اور اس کا اقرار نہ کیا۔

پھر جب جہاد کا حکم نازل ہوا تو مومنوں میں کچھ لوگوں نے اس کو ناپسند کیا اور اس کا حکم ان پر شاق گزرا۔ اس پر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾[1] (أخرجه ابن المنذر وابن أبي حاتم وابن مردويه)۔ امام نخعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تین آیتیں ہیں جنھوں نے مجھے اس سے منع کیا کہ لوگوں پر کوئی فیصلہ کروں: ﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ [البقرة: ٤٤] ''کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو؟ اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟'' اور قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ﴾ [هود: ٨٨] ''میرا یہ ارادہ بالکل نہیں کہ تمھارا خلاف کر کے خود اس چیز کی طرف جھک جاؤں جس سے تمھیں روک رہا ہوں۔'' اور یہ آیتِ کریمہ۔[2]

یہاں سوالیہ انداز ملامت اور دھمکی کے لیے ہے انکار کی جہت سے، یعنی اس خیر و نیکی کے بارے میں کیوں کہتے ہو جس کو خود نہیں کرتے۔ کلمۂ ﴿ لِمَ ﴾ لامِ جارہ و مائے استفہامیہ سے مرکب ہے۔ اس کا الف تخفیفاً حذف ہوا ہے کثرتِ استعمال کے سبب سے جس طرح کہ اس کے نظائر میں ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اضافت کا لام ہے جو مائے استفہامیہ پر داخل ہوا ہے، جیسے کہ ان اقوال میں اس کے سوا اور حرفِ جر اس پر داخل ہوئے ہیں تمھارے اس قول میں: ''لِمَ وَفِيْمَ وَمِمَّ وَعَمَّ وَإِلَامَ وَعَلَامَ''۔ الف صرف اس لیے محذوف ہوا ہے کہ ما و لام اور اس کے سوا اور حروفِ جر ایک ایسی شے کی طرح ہیں جن کا استعمال کلامِ مستفہم میں بحذفِ الف بہت واقع ہوا ہے اور اصل کا استعمال قلیل آیا ہے جیسے کسی شاعر کا قول ہے: ''عَلَى مَا قَامَ يَشْتِمُنِيْ جَرِيْرٌ''[3] (یعنی کس بات پر کھڑا ہوا جریر مجھے گالیاں دیتا ہے)۔

بالجملہ پھر اللہ پاک نے اس کام پر ان کی مذمت کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ یعنی یہ بات بغض اور غصے میں بہت عظیم اور کبیر ہوئی کہ تم وہ بات کہو جو نہ کرو۔ ''مقت'' بہت سخت بغض کو کہتے ہیں۔ ''مَقْتٌ وَمَقَاتَةٌ'' دونوں مصدر ہیں۔ جب کسی کو لوگ پسند نہیں کرتے تو اس وقت محاورۂ عرب میں یوں بولتے ہیں کہ ''فُلَانٌ مَقِيْتٌ وَمَمْقُوْتٌ''، یعنی فلاں کو لوگ چاہتے نہیں ہیں، اس سے بغض رکھتے ہیں۔

امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْا ﴾ محلِ رفع میں ہے، اس لیے کہ فعل ہے بہ معنی ''بِئْسَ'' اور ''مَقْتًا'' منصوب ہے بنا بر تمیز تو اب ﴿ كَبُرَ ﴾ میں ضمیر مبہم ہوگی جس کی نکرے سے تفسیر کی گئی ہے اور ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْا ﴾ مخصوص بالذم ہوگا (اور اس میں وہی اختلاف آئے گا کہ آیا اس کا رفع بہ بتدا ہے اور خبر اس کی جملہ ماقبل یا خبر اس کی

[1] تفسير الطبري (٢٣/٣٥٣، ٣٥٤) [2] تفسير القرطبي (١٨/٨٠) [3] تفسير النسفي (٤/٢٤١)

محذوف یا خود خبر ہے مبتدائے محذوف کی)۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ كَبُرَ ﴾ سے مقصود تعجب ہے۔ ابن عصفور نے اس کو افعالِ تعجب سے شمار کیا ہے[1] جن کے لیے نحو میں علاحدہ باب مقرر کیا گیا ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ بھی اسی طرف مائل ہیں اور کہا ہے کہ یہ من جملہ افصح و ابلغ کلام ہے۔

تعجب کے معنی ہیں سامعین کے دلوں میں امر کا عظیم و بزرگ کرنا، اس لیے کہ تعجب اسی شے سے ہوتا ہے جو اپنے جیسے امور سے خارج ہوتی ہے۔[2] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: یہ قاعدہ مطرد (پے در پے ہونے والا) ہے، یعنی ہر فعل جس سے تعجب کرنا جائز ہے تو یہ بھی جائز ہے کہ "فَعُلَ" بہ ضمِ عین کا وزن بنایا جائے اور سارے احکام میں "نِعْمَ وَبِئْسَ" کا قائم مقام ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ نہ یہ مذمت کے افعال سے ہے اور نہ تعجب کے افعال سے، بلکہ اس کا اسناد ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْا ﴾ کی طرف کیا گیا ہے اور ﴿ مَقْتًا ﴾ تمییز محول عن الفاعل ہے۔ "أَيْ: كَبُرَ مَقْتًا أَنْ تَقُوْلُوْا"

بالجملہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت یعنی ﴿ كَبُرَ مَقْتًا ...الآية ﴾ تنہا قتال کے بارے میں ہے، وہ ایک قوم تھی کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی تھی۔ پھر مرد کہتا کہ میں نے قتال کیا اور میں نے اپنی تلوار سے مارا، حالاں کہ انھوں نے یہ کام نہ کیا ہوتا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[3] (أخرجه ابن مردويه وابن أبي حاتم)

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴾ مفسرین کہتے ہیں کہ مومنوں نے کہا: ہم نے چاہا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس عمل کے بارے میں خبر دے جو اس کو سب اعمال سے زیادہ محبوب ہے، تا کہ ہم اس کو کریں، گو اس میں ہمارے مال اور جانیں چلی جائیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں مروی ہے کہ مومنوں نے کہا ہے کہ اگر ہم اس عمل کو جانتے جو اللہ تعالیٰ کو تمام اعمال سے زیادہ محبوب ہے تو البتہ ہم اس کو کرتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی تو فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴾ پس اس کو ناپسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾[4] (أخرجه عبد بن حميد وابن مردويه)

﴿ كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴾ کی تفسیر میں ان سے مروی ہے "مُثْبَتٌ لَا يَزُوْلُ، مُلْصَقٌ بَعْضُهُ عَلَى بَعْضٍ"[5] (أخرجه ابن المنذر و ابن أبي حاتم) یعنی گویا وہ جمی ہوئی دیوار ہے جو زائل نہیں ہوتی اس کا بعض بعض پر چپکا ہوا ہے۔ جمہور نے ﴿ يُقَاتِلُوْنَ ﴾ کو بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی زید بن علی نے) بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور کسی نے "يُقَتِّلُوْنَ" بہ تشدید پڑھا ہے۔ ﴿ صَفًّا ﴾ کا نصب مفعول مطلق کی بنا پر ہے اور مفعول بہ محذوف ہے: "أَيْ: يَصُفُّوْنَ أَنْفُسَهُمْ صَفًّا"۔ کسی نے کہا ہے کہ مصدر ہے موضعِ حال میں "أَيْ: صَافِّيْنَ أَوْ مَصْفُوْفِيْنَ"

---

[1] فتح القدير (٢٩٢/٥) [2] الكشاف (٥٢٣/٤) [3] فتح القدير (٢٩٤/٥)

[4] الدر المنثور (١٤٦/٨، ١٤٧) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٤/١٠)

جملہ ﴿ كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴾ ﴿ يُقَاتِلُوْنَ ﴾ کے فاعل سے حال ہے یا ﴿ صَفًّا ﴾ کی ضمیر سے حال ہے اس تقدیر پر کہ اس کی تاویل "صَافِّیْنَ" یا "مَصْفُوْفِیْنَ" سے کی جائے۔ کما تقدم۔ ﴿ مَرْصُوْصٌ ﴾ کے معنی یہ ہے کہ بعض اس کا بعض سے چپکا ہوا ہے "يُقَالُ: رَصَصْتُ الْبِنَاءَ أَرُصُّهُ رَصًّا إِذَا ضَمَمْتَ بَعْضَهُ إِلَى بَعْضٍ" امام فراء نے کہا ہے کہ "مَرْصُوْصٌ بِالرُّصَاصِ" یعنی ملائی گئی سیسے سے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا: اس محاورے میں ماخوذ ہے: "رَصَصْتُ الْبِنَاءَ إِذَا لَايَمْتَ بَيْنَهُ وَقَارَبْتَ حَتّٰى يَصِيْرَ كَقِطْعَةٍ وَّاحِدَةٍ"[1] یعنی دیوار کا رص یہ ہے کہ اس کے درمیان میں خوب وصل کیا جائے اور اس کے پتھر قریب قریب رکھے جائیں، یہاں تک کہ وہ ایک ٹکڑے کی طرح ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ "رصیص" سے ماخوذ ہے، یعنی بعض اشیاء کا بعض کی طرف ملانا۔ "تراص" بہ معنی "تلاصق" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اپنے دشمنوں کی لڑائی میں ان کی نیتوں کا برابر ہو جانا، یہاں تک کہ اجتماع کلمہ میں ایسے ہو جائیں جیسے دیوار جس کا بعض بعض کی طرف ملایا گیا ہے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔[2] (كذا في الفتح)

بات کر کے عمل نہ کرنے والے کی مذمت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، بروایتِ امام احمد، ابن ابی حاتم اور ترمذی رحمہ اللہ بیان کی ہے[3] اور یہ ذکر کیا ہے کہ راویانِ حدیث نے پوری سورۃ الصّف ایک دوسرے کو پڑھ کر سنائی ہے اور اس قراءت کا تسلسل نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا ہے اور اس سورت کی قراءت کے بارے میں اپنی سند بواسطہ ابو الحجاج اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ ذکر کی ہے۔ پھر کہا ہے کہ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ اس شخص پر انکار ہے جو کوئی وعدہ کرتا ہے یا کوئی بات کرتا ہے جس کو پورا نہیں کرتا۔ اسی لیے اس آیتِ کریمہ سے علماء میں سے اس شخص نے استدلال کیا ہے جو اس طرف گیا ہے کہ مطلقاً وعدے کا وفا کرنا واجب ہے، برابر ہے کہ اس پر عزمِ موعود مترتب ہو یا نہ ہو۔

نیز سنت سے اس حدیث کے ساتھ حجت پکڑی ہے جو صحیحین میں ثابت ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب وعدہ کرے تو خلاف کرے اور جب بات کہے تو جھوٹ بولے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے[4] اور صحیح کی دوسری حدیث میں ہے: «أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ وَاحِدَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْ نِفَاقٍ حَتّٰى يَدَعَهَا»[5] پھر ان میں سے وعدہ کے خلاف کرنے کا ذکر کیا

---

[1] فتح القدير (٥/٢٩٢) [2] فتح البيان (١٤/٩٧-٩٩) [3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] صحيح البخاري (٣٣) صحيح مسلم (٥٩) [5] صحيح مسلم (٥٨)

ہے۔ شرح بخاری کے شروع میں ہم نے اس پر مکمل کلام کر دیا ہے۔ وللہ الحمد والمنة۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر اس قول کے ساتھ اس انکار کی تاکید فرمائی کہ ﴿ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾

امام احمد اور ابو داود رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس آئے اور میں بچہ تھا، چنانچہ میں چلا کہ کھیلنے کے لیے نکلوں تو میری ماں بولی: او عبداللہ! تو آ میں تجھے دوں گی تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: تو نے کیا ارادہ کیا ہے کہ اسے دے گی؟ عرض کی کہ کھجوریں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: خبردار! اگر تو ایسا ارادہ نہ کرتی تو تجھ پر ایک جھوٹ لکھا جاتا۔[1] امام مالک رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ جب وعدے کے ساتھ موعود پر عزم متعلق ہو تو اس کو پورا کرنا واجب ہے جس طرح کہ اگر اپنے غیر سے کہ تو بی بی کر لے اور تیرے لیے مجھ پر ہر روز اتنا ہے، پھر اس نے نکاح کر لیا تو اس پر واجب ہے کہ اس کو دیتا رہے، جب تک کہ وہ بیوی والا رہے، اس لیے کہ اس کے ساتھ آدمی کا حق متعلق ہو گیا۔

یہ قول مضایقہ و تنگی پر مبنی ہے۔ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ مطلقاً واجب نہیں ہے اور آیت کو اس پر محمول کیا ہے کہ وہ اس وقت نازل ہوئی کہ انھوں نے اپنے اوپر جہاد کے واجب ہونے کی تمنا کی تھی، پھر جب وہ فرض ہو گیا تو بعض نے اس سے نکول (بزدلی سے پیچھے ہٹنا) کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ [النساء: ۷۷۔ ۷۸] ”کیا تم نے انھیں نہیں دیکھا جنھیں حکم کیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نمازیں پڑھتے رہو اور زکاۃ ادا کرتے رہو۔ پھر جب انھیں جہاد کا حکم دیا گیا تو اسی وقت ان کی ایک جماعت لوگوں سے اس قدر ڈرنے لگی جیسے اللہ تعالیٰ کا ڈر ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ، اور کہنے لگے: اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا؟ کیوں ہمیں تھوڑی سی زندگی اور نہ جینے دی؟ آپ کہہ دیجیے کہ دنیا کی سود مندی تو بہت ہی کم ہے اور پرہیز گاروں کے لیے تو آخرت ہی بہتر ہے اور تم پر ایک دھاگے کے برابر بھی ستم روا نہ رکھا جائے گا۔ تم جہاں کہیں بھی ہو موت تمھیں آ پکڑے گی گو تم مضبوط قلعوں میں ہو۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴾ [محمد: ۲۰] ”اور جو لوگ ایمان لائے وہ کہتے ہیں کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی گئی؟ پھر جب کوئی صاف مطلب

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٩١) مسند أحمد (٣/٤٤٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٧٤٨)

والی سورت نازل کی جاتی ہے اور اس میں قتال کا ذکر کیا جاتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کے دل میں بیماری ہے وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے اس شخص کی نظر ہوتی ہے جس پر موت کی بیہوشی طاری ہو، پس بہت بہتر تھا ان کے لیے۔'' اسی طرح یہ آیت ہے، یعنی آیتِ باب۔

پھر بروایتِ علی بن ابی طلحہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا وہی قول ذکر کیا جو پہلے گزر چکا ہے۔[1] اس کے بعد کہا ہے کہ یہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا اختیار ہے۔[2] امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا: مومنوں نے کہا ہے کہ اگر ہم ان اعمال کو جانتے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں تو البتہ اس پر عمل کرتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ پسندیدہ عمل بتایا تو فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا ﴾ چنانچہ ان کے لیے بیان کر دیا۔

پھر وہ اُحد کے دن اس کے ساتھ آزمائے گئے تو نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیٹھ دے کر بھاگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ اور فرمایا کہ تم میں مجھ کو سب سے محبوب وہ ہے جو میری راہ میں لڑا۔[3] بعض کہتے ہیں کہ قتال کی شان میں اتاری گئی ہے۔ مرد کہتا ہے کہ میں نے قتال کیا، حالاں کہ نہیں کیا اور نیزہ مارا، حالاں کہ نہیں مارا اور ضرب لگائی، حالاں کہ نہیں لگائی اور صبر کیا، حالاں کہ نہیں کیا۔ امام قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ایک قوم کی علامت کے لیے نازل ہوئی، وہ کہتے تھے: ''قَتَلْنَا، ضَرَبْنَا، طَعَنَّا وَفَعَلْنَا'' حالاں کہ یہ کام نہیں کیے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافقوں کی ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی، وہ مسلمانوں سے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کرتے تھے اور ان کے لیے اس وعدے کو پورا نہیں کرتے تھے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: ﴿ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ فرمایا جہاد ہے۔[4] غرض یہ کہ اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ وہ دوست رکھتا ہے اپنے مومن بندوں کو جب وہ صف باندھتے ہیں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے آمنے سامنے اور مقابل ہو کر۔ حومۃ الوغی میں لڑتے ہیں (حومہ عظیم شے کو کہتے ہیں، جیسے حومۃ القتال معظم القتال ہے اور حومۃ الماء بھی اسی طرح ہے)۔ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اس سے جو اللہ کا منکر ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلمہ بلند تر ہو اور اسی کا دین سارے ادیان پر ظاہر اور عالی ہو جائے۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ تین آدمی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف ہنستا ہے: وہ شخص جو رات میں قیام کرتا ہے اور وہ قوم جبکہ نماز کے لیے صف باندھتے ہیں اور وہ قوم جبکہ قتال کے لیے صف باندھتے ہیں۔[5] (رواه الإمام أحمد و ابن ماجه)

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/٣٥٠_٣٥٤)
[2] تفسير الطبري (٢٣/٣٥٥، ٣٥٦)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٥٤) تفسير ابن كثير (٤/٤٥٨)
[4] تفسير الطبري (٢٣/٣٥٥) تفسير ابن كثير (٤/٤٥٨)
[5] مسند أحمد (٣/٨٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٠) اس کی سند میں ''مجالد بن سعید'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٤٥٣)

مطرف سے مروی حدیث میں ہے کہ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ عزوجل تین آدمیوں کو دوست رکھتا ہے: ”رَجُلٌ غَزَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَرَجَ مُحْتَسِبًا مُجَاهِدًا فَلَقِيَ الْعَدُوَّ فَقُتِلَ وَأَنْتُمْ تَجِدُوْنَهٗ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ الْمُنْزَلِ ثُمَّ قَرَأَ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا﴾ [1] «أخرجه ابن أبي حاتم وأخرجه الترمذي والنسائي» کعب احبار رحمہ اللہ سے مروی حدیث میں اُمتِ محمدیہ کے اوصاف کے ذیل میں یہ ہے کہ ”صَفُّهُمْ فِي الْقِتَالِ مِثْلُ صَفِّهِمْ فِي الصَّلَاةِ“۔ پھر آیتِ مذکورہ پڑھی۔[2] «رواه ابن أبي حاتم»

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں سے نہیں لڑتے تھے مگر یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صف باندھتے تھے، یہ مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم ہے۔ کہا: وقوله تعالىٰ: ﴿كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ ”أَيْ: مُلْتَصِقٌ بَعْضُهٗ فِيْ بَعْضٍ مِنَ الصَّفِّ فِي الْقِتَالِ“[3] امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: کیا تو نے کسی عمارت والے کو نہیں دیکھا کہ کیا وہ اس کو پسند کرتا ہے کہ اس کی دیوار مختلف ہو جائے، چنانچہ اسی طرح اللہ عزوجل اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا امر مختلف ہو جائے اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صف باندھی ان کے قتال میں اور اُن کی صف باندھی ان کی نماز میں، پس تم لازم پکڑو اللہ تعالیٰ کے امر کو اس لیے کہ وہ اس شخص کے لیے عصمت اور بچاؤ ہے جس نے اس کو لازم پکڑ لیا۔[4] «أورد ذلك كله ابن أبي حاتم»

ابو بحریہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ یعنی صحابہ گھوڑوں پر لڑنے کو مکروہ جانتے تھے اور زمین پر لڑنے کو مستحب جانتے تھے، اللہ کے اس فرمان کے سبب سے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ یحییٰ بن جابر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابو بحریہ رحمہ اللہ کہتے تھے کہ جس وقت تم مجھے دیکھو کہ میں نے صف میں التفات کیا (یعنی اِدھر یا اُدھر پھر کر دیکھا) تو تم میرے جبڑے میں مارو[5] (یعنی تا کہ میں اپنے قصور کی سزا پاؤں اور ہوشیار ہو جاؤں)۔ جب اللہ پاک نے جہاد کا ذکر کیا جو مشقتوں پر مشتمل ہے اور یہ ذکر کیا کہ وہ اس کی راہ میں لڑنے والوں کو دوست رکھتا ہے تو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی وتشفی کے لیے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے دو قصے ذکر کیے، تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کی ایذا پر صبر کریں اور یہ بیان کیا کہ ان کو توحید کا حکم دیا گیا تھا اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا اور اس کے لیے سزا ٹھہرائی جس نے ان کی مخالفت کی۔ موسیٰ علیہ السلام کے قصے سے ابتداء فرمائی، اس لیے کہ ان کا زمانہ پہلے ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۭ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۵۳) سنن الترمذي (۲۵۶۸) سنن النسائي (۱۶۱۵) (2) تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۵۴)
(3) تفسير ابن كثير (۴/۴۵۹) (4) تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۵۴)
(5) تفسير الطبري (۲۳/۳۵۷، ۳۵۸) تفسير ابن كثير (۴/۴۵۶_۴۵۹)

وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۝ وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝۶

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تم مجھے ایذا کیوں دیتے ہو؟ حالاں کہ تم جانتے ہو کہ بلاشبہہ میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے، اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا⑤ اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، پھر جب وہ (رسول) ان کے پاس کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ بولے: یہ تو کھلا جادو ہے⑥

بنی اسرائیل ہر بات میں اپنے رسول سے ضد کرتے بالآخر مردود ہو گئے۔ نبیِ مکرم ﷺ کا نام دنیا میں محمد رکھا گیا اور فرشتوں میں احمد ہے۔ انتہیٰ.

فتح البیان کا بیان:

یہ بھی جائز ہے کہ اللہ پاک نے مجاہدین کی محبت کے بعد جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا قصہ ذکر فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہو کہ نبیِ کریم ﷺ کی اُمت کو اس بات سے ڈرانا منظور ہو کہ وہ اپنے نبی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کریں جو ان دونوں نبیوں کی قوموں نے ان کے ساتھ کیا۔ کلمہ ﴿اِذْ﴾ ''اُذْكُرْ'' محذوف سے متعلق ہے اور قول کا مقولہ ہے۔ ایذا کا بیان سورت احزاب میں گزر چکا ہے۔[1]

جملہ ﴿قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ﴾ محلِ نصب میں ہے بنا بر حال۔ کلمہ ﴿قَدْ﴾ جو ''علم'' کے تحقق یا تاکید کے لیے ہے تقریب و تقلیل کے لیے نہیں ہے۔ مضارع کا صیغہ اس لیے ہے کہ استمرار پر دال ہو۔ یعنی اے محمد! تو ان اعراض کرنے والوں سے اس وقت کا ذکر کر جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تم

---

(1) رقم الآية (٥٧)

مجھے کیوں ستاتے ہو، اس طرح سے کہ جس شریعت کا میں تم کو حکم دیتا ہوں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیا ہے تم اس کی مخالفت کرتے ہو، یا مجھے گالیاں دیتے ہو اور مجھے گھٹاتے ہو۔ اسی سے متعلق ہے کہ ان کو ادرہ کی تہمت لگائی تھی (یعنی یہ کہ ان کے خصیے پھولے ہوئے ہیں، اسی لیے تو یہ اکیلے نہاتے ہیں)۔ حالاں کہ تمھیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھاری طرف بھیجا ہوا ہوں۔ یعنی باوجود یہ بات جاننے کے تم مجھے ایذا کیوں دیتے ہو، حالاں کہ رسول کا تو احترام اور تعظیم کی جاتی ہے اور میری رسالت میں تمھیں کوئی شک باقی نہیں رہا، اس لیے کہ تم وہ معجزات دیکھ چکے ہو جن سے تمھارے لیے میری رسالت کا اقرار واجب ہو جاتا ہے اور وہ معجزات تم کو یقینی علم کا فائدہ دیتے ہیں۔

﴿ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ﴾ یعنی پھر جب وہ ایمان سے اور اس کی طرف رجحان کرنے سے مائل ہوئے، یعنی منہ پھیرا اور اسی پر جم گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ہدایت اور حق قبول کرنے سے مائل کر دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے دل ثواب سے پھیر دیے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب وہ اپنے نبی ﷺ کو ستانے کی وجہ سے حق سے مائل ہوئے، یعنی دور ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کا بدلہ لینے کے لیے جس کے وہ مرتکب ہوئے، ان کے دل حق سے مائل کر دیے۔[1] یا یہ معنی ہیں کہ جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیا تو اس نے ان کے دلوں سے نور کھینچ لیا، یا پھر جب انھوں نے زیغ (کج روی، ٹیڑھا پن) کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا، یعنی ان کو مخذول کیا اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا اور اتباعِ حق کی توفیق سے ان کو محروم کر دیا۔

جملہ ﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ پہلے مضمون کی تاکید کرتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو ہدایت نہیں کرتا جس کا فاسق ہونا اس کے علم میں سابق ہو چکا ہے۔[2] معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو ہدایت نہیں کرتا جس میں فسق کی صفت ہوتی ہے اور یہ لوگ انہیں میں سے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو کافروں میں سے بہت سے لوگوں کو ہدایت کی اور ان کو ہدایت کی توفیق دی۔ پھر ﴿ لَا يَهْدِي ﴾ کیوں فرمایا؟ تو کہیں گے کہ ان میں سے جو اسلام لایا تو وہ اس کے علم میں حتمی طور پر کافر نہ تھا اس طرح کہ اس پر مر جائے۔

﴿ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ﴾، ﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى ﴾ پر معطوف ہے، اس کے عامل کا معمول ہے، یا معمول ہے عامل مقدر کا جو ظرفِ اول کے عامل پر معطوف ہے۔ ﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ کہا: "یا قوم" نہ کہا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا، اس لیے کہ بنی اسرائیل میں نہ ان کا نسب ہے نہ والد ہے کہ وہ ان کی قوم ہوں اور ان کی والدہ محترمہ مریم علیہا السلام نسب میں ان کے سب سے زیادہ شریف لوگوں میں سے ہیں۔

﴿ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ ... ﴾ نصب ﴿ مُصَدِّقًا ﴾ و ﴿ مُبَشِّرًا ﴾ کا بنا بر

---

[1] فتح القدير (٥/٢٩٣) [2] معاني القرآن (٥/١٦٤)

حال ہے، دونوں میں عامل ارسال کے معنی ہیں جو رسول میں ہیں۔ ﴿بَعْدِی﴾ کو بہ فتح و اسکانِ یاء دونوں طرح پڑھا ہے (امام نافع، ابن کثیر، ابو عمرو، سلمی، زر بن حبیش اور ابو بکر رحمہم اللہ نے عاصم سے بہ فتحِ یاء پڑھا ہے اور باقی قراء نے بہ اسکانِ یاء پڑھا ہے)۔[1] یعنی اور اس وقت کا ذکر کر جب عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، یعنی میں تمھاری طرف اس وصف کے ساتھ بھیجا گیا ہوں جس وصف کا ذکر تورات میں کیا گیا ہے، درآنحالیکہ میں تصدیق کرنے والا ہوں اس کی جو میرے آگے ہے، یعنی تورات اور ایک رسول کی خوش خبری سنانے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہے اور جب میں تصدیق کرنے میں اور بشارت دینے میں ایسا ہوں تو اب میری تکذیب کا کوئی جواز نہیں ہے، اس لیے کہ میں تمھارے پاس کوئی ایسی چیز لے کر نہیں آیا جو تورات کی مخالف ہو، بلکہ وہ تورات تو میری بشارت دینے پر مشتمل ہے، پھر تم مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہو اور میری مخالفت کیوں کرتے ہو۔ سب سے زیادہ مشہور کتابوں کا ذکر کیا جن کے ساتھ انبیاء علیہم السلام نے حکم کیا اور سب سے مشہور رسول کا ذکر فرمایا جو خاتم المرسلین ہیں۔

﴿اَحْمَدُ﴾ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ مبارک ہے یہ صفت سے ایک علم منقول ہے۔ احتمال ہے کہ یہ مبالغے کے لیے فاعل سے صفت ہو تو اب یہ معنی ہوں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے غیر سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے ہیں۔ یا مفعول سے ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں جو خصالِ خیر ہیں، ان کے ساتھ آپ کی تعریف کی جاتی ہے، اس سے زیادہ کہ جس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر کی تعریف کی جاتی ہے۔ پہلی وجہ کے اعتبار سے عیسیٰ علیہ السلام نے اس نام کو اسمِ محمد پر مقدم فرمایا، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے لیے حامد ہونا اس سے پہلے ہے کہ خلق آپ کی تعریف کرے، کیوں کہ خلق نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف نہیں کی، مگر اس کے بعد کہ آپ خارج میں موجود ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے رب تعالیٰ کی حمد کرنا اس سے پہلے تھا کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کریں۔

امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ احمد کا اسم خاص کر کے اس لیے ذکر کیا کہ انجیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی نام رکھا گیا ہے اور اس لیے کہ آسمان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی واسمِ سامی احمد ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانی نام ذکر کیا گیا، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ اپنے رب تعالیٰ کی حمد کرنے والے ہیں، کیوں کہ قیامت کے دن اپنی امت کے لیے شفاعت کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر تعریفوں کو کھول دے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان تعریفوں کے ساتھ اپنے رب کی حمد کریں گے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے رب تعالیٰ کی حمد کرنا، اس پر سابق ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی حمد کریں۔

بالجملہ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میرے نام ہیں، میں محمد ہوں اور

---

[1] تفسير القرطبي (۸۳/۱۸)

میں احمد ہوں اور میں وہ حاشر ہوں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو میرے قدموں پر حشر کرے گا اور میں وہ ماحی ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے سبب سے کفر کو مٹا دے گا اور میں عاقب ہوں، عاقب وہ ہے کہ جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔[1] (أخرجه البخاري و مسلم وغيرهما) تفسیر بیضاوی کے بعض حواشی میں ہے کہ آپ ﷺ کے چار ہزار نام ہیں اور اُن میں سے ستر نام کے قریب اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہیں۔ انتہی. حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور رسالت پناہ کے اسماء توقیفی ہیں، نہ ان سے زیادہ کریں نہ ان کے علاوہ کسی اور نام سے ان کو پکاریں، نہ ان کا نام رکھیں۔

تفسیر خازن میں اس آیت کے زیرِ تفسیر سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو امر فرمایا کہ نجاشی کے پاس آئیں اور حدیث ذکر کی۔ اس میں یہ ہے کہ راوی نے کہا: میں نے نجاشی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور بے شک یہ وہی ہیں جن کی عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی اور اگر میں اس ملک میں نہ ہوتا جس میں ہوں اور لوگوں کے اس کام میں نہ ہوتا جس کی ذمے داری میں نے اٹھائی ہے تو میں ان کے پاس آتا، یہاں تک کہ میں ان کی جوتیاں اٹھاتا۔[2] (أخرجه أبو داود) عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تورات میں محمد ﷺ کی صفت لکھی ہوئی ہے اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ دفن کیے جائیں گے۔ امام ابو مودود مدنی نے کہا ہے کہ واقعی اس گھر میں ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔[3] (أخرجه الترمذي)

کعب احبار رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کی: کہ یا رسول اللہ! کیا ہمارے بعد کوئی امت ہے؟ فرمایا: ہاں تمھارے بعد حکماء، علماء، ابرار اور متقی لوگوں کی ایک امت آئے گی، گویا وہ فقہ میں انبیاء ہیں، تھوڑے رزق کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوں گے اور تھوڑے عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گا۔[4] انتہٰی. اسی طرح خطیب میں بھی ہے۔ اور "يَأْتِي أُمَّةٌ بَعْدَكُمْ" کے بجائے "أُمَّةُ أَحْمَدَ" کے الفاظ ہیں۔ اور کہا: مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: تورات میں میرا نام احمد ہے، اس لیے کہ میں اپنی امت کو نار سے مائل کرتا ہوں اور زبور میں میرا نام ماحی ہے، میرے نام سے اللہ تعالیٰ نے بتوں کو پوجنے والوں کو مٹایا۔ اور انجیل میں میرا نام احمد ہے۔ اور قرآن میں محمد ہے، اس لیے کہ میں آسمان اور زمین والوں میں محمود ہوں۔[5] انتہٰی. اس حدیث کی سند میں نظر کر لی جائے۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٣٩) صحيح مسلم (٢٣٥٤) ② سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٠٥)

③ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦١٧) یہ روایت موقوف ہے، نیز اس کی سند میں "عثمان بن ضحاک" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٩٦٢)

④ تفسير الخازن (٨٤/٧، ٨٥)

⑤ تفسير القرطبي (٨٤/١٨) امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے، نیز اس جیسی دوسری روایت الكامل لابن عدي (٣٣٧/١) میں مروی ہے اس کی سند میں "اسحاق بن بشر" سخت ضعیف راوی ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسمِ محمد اپنے معنی کے مطابق ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام اس سے بھی پہلے رکھا کہ اس کے ساتھ آپ اپنا نام رکھیں۔ سو یہ آپ ﷺ کے اعلامِ نبوت (نبوت کی نشانیاں) میں سے ایک علامت ہے۔[1] انتھی. اور عیسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ آپ کا نام احمد ہے اور موسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کا ذکر کیا، جب اُن کے رب نے ان سے فرمایا کہ وہ احمد کی امت ہے تو عرض کی: الٰہی! تو مجھے محمد کی اُمت میں سے کر دے، چنانچہ احمد کے ساتھ ان کا ذکر کیا، اس سے پہلے کہ محمد کے ساتھ ان کا ذکر کریں، اس لیے کہ آپ ﷺ کا اپنے رب کی حمد کرنا اس سے پہلے تھا کہ لوگ ان کی حمد کریں، پھر جب آپ ﷺ وجود میں آئے اور مبعوث ہوئے تو آپ ﷺ محمد بالفعل ہو گئے۔ انتھیٰ من الخطیب.

تنبیہ:

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ جو تفاسیر اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں، جیسے: تفسیر امام ابو السعود، مدارک نسفی رحمہ اللہ کی، بیضاوی رحمہ اللہ اور اس کا حاشیہ خفاجی رحمہ اللہ کا اور جلالین اور سلیمان جمل کا اس پر حاشیہ اور خطیب و خازن رحمہما اللہ اور ان جیسی اور تفاسیر اس مقام میں اور اس آیت کے تحت میں ان سب کی طرف مراجعت کی تو ان اعلام میں سے ہم نے کسی کو نہیں پایا کہ انجیل سے نقل کر کے اس بشارت کا ذکر کیا ہو، شاید اس کا یہ سبب ہو کہ انھوں نے کتبِ عتیقہ و جدیدہ (پرانی اور نئی) کی طرف رجوع نہیں کیا اور نہ ان کتابوں کے تراجم کی طرف جو مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں، یا اس وقت میں ان کا وجود نہ ہو، یا ان پر اعتماد نہ کیا، اس لیے کہ تحریف نے ان کی طرف راہ پائی ہے۔

لیکن ہم نے اس بات کو پسند کیا کہ نصوصِ انجیلیہ وغیرہا (انجیل کے صریح احکام) سے بعض کا اس جگہ ذکر کر دیں، من جملہ ان دلیلوں کے جو اس پر دال ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد ایک رسول کے آنے کی بشارت دی ہے جن کا نام مبارک احمد ہے صلى الله عليه وسلم وبارك إلى يوم الدين آمين. اس لیے کہ یہ اپنے مومن بندوں پر اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ہے اور اہلِ کتاب پر اس کی حجت کو پورا کرنے سے ہے۔ یہ بات کہ جو خبریں اور مثالیں اور بشارتیں ہمارے نبی کریم ﷺ کے حق میں وارد ہیں اور آپ ﷺ کی نبوت اور رسالتِ عامہ کے ثبوت کے لیے واضح حکم اور تصریح کرنے والی ہیں، وہ ان کتابوں میں بہت پائی جاتی ہیں، وہ اس وقت تک ان کتابوں میں موجود ہیں باوجود اس کے کہ ان میں لفظی اور معنوی لحاظ سے بہت کچھ تحریف ہو چکی ہے جس طرح کہ احادیث و قرآن پاک اس کے بارے میں بتاتے ہیں۔

جو کوئی یہ طریق جانتا ہے کہ پہلے والا نبی بعد والے نبی کی اس طرح سے خبر دیتا ہے اور انصاف کی آنکھ سے ان بشارتوں کی طرف نظر کرے گا اور ان کا مقابلہ ان خبروں سے کرے گا جن کو کہ نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں نقل

[1] تفسير القرطبي (١٨/ ٨٣، ٨٤)

کیا ہے تو وہ یہ پختہ یقین کرے گا کہ یہ خبریں صحتِ شہرت اور قبولیت کے لحاظ سے نہایت مضبوط اور قوی ہیں اور ہمارے نبی ﷺ کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد دس اوراق تک ان بشارتوں اور خبروں کا ذکر کیا ہے۔

خاکسار نے طوالت کے خوف سے ان کا ذکر نہیں کیا اور اس لیے بھی کہ بعض معاصرین نے نصاریٰ کے رد میں ایک ایسی نفیس وعمدہ و سادہ پرکار کتاب لکھی ہے کہ وہ آیة من آیات اللّٰہ ہے۔ کتبِ قدیم سے بے حساب بشارتیں ذکر کی ہیں، اسی بارے میں وہ کتاب ایسی ہے کہ باقی سب کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ جزاه الله خير الجزاء، وأحسن عواقبنا وعواقبه في الدين والدنيا: ووفقنا وإياه لمرضائه، وجنبنا وإياه عما يوجب سخطه و عدم رضاه آمين.

آخر میں فرمایا ہے کہ ان کے سوا اور صریح دلائل جن کا نصاریٰ انکار کرتے ہیں اور ان کی ایسی تاویل کرتے ہیں جس پر وہ محمول نہیں، علمائے اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ میں سے جو کوئی مسلمان ہوا پہلے زمانوں میں سے بلکہ اب تک ان سب نے یہ گواہی دی کہ محمد ﷺ کے متعلق بشارتیں پرانی اور نئی کتابوں میں موجود ہیں۔ اور اسی طرح آپ ﷺ کی نبوت کی سچائی اور عمومیت کا ان لوگوں نے بھی اقرار کیا جن کے دل کبھی بھی اسلام اور ایمان کو قبول کے لیے اپنی بدبختی کی وجہ سے تیار نہ ہوئے جیسے ہرقل عظیم روم ومقوقس صاحبِ مصر و ابن صوریا و حیی بن اخطب و ابو یاسر بن اخطب اور ان جیسے اور لوگ۔ والله سبحانه وتعالىٰ يتم نوره ولو كره الكافرون، وفي هذا المقدار كفاية له هداية۔ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ یعنی پھر جب عیسیٰ علیہ السلام ان کے پاس معجزات و آیات لے کر آئے تو کہا کہ یہ جو ہمارے پاس لے کر آیا ہے ایک واضح اور ظاہر جادو ہے۔ کسی نے کہا کہ مراد نبی کریم علیہ السلام ہیں۔ آپ ﷺ ان کے پاس یہ لے کر آئے تو یہ بات کہی۔ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے، بلکہ سیاق سے وہی متبادر (ذہن میں جلد آ جانے والا) ہے یہ دو قول ہیں، مفسرین نے ان کو بیان کیا ہے۔ جمہور نے ﴿سِحْرٌ﴾ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے) ''سَاحِرٌ'' پڑھا ہے اور دونوں سبعیہ ہیں۔[1]

(كذا في فتح البيان)

موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم سے انھیں ایذاء پہنچانے پر خطاب:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے اور رسول اور کلیم موسیٰ علیہ السلام کی خبر دیتا ہے کہ اس نے اپنی قوم سے کہا ہے کہ تم مجھے ایذا کیوں پہنچاتے ہو اور تم اس رسالت میں میری سچائی کو جانتے ہو جس کو لے کر میں تمھارے پاس آیا ہوں۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کو اس تکلیف میں تسلی دی ہے جو آپ ﷺ کو اپنی قوم وغیرہ کے کفار سے

[1] تفسير القرطبي (١٨/٨٤) فتح البيان (١٤/١٠٠_١١٩)

پہنچی اور آپ ﷺ کو صبر کرنے کا امر ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، البتہ مقرر ان کو اس سے زیادہ ایذا دی گئی، پس انھوں نے صبر کیا۔[1] اس میں مومنوں کو اس بات سے ممانعت کی گئی ہے کہ نبی مکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کریں، یا آپ ﷺ کو ایذا پہنچائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا ﴾ [الأحزاب: ٦٩] "اے ایمان والو! ان لوگوں جیسے نہ بن جاؤ جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف دی پس جو بات انھوں نے کہی تھی اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سے بری فرما دیا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعزت تھے۔"

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر جب وہ اتباع حق سے مائل ہوئے باوجود اس کے جاننے کے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ہدایت سے مائل کر دیے اور ان میں شک اور حیرت اور خزلان (شرمندگی) کو ساکن کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴾ [الأنعام: ١١٠] "اور ہم بھی ان کے دلوں کو اور ان کی نگاہوں کو پھیر دیں گے جیسا کہ یہ لوگ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں حیران رہنے دیں گے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴾ [النساء: ١١٥] "جو شخص باوجود راہِ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بھی رسول (ﷺ) کا خلاف کرے اور تمام مومنوں کی راہ چھوڑ کر چلے، ہم اسے ادھر ہی متوجہ کر دیں گے جدھر وہ خود متوجہ ہو اور دوزخ میں ڈال دیں گے، وہ پہنچنے کی بہت بری جگہ ہے۔" اور اسی لیے اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴾

عیسیٰ علیہ السلام کی ہمارے نبی ﷺ کے نام احمد کے ساتھ بشارت:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم ... ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تورات میری بشارت دے چکی ہے اور میں اس بات کا مصداق ہوں جس کی اس نے خبر دی اور میں اس رسول کی خوش خبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ یہ رسول نبی، امی، عربی، مکی، احمد ہیں۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل کے خاتم ہیں، وہ بنی اسرائیل کی جماعت میں محمد رسول اللہ ﷺ کی بشارت سناتے ہوئے کھڑے ہوئے اور وہ احمد ہیں، خاتم الانبیاء والمرسلین جن کے بعد نہ کوئی رسالت ہے نہ کوئی نبوت، کیا خوب ہے وہ حدیث جو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کی ہے، یہ وہی سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔[2]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٨١) صحيح مسلم (١٠٦٢)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

امام ابو داود طیالسی سے مروی حدیث میں بروایتِ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے اپنی ذات کے نام لیے، ان میں سے وہ ہیں جو ہم نے یاد رکھے۔ چنانچہ فرمایا: میں محمد ہوں اور میں احمد و حاشر و مقفی و نبی الرحمۃ والتوبہ والملحمۃ ہوں۔[1] (ورواه مسلم من حديث الأعمش عن عمرو بن مرة به) نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٥٧] ''جو لوگ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔ سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٨١] ''جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جب میں تمھیں کتاب و حکمت دوں، پھر تمھارے پاس وہ رسول آئے جو تمھارے پاس کی چیز کو سچ بتائے تو تمھارے لیے اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا ضروری ہے۔ فرمایا کہ تم اس کے اقراری ہو اور اس پر میرا ذمہ لے رہے ہو؟ سب نے کہا کہ ہمیں اقرار ہے، فرمایا تو اب گواہ رہو اور خود میں بھی تمھارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا، مگر اس سے یہ عہد لیا کہ البتہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں اور وہ زندہ ہوں تو چاہیے کہ اس کا اتباع کرے اور اس سے یہ عہد لیا کہ وہ اپنی امت سے یہ عہد لے کہ البتہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں اور وہ زندہ ہوں تو چاہیے کہ اس کا اتباع کریں اور اس کی مدد کریں۔[2] خالد بن معدان رحمہ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے راوی ہیں کہ انھوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ اپنے نفس کے متعلق ہم کو خبر دیں، فرمایا میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں اور میری ماں جب میرے ساتھ حاملہ ہوئی تو دیکھا کہ گویا اس سے ایک نور نکلا جس سے زمینِ شام سے لے کر بصریٰ کے محل روشن ہو گئے۔[3] (قال محمد بن إسحاق حدثني ثور بن يزيد عن خالد... الخ وهذا إسناد جيد وروي

[1] صحيح مسلم (٢٣٥٥) مسند الطيالسي (٦٧/١) [2] تفسير ابن كثير (٤٦٠/٤) [3] مستدرك الحاكم (٦٥٦/٢)

له شواهد من وجوه آخر) پھر اس مضمون کے دو شاہد بروایتِ امام احمد وسیدنا عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ[1] اور ابو امامہ رضی اللہ عنہ[2] کی راویت کردہ حدیثوں سے ذکر کیے ہیں (یہ دونوں حدیثیں مرفوع ہیں: عرباض سے مروی حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ خواب ہوں میری ماں کا جو اس نے دیکھا اور اسی طرح نبیوں کی مائیں دیکھتی ہیں)۔

امام احمد رحمہ اللہ نے عن عبد اللہ بن عتبہ عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو نجاشی کی طرف بھیجا اور ہم قریباً اسّی مرد تھے، ان میں سے عبد اللہ بن مسعود، جعفر، عبد اللہ بن رواحہ، عثمان بن مظعون اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہم ہیں اور قریش نے عمرو بن العاص اور عمارہ بن ولید کو ہدیہ دے کر بھیجا۔ جب یہ دونوں نجاشی پر داخل ہوئے تو اس کو سجدہ کیا، پھر اس کی طرف مبادرت کی (جلدی کی) اس کے دائیں اور بائیں طرف بیٹھ گئے، پھر اس سے کہا کہ ہمارے بنی عم سے ایک گروہ تیری مملکت میں داخل ہوا ہے اور انھوں نے ہم سے اور ہماری ملت سے روگردانی کی ہے۔ نجاشی نے کہا: پھر وہ لوگ کہاں ہیں؟ کہا کہ وہ تیری زمین میں ہیں، چنانچہ تو ان کی طرف آدمی بھیج دے (یعنی ان دونوں نے یہ کہا)۔ چنانچہ ان کی طرف آدمی بھیجا تو سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ بولے کہ میں آج تمھارا خطیب ہوں (یعنی تمھاری طرف سے میں بات چیت کروں گا، تم میرے تابع رہنا، پس ان کے ساتھی تابع ہوئے اور سب نجاشی کے پاس پہنچے) چنانچہ جعفر رضی اللہ عنہ نے سلام کیا اور سجدہ نہ کیا تو ان لوگوں نے ان سے کہا: تجھے کیا ہے کہ تو بادشاہ کو سجدہ نہیں کرتا تو جعفر رضی اللہ عنہ بولے کہ ہم تو صرف اللہ عزوجل ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ کہا: یہ کیا ہے؟ جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بے شک اللہ نے ہماری طرف اپنا رسول بھیجا اور اس نے ہم کو یہ حکم دیا کہ ہم کسی کو سجدہ نہ کریں مگر اللہ عزوجل کے لیے اور ہم کو نماز و زکات کا حکم کیا ہے۔

سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بولے: بے شک عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے حق میں یہ تیری مخالفت کریں گے۔ نجاشی نے کہا کہ تم عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے بارے میں کیا کہتے ہو اور ان کی ماں کے متعلق؟ جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم وہ کہتے ہیں جو اللہ عزوجل نے فرمایا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہے اور اس کی روح ہے، اس کا عذراء بتول کی طرف القا کیا کہ جس کو نہ کسی بشر نے چھوا اور نہ اس کو کوئی ولد عارض ہوا۔ چنانچہ نجاشی نے زمین سے ایک لکڑی اٹھائی اور کہا: او حبشہ و قسیسین و رہبان کے گروہ! واللہ! یہ اس پر کچھ اضافہ نہیں کرتے جو ہم ان کے بارے میں (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں) کہتے ہیں، اسی کے برابر یہ کہتے ہیں۔ مرحبا ہو تم کو اور اس کو جس کے پاس سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک وہ اللہ کا رسول ہے اور بے شک وہ وہی ہے جس کو ہم انجیل میں پاتے ہیں اور بے شک وہ وہی ہے جس کی عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے بشارت دی ہے۔

---

[1] مسند أحمد (۱۲۷/٤) اس روایت کا آخری جملہ (اور اسی طرح نبیوں کی مائیں دیکھتی ہیں) یہ ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۲۰۸۵)

[2] مسند أحمد (۲٦۲/٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱٥٤٦)

تم اترو جہاں چاہو، واللہ! اگر وہ حکومت نہ ہوتی جس میں مَیں ہوں تو البتہ میں اس کے پاس آتا، یہاں تک کہ میں خود اس کی جوتیاں اٹھاتا اور اس کو وضو کراتا اور دوسرے ان دو شخصوں کے ہدیہ کو واپس کرنے کا حکم دیا اور وہ واپس کر دیا گیا۔[1] (ثم تعجل ابن مسعود حتى أدرك بدرا أو زعم أن النبيﷺ استغفر له حين بلغه موته.» و قد رويت هذه القصة عن جعفر رضی اللہ عنہ و أم سلمة رضی اللہ عنہا و موضع ذلك كتاب السيرة) مقصد یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ سے آپ کی صفت و تعریف اور حکایت کرتے رہے ہیں اپنی کتابوں میں اپنی امتوں پر اور ان کو آپ ﷺ کے اتباع اور نصرت کا اور مدد کا حکم کرتے رہے ہیں جبکہ آپ ﷺ مبعوث ہوں۔ اور زمین والوں میں یہ بات مشہور ہوئی ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے جو اپنے بعد والے انبیاء کے باپ ہیں جبکہ مکے والوں کے لیے یہ دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان میں ایک ان کا رسول مبعوث کرے اور اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر یہ بات مشہور ہوئی۔

اور اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: آپ ہم کو اپنے شروع امر کی خبر دیں (جیسا کہ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے) یعنی زمین میں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی بشارت ہوں اور اپنی ماں کا خواب ہوں جو اس نے دیکھا،[2] یعنی اہلِ مکہ میں اس کا اثر ظاہر ہوا اور ارہاص ظاہر ہوا (یعنی وہ خرقِ عادت جو نبوت سے پہلے ظاہر ہوتا ہے)۔ پھر آپ ﷺ نے اس کا ذکر کیا۔ صلوات اللّٰه وسلام اللّٰه عليه وعلى آله وصحبه أجمعين.

قولہ تعالیٰ: ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ میں ابن جریج اور ابن جریر رحمہما اللہ کا قول ذکر کیا ہے "فَلَمَّا جَاءَهُمْ أَحْمَدُ" یعنی جس کی پہلے زمانوں میں بشارت دی گئی اور جس کے ذکر کی آواز پہلے زمانوں میں بلند کی گئی جب اس کا امر ظاہر ہوا اور وہ بینات لے کر آیا تو کافروں اور مخالفوں نے کہا کہ یہ ظاہر جادو ہے۔ یہ ان دو قولوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔[3]

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۷ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے، حالاں کہ اسے اسلام کی طرف

[1] مسند أحمد (٤٦١/١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح السيرة النبوية: ١٦٤/١)

[2] مسند أحمد (٢٦٢/٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٤٦) [3] تفسير ابن كثير (٤٥٩/٤۔٤٦١)

بلایا جاتا ہے؟ اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا⑦ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور (دینِ اسلام) اپنے مونہوں سے بجھا دیں، جبکہ اللہ اپنا نور پورا کرنے والا ہے اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں⑧ وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے، اگرچہ مشرک ناپسند ہی کریں⑨

یہ جو فرمایا کہ سب سے زیادہ ظالم وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے، یہ اہلِ کتاب کا حال فرمایا جو نبی ﷺ کی خبر چھپاتے تھے۔ انتھٰی.

فتح البیان کا بیان:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس کو اس کا رب اپنے نبی کی زبان پر اسلام کی طرف بلاتا ہے۔ وہ اسلام جو سب دینوں سے بہتر اور زیادہ شریف ہے اور اس میں اس کے لیے دارین کی سعادت ہے، پھر وہ اس کے قبول کرنے کی جگہ میں اللہ تعالیٰ پر افترائے کذب کو رکھتا ہے، اس طرح سے کہ وہ جس کلام سے اس کے بندوں کو حق کی طرف بلاتا ہے، اس کو کہتا ہے کہ یہ ظاہر جادو ہے، حالاں کہ سحر ایک جھوٹ اور تمویہ (چکنی چپڑی باتیں) ہیں۔

یا یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے اس طرح کہ اس کی طرف شریک اور اولاد کی نسبت کرتا ہے اور اس کی آیتوں کو موصوف بہ سحر کرتا ہے، حالاں کہ اس کا رب اس کو اپنے نبی کی زبان پر اسلام کی طرف بلاتا ہے جو تمام دینوں سے بہترین ہے اور جس میں توحید ہے اور شرک کی نفی ہے۔ جمہور نے ﴿ يُدْعٰى ﴾ کو بہ صیغۂ مجہول ''دعا'' سے پڑھا ہے اور کسی نے، (یعنی طلحہ بن مصرف نے) ''يَدَّعِيُ'' بہ فتح یاء وتشدیدِ دال بہ صیغۂ معروف ''اِدَّعَی'' سے پڑھا ہے۔ حرفِ ﴿ اِلٰى ﴾ کے ساتھ صرف اس لیے متعدی ہوا کہ اس میں انتماء (کسی سے لگاؤ کرنا) وانتساب کے معنی شامل ہیں۔

جملۂ ﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ پہلے مضمون کی تقریر اور تاکید کرتا ہے، یعنی جو لوگ ظلم کے ساتھ متصف ہیں اللہ تعالیٰ ان کو راہ نہیں دیتا اور یہ جن کا ذکر ہوا انہیں میں سے ہیں۔ اطفاء واخماد میں ایک وجہ سے فرق بھی ہے، وہ یہ ہے کہ اطفاء تو قلیل میں استعمال ہوتا ہے اور یوں بولا جاتا ہے: ''أَطْفَأْتُ السِّرَاجَ'' اور ''أَخْمَدْتُ السِّرَاجَ'' نہیں کہا جاتا۔

نور میں پانچ اقوال ہیں: ایک یہ ہے کہ مراد قرآن شریف ہے، یعنی اس کے ''ابطال'' اور ''تکذیب'' کا ارادہ کرتے ہیں قول کے ساتھ۔ (قالہ ابن زید) دوسرا یہ ہے کہ مراد اسلام ہے اس کو کلام کے ساتھ رد کرنے کا ارادہ

کرتے ہیں۔ تیسرا یہ ہے کہ مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، آپ کو اراجیف (جمع ارجاف یعنی جھوٹی خبریں) کے ساتھ ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ (قاله الضحاك) چوتھا یہ ہے کہ مراد اللہ تعالیٰ کی حجتیں اور دلیلیں ہیں ان کے ابطال کا ارادہ کرتے ہیں اپنے انکار اور تکذیب سے۔ (قاله ابن بحر) (فتح البیان میں ہے: یا نور سے مراد جمیع ما ذکر ہے، یعنی وہ سب باتیں جن کا ذکر کیا گیا)۔[1] پانچواں یہ ہے کہ ایک مثال بیان کی گئی ہے، اس شخص سے تشبیہ دی ہے جس نے آفتاب کا نور بجھانا چاہا، پھر اس کو مشکل اور ناممکن پایا۔ اسی طرح وہ شخص ہے جس نے حق کے ابطال کا ارادہ کیا۔[2] (حكاه ابن عيسىٰ)

یہ تمثیل اس کے ساتھ تہکم (مذاق) وسخریہ (تمسخر) کرنے کے لیے بیان کی ہے۔ شہاب میں ہے کہ ﴿نُوْرَ اللّٰهِ﴾ استعارہ تصریحیہ ہے اور اطفاء ترشیح ہے اور ﴿بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ میں توریہ ہے اور اسی طرح "نُوْرِهٖ" ہے، لیکن ﴿مُتِمُّ﴾ متم تجرید ہے، ترشیح نہیں ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس کو استعارہ تمثیلیہ ٹھہرایا ہے۔ وہ جو حق کے ابطال میں سعی وکوشش کرتے ہیں، اس میں ان کے حال کی تمثیل دی اس شخص کے حال سے جو سورج کو اپنے منہ سے پھونکتا ہے تاکہ اس کو بجھائے، اس تمثیل سے ان کے ساتھ تمسخر کرنا منظور ہے۔[3] انتهىٰ. بھلا کسی کے پھونک مارنے سے سورج کی روشنی بجھ سکتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کلام کی روشنی ان کے شعر وسحر کہہ دینے سے کہیں بجھ سکتی ہے، ہرگز نہیں۔

حرفِ لام میں کئی وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ مفعول ارادہ میں زیادہ کیا گیا ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کی اصل یہ ہے: ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا﴾ [التوبة: ٣٢] جیسا کہ سورۃ التوبہ میں آیا ہے۔[4] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لام موکدہ ہے جو مفعول پر داخل ہوا ہے، اس لیے کہ تقدیر "يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا" ہے (اکثر یہ لام مفعول کو لازم ہوتا ہے جبکہ وہ مقدم ہو، جیسے: "لزيد ضربت ولرؤيتك قصدت")۔ دوسری یہ ہے کہ تعلیل کا لام ہے اور مفعول محذوف ہے: "أَيْ: يُرِيْدُوْنَ إِبْطَالَ الْقُرْآنِ" اور "دفع الإسلام" اور "هلاك الرسول ليطفئوا"[5] (علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے: "أَيْ: يريدون الكذب ليطفئوا نور الله بأفواههم أَيْ: بكلامهم")۔[6] تیسری یہ ہے کہ ﴿اَنْ﴾ ناصبہ کے معنی میں ہے اور یہ خود فعل کا ناصب ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب لوگ لام کے بجائے ﴿اَنْ﴾ رکھتے ہیں "أَرَادَ" اور "أَمَرَ" میں۔ امام کسائی رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے۔ اس کی طرح یہ آیت ہے: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ﴾ [النساء: ٢٦] "اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمھارے واسطے خوب کھول کر بیان کرے۔" "أَيْ: أَنْ يُّبَيِّنَ"۔ معنی یہ ہیں: چاہتے ہیں کہ قرآن کے نور کو یا اسلام کی روشنی کو یا نبی کریم ﷺ کے نور کو بجھا دیں، یا دلائلِ الٰہی کی روشنی کو اپنے اقوال سے بجھا دیں جو ان کے مونہوں سے

[1] فتح البيان (١٤/١٢٠، ١٢١) [2] تفسير القرطبي (١٨/٨٥) [3] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٨/١٩٢)
[4] الكشاف (٤/٥٢٥، ٥٢٦) [5] فتح القدير (٥/٢٩٤) [6] تفسير النسفي (٤/٢٤٢)

نکلنے والے ہیں جن کا کوئی منشا نہیں ہے، سوائے افواہ کے بغیر دلوں کے اعتقاد کے اور جو طعنوں کی طرح ہیں۔

﴿ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ ﴾ (امام ابن کثیر، حمزہ اور کسائی وحفص عن عاصم نے بہ اضافت پڑھا ہے، باقی قراء نے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے)[1] یعنی اور اللہ اپنے نور کو تمام کرنے والا ہے اور حق کو پورا کرنے والا ہے اور اسے اس کی انتہاء کو پہنچانے والا ہے، اس طرح سے کہ اس کو آفاق میں اور مشارق سے لے کر مغارب تک سارے شہروں میں ظاہر کرے گا اور اس کو اس کے غیر پر بلند کرے گا۔ ﴿ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ یعنی اور اگر کافر نور کے تمام کرنے کو مکروہ رکھیں، یعنی ناپسند کریں تو کوئی پروا نہیں وہ تو ضرور ہی ہونے والا ہے۔

اس آیت کا شانِ نزول وہ ہے جو عطاء نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت کیا ہے کہ چالیس دن وحی نے نبی ﷺ کے پاس آنے میں دیر کی تو کعب بن اشرف بولا: اے یہود کے گروہ! خوش ہو جاؤ تحقیق اللہ تعالیٰ نے محمد کا نور اس شے میں بجھا دیا جو اس پر نازل ہوا کرتی تھی، اس کا امر تمام ہونے والا نہیں ہے، چنانچہ آپ ﷺ غمگین ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس کے بعد وحی کا اتصال (نازل ہونا) جاری رہا۔[2] (حكاه الماوردي على ما قاله القرطبي)

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ کا جملہ مستانفہ ہے، ماقبل کا مقرر ہے، یعنی وہی ہے جس نے اپنے رسول کو بیانِ شافی وقرآن یا معجزات اور ملتِ حقہ اسلام دے کر بھیجا، تاکہ اس کو سارے دینوں پر جو اس کے مخالف ہیں ظاہر و عالی اور غالب کرے اور اگر مشرک اس کے غالب کرنے کو مکروہ جانیں تو وہ تو ضرور ہی ہوگا۔ ﴿ دِيْنِ ﴾ مصدر ہے، اس کے ساتھ ادیانِ متعددہ کی تعبیر کی جاتی ہے۔

جملۂ ﴿ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ ﴾، ﴿ يُرِيْدُوْنَ ﴾ سے حال ہے، یا ﴿ لِيُطْفِـُٔوْا ﴾ سے اور جملۂ ﴿ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ حال ہے اس حال سے تو اب یہ دونوں متداخل ہوں گے اور اسی طرح ﴿ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ ہے اور یہ جواب ﴿ لَوْ ﴾ کا دونوں جگہ محذوف ہے، پہلے میں "أَتَمَّهُ" ہے اور دوسرے میں "أَظْهَرَهُ"۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کو بلند اور غالب کر دیا، پھر دینوں میں سے کوئی دین باقی نہیں رہا مگر حال یہ ہے کہ وہ دینِ اسلام سے مغلوب اور مقہور ہے، یعنی حجت اور برہان سے تو ہمیشہ اسلام غالب ہے اور ایک مدت تک تیر و تلوار سے بھی غالب رہا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اس وقت ہوگا جب عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، اس وقت زمین میں سوائے دینِ اسلام کے اور کوئی دین نہ ہوگا۔[3]

نکتہ:

اگر کوئی کہے کہ پہلے تو ﴿ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ فرمایا اور اس کے بعد ﴿ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ کہا تو

---

[1] تفسير القرطبي (٨٥/١٨) فتح القدير (٢٩٤/٥) [2] تفسير القرطبي (٨٥/١٨) [3] تفسير القرطبي (٨٦/١٨)

اس کی کیا حکمت ہے؟ تو کہیں گے: اللہ پاک نے اپنا رسول ﷺ بھیجا اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں اور سارے کافر کفرانِ نعمت میں برابر ہیں، اس لیے ﴿ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ فرمایا، کیونکہ کافر کا لفظ مشرک کے لفظ سے زیادہ عام ہے، اس لیے کافروں سے یہاں مراد یہود ونصاریٰ اور مشرکین ہیں، لہٰذا کافر کا لفظ اس کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ اَب رہا ﴿ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ تو یہ اس وقت تھا جب مشرکوں نے توحید کا انکار کیا اور اپنے انکار پر مصر ہوئے (جم گئے) اس لیے کہ دعوت کی ابتداء میں نبیِ کریم ﷺ کو توحید کا امر کیا گیا تھا کہ لوگ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہُ'' کہیں اور مشرکوں نے اس کو نہ کہا، چنانچہ اس لیے یہاں ﴿ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ فرمایا۔[1] (کذا قال الخطیب)

سب سے بڑا ظالم کون ہے؟

تفسیر ابن کثیر میں ہے: ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ﴾ یعنی اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ پر کذب کا افتراء کرتا ہے اور اس کے لیے انداد اور شرکاء ٹھہراتا ہے۔ حالاں کہ اسے توحید اور اخلاص کی دعوت دی جاتی ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ پھر فرمایا: ﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ﴾ یعنی یہ ارادہ کرتے ہیں کہ حق کو باطل کے ساتھ رد کر دیں۔ اس بارے میں ان کی مثال اس شخص کی مثال کی طرح ہے جو یہ ارادہ کرتا ہے کہ سورج کی شعاع کو اپنے منہ سے بجھا دے۔ جس طرح یہ محال ہے اسی طرح وہ بھی ناممکن ہے، اسی لیے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى ... الآیۃ ﴾ سورت براءت میں ان دونوں آیتوں پر ایسا کلام گزر چکا ہے جو کافی ہے۔[2] وللّٰہ الحمد والمنۃ.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ
عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ
عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۲ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ
اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳

اے ایمان والو! کیا میں تمھیں ایسی تجارت بتاؤں، جو تمھیں دردناک عذاب سے نجات دے؟ (10)

[1] فتح البیان (١٤/١٢٠ـ١٢٢) [2] رقم الآیۃ (٣٢، ٣٣) تفسیر ابن کثیر (٤/٤٦١، ٤٦٢)

تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو⑪ وہ (اللہ) تمھارے گناہ بخش دے گا اور تمھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور پاکیزہ محلات میں (جو) ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں ہیں، یہ ہے عظیم کامیابی⑫ اور ایک اور (نعمت) جسے تم پسند کرتے ہو، اللہ کی طرف سے مدد اور فتح قریب، اور مومنوں کو بشارت دے دیجیے⑬

عذابِ الیم سے بچانے والی تجارت کا ذکر:

سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزر چکا ہے[1] کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے محبوب عمل کے بارے میں پوچھیں، تاکہ اس کو کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی اور اس کے جملے سے یہ آیت ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ پھر اس عظیم تجارت کی تفسیر کی جس میں کوئی نقصان نہیں ہے اور جس سے مقصد حاصل ہوتا ہے اور وہ چیز جس کا اندیشہ اور ڈر ہے وہ دور ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی وہ تجارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال و جان سے لڑو، یہ تجارت تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو دنیا کی تجارت سے اور اس کے لیے محنت و مشقت اٹھانے سے اور صرف اسی کے لیے پیش آنے سے۔

پھر فرمایا: ﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ﴾ یعنی اگر تم وہ کام کرو گے جس کا میں نے تم کو امر کیا اور تم کو بتایا تو تمھیں زلات (گناہ، لغزشیں) بخش دوں گا اور تم کو جنات اور پاکیزہ رہائش گاہوں اور بلند درجات میں داخل کروں گا۔ اور اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾۔ پھر فرمایا: ﴿ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ﴾ یعنی اس پر تم کو اور زیادہ دوں گا جس کو تم پسند کرتے ہو اور وہ یہ ہے: ﴿ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ﴾ یعنی جب تم اس کی راہ میں لڑو گے اور اس کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری نصرت کا کفیل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ﴾ [محمد: ۷] ''اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھیں ثابت قدم رکھے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [الحج: ۴۰] ''جو اللہ تعالیٰ کی مدد کرے گا اللہ تعالیٰ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوتوں والا بڑے غلبے والا ہے۔''

① اس کی تخریج اس سورت کے شروع میں گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ﴾ "أي: عَاجِلٌ" پس یہ زیادت وہ خبر دینا ہے جو آخرت کی نعمتوں سے ملی ہوئی ہے۔ اس شخص کے لیے جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی اور اس کے دین کی مدد کی۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴾[1] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

﴿ هَلْ أَدُلُّكُمْ ﴾ کا استفہام معنی میں ایجاب و اخبار ہے اور سوالیہ انداز میں بیان کیا ہے اس کے شرف کے لیے، اس لیے کہ اس انداز سے نفس پر خوب اثر کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ معنی "سَأَدُلُّكُمْ" ہیں۔ یہ خطاب سارے مومنوں کو ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب کو خطاب ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ اگر ہم جانتے ہوتے کہ اعمال میں سے کون سا عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، پھر اس کو ناپسند جانا تو یہ نازل ہوئی: ﴿ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ... بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ ﴾۔[2] (أخرجه ابن مردويه)

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی۔ کہا کہ اے اللہ کے نبی! میں نے یہ چاہا کہ مجھے معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کو کون سی تجارت زیادہ پسند ہے، تاکہ میں وہ تجارت کروں۔[3] بالجملہ عملِ مذکور کو تجارت کی طرح ٹھہرایا، اس لیے کہ وہ اس عمل میں نفع پاتے ہیں، جیسا کہ تجارت میں نفع پاتے ہیں وہ نفع یہ ہے کہ جنت میں داخل ہوں گے اور نار سے نجات پائیں گے۔ جمہور نے ﴿ تُنْجِيكُمْ ﴾ کو انجاء سے پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام حسن، ابن عامر اور ابو حیوہ رحمہم اللہ نے) بہ تشدید پڑھا ہے "تُنَجِّيهِ" سے۔[4]

پھر اللہ پاک نے یہ تجارت بیان کی جس کی راہ بتائی، چنانچہ فرمایا: ﴿ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ ... الآية ﴾ یعنی وہ تجارت یہ ہے کہ تم ایمان پر دائم اور قائم ہو اس لیے کہ خطاب مومنوں کو ہے۔ ﴿ تُؤْمِنُونَ ﴾ خبر بہ معنی امر ہے، اس سے امتثال (حکم ماننا) کے وجوب کی خبر دینا ہے تو گویا امتثالِ امر کا وقوع ہو چکا، پھر اس کے واقع ہونے کی خبر دی گئی۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تُؤْمِنُونَ ﴾ تجارت کا عطفِ بیان ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ جملہ مستانفہ ہو جو ماقبل کی وضاحت کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "آمِنُوا وَجَاهِدُوا" کو صیغۂ امر سے پڑھا ہے[5] اور کسی نے (یعنی زید بن علی رحمہ اللہ نے) "تُؤمِنُوا وَتُجَاهِدُوا" بنا بر اضمار لامِ امر پڑھا ہے۔[6] اموال کو انفس سے پہلے رکھا، اس لیے کہ خرچ کرنے میں اور جہاد کے لیے تیاری کرنے میں اسی مال سے ابتداء کی جاتی ہے، یا اس لیے کہ مال اس وقت میں عزیز الوجود تھا تو اہتمام کے لیے اس کو مقدم کیا، یا اس لیے کہ مال قوامِ نفس (نفس کو قائم رکھنے کا دار و مدار) ہے اور یہ ایمان باللہ و بالرسول و جہاد فی سبیل اللہ باموال و انفس اس قیمت کی طرح ہے جس کو خرید نے والا دیتا ہے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/٤٦٢) [2] الدر المنثور (٨/١٤٦) [3] تفسير القرطبي (١٨/٨٧)
[4] تفسير القرطبي (١٨/٨٧) [5] فتح القدير (٥/٢٩٥) [6] تفسير القرطبي (١٨/٨٨)

﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی یہ ایمان اور جہاد کا فعل تمھارے لیے تمھارے اموال اور انفس سے، یا ہر شے سے بہتر ہے اگر تم ان لوگوں میں سے ہو جو جانتے ہیں۔ پس تم جانتے ہو کہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ تم جاہلوں میں نہیں ہو کہ اس بات کو نہ جانو۔ ﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ ... الآیۃ ﴾ یہ گناہوں کا بخشنا اور جنتوں میں داخل کرنا بیع کی طرح ہے جس کو خریدنے والا بیچنے والے سے لیتا ہے، اس قیمت کے عوض میں جو اس کو دی گئی ہے۔ یہ اس امر کا جواب ہے جو مدلول بہ لفظِ خبر ہے اور اسی لیے مجزوم ہوا۔

امام زجاج اور مبرد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ تُؤْمِنُوْنَ ﴾ ''اٰمِنُوْا'' کے معنی میں ہے اور اسی لیے ﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ ﴾ مجزوم آیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استفہام کا جواب ہے، چنانچہ انھوں نے استفہام ہونے کی وجہ سے اس کو مجزوم ٹھہرایا۔ بعض اہلِ علم نے فراء رحمہ اللہ کی تغلیط کی (انھیں غلط ٹھہرایا)۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: وہ نہیں ہیں کہ جب ان کو وہ شے بتا دی جو اُن کو نفع دیتی ہے تو ان کو بخش دے۔ ان کو تو اسی وقت بخشے گا جب وہ ایمان لائیں گے اور جہاد کریں گے۔[1] غرض امام زجاج رحمہ اللہ نے فراء رحمہ اللہ کی تردید کی ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے فراء رحمہ اللہ کے قول کی توجیہ میں فرمایا ہے کہ ﴿ هَلْ اَدُلُّكُمْ ﴾ اس کے نزدیک امر کے معنی میں ہے: ''يُقَالُ: هَلْ أَنْتَ سَاكِتٌ أَيْ: اُسْكُتْ'' اس کا بیان یہ ہے کہ ﴿ هَلْ ﴾ بہ معنی استفہام ہے۔ پھر متدرج ہوتا ہے، یہاں تک کہ عرض و حث ہو جاتا ہے اور حث اغراء کے مثل ہے اور اغراء امر ہے[2] (واللّٰه هذا توجيه عجيب وتأويل غريب أتى به الإمام رحمہ اللہ، فتأمل)۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ ﴾ شرط مقدر سے مجزوم ہے: ''أَيْ: أَنْ تُؤْمِنُوْا يَغْفِرْ لَكُمْ'' بعض نے ﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ ﴾ کو بہ ادغام پڑھا ہے۔ زیادہ بہتر ترکِ ادغام ہے، اس لیے کہ راء حرفِ متکرر ہے، اس کا لام میں ادغام بہتر نہیں۔ ﴿ فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ﴾ یعنی اقامت وخلود (قیام کرنے والے اور ہمیشہ) کے باغوں میں۔ ﴿ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ یعنی یہ گناہوں کی مغفرت اور جنتوں میں داخل کرنا جن کے وصف کا ذکر ہوا وہ کامیابی ہے جس کے بعد کوئی کامیابی نہیں ہے اور وہ ظفر ہے جس کے برابر اور مماثل اور کوئی ظفر نہیں ہے۔

﴿ وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ﴾ مفعول ہے فعل محذوف کا: ''أَيْ: يُؤْتِكُمْ نِعْمَةً أُخْرَى'' یعنی تم کو ایک اور نعمت دے گا جس کو تم پسند کرتے ہو۔ کسی نے یہ تقدیر کی ہے: ''أَيْ: يُعْطِيْكُمْ خَصْلَةً أُخْرَى''۔ امام اخفش اور فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ تِجَارَةٍ ﴾ پر معطوف ہے تو اب محلِ جر میں ہوگا۔ ''أَيْ: وَهَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى خَصْلَةٍ أُخْرَى تُحِبُّوْنَهَا فِي الْعَاجِلِ مَعَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ''[3] یعنی کیا میں تم کو ایک خصلت بتاؤں جس کو تم پسند کرتے ہو دنیا میں آخرت کے ثواب کے ساتھ ساتھ۔ کسی نے کہا ہے کہ محلِ رفع میں ہے: ''أَيْ: وَلَكُمْ خَصْلَةٌ أُخْرَى'' یعنی تمھارے

---

[1] فتح القدير (٥/٢٩٥) [2] تفسير الرازي (٢٩/٢٧٤) [3] فتح القدير (٥/٢٩٦)

لیے ایک اور خصلت ہے۔ ﴿ تُحِبُّوْنَهَا ﴾ میں کچھ تعریض ہے اس بات کی کہ وہ عاجل (فوری طور پر ملنے والی) کو آجل (کچھ دیر کے بعد ملنے والی) پر اختیار کرتے ہیں تو اب اس میں عاجل کی محبت پر ایک قسم کی توبیخ (دھمکی) ہو گی۔

پھر اللہ پاک نے اس ﴿ اُخْرٰى ﴾ کا بیان فرمایا: ﴿ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ ﴾ یعنی وہ دوسری نعمت جو تم کو دنیا میں عطا کروں گا وہ تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہے اور قریبی فتح ہے جو تم کو عطا کرے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ نَصْرٌ ﴾ ﴿ اُخْرٰى ﴾ سے بدل ہے اس تقدیر پر کہ وہ محلِ رفع میں ہو۔ کسی نے کہا کہ تقدیر "وَلَكُمْ نَصْرٌ وَّفَتْحٌ قَرِيْبٌ" ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد قریش پر نصرت ہے اور فتح مکہ ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فارس و روم کی فتح ہے۔ ﴿ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ معطوف ہے محذوف پر "أَيْ: قُلْ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَبَشِّرْ" یا ﴿ تُؤْمِنُوْنَ ﴾ پر، اس لیے کہ امر کے معنی میں ہے معنی یہ ہیں: "آمِنُوْا وَجَاهِدُوْا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ وَبَشِّرْهُمْ يَا مُحَمَّدُ بِالنَّصْرِ وَالْفَتْحِ"[1] یعنی ایمان لاؤ اور لڑو اے مومنو اور اے محمد! ان کو خوشخبری دے نصر اور فتح کی۔ صاحبِ کشاف اسی پر چلے ہیں۔[2] یا یہ معنی ہیں: "وَبَشِّرْهُمْ بِالنَّصْرِ فِي الدُّنْيَا وَالْفَتْحِ وَبِالْجَنَّةِ فِي الْآخِرَةِ" یہاں جو اضمار کے بجائے اظہار کیا تو اس سے منظور یہ خبر دینا ہے کہ اس بشارت کی مقتضی ایمان ہی کی صفت ہوئی ہے۔ پھر اللہ پاک نے مومنوں کو اپنے دین کی نصرت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ فرمایا:[3]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۟﴿۱۴﴾

اے ایمان والو! تم اللہ کے مددگار ہو جاؤ، جیسے عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا: اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے کفر کیا، تو ہم نے ان لوگوں کو، جو ایمان لائے، ان کے دشمنوں پر قوت دی تو وہ غالب آ گئے ⑭

مسلمان ہر حال میں دین کے مددگار ہیں:

عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے یاروں نے بڑی محنتیں کی ہیں، تب ان کا دین پھیلا۔ ہمارے نبی ﷺ کے بعد بھی

① فتح القدير (٥/٢٩٦) ② الكشاف (٤/٥٢٧) ③ فتح البيان (١٤/١٢٢_١٢٤)

خلیفوں نے اس سے زیادہ کیا۔ انتھٰی.

اللہ پاک اپنے مومن بندوں کو حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مددگار ہوں۔ اپنے اقوال و افعال اور جانوں اور مالوں کے سارے احوال میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا کہنا مانیں، جیسا کہ حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام کا کہنا مانا، جبکہ انھوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی طرف میرا مددگار کون ہے؟ یعنی اللہ عزوجل کی طرف دعوت دینے میں میرا مددگار کون ہے؟ تو حواری بولے کہ ہم اس شے پر تمھارے مددگار ہیں جس کو دے کر تم بھیجے گئے ہو اور اس پر تمھارے معین ہیں۔ یہ حواری لوگ ان کے پیرو ہیں۔ اسی لیے عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو داعی بنا کر بلادِ شام میں اسرائیلی اور یونانی لوگوں کی طرف بھیجا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ حج کے دنوں میں فرماتے تھے: کوئی مرد ہے جو مجھے ٹھکانا دے، یہاں تک کہ میں اپنے رب کی رسالت کو پہنچاؤں؟ بے شک قریش نے مجھ کو اس سے منع کیا ہے کہ میں اپنے رب تعالیٰ کی رسالت پہنچاؤں۔[1] یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے مدینے والوں میں سے اوس و خزرج کو آپ ﷺ کے لیے متعین فرمایا تو انھوں نے آپ ﷺ سے بیعت کی اور موازرت اور مدد کی اور یہ شرط کی کہ اگر ان کی طرف ہجرت کر آئیں گے تو وہ آپ ﷺ کو اسود و احمر سے روکیں گے۔ پھر جب اپنے اصحاب کے ہمراہ، جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے ہجرت کی تو جس بات پر اللہ تعالیٰ سے معاہدہ کیا تھا وہ آپ ﷺ کے لیے پوری کی، اسی لیے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ نے ان کا نام انصار رکھا اور یہ ان کا علم یعنی اصل نام ہوگیا۔ رضي اللّٰه عنم وأرضاهم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب تعالیٰ کی رسالت اپنی قوم کو پہنچائی اور حواریوں میں سے جس نے ان کی مدد کی تو بنی اسرائیل کے ایک فرقے نے تو ہدایت پائی اس شے سے جس کو وہ ان کے پاس لائے اور ایک فرقہ گمراہ ہوا تو وہ اس شے سے نکل گیا جس کو وہ لائے اور ان کی نبوت کا انکار کیا اور بڑے بڑے امور کی ان کو تہمت لگائی۔ یہ لوگ یہود ہیں۔ عليهم لعائن اللّٰه المتتابعة إلى يوم القيامة۔ اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان میں سے ایک فرقے نے ان کے حق میں غلو کیا، یہاں تک کہ ان کو نبوت کے اس درجے سے بھی اوپر چڑھا دیا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا اور فرقے فرقے ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ثالث ثلاثہ ہیں: باپ اور بیٹا اور روح القدس۔ کوئی کہتا ہے: وہ اللہ ہیں۔ معاذ اللّٰه من جميع ما كرهه اللّٰه۔ یہ سب اقوال سورۃ النساء میں مفصل ہیں۔[2]

مومنوں کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد:

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ﴾ یعنی پھر ہم نے ایمان والوں کو

---

[1] مسند أحمد (٣٢٢/٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٣)
[2] رقم الآية (١٧١)

اس پر مدد دی جس نے نصاریٰ کے فرقوں میں سے ان کے ساتھ دشمنی کی، پھر مومنین ان پر غالب ہو گئے۔ یہ غلبہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے ہوا، جیسا کہ امام ابو جعفر ابن جریر رحمہ اللہ نے عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، کہا: جب اللہ عزوجل نے یہ ارادہ کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھا لے تو وہ اصحاب کی طرف نکلے اور وہ گھر میں بارہ مرد تھے، ایک چشمے کے پاس جو گھر میں تھا اور ان کا سر پانی سے ٹپکتا تھا تو فرمایا: بے شک تم میں سے وہ شخص ہے کہ بارہ دفعہ میرا انکار کرے گا، اس کے بعد کہ مجھ پر ایمان لا چکا۔

کہا: پھر فرمایا: تم میں سے کون وہ شخص ہے جو اس کے لیے راضی ہو کہ اس پر میرا شبہہ ڈال دیا جائے، پھر وہ میری جگہ قتل کیا جائے اور میرے ساتھ میرے درجے میں ہو۔ کہا: پس ان میں سے ایک کم سن جوان کھڑا ہوا اور کہا کہ میں۔ چنانچہ اس سے کہا کہ بیٹھ جا، پھر ان سے دوبارہ وہی بات کہی تو وہی جوان کھڑا ہوا اور کہا کہ میں۔ تو اس سے فرمایا کہ بیٹھ جا، پھر ان سے دوبارہ وہی بات کہی تو پھر وہی جوان کھڑا ہوا اور کہا کہ میں تو فرمایا کہ ہاں تو وہی ہے۔ کہا: پھر اس پر عیسیٰ علیہ السلام کا شبہہ ڈال دیا گیا اور گھر کے ایک سوراخ میں سے آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے۔ کہا اور یہودیوں میں سے ان کی تلاش کرنے والے لوگ آئے اور ان کے ہم شکل نوجوان کو پکڑ لیا، پھر اس کو قتل کیا اور اس کو سولی دی اور ان میں سے بعض نے عیسیٰ علیہ السلام کا بارہ بار انکار کیا اس کے بعد کہ ان پر ایمان لائے، پھر ان کے حق میں تین فرقے ہو گئے۔

چنانچہ ایک فرقے نے تو کہا کہ وہ اللہ تھا جب تک اس نے چاہا ہم میں رہا، پھر آسمان کی طرف چڑھ گیا، یہ یعقوبیہ ہیں۔ اور ایک فرقے نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا ہم میں تھا، پھر اس کو اپنی طرف اٹھا لیا، یہ نسطوریہ ہیں۔ ایک فرقے نے کہا کہ ہم میں اللہ تعالیٰ کا بندہ و رسول تھا، جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا، یہ لوگ مسلمان ہیں۔ پھر دو کافر فرقوں نے مسلمان فرقے کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی اور اس کو قتل کیا۔ پھر ہمیشہ اسلام ناپید رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو معبوث فرمایا: ﴿فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ﴾ یعنی وہ گروہ جو بنی اسرائیل میں سے عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کافر ہوا اور وہ گروہ جو عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایمان لایا۔

﴿فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ﴾ یعنی پس ہم نے ان کی مدد کی جو ایمان لائے ان کے دشمنوں پر تو وہ غالب ہو گئے بسبب محمد ﷺ کے ان کے دین کو دشمنوں کے دین پر غالب کرنے کے۔[1]

(وهذا لفظه في كتابه عند تفسير هذه الآية الكريمة و هكذا رواه النسائي عند تفسير هذه الآية من سننه عن أبي كريب عن محمد بن العلاء عن أبي معاوية بمثله سواء).

چنانچہ سید المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کی امت ہمیشہ حق پر غالب و ظاہر رہے گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا امر

[1] تفسير الطبري (٣٦٦/٢٣، ٣٦٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٨٩/٦)

آئے اور وہ اسی طرح ہوں گے اور یہاں تک کہ ان کا آخر مسیح عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ہمراہ دجال سے لڑے گا جس طرح کہ اس بارے میں صحیح حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ والله أعلم. آخر تفسير سورة الصف ولله الحمد والمنة كذا في ابن كثير.

فتح البیان کا بیان:

﴿ كُونُوٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ جس نصرتِ دین پر تم ہو اسی پر دائم اور قائم رہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں بحمد اللہ تعالیٰ یہ ہو گیا۔ نبی مکرم ﷺ کے پاس ستر مرد آئے اور عقبہ کے پاس آپ ﷺ سے بیعت کی اور آپ ﷺ کو ٹھکانا دیا اور آپ ﷺ کی مدد کی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو غالب کر دیا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ (یعنی ابو عمرو اور نافع رحمہ اللہ نے) "أَنْصَارًا لِلّٰهِ" پڑھا ہے، تنوین اور ترکِ اضافت کے ساتھ[1] اور باقی قراء نے بہ اضافت پڑھا ہے (یہ سبعیہ ہے)۔ رسم (تحریر) دونوں کو محتمل ہے، ابو عبید رحمہ اللہ نے اضافت کو اختیار کیا ہے، اس لیے کہ ﴿ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ﴾ بہ اضافت ہے۔[2]

اول میں احتمال ہے کہ حرفِ لام مفعول میں زیادہ کیا گیا زیادتِ تقویت کے لیے، یہ غیر زائد ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت کرو جس طرح حواریوں نے نصرت کی جب ان سے عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: ﴿ مَنْ اَنْصَارِيٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ تو وہ بولے: ﴿ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ﴾۔ مکی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَمَا ﴾ میں کاف مصدر محذوف کی صفت ہے۔ "أَيْ: كُونُوا كَوْنًا كَمَا قَالَ"[3] لیکن اس قول میں نظر ہے۔ اس لیے کہ ان کو حکم نہ ہوگا کہ وہ اس طرح ہو جائیں۔ کسی نے کہا ہے کہ کاف محلِ نصب میں ہے بنا بر اضمار قول: "أَيْ: قُلْنَا لَهُمْ ذٰلِكَ كَمَا قَالَ عِيسَى" کسی نے کہا ہے کہ ایک کلام ہے جو اپنے معنی پر محمول ہے نہ کہ اپنے لفظ پر۔ امام زمخشری رحمہ اللہ اسی طرف مائل ہیں۔[4]

معنی یہ ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے انصار ہو جاؤ، جیسے حواری عیسیٰ علیہ السلام کے انصار ہوئے، جبکہ ان سے کہا: ﴿ مَنْ اَنْصَارِيٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ تو بولے: ﴿ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ﴾۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ اِلٰى ﴾ بہ معنی "مَعَ" ہے: "أَيْ: مَنْ أَنْصَارِيْ مَعَ اللّٰهِ" کسی نے کہا: تقدیر یہ ہے: "مَنْ أَنْصَارِيْ فِيمَا يُقَرِّبُ إِلَى اللّٰهِ" یعنی اس شے میں میرا مددگار کون ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف قریب کر دے؟ کسی نے کہا کہ تقدیر یہ ہے: "مَنْ أَنْصَارِيْ مُتَوَجِّهًا إِلٰى نُصْرَةِ اللّٰهِ" یعنی میرا مددگار کون ہے اللہ تعالیٰ کی نصرت کی طرف متوجہ ہونے والا؟ سورت آل عمران میں اس پر کلام گزر چکا ہے۔[5]

---

① تفسير ابن كثير (٤/٤٦٢ـ٤٦٤) ② تفسير القرطبي (٨٩/١٨) ③ اللباب في علوم الكتاب (٦٥/١٩)
④ الكشاف (٥٢٨/٤) ⑤ رقم الآية (٥٢)

﴿ لِلْحَوَارِيّنَ ﴾ سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کے انصار اور اُن کے مخلص اصحاب ہیں اور ان لوگوں سے پہلے تھے جو اُن پر ایمان لائے، یہ لوگ بارہ مرد تھے۔ حوارِي رجل اس کے صاف اور خالص دوست کو کہتے ہیں۔ ''حور'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی بیاض خالص ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ دھوبی تھے، کپڑوں کو سفید کیا کرتے تھے۔ مختار میں ہے کہ تحویر کپڑوں کے سفید کرنے کو کہتے ہیں۔[1] ﴿ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ﴾ ''إضافة وصف إلی مفعوله'' کے باب سے ہے ''أَيْ: نَحْنُ الَّذِيْنَ نَنْصُرُ اللّٰهَ أَيْ: نَنْصُرُ دِيْنَهُ'' یعنی ہم وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرتے ہیں۔

عبد اللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم رحمہ اللہ سے مروی ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گروہ سے فرمایا جو عقبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے: تم اپنے میں سے میری طرف بارہ آدمی نکالو، وہ اپنی قوم پر کفیل ہوں، جیسے کہ حواری عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے لیے کفیل ہوئے۔[2] (أخرجه ابن سعد وابن إسحاق) سیدنا محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقباء سے فرمایا کہ بے شک تم اپنی قوم پر کفیل ہو جس طرح کہ حواریوں نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے لیے کفالت کی اور میں اپنی قوم کا کفیل ہوں، وہ بولے: ہاں۔[3] (أخرجه ابن سعد)

﴿ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا اور ان کا ایک گروہ منکر ہوا۔ یہ اس لیے ہوا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کے مرفوع ہونے کے بعد انھوں نے اختلاف کیا تو وہ متفرق ہوئے اور باہم لڑے۔ ایک فرقے نے تو کہا کہ وہ اللہ تھا، پھر اوپر چڑھ گیا۔ ایک فرقہ بولا کہ اللہ کا بیٹا تھا اور اس نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ ایک فرقے نے کہا کہ وہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول تھا اور اس نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا، یہ لوگ مومنین ہیں۔ ہر فرقے کا تابع لوگوں میں سے ایک ایک گروہ ہو گیا، پھر وہ لڑے اور دو کافر فرقے غالب ہو گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو مومن فرقہ کافر فرقے پر غالب ہوا۔

چنانچہ وہ اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴾ یعنی ہم نے ان میں سے حق والوں کو باطل والوں پر قوت دی۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی ہم نے ان کی تائید کی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور اُن کی اُمت کی ان کے دشمنوں پر۔[4] کسی نے کہا ہے کہ ہم نے اب مسلمانوں کے دونوں فرقوں پر تائید کی جَمِيْعًا ''فَأَصْبَحُوْا ظَاهِرِيْنَ'' یعنی پھر وہ غالب و قاہر ہو گئے اپنے اقوال و افعال میں اس ذلت کے بعد کہ جس میں وہ تھے۔ کسی سے نہیں ڈرتے ہیں اور نہ اس سے چھپتے ہیں۔[5] (كذا في البيان)

---

[1] مختار الصحاح (۱/۱۶۷) [2] الطبقات الکبریٰ (۳/۶۰۲) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] الطبقات الکبیر (۳/۶۰۲) اس کی سند میں انقطاع ہے ''داود بن حصین'' کا سماع سیدنا محمود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[4] فتح القدیر (۵/۲۹۷) [5] فتح البیان (۱۴/۱۲۴۔۱۲۶)

الحمد للّٰه و المنة کہ سورۃ الصف کی تفسیر ۱۴؍ ماہِ شوال ۱۳۱۵ ہجری شب چہار شنبہ (بدھ) بوقت یازدہ ساعت شب (رات کے گیارہ بجے) مکمل ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آئندہ توفیق دے آمین!۔ ربنا آتنا في الدنيا حسنة و في الآخرة حسنة وقنا عذاب النار آمين. وصلى اللّٰه عليه وسلم وبارك على سيد المرسلين وسيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه إلى يوم الدين، عدد ما علم وزنة ما علم و ملأ ما علم آمين. والحمد للّٰه أولا و آخرا وظاهرا وباطنا.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ

اس سورت مبارکہ کی گیارہ (۱۱) آیتیں ہیں بلا خلاف۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مدینے میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس والنحاس و ابن مردويه والبيهقي في الدلائل) سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] (أخرجه ابن مردويه) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ جمعہ میں سورۃ الجمعہ اور ﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ ﴾ پڑھتے تھے۔[3] (أخرجه مسلم وأهل السنن وأخرجوا عن ابن عباس رضي الله عنهما نحوه) سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شبِ جمعہ کی نمازِ مغرب میں ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ اور ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھتے تھے۔ شبِ جمعہ کی نمازِ عشاء میں سورۃ الجمعہ اور منافقون پڑھتے تھے۔[4] (أخرجه ابن حبان و البيهقي في سننه)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ
الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي
الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ
لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۲ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۴

[1] تفسير القرطبي (۹۱/۱۸) [2] الدر المنثور (۱۵۱/۸)

[3] صحيح مسلم (۸۷۹) سنن أبي داود (۱۰۷۵) سنن الترمذي (۵۱۹) سنن النسائي (۱۴۲۱)

[4] صحيح ابن حبان (۱۸۴۱) سنن البيهقي الكبرى (۲۰۱/۳) اس کی سند میں ''سعید بن سماک'' سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۵۵۹)

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اللہ کی تسبیح کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے، (وہ) بادشاہ ہے، نہایت پاک ذات، زبردست، بہت حکمت والا① وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں ایک رسول بھیجا انہی میں سے، وہ اس کی آیات ان پر تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بلاشبہہ اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں پڑے تھے② اور (اسے) ان میں سے دوسرے لوگوں کے لیے بھی (بھیجا) جو ابھی تک ان کے ساتھ نہیں ملے، اور وہ (اللہ) زبردست خوب حکمت والا ہے③ (۳) یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے یہ (فضل) دیتا ہے اور اللہ عظیم فضل والا ہے④

ناخواندہ عرب لوگ تھے جن کے پاس کسی نبی کی کتاب نہ تھی۔ یعنی یہی رسول دوسرے اَن پڑھ لوگوں کے لیے بھی ہے، وہ فارس کے لوگ بھی نبی کی کتاب نہ رکھتے تھے حق تعالیٰ نے پہلے عرب پیدا کیے اس دین کو تھامنے والے بعد میں عجم میں ایسے کامل لوگ پیدا ہوئے۔ انتھی[1].

ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح خوان ہے:

اللہ پاک خبر دیتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی ساری مخلوق خواہ وہ ناطق ہے (یعنی بول سکتی ہے) یا جامد ہے وہ اللہ کی پاکی بولتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''ایسی کوئی شے نہیں جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو۔''

نہ بلبل بر گلشن تسبیح خوانیست　　　که هر خارے به تسبیحش زبانیست

''باغ میں بلبل ہی (اللہ کی) پاکی بیان کرنے والی نہیں ہے، بلکہ ہر کانٹا اس کی تسبیح بیان کرنے کے لیے ایک زبان کی حیثیت رکھتا ہے۔''

پھر فرمایا: ﴿ اَلۡمَلِکِ الۡقُدُّوۡسِ ﴾ یعنی وہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، ان میں اپنے حکم سے تصرف کرنے والا ہے اور وہ نقائص سے پاک اور مبرا ہے۔ صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف ہے۔ ﴿ اَلۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴾ کی تفسیر بارہا گزر چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت ایک احسانِ عظیم:

﴿ ھُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا ﴾ ''اُمِّیِّیْنَ'' سے مراد عرب ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقُلۡ

لِّلَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْأُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۚ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَّاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾ [آل عمران: ٢٠] ''اور اہلِ کتاب اور اَن پڑھ لوگوں سے کہہ دیجیے! کہ کیا تم بھی اطاعت کرتے ہو؟ پس اگر یہ بھی تابعدار بن جائیں تو یقیناً ہدایت والے ہیں اور اگر یہ روگردانی کریں تو آپ پر صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھ بھال رہا ہے۔''

''اُمِّیّٖنَ'' کا خاص کر کے ذکر کرنا ان کے علاوہ کے لیے مانع نہیں ہے، لیکن ان پر احسان سب سے زیادہ اور ابلغ ہے جس طرح کہ اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ﴾ [الزخرف: ٤٤] ''اور یقیناً یہ (خود) آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے نصیحت ہے۔'' حالانکہ قرآن شریف میں دوسروں کے لیے بھی ذکر ہے، وہ اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں اور اسی طرح یہ فرمایا: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢١٤] ''اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا دے۔''

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ عامہ کا بیان:

یہ آیت اور اس جیسی دوسری آیتیں ان آیتوں کے منافی نہیں ہیں: ﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ١٥٨] ''آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں۔'' اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ١٩] ''تاکہ میں اس قرآن کے ذریعے سے تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو ڈراؤں۔'' اور یہ آیت جس میں قرآن کے متعلق خبر دی ہے: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [هود: ١٧] ''اور تمام فرقوں میں سے جو بھی اس کا منکر ہوا اس کے آخری وعدے کی جگہ جہنم ہے۔'' ان کے سوا اور آیتیں جو اس پر دال ہیں کہ نبیِ مکرم ﷺ کی بعثت احمر و اسود ساری مخلوق کے لیے عام ہے اور ان سب کو شامل ہے۔ سورۃ الانعام میں اس کی تفسیر آیات و احادیثِ صحیحہ کے ساتھ گزر چکی ہے۔ وللہ الحمد والمنة.

یہ آیت اس امر کا مصداق ہے کہ اللہ پاک نے اپنے خلیل جلیل ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی جب انھوں نے اہلِ مکہ کے لیے یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ان میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث کرے جو اُن پر اس کی آیتیں پڑھے اور ان کو پاک کرے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے۔ چنانچہ اللہ پاک نے نبیِ کریم ﷺ کو اس وقت مبعوث فرمایا کہ رسولوں کا توڑا پڑ گیا تھا اور پہلے رسولوں کی راہیں مٹ گئی تھیں اور رسول کی سخت حاجت تھی اور اللہ تعالیٰ عرب و عجم سارے زمین والوں پر خفا ہو چکا تھا مگر تھوڑے سے اہلِ کتاب میں سے جنھوں نے اس شریعت کے ساتھ تمسک کیا تھا جس کو عیسیٰ علیہ السلام لے کر مبعوث ہوئے تھے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾

﴿ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ میں ہونے کا یہ مطلب ہے کہ عرب لوگ بہت پہلے سے دینِ ابراہیمی کو ماننے والے تھے۔ پھر انھوں نے اس دین کو تبدیل اور متغیر اور مقلوب کر ڈالا تھا اور اس کی مخالفت کی تھی اور توحید کے بدلے میں شرک اور یقین کے عوض شک کو لے لیا اور کئی ایسی نئی چیزیں نکالیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ان کو اذن نہیں دیا۔

اسی طرح اہلِ کتاب نے بھی اپنی کتابیں مبدل ومحرف ومغیر وماول (تاویل کی گئیں) کر ڈالیں، پس اللہ تعالیٰ پاک نے نبیِ مکرم ﷺ کو ایک ایسی شرعِ عظیم وکامل وشامل دے کر مبعوث فرمایا جو ساری خلق کے لیے ہے اور اس میں ان کے لیے ہدایت ہے اور ان کی معاش اور معاد کے سارے امور جن کی حاجت ہوتی ہے ان کا بیان ہے اور ان کو اس شے کی طرف بلانا ہے جو ان کو جنت کے اور رضائے الٰہی کے قریب کر دے اور ان کو اس شے سے منع کرنا ہے جو ان کو نار کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی طرف قریب کر دے۔ وہ شریعت اصول وفروع میں سارے مشکوک وشبہات کے دور کرنے کے لیے ایک فیصلہ کرنے والا حاکم ہے۔ للّٰہ الحمد والمنة کہ اس نے پہلے انبیاء کے تمام محاسن آپ کے لیے جمع کر دیے اور آپ کو وہ خوبیاں عطا کیں جو پہلے انبیاء میں سے کسی کو عطا نہیں کیں اور نہ بعد والوں میں سے کسی کو عطا کرے گا۔ فصلوات اللّٰہ و سلامه علیه دائماً إلی یوم الدین.

قولہ تعالیٰ: ﴿وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ کی تفسیر میں امام ابو عبداللہ رحمہ اللہ بخاری نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نبیِ مکرم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ﷺ پر سورۃ الجمعہ نازل ہوئی: ﴿وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾۔ صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! وہ کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ان کو جواب نہ دیا یہاں تک کہ آپ ﷺ سے تین بار پوچھا اور ہم میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے تو آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر رکھا، پھر فرمایا: اگر ایمان ثریا کے نزدیک ہوتا تو البتہ اس کو ان لوگوں میں سے جا پہنچتے۔[1] (و رواہ مسلم والترمذي والنسائي و ابن أبي حاتم و ابن جریر من طرق عن ثور بن یزید الدیلمي عن سالم أبي الغیث عن أبي هریرة)

چنانچہ اس حدیث شریف میں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ سورت مدنی ہے اور اس بات پر کہ آپ ﷺ کی نبوت سارے لوگوں کو عام ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ نے ﴿وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ﴾ کی تفسیر فارس کے ساتھ کی اور اسی لیے اپنے خطوط فارس و روم وغیرہ اُمتوں کی طرف لکھے، ان کو اللہ عزوجل کی طرف دعوت دیتے تھے اور اس بات کی طرف کہ وہ اتباع کریں اس چیز کا جو آپ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ اسی لیے امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے ﴿وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ اعاجم ہیں[2] اور ہر وہ شخص ہے جس نے غیر عرب میں سے نبیِ کریم ﷺ کی تصدیق کی۔

---

(1) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٦١٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٤٦) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٣١٠) سنن النسائي الکبریٰ (٥/٧٥) تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٥٥) تفسیر الطبري (٢٣/٣٧٤، ٣٧٥)

(2) تفسیر الطبري (٢٣/٣٧٤)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:
«إِنَّ فِي أَصْلَابِ أَصْلَابِ أَصْلَابِ رِجَالٍ وَنِسَاءٍ مِنْ أُمَّتِي يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ» (فتح البیان میں یوں ہے: « إن في أصلاب أصلاب أصلاب الرجال من أصحابي رجالا ونساء من أمتي يدخلون الجنة بغير حساب » یعنی میرے اصحاب کے مردوں کی پشتہا پشت میں مرد اور عورتیں ہیں میری امت سے کہ وہ جنت میں بغیر حساب داخل ہوں گے۔ فتح القدیر میں اس کے مخرج یہ ہیں۔ طبراني و ابن مردويه وضياء) ثُمَّ قَرَأَ ﴿ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ﴾[1] يَعْنِيْ بَقِيَّةَ مَنْ بَقِيَ مِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ ».

﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی وہ اپنی شریعت اور تقدیر میں عزت وحکمت والا ہے۔ ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ یعنی یہ جو اللہ پاک نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوتِ عظیمہ عطا فرمائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو خاص فرمایا، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ وہ دیتا ہے جس کو چاہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔[2] (كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ ﴾ بہ معنی "يُنَزِّهُهُ" ہے تو اب حرفِ لام زاید ہوگا۔ اکثریت چونکہ ان کی ہے جو "ما لا يعقل" ہیں، اس لیے اکثریت کو تغلیب دے کر کلمۂ ﴿ مَا ﴾ فرمایا جو غیر عقلاء کے لیے ہے۔
علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تسبیح یا تو تسبیحِ خلقت ہوتی ہے، یعنی جب تم ہر شے کی طرف نظر کرو گے تو اس کی خلقت اور پیدایش تم کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بتائے گی اور اشباہ اور امثال سے اس کی تنزیہ ظاہر ہوگی۔ یا تسبیح معرفت کی ہوتی ہے۔ اس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف سے ہر شے میں وہ چیز رکھتا ہے جس سے وہ اللہ پاک کو پہچانتی ہے اور اس کی تنزیہ کرتی ہے۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو نہیں دیکھتے: ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] "ایسی کوئی چیز نہیں جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ تم اس کی تسبیح سمجھ نہیں سکتے۔" یا تسبیح ضرورت کی ہوتی ہے اس طرح سے کہ اللہ پاک تسبیح کو ہر جوہر پر جاری کرتا ہے بغیر اس کے کہ وہ اس کو سمجھے۔

جمہور نے چاروں اوصاف کو بہ جر پڑھا ہے اس بنا پر کہ اسم مبارک اللہ کی صفت ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ بدل کی بنا پر۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ کسی نے (یعنی ابو وائل بن محارب، ابو العالیہ، نصر بن عاصم اور رؤبہ نے) بہ رفع

---

[1] المعجم الكبير (٦/٢٠١) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٥) فتح البيان (١٤/١٣٢) فتح القدير (٥/٣٠١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده جيد" مجمع الزوائد (١٠/٧٥٤)

[2] تفسير ابن كثير (٤/٤٦٤، ٤٦٥)

پڑھا ہے بنا بر اضمارِ مبتداء۔ نیز جمہور نے ﴿ اَلْقُدُّوْسِ ﴾ کو بہ ضم قاف پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی زید بن علی رحمہ اللہ نے) بہ فتحِ قاف پڑھا ہے[1] اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ میسرہ سے مروی ہے کہ یہ آیت (یعنی سورت جمعہ کی پہلی آیت) تورات میں سات سو آیتوں کے ساتھ لکھی ہوئی ہے۔[2] (أخرجه ابن المنذر والحاكم والبيهقي في الشعب عن عطاء بن السائب عنه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ ﴾ "أَيْ: أَرْسَلَ إِلَيْهِمْ"، یعنی وہی ہے جس نے امیین کی طرف بھیجا۔ ان سے مراد عرب ہیں وہ جو ان میں سے اچھی طرح لکھ سکتے ہیں اور وہ جو نہیں لکھ سکتے، اس لیے کہ وہ اہلِ کتاب نہیں ہیں۔ "أمي" اصل میں وہ ہے جو نہ لکھتا ہے اور نہ لکھے ہوئے کو پڑھتا ہے۔ عرب میں سے اکثر ایسے ہی تھے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امی امتِ عرب کی طرف منسوب ہے، اس لیے کہ وہ امتوں میں سے نہ لکھتے تھے نہ پڑھتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ کتابت طائف میں شروع ہوئی، انھوں نے اہلِ حیرہ سے لی اور اہلِ حیرہ نے اہلِ انبار سے لی۔[3] انتہیٰ۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسِبُ »[4] "ہم امی امت ہیں، نہ ہم لکھتے ہیں اور نہ حساب جانتے ہیں۔"
(أخرجه البخاري و مسلم وغيرهما)

﴿ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ سے مراد "مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَجِنْسِهِمْ وَمِنْ جُمْلَتِهِمْ" ہے، یعنی ایک رسول انہیں کی ذات کا اور جنس کا اور جملے کا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ﴾ [التوبة: ١٢٨] "تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمھاری جنس سے ہیں۔" قبائلِ عرب میں سے کوئی قبیلہ ایسا نہیں تھا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت نہ ہو اور انھوں نے آپ کو جنا تھا (ابن اسحاق کہتے ہیں کہ سوائے بنی تغلب کے، اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے پاک رکھا، چنانچہ ان کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ولادت نہیں ٹھہرائی ان کی نصرانیت کے سبب سے۔[5] ذكره الخطيب)۔

اللہ پاک نے جو احسان رکھا کہ انہیں میں سے ایک رسول بھیجا، اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ بات موافقت کے بہت قریب ہے، کیوں کہ جنس اپنی جنس کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے اور اس سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ کسی نے کہا کہ ﴿ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ ان کی طرح امی رسول بھیجا۔ یہ رسول امی صرف اس لیے ہوئے کہ پہلے انبیاء کی کتب میں ان کی صفت امی ہے اور ان میں اس صفت کا ہونا اس وہم کو زیادہ تر دور کر دیتا ہے کہ جو وحی اور حکمت لے کر وہ آئے، اس کے لیے کتابت سے مدد لی ہو اور اس لیے کہ ان کا حال اپنی امت کے حال سے ملتا جلتا ہو جس اُمت میں وہ مبعوث ہوئے۔ یہ بات ان کی سچائی اور صحیح ہونے کے زیادہ قریب ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں

[1] فتح القدير (٥/٢٩٩) [2] مستدرك الحاكم (٢/٥٢٩) شعب الإيمان (٢/٤٩٣) [3] تفسير النسفي (٤/٢٤٤)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨١٤) صحيح مسلم (١٠٨٠) [5] تفسير القرطبي (١٨/٩٢)

کی طرف بھیجے گئے ان میں سے یہاں امیین کا ذکر کرنا اس بات کے منافی نہیں ہے، یعنی مانع نہیں ہے کہ ان کے علاوہ دوسروں کی طرف بھی بھیجے گئے ہیں، اس لیے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے امر اور دلیل سے ثابت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ ﴾ [سبا: ۲۸] ''ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بھیجا ہے۔''

جملۂ ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ حال ہے یا صفت ہے ﴿ رَسُوْلًا ﴾ کی، یعنی ایسا رسول جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے۔ مراد قرآن شریف ہے، باوجود اس کے کہ امی ہے، نہ پڑھتا ہے، نہ لکھتا ہے اور نہ یہ کسی سے سیکھا ہے۔ جملۂ ﴿ وَيُزَكِّيْهِمْ ﴾ بھی ﴿ رَسُوْلًا ﴾ کی صفت ہے، یعنی ایسا رسول ہے جو اُن کو کفر اور گناہوں کے میل کچیل سے پاک کرتا ہے۔[1] (كما قاله ابن جريج و مقاتل) کسی نے کہا کہ ان کے دلوں کو ایمان کے ساتھ زکی اور پاک کرتا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ان کو عقائد کی جہت سے اس شے پر آمادہ کرتا ہے جس سے وہ زکی اور پاک ہو جاتے ہیں۔

جملۂ ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾، ﴿ رَسُوْلًا ﴾ کی تیسری صفت ہے، یعنی ایسا رسول ہے کہ ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔ ''کتاب'' سے مراد قرآن شریف ہے اور ''حکمت'' سے مراد سنت ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''کتاب'' خط بالقلم (قلم کے ساتھ لکھنا) اور ''حکمت'' دین میں سمجھ ہے۔ مالک بن انس نے اسی طرح کہا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ''کتاب'' سے مراد فرائض ہیں۔ ﴿ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ کلمۂ ﴿ اِنْ ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے، حرفِ لام اس پر دلیل ہے، یعنی اور بے شک حال یہ ہے کہ وہ ان میں اس رسول کے مبعوث ہونے سے پہلے ایسی کھلی گمراہی میں تھے کہ اس سے بڑھ کر تم کوئی گمراہی نہ دیکھو گے، وہ یہ ہے کہ شرک وکفر و جہالت میں پڑے تھے، حق سے ہٹے ہوئے تھے۔

﴿ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ﴾ مجرور ہے ﴿ اَلْاُمِّيّٖنَ ﴾ پر معطوف ہے، یعنی اس نے ﴿ اَلْاُمِّيّٖنَ ﴾ میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا، وہ امی جو اس کے زمانے میں تھے اور اس کو ان میں سے دوسروں میں بھیجا، وہ اس وقت ان کے ساتھ لاحق نہیں ہوئے اور بعد میں ان کے ساتھ لاحق ہوں گے۔ یا منصوب ہے، ﴿ يُعَلِّمُهُمْ ﴾ کی ضمیر منصوب پر معطوف ہے۔ "أَيْ: يُعَلِّمُهُمْ وَيُعَلِّمُ آخَرِيْنَ مِنْهُمْ"، جو کوئی آخر زمانے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو جانے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالقوۃ اس کے معلم ہیں، اس لیے کہ آپ اس عظیم خیر اور بڑے فضل کی اصل ہیں۔ یا ﴿ يُزَكِّيْهِمْ ﴾ کے مفعول پر معطوف ہے۔ "أَيْ: يُزَكِّيْهِمْ وَيُزَكِّيْ آخَرِيْنَ مِنْهُمْ"۔ ﴿ اٰخَرِيْنَ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزِ قیامت تک صحابہ کے بعد آئے۔ کسی نے کہا کہ ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو غیر عرب میں مسلمان ہوئے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تابعین ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے لوگ ہیں۔ اسی طرح امام ابن زید اور سدی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (۹۲/۱۸) [2] تفسير القرطبي (۹۲/۱۸) [3] تفسير القرطبي (۹۲/۱۸) فتح القدير (۲۹۹/۵)

﴿ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ﴾، ﴿ اٰخَرِيْنَ ﴾ کی صفت ہے، یعنی ایسے ﴿ اٰخَرِيْنَ ﴾ کہ ابھی ان سے لاحق نہیں ہوئے اور آئندہ لاحق ہوں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ اسلام کی طرف سبقت کرنے میں اور شرف و درجے میں لاحق نہ ہوں گے۔ یہ نفی ہمیشہ کے لیے ہے، اس لیے کہ تابعین میں سے اور اُن کے بعد کے لوگوں میں سے کوئی بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے لاحق نہ ہوگا اور نہ ان کی شان میں ان کے مساوی ہوگا تو اب یہاں منفی غیر متوقع الحصول ہوگا۔ چونکہ اس پر یہ بات وارد ہوتی تھی کہ ﴿ لَمَّا ﴾ تو اس شے کی نفی کرتا ہے جو متوقع الحصول ہے، حالاں کہ یہاں منفی ایسا نہیں ہے، اس لیے محلی نے ﴿ لَمَّا ﴾ کی تفسیر کلمۂ "لم" سے کی ہے[1] کہ جس کا منفی اس سے عام تر ہے کہ متوقع الحصول ہو یا نہ ہو، چنانچہ اس جگہ ﴿ لَمَّا ﴾ اپنے باب پر نہیں ہے۔

﴿ بِهِمْ ﴾ اور ﴿ مِنْهُمْ ﴾ میں ضمیر ﴿ اَلْاُمِّيّٖنَ ﴾ کی طرف راجع ہے۔ یہ اس بات کا موید ہے کہ ﴿ اٰخَرِيْنَ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد آئیں گے، خاص طور پر عرب میں سے روزِ قیامت تک۔ اور اگرچہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمیع ثقلین کی طرف بھیجے گئے ہیں تو اس جگہ عرب کی تخصیص اس لیے ہے کہ ان پر احسان رکھا جائے اور یہ رسالت کے عام ہونے کو مانع نہیں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ اٰخَرِيْنَ ﴾ سے مراد عجم ہوں، اس لیے کہ گو وہ عرب میں سے نہیں ہیں، لیکن اسلام کے سبب سے بیشک وہ مثل عرب کے ہو گئے اور مسلمان سب کے سب ایک امت ہیں اگرچہ ان کی جنسیں مختلف ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ان الفاظ میں ہے: ہم نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۃ الجمعہ نازل ہوئی: ﴿ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ﴾۔ صحابہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! وہ کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جواب نہ دیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بار پوچھا اور ہم میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر رکھا، پھر فرمایا: اگر ایمان ثریا کے نزدیک ہوتا تو البتہ اس کو ان لوگوں میں سے جا پہنچتے۔[2] (أخرجه البخاري وغيره و أخرجه أيضا مسلم من حديثه مرفوعاً بلفظ "لو كان الإيمان عند الثريا لذهب به رجال من فارس أو قال من أبناء فارس"۔[3] وعن قيس بن سعد بن عبادة أن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال: "لو كان الإيمان بالثريا لناله ناس من أهل فارس"[4] أخرجه سعيد بن منصور وابن مردويه.)

﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی وہ بہت عزت اور حکمت والا ہے اس بات میں کہ اس نے ایک آدمی کو اس امرِ عظیم کی قدرت دی اور اس پر اس کی تائید فرمائی اور سارے بشر سے اس کو چن لیا۔ ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾[5] یعنی یہ جس کا ذکر ہو چکا ہے یا اسلام جیسا کہ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا، یا

[1] تفسير الجلالين (٧٤١/١) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں ہو چکی ہے۔ [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٦)
[4] الدر المنثور (١٥٣/٨) [5] فتح القدير (٢٩٩/٥)

وحی و نبوت جیسا کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا، یا عجم کا عرب سے لاحق کرنا یا دین جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔[1] اللہ کا فضل ہے وہ دیتا ہے جس کو دینا چاہتا ہے اور جیسا اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے بڑے فضل والا ہے کہ کوئی فضل اس کے برابر یا اس کے قریب نہیں ہوتا۔ جبکہ یہود نے تورات پر عمل کرنا ترک کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تو اللہ پاک نے ان کی ایک مثال بیان فرمائی:[2]

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

ان لوگوں کی مثال، جنھیں حاملِ تورات بنایا گیا، پھر انھوں نے اسے نہیں اُٹھایا، اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اُٹھاتا ہے، بری مثال ہے اس قوم کی جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا⑤ (اے نبی!) کہہ دیجیے: اے لوگو جو یہودی ہوئے! اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ بے شک تم اللہ کے دوست ہو سب لوگوں کے سوا، تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو⑥ اور وہ کبھی یہ تمنا نہیں کریں گے بوجہ ان (برے اعمال) کے جو وہ اپنے ہاتھوں آگے بھیج چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے⑦ کہہ دیجیے: بے شک موت جس سے تم فرار ہوتے ہو، وہ تو یقیناً تمھیں ملنے والی ہے، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے، پھر وہ تمھیں بتائے گا جو تم عمل کرتے تھے⑧

یہود کے عالم ایسے تھے کہ کتاب پڑھی اور دل پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اللہ ہم کو پناہ دے، آمین۔ جس کو معلوم ہو کہ

[1] تفسير الطبري (٢٣/٣٧٦) [2] فتح البيان (١٤/١٢٩، ١٣٢)

میرا اللہ تعالیٰ کے ہاں درجہ ہے اور کچھ خطرہ نہیں تو وہ بے شک مرنے سے خوش ہو اور نہ ڈرے۔ یہود کی یہی خرابی تھی کہ دین کو سمجھتے بوجھتے دنیا کی خاطر چھوڑ دیتے تھے۔ ایسی بات سے ہم کو منع کیا۔ جمعے کا حکم بھی ایسا ہی ہے کہ جب جمعے کا وقت ہو تو دنیا کے کاموں میں نہ لگو۔ انتھٰی.

یہود کی مذمت اور انھیں مباہلے کے طور پر موت کی تمنا کی دعوت:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کی مذمت فرماتا ہے جن کو تورات عطا ہوئی اور اس پر عمل کرنے کے لیے ان پر لادی گئی، پھر انھوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ اس بات میں ان کی مثال گدھے کی طرح ہے کہ جب اس پر کتابیں لادی جاتی ہیں تو وہ اس شے کو نہیں جانتا جو اُن میں ہے اور وہ ان کو اٹھائے ہوئے چلتا ہے، ظاہری اور حسی طور پر اٹھانا اور وہ اس شے کو نہیں جانتا جو اس پر ہے۔ اسی طرح یہ لوگ ہیں اس کتاب کو لادنے میں جو اُن کو دی گئی۔ لفظاً تو اس کو حفظ کیا اور اس کو سمجھتے نہیں، نہ اس کے مقتضیٰ پر عمل کیا، بلکہ اس کی تاویل وتحریف اور تبدیل کی تو ان کا حال گدھے سے بھی زیادہ برا ہے، کیوں کہ گدھے کو تو کچھ فہم نہیں ہے اور ان لوگوں کی فہمیں ہیں جن سے کام نہ لیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ أُولَٰٓئِكَ كَالْأَنْعَٰمِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْغَٰفِلُونَ ﴾ [الأعراف: ۱۷۹] ''یہ لوگ چوپائیوں کی طرح ہیں، بلکہ یہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ غافل ہیں۔'' اور یہاں ﴿ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِـَٔايَٰتِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظَّٰلِمِينَ ﴾ فرمایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جس شخص نے جمعے کے دن کلام کیا اور امام خطبہ پڑھ رہا ہے تو وہ گدھے کی طرح ہے جو کتابیں لادے چلتا ہے اور جس نے اس شخص سے کہا کہ چپ رہ تو اس کا جمعہ نہیں ہے۔[1]
(أخرجه الإمام أحمد)

پھر فرمایا: ﴿ قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوٓا إِن زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَآءُ لِلَّهِ مِن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴾ یعنی اے یہودیو! اگر تم یہ زعم کرتے ہو کہ تم ہدایت پر ہو اور محمد ﷺ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم گمراہی پر ہیں تو دونوں گروہ میں سے جو گمراہ ہے اس پر موت کی دعا کرو، اگر تم سچے ہو اس بات میں جس کا زعم کرتے ہو۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُۥٓ أَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ﴾ یعنی اس کفر وظلم و فجور کے سبب سے جو اپنے لیے کر رہے ہیں کبھی اس کی دعا نہ کریں گے۔ ﴿ وَاللَّهُ عَلِيمٌۢ بِالظَّٰلِمِينَ ﴾

یہ مباہلہ جو یہود کے لیے ہے، اس پر سورۃ البقرہ میں کلام گزر چکا ہے، جہاں پر یہ فرمایا ہے: ﴿ قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْءَاخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٩٤﴾ وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌۢ بِالظَّٰلِمِينَ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَوٰةٍ وَمِنَ

[1] مسند أحمد (۲۳۰/۱) اس کی سند میں ''مجالد بن سعید'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الترغیب والترھیب: ۱۱۲/۱)

الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [البقرة: ٩٤۔ ٩٦] ''آپ کہہ دیجیے کہ اگر آخرت کا گھر صرف تمھارے ہی لیے ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور کسی کے لیے نہیں، تو آؤ اپنی سچائی کے ثبوت میں موت طلب کرو۔ لیکن اپنی کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے کبھی بھی موت نہیں مانگیں گے۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ دنیا کی زندگی کا حریص اے نبی! آپ انھیں کو پائیں گے۔ یہ حرصِ زندگی میں مشرکوں سے بھی زیادہ ہیں، ان میں سے تو ہر شخص ایک ایک ہزار سال کی عمر چاہتا ہے، گویا یہ عمر دیا جانا بھی انھیں عذاب سے نہیں چھڑا سکتا، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو بخوبی دیکھ رہا ہے۔''

وہاں اس پر گفتگو گزر چکی ہے جس طرح کہ آلِ عمران میں نصاریٰ کے مباہلے کا ذکر گزر چکا ہے: ﴿ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَي الْكٰذِبِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٦١] ''اس لیے جو شخص آپ کے پاس اس علم کے آ جانے کے بعد بھی آپ سے اس میں جھگڑے تو آپ کہہ دیں کہ آؤ ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کو اور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو اور ہم تم خاص اپنی اپنی جانوں کو بلا لیں، پھر ہم عاجزی کے ساتھ التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت کریں۔'' اور مشرکین کا مباہلہ سورت مریم میں مذکور ہے: ﴿ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ﴾ [مريم: ٧٥] ''کہہ دیجیے! جو گمراہی میں ہوتا ہے اللہ رحمان اس کو خوب لمبی مہلت دیتا ہے۔''

امام احمد رحمہ اللہ نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ ابوجہل ۔لعنه الله۔ نے کہا کہ اگر میں محمد ﷺ کو کعبے کے نزدیک دیکھوں تو البتہ میں آؤں اس کے پاس یہاں تک کہ اس کی گردن کو روندوں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر وہ ایسا کرتا تو اسی وقت فرشتے اس کو پکڑ لیتے اور اگر یہود موت کی تمنا کرتے تو البتہ مر جاتے اور نار میں اپنے ٹھکانے دیکھ لیتے اور اگر نکلتے وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مباہلہ کرتے تھے، تو البتہ وہ اس حال میں لوٹتے کہ نہ پاتے اہل کو اور نہ مال کو۔[1] (ورواه البخاري والترمذي والنسائي من حديث عبدالرزاق عن معمر ابن خالد عن عبيد الله بن عمرو عن عبدالكريم ورواه النسائي أيضا عن عبد الرحمن بن عبد الله الحلبي عن عبيد الله ابن عمرو الرقي و به أتم)

قولہ تعالیٰ: ﴿ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا سورۃ النساء میں فرمان ہے: ﴿ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ [النساء: ٧٨] ''تو جہاں کہیں بھی ہو موت تمھیں آ پکڑے گی، گو تم مضبوط قلعوں میں ہو۔'' معجم طبرانی میں عن الحسن عن سمرہ مرفوعاً مروی ہے: ''موت سے بھاگنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک لومڑی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧٥) سنن الترمذي (٣٣٤٨) سنن النسائي الكبرى (٥١٨،٣٠٨/٦) مسند أحمد (٢٤٨/١)

ہو جس پر زمین کا کچھ قرض ہو، وہ اس خوف سے کہ کہیں یہ مجھ سے مانگ نہ بیٹھے بھاگے، بھاگتے بھاگتے جب تھک جائے تب اپنے جھٹ میں گس جائے، جہاں گھسی اور زمین نے پھر اس سے تقاضا کیا کہ لومڑی میرا قرض ادا کر، وہ پھر وہاں سے دم دبائے ہوئے تیزی سے بھاگی، آخر یوں ہی بھاگتے بھاگتے ہلاک ہوگئی۔‘‘[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: ﴿ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اس کے ساتھ قائم ہونے کی اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کرنے کی تکلیف دی گئی تھی۔ جرجانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ’’حُمِّلُوْا حَمَّالَةً‘‘ بہ معنی ’’کَفَالَةً‘‘ سے ہے ’’حُمِّلَ عَلَى الظَّهْرِ‘‘ سے نہیں ہے۔ ’’حَمِيْلٌ‘‘ کفیل کو کہتے ہیں، یعنی وہ احکامِ تورات کے ضامن وکفیل کیے گئے تھے۔ پھر اس نے جس شے کو واجب کیا اس پر انھوں نے عمل نہ کیا اور نہ ہی ان حکمتوں کی اطاعت کی جن کا اس میں ان کو حکم دیا گیا تھا اور نہ اس کا حق ادا کیا، ان کی مثال گدھے کی مثال کی طرح ہے جو سب حیوانوں سے بڑھ کر کند ذہن ہے، خاص کر کے اس کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ وہ انتہا درجے کا غبی ہے۔ ﴿ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ﴾ حال ہے ﴿ الْحِمَارِ ﴾ سے، یا اس کی صفت ہے، اس لیے کہ اس سے مراد جنسِ حمار ہے (اس سے کوئی معین حمار مراد نہیں ہے تو اب نکرہ کے حکم میں ہوگیا۔ جملہ جو نکرہ کے حکم میں ہے اس کی صفت ہو سکتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

وَلَقَدْ أَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ ۔ فَمَضَيْتُ ثَمَّهْ قُلْتُ لَا يَعْنِيْنِيْ)

مامون بن ہارون رشید نے ’’يُحَمَّلُ‘‘ مشدد بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے۔[3] ’’أَسْفَارٌ‘‘ جمع ’’سِفْرٌ‘‘ بہ معنی کتاب کبیر ہے، اس لیے کہ جب کتاب پڑھی جاتی ہے تو معنی کا اسفار واظہار کرتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ اَسْفَارًا ﴾ ’’كُتُبًا‘‘[4] یعنی بڑی بڑی علم کی کتابیں۔ میمون بن مہران رحمہ اللہ کہتے ہیں: ’’اَلْحِمَارُ لَا يَدْرِيْ أَسِفْرٌ عَلَى ظَهْرِهِ أَمْ زَبَلٌ‘‘[5] یعنی گدھا نہیں جانتا کہ اس کی پشت پر کتاب ہے یا سرگین۔ چنانچہ یہود ایسے ہی ہیں اور ہر وہ شخص جس نے جان لیا اور اپنے علم پر عمل نہ کیا پس یہ اس کی مثال ہے اور یہ مثال اس شخص کو بھی لاحق ہوتی ہے جس نے قرآن کے معنی نہ سمجھے اور اس شے پر عمل نہ کیا جو اس میں ہے اور اس سے اعراض کیا اس شخص کے اعراض کرنے کی طرح جس کو اس کی حاجت نہیں ہے۔ اسی لیے میمون بن مہران رحمہ اللہ نے کہا ہے: ’’يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ اِتَّبِعُوا الْقُرْآنَ قَبْلَ أَنْ يَّتَّبِعَكُمْ‘‘، پھر یہ آیت پڑھی،[6] یعنی آؤ قرآن والو قرآن کی پیروی کرو، اس سے قبل کہ وہ تمھارا پیچھا کرے اور کہے کہ تم نے مجھ پر عمل کیوں نہ کیا۔

---

[1] المعجم الكبير (۲۲۲/۷) تفسير ابن كثير (۴۶۶/۴، ۴۶۷) اس کی سند میں ’’معاذ بن محمد ہذلی‘‘ ضعیف راوی ہے۔

[3] اللباب في علوم الكتاب (۷۳/۱۹) [4] تفسير الطبري (۳۷۸/۲۳) [5] فتح القدير (۳۰۰/۵) [6] تفسير الرازي (۶/۳۰)

لطیفہ:

شیخنا المرحوم صاحبِ فتح البیان نے اپنی کتاب "اتحاف النبلاء" میں ذکر کیا ہے۔ دمامینی نے اپنے استاد ابن عرفہ سے نقل کیا ہے کہ وہ اسکندریہ میں درس دے رہے تھے کہ ایک عبارت وارد ہوئی جس میں مضاف الیہ کی طرف ضمیر پھرتی تھی تو درس میں جو طالب علم حاضر تھے ان میں سے ایک بولا کہ نحوی تو مضاف الیہ کی طرف ضمیر پھیرنے کو منع کرتے ہیں، پھر یہ عبارت کیسے ٹھیک ہو گی؟ تو ابن عرفہ اسی وقت بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ﴾ وَفِيْهِ مِنَ اللَّطَافَةِ مَا لَا يَخْفَى.

بالجملہ پھر اللہ پاک نے مذکورہ مثال کی مذمت کی اور مراد یہودیوں کی مذمت ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ "أَيْ: بِئْسَ مَثَلًا" تمیز محذوف ہے اور فاعل مضمر ہے جس کی تمیز سے تفسیر کی گئی ہے اور ﴿مَثَلُ الْقَوْمِ﴾ مذمت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی وہ ازروئے مثال بری ہے اس قوم کی مثال جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتیں جھٹلائیں، یا یوں کہو کہ ﴿ مَثَلُ الْقَوْمِ ﴾، ﴿ بِئْسَ ﴾ کا فاعل ہے اور مذمت کے ساتھ مخصوص اس کے بعد کا موصول ہے بنا بر حذف مضاف: "أَيْ: مَثَلُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا" یہ بھی جائز ہے کہ موصول قوم کی صفت ہو تو اب محلِ جر میں ہوگا اور مخصوص بالذم محذوف۔ تقدیر یہ ہے: "بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الْمُكَذِّبِيْنَ مَثَلُ هٰؤُلَاءِ"

"آیات" سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں اور قرآن کی آیات جن کو آپ ﷺ لے کر آئے۔ کسی نے کہا کہ تورات کی آیات مراد ہیں، اس لیے کہ انھوں نے ان کی تکذیب کی، جبکہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کو ترک کیا، کیوں کہ تورات میں تو آپ ﷺ پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کافروں کو علی العموم راہ نہیں بتاتا تو اب یہود اس میں بدرجہ اولیٰ داخل ہوں گے۔ ان سے مراد وہ ہیں جن کا ایمان نہ لانا اس کے علم میں سابق ہو چکا ہے، ورنہ اس نے تو بہت سے کافروں کو ہدایت کی۔

﴿ الَّذِيْنَ هَادُوْا ﴾ سے مراد وہ ہیں جو یہودی ہوئے اور یہودیت کا دین اختیار کیا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی ملت ہے۔ یہود نے لوگوں پر فضیلت کا دعویٰ کیا اور یہ کہا تھا کہ وہ اور لوگوں کے سوا اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ [المائدۃ: ١٨] "ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔" نیز فرمایا: ﴿ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا ﴾ [البقرۃ: ١١١] "جنت میں یہود ونصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا۔"

چنانچہ اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ وہ جب اس باطل دعوے کا ادعا (دعویٰ) کریں تو ان سے یوں کہیں: ﴿ اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ سب لوگوں کے سوا تم اللہ تعالیٰ کے دوست ہو اور دوست آخرت کو اختیار کرتا ہے اور اس کا مبدا اور راستہ موت ہے تو تم موت کی تمنا کرو تا کہ تم اس کی کرامت کی طرف چلے جاؤ جس کی طرف تم اپنے زعم میں جاؤ گے

اگر تم اس دعوے میں سچے ہو، کیوں کہ جو کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ اہلِ جنت سے ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس دارِ ناپائیدار مشوب باکدار (گرا ہوا) سے رہائی پائے۔ جمہور نے ﴿ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ ﴾ کو بہ ضمِ واو پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی ابن سمیفع رحمہ اللہ نے) بہ فتحِ واو پڑھا ہے تخفیف کے لیے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے واؤ کا ہمزہ سے ابدال بیان کیا ہے۔①

بالجملہ پھر اللہ پاک نے اس بات کی خبر دی جو ان سے آیندہ زمانے میں صادر ہوگی، یعنی وہ اپنے گناہوں کے سبب سے یہ کبھی نہ کریں گے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾ یعنی ان اعمال کے سبب سے جو انھوں نے کیے ہیں، یعنی کفر و معاصی جو نار میں داخل ہونے کا موجب ہیں اور کتابِ الٰہی میں تحریف اور تبدیل کرنے کے سبب سے وہ کبھی موت کی تمنا نہ کریں گے۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی اور اللہ تعالیٰ علی العموم ظالموں کو جانتا ہے اور یہ یہود تو اس میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں۔

امام زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "لَا" اور "لَنْ" کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اس بات میں کہ ان میں سے ہر ایک مستقبل کی نفی کے لیے ہے، مگر اتنا فرق ہے کہ "لَنْ" میں جو تاکید اور تشدید ہے وہ "لا" میں نہیں ہے، چنانچہ ایک دفعہ تو تاکید کے لفظ کے ساتھ آیا: ﴿ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ ﴾ [البقرة: ٩٥] میں اور ایک دفعہ لفظِ تاکید کے بغیر آیا ﴿ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ ﴾ میں۔② امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ زمخشری رحمہ اللہ کا اپنے مذہب کی طرف سے جماعت کے مذہب کی طرف رجوع ہے۔ اس کا مذہب یہ ہے کہ "لَنْ" تابید پر نفی کا مقتضی ہے۔ اور جماعت کا یہ مذہب ہے کہ وہ اس کا مقتضی نہیں ہے۔③ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں رجوع نہیں ہے۔ اس میں غایت یہ ہے کہ زمخشری رحمہ اللہ نے اس سے سکوت کیا اور اس کا نفی مستقبل میں "لَا" اور "لَنْ" کے درمیان شریک کرنا اس کی نفی نہیں کرتا کہ "لَنْ" کا اختصاص کسی اور معنی کے ساتھ ہو۔④

بالجملہ پھر اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے یہ کہہ دیں کہ موت سے بھاگنا ان کو نجات نہ دے گا اور وہ ان پر نازل ہو کر رہے گی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ﴾ یعنی جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تو ضرور تم کو ملنی ہے اور بلاشک تم پر نزول کرنے والی ہے۔ ﴿ فَاِنَّهٗ ﴾ میں حرفِ فاء اس لیے داخل ہوا ہے کہ اس میں اسمِ شرط کے معنی شامل ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "إِنَّ زَيْدًا فَمُنْطَلِقٌ" نہیں بولا جاتا⑤ اور یہاں فرمایا: ﴿ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ﴾ شرط و جزا کے سبب سے جو ﴿ الَّذِيْ ﴾ کے معنی میں ہیں: "أَيْ: إِنْ فَرَرْتُمْ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ" اور اس بات پر دلالت کرنے میں مبالغہ ہوگا کہ موت سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ محض زاید ہے نہ کہ مذکور تضمن کے سبب۔ کسی نے کہا کہ کلام تو ﴿ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ ﴾ پر

① فتح القدير (٣٠٠/٥) ② الكشاف (٥٣٢/٤) ③ البحر المحيط (٢٦٤/٨)
④ فتح البيان (١٣٥/١٤) ⑤ معاني القرآن (١٧١/٥)

تمام ہو چکا۔ پھر ابتداء کی تو فرمایا: ﴿ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ﴾ چونکہ برزخ میں قیام کرنا ایک ہولناک بات ہے اور اس کا ہونا ضروری ہے۔

اس لیے اس پر اور اس کے لمبا ہونے پر بہ آلۂ تراخی (دیر کرنا) تنبیہ کی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی موت تم سے ضرور ملے گی اس کے بعد برزخ کے ہولناک امور پیش آئیں گے، پھر ایک مدتِ دراز کے بعد قیامت کے دن اس ذات پاک کی طرف پھیرے جاؤ گے جو پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے پھر وہ تم کو تمھارے قبیح اعمال کی خبر دے گا اور ان پر تم کو جزا دے گا۔ اس میں وعید اور دھمکی ہے۔[1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

اے ایمان والو! جب اذان دی جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن، تو تم اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت کرنا چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو⑨ پھر جب نماز پوری ہو جائے، تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، شاید تم فلاح پاؤ⑩

جمعہ اور یوم جمعہ کے آداب کا بیان:

ہر اذان کا یہ حکم نہیں، کیوں کہ جماعت پھر بھی ملے گی اور جمعہ ایک ہی جگہ ہوتا تھا، پھر کہاں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر خطبے کو کہا۔ ایسے وقت جائے کہ خطبہ سنے۔ یہود کے ہاں عبادت کا دن ہفتہ تھا سارا دن خرید و فروخت منع تھی، اس واسطے فرما دیا کہ تم نماز کے بعد روزی تلاش کرو اور روزی کی تلاش میں بھی اللہ تعالیٰ کو نہ بھولو۔ انتہی۔

① جمعے کا نام جمعہ صرف اس لیے رکھا گیا کہ یہ جمع سے مشتق ہے، کیوں کہ اہلِ اسلام ہر ہفتے میں ایک بار اس میں بڑی بڑی عبادت گاہوں میں جمع ہوتے ہیں۔ ② اور اس میں ساری مخلوق کامل ہوئی ہے اس لیے کہ یہ چھٹا دن ہے ان چھے دنوں میں سے جن میں اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کیے۔ ③ اور اسی میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے۔

[1] فتح البیان (۱۴/۱۳۳۔۱۳۵)

④اور اسی میں جنت کے اندر داخل کیے گئے۔ ⑤اور اسی میں اس سے نکالے گئے۔ ⑥اور اسی میں قیامت قائم ہو گی۔ ⑦اور اسی میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ اس میں مومن اللہ تعالیٰ سے کسی بھی خیر کا سوال کرتا ہے تو وہ اس کو عطا کرتا ہے، جیسا کہ اس بارے میں صحیح حدیثیں ثابت ہوئی ہیں۔ سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابو القاسم ﷺ نے فرمایا: او سلمان! یومِ جمعہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: یومِ جمعہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تیرے ماں باپ کو جمع کیا، یا تمھارے باپ کو۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم وقد روي عن أبي هريرة رضي الله عنه من كلامه نحو هذا فالله أعلم)

قدیم لغت میں اس کو "یوم العروبة" کہتے تھے۔ ثابت ہوا کہ ہم سے پہلی امتوں کو اس کا حکم ہوا تھا تو وہ اس سے گمراہ ہوئے اور یہود نے شنبہ (ہفتہ) کا دن اختیار کیا جس میں خلق واقع نہیں ہوئی اور نصاریٰ نے یکشنبہ (اتوار) کا دن اختیار کیا جس میں خلق کی ابتداء کی گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے جمعے کا دن پسند فرمایا جس میں اس نے خلق کو کامل کیا، جیسا کہ بخاری و مسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ہم آخرون سابقون ہیں سوائے اس کے کہ ان کو کتاب ہم سے پہلے دی گئی۔ پھر یہ ان کا وہ دن ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا تھا، انھوں نے اس میں اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کی ہدایت کی، چنانچہ لوگ اس میں ہمارے تابع ہیں، یہود تو کل ہیں اور نصاریٰ پرسوں ہیں۔[2] یہ بخاری کی روایت ہے۔

مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جمعے سے ان لوگوں کو گمراہ کیا جو ہم سے پہلے تھے، چنانچہ یہود کے لیے تو روزِ شنبہ تھا اور نصاریٰ کے لیے روزِ یکشنبہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ ہم کو لایا تو اس نے ہم کو روزِ جمعہ کی ہدایت فرمائی، پھر ٹھہرایا گیا جمعہ و سبت (ہفتہ) واحد (اتوار) اور اسی طرح قیامت کے دن وہ ہمارے تابع ہیں۔ ہم اہلِ دنیا میں سب سے آخر ہیں اور قیامت کے دن سب سے پہلے ہیں جن کے درمیان ساری مخلوق سے قبل فیصلہ کیا جائے گا۔[3] اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا کہ جمعے کے دن اس کی عبادت کے لیے جمع ہوں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ یعنی اے ایمان والو! جب جمعے کے دن اذان ہو تو تم اس کی طرف جانے کے لیے قصد، ارادہ اور اہتمام کرو۔

یہاں سعی سے مراد تیز چلنا نہیں ہے، وہ تو صرف جمعے کا اہتمام کرنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ ﴾ [بني إسرائيل: ١٩] "اور جس کا ارادہ آخرت کا ہو اور جیسی کوشش

---

① مسند أحمد (٤٣٩/٥) المعجم الكبير (٢٣٧/٦) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٦/١٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٣٩٠/٢)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٣٦) صحيح مسلم (٨٥٥) ③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥٥)

اس کے لیے ہونی چاہیے، وہ کرتا بھی ہو اور وہ با ایمان بھی ہو۔‘‘ سیدنا عمر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اس آیت کو ’’فَامْضُوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ‘‘ پڑھتے تھے۔[1] اب رہا نماز کی طرف تیز چلنا تو اس سے منع کیا گیا ہے۔ صحیحین میں عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مروی ہے کہ جس وقت تم اقامت سنو تو نماز کی طرف چلو اور سکینت اور وقار کو لازم پکڑو اور سرعت مت کرو تو جو نماز تم نے پالی تو پڑھ لو اور جو تم سے فوت ہوگئی اسے پورا کرلو۔[2] (هذا اللفظ للبخاري)

ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نماز پڑھ رہے تھے تو اس اثنا میں لوگوں کی آوازیں سنی گئیں اور جب آپ نماز پڑھ چکے تو فرمایا: تمھارا کیا حال ہے؟ عرض کی کہ ہم نے نماز کی طرف جلدی چاہی۔ فرمایا: پھر مت کرنا، جس وقت تم نماز کو آؤ تو چل کر آؤ اور سکینت کو لازم پکڑو، پھر جو تم پاؤ، وہ پڑھ لو اور جو تم سے فوت ہو جائے اسے پورا کرلو۔[3] (أخرجاه) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس وقت نماز قائم کی جائے تو اس کو دوڑتے ہوئے مت آؤ لیکن اس کو چلتے ہوئے آؤ اور سکینت اور وقار کو لازم پکڑو۔ « فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْهَا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوْا »[4] (أخرجه عبد الرزاق و رواه الترمذي من حديث عبد الرزاق كذلك و أخرجه أيضا من طريق أخرى)

حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خبردار! واللہ! قدموں پر اس طرح دوڑنا منع ہے اور البتہ تحقیق وہ اس سے منع کیے گئے کہ نماز کو اس طرح سے آئیں مگر اس حال میں کہ ان پر سکینہ اور وقار ہو لیکن دل کے ارادے اور نیت اور خشوع کے ساتھ آئیں۔[5] امام قتادہ رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ تو اپنے دل سے اور عمل سے سعی کرے اور وہ اس کی طرف چل کر آنا ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ﴾ [الصافات: ۱۰۲] ’’پھر جب وہ (بچہ) اتنی عمر کو پہنچا کہ اس کے ساتھ چلے پھرے۔‘‘ کی تاویل کرتے تھے: ’’أَيْ: اَلْمَشْيُ مَعَهُ‘‘، محمد بن کعب و زید بن اسلم رحمہما اللہ وغیرہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[6]

غسلِ جمعہ:

1. جو کوئی جمعہ کو آئے تو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ پہلے غسل کرے۔ صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً ثابت ہوا ہے کہ جس وقت تم میں سے کوئی جمعہ کو آئے تو چاہیے کہ غسل کرلے۔[7]
2. سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جمعہ کے دن کا غسل ہر محتلم پر واجب ہے۔[8] (أخرجاه)
3. سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے ہر محتلم پر کہ ہر ہفتے میں غسل کرے، اپنا سر اور بدن

[1] تفسير الطبري (۳۸۱/۲۳)
[2] صحيح البخاري (٦١٠) صحيح مسلم (٦٠٢)
[3] صحيح البخاري (٢٠٩) صحيح مسلم (٦٠٣)
[4] صحيح البخاري (٨٦٦) صحيح مسلم (٦٠٢) سنن الترمذي (٣٢٧)
[5] مصنف ابن أبي شيبة (٤٨٢/١)
[6] تفسير الطبري (۳۸۰/۲۳، ۳۸۱) تفسير ابن كثير (٤٦٨/٤)
[7] صحيح البخاري (٨٣٧) صحيح مسلم (٨٤٤)
[8] صحيح البخاري (٨٣٩) صحيح مسلم (٨٤٦)

دھوئے۔[1] (رواه مسلم)

4 سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ہر مسلم مرد پر ہر ہفتے میں ایک دن غسل واجب ہے اور وہ جمعہ کا دن ہے۔[2] (رواه أحمد والنسائي و ابن حبان)

5 اوس بن اوس ثقفی سے مرفوعاً مروی ہے کہ « مَنْ غَسَّلَ وَاغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَبَكَّرَ وَابْتَكَرَ وَمَشَى وَلَمْ يَرْكَبْ وَدَنَا مِنَ الْإِمَامِ وَاسْتَمَعَ وَلَمْ يَلْغُ كَانَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ أَجْرُ سَنَةٍ أَجْرُ صِيَامِهَا وَقِيَامِهَا » (أخرجه الإمام أحمد) یعنی جس نے نہلایا، یعنی اپنی بیوی سے صحبت کی کہ اس کو نہانا پڑا (حدیث کی شروح میں اس کے سوا اور معنی بھی لکھے ہیں۔ فلیعلم) اور خود نہایا جمعے کے دن اور اول وقت میں آیا اور اول خطبہ سنا اور چل کر آیا اور سوار نہ ہوا اور امام سے قریب ہوا اور سنا اور لغو بات نہ کی تو اس کے لیے ہر قدم کے عوض میں ایک سال کے روزوں اور قیام کا اجر ہوگا۔[3] (وهذا الحديث له طرق وألفاظ وقد أخرجه أهل السنن الأربعة وحسنة الترمذي)

6 سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جو کوئی جمعے کے دن جنابت کا نہانا نہایا، پھر پہلی گھڑی میں چلا تو گویا اس نے ایک بدنہ (اونٹ) قربان کیا اور جو کوئی دوسری گھڑی میں چلا تو گویا اس نے ایک گائے قربان کی اور جو کوئی تیسری گھڑی میں چلا تو گویا اس نے سینگوں والا ایک دنبہ قربان کیا اور جو کوئی چوتھی گھڑی میں چلا تو گویا اس نے ایک مرغی قربان کی اور جو کوئی پانچویں گھڑی میں چلا تو گویا اس نے ایک انڈے کی قربانی کی۔ پھر جب امام نکلا تو فرشتے حاضر ہو گئے ذکر سننے لگتے ہیں۔[4] (أخرجاه)

اچھے کپڑے پہننا:

مستحب یہ ہے کہ اپنے اچھے سے اچھے کپڑے پہنے، خوشبو لگائے، مسواک کرے۔ خوب لطیف، طاہر اور پاک صاف ہو۔

1 سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ متقدم میں یہ ہے کہ ہر محتلم پر جمعہ کے دن کا غسل واجب ہے اور یہ کہ اپنی بیوی کی خوشبو میں سے ملے۔[5]

2 سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جو کوئی جمعے کے دن نہائے اور اپنی بیوی کی خوشبو سے اگر

---

1. صحيح البخاري (٨٥٦) صحيح مسلم (٨٤٩)
2. مسند أحمد (٣٠٤/٣) سنن النسائي (١٣٧٨) صحيح ابن حبان (٢١/٤)
3. مسند أحمد (٩/٤) سنن أبي داود (٣٤٥) سنن الترمذي (٤٩٦) سنن النسائي (١٣٨١) سنن ابن ماجه (١٠٧٨) صحيح الترغيب والترهيب (١٦٨/١)
4. صحيح البخاري (٨٤١) صحيح مسلم (٨٥٠)
5. صحيح مسلم (٨٤٠) مسند أحمد (٣٠/٣)

اس کے پاس ہو، ملے اور اپنے بہترین کپڑے پہنے، پھر نکلے یہاں تک کہ مسجد میں آئے اور نماز پڑھے اگر اسے ظاہر ہو اور کسی کو ایذا نہ دی اور خاموش رہا جب اس کا امام نکلا، یہاں تک کہ نماز پڑھی تو وہ اس کے لیے اس شے کا کفارہ ہوگا جو اس جمعے اور دوسرے جمعے کے درمیان ہے۔[1] (أخرجه الإمام أحمد)

3 سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مرفوعا مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر فرما رہے تھے کہ تم میں سے کوئی اگر دو کپڑے جمعہ کے دن کے لیے خرید رکھتا جو اپنے کام کاج کے کپڑوں کے علاوہ ہوتے تو کیا تھا۔[2] (أخرجه أبو داود في سننه وابن ماجه)

4 سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعے کے دن لوگوں کو خطبہ دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر ثیاب نمار دیکھے (یعنی مخطط کپڑے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کپڑے میلے کام کاج کرنے والے تھے۔ واللہ أعلم) تو فرمایا کہ تم سے اگر کوئی فراخی پائے اور اپنے جمعے کے لیے دو علاحدہ کپڑے بنا لے تو کیا ہے، یعنی اپنے کام کاج کے کپڑوں کے علاوہ۔[3] (رواه ابن ماجه)

اس ندا سے مراد وہ اذانِ ثانی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت دی جاتی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلتے اور منبر پر جلوس فرماتے تھے اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دی جاتی تھی چنانچہ اس سے وہی مراد ہے۔ اب رہی پہلی اذان جو امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے زیادہ فرمائی تو یہ صرف لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تھی، جیسا کہ بخاری رحمہ اللہ نے سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ جمعے کے دن پہلی ندا اس وقت ہوتی تھی جبکہ امام منبر پر بیٹھتا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں تھی۔ پھر جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ایک زمانے کے بعد خلیفہ ہوئے اور لوگوں کی تعداد بہت ہوگئی تو دوسری اذان زیادہ کی زوراء پر،[4] یعنی وہ اذان اس گھر پر دی جائے جس کا نام زوراء رکھا جاتا ہے، یہ گھر مدینے میں سب گھروں سے زیادہ بلند تھا اور مسجد کے قریب تھا۔

مکحول ریحانۃ الشام سے مروی ہے کہ بے شک جمعے کے دن ایک ہی اذان ہوتی تھی اور ایک ہی موذن تھا جبکہ امام نکلتا (مطلب یہ ہے کہ جمعے میں ایک ہی موذن تھا اور جب امام نکلتا تو ایک ہی اذان کہی جاتی تھی)۔ پھر نماز قائم کی جاتی اور یہ وہی اذان ہے جس کے نزدیک، جب وہ دی جاتی ہے تو خرید و فروخت حرام ہو جاتی ہے۔ پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ امام کے نکلنے سے پہلے اذان دی جائے، یہاں تک کہ لوگ جمع ہو جائیں۔[5]

جمعے کی حاضری کس پر ہے؟ صرف آزاد مردوں کو جمعے کے دن حاضر ہونے کا امر کیا جاتا ہے۔ غلاموں،

---

1 مسند أحمد (٤٢٠/٥)

2 سنن أبي داود (١٠٧٨) سنن ابن ماجه (١٠٩٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح أبي داود: ٢٤٤/٤)

3 سنن ابن ماجه (١٠٩٦) صحيح الجامع (٥٦٣٥) 4 صحيح البخاري (٨٧٠) 5 تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٦/١٠)

عورتوں اور بچوں کو نہیں کیا جاتا اور مسافر و مریض اور بیمار کی تیمار داری کرنے والے کو معذور رکھا جاتا ہے، ان کے مشابہ اَور عذر ہیں جس طرح کہ فروع کی کتابوں میں مقرر ہیں اور لکھے گئے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف چلو اور خرید و فروخت چھوڑ دو جبکہ نماز کی اذان دی جائے۔ اسی لیے علماء نے دوسری اذان کے بعد بیع کے حرام ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ اور دو قول پر اختلاف کیا ہے کہ جب کوئی لین دین کرنے والا لین دین کرے تو صحیح ہے یا نہیں؟ آیت کا ظاہر تو یہ ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے، جیسا کہ بجائے خود مقرر ہے۔ واللّٰه أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی تمھارا بیع کو چھوڑنا اور نماز اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف تمھارا متوجہ ہونا تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جب دوسری اذان کے بعد ان پر خرید وفروخت میں مصروف رہنا ممنوع کیا اور اسے چھڑایا اور جمع ہونے کا ان کو حکم دیا تو اس سے فارغ ہونے کے بعد ان کو اجازت دی کہ زمین میں منتشر ہوں اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کریں جس طرح کہ عراک بن مالک رحمہ اللہ جس وقت جمعے کی نماز پڑھ لیتے تو واپس لوٹتے اور مسجد کے دروازے پر رکتے، پھر کہتے: "اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَجَبْتُ دَعْوَتَكَ وَصَلَّيْتُ فَرِيْضَتَكَ وَانْتَشَرْتُ كَمَا أَمَرْتَنِي فَارْزُقْنِي مِنْ فَضْلِكَ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ" [1] (رواه ابن أبي حاتم) "اے اللہ! میں نے تیری دعوت پر لبیک کہا، تیری فرض کردہ نماز کو ادا کیا، تیرے ہی حکم کے مطابق میں نکل کھڑا ہوا، لہٰذا تو مجھے اپنے فضل سے رزق عطا فرما، تو ہی سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔" نیز بعض سلف سے مروی ہے کہ جو کوئی جمعے کے دن نماز کے بعد خرید وفروخت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ستر بار برکت دے گا، اس آیت کے سبب سے: ﴿ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ یعنی تم اپنے بیع وشرا اور لین دین میں اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو اور تم کو دنیا اس شے سے باز نہ رکھے جو تم کو آخرت میں فائدہ دے گی، شاید تم فلاح پاؤ، اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو کوئی بازاروں میں سے کسی بازار میں داخل ہو اور کہے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دس لاکھ نیکیاں لکھے گا اور دس لاکھ برائیاں اس سے مٹائے گا۔ [2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بندہ اس وقت تک اللہ کا بہت سا ذکر کرنے والوں میں سے نہیں ہوتا جب تک کہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے اس کا ذکر نہ کرے۔ [3] (كذا في ابن كثير)

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۵٦/۱۰)
(2) سنن الترمذي (٤٣٢٨) سنن ابن ماجه (۲۲۳۵) صحيح الجامع (٦٢٣١)
(3) تفسير ابن كثير (٤٦٧/٤-٤٦٩)

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ِۨانْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿11﴾

اور (اے نبی!) جب وہ تجارت ہوتی یا کوئی تماشا دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں، کہہ دیجیے: جو اللہ کے پاس ہے وہ تماشے اور (سامانِ) تجارت سے کہیں بہتر ہے اور اللہ بہتر رزق دینے والا ہے ﴿11﴾

ایک دفعہ نبی کریم ﷺ جمعے کا خطبہ دے رہے تھے، اس وقت ایک بنجارا، یعنی تاجر آیا، اس کے ساتھ نقارہ بجتا تھا۔ شہر میں اناج کی کمی تھی، لوگ دوڑے تا کہ اس کو روکیں، نماز بعد میں پڑھیں گے۔ نبی مکرم ﷺ کے ساتھ بارہ آدمی رہ گئے، ان کے ساتھ ہی نماز پڑھی، یہ آیت اس وقت نازل ہوئی۔[1] انتہٰی۔

دورانِ خطبہ مسجد سے نکلنے کی ممانعت:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس امر پر جو واقع ہوا اس پر عتاب فرماتا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ لوگ جمعے کے دن خطبہ سے اٹھ کر تجارت کی طرف چلے گئے جو اس دن مدینے میں تاجر آئے تھے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ِۨانْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا﴾، ﴿وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا﴾ کا یہ مطلب ہے کہ تجھے چھوڑ جائیں منبر پر کھڑا ہوا کہ تو خطبہ پڑھ رہا ہے، اسی طرح تابعین میں سے کئی ایک اہلِ علم نے اس کا ذکر کیا ہے۔ امام ابو العالیہ، حسن، زید بن اسلم اور قتادہ رحمہم اللہ ان میں سے ہیں۔ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے زعم کیا ہے کہ یہ تجارت دحیہ بن خلیفہ کی تھی، اس سے پہلے کہ وہ اسلام لائے، اس کے ساتھ نقارہ تھا، پس لوگ اس کی طرف چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ کو منبر پر کھڑا چھوڑ گئے مگر ان میں سے تھوڑے لوگ رہ گئے۔[2] اس بارے میں صحیح خبر آئی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ مدینے عیر (اونٹوں کا قافلہ غلہ کے ساتھ) آیا اور رسول اللہ ﷺ خطبہ فرما رہے تھے، چنانچہ لوگ نکلے اور صرف بارہ لوگ رہ گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ِۨانْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا﴾[3] (وأخرجاه في الصحيحين من حديث سالم به) سالم بن ابی الجعد جابر رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں۔

حافظ ابو یعلیٰ موصلی نے عن سالم عن ابی الجعد و ابی سفیان عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ اس دوران میں کہ نبی مکرم ﷺ جمعے کے دن خطبہ فرما رہے تھے، مدینے کی طرف ایک عیر آیا تو رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اس کی

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں آگے آئے گی۔ [2] تفسیر ابن كثير (٤٧٠/٤)

[3] صحيح البخاري (٤٢١٦) صحيح مسلم (٨٦٣) مسند أحمد (٣١٣/٣)

طرف دوڑے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے ساتھ صرف بارہ شخص رہ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم پے در پے چلے جاتے، یہاں تک کہ تم میں سے کوئی باقی نہ رہتا تو البتہ تم کو وادی نار ہو کر بہا لے جاتی اور یہ آیت نازل ہوئی اور کہا کہ ان بارہ آدمیوں میں سے جو آپ ﷺ کے پاس جمع رہے ان میں سیدنا ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما تھے۔[1]

﴿ وَتَرَكُوكَ قَآئِمًا ﴾ میں اس بات پر دلیل ہے کہ امام جمعے کا خطبہ کھڑا ہو کر پڑھے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے دو خطبے ہوتے تھے، ان کے درمیان جلوس فرماتے تھے، قرآن پڑھتے اور لوگوں کو وعظ کرتے تھے۔[2] لیکن یہاں ایک شے اس لائق ہے کہ جانی جائے، وہ یہ ہے کہ کہا گیا ہے کہ یہ قصہ اس وقت کا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ جمعے کے دن نماز کو خطبے پر مقدم کرتے تھے، جیسا کہ امام ابو داود رحمہ اللہ نے مراسیل میں مقاتل بن حیان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے (سند یہ ہے: ”حدثنا محمود بن خالد عن الولید أخبرني أبو معاذ بکیر بن معروف أنه سمع مقاتل بن حیان یقول: کان رسول الله ﷺ ..الخ“) کہ رسول اللہ ﷺ جمعے کے دن نماز سے قبل عیدین کی طرح دو خطبے پڑھتے تھے، یہاں تک کہ جب ایک دن ہوا اور آپ ﷺ خطبہ فرما رہے تھے اور آپ ﷺ جمعے کی نماز واقعی پڑھ چکے تھے، پس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ دحیہ بن خلیفہ تجارت لے کر آیا ہے، یعنی پھر وہ متفرق ہو گئے اور آپ ﷺ کے ساتھ ذرا سا گروہ باقی رہ گیا۔[3]

قولہ تعالیٰ: ﴿ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ﴾ یعنی جو ثواب اللہ کے پاس ہے دارِ آخرت میں وہ لہو سے اور تجارت سے بہتر ہے اور ﴿ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴾ ہے اس شخص کے لیے جس نے اس پر توکل کیا اور اس کے وقت میں طلبِ رزق کیا۔[4] (آخر تفسیر سورة الجمعة ولله الحمد والمنة و به التوفیق والعصمة. کذا في ابن کثیر)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: ﴿ اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت نماز کے لیے اذان واقع ہو، اس سے مراد وہ اذان ہے جس وقت خطیب جمعے کے دن منبر پر بیٹھے تو دی جائے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد شریف میں اس کے سوا اور کوئی اذان نہ تھی۔ پھر سیدنا ابو بکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم کوفے میں اسی طریقے پر تھے، یہاں تک کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور لوگوں کی کثرت ہوئی اور منازل دور ہوئیں تو ایک اور اذان زیادہ کی، چنانچہ اولاً اپنے گھر زوراء نام پر اذان دینے کا حکم دیا، چنانچہ جب لوگ سنتے تو متوجہ ہوتے، یہاں تک کہ جب منبر پر بیٹھتے تو موذن دوسری اذان دیتا اس وقت کسی نے ان کی مخالفت نہ کی اس حدیث شریف کے سبب سے: ((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي

---

[1] مسند أبي یعلیٰ (۴٦۸/۳) السلسلة الصحیحة (۳۱٤۷)
[2] صحیح مسلم (۸٦۲)
[3] تفسیر ابن کثیر (٤۷۰/٤) یہ روایت مرسل ہے۔
[4] تفسیر ابن کثیر (٤۷۰/٤)

وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ »[1] (كذا قال الخطيب على ما نقله الجمل) ''میری سنت اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت سے تمسک کرو۔''

﴿ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ ﴾، ﴿ إِذَا ﴾ کا بیان اور اس کی تفسیر ہے۔[2] (كما قاله الزمخشري) امام ابو البقاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حرف ﴿ مِنْ ﴾ بہ معنی ''في'' ہے[3] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ ﴾ [الفاطر: ٤٠] ''مجھ کو یہ بتلاؤ کہ انھوں نے زمین میں سے کون سا (جزو) بنایا ہے۔'' ''أَيْ: فِيْ الْأَرْضِ'' کواشی نے دونوں میں جمع کیا ہے۔ ﴿ اَلْجُمُعَةِ ﴾ کو جمہور نے بہ ضمِ میم پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی عبد اللہ بن زبیر واعمش نے كذا في فتح القدير سمین نے زيد بن علي وأبو حيوة وأبو عمرو في رواية وعبد الله ابن الزبير کہا ہے) بہ سکونِ میم پڑھا ہے تخفیف کے لیے،[4] یہ دونوں دو لغت ہیں اس کی جمع ''جُمُع وَ جُمُعَاتٌ'' ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْجُمُعَةِ ﴾ بہ سکونِ و فتح و ضمِ میم ہے یہ ﴿ يَوْمِ ﴾ کی صفت ہے: ''أَيْ: يَوْمٌ يُجْمِعُ النَّاسَ'' یعنی ایک دن ہے جو لوگوں کو جمع کرتا ہے۔ نیز امام فراء اور ابو عبید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ تخفیف اخف و اقیس ہے، جیسے: ''غُرْفَةٌ وَغُرَفٌ وَطُرْفَةٌ وَطُرَفٌ وَحُجْرَةٌ وَحُجَرٌ'' اور میم کا فتح لغتِ عقیل ہے۔[5] وجہ تسمیہ کی اور قول پہلے گزر چکے ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! یوم الجمعہ نام کس لیے رکھا گیا؟ فرمایا: اس لیے کہ اس میں تمھارے باپ آدم علیہ السلام کی مٹی جمع کی گئی اور اسی میں صعقہ و بعثہ (قیامت اور دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا) ہے اور اس کے آخر میں تین گھڑیاں ہیں، ان میں سے ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں جو کوئی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے تو وہ اسے قبول کرتا ہے۔[6] (أخرجه سعيد بن منصور و ابن مردويه) نیز ان سے مرفوعاً مروی ہے کہ بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوا وہ روزِ جمعہ ہے۔ اسی میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے اور اسی میں جنت کے اندر داخل کیے گئے اور اسی میں اس سے نکالے گئے اور قیامت بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔[7] (أخرجه أحمد و مسلم و الترمذي و ابن مردويه)

اس بارے میں اور حدیثیں ہیں جو تصریح کرتی ہیں کہ آدم علیہ السلام اس میں پیدا کیے گئے۔ روزِ جمعہ کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں اور اسی طرح نمازِ جمعہ کی فضیلت اور اس کے اجرِ عظیم کے بارے میں اور اس گھڑی کے متعلق جو اس کے اندر ہے اور اس بارے میں کہ اس گھڑی میں دعا قبول ہوتی ہے بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ شیخ شیوخنا الشوکانی رحمہ اللہ نے شرح منتقیٰ میں اس مقام کی ایسی وضاحت کی ہے کہ دیکھنے والا اس کے علاوہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔[8]

---

[1] سنن أبي داود (٤٦٠٧) سنن الترمذي (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه (٤٢) صحيح الجامع (٢٥٤٩) [2] الكشاف (٤/٤٧٠)
[3] التبيان في إعراب القرآن (٢/١٢٢٣) [4] اللباب في علوم الكتاب (١٨/٩٧)، [5] فتح القدير (٥/٣٠٢)
[6] الدر المنثور (٨/١٥٥) [7] صحيح مسلم (٨٥٤) مسند أحمد (٢/٤١٨) سنن الترمذي (٤٨٨) [8] نيل الأوطار (٣/٢٩٥)

پہلا جمعہ جو رسول اللہ ﷺ نے پڑھا، وہ بنی سالم بن عوف کے گھر میں تھا، یہ اس طرح ہوا کہ جب آپ ﷺ مدینے میں آئے تو قبا میں اترے اور وہاں جمعے تک ٹھہرے، پھر مدینے میں داخل ہوئے اور اس گھر میں جمعہ پڑھا۔ جمعہ اللہ تعالیٰ کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے اس کے مطابق جو کتاب اللہ میں ہے اور ان حدیثوں کے سبب سے جو صحیح ہیں اور بہت سی ہیں۔ نبی مکرم ﷺ نے اس وقت سے اس پر ہیشگی اور مداومت فرمائی جس میں اللہ تعالیٰ نے اس کو مشروع کیا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کو مقبوض فرمایا، یعنی وفات دی۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ جمعہ فرضِ عین ہے۔

امام ابن العربی رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کہا کہ جس نے جمعے کی فرضیت کے بارے میں تنازعہ کیا تو واقعی اس نے خطا کی اور وہ صحیح نہیں ہے۔ جمعہ دوسری نمازوں کی طرح ہے، صرف ان سے اتنا مختلف ہے کہ اس سے پہلے دو خطبے مشروع ہیں۔ چنانچہ جس شخص نے بھی اس فضیلت والی عبادت کے متعلق وارد ردی قسم کے اقوال، حق سے ہٹے ہوئے مذاہب اور کسی نہ کام کے اجتہادات کا مشاہدہ کیا، وہ تعجب کیے بغیر نہ رہ سکا۔

فرضیتِ جمعہ اور اس کی صحت کے بارے میں یہ جو امور وشرائط ہیں کہ بڑا شہر ہو، مخصوص تعداد ہو، وہاں امامِ اعظم ہو اور حمام وغیرہ ہوں، کتاب وسنت میں سے ان کا کوئی شوشہ بھی نہیں ہے، ہائے تعجب! یہ رائے اہل الرائے سے کیا کچھ کرواتی ہے۔ ان کی یہ بے کار باتیں شریعتِ مطہرہ سے بالکل کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ جو شخص شریعت پر ثابت قدم ہے اور قیل وقال سے اس کے پاؤں میں صراطِ مستقیم پر چلنے سے کوئی لغزش نہیں ہوتی، وہ اس سے بہ خوبی آگاہ ہے اور جو اس سے گمراہ ہے، اس کی گمراہی اس کے گلے کا طوق بن کر رہے گی۔ مزید تفصیل کے لیے قاضی شوکانی رحمہ اللہ کی "نيل الأوطار" اور "السيل الجرار" کی طرف رجوع کیا جائے۔

سب راتوں سے افضل شبِ مولد ہے، پھر شبِ قدر، پھر شبِ معراج، پھر عرفہ، پھر جمعہ، پھر نصف شعبان، پھر عید اور سب دنوں سے افضل روزِ عرفہ ہے، پھر روزِ نصف شعبان، پھر روزِ جمعہ اور رات افضل ہے دن سے۔[1] (قاله الشيخ رحماني في حاشية على التحرير) کاتب الحروف۔ عفا الله عنه۔ کہتا ہے کہ روزِ جمعہ عجیب مبارک دن ہے اس کے فضائل اور خصائص حدیثوں میں کثرت سے آئے ہیں، اسی لیے یہ بابرکت دن مسلمانوں کی عید کا دن قرار پایا ہے۔ جناب سیوطی رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک عمدہ رسالہ "نور اللمعة" نام کا تالیف فرمایا ہے، اس میں سارے خصائص کو مکمل تفصیل سے بیان فرمایا ہے اور امام یافعی رحمہ اللہ نے تاریخ مرآۃ الجنان کے آخر میں روزِ جمعہ کے ۱۰۲ خصائص ذکر فرمائے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو شخص روزِ جمعہ یا شبِ جمعہ میں انتقال کرتا ہے تو قبر میں اس سے پوچھ کچھ نہیں ہوتی۔

طی الفراسخ میں اس کے دلائل لکھے ہیں، اس کے بعد شرح برزخ سے نقل کیا ہے، روایت کیا گیا ہے کہ جو

[1] فتح البیان (۱۳۷/۱۴، ۱۳۸)

شخص سال کے فضیلت والے اوقات میں مرتا ہے وہ قبر میں عذاب نہیں دیا جاتا اور یہ چند وقت ہیں: ① ماہِ رجب خصوصاً لیلۃ الرغائب۔ ② یومِ استفتاح۔ ③ ماہِ شعبان خاص کر لیلۃ البراءت۔ ④ رمضان شریف خاص کر شبِ قدر۔ ⑤ دس دن ذی الحجہ کے، خصوصاً یومِ ترویہ، یعنی آٹھویں تاریخ جس دن منیٰ کو جاتے ہیں اور عرفہ کا دن۔ ⑥ روزِ عید الفطر۔ ⑦ روزِ عید الاضحیٰ۔ ⑧ روزِ عاشوراء۔ یہ ایسے عمدہ وقت ہیں کہ جو شخص ان میں مرے گا وہ قبر میں معذب نہ ہوگا۔ واللہ أعلم. انتہیٰ. اللهم ارزقنا الموت في يوم الجمعة أو ليلة الجمعة أو في أحد هذه الأيام والليالي الفاضلة بفضلك و كرمك وصلى الله على سيدنا و مولانا محمد وآله وصحبه إلى يوم الدين آمين عدد ما علمت وزنة ما علمت وملء ما علمت آمين.

امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''سعی إلی ذکر الله'' سے مراد نماز کی طرف جانا اور چلنا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مضي وسعی و ذہاب کے ایک ہی معنی ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ''فَامْضُوا إِلَى ذِكْرِ اللّٰهِ'' اس پر دال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد ارادہ ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ ''سعی علی الأقدام'' مراد نہیں ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ سعی سے مراد ''سعی علی الأقدام'' ہے۔ اور یہ فضیلت ہے کچھ شرط نہیں ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''سعی'' سے مراد عمل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ ﴾[بني إسرائيل: ١٩] ''اور جس کا ارادہ آخرت کا ہو اور جیسی کوشش اس کے لیے ہونی چاہیے، وہ کرتا بھی ہو اور وہ با ایمان بھی ہو۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ﴾ [الليل: ٤] ''یقیناً تمھاری کوشش مختلف قسم کی ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسٰنِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ [النجم: ٣٩] ''اور یہ کہ ہر انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی۔''

اور داعی کا قول ہے: ''وَإِلَيْكَ نَسْعَى وَنَحْفَدُ'' مطلب یہ ہے کہ سعی سے مراد چلنے میں سرعت کرنا نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دو قول مروی ہیں: ایک ﴿ فَاسْعَوْا ﴾ کی تفسیر ''فَامْضُوا''۔ دوسرا یہ ہے کہ سعی عمل ہے۔[2] (أخرجهما عبد بن حميد عنه)۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول جمہور کا ہے، یعنی ذکر اللہ کی طرف جانے کا عمل کرو اور اس کے اسباب میں مشغول ہو جو نہانا، وضو کرنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا ہے۔[3] خرشہ بن حر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے میرے پاس ایک تختی دیکھی، اس میں لکھا ہوا تھا: ﴿ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ تو فرمایا: یہ تجھ کو کس نے املاء کرایا؟ میں نے کہا: سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے۔ فرمایا کہ بے شک اُبی ہم سے زیادہ پڑھنے والے ہیں منسوخ کو، تو اس کو پڑھ ''فَامْضُوا إِلَى ذِكْرِ اللّٰهِ''[4] (رواه ابن المنذر وابن الأنباري وابن أبي شيبة وأبو عبيد في فضائله و سعيد بن منصور)

---

① فتح القدير (٣٠٢/٥) ② الدر المنثور (١٦٢/٨)
③ تفسير القرطبي (١٠١/١٨) ④ الدر المنثور (١٦١/٨)

ان سب لوگوں نے سوا ابوعبید رحمہ اللہ کے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: البتہ مقرر وفات دیے گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہم نہیں پڑھتے تھے اس آیت کو جو سورۃ الجمعہ میں ہے، مگر "فَامْضُوْا إِلَى ذِكْرِ اللّٰهِ"[1] (وأخرجه عنه أيضا الشافعي في الأم وعبد الرزاق والفريابي وابن جرير وابن أبي حاتم وأخرجوا كلهم أيضا عن ابن مسعود) کہ وہ پڑھتے تھے: "فَامْضُوْا إِلَى ذِكْرِ اللّٰهِ". کہا: اور اگر ﴿ فَاسْعَوْا ﴾ ہوتا تو البتہ میں سعی کرتا، یہاں تک کہ میری چادر گر پڑتی۔[2] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔[3] (كما رواه عبد بن حميد عنه)

یہاں ﴿ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد نمازِ جمعہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ امام کا وعظ ہے، پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ جمہور نے کہا ہے کہ خطبہ ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسی سے استدلال فرمایا ہے اس بات پر کہ اگر خطیب صرف الحمدللہ پر اکتفا کرے تو جائز ہے۔ ﴿ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ بیع کے معاملے کو ترک کرو اور باقی معاملات اس کے ساتھ ملحق ہیں۔ یا بیع سے مراد عقدِ بیع ہے بتمامہ، یعنی خرید و فروخت کا مکمل کرنا، تو اب یہ خطاب ہر فروخت کرنے والے اور خریدنے والے کے لیے ہوگا۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اصحاب اپنی تجارت کے سلسلے میں ملکِ شام کی طرف آمد و رفت رکھتے تھے اور بسا اوقات وہ جمعے کے دن آتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھتے ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑتے اور اُٹھ کھڑے ہوتے تھے (یعنی وہ صحابہ جو خطبے میں حاضر ہوتے تھے)۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ﴾ چنانچہ ان پر حرام کیا گیا جو اس سے پہلے تھا۔[4] (أخرجه عبد بن حميد)

آیت سے مراد اس شے کا ترک کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بے پروا اور غافل کرتی ہے، یعنی دنیا کے کام۔ ان میں سے خاص طور پر بیع کا ذکر صرف اس لیے کیا کہ جمعے کے دن زوال کے وقت خرید و فروخت کثرت سے ہوتی تھی، اس لیے ان سے کہا گیا ہے کہ آخرت کی تجارت کی طرف دوڑو اور دنیا کی تجارت چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف سعی کرو جس سے بڑھ کر نفع اور فائدہ دینے والی کوئی شے نہیں ہے اور اس خرید و فروخت کو چھوڑ دو جس کا نفع تھوڑا ہے۔

﴿ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف سعی کرنا اور خرید و فروخت کو چھوڑ دینا اس وقت میں تمھارے خرید و فروخت اور کمائی کرنے سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ حکم ماننے میں اجر و جزا ہے اور اس کے نہ ماننے سے اجر و جزا بھی نہیں ہے جب کہ وہ سزا کا موجب نہ ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس مسئلے میں اس سے تمسک کیا ہے، کہا: اذان و خطبے کے وقت نماز پوری ہونے تک بیع صحیح ہے اگرچہ حرمت کے ساتھ۔ کشاف میں کہا ہے کہ عام علماء کا

[1] فتح القدير (٥/٣٠٤) [2] تفسير الطبري (٢٣/٣٨١)
[3] الدر المنثور (٨/١٦٢) [4] الدر المنثور (٨/١٦٣) یہ روایت مرسل ہے۔

یہ خیال ہے کہ یہ فساد کا موجب نہیں ہے، اس لیے کہ بیع بالکل حرام نہیں ہوئی مگر نماز سے اس مشغولیت کی وجہ سے جو اس میں ہے۔ چنانچہ وہ ایسی ہے جیسے کسی مغصوب زمین میں نماز ہو۔[1] امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو بیع وقتِ مذکور میں واقع ہوئی اسے فسخ کیا جائے اور اسی طرح باقی عقود، یعنی پکے لین دین۔ ﴿ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اگر تم اہلِ علم سے ہو تو بے شک تم پر یہ مخفی نہ رہے گا کہ یہ تمھارے لیے تمھاری جانوں کی مصلحتوں سے بہتر ہے۔

﴿ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ یعنی پھر جب تم نماز پڑھ لو اور اس کو ادا کر چکو اور اس سے فارغ ہو جاؤ تو تجارت اور اپنی معاش کے کام کاج کے لیے زمین میں پھیل جاؤ جس کی تمھیں حاجت ہوتی ہے۔ یہ امر جواز کا ہے، یعنی نماز کے بعد خرید و فروخت کی اجازت ہے۔ تم کو اختیار ہے چاہو تو کرو اور چاہو تو نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کے رزق سے تلاش کرو جس کا وہ اپنے بندوں پر فضل فرماتا ہے ان منافع کے سبب سے جو معاملات اور کام کاج میں ان کو حاصل ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "اِبْتِغَاء" سے مراد اس اجر کا طلب کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے طاعات کے سبب سے اور اس شے سے بچنے کے سبب سے جو حلال نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ طلبِ علم ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ طلبِ دنیا نہیں ہے لیکن مریض کی عیادت اور جنازے میں حاضر ہونا اور اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے بھائی کی زیارت کرنا ہے۔[2] (أخرجه ابن جرير) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ طلبِ دنیا میں سے کسی شے کا امر نہیں کیے گئے وہ تو صرف مریض کی عیادت اور جنازہ میں حاضر ہونا اور اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے بھائی کی زیارت کرنا ہے۔[3] (أخرجه ابن مردويه)

﴿ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کا بہت سا ذکر کرو اس طرح سے کہ اس اخروی و دنیوی خیر پر جس کی اس نے تم کو ہدایت فرمائی، اس کا شکر ادا کرو اور اسی طرح ان اذکار کے ساتھ اس کا ذکر کرو جو تم کو اس کی طرف قریب کرتے ہیں، جیسے: حمد و تسبیح و تکبیر و استغفار اور اس طرح کے اَور اذکار۔ اور اس کے ذکر کے لیے صرف نماز کی حالت کو کافی نہ سمجھو۔ ﴿ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ یعنی تاکہ تم دونوں جہان کی خیر اور بہتری حاصل کر کے کامیاب ہو جاؤ۔

﴿ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا ﴾ کا سببِ نزول یہ ہے کہ مدینے والوں پر فاقہ تھا اور وہ ضرورت مند تھے، چنانچہ شام کا قافلہ آیا اور اس کے آنے کا نقارہ بجایا گیا اور نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعے کے دن خطبہ فرما رہے تھے، چنانچہ لوگ اس کی طرف چلے گئے، یہاں تک کہ مسجد میں صرف بارہ اشخاص رہ گئے۔ (امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: ایک روایت میں چالیس مرد باقی رہے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آٹھ تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ گیارہ تھے۔ ایک اور میں ہے کہ تیرہ تھے۔ ایک اور میں ہے کہ چودہ تھے۔[4] پس یہ منشا ہے ائمہ کے درمیان اس عدد کے

---

[1] الكشاف (٥٣٧/٤)
[2] تفسير الطبري (٣٨٥/٢٣) اس کی سند میں ''ابو عامر صائغ'' سخت ضعیف راوی ہے۔
[3] الدر المنثور (١٦٥/٨)
[4] تفسير القرطبي (١١٠/١٨)

بارے میں اختلاف کا جس سے جمعہ منعقد ہوتا ہے)۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہم کو پہنچا ہے کہ انھوں نے یہ کام تین بار کیا، ہر بار شام سے قافلہ آتا اور اس کا آنا جمعے کے دن عین خطبے کے وقت ہوتا تھا۔ کسی نے کہا کہ اہلِ مدینہ نے اپنی عادت کے مطابق نقارہ بجایا، وہ اسی طرح سے قافلے کا استقبال کرتے تھے۔ طبل بجانے اور تالیاں بجانے سے، یا جو لوگ اسے لے کر آئے تھے انھوں نے بجایا۔ یہ تین قول ہیں جن کو خطیب نے نقل کیا ہے۔[1] ﴿ اِنْفَضُّوْٓا ﴾ کے معنی یہ ہے کہ متفرق ہوئے اس حال میں کہ اس کی طرف نکلنے والے تھے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی طرف مائل ہوئے۔[2] ﴿ اِلَيْهَا ﴾ کی ضمیر تجارت کی طرف راجع ہے جو زیادہ اہم تھی۔ کسی نے کہا کہ تقدیر یہ ہے: "إِذَا رَأَوْا تِجَارَةً اِنْفَضُّوْا إِلَيْهَا أَوْ لَهْوًا اِنْفَضُّوْا إِلَيْهِ" چونکہ پہلا اس پر دال ہے، اس لیے دوسرے کو حذف کر دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ تجارت کی ضمیر پر اس لیے اکتفا کیا کہ جب تجارت کی حاجت ہونے کے باوجود اس کی طرف مائل ہونا مذموم ہوا تو پھر لہو کی طرف مائل ہونا کیسے مذموم نہ ہوگا۔ کسی نے کچھ اور بھی کہا ہے۔

یہاں جو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث، جو بروایتِ بخاری و مسلم وغیرہما ذکر کی ہے، میں یہ الفاظ ہیں: یہاں تک کہ باقی نہ ہے ان میں سے مگر بارہ مرد، میں ان میں تھا اور سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا: ﴿ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا ۭ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴾[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عبد الرحمان بن عوف کا قافلہ اناج لادے ہوئے آیا تو وہ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعے سے نکلے، بعض یہ ارادہ رکھتے تھے کہ خریدیں گے اور بعض یہ ارادہ رکھتے تھے کہ دحیہ بن خلیفہ کی طرف نظر کریں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر کھڑا چھوڑ گئے اور مسجد میں بارہ مرد اور سات عورتیں باقی رہ گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ سب نکل جاتے تو البتہ ان پر مسجد آگ بن کر شعلہ مارتی۔[4]

(أخرجه عبد بن حميد)

اس بارے میں صحابہ وغیرہم کی ایک جماعت سے روایتیں ہیں جو اس معنی کو ظاہر کرتی ہیں۔ جس بات نے ان کے لیے یہ جائز کیا کہ وہ نکل گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ پڑھتے چھوڑ گئے وہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ خیال کیا کہ نماز پوری ہونے کے بعد نکلنا جائز ہے، کیوں کہ مقصد پورا ہوگیا اور وہ نماز تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعے کی نماز عیدین کی طرح خطبے سے پہلے پڑھتے تھے، پھر جب یہ واقعہ ہوا اور آیت نازل ہوئی تو خطبے کو پہلے اور نماز کو بعد میں کر دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو خطبے پڑھتے تھے، دونوں کے درمیان بیٹھتے تھے۔[5] (أخرجه الشيخان)

---

[1] فتح البيان (١٤/١٤١) [2] فتح القدير (٥/٣٠٣) [3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[4] فتح القدير (٥/٣٠٤) [5] صحيح البخاري (٨٨٦) صحيح مسلم (٨٦١)

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ خطیب کو لائق ہے کہ کھڑا ہو کر خطبہ پڑھے، اس پر اتفاق کیا ہے کہ یہ کھڑا ہونا جمعے کے لیے خطبے میں تھا۔ پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ ان کو یہ بتائیں کہ آخرت کے لیے عمل کرنا دنیا کے لیے عمل کرنے سے بہتر ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ﴾ یعنی ان کو ادب سکھانے اور انھیں زجر کرنے کے لیے تو یہ کہہ دے کہ ایسے فعل کو دوبارہ کرنے سے وہ جزائے عظیم بہتر ہے جو رسول اللہ کے ہمراہ ثابت رہنے پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، یعنی جنت اس تمام شے اور تجارت سے بہتر ہے جس کی طرف تم گئے اور اس لیے کہ مسجد میں ٹھہرے رہنا اور نبیِ مکرم ﷺ کا خطبہ سننا تم نے چھوڑ دیا۔

﴿ مَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ صرف اس لیے بہتر ہوا کہ وہ محقق ومخلد (حقیقی اور ہمیشہ رہنے والا فائدہ) ہے بخلاف تجارت اور لہو کے نفع کے جس کا وہ وہم کرتے ہیں، کیونکہ لہو کا نفع تو کچھ محقق نہیں ہے اور تجارت کا نفع مخلد نہیں ہے۔ اسی سے لہو کو پہلے ذکر کرنے کی وجہ معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ اعدام، ملکات پر مقدم ہیں۔ ﴿ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴾ یعنی اور اللہ تعالیٰ تمام روزی دینے والوں سے بہتر ہے تو تم اسی سے رزق طلب کرو اور اسی کی طرف توسل کرو، اس کی طاعت اختیار کر کے، بے شک یہ رزق حاصل کرنے کے اسباب میں سے ہے اور ان امور میں سے سب سے بڑا ہے جو رزق کو کھینچ لاتے ہیں۔ "رازقین" کو جو جمع کے عدد کے ساتھ ذکر کیا ہے تو یہ صرف مجاز کے طور پر ہے، اس لحاظ سے کہ کہا جاتا ہے: ہر انسان اپنے عیال کو رزق دیتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے رزق سے، ورنہ پھر رازق تو حقیقت میں وہی ہے جو اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے۔[1]

الحمد للّٰه والمنة کہ سورۃ الجمعہ کی تفسیر روز یکشنبہ (اتوار) ۱۹ شوال ۱۳۱۵ ہجری کو وقت نیم شب مکمل ہوئی، اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آئندہ کی توفیق دے آمین!۔ ولا حول ولا قوة إلا باللّٰه العلي العظيم، وصلى اللّٰه على رسول اللّٰه سيد المرسلين و بارك وسلم و على آله وصحبه إلى يوم الدين آمين، والحمد للّٰه أولا و آخرا و ظاهرا و باطنا.

---

[1] فتح البیان (۱۴/۱۳۵۔۱۴۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ

اس سورت مبارکہ کی بلا خلاف گیارہ (۱۱) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ سب کے قول کے مطابق مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ سورۃ المنافقین مدینے میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس والنحاس و ابن مردويه و البيهقي) سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] (أخرجه ابن مردويه) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعے کی نماز میں سورۃ الجمعہ پڑھتے تھے، اس کے ساتھ مومنوں پر تحریض کرتے تھے، یعنی انھیں جنگ پر اُبھارتے تھے اور دوسری رکعت میں سورۃ المنافقین پڑھتے تھے، اس کے ساتھ منافقوں کو تقریع کرتے تھے، یعنی انھیں ملامت کرتے اور دھمکاتے تھے۔[3] (أخرجه سعيد بن منصور و الطبراني في الأوسط قال السيوطي بسند حسن وأخرج البزار والطبراني عن أبي عيينة الخولاني مرفوعاً نحوه)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾ اِتَّخَذُوْٓا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ إِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۳﴾ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ؕ وَإِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ؗ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾

(اے نبی!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: ہم شہادت دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں۔ اور اللہ شہادت

[1] تفسير القرطبي (١٢٠/١٨) [2] الدر المنثور (١٧٠/٨) [3] المعجم الأوسط (١١٢/٩)

دیتا ہے کہ یقیناً منافق البتہ جھوٹے ہیں① انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے، پھر وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، بے شک برا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں② یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا، تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، تو وہ سمجھتے ہی نہیں③ جب آپ انھیں دیکھیں تو آپ کو ان کے جسم اچھے لگتے ہیں اور اگر وہ (کوئی بات) کہیں تو آپ ان کی بات پر کان لگائیں، گویا وہ ٹیک لگائی ہوئی لکڑیاں ہوں۔ وہ ہر اونچی آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں، وہی (اصل) دشمن ہیں، لہٰذا آپ ان سے بچیں، اللہ انھیں ہلاک کرے، وہ کہاں پھیرے جاتے ہیں④

منافقوں کے حالات اور ان کے ہیر پھیر:

یعنی منافق قائل نہیں ہیں، وہ اپنی غرض سے کہتے ہیں کہ تو اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔ اپنی مجلس میں منافق مسلمانوں کو طعن کرتے اور ان کا عیب بیان کرتے، جب ان باتوں پر ان کی پکڑ ہوتی تو انکار کر دیتے اور قسم کھا جاتے کہ ہم نے یہ بات نہیں کہی۔ یہی حقیقی دشمن ہیں، یعنی دیکھنے میں آدمی ہیں اور دل میں دغا باز۔ انتھیٰ.

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقوں کے متعلق خبر دیتا ہے کہ وہ صرف اپنے منہ سے اسلام کے قائل ہوتے ہیں، جب نبی اکرم ﷺ کے پاس آتے ہیں۔ اب رہا ان کے باطن کا حال تو اس میں ایسے نہیں ہیں، بلکہ اس کے بالکل برعکس قائم ہیں۔ اسی لیے یوں فرمایا کہ جب تیرے پاس منافق آئیں تو کہتے ہیں کہ ہم قائل ہیں کہ تو اللہ تعالیٰ کا رسول ہے، یعنی جب وہ تیرے پاس حاضر ہوتے ہیں تو تیرے روبرو اس طرح کہتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں، حالاں کہ وہ ویسے نہیں ہیں جیسے کہتے ہیں۔ اسی لیے ایک جملۂ معترضہ لایا گیا جو یہ خبر دیتا ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ﴾ یعنی اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ بے شک تو اس کا رسول ہے۔

پھر فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ یعنی اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بے شک منافق البتہ جھوٹے ہیں، اس بات میں جس کی خبر دی ہے، گو وہ خارج کے مطابق ہے، اس لیے کہ جو بات وہ کہتے ہیں اس کے صحیح اور سچا ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے، اسی لیے اللہ پاک نے بہ نسبت ان کے اعتقاد کے ان کی تکذیب کی۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ﴾ یعنی وہ جھوٹی اور گناہ گار کرنے والی قسمیں کھا کر لوگوں سے بچتے ہیں، تاکہ لوگ ان کو اس بات میں سچا جانیں جو وہ کہتے ہیں۔ چنانچہ جو ان کے ظاہر حال کو پہچانتا نہیں ہے، اس نے ان سے دھوکا کھایا اور یہ اعتقاد کر بیٹھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ (اس عبارت کے معنی صحیح نہیں، کیونکہ جو امرِ جلی کو نہیں جانے، وہ کیسے مغتر یعنی دھوکا کھانے والا ہو سکتا ہے اور خلافِ واقعہ اعتقاد کر سکتا ہے، پھر جلی کو نہ جاننے کی کوئی

صورت بھی نہیں، لہٰذا ضرور اس جگہ پر کچھ اسقاط ہے۔ شاید عبارت یوں ہو: "فاغتر بهم من لا يعرف إلا جلية أمرهم" اور یہ عبارت باعتبار معنی کے صحیح ہے۔ از مصحح سلمه الله تعالىٰ)

پھر بسا اوقات ان کی پیروی کی اس کام میں جو وہ کرتے ہیں اور تصدیق کی اس بات میں جو وہ کہتے ہیں، حالانکہ ان کا حال تو یہ ہے کہ وہ باطن میں اسلام اور اہلِ اسلام کے بگاڑنے میں کسی طرح کی کمی نہیں کرتے۔ چنانچہ اسی طرح سے بہت سے لوگوں کو بڑا ضرر حاصل ہوا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾۔ امام ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ اس آیت کو اس طرح سے پڑھتے تھے: ﴿ اِتَّخَذُوْٓا اِيْمٰنَهُمْ جُنَّةً ﴾ یعنی انھوں نے ظاہری طور پر اپنی تصدیق کو اپنا بچاؤ ٹھہرایا کہ اس کے سبب سے قتل سے بچتے تھے۔ جمہور اس کو ﴿ اَيْمٰنَهُمْ ﴾ جمع "یمین" کی پڑھتے ہیں۔[1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴾ یعنی ان پر جو نفاق مقدر کیا گیا تو صرف اس لیے کہ وہ ایمان سے کفر کی طرف لوٹ گئے اور ہدایت کے بدلے گمراہی لے لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، چنانچہ اب وہ سوجھتے بوجھتے نہیں، یعنی اب نہ ان کے دلوں کی طرف ہدایت پہنچتی ہے اور نہ ان تک کوئی خبر پہنچتی ہے۔ چنانچہ وہ نہ یاد رکھتے ہیں نہ راہ پاتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ﴾ یعنی ان کی شکلیں اور ڈیل ڈول خوبصورت ہیں، فصاحت اور زبان والے ہیں۔ جب سننے والا ان کو سنتا ہے تو ان کی بلاغت کی وجہ سے اپنا کان ان کی بات کی طرف جھکا دیتا ہے، حالانکہ اس کے باوجود وہ انتہا درجے کی کمزوری وسستی، گھبراہٹ اور بزدلی میں ہیں۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ﴾ یعنی جب کوئی امر یا کوئی حادثہ یا کچھ خوف واقع ہوتا ہے تو اپنی نامردی کے مارے یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ وہ انہیں پر نازل ہونے والا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴾ [الأحزاب: ١٩] "اس حال میں کہ وہ تمھارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں، چنانچہ جب خوف (کا وقت) آئے تو آپ انھیں دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، ان کی آنکھیں (اس طرح) گھومتی ہیں، جیسے وہ شخص جس پر موت کی غشی طاری ہو، پھر جب خطرہ دور ہو جائے تو مال (غنیمت) کے انتہائی حریص بن کر تیز زبانوں کے ساتھ تمھارے بارے میں زبان درازی کرنے لگتے ہیں، یہ لوگ ایمان لائے ہی نہیں، لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے اور یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔"

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٧١)

چنانچہ یہ منافقین ابرِ بے آب ہیں اور صورتیں ہیں بلا معانی۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ لِلْمُنَافِقِينَ عَلَامَاتٍ يُعْرَفُونَ بِهَا: تَحِيَّتُهُمْ لَعْنَةٌ، وَطَعَامُهُمْ نُهْبَةٌ، وَغَنِيمَتُهُمْ غُلُولٌ، وَلَا يَقْرَبُونَ الْمَسَاجِدَ إِلَّا هَجْرًا، وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا دُبْرًا، مُسْتَكْبِرِينَ، لَا يَأْلَفُونَ وَلَا يُؤْلَفُونَ، خُشُبٌ بِاللَّيْلِ، صُخُبٌ بِالنَّهَارِ وَقَالَ يَزِيدُ: (یعنی امام احمد کے استاد) سُخُبٌ بِالنَّهَارِ »[1] ''بلاشبہ منافقوں کی کچھ علامتیں ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں: ان کا سلام لعنت ہے، ان کا کھانا لوٹ مار ہے، ان کی غنیمت دھوکا ہے اور مساجد کے قریب بہت کم آتے ہیں۔ وہ نماز تاخیر سے ادا کرتے ہیں اور بے حد متکبر ہیں، نہ محبت کرتے ہیں اور نہ محبت کیے جاتے ہیں، رات کو لکڑیاں ہیں اور دن کو بہت جھگڑالو اور شور وغوغا کرنے والے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کا نام منافق رکھا، اس لیے کہ انھوں نے شرک چھپایا اور ایمان ظاہر کیا۔[2] ان سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں، یعنی منافق تیرے پاس پہنچیں اور تیری مجلس میں حاضر ہوں تو کہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک تو اللہ کا رسول ہے۔ ﴿ قَالُوْا ﴾ شرط کا جواب ہے۔ کسی نے کہا کہ جواب محذوف ہے اور ﴿ قَالُوْا ﴾ حال ہے: ''أَيْ: إِذَا جَاءَكَ قَائِلِينَ كَيْتَ وَكَيْتَ فَلَا تَقْبَلْ مِنْهُمْ'' یعنی جب وہ تیرے پاس فلاں فلاں بات کہتے ہوئے آئیں تو تُو ان سے مت قبول کر۔ کسی نے کہا ہے کہ شرط کا جواب ﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ ﴾ ہے (اس صورت میں بھی ﴿ قَالُوْا ﴾ حال ہوگا) لیکن یہ قول نہایت درجہ بعید ہے۔ کما لا یخفیٰ۔ انھوں نے جو اپنی شہادت کو مؤکد بانون ولامِ تاکید کیا تو منظور اس سے یہ خبر دینا ہے کہ اس کا صدور ان کے صمیم قلب سے خلوصِ اعتقاد کے ساتھ ہوا ہے ﴿ نَشْهَدُ ﴾ کے معنی ''نَحْلِفُ'' ہیں، یعنی ہم قسم کھاتے ہیں، پس یہ جاری مجریٰ قسم ہوتا ہے اور اسی لیے ''إِنَّ'' و لامِ تاکید جو قسم کے جواب پر داخل ہوتا ہے، وہ اس کے بعد کے جملے پر بھی آتا ہے (ومنه قول قيس بن دريح: وأشهد عند الله أني أحبها فهذا لها عندي فما عندها لها)

حلف جو شہادت کے پیرایہ میں ادا کی گئی، وہ صرف اس لیے کہ ہر ایک ان میں سے امرِ معین کے لیے اثبات ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اپنے ظاہر پر محمول ہو، اپنے نفوس سے نفاق کی نفی کرنے کے لیے اشبہ یہی ہے ﴿ نَشْهَدُ ﴾ کی طرح ''نعلم'' ہے، یہ بھی جاری مجریٰ قسم ہوتا ہے۔ کما في قول الشاعر ؎

ولقد علمت لتأتين منيتي إن المنايا لا تطيش سهامها[3]

---

[1] مسند أحمد (۴۹۳/۲) تفسير ابن كثير (۴۷۲،۴۷۱/۴) اس کی سند میں ''عبدالملک بن قدامہ'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ۵۸۷۲)

[2] الدر المنثور (۱۷۲/۸) [3] فتح القدير (۳۰۶/۵)

﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ﴾ جملہ معترضہ ہے، مضمونِ ماقبل کا مقرر ہے، یعنی وہ شہادت جس کا اظہار کیا، اگرچہ ان کے باطن اس کے خلاف پر جمے ہوئے ہیں۔ ﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بے شک منافق البتہ جھوٹے ہیں، اپنی شہادت میں جس کا دعویٰ کیا ہے کہ وہ دل کی گہرائی سے اور خلوصِ اعتقاد سے ہے نہ صرف اپنے زبانی کلام سے اور وہ رسالت کی شہادت ہے، کیونکہ وہ تو حق ہے، یعنی وہ البتہ جھوٹے ہیں، اس تاکید میں جو اُن کے کلام سے ظاہر ہو رہی ہے، کون سی تاکید جو اس پر دال ہے کہ ان کا رسالت کی گواہی دینا ان کے خلوصِ اعتقاد وطمانینتِ قلب وموافقتِ باطن بظاہر سے ہے۔ یا وہ اپنی جانوں کے نزدیک کاذب ہیں، کیوں کہ وہ تو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کا کہنا: ﴿ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ سراسر جھوٹ ہے اور ایک خبر ہے برخلاف اس کے جس پر مخبر عنہ کا حال ہے۔

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ﴾ یعنی ان کی قسمیں جو انھوں نے تمھارے لیے کھائیں کہ بے شک وہ تم میں سے ہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، ان قسموں کو ایک بچاؤ کا ذریعہ بنایا ہے کہ وہ ان کو تم سے بچائے اور ایک سُترہ کہ اس کے سبب قتل اور قید سے چھپتے ہیں۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ "أشهد" یمین ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "حَلْفُهُمْ بِاللّٰهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ اِجْتَنُّوْا بِأَيْمَانِهِمْ مِنَ الْقَتْلِ وَالْحَرْبِ"[2] یعنی ان کا اللہ کی قسم کھانا کہ وہ البتہ تم میں سے ہیں، یہ اس لیے ہے کہ اپنی قسموں کے سبب سے قتل اور حرب سے بچاؤ کریں۔ یہ جملہ مستانفہ ہے، اس سے ان کے کذب اور ان کا جھوٹ پر قسم کھانے کا بیان کرنا منظور ہے۔ جمہور نے ﴿ اَيْمَانَهُمْ ﴾ بہ فتحِ ہمزہ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی حسن رحمہ اللہ نے) بہ کسرِ ہمزہ پڑھا ہے۔[3] اس کی تفسیر سورۃ المجادلہ میں گزر چکی ہے۔

﴿ جُنَّةً ﴾ کہتے ہیں: ''ترس'' اور اس جیسی چیزوں کو، یعنی ڈھال اور ہر وہ شے جو تم کو کسی برائی سے بچائے۔ فصحاء کے کلام میں سے یہ جملہ ہے "جبة البرد" (بالضم جابہ معروف و برد بالفتح سردی) "جنة البرد"، یعنی چادر کا جبہ سردی کا بچاؤ ہے۔ ﴿ فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ یعنی انھوں نے لوگوں کو ایمان و جہاد سے منع کیا اور اطاعت کے اعمال سے روکا، یہ نبوت میں شک اور عیب جوئی کے سبب سے ہے جو اُن سے صادر ہوتے ہیں۔ یہ معنی اس "صَدَّ" کے ہیں جو صَرف، یعنی پھیرنے کے معنی میں ہے۔ یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ "صدود"، یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں داخل ہونے سے اور اس کے احکام کے قائم کرنے سے اعراض کیا۔ ﴿ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی جو نفاق اور "صَد" وہ کر رہے، بے شک وہ برا ہے۔ یہ "سَاءَ"، جاری مجرائ "بِئْسَ" ہے افادۂ ذم میں اور اس کے ساتھ ہے، پھر اس میں تعجیب کے معنی ہیں اور سامعین کے سامنے ان کے کام کا عظیم کرنا ہے۔

---

[1] تفسير النسفي (٢٤٧/٤) [2] رقم الآية (١٦) [3] فتح القدير (٣٠٦/٥)

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴾ یعنی یہ کذب وصد وقباحتِ اعمال جن کا ذکر ہوا، اس سبب سے ہے کہ وہ ظاہری طور پر زبان سے ایمان لائے، نفاق سے پھرے، باطن میں دل سے منکر ہوئے، اس بنا پر کلمۂ ﴿ ثُمَّ ﴾ ترتیبِ اخباری کے لیے ہے ایجادی کے لیے نہیں ہے۔ یا مومنوں کے لیے تو ایمان ظاہر کیا اور کافروں کے لیے کفر ظاہر کیا۔ یہ منافقوں کے کفر میں صریح ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک قوم کے حق میں نازل ہوئی جو ایمان لائے، پھر مرتد ہوگئے، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے، چنانچہ سیاق اسی کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر کی گئی۔ جمہور نے "طُبِعَ" بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی زید بن علی نے) بہ صیغۂ معروف پڑھا ہے۔ فاعل وہ ضمیر ہے جو اللہ پاک کی طرف راجع ہے۔ امام اعمش رحمہ اللہ کی قراءت "فَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ" اس پر دال ہے۔[1] چنانچہ وہ اس شے کو نہیں بوجھتے جس میں ان کی بہتری اور ہدایت ہے اور وہ ایمان کی حقیقت ہے اور اس کی اچھائی کو نہیں پہچانتے۔

﴿ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ﴾ یعنی حقیقت میں تو وہ ایسے ہیں جیسا ذکر ہوا اور ان کا ظاہر حال یہ ہے کہ جس وقت تو ان کو دیکھے تو تجھے ان کی ہیئت اور منظر اچھے لگیں، یعنی ان کی شکل وصورت ڈیل ڈول۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے جسم ایسے ہیں کہ جو کوئی انھیں دیکھے تو اسے اس تروتازگی اور رونق کے سبب میں، جو ان میں ہے، وہ بھلے لگیں۔ دیکھنے میں چکنے چپڑے، سرخ وسفید، گورے چٹے اور قوی خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی جسیم، صحیح، فصیح اور تیز زبان تھا اور اسی کی طرح منافقوں میں ایک قوم تھی، یہ لوگ مدینہ کے رؤسا تھے اور نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس شریف میں حاضر ہوا کرتے تھے اور اس میں دیواروں سے ٹک کر بیٹھتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حاضرینِ مجلس ان کے جسموں پر تعجب کرتے تھے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد عبداللہ بن ابی، جد بن قیس اور معتب بن قشیر ہیں، ان کے بڑے بڑے اجسام تھے جو خوبصورت تھے اور ان کی فصاحت تھی۔[2] یہ تو جسم اور شکل وصورت کا حال تھا۔

پھر ان کی خوش تقریری کا حال بیان فرمایا: ﴿ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ﴾ یعنی اگر وہ گفتگو کریں تیری مجلس میں تو تُو ان کی فصاحت کی وجہ سے ان کی بات پر کان رکھے اور سنے۔ ﴿ تَسْمَعْ ﴾ بہ معنی "تستمع" ہے۔ (کما قاله الخطيب) استماع گوش داشتن کو کہتے ہیں۔ اس کا صلہ بہ حرفِ لام آتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ﴾ [الأعراف: ٢٠٤] "تو تم اس کی طرف کان لگا دیا کرو۔" امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَسْمَعْ ﴾ "تَصْغٰى وَتَمِيْلُ" کے معنی کو متضمن کیا گیا ہے، یا ہر اس شخص کو جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے۔ "يسمع" کی بہ صیغۂ مجہول قراءت اس پر دال ہے۔

---

[1] فتح القدير (٣٠٦/٥) [2] تفسير القرطبي (١٢٤/١٨، ١٢٥) فتح البيان (١٤٧/١٤)

﴿ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ﴾ یہ جملہ یا تو مبتدائے محذوف کی خبر ہے: "أَيْ: هُمْ كَأَنَّهُمْ" یا تقریر ماتقدم کے لیے مستانفہ ہے کہ ان کے جسم دیکھنے والے کو تعجب میں ڈالتے ہیں اور اسے بھلے لگتے ہیں۔ ان دونوں کے قائل تو امام زمخشری رحمہ اللہ ہیں۔[1] یا محلِ نصب میں ہے بنا بر حال اور ذو الحال "قولھم" کی ضمیر ہے۔ یہ قول امام ابو البقاء رحمہ اللہ کا ہے۔[2] جمہور نے ﴿ خُشُبٌ ﴾ بہ ضمتین پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی ابو عمرو، کسائی اور قنبل رحمہم اللہ نے، اور اسی طرح سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے پڑھا ہے) بہ اسکانِ شین پڑھا ہے، اس لیے کہ اس کا واحد "خشبة" ہے، جیسے "بدنة و بدن" اور دونوں سبعیہ ہیں۔ پہلی قراء ت کو ابو حاتم رحمہ اللہ نے اور دوسری کو امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ اور کسی نے (یعنی سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے) بہ فتحتین پڑھا ہے۔[3]

﴿ مُسَنَّدَةٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ لکڑیاں اپنے غیر کی طرف ٹکائی گئی ہیں۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: "أَسْنَدْتُ كَذَا إِلٰى كَذَا" تشدید تکثیر کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منافق لوگ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں دیواروں سے ٹکے ہوئے بیٹھتے تھے تو ان کے اس طرح سے بیٹھنے کو ان لکڑیوں سے تشبیہ دی جو دیوار کے ساتھ کھڑی کی گئی اور ٹکائی گئی ہیں جو نہ کچھ سمجھیں نہ جانیں، اسی طرح یہ لوگ بھی ہیں، کیوں کہ وہ نفع دینے والے فہم اور اس علم سے خالی ہیں جس سے صاحبِ علم نفع حاصل کرتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کو موصوف بہ تمام صور کیا،[4] یعنی ان کی صورتیں مکمل ہیں۔

پھر یہ خبر دی کہ فہم اور استبصار (بصیرت) کے نہ استعمال کرنے اور جسموں کی عظمت میں وہ خشب کی طرح ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ گویا وہ کھجور کے درخت کھڑے ہوئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ اشباح بلا ارواح (روحوں کے بغیر بدن) اور اجسام بلا اَحلام ہیں۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نکلے کسی سفر میں تو لوگوں کو سختی پہنچی، یعنی تکلیف اور تنگی پہنچی۔ پس عبداللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان لوگوں پر خرچ مت کرو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں، یہاں تک کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد سے متفرق ہو جائیں اور کہا: ﴿ لَىِٕنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ﴾ پس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کے پاس آدمی بھیجا اور اس سے پوچھا تو اس نے اپنی قسم میں اجتہاد کیا (یعنی سخت قسم کھائی) اور کہا کہ "مَا فَعَلَ" یعنی اس نے وہ کام نہیں کیا، وہ بات نہیں کہی۔ چنانچہ لوگ بولے کہ زید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ بات کہی، پس میرے دل میں ایک شدت واقع ہوئی، یعنی مجھے سخت رنج ہوا اس بات سے جو انھوں نے کہی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میری تصدیق نازل فرمائی: ﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ ﴾

[1] الكشاف (٥٤٢/٤) [2] التبيان في إعراب القرآن (١٢٢٤/٢) [3] تفسير القرطبي (١٢٥/١٨) [4] معاني القرآن (١٨٦/٥)

میں۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان کو بلایا، تا کہ ان کے لیے مغفرت مانگیں تو انھوں نے اپنے سر مٹکائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ﴾۔ کہا: "كَانُوا رِجَالًا أَجْمَلَ شَيْءٍ" یعنی وہ نہایت درجہ حسین وجمیل مرد تھے۔[1] (أخرجه البخاري ومسلم وغيرهما وأخرجه عنه بأطول من هذا ابن سعد وعبد بن حميد والترمذي وصححه وابن المنذر والطبراني والحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقي)

بالجملہ جب ان کے ڈیل ڈول اور بات چیت کا ذکر ہو چکا تو ان کی جُبن اور بزدلی کا عیب بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ﴾ یعنی ہر چیخ جس کو وہ سنتے ہیں اسے اپنے ہی اوپر واقع خیال کرتے ہیں اپنی بزدلی اور دلوں پر رُعب کی وجہ سے۔ ﴿ يَحْسَبُونَ ﴾ کے مفعول ثانی میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ ﴿ عَلَيْهِمْ ﴾ ہے اور جملۂ ﴿ هُمُ الْعَدُوُّ ﴾ مستانفہ ہوگا، یہ بات بیان کرنے کے لیے ہے کہ وہ عداوت میں کامل ہیں۔ اس لیے کہ وہ ظاہر کرتے ہیں اس شے کے علاوہ جس کو چھپاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا دوسرا مفعول ﴿ هُمُ الْعَدُوُّ ﴾ ہے اور ﴿ عَلَيْهِمْ ﴾ ﴿ صَيْحَةٍ ﴾ سے متعلق ہوگا اور ضمیر جمع کی طرف خبر کے اعتبار سے آئی ہے، کیونکہ "عَدُوٌّ" کا کلمہ واحد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے ورنہ اس صورت میں اس کا حق یہ تھا کہ "هِيَ الْعَدُوُّ" ہوتا، ﴿ صَيْحَةٍ ﴾ کے اعتبار سے، یا لفظ ﴿ كُلَّ ﴾ کے اعتبار سے "هُوَ الْعَدُوُّ" ہوتا۔ پہلی وجہ زیادہ بہتر ہے۔

امام مقاتل اور سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب کوئی منادی لشکر میں ندا کرتا یا کوئی جانور چھوٹ جاتا، یا کوئی گمی ہوئی شے ڈھونڈی جاتی تو خیال کرتے کہ وہی مراد ہیں، اس رعب کی وجہ سے جو اُن کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ منافق اس خوف میں تھے کہ کہیں ان کے بارے میں وہ شے نازل ہو جائے جو اُن کے پردوں کو اٹھا دے اور ان کے خون اور مال حلال کر دے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے اپنے آپ کو بچا لیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاحْذَرْهُمْ ﴾ یعنی پس تو ان سے بچتا رہ۔ یعنی کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھ سے کسی فرصت کا قابو پا لیں، یا تیرے بھیدوں میں سے کسی پر مطلع ہو جائیں، کیونکہ وہ تو کفار دشمنوں کے جاسوس ہیں۔ مفتی ابو السعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حرفِ فاء حذر کرنے کے حکم کی ترتیب کے لیے ان کے اعدی الاعداء، یعنی سب سے بڑے دشمن ہونے پر۔[3] اس بنا پر ﴿ هُمُ الْعَدُوُّ ﴾ کا مفعول ثانی ٹھہرانا اس قبیل سے ہے جس کی نظمِ کریم مساعد نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ﴿ هُمُ الْعَدُوُّ ﴾ جملۂ مستانفہ ٹھہرا تو اس سے یہ نکلا کہ وہ سب دشمنوں سے بڑھ کر دشمن ہیں اور جب وہ ایسے سخت دشمن ہیں تو اس پر یہ بات مرتب ہوئی کہ ان سے حذر کر، کیوں کہ دشمن سے حذر کرنا ضروری ہے اور جب ﴿ عَلَيْهِمْ ﴾ ﴿ صَيْحَةٍ ﴾ سے متعلق

---

[1] صحيح البخاري (٤٦٢٠) صحيح مسلم (٢٧٧٢) سنن الترمذي (٣٣١٣) المعجم الكبير (١٨٩/٥) مستدرك الحاكم (٥٣١/٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (١٩٨/٨)

[2] تفسير القرطبي (١٢٥/١٨) [3] تفسير أبي السعود (٢٥٢/٨)

ہو گا اور ﴿ هُمُ الْعَدُوُّ ﴾ دوسرا مفعول ٹھہرے گا تو پھر ﴿ فَاحْذَرْهُمْ ﴾ کس شے پر مرتب ہو گا، کیوں کہ اس ترکیب پر سارا جملہ ان کی بزدلی بیان کرنے کے لیے ہو گا، یعنی وہ ایسے بزدل ہیں کہ مارے بزدلی کے جو چیخ ان پر واقع ہوتی ہے، وہ کسی طرح کی ہو اس کو اپنا دشمن ہی خیال کرتے ہیں، پس واقع میں ﴿ فَاحْذَرْهُمْ ﴾ اس پر مرتب نہیں ہو سکتا، اگر بات ایسی ہی ہوتی تو بجائے ﴿ فَاحْذَرْهُمْ ﴾ کے "فَلَا تبَالِ بِهِمْ" ہوتا، یعنی وہ بڑے بزدل ہیں تو تُو ان کی کچھ پروا مت کر۔

حقیقت میں مفتی صاحب مرحوم کا فرمانا بے شک ٹھیک ہے۔ بالجملہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر بددعا فرمائی، اس قول میں کہ ﴿ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ﴾ یعنی اللہ ان پر لعنت کرے۔ عرب لوگ کبھی اس کلمے کو تعجب کے طور پر بھی بولتے ہیں: "كَقَوْلِهِمْ قَاتَلَهُ اللّٰهُ مِنْ شَاعِرٍ أَوْ مَا أَشْعَرَهُ" یہ یہاں مراد نہیں ہے، بلکہ مراد ان کی مذمت اور توبیخ ہے۔ یہ اللہ پاک کی طرف سے ایک طلب ہے، اس نے اپنی ذاتِ مقدس سے یہ مطلب کیا ہے کہ ان کو ملعون اور رسوا کرے، یا یہ مومنوں کو تعلیم ہے کہ یہ الفاظ کہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی "أهلكهم" ہیں۔ یہ وہ قول ہے جس پر ابو عیسیٰ رحمہ اللہ چلے ہیں۔ ﴿ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ وہ حق سے کیسے پھیرے جاتے ہیں اور کس طرح اس سے کفر کی طرف مائل ہوتے ہیں ایمان کی حقیقت پر برہان قائم ہو جانے کے بعد۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "يَعْدِلُوْنَ عَنِ الْحَقِّ" امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کے معنی ہیں: "يَصْرِفُوْنَ عَنِ الرُّشْدِ"[1]

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝٥ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝٦ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝٧ يَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٨

اور جب ان سے کہا جائے: آؤ، رسول اللہ تمھارے لیے استغفار کریں، تو وہ (نفی میں) اپنے

[1] تفسير القرطبي (١٨/١٢٦) فتح البيان (١٤/١٤٥۔١٤٩)

سر پھیر لیتے ہیں، اور آپ انھیں دیکھتے ہیں کہ وہ تکبر کرتے ہوئے رک جاتے ہیں⑤ ان کے حق میں برابر ہے کہ آپ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں، اللہ انھیں ہرگز نہیں بخشے گا، بے شک اللہ نافرمان قوم کو ہدایت نہیں دیتا⑥ وہ وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ تم ان پر خرچ نہ کرو جو رسول اللہ کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں، اور آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں، لیکن منافق سمجھتے نہیں⑦ وہ کہتے ہیں: البتہ اگر ہم لوٹ کر مدینے گئے تو معزز ترین لوگ ذلیل ترین لوگوں کو وہاں سے نکال دیں گے، اور عزت اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے، لیکن منافق (اس حقیقت کو) نہیں جانتے⑧

ایک سفر میں دو شخص لڑ پڑے، ایک مہاجرین میں سے تھا اور ایک انصار میں سے تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کو ملا دیا۔ منافق پیٹھ پیچھے کہنے لگے کہ ہم ان کو اپنے شہر میں جگہ نہ دیتے تو ہم سے مقابلہ کیوں کرتے۔ ایک نے کہا کہ تم ہی ان کی خبر گیری کرتے ہو تو یہ لوگ رسول ﷺ کے ساتھ جمع رہتے ہیں، خبر گیری چھوڑ دو تو یہ خود ہی متفرق ہو جائیں گے۔ ایک نے کہا کہ اس سفر سے جب ہم مدینے پہنچے تو جس کا اس شہر میں زور ہے اسے چاہیے کہ بے قدروں کو نکال دے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ باتیں سنیں اور رسول اللہ ﷺ کو بتائیں۔ نبیِ کریم ﷺ نے بلایا اور پوچھا تو قسمیں کھا گئے کہ اس نے ہماری دشمنی سے جھوٹ کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔[1] انتہیٰ

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے: ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ یعنی جب مومنوں میں سے کوئی کہنے والا ان سے کہتا ہے کہ تمھارے حق میں قرآن سے نازل ہوا ہے جو کچھ کہ نازل ہوا ہے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف توبہ کرو اور تم آؤ کہ تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کا رسول ﷺ مغفرت مانگے۔ ﴿ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ ﴾ یعنی تو وہ اپنے سر ہلاتے ہیں اس بات کا ٹھٹھا کر کے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے سر استغفار سے اعراض کر کے موڑتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے اعراض اور تکبر کر کے۔ جمہور نے ﴿ لَوَّوْا ﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام نافع رحمہ اللہ نے) بہ تخفیف پڑھا ہے۔ پہلی قراءت کو امام ابو عبید رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے[2] اور دونوں سبعیہ ہیں۔

﴿ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ ﴾ یعنی اور تو دیکھے ان کو کہ اس شخص کی بات سے اعراض کرتے ہیں جس نے ان سے کہا کہ آؤ اللہ تعالیٰ کا رسول ﷺ تمھارے لیے مغفرت مانگے، یا رسول اللہ ﷺ سے اعراض کرتے ہیں۔ جملہ ﴿ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ حال ہے، اول حال کے فاعل سے، یعنی ﴿ يَصُدُّوْنَ ﴾، اس لیے کہ رویت بصری ہے، "رَأَيْتَ"

---

[1] اس کی تخریج گزشتہ آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ [2] فتح القدیر (۳۰۷/۵)

ایک مفعول کا خواہاں تھا، چنانچہ وہ ضمیر ﴿ هُمْ ﴾ ہوگیا اور ﴿ يَصُدُّوْنَ ﴾ اس سے حال ہے اور اس کی ضمیر سے یہ جملہ حال ہے۔ معنی یہ ہیں کہ دیکھے تو ان کو اس حال میں کہ رکنے والے تکبر کرنے والے ہیں، عذر کرنے اور مغفرت مانگنے سے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ ان کی بھلائی اور درستی پسند کرتے تھے اور ان کے لیے مغفرت مانگنے کو دوست رکھتے تھے اور بعض اوقات ان کے بعض قریبی رشتہ داروں نے آپ کو اس طرف بلایا۔ اس لیے اللہ پاک نے آپ کو آگاہ کیا اس بات پر کہ وہ استغفار کے لائق نہیں ہیں، کیونکہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ﴾ (جمہور نے ''أَسْتَغْفَرْتَ'' کو بہ ہمزۂ مفتوحہ بغیر مد پڑھا ہے اور ہمزۂ استفہام کو حذف کیا ہے، اس پر اعتماد کر کے ''أَمْ'' اس پر دال ہے اور یزید بن قعقاع نے بہ ہمزہ، بعد اس کے الف پڑھا ہے)[1] یعنی ان کے لیے تیرا مغفرت مانگنا اور نہ مانگنا دونوں برابر ہیں، یہ ان کو فائدہ نہ دے گا، اس لیے کہ وہ تو نفاق و کفر پر جمے ہوئے اور ہمیشگی کرنے والے ہیں۔

﴿ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہ بخشے گا جب تک کہ وہ اپنے نفاق پر جمے رہیں گے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا جو طاعت سے نکلنے میں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں منہمک ہونے میں کامل ہیں اور یہ منافق ان میں بدرجہ اولیٰ داخل ہیں۔ اس آیت سے آپ کو ان کے ایمان سے ناامید کرنا منظور ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بعض قبائح، یعنی بری باتیں ذکر فرمائی ہیں: ﴿ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ﴾ جملہ مستانفہ ہے ان کے فسق کے لیے جاری مجریٰ تعلیل ہے، یا ان کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت نہ نصیب ہونے کے لیے، یعنی وہ فاسق ہیں یا اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا، اس لیے کہ یہ لوگ وہی ہیں جو انصار میں سے اپنے اصحاب سے کہتے ہیں جو ایمان میں مخلص ہیں اور منافقوں کے ساتھ ان کی صحبت بہ حسبِ ظاہر حال ہے کہ ان لوگوں پر جو رسول اللہ ﷺ کے پاس ہیں مت خرچ کرو۔ ظاہر تو یہ ہے کہ یہ بعینہٖ ان کے قول کا بیان ہے، اس لیے کہ وہ منافق تھے، ظاہر میں آپ ﷺ کی رسالت کے اقراری تھے۔ اور اس کی کوئی حاجت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کلمہ انھوں نے استہزاء کے طور پر کہا، یا اس لیے کہ یہ کلمہ آپ پر غالب ہوگیا، حتیٰ کہ بہ منزلہ علَم یعنی نام کی طرح ہوگیا، جیسا کہ کہا گیا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انھوں نے کسی اور عبارت میں ادا کیا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے اجلال کے لیے اُس عبارت کو بدل دیا ہو۔

پھر نہی مذکور کی وجہ یہ بیان کی: ﴿ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ﴾ (''حتی'' تعلیلیہ ہے، ''أَيْ: لأجل أن ينفضوا) یعنی ان پر مت خرچ کرو، تاکہ وہ متفرق ہو جائیں اس طرح سے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اہل اور کام کی طرف چلا جائے

---

[1] فتح القدير (٣٠٨/٥)

جو اس سے پہلے اس کا شغل تھا۔ ان لوگوں سے مراد فقرائے مہاجرین ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ایک مزدور کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[1] (أخرجه ابن مردويه و الضياء في المختارة)

جمہور نے ﴿ يَنْفَضُّوْا ﴾ پڑھا ہے، "إنفاض" بہ معنی "تفرق" سے اور کسی نے (یعنی فضل بن عیسیٰ رقاشی نے) "إنفاض" سے پڑھا ہے جو اس محاورے سے ماخوذ ہے: "اِنْفَضَّ الْقَوْمُ إِذَا فَنِيَتْ أَزْدَادُهُمْ يُقَالُ: نَفَضَ الرَّجُلُ دُعَاءَهُ مِنَ الزَّادِ فَانْفَضَّ"[2]

اور زید بن ارقم اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے "حَتّٰى يَنْفَضُّوْا مَنْ حَوْلَهُ" پڑھا ہے۔[3] پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی وسعتِ ملک کی خبر دی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ یعنی ان مہاجرین وغیرہم کا رزاق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس لیے کہ رزق کے خزانے اسی کے ہیں۔ چنانچہ وہی دیتا ہے جس کو چاہتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور روکتا ہے جس سے چاہتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔

خزانے ان لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں ہیں۔ یہ ان کے دعوے کا رد ہے جو انھوں نے کیا تھا کہ ان کے خرچ نہ کرنے سے ایسا ہوگا کہ فقراء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے علاحدہ اور متفرق ہو جائیں گے۔ یہ جملہ حالیہ ہے، یعنی انھوں نے تو وہ بات کہی جو مذکور ہوئی اور حال یہ ہے کہ رزق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، کوئی کسی شے کے روک لینے پر قادر نہیں ہے، نہ تو اس شے میں سے جو اس کے ہاتھ میں ہے اور نہ اس چیز میں سے جو کسی اَور کے ہاتھ میں ہے۔ ﴿ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴾ یعنی منافق اس بات کو نہیں سمجھتے اور نہ یہ جانتے ہیں کہ روزیوں کے خزانے اللہ عزوجل کے ہاتھ میں ہیں اور وہی باسط ہے، قابض ہے، معطی اور مانع ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ایک اور بری اور قبیح بات کا ذکر کیا جو انھوں نے کہی تھی، چنانچہ فرمایا: ﴿ يَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ ﴾ یہ بات کہنے والا عبداللہ بن ابی منافقوں کا سردار ہے۔ "أَعَزُّ" سے اس کی مراد خود وہ اور اس کے ساتھی ہیں اور "أَذَلُّ" سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہی ہیں۔ رجوع سے مراد ان کا اس غزوے سے لوٹنا ہے۔ قول کی نسبت جو منافقوں کی طرف کی، حالانکہ وہ کہنے والا ان میں سے ایک فرد تھا، یعنی عبداللہ بن ابی تو اس لیے کہ وہ منافقوں کا سردار اور صاحبِ امر تھا، وہ اس سے راضی تھے اور جو وہ کہتا تھا اس کے حکم کو سننے اور ماننے والے تھے۔

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ سفیان نے کہا: خیال یہ ہے کہ وہ غزوۂ بنی المصطلق تھا، چنانچہ مہاجرین میں سے ایک شخص نے انصار میں سے ایک شخص کی دُبر کو اپنے ہاتھ سے مارا، پھر مہاجر نے کہا: "يَا لَلْمُهَاجِرِيْنَ" (لام مفتوح استغاثے کا ہے، فریاد رسی چاہنے کے وقت اس کو بولتے ہیں)

---

[1] الدر المنثور (۱۷۶/۸) [2] فتح القدير (۳۰۹/۵) [3] الدر المنثور (۱۷۶/۸)

اور انصاری نے کہا: "یَا لَلْاَنْصَارِ" چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اس کو سنا تو فرمایا کہ یہ جاہلیت کی پکار کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کی کہ مہاجروں میں سے ایک شخص نے انصار کے ایک شخص کی دُبر کو اپنے ہاتھ سے مارا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((دَعُوْهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ)) یعنی جاہلیت کی پکار کو چھوڑو جو "یا لفلان" کہہ کر ہوتی ہے، چنانچہ وہ گندی ہے، یعنی شرعی طور پر مذموم ہے، اس سے اس طرح اجتناب کیا جاتا ہے جیسے گندگی سے کرتے ہیں۔

چنانچہ عبداللہ بن ابی نے اس کو سنا تو کہا کہ کیا واقعی انھوں نے اس کام کو کیا ہے۔ "وَاللّٰهِ لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ" پھر یہ بات نبی اکرم ﷺ کو پہنچی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے چھوڑیں کہ میں اس منافق کی گردن ماروں تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسے چھوڑ دے، لوگ ایسا نہ کہیں کہ محمد اپنے اصحاب کو قتل کرتا ہے۔[1] (أخرجه البخاري و مسلم وغيرهما زاد الترمذي فقال له ابنه عبدالله بن عبدالله: والله لا تنقلب حتى تقر أنك الذليل و رسول الله العزيز ففعل)

یہ غزوہ سنہ ۴ ہجری میں تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ۶ ہجری میں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بات کہنے والے پر رد کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ یہ جملہ حالیہ ہے، یعنی انھوں نے تو وہ بات کہی جو مذکور ہے اور حال یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کو ایک طرح کی بصیرت ہے، وہ جانتا ہے کہ قوت اور غلبہ اللہ وحدہ کے لیے ہے اور اس کے رسولوں اور صالح بندوں کے لیے ہے جن پر اس کا افاضہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عزت تو اس کا قہر اور اپنے دشمنوں پر غلبہ ہے اور اس کے رسول ﷺ کی عزت اس کے دین کا سارے دینوں پر غالب کرنا ہے اور مومنوں کی عزت اللہ تعالیٰ کا ان کی ان کے دشمنوں پر مدد کرنا ہے۔

بعض صالحات سے مروی ہے اور وہ ہیئتِ رثہ میں تھیں، یعنی پرانے کپڑے پہنے ہوئے بدحال تھیں۔ کہا: کیا میں اسلام پر نہیں ہوں اور یہ وہ عزت ہے جس کے ساتھ کسی طرح کی ذلت نہیں ہے اور وہ غنا ہے جس کے ساتھ کسی طرح کی فقیری نہیں۔ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے عرض کی: لوگ یہ زعم کرتے ہیں کہ آپ میں تیہیہ ہے، یعنی کبر۔ فرمایا، یہ تیہیہ نہیں ہے اور لیکن یہ عزت ہے اور یہ آیت پڑھی۔[2] اللهم كما جعلت العزة للمؤمنين على المنافقين فاجعل العزة للعادلين من عبادك وأنزل الذلة على الجائرين الظالمين.

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی لیکن منافق اس شے کو نہیں جانتے جس میں فائدہ ہے کہ اس کو کریں اور جس میں نقصان ہے کہ اس سے بچیں، بلکہ وہ تو اپنے فرطِ جہل اور مزید حیرت کے مارے چوپایوں کی طرح ہیں اور اس لیے کہ ان کے دلوں پر مہر کی گئی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري (٤٦٢٢) صحيح مسلم (٢٥٨٤) سنن الترمذي (٣٣١٥) [2] تفسير النسفي (٢٤٩/٤)

نکتہ:

اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت کو ﴿ لَا یَفْقَهُوْنَ ﴾ سے ختم فرمایا اور اس آیت کو ﴿ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾ سے، اس کی یہ وجہ ہے کہ پہلی آیت متصل ہے ﴿ وَ لِلّٰهِ خَزَآىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ سے اور ان کی معرفت میں ایک ایسا غموض (باریک نکتہ) ہے جو فطانت اور فقہ کی طرف محتاج ہے تو وہاں ان سے فقہ کی نفی مناسب ہے اور دوسری آیت ﴿ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ ﴾ سے متصل ہے اور اس کی معرفت میں زائد غموض ہے جو علم کی طرف محتاج ہے۔ چنانچہ یہاں ان سے علم کی نفی مناسب ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہیں کہ اللہ عزوجل اپنے دوستوں کو عزت دینے والا ہے اور اپنے دشمنوں کو ذلیل کرنے والا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حاصل یہ ہے کہ جب منافقوں نے اپنے فریق کے لیے مدینے سے مومنوں کا نکال دینا ثابت کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رد کرنے میں عزت کی صفت ان کے دوسرے فریق کے لیے ثابت فرمائی۔ یہ فریق اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین ہیں۔ شرح جمع الجوامع میں ہے منجملہ قوادح علت قول بالموجَب بہ فتحِ جیم، یعنی دلیل کا تسلیم کر لینا مع بقائے نزاع کے اس طرح سے کہ معترض عدمِ استلزامِ دلیل کو واسطے محلِ نزاع کے ظاہر کرے۔ اس کا شاہد ﴿ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ ﴾ ہے جو ﴿ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ﴾ کے جواب میں ہے۔[1]

منافقوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار اور مسلمانوں پر خرچ کرنے سے اعراض:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین ۔علیہم لعائن اللہ۔ کی خبر دیتا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تمھارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغفرت مانگیں تو رکتے ہیں اور اس بات سے اعراض کرتے ہیں جو ان کو کہی گئی، اس سے تکبر کر کے اور اس کو حقیر جان کر۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ وَ رَاَیْتَهُمْ یَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴾

پھر اللہ پاک نے اس پر ان کو بدلہ دیا تو فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ﴾ جیسا کہ سورۃ التوبہ میں فرمایا ہے۔[2] اس پر وہاں کلام گزر چکا ہے اور اس بارے میں جو احادیث مروی ہیں، وہ مذکور ہو چکی ہیں۔ امام ابن ابی عمر عبدی کہتے ہیں (یعنی ﴿ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ ﴾ کی تفسیر میں) کہ سفیان نے اپنا چہرہ اپنی دائیں جانب پر پھیرا اور اپنی آنکھ سے بطور شزر (شزر غصے کے مارے یا تکبر کے مارے دنبال چشم سے دیکھنے کو کہتے ہیں) دیکھا، پھر کہا: وہ یہ ہے۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

سلف میں سے کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ کل سیاق، یعنی آیت کا سیاق عبداللہ بن ابی سلول کے حق میں نازل ہوا ہے۔ پھر بہت حدیثیں بہ روایتِ محمد بن اسحاق و امام احمد و ابن ابی حاتم ذکر کی ہیں۔ ان میں سے یہ ہے کہ

---

[1] فتح البیان (١٤/١٤٩۔١٥٣) [2] رقم الآیة (٨٠) [3] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٧٢)

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے عاصم بن عمر بن قتادہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عبداللہ بن ابی کو جب اپنے باپ کے حال کی خبر پہنچی جو کچھ کہ ہوا تھا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! بے شک شان یہ ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ اس بات کی وجہ سے جو آپ کو اس سے پہنچی ہے عبداللہ بن ابی کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں، چنانچہ اگر آپ ایسا کرنے والے ہیں تو آپ مجھے اس کا حکم دیں تو میں آپ کے پاس اس کا سر اٹھا لاؤں۔ چنانچہ قسم ہے اللہ کی! البتہ یقیناً قبیلہ خزرج یہ بات جان چکا ہے کہ اپنے باپ کے ساتھ مجھ سے زیادہ نیکی کرنے والا اور کوئی نہیں۔ بے شک میں اس سے ڈرتا ہوں کہ آپ میرے علاوہ کسی اور کو اس کے قتل کا حکم دے دیں اور وہ اسے قتل کرے اور مجھے میرا نفس نہ چھوڑے کہ میں عبداللہ بن ابی کے قاتل کی طرف نظر کروں کہ وہ لوگوں میں چل پھر رہا ہے۔ پھر میں اسے قتل کروں تو ایک مومن کو ایک کافر کے بدلے میں قتل کروں، پھر میں نار میں داخل ہوں۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلکہ ہم اس کے ساتھ نرمی کریں گے اور اس کی صحبت اچھی کریں گے جب تک وہ ہمارے ساتھ باقی رہے گا۔[1] امام عکرمہ اور ابن زید رحمہما اللہ وغیرہما نے ذکر کیا ہے کہ جب لوگ مدینے کی طرف لوٹے تو یہ عبداللہ بن عبداللہ مدینے کے دروازے پر ٹھہرا اور اپنی تلوار میان سے کھینچ لی اور لوگ اس کے پاس سے گزرنے لگے اور جب اس کا باپ عبداللہ بن ابی آیا تو اس سے اس کے بیٹے نے کہا: پیچھے ہٹ جا، تو وہ بولا: تجھے کیا ہو گیا ہے تیرا برا ہو! چنانچہ اس نے کہا کہ تو یہاں سے نہیں گزرے گا جب تک کہ رسول اللہ ﷺ تیرے لیے اجازت نہ دیں، بے شک وہ عزیز ہیں اور تو ذلیل ہے، پھر جب رسول اللہ ﷺ آئے اور آپ ﷺ تو لشکر کے آخری ٹکڑے میں چلتے تھے تو عبداللہ بن ابی نے اپنے بیٹے کی شکایت آپ ﷺ سے کی تو اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: واللہ! اے اللہ کے رسول! وہ اس میں داخل نہ ہوگا یہاں تک کہ آپ اس کے لیے اذن دیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے لیے اذن دیا۔ پھر عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: خبردار! اب جب کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرے لیے اذن دے دیا تو اب تو گزر۔[2]

ابو ہارون مدنی کہتے ہیں: "قال أبو بكر عبد الله ابن الزبير الحميدي في مسنده: حدثنا سفيان ابن عيينة حدثنا أبو هارون المدني... الخ" کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول نے اپنے باپ سے کہا: واللہ! تو کبھی مدینے میں داخل نہ ہوگا یہاں تک کہ تو کہے کہ رسول اللہ ﷺ اَعَز ہیں اور میں اَذَل ہوں۔ کہا: اور نبی اکرم ﷺ کی طرف آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! بے شک شان یہ ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ میرے باپ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! میں نے اس کی ہیبت کے مارے کبھی اس کے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا اور اگر آپ چاہیں کہ میں اس کا سر آپ کے پاس لے آؤں تو البتہ آپ کے پاس لے آؤں، بے شک میں یہ مکروہ رکھتا ہوں کہ اپنے باپ کے قاتل کو دیکھوں۔[3] بالجملہ

---

(1) السيرة النبوية لابن هشام (٢٥٥/٤) یہ روایت مرسل ہے۔ (2) تفسير الطبري (٤٠٣/٢٣-٤٠٦)

(3) مسند الحميدي (٥٢٠/٢) تفسير ابن كثير (٤٧٢/٤-٤٧٧)

جب اللہ پاک منافقوں کی قباحتوں کا ذکر کر چکا تو مومنوں کے خطاب کی طرف رجوع ہوا، ان کو اپنے ذکر کی طرف ترغیب دیتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

اے ایمان والو! تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تمھیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں اور جو کوئی یہ کام کرے تو وہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں⑨ اور تم اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھیں رزق دیا ہے، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آئے، پھر وہ کہے: اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ مدت تک اور کیوں نہ مہلت دی کہ میں صدقہ کرتا اور میں صالحین میں سے ہو جاتا⑩ اور اللہ کسی کو ہرگز مہلت نہیں دیتا، جب اس کی اَجل آجائے اور اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو⑪

موت سے پہلے پہلے صدقہ کرلو:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو حکم دیتا ہے کہ بکثرت اس کی یاد کریں اور ان کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ ان کے اموال اور اولاد ان کو اس سے باز رکھیں اور یہ خبر دیتا ہے کہ جو کوئی اپنے رب تعالیٰ کی طاعت اور ذکر کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی کی متاع اور زینت میں مشغول ہوا تو بے شک وہ ان زیاں کاروں میں سے ہے جو قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو ہار بیٹھیں گے۔ پھر ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس کی طاعت میں خرچ کیا کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ﴾ چنانچہ موت آجانے کے وقت ہر کمی کرنے والا نادم ہوگا اور طولِ مدت کا سوال کرے گا، گو ذرا سی ہی سہی، تاکہ رضا کا طالب ہو اور جو کچھ گزر چکا ہے اس کی تلافی کرے، حالانکہ یہ بات دور ہوگئی جو ہونا تھا وہ ہوگیا اور جو شے آنے والی تھی وہ آگئی۔ کسی نے (ناظم اس کے سید شاہ محمد سلیم بدخشانی سلمہ اللہ تعالیٰ ہیں۔ سید زکریا بخاری وارد بھوپال کی زبانی

۱۹رشوال ۱۳۱۵ہجری کو سنی) کیا خوب کہا ہے:

جہاں افسانہ سامان است تو در خواب اے غافل
نمی بندی چرا احرامِ طوفِ آستانِ دل
غرور آوارۂ طولِ امل اے بے خبر منشین
بزن ہوئے چومستانِ حق نہ از ما سوا بگسل

''اے غافل! دنیا ناپائیدار اسباب کی جگہ ہے۔ تو دل کے آستانے کا طواف کرنے کے لیے احرام کیوں نہیں باندھتا۔ اے لمبی لمبی امیدوں کے دھوکے میں گم کردۂ راہ! بے خبر نہ بیٹھ۔ حق (اللہ) کے متوالوں کی مانند اللہ تعالیٰ کے نام کا نعرہ مار لے اسی کو پکار اور اس کے سوا کسی سے متاثر مت ہو۔''

بالجملہ ہر شخص اپنی تفریط وکمی کے مطابق نادم ہوگا، رہے کفار تو ان کا ویسا حال ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴾ [إبراھیم: ٤٤] ''اور (اے نبی!) لوگوں کو اس دن سے ڈرائیں جب انھیں عذاب آلے گا تو ظالم کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی مدت تک مہلت دے (تاکہ) ہم تیری دعوت قبول کریں اور رسولوں کی اتباع کریں۔ (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تمھارے لیے کوئی زوال نہیں؟'' نیز فرمایا: ﴿ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٩٩۔ ١٠٠] ''حتی کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے گی تو وہ کہے گا: اے میرے رب! مجھے واپس بھیج۔ تاکہ میں اس (دنیا) میں، جسے میں چھوڑ آیا ہوں، نیک عمل کروں، ہرگز نہیں! بے شک یہ ایک بات ہے جو وہ کہنے والا ہے۔ اور ان کے آگے پردہ ہے اس دن تک جب وہ (دوبار) اُٹھائے جائیں گے۔''

پھر فرمایا: ﴿ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی اجل کے آجانے کے بعد مہلت نہیں دیتا اور وہ سب سے بڑھ کر اس شخص کا علم رکھنے والا اور خبر رکھنے والا ہے جو اپنے قول اور سوال میں سچا ہے، اس سے کہ اگر وہ لوٹایا جاتا تو وہ دوبارہ بدتر حال کی طرف عود کرتا اس حال سے جس پر وہ تھا، اس لیے یوں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے عن ضحاک بن مزاحم عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے، فرمایا: جس شخص کے پاس اتنا مال ہو جو اس کو حج بیت اللہ کے لیے پہنچا دے، یا اس پر اس میں زکات واجب ہو اور اس نے نہ کیا تو وہ موت کے وقت رجعت، یعنی دوبارہ لوٹائے جانے کا سوال کرے گا، اس پر ایک شخص بولا: اوابن عباس! اللہ سے ڈرو اس لیے کہ رجعت کا سوال تو صرف کفار کریں گے تو فرمایا: میں ابھی اس بارے میں تم پر قرآن پڑھتا

ہوں: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ ... إلى قوله ... وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (فتح البیان میں اس کے بعد ہے: أخرجه الترمذي و عبد بن حميد و ابن المنذر و ابن أبي حاتم والطبراني و ابن مردويه و الحسن ابن أبي الحسن في كتاب منهاج الدين إلىٰ قوله الموت مرفوعاً)

اس شخص نے کہا: پھر کیا شے زکات کو واجب کرتی ہے؟ کہا: جبکہ مال دوسو کو یا اس سے زیادہ کو پہنچے۔ کہا: پھر حج کو کیا شے واجب کرتی ہے؟ فرمایا: زاد و بعیر، یعنی راہ خرچ و سواری۔ پھر ترمذی نے کہا ہے: حدثنا عبد بن حُميد حدثنا عبد الرزاق عن الثوري عن يحيىٰ بن أبي حية وهو ابن جناب الكلبي عن الضحاك عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبي ﷺ بنحوه ثم قال: وقد رواه سفيان بن عيينة وغيره عن أبي جناب الكلبي عن الضحاك عن ابن عباس رضی اللہ عنہما من قوله وهو أصح وضعف أبا جناب الكلبي.[1] قلت و رواية الضحاك عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فيها انقطا ع والله أعلم.

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے نزدیک عمر کی زیادتی ہونے کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تاخیر نہیں دیتا جب اس کی اجل آجائے اور عمر میں جو زیادت ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو ذریت صالحہ عطا فرمائے کہ وہ اس کے لیے دعا کریں تو ان کی دعا اس کو قبر میں لاحق ہو، یعنی فائدہ پہنچائے۔[2] آخر تفسير سورة المنافقين ولله الحمد والمنة وبه التوفيق والعصمة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ اے ایمان والو! نہ مشغول کریں تم کو تمھارے مال اس طرح سے کہ ان میں تصرف کرو اور ان کے کام کی تدبیر میں سعی و کوشش بجا لاؤ، اس طرح سے کہ ان کو بڑھاؤ، ان کے نتائج کے طالب ہو اور ان کا اہتمام کرو اور نہ اولاد تمھاری کہ ان سے خوش ہو ان پر شفقت کرو ان کے خرچ وغیرہ کا بندوبست کرو۔ اللہ پاک نے مومنوں کو اس سے ڈرایا کہ دھوکا کھانے میں منافقوں کے مشابہ بنیں اور ان لوگوں جیسے اخلاق و عادات اپنائیں جن کو ان کے اموال و اولاد نے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دیا۔

ذکر سے مراد اسلام کے فرائض ہیں۔ (قاله الحسن) امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ پانچوں نمازیں ہیں۔[3] کسی

---

① سنن الترمذي (٣٣١٦) مسند عبد بن حميد (٢٣١/١) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٧/١٠) المعجم الكبير (١١٤/١٢) فتح البيان (١٥٥/١٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ضحاک رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے، نیز ''یحییٰ بن ابی حیہ'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٦٤١)

② تفسير ابن كثير (٤٧٨،٤٧٧/٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ ③ تفسير القرطبي (١٢٩/١٨)

نے کہا ہے کہ قرآن شریف کی قراءت ہے۔ کسی نے کہا کہ حج اور زکات ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ذکر کا دوام کرنا۔ کسی نے کہا کہ یہ خطاب منافقوں کو ہے، ان کو ایمان کے ساتھ موصوف اس لیے کیا کہ وہ ظاہر میں ایمان لائے ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبي ﷺ اس کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا: وہ میری امت سے ان کے صالح عباد ہیں، نہیں مشغول کرتی ان کو کوئی تجارت اور نہ بیع اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اور پانچوں مفروض نمازوں سے۔[1] (أخرجه ابن مردويه)

﴿ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ یعنی اور جو کوئی دنیا کے ساتھ دین سے مشغول ہو، یعنی غافل ہو اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے باز رہے تو وہی ہیں جو اپنی تجارت میں کامل ٹوٹا پانے والے ہیں، اس لیے کہ باقی رہنے والی عظیم چیز کو فنا ہونے والی حقیر چیز کے عوض بیچ ڈالا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: « اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ وَمَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا إِلَّا ذِكْرُ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ وَعَالِمٌ وَمُتَعَلِّمٌ »[2] (أخرجه الترمذي) (موالاة بہ معنی محبت ہے، یعنی دنیا ملعون ہے اور وہ شے ملعون ہے جو دنیا میں ہے مگر اللہ کا ذکر اور وہ شے جس کو اللہ نے محبوب رکھا ان چیزوں میں سے جو دنیا میں جاری ہوتی ہیں اور عالم اور متعلم۔ اس کے سوا اور معنی بھی ہیں۔ ابن ماجہ میں بہ نصب ہر دو وتکرار "أو" ہے۔ مجمع البحار میں فرمایا: ظاہر یہی ہے[3] اور جامع الاصول و ترمذی میں بہ رفع ہے ان معنوں میں کہ "لا يحمد فيها إلا ذكر الله وعالم ومتعلم")

یہ تو بدنی عبادت کا ذکر تھا، اب مالی عبادت کا حکم فرمایا: ﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ یعنی اس روزی میں سے خرچ کرو جو ہم نے تم کو دی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ مراد خیر کے کاموں میں خرچ کرنا ہے، عام طور پر وہ کوئی سی خیر ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ زکاتِ مفروضہ مراد ہے۔ کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے، یعنی اس شے کا کچھ حصہ جو ہم نے تم کو دی ہے، اسے خیر کے راستوں میں خرچ کرو۔ یہ جو فرمایا کہ ہم نے جو تم کو روزی دی ہے، اس میں سے خرچ کرو اور یوں نہ کہا کہ روزی میں سے کچھ خرچ کرو، بلکہ رزق کی نسبت اپنی ذاتِ مقدس کی طرف فرمائی تو اس سے اس حکم کی بجا آوری کی طرف زیادہ توجہ دلانا منظور ہے، اس لیے کہ رزق تو سب کا سب اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس کے باوجود ان سے اس کا کچھ حصہ خرچ کرنے پر اکتفا فرمایا۔

﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ﴾ یعنی خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے، اس طرح سے کہ موت کے اسباب اور مقدمات و امارات اس پر نازل ہوں اور وہ اس کی علامات اور دلائل کا مشاہدہ کر لے اور خرچ کرنا اس پر متعذر ہو جائے، یعنی مشکل ہو جائے۔ مفعول کو فاعل سے پہلے اہمیت کے لیے رکھا ہے۔

---

[1] الدر المنثور (۱۷۹/۸)
[2] سنن الترمذي (۲۳۲۲) سنن ابن ماجه (٤١١٢) صحيح الجامع (١٦٠٩)
[3] مجمع بحار الأنوار (١١٥/٥)

﴿ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ یعنی جب اس پر موت نازل ہوتو اس وقت اپنے رب کو پکار کر کہے: اے میرے رب! تو نے کیوں میری موت تھوڑی دیر کے لیے موخر نہیں کی اور مجھے مہلت نہیں دی، اتنی دیر کے لیے کہ میں اس میں اس چیز کی تلافی کر لیتا جو مجھ سے فوت ہوگئی، یعنی میں اپنے مال سے خیرات کرتا اور زکات دیتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا۔ (کافر کہے گا تو صالحین کے معنی مومنین ہوں گے اور مومن فاسق کہے گا تو صالحین کے معنی فاسقین کی ضد ہوں گے)۔

﴿ لَوْلَآ ﴾ بہ معنی "هَلَّا" ہے جس کے معنی تحضیض کے ہیں۔ یہ اس فعل کے ساتھ خاص ہے جس کا لفظ تو ماضی ہوتا ہے اور مضارع کے معنی میں ٹھہرتا ہے جس طرح یہاں ہے، کیونکہ زمانہ ماضی میں تاخیر طلب کرنے کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ یا یوں کہو کہ حرفِ "لَا" زاید ہے اور "لَو" تمنی کا ہے۔ کلامِ کشاف کا مقتضا یہ ہے کہ "لَوْ لَا" بہ معنی "هَل" استفہامیہ ہے،[1] لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

جمہور نے ﴿ فَاَصَّدَّقَ ﴾ کو بہ ادغام پڑھا ہے، تاء کو صاد میں ادغام کیا ہے۔ اس کا نصب بنا بر جواب تمنی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ لَوْلَآ ﴾ میں حرفِ "لَا" زاید ہے، اصل "لَوْ أَخَّرْتَنِي" ہے۔ کسی نے (یعنی سیدنا ابی، ابن مسعود رضی اللہ عنہما اور امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے) "فَأَتَصَدَّقَ" بغیر ادغام بنا بر اصل پڑھا ہے۔ ﴿ اَكُنْ ﴾ کو جمہور نے بہ جزم پڑھا ہے۔ ﴿ فَاَصَّدَّقَ ﴾ کے محل پر عطف کیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا: "إِنَّ أَخَّرْتَنِ أَصَّدَّقَ وَأَكُنْ" امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں: "هَلَّا أَخَّرْتَنِي" اور "أَكُنْ" کا جزم "فَأَصَّدَّقَ" کے موضع پر ہے، اس لیے کہ وہ اس معنی پر ہے: "إِنَّ أَخَّرْتَنِ أَصَّدَّقَ وَأَكُنْ" ابوعلی فارسی اور ابن عطیہ رحمہما اللہ وغیرہما نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے خلیل سے حکایت کیا ہے کہ یہ جزم بنا بر توہم شرط ہے جس پر تمنی دال ہے اور امام سیبویہ رحمہ اللہ نے اس کو قولِ زہیر کا نظیر ٹھہرایا ہے:

بَدَا لِيَ أَنِّي لَسْتُ بِمُدْرِكِ مَا مَضٰى وَلَا سَابِقٍ شَيْئًا إِذَا كَانَ جَائِيًا

یعنی مجھے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ میں اس شے کو پانے والا نہیں ہوں جو گزر گئی اور نہ سبقت کرنے والا ہوں، کسی شے سے جب کہ وہ آنے والی ہو۔

یہاں "ولا سابق" کو جر دیا ہے "مدرك" پر عطف کر کے جو "ليس" کی خبر ہے، اس بنا پر کہ اس میں زیادتِ باء کا توہم ہے۔ کسی نے (یعنی امام ابوعمرو، ابن محیصن اور مجاہد رحمہم اللہ نے) "وأكون" بہ نصب پڑھا ہے۔ ﴿ فَاَصَّدَّقَ ﴾ پر معطوف کیا ہے اس کی وجہ ظاہر ہے۔ لیکن امام ابوعبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ﴿ وَاَكُنْ ﴾ کو بغیر واو دیکھا ہے اور کسی نے (یعنی امام عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے) "وَأَكُونُ" بہ رفع بنا بر

[1] الكشاف (٤/٥٤٦)

استیناف ''أَيْ: وَأَنَا أَكُوْنُ'' پڑھا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ کی تفسیر میں فرمایا: ''أَحُجَّ''[2] (أخرجه ابن المنذر) بالجملہ پھر اللہ تعالیٰ نے اس تمنا کرنے والے کا جواب ارشاد فرمایا: ﴿ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ موت سے ہرگز کسی نفس کو مؤخر نہ کرے گا، وہ کوئی سا نفس ہو، جبکہ اس کی آخر عمر آ پہنچی جو لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے اور جن نفوس کو یہ نفی شامل ہے۔ انہیں میں وہ نفس بھی شامل ہے جو یہ الفاظ کہنے والا ہے اور وہ بھی تاخیر نہ دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو، یعنی اگر وہ شخص دنیا کی طرف پھیر لایا جاتا اور اس کا سوال مان لیا جاتا تو وہ نہ حج کرتا نہ زکات دیتا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ خطاب ہر خیر و شر کرنے والے کے لیے ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے۔ جمہور نے ﴿ تَعْمَلُوْنَ ﴾ کو بہ تائے فوقیہ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی ابوبکر عن عاصم وسلمی نے) بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے[3] اور ہر ایک کی ایک وجہ ہے۔

فائدۂ نفیسہ:

اہلِ علم کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے اور اس کے دامن دراز ہوئے ہیں اور اس کی بحثوں کی اس بات میں شاخیں پھوٹی ہیں کہ اس کے درمیان کہ جو کچھ وارد ہوا ہے، تعارض آ پڑا ہے کہ قضائے ازلی اللہ عزوجل کی طرف سے نہ متغیر ہوتی ہے نہ بدلتی ہے اور اس کی تعبیر ام الکتاب سے اور اس آیت سے کی گئی ہے: ﴿ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ﴾ [الرعد: ٤١] ''کوئی اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا نہیں۔'' اور اس آیت سے: ﴿ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ ﴾ [ق: ٢٩] ''میرے ہاں بات بدلتی نہیں ہے۔'' اور اس کے درمیان کہ جو ارشاد ہوا ہے کہ دعائیں مانگا کرو اور اللہ عزوجل سے خیر طلب کیا کرو اور شر اور ضرر کا دفع اور رفع چاہا کرو اور باقی مطالب میں جن کو بندے اپنے رب سبحانہ سے طلب کرتے ہیں:

1. جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ نہیں پھیرتی قضا کو مگر دعا اور زیادہ نہیں کرتی عمر میں مگر بر، یعنی نیکی۔[4] (أخرجه الترمذي من حديث سلمان وحسنه وابن حبان وصححه والحاكم وصححه والطبراني في الكبير والضياء في المختارة)

2. اسی کے مثل سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی حدیث ہے ان الفاظ میں کہ نہیں پھیرتی قدر کو مگر دعا اور نہیں زیادہ کرتا عمر میں مگر برّ اور بے شک مرد البتہ محروم ہوتا ہے رزق سے اس گناہ کے سبب جس کو وہ پہنچتا ہے۔[5]

3. اس حدیث شریف کی طرح کہ « لَا يُغْنِيْ حَذَرٌ مِنْ قَدَرٍ »یعنی قدر سے بچنا کام نہیں آتا اور دعا نفع دیتی ہے

---

[1] فتح القدير (٣١٠/٥) [2] الدر المنثور (١٨٠/٨) [3] تفسير القرطبي (١٣١/١٨)

[4] سنن الترمذي (٢١٣٩) السلسلة الصحيحة (١٥٤)

[5] سنن ابن ماجه (٩٠) اس کی سند میں ''عبداللہ بن ابی الجعد'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع: ١٤٥٢) اس حدیث کا آخری جملہ (اور بے شک البتہ مرد محروم ہوتا ہے) ہی ضعیف ہے، البتہ پہلے جملے کی تائید تو گذشتہ روایت بھی کرتی ہے۔

اس شے سے جو نازل ہوئی اور اس شے سے جو نازل نہیں ہوئی اور بے شک بلا البتہ نازل ہوتی ہے، پھر اس کو دعا ملتی ہے تو دونوں باہم الجھتی رہتی ہیں قیامت کے دن تک۔[1] (أخرجه الحاكم في المستدرك والبزار والطبراني في الأوسط والخطيب، قال الحاكم: صحيح الإسناد من حديث عائشة مرفوعاً وقال في مجمع الزوائد: رواه أحمد وأبو يعلىٰ بنحوه والبزار والطبراني في الأوسط ورجال أحمد وأبي يعلىٰ وأحد إسنادي البزار رجاله رجال الصحيح غير علي بن الرفاعي وهو ثقة وقد ضعف هذا الحديث بزكريا بن منظور كما ذكره الشوكاني رحمه الله في شرحه للعدة)

(4) اسی جملے سے سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث ہے کہ بے شک تمھارا رب بڑا شرم کرنے والا ہے، کریم ہے اپنے بندے سے شرماتا ہے، جب اس نے اپنے ہاتھ اٹھائے کہ ان کو خالی پھیر دے۔[2] (أخرجه أبو داود والترمذي وابن ماجه وابن حبان وصححه وأخرجه أيضاً الحاكم وقال: حديث صحيح علىٰ شرط الشيخين ولم يخرجاه وله شاهد صحيح ثم رواه من حديث أنس رضي الله عنه مرفوعاً) بے شک تمھارا رب رحیم ہے، بڑا شرمانے والا ہے، کریم ہے اپنے بندے سے شرماتا ہے کہ وہ اس کی طرف اپنے ہاتھ اٹھائے، پھر وہ ان میں کوئی خیر نہ ڈالے۔[3]

(5) اسی جملے سے یہ حدیث شریف ہے: مت عاجز ہو دعا میں، بے شک حال یہ ہے کہ ہرگز کوئی دعا کے ساتھ ہلاک نہیں ہوتا۔[4] (أخرجه ابن حبان من حديث أنس والحاكم في المستدرك وقال: صحيح الإسناد والضياء في المختارة وقد رد الشوكاني في شرحه للعدة على من ضعفه)

(6) اسی جملہ سے یہ مرفوع حدیث ہے کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون ہے اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔[5] (أخرجه الحاكم في المستدرك من حديث أبي هريرة رضي الله عنه وقال: صحيح الإسناد وأخرجه أبو يعلىٰ من حديث علي مرفوعاً) کیا میں تم کو وہ شے نہ بتاؤں جو تم کو تمھارے دشمنوں سے نجات دے اور تمھارے لیے تمھاری روزیاں برسا دے۔ تم اپنی رات میں اور اپنے دن میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، بے شک دعا مومن کا ہتھیار ہے۔[6]

(7) اسی جملے سے یہ حدیث شریف ہے: نہیں ہے کوئی مسلمان کہ وہ کسی مسئلے میں یعنی سوال میں اپنے چہرے کو اللہ تعالیٰ کے لیے تھکا دے مگر وہ اس کو عطا فرمائے یا تو یہ کہ وہ اس کو فوری طور پر دے یا اس کو اس کے لیے رکھ

---

(1) مستدرك الحاكم (٦٦٩/١) اس کی سند میں ''زکریا بن منظور'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٦٧٦٤)

(2) سنن أبي داود (١٤٨٨) سنن الترمذي (٣٥٥٦) سنن ابن ماجه (٣٨٦٥) مستدرك الحاكم (١٧٥٧)

(3) مستدرك الحاكم (٦٧٥/١) صحيح الجامع (١٧٦٨)

(4) صحيح ابن حبان (١٥٢/٣) مستدرك الحاكم (٦٧١/١) اس کی سند میں ''عمر بن محمد'' سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٨٤٣)

(5) مستدرك الحاكم (٦٦٩/١) مسند أبي يعلىٰ (٣٤٤/١) اس کی سند میں ''علی بن حسین اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ'' کے درمیان انقطاع ہے۔ نیز ''محمد بن حسن ہمدانی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ١٧٩)

(6) مسند أبي يعلىٰ (٣٤٦/٣) اس کی سند میں ''محمد بن ابی حمید اور سلام بن سلیم'' ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ١٨٠)

چھوڑے۔[1] (أخرجه الإمام أحمد في المسند من حديث أبي هريرة رضي الله عنه قال المنذري في الترغيب والترهيب: لا بأس بإسناده وأخرجه البخاري في الأدب المفرد والحاكم) (توفیق الباری کے الفاظ یہ ہیں کہ نہیں کھڑا کرتا کوئی مومن اپنا منہ اللہ تعالیٰ کی طرف۔ انتہیٰ. اور یہی ترجمہ زیادہ مناسب ہے)۔ اور اس کے معنی کی شاہد یہ حدیث شریف ہے کہ نہیں ہے کوئی مسلمان کہ وہ کوئی دعا کرے کہ جس میں گناہ نہیں ہے اور نہ قطع رحمی ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کو اس کے سبب سے تین چیزوں میں سے ایک عطا فرمائے یا تو یہ اس کی دعا فوراً قبول کرے، یا اس کو اس کے لیے آخرت میں رکھ چھوڑے، یا اس سے اس کے مثل کوئی برائی پھیر دے۔[2] (أخرجه الإمام أحمد والبزار وأبو يعلىٰ قال المنذري: بأسانيد جيدة من حديث أبي سعيد الخدري رضي الله عنه)

8 اسی جملے سے یہ حدیث شریف ہے کہ « اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ » یعنی دعا ہی عبادت ہے (یعنی دعا ہی وہ حقیقی عبادت ہے جو اس لائق ہے کہ اس کا نام عبادت رکھا جائے، اس لیے کہ دعا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے پر اور اس کے ما سوا سے اعراض کرنے پر دلالت کرتی ہے۔ قاله السيد) پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''اور تمھارے رب نے کہا ہے: تم مجھے پکارو، میں تمھاری (دعائیں) قبول کروں گا، بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عن قریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''[3] (أخرجه ابن أبي شيبة في مصنفه و أبو داود والترمذي والنسائي و ابن حبان و صححه الترمذي و ابن حبان والحاكم في المستدرك من حديث أنس رضي الله عنه قال: قال: رسول الله ﷺ: « الدعاء مخ العبادة »[4] یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔)

9 اسی جملے سے یہ حدیث شریف ہے کہ جو شخص نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ سے تو وہ اس پر خفا ہوتا ہے۔[5] (أخرجه الترمذي والحاكم في المستدرك من حديث أبي هريرة رضي الله عنه)

10 ایک روایت میں یہ ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتا تو وہ اس پر خفا ہوتا ہے۔[6] (أخرجه ابن أبي شيبة في المصنف والحاكم في المستدرك)

11 اسی جملے سے آپ کا سوئے قضا سے پناہ مانگنا ہے،[7] جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے۔

---

1. مسند أحمد (٤٤٨/٢) الأدب المفرد (٢٤٨/١) مستدرك الحاكم (٦٧٤/١)
2. مسند أحمد (١٨/٣) صحيح الترغيب والترهيب (١٢٨/٢)
3. مصنف ابن أبي شيبة (٢١/٦) سنن أبي داود (١٤٧٩) سنن الترمذي (٢٩٦٩) مستدرك الحاكم (٦٦٧/١) صحيح الجامع (٣٤٠٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٤٥٠/٦) صحيح ابن حبان (١٧٢/٣)
4. سنن الترمذي (٣٣٧١) اس کی سند میں ''ابن لھیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع: ٣٠٠٣)
5. سنن الترمذي (٣٣٧٣) صحيح الجامع (٨٤١٨)
6. مستدرك الحاكم (٦٦٧/١) السلسلة الصحيحة (٢٦٤)
7. صحيح الجامع (٥٩٨٧) صحيح مسلم (٢٧٠٧)

(12) اسی جملے سے وہ ہے جو وتر کی دعائے قنوت میں آپ ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے قنوت میں فرمایا: « وَقِنِي شَرَّ مَا قَضَيْتَ »[1] یہ حدیث صحیح ہے، گو شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی۔

(13) صحیحین میں آپ ﷺ کا اس قضا سے پناہ مانگنا ہے جو شر اور سوء پر مشتمل ہے۔[2]

(14) اسی جملے سے وہ حدیثیں ہیں جو صلۂ رحم میں وارد ہوئی ہیں اور اس بارے میں کہ وہ عمر میں زیادہ کرتا ہے۔[3] یہ حدیثیں صحیح ہیں۔

(15) اسی جملے سے وہ حدیثیں ہیں جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ مظلوم کی دعا اپنے ظالم پر قبول کی جاتی ہے۔[4]

(16) اور وہ حدیثیں ہیں جو والدین کی اپنی اولاد کے لیے دعا کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔[5]

(17) اور وہ حدیثیں جو امام عادل کی دعا کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔[6]

(18) اور وہ حدیثیں جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ جو کوئی اپنے رب تعالیٰ کو اس کے اسمِ اعظم کے ساتھ پکارتا ہے تو اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔[7] ان کے سوا اور بہت حدیثیں ہیں اور یہ سب حدیثیں اپنی دلالت کے اختلاف کے ساتھ متواتر ہیں۔ پس کاش! ہم جان لیتے کہ اہلِ علم کی ایک جماعت اس سب کی مخالفت کی طرف کیوں گئی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی قضا اپنے سابق علم میں ہرگز تبدیل نہیں ہوتی ہے۔

پھر اگر وہ ایسی آیت سے استدلال کریں کہ ﴿ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ ﴾ [ق: ٢٩] ''میرے ہاں بات بدلتی نہیں ہے۔'' اور جو لوحِ محفوظ میں وارد ہوا ہے اور جو اس میں لکھا گیا ہے اور یہ کہ قضا خشک ہوگئی اور مثل اس کے تو پھر اللہ عزوجل کے یہ فرمانے میں کون سا فائدہ ہے کہ ﴿ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''مجھ سے دعا کرو میں تمھاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔'' کیوں کہ یہ تو اس کی طرف سے اپنے بندوں کو حکم ہے کہ اس سے دعا مانگا کریں اور رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم کرنے میں کیا فائدہ ہے کہ اس کے بندوں کو یہ خبر دیں کہ وہ قریبِ مجیب ہے، وہ دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہے جب کہ وہ اس کو پکارتا ہے۔ اور اللہ عزوجل کے اس قول میں کیا فائدہ ہے جس میں وہ اپنے بندوں کو خبر دیتا ہے: ﴿ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴾ [الرعد: ٣٩] ''اللہ جو

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٢٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٤٥) سنن ابن ماجه (١١٧٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (إرواء الغليل: ١٧٢/٢)

(2) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

(3) صحيح البخاري (١٩٦١) صحيح مسلم (٢٥٥٧)

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩)

(5) سنن أبي داود (١٥٣٦) سنن الترمذي (١٩٠٥) سنن ابن ماجه (٣٨٦٢) صحيح الجامع (٣٠٣١)

(6) سنن الترمذي (٣٥٩٨) سنن ابن ماجه (١٧٥٢) اس کی سند میں ''ابومدلہ'' مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ١٣٥٨)

(7) سنن أبي داود (١٤٩٤) سنن الترمذي (٣٤٧٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٧٦٦٦) سنن ابن ماجه (٣٨٥٧) صحيح الترغيب والترهيب (١٣٠/٢)

چاہے مٹا دے اور جو چاہے ثابت رکھے، لوحِ محفوظ اسی کے پاس ہے۔‘‘

نیز اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس قسم کی آیت میں سکھایا کہ دعا کیسے کریں: ﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرة: ٢٨٦] ’’اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کر۔ اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب! جس بوجھ کو اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں، وہ ہم سے نہ اُٹھوا اور ہم سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے، اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا کارساز ہے، پس تو کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔‘‘ اور رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے بیان کیا، جیسا کہ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ اللہ عزوجل نے ان دعاؤں کے وقت فرمایا: « قَدْ فَعَلْتُ »[1] یعنی میں نے ساری دعائیں قبول کیں اور اسی طرح وہ سارے قصے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہم سے بیان فرمائے ہیں کہ اس نے اپنے انبیاء کی دعا قبول فرمائی، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ﴾ [یوسف: ١١٠] ’’حتیٰ کہ جب رسول مایوس ہو گئے اور وہ (لوگ) گمان کرنے لگے کہ انھیں خلافِ واقعہ خبر دی گئی ہے تو ان (انبیاء و رسل) کے پاس ہماری مدد آ پہنچی۔‘‘

نیز اس قسم کی آیت میں ہے: ﴿ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ﴾ [محمد: ٧] ’’اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم ثابت رکھے گا۔‘‘ اور جو اس طرح کی آیتیں ہیں اور وہ جو ہمارے نبی ﷺ سے مشاہدہ کیا گیا ہے کہ آپ کی دعائیں اتنے مواضع میں قبول کیں جن کا شمار مشکل ہے اور وہ جو اس امت کے صالحین سے مشاہدہ کیا گیا ہے تمام زمانوں میں سے ہر زمانے میں کہ اس نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں فی الحال۔ جو کوئی اس بات کو یا ان میں سے بعض کو نہ جانے تو وہ اس قسم کی کتابوں کو دیکھے جیسے: ”حلية الأولياء“، ”رسالة القشيري“، ”صفوة الصفوة لابن الجوزي“ ان کے سوا اور کتابیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ (مثلاً: امام یافعی رحمہ اللہ کی ”روض الرياحين“ اور اس کا فارسی ترجمہ ”رياض العارفين“ جو عہدِ جہانگیری میں ہوا اور اردو کا ترجمہ ”محاسن للمحسنين“ کے نام سے جو اس دور میں ہوا۔ محاسن میں قبولِ دعا کے متعلق ایک مستقل باب ہے)۔

بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دعاؤں میں نظر کرے جو مقبول ہوئیں اور جس طرح کہ سلف رحمہم اللہ میں سے ایک کثیر جماعت سے واقع ہوا کہ وہ اپنی دعاؤں میں اس طرح کہا کرتے تھے: ”اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ قَدْ كَتَبْتَنِيْ فِيْ دِيْوَانِ الْأَشْقِيَاءِ فَانْقُلْنِيْ إِلٰى دِيْوَانِ السُّعَدَاءِ“ یہ مضمون مختلف عبارتوں میں ادا کرتے تھے۔ انہیں میں سے یہ ایک

[1] صحيح مسلم (١٢٦)

عبارت ہے جو پیش کی گئی۔ بالجملہ پس کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ شمس النار سے بھی بڑھ کر ظاہر و باہران پر رد کرتی ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ اقضیہ دو قسم کے ہیں: مطلقہ و مقیدہ ''فالمطلقة ما لم تكن مشروطة واقعة وإلا فلا'' یہ قول بھی پہلے قول کی طرح گو مردود ہے مگر مفسدی میں اس سے کم ہے، اگرچہ رائے بحث (خالص) ہے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس پر دلیل سورت نوح میں قولہ تعالیٰ: ﴿ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [نوح: ٤] ''اور تمھیں ایک مقرر وقت تک مہلت دے گا۔ بے شک جب اللہ تعالیٰ کا مقرر وقت آ جائے تو وہ موخر نہیں ہوتا۔ کاش! تمھیں علم ہوتا۔'' ہے۔ كما أشار إليه بعض المحققين)

بالجملہ اس سلسلے میں بحث بہت طویل ہے، مگر ہم اس قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔ والحمد لله أولًا و آخرا. اس وقت میں بھی ایک فرقہ دعا کا منکر ہے، بعض معاصرین نے نہایت اچھے انداز سے اس کا رد کیا ہے۔ فجزاه الله خير الجزاء آمین. بعض نے اس آیت سے نبی اکرم ﷺ کی عمر کا استنباط کیا ہے، اس لیے کہ یہ سورت تریسٹھویں سورت کا سر ہے اور اس کے بعد میں سورۃ التغابن لائی گئی تو یہ آپ ﷺ کی وفات شریف کے سبب سے ظہورِ تغابن کی طرف اشارہ ہے۔ (ذكره الكرخي) یہ کچھ کتاب اللہ کی تفسیر سے نہیں ہے، بلکہ منجملہ لطائف الکلام وتفنن المرام ہے۔[1]

الحمد لله و المنة کہ سورۃ المنافقین کی تفسیر ۲۴ ماہِ شوال ۱۳۱۵ ہجری روز جمعہ وقت نمازِ صبح مکمل ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آیندہ کی توفیق دے۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ آمين، والحمد لله أولًا وآخراً وظاهراً وباطناً وصلى الله تعالىٰ علىٰ سيدنا ومولانا سيدنا المرسلين إمام المتقين محمد وآله و صحبه وأتباعه وأشياعه وبارك وسلم آمين إلىٰ يوم الدين ملء ما علم و زنة ما علم وعدد ما علم.

---

[1] فتح البيان (١٤/١٥٣_١٥٩)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ التَّغَابُن

اس سورت مبارکہ کی بالاتفاق اٹھارہ (۱۸) آیتیں ہیں اور اکثر کے قول کے مطابق مدنی ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکی ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکی اور مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مدینے میں نازل ہوئی۔ (أخرجه ابن الضريس وابن مردويه والبيهقي في الدلائل)۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] (أخرجه ابن مردويه) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ مکے میں نازل ہوئی، مگر اس کے آخر کی کئی آیتیں جو مدینے میں نازل ہوئیں عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کے بارے میں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اہل اور ولد کی جفا کی شکایت کی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ... ﴾ إلى آخر السورة۔[3] (أخرجه النحاس وأخرج ابن إسحاق و ابن جرير عن عطاء بن يسار نحوه) بخاری نے اپنی تاریخ میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، کہا: نہیں ہے کوئی مولود کہ پیدا کیا جائے مگر اس کے سر کی تشبیک میں پانچ آیتیں سورۃ التغابن کے شروع سے لکھی ہوئی ہے۔[4]
(وأخرجه ابن حبان في الضعفاء والطبراني و ابن مردويه و ابن عساكر مرفوعا عنه قال ابن كثير: وهو غريب جدا بل منكر)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ
وَ لَهُ الْحَمْدُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱ هُوَ الَّذِيْ
خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ وَ اللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ
وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۳ يَعْلَمُ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا
تُعْلِنُوْنَ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۴

[1] تفسير القرطبي (١٣٢/١٨) [2] الدر المنثور (١٨١/٨) [3] تفسير الطبري (٤٢٤/٢٣) یہ روایت مرسل ہے۔
[4] مسند الشامين (٧٢/١) تاريخ دمشق (١٥٣/٦٣) تفسير ابن كثير (٤٧٨/٤) اس کی سند میں ''ولید بن ولید عنسی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اللہ کی تسبیح کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اسی کے لیے بادشاہی ہے اور اسی کے لیے (ہر قسم کی) حمد ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ① وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر اور کوئی مومن ہے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے ② اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تمھیں صورت دی تو تمھاری صورتیں بہت اچھی بنائیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ③ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو اور اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے ④

تسبیح صرف اللہ تعالیٰ کی:

سب جانوروں سے انسان کی پیدائش یعنی شکل وصورت اچھی ہے۔ انتہیٰ

یہ سب مسبحات میں سے آخری ہے۔ مخلوقات جو اپنے باری تعالیٰ اور مالک کی تسبیح کرتی ہیں اس پر پہلے کلام گزر چکا ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ﴾ یعنی وہ ساری کائنات میں تصرف کرنے والا ہے وہ محمود ہے اس سب پر جس کو پیدا کرتا ہے اور مقدر فرماتا ہے۔ ﴿ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس نے جس شے کا ارادہ کیا، وہ بغیر کسی ممانع و مدافع یعنی رکاوٹ کے ہوگئی اور جس کو نہ چاہا وہ نہ ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے خلق وعلم کا بیان:

قولہ تعالیٰ: ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ﴾ یعنی وہی تمھارا خالق ہے اس صفت پر اور اس نے تم سے اس کا ارادہ کیا ہے تو مومن و کافر ہونے سے کوئی خلاصی نہیں ہے، اس کا ہونا ضروری ہے اور وہ خوب دیکھنے والا ہے، اس کو جو اس کا مستحق ہے کہ اسے راہ بتائی جائے اور اس کو جو اس کا مستحق ہے کہ بھٹکایا جائے۔ اور وہ اپنے بندوں کے اعمال پر شہید ہے اور عن قریب ان کو ان اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا، اسی لیے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾

پھر فرمایا: ﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ﴾ یعنی اس نے آسمانوں اور زمین کو عدل و حکمت کے ساتھ پیدا کیا اور اس نے تمھاری صورت کھینچی اور تمھاری شکلیں اچھی بنائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ﴾ [الانفطار: ٦۔ ٨] ”اے انسان! تجھے اپنے ربِ کریم سے کس چیز نے بہکایا؟ جس (رب) نے تجھے پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھاک کیا، پھر (درست اور) برابر بنایا۔ جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔“ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا

فرمان ہے: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ښ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الغافر: ٦٤] ''جس نے تمھارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنا دیا اور تمھاری صورتیں بنائیں اور بہت اچھی بنائیں اور تمھیں عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو عطا فرمائیں، یہی اللہ تمھارا پروردگار ہے، پس بہت ہی برکتوں والا اللہ ہے سارے جہاں کا پرورش کرنے والا۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی یہ سب کام اسی نے کیے اور اسی کی طرف مرجع ومآب و بازگشت ہے۔

پھر یہ خبر دی کہ وہ ساری کائناتِ ارضی، سماوی اور نفسی کا عالم ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

کیا تمھارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی، جنھوں نے اس سے پہلے کفر کیا؟ پھر انھوں نے اپنے معاملے (عملوں) کا وبال چکھا، اور ان کے لیے نہایت دردناک عذاب ہے⑤ یہ اس لیے کہ بے شک ان کے رسول ان کے پاس کھلی نشانیاں لاتے تھے تو انھوں نے کہا: کیا بشر ہمیں راہ دکھائیں گے؟ پھر انھوں نے کفر کیا اور (حق سے) منہ موڑا اور اللہ نے (ان سے) بے پروائی کی، اور اللہ بے پروا بہت قابلِ تعریف ہے⑥

سابقہ کفار کی ہلاکت سے عبرت پکڑنے کا حکم:

اللہ پاک گذشتہ امتوں کی خبر دیتا ہے اور اس عذاب اور سزا کا حال بتاتا ہے جو رسولوں کی مخالفت اور حق کی تکذیب کرنے پر ان پر نازل ہوا۔ چنانچہ فرمایا: کیا تمھیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی اور ان کے حال کی جو کچھ کہ ہوا۔ پھر انھوں نے اپنی تکذیب اور خیم (عادت) اور اپنے ردی افعال کا وبال چکھا۔ یہ وبال وہی سزا اور رسوائی ہے جو دنیا میں ان پر نازل ہوئی اور ان کے لیے دارِ آخرت میں عذابِ الیم ہے جو اس دنیوی عذاب سے ملایا گیا ہے۔

پھر اس کی علت بیان فرمائی کہ یہ عذاب ان پر اس لیے نازل ہوا کہ ان کے پاس رسول حجتیں اور دلیلیں لے کر اور براہینیں لے کر آتے تھے تو یہ کہتے تھے کہ کیا آدمی ہم کو راہ سمجھائیں گے۔ غرض یہ ہے کہ انھوں نے بشر میں رسالت ہونے کو بعید سمجھا اور اس بات کو کہ ان کی ہدایت اپنے جیسے بشر کے ہاتھوں پر ہو۔ پھر وہ کافر ہوئے، یعنی حق

کو جھٹلایا اور عمل سے نکول لیا، یعنی عمل سے بیٹھ رہے۔ ﴿ وَاسْتَغْنَى اللّٰهُ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے بے پروائی کی۔ ﴿ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ
لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۷
فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرٌ ۝۸ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ
يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ ۝۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۰

کافروں نے دعویٰ کیا کہ وہ (قبروں سے) ہرگز نہیں اُٹھائے جائیں گے۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: کیوں نہیں؟ میرے رب کی قسم! تمھیں ضرور اٹھایا جائے گا، پھر تمھیں ضرور بتایا جائے گا جو تم نے عمل کیے اور یہ اللہ پر بالکل آسان ہے ⑦ چنانچہ تم اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا، اور اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو ⑧ جس دن وہ تمھیں جمع ہونے کے دن اکٹھا کرے گا، وہی ہار جیت کا دن ہے۔ اور جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اللہ اس سے اس کی برائیاں مٹا دے گا اور اسے جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ابد تک۔ یہی عظیم کامیابی ہے ⑨ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات جھٹلائیں وہی دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور وہ برا ٹھکانا ہے ⑩

حیات بعد الممات برحق ہے:

ہار جیت کا دن ہے، یعنی ہر آدمی کا ایک گھر بہشت میں ہے اور ایک دوزخ میں۔ بہشت والوں نے اپنے گھر لیے اور دوزخیوں نے اپنے گھر لیے۔ دوزخی ہارے بہشتی جیتے۔ انتہی.

اللہ پاک کافروں، مشرکوں اور ملحدوں کی خبر دیتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔ تو ان سے کہہ: کیوں نہیں میرے رب کی قسم ہے! البتہ تم اٹھائے جاؤ گے، پھر البتہ تمھیں تمھارے سارے اعمال کے متعلق

خبر دی جائے گی، خواہ وہ اعمال اعلیٰ ہوں یا حقیر ہوں، چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں اور تمھارا یہ اٹھانا اور تمھیں جزا دینا اللہ کے لیے آسان ہے۔ یہ وہی تیسری آیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم فرمایا ہے کہ قیامت کے واقع ہونے پر اور اس کے وجود پر اپنے رب عزوجل کی قسم کھائیں۔

چنانچہ پہلی تو سورت یونس میں ہے: ﴿ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِیْ وَ رَبِّیْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴾ [یونس: ٥٣] ''اور وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا عذاب واقعی سچ ہے؟ آپ فرما دیجیے کہ ہاں قسم ہے میرے رب کی! وہ واقعی سچ ہے اور تم کسی طرح اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے۔'' اور دوسری آیت سورت سبا میں ہے: ﴿ وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِیْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَیْبِ ۚ لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴾ [سبا: ٣] ''کفار کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔ آپ کہہ دیجیے کہ مجھے میرے رب کی قسم! جو عالم الغیب ہے کہ وہ یقیناً تم پر آئے گی اللہ تعالیٰ سے ایک ذرے کے برابر کی چیز بھی پوشیدہ نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں بلکہ اس سے بھی چھوٹی اور بڑی ہر چیز کھلی کتاب میں موجود ہے۔'' اور تیسری آیت یہی ہے: ﴿ زَعَمَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا ... ﴾

پھر فرمایا: ﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْۤ اَنْزَلْنَا ﴾ نور سے مراد قرآن شریف ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمھارے کاموں کی خوب خبر ہے، چنانچہ تمھارے اعمال میں سے تو کوئی پوشیدہ شے بھی اس سے مخفی نہیں ہے پھر ظاہر شے کا ذکر کیا ہے۔

قیامت کا ذکر:

﴿ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ﴾ سے مراد روزِ قیامت ہے۔ اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ اس میں اگلے پچھلے سب ایک جگہ پر جمع کیے جائیں گے۔ پکارنے والا ان کو اپنی آواز سنائے گا اور بصر ان کو نفوذ کرے گی، یعنی ان کی آنکھیں سب کچھ دیکھیں گی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴾ [هود: ١٠٣] ''اور وہ دن ہے جس میں سب حاضر کیے جائیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ ۝ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ [الواقعة: ٤٩۔ ٥٠] ''آپ کہہ دیجیے کہ یقیناً سب اگلے اور پچھلے ضرور جمع کیے جائیں گے ایک مقررہ دن کے وقت۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ یَوْمُ التَّغَابُنِ ﴾ قیامت کے دن کے ناموں میں سے ایک نام ہے، یہ اس لیے ہے کہ اہلِ جنت اہلِ نار کو مغبون کریں گے۔ اسی طرح امام قتادہ اور مجاہد رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[1]

---

(1) تفسير الطبري (٢٣/٤١٩، ٤٢٠)

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی غبن (نقصان) اس سے بڑھ کر نہیں ہے کہ یہ لوگ تو جنت میں داخل کیے جائیں گے اور ان کو نار کی طرف لے جائیں گے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ تفسیر اس آیت سے کی ہے: ﴿ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صٰلِحًا... إلىٰ قوله ... وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ اس جیسی آیت کئی بار گزر چکی ہے۔[1]

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿١٢﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٣﴾

جو مصیبت بھی آتی ہے وہ اللہ ہی کے حکم سے آتی ہے، اور جو کوئی اللہ پر ایمان لائے تو وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے، اور ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ⑪ اور تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم (حق سے) منہ موڑو تو ہمارے رسول کا کام بس کھول کر پہنچا دینا ہے ⑫ اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، اور پس لازم ہے کہ مومن اللہ ہی پر توکل کریں ⑬

ہر تکلیف اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے:

اللہ پاک اس بات کی خبر دیتا ہے جس کی خبر سورۃ الحدید میں دی: ﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ ﴾ [الحدید: ٢٢] ''نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے اور نہ (خاص) تمھاری جانوں میں، مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔'' اسی طرح یہاں فرمایا ہے: ﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یعنی نہیں ہے کوئی مصیبت مگر اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت سے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾ یعنی جس کسی پر کوئی مصیبت آپڑے پھر وہ یہ جانے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہے، پھر صبر کرے اور اجر طلب کرے اور قضائے الٰہی کا فرمانبردار ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت کرے اور جو دنیا اس سے فوت ہوگئی اس کے عوض اس کے دل میں ہدایت اور یقینِ صادق دے اور جو شے اس سے لی گئی ہے کبھی وہی شے یا اس سے بہتر اس کو بدلے میں عطا فرمائی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے

① تفسیر ابن کثیر (٤٨٠/٤) ② تفسیر ابن کثیر (٤٨٠/٤)

(یعنی بہ روایت علی بن ابی طلحہ) یعنی اس کے دل کو یقین کی راہ بتائی تو یہ جان لے کہ جو کچھ اسے پہنچا، وہ اس سے چوکنے والا نہیں تھا اور جو کچھ اس سے چوک گیا، وہ اسے پہنچنے والا نہیں تھا۔ امام اعمش رحمہ اللہ ابوظبیان سے راوی ہیں، کہا: ہم علقمہ کے پاس تھے کہ ان کے نزدیک یہ آیت پڑھی گئی: ﴿ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾ چنانچہ کسی نے ان سے اس کے متعلق پوچھا تو فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے کہ اسے مصیبت پہنچے اور وہ جانے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے اور راضی ہوا اور فرماں بردار ہوا۔[1] (رواہ ابن جریر وابن أبي حاتم)

امام سعید بن جبیر اور مقاتل بن حیان رحمہما اللہ کہتے ہیں، یعنی اللہ سے استرجاع کرتا ہے، کہتا ہے: "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ"۔[2] متفق علیہ حدیث میں ہے کہ مومن کے لیے تعجب ہے کہ نہیں جاری کرتا اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی قضا مگر وہ اس کے لیے خیر ہوتی ہے، اگر پہنچتی ہے اس کو کوئی تکلیف تو وہ صبر کرتا ہے، پس یہ اس کے لیے بہتر ہے اور اگر اس کو کوئی خوشی پہنچتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے، پس یہ اس کے لیے بہتر ہے اور یہ بات سوائے مومن کے کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔[3] سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا کہ اللہ پر ایمان لانا اور اس کی تصدیق اور اس کی راہ میں جہاد۔ عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں اس سے زیادہ آسان چاہتا ہوں۔ فرمایا: اللہ کو اس شے میں تہمت مت لگا جو اس نے تیرے لیے جاری کی ہے۔[4] (أخرجه الإمام أحمد ولم يخرجوه)

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم ہے اس شے میں جو مشروع ہوئی اور اس شے کو کرنے کا جس کا حکم دیا اور اس شے کو چھوڑنے کا جس سے منع فرمایا۔ پھر فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ یعنی اگر تم عمل سے باز رہے تو ہمارے رسول پر تو وہ پہنچا دینا ہے جو اس پر لادا گیا ہے اور تم پر سننا اور ماننا ہے اس کو جو تم پر لادا گیا ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو رسالت اور رسول پر پہنچا دینا ہے اور ہم پر تسلیم یعنی حکم کو ماننا ہے۔[5]

پھر یہ خبر دی کہ وہ احد صمد ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ پس اول تو توحید کی خبر ہے اور معنی اس کے طلب کے معنی ہیں، یعنی اس کے لیے الٰہیت کی توحید کرو اور اس کا اخلاص کرو اور اس پر بھروسا کرو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴾ [المزمل: ۹] "مشرق و مغرب کا پروردگار جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اسی کو اپنا کارساز بنا لے۔"

---

(1) تفسير الطبري (۲۳/۴۲۱) (2) تفسير ابن كثير (۴۸۰) (3) صحيح مسلم (۲۹۹۹)
(4) مسند أحمد (۳۱۸/۵) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔ (5) تفسير ابن كثير (۴۸۰/۴)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۚ وَإِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٤﴾ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿١٥﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٦﴾ إِنْ تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٧﴾ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٨﴾

اے ایمان والو! بے شک تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں، لہٰذا تم ان سے محتاط رہو۔ اور اگر تم معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو بے شک اللہ خوب بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے ⑭ بلاشبہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد فتنہ (آزمایش) ہیں، اور اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے ⑮ چناں چہ جہاں تک تمھاری استطاعت ہو تم اللہ سے ڈرو اور سنو اور اطاعت کرو، اور خرچ کرو، یہ تمھاری ذات کے لیے بہتر ہے اور جسے اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ⑯ اگر تم اللہ کو قرض دو، قرضِ حسنہ، تو وہ اسے تمھارے لیے بڑھا دے گا اور تمھیں بخش دے گا۔ اور اللہ بڑا قدردان، بہت حلم والا ہے ⑰ وہ غیب اور ظاہر کا علم رکھنے والا، زبردست، خوب حکمت والا ہے ⑱

بیوی بچوں کے فتنے سے بچنے کی تلقین:

آدمی بیوی اور بچوں کی خاطر بہت سی نیکیاں گنواتا ہے اور بہت برائی میں پڑتا ہے مگر پھر بھی ان سے نیک سلوک رکھنا چاہیے۔ اور آپ بچتا رہے۔ انتھٰی.

اللہ تعالیٰ بیویوں کے اور اولاد کے متعلق بتاتا ہے کہ ان میں سے بعض اپنے خاوند اور والد کے دشمن ہوتے ہیں اس معنی میں کہ آدمی اپنی بیوی اور اولاد کی وجہ سے عملِ صالح سے غافل ہو جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ

﴿ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [المنافقون: ۹] ”اے مسلمانو! تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ کریں اور جو ایسا کریں وہ بڑے ہی زیاں کار لوگ ہیں۔“ اور اسی لیے یہاں ﴿ فَاحْذَرُوْهُمْ ﴾ فرمایا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: ”أَيْ: عَلٰى دِيْنِكُمْ“ یعنی تم ان سے اپنے دین پر بچتے رہو۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض بیویوں اور اولاد کے دشمن ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ مرد کو قطع رحم پر یا اپنے رب کی معصیت پر آمادہ کرتے ہیں تو مرد اپنی محبت کی وجہ سے ان کا کہنا مان لیتا ہے اور انکار کی طاقت نہیں رکھتا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے اس آیت کے متعلق پوچھا تو فرمایا کہ یہ مکے میں کچھ مرد ہیں جو ایمان لائے، انھوں نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، مگر ان کی بیویوں اور اولاد نے ان کو چھوڑنے سے انکار کیا، پھر جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو لوگوں کو دیکھا کہ دین میں سمجھ والے ہو گئے ہیں، چنانچہ ارادہ کیا کہ اپنی بیویوں اور اولاد پر سختی کریں اور سزا دیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾[3] (أخرجه ابن أبي حاتم و كذا رواه الترمذي عن محمد بن يحيى عن الفريابي وهو محمد بن يوسف به قال: حسن صحيح و رواه ابن جرير والطبراني من حديث إسرائيل به وروي من طريق العوفي عن ابن عباس نحوه وهكذا قال عكرمة مولاه سواء)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾ یعنی مال و اولاد جو ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی مخلوق کی آزمایش اور امتحان اور اختبار ہے تاکہ وہ ظاہری طور پر جان لے کہ کون سا شخص اس کی اطاعت کرتا ہے اور کون اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے پاس بڑا اجر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ﴾ [آل عمران: ۱۴۔ ۱۵] ”مرغوب چیزوں کی محبت لوگوں کے لیے مزین کر دی گئی ہے، جیسے عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کیے خزانے اور نشاندار گھوڑے اور چوپائے اور کھیتی، یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور لوٹنے کا اچھا ٹھکانا تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ آپ کہہ دیجیے! کیا میں تمھیں اس سے بہت ہی بہتر چیز نہ بتاؤں؟ تقویٰ والوں کے لیے ان کے رب تعالیٰ کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہے،

[1] تفسیر الطبري (۴۲۵/۲۳) [2] تفسیر الطبري (۴۲۴/۲۳) تفسیر ابن کثیر (۴۸۱/۴)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۵۸/۱۰) سنن الترمذي (۳۳۱۷) تفسیر الطبري (۴۲۳/۲۳) المعجم الکبیر (۲۷۵/۱۱)

سب بندے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔''

سیدنا ابو بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرما رہے تھے کہ سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما آئے، دونوں نے سرخ کرتے پہن رکھے تھے، وہ چلتے تھے اور الجھتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اترے اور ان کو اٹھا لیا، پھر ان کو اپنے سامنے بٹھایا، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے سچ فرمایا: ﴿ إِنَّمَآ أَمْوَٰلُكُمْ وَأَوْلَٰدُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾ میں نے ان دو بچوں کی طرف نظر کی کہ چل رہے ہیں اور الجھ رہے ہیں تو میں صبر نہ کر سکا، یہاں تک کہ میں نے اپنی بات کو وہیں چھوڑا اور ان کو اٹھا لیا۔[1] (رواه الإمام أحمد ورواه أهل السنن من حديث حسين بن واقد به وقال الترمذي: حسن غريب إنما نعرفه من حديثه)

سیدنا اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں کندہ کے وفد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: کیا تیرا کوئی بیٹا ہے؟ میں نے کہا: ایک لڑکا ہے جو میرے آپ کی طرف آنے کے وقت جنا گیا ہے، حمد کی بیٹی سے اور البتہ میں نے دوست رکھا ہے کہ اس کی جگہ سبع قوم (یعنی کتا) ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا ہرگز مت کہو، بے شک ان میں تو آنکھ کی ٹھنڈک ہے اور اجر ہے جبکہ وہ قبض کیے جائیں، یعنی فوت ہو جائیں، پھر فرمایا: ''وَلَئِنْ قُلْتَ ذَاكَ إِنَّهُمْ لَمَجْبَنَةٌ مَحْزَنَةٌ، إِنَّهُمْ لَمَجْبَنَةٌ مَحْزَنَةٌ''[2] (تفرد به أحمد) یعنی البتہ اگر وہ بات کہے اس وجہ سے کہ وہ مجبنہ محزنہ ہیں تو بے شک وہ مجبنہ محزنہ ہیں، یعنی اولاد بزدلی اور حزن کا گھر ہے ان کی وجہ سے آدمی بزدل اور بخیل ہو جاتا ہے، طرح طرح کے رنج اٹھانے پڑتے ہیں۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اولاد دلوں کا پھل ہے اور بے شک وہ مجبنہ مبخلہ محزنہ (بزدلی، بخیلی اور حزن پیدا کرنے والی) ہیں۔[3] (أخرجه الحافظ أبو بكر البزار ثم قال: لا نعرفه إلا بهذا الإسناد، حدثنا محمود بن بكير حدثنا أبي عن عيسىٰ عن ابن أبي ليلىٰ عن عطية عن أبي سعيد رضي الله عنه)

سیدنا ابو مالک اشعری مرفوعاً کہتے ہیں کہ وہ تیرا دشمن نہیں ہے کہ اگر تو اسے قتل کرے تو تیرے لیے نور ہو اور اگر وہ تجھے قتل کرے تو تو جنت میں داخل ہو، لیکن شاید وہ جو تیری پشت سے نکلا ہے یعنی تیرا لڑکا شاید تیرا دشمن ہو، پھر سب سے بڑھ کر تیرا دشمن تیرا مال ہے جس کا مالک تیرا داہنا ہاتھ ہوا ہے۔[4] (أخرجه الطبراني)

بقدرِ استطاعت تقوے کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ یعنی تم اللہ تعالیٰ سے اپنی کوشش اور طاقت کے مطابق ڈرو، جیسا

---

① مسند أحمد (٣٥٤/٥) سنن أبي داود (١١٠٩) سنن الترمذي (٣٧٧٤) سنن النسائي (١٤١٣) سنن ابن ماجه (٣٦٠٠) صحيح الجامع (٣٧٥٧)

② مسند أحمد (٢١١/٥)

③ كشف الأستار عن زوائد البزار (٣٧٨/٢) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٧٦٤)

④ المعجم الكبير (٢٩٤/٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ''شریح بن عبید'' کا سماع سیدنا ابو مالک رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے، نیز ''محمد بن اسماعیل بن عیاش'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٣٧٥)

کہ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ثابت ہوا ہے کہ جب میں تم کو کسی چیز کا حکم دوں تو تم آؤ اس سے جو تم طاقت رکھتے ہو اور جس شے سے میں تم کو منع کروں تو اس سے بچو۔[1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، یہ آیت سورت آلِ عمران کی اس آیت کی ناسخ ہے: ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴾ [آل عمران: ١٠٢] ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو جتنا اس سے ڈرنا چاہیے اور دیکھو مرتے دم تک مسلمان ہی رہنا۔''

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو قوم کے لیے عمل کرنا سخت ہوا۔ انھوں نے قیام کیا، یعنی نماز میں کھڑے رہے، یہاں تک کہ ان کی کونچیں ورم کر آئیں اور ان کی پیشانیاں زخمی ہوگئیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر تخفیف کے لیے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ تو اس نے پہلے حکم کو منسوخ کر دیا۔ (رواہ ابن أبي حاتم) امام ابو العالیہ، زید بن اسلم، قتادہ، ربیع بن انس، سدی اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا ﴾ یعنی جس شے کا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم کو حکم دیتا ہے اس کے مطیع اور فرماں بردار ہو جاؤ اور اس سے دائیں اور بائیں طرف نہ پھر جاؤ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے مت بڑھو اور اس شے سے پیچھے نہ رہ جاؤ جس کا تم کو حکم کیا گیا اور اس شے پر مت سوار ہو جس سے تم کو منع کیا گیا ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تم کو روزی دی ہے اس میں سے اپنے اقارب، فقراء، مساکین اور حاجتمندوں پر خرچ کرو اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر احسان کرو، جیسا کہ اس نے تم پر احسان کیا ہے، یہ تمھارے لیے دنیا اور آخرت میں بہتر ہوگا۔ اور اگر نہ کرو گے تو تمھارے لیے دنیا اور آخرت میں برا ہوگا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ کی تفسیر سورۃ الحشر میں گزر چکی ہے[3] اور وہ حدیثیں بھی بیان ہو چکی ہیں جو اس آیت کے معنی میں وارد ہوئی ہیں۔ وللّٰه الحمد والمنة.

صدقے کی ترغیب:

قولہ تعالیٰ: ﴿ إِنْ تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعِفْهُ لَكُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم جو کچھ خرچ کرو گے تو وہ اس کا عوض دے گا اور جو کچھ تم خیرات کرو گے تو اس پر اس کی جزا ہے اور یہ قرض کی طرح ٹھہرایا گیا جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: « مَنْ يُقْرِضُ غَيْرَ ظَلُومٍ وَلَا عَدِيمٍ »[4] یعنی کون قرض دیتا ہے اس ذات کو جو نہ ظالم ہے نہ مفلس ہے۔ اسی لیے یوں فرمایا: ﴿ يُضَاعِفْهُ لَكُمْ ﴾ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا

[1] صحيح البخاري (٦٨٥٨) صحيح مسلم (١٣٣٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٨/١٠) تفسير ابن كثير (٤٨٢/٤)
[3] رقم الآية (٩) [4] صحيح مسلم (٧٥٨)

ہے: ﴿ فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ﴾ [البقرۃ: ۲٤٥] ''پس اللہ تعالیٰ اسے بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے۔''

﴿ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ﴾ یعنی اور کفارہ کر دے گا تم سے سیئات کا، اسی لیے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ قلیل پر کثیر کے ساتھ جزا دیتا ہے۔ ﴿ حَلِیْمٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ درگزر کرتا ہے اور بخشتا ہے اور ذنوب و زلات (گناہوں کو اور پھسل جانے کو) اور خطاؤں اور برائیوں کو ستر کرتا ہے اور ان سے تجاوز کرتا ہے۔ ﴿ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴾ کی تفسیر کئی بار گزر چکی ہے۔[1] (آخر تفسیر سورة التغابن ولله الحمد والمنة كذا في ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا وضاحتی بیان یہ ہے کہ ﴿ یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ﴾ یعنی اللہ پاک کی ساری مخلوق جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے ہر نقص اور عیب سے اس کی پاکی بیان کرتی ہے۔ کلمۂ ﴿ مَا ﴾ جو یہاں اور ﴿ مَا تُعْلِنُوْنَ ﴾ میں مکرر لایا گیا تو یہ تاکید کے لیے ہے اور تعمیم کے لیے اور اختلاف کے لیے ہے، کیوں کہ ﴿ مَا فِی السَّمٰوٰتِ ﴾ کی تسبیح ﴿ مَا فِی الْاَرْضِ ﴾ کی تسبیح سے کثرت اور قلت کے لحاظ سے مختلف ہے اور ہمارے اسرار ہمارے علانیہ سے مختلف ہیں۔ اور ﴿ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ میں کلمۂ ﴿ مَا ﴾ کی تکرار نہیں کی گئی اس لیے کہ اللہ پاک کا علم مختلف نہیں ہے، کیوں کہ وہ اس شے کو جو زمین کے نیچے ہے ویسا ہی جانتا ہے، جیسا کہ وہ اس شے کو جانتا ہے جو زمین کے اوپر ہے اور اس کا اس شے کو جاننا جو ہو گئی ویسا ہی ہے، جیسا کہ اس شے کو جاننا جو آئندہ ہو گی۔

﴿ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ﴾ یعنی ملک اور حمد اس کے لیے خاص ہیں، اس کے غیر کے لیے ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے اور ان میں سے جو کچھ اس کے بندوں کے لیے ہے سو وہ اسی کے فیض سے ہے اور اسی کی طرف راجع ہے۔ حمد میں کسی نے خوب کہا ہے:

حمد را با تو نسبتے ست درست　　　　بر در ہر کہ رفت بر درِ تست

''تعریف اور شکر تیرے ہی لیے درست ہے۔ مانگنے کے لیے جو بھی گیا وہ تیرے دروازے ہی پر گیا۔''

ظرف کی تقدیم حقیقت کی جہت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اختصاص کو مفید ہے۔ اس لیے کہ وہ ہر شے کا مبدی و مبدع ہے۔ تو ملک حقیقتاً اسی کا ہے نہ کہ اس کے غیر کا اور اس لیے کہ نعمتوں کے اصول اور فروع اسی سے ہیں تو حمد حقیقت میں اسی کے لیے ہے اور اس کے غیر کی حمد جو ہوتی ہے تو صرف ظاہر حال کے اعتبار سے اور اس کے ہاتھوں پر نعمتوں کے جاری ہونے کے اعتبار سے۔ ملک استیلاء ہے اور ہر شے میں اس ارادے کے مطابق تصرف کی قدرت

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/ ٤٨١۔٤٨٢)

پانا ہے جو ازل میں کیا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ملک تمام قدرت اور استحکامِ قدرت ہے۔ ”یُقَالُ: مُلْكٌ بَيْنَ الْمُلْكِ بِالضَّمِّ وَمَالِكٌ بَيْنَ الْمِلْكِ بِالْكَسْرِ“[1] ﴿ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ یعنی اور وہ ہر شے پر بڑا قدرت رکھنے والا ہے، کوئی شے اس کو عاجز نہیں کرتی ہے کہ اس سے فوت ہو جائے۔

﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ﴾ یعنی وہی ہے جس نے ازل میں تمھاری خلق کا اندازہ کیا اور اسی طرح یہ قول ہے: ﴿ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ﴾ یعنی ازل میں کافر کے کفر کا اور مومن کے ایمان کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس نے خلق پیدا کی، پھر وہ کافر ہوئی اور مومن ہوئی۔ تقدیر یہ ہے: وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو موصوف کیا تو فرمایا: ﴿ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ﴾۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [النور: ٤٥] ”تمام کے تمام چلنے پھرنے والے جانداروں کو اللہ تعالیٰ ہی نے پانی سے پیدا کیا ہے، ان میں سے بعض تو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں، بعض دو پاؤں پر چلتے ہیں، بعض چار پاؤں پر چلتے ہیں اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

مفسرین نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا اور مشی ان کا فعل ہے۔ یہ قول حسین بن فضل کا مختار ہے، کہا: اگر وہ ان کو مومنین و کافرین پیدا کرتا تو ان کو ان کے فعل کے ساتھ موصوف نہ کرتا اپنے اس قول میں: ﴿ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ﴾ اور اس قول والوں نے اس حدیث شریف سے حجت پکڑی ہے: « كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ وَيُمَجِّسَانِهِ »[2] (ذكره الخطيب) امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: پھر تم میں سے پوشیدہ طور پر کافر ہے اور علانیہ مومن ہے، جیسے: منافق، اور تم میں سے پوشیدہ طور پر مومن ہے اور علانیہ کافر ہے، جیسے: عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما اور ان کی طرح کے اور لوگ جن کو کفر پر زبردستی کی گئی۔

امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پھر تم میں سے اللہ تعالیٰ کا منکر ہے اور ستاروں پر ایمان لانے والا ہے اور تم میں سے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والا اور ستاروں کا کافر ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر کو پیدا کیا اور اس کا کفر اس کا فعل اور کسب ہے باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کفر کا خالق ہے۔ اور مومن کو پیدا کیا اور اس کا ایمان اس کا فعل اور کسب ہے، اس کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ایمان کا خالق ہے اور کافر کفر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کفر کو پیدا کرنے کے بعد کفر کو اختیار کرتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس پر مقدر کیا ہے اور اس کو اس سے جان لیا ہے، کیوں کہ خلافِ مقدر کا وجود عجز ہے اور خلافِ معلوم کا وجود جہل ہے۔

یہ اہلِ سنت کا طریق ہے، چنانچہ جو کوئی اس طریقے پر چلا تو وہ حق کو پہنچ گیا اور جبریہ اور قدریہ کے مذہب

---

[1] فتح البيان (١٤/١٦٣، ١٦٤) [2] صحيح البخاري (١٢٩٢) صحيح مسلم (٢٦٥٨)

سے بچا رہا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول تمام اقوال سے بہترین ہے اور اسی پر جمہور امت ہیں۔ کافر کا ذکر مومن سے پہلے اس لیے کیا کہ نزولِ قرآن کے وقت زیادہ غالب یہی کافر لوگ تھے،[1] اس آیتِ کریمہ میں اس شخص کے قول کا رد ہے جو دو منزلتوں کے درمیان ہے، یعنی انسان یا مومن ہے یا کافر ہے اس کے درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ یعنی جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب دیکھتا ہے۔ تمھارے اعمال میں سے کوئی مخفی عمل بھی اس سے چھپا ہوا نہیں، چنانچہ وہ تم کو تمھارے اعمال کی جزا دے گا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ بندہ مومن پیدا کیا جاتا ہے اور مومن جیتا ہے اور مومن مرتا ہے۔ اور بندہ پیدا کیا جاتا ہے کافر اور جیتا ہے کافر اور مرتا ہے کافر اور بے شک بندہ اپنے زمانے سے ایک مدت دراز تک نیک نیتی کے ساتھ عمل کرتا ہے، پھر اس کو وہ شے پا لیتی ہے جو اس کے لیے لکھی گئی ہے اور وہ شقی ہو کر مرتا ہے اور بے شک بندہ ایک مدت دراز تک اپنے زمانے میں بدبختی کے ساتھ عمل کرتا ہے، پھر اس کو وہ شے پا لیتی ہے جو اس کے لیے لکھی گئی ہے اور وہ سعید ہو کر مرتا ہے۔[2] (أخرجه ابن مردويه)

پھر جب اللہ پاک نے عالمِ صغیر کی پیدائش کا ذکر کیا تو اس کے بعد عالمِ کبیر کی پیدائش کا بیان کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ﴾ یعنی اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ایسا پیدا کرنا کہ اس میں اس کی حکمتِ بالغہ پوشیدہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس نے یہ یقینی پیدا کیا جس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حرفِ باء لام کے معنی میں ہے، یعنی اس نے یہ حق کے ظاہر کرنے کے لیے پیدا کیا، وہ یہ ہے کہ نیکی کرنے والے کو اس کی نیکی کی جزا دے اور برائی کرنے والے کو اس کے برائی کرنے کا بدلہ دے۔

پھر اللہ تعالیٰ عالمِ صغیر کی پیدائش کی طرف رجوع ہوا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ﴾ کسی نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام مراد ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی کرامت اور عزت کے لیے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ مراد ساری مخلوق ہے، ظاہر یہی ہے، یعنی اللہ پاک نے ساری مخلوقِ انسانی کو مکمل اور حسین صورت و تقویم اور سب سے زیادہ جمیل شکل پر بنایا۔ انسان یہ کبھی بھی آرزو نہیں کرتا کہ اس کی شکل کسی اور مخلوق کی شکل کی طرح ہو جسے وہ دیکھتا ہے۔ بعض حکماء نے کہا ہے کہ دو چیزیں ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں ہے: خوبصورتی اور قوتِ گویائی، یعنی بیان۔ تصویر بہ معنی تخطیط و تشکیل ہے۔ جمہور نے ﴿ صُوَرَكُمْ ﴾ کو بہ ضمِ صاد پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام زید بن علی، اعمش اور ابو زید رحمہم اللہ نے) بہ کسرِ صاد پڑھا ہے۔[4]

---

[1] تفسير القرطبي (١٣٣/١٨) فتح القدير (٣١٢/٥، ٣١٣)

[2] المعجم الأوسط (٢٣٥/٨) اس کی سند میں ''عمر بن ابراہیم عن قتادۃ'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير القرطبي (١٣٤/١٨) [4] فتح القدير (٣١٣/٥)

﴿ وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ﴾ یعنی اور دارِ آخرت میں اسی کی طرف پھر جانا ہے نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: جب منی رحم میں چالیس رات تک ٹھہر چکتی ہے تو اس کے پاس نفوس کا فرشتہ آتا ہے، پھر اس کو رب تعالیٰ کی طرف چڑھا لے جاتا ہے اور کہتا ہے: اے رب! کیا یہ نر ہے یا مادہ، پھر اللہ تعالیٰ قضا کرتا ہے جو وہ قضا کرنے والا ہے۔ پھر کہتا ہے: کیا بدبخت ہے یا نیک بخت، پھر وہ چیز لکھی جاتی ہے جس پر وہ چلنے والا ہوتا ہے۔ اور سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے سورۃ التغابن کی ابتدائی آیتیں ﴿ وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ﴾ تک پڑھیں۔[1] (أخرجه عبد بن حميد وابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم وابن مردويه)

﴿ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ یعنی اور وہ اس شے کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اس میں سے کوئی مخفی شے بھی اس پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ پاک کا علم ساری اشیاء کو شامل ہے اور اس کے تحت میں ﴿ وَ یَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴾ بھی مندرج ہے لیکن اس کی تصریح فرمائی تو اس سے منظور وعد اور وعید میں مزید تاکید کرنا ہے، یعنی وہ اس شے کو جانتا ہے جس کو تم چھپاتے ہو اور جس کو تم ظاہر کرتے ہو۔ جملۂ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ مقرر ہے اپنے ماقبل کا وہ یہی تھا کہ اس کا علم معلوم ہر شے کو شامل ہے اور یہ تذییلیہ ہے۔ خطیب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان تین جملوں میں سے ہر ایک اپنے ماقبل سے اخص ہے ان کو جو اکٹھا کیا تو اس سے اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ اللہ پاک کا علم جزئیات اور کلیات کو محیط ہے۔ اشیاء میں سے کوئی شے اس سے غائب نہیں ہوتی۔

﴿ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ﴾ میں سوالیہ انداز توبیخ کے لیے ہے یا تقریر کا اور خطاب عرب کے کفار کو ہے۔ ﴿ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ﴾ معطوف ہے ﴿ كَفَرُوْا ﴾ پر، یہ سبب پر مسبب کا عطف ہے، کیوں کہ ان کا کفر وبال چکھنے کا سبب ہے، یعنی اے کفارِ عرب! کیا تم کو اگلی اُمتوں کے کافروں کی خبر نہیں آئی، جیسے قومِ نوح، عاد اور ثمود، پھر انھوں نے اپنے کام کا وبال چکھا۔ عقوبت کو جو پیرایۂ وبال میں ادا فرمایا تو یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ عقوبت ایک ثقیل محسوس ہونے والی شے کی طرح ہے، اس کی یہ وجہ ہے کہ وبال اصل میں ثقل اور شدت کو کہتے ہیں، اسی معنی میں وبیل اس طعام کو بولتے ہیں جو معدے پر ثقیل اور گراں ہوتا ہے اور ''وابل'' وہ بارش ہے جو ثقیل القطر ہے۔ ﴿ اَمْرِهِمْ ﴾ سے یہاں مراد وہ کفر و معاصی ہیں جو اُن سے واقع ہوئے اور ﴿ وَبَالَ ﴾ سے مراد دنیا کا عذاب ہے جو ان کو پہنچا۔ ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ یعنی دنیا کے عذاب پر بس نہیں ہے، بلکہ ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے اور وہ آگ کا عذاب ہے۔

﴿ ذٰلِكَ ﴾ مبتداء ہے۔ ﴿ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِیْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ﴾ خبر ہے، یعنی عذابِ دارین میں

---

[1] تفسير الطبري (٤١٦/٢٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٨/١٠) الدر المنثور (١٨٢/٨) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

جس کا مذکور ہوا وہ اس سبب سے ہے کہ ان کے پاس رسول آتے تھے جو اُن کی طرف باہر حجتیں اور ظاہر معجزے دے کر بھیجے گئے تو ان میں سے ہر قوم اپنے اپنے رسول سے کہتی کہ کیا بشر ہم کو راہ بتائیں گے۔ جنسِ بشر میں سے رسول ہونے کا انکار کیا اور اس سے تعجب کر کے یہ بات کہی، جیسا کہ ثمود نے کہا تھا: ﴿ اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ﴾ [القمر: ٢٤] ''کیا اپنے میں سے ایک شخص کی ہم فرماں برداری کرنے لگیں؟''

ان کی بغاوت یعنی کند ذہنی میں سے یہ ہے کہ رسول کے بشر ہونے کا تو انکار کیا اور یہ تسلیم اور اعتقاد کر بیٹھے کہ معبود پتھر ہوتا ہے۔ ﴿ بَشَرٌ ﴾ سے مراد جنس ہے، اس لیے ﴿ يَهْدُوْنَنَا ﴾ بہ صیغۂ جمع کہا۔ یہاں حکایت میں اجمال کیا گیا ہے تو تمام قوموں کی طرف قول کی نسبت کی گئی جس طرح کہ اس آیت میں خطاب اور امر کا اجمال کیا گیا ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ﴾ [المؤمنون: ٥١] ''اے پیغمبرو! حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔'' ﴿ فَكَفَرُوْا ﴾ یعنی پھر رسولوں کے منکر ہوئے اور اس شے کے جس کو وہ لے کر آئے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس قول کے سبب سے کافر ہوئے جو انھوں نے رسولوں سے کہا۔ اس معنی کی بنا پر حرفِ فاء سببیہ ہوگا نہ کہ واسطے تعقیب کے۔

﴿ وَتَوَلَّوْا ﴾ یعنی انھوں نے رسولوں سے اعراض کیا اور اس شے میں غور نہ کیا جس کو وہ لے کر آئے۔

﴿ وَاسْتَغْنَى اللّٰهُ ﴾ یعنی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان اور عبادت سے اپنی غنا اور بے پروائی اس طرح سے ظاہر کی کہ ان کو ایمان کی طرف بے چین نہ کیا باوجود اس کے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس برہان کے سبب سے جس کو ان کے لیے ظاہر کیا اور ان معجزات کے سبب سے جن کو ان کے لیے واضح فرمایا ان سے استغنیٰ کیا۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سلطان کے سبب سے اپنے بندوں کی طاعت سے مستغنی ہوا۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: ظَهَرَ غِنَاهُ"[2] پس سین طلب کے لیے نہیں ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو عالم کی حاجت نہیں ہے اور نہ اس کی کہ وہ اس کی عبادت کریں، وہ اپنی تمام مخلوقات کی طرف سے بہ زبانِ حال و مقال تعریف کیا گیا ہے۔

﴿ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا ﴾ ﴿ زَعَمَ ﴾ دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ ﴿ اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ﴾ قائم مقام دو مفعول کے ہے۔ کلمۂ ﴿ اَنْ ﴾ مخففہ ہے مثقلہ سے: "أَيْ: أَنَّ الشَّأْنَ يُّبْعَثُوْا أَبَدًا" ناصبہ مصدریہ نہیں ہے، تاکہ ایک ناصب دوسرے ناصب پر داخل نہ ہو۔ زعم قول باطن اور ادعائے علم ہے، اس کا اطلاق کبھی کذب پر بھی ہوتا ہے۔ شریح کہتے ہیں: ہر شے کے لیے ایک کنیت ہے اور کذب کی کنیت "زَعَمُوْا" ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ان سے کسی نے کہا ہے کہ تم نے کیا سنا ہے کہ نبی ﷺ "زَعَمُوْا" کے بارے میں فرماتے تھے؟ کہا: میں

---

[1] فتح القدير (٣١٣/٥) [2] الكشاف (٥٤٩/٤) [3] تفسير القرطبي (١٣٥/١٨)

نے آپ کو سنا ہے کہ فرماتے تھے: «بِئْسَ مَطِيَّةُ الرَّجُلِ» یعنی "زَعَمُوا" مرد کی بری سواری ہے۔[1] (اخرجه أحمد والبيهقي وغيرهما) ان سے یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے اس کو مکروہ سمجھا ہے۔[2] (ابن أبي شيبة وغيره)

﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ﴾ سے مراد کفارِ عرب ہیں، یعنی اہلِ مکہ جیسا کہ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے،[3] یہ اس خطاب کے مناسب ہے جو ﴿ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ﴾ میں ہے اور اس کو "عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ" پر محمول کرنا غیر مناسب ہے، جیسا کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے بعض محشین نے کہا ہے۔ اس لیے کہ یہ خطاب کو مناسب نہیں ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کفارِ مکہ نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز کبھی مبعوث نہ ہوں گے۔

پھر اللہ پاک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان کی تردید کریں اور ان کے زعم کو باطل کریں، چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ بَلٰى ﴾ یہ کلمہ ایجابِ نفی کے لیے ہے تو اب یہ معنی ہوئے: "بَلَى تُبْعَثُوْنَ" (یہ تو کلمۂ ﴿ بَلٰى ﴾ سے نکل آیا، پھر ﴿ لَتُبْعَثُنَّ ﴾ فرما کر اس کا اعادہ کیا تو اس سے مقصد صرف یہ ہے کہ قسم سے منظور بعث کی تاکید کرنا ہے اور ما بعد کا اس پر معطوف کرنا ہے، یعنی ﴿ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ ﴾)۔ یعنی تو ان سے کہہ دے، کیوں نہیں، تم مبعوث ہو گے، پھر اس خبر پر یہ قسم کھائی ﴿ وَرَبِّيْ ﴾ اور قسم کا جواب یہ ہے: ﴿ لَتُبْعَثُنَّ ﴾ یعنی قسم ہے میرے رب کی! البتہ تم اپنی قبروں سے نکالے جاؤ گے، بعث کی خبر دینے کے لیے قسم کے ساتھ تاکید کی گئی۔ اب اگر کوئی کہے کہ ایسی شے پر قسم کھانے کے کیا معنی ہیں جس کا انھوں نے انکار کیا تو کہیں گے، یہ جائز ہے اس لیے کہ قسم کے ساتھ دھمکی دینے کا اثر دل میں عظیم تر ہوتا ہے، قلب میں خوب بیٹھتا ہے۔ تو گویا ان سے یوں کہا گیا کہ جس شے کا تم انکار کرتے ہو وہ ضرور واقع ہونی ہے، وہ ہرگز بغیر ہوئے نہ رہے گی۔ یہاں جو "رب" کے لفظ کے ساتھ مبعوث ہونے پر قسم کھائی، شاید اس کا نکتہ یہ ہو کہ بعث کا ہونا ربوبیت کا مقتضا ہے، کیوں کہ تربیت یہ ہے کہ ہر شے بتدریج اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور یہ بغیر بعث کے ہو نہیں سکتا۔

﴿ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ﴾ یعنی پھر بعث کے بعد تم کو اس کام کی خبر دی جائے گی جو تم نے کیا، تاکہ تم پر حجت قائم کی جا سکے، پھر تم کو اس کی جزا دی جائے گی۔ ﴿ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ یعنی یہ بعث و جزا اللہ تعالیٰ پر آسان ہے، اس لیے کہ کسی چیز کا اعادہ کرنا اس کے ابتداء کرنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ حرفِ فاء فصیحہ ہے جو شرطِ مقدر پر دال ہوتا ہے۔ "أَيْ: إِذَا كَانَ الْأَمْرُ هَكَذَا فَصَدِّقُوْا"، یعنی جب بات یہ ہوئی کہ مبعوث ضرور ہو گے اعمال کی خبر دے کر جزا ضرور دی جائے گی تو اب اے کفارِ مکہ! تم اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرو اور "بِالْيَوْمِ الآخِرِ" نہیں فرمایا، اس شے کی بنا پر جو ﴿ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ﴾ کے مناسب ہے، چنانچہ اس کی یہ وجہ ہے کہ ﴿ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ﴾ کے ساتھ اکتفا کیا، اس

---

[1] مسند أحمد (١١٩/٤) سنن البيهقي الكبرىٰ (٢٤٧/١٠) السلسلة الصحيحة (٨٦٦)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (٢٥٢/٥) [3] البحر المحيط (٢٧٤/٨)

لیے کہ نور سے مراد قرآن ہے اور قرآن مشتمل ہے بعث وحساب پر۔ قرآن شریف اس لیے ہے کہ اس کی وجہ سے گمراہی کی تاریکی سے راہ ملتی ہے، یعنی اور ایمان لاؤ اس روشنی پر جس میں بعث وحساب کا ذکر ہے۔ ﴿ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمھارے کاموں کی خوب خبر ہے تمھارے اقوال و افعال میں سے کوئی شے اس سے مخفی نہیں ہے، وہ تو اس پر تم کو جزا دینے والا ہے۔

﴿ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ ﴾ اس ظرف کا عامل ﴿ لَتُنَبَّؤُنَّ ﴾ ہے، یہ امام نحاس رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ کے علاوہ نے کہا ہے کہ ﴿ خَبِيْرٌ ﴾ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "اُذْكُرْ" محذوف ہے۔ امام ابوالبقاء رحمہ اللہ نے کہا: وہ ہے جس پر کلام دال ہے: "أَيْ: تَتَفَاوَتُوْنَ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ"۔ جمہور نے بہ فتح یاء وضم عین پڑھا ہے اور کسی نے (یہ ابوعمرو سے مروی ہے) بہ اسکانِ عین پڑھا ہے۔ سوائے تخفیف کے اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہے، اگرچہ یہ اس کی جگہ نہیں ہے جس طرح کہ ﴿ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ﴾ [الإنعام: ١٠٩] میں بہ سکونِ راء پڑھا گیا ہے اور کسی نے (یعنی امام زید بن علی، شعبی، یعقوب، نصر، ابن ابی اسحاق اور جحدری رحمہم اللہ نے) "نَجْمَعُكُمْ" بہ نون پڑھا ہے۔[1]

﴿ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ﴾ یعنی اس دن کا ذکر کرو جس دن تم کو اللہ تعالیٰ جمع کرے گا حساب کے دن کے لیے۔ روزِ جمع سے مراد روزِ قیامت ہے، اس لیے کہ اہلِ محشر اس میں جزا کے لیے جمع کیے جائیں گے اور اس دن ہر عامل اور اس کے عمل کے درمیان اور ہر نبی اور اس کی امت کے درمیان اور ہر ظالم اور مظلوم کے درمیان انسانوں اور جنوں کے اولین اور آخرین کے درمیان اور تمام آسمانوں والوں اور زمین والوں کے درمیان جمع کیا جائے گا۔

﴿ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ﴾ یعنی یہ قیامت کا دن ایک دوسرے کے زیاں میں ڈالنے کا دن ہے۔ یہ نام اس لیے رکھا کہ اس میں بعض اہلِ محشر بعض کو زیاں میں ڈالیں گے، پس اہلِ حق تو اہلِ باطل کو زیاں میں ڈالیں گے اور اہلِ ایمان اہلِ کفر کو اور اہلِ طاعت اہلِ معصیت کو۔ کوئی غبن اس سے زیادہ عظیم نہیں ہے کہ اہلِ جنت اہلِ نار کو زیان میں ڈالیں گے، جب کہ یہ لوگ تو جنت میں داخل ہوں گے اور یہ لوگ نار میں، چنانچہ نار والے اپنے وہ منازل چھوڑ گئے جو ان کے لیے جنت میں تھے، اگر وہ وہ کام نہ کرتے جو ان کو نار میں ڈالنے کا سبب بنے تو گویا اہلِ نار نے خیر کے بدلے شر حاصل کی اور نعیم کے بدلے عذاب لیا اور اہلِ جنت اس کے برعکس ہیں۔ "يُقَالُ: غَبَنْتُ فُلَانًا إِذَا بَايَعْتَهُ أَوْ شَارَكْتَهُ فَكَانَ النَّقْصُ عَلَيْهِ. وَالْغَلَبَةُ وَالْغَبْنُ فَوْتُ الْحَظِّ كَذَا قَالَ الْمُفَسِّرُوْنَ" پس مغبون وہ شخص ہے جس نے اپنے اہل و منازل کا غبن اٹھایا جو جنت میں تھے، پس تغابن کا اطلاق اس شے میں جو اس میں ہے صرف استعارے کے لیے ہے اور تفاعل دو کی طرف سے نہیں ہے اور اسی طرح مغابنہ ہے بر سبیلِ تجرید۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ يَوْمُ التَّغَابُنِ ﴾ اسمائے "یوم القیامة" سے ہے۔[2] ان کی دوسری روایت یہ ہے:

---

[1] فتح القدير (٣١٤/٥)
[2] تفسير الطبري (٤٢٠/٢٣)

"غَبَنَ أَهْلُ الْجَنَّةِ أَهْلَ النَّارِ"[1] یعنی اہلِ جنت نے اہلِ نار کو زیاں میں ڈالا۔

﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ جمہور نے ﴿ يُّكَفِّرْ ﴾ اور ﴿ يُدْخِلْهُ ﴾ کو بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام نافع اور ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے) (اس میں صیغۂ غائب سے صیغۂ حاضر کی طرف التفات ہے) بہ نون پڑھا ہے۔[2]

﴿ خٰلِدِيْنَ ﴾ کا نصب بنا بر حالِ مقدرہ ہے، اس میں ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی کی رعایت کر کے بہ صیغۂ جمع فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کسی سے تصدیق واقع ہوئی تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے گناہ مٹا دیے جائیں گے اور باغوں میں داخل کیا جائے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس حال میں کہ ان کا وہاں رہنا ہمیشہ کے لیے مقدر کیا گیا ہے۔

﴿ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ یعنی یہ گناہوں کا مٹانا اور جنتوں میں داخل کرنا جس کا ذکر ہوا وہ کامیابی اور فیروزی ہے جس کے برابر کوئی اور کامیابی نہیں ہو سکتی۔ عظیم کا حال کبیر سے اعلیٰ و برتر ہے جس کا ذکر سورۃ البروج میں کیا گیا ہے،[3] اس لیے کہ اس میں جو ہے تو وہ صرف جنت کے داخل ہونے پر مرتب ہوا ہے تو یہ جامع ہے مصالح کا اور مصالح یہی ضرر دینے والی چیز کو دور کرنا اور نفع دینے والی چیز کو حاصل کرنا ہے کہ گناہ مٹائے گئے، یہ تو ضرر دینے والی چیز کو دور کرنا ہوا اور جنتوں میں داخل کیے گئے یہ منافع حاصل کرنا ہوا۔

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ آیات سے مراد یا تو تنزیلی آیتیں ہیں، یا ان سے جو زیادہ عام ہیں، یعنی آیاتِ تنزیلی و آفاقی و انفسی۔ اللہ پاک نے یہاں نیک بختوں اور بدبختوں کا حال بیان کیا، تغابن کا ذکر کرنے کے لیے جس کا بیان ہو چکا ہے اور یہ بیان کرنے کے لیے کہ پہلے طائفہ کے لیے تو وہ برائیوں کو دور کرنے اور جنت میں داخل کرنے کا سبب ہوگا اور دوسرے طائفہ کے لیے یہ نار میں داخل کرنے کا اور اس میں ہمیشہ رہنے کا سبب ہوگا۔

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ یعنی کسی کو مصائب میں سے کوئی مصیبت نہیں پہنچی، مگر اللہ تعالیٰ کی قضا اور قدر سے۔ امام فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: "بِأَمْرِ اللّٰهِ"[4] کسی نے کہا: "بِعِلْمِ اللّٰهِ" اس کے سببِ نزول کے بارے میں کسی نے کہا ہے کہ کفار نے کہا تھا کہ جس شے پر مسلمان ہیں، اگر وہ حق ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں مصائب سے بچاتا۔ ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾ یعنی اور جو کوئی اللہ کی تصدیق کرے اور یہ یقین رکھے کہ اسے نہ پہنچے گی کوئی شے مگر وہ جو اللہ تعالیٰ نے اس پر مقدر کی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو صبر کی راہ بتائے گا اور قضا پر راضی ہونے کی۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ مصیبتیں ہیں، آدمی کو پہنچتی ہیں اور وہ جانتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہیں تو ان کے لیے تسلیم اختیار کرتا ہے اور راضی ہوتا ہے۔[5] امام کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: وہ یہ ہے کہ جب

---

[1] الدر المنثور (۱۸۳/۸) [2] فتح القدير (۳۱۵/۵) [3] رقم الآية (۱۱)

[4] تفسير القرطبي (۱۳۹/۱۸) [5] الدر المنثور (۱۸۴/۸)

آزمایش میں ڈالا جائے تو صبر کرے اور جب اس پر انعام کیا جائے تو شکر کرے اور جب ظلم کیا جائے تو معاف کرے۔

جمہور نے ﴿ يَهْدِ ﴾ کو بہ فتحِ یاء وکسرِ دال پڑھا ہے: ”أَيْ: يَهْدِهِ اللّٰهُ“ اور کسی نے (یعنی امام قتادہ، سلمی، ضحاک اور ابوعبد الرحمان رحمہ اللہ نے) بہ ضمِ یاء وفتحِ دال بہ صیغۂ مجہول پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام طلحہ بن مصرف، اعرج، سعید بن جبیر، ابن ہرمز اور ازرق رحمہ اللہ نے) ”نَهْدِ“ بہ نون پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام مالک بن دینار، عمرو بن دینار اور عکرمہ رحمہ اللہ نے) ”يَهْدَأْ“ بہ سکونِ ہمزہ اور ”قَلْبُهُ“ کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ ”أَيْ: يَطْمَئِنُّ وَيَسْكُنُ“۔[1] ﴿ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ بلیغ العلم ہے، اس کا علم ہر شے کے ساتھ لگا ہوا ہے، کوئی شے اس کے علم سے باہر نہیں ہے یہ جو مذکور ہوا اس میں سے کوئی پوشیدہ شے بھی اس پر مخفی نہیں ہے۔

﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ یعنی تم مصائب کو اپنی جانوں پر آسان کرو اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اور اس کے رسول کی اطاعت میں اپنے سارے اوقات میں مشغول ہو اور اس کی کتابِ عزیز اور اس کے رسول کی سنتِ مطہرہ پر عمل کرنے میں مصروف رہو۔ ﴿ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ ﴾ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے: ”أَيْ: فَلَا بَأْسَ أَوْ فَلَا ضَرَرَ عَلَى الرَّسُوْلِ ﷺ“۔ جملۂ ﴿ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ جواب محذوف کی علت ہے، یعنی پھر اگر تم اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی طاعت سے منہ موڑو تو رسول ﷺ پر کچھ ضرر نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارے رسول ﷺ پر تو صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔ چنانچہ وہ یہ کام کر چکا اب تم جانو اور تمھارا کام۔

پھر اللہ پاک نے توحید اور توکل کی ہدایت فرمائی، ارشاد کیا: ﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ یعنی عبودیت کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کا غیر نہیں تو اب تم اس کی توحید کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور مومن اپنے کام اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد کریں اور اسی پر بھروسا کریں نہ کہ اس کے غیر پر۔ اس میں رسول کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرے اور اس کا تقویٰ رکھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے، اس پر جس نے اس کی تکذیب کی اور اس سے اعراض کیا۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ ﴾ اس میں عورت اور مرد داخل ہیں یعنی اے ایمان والو! تمھاری بیوی، خاوند اور لڑکے لڑکیوں میں سے تمھارے دشمن ہیں، تم سے دشمنی کرتے ہیں اور بھلائی کے کاموں سے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے تم کو باز رکھتے ہیں، یا دین و دنیا کے کاموں میں تجھ سے جھگڑتے ہیں۔ نزول کا سبب جو پہلے گزر چکا ہے وہ اس میں بہ درجۂ اولیٰ داخل ہے، چنانچہ تم ان سے بچتے رہو کہ کہیں خیر سے پیچھے رہ جانے میں تم ان کا کہنا مان لو، خیر جیسے جہاد و ہجرت، اس لیے کہ آیت کا سبب نزول اسی میں کہا مانا ہے۔

---

[1] تفسیر القرطبي (١٨/ ١٣٩، ١٤٠) فتح القدير (٥/ ٣١٥، ٣١٦)

﴿ فَاحْذَرُوْهُمْ ﴾ کی ضمیر ﴿ عَدُوًّا ﴾ کی طرف راجع ہے۔ ضمیر کا جمع لانا اس لیے صحیح ہوا کہ ﴿ عَدُوًّا ﴾ کا اطلاق واحد و اثنین و جماعت پر ہوتا ہے، یا ضمیر ازواج و اولاد کی طرف پھرتی ہے، لیکن عام ازواج و اولاد کی طرف نہیں، بلکہ ان کی طرف جو اُن میں سے عداوت کی صفت والے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: واللہ! انھوں نے دنیا میں ان سے عداوت نہیں کی، لیکن ان کی محبت نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ان کے لیے حرام لیا اور وہ ان کو دیا۔[1]

پھر اللہ پاک نے تجاوز اور درگزر کی طرف ان کو ارشاد کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی انھوں نے جن گناہوں کا ارتکاب کیا ہے، اگر تم ان پر عفو کرو، اس طرح سے کہ ان کو سزا نہ دو اور ان سے اعراض کرو اور ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا ترک کر دو اور بخش دو، اس طرح سے کہ ان گناہوں کا اخفا کرو اور اُن کی معذرت کی ان میں تمہید کرو اور ان کا ستر کرو تو بے شک اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والا ہے تمھارے لیے اور ان کے لیے۔ تم سے ویسا معاملہ کرے گا، جیسا تم نے عمل کیا اور تم پر اپنا فضل و کرم اور مہربانی فرمائے گا۔

پھر اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ اموال اور اولاد فتنہ ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾ یعنی تمھارے مال و اولاد تو یہی آزمایش و اختبار و محنت اور امتحان ہیں اور آخرت سے تمھیں غافل کرتے ہیں، وہ تم کو حرام کے کمانے اور لینے پر آمادہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا حق روکنے پر اور بڑے بڑے گناہوں میں واقع ہونے پر اور غیر کے مال غصب کرنے پر اور باطل طریقے سے مال حاصل کرنے اور اس جیسے اور کاموں پر تمھیں اُکساتے ہیں، چنانچہ تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے ان کی اطاعت مت کرو۔ یہاں کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ ذکر نہیں کیا گیا، جیسا کہ ﴿ اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ ﴾ میں مذکور ہوا ہے، اس لیے کہ مال و اولاد فتنے سے اور دل ان کے ساتھ مشغول ہونے سے خالی نہیں ہوتے۔

اموال کو اولاد سے پہلے اس لیے رکھا کہ مال کا فتنہ زیادہ ہوتا ہے۔ "أزواج" کا ذکر فتنے میں نہیں کیا۔ امام بقاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کی یہ وجہ ہے کہ ان میں سے وہ بیویاں ہیں جو آخرت پر صلاح و عون، یعنی مشورہ دینے والی اور مددگار ہوتی ہیں۔[2] یہاں جو ابو بریدہ رحمہ اللہ سے مروی حدیث ذکر کی ہے جس کا پہلے بیان ہو چکا ہے سو دونوں میں الفاظ کا کچھ فرق ہے مخرج اس کے یہ لکھے ہیں۔[3] (أخرجه أحمد وأبو داود والترمذي والنسائي وابن ماجه والحاكم وصححه وابن مردويه وابن أبي شيبة). ﴿ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ یعنی اور اللہ تعالیٰ کے پاس بڑا اجر ہے، یعنی جنت ہے، اس شخص کے لیے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اختیار کی اور اپنے مال اور اولاد کی محبت میں معصیت چھوڑی۔

بالجملہ پھر اللہ پاک نے اپنے بندوں کو تقویٰ اور اطاعت کا حکم کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ یعنی پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھو اور جہاں تک تمھاری کوشش اور طاقت پہنچے۔ اہلِ علم میں سے ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ آیت ﴿ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] کی ناسخ ہے، کیوں کہ اس کے یہ معنی ہیں

---

[1] تفسير القرطبي (١٤٢/١٨) [2] نظم الدرر للبقاعي (١٩/٨) [3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، پھر اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور اس کا ذکر کیا جائے اور اس کو نہ بھولا جائے اور اس کا شکر کیا جائے اور اس کی ناشکری نہ کی جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان سے تخفیف کی اور یہ آیت نازل فرمائی۔ اس جماعت میں سے یہ لوگ ہیں: قتادة وربيع بن أنس وسدي وابن زيد رحمهم الله۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آیتِ مذکور محکم ہے، اس میں کسی طرح کا نسخ نہیں ہے، لیکن ﴿ حَقَّ تُقَاتِهِ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس کی راہ میں مجاہدہ کریں، جیسا کہ مجاہدے کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ کے حق میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت ان کو نہ پکڑے اور اللہ تعالیٰ کے لیے عدل پر قائم رہیں، اگرچہ اس کا انھیں خود نقصان ہوتا ہو، یا ان کے آباء اور اولاد کے خلاف ہی فیصلہ کرنا پڑے۔[1] ﴿ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ ﴾ [آل عمران: ١٠٢] کے تحت میں اس پر وضاحت کے ساتھ کلام گزر چکا ہے۔ ﴿ وَاسْمَعُوْا ﴾ یعنی اور اس حکم کو سنو جو تم کو کیا جاتا ہے ایسا سننا جس میں قبول کرنا ہو، کیوں کہ خالی سن لینے میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔

﴿ وَاَطِيْعُوْا ﴾ یعنی اور احکام کی اطاعت کرو۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ”اِسْمَعُوْا أَيْ: اِصْغَوْا“[2] یعنی اس شے کی طرف کان جھکاؤ جو تم پر نازل ہوتی ہے اور اس کے رسول کی اس شے میں اطاعت کرو جس کا تم کو حکم دیتا ہے اور جس سے تم کو منع کرتا ہے۔ ﴿ وَاَنْفِقُوْا ﴾ یعنی اپنے مالوں میں سے جو اللہ تعالیٰ نے تم کو دیے ہیں خرچ کرو نیک کاموں میں اور اطاعت میں اور ان کا بخل مت کرو۔

﴿ خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ﴾ منصوب ہے فعل مضمر سے جس پر ﴿ اَنْفِقُوْا ﴾ دال ہے۔ گویا یوں کہا گیا: ”اِئْتُوْا فِي الإِنْفَاقِ خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ“، یعنی تم اپنی جانوں کے لیے بھلائی کے کاموں میں خرچ کرو۔ ”أَوْ قَدِّمُوْا خَيْرًا لَهَا“ یعنی خیر کو اپنی جانوں کے لیے آگے بھیجو۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام کسائی اور فراء رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ مصدر محذوف کی نعت ہے: ”أَيْ: إِنْفَاقًا خَيْرًا“ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: (فتح البیان اور جمل میں ابوعبید ہے اور فتح القدیر میں ابوعبیدہ ہے۔ والله أعلم)۔ ﴿ كَانَ ﴾ مقدر کی خبر ہے: ”أَيْ: يَكُنِ الإِنْفَاقُ خَيْرًا لَكُمْ“ (یہ قلیل ہے اس لیے کہ ”كَانَ“ اور اس کے اسم کا حذف مع بقائے خبر صرف ”إِنْ“ اور ”لَوْ“ کے بعد ہوتا ہے۔ قاله الحفناوي)۔

اہلِ کوفہ نے کہا ہے کہ بنا بر حال منصوب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وَاَنْفِقُوْا ﴾ کا مفعول بہ ہے ”أَيْ: أَنْفِقُوْا مَالًا خَيْرًا“[3] (شاید یہ مفعول لہ ہے اس لیے کہ ”مَالًا“ تو مفعول بہ ہوا اور ”خَيْرًا“ مفعول لہ۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ترجمے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور خرچ کرو اپنے بھلے پر)۔ آیت میں ظاہر صرف خرچ کرنا ہے اس کے بغیر کہ زکاتِ واجبہ کے ساتھ اس کو مقید کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد فرض زکات ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نافلہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جہاد میں خرچ کرنا ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٨/١٤٤) [2] تفسير القرطبي (١٨/١٤٥) [3] فتح القدير (٥/٣١٧) فتح البيان (١٤/١٧٣)

﴿ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ یعنی اور جو کوئی اپنے جی کے لالچ سے بچایا جائے، پھر وہ اپنے مال میں سے سب قسم کا خرچ کرے جس کا اس کو حکم دیا گیا ہے، اس پر یقین کر کے اور اس کی طرف مطمئن ہو کر اور شح (حرص) اس کو اس سے نہ روکے تو ایسے لوگ ظافر بہر خیر (یعنی خیر کو حاصل کرنے والے) اور فائز بہر مطلوب (اپنی مطلوبہ چیز، یعنی جنت کو پالینے والے) ہیں۔ اس کی تفسیر کئی بار گزر چکی ہے۔

﴿ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دو، یعنی تم مال کو بھلائی کے کاموں میں اخلاصِ نیت سے اور دل کی خوشی سے خرچ کرو تو وہ اس کو تمھارے لیے مضاعف، یعنی کئی گنا کر دے گا اور نیکی کا بدلہ اس کے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دے گا اور اس کے ساتھ تمھارے گناہوں کے بخشنے کو بھی ملائے گا اور اللہ تعالیٰ قدردان ہے اور حلم والا ہے۔ جس نے اس کی اطاعت کی تو اس کو ثواب بہ اضعاف مضاعفہ، یعنی کئی گنا بڑھا چڑھا کر دیتا ہے اور جس نے اس کی نافرمانی کی اس کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ اس خرچ کرنے کا نام قرض رکھا کہ اللہ پاک نے اس پر مجازاۃ کرنے کا (جزا دینے کا) التزام کر لیا ہے کہ قرض کے ذکر میں استدعا میں تلطف ہے اور صدقے میں ترغیب ہے اس انداز سے کہ صدقے کو اللہ تعالیٰ کے لیے قرض ٹھہرایا، باوجود اس کے کہ بندہ تو اپنے ہی نفس کو قرض دیتا ہے، اس لیے کہ اس کا نفع اسی کی طرف لوٹتا ہے۔

امام قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا خطاب مالدار لوگوں پر تو ان کے مالوں کے خرچ کرنے میں متوجہ ہوتا ہے اور فقراء پر اس بات میں متوجہ ہوتا ہے کہ اپنے اوقات کو حق کی مراد اور انتظار سے خالی نہ رکھیں اور اپنے نفوس کی مراد پر اس کی مراد کو اختیار کریں۔ پس غنی سے تو کہا جاتا ہے کہ تو اپنے مال وغیرہ میں اپنی مراد پر میرے حکم کو اختیار کر اور فقیر سے کہا جاتا ہے کہ تو اپنے نفس میں اور اپنے قلب میں اور اپنے وقت میں میرے حکم کو اختیار کر۔ (كذا ذكر الخطيب) اس آیت کی تفسیر سورۃ البقرہ و سورۃ الحدید میں گزر چکی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے اپنے بندے سے قرض مانگا تو اس نے مجھے قرض دینے سے انکار کیا اور میرا بندہ مجھ کو گالیاں دیتا ہے اور وہ جانتا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے: ''وَا دَهْرَاه وَا دَهْرَاه'' اور میں دھر ہوں (یعنی بندہ تو ساری مصیبتوں کی نسبت دہر کی طرف کرتا ہے اور اس کو برا کہتا ہے، حالانکہ میں دہر کا خالق ہوں، دن اور رات کو لوٹتا پوٹتا ہوں، یعنی میرے ارادے اور مشیت سے سب کام ہوتے ہیں) پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی۔ [1] (أخرجه ابن جرير و الحاكم وصححه)

﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ یعنی وہ اس شے کا جاننے والا ہے جو غائب ہے اور اس شے کا جو حاضر ہے، اس میں سے اس پر کوئی مخفی شے بھی مخفی نہیں ہے۔ کسی نے یوں کہا ہے کہ وہ دلوں کے بھیدوں کا جاننے

---

[1] مستدرك الحاكم (٢/٥٣٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

والا ہے جو چھپے ہوئے ہیں اور ظواہرِ خطوب کا جاننے والا ہے جو منتشر ہیں، وہ غالب اور قاہر ہے، اس طرح سے کہ جو اشیاء گڑی ہوئی اور چھپی ہوئی ہیں ان کو ظاہر کر دیتا ہے۔ غیب کی خبر دینے میں اور اپنے کام میں وہ حکمتِ باہرہ کا مالک ہے۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ﴿ اَلْحَكِيْمُ ﴾ "هُوَ الْمُحْكِمُ لِخَلْقِ الْأَشْيَاءِ" یعنی اشیاء کی پیدائش کو پختہ کرنے والا ہے۔[1] والله أعلم بأسرار كلامه.

الحمد لله والمنة کہ سورۃ التغابن کی تفسیر ۲۹/شوال ۱۳۱۵ ہجری شبِ پنج شنبہ (جمعرات) قریب نیم شب مکمل ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آیندہ کی توفیق دے، آمین۔ ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم. ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار وصلى الله على سيدنا ومولانا محمد شفيع المذنبين ورحمة للعالمين وعلى آله وصحبه وأتباعه أجمعين، وبارك وسلم إلى يوم الدين، ملء ما علم وزنة ما علم وعدد ما علم، آمين، و الحمد لله أولا و آخرا وظاهرا وباطنا.

---

[1] فتح البيان (١٤/ ١٦٣ـ١٧٤)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

سُوْرَةُ الطَّلَاقِ

اس سورت مبارکہ کی گیارہ (۱۱) یا بارہ (۱۲) یا تیرہ (۱۳) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۃ الطلاق مدینے میں نازل ہوئی۔[2]
(أخرجه ابن الضريس والنحاس وابن مردويه والبيهقي)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ
وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ
بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ
وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ
لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ①

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو انھیں ان کی عدت کے (آغاز) وقت میں طلاق دو، اور عدت گنتے رہو۔ اور اللہ سے جو تمھارا رب ہے، ڈرو۔ تم انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو، اور نہ وہ خود نکلیں، مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کریں، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو شخص اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو یقیناً اس نے خود پر ظلم کیا۔ (اے مخاطب!) تو نہیں جانتا شاید اللہ تعالیٰ اس (طلاق) کے بعد کوئی نئی راہ نکال دے ①

عدت پر طلاق دو۔ عدت تین حیض ہیں، حیض سے پہلے دو کہ سارا حیض گنتی میں آئے اور اس پاکی میں نزدیکی نہ ہوئی ہو۔ اور طلاق کے وقت وہ عورت جس جگہ رہتی تھی اسی گھر میں عدت پوری کرے، نہ آپ نکلے نہ کوئی نکالے۔ یہ نکلنا بے حیائی ہے۔ یہ فرمایا کہ شاید پھر دونوں میں صلح ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ یہ نئی بات پیدا کر دے۔ انتہیٰ[1]

[1] تفسير القرطبي (۱۸/۱۴۸) [2] الدر المنثور (۸/۱۸۸)

فتح البیان کا بیان:

اس خطاب میں پانچ قول ہیں: ایک یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ ﷺ کی تعظیم کے لیے بہ لفظِ جمع خطاب ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو خطاب ہے۔ تقدیر یہ ہے: "يَأَيُّهَا النَّبِيُّ وَأُمَّتُهُ إِذَا طَلَّقْتُمْ"، پس معطوف حذف کیا گیا، اس لیے کہ اس کا مابعد اس پر دال ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ فقط آپ ﷺ کی اُمت کو خطاب ہے آپ ﷺ کی ندا کے بعد۔ یہ خطاب تلوینِ خطاب کے باب سے ہے کہ آپ ﷺ کو مخاطب کرنے کے بعد آپ ﷺ کی امت کو خطاب کیا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ بنا بر اضمارِ قول ہے: "أَيْ: يَأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأُمَّتِكَ إِذَا طَلَّقْتُمْ"۔ پانچواں قول یہ ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ کو خاص کر ندا کی اور خطاب کے ساتھ عام کیا، اس لیے کہ نبی اپنی امت کا امام اور پیشوا ہوتا ہے جس طرح کہ قوم کے سردار اور بڑے سے یوں کہتے ہیں: "يَا فُلَانُ اِفْعَلُوا كَيْتَ وَكَيْتَ" (یعنی اے فلاں! ایسا ایسا کام کرو) اس کے تقدم کا اعتبار کر کے اور حسنِ کلام کے ساتھ اس کی سرداری ظاہر کرنے کے لیے۔ یہ قول امام زمخشری رحمہ اللہ کا ہے۔[1] امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تیسرے قول کے معنی ہیں جو گزر چکا ہے۔ (یہ وجوہ سمین رحمہ اللہ نے ذکر کیے ہیں)۔

محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مابعد قرینے کے ساتھ مراد آپ ﷺ کی امت ہے۔[2] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی نبی کا لفظ بولا گیا اور اس سے اس کی امت مراد لی گئی تو گویا یوں کہا گیا: "يَأَيُّهَا الْأُمَّةُ إِذَا طَلَّقْتُمْ... الخ"۔ گازرونی اسی اسلوب پر چلے ہیں۔ تفسیر محلی کے ایک نسخے میں "اَلْمُرَادُ وَأُمَّتُهُ" بزیادتِ واو ہے، یعنی اس کلام میں اکتفا ہے برطریق اس آیت کے: ﴿ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ ﴾ [النحل: ٨١] "اور تمھارے کرتے جو تمھیں گرمی سے بچائیں۔" "أَيْ: وَالْبَرْدَ" چنانچہ اس بنا پر نبی کے لفظ میں کچھ مجاز نہیں ہے، بلکہ نبی کو اپنی امت کے ساتھ ندا کی گئی ہے تو گویا یوں کہا گیا: "يَأَيُّهَا النَّبِيُّ وَالْأُمَّةُ إِذَا طَلَّقْتُمْ... الخ" ﴿ إِذَا طَلَّقْتُمُ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ "إِذَا أَرَدْتُمْ تَطْلِيقَ النِّسَاءِ وَعَزَمْتُمْ عَلَيْهِ" یعنی جس وقت تم عورتوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو اور اس پر عزم کرو، یہ معنی اس بنا پر ہیں کہ جب کوئی شخص کسی کام پر متوجہ ہونے والا ہے، اس کے کرنے پر مستعد ہے، ابھی اسے شروع نہیں کیا تو اس کو اس شخص کے قائم مقام کرتے ہیں جو اس کام میں شروع کرنے والا ہے۔

اس مجاز کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قولہ تعالیٰ: ﴿ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾ ٹھیک ہو جائے، کیوں کہ شے اپنے نفس پر مترتب نہیں ہوتی اور نہ کسی کو تحصیلِ حاصل کا حکم کیا جاتا ہے، مثلاً: کوئی شخص عورت کو طلاق دے چکا، پھر تم اس کو حکم دو کہ تو اس کو طلاق دے یہ ایک بے معنی بات ہے۔

---

[1] الکشاف (٤/٥٥٤) [2] تفسیر الجلالین (٧٤٨/١)

﴿ اَلنِّسَآءَ ﴾ سے مراد وہ عورتیں ہیں جن سے دخول کیا گیا ہے اور وہ اقراء والیاں ہیں۔ اب رہیں وہ عورتیں جن سے دخول نہیں کیا گیا تو ان پر بالکل کچھ عدت نہیں ہے اور جو اشہر والیاں ہیں ان کا بیان قولہ تعالیٰ: ﴿ وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ ﴾ میں آئندہ آئے گا۔ ﴿ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾ کے معنی ہیں: "مُسْتَقْبِلَاتٍ لِعِدَّتِهِنَّ أَوْ فِيْ قُبُلِ عِدَّتِهِنَّ أَوْ لِقُبُلِ عِدَّتِهِنَّ أَوْ لِزَمَانِ عِدَّتِهِنَّ" وہ زمانہ طہر ہے۔ امام جرجانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرف لام بہ معنی "فِيْ" ہے "أَيْ: فِيْ عِدَّتِهِنَّ"۔ امام ابوحیان رحمہ اللہ نے کہا: "لِاسْتِقْبَالِ عِدَّتِهِنَّ" بنا بر حذف مضاف۔[1] حرف لام توقیت کے لیے ہے: "نَحْوُ لَقِيْتُهُ لِلَيْلَةٍ بَقِيَتْ مِنْ شَهْرِ كَذَا"۔ مراد یہ ہے کہ ان کو اس طہر میں طلاق دیں جس میں جماع واقع نہ ہوا ہو، پھر چھوڑ رکھی جائیں، یہاں تک کہ ان کی عدت پوری ہو جائے، چنانچہ جب تم نے ان کو ایسی طلاق دی تو واقعی تم نے ان کو ان کی عدت کے وقت میں طلاق دی۔

سنتِ مطہرہ سے اس کا بیان یہ ہے:

1. سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پڑھا ہے: "فِيْ قُبُلِ عِدَّتِهِنَّ"، یعنی ان کی شروع عدت میں۔ (رواه عبد الرزاق في المصنف و ابن المنذر والحاكم و ابن مردويه)
2. سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے پڑھا: "لِقُبُلِ عِدَّتِهِنَّ" (أخرجه ابن الأنباري)
3. امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ (أخرجه ابن الأنباري وسعيد بن منصور وغيرهما)
4. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ (أخرجه عبد الرزاق وغيره)
5. اور اس کی تفسیر میں فرمایا: "طَاهِرًا مِنْ غَيْرِ جِمَاعٍ" (أخرجه سعيد بن منصور وغيره)
6. سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو کوئی یہ ارادہ کرے کہ سنی طلاق دے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو امر فرمایا ہے تو چاہیے کہ اس کو اس حال میں طلاق دے کہ وہ بغیر جماع کے پاک ہو۔[2] (أخرجه عبد الرزاق وغيره)
7. سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی تو وہ اپنے گھر والوں کے پاس آ گئیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ چنانچہ آپ ﷺ سے کہا گیا کہ تم اس سے رجوع کر لو، بے شک وہ بڑی روزے رکھنے والی، بڑی قیام کرنے والی ہے اور وہ جنت میں تیری ازواج میں سے ہے۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم و أخرجه ابن جرير عن قتادة مرسلا)
8. سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اس حال میں طلاق دی کہ وہ حائضہ تھی، چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ ناراض ہوئے اور فرمایا: چاہیے کہ اس سے

---

[1] فتح القدير (٣١٩/٥) [2] الدر المنثور (١٩٠/٨) فتح القدير (٣٢٣/٥)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٩/١٠) تفسير الطبري (٤٣٦/٢٣) السلسلة الصحيحة (٢٠٠٧)

رجوع کرے، پھر اسے روک رکھے، یہاں تک کہ وہ طاہر ہو، پھر حائض ہو اور طاہر ہو جائے، پھر اگر اس کو یہ ظاہر ہو کہ اسے طلاق دے تو چاہیے کہ اس کو طلاق دے اس حال میں کہ طاہر ہو، اس سے پہلے کہ اسے چھوئے، چنانچہ وہ یہ عدت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ عورتیں اس کے وقت میں طلاق دی جائیں اور نبی مکرم ﷺ نے پڑھا: ”يَأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ فِيْ قُبُلِ عِدَّتِهِنَّ“ (خازن کے حاشیہ پر لکھا ہے: ”قال في شرح مسلم هي قراءة ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہم وهي شاذة لا تثبت قرآنا بالإجماع ولا يكون لها حكم خبر الواحد عندنا“[1] (أخرجه البخاری و مسلم وغيرهما))

9 سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت عبد یزید کے قصۂ طلاق میں نازل ہوئی۔[2] (وقد أخرجها ابن أبي حاتم أثرا طويلا قال الذهبي: إسناده واه و الخبر خطأ فإن عبد يزيد لم يدرك الإسلام وفي الباب أحاديث)

﴿ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ﴾ یعنی حفظ رکھو عدت کو اور حفظ رکھو اس وقت کو جس میں طلاق واقع ہوئی، یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے۔ عدت تین قروء ہیں: مستقبلات کوامل جن میں کسی طرح کا نقصان نہیں ہے۔ یہ خطاب خاوندوں کو ہے عورتوں کی غفلت کے سبب سے۔ کسی نے کہا ہے کہ خطاب بیویوں کو ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ علی العموم مسلمانوں کو خطاب ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ ساری ضمیریں خاوندوں کی ہیں، لیکن زوجات اس خطاب میں داخل ہیں اس طرح سے کہ ان کو ازواج کے ساتھ لاحق کریں، کیوں کہ خاوند تو عدت کا شمار اس لیے کرتا ہے، تا کہ رجوع کرے اور نفقہ دے یا قطع کرے اور رہنے کے لیے گھر دے یا نکالے اور اپنا نسب لاحق کرے یا قطع کرے۔ یہ سب معاملات خاوند اور بیوی کے درمیان مشترک ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ خاوند کو عدت کے شمار کرنے کا حکم کیا گیا تا کہ أقراء کی طلاق میں فرق ہو جب وہ اسے تین طلاقیں دینے کا ارادہ کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کو اس لیے حکم ہوا کہ رجوع کرنے کے زمانے کے باقی رہنے کا اسے علم ہو اور نفقہ اور رہائش دینے کی مراعات کا اسے علم رہے۔

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ﴾ یعنی اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے جو تمھارا رب ہے اس بات میں کہ ان کے لیے عدت کو لمبا کرو اور ان کو ضرر دو۔ یہاں جو اللہ تعالیٰ کا وصفِ ربوبیت بیان کیا کہ اس اللہ سے ڈرو جو تمھارا پالنے والا ہے، تم اس کی نعمتوں میں سراپائے غرقاب ہو رہے ہو، ہر دم ہر بات میں اس کے محتاج ہو، پس اس سے منظور تقوے کے حکم کی تاکید ہے اور ایجابِ اتقا میں مبالغہ ہے، کیوں کہ جو ذات پاک اس صفت سے موصوف ہے اس سے تو ضرور ہی ڈرنا چاہیے۔

﴿ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ ﴾ یعنی ان کو ان کے گھروں سے مت نکالو جن میں وہ طلاق کے وقت تھیں جب تک کہ عدت میں رہیں۔ ”بیوت“ کی نسبت جو عورتوں کی طرف کی، حالانکہ وہ تو ان کے خاوندوں کے ہیں،

[1] صحيح البخاري (٤٦٢٥) صحيح مسلم (١٤٧١) المنهاج للنووي (١٠/٦٩)

[2] مستدرك الحاكم (٢/٥٣٣) الدر المنثور (٨/١٨٩)

چنانچہ اس سے نہی کی تاکید مقصود ہے اور عدت کی مدت میں رہائش رکھنے کا استحقاق بیان کرنا ہے۔ اسی کی طرح یہ آیت ہے: ﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ﴾ [الأحزاب: ٣٤] ''اور تمھارے گھروں میں اللہ تعالیٰ کی جو آیتیں پڑھی جاتی ہیں ان کا ذکر کرتی رہو۔'' اور یہ آیت ہے: ﴿ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ﴾ [الأحزاب: ٣٣] ''اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو۔''

پھر جب اللہ پاک نے خاوندوں کو منع کیا ان کو ان گھروں سے نکالنے سے جن میں وہ طلاق واقع ہونے کے وقت تھیں تو عورتوں کو بھی خود نکلنے سے منع کیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لَا يَخْرُجْنَ ﴾ یعنی اور وہ عورتیں ان گھروں سے خود بھی نہ نکلیں، جب تک کہ وہ عدت میں رہیں مگر کسی ضروری کام سے چنانچہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگرچہ خاوندوں کی طرف سے اذن ہے، کیوں نہ ہو اس لیے کہ نکلنے کا حکم دینا اخراج کے حکم میں ہے۔[1] خطیب کہتے ہیں کہ نہ نکلنے کی یہ وجہ ہے کہ عدت میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے تو وہ دونوں کے باہم راضی ہونے سے ساقط نہیں ہوتا۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے نہ نکلیں لیکن جب خاوندوں نے ان کو اجازت دے دی ہو تو کوئی ڈر نہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ یہ سب اس وقت ہے جب عذر نہ ہو۔ اب رہا عذر کی وجہ سے نکلنا، جیسے کھانے پینے کی چیزیں خریدنا اس عورت کا جس کے لیے علاحدہ کرنے والے پر نفقہ نہیں ہے تو اس وقت اس کو دن میں نکلنا جائز ہے۔ (قاله الخطيب) امام قرطبی کہتے ہیں: اور جب وہ بغیر کسی عذر کے نکلے تو گناہ گار ہو گی اور اس کی عدت نہ ٹوٹے گی۔[2]

﴿ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ بہ فتح و کسرِ یاء دونوں قراءتیں سبعیہ ہیں۔ یہ استثناء اول جملے سے ہے (یعنی ﴿ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ ﴾) امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر مفسرین اس پر ہیں کہ یہاں ''فاحشة'' سے مراد زنا ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[4] (أخرجه عبد بن حميد و ابن المنذر) ''فاحشة'' یہ ہے کہ وہ زنا کرے تو اس پر حد قائم کرنے کے لیے اسے نکالا جائے، پھر اپنے گھر کی طرف واپس لائی جائے گی۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ فاحشہ بذاء ہے زبان میں اور جس شخص کے ساتھ اس کے گھر میں ساکن ہے اس کے ساتھ دست درازی ہے، یعنی زبان سے بے ہودہ باتیں بکتی ہے اور گھر والوں پر زبان درازی کرتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ''فاحشة مبينة'' یہ ہے کہ وہ عورت اس مرد کے گھر والوں پر بے ہودہ باتیں بکے۔ پھر جب وہ ان پر اپنی زبان سے بے ہودہ باتیں بکے تو ان کے لیے اس کو اس کی بدخلقی کے سبب سے گھر سے نکالنا حلال ہے۔[5] (أخرجه عبد الرزاق و سعيد بن منصور و ابن راهويه و عبد بن حميد و ابن جرير و ابن مردويه والبيهقي من طرق عنه)

---

[1] تفسير أبي السعود (٢٦٠/٨) [2] تفسير القرطبي (١٥٥/١٨) [3] فتح القدير (٣٢٠/٥)
[4] الدر المنثور (١٩٣/٨) [5] مصنف عبد الرزاق (٣٢٣/٦) تفسير الطبري (٤٣٩/٢٣) الدر المنثور (١٩٣/٨)

اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے جو امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہی ہے کہ ابی رضی اللہ عنہ کے مصحف میں "إِلَّا أَنْ يَّفْحَشْنَ عَلَيْكُمْ" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ استثناء دوسرے جملے سے ہے خروج سے نہی میں مبالغے کے لیے۔ یہ بات بیان کر کے کہ اس کا نکلنا ایک فاحشہ ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول بعید ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عدت پوری ہونے سے پہلے اس کا اپنے گھر سے نکلنا یہی "فاحشة مبينة" ہے۔[2] (أخرجه عبد الرزاق وعبد بن حميد و ابن المنذر والحاكم وصححه و ابن مردويه والبيهقي في سننه یہ اثر قول ماقبل کی تائید کرتا ہے) کسی نے کہا ہے کہ "فاحشة" "نشوز" (عورت کا بدخوئی کرنا) ہے۔

﴿ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ﴾ یعنی یہ احکام جو اللہ پاک نے اپنے بندوں کے لیے بیان فرمائے اس کی حدیں ہیں جو اُن کے لیے باندھی ہیں، ان کے لیے حلال نہیں کہ ان حدوں سے تجاوز کر کے غیر کی طرف جائیں۔ "هذه" نہ فرمایا ﴿ تِلْكَ ﴾ فرمایا جس میں بعد کے معنی ہیں باوجود اس کے کہ مشار الیہ قریب العہد ہے، چنانچہ اس سے منظور ان احکام کے بلند درجہ اور منزلت کی خبر دینا ہے، یعنی یہ احکام بڑے عالی درجہ بعید المنزلۃ ہیں، تم کو چاہیے کہ ان کا پاس رکھو اور ہرگز ان سے آگے نہ بڑھو۔

﴿ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ﴾ یعنی جو کوئی اللہ تعالیٰ کی حدوں کو تجاوز کر کے کسی اور کی طرف جائے، یا ان میں سے کسی میں خلل اندازی کرے تو یقیناً اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اس طرح سے کہ اس کو ہلاکت کے گھاٹوں پر لا اتارا اور اس کو ایسی جگہ پر لے آیا جہاں نقصان ہی نقصان ہے، اس لیے کہ اس نے جو اللہ تعالیٰ کی حدوں کو توڑا اور اللہ تعالیٰ کی کھینچی ہوئی لکیر سے آگے بڑھا تو وہ اس کو اس پر سزا دے گا۔ اس سے بڑھ کر اپنے نفس کے لیے برا کرنا اور کیا ہے! امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "أَيْ: بِأَنْ عَرَضَهَا لِلْعِقَابِ"[3] یعنی اپنے نفس پر ایسے ظلم کیا کہ اس کو عقاب کے لیے پیش کیا۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "أَيْ: أَضَرَّ بِهَا" یعنی اپنے نفس کو ضرر پہنچایا اور ظلم کی یہ تفسیر کہ نفس کو سزا کے لیے پیش کرنا (جیسے کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کی ہے، یہ بیضاوی پر رد ہے) اس تفسیر کو اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں مانتا: ﴿ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ﴾ (علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: "لا تدري أيها المخاطب"[4] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا: "يأيها المطلق") اس لیے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے مضمون شرطیہ کی تعلیل کے لیے لایا گیا ہے اور مفسرین نے مقرر کہا ہے کہ جس امر کو اللہ تعالیٰ احداث کرے وہ یہ ہے کہ مرد کے دل کو اس کام سے قلب کر دے اور وہ اس کام سے پھر جائے جو اس نے ظلم اور تجاوز کی بنا پر کیا تو اب ضروری ہے کہ ظلم

---

[1] فتح القدير (٣٢٠/٥) [2] مصنف عبد الرزاق (٣٢٣/٦) مستدرك الحاكم (٥٣٣/٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (٤٣١/٧)
[3] تفسير البيضاوي (٣٤٩/٥) [4] تفسير النسفي (٢٥٤/٤)

سے مراد دنیوی ضرر ہو جو اس زیادتی کی وجہ سے اسے لاحق ہو اور اس کا تدارک ممکن نہ ہو۔ یا اس سے مراد مطلق ضرر ہو جو دنیوی اور اخروی دونوں کو شامل ہے اور تعلیل دنیوی ضرر کے ساتھ خاص کی جائے، اس لیے کہ لوگ دنیوی ڈر سے زیادہ احتراز کرتے ہیں اور اس کو دور کرنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ اور ﴿ لَا تَدۡرِيۡ ﴾ کا خطاب متعدی کو ہے توجہ دلانے کے لیے، اس لیے کہ زیادتی سے زجر کرنے کے ساتھ مزید اہتمام منظور ہے۔

نبی مکرم ﷺ کو خطاب نہیں ہے، جیسا کہ وہم کیا گیا ہے، چنانچہ معنی یہ ہیں کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی حدوں سے تجاوز کرے اور زیادتی کرے تو یقیناً اس نے اپنے نفس کو ضرر پہنچایا، اس لیے اے متعدی! تو انجام کار کو نہیں جانتا، شاید اس تعدی کے بعد جو تو نے کی ہے، اللہ تعالیٰ تیرے دل میں کوئی ایسی بات پیدا کر دے جو اس کام کے خلاف ہو جو تو نے کیا ہے، پس وہ اس کے ساتھ بغض کو محبت سے بدل دے اور اس سے اعراض کرنے کے بدلے اس کی طرف متوجہ کر دے اور اس زیادتی کی تلافی کو آسان کر دے اور رجوع کرنے اور استئناف نکاح کی طرف مائل کر دے۔[1] انتھی۔

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سارے مفسروں نے کہا ہے کہ یہاں امر سے مراد رجوع کرنے میں رغبت ہے اور ایک یا دو طلاق پر آمادہ کرنا ہے اور تین طلاق سے نہی کرنا ہے، اس لیے کہ جب وہ تین طلاق دے گا تو اپنے نفس کو تکلیف پہنچائے گا، جب وہ جدائی پر نادم ہو گا اور رجوع کرنے کی طرف رغبت پیدا ہو گی، لیکن رجوع کرنے کی طرف کوئی راہ نہ پائے گا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بَعۡدَ ذٰلِكَ ﴾ یعنی ایک یا دو طلاق کے بعد ''أَمۡرًا بِالۡمُرَاجَعَةِ''[2] امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں ہے کہ وہ امر جو احداث کرے، یہ ہے کہ مرد کے دل میں ایک یا دو طلاق کے بعد رجوع کرنے کی محبت ڈال دے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اسے ایک وقت میں تین طلاق دے دیں تو قولہ تعالیٰ: ﴿ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ﴾ کے کچھ معنی نہ ہوں گے۔[3]

سیدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے ﴿ اَمۡرًا ﴾ کی تفسیر میں رجوع کرنا مروی ہے۔[4] (أخرجه ابن أبي حاتم)۔ محارب بن دثار سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جو طلاق سے زیادہ اسے مبغوض یعنی ناپسند ہو۔[5] (أخرجه أبو داود مرسلا) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ طلاق ہے۔[6] (رواه الثعلبي من حديثه) سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعا مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بیاہ کرو اور طلاق مت دو، پس بے شک طلاق سے عرش ہلتا ہے۔[7] سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ مت طلاق دو عورتوں کو مگر ریبت سے، بے شک اللہ عزوجل ذواقین اور ذواقات کو دوست نہیں

---

(1) تفسير أبي السعود (٢٦٠/٨، ٢٦١) (2) تفسير القرطبي (١٥٧/١٨، ١٥٨) (3) فتح القدير (٣٢٠/٥)
(4) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٥٩/١٠) (5) سنن أبي داود (٢١٧٧) یہ روایت مرسل ہے۔
(6) مستدرك الحاكم (٢١٤/٢) اس کی سند میں ''محمد بن عثمان بن ابی شیبہ'' متکلم فیہ راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (إرواء الغليل: ١٠٧/٧)
(7) الكامل لابن عدي (١١٢/٥) اس کی سند میں ''جویبر اور عمرو بن جمیع'' سخت ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٥٨٩٤)

رکھتا۔[1] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نہیں قسم کھائی طلاق کے ساتھ اور نہ اس کے ساتھ قسم لی مگر منافق ہے۔[2] (أسند جميعه الثعلبي رحمه الله في كتابه)

صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کو ابو داود اور ابن ماجہ نے عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے موصولاً روایت کیا ہے اور حاکم وغیرہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ نیز ابو داود اور بیہقی نے محارب بن دثار سے مرسلاً روایت کیا ہے جس میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ذکر نہیں ہے۔ ابو حاتم، دارقطنی اور بیہقی نے اس کے مرسل ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی مشہور ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے معاذ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی جو طلاق سے زیادہ اسے مبغوض ہو۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی سند ضعیف و منقطع ہے۔ انتہیٰ

رہی علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث تو اسے ابن عدی نے اپنی کتاب "الكامل في معرفة الضعفاء" میں ان سے ضعیف بلکہ موضوع سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے بھی اسے علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں عمر بن جمیع راوی ہے جو اثبات سے موضوع روایات بیان کرتا ہے۔ جہاں تک ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت کا تعلق ہے تو اسے امام طبرانی رحمہ اللہ نے ان سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام دارقطنی رحمہ اللہ نے "الأفراد" میں۔ امام طبرانی رحمہ اللہ نے اسے "المعجم الكبير" میں عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ مزے لینے والوں اور مزے لینے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس کی سند میں ایک بے نام راوی ہے۔ باقی راوی ثبات ہیں۔ رہی انس رضی اللہ عنہ کی روایت تو اسے حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں سخت ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جونسی عورت بلا وجہ اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرے، اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔[3] (أخرجه أبو داود والترمذي. كذا في فتح البيان)

عدتِ طلاق کا ذکر:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شرف اور عزت کے لیے پہلے خطاب کیا گیا، پھر تبعاً امت کو خطاب کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول: "اَلطُّهْرُ مِنْ غَيْرِ جِمَاعٍ" کا ذکر کرنے کے بعد یوں کہا ہے: "وروي عن ابن عمر رضي الله عنهما وعطاء ومجاهد والحسن وابن سيرين وقتادة وميمون بن مهران ومقاتل بن حيان مثل ذلك وهو رواية عن عكرمة والضحاك"

[1] المعجم الأوسط (٨/٢٤)

[2] تاریخ دمشق (٥٧/٣٩٣) اس کی سند میں "سوید بن عبدالعزیز" ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الجامع: ٥٠٥٥)

[3] سنن أبي داود، ٢٢٢٦) سنن الترمذي (١١٨٧) فتح البيان (١٤/١٧٧-١٨٣) صحيح الجامع (٢٧٠٦)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے (یعنی بروایتِ علی بن ابی طلحہ) کہ اس کو طلاق نہ دے اس حال میں کہ وہ حائض ہو اور نہ اس طہر میں جس میں اس سے جماع کر چکا ہے، لیکن اسے چھوڑ رکھے، یہاں تک کہ جب حائض ہو اور طاہر ہو جائے تو اس کو ایک طلاق دے دے۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عدت طہر ہے اور قرء حیض ہے۔ حاملہ ہونے کی صورت میں اس کو طلاق دے اس حال میں کہ اس کا حمل خوب ظاہر ہو گیا ہو اور اس کو اس حال میں طلاق نہ دے کہ اس سے صحبت کر چکا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ حاملہ ہے یا نہیں۔[1] اسی جگہ سے فقہاء نے طلاق کے احکام لیے ہیں اور اس کو طلاقِ سنت اور طلاقِ بدعت میں تقسیم کیا ہے۔ چنانچہ طلاقِ سنت تو یہ ہے کہ اسے اس حال میں طلاق دے کہ وہ پاک ہو بغیر جماع کے، یا حاملہ ہو اور اس کا حمل ظاہر ہو چکا ہو۔ بدعی طلاق یہ ہے کہ اسے حیض کی حالت میں طلاق دے اور اس طہر میں طلاق دے جس میں اس سے جماع کر چکا ہے اور نہیں جانتا کہ آیا وہ حاملہ ہوئی ہے یا نہیں۔ ایک تیسری طلاق ہے اس میں نہ سنت ہے نہ بدعت، یہ طلاقِ صغیرہ و آیسہ (ناامید) اور غیر مدخول بہا کی ہے۔ (وتحرير الكلام في ذلك وما يتعلق به مستقصى في كتب الفروع والله سبحانه و تعالى أعلم)

عدت میں نان ونفقہ خاوند کے ذمے ہے:

﴿ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ عدت کا حفظ کرو اور اس کی ابتداء اور انتہاء کو پہچانو، تاکہ عورت پر عدت طویل نہ ہو جائے کہ وہ ازواج (نکاح کرنے) سے باز رہے اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جو تمھارا رب ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ ﴾ یعنی عدت کی مدت میں اس کے لیے رہایش کا خاوند پر حق ہے جب تک کہ وہ اس کی عدت میں رہے۔ چنانچہ مرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کو گھر سے نکالے اور اس کو بھی گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اسے بھی خاوند کے حق کے لیے روکا گیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ یعنی وہ عورتیں اپنے گھروں سے نکالی نہ جائیں مگر اس صورت میں کہ عورت فاحشہ مبینہ کی مرتکب ہو تو اس گھر سے نکالی جائے گی۔ فاحشہ مبینہ زنا کو شامل ہے جیسا کہ ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم، سعید بن مسیّب، شعبی، حسن، ابن سیرین، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو قلابہ، ابو صالح، ضحاک، زید بن اسلم، عطا خراسانی، سدی اور سعید بن ابی ہلال رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے اور اس میں یہ شامل ہے کہ جب عورت نشوز (بدخوئی) کرے یا مرد کے گھر والوں پر بے ہودہ باتیں بکے اور کلام اور افعال میں ان کو ایذا دے، جیسا کہ ابی بن کعب، ابن عباس رضی اللہ عنہم اور عکرمہ رحمہ اللہ وغیرہم نے کہا ہے۔[2]

[1] تفسیر الطبري (٢٣/٤٣٢۔٤٣٦) تفسیر ابن کثیر (٤/٤٨٣، ٤٨٤) [2] تفسیر الطبري (٢٣/٤٣٨۔٤٣٩) تفسیر ابن کثیر (٤/٤٨٤)

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ﴾ یعنی یہ احکام اللہ تعالیٰ کے شرائع اور محارم ہیں اور جو کوئی ان سے نکلے اور ان سے تجاوز کرکے کوئی اور طرزِ عمل اختیار کرے اور ان کی بجا آوری نہ کرے تو یقیناً اس نے یہ کام کرکے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو عدت کی مدت میں مطلقہ عورت کو خاوند کے گھر میں باقی رکھا تو اس لیے کہ شاید وہ اس کی طلاق پر نادم ہو اور اللہ تعالیٰ اس کے دل میں رجوع کرنے کا خیال پیدا کردے تو یہ زیادہ سہل اور آسان ہو۔

امام زہری رحمہ اللہ نے عن عبید اللہ بن عبداللہ، عن فاطمۃ بنت قیس ﴿ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ﴾ میں روایت کیا ہے کہ اس سے مراد رجوع کرنا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔[1] اسی طرح امام شعبی، عطاء، قتادہ، ضحاک، مقاتل بن حیان اور ثوری رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ اسی جگہ سے سلف میں کے جانے والے اور ان کے تابعین جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جو گئے ہیں، وہ اس طرف گئے ہیں کہ مبتوتہ یعنی مقطوعہ کے لیے رہائش دینا واجب نہیں ہے اور اسی طرح وہ عورت جس کا خاوند مر گیا ہے۔ فاطمہ بنت قیس فہریہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث پر بھی اعتماد کیا ہے جب کہ ابو عمرو بن حفص رضی اللہ عنہ اس کے خاوند نے اس کو آخر تین طلاقیں دیں اور وہ اس عورت سے یمن میں غائب تھا، اس نے وہاں سے یہ اس کی طرف کہلا بھیجا، پھر اس کے وکیل نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف نفقے کے طور پر جو بھیجے تو وہ اس پر خفا ہوئی، چنانچہ وکیل نے کہا: واللہ! تیرے لیے ہم پر کچھ نفقہ نہیں ہے۔

پھر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے لیے اس پر کچھ نفقہ نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں یہ ہے اور نہ سکنیٰ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حکم دیا کہ ام شریک کے گھر میں عدت کرے۔ پھر فرمایا: وہ ایک عورت ہے کہ میرے اصحاب اس کے پاس آتے جاتے ہیں، تو ابن ام کلثوم کے پاس عدت کر، بے شک وہ ایک نابینا شخص ہے تو اپنے کپڑے رکھ سکے گی۔[2] (الحديث)

امام احمد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بطریقِ دیگر دوسرے الفاظ سے روایت کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ سوا اس کے نہیں کہ نفقہ اور رہائش عورت کے لیے اپنے خاوند پر ہے جب تک اس کے لیے رجوع کرنے کا موقع ہے، پھر جب اس کے لیے رجوع کرنے کا موقع نہ رہے تو نہ نفقہ ہے اور نہ سکونت۔[3] طبرانی کی حدیث میں ہے: فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: « إِنَّمَا السُّكْنَى وَالنَّفَقَةُ لِلْمَرْأَةِ إِذَا كَانَ لِزَوْجِهَا عَلَيْهَا رَجْعَةٌ فَإِذَا كَانَتْ لَا تَحِلُّ لَهُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَلَا نَفَقَةَ لَهَا وَلَا سُكْنَى »[4] (وكذا رواه النسائي عن أحمد بن يحيىٰ الصوفي عن أبي نعيم الفضل بن دكين عن سعيد بن يزيد وهو الأحمسي البجلي الكوفي قال أبو حاتم الرازي: هو شيخ يروى عنه)

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] صحيح مسلم (١٤٨٠)

[3] مسند أحمد (٣٧٣/٦) [4] المعجم الكبير (٣٨٢/٢٤) سنن النسائي (٣٤٠٣) تفسير ابن كثير (٤/٤٨٣ـ٤٨٥)

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ
وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ
يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ
اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ
يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ
لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾

پھر جب وہ اپنی عدت (ختم ہونے) کو پہنچیں تو تم انھیں معروف طریقے سے (اپنے پاس بحیثیت بیوی) روک لو یا انھیں معروف طریقے سے جدا کر دو، اور تم اپنے میں سے دو صاحبِ عدل آدمی گواہ بنا لو اور اللہ کے لیے گواہی قائم کرو، اس (حکم) کی اسے نصیحت کی جاتی ہے جو کوئی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے اور جو شخص اللہ سے ڈرے تو وہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے ② اور وہ اسے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان تک نہیں ہوتا۔ اور جو شخص اللہ پر توکل کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے، بے شک اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ بے شک اللہ نے ہر چیز کے لیے اندازہ مقرر کر رکھا ہے ③

طلاق دے کر عدت پوری ہونے سے پہلے اگر عورت کو رکھ لینا چاہے تو رجوع پر دو گواہ کر لے، تا کہ لوگوں میں متہم نہ ہو۔ انتہیٰ.

فتح البیان کا بیان:

﴿ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ یعنی پھر جب وہ عدت کی مدت پورا کرنے کے قریب ہوں اور اس کے آخر کے پاس آ لگیں تو ان سے رجوع کر لو اس نیت سے کہ آپس میں اچھا گزارا کرو گے اور باہم مناسب اتفاق کرو اور ان میں راغب ہو۔ یہ نیت نہ ہو کہ دوسری طلاق دے کر ان کو تکلیف دو اور دوسری عدت ان پر واجب کرو۔ یا ایذا دینے کے اور طریقے اختیار کرو۔ یا ان کو چھوڑ رکھو، یہاں تک کہ ان کی عدت پوری ہو جائے اور وہ اپنی جانوں کی مالک ہو جائیں، اس کے ساتھ ساتھ تم پر ان کے جو حقوق ہیں ان کو پورا کرو اور قول و فعل سے ان کو تکلیف پہنچانا چھوڑ دو، بے شک یہ آیت اپنی وضاحت سے تو اس بات کی ضامن ہے کہ بھلائی کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور منکرات سے اجتناب کی ضامن ہے۔

﴿ وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ یعنی اور اپنے میں دو صاحبِ عدل گواہ کر لو۔ ﴿ عَدْلٍ ﴾ سے مراد عدالت ہے، اس لیے کہ عدل ظلم کی ضد ہے اور عدالت کے معنی کی طرف راجع ہے۔ یہ شہادت رجوع کرنے پر ہے۔ کسی نے کہا کہ طلاق پر۔ کسی نے کہا کہ دونوں پر ہے، تاکہ تنازع کٹ جائے اور جھگڑے کا مادہ قطع ہو جائے۔ یہ امر ندب کے لیے ہے (استحبابی ہے) تاکہ دونوں میں جھگڑا اور انکار واقع نہ ہو۔ کما فی قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ﴾ [البقرۃ: ۲۸۲] ''خرید و فروخت کے وقت گواہ مقرر کر لیا کرو۔''

کسی نے کہا کہ حکم وجوب کے لیے ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ فرمایا کہ رجوع میں تو گواہ کرنا واجب ہے اور فرقت میں مندوب الیہ ہے، یعنی مستحب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے ایک قول میں یہ ہے کہ رجعت باقی حقوق کی طرح گواہ کرنے کی طرف محتاج نہیں ہے۔ اسی کے مثل امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے ایک شخص کے متعلق پوچھا کہ اس نے طلاق دی اور گواہ نہ کیے۔ فرمایا: اس نے برا کیا، طلاق تو بدعت میں دی اور رجوع غیر سنت میں کیا، لہٰذا وہ اپنی طلاق پر اور رجوع کرنے پر گواہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے[1] (اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں رجعت بغیر شہود کا ذکر ساقط ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابو داود اور ابن ماجہ کی ہے[2] جس کو امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے راویت کیا ہے: ''أنه سئل عن الرجل يطلق المرأة ثم يقع بها ولم يشهد على طلاقها ولا على رجعتها فقال: طلقت لغير سنة و راجعت لغير سنة، أشهد على طلاقها وعلى رجعتها ولا تعد'' از مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔

﴿ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ﴾ یہ گواہوں کو حکم ہے کہ وہ جس بات کے گواہ ہوئے ہیں اس کو تقرب الی اللہ کے لیے ادا کریں، یعنی محض اللہ تعالیٰ کے لیے بغیر دکھاوے کے شہادت دیں اور مشہود لہ و علیہ کا کچھ خیال نہ کریں۔ شہادت کے ادا کرنے پر اس لیے برانگیختہ کیا اور رغبت دلائی کہ اس میں گواہوں پر تنگی ہے، کیوں کہ بسا اوقات اسے اپنے اہم کاموں کو چھوڑنا پڑتا ہے اور اس لیے کہ اس میں حاکم سے ملاقات کی تنگی ہے جس کے پاس جا کر شہادت دینی پڑتی ہے اور کبھی اس کی جگہ دور ہوتی ہے اور گواہ کو کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ حکم خاوندوں کو ہے کہ شہادت کو قائم کریں، یعنی رجوع کرنے کے وقت گواہ لائیں، چنانچہ اب ﴿ وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ شہادت قائم کرنے کا حکم ہو گا اور ﴿ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ﴾ اس بات کا حکم ہو گا کہ وہ شہادت خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو نہ کہ مشہود علیہ و لہ کے لیے اور نہ ہی حق کے قائم کرنے اور ضرر کے دور کرنے کے سوا کسی اور غرض کے لیے ہو۔

﴿ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ یعنی یہ گواہ مقرر کرنے اور شہادت کا اللہ تعالیٰ کی

[1] مصنف عبد الرزاق (۶/۱۳۶) الدر المنثور (۸/۱۹۵) [2] سنن أبي داود (۲۱۸۶) سنن ابن ماجه (۲۰۲۵)

خاطر قائم کرنے کا امر جس کا ذکر گزرا، یا شروع سورت سے لے کر یہاں تک جو کچھ مذکور ہوا اس سے اس شخص کو نرم اور رقیق کیا جاتا ہے جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتا ہے۔ مومن کا ذکر اس لیے کیا کہ اس سے نفع لینے والا وہی ہے نہ کہ کوئی اور۔

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ﴾ یعنی جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے تو وہ اس کے لیے ان سختیوں اور تکالیف سے نکلنے کا راستہ کر دیتا ہے جن میں وہ واقع ہوا ہے۔ یہ جملہ اعتراضیہ ماسبق کی تاکید کرتا ہے۔ ماقبل میں سنت پر طلاق کے جاری کرنے کا حکم مذکور تھا۔ معنی یہ ہیں کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، پھر سنت کے مطابق طلاق دے اور عدت والی عورت کو ضرر نہ پہنچائے اور اسے اس کے گھر سے نہ نکالے اور احتیاط کرے، پھر گواہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ان غموں اور تنگیوں میں واقع ہونے سے جو ازواج کی شان میں ہوتی ہیں، اس کے لیے نکاسی کر دے اور ان کو اس سے دور کر دے اور اس کو خلاصی عطا فرمائے۔

کسی نے کہا ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے اس طرح سے کہ اس کے احکامات بجا لاتا ہے اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرتا ہے اور اس نے اپنے بندوں کے لیے جو حدیں باندھی ہیں ان کے پاس ٹھہرا رہے، ان سے آگے نہ بڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ان شداید اور تکالیف سے نکاسی کر دے جن میں وہ پڑ گیا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس کا مخرج یہ ہے کہ وہ جانے کہ وہ شے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اس کو عطا کرتا ہے اور وہی اس سے روکتا ہے اور وہی اس کو آزمایش میں ڈالتا ہے اور وہی اس کو عافیت دیتا ہے اور وہی اس سے تکلیف کو دور کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کو دنیا و آخرت کی ہر تکلیف سے نجات دے۔[1]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت قبیلۂ اشجع کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی، وہ فقیر خفیف ذات الید کثیر العیال تھا، یعنی اس کے عیال بہت تھے اور مال کم تھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اللہ تعالیٰ سے ڈر اور صبر کر، پھر وہ تھوڑی دیر ٹھہرا تھا کہ اس کا ایک بیٹا بکریوں کا گلہ لایا، دشمنوں نے اس کو پا لیا تھا (یعنی اس کو پکڑ لیا تھا، پھر وہ ان سے بکریاں لے کر چھوٹ آیا تھا) پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان بکریوں کے متعلق پوچھا تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو ان کو کھا۔ اس پر یہ آیت اتری: ﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ﴾[2] (أخرجه الحاكم، من طريق سالم بن أبي الجعد عن جابر وصححه و ضعفه الذهبي)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! میرے بیٹے کو دشمنوں نے قید کر لیا ہے اور اس کی ماں بے صبر ہو گئی ہے، چنانچہ آپ مجھے کیا

---

[1] الدر المنثور (۸/۱۹۵، ۱۹۶) [2] مستدرك الحاكم (۲/۵۳٤)

حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: میں تجھ کو اور اس کو یہ حکم دیتا ہوں کہ دونوں کثرت سے ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' پڑھو۔ وہ عورت بولی: جس کا تجھے حکم دیا ہے وہ اچھی شے ہے۔ پھر ان دونوں نے اس کو کثرت سے کہنا شروع کیا، چنانچہ دشمن اس کے بیٹے سے غافل ہو گئے اور وہ ان کی بکریاں ہانک کر لے آیا، پھر ان کو لے کر اپنے باپ کی طرف آیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] (أخرجه ابن مردويه من طريق الكلبي عن أبي صالح عنه وفي الباب روايات تشهد لهذا)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یہ اس کو دنیا کے فکر وغم سے کفایت کرے گا۔[2] سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پڑھنا شروع کیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بار بار کہنے لگے، یہاں تک کہ میں اونگھ گیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: او ابو ذر! اگر لوگ سارے اس کو لے لیتے تو البتہ ان کو کافی ہوتی۔[3] (أخرجه أحمد والحاكم وصححه وغيرهما وفي الباب أحاديث) امام کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں جو کوئی اللہ سے اس طرح سے ڈرے کہ مصیبت کے وقت صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے نار سے جنت کی طرف مخرج کر دے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مخرج اس شے سے جس سے اللہ نے نہی کی ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مخرج ہر اس شے سے جو لوگوں پر تنگ ہوئی۔ امام شعبی اور ضحاک رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ یہ خاص طور پر طلاق میں ہے جو کوئی ایسے طلاق دے، جیسا کہ اللہ نے اس کو امر فرمایا ہے تو اس کے لیے عدت کے اندر رجوع کرنے کے لیے راستہ کر دے اور وہ عدت کے بعد احد الخطاب کی طرح ہو گا۔[4]

﴿ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ یعنی اور دے اس کو کشادگی اور خلف جہاں سے اس کو خیال نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یعنی جہاں سے وہ نہیں جانتا۔[5] مطلب یہ ہے کہ ایسی وجہ سے جس کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آتا اور نہ اس کے وہم وگمان میں ہوتی ہے۔ حسین بن فضل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو کوئی فرائض کے ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو اس کے لیے عقوبت سے مخرج کر دے اور اس کو ثواب ایسی جگہ سے دے جہاں سے وہ خیال نہیں کرتا، یعنی اس کے لیے اس شے میں برکت دیتا ہے جو اس کو دی ہے۔ سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں جو کوئی اتباعِ سنت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو اس کے لیے اہلِ بدعت کی عقوبت سے نکلنے کا راستہ کر دے اور اس کو جنت دے جہاں سے وہ خیال نہیں کرتا۔[6] ان کے سوا اور قول بھی کہے ہیں۔

آیت کا ظاہر عام ہے، اس کو کسی قسم کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور جس میں سیاق ہے وہ تو بہ درجہ اولیٰ اس میں داخل ہے، اب اگر کوئی کہے کہ بہت سے اتقیاء کو دیکھتے ہیں کہ ان پر رزق میں تنگی کی گئی ہے تو

---

① الدر المنثور (۱۹۷/۸) ② تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳٦۰/۱۰)

③ مسند أحمد (۱۷۸/۵) مستدرك الحاكم (۵۳٤/۲) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ''ابو السلیل ضریب بن نقیر'' کا سماع سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ۲٦۵/۱)

④ تفسير القرطبي (۱٦۰/۱۸) ⑤ الدر المنثور (۱۹۵/۸) ⑥ تفسير القرطبي (۱٦۱،۱٦۰/۱۸)

جواب دیں گے: متقی رزق سے خالی نہیں رہتا اور آیت اس پر دال نہیں ہے کہ متقی کے لیے رزق میں وسعت کی جاتی ہے، بلکہ اس پر دال ہے کہ اس کو وہاں سے روزی ملتی ہے، جہاں سے اس کو خیال بھی نہیں ہوتا۔ اور یہ اتقیاء میں ایک مطرد (پے در پے) امر ہے۔ (أفاده الكرخي)

﴿ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾ یعنی اور جو کوئی اللہ تعالیٰ پر اس شے میں وثوق اور اعتماد کرے جو اسے پیش آئی ہے تو اس کو اس شے سے کفایت کرے جس نے اسے فکر میں ڈالا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہ متوکل نہیں ہے جو کہتا ہے کہ میری حاجت روائی کی جائے گی اور نہیں ہے ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی اس شے میں کفایت کرے جس نے اس کو فکر میں ڈالا اور اس سے وہ شے دور کرے جو اس کو ناپسند ہے اور اس کی حاجت کو پورا کرے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو فضیلت دی ہے جس نے اس پر توکل کیا اس پر جس نے توکل نہ کیا اس طرح کہ اس سے اس کے گناہ دور کرتا ہے اور اس کے لیے اجر بڑا کرتا ہے۔[1] سبحان اللہ! کیا منور قول ہے اس سے بہت سے اشکالوں کا جواب ہو جاتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ اپنے کام کو پہنچنے والا ہے، چنانچہ اس کام کا ہونا ضروری ہے، وہ اس کو نافذ و جاری کرے گا خواہ توکل حاصل ہو یا نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس پر اپنے امر کا قضا کرنے والا ہے جس نے توکل کیا اور اس پر جس نے توکل نہ کیا لیکن متوکل سے اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتا ہے اور اس کے لیے اس کے اجر کو عظیم کر دیتا ہے۔[2] جمہور نے بہ تنوین "بَالِغٌ" ونصب "أَمْرَهٗ" پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی حفص نے) بہ اضافت پڑھا ہے یہ سبعیہ ہے (اور اسی طرح قراءتِ سابقہ بھی سبعیہ ہے) اور کسی نے (یعنی ابن ابی عبلہ، داود بن ابی ہند، ابوعمرو فی روایۃ عنہ نے) بہ تنوین "بَالِغٌ" و رفع "أَمْرُهٗ" پڑھا ہے، اس لیے کہ "بَالِغٌ" کا فاعل ہے، یا یوں کہو کہ "أَمْرُهٗ" مبتدائے موخر ہے اور "بَالِغٌ" خبر مقدم۔

امام فراء رحمہ اللہ اس قراءت کی توجیہ میں فرماتے ہیں: "أَيْ: أَمْرُهٗ بَالِغٌ" اور کسی نے (یعنی مفضل نے) "بَالِغًا" بہ نصب پڑھا ہے بنا بر حال اور ﴿ اِنَّ ﴾ کی خبر قولہ: ﴿ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾ ہو گی۔[3] پہلے اور دوسرے کی بنا پر معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک اس امر کو پہنچنے والا ہے جس کا ارادہ کرتا ہے، کوئی شے اس سے رہ نہیں جاتی اور نہ کوئی مطلوب اس کو عاجز کرتا ہے۔ تیسرے کی بنیاد پر یہ معنی ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ کا امر نافذ ہے، اس کو کوئی شے رد نہیں کرتی۔

﴿ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾ یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے لیے ایک تقدیر یا وقت یا مقدار رکھی ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتی، بے شک ساری مخلوق اس بات کی کوشش کرے کہ وہ اس سے تجاوز کرے۔ چنانچہ

[1] تفسير الطبري (٢٣/٤٤٨، ٤٤٩) الدر المنثور (٨/٢٠٠) [2] فتح القدير (٥/٣٢٤) [3] فتح القدير (٥/٣٢١)

اللہ پاک نے شدت کے لیے ایک مدت رکھی ہے کہ وہ اس تک منتہی ہو گی اور نرمی اور راحت کے لیے ایک مدت ٹھہرائی ہے کہ وہ اس تک منتہی ہو گی۔ یہ اس بات کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا اور اپنے کام اس کے سپرد کرنا واجب ہے، اس لیے کہ بندہ جب یہ جان لے گا کہ ہر شے، یعنی رزق وغیرہ نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور توقیت (مقررہ وقت) پر تو اب کچھ باقی نہ رہا، مگر تقدیر کو اور توکل کو تسلیم کرنا۔

امام سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قدر سے مراد حیض اور عدت کی تقدیر ہے،[1] اس لیے کہ آیت کا سیاق اسی بارے میں ہے، یہ بھی تقدیر کی مختلف باتوں میں سے ایک ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یعنی "أَجَلًا وَمُنْتَهًى يَنْتَهِي إِلَيْهِ"[2] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اگر تم اللہ پر توکل کرتے، جیسا کہ اس کے توکل کا حق ہے تو البتہ تم رزق دیے جاتے جیسے پرندے رزق دیے جاتے ہیں، وہ صبح کو خالی شکم ہو کر جاتے ہیں اور شام کر پُر شکم ہو کر آتے ہیں۔[3] (أخرجه أحمد والترمذي والنسائي و ابن ماجه والحاكم وصححه وغيرهم. كذا في فتح البيان)

مطلقہ عورت سے احسان کا حکم:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عدت والی عورتیں جب عدت ختم ہونے کے قریب ہوں اور عدت بالکل فارغ نہ ہو جائے تو خاوند یا تو اس کو روک رکھنے پر عزم کرے، وہ یہ ہے کہ اس کو اپنی عصمتِ نکاح کی طرف پھیرے اور جس حال پر وہ اس کے پاس تھی اسی پر مستمر رہے، یعنی برقرار رہے۔ ﴿ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اس کی صحبت میں اس پر احسان کرے، اس کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھے۔ یا یہ کہ اس کو معروف کے ساتھ علاحدہ کرنے کا عزم کر لے، یعنی بغیر اس کے کہ اس کو برا کہے، گالیاں دے، سختی اور درشتی کرے، بلکہ اچھی طرح اور احسن طریقے سے اسے طلاق دے دے۔

﴿ وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ یعنی اپنے میں سے دو صاحبِ عدل گواہ کر لو جب رجوع کرنے کا ارادہ کرو، جیسا کہ امام ابو داود اور ابن ماجہ نے سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کسی نے ان سے اس شخص کے بارے میں پوچھا جو عورت کو طلاق دیتا ہے، پھر اس سے صحبت کرتا ہے اور نہ اس کی طلاق پر گواہ کیے اور نہ اس کے رجوع کرنے پر تو فرمایا: "طَلَّقْتَ لِغَيْرِ سُنَّةٍ وَرَاجَعْتَ لِغَيْرِ سُنَّةٍ" یعنی تو نے دونوں کام طلاق و رجوع خلافِ سنت کیے، اس کی طلاق پر اور اس کی رجعت پر گواہ کر اور پھر ایسا کام مت کرنا۔[4] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا

[1] تفسير الطبري (٤٤٩/٢٣) [2] الدر المنثور (٢٠٠/٨)

[3] مسند أحمد (٣٠/١) سنن الترمذي (٢٣٤٤) سنن ابن ماجه (٤١٦٤) مستدرك الحاكم (٣٥٤/٤) فتح البيان (١٨٣/١٤-١٨٦) صحيح الجامع (٥٢٥٤)

[4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کہ امام عطا رحمہ اللہ کہتے تھے کہ نکاح اور طلاق اور رجوع کرنے میں دو عادل گواہ ضروری ہیں، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے، مگر یہ کہ کسی عذر سے ہو۔[1]

﴿ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ یہ گواہ کرنا اور گواہی کا قائم کرنا جس کا ہم نے تم کو حکم کیا اس کی بجا آوری وہی کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتا ہے اور اس بات پر کہ یہ امر مشروع ہے اور وہ شخص جو دارِ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی سزا سے ڈرتا ہے۔ اسی جگہ سے امام شافعی رحمہ اللہ اپنے احد القولین (دو اقوال میں سے ایک) میں اس طرف گئے ہیں کہ رجوع کرنے میں گواہ کرنا واجب ہے جس طرح ان کے نزدیک نکاح کے شروع میں واجب ہے۔ علماء کا ایک گروہ اسی کا قائل ہے، اور جو اس کا قائل ہے وہ یہ کہتا ہے کہ رجعت نہیں ہوتی مگر زبان سے، تا کہ اس پر گواہ کرنا واقع ہو سکے۔

تقوے کے فوائد:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ﴾ یعنی جو کوئی اللہ سے اس بات میں ڈرے جس کا اسے حکم کیا اور اس شے کے ترک کرنے میں جس سے اس کو منع کیا تو وہ اس کے لیے اس کے امر سے ایک مخرج کر دے اور اس کو ایسی جہت سے روزی دے جس کا اسے خیال تک نہ ہو۔ اس کے بعد سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بیان کی ہے، اس میں اتنا زیادہ ہے: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: او ابو ذر! تو کیسے کرے گا جب مدینے سے نکالا جائے گا؟ میں نے کہا: میں فراخی اور راحت کی طرف جاؤں گا تو میں مکے کے کبوتروں سے ایک کبوتر ہوں گا، فرمایا: تو کیا کرے گا جب مکے سے نکالا جائے گا؟ میں نے عرض کی کہ شام وارضِ مقدس کی طرف فراخی اور راحت کی طرف جاؤں گا۔ فرمایا: اور کیسے کرے گا جب شام سے نکالا جائے گا؟ میں نے عرض کی: اب تو اس کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! میں اپنی تلوار اپنے کندھے پر رکھوں گا۔ فرمایا: « أَوْخَيْرٌ مِنْ ذَلِكَ قُلْتَ أَوْ خَيْرٌ مِنْ ذَلِكَ » (یعنی تیرا عمل جو تو نے پہلے ذکر کیا وہ ہو یا جو اس سے بہتر ہے وہ ہو، اسی قیاس پر معنی جملہ جواز کے ہیں اور اگلا قول اس خیر کا بیان ہے)۔ فرمایا: تو سنے اور مانے اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہو۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قرآن میں جامع تر آیت یہ ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ﴾ [النحل: ۹۰] ''اللہ تعالیٰ عدل کا، بھلائی کا حکم دیتا ہے۔'' اور کشادگی کی رو سے سب سے کثیر آیت یہ ہے: ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ﴾[3] (أخرجه ابن أبي حاتم)

مسند میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ جو کوئی استغفار کی کثرت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر ہم سے فرج، یعنی کشادگی اور ہر تنگی سے نکاسی کر دے اور اس کو روزی وہاں سے دے جہاں سے وہ خیال نہیں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٨٥) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٨٦)

کرتا۔[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جو کوئی طلاق دے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا ہے تو وہ اس کے لیے مخرج (نکلنے کا راستہ) کر دے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اس کے لیے شبہاتِ امور سے اور موت کے نزدیک تکلیف سے نکلنے کا راستہ کر دے اور اس کو وہاں سے روزی دے جہاں سے اسے کوئی امید نہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ''وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُطَلِّقْ لِلسُّنَّةِ وَيُرَاجِعُ لِلسُّنَّةِ'' یعنی جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس طرح سے کہ سنت کے مطابق طلاق دے اور اس کے بعد رجوع کرے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے عوف بن مالک کا قصہ بیان کیا ہے، کچھ الفاظ کا فرق ہے۔[2] سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ بے شک بندہ البتہ گناہ کے سبب سے جو وہ کرتا ہے رزق سے محروم ہوتا ہے۔ اور رد نہیں کرتی قضا کو مگر دعا اور زیادہ نہیں کرتا عمر میں مگر بر (نیک کام)۔[3] (أخرجه الإمام أحمد ورواه النسائي وابن ماجه من حديث سفيان وهو الثوري به)

اس کے بعد بہ روایتِ محمد بن اسحاق عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کا قصہ ذکر کیا ہے۔[4] سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے جو کوئی اللہ تعالیٰ کی طرف منقطع ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کی ہر مؤنت (رنج وتکلیف) میں کفایت کرتا ہے اور اس کو وہاں سے روزی دیتا ہے جہاں سے اسے خیال بھی نہیں ہوتا اور جو کوئی دنیا کی طرف منقطع ہوا تو اس کو اس کی طرف سونپ دیتا ہے۔[5] (أخرجه ابن أبي حاتم) اس کی سند میں فضیل بن عیاض اور عمران کے درمیان ہشام بن حسن کا واسطہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''اے لڑکے! میں تمھیں کچھ باتیں سکھاتا ہوں (انھیں اچھی طرح یاد رکھو) تم اللہ (کے اوامر ونواہی) کی حفاظت کرو، وہ تمھاری حفاظت فرمائے گا، اللہ (کے حقوق) کی حفاظت کرو، تم اسے (ہمیشہ) اپنے سامنے پاؤ گے، جب کچھ مانگو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مانگو، جب مدد طلب کرو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کرو اور اس بات کو خوب جان لو کہ اگر ساری امت اس بات پر جمع ہو جائے کہ وہ تمھیں نفع پہنچائے تو وہ صرف وہی نفع پہنچا سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے لکھ رکھا ہے اور اگر وہ سارے اس بات پر جمع ہو جائیں کہ تمھیں نقصان پہنچائیں تو وہ تمھیں صرف وہ نقصان پہنچا سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے لکھ رکھا ہے، قلموں کو اٹھا لیا گیا ہے اور صحیفے خشک ہو گئے ہیں۔''[6] (أخرجه الإمام أحمد وقد رواه الترمذي من حديث الليث بن سعد وابن لهيعة به وقال: حسن صحيح) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس شخص

---

[1] مسند أحمد (١/٢٤٨) اس کی سند میں ''حکم بن مصعب'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع: ٥٤٧١)

[2] تفسير الطبري (٢٣/٤٤٦۔٤٤٨)

[3] مسند أحمد (٥/٢٧٧) سنن ابن ماجه (٤٠٢٢) اس حدیث کا پہلا جملہ (بے شک بندہ ... محروم ہوتا ہے) ثابت نہیں ہے البتہ باقی روایت صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الصحيحة: ١٥٤)

[4] تفسير ابن كثير (٤/٤٨٧)

[5] المعجم الأوسط (٣/٣٤٦) اس کی سند میں ''ابراہیم بن اشعث'' ضعیف راوی ہے۔

[6] مسند أحمد (١/٢٩٣) سنن الترمذي (٢٥١٦) صحيح الجامع (٧٩٥٧) ضعيف الترغيب والترهيب (١٦٣٨)

کو کوئی ضرورت پیش آئی تو اس نے اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا تو وہ کس قدر لائق ہے کہ اس کی حاجت روائی نہ ہو اور جس نے اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا تو اللہ تعالیٰ اس کی اس ضرورت کو جلد ملنے والے رزق سے پوری کرے گا یا اس کی موت میں تاخیر کرے گا۔[1] (أخرجه الإمام أحمد)

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ﴾ یعنی بے شک اللہ اپنی خلق پر اپنے فیصلے اور احکام کو نافذ کرنے والا ہے جو کچھ ارادہ کرتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے۔ ﴿ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴾[2] [الرعد: ۸] ''ہر چیز اس کے پاس اندازے سے ہے۔''

وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ
فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ
اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ
اَمْرِهٖ يُسْرًا۝ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ
يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا۝

اور وہ جو حیض سے مایوس ہو جائیں تمھاری (طلاق یافتہ) عورتوں میں سے، اگر تم شک میں پڑو تو اُن کی عدت تین ماہ ہے، اور (اسی طرح) ان کی بھی جنھیں (ابھی) حیض نہیں آیا۔ اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔ اور جو شخص اللہ سے ڈرے تو وہ اس کے لیے اس کے کام میں آسانی فرما دیتا ہے④ یہ اللہ کا حکم ہے جسے اس نے تمھاری طرف نازل کیا ہے اور جو (شخص) اللہ سے ڈرے تو وہ اس سے اس کی برائیاں مٹا دیتا ہے اور اسے زیادہ اجر دیتا ہے⑤

یعنی تین حیض عدت فرمائی، اگر شبہہ رہا ہو کہ جس کو حیض نہیں آیا یا بڑی عمر کے سبب سے موقوف ہوا اس کی عدت کیا ہوگی تو بتا دیا کہ تین مہینے۔ انتہی.

فتح البیان کا بیان:

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب سورۃ البقرہ میں عورتوں کی عدت کے بارے میں آیت نازل ہوئی تو اہلِ مدینہ میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ ابھی عورتوں کی عدت میں سے کچھ عدتیں باقی ہیں جن کا قرآن میں ذکر نہیں کیا گیا، یعنی چھوٹی عمر کی عورتیں اور وہ بڑی عمر کی عورتیں جن کا حیض منقطع ہو چکا ہے اور حمل والی عورتیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ

---

[1] مسند أحمد (۳۸۹/۱) السلسلة الصحيحة (۲۷۸۷) [2] تفسير ابن كثير (۴۸۵/۴۔۴۸۷)

﴿اَشْهُرٍ﴾[1] (أخرجه إسحاق بن راهويه وغيره يعني ابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم و الحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقي في سننه) یعنی تمھاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے نا امید ہو گئیں ان کے متعلق اگر تمھیں شک ہو اور تم نہ جانو کہ ان کی عدت کیسی ہے اور اس کا کیا اندازہ ہے۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر تم یقین کرو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو ترجیح دی ہے کہ شک کے معنی میں ہے اور یہی ظاہر ہے۔[2]

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صفت کا شقہ ہے، اس لیے کہ ان کی عدت یہی تین ماہ ہے برابر ہے کہ شک ہو یا نہ ہو۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر تم اس کے حیض میں شک کرو اور واقعی اس سے حیض منقطع ہو چکا ہے اور وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کو حیض آتا ہے اور وہ جوان جیسی ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اگر تم شک کرو، یعنی آیسہ کی اور اس عورت کی عدت کو نہ جانو جسے حیض نہیں آیا تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اگر تم اس خون میں شک کرو جو اس عورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حیض ہے یا نہیں، بلکہ استحاضہ ہے تو عدت یہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اگر تم ان عورتوں کے خون کے بارے میں شک کرو جو مبلغِ ''یأس'' کو پہنچنے والی ہیں اس کا اندازہ کیا ہے، ساٹھ برس یا پچپن برس کی عمر کا تو ان کی عدت یہی ہے جو مذکور ہوئی۔ یہ سیدنا عثمان، علی، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور اسی کے قائل امام عطا رحمہ اللہ ہیں اور اسی طرف امام شافعی رحمہ اللہ اور اصحابِ رائے گئے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نو مہینے انتظار کرے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: سال بھر تک انتظار کرے، پھر اس کو اگر حیض نہ آیا تو تین مہینے عدت کرے،[4] لہٰذا جب یہ عدت اس کی ہے جس میں شک کیا جاتا ہے تو جس میں شک نہیں کیا جاتا وہ تو اس کی زیادہ تر مستحق ہے۔

﴿وَالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ﴾ یعنی وہ عورتیں جو چھوٹی عمر ہونے کی وجہ سے حائض نہیں ہوئیں، یعنی وہ حیض کی عمر کو نہیں پہنچیں، یا اس لیے کہ اصلاً ان کو بالغ ہونے کے باوجود حیض نہیں ہے۔ (كما قاله الخطيب) تو ان کی عدت بھی تین مہینے ہے۔ اس کو اس لیے حذف کر دیا ہے کہ اس کا ماقبل اس پر دال ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کی خبر مفرد مقدر کی جائے: ''أَيْ: فَكَذٰلِكَ'' اور ''مِثْلُهُنَّ'' اور اگر یوں کہا جاتا کہ یہ ﴿وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ﴾ پر معطوف ہے اس طرح سے کہ مفرد کا عطف مفرد پر ہے اور خبر دی جاتی سب کی ﴿فَعِدَّتُهُنَّ﴾ سے تو ایک وجہ حسین ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ جو بات اس میں ہے وہ صرف یہ ہے کہ مبتداء کے اور اس کے درمیان جو اس پر معطوف ہے خبر متوسط ہو گئی۔ یہ شیخ امام ابوحیان رحمہ اللہ کے قول کا ظاہر ہے۔[5]

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ یعنی حمل والی عورتوں کی عدت کی انتہاء وضعِ حمل ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٤٥١/٢٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٦٠/١٠) مستدرك الحاكم (٥٣٤/٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (٤٢٠/٧) اس کی سند میں ''عمرو بن سالم'' مجہول راوی ہے، نیز اس کا سماع سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسير الطبري (٤٥٢/٢٣) [3] تفسير القرطبي (١٦٤/١٨) [4] تفسير البغوي (١٥٣/٨) [5] البحر المحيط (٢٨٠/٨)

آیت کا ظاہر یہ ہے کہ حاملہ عورتوں کی عدت وضعِ حمل سے ہی پوری ہو جاتی ہے، خواہ وہ مطلقہ ہوں یا ان کے خاوند مر گئے ہوں اور اس کا عموم باقی ہے تو یہ آیت: ﴿ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ﴾ [البقرة: ٢٣٤] کی مخصص ہو گی، یعنی جب تک کہ وہ حاملہ نہ ہوں اور اس کا عکس صرف اس لیے نہیں کیا گیا کہ اس آیت کی عموم پر محافظت اس آیت کے عموم پر محافظت سے اولیٰ ہے، کیونکہ سورۃ البقرۃ کی آیت میں جو ﴿ اَزْوٰجًا ﴾ [البقرة: ٢٣٤] ہے اس کا عموم بدلی ہے، ایک حال میں سارے افراد کے لیے صلاحیت نہیں رکھتا، اس لیے کہ سیاقِ اثبات میں جمع منکر ہے۔

اب رہا ﴿ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ ﴾ تو اس کا عموم شمولی ہے، اس لیے کہ موصول من جملہ صیغ عموم ہے اور یہ بھی ہے کہ حکم یہاں معلل بہ وصف حملیہ ہے۔ بہ خلاف اس کے جو وہاں ہے اور یہ بھی ہے کہ یہ آیت نزول میں سورۃ البقرہ کی آیت سے بعد میں ہے۔ اس کی اس پر تقدیم بہ تخصیص ہے اور اس کی تقدیم اس صورت میں کہ اگر اس کے عموم پر عمل کیا جاتا تو اس حکم کا رفع ہوتا جو خاص میں ہے پس یہ نسخ ہوتا، حالاں کہ تخصیص نسخ سے اولیٰ ہے۔ سورۃ البقرہ میں اس پر مکمل کلام گزر چکا اور ہم نے اس آیت کے ضمن میں اس پر بحث کی ہے اور ایک دوسری آیت کے ضمن میں جو یہ ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ﴾ [البقرة: ٢٣٤] ''تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس (دن) عدت میں رکھیں۔''

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یہ تین طلاق دی ہوئی عورت ہے، یا وہ ہے جس کا خاوند مر گیا ہے؟ فرمایا: یہ تین طلاق دی ہوئی عورت ہے اور وہ ہے جس کا خاوند مر گیا ہے۔[1] (أخرجه عبد الله بن أحمد في زوائد المسند وأبو يعلىٰ وغيرهما وروي بوجه آخر مرفوعاً عنه)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کو یہ خبر پہنچی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ آخر الاجلین کی عدت کرے تو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بولے: جو کوئی چاہے میں اس بات پر اس سے لعان کروں کہ جو آیت سورۃ النساء قصریٰ میں ہے (قصریٰ تانیث ہے اقصر کی۔ قصریٰ سے مراد سورۃ الطلاق ہے اور طولیٰ سورۃ البقرہ ہے، اس لیے کہ وفات کی عدت سورۃ البقرہ میں چار مہینے دس دن ہے اور سورۃ الطلاق میں وضع حمل ہے۔[2] كذا في المجمع) وہ سورۃ البقرہ کے بعد میں نازل ہوئی ہے: ﴿ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ اتنے اتنے مہینوں کے بعد نازل ہوئی اور ہر طلاق دی ہوئی، یا جس کا خاوند وفات دیا گیا، چنانچہ اس کی مدت یہ ہے کہ وہ بچہ جن دے۔[3] (أخرجه عبد الرزاق وسعيد بن منصور وعبد بن حميد وأبو داود وابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم والطبراني وابن مردويه من طرق عنه وروى عنه نحو هذا من طرق وبعضها في صحيح البخاري)

---

[1] مسند أحمد (١١٦/٥) اس کی سند میں ''مثنی بن صباح'' ضعیف راوی ہے۔ [2] مجمع بحار الأنوار (٢٨٩/٤)

[3] مصنف عبد الرزاق (٤٧١/٦) سنن أبي داود (٢٣٠٧) تفسير الطبري (٤٥٣/٢٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٦١/١٠)

صحیحین وغیرہما میں سیدہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث سے ثابت ہوا ہے کہ سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا کا خاوند فوت ہو گیا اور وہ حاملہ تھی، چنانچہ اس کے فوت ہونے کے چالیس دن بعد اس نے بچہ جن دیا، پھر لوگوں نے اس سے نکاح کا پیغام کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا نکاح کرا دیا۔[1] اس بارے میں اور حدیثیں ہیں۔

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ﴾ یعنی جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اس کے احکام کی بجا آوری میں اور اس کی نافرمانی سے بچنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو اس پر اس کا کام دنیا اور آخرت میں آسان کر دے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اس کی نافرمانیوں سے بچے تو اللہ تعالیٰ اس کے امور اس کے لیے آسان کر دے اور اس کو اطاعت کی توفیق دے دے۔[2] ﴿ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ﴾ یعنی یہ احکام اور عدت کی تفصیلات جن کا بیان ہوا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے اور اس کی شریعت ہے جو اس نے ان کے لیے مشروع کی ہے۔ اس کو اپنی کتاب میں اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا ہے اور تمھارے لیے اس کو بیان کیا ہے اور اس کے احکام کی تفصیل کی ہے اور اس کے حلال وحرام کی وضاحت کی ہے۔

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ﴾ یعنی اور جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرے اس طرح سے کہ جس بات کو وہ پسند نہیں کرتا اس کو چھوڑ دے تو وہ اس سے اس کی برائیاں اتار دے جو اس نے کی ہیں، اس لیے کہ تقویٰ گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے۔ اور اس کو آخرت میں اجرِ عظیم عطا کرے، یعنی جنت جو تمام اجروں اور نعمتوں کا گھر ہے۔[3] -(كذا في فتح البيان)

حیض سے ناامید اور جسے ابھی حیض نہ آیا ہو ان کی عدت:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ آیسہ کی عدت بیان فرماتا ہے۔ یہ وہ عورت ہے جس سے اس کی بڑی عمر ہونے کی وجہ سے حیض منقطع ہو چکا ہے۔ وہ عدت تین ماہ ہے تین قروء کے بدلے جو اس عورت کے لیے ہے جس کو حیض آتا ہے جس طرح کہ سورۃ البقرہ کی آیت اس پر دال ہے۔[4] اسی طرح وہ کم سن لڑکیاں جو حیض کے سن کو نہیں پہنچیں ان کی عدت بھی آیسہ کی طرح تین مہینے ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ اِنِ ارْتَبْتُمْ ﴾ میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے اگر وہ عورتیں خون دیکھیں اور تم اس کے حیض یا استحاضہ ہونے میں شک کرو۔ یہ سلف کے ایک گروہ کا قول ہے، جیسے: امام مجاہد، زہری اور ابن زید رحمہم اللہ۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر تم ان کی عدت کے حکم میں شک کرو اور اس کو نہ پہچانو تو وہ تین مہینے ہے۔ یہ قول امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے اور یہی ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار ہے[5] اور یہ معنی ظاہر ہیں۔ اس پر ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے قول سے حجت لی

---

[1] صحيح البخاري (٤٦٢٦) صحيح مسلم (١٤٨٥) [2] فتح البيان (١٨٩/١٤) [3] فتح البيان (١٤/١٨٧۔١٩٨)
[4] رقم الآية (٢٢٨) [5] تفسير الطبري (٢٣/٤٥٠۔٤٥٢)

ہے جو پہلے گزر چکا ہے اور یہاں اس کو دو طریق سے ذکر کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿وَاُولٰتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جو عورت حاملہ ہو اس کی عدت وضعِ حمل تک ہے، گو طلاق کے بعد یا خاوند کی موت کے بعد بہ مقدار فواق ناقہ (اونٹنی کے دودھ دوہنے کے وقفے برابر) وقت گزرا ہو۔ یہ سلف و خلف کے جمہور علماء کا قول ہے جس طرح کہ یہ اس آیتِ کریمہ کی نص ہے اور جس طرح کہ اس بارے میں سنتِ نبویہ وارد ہوئی ہے۔ سیدنا علی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ یہ دونوں اس عورت کی عدت کے بارے میں ہے کہ جس کا خاوند مر گیا ہو، اس طرف گئے ہیں کہ وضعِ حمل اور چار مہینے دس دن میں سے جو مدت زیادہ لمبی ہو، وہ عدت کرے۔ اس سے منظور اس آیت پر اور اس آیت پر جو سورۃ البقرہ میں ہے عمل کرنا ہے۔ بخاری نے ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا کہ ایک شخص عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف آیا اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے عرض کی کہ آپ مجھے اس عورت کے بارے میں فتویٰ دیں جس نے اپنے خاوند کے مرنے کے چالیس رات بعد بچہ جنا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "آخر الأجلين". میں نے کہا: ﴿وَاُولٰتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بولے: میں اپنے بھتیجے کے ساتھ ہوں، یعنی ابو سلمہ کے ساتھ۔ پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے غلام کریب کو ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا، ان سے پوچھنے کے لیے تو انھوں نے کہا کہ سبیعہ اسلمیہ کا خاوند مارا گیا اور وہ حاملہ تھی اور اس کے مرنے کے چالیس رات بعد اس نے بچہ جنا، پھر اس کو لوگوں نے نکاح کے پیام بھیجے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نکاح کرا دیا اور ابو السنابل ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے اس کو پیام بھیجا۔[1]

(هكذا أورده البخاري ههنا مختصرا وقد رواه هو و مسلم وأصحاب الكتب مطولا من وجوه آخر) اس کے بعد وہ سارے طرق ذکر کیے ہیں۔[2]

﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۭ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۝ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝﴾

[1] صحيح البخاري (٤٦٢٦) [2] تفسير ابن كثير (٤/٤٨٨-٤٩٠)

تم انھیں رہائش دو جہاں تم (خود) رہتے ہو اپنی حیثیت کے مطابق، اور ان کو تنگ کرنے کے لیے انھیں تکلیف نہ دو۔ اور اگر وہ (طلاق یافتہ) حمل والیاں ہوں تو وضع حمل تک تم ان پر خرچ کرو، پھر اگر وہ (بچے کو) تمھارے لیے دودھ پلائیں تو تم انھیں ان کی اُجرت دو، اور (یہ) آپس میں دستور کے مطابق مشورے سے (طے) کرو، اور اگر تم باہم ضد پکڑ لو تو اسے کوئی اور عورت دودھ پلائے ⑥ پس لازم ہے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے، اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو تو وہ اسی میں سے خرچ کرے جو اسے اللہ نے دیا۔ اللہ کسی شخص پر اتنی ہی ذمے داری ڈالتا ہے جتنا اس نے اسے دیا۔ اللہ تنگی کے بعد جلد آسانی فرما دے گا ⑦

بچے کا خرچ باپ پر ہے۔ پیٹ میں ہو تو اس کی ماں کو کھلائے، پہنائے۔ بچہ اگر دودھ پیتا ہو تو دودھ پلانے کی اجرت جو کسی اور کو دیتا، وہ اس کو دے، جب تک ماں قبول کرے کسی اور کو نہ دے، اگر وہ قبول نہ کرے، تب کسی اور کو مزدوری دے کر دودھ پلوائے۔ اور عدت تک رہائش دینا ضروری ہے، گو بچہ پیٹ میں نہ ہو۔ انتہیٰ.

مطلقہ کو رہائش فراہم کرنے اور تکلیف نہ دینے کا حکم:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ جب کوئی اپنی عورت کو طلاق دے تو اسے گھر میں رہنے دے، یہاں تک کہ اس کی عدت پوری ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ ﴾ "أَيْ: عِنْدَكُمْ" ان کو رہنے کے لیے اپنے پاس گھر دو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ اور ان کے علاوہ نے کہا ﴿ مِنْ وُّجْدِكُمْ ﴾ "أَيْ: مِنْ سَعَتِكُمْ"[1] یعنی اپنے مقدور کے مطابق۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے یہاں تک کہا کہ اگر تم اپنے گھر کے کنارے کے علاوہ کوئی جگہ نہ پاؤ تو اس کو اس میں بساؤ۔ قولہ تعالیٰ: ﴿ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ﴾۔ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اسے گھبرائے، بے قرار کرے، اس پر چیخے چلائے، تاکہ اپنا مال دے کر اس سے اپنی جان چھڑائے، یا اس کے گھر سے نکل جائے۔ ابو الضحیٰ سے مروی ہے (قال الثوري عن منصور) کہ اس کو طلاق دے، پھر جب دو دن باقی رہ جائیں تو رجوع کرے۔[2]

حاملہ عورت کا نان ونفقہ شوہر کے ذمے ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ كُنَّ اُولٰتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ یہ بات مطلقہ بائنہ میں ہے، اگر وہ حاملہ ہو تو اس کو نفقہ دے، یہاں تک کہ وہ بچہ جن دے۔ یہ بہت سے علماء کا قول ہے، ان میں سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں اور سلف میں سے ایک گروہ ہے اور خلف میں سے کئی گروہ ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ

---

[1] تفسیر الطبري (٢٣/٤٥٦، ٤٥٧) [2] تفسیر ابن کثیر (٤/٤٩٠)

اس کی دلیل یہ ہے کہ رجعیہ کا نفقہ تو واجب ہے، خواہ وہ حاملہ ہو یا حائل ہو، یعنی غیر حاملہ ہو۔ دوسروں نے کہا: بلکہ آیت کا سارا سیاق رجعیات میں ہے اور یہ جو حاملہ کے نفقہ دینے پر نص کی ہے، گو وہ رجعیہ ہے، تو صرف اس لیے کہ غالباً حمل کی مدت طویل ہوتی ہے، اس لیے وضعِ حمل تک نفقہ کے واجب ہونے پر نص کرنے کی حاجت ہوئی، تا کہ کوئی یہ وہم نہ کرے کہ عدت کی مدت کے برابر نفقہ دینا واجب ہے۔ (مگر یہ نکتہ محلِ تامل ہے، اس لیے کہ حاملہ کی مدتِ عدت تو خود وضعِ حمل ہے، پھر یہ وہم کیسے مضر ہو سکتا ہے۔ از مصحح سلمہ اللّٰہ تعالیٰ)۔ پھر علماء نے دو قول پر اختلاف کیا ہے کہ آیا نفقہ اس عورت کے لیے حمل کے واسطے سے ہے، یا صرف حمل کے لیے ہے۔ یہ دو قول امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ سے منصوص ہیں اور ان سے کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں جن کا بیان علمِ فروع میں کیا گیا ہے۔

مطلقہ ماں کو رضاعت کی اجرت دینے کا حکم:

قولہ تعالیٰ: ﴿ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ﴾ یعنی جب وہ بچہ جن دیں اس حال میں کہ وہ مطلقہ ہیں تو عدت پوری ہونے سے وہ بائن ہو گئیں، اس وقت اس عورت کو اختیار ہے کہ بچے کو دودھ پلائے یا نہ پلائے، لیکن یہ اس کے بعد ہے کہ اس کو لبا کی غذا دے لے۔ لبا وہ پہلا دودھ ہے جس کے بغیر غالباً بچہ رہ نہیں سکتا، اس کے بعد اگر دودھ پلائے گی تو اس کے برابر اجر کی مستحق ہوگی، اس کو حق پہنچتا ہے کہ بچے کے باپ سے یا اس کے ولی سے اس اجرت کا معاہدہ کرے جس پر دونوں باہم متفق ہو جائیں۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ﴾

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ یعنی چاہیے کہ تمھارے کام آپس میں دستور کے مطابق ہوں، بغیر اضرار و مضارۃ (تکلیف پہنچانے) کے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں فرمایا: ﴿ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ﴾ [البقرۃ: ۲۳۳] ''ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے یا باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اگر مرد اور عورت رضاع کی اجرت میں اختلاف کریں، عورت بہت اجرت مانگے اور مرد اس کو قبول نہ کرے، یا مرد تھوڑی اجرت دے اور عورت اس پر اس کی موافقت نہ کرے تو چاہیے کہ مرد غیر عورت سے بچے کو دودھ پلوائے، پھر اگر ماں اس اجرت پر راضی ہو گئی جس پر اجنبی عورت کو رکھا گیا تو ماں بچے کو دودھ پلانے کی زیادہ حقدار ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ﴾ یعنی چاہیے کہ بچے پر بچے کا باپ یا اس کا ولی اپنی قدرت کے مطابق خرچ کرے۔ ﴿ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرۃ: ۲۸۶] ''اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔'' ابو سنان سے مروی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے متعلق

پوچھا تو ان سے کہا گیا کہ وہ موٹے کپڑے پہنتے ہیں اور سخت کھانا کھاتے ہیں، چنانچہ انھوں نے ان کی طرف ہزار دینار بھیجے اور قاصد سے کہا کہ تو خیال رکھ کہ وہ ان سے کیا کرتا ہے۔ قاصد کیا دیکھتا ہے کہ سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے وہ دینار لیے، پھر نہ ٹھہرے کہ نرم نرم کپڑے پہنے اور عمدہ سے عمدہ کھانے کھائے، پھر قاصد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان کو خبر دی۔ چنانچہ فرمایا: اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے اس نے اس آیت کی تاویل کی: ﴿ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ﴾[1] (أخرجه ابن جرير) یعنی اس کے مقتضا پر عمل کیا۔

امام طبرانی رحمہ اللہ نے اپنی معجم کبیر میں شریح بن عبید عن ابی مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے (واسمه الحارث)، فرمایا: تین آدمی تھے: ایک کے پاس تو دس دینار تھے، چنانچہ ان میں سے اس نے ایک دینار خیرات کیا اور دوسرے کے پاس دس اوقیہ تھے، اس نے ان میں سے ایک اوقیہ خیرات کیا اور تیسرے کے پاس سو اوقیہ تھے، اس نے ان میں سے دس اوقیہ خیرات کیے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اجر میں برابر ہیں، ہر ایک نے اپنے مال کا دسواں حصہ خیرات کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ﴾[2] (هذا حديث غريب من هذا الوجه)

قولہ تعالیٰ: ﴿ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ﴾ یہ اللہ پاک کی طرف سے وعدہ ہے اور اس کا وعدہ حق ہے وہ اس کے خلاف نہیں کرتا۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ [الانشراح: ۵] ''پس یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔'' شہر بن حوشب سے مروی ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگلے زمانے میں ایک مرد اور اس کی عورت تھی، دونوں کسی شے پر قدرت نہیں رکھتے تھے، چنانچہ مرد اپنے سفر سے آیا اور اپنی عورت پر بھوکا داخل ہوا، اسے سخت بھوک لگی تھی، اپنی عورت سے کہا کہ تیرے پاس کچھ ہے؟ اس نے کہا: ہاں خوش ہو جا، ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا رزق آیا ہے۔ پھر مرد نے اس سے جلدی مانگا اور کہا تیرا برا ہو، ڈھونڈھ، اگر تیرے پاس کوئی شے ہو، اس نے کہا: اچھا ذرا ٹھہرو، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھتی تھی، یہاں تک کہ مرد کے لیے بہت دیر ہوگئی تو کہا کہ تیرا برا ہو جا کر ڈھونڈھ اگر تیرے پاس کوئی شے ہو تو اسے میرے پاس لے کر آ، مجھے بہت سختی پہنچی ہے اور میں مشقت میں پڑا ہوں تو وہ بولی: ہاں اب ہم تنور کھولتے ہیں تو جلدی مت کر، پھر جب مرد نے تھوڑی دیر کے لیے خاموشی اختیار کی اور عورت نے وقت دیکھا کہ اب وہ اس سے دوبارہ کہے گا تو اس نے خود ہی اس سے کہا کہ اگر تو اپنے تنور کے پاس جا کر خود ہی نظر کرتا تو کیا اچھا تھا، پھر وہ کھڑی ہوئی اور اپنے تنور کی طرف دیکھا تو وہ بکریوں کی پسلیوں سے بھرا ہوا ہے اور اس نے اپنی دونوں چکیوں کو دیکھا کہ آٹا پیس رہی ہیں (اصل روایت کے الفاظ ''رحييها'' ہے اس سے مراد چکی کے دو پاٹ ہیں) پھر وہ چکی کی طرف کھڑی ہوئی اور اس کو جھاڑا اور تنور میں سے بکری کی پسلیوں کو نکالا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

[1] تفسير الطبري (٢٣/٤٦٣)

[2] المعجم الكبير (٢٩٢/٣) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٣٤٤٩)

کہتے ہیں: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں ابو القاسم کی جان ہے! یہ محمد ﷺ کا قول ہے کہ اگر وہ اس شے کو لے لیتی جو چکی کے پاٹوں میں ہے اور اس کو نہ جھاڑتی تو وہ قیامت تک پیسے جاتی۔[1] (أخرجه الإمام أحمد وقال في موضع آخر بسنده عن محمد بن سيرين عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: دخل رجل على أهله فلما رأى ما بهم من الحاجة خرج إلى البرية فلما رأت امرأته قامت إلى الرحى فوضعتها و إلى التنور فسجرته ثم قالت: اللهم ارزقنا فنظرت إلى الجفنة (اصل کے الفاظ ہیں: فنظرت فإذا الجفنة قد املأت) قد امتلأت قال: وذهبت إلى التنور فوجدته ممتلأ قال: فرجع الزوج فقال: أصبتم بعدي شيئا، قالت امراته، نعم من ربنا قام إلى الرحى فذكر ذلك للنبي ﷺ أما إنه لولم ترفعها لم تزل تدور إلى يوم القيامة)[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ ﴾ یہ ایک ابتدائی کلام ہے، سکنے کے بیان کو متضمن ہے، وہ ''سکنی'' جو مطلقات وغیرہا علاحدہ ہونے والی عورتوں کے لیے واجب ہے۔ حرف ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے: ''أَيْ: بَعْضِ مَكَانِ سُكْنَاكُمْ'' یعنی تم اپنے رہنے کے مکان میں سے کوئی جگہ ان کو رہنے کے لیے دو، تاکہ عدت پوری ہونے تک اس میں رہیں۔ امام زمخشری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[3] امام کسائی اور رازی رحمہما اللہ کہتے ہیں: ﴿ مِنْ ﴾ زائد ہے۔ امام حوفی اور ابو البقا رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ ابتدائے غایت کا ہے۔[4] ﴿ مِنْ وُّجْدِكُمْ ﴾ ''أَيْ: مِنْ سَعَتِكُمْ وَطَاقَتِكُمْ'' یعنی تمھارے حسبِ مقدور۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ''مِنْ سَعْيِكُمْ'' ہے (حسبِ روایت ابن جریر علی ما فی فتح القدیر وفتح البیان، مگر پہلے ''مِنْ سَعَتِكُمْ'' گزرا ہے، ظاہر یہی ہے گو معنی اس کے بھی بن سکتے ہیں)۔

''وجد'' کا لفظ بہ حرکاتِ ثلاثہ ہے اور قاریوں کے اتفاق سے مشہور بالضم ہے، اس کے معنی مقدرت ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: اللہ پاک فرماتا ہے: یہ اس شخص پر ہے جو نہیں پاتا اور اگر وہ وسعت والا ہے تو رہایش اور خرچ میں اس پر وسعت کرے اور اگر فقیر ہو تو فقر کے مطابق خرچ کرے۔[5] اہلِ علم نے تین طلاق والی عورت کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آیا اس کے لیے رہایش اور نفقہ ہے یا نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ اس طرف گئے ہیں کہ اس کے لیے رہایش ہے اور خرچ نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب اس طرف گئے ہیں کہ اس کے لیے رہایش اور نفقہ ہے اور امام احمد، اسحاق اور ابو ثور رحمہم اللہ اس طرف گئے ہیں کہ اس کے لیے نہ نفقہ ہے نہ رہایش۔ صاحبِ فتح البیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ یہی درست ہے۔ امام شوکانی نے ''نيل الأوطار'' میں اسے اس انداز میں ثابت کیا ہے کہ اس کے علاوہ کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی اور ہم نے ''الروضة الندية شرح الدرر البهية'' میں اس کی خوب وضاحت کر دی ہے۔[6]

---

[1] مسند أحمد (٤٢١/٢)
[2] مسند أحمد (٥١٣/٢) تفسیر ابن کثیر (٤٩٠/٤-٤٩٢)
[3] الكشاف (٥٦١/٤)
[4] تفسير الطبري (٣٥٦/٢٣، ٤٥٧) فتح القدير (٣٢٦/٥) فتح البيان (١٩٠/١٤)
[5] فتح القدير (٣٢٥/٥)
[6] فتح البيان (١٩٠/١٤)

﴿ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ﴾ اللہ پاک عورتوں کی ضرر رسانی سے منع فرماتا ہے کہ نفقہ اور رہایش میں ان پر تنگی مت کرو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسکن میں تنگی نہ کرو۔ اسی کے قائل سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نفقے میں۔ ابوالضحیٰ نے کہا: وہ یہ ہے کہ اسے طلاق دے، پھر جب اس کی عدت سے دو دن باقی رہ جائیں تو اس سے رجوع کرے، پھر اسے طلاق دے۔

﴿ وَاِنْ كُنَّ اُولٰتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ یعنی اگر وہ رجعی طلاق والی یا بائن طلاق والی عورتیں ہوں نہ حاملہ عورتیں جن کے خاوند مر گئے ہیں۔ حمل والی تو ان پر ایک غایت تک خرچ کرو، وہ یہ ہے کہ بچہ جن لیں۔ حاملہ مطلقہ کے لیے نفقہ و رہایش واجب ہونے میں علماء کے درمیان کچھ اختلاف نہیں ہے۔ اب رہی وہ حاملہ عورت جس کا خاوند مر گیا تو اس کو نفقہ دیا جائے جمیع مال سے یہاں تک کہ وہ بچہ جن دے۔ سیدنا علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم، شریح، نخعی، شعبی، حماد، ابن ابی لیلی، سفیان اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ اس کے قائل ہیں۔ سیدنا ابن عباس، ابن الزبیر، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم، امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اسے نفقہ نہ دیا جائے مگر اس کے حصے سے۔[1] سنتِ مطہرہ سے وارد دلائل سے یہی موقف حق معلوم ہوتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کی تفسیر میں مروی ہے، چنانچہ یہ اس عورت میں ہے جس کو اس کا خاوند طلاق دیتا ہے اور وہ حاملہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کو یہ حکم دیا ہے کہ اسے رہنے کے لیے گھر دے اور اس پر خرچ کرے، یہاں تک کہ بچہ جن دے اور اگر وہ دودھ پلائے، یہاں تک کہ دودھ چھڑائے اور اگر اس کی طلاق کو بائن کرے اور اس کو حمل نہ ہو تو اس کے لیے رہایش ہے جب تک کہ اس کی عدت پوری ہو جائے اور اس کے لیے نفقہ نہیں ہے۔[2]

﴿ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ﴾ یعنی اگر وہ تمھارے لیے تمھاری اولاد کو دودھ پلائیں اس کے بعد تو ان کو ان کے دودھ پلانے کی اجرت دو۔ مطلب یہ ہے کہ مطلقہ عورتیں جب خاوندوں کی اولاد کو دودھ پلائیں جو انہیں عورتوں سے ہیں وہ خاوند جنھوں نے ان کو طلاق دی ہے تو ان عورتوں کے لیے اس دودھ پلانے پر ان کی اجرت ہے۔ ﴿ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ یہ خاوندوں اور بیویوں کو خطاب ہے، یعنی او خاوندو اور بیویو! تم آپس میں مشورہ کرو، اس بات کے ساتھ جو معروف ہے اور غیر منکر ہے اور چاہیے کہ ایک دوسرے سے معروف اور اچھی بات کو قبول کر لے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِئْتَمِرُوْا" بہ معنی "تشاوروا" ہے اور اس کی سند میں یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ ﴾[3] [القصص: ٢٠] "بے شک سردار تیرے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں۔"

آیت کے اصل معنی یہ ہیں: چاہیے کہ بعض تمھارا بعض کو اس بات کا امر کرے جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے، ان کے نزدیک منکر نہیں ہے، یعنی دستور کی بات جسے جانتے پہچانتے ہیں، کوئی نئی انوکھی بات نہیں ہے۔

[1] تفسیر القرطبي (١٨/١٦٩) [2] الدر المنثور (٨/٢٠٧) [3] اللباب في علوم الكتاب (١٩/١٧١)

امام مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں: معنی یہ ہیں: چاہیے کہ باپ اور ماں باہم ایک مقرر اجرت پر راضی ہو جائیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ خاوند کی طرف سے معروف اور اچھی بات یہ ہے کہ اس کے لیے وافر اجرت مقرر کرے اور عورت کی طرف سے معروف اور اچھی بات یہ ہے کہ وہ ایسی اجرت طلب نہ کرے جس کا دینا خاوند کے لیے سخت اور مشکل ہو۔

﴿ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ﴾ یعنی او خاوند اور جورو! اگر تم باہم بچے کے حق میں تنگی اور ضد کرو اور دودھ پلانے کی اجرت کے بارے میں اڑ جاؤ کہ خاوند تو اس سے انکار کرے کہ ماں کو اجرت دے اور ماں اس بات پر اڑے کہ وہ اسی اجرت پر دودھ پلائے گی جو وہ چاہتی ہے تو باپ کوئی اور عورت دودھ پلانے کے لیے اجرت پر رکھ لے کہ وہ اس کے بچے کو دودھ پلایا کرے گی۔ خاوند پر واجب نہیں کہ جو اجرت بیوی طلب کرتی ہے وہ مان لے اور اس کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ جو اجرت وہ خود دینا چاہتا ہے وہی دے کر جورو سے زبردستی دودھ پلوائے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر ماں دودھ پلانے سے انکار کرے تو اپنے بچے کے لیے کوئی اور عورت اجرت پر رکھ لے، پھر اگر بچہ اس عورت کا دودھ قبول نہ کرے (جیسے بعض بچے ہوتے ہیں کہ اپنی ماں کے سوا کسی اور کا دودھ نہیں پیتے) تو اس کی ماں اجرت پر دودھ پلانے کے لیے مجبور کی جائے گی۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ فَسَتُرْضِعُ ﴾ خبر بہ معنی امر ہے، یعنی چاہیے کہ اسے کوئی اور عورت دودھ پلائے، ظاہر یہ ہے کہ یہ اپنے باب پر ہے، یعنی خبر ہی ہے امر کے معنی میں نہیں ہے، اس جملے میں ماں کو تنگی کرنے پر ناراضی ہے، اس لیے کہ جو شے اس کی طرف سے مبذول (خرچ کی گئی) ہے وہ دودھ ہے، حالاں کہ وہ غیر متمول (مالدار نہیں) ہے اور اس کے ساتھ بخل نہیں کیا جاتا ہے، خصوصاً اسی کے اپنے بچے پر بہ خلاف اس شے کے جو باپ کی طرف سے مبذول ہے، کیوں کہ وہ مال ہے جس کے ساتھ عادتاً بخل کیا جاتا ہے۔

﴿ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ﴾ اس میں وسعت والوں کو امر ہے کہ ان کی عورتوں میں جو دودھ پلانے والیاں ہیں ان پر انھی وسعت کے مطابق وسعت کریں۔ ﴿ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ﴾ یعنی جس کا رزق بہ مقدارِ قوت ہے (یعنی بہت تھوڑا ہے) یا اس پر تنگی کی گئی ہے اور اس پر وسعت اور آسودگی نہیں ہے تو چاہیے کہ اس رزق میں سے خرچ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا ہے اس کے سوا اس پر اور کچھ نہیں ہے۔ خطیب میں ہے کہ قاضی اپنے اجتہاد سے خرچ کرنے والے اور جس پر خرچ کیا جائے ان کی حالت کے مطابق نفقہ مقرر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [البقرة: ٢٣٣] ''اور جن کے بچے ہیں ان کے ذمے ان کا روٹی کپڑا ہے۔''

لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک زوجہ کا نفقہ مقدر اور محدود ہے تو اب اس میں نہ حاکم کے لیے اجتہاد ہے نہ مفتی کے لیے نفقے کا اندازہ، صرف خاوند کے حال، یعنی عسر و یسر کے مطابق ہے اور زوجہ کے حال کا کچھ اعتبار نہیں

[1] تفسير البغوي (٨/١٥٦) [2] تفسير القرطبي (١٨/١٧٠)

ہے۔ چنانچہ خلیفہ کی بیٹی کے لیے بھی وہی واجب ہے جو ایک کسان کی بیٹی کے لیے ہے۔ لہٰذا آسودہ خاوند کو دو مد لازمی ہیں اور متوسط کو ڈیڑھ مد اور تنگ حال کو ایک مد اس آیت کے ظاہر کے سبب سے کہ ﴿ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ﴾ چنانچہ انھوں نے تنگی اور آسودگی میں خاوند کا اعتبار کیا ہے اور اس لیے کہ بیوی کی حالت پر اعتبار کرنا جھگڑے کا باعث ہوتا ہے، کیوں کہ اس صورت میں زوج تو یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ اپنی کفایت سے زیادہ طلب کرتی ہے اور زوجہ یہ دعویٰ کرے گی کہ وہ اپنی کفایت کے مطابق طلب کرتی ہے۔ چنانچہ جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے نفقے کا اندازہ مقرر کیا گیا۔ انتھیٰ. نفقۂ زوجہ و نفقۂ مطلقہ میں جب کہ وہ رجعیہ ہو مطلقاً یا بائن حاملہ ہو بہ خلاف مرضعہ کے، ان کے لیے مذکورہ اندازہ مسلم ہے۔ (قاله سليمان الجمل)

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا، مگر اس رزق کی جو اس کو عطا کیا ہے، چنانچہ فقیر کو یہ تکلیف نہیں دیتا کہ جو اس کی طاقت میں نہیں وہ خرچ کرے، بلکہ اس کے لیے وہی لازمی ہے جس پر وہ قادر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو جو رزق دیا ہے، اس میں سے جہاں تک اس کی طاقت ہے۔

﴿ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ﴾ یعنی عن قریب اللہ تعالیٰ تنگی وسختی کے بعد فراخی اور آسودگی کر دے گا۔ یہ وعدہ آسودگی کا تنگی والوں کو ہے، بیشک اللہ پاک نے اپنا وعدہ ان لوگوں کے حق میں سچا کر دیا جو اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے۔ چنانچہ ان پر جزیرۂ عرب کو فتح کر دیا، پھر فارس و روم بھی فتح کر دیے، یہاں تک کہ وہ تمام لوگوں سے زیادہ غنی ہو گئے اور آیت کا صدق ہمیشہ کے لیے ہے، مگر اتنی بات ہے کہ صحابہ میں اس کا صدق پوری طرح ظاہر ہوا، اس لیے کہ ان کا ایمان دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قوی تھا۔ بالجملہ اللہ پاک وہ احکام ذکر کر چکا جو پہلے گزر چکے ہیں تو ان کی مخالفت کرنے سے ڈرایا اور اس قوم کی سرکشی کا بیان کیا جنھوں نے اس کے احکام کی مخالفت کی، پھر اُن پر اس کا عذاب نازل ہوا۔ چنانچہ فرمایا:[1]

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا
شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ
اَمْرِهَا خُسْرًا ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي
الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْ ۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ

[1] فتح البيان (١٤/١٨٩-١٩٢)

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴿۱۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ۬ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرکشی کی تو ہم نے ان کا شدید محاسبہ کیا، اور ہم نے انھیں ہولناک عذاب دیا⑧ بالآخر (ان بستیوں نے) اپنے کرتوتوں کا وبال چکھا اور اُن کے کرتوتوں کا انجام خسارہ ہی تھا⑨ اللہ نے ان کے لیے شدید عذاب تیار کیا ہے، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اے عقل والو جو ایمان لائے ہو! تحقیق اللہ نے تمھاری طرف ذکر (قرآن) نازل کیا ہے⑩ (اور) ایک رسول جو تم پر اللہ کی واضح آیات تلاوت کرتا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لائے، اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے، وہ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ابد تک۔ اللہ نے اسے خوب رزق دیا ہے⑪ اللہ وہ ذات ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمینیں بھی ان (آسمانوں) کی مثل، ان کے درمیان اس کا حکم نازل ہوتا ہے، تاکہ تم جان لو کہ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے اور بلاشبہ اللہ نے (اپنے) علم سے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے⑫

اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کی سزا کا بیان:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو وعید سناتا ہے جس نے اس کے امر کی مخالفت کی اور اس کے رسولوں کو جھٹلایا اور جو راہ اس نے ڈالی اس کو چھوڑ کر اور راہ پر چلا اور اس عذاب کی خبر دیتا ہے جو اس کی وجہ سے اگلی اُمتوں پر نازل ہوا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ... الآیة﴾ یعنی کتنی بستیاں ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع سے سرکشی وطغیان اور تکبر کیا اور اس کے رسولوں کی اتباع کرنے سے سرکشی اور تکبر کیا، پھر ہم نے ان کو ایسے سخت عذاب میں پکڑا اور ایسی آفت ڈالی جو کبھی دیکھی نہ سنی۔ پھر انھوں نے اپنی مخالفت کے بعد اپنے کام کا وبال چکھا اور پشیمان ہوئے مگر ان کی پشیمانی نے ان کو کچھ نفع نہیں دیا اور ان کے کام کا انجام سراسر نقصان اور زیان ہوا۔ اللہ نے دارِ آخرت میں ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے، اس عذاب کے ساتھ جو جلدی سے ان کو دنیا میں دیا گیا۔

پھر ان لوگوں کی خبر بیان کرنے کے بعد فرمایا: اے مستقیم فہم والو! اللہ سے ڈرو، یعنی اے وہ لوگو جنھوں نے اللہ کی تصدیق کی اور اس کے رسولوں کو مانا! تم ان جیسے مت ہونا کہ تم کو بھی وہی پہنچے جو ان پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے تمھاری طرف ذکر، یعنی قرآن نازل کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر: ۹] ''ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔'' بعض نے کہا ہے کہ ﴿ رَسُوْلًا ﴾ اس لیے منصوب ہے کہ ﴿ ذِكْرًا ﴾ سے بدلِ اشتمال و ملابست ہے، اس لیے کہ رسول ہی نے تو ذکر پہنچایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی صفات کا ذکر:

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ ﴿ رَسُوْلًا ﴾ ترجمہ ہے ﴿ ذِكْرًا ﴾ کا،[1] یعنی اس کی تفسیر ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ ﴾ یعنی ایسا رسول جو تم پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھتا ہے۔ درآں حالیکہ وہ بیّن اور واضح اور جلی ہیں، تا کہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور بھلائیاں کیں ان کو نور کی طرف نکالے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ [إبراهيم: ۱] ''یہ عالی شان کتاب ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے کہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے اجالے کی طرف لائیں۔'' اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ [البقرة: ۲۵۷] ''ایمان والوں کا کارساز اللہ تعالیٰ خود ہے وہ انھیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے۔'' یعنی کفر اور جہالت کے اندھیروں سے ایمان اور علم کے نور کی طرف۔

اللہ تعالیٰ نے جو وحی نازل فرمائی ہے، اس کا نام نور رکھا ہے اس لیے کہ اس سے ہدایت حاصل ہوتی ہے جس طرح کہ وحی کا نام روح رکھا ہے، اس لیے کہ اس سے دلوں کی حیات حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الشورىٰ: ۵۲] ''اور اسی طرح ہم نے اسے نور بنایا، اس کے ذریعے سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، بیشک آپ راہِ راست کی راہنمائی کر رہے ہیں۔'' قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴾ اس جیسی آیت کی تفسیر کئی بار اس طور سے گزر چکی ہے کہ یہاں اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وللّٰه الحمد والمنة.

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ وسلطانِ عظیم کا بیان:

اللہ پاک اپنی قدرتِ تامہ اور سلطانِ عظیم کی خبر دیتا ہے، تا کہ اس کی وجہ سے اس دینِ قدیم کی تعظیم کی جائے

[1] تفسير الطبري (۲۳/۴٦٨)

جو اس نے مشروع فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے جس کو نوح علیہ السلام کی زبان سے اپنی قوم کو خبر دینے کی صورت میں ادا فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴾ [نوح: ١٥] ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے کس طرح سات آسمان پیدا کر دیے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ ﴾ [بني إسرائیل: ٤٤] ''ساتوں آسمان اور زمین اور جو بھی ان میں ہے اسی کی تسبیح کر رہے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾ یعنی زمینیں بھی سات بنائیں جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہوا ہے کہ جو کوئی زمین کے بالشت بھر ظلم کرے تو سات زمین سے اس کے طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالیں گے[1] (حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں: «من ظلم قيد شبر من الأرض طوقه من سبع أرضين» یہ اس بات کی تصریح ہے کہ زمینیں سات ہیں اور ہیئت میں مماثلت کی تاویل کرنا ظاہر کے خلاف ہے، اسی طرح سات اقلیموں کی تاویل ورنہ جس شخص نے اس اقلیم سے بالشت بھر زمین لے لی ہے تو دوسری اقلیم سے اس کے طوق نہ ڈالا جانا بخلاف طبقات زمین کے کہ یہ ملک میں اس بالشت بھر زمین کے تابع ہیں۔ طوق ڈالنے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو لے کر زمین میں دھنسا دے گا تو اس میں سے جو قطعہ مغضوب ہے، وہ اس کی گردن میں طوق کی طرح ہو جائے گا یا اس کے اٹھانے کی تکلیف دی جائے گی۔ ''طوقه'' طوقِ تکلیف سے ماخوذ ہے طوقِ تقلید سے نہیں ہے۔[2] كذا في المجمع)

صحیح بخاری میں ہے: «خُسِفَ بِهِ إِلَى سَبْعِ أَرَضِينَ»[3] یعنی وہ ساتوں زمینوں تک دھنسا دیا جائے گا۔ (وقد ذكرت طرقه وألفاظه وعزوه في أول البداية والنهاية عند ذكر خلق الأرض.[4] ولله الحمد والمنة) جس کسی نے اس کو سات اقلیموں پر محمول کیا تو اس نے ابعادِ نجعہ اور اغراق فی النزع کیا اور بغیر کسی سند کے قرآن شریف اور حدیث پاک کی مخالفت کی۔ سورۃ الحدید میں زیرِ تفسیر آیت ﴿ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ﴾ [الحدید: ٣] سات زمینوں کا ذکر گزر چکا ہے ان کے درمیان کا فاصلہ اور ہر زمین کی موٹائی پانچ سو برس کی راہ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے[5] اور اسی طرح دوسری حدیث شریف میں ہے کہ نہیں ہیں ساتوں آسمان اور جو کچھ ان میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اور ساتوں زمینیں اور جو کچھ اُن میں ہے اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے، کرسی کے اندر مگر ایک حلقے کی طرح ہے جو ارضِ فلاۃ (بغیر پانی اور گھاس کا جنگل) میں ڈالا گیا ہو۔[6] عن مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر میں مروی ہے، اگر میں تم سے اس کی تفسیر بیان کرتا تو

---

(1) صحيح البخاري (٢٣٢١) صحيح مسلم (١٦١٢) (2) مجمع بحار الأنوار (٢٣/٣) (3) صحيح البخاري (٢٣٢٢)
(4) البداية والنهاية (١٨/١) (5) تفسير الطبري (٢٣/٤٦٩، ٤٧٠) (6) صحيح ابن حبان (٧٦/٢) تفسير ابن كثير (٤٩٣/٤)

البتہ تم کافر ہو جاتے اور تمھارا کفر اس کو جھٹلانا ہے۔ (أخرجه ابن جرير)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اس آیت کے متعلق سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا، فرمایا کہ تجھے کون سی چیز اس بات سے بے خوف کرتی ہے کہ میں تجھے اس کے بارے میں بتاؤں تو تو کافر ہو جائے۔ (أخرجه ابن جرير) عن ابی الضحیٰ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر میں مروی ہے، فرمایا: ہر زمین میں مثل ابراہیم کے ہے اور مثل اس خلق کے جو زمین پر ہے۔ (أخرجه ابن مثنى) یعنی ابن جریر رحمہ اللہ کے استاد نے اپنی مروی حدیث میں کہا کہ ہر آسمان میں ابراہیم ہے۔[1] بیہقی نے "كتاب الأسماء والصفات" میں اس اثر کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سے زیادہ مبسوط روایت کیا ہے، پس بہ سندِ خود عن ابی الضحیٰ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا ہے کہ ہر زمین میں ایک نبی ہے تمھارے نبی کی طرح اور ایک آدم ہے آدم علیہ السلام کی طرح اور ایک نوح ہے نوح علیہ السلام کی طرح اور ایک ابراہیم ہے ابراہیم علیہ السلام کی طرح اور ایک عیسیٰ ہے عیسیٰ علیہ السلام کی طرح۔ (ثم رواه البيهقي من حديث شعبة عن عمرو بن مرة عن أبي الضحى عن ابن عباس رضی اللہ عنہما في قول الله عزوجل: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ ...﴾ الآية. قال في كل أرض نحو إبراهيم علیہ السلام ثم قال البيهقي إسناد هذا عن ابن عباس رضی اللہ عنہما صحيح و هو شاذ بمرة لا أعلم لأبي الضحى عليه متابعا. والله أعلم)[2]

عثمان بن ابی دھرش سے مروی ہے، کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے پاس پہنچے اور وہ خاموش تھے، باتیں نہیں کرتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم کو کیا ہے کہ باتیں نہیں کرتے ہو؟ عرض کی کہ ہم اللہ عزوجل کی خلق میں غور کر رہے ہیں۔ فرمایا: "فَلِذٰلِكَ فَافْعَلُوْا" یعنی اب تم ایسا ہی کرو، اس کی خلق میں فکر کیا کرو اور اس میں مت فکر کیا کرو، بے شک اس مغرب میں ایک سفید زمین ہے، اس کا نور اس کی سفیدی ہے، یا فرمایا: اس کی سفیدی اس کا نور ہے، سورج کا چلنا چالیس دن ہے، اس کی اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے۔ انھوں نے کبھی پلک جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: پھر شیطان ان سے کہاں ہے؟ فرمایا: وہ نہیں جانتے کہ شیطان بھی کوئی مخلوق ہے یا نہیں۔ عرض کی: کیا وہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں؟ فرمایا: وہ نہیں جانتے کہ آدم پیدا ہوئے یا نہیں۔ (أخرجه الإمام أبو بكر عبد الله بن محمد بن أبي الدنيا القرشي في كتابه التفكر والاعتبار وهذا حديث مرسل وهو منكر جدا و عثمان بن أبي دهرش ذكره ابن أبي حاتم في كتابه فقال: روى عن رجل من آل الحكم بن أبي العاص وعنه سفيان بن عيينة ويحيى بن سليم الطائفي و ابن المبارك سمعت أبي يقول ذلك) آخر تفسير سورة الطلاق. ولله الحمد والمنة.[3]

فتح البیان کا بیان:

﴿ وَكَاَيِّنْ ﴾ بہ معنی "كَمْ" ہے۔ ﴿ قَرْيَةٍ ﴾ سے مراد اہلِ قریہ ہیں۔ ﴿ عَتَتْ ﴾ سے مراد "عَصَتْ"

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/٤٦٩، ٤٧٠) [2] الأسماء والصفات للبيهقي (٢/٢٦٧، ٢٦٨)

[3] تفسير ابن كثير (٤/٤٩٢_٤٩٤) یہ روایت مرسل ہے۔

ہے، یا ''أَعْرَضَتْ'' یا ''خَرَجَتْ'' کے معنی میں شامل ہے، یعنی کتنی بستیوں والے ہیں کہ نافرمانی کی اپنے رب کے حکم کی اور اس کے رسولوں کے حکم کی، یا اُن کے حکم سے منہ موڑا اور خروج کیا۔ ''کَأَیِّنْ'' کی بحث آلِ عمران وغیرہ میں گزر چکی ہے۔[1] ﴿ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ﴾ یعنی جب انھوں نے حکم کی نافرمانی کی تو ہم نے مناقشہ و استقصا کر کے ان پر حساب میں سختی کی ان کے کاموں کے سبب سے جو انھوں نے کیے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان کے اعمال کے سبب سے حساب میں ان کو پکڑا، پھر ان کو عذاب کے ساتھ جزا دی۔[2] یہ اس آیت کے معنی ہیں۔ ﴿ وَعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴾ یعنی ہم نے ان کو آخرت میں عذابِ عظیم ومنکر کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کلام میں تقدیم وتاخیر ہے، یعنی ہم نے ان کو دنیا میں عذابِ منکر کیا گرسنگی وقحط وسیف وخسف ومسخ کے ساتھ اور آخرت میں ان کا سخت حساب کے ساتھ محاسبہ کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے کہ وہ رحم نہیں کیے گئے۔ اور ''نکر'' سے مراد عظیم منکر ہے۔[3] ''نُکُر'' بہ سکون وضمِ کاف دونوں سبعیہ ہیں۔

﴿ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا ﴾ یعنی جب ہم نے ان کو عذاب کیا تو پھر یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے کفر کا انجام چکھا۔ ﴿ وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ﴾ یعنی اور ان کے کام کا انجام دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں عذاب ہوا۔ یہ مضمون ماضی کے صیغے میں اس لیے ادا کیا گیا کہ اللہ کے وعد ووعید میں سے جس کا انتظار کیا گیا ہے، وہ حقیقت میں ملا ہوا ہے اور جو شے ہونے والی ہے تو گویا وہ ہو ہی چکی ہے۔

﴿ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آخرت میں دردناک، یعنی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس آیت کی تکرار تاکید کے لیے ہے، تاسیس بھی ہو سکتی ہے، اس لیے کہ پہلی آیت سے صرف ان کا خسارے اور نقصان کا انجام معلوم ہوا کہ دنیا میں تو ہلاک ہوئے اور آخرت میں عذاب کیے گئے۔ اور اس آیت سے ان کے عذاب کا اہتمام اور اس کی شدت اور دوام معلوم ہوا، کیونکہ اکثر جگہ جہاں عذابِ شدید کے اعداد کا ذکر ہے وہاں عذاب کی ہمیشگی مراد ہوتی ہے۔ ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ یعنی جب ان لوگوں کا وہ انجام ہوا جس کا ابھی ذکر ہوا تو اے عقلِ راجحہ والو تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ تم سے کہیں ویسا کام نہ ہو جائے کہ تمھاری گت بھی ان جیسی ہو۔ اس سے نکلتا ہے کہ جس کی عقل راجح وگراں ہوتی ہے وہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ محلِ نصب میں ہے بہ تقدیر ''أَعْنِيْ''، منادیٰ کا بیان ہے۔ یا اس کا عطفِ بیان ہے، یا نعت ہے، اس سے یہ نکلا کہ جو ایمان لایا وہی عقلِ راجح والا ہے اور جو مومن نہ ہوا اس کی عقل راجح نہیں، گو دنیا کے صنائع، بدائع، علوم وفنون میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کو کیوں نہ پہنچا ہو۔ ﴿ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ ﴾

---

(1) رقم الآية (١٤٦) (2) تفسير البغوي (١٥٧/٨) (3) تفسير الطبري (٤٦٦/٢٣)

﴿ رَّسُوْلًا ﴾ ذکر سے مراد قرآن شریف ہے۔ ﴿ رَسُوْلًا ﴾ کا نصب فعل محذوف سے ہے: "أَيْ: أَرْسَلَ رَسُوْلًا" (سمین رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کے نصب میں نو وجہیں ذکر کی ہیں)۔ اس رسول میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد نبی مکرم ﷺ ہیں، یا خود قرآن شریف ہے، یا جبریل علیہ السلام ہیں، پس اکثر مفسرین جن میں سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، اس طرف گئے ہیں کہ یہاں رسول سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔[1] امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبریل علیہ السلام ہیں۔[2] امام زمخشری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں[3] یعنی اے عقل والو جو ایمان لائے ہو! تو اللہ سے ڈرتے رہو، اس نے تمھارے لیے تقویٰ کا سامان جمع کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ مقرر اللہ نے تمھاری طرف ذکر، یعنی قرآن نازل کیا جس میں سمجھنے کی باتیں ہیں اور ایک عظیم الشان رسول بھیجا جس کے بعد نہ کوئی رسول ہے نہ کتاب ہے۔ پھر اس رسول کی صفت بیان کی۔

﴿ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ ﴾ یعنی وہ ایسا رسول ہے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی آیاتِ مبینات پڑھتا ہے۔ جمہور نے بہ صیغۂ اسم مفعول پڑھا ہے، یعنی درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیان کیا ہے اور ان کو واضح اور ظاہر فرمایا ہے۔ کسی نے (یعنی ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے) بہ صیغۂ اسم فاعل پڑھا ہے، یعنی وہ آیتیں لوگوں کے لیے وہ احکام بیان کرتی ہیں جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے، یا یہ معنی ہیں کہ وہ اور اپنے معانی پر دلالت کرن میں خود واضح اور ظاہر ہیں۔ امام ابو حاتم اور ابو عبید رحمہما اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اس آیت کے سبب سے: ﴿ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾[4] [آل عمران: ١١٨]

قولہ تعالیٰ: ﴿ لِيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ حرفِ لام ﴿ اَنْزَلَ ﴾ سے متعلق ہے، یعنی تاکہ اللہ ان کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ذکر و رسول کے آنے کے بعد، گمراہی کے اندھیروں سے ہدایت کے نور کی طرف یا جہالت سے علم کی طرف یا کفر سے ایمان کی طرف۔ یا یہ ﴿ يَتْلُوْا ﴾ سے متعلق ہے، یعنی تاکہ رسول ﷺ جو آیتیں پڑھتا ہے ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے۔ ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ یعنی جو کوئی یہ باتیں اکٹھی کرے کہ اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرے اور اس شے پر عمل کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر فرض کی ہے اور اس شے سے بچے جس سے اس کو منع کیا ہے تو وہ اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے ندیاں بہتی ہیں۔ جمہور نے ﴿ يُدْخِلْهُ ﴾ بہ یائے تحتیہ پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ نے) نون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ قراءتِ سبعیہ ہے۔[5] اس کی بنا پر کلام میں صیغۂ غائب سے صیغۂ متکلم کی طرف التفات ہوگا۔

﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ﴾ میں ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی کے اعتبار سے جمع کا صیغہ فرمایا اور ﴿ يُدْخِلْهُ ﴾ میں لفظ

---

[1] الدر المنثور (٢٠٩/٨) [2] تفسير القرطبي (١٧٥/١٨) [3] الكشاف (٥٦٤/٤)
[4] تفسير القرطبي (١٧٥/١٨) [5] تفسير القرطبي (١٧٥/١٨)

﴿ مَنْ ﴾ کے اعتبار سے واحد کی ضمیر پھیری ہے۔ یعنی ان کو باغوں میں داخل کرے گا جن میں ان کا ہمیشہ کے لیے رہنا مقدر کیا گیا ہے۔ ﴿ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴾ (یہ جملہ بنا بر حال محل نصب میں ہے ﴿ خٰلِدِيْنَ ﴾ کے ضمیر سے تداخل کی بنیاد پر یا ﴿ يُدْخِلْهُ ﴾ کے مفعول سے بنا بر ترادف۔[1] كذا في فتح القدير)۔ اس جملے میں پھر لفظ ﴿ مَنْ ﴾ کی رعایت فرمائی۔ چنانچہ اس عبارت میں پہلے لفظ ﴿ مَنْ ﴾ کی رعایت کی اس کے بعد ﴿ مَنْ ﴾ کے معنی کی اور پھر اس کے لفظ کی رعایت فرمائی۔

مطلب یہ ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت میں اس کے رزق کی وسعت فرمائی جس کی نعمتیں کبھی منقطع نہ ہوں گی۔ کسی نے کہا: احسانِ رزق کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو ان کو اطاعت کی روزی دی جائے گی، یعنی اطاعت کی توفیق عنایت ہوگی اور آخرت میں ان کو ثواب عطا کیا جائے گا۔ امام قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حسن وہ ہے جو کفایت کی حد پر ہو اور اس میں کچھ نقصان نہ ہو کہ اس کی وجہ سے اپنے امور سے معطل ہو جائے اور نہ زیادہ کہ اس رزق کا تمتع لینے میں اس کو مشغول کر دے جو اس کو دیا گیا ہے اس کی حرص کی وجہ سے۔ اسی طرح دلوں کے رزق ہیں، اس کا احسن یہ ہے کہ اس کا حال ایسا ہو جس کے ساتھ وہ مستقل ہو بغیر نقصان اور بغیر زیادتی کے کہ وہ اس حال پر مستقل نہ رہ سکے۔ (ذكره الخطيب)

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے اور عمل صالح کرنے والے کو جناتِ نعیم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داخل کرنا اور دنیا اور آخرت میں رزقِ حسن عطا فرمانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس کی رحمت اور قدرت نہایت وسیع ہے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے، یعنی اسی اکیلے نے بغیر کسی وزیر، مشیر اور مددگار کے محض اپنی قدرتِ تامہ سے اور اس اندازے کے مطابق جس کی تدبیر وہ اپنے علم سے خود کر چکا تھا، ایسی عجیب وغریب اور انوکھی طرز پر سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر ایجاد کر دیے۔ علامہ نسفی فرماتے ہیں کہ مفسرین نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ آسمان سات ہیں۔[2] حدیثِ اسراء وغیرہ کے سبب سے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

﴿ وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾ یعنی اور زمین سے ان کی مثل یعنی سات عدد۔ جمہور نے ﴿ مِثْلَهُنَّ ﴾ کو بہ نصب پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ ﴿ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ﴾ پر معطوف ہے۔[3] (قاله الزمخشري) یا واؤ کے بعد بر تقدیر فعل "أَيْ: وَخَلَقَ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ"، کسی نے (یعنی عاصم نے) في رواية عنه بہ رفع پڑھا ہے، اس بنا پر کہ مبتداء ہے اور اس کے قبل جو جار و مجرور ہے وہ خبر ہے۔[4] کہا گیا ہے کہ قرآن شریف میں سوائے اس آیت کے کوئی آیت نہیں جو اس پر دال ہو کہ زمینیں سات ہیں۔ لوگوں نے مثلیت میں اور طبقاتِ زمین کی کیفیت میں دو قول پر اختلاف کیا ہے۔

---

(1) فتح القدير (٣٢٨/٥) (2) تفسير النسفي (٢٥٨/٤) (3) الكشاف (٥٦٤/٤) (4) فتح القدير (٣٢٩/٥)

جمہور کا قول یہ ہے کہ طبق در طبق سات زمینیں ہیں، ایک اوپر ایک کے۔ ایک زمین اور دوسری زمین کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان ہے اور ہر زمین پر رہنے اور بسنے والی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطبق ہیں (طبقات ہیں) بعض کے اوپر بعض فتوق (پھٹنے) کے بغیر بہ خلاف آسمانوں کے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا قول سب سے زیادہ صحیح ہے،[1] اس لیے کہ بخاری و ترمذی سے احادیث اس پر دال ہیں۔ صحیح مسلم میں سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: «مَنْ أَخَذَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا فَإِنَّهُ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِيْنَ»''[2] (إلى آخر كلامه) ''جس نے ظلم سے کسی کی ایک بالشت زمین غصب کر لی اسے قیامت کے دن ساتوں زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔'' حدیث شریف میں ہے کہ آپ نہیں دیکھتے کسی بستی کو جس میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے مگر جس وقت اس کو دیکھتے تو فرماتے: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَمَا أَظْلَلْنَ وَرَبَّ الْأَرَضِيْنَ السَّبْعِ وَمَا أَقْلَلْنَ»[3] (الحديث) ''اے سات آسمانوں اور جس پر وہ سایہ فگن ہیں ان کے رب! اور سات زمینوں اور جس کو وہ اٹھائے ہوئے ہیں ان کے رب!''

سورۃ البقرہ کی تفسیر میں ماوردی رحمہ اللہ کا قول گزر چکا ہے اور اس بنا پر کہ وہ سات زمینیں ہیں تو اسلام کی دعوت ارضِ علیا والوں کے لیے خاص ہوگی، اس کے سوا دوسری زمینوں کے لیے لازمی نہیں ہے گو ان میں کوئی ایسی مخلوق ہو جو عقل رکھتی ہو۔ یہ بات کہ وہ لوگ آسمان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں، اس میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ اپنی زمین کی ہر طرف سے آسمان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس سے روشنی کی مدد لیتے ہیں۔ ابن عادل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول اس شخص کا ہے جس نے زمین کو مبسوط (پھیلا ہوا) ٹھہرایا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ آسمان کا مشاہدہ نہیں کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک روشنی پیدا کی ہے، وہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ابن عادل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس کا قول ہے جس نے زمین کروی (گول) قرار دی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ سات زمینیں منبسط ہیں، بعض زمین بعض کے اوپر نہیں ہیں۔ دریا ان کے درمیان تفریق کرتے ہیں اور ان سب پر آسمان سایہ کیے ہوئے ہیں۔ (حكاه الكلبي عن أبي صالح عنه)

چنانچہ اس بنا پر اگر زمین والوں میں سے کسی کو دوسری زمین کی طرف ملنا یا پہنچنا نہ ہو تو اسلام کی دعوت اس زمین کے ساتھ خاص ہوگی اور اگر ان میں سے کسی قوم کو دوسری زمین کی طرف جانا ممکن ہو تو احتمال ہے کہ ان کو اسلام کی دعوت دینا لازم ہو، اس وجہ سے کہ ان کی طرف جانے اور ان سے ملنے کا امکان ہے، اس لیے کہ جب فصل بحار کا سلوک (مختلف دریاؤں، سمندروں کا سفر) ممکن ہے تو یہ لزوم ماعم حکمہ سے مانع نہ ہوگا، یعنی اس سے اسلام کی دعوت ان تک پہنچانے کی ممانعت لازمی نہیں ہوگی۔ اور یہ احتمال ہے کہ ان کو اسلام کی دعوت دینا لازمی نہ

[1] تفسير القرطبي (١٨/١٧٦) [2] صحيح البخاري (٣٠٢٦) صحيح مسلم (١٦١٠)

[3] سنن النسائي الكبرىٰ (٥/٢٥٦) مستدرك الحاكم (٢/١١٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

ہو، اس لیے کہ اگر وہ لازمی ہوتی تو اس کے لیے واضح حکم دیا جاتا اور نبی ﷺ اس کے ساتھ مامور ہوتے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ سماء سے مراد "مَا عَلَاكَ" ہے، یعنی جو شے تمھارے اوپر ہو وہ سما ہے، چنانچہ پہلا آسمان دوسرے آسمان کے لیے زمین ہے اور اسی طرح دوسرا آسمان تیسرے آسمان کے لیے زمین ہے اور اسی طرح باقی آسمان اپنے سے نیچے والے کے لیے آسمان ہیں اور اپنے سے اوپر والے کے لیے زمین ہیں تو اس بنا پر ساتوں آسمان اور ایک یہ زمین سات آسمان اور سات زمینیں ہیں۔[1] انتھی. (كذا في الجمل)

اس کے بعد سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اثرِ مذکور ذکر کیا ہے۔[2] پھر یہ اثر بیان کیا ہے: ہر زمین میں ابراہیم علیہ السلام اور اس زمین کے مثل مخلوق ہے۔ اسے ابن جریر طبری نے شعبہ عن عمرو بن مرہ عن ابی الضحیٰ کے طریق سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کہا ہے: انھوں نے اس طرح اسے مختصر روایت کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ اور اس طرح کی دیگر روایات جب نبی مکرم ﷺ سے بسند صحیح ثابت نہ ہوں تو انھیں ان کے قائل ہی کے سپرد کر دیا جائے۔ انتھی. امام حاکم رحمہ اللہ کے اسے صحیح کہنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ حافظ سیوطی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ حاکم کی تصحیح سے تعجب کرتا رہا، یہاں تک کہ میں نے بیہقی رحمہ اللہ کو دیکھا کہ یوں کہا: "إسناده صحيح لكن شاذ بمرة"[3] انتھی.

اسناد کی صحت سے کچھ متن کی صحت لازم نہیں آتی، چنانچہ کبھی اسناد تو صحیح ہوتی ہے اور متن میں کوئی علت و شذوذ ہوتا ہے وہ اس کی صحت میں رکاوٹ ہو جاتا ہے۔[4] (قاله القسطلاني) بدایہ میں کہا ہے کہ اگر اس کی نقل صحیح ہو تو یہ اس بات پر محمول ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو اسرائیلیات سے لیا ہے۔[5] اسی طرح مقاصدِ حسنہ میں امام سخاوی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے[6] اور ایسا ہی تفسیر روح البیان میں بھی ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ سے نقل کر کے اتنا زیادہ کہا ہے: ممکن ہے کہ اس پر اس کی تاویل کی جائے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو انبیائے بشر کی طرف سے جنوں کو تبلیغ کرتے تھے اور یہ بات بعید نہیں ہے کہ ان میں سے ہر اس نبی کا نام رکھا جائے جس کی طرف سے وہ رسالت پہنچاتا ہے۔ انتھی. اسی کی طرح ارشاد الساری میں بھی ہے۔[7] حاصل یہ ہے کہ اثرِ مذکور اگر صحیح ہو تو موقوف، شاذ ہے اور شاذ سے حجت نہیں لی جاتی۔ جیسا کہ طیبی نے خلاصہ میں کہا ہے: "وَغَيْرُهُ فِي غَيْرِهَا"۔ خلاصۂ عبارت یہ ہے: "هُوَ مُطْلَقُ مَا رُوِيَ عَنِ الصَّحَابِيِّ مِنْ قَوْلٍ أَوْ فِعْلٍ مُتَّصِلًا كَانَ أَوْ مُنْقَطِعًا وَهُوَ لَيْسَ بِحُجَّةٍ عَلَى الصَّحِيحِ" "موقوف وہ مطلق روایت ہے جو صحابی کا قول یا فعل ہو، متصل سند کے ذریعے مروی ہو یا منقطع سند سے، صحیح قول کے مطابق وہ حجت نہیں ہے۔ (فتح البیان کی عبارت یوں ہے: "ولفظها والموقوف هو

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (١٨٢،١٨١/١٩) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] فتح البيان (١٩٨،١٩٧/١٤)
[4] إرشاد الساري (٢٥٢/٥) [5] البداية والنهاية (٢١/١)
[6] المقاصد الحسنة (١٠٣/١) [7] إرشاد الساري (٢٥٢/٢) فتح البيان (١٩٨/١٤)

مطلق ما روي عن الصحابي[1] ... الخ" اور شاید ۔واللہ أعلم ۔اصل عبارت یوں ہوں:"والموقوف مطلقا هو ما روي عن الصحابی... الخ" از مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں کہا ہے:''غزالی رحمہ اللہ کے نزدیک مختار مذہب کے مطابق موقوف حجت نہیں ہے اور یہی صحیح ہے۔''[2] انتہی۔

امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم جو اعتقاد رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ زمینیں سات ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے جو ان میں سکونت رکھنے والے ہیں، وہی ان کو جانتا ہے۔[3] انتہی۔ یہ قول تمام اقوال سے اعدل (زیادہ انصاف والا) اور احوط (زیادہ احتیاط والا) ہے۔امام نیساپوری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ثعالبی نے اپنی تفسیر میں سماوات اور ارض کی پیدائش اور ان کی شکلوں اور ناموں کے بارے میں ایک فصل ذکر کی ہے۔ایسی روایتوں پر عدمِ وثوق کی وجہ سے ہم نے ان کو وارد کرنے سے اعراض کیا ہے۔انتہی۔امام کعب و وہب رحمہما اللہ اور ان کی امثال سے جو کچھ اس بارے میں آیا ہے، وہ سب غیر معتد بہ ہے، اس لیے کہ ان لوگوں نے اس کو اسرائیلیات سے لیا ہے۔[4]

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے طویل مرفوع حدیث میں مروی ہے، پھر کہا: اے محمد! اس کے نیچے کیا ہے، یعنی اس زمین کے نیچے؟ فرمایا: ایک خلق ہے۔فرمایا: پھر زمین کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا: پانی ہے۔پھر پانی کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا: ظلمت۔ پھر ظلمت کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا: ہوا۔کہا: پھر ہوا کے نیچے کیا ہے؟ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھیں بہ نکلیں اور فرمایا کہ اے سائل! خلائق کا علم منقطع ہوگیا۔تو وہ سائل بولا: تم نے سچ کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے رسول ہو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ کون ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔فرمایا: یہ جبرائیل ہے۔[5] (الحديث مختصرا أخرجه الحافظ ابن كثير بسنده وأخرجه ابن مردويه أيضا عنه بطوله)

یہ حدیث اس کو رد کرتی ہے جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، اگر ان کا قول صحیح ہو۔اس بات پر کلام کی زیادہ تفصیل کوئی خاص فائدہ نہیں دیتی۔ یہ اعتقاد کافی ہے کہ آسمان سات ہیں اور زمینیں سات ہیں۔ (كما ورد به الكتاب العزيز والسنة المطهرة) ان کی مخلوق میں اور ان چیزوں میں جو ان کے اندر ہیں غور وخوض نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ یہ ایک ایسی شے ہے کہ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اس کے سوا کوئی اور اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔اللہ پاک نے ہم کو مکلّف نہیں کیا کہ ایسے مسائل میں غور وخوض کریں اور ان میں تفکر کریں اور ان پر گفتگو کریں۔ وبالله التوفيق۔سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ بے شک زمینیں اس طرح ہیں کہ ہر زمین اور دوسری زمین جو اس سے متصل ہے اس کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے اور اُن میں سب سے اوپر والی زمین حوت (مچھلی) کی

---

[1] فتح البیان (١٩٨/١٤) [2] المنهاج للنووي (٣١/١) [3] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٢٠٩/٨)

[4] فتح البیان (١٩٨/١٤) [5] تفسير ابن كثير (١٩٢،١٩١/٣) اس کی سند میں ''قاسم بن عبدالرحمان'' ضعیف راوی ہے۔

پشت پر ہے جو اس کے دونوں طرف آسمان سے مل گئی ہے اور حوت صخرہ پر ہے اور صخرہ ایک فرشتے کے ہاتھ میں ہے اور دوسری ہوا کو قید رکھتی ہے اور تیسری میں جہنم کے پتھر ہیں اور چوتھی میں جہنم کی کبریت ہے۔[1] (الحديث بطوله وتفصيله أخرجه ابن أبي حاتم والحاكم وصححه) امام ذہبی رحمہ اللہ نے حاکم رحمہ اللہ کا تعقب کر کے کہا ہے کہ یہ ایک منکر حدیث ہے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ کسی کو لائق نہیں ہے کہ حاکم نے جو حدیثوں کی تصحیح کی ہے، اس سے دھوکا کھائے، یہاں تک کہ ذہبی رحمہ اللہ نے حاکم رحمہ اللہ کے جو تعقبات کیے ہیں ان میں غور کرے۔ أو كما قال۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "سید السماوات" وہ آسمان ہے جس میں عرش ہے اور "سید الأرضين" وہ زمین ہے جس میں ہم ہیں۔[2]

﴿ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ ﴾ جملہ مستانفہ ہے، ماقبل کی صفت ہے۔ جمہور نے ﴿ يَتَنَزَّلُ ﴾ پڑھا ہے "تنزل" سے اور بہ رفع ﴿ اَلْاَمْرُ ﴾ پڑھا ہے بنا بر فاعلیت اور کسی نے (یعنی ابوعمرو في رواية عنه نے) "يُنْزِلُ اِنْزَال" سے پڑھا ہے اور بہ نصب "اَلْاَمْرَ" بنا بر مفعولیت پڑھا ہے۔ فاعل اللہ پاک ہے۔ ﴿ اَلْاَمْرُ ﴾ سے مراد وحی ہے۔ کسی نے کہا: قضا و قدر کی ضمیر سماوات و ارضین کی طرح راجع ہے۔ جمہور کے نزدیک یا وہ اس شخص کے نزدیک سماوات وارض کی طرح راجع ہے جو یہ کہتا ہے کہ وہ ایک زمین ہے۔ (قاله السمين) محلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام اس امر کو ساتویں آسمان سے ساتویں زمین تک لے اترتے ہیں۔[3] انتهٰی.

علی قاری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم نے یہ قول ان کے سوا کسی اور مفسر کا نہیں پایا، اس لیے کہ انتہائی درجے کی یہ بات ہے کہ جس نے ﴿ اَلْاَمْرُ ﴾ کی تفسیر وحی کے ساتھ کی ہے اس نے ﴿ بَيْنَهُنَّ ﴾ کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ اس اوپر کی زمین کے درمیان جو اس کے پہلے ہے اور ساتویں آسمان کے درمیان جو ان سب سے اوپر ہے۔ انتهٰی.

سلیمان جمل رحمہ اللہ کہتے ہیں: علی قاری رحمہ اللہ کی طرف سے یہ توقف اس پر مبنی ہے کہ وحی سے مراد وحیِ تکلیف باحکام ہو، حالاں کہ یہ کچھ لازم نہیں ہے، اس لیے کہ وحی کو وحی تصرف فی الکائنات پر محمول کرنا ممکن ہے۔ خطیب کا بیان یہ ہے کہ اکثر اس پر ہیں کہ امر سے مراد قضا و قدر ہے، پس اس بنا پر قولہ ﴿ بَيْنَهُنَّ ﴾ سے مراد اس شے کی طرف اشارہ ہوگا جو ارضِ سفلیٰ کے درمیان جو اس کے پرلے سرے کی ہے اور ساتویں آسمان کے درمیان جو ان سب سے بلند ہے۔ چنانچہ اللہ کا امر اور قضا ان کے درمیان جاری ہوتا ہے اور اس کا حکم ان میں نافذ ہوتا ہے۔ انتهٰی.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نافع بن ارزق نے ان سے پوچھا: آیا زمینوں کے نیچے کوئی مخلوق ہے؟ فرمایا: ہاں، کہا: پھر کون سی مخلوق ہے؟ فرمایا یا تو ملائکہ ہیں یا جن۔[4] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساتوں آسمانوں

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٦١/١٠) مستدرك الحاكم (٦٣٦/٤) اس کی سند میں "دراج عن ابی الهیثم" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢٣٤/٢)

(2) الرد على الجهمية للدارمي (٦٠/١) (3) تفسير الجلالين (٧٥٠/١) (4) الكشاف (٥٦٤/٤)

سے ساتوں زمینوں کی طرف امر اترتا رہتا ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہر دو آسمانوں کے درمیان زمین ہے اور امر ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر ارض میں اس کے ارض سے اور ہر آسمان سے اس کے آسمان سے اس کی مخلوق میں سے ایک مخلوق اور اس کے امر سے ایک امر ہے اور اس کی قضا سے ایک قضا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ان کے درمیان کسی کی حیات کا اور کسی کی موت کا حکم اترتا رہتا ہے اور کسی قوم کے غنا کا اور کسی قوم کی فقیری کا حکم اترتا رہتا ہے۔ کسی نے کہا: یہ وہ امر ہے جس کی اپنی تدبیرِ عجیب سے تدبیر کرتا ہے، چنانچہ وہ بارش برساتا ہے، سبزی اُگاتا ہے۔ شب و روز لاتا ہے گرمی و سردی لاتا ہے، مختلف قسموں اور شکلوں کے حیوانات پیدا کرتا ہے، پھر ان کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل کرتا ہے۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ امر لغت کی وسعت کی بنا پر ہے، جیسے موت کو "أَمْرُ اللّٰهِ" کہا جاتا ہے، اسی طرح ہوا، بادل اور اس جیسی دوسری چیزوں کو بھی "أَمْرُ اللّٰه" کہتے ہیں۔[3]

﴿ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ حرفِ لام خلق سے متعلق ہے "مَا يَتَنَزَّلُ" سے یا مقدر سے "أَيْ: فَعَلَ ذٰلِكَ" یعنی اللہ تعالیٰ نے سات آسمان اور سات زمینیں بنائیں، یا ان کے درمیان اس کا امر نازل ہوتا رہتا ہے، یا یہ سب کام کیے، تاکہ تم اس بات کو جان لو کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے، خواہ وہ اس عالم کے علاوہ کسی اور عالم سے ہو، جس کا اس کی مشیت کے تحت میں داخل ہونا ممکن ہے۔ وہ اتنی قدرت والا ہے کہ اس عالم کی طرح کا ایک اور عالم لے آئے اور اس سے بھی زیادہ نادر اور عجیب اور اس سے بھی بڑھ کر عجیب اور بے انتہا ایک سے ایک بڑھ کر عالم بناتا رہے۔

یہ بات اس عالم سے استدلال کر کے معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ جو ایک ذرے کی عدم سے ایجاد پر قادر ہے، وہ اس پر بھی قادر ہے کہ جو شے ذرے سے کم ہے اور اس کی مثل ہے اور اس سے اوپر ہے اس کو ایجاد کر دے بے نہایت تک، کیوں کہ اس کے لیے قلیل و کثیر و جلیل و حقیر کے درمیان کچھ فرق نہیں ہے۔ ﴿ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ﴾ [الملك: ٣] "تو (اے دیکھنے والے) اللہ رحمان کی پیدائش میں کوئی بے ضابطگی نہ دیکھے گا۔" (كذا قال الخطيب)

سلیمان جمل رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ سب بہ نظرِ امکان عقلی کے ہے اور یہ اس قول کے مخالف نہیں ہے جو امام غزالی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ "لَيْسَ فِيْ الْإِمْكَانِ أَبْدَعُ مِمَّا كَانَ"، کیوں کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ پاک کا علم ازل میں اس بات کے ساتھ متعلق ہو چکا ہے کہ وہ اس عالم کے سوا کوئی اور عالم پیدا نہ کرے گا، اگرچہ اس کا پیدا کرنا جائز اور ممکن ہے، چنانچہ اس لحاظ سے کہ اس کے نہ ہونے کے ساتھ علم متعلق ہو چکا ہے، وہ غیر ممکن ہو گیا، اس لیے کہ اگر وہ وقوع میں آتا تو علمِ ازلی کے مقتضا کے خلاف ہوتا، پھر جہل سے علم کا انقلاب لازم آتا، چنانچہ اس لحاظ سے دوسرے عالم کا ایجاد محال عرضی ہو گیا، اگرچہ ذاتی طور پر ممکن ہے۔ پس شیخ کا کہنا: "قَوْلُ لَيْسَ فِي الْإِمْكَانِ أَبْدَعُ

---

[1] تفسير القرطبي (١٧٧/١٨) [2] تفسير البغوي (١٥٨/٨) [3] تفسير القرطبي (١٧٧/١٨)

مِمَّا كَانَ، اس کے یہ معنی ہیں جو مذکور ہوئے، یعنی ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عالم کے سوا کوئی اور عالم پیدا کرے اور امکان کی نفی وہی استحالہ ہے تو گویا یوں کہا: یہ محال ہے کہ اس عالم کے سوا کوئی اور عالم پیدا کرے اور تم جان چکے ہو کہ یہ استحالہ عرضی ہے ذاتی نہیں ہے اور اسی تقریر سے تم اس بات کا ساقط ہونا پہچان لوگے جو یہاں بقاعی سے نقل کی گئی ہے۔ تأمل انتھی.

صاحبِ فتح البیان ۔رحمه الله تعالیٰ و تجاوز عنا و عنه۔ فرماتے ہیں کہ یہ سب بہ نظرِ امکان عقلی کے نہیں ہے، جیسا کہ سلیمان جمیل رحمہ اللہ نے کہا ہے، بلکہ اللہ پاک کی عمومِ قدرت پر اور کمالِ قدرت پر کتابِ عزیز و سنتِ مطہرہ دال ہیں کہ وہ علی العموم ہر شے کی ایجاد پر قادر ہے، چنانچہ اس عالم کی طرح کا عالم ایجاد کرنا تو اس میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہے، گو وہ مقتضائے علمِ ازلی کی بنا پر پایا نہ گیا۔ غزالی کا قول ایک ساقط الاعتبار بات ہے اور ایسی فلسفیانہ بات کو زبان پر بھی نہیں لانا چاہیے، اگرچہ بعید وفاسد تاویل اور باردتوجیہ کے ذریعے اس کا مطلب درست بھی ٹھہر جائے، بہر حال کتابِ عزیز وعالی کا نظمِ بیان غزالی کی اس قسم کی عبارتوں سے بے پروا کر دیتا ہے۔[1] انتھی.

شیخنا المرحوم نے یہ بات جب کہی ہے کہ امام غزالی کے کلام سے ان کو چنداں فریفتگی نہ تھی، بعد میں پھر امام غزالی رحمہ اللہ کا ایسا رنگ چڑھا کہ اکثر ان کا ذکرِ خیر کرتے تھے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ ”إحياء العلوم“ سے انتخاب کر کے کئی رسالے تالیف فرمائے، آدمی کا حال برابر نہیں رہتا، ہر حال کا جدا مقتضا ہوتا ہے۔ غفر الله لنا وله آمین. (مگر تحقیقِ سابق جب کتاب اور سنت سے ثابت ہے تو اس کا خلاف کسی کے رنگ چڑھنے سے تسلیم نہیں ہوسکتا۔ صبغة الله و من أحسن من الله صبغة. از مصحح سلمه الله)۔

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ اس کا نصب بنا بر مصدریت ہے، اس لیے کہ احاطہ بہ معنی علم ہے یا صفت ہے مصدر محذوف کی: ”أَيْ: أَحَاطَ إِحَاطَةً عِلْمًا“ (تو مفعول مطلق من غیر لفظ الفعل ہوا جیسے: ”قعدت جلوسا“)۔ یہ بھی جائز ہے کہ تمیز محول عن الفاعل ہو (أَيْ: أحاط علمه بكل شيء) معنی یہ ہیں اور تا کہ اس بات کو جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے علم نے ہر شے کو گھیر لیا ہے۔[2] كذا في فتح البيان والله أعلم بأسرار كلامه.

الحمد لله و المنة سورة الطلاق کی تفسیر ہفتم ماہ ذی قعدہ ۱۳۱۵ ہجری روز چہار شنبہ (بدھ) بعد مغرب مکمل ہوئی۔ اللہ سبحانہ قبول فرمائے اور آئندہ کی توفیق دے۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ آمِيْنَ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ. اللهم صل وسلم وبارك على سيدنا ومولانا سيد المرسلين شفيع المذنبين محمد وعلى آله الطاهرين و صحبه الأكرمين إلى يوم الدين عدد ما علمت و زنة ما علمت وملء ما علمت آمين، والحمد لله أولا وآخرا وظاهرا وباطنا.

---

[1] فتح البيان (۲۰۱/۱۴)

[2] فتح البيان (۱۴/۱۹۳۔۲۰۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا نام ''سورۃ النبی ﷺ'' بھی رکھا جاتا ہے، اس سورت مبارکہ کی بارہ (۱۲) آیتیں ہیں اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۃ التحریم مدینے میں نازل ہوئی۔ (أخرجه النحاس و ابن مردويه عنه۔ ابن مردویہ رحمہ اللہ کے الفاظ سورۃ المحرم ہیں)۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۃ النساء ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ ﴾ مدینے میں نازل کی گئی۔[2]
(أخرجه ابن مردويه عنه)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١﴾ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ
وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿٢﴾ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ
فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ
بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ
الْخَبِيْرُ ﴿٣﴾ اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا
عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴿٤﴾ عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا
خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ
وَّاَبْكَارًا ﴿٥﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اے نبی! آپ حرام کیوں ٹھہراتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے؟ آپ اپنی

[1] تفسير القرطبي (۱۸/۱۸۷) [2] الدر المنثور (۸/۲۱۳)

بیویوں کی رضا مندی چاہتے ہیں۔ اور اللہ خوب بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے① تحقیق اللہ نے تمھارے لیے تمھاری (ناجائز) قسمیں کھولنا (توڑنا) فرض کر دیا ہے، اور اللہ تمھارا مولا ہے، اور وہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے② اور جب نبی نے اپنی بیویوں میں سے کسی ایک سے ایک بات چھپا کر کہی، پھر جب اس نے (دوسری کو) وہ بتا دی اور اللہ نے وہ (گفتگو) اس (نبی) پر ظاہر کر دی تو اس نے اس میں سے کچھ (اس بیوی کو) بتائی اور کچھ ٹال دی۔ پھر جب اس (نبی) نے اسے وہ (بات) بتائی تو وہ کہنے لگی: آپ کو یہ کس نے بتائی؟ اس (نبی) نے فرمایا: مجھے خوب جاننے والے، بہت باخبر (اللہ) نے خبر دی ہے③ اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو بہتر ہے) پس تمھارے دل (حق سے) ہٹ گئے ہیں، اور اگر تم دونوں اس (نبی) کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو گی تو اللہ خود اس کا مددگار ہے اور جبریل اور تمام نیک مومن اور ان کے علاوہ (تمام) فرشتے (بھی) مددگار ہیں④ اگر وہ (نبی) تمھیں طلاق دے دے تو شاید اس کا رب اس کو تم سے بہتر بیویاں بدلے میں دے دے، مسلمان، مومن، فرمانبردار، توبہ کرنے والی، عبادت گزار، روزہ دار، شوہر دیدہ اور کنواری عورتیں⑤

نبیِ مکرم ﷺ نے دوسری بیویوں کی خاطر اپنی ایک بیوی کے پاس جانا موقوف کر دیا، یا ایک بیوی کے پاس سے شہد پینا چھوڑ دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا اور کفارہ دے کر قسم توڑنے کی اجازت دے دی۔ اب جو کوئی اپنے مال کو کہے کہ مجھ پر حرام ہے تو یہ قسم ہوگئی۔ کھانا ہو یا کپڑے ہوں یا لونڈی ہو، کفارہ دے تو اس کو استعمال کر لے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس بیوی کے پاس جانے کو جو موقوف کیا اس کے متعلق سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو بتایا اور انھیں کسی اور کو بتانے سے منع کیا اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی تھا۔ پھر انھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو خبر دی کہ دونوں باتوں میں دونوں کا کچھ مطلب تھا۔ پھر وحی کے ذریعے معلوم کر کے نبیِ مکرم ﷺ نے حفصہ کو بیوی کی بات کا الزام دیا اور دوسری بات کا ذکر نہ کیا۔ وہ دوسری بات کیا ہے، شاید یہ تھی کہ تیرا باپ اس کے باپ کے بعد خلیفہ ہوگا۔ ”الغیب عند اللّٰہ“ جو بات اللہ اور رسول نے ٹلا دی، ہم کیا جانیں، اسی لیے ٹلا دی کہ مشہور نہ ہو، تاکہ اور لوگ برا نہ مانیں۔ تمھارے دل جھک پڑے ہیں یعنی توبہ ضروری ہے۔ انتہیٰ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہاں تحریم سے مراد تمتع لینے سے باز رہنا ہے، اس کے حرام ہونے کا اعتقاد نہیں اس

کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے حلال کیا، کیوں کہ یہ اعتقاد آپ ﷺ سے صادر نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ یہ تو کفر ہے۔ (قاله الخطيب) جملہ ﴿ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوٰجِكَ ﴾ مستانفہ ہے یا تحریم کی تفسیر ہے، یا حال ہے ﴿ تُحَرِّمُ ﴾ کی ضمیر سے۔ ﴿ مَرْضَاتَ ﴾ اسم مصدر ہے اور رضا مصدر ہے، اصل اس کی "مرضوة" ہے۔ یہ مصدر یا تو مفعول کی طرف مضاف ہے: "أَيْ: تَرْضَى أَزْوَاجَكَ" یا فاعل کی طرف مضاف ہے: "أَيْ: أَنْ يَرْضَيْنَ هُنَّ" یعنی اے نبی! تو اس شے کے تمتع لینے سے کیوں باز رہے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے حلال کی ہے، درآنحالیکہ تو یہ چاہتا ہے کہ تو اپنی بیویوں کو راضی کرے یا یہ کہ وہ تجھ سے راضی ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ تیری طرف سے یہ بات لائق نہیں کہ تو اس کام میں مشتغل ہو جو خلق کو راضی کرے، بلکہ چاہیے کہ تیری بیبیاں اور ساری مخلوق تیری رضا جوئی میں سعی وکوشش کریں اور تو خود اس شے کے لیے فارغ ہو جائے جس کی تیرے رب تعالیٰ کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ خطیب نے کہا: اس میں اس بات پر تنبیہ ہے جو آپ ﷺ سے صادر ہوئی وہ علی ما ينبغي نہ تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ صغائر میں سے ایک گناہ تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس پر عتاب فرمایا۔ کسی نے کہا کہ یہ ترکِ اولیٰ پر عتاب تھا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آپ ﷺ سے ایک زلہ، یعنی لغزش تھی۔[1] ﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی اس تحریم ﴿ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ﴾ کے لیے جو تجھ سے اچانک ہوگئی اللہ بلیغ المغفرت والرحمت ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے شانِ نزول میں کئی قول پر اختلاف کیا ہے۔ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے، چنانچہ وہ اپنے والد کی ملاقات کے لیے گئیں، جب لوٹ کر آئیں تو ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر میں نبیِ مکرم ﷺ کے ساتھ دیکھا تو وہ گھر کے اندر نہ آئیں، یہاں تک کہ ماریہ رضی اللہ عنہا نکل گئیں، پھر اندر آئیں، جب نبی اکرم ﷺ نے بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے چہرے میں غیرت اور شکستگی دیکھی تو ان سے فرمایا کہ تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مت بتانا اور تیری خاطر مجھ پر یہ ہے کہ میں اس سے کبھی قربت نہ کروں گا۔ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو خبر کر دی، یہ دونوں باہم صاف تھیں تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا خفا ہوئیں اور نبیِ کریم ﷺ کے پیچھے پڑی رہیں، یہاں تک کہ آپ نے یہ قسم کھائی کہ ماریہ رضی اللہ عنہا کے قریب نہ ہوں گے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ محلی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر مفسرین اس پر ہیں کہ یہ آیت بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے حق میں نازل ہوئی اور قصۂ مذکور ذکر کیا۔[3] امام ابو السعود اور نسفی رحمہما اللہ کہتے ہیں: مروی ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے دن میں ماریہ سے خلوت کی اور بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوگیا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تو مجھ پر کتمان کر (یعنی یہ

[1] تفسير النسفي (٤/٢٥٩) [2] تفسير الجلالين (٧٥١/١) [3] فتح القدير (٣٣١/٥)

بات چھپا) کہ میں نے ماریہ کو اپنے نفس پر حرام کر لیا اور میں تجھے بشارت دیتا ہوں کہ میرے بعد میری امت کے امور کے سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما مالک ہوں گے۔ چنانچہ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کی خبر دے دی اور یہ دونوں باہم صاف تھیں۔[1] انتہیٰ. سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حرم تھیں، ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم وطی کرتے تھے، پھر بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا اور بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا پیچھے پڑی رہیں، یہاں تک کہ اس حرم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر حرام کر لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2] (أخرجه النسائي و الحاكم وصححه و ابن مردويه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا: وہ کون سی دو عورتیں ہیں جنھوں نے باہم مل کر چڑھائی کی؟ فرمایا: سیدہ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہا اور قصے کا شروع ماریہ قبطیہ کی شان میں تھا جو اُم ابراہیم ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں اس کے باری کے دن میں اس سے صحبت کی تو حفصہ رضی اللہ عنہا رنجیدہ ہوئیں اور کہا: اے اللہ کے رسول! البتہ واقعی آپ میری طرف ایک ایسی شے لائے میرے دن میں، میرے گھر میں، میرے بچھونے پر کہ آپ اپنی بیبیوں میں سے کسی اور کی طرف اس کو نہ لائے۔ فرمایا: کیا تو راضی نہیں ہوتی کہ میں اس کو حرام کر لوں اور اس کے قریب کبھی نہ آؤں؟ عرض کی: کیوں نہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام کر لیا اور فرمایا کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا، چنانچہ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کو ظاہر کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ نازل کیا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ چنانچہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قسم کا کفارہ دیا اور ماریہ سے صحبت کی۔[3] (أخرجه البزار والطبراني قال السيوطي بسند صحيح وأخرجه ابن سعد وابن مردويه عنه بأطول من هذا وأخرجه ابن مردويه من وجه آخر عنه بأخصر منه وأخرجه ابن المنذر والطبراني وابن مردويه عنه مختصرا بلفظ قال حرم سريته وجعل ذلك سبب النزول في جميع ما روي من هذه الطرق)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: کسی سے بیان مت کرنا اور ابراہیم کی ماں مجھ پر حرام ہے۔ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: کیا آپ اس شے کو حرام کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کی؟ فرمایا: قسم ہے اللہ کی! میں اس کے قریب نہ ہوؤں گا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قریب نہ ہوئے، یہاں تک کہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو خبر دی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ﴾[4] (أخرجه الهيثم بن كليب في مسنده والضياء المقدسي في المختار من طريق نافع)

---

[1] تفسير أبي السعود (٢٦٦/٨) تفسير النسفي (٢٥٨/٤)

[2] سنن النسائي (٣٩٥٩) مستدرك الحاكم (٥٣٥/٢) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] فتح القدير (٣٣٤/٥) [4] الدر المنثور (٢١٦/٨)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آیت کے نزول کا سبب ماریہ رضی اللہ عنہا کی تحریم ہے، جیسا کہ گزر چکا ہے۔[1] (أخرجه الطبراني في الأوسط و ابن مردويه وسنده ضعيف)

دوسرا قول ہے جو کسی نے کہا ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہد پیا کرتے ہیں۔ یہ وہ سببِ نزول ہے جس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔ وہ بی بی جن کے پاس شہد پیا وہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا تھیں۔ چنانچہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا اور بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے آپس میں اس بات پر اتفاق کیا کہ جس وقت نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائیں تو دونوں کہیں کہ ہم آپ سے مغافیر کی بو پاتے ہیں (جمع "مغفور" بالضم یہ ایک میٹھی گوند ہے جس کی بو کریہ ہوتی ہے، اس کو پانی میں گھول کر پیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے کریہ بو آنے کو ناپسند فرماتے تھے) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد کو حرام کر لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس ٹھہرتے تھے اور ان کے پاس شہد پیا کرتے تھے، پھر میں نے اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے ایک دوسرے کو اس کی وصیت کی کہ ہم میں سے جس کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو وہ کہے کہ میں آپ سے مغافیر کی بو پاتی ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے ایک کے پاس تشریف لائے تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی کہا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ میں نے تو زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پیا ہے اور میں ہرگز پھر نہ پیوں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ ... إلىٰ قوله ... اِنْ تَتُوْبَآ ﴾ یہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا اور بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کو خطاب ہے۔ ﴿ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ﴾ اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا ہے بلکہ میں نے تو شہد پیا ہے۔[2] کسی نے کہا کہ یہ عورت بی بی سودہ رضی اللہ عنہا ہیں، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی سودہ رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پیا، پھر بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے تو کہا کہ مجھے آپ سے ایک بو آتی ہے، پھر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو انھوں نے بھی یہی کہا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اس کو خیال کرتا ہوں کہ یہ اس پینے کی شے سے ہے جو میں نے سودہ کے پاس پی ہے۔ واللہ! میں اسے کبھی نہ پیوں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[3] (أخرجه ابن المنذر و ابن أبي حاتم والطبراني و ابن مردويه. قال السيوطي بسند صحيح)

کسی نے کہا: یہ بی بی اُم سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں، جیسا کہ عبداللہ بن رافع رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ کہا: میں نے بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت کے متعلق پوچھا: ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ ﴾ کہا: میرے پاس سفید شہد کا ایک کپہ تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

① المعجم الأوسط (۱۳/۳) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني في الأوسط من طريق موسى بن جعفر بن أبي كثير عن عمه قال الذهبي: مجهول و خبره ساقط" (مجمع الزوائد: ۲٦۸/۷)

② صحيح البخاري (۳۳٦٦) صحيح مسلم (۱٤۷٤)

③ تفسير ابن أبي حاتم (۳۳٦۲/۱۰) المعجم الكبير (۱۱۷/۱۱) الدر المنثور (۲۱۳/۸، ۲۱٤)

اس میں سے لحوق فرماتے تھے (چاٹتے تھے) اور وہ آپ ﷺ کو پسند تھا، چنانچہ بی بی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہہ دیا، اس کی مکھیاں عرفط کھاتی ہیں ("عرفط" بالضم خاردار درخت ہیں، ان کے گوند میں بدبو ہوتی ہے، جب شہد کی مکھیاں اس کو کھاتی ہیں تو ان کے شہد میں اس کی بو آ جاتی ہے۔ مکھیاں جو درخت کے پھول کھاتی ہیں اس کھانے کو جرس بالسین کہتے ہیں)۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] (أخرجه ابن سعد) امام خطیب اور خازن رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ یہ عورت بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ چنانچہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا، بی بی سودہ اور بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا نے آپس میں اتفاق کیا اور نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ہم اس سے مغافیر کی بو پاتے ہیں، آپ ﷺ نے شہد کو حرام کر لیا۔[3] (قاله البيضاوي)

تیسرا قول یہ ہے کہ کسی نے کہا کہ آیت کا سببِ نزول وہ عورت ہے جس نے اپنا نفس نبی مکرم ﷺ کو ہبہ کر دیا تھا۔ پہلے دو تو نزولِ آیت کے صحیح سبب ہیں۔ اور ان میں جمع اس طرح سے ممکن ہے کہ دو قصے واقع ہوئے ہوں: ایک ماریہ رضی اللہ عنہا کا قصہ اور ایک شہد کا قصہ اور قرآن شریف دونوں میں نازل ہوا ہو اور ان میں سے ہر ایک میں یہ ہو کہ نبیِ کریم ﷺ نے اپنی بعض بیویوں سے پوشیدہ بات کہی ہو۔ اب رہا تیسرا قول تو شیخ شیوخنا علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں نہیں ہے مگر وہی اثر جو بہ روایت ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت اس عورت کے لیے نازل ہوئی جس نے اپنا نفس نبیِ کریم ﷺ کو بخشا تھا۔

امام سیوطی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے[4] اور یہ بات بھی اس کو رد کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے اس واہبہ نفس کو قبول نہیں فرمایا، پھر یہ کس طرح ٹھیک ہو سکتا ہے کہ یوں کہا جائے کہ آیت اس کی شان میں نازل ہوئی، کیوں کہ جس نے وہ شے رد کر دی جو اسے بخشی گئی تو یہ صحیح نہیں ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس نے وہ اپنے نفس پر حرام کر لی اور اس سبب کی بنا پر قولہ تعالیٰ: ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ...﴾ إلى آخر ما حكاه الله بھی منطبق نہیں ہوتا۔ اب رہی وہ بات جو صحیحین وغیرہ میں ثابت ہوئی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ان دو عورتوں کے متعلق پوچھا جنھوں نے نبی اکرم ﷺ پر چڑھائی کی تو انھوں نے بتایا کہ وہ سیدہ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما ہیں۔

پھر ایلاء کا قصہ بیان کیا، جیسا کہ حدیثِ طویل میں ہے، چنانچہ اس بات میں اس کی نفی نہیں ہے کہ ہم جو قصۂ شہد اور خفیہ بات کا پہلے ذکر کر آئے ہیں، وہ سببِ نزول ہے (مطلب یہ ہے کہ اس کے سببِ نزول ہونے کی اس میں نفی نہیں ہے)۔ اس لیے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو صرف دو متظاہر عورتوں کی خبر دے دی اور اس میں یہ ذکر کیا کہ نبیِ اکرم ﷺ کی بیبیاں ان سے تکرار کرتی تھیں اور ان میں سے کوئی دن سے رات تک

---

[1] الدر المنثور (٢١٤/٨) [2] تفسير الخازن (١١٥،١١٤/٧) [3] تفسير البيضاوي (٣٥٤/٥)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٦٢/١٠) الدر المنثور (٢١٧/٨)

آپ ﷺ سے بات نہیں کرتی تھی اور یہ کنارہ کر لینے کا سبب ہے، ﴿ يَآيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ کے نزول کا سبب نہیں ہے اور اسی کی مؤید وہ بات ہے جو ہم پہلے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کر آئے ہیں کہ انھوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے دو متظاہر عورتوں کے متعلق پوچھا تو انھوں نے ان کو خبر دی کہ وہ حفصہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما ہیں اور ان سے بیان کر دیا کہ نزول کا سبب ماریہ کا قصہ ہے۔ یہ رہا اس آیت کریمہ کے سببِ نزول کا خلاصہ جس سے اختلاف رفع دفع ہو جاتا ہے، لہٰذا آپ اس کو اختیار کر لیں، تاکہ آپ مفسرین کے اس خلجان سے بچ جائیں جن میں وہ ملوث ہو گئے۔[1]

﴿ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ﴾ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے تمھاری قسموں کا کھولنا مشروع کیا اور تمھارے لیے ان سے نکلنا اور کفارہ دے کر رہائی پانا بیان کر دیا۔ ﴿ تَحِلَّةَ ﴾ کی اصل "تحللہ" ہے، پھر ایک لام کا دوسرے میں ادغام کیا گیا، یہ مصدر مصادرِ تفعیل سے ہے، جیسے: "توصية و تسمية" تو گویا قسم عقد ہے اور کفارہ حل ہے، اس لیے کہ کفارہ قسم کھانے والے کے لیے اس شے کو حلال کر دیتا ہے جو اس نے اپنے نفس پر حرام کی تھی۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے پہلے معنی بیان کرنے کے بعد کہا ہے: یا یہ معنی ہیں کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری قسموں میں سے استثناء مشروع کیا جو اس محاورے میں ماخوذ ہے: "حَلَّلَ فُلَانٌ فِيْ يَمِيْنِهِ إِذَا اسْتَثْنَى فِيْهَا" یہ یوں ہے کہ قسم کھانے کے بعد ان شاء اللہ کہہ دے، تاکہ حانث (قسم توڑنے والا) نہ ہو۔ حلال کی تحریم ہمارے نزدیک قسم ہے۔[2] انتہٰی.

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تحقیق اللہ پاک نے تمھاری قسموں کا کفارہ سورۃ المائدہ میں بیان کر دیا۔[3] اللہ پاک نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ اپنی قسم کا کفارہ دیں اور اپنی لونڈی سے رجوع کریں، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک گردن آزاد کی۔ حسن سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے کفارہ نہیں دیا، اس لیے کہ آپ تو مغفور لہ ہیں۔[4] (ذكره المحلي والنسفي) یعنی آپ ﷺ کے تو اگلے پچھلے گناہ بخش دیے گئے۔ یہ صرف مومنین کو تعلیم ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ جو شے اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہے اس کو حرام کرے۔[5] حق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کی تحریم منعقد نہیں ہوئی اور نہ وہ حرام کرنے والے پر لازم ہوئی ہے۔ چنانچہ تحلیل و تحریم اللہ پاک کی طرف ہیں نہ کہ کسی اور کی طرف۔ اللہ پاک کا اس سورت میں نبی اکرم ﷺ سے ناراضی کا اظہار کرنا اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس سلسلے میں ایک لمبی بحث ہے اور علماء کے کئی ایک مذاہب اور اقوال ہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی تالیفات میں ان کی تحقیق پیش کر دی ہے جس سے قارئین کی تسلی ہو جاتی ہے، چنانچہ انھوں نے "نیل الأوطار" میں اس سلسلے کے پندرہ اقوال ذکر فرمائے ہیں۔

---

[1] فتح القدير (٣٣٥/٥) فتح البيان (٢٠٨/١٤، ٢٠٩) [2] تفسير النسفي (٢٥٩/٤) [3] رقم الآية (٨٩)
[4] تفسير النسفي (٢٥٩/٤) تفسير الجلالين (٧٥١/١) [5] معاني القرآن (١٩٢/٥)

علماء رحمہم اللہ نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ آیا تحریم یمین (قسم اٹھا کر حرام کرنا) ہے جو کفارے کو واجب کرتی ہے یا نہیں اور اس میں اختلاف ہے۔ آیتِ کریمہ میں وہ بات نہیں جو اس پر دال ہے کہ وہ یمین ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے آپ ﷺ کو اس پر عتاب فرمایا کہ جو شے اس نے آپ ﷺ کے لیے حلال کی اس کو آپ ﷺ نے حرام کر لیا۔ پھر فرمایا: ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ جس قصے کی طرف اکثر مفسرین گئے ہیں کہ وہ آیت کا سببِ نزول ہے، اس میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے تحریم کی پھر دوبارہ قسم کھائی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حرام میں کفارہ دے اور فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب:٢١] ”یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے۔“[1] (أخرجه عبد الرزاق وغيره يعني البخاري و ابن مردويه)

ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے عرض کی کہ بے شک میں نے اپنی عورت اپنے اوپر حرام کر لی ہے تو فرمایا کہ تو نے جھوٹ کہا، وہ تجھ پر حرام نہیں ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ فرمایا، تم پر اغلظ کفارات (سب سے زیادہ سخت کفارہ) ہے، ایک گردن کا آزاد کرنا۔[2] (أخرجه ابن المنذر وغيره) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ قسم کھائی کہ مسطح کو نفقہ نہ دیں گے اس پر اللہ تعالیٰ نے ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ نازل فرمائی، پھر انھوں نے قسم کھول ڈالی اور اس کو نفقہ دیا۔[3] (أخرجه الحارث بن أبي أسامة)

﴿وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تمھارا ولی اور ناصر ہے اور تمھارے کاموں کا متولی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿مَوْلٰىكُمْ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ”أَوْلٰى بِكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ“، یعنی اس کو تمھارے ساتھ تمھارے نفوس سے بھی بڑھ کر لگاؤ ہے، چنانچہ تم جو اپنے نفوس کی خیر خواہیاں کرتے ہو، اُن سے بڑھ کر اس کی نصیحت اور خیر خواہی تمھارے لیے فائدہ مند ہے۔[4] (ذكره النسفي)۔ ﴿وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ یعنی جس شے میں تمھاری بہتری اور فلاح ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے اور اپنے اقوال و افعال میں حکمت والا ہے۔

﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا﴾ عامل ظرف میں فعل مقدر ہے: ”أَيْ: اُذْكُرْ إِذْ أَسَرَّ“، اکثر مفسرین نے جن میں سے علامہ نسفی، محلی اور خازن رحمہم اللہ ہیں، کہا ہے کہ بعض ازواج سے مراد بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں،[5] جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور حدیثِ تحریم ماریہ کی ہے، یا شہد کی، یا تحریم اس عورت کی جس نے اپنا نفس آپ ﷺ کو

---

[1] صحيح البخاري (٤٦٢٧) صحيح مسلم (١٤٧٢)
[2] سنن النسائي (٣٤٢٠) الدر المنثور (٢١٨/٨)
[3] الدر المنثور (٢١٨/٨)
[4] تفسير النسفي (٢٥٩/٤)
[5] تفسير النسفي (٢٥٩/٤) تفسير الجلالين (٧٥١/١) تفسير الخازن (١١٧/٧)

بخشا تھا۔ امام کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس بی بی سے پوشیدہ بات یہ کہی تھی کہ تیرا باپ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کا باپ دونوں میرے بعد میری امت پر خلیفہ ہوں گے۔[1] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اس بی بی سے پوشیدہ بات یہ فرمائی تھی کہ میرے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ میرا خلیفہ ہے۔(أخرجه ابن عدي و ابن عساكر)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، واللہ! بے شک ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی امارت البتہ کتاب میں ہے: ﴿ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ﴾ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تیرا باپ اور عائشہ کا باپ دونوں میرے بعد لوگوں کے والی ہیں، چنانچہ تو اس سے بچ کہ کسی کو اس کی خبر دے۔[2] (أخرجه ابن عدي وأبو نعيم في الصحابة والعشاري في خصائل الصديق رضی اللہ عنہ وابن مردويه وابن عساكر من طرق عنهما) امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بات نہیں کہ یہ قولہ تعالیٰ: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ کا سببِ نزول ہے، بلکہ اس میں تو یہ ہے کہ جو بات میں نے پوشیدہ کہی وہ یہ ہے، چنانچہ بالفرض کہ اس کی اسناد ایسی ہو جس پر اعتبار کیا جا سکے تو بھی اس کے خلاف وہ صحیح روایتیں ہیں جو پہلے گزر چکی ہیں اور وہ اس پر مقدم ہیں اور اس کی نسبت وہ مرجح ہیں۔[3]

﴿ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ ﴾ یعنی جب ان بی بی نے اس بات کی خبر دے دی، دوسری کو یہ خیال کر کے کہ اس میں کوئی حرج نہیں تو یہ ان کی طرف سے ایک اجتہاد تھا اس میں وہ ماجور ہیں (اجر کی مستحق) اور یہ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی قولِ صحیح کی بنا پر اجتہاد جائز تھا جیسا کہ "جمع الجوامع" میں ہے: "نبأ وأنبأ وخبر وحدث" کی اصل یہ ہے کہ دو مفعول کی طرف متعدی ہوں، ایک کی طرف تو بنفسہا اور دوسرے کی طرف بہ حرفِ جر اور کبھی جار محذوف ہوتا ہے تخفیفاً اور کبھی پہلا مفعول حذف کیا جاتا ہے، اس لیے کہ اس پر کوئی دال ہوتا ہے، یہ تینوں استعمال اس آیتِ کریمہ میں آئے ہیں۔ چنانچہ ﴿ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ ﴾ دو مفعول کی طرف متعدی ہے جن کا اول محذوف ہے اور دوسرا مجرور بہ حرفِ باء ہے اور ﴿ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ ﴾ میں دونوں کو حذف کیا ہے۔ اور ﴿ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ﴾ میں دونوں کو ذکر کیا ہے اور جار کو محذوف کیا ہے۔

﴿ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ ﴾ یعنی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو جبریل کی زبانی اس بات پر مطلع کر دیا جو ان کی بی بی سے واقع ہوئی تھی (یعنی حفصہ رضی اللہ عنہا سے) کہ انھوں نے دوسری کو اس کی خبر دے دی تھی۔ ﴿ عَرَّفَ بَعْضَهٗ ﴾ یعنی جس بات کی خبر ان کی بی بی نے اپنے غیر کو دے دی تھی، اس میں سے کچھ تو ان کو جتا دی، یعنی تحریم ماریہ کی یا شہد کی۔ جمہور نے ﴿ عَرَّفَ ﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے تعریف سے۔ معنی یہ ہیں کہ بعض قصہ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کو بتا دیا اور جو

---

[1] تفسير البغوي (١٦٤/٨) [2] الدر المنثور (٢١٨/٨، ٢١٩) [3] فتح القدير (٣٣٦/٥)

بات ان سے واقع ہوئی تھی اس میں سے بعض کی ان کو خبر دے دی اور کسی نے (یعنی علی، طلحہ بن مصرف، ابوعبدالرحمان سلمی، حسن، قتادہ اور کسائی رحمہ اللہ نے) اس کو بہ تخفیف پڑھا ہے، یعنی اس میں سے بعض بات پہچان لی جو بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے کی تھی۔

امام ابو عبید اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے پہلی قراءت کو اختیار کیا ہے، اس لیے کہ اس کے بعد یوں فرمایا ہے: ﴿ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ﴾ اگر ﴿ عَرَفَ ﴾ مخفف ہوتا تو اللہ پاک اس کی ضد میں "وَأَنْكَرَ بَعْضًا" فرماتا، یعنی بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے جو بات اپنے غیر سے کہہ دی تھی اس میں سے بعض ان کو نہیں جتائی اور نہ اس کی ان کو خبر دی اپنی بڑائی رکھ کر اور شرما کر اور حسنِ عشرت کا پاس کر کے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: "مَا اسْتَقْصَى كَرِيْمٌ قَطُّ"[1] یعنی کریم نے کبھی استقصا نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ کریم کی شان زیادہ کرید کرنے کی نہیں ہوتی، ہمیشہ اس کا برتاؤ درگزر اور چشم پوشی کا ہوتا ہے۔

امام سفیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "مَا زَالَ التَّغَافُلُ مِنْ فِعْلِ الْكِرَامِ"[2] یعنی ہمیشہ جان بوجھ کر غافل بننا من جملہ فعلِ کرام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں سے بعض بات جتانے سے اعراض کیا اس امر کی کراہت کے لیے کہ وہ لوگوں میں منتشر ہو جائے۔ کسی نے کہا: جس بات سے اعراض فرمایا، وہ ماریہ کا قصہ ہے۔ کسی نے کہا: وہ یہ ہے کہ ان کا باپ اور ابوبکر رضی اللہ عنہما آپ کے بعد خلیفہ ہوں گے۔ یہاں مفسرین کو ایک خلط وخبط واقع ہوا ہے۔ ان میں سے ہر جماعت اس طرف گئی ہے کہ تعریف و اعراض کی تفسیر اس شے کے ساتھ کی ہے جو اس شے میں سے کسی شے کے مطابق ہے جو سببِ نزول میں وارد ہوئی ہے، ہم اس کی وضاحت پہلے کر چکے ہیں۔

﴿ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾ یعنی پھر جب نبی اکرم ﷺ نے ان بی بی کو اس قصے کی خبر دی جس کا انھوں نے افشا کیا تو بولیں کہ آپ کو کس نے اس کی خبر دی؟ فرمایا: مجھے اس جاننے والے اور واقف کار نے خبر دی جس پر کوئی چھپی ہوئی بات بھی مخفی نہیں رہتی۔

﴿ اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ یہ سیدہ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کو بر طریقِ التفات خطاب ہے، تا کہ ان کے عتاب میں زیادہ مبالغہ ہو۔ اس شرط کا جواب محذوف ہے: "أَيْ: فَهُوَ الْوَاجِبُ" اس محذوف پر یہ قول دال ہے۔ ﴿ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ﴾ "أَيْ: أَثِمَتْ وَزَاغَتْ وَعَدَلَتْ وَمَالَتْ عَنِ الْوَاجِبِ" یعنی اے عائشہ و حفصہ! اگر تم اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو اور اس کی طرف رجوع ہو تو تمھارا یہ توبہ کرنا واجب ہے، اس لیے کہ واقعی تمھارے دل گناہ گار ہو گئے اور نبی اکرم ﷺ کی مخالفت میں واجب سے میل کر گئے۔ وہ واجب یہ ہے کہ جس بات کو وہ محبوب رکھیں تم بھی اس کو محبوب رکھو اور جس کو وہ ناپسند رکھیں تم بھی اس کو ناپسند رکھو۔ تم کو نبی کریم ﷺ سے اس طرح کا خلوص چاہیے تھا اور

[1] تفسیر القرطبي (١٨/١٨٨) [2] روح المعاني (٢٨/١٥٠)

یہ تم پر واجب تھا۔ تمھارے دل اس واجب سے مائل ہو گئے، تم نے اس کے خلاف کیا اور تم سے وہ بات پائی گئی جو توبہ کو واجب کرتی ہے وہ بات یہ ہے کہ دونوں نے افشائے قصہ کو پسند کیا جسے نبی اکرم ﷺ نے ناپسند کیا۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اگر تم توبہ کرو تو یقیناً تمھارے دل توبہ کی طرف مائل ہو گئے۔ ﴿قُلُوْبُكُمَا﴾ فرمایا، "قَلْبَاكُمَا" نہ کہا، اس لیے کہ عرب لوگ ایک لفظ میں دو تثنیوں کا اکٹھا کرنا مکروہ جانتے ہیں اور مضاف و مضاف الیہ کا مجموع شے واحد کی طرح ہے، اس لیے کہ دونوں میں پورا تعلق اور نسبت ہے۔

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ﴾ جمہور نے ایک تاء کے حذف سے پڑھا ہے تخفیفاً اور کسی نے (یعنی عکرمہ رحمہ اللہ نے) دو تاء کے ساتھ پڑھا ہے بنا بر اصل اور کسی نے (یعنی حسن و عاصم و نافع نے في رواية عنهما وهي سبعية) بہ تشدید ظاء و ہاء بہ دون الف پڑھا ہے۔[1] ﴿تَظٰهَرَا﴾ سے تعاضد و تعاون مراد ہے۔ یعنی باہم ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ شرط کا جواب محذوف ہے: "أَيْ: فَلَا يَعْدَمُ نَاصِرًا وَلَا مُعِينًا" یعنی اگر تم دونوں باہم مل کر ایک دوسرے کی مدد و معاون ہو گی اس شے کے ساتھ جو اس کو بری لگتی ہے، وہ شے یہ ہے کہ غیرت میں افراط کرنا، حد سے بڑھنا اور اس کا بھید افشا کرنا یا تحکم (دعویٰ) کرنے میں نفقے کے بارے میں ایک دوسرے کی مدد کرو گی تو وہ اپنے ناصر اور معین کو غائب نہیں پائے گا۔

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یہ جملہ جوابِ محذوف کی تعلیل ہے۔ کلمۂ ﴿هُوَ﴾ ضمیر فعل ہے، یعنی اس لیے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس کا مولیٰ ہے وہ اس کی نصرت اور مدد کا بہ ذاتِ خود متولی ہو گا اور اسی طرح جبریل بھی اس کا ولی اور ناصر ہے اور اس کے مومن بندوں میں سے صالح لوگ بھی اس کے یار و مددگار ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ سے مراد وہ شخص ہے جو نفاق سے بری اور پاک ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿صَالِحُ﴾ کا لفظ تو واحد ہے اور اس سے مراد جمع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی اصل "صَالِحُو الْمُؤْمِنِيْنَ" ہے۔ پھر لفظ کی موافقت کے لیے لکھنے میں واؤ کو حذف کر دیا ہے۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اسی طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[2] (وعن أبي أمامة مرفوعا مثله أخرجه الحاكم)[3] سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔[4] (أخرجه ابن أبي حاتم قال السيوطي بسند ضعيف عنه مرفوعا) سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ﴿صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہے۔[5] (أخرجه ابن مردويه)

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ﴾ یعنی اور فرشتے باوجود ان کی تعداد کے بہت زیادہ ہونے کے اللہ تعالیٰ کے اور ان لوگوں کے مدد کرنے کے بعد جن کا ذکر ہوا، اعوان اور مددگار ہیں کہ اس کی مدد کریں گے۔ امام ابو علی فارسی رحمہ اللہ

---

(1) فتح القدير (٣٣٣/٥) (2) الدر المنثور (٢٢٣/٨، ٢٢٤) (3) مستدرك الحاكم (٧٣/٣)
(4) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٦٢/١٠) (5) الدر المنثور (٢٢٤/٨)

نے کہا ہے کہ فعیل کا وزن کثرت کے لیے آیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ﴾ [المعارج: ١٠] ''اور کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا۔'' امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ اس واحد کے جملہ سے ہے جو جمع کے معنی ادا کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَحَسُنَ أُولَٰٓئِكَ رَفِيقًا ﴾ [النساء: ٦٩] ''یہ بہترین رفیق ہیں۔''

علم نحو میں ثابت ہو چکا ہے کہ جریح وصبور وظہیر کی طرح واحد وثنی وجمع کی صفت کی جاتی ہے۔[1] عطفِ مفرد سے جو عطفِ جملہ کی طرف عدول کیا گیا تو صرف اس لیے کہ فرق ظاہر کیا جائے، کیوں کہ حقیقت میں نصرت اللہ تعالیٰ ہی کی نصرت ہے اور اللہ پاک نے اپنی نصرت کے ساتھ جبرئیل وصالح المومنین وملائکہ کی مظاہرت (مدد) ملائی تو یہ صرف تتمیم کے لیے ہے، تاکہ مومنین کے دل خوش ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی عزت وتوقیر ہو اور آیاتِ بینات ظاہر ہوں، جیسا کہ بدر وحنین کے دنوں میں ہوا، اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِ ۗ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ﴾ [آل عمران: ١٢٦] ''اور یہ تو محض تمھارے دل کی خوشی اور اطمینانِ قلب کے لیے ہے، ورنہ مدد تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔''

﴿ عَسَىٰ رَبُّهُ إِن طَلَّقَكُنَّ أَن يُبْدِلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنكُنَّ ﴾ ﴿ يُبْدِلَهُ ﴾ بہ تخفیف و تشدید دونوں سبعیہ ہیں، یعنی ابھی اگر وہ تم سب کو طلاق دے دے تو اس کا رب تمھارے بدلے میں اسے تم سے افضل بیبیاں عطا کرے، اللہ پاک جان چکا ہے کہ وہ ان کو طلاق نہ دیں گے لیکن اس نے اپنی قدرت کی خبر دی کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ اگر اس سے طلاق واقع ہو تو بدلے میں اس کو ان سے بہتر دے۔ اس سے ان کا ڈرانا منظور ہے۔ یہ آیتِ کریمہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم ﴾ [محمد: ٣٨] ''اور اگر تم روگردان ہو جاؤ تو وہ تمھارے بدلے تمھارے سوا اور لوگوں کو لائے جو پھر تم جیسے نہ ہوں گے۔''

اس لیے کہ یہ اس کی قدرت کی اطلاع ہے اور ان کو خوف دلانا ہے اور آیت کے مقتضا کے مطابق جو ہے وہ صرف کل کو طلاق دینا ہے۔ تو اب یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ ایک کو طلاق دی اور اس کی تبدیل نہ ہوئی، اس لیے کہ تبدیل تو فقط کل کے لیے ہے اور وہ صرف کل کی تطلیق پر مرتب ہے۔ خطیب میں ہے کہ کہا گیا ہے کہ قرآن شریف میں ہر ﴿ عَسَىٰ ﴾ واجب الوقوع ہے سوائے اس آیت کے۔ کسی نے کہا: یہ بھی واجب الوقوع میں سے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی شرط کے ساتھ ملحق کیا ہے، وہ شرط سب کی تطلیق (طلاق دینا) ہے۔ اور آپ ﷺ نے ان کو طلاق نہیں دی۔ کرخی نے کہا ہے: ابن عرفہ نے کہا کہ ﴿ عَسَىٰ ﴾ یہاں تخویف کے لیے ہے وجوب کے لیے نہیں۔

---

[1] فتح القدير (٣٣٣/٥)

پھر اللہ پاک نے ازواج کے اوصاف ذکر فرمائے: ﴿ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىِٕحٰتٍ ﴾ یہ نعت ہے یا حال ہے یا منصوب بنا بر اختصاص ہے، یعنی ایسی بیبیاں کہ اسلام کے فرائض کے ساتھ قیام کرنے والی ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اخلاص کرنے والی، اقرار کرنے والی ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امر اور رسول کے امر کو ماننے والی ہیں۔ ﴿ مُّؤْمِنٰتٍ ﴾ یعنی وہ تصدیق کرنے والی ہیں اللہ تعالیٰ کی اور اس کے فرشتوں کی اور اس کی کتابوں کی اور اس کے رسولوں کی اور تقدیر کے خیر اور شر کی۔ ﴿ قٰنِتٰتٍ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی مطیع اور فرمانبردار۔ "قُنُوْتٌ" بہ معنی طاعت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ رات کو نماز پڑھنے والیاں۔ کسی نے کہا ہے کہ دعا کرنے والیاں۔ کسی نے کہا ہے کہ "طَائِعَاتٍ" یعنی فرمانبردار۔ ﴿ تٰٓىِٕبٰتٍ ﴾ یعنی گناہوں سے توبہ کرنے والیاں یا گناہوں کو ان کی قباحت کی وجہ سے ترک کرنے والیاں۔ یا بہت توبہ کرنے والیاں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے والیاں اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی طرف ہفوات وزلات (لغزشوں) سے رجوع ہونے والیاں۔

﴿ عٰبِدٰتٍ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے واسطے عبادت کرنے والیاں اور اس کے لیے ذلیل بننے والیاں۔ امام حسن اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ نے کہا: بہت عبادت کرنے والیاں۔[2] ﴿ سٰٓىِٕحٰتٍ ﴾ یعنی روزے رکھنے والیاں۔ (قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما) زید بن اسلم اور حسن رحمہما اللہ نے کہا: ہجرت کرنے والیاں۔ نبیِ کریم ﷺ کی امت میں کوئی سیاحت نہیں ہے مگر ہجرت۔[3] ابن قتیبہ اور فراء رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا: صیام کا نام سیاحت اس لیے رکھا گیا ہے کہ سیاحت کرنے والے کے ساتھ زاد نہیں ہوتا[4] (پس وہ رکا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ شے پائے جس کو کھائے اس لیے صائم کو اس کے ساتھ تشبیہ دی اس کے امساک (رکے رہنے) میں، یہاں تک کہ اس کے افطار کا وقت آ جائے)۔ کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جانے والیاں ہیں اللہ کی طاعت میں، ماخوذ ہے "سَاحَ الْمَاءُ إِذَا ذَهَبَ" سے۔ سیاحت کی اصل زمین میں جولان ہے "وَقِيْلَ: يَسِحْنَ مَعَهُ حَيْثُ سَاحَ"[5] (الخازن) سورت براءۃ میں سیاحت پر کلام گزر چکا ہے۔[6]

﴿ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ﴾ یعنی بعض ثیبات اور بعض ابکار، ان کے وسط میں عطف لایا گیا، دونوں کی تنافی (ایک دوسرے کی نفی کرنا) کے سبب سے۔ باقی صفات کے سوائے "ثیبات"، "ثیب" کی جمع ہے، یہ جمع قیاسی نہیں ہے اس لیے کہ "ثیب" اسمِ جنس مونث ہے اس کا وزن فیعل ہے: "ثَابَ يَثُوْبُ إِذَا رَجَعَ" سے۔ "ثیب" وہ عورت ہے جس کا بیاہ کیا گیا، پھر وہ اپنے خاوند سے رجوع کر آئی تو ویسی ہوگئی جیسے پہلے بغیر خاوند کے تھی۔ کسی نے کہا: اس لیے کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر واپس آ گئی۔ (وهذا أصح) ﴿ اَبْكَارًا ﴾ [illegible] عذراء ہے (کنواری کو عذراء اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا عذرہ ابھی تک ہے، یعنی بکارت)۔ اس کا یہ نام [illegible] رکھا گیا کہ وہ اپنے پہلے حال پر ہے جس پر وہ پیدا ہوئی۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٩٤/١٨) فتح البيان (٢١٤/١٤، ٢١٥) [2] فتح القدير (٣٣٣/٥) [3] تفسير الطبري (٤٩٠/٢٣)
[4] فتح القدير (٣٣٣/٥) [5] تفسير الخازن (١٢١/٧) [6] رقم الآية (١١٢)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے نبی ﷺ کو یہ وعدہ دیا ہے کہ "ثیب" سے ان کا بیاہ کرے گا اور وہ آسیہ زنِ فرعون ہے اور بکر سے وہ مریم علیہا السلام بنت عمران ہیں۔[1] (أخرجه الطبراني وابن مردويه) یہ بات نہ کہی جائے کہ ان کے "ثیب" ہونے میں کون سی تعریف ہے، اس لیے کہ "ثیب" کی کبھی تعریف کی جاتی ہے اس لحاظ سے کہ اس کا تجربہ اور اس کی عقل زیادہ ہوتی ہے اور غالباً حاملہ جلد تر ہو جاتی ہے (حدیث «وَأَنْتَقُ أَرْحَامًا»[2] سے بکر کا جلد تر حامل ہونا مفہوم ہوتا ہے۔ از مصحح سلمه الله تعالیٰ)۔ اور بکر کی اس وجہ سے تعریف کی جاتی ہے کہ وہ اطیب واطہر ہوتی ہے اور اس کی مداعبت وملاعبت (آپس میں کھیلنا) غالباً اکثر ہوتی ہے۔[3]

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۞ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۞

اے ایمان والو! تم خود کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں، اس پر تند مزاج اور سخت گیر فرشتے (مقرر) ہیں، اللہ انھیں جو حکم دے، وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم دیا جاتا ہے ⑥ اے کفر کرنے والو! تم آج عذر پیش نہ کرو، یقیناً تمھیں وہی بدلہ دیا جائے گا جو تم عمل کرتے تھے ⑦

مسلمان کے لیے لازمی ہے کہ اپنے گھر والوں کو دین کی راہ پر لائے، لالچ دے کر، ڈر دکھا کر، پیار سے، مار سے، اس پر بھی اگر وہ راہ پر نہ آئیں تو ان کی کم بختی ہے، یہ مسلمان بے گناہ ہے۔ انتهى.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اے ایمان والو! اپنی جان کو بچاؤ اس طرح سے کہ تم کو اللہ نے جس کام کا حکم دیا ہے اس کو کرو اور جس سے منع کیا ہے اس کو چھوڑ دو، یعنی اپنی جان کے لیے ایک بچاؤ بناؤ، اس طرح سے کہ گناہوں کے ترک کرنے میں اور طاعات کے بجا لانے میں نبی اکرم ﷺ کی پیروی کرو اور اپنے گھر والوں کو بچاؤ جو عورتیں اور بچے ہیں اور ہر کوئی جو اس اہل میں داخل ہے، اس طرح سے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دو اور اس کی نافرمانی سے

---

① المعجم الأوسط (٣/١٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني في الأوسط من طريق موسى بن جعفر بن أبي كثير عن عمه، قال الذهبي: مجهول وخبره ساقط" (مجمع الزوائد: ٧/٢٦٨)

② سنن ابن ماجه (١٨٦١) السلسلة الصحيحة (٦٢٣) ③ فتح البيان (١٤/٢٠٥_٢١٥)

ان کو منع کرو اور ان کو اس بات پر پکڑو جس بات پر تم اپنے آپ کو پکڑتے ہو نصیحت کر کے اور تادیب کر کے۔

﴿ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ یعنی تم اپنے نفوس کو اور گھر والوں کو مذکورہ افعال کر کے اس بڑی آگ سے بچاؤ جو کافر آدمیوں سے اور پتھروں سے جلتی ہے اور روشن ہوتی ہے، جیسے بت جو پتھر سے بنتے ہیں جس طرح کہ اس کے سوا آگ چھپٹیوں (لکڑیوں) سے جلتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ کبریت ہے، یعنی گندھک، اس لیے کہ یہ گرمی میں سب چیزوں سے بڑھ کر ہے اور جلانے میں زیادہ تیز ہے۔ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔[1]

امام مقاتل بن سلیمان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اپنے نفوس کو اور گھر والوں کو ساتھ ادبِ صالح کے آگ سے آخرت میں۔ قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا بچاؤ اپنے نفوس کو اپنے افعال کے ساتھ اور اپنے گھر والوں کو اپنی وصیت کے ساتھ بچاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ تم خود اچھے کام کرو اور ان کو اچھے کاموں کی تاکید کرو، تا کہ تم اور وہ آگ سے بچیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں: چنانچہ ہم پر یہ بات لازم ہے کہ ہم اپنی اولاد کو دین اور خیر سکھائیں اور وہ ادب سکھائیں جس سے استغنا نہیں ہوتا[2] (یعنی جس کے بغیر زندگی صحیح نہیں ہوتی)۔ اسی بارے میں یہ آیت ہے: ﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ [طٰهٰ: ١٣٢] ''اپنے گھرانے کے لوگوں پر نماز کی تاکید رکھ اور خود بھی اس پر جما رہ۔'' اور یہ آیت ہے: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢١٤] ''اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا دے۔'' سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اپنے نفوس کو اور اپنے گھر والوں کو خیر سکھاؤ اور ان کو تادیب کرو۔[3] (أخرجه عبد الرزاق وغيره)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: عمل کرو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ اور بچو اللہ تعالیٰ کے معاصی سے اور اپنے گھر والوں کو ذکر کرنے کا حکم دو، اللہ تعالیٰ تم کو آگ سے نجات دے گا۔[4] (أخرجه ابن جرير و ابن المنذر)۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے: ''أَدِّبُوْا أَهْلِيْكُمْ''[5] (أخرجه بن حميد) یعنی اپنے گھر والوں کو مودب بناؤ۔

﴿ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ ﴾ یعنی وہ بڑی آگ جس کا ذکر ہوا اس پر فرشتوں میں داروغہ مقرر کیے گئے ہیں جو اس کا کاروبار اور اس کے اہل لوگوں کو عذاب کرنے کے والی ہوتے ہیں۔ یہ فرشتے زبانیہ ہیں، تندخو ہیں، اہلِ نار پر سخت اور ان پر زبردست ہیں، جب وہ ان سے رحم چاہیں گے تو ان پر رحم نہ کریں گے۔ اس لیے کہ اللہ پاک نے تو ان کو اپنے غضب سے پیدا فرمایا ہے اور اپنی مجرم مخلوق کو عذاب کرنا ان کے لیے پسندیدہ کر دیا ہے۔ ان کا محبوب کام یہی عذاب کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بات کرنے میں درشت اور افعال میں سخت ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ غِلَاظٌ ﴾ کے معنی ضخام الاجسام (بڑے جسموں والے) اور ﴿ شِدَادٌ ﴾ اقویاء، یعنی قوی اور زبردست ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کے دل غلیظ و قاسی و سخت ہیں، ان کے بدن شدید اور سخت ہیں، یہ غلظِ قلب سے ماخوذ ہے،

---

[1] رقم الآية (٢٤) [2] فتح القدير (٣٣٧/٥) [3] تفسير الصنعاني (٣٠٣/٣) تفسير الطبري (٤٩١/٢٣)
[4] تفسير الطبري (٤٩١/٢٣) [5] الدر المنثور (٢٢٥/٨)

یعنی قوتِ قلب سے، غلظِ جسم و غلظِ قول سے ماخوذ نہیں ہے۔

ابو عمران جونی رحمہ اللہ سے مروی ہے، کہا: ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ نار کے داروغہ انیس ہیں، ان میں سے ایک کے کاندھے (اصل کا لفظ منکب ہے۔ صراح میں منکب کا ترجمہ بن بازو لکھا ہے اور کتف کا ترجمہ شانہ گاہ لکھا ہے) کے درمیان سو خریف کی راہ ہے (خریف بہ معنی سال آتا ہے) ان کے دلوں میں کچھ رحمت نہیں ہے، وہ تو صرف عذاب کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک فرشتہ اہلِ نار میں سے ایک آدمی کو ایک مار مارے گا کہ اس کو اس کی چوٹی سے لے کر اس کے قدم تک آٹے کی طرح پیس کر رکھ دے گا۔[1] (أخرجه عبد الله بن أحمد في زوائد الزهد)

﴿ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ ﴾ یعنی وہ نار کے فرشتے اللہ تعالیٰ کی اس کے حکم میں مخالفت نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ ﴿ مَاۤ ﴾ موصولہ ہو اور عائد محذوف ہو: "أَيْ: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ الَّذِيْ أَمَرَهُمْ بِهِ" یعنی اللہ کے اس کام کی نافرمانی نہیں کرتے جس کا اس نے ان کو حکم دیا۔ یا مصدریہ ہے: "أَيْ: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ أَمْرَهُ" یعنی اللہ تعالیٰ کی اس کے امر میں نافرمانی نہیں کرتے اس بنا پر کہ ﴿ اَمَرَهُمْ ﴾ اسم شریف سے بدلِ اشتمال ہو، یا بر تقدیرِ نزع خافض: "أَيْ: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ فِيْ أَمْرِهِ" یعنی اللہ تعالیٰ کی اس کے حکم میں نافرمانی نہیں کرتے۔

﴿ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾ یعنی اس کام کو ادا کرتے ہیں جس کا ان کو حکم کیا گیا ہے، بغیر اس میں تاخیر کیے ہوئے اور بغیر مہلت کے۔ نہ اس کو اس وقت سے موخر کرتے ہیں نہ اس کو مقدم کرتے ہیں۔ یہ دونوں جملے ایک معنی میں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ پہلے کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ اس کے اوامر کو قبول کرتے ہیں اور ان کے ملتزم ہوتے ہیں (یعنی لازمی طور پر ان کو بجا لاتے ہیں) دوسرے کے معنی یہ ہیں کہ ادا کرتے ہیں اس کام کو جس کا ان کو حکم کیا گیا ہے اور اس سے گراں جان نہیں ہوتے اور نہ اس میں کاہلی اور سستی کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ پہلا جملہ دوسرے کی تاکید ہے۔ محلی اسی کے قائل ہیں،[2] اس لیے کہ جو مفاد پہلے کا ہے وہی دوسرے کا مفاد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ پہلا ماضی میں ہے اور دوسرا مستقبل میں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔[3]

یہ آیتِ کریمہ مومنوں کو ارتداد سے ڈراتی ہے اور منافقوں کو ڈراتی ہے جو اپنی زبانوں سے مومن ہیں اور دلوں سے مومن نہیں ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے اگر کوئی کہے کہ اللہ پاک نے مشرکوں کو اس آیت میں مخاطب کیا ہے کہ ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرۃ: ٢٤] ''پس اگر تم نے نہ کیا اور تم ہرگز نہیں کر سکتے تو (اسے سچا مان کر) اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔'' چنانچہ اس آگ کو کافروں کے لیے تیار کی ہوئی ٹھہرایا ہے، پھر مومنوں سے اس کے ساتھ خطاب کرنے کے کیا معنی، تو کہیں گے کہ اس آیت میں ارتداد سے بچنے کا حکم ہے جو نار کی

[1] الدر المنثور (٨/٢٢٦) [2] تفسير الجلالين (١/٧٥٢) [3] تفسير البيضاوي (٥/٣٥٧)

طرف لے جاتا ہے، وہ آگ جو کافروں کے لیے تیار رکھی گئی ہے اور اس میں منافقوں کو بھی خطاب ہے، یہ لوگ بھی کفار ہی میں شامل ہیں۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ﴾ جب کفار کو نار میں داخل کریں گے تو داخل کرنے کے وقت ان کو نا امید کرنے کے لیے اور ان کے طمع کو ختم کرنے کے لیے ان سے یہ بات کہی جائے گی کہ اے منکر ہونے والو! آج کے دن بہانے مت بناؤ، کیوں کہ یہ تو جزا کا دن ہے اور عذر کرنے اور بہانے بنانے کا وقت گزر چکا ہے اور کام وہاں تک پہنچ چکا جہاں تک اس نے پہنچنا تھا۔ ﴿ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ تم کو تو انہیں اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم دنیا میں کرتے تھے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴾ [الروم: ٥٧] ''پس اس دن ظالموں کو ان کا عذر بہانہ کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ان سے توبہ اور عمل طلب کیا جائے گا۔''[1]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۸ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۹

اے ایمان والو! تم اللہ کے حضور خالص توبہ کرو، شاید تمھارا رب تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے اور تمھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، اس دن جب اللہ نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا، ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑتا ہوگا، وہ کہیں گے: (اے) ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر اور ہماری مغفرت فرما، بے شک تو ہر چیز پر خوب قادر ہے ⑧ اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے اور اُن پر سختی کیجیے، اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے ⑨

خالص توبہ یہ کہ دل میں پھر اس گناہ کا خیال نہ رہے۔ ایمان کی روشنی دل میں ہے۔ دل سے بڑھی تو سارے

[1] فتح البیان (١٤/٢١٥-٢١٧)

بدن میں پھر گوشت پوست میں پھیل گئی۔ نبی کریم ﷺ کا خُلق یہاں تک ہے کہ اللہ تعالیٰ اُور لوگوں کو فرماتا ہے تحمل کرو اور ان کو فرماتا ہے کہ سختی کرو۔ انتھی۔

فتح البیان کا بیان:

"نصوح" کو جمہور نے بہ فتح پڑھا ہے اس بنا پر کہ ﴿ تَوْبَةً ﴾ کا وصف ہے، یعنی ایسی توبہ کہ نصح وخلوص میں انتہا کو پہنچنے والی ہے۔ کسی نے (یعنی امام حسن، خارجہ اور ابوبکر عن عاصم رحمہ اللہ نے) بہ ضم نون پڑھا ہے: "أَيْ: تَوْبَةَ نُصْحٍ لِأَنْفُسِكُمْ"، یعنی توبہ کرو اپنے نفوس کے لیے خیر خواہی کا توبہ کرنا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ناصح کی جمع ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ مصدر ہو: "يُقَالُ: نَصَحَ نَصَاحَةً وَنُصُوحًا" امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد توبہ ذاتِ نصح ہے،[1] یعنی اپنے صاحب کو خالص کر دے اس طرح سے کہ جس گناہ سے توبہ کر چکا ہے اس کی طرف دوبارہ آنے کو ترک کر دے۔ توبہ اس وصف کے ساتھ بنا بر اسناد مجازی موصوف ہوئی، اصل میں یہ وصف توبہ کرنے والوں کا ہے کہ اپنے نفس کو خالص اور صاف کریں، اس طرح سے کہ وہ عزم کر لیں کہ وہ اس گناہ کو ترک کر دیں اور اس کی طرف دوبارہ نہ لوٹیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ توبہ نصوح سچی توبہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خالص توبہ ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ ہے کہ جس گناہ کو محبوب رکھا تھا اسے مبغوض رکھے، یعنی اس سے دشمنی کرے جس وقت اس کو یاد کرے، اس سے استغفار کرے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دل سے نادم و پشیمان ہونا ہے اور زبان سے مغفرت مانگنا اور بدن سے باز رہنا ہے اور اس پر اطمینان ہے کہ دوبارہ نہ کرے گا۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ توبہ مقبولہ ہے۔[2] نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کسی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے توبہ نصوح کے متعلق پوچھا۔ فرمایا: یہ ہے کہ آدمی برے کام سے توبہ کرے، پھر کبھی اس کی طرف عود نہ کرے۔[3] (أخرجه عبد الرزاق والحاكم وصححه وغيرهما)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعا مروی ہے کہ گناہ سے توبہ یہ ہے کہ اس سے توبہ کرے، پھر کبھی اس کی طرف عود نہ کرے۔[4] (أخرجه أحمد و البيهقي وفي إسناده إبراهيم بن مسلم الهجري وهو ضعيف والصحيح الموقوف كما أخرجه موقوفا عليه ابن أبي شيبة وعبد بن حميد و ابن جرير والبيهقي و ابن المنذر) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ توبہ نصوح ہر گناہ کا کفارہ کر دیتی ہے اور وہ قرآن میں ہے، پھر یہ آیت پڑھی۔[5] (أخرجه الحاكم وصححه)

---

[1] تفسير القرطبي (١٨/١٩٩) [2] تفسير القرطبي (١٨/١٩٧، ١٩٨) [3] تفسير الطبري (٢٣/٤٩٣)

[4] مسند أحمد (١/٤٤٦) شعب الإيمان (٥/٣٨٧) اس کی سند میں "ابراہیم بن مسلم ہجری" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٢٢٣٣)

[5] مستدرك الحاكم (٢/٥٣٧)

کتاب وسنت کے دلائل اور امت کا اجماع یہ سب توبہ کے وجوب پر باہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور توبہ تمام لوگوں پر تمام احوال وازمان میں فرض ہے اس کے معنی میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اور لوگوں نے اس کی تفسیر میں بست وسہ (۲۳) قول ذکر کیے ہیں، سب کے معنی قریب یک دیگر ہیں، یہ جگہ ان کی گنجایش نہیں رکھتی۔

ان میں اصل بات یہ ہے کہ توبہ کرے، پھر اس گناہ کی طرف عود نہ کرے جس طرح کہ دودھ تھن کی طرف عود نہیں کرتا، اگرچہ تلوار سے کاٹا جائے اور آگ سے جلایا جائے۔ ہر معصیت سے فوری طور پر توبہ واجب ہے، وہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ، اس کی تاخیر جائز نہیں ہے اور سارے گناہوں سے واجب ہے۔ اگر بعض گناہوں سے توبہ کرے تو ان گناہوں سے جن سے توبہ کر لی ہے، اس کی توبہ صحیح ہوگی اور جس گناہ سے توبہ نہیں کی وہ باقی رہے گا۔ یہ اہلِ سنت وجماعت کا مذہب ہے۔ اغر بن یسار مزنی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرو، بے شک میں دن بھر میں سو دفعہ توبہ کرتا ہوں۔[1] (أخرجه مسلم)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: بے شک واللہ! میں البتہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتا ہوں اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں، دن بھر میں ستر بار سے زیادہ۔[2] (أخرجه البخاري) سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ البتہ اللہ تعالیٰ زیادہ تر خوش ہونے والا ہے اپنے مومن بندے کی توبہ سے ایک تمھارے سے جو گر پڑا اپنے اونٹ پر اور مقرر اس کو گم کر چکا تھا بیابان زمین میں۔[3] (الحديث أخرجاه) ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کا گناہ گار توبہ کرے اور پھیلاتا ہے اپنا ہاتھ دن کو تاکہ رات کا گناہ گار توبہ کرے، یہاں تک کہ سورج اپنے مغرب سے نکلے۔[4] (رواه مسلم) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے، جب تک کہ اس کو غرغرہ نہیں لگا ہے۔[5] (أخرجه الترمذي وحسنه)

﴿ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ یعنی جب تم توبہ نصوح کرو گے تو شاید تمھارا رب تم سے تمھاری برائیاں اتار دے اور اس توبہ کے سبب سے تم کو باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ﴿ وَيُدْخِلَكُمْ ﴾ معطوف ہے ﴿ يُكَفِّرَ ﴾ پر اسی کے ناصب سے۔ جمہور نے اس کو بہ نصب پڑھا ہے اور کسی نے بہ جزم ﴿ عَسٰی ﴾ کے محل پر عطف کیا ہے۔ گویا یوں کہا: "تُوْبُوْا يُوْجِبُ تَكْفِيْرَ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلُكُمْ"، یعنی تم توبہ کرو اللہ تعالیٰ تمھاری برائیوں کا مٹانا واجب کر دے گا اور تم کو باغوں میں داخل کر دے گا۔ ﴿ عَسٰی ﴾ کا کلمہ گو اس کی اصل طمع دلانے کے لیے ہے، لیکن اللہ پاک کی طرف سے یہ واجب ہوتا

---

[1] صحيح مسلم (۲۷۰۲) [2] صحيح البخاري (۵۹۴۸) [3] صحيح البخاري (۵۹۵۰) صحيح مسلم (۲۷۴۷)
[4] صحيح مسلم (۲۷۵۹) [5] سنن الترمذي (۳۵۳۷) صحيح الجامع (۱۹۰۳)

ہے اس کے فضل و کرم کے لحاظ سے، کیوں کہ گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس کا کوئی گناہ ہی نہیں ہے اور یہ کچھ واجبِ عقلی نہیں ہے۔

﴿ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ﴾ ﴿ يَوْمَ ﴾ کا کلمہ ظرف ہے ﴿ يُدْخِلَكُمْ ﴾ سے جڑتا ہے۔ یا ''اُذْكُرْ'' محذوف سے لگتا ہے۔ موصول معطوف ہے ﴿ اَلنَّبِيَّ ﴾ پر۔ کسی نے کہا ہے کہ موصول مبتداء ہے اور اس کی خبر یہ جملہ ہے: ﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے اور یہ جملہ حالیہ ہے یا مستانفہ ہے ان کا حال بیان کرنے کے لیے۔ یعنی ان کو باغوں میں داخل کرے گا جس دن کہ اللہ تعالیٰ نبی کو اور ان لوگوں کو رسوا نہ کرے گا جو وصفِ ایمان میں نبی کے مصاحب ہوئے اس طرح سے کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے داہنے دوڑتی ہوگی۔ اس آیت میں تعریض اور اشارہ ہے اہلِ کفر کی طرف جن کو اللہ تعالیٰ نے رسوا کیا۔ سورۃ الحدید میں گزر چکا ہے کہ نور اس حال میں ان کے ساتھ ہوگا، جبکہ وہ پل صراط پر چلیں گے۔[1]

﴿ بِاَيْمَانِهِمْ ﴾ سے مراد ان کی تمام اطراف ہیں آگے کی اور داہنی طرف کی۔ قید لگانے سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ ان کے بائیں طرف نور ہو، بلکہ ان کے لیے نور ہوگا لیکن وہ اس کی طرف توجہ نہ کریں گے، اس لیے کہ یا تو وہ سابقین میں ہوں گے تو اس جانب میں چلیں گے جو اُن کے آگے ہے، یا اہلِ یمین ہوں گے تو اس طرف میں چلیں گے جو ان کے داہنی طرف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ موحدوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے کہ قیامت کے دن اسے نور نہ دیا جائے۔

اب رہا منافق تو اس کا نور بجھ جائے گا اور مومن منافق کا نور بجھنے سے ڈرے گا جس کو دیکھے گا تو کہے گا: ﴿ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ﴾۔[2] (أخرجه الحاكم والبيهقي في البعث)۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صراط پر اپنے اعمال کے مطابق گزریں گے، ان میں سے وہ شخص ہے جس کا نور پہاڑ جتنا ہوگا اور اُن میں سے وہ ہے جس کا نور کھجور کے درخت کے برابر ہوگا اور نور کے لحاظ اُن میں سے سب سے کم درجے کا وہ ہے جس کا نور اس کے پاؤں کے انگوٹھے میں ہوگا۔[3] (أخرجه ابن جرير و ذكره السيوطي في البدور السافرة) (﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ میں دو وجہ ہیں: ایک یہ ہے کہ نبی پر معطوف ہے اس بنا پر جملۂ ﴿ نُوْرُهُمْ ﴾ مستانفہ ہوگا یا حال۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مبتداء ہے اور اس کی خبر جملۂ ﴿ نُوْرُهُمْ ﴾ ہے اور ﴿ يَقُوْلُوْنَ ﴾ خبرِ ثانی یا حال ہے۔ كذا في السمين)۔

﴿ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ جب منافقوں کا نور بجھ جائے گا تو مومنین یہ دعا کریں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر دے اور ہم کو معاف کر، بے شک تو ہر شے پر قادر ہے۔ اس کا بیان اور تفصیل پہلے گزر چکا ہے۔

---

[1] رقم الآية (١٢) [2] مستدرك الحاكم (٥٣٨/٢) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٣٦/١٠)

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی اے نبی! کفار کے ساتھ تلوار اور نیزے سے لڑ اور منافقوں سے حجت اور موثر وعظ کے ساتھ لڑ۔ سورت براءت میں اس آیت پر کلام گزر چکا ہے۔[1] اور ان پر سختی کر انتہائی زجر اور غصے اور بغض کے ساتھ، یعنی ان پر دعوت و خطاب اور زبان کے ساتھ قتال اور جھگڑا کرنے میں اور اُن کے متعلق شرعی حکم کرنے میں خشونت اور درشتی کا برتاؤ کر اور ان سے نرمی کے ساتھ معاملہ نہ کر۔ امام حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ان پر حدوں کے قائم کرنے کے ساتھ جہاد کر، اس لیے کہ وہ حدوں کو توڑنے کے مرتکب ہوتے تھے۔[2] اور کفار و منافقین کا مصیر (چل کر جانا) اور مرجع جہنم کی طرف ہے اور وہ مرجع برا ہے جس کی طرف وہ رجوع کریں گے۔[3] چونکہ بعض کفار کی مسلمانوں سے قرابت تھی، چنانچہ بعض اوقات یہ وہم کیا کہ وہ قرابت ان کو نفع دے گی اور بعض مسلمانوں کی قرابت کفار سے تھی اور بعض اوقات انھوں نے یہ وہم کیا کہ یہ قرابت ان کو نقصان دے گی، اس لیے ہر ایک کے لیے ایک مثال بیان کی اور پہلی قسم سے ابتدا کی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝10 وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝11 وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝12

کفر کرنے والوں کے لیے اللہ نے مثال بیان فرمائی نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی، دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے تحت (نکاح میں) تھیں، تو ان دونوں (عورتوں) نے ان کی خیانت کی، پھر وہ دونوں (رسول) ان دونوں (عورتوں) کو اللہ (کے عذاب) سے بچانے میں کچھ کام نہ آئے اور ان سے کہا گیا: تم دونوں دوزخ میں داخل ہو جاؤ داخل ہونے والوں کے ساتھ ⑩ اور اللہ نے اہلِ ایمان کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کی، جب اس نے کہا: (اے) میرے رب!

[1] رقم الآية (٧٣) [2] تفسير القرطبي (٢٠١/١٨) [3] فتح البيان (٢١٧/١٤_٢٢٠)

میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل (شر) سے نجات دے اور مجھے ظالم قوم سے نجات دے ⑪ (اور مثال بیان فرمائی) مریم بنت عمران کی، جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس (کے گریبان) میں اپنی روح پھونکی، اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرماں برداروں میں سے تھی ⑫

یعنی اپنا ایمان درست کرو۔ نہ خاوند بچا سکتا ہے نہ جورو۔ یہ سب کو سنا دیا ہے۔ یہ نہ جاننا کہ یہ نبی مکرم ﷺ کی بیبیوں پر کہا۔ ان پر تو یہ کہا ہے: ﴿ اَلطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ ﴾ [النور: ٢٦] ''پاک عورتیں پاک مردوں کے لائق ہیں۔'' فرعون کی بیوی نے موسیٰ علیہ السلام کو پالا اور اُن کی مددگار تھیں۔ کہتے ہیں کہ آخر کار اُن کو فرعون نے سیاست سے قتل کیا اور وہ شہید ہو گئیں۔ انتھی۔

فتح البیان کا بیان:

بار ہا گزر چکا ہے کہ کبھی مثال سے مراد ایک ایسی عجیب وغریب حالت کا لانا ہوتا ہے جس سے ایک اور حالت پہچانی جاتی ہے جو غرابت میں اس کے مماثل اور مشابہ ہوتی ہے۔ یہاں یہی مراد ہے۔ ﴿ اِمْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ﴾ ﴿ ضَرَبَ ﴾ ضرب کا مفعول اول ہے اور ﴿ مَثَلًا ﴾ مفعولِ ثانی ہے (اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے)۔ اصل میں یوں ہے: ''ضَرَبَ اللّٰهُ امْرَاَةَ نُوْحٍ وَّامْرَاَةَ لُوْطٍ مَثَلًا لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' مفعولِ ثانی کو صرف اس لیے موخر کیا کہ جو جملہ اس کی تفسیر اور اس کے معنی کی وضاحت کرتا ہے وہ اس سے متصل ہو جائے۔ وہ جملہ یہ ہے: ﴿ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صٰلِحَیْنِ ﴾ اور یہ جملہ مستانفہ ہے گویا ضرب مثل کا مفسر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زنِ نوح اور زنِ لوط کو اس بات میں ان کفار کے حال کی مثل ٹھہرایا کہ وہ اپنے کفر کی وجہ سے عذاب کیے جائیں گے اور کوئی بھی کسی کے کام نہ آئے گا۔

پھر اس مثل کی یہ تفسیر بیان فرمائی کہ دیکھو یہ دونوں عورتیں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کی عصمتِ نکاح میں تھیں۔ ﴿ فَخَانَتٰهُمَا ﴾ یعنی پھر ان دونوں سے اپنے خاوندوں کی خیانت واقع ہوئی۔ ﴿ فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ﴾ یعنی نوح ولوط علیہما السلام نے ان کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچایا، نہ کچھ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان سے دور کیا، باوجود اس کے کہ وہ دونوں ان کی بیبیاں تھیں اور یہ دونوں نبی تھے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی عزت وتکریم تھی۔ اس میں اس بات کی تنبیہ ہے کہ عذاب طاعت کے سبب سے دور کیا جاتا ہے نہ کہ وسیلے کی وجہ سے۔

﴿ وَقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ﴾ یعنی اور اُن سے آخرت میں کہا جائے گا، یا ان سے ان کی موت کے وقت کہا گیا کہ اہلِ کفر اور معاصی کے ساتھ نار میں داخل ہو جاؤ جو اس میں داخل ہونے والے ہیں۔ مطلب یہ

ہے کہ کفار کا جو مسلمانوں سے رشتہ ہے وہ ان کے کچھ کام نہ آئے گا جس طرح کہ ان دو عورتوں کا رشتۂ زوجیت کچھ کام نہ آیا۔ اگر خود ایمان لائیں گے تو بلاشک ان کے کام آئے گا۔ نوح علیہ السلام کی بی بی کا نام واہلہ تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ والھہ تھا اور لوط علیہ السلام کی بی بی کا نام داعلہ تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ والعہ تھا۔ چونکہ نوح اور لوط علیہما السلام کا ذکر ہو چکا تھا تو "تحتھما" کہہ دینا کافی تھا، مگر ایسا نہ کیا اس لیے کہ ﴿مِنْ عِبَادِنَا﴾ کی اضافتِ شریفہ سے ان کی تشریف وتکریم مقصود ہے اور اس کے اندر معنی مقصود میں مبالغہ ہے، وہ معنی یہ ہیں کہ عادتاً انسان کو اپنے ہی نفس کی اچھائی نفع دیتی ہے اپنے غیر کی اچھائی کچھ کام نہیں آتی گو وہ دوسرا شخص اچھائی اور اللہ تعالیٰ کے قرب میں اعلیٰ مرتبہ ہی میں کیوں نہ ہو۔ خیانت سے یہاں زنا مراد نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کبھی کسی نبی کی بیوی نے زنا نہیں کیا۔[1] (أخرجه ابن المنذر عنه وقد رواه عنه ابن عساكر مرفوعا)

ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ انھوں نے زنا نہیں کیا۔ نوح علیہ السلام کی بیوی کی خیانت تو یہ ہے کہ لوگوں سے کہتی تھی کہ وہ تو مجنون ہے۔ اب رہی لوط علیہ السلام کی بیوی تو اس کی خیانت یہ ہے کہ وہ قوم کو ان کے مہمانوں کا پتا دے دیتی تھی۔ پس یہ ان کی خیانت ہے۔[2] (أخرجه عبد الرزاق والحاكم وصححه وغيرهما) امام عکرمہ اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ خیانت بہ کفر تھی۔[3] اجماعی طور پر اس پر دلائل واقع ہو چکے ہیں کہ کبھی کسی نبی کی بیوی نے زنا نہیں کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ ان کی خیانت نفاق تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ خیانت بہ نمیمہ (چغلی کھانے میں) تھی۔ یحییٰ بن سلام رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے مثال بیان فرمائی، اس کے ساتھ سیدہ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے ڈراتا ہے، جب کہ دونوں نے باہم مل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک نے دوسرے کی مدد کی۔[4]

واقع میں کیا خوب بات کہی، اس لیے کہ ان کے قصہ اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مظاہرت کا بیان کرنے کے بعد دو نبیوں کی دو عورتوں کا ذکر کرنا اس طرف پوری راہنمائی اور مکمل اشارہ کرتا ہے کہ مراد ان دونوں کا ڈرانا ہے مع دوسری امہاتِ مومنین کے اور اس بات کا بیان ہے کہ اگرچہ یہ دونوں اللہ کی مخلوق میں سے بہترین شخص اور خاتمِ رسل کے زیرِ عصمت ہیں مگر یہ زیرِ عصمت ہونا ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے میں کچھ کام نہ آئے گا۔ یقیناً اللہ پاک نے ان کو اس مظاہرت کے گناہ سے بچا لیا اس توبۂ خالصہ اور صحیحہ کے سبب سے جس کا ان سے وقوع ہوا۔

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ﴾ زنِ فرعون کا نام آسیہ بنت مزاحم تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اسرائیلی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی پھوپھی تھی۔ کسی نے کہا کہ فرعون کے چچا کی بیٹی تھی اور عمالقہ میں سے تھی اور صاحبِ فراستِ صادقہ تھی۔ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی تو فرعون نے اس کو چومیخا کر کے عذاب کیا۔ مثل میں ویسا ہی کلام

---

[1] الدر المنثور (٨/٢٢٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٦٢) مستدرك الحاكم (٢/٥٣٨)
[3] تفسير الطبري (٢٣/٤٩٨) [4] تفسير القرطبي (١٨/٢٠٢)

ہے، جیسا کہ پہلی مثل میں گزر چکا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی بیوی کے حال کو مومنوں کے حال کے لیے مثال ٹھہرایا، طاعت پر ثابت قدم رہنے اور دین کو مضبوطی سے پکڑنے اور شدت میں صبر کرنے اور اسی طرح کے اور حالات میں صبر کرنے کی ترغیب دینے کے لیے کہ کفر کا رشتہ انھیں کوئی نقصان نہ دے گا جس طرح کہ فرعون کی بیوی کو ضرر نہ دیا، حالاں کہ وہ سب سے بڑے کافر کے تحت میں تھی اور اپنے اللہ پر ایمان لانے کی وجہ سے جناتِ نعیم میں ہوگئی۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ کافروں کے ساتھ رشتہ داری اور تعلق کوئی نقصان نہیں دیتا اگر ایمان ہو۔

﴿ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ ﴾ یعنی جب کہ اس نے کہا: اے میرے اللہ! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا، یعنی ایسا گھر جو تیری رحمت سے قریب ہو، یا تیرے مقربین بندوں کے اعلیٰ درجات میں ہو، یا ایسے مکان میں ہو کہ جس میں تیرے اذن کے بغیر تصرف نہیں کیا جاتا اور وہ جنت ہے۔ کلمۂ ﴿ اِذْ ﴾ ظرف ہے ﴿ مَثَلًا ﴾ کا، یا ﴿ ضَرَبَ ﴾ کا۔ ﴿ عِنْدَكَ ﴾ حال ہے ضمیرِ متکلم سے، یعنی بنا میرے لیے درآنحالیکہ میں تیرے پاس ہوں۔ یا حال ہے ﴿ بَیْتًا ﴾ سے، اس لیے کہ وہ اس پر مقدم ہے، یعنی میرے لیے ایک گھر بنا ایسے کہ وہ تیرے پاس ہو۔ ﴿ فِی الْجَنَّةِ ﴾ بدل یا عطفِ بیان ہے ﴿ عِنْدَكَ ﴾ کا، یا متعلق ہے ﴿ اِبْنِ ﴾ سے۔ ﴿ عِنْدَكَ ﴾ کو جو یہاں مقدم کیا ہے تو اس سے منظور ان کے اس قول کی طرف اشارہ ہے: "اَلْجَارُ قَبْلَ الدَّارِ" "گھر خریدنے سے پہلے ہمسایہ دیکھو۔"

﴿ وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴾ یعنی اور مجھ کو فرعون سے، یعنی اس کی ذاتِ خبیث سے نجات دے اور اس کے عمل سے، یعنی اس کے شرک سے اور ان اعمالِ شر سے جو اس سے صادر ہوتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ﴿ عَمَلِهٖ ﴾ سے مراد "جماعه" ہے۔ (كذا في فتح البيان۔ فتح القدیر میں "من جماعته" ہے۔[1] أخرجه وكيع في الغرر عنه) اور نجات دے مجھ کو ظالم قوم سے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظالم قوم سے مراد اہلِ مصر ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قبط ہیں۔[2] سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرعون کی عورت دھوپ سے عذاب کی جاتی تھی، پھر جب وہ لوگ اس کے پاس سے چلے جاتے تھے جو اس کام پر مقرر تھے تو فرشتے اس پر اپنے پروں سے سایہ کرتے تھے اور وہ اپنا گھر جنت میں دیکھتی تھی۔[3] (أخرجه ابن أبي شيبة والحاكم وصححه وغيرهما)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرعون نے اپنی عورت کے لیے چار میخیں گاڑیں اور اس کو ان پر لٹایا (اصل روایت کے الفاظ "وأضجعها على صدرها" ہیں، ظاہر یہ ہے کہ یا تو "عليها" ہو یا "على ظهرها" والله أعلم) اور اس کے سینے پر چکی رکھی اور سورج کے سامنے اس کو کیا، چنانچہ اس نے اپنا سر آسمان کی طرف

---

[1] فتح البيان (٢٢٣/١٤) فتح القدير (٣٤١/٥) [2] تفسير القرطبي (٢٠٣/١٨)

[3] مصنف ابن أبي شيبة (١٢٠/٧) مستدرك الحاكم (٥٣٨/٢)

اٹھایا۔ پھر کہا: ﴿ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت میں اس کا گھر کھول دیا اور اس نے اس کو دیکھ لیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کر لی (یہ آخری جملہ اصل میں نہیں ہے)[1] (أخرجه عبد بن حميد) امام حسن اور ابن کیسان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عزت والی نجات دی اور اس کو جنت کی طرف اٹھا لیا، چنانچہ وہ کھاتی ہے اور پیتی ہے۔[2] اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا اور اس کی طرف التجا کرنا اور تکالیف اور آزمایش میں اس سے خلاصی کا سوال کرنا صالحین لوگوں کے طریقے میں سے ہے اور ایسے لوگوں کی عادات سے ہے جو قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ معطوف ہے ﴿ اِمْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ﴾ پر: "أَيْ: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ"، یعنی اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لیے مریم کا حال وصفت بیان کی۔ اس بنا پر یہ ہے کہ اللہ پاک نے دو عورتوں سے مومنوں کے حال کی مثال دی جس طرح کہ کفار کے حال کی دو عورتوں سے مثال دی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ مَرْيَمَ ﴾ کا ناصب فعلِ مقدر ہے: "أَيْ: اُذْكُرْ مَرْيَمَ"، یعنی ذکر کر مریم کا جس نے اپنی شرم گاہ کو فواحش سے محفوظ رکھی اور مردوں سے محفوظ رکھی، چنانچہ ان تک کوئی نہیں پہنچا، نہ نکاح سے اور نہ زنا سے۔ محصنہ عفیفہ اور پارسا کو کہتے ہیں۔ ان کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کے لیے دنیا اور آخرت کی عزتیں جمع کر دی تھیں اور ان کو دنیا کی عورتوں سے برگزیدہ کیا تھا، اس کے باوجود کہ وہ کافر قوم کے درمیان میں تھیں۔ اس کی تفسیر سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں "فرج" سے مراد "جیب" ہے۔ اس لیے کہ بعد کو یوں فرمایا ہے: ﴿ فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ یعنی پھر ہم نے اس میں اپنی روح سے پھونکا یعنی وہ روح کہ ہماری مخلوق تھی یہ اس طرح ہوا کہ جبریل علیہ السلام نے ان کے کرتے کی جیب میں یعنی ان کی قمیض کے طوق میں پھونکا تو پھونکنے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہو گئیں، پھر نفخ وحمل و وضع ایک ساعت میں ہو گیا، اس کا پورا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ "نَفَخْنَا" میں اسناد مجازی ہے، یعنی وہ پھونکنا جبریل علیہ السلام کا تھا، پھر اس کی نسبت اللہ پاک کی طرف کی گئی، اس لحاظ سے کہ خالق اور موجد وہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "روح" سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کی روح ہے جس سے وہ زندہ ہو گئے، چنانچہ نفخ جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے وہ روح مریم علیہا السلام کی شرم گاہ کی طرف پہنچ گئی اور روح کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف مخلوق کی اپنے خالق کی طرف اضافت ہے، اس کے شرف اور عزت کے لیے۔

﴿ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا ﴾ اور اپنے رب کے شرائع و احکام کی تصدیق کی جن کو اس نے اپنے بندوں کے لیے مشروع فرمایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "کلمات" سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔[3] (قاله مقاتل) کسی نے کہا ہے کہ

---

[1] الدر المنثور (٢٢٩/٨) [2] تفسير القرطبي (٢٠٣/١٨) [3] تفسير القرطبي (٢٠٤/١٨)

یہاں ''کلمات'' سے مراد جبریل علیہ السلام کا ان سے یہ کہنا ہے کہ ﴿ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴾ [مریم: ۱۹] ''میں تو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا قاصد ہوں، تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دینے آیا ہوں۔'' کسی نے کہا ہے کہ صحفِ الٰہیہ ہیں جن کو ادریس علیہ السلام وغیرہ پر نازل کیا۔ جمہور نے ﴿ وَصَدَّقَتْ ﴾ کو بہ تشدید پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی حمزہ اموی، یعقوب، قتادہ، ابومجلز اور عاصم رحمہ اللہ نے في رواية عنه) بہ تخفیف پڑھا ہے۔ جمہور نے ﴿ بِكَلِمٰتِ ﴾ بہ جمع پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی امام حسن، مجاہد اور جحدری رحمہ اللہ نے) بہ افراد پڑھا ہے۔ ﴿ وَكُتُبِهٖ ﴾ جمہور نے ''وَكِتَابِهٖ'' بہ افراد پڑھا ہے اور کسی نے (یعنی اہلِ بصرہ اور حفص رحمہم اللہ نے) بہ جمع پڑھا ہے۔ پہلے کی بنا پر جنس مراد ہے تو جمع کے معنی میں ہوگی اور تصدیق کی اپنے رب کی کتابوں کی۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو انبیاء علیہم السلام پر نازل کی گئیں، جیسے: ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام اور خود ان کے فرزند ارجمند عیسیٰ علیہ السلام۔

﴿ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴾ یعنی اور وہ اس قوم میں سے تھیں جو اپنے رب کے مطیع ہیں۔ (كما قاله قتادة) امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نماز پڑھنے والوں میں سے۔ وہ مغرب وعشاء کے درمیان نماز پڑھا کرتی تھیں۔[1] یہ بھی جائز ہے کہ ﴿ اَلْقٰنِتِيْنَ ﴾ سے مراد ان کا گروہ اور کنبہ ہو جن میں سے وہ تھیں۔ وہ لوگ مطیع اور صلاح و طاعت کے گھر والے تھے۔ چونکہ قنوت ایک ایسی صفت تھی جو اُن کو شامل ہوتی ہے جو مردوں اور عورتوں دونوں قبیل سے قانت ہوتی ہیں، اس لیے اس کے مردوں کو اس کی عورتوں پر تغلیب دی گئی اور اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ان کی اطاعت رجال کاملین کی اطاعت سے کم نہیں تھی، یہاں تک کہ وہ ان کے جملے سے شمار کی گئیں۔

کلمۂ ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ابتدائے غایت کے لیے ہو، اس بنا پر کہ ان کی ولادت قانتین سے ہوئی، اس لیے کہ وہ ہارون علیہ السلام برادرِ موسیٰ علیہ السلام کی اولاد میں سے تھیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ اہلِ جنت کی عورتوں میں سے افضل خدیجہ بنت خویلد ہے اور فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم زنِ فرعون جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ... الآية ﴾[2] (أخرجه أحمد والطبراني والحاكم وصححه) صحیحین وغیرہما میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث سے مرفوعاً مروی ہے کہ مردوں میں سے بہت کامل ہوئے اور عورتوں میں سے کامل نہیں ہوئیں مگر آسیہ زنِ فرعون اور مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد اور بے شک عائشہ رضی اللہ عنہا کی عورتوں پر فضیلت اس طرح ہے جس طرح ثرید کو باقی کھانوں پر فضیلت ہے۔[3] ﴿ اِمْرَاَتَ ﴾ اور ﴿ اِبْنَتَ ﴾ کا کلمہ یہاں بہ تائے دراز لکھا جاتا ہے اور ہاء وتاء سے اس پر وقف کیا جاتا ہے۔[4]

---

[1] تفسير القرطبي (٢٠٤/١٨) فتح القدير (٣٤٠/٥)

[2] مسند أحمد (٣١٦/١) المعجم الكبير (٣٣٦/١١) مستدرك الحاكم (٥٣٩/٢) السلسلة الصحيحة (١٥٠٨)

[3] صحيح البخاري (٣٢٣٠) صحيح مسلم (٢٤٣١) [4] فتح البيان (٢٢١/١٤_ ٢٢٥)

آیتِ تحریم کا شانِ نزول:

تفسیر ابن کثیر میں آیتِ تحریم کی شانِ نزول کا اختلاف بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی شان میں نازل ہوئی ہے، پھر اس کے یہ دلائل بیان کیے ہیں۔ ① روایتِ نسائی: عن ثابت عن أنس رضی اللہ عنہ.[1] ② روایتِ ابن جریر: عن زيد بن أسلم.[2] ③ روایتِ ابن جریر: عن ابن عباس رضی اللہ عنہما وعمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ.[3] ④ روایتِ ہیثم بن حبیب صاحبِ مسند: عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن عمر رضی اللہ عنہ.[4] (اصل میں اسی طرح ہے مگر خلاصہ کے حاشیہ پر یوں لکھا ہے: "الهيثم بن حبيب الصيرفي الكوفي عن الحكم و عكرمة وعنه شعبة و أبو حنيفة و ثقه ابن معين و أبو زرعة و أبو حاتم و لم يخرج له أحد فلذا أهمله المؤلف وقد أثبته المزي و ابن حجر في التقريب. والله أعلم" یہ وہی ہیں یا کوئی اور)۔ ⑤ روایتِ ابن جریر: عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضی اللہ عنہما.[5] ⑥ روایتِ نسائی: عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضی اللہ عنہما. ⑦ روایتِ طبرانی: عن مجاهد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما.[6] کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی لونڈی کی تحریم کی۔[7] جو فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ جو کوئی اپنی لونڈی کو یا بی بی کو یا کسی کھانے پینے کی شے کو یا کسی کپڑے کو یا مباحات میں سے کسی شے کو حرام کر لے تو اس پر کفارہ واجب ہے، وہ اسی جگہ سے اس طرف گئے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ اور ایک گروہ کا یہی مذہب ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ سوائے لونڈی کے اور بی بی کے کسی اور شے میں کفارہ واجب نہیں ہے، جبکہ ان دونوں کے عین کو، یعنی علاحدہ علاحدہ حرام کرے یا دونوں میں ایک ہی قول سے تحریم کا اطلاق کرے۔ پھر اگر تحریم سے بیوی کی طلاق کی نیت کرے اور لونڈی کے آزاد کرنے کی نیت کرے تو دونوں نافذ ہوں گی۔ دوسرا قول عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ ہے کہ زنِ واہبہ نفس (یعنی جس عورت نے اپنا نفس نبی اکرم ﷺ کو ہبہ کر دیا تھا) کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[8] یہ قول غریب ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ تحریمِ شہد میں اتری ہے۔ اس قول کو صحیح کہا ہے، پھر اس کے یہ دلائل ذکر کیے ہیں:

① روایتِ بخاری عن عائشہ رضی اللہ عنہا۔ اس میں بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پینے کا ذکر ہے۔[9] ② روایتِ بخاری عن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا اس میں بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پینے کا ذکر ہے۔[10] کبھی یوں کہا جاتا ہے کہ یہ دو

---

① سنن النسائي (٣٩٥٩) ② تفسير الطبري (٤٧٥/٢٣) یہ روایت مرسل ہے۔ ③ تفسير الطبري (٤٧٩/٢٣)
④ تفسير ابن كثير (٤٩٥/٤) الدر المنثور (٢١٦/٨) ⑤ تفسير الطبري (٤٧٨/٢٣)
⑥ سنن النسائي (٣٤٢٠) ⑦ المعجم الكبير (٨٦/١١) ⑧ تفسير ابن كثير (٤٩٦/٤)
⑨ صحيح البخاري (٤٦٢٨) ⑩ صحيح البخاري (٤٩٦٧)

واقعے ہیں اور اس میں کچھ بعد نہیں ہے، مگر یہ بات کہ یہ دونوں اس آیت کا سببِ نزول ہیں، اس میں نظر ہے۔ واللہ أعلم۔ سیدہ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کے متظاہر ہونے پر دلائل قائم ہیں جو حدیثیں اس پر دال ہیں، ان میں سے وہ حدیث ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے عن ابن عباس عن عمر رضی اللہ عنہم روایت کیا ہے، اس میں مذکور ہے کہ متظاہر یہی دونوں ہیں، یہ حدیث طویل ہے اس میں ایلاء کا قصہ ہے۔[1]

مسلم میں جو حدیث بہ روایتِ ابن عباس عن عمر رضی اللہ عنہم ہے، اس میں یہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ پر جو عورتوں کا امر شاق گزرتا ہے سو اگر آپ نے ان کو طلاق دے دی ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہے اور اس کے فرشتے اور جبریل اور میکائیل علیہما السلام اور میں اور ابو بکر اور مومنین آپ کے ساتھ ہیں اور میں نے کوئی بات نہیں کی اور میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں مگر میں نے اس کی امید کی کہ اللہ تعالیٰ میری بات کی تصدیق کر دے۔

پھر یہ آیت نازل ہوئی: آیتِ تخییر ﴿عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ﴾ پھر میں نے عرض کی: آپ نے ان کو طلاق دے دی؟ فرمایا: نہیں، پھر میں مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا تو میں نے اپنی بلند آواز سے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عورتوں کو طلاق نہیں دی اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ [النساء: ٨٣] ''جہاں انھیں کوئی خبر امن کی یا خوف کی ملی انھوں نے اسے مشہور کرنا شروع کر دیا، حالاں کہ اگر یہ لوگ اسے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور اپنے میں سے ایسی باتوں کی تہہ تک پہنچنے والوں کے حوالے کر دیتے تو اس کی حقیقت وہ لوگ معلوم کر لیتے جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔'' پس میں تھا کہ میں نے اس امر کا استنباط کیا۔[2] (وكذا قال سعيد ابن جبير وعكرمة ومقاتل بن حيان والضحاك وغيرهم) ﴿وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ سیدنا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے زیادہ کیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔[3] بشر بن سلیم رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب ہیں۔ اسی طرح خود اُن سے مرفوعاً یہی مروی ہے۔[4] (كما أخرجه ابن أبي حاتم إسناده ضعيف وهو منكر جدا)

﴿سٰٓئِحٰتٍ﴾ کی تفسیر:

﴿سٰٓئِحٰتٍ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: ''أَيْ: صَائِمَاتٍ'' یہ قول ان لوگوں کا ہے: سیدنا ابو ہریرہ، عائشہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر، عطاء، محمد بن کعب قرظی، ابو عبد الرحمٰن سلمی، ابو مالک، ابراہیم نخعی، حسن،

---

[1] صحيح البخاري (٢٣٣٦) صحيح مسلم (١٤٧٩) مسند أحمد (٣٣/١) [2] صحيح مسلم (١٤٧٩)

[3] تفسير ابن كثير (٤٩٩/٤)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٢٦/١٠) تفسير ابن كثير (٤٩٩/٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہِ ضعف ہیں۔

قتادہ، ضحاک، ربیع بن انس اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم۔ اس میں حدیث مرفوع بھی گزر چکی ہے۔ زیرِ تفسیر ''السائحون'' سورت براءت میں۔[1] اس کے الفاظ یہ ہیں: «سِيَاحَةُ هَذِهِ الْأُمَّةِ الصِّيَامُ»۔ زید بن اسلم اور عبدالرحمان بن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿سَٰٓئِحَٰتٍ﴾ بہ معنی ''مُهَاجِرَاتٍ'' ہے اور عبدالرحمان نے پڑھا: ''اَلسَّائِحُونَ أَيْ: الْمُهَاجِرُونَ'' پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔[2] واللّٰه أعلم.

﴿ثَيِّبَٰتٍ وَأَبْكَارًا﴾ کی تفسیر:

﴿ثَيِّبَٰتٍ وَأَبْكَارًا﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: یعنی بعض ان میں سے بیاہیاں اور بعض کنواریاں ہیں، تا کہ یہ اشہی ہو نفس کی طرف اس لیے کہ قسم قسم کی چیزیں نفس کو خوش کرتی ہیں اور اسی لیے فرمایا: ﴿ثَيِّبَٰتٍ وَأَبْكَارًا﴾ ابن بریدہ عن ابیہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے نبی اکرم ﷺ سے وعدہ کیا ہے کہ آپ ﷺ کا بیاہ کرے گا۔ چنانچہ ثیب تو آسیہ زنِ فرعون ہے اور ابکار مریم علیہا السلام بنت عمران ہیں۔[3] (أخرجه الطبراني في معجمه الكبير) عن الضحاک ومجاہد عن ابن عمر مروی ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، چنانچہ بی بی خدیجہ پاس سے گزریں تو جبریل علیہ السلام نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر سلام پڑھتا ہے اور اسے جنت میں ایک گھر کی خوش خبری دیتا ہے جو قصب سے ہے، لہب سے دور ہے، جس میں نہ نصب ہے اور نہ صخب ہے، یہ موتی جوف دار ہے جو مریم بنت عمران و آسیہ بنت مزاحم کے گھروں کے درمیان ہے۔[4] (أخرجه الحافظ ابن عساكر في ترجمة مريم علیہا السلام من طريق سويد بن سعيد)

ومن حدیث ابی بکر الہذلی عن عکرمہ عن ابن عباس مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ خدیجہ پر داخل ہوئے اور وہ موت کی حالت میں تھیں تو فرمایا: او خدیجہ! جس وقت تو اپنی سوتوں سے ملے تو میری طرف سے ان پر سلام پڑھنا، چنانچہ وہ بولیں: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے مجھ سے پہلے بیاہ کیا ہے؟ فرمایا: نہیں، لیکن اللہ نے میرا بیاہ مریم بنت عمران اور آسیہ زنِ فرعون وکلثم موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کیا ہے۔[5] یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، کیا تو نے جانا کہ اللہ تعالیٰ نے میرا بیاہ جنت میں مریم بنت عمران وکلثم موسیٰ علیہ السلام کی بہن و آسیہ زنِ فرعون سے کیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کو مبارک ہو۔[6] (أخرجه أبو يعلىٰ) یہ حدیث بھی ضعیف ہے اور ابن ابی داود سے مرسلاً بھی مروی ہے۔

---

[1] رقم الآية (١١٢) [2] تفسير ابن كثير (٥٠٠/٤) [3] تفسير ابن كثير (٥٠٠/٤)

[4] تاريخ دمشق (١١٨/٧٠) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجۂ ضعف ہیں۔

[5] تاريخ دمشق (١١٨/٧٠) اس کی سند میں ''ابوبکر ہذلی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[6] العجم الكبير (٢٥٧/٨) تفسير ابن كثير (٥٠٠/٤) اس کی سند میں ''یونس بن شعیب اور عبدالنور بن عبداللہ'' سخت ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٨١٢)

اہل وعیال کو دین وادب کی تعلیم:

﴿ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ﴾ میں علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''أَدِّبُوْهُمْ وَعَلِّمُوْهُمْ''۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے گھر والوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وصیت کرو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو ان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم کرے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی معصیت سے منع کرے اور یہ کہ تو ان پر اللہ تعالیٰ کے امر کے ساتھ قیام کرے، اور امر کرے اور اس پر ان کی مدد کرے، پھر جب تو اللہ کی کوئی معصیت دیکھے تو اس سے ان کو باز رکھے اور ڈانٹ ڈپٹ کرے۔[1] اسی طرح امام ضحاک اور مقاتل رحمہما اللہ نے بھی کہا ہے، مسلمان پر حق ہے کہ اپنے گھر والوں کو جو اس کے رشتے دار اور اس کے لونڈی اور غلام ہیں، اس شے کی تعلیم دے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کی ہے اور اس شے کی جس سے ان کو منع کیا ہے۔[2] اسی آیت کے معنی میں وہ حدیث ہے جس کو امام احمد، ترمذی اور ابو داود رحمہم اللہ نے من حدیث عبد الملک بن الربیع بن سبرۃ عن ابیہ عن جدہ مرفوعاً روایت کیا ہے: بچے کو نماز کا حکم کرو جب وہ سات سال کا ہو جائے، پھر جب وہ دس برس کا ہو جائے تو اس پر اس کو مارو۔ یہ الفاظ امام ابو داود کے ہیں۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔[3] (وروى أبو داود من حديث عمرو بن شعيب عن أبيه جده عن رسول الله ﷺ مثل ذلك) فقہاء نے کہا ہے کہ اسی طرح روزے میں ہے، یہ اس کو عبادت کا خوگر بنانا ہے کہ وہ اس حال میں بالغ ہو کہ اطاعت وعبادت پر اور معصیت سے اجتناب پر اور منکرات کے چھوڑنے پر مستمر اور پکا ہو۔ والله الموفق.

جہنم کا ایندھن:

﴿ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ یعنی اس آگ کی چپٹیاں جو اس میں ڈالی جائیں گی وہ بنی آدم کے جثے ہیں اور کہا ہے کہ حجارہ سے مراد وہ بت ہیں جو پوجے جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۹۸] ''تم اور اللہ تعالیٰ کے سوا جن جن کی تم عبادت کرتے ہو، سب دوزخ کا ایندھن بنو گے۔'' سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، ابو جعفر باقر اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ گندھک کے پتھر ہیں۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے یہ زیادہ کہا ہے کہ مردار سے زیادہ بدبودار ہیں۔[4] وروى ذلك ابن أبي حاتم رحمہ اللہ پھر بہ سند خود عبد العزیز، یعنی ابن ابی رواد سے روایت کی ہے، کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ اور آپ ﷺ کے پاس بعض اصحاب تھے اور ان میں ایک شیخ تھا تو اس شیخ نے کہا کہ یا رسول اللہ! جہنم کے پتھر کیا دنیا کے پتھروں کی طرح

[1] تفسير الطبري (۲۳/۴۹۱، ۴۹۲) [2] تفسير ابن كثير (۴/۵۰۱)
[3] سنن أبي داود (۴۹۴) سنن الترمذي (۴۰۷) مسند أحمد (۳/۴۰۴) صحيح الجامع (۵۸۶۷) [4] تفسير ابن كثير (۴/۵۰۱)

ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جہنم کا ایک بڑا پتھر دنیا کے سارے پہاڑوں سے بھی بڑا ہے، چنانچہ وہ شیخ غش کھا کر گر پڑا تو نبی کریم ﷺ نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا تو وہ زندہ تھا۔

پھر آپ ﷺ نے اس کو پکارا اور فرمایا: او شیخ! کہہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه. چنانچہ اس نے یہ کہا۔ پھر آپ ﷺ نے اس کو جنت کی بشارت دی۔ راوی نے کہا، چنانچہ آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا ہمارے درمیان میں سے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ﴾ [إبراهيم: ١٤] ''یہ ہے ان کے لیے جو میرے سامنے کھڑے ہونے کا ڈر رکھیں اور میری وعید سے خوف زدہ رہیں۔''[1] یہ حدیث مرسل غریب ہے۔

جہنم کے داروغے:

﴿عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ یعنی اس پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جن کی طبیعتیں سخت اور درشت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے منکروں پر رحم کرنا ان کے دلوں سے کھینچ لیا گیا ہے۔ ﴿شِدَادٌ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان کی ترکیب انتہا درجے کی شدت اور کثافت اور منظرِ مزعج میں ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جس وقت پہلے نار والے نار کی طرف پہنچیں گے تو جہنم کے خازنوں میں سے چار لاکھ خازن پائیں گے جن کے چہرے سیاہ اور اُن کے انیاب (چار تیز دانت) کالے ہوں گے، یعنی ترش رو دانت نکالے ہوئے ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے رحمت کھینچ لی ہے۔ ان میں کسی ایک کے دل میں بھی ذرا برابر رحمت نہیں ہے۔ ان میں سے اگر کسی ایک کے ایک شانے سے پرندہ اڑایا جاتا تو وہ اس کے دوسرے شانے تک پہنچنے سے پہلے دو ماہ تک اڑتا رہتا۔ پھر دروازے پر انیس فرشتوں کو پائیں گے، ان میں سے ایک کے سینے کی چوڑائی ستر خریف، یعنی سال کی ہے، پھر وہ ایک دروازے سے دوسرے دروازے کی طرف گرتے رہیں گے، پانچ سو برس تک، پھر ہر دروازے پر اسی کے مثل پائیں گے جو پہلے دروازے پر پایا تھا، یہاں تک کہ اس کے آخر تک پہنچیں گے۔[2] نعوذ بالله من النار وأهل النار ما أقبل الليل وأدبر النهار.

﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ﴾ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان کو کوئی حکم دیا تو اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ پلک جھپکنے تک کی بھی اس سے تاخیر نہیں کرتے اور وہ اس کے کرنے پر قادر ہیں، ان کو اس سے کسی طرح کی عاجزی نہیں ہے۔ یہ فرشتے وہی زبانیہ ہیں۔ عياذا بالله منهم۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن کفار سے کہا جائے گا کہ مت عذر پیش کرو، کیوں کہ وہ تو تم سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ تم تو آج کے دن اپنے ہی اعمال کا بدلہ پاؤ گے۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢٢٣٨،٢٢٣٧/٧) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسير ابن كثير (٥٠٢/٤)

سچی اور پکی توبہ کا حکم:

پھر فرمایا: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ﴾ یعنی اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرو سچی پکی توبہ جو اپنے سے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور تائب کی پریشانی کو جمع کر دیتی ہے اور اس کو ان دناءآت سے باز رکھتی ہے یعنی ان کمینگیوں سے دور رکھتی ہے جن کو وہ پہلے کیا کرتے تھا۔ اس کے بعد وہی اقوال ذکر کیے ہیں جن کا پہلے بیان ہو چکا ہے۔

پھر یہ اثر ذکر کیا ہے: عن زر بن حبیش عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مروی ہے، کہا: ہم سے کئی چیزیں کہی گئی ہیں کہ وہ اس امت کے آخر میں قیامت کے قریب ہونے کے وقت ہوں گی، ان میں سے مرد کا اپنی عورت اور اپنی لونڈی سے اس کے دبر میں جماع کرنا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اور ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم دشمنی رکھتے ہیں۔ اور ان میں سے مرد کا مرد سے جماع کرنا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس پر سخت غصہ ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے عورت کا عورت سے جماع کرنا ہے۔ اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سخت غصہ ہوئے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لیے کوئی نماز نہیں ہے، جب تک کہ وہ اقامت کریں اس پر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کریں توبہ نصوح۔

زر رحمہ اللہ کہتے ہیں، میں نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا: پھر توبہ نصوح کیا ہے؟ کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ندامت ہے گناہ پر، جس وقت کہ وہ اچانک تم سے ہو جاتا ہے، پھر تو اللہ تعالیٰ سے ندامت کے ساتھ مغفرت مانگے اور دوبارہ اس کو کبھی نہ کرے۔[1] (أخرجه ابن أبي حاتم) ابوعمرو بن العلاء رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے حسن رحمہ اللہ کو سنا، وہ کہتے تھے: توبہ نصوح یہ ہے کہ تو گناہ کو مبغوض رکھے، جیسا کہ تو نے اس کو محبوب رکھا تھا اور تو اس سے مغفرت مانگے جبکہ تو اس کو یاد کرے۔[2] (أخرجه ابن أبي حاتم)

اب رہی یہ بات کہ جس وقت پکی توبہ کی اور اس پر پختگی کی تو بے شک وہ اپنے سے پہلے کے گناہوں کو کاٹ دے گی، جیسا کہ صحیح میں ثابت ہوا ہے کہ اسلام اس شے کو قطع کر دیتا ہے جو اس سے پہلے ہے اور توبہ قطع کر دیتی ہے اس شے کو جو اس سے پہلے ہے۔[3] کیا توبہ نصوح کی یہ شرط ہے کہ مرنے تک اس پر قائم رہے، جیسا کہ حدیث میں اور اثر میں گزر چکا ہے کہ پھر کبھی اس کی طرف رجوع نہ کرے۔ یا اس پر پکا ارادہ کر لینا کہ دوبارہ نہ کرے گا، یہ تکفیر ماضی کے لیے (پہلے کے گناہ کو دور کرنے کے لیے) کافی ہے، اس طرح سے کہ اس کے بعد اگر وہ گناہ اس سے واقع

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۶۲/۱۰) شعب الإيمان (۳۷٤/٤) [2] تفسیر ابن کثیر (۵۰۳/٤)

[3] صحیح مسلم (۱۲۱) مسند أحمد (۱۹۸/٤) اس حدیث کا آخری جملہ (اور توبہ قطع ... پہلے ہے) ان الفاظ کے ساتھ نہیں ملا ہے۔

ہوتا تو تکفیر ما تقدم (پہلے کیے ہوئے گناہوں کو جو دور کر دیا گیا) میں کچھ نقصان نہ دیتا، اس حدیث شریف کے عموم کے سبب سے کہ «اَلتَّوْبَةُ تَجُبُّ مَا قَبْلَهَا»۔[1] پہلے قول کے لیے اس بات سے حجت پکڑی جاتی ہے جو صحیح میں بھی ثابت ہوئی ہے کہ ”جس نے اسلام لانے کے بعد اچھے عمل کیے، اس کا جاہلیت کے اعمال پر مواخذہ نہیں ہوگا اور جس نے برے عمل کیے اس کا جاہلیت اور اسلام دونوں کے اعمال پر مواخذہ ہوگا۔“[2] جب یہ اسلام میں ہے جو توبہ سے قوی تر ہے تو توبہ میں تو بہ طریق اولیٰ ہوگا۔ واللہ أعلم.

قولہ تعالیٰ: ﴿ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ کی تفسیر میں مذکور ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے عن رجل من بنی کنانہ روایت کیا ہے، کہا: میں نے فتح مکہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: «اَللّٰهُمَّ لَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[3] یعنی اے اللہ! تو مجھے قیامت کے دن رسوا نہ کرنا۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے پہلے مجھے سجدہ کرنے کی اجازت دی جائے گی اور سب سے پہلے مجھے سجدے سے سر اٹھانے کی اجازت دی جائے گی۔ میں اپنے سامنے دیکھوں گا تو تمام امتوں میں سے اپنی امت کو پہچان لوں گا۔ میں اپنے دائیں دیکھوں گا تو تمام امتوں میں سے اپنی امت کو پہچان لوں گا۔ میں اپنے بائیں دیکھوں گا تو امتوں میں سے اپنی امت کو پہچان لوں گا۔ ایک آدمی نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ امتوں میں سے اپنی امت کو کیسے پہچان لیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وضو کے نشانات کی وجہ سے ان کے ہاتھ پاؤں اور پیشانی چمکتی ہوگی۔ ان کے علاوہ کوئی ایسا نہ ہوگا۔ اور میں انھیں اس لیے بھی پہچان لوں گا کہ انھیں ان کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور میں ان کے چہروں میں نشاناتِ سجود سے بھی پہچان لوں گا۔ اور میں انھیں ایک اور علامت سے بھی پہچان لوں گا کہ ان کا نور ان کے آگے دوڑ رہا ہوگا۔“[4] (أخرجه الإمام أحمد)

کفار ومنافقین سے جہاد کا حکم:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ یعنی اے نبی! کفار و منافقین سے لڑ۔ کفار سے تو ہتھیار اور قتال کے ساتھ اور منافقوں سے ان پر حدوں کے قائم کرنے کے ساتھ اور ان پر سختی کر، یعنی دنیا میں اور ان کا ماویٰ جہنم ہے اور آخرت میں برا مرجع ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی مومن کسی کافر کو فائدہ نہ دے سکے گا:

پھر فرمایا: ﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے ان کے مسلمانوں کے

---

1. ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ 2. صحيح مسلم (١٢٠)
3. مسند أحمد (٢٣٤/٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله ثقات“ (مجمع الزوائد: ١٠/ ١٤٣)
4. مسند أحمد (١٩٩/٥) مستدرك الحاكم (٥٢٠/٢)

ساتھ خلط ملط ہونے اور معاشرت، یعنی رہنے سہنے کی ایک مثال بیان کی کہ یہ ان کے کچھ کام نہیں آئے گی اور نہ ان کو اللہ کے نزدیک کچھ نفع دے گی، اگر ان کے دلوں میں ایمان نہیں ہوگا۔ پھر مثال کا ذکر کیا تو فرمایا: ﴿ اِمْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ اِمْرَاَتَ لُوْطٍ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صٰلِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا ﴾ یعنی نوح علیہ السلام کی عورت اور لوط علیہ السلام کی عورت ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نیچے تھیں، یعنی دو نبیوں دو رسولوں کے پاس تھیں، رات دن ان کی صحبت میں رہتی تھیں، وہ ان کو اپنے پاس کھلاتے، پلاتے اور سلاتے تھے، ان سے نہایت درجہ عشرت اور اختلاط کرتے تھے، پھر دونوں نے ایمان میں ان کی خیانت کی۔ ایمان میں ان کی موافقت نہ کی اور نہ رسالت میں ان کی تصدیق کی تو اس سب نے ان کو کچھ فائدہ نہ دیا اور نہ ہی کسی محذور (وہ عذاب جس سے ڈرایا گیا) کو ان سے دور کیا۔

اسی لیے فرمایا: ﴿ فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ﴾ یعنی پھر وہ نبی ان کے کفر کی وجہ سے ان کے کچھ کام نہ آئے اور ان دونوں عورتوں سے کہا گیا کہ نار میں داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی داخل ہو جاؤ۔ یہ مراد نہیں ہے کہ انھوں نے فاحشہ میں خیانت کی، بلکہ دین میں خیانت کی، اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کی عورتیں فاحشہ میں واقع ہونے سے بچائی گئی ہیں، انبیاء علیہم السلام کی حرمت کے سبب سے جیسا کہ سورۃ النور میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔

امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان کی خیانت یہ ہے کہ ان کے دین کے علاوہ دین پر تھیں، چنانچہ نوح علیہ السلام کی عورت ان کے بھید پر مطلع ہوتی اور جب کوئی نوح علیہ السلام پر ایمان لاتا تو ان کی قوم کے جابروں اور سرداروں کو اس کی خبر کر دیتی تھی۔ اور لوط علیہ السلام کی عورت ایسا کرتی کہ جب لوط علیہ السلام کسی کو مہمان رکھتے تو وہ شہر کے لوگوں میں سے بدفعلی کرنے والوں کو اس کی خبر کر دیتی تھی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کے ان سے الفاظ یہ ہیں کہ کسی نبی کی عورت نے کبھی زنا نہیں کیا، ان کی خیانت صرف دین میں تھی۔ اسی طرح عکرمہ، سعید بن جبیر اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی کہا ہے۔[1] بعض علماء نے اسی آیت کریمہ سے اس حدیث کے ضعف پر استدلال کیا ہے جس کو بہت لوگ نقل کرتے ہیں کہ ''مَنْ أَكَلَ مَعَ مَغْفُوْرٍ لَهُ غُفِرَ لَهُ'' ''جس نے کسی بخشے ہوئے شخص کے ساتھ کھانا کھایا اسے بھی بخش دیا جائے گا'' اس حدیث کی کچھ اصل نہیں ہے یہ تو صرف بعض صالحین سے روایت کی جاتی ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''مَنْ أَكَلَ مَعَ مَغْفُوْرٍ لَهُ غُفِرَ لَهُ'' فرمایا: نہیں، لیکن میں اب کہتا ہوں۔[2]

کافر اللہ تعالیٰ کے ہاں مومن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا:

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ﴾ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لیے بیان فرمائی ہے کہ کفار کے ساتھ ان کی مخالطت کوئی ضرر نہ دے گی، جبکہ وہ ان کے محتاج ہوں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ

---

① تفسیر الطبري (۲۳/۴۹۷، ۴۹۸) ② اس کی کوئی اصل نہیں، مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ۳۱۵)

فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ﴾ [آل عمران: ۲۸] ''مومنوں کو چاہیے کہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حمایت میں نہیں ہے مگر یہ کہ ان کے شر سے کسی طرح بچاؤ مقصود ہو۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فرعون تمام زمین والوں سے بڑھ کر زیادتی کرنے والا، سرکش اور کافر تھا۔ اللہ کی قسم ہے کہ اس کی عورت نے جب اپنے رب کی اطاعت کی تو اس کے خاوند کے کفر نے اس کو کوئی ضرر نہیں دیا، تاکہ مومنین اس بات کو جان لیں کہ اللہ تعالیٰ عدل کرنے والا حاکم ہے، کسی سے مواخذہ نہیں کرتا مگر اس کے گناہ کا۔ قاسم بن ابی بزہ کہتے ہیں کہ فرعون کی عورت پوچھتی تھی کہ کون غالب ہوا؟ پھر جب کہا جاتا کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام غالب ہوئے تو کہتی: میں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے رب پر ایمان لائی۔

چنانچہ فرعون نے اس کی طرف آدمی بھیجے اور کہا کہ اگر وہ اپنی بات پر چلے تو تم بڑے سے بڑا پتھر جو پاؤ، وہ اس کو مارو اور اگر وہ اپنی بات سے رجوع کرے تو وہ میری عورت ہے۔ پھر جب وہ لوگ اس کے پاس آئے تو اس نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی تو جنت میں ایک گھر دیکھا، پس وہ اپنی بات پر چلی اور اس کی روح کھینچ لی گئی اور وہ پتھر ایک ایسے جسم پر ڈالا گیا تھا جس میں روح نہ تھا۔[1] (أخرجه ابن جرير)

چنانچہ علماء نے کہا ہے کہ اس کا یہ قول: ﴿ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ ﴾ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے دار سے قبل جار کو اختیار کیا۔ اس میں سے کچھ مرفوع حدیث میں بھی وارد ہوا ہے۔ ﴿ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ یعنی مجھے فرعون سے رہائی دے۔ بے شک میں اس کے عمل سے تیری طرف بری ہوتی ہوں اور مجھ کو ظالم قوم سے نجات دے۔ یہ عورت آسیہ بنت مزاحم رضی اللہ عنہا ہے۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ فرعون کی بیوی کا ایمان فرعون کے خازن کی بیوی کے ایمان کے سبب سے تھا۔ یہ اس طرح ہے کہ خازن کی بیوی بیٹھی ہوئی فرعون کی بیٹی کو کنگی کر رہی تھی تو اس کے ہاتھ سے کنگھی گر پڑی، چنانچہ وہ بول اٹھی کہ ہلاک ہو وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا منکر ہوا! تو فرعون کی بیٹی نے اس سے کہا کہ میرے باپ کے سوا تیرا کوئی اور رب ہے؟ اس نے کہا: ہاں میرا رب اور تیرے باپ کا رب اور ہر شے کا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ اس پر فرعون کی بیٹی نے اس کو طمانچا لگایا اور مارا اور اپنے باپ کو بتایا تو فرعون نے اس کی طرف آدمی بھیجا اور کہا: کیا تو میرے سوا کسی اور رب کو پوجتی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں، میرا رب اور تیرا رب اور ہر شے کا رب اللہ ہے اور اسی کو میں پوجتی ہوں۔ پھر فرعون نے اس کو عذاب کیا اور اس کے لیے میخیں گاڑیں اور اس پر سانپ چھوڑے، پھر وہ پورا دن اسی طرح رہی۔ پھر فرعون نے اس سے کہا کہ اگر تو نہ مانے گی میں تیرے بیٹے کو تیرے منہ کے سامنے ذبح کرنے والا ہوں، اس نے

[1] تفسير الطبري (۲۳/۵۰۰)

فرعون سے کہا کہ تو جو کرنا چاہتا ہے وہ کر لے، پھر فرعون نے اس کے بیٹے کو اس کے سامنے ذبح کیا اور اس کے بیٹے کی روح نے اس کو بشارت دی اور کہا: او اماں! تو خوش ہو جا۔ بے شک تیرے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس ایسا ایسا ثواب ہے تو اس نے صبر کیا۔ پھر فرعون ایک دوسرے دن اس کے پاس آیا اور اس سے ویسا ہی کہا اور اس نے بھی اس کو ویسا ہی جواب دیا۔ پھر فرعون نے اس کی بیٹی کو اس کے سامنے ذبح کیا تو اس کی روح نے بھی اس کو بشارت دی اور اس سے کہا: او اماں! تو صبر کر بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس تیرے لیے ایسا ایسا ثواب ہے۔ راوی نے کہا ہے کہ فرعون کی بیوی نے اس کے بڑے بیٹے کی اور چھوٹی بیٹی کی باتیں سنیں تو فرعون کی عورت ایمان لے آئیں اور اللہ تعالیٰ نے فرعون کے خازن کی بیوی کی روح قبض کر لی اور فرعون کی بیوی کے لیے اس کے ثواب اور مقام اور عزت کا پردہ کھول دیا، وہ ثواب جو جنت میں ہے۔ یہاں تک کہ اس نے دیکھ لیا تو اس کا ایمان و یقین و تصدیق اور زیادہ ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرعون کو اس کے ایمان پر مطلع کر دیا۔ تو اس نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ تم آسیہ بنت مزاحم کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ تو انھوں نے اس کی تعریف کی۔ چنانچہ اس نے کہا کہ وہ تو میرے علاوہ کسی کو پوجتی ہے، اس پر انھوں نے اس سے کہا کہ تو اس کو مار ڈال تو اس کے لیے میخیں گاڑیں۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں باندھے، چنانچہ آسیہ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا: ﴿ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ ﴾

چنانچہ یہ کہنا اس وقت ہوا جب فرعون اس کے پاس آیا تو اس کی بیوی نے جب اپنا گھر جنت میں دیکھا تو ہنس دی۔ چنانچہ فرعون نے کہا: کیوں جی تم اس کے جنون پر تعجب نہیں کرتے ہو کہ ہم تو اس کو عذاب کرتے ہیں اور وہ ہنستی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی روح جنت میں قبض کی۔[1] (قاله جعفر الرازي عن الربيع بن أنس عن أبي العالية لیکن اس قصے سے خازن کی عورت کا ایمان فرعون کی عورت سے قبل معلوم ہوتا ہے۔ والله أعلم)

مریم علیہا السلام کے فضائل:

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ یعنی اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ محفوظ اور مصئون رکھی۔ احصان بہ معنی پاک دامنی و حریت ہے۔ پھر ہم نے اس میں اپنی روح سے پھونکا۔ یعنی فرشتے کے واسطے سے، مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مریم علیہا السلام کی طرف بھیجا تو وہ اُن کے لیے ایک پورے آدمی کی صورت بن کر آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ اپنے منہ سے ان کے کُرتے کی جیب میں پھونکیں، پھر وہ پھونک نیچے اتری تو ان کی شرم گاہ میں داخل ہو گئی۔ پھر اس سے عیسیٰ علیہ السلام کا حمل ہوا اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿ فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ اور سچی جانیں اپنے رب کی باتیں اور اس کی کتابیں، یعنی اس کی تقدیر اور شریعت کی تصدیق کی اور تھی وہ قانتین سے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٥٠٥/٤)

عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین میں چار خط کھینچے اور فرمایا کہ اہل جنت کی عورتوں میں سے افضل خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ہے اور فاطمہ بنت محمد رضی اللہ عنہا اور مریم بنت عمران علیہا السلام اور آسیہ بنت مزاحم رضی اللہ عنہا زنِ فرعون ہیں۔[1] (أخرجه الإمام أحمد). پھر ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ مذکورہ حدیث ذکر کی ہے۔[2] پھر یوں کہا ہے: ہم نے اپنی کتاب ''البداية والنهاية'' میں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے قصے میں ان احادیث کے جملہ طرق اور الفاظ ذکر کرکے ان پر کلام کیا ہے۔ ولله الحمد والمنة. نیز ہم نے فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا﴾ کے تحت وہ حدیث بھی ذکر کی ہے جس میں یہ بیان ہے کہ وہ (مریم علیہا السلام) اور آسیہ بنت مزاحم رضی اللہ عنہا جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں سے ہوں گی۔ آخر سورة التحريم. ولله الحمد والمنة.[3]

---

[1] مسند أحمد (١/٢٩٣) [2] صحيح البخاري (٣٢٣٠) صحيح مسلم (٢٤٣١) [3] تفسير ابن كثير (٤/٤٩٤-٥٠٦)

ہماری دیگر مطبوعات

نمبر شمار	نام کتاب	تالیف	صفحات / مجلد
1	قرآنِ کریم (مترجم و محشی)	مولانا فتح محمد جالندھری و حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ	مجلد۔735
2	تفسیر ترجمان القرآن (جلد 1)	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔1024
3	تفسیر ترجمان القرآن (جلد 2)	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔968
4	تفسیر ترجمان القرآن (جلد 3)	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔1020
5	تفسیر ترجمان القرآن (جلد 4)	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔1006
6	تفسیر ترجمان القرآن (جلد 5)	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔996
7	تفسیر ترجمان القرآن (جلد 6)	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔976
8	تفسیر ترجمان القرآن (جلد 7)	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔984
9	تفسیر ترجمان القرآن (جلد 8)	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔904
10	تفسیر ترجمان القرآن (جلد 9)	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔832
11	ارکانِ اسلام	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔752
12	ارمغان مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ	حمید اللہ خان عزیز حفظہ اللہ	مجلد۔948
13	**إسعاد العباد بحقوق الوالدين والأولاد**	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	کارڈ کور۔128
14	امام ابن تیمیہ اور ان کے تجدیدی کارنامے	رشحاتِ قلم: علامہ شبلی نعمانی، مولانا غلام رسول مہر، علامہ عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، پروفیسر خلیق احمد نظامی، علامہ محمد عزیر شمس رحمۃ اللہ علیہم	مجلد۔224
15	اہلِ حدیث کا مذہب	مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ	کارڈ کور۔144
16	اہلِ حدیث کی اولیات	مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ	مجلد۔208
17	ایمان افروز وصیتیں	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔336
18	**بداية المجتهد**- عالمیہ (عربی) سنہ اولیٰ برائے طلبہ وطالبات	امام ابن رشد قرطبی رحمہ اللہ	کارڈ کور۔184

19	**بداية المجتهد**- عالیہ (عربی) سنہ ثانیہ برائے طلبہ	امام ابن رشد قرطبی رحمہ اللہ	کارڈ کور۔184
20	**بداية المجتهد**- عالیہ (عربی) سنہ ثانیہ برائے طالبات	امام ابن رشد قرطبی رحمہ اللہ	کارڈ کور۔172
21	**بداية المجتهد**- عالیہ (عربی) سنہ ثانیہ برائے طلبہ	امام ابن رشد قرطبی رحمہ اللہ	کارڈ کور۔220
22	بدیع التفاسیر (سندھی)	علامہ بدیع الدین شاہ راشدی سندھی رحمہ اللہ	11 جلدیں
23	برصغیر میں اصحاب الحدیث [ایک مطالعہ]	محمد تنزیل الصدیقی الحسینی حفظہ اللہ	مجلد۔464
24	**بغية الرائد في شرح العقائد**	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔304
25	تحریک اہلِ حدیث	مولانا حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ	مجلد۔576
26	تذکرہ ثنائیہ	مولانا ثناء اللہ امر تسری رحمہ اللہ	مجلد۔584
27	تذکرہ نذیریہ	محمد تنزیل الصدیقی الحسینی حفظہ اللہ	2 جلدیں
28	تذکرہ مولانا عبدالحق محدث ملتانی رحمہ اللہ	حافظ ریاض احمد عاقب اثری حفظہ اللہ	مجلد۔592
29	تذکرہ مولانا عبدالرحمان مبارک پوری رحمہ اللہ	ملک عبدالرشید عراقی حفظہ اللہ	مجلد۔312
30	**التعليق المنصور على فتح الغفور في وضع الأيدي على الصدور**	علامہ بدیع الدین شاہ راشدی سندھی رحمہ اللہ	کارڈ کور۔144
31	تعلیقاتِ سلفیہ علی تفسیر الجلالین	مولانا صفی الرحمن مبارک پوری	مجلد۔192
32	تعلیم الاسلام	نواب سید صدیق حسن خان رحمہ اللہ	مجلد۔256
33	تفسیر بالرائے	مولانا ثناء اللہ امر تسری رحمہ اللہ	مجلد۔320
34	**التفسير والمفسرون** (عربی)	دکتور محمد حسین ذہبی رحمہ اللہ	کارڈ کور۔216
35	تکفیر کے اصول وضوابط	فضیلۃ الشیخ ابراہیم بن عامر الرحیلی	مجلد۔272
36	تلخیص الجامع الکامل	فضیلۃ الشیخ ضیاء الرحمان اعظمی رحمہ اللہ	6 جلدیں
37	الجامع الکامل	فضیلۃ الشیخ ضیاء الرحمان اعظمی رحمہ اللہ	19 جلدیں
38	**جائزة الأحوذي في شرح سنن الترمذي** (عربی)	شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی رحمہ اللہ	5 جلدیں

39	الحاد (وسائل، خطرات اور علاج)	ڈاکٹر صالح بن عبدالعزیز سندی	کارڈ کور۔104
40	حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان	علامہ عبدالعزیز رحیم آبادی رحمہ اللہ	مجلد۔368
41	**الحیاۃ بعد المماۃ** (میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کی اولین مفصل سوانح عمری)	مولانا فضل حسین بہاری رحمہ اللہ	مجلد۔512
42	خطبہ غدیرِ خُم اور اہلِ بیت کے حقوق	مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ	کارڈ کور۔144
43	دارالحدیث رحمانیہ دہلی (تاریخ وتعارف)	فضیلۃ الشیخ مولانا اسعد اعظمی حفظہ اللہ	مجلد۔352
44	دبستانِ نذیریہ	محمد تنزیل الصدیقی الحسینی حفظہ اللہ	3 جلدیں
45	دینی تعلیم و تربیت کے اصول وآداب	مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری رحمہ اللہ	کارڈ کور۔118
46	دیوانِ صمصام (پنجابی شعری مجموعہ)	حضرت مولانا علی محمد صمصام حفظہ اللہ	مجلد۔662
47	راشدی خاندان کی دینی وعلمی خدمات	ڈاکٹر عبدالعزیز نہڑیو حفظہ اللہ	مجلد۔776
48	روداد مناظرہ سیالکوٹ	مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ	کارڈ کور۔144
49	زبانِ خامہ کی خامیاں	علیم ناصری/ محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ	مجلد۔224
50	زیورِ علم۔ ترجمہ: حلیۃ طالب العلم	علامہ بکر بن عبداللہ ابوزید رحمہ اللہ	کارڈ کور۔112
51	سلفیانِ برصغیر اور سعودی عرب ودیگر عرب ممالک کے مابین تعلقات	فضیلۃ الشیخ صلاح الدین مقبول احمد / فضیلۃ الشیخ عارف جاوید محمدی	کارڈ کور۔80
52	سوانح مولانا احمد دین گکھڑوی	مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ	مجلد۔360
53	سوئے منزل (فکرِ آخرت)	مولانا عبدالخالق مدنی حفظہ اللہ	مجلد۔304
54	شرح عقیدہ واسطیہ (عربی)	امام ابن تیمیہ - علامہ خلیل ہراس	مجلد۔296
55	شرح کتاب العلم من صحیح بخاری	فضیلۃ الشیخ حافظ عبدالحمید ازہر رحمہ اللہ	مجلد۔296
56	شہادۃ القرآن	مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ	مجلد۔508
57	صحیح فضائلِ صحابہ	فضیلۃ الشیخ ضیاء الرحمان اعظمی رحمہ اللہ	مجلد۔702
58	صریح السنۃ (اردو ترجمہ)	امام محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ	کارڈ کور۔80
59	**ضوابط الجرح والتعدیل** (عربی)	ڈاکٹر عبدالعزیز عبداللطیف رحمہ اللہ	مجلد۔352
60	علمائے اہلِ حدیث کی کہانی، ان کی اپنی زبانی	مولانا یحییٰ عزیز ڈاہروی	مجلد۔856